جلد دوم

پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا

سرحد

NWFP

الفیصل

لوک ورثہ
LOK VIRSA

PAKISTAN ENCYCLOPEDIA OF FOLKLORE

جلد دوم

پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا

صوبہ سرحد

(این، ڈبلیو، ایف، پی)

9844

زیر اہتمام

مشترکہ اشاعتی پروگرام

لوک ورثہ
LOK VIRSA

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

DATA ENTRED

©Lok virsa, Islamabad.

PAKISTAN ENCYCLOPEDIA OF FOLKLORE,
NWFP

All rights reserved --no part of this Encyclopedia may be reproduced in any form without permission in writing from the Publisher, except by a reviewer who wishes to quote brief passages in connection with a review written for inclusion in magazine or newspaper.

Executive Editor/Publisher
Uxi Mufti

Editor
Syed Muhammad Ali

Panel of Contributors

Qari Javaid Iqbal.....Peshawar, Mardan, Swat,
Hazara, Kohat, Bannu, D.I.Khan
Mukhtar Ali Nayyer.....Hindco Portion
Razwal Kohistani.....Indus Kohistan

Title Photo.....Abdul Rashid

A joint venture of
Lok Virsa, Islamabad
and
Al-Faisal Nashran, Lahore,
In five volumes
NWFP, Sindh, Baluchistan, Punjab and Karakorum Region

Sold and distributed in Pakistan by
Al-Faisal Nashran, Ghazni Street, Urdu Bazaar, Lahore, Pakistan
Ph: 92-042-7230777
E.Mail: alfaisal_pk@hotmail.com
Lok Virsa, Garden Avenue,
Islamabad, Pakistan.
Ph: +92-051-9252097

فہرست

۱۔ دیباچہ.....i

۲۔ فوک لور اور ثقافتی اقدار کا شعور

عکسی مفتی.....vi

پشاور:

جغرافیہ.....1

پشاور کے معروف باغات.....5

زبان.....7

ہندکو، اصناف سخن.....12

ہندکو نثری ادب.....18

ریتاں (رسوم).....22

پشاور اور گردونواح میں آباد اقوام.....30

مقامی خصوصیات.....45

خاص خاص پکوان.....51

ادبی اور ثقافتی شخصیات.....58

پشاور کے نامور مصور و خطاط.....73

پشاور کے نامور گلوکار اور قوال.....81

پشاور کے مزارات.....83

میلے، تہوار اور عرس.....96

لوک داستانیں اور کہانیاں.....103

جسمانی کھیل تماشے.....112

لوک ساز، گیت اور ناچ.....116

سرحد کی لوک کہانیاں/داستانیں.....125

تاریخ، پشاور کے قدیم نام.....3

آبادی کے اجزائے ترکیبی.....6

ہندکو، تاریخ و ثقافت.....8

ہندکو کے چند قدیم شعراء.....15

قدیم پیشے.....19

ہندکو لوک کہانیاں.....27

پشاور کے قدیم لباس.....41

مقامی کھانے.....47

پیشے اور دستکاریاں.....53

پشتون اہل قلم شاعر اور ادیب.....69

معتبر روحانی اور علمی شخصیات.....76

پشاور کے نامور پہلوان.....82

قبریں اور قبرستان، رسوم و رواج.....89

فن تعمیر.....98

لوک لباس، زیورات و دیگر سامان آرائش.....110

لوک کھیل تماشے.....115

لوک علاج.....122

DATA ENTRED

مردان ریجن:

مردان ریجن..... 145
آبادی کے اجزائے ترکیبی..... 149
پیشے اور دستکاریاں..... 156
رسوم ورواج (شادی بیاہ، پیدائش اور موت)..... 163
تعمیرات، یادگاریں، رہائش گاہیں، غاریں اور کھنڈرات..... 167
لوک ساز گیت..... 176
لباس وزیورات، رہن سہن..... 184
تاریخ مردان، صوابی..... 146
مقامی کھانے اور پکوان..... 154
شخصیات..... 159
تہوار اور میلے..... 166
رومانوی داستانیں..... 169
آلاتِ موسیقی..... 183
جسمانی کھیل..... 185

سوات "مالاکنڈ ریجن":

جغرافیہ..... 188
آبادی کے اجزائے ترکیبی..... 194
مقامی کھانے..... 199
ادبی سماجی اور ثقافتی شخصیات..... 202
عبادت گاہیں..... 204
"لوک ساز، گیت اور رقص..... 210
لوک کھیل تماشے..... 213
تاریخ..... 192
مقامی خصوصیات..... 198
عوامی پیشے اور دستکاریاں..... 200
جشن میلے اور تہوار..... 203
لوک داستانیں اور کہانیاں..... 206
لوک لباس، زیورات اور سامان آرائش..... 211
لوک علاج..... 214

ہزارہ:

مقامی خصوصیات..... 216
آبادی کے اجزائے ترکیبی..... 224
روایتی کھانے اور ان سے متعلقہ روایات..... 230
ادبی اور ثقافتی شخصیات..... 233
غمی کی رسمیں..... 237
لوک داستانیں اور کہانیاں..... 241
شادی کے لوک گیت..... 246
لباس اور زیورات..... 248
لوک علاج، دم درود..... 252
تاریخ ہزارہ..... 223
قومیں..... 225
عوامی پیشے اور دستکاریاں..... 232
رسم ورواج..... 235
طرزِ تعمیر، آرائش ورہن سہن..... 239
لوک ساز گیت اور ناچ..... 245
ہزارہ کے آلاتِ موسیقی..... 247
کھیل اور لوک کھیل تماشے..... 250

کوہاٹ:

جغرافیہ..... 254
تاریخ کوہاٹ..... 256

اجزائے ترکیبی..... 258

روایتی پکوان، عرس اور میلے..... 267

لوک رقص گیت اور لوک ساز..... 269

بنوں:

جغرافیہ..... 271

مقامی خصوصیات..... 281

پیشے، دستکاریاں، ہنر اور ہنر مند..... 283

عرس، میلے اور تہوار..... 290

بنوں کی رومانوی اور رزمیہ داستانیں..... 293

طرز زندگی، لباس و زیورات..... 297

ڈیرہ اسماعیل خان ریجن:

جغرافیہ..... 301

ڈیرہ کا تاریخی پس منظر..... 305

مقامی خصوصیات..... 312

پیشے اور دستکاریاں..... 316

رسوم و رواج..... 319

ہندوؤں کے تہوار اور میلے..... 321

مندر اور مساجد..... 327

لوک ساز، لوک گیت اور اصناف کی شاعری..... 333

خواتین کا لباس..... 339

لوک علاج..... 342

انڈس کوہستان:

محل وقوع..... 343

کوہستان کے لوک ادارے، ذاتیں اور قبیلے..... 351

کوہستان کے مشہور ڈوم گھرانے..... 356

کوہستان میں لوک فنون اور روایتی تعمیرات..... 361

کشیدہ کاری..... 365

ہار، مالائیں اور زیور..... 369

کوہاٹ کی ادبی و ثقافتی شخصیات..... 264

تعمیرات..... 268

لوک اور روحانی علاج..... 270

آبادی کے اجزائے ترکیبی..... 275

پکوان اور کھانے کے طور طریقے..... 282

رسم و رواج..... 289

روایتی طرز تعمیر، قلعے اور کھنڈرات..... 291

لوک ساز، گیت اور ناچ..... 296

لوک کھیل..... 298

تاریخ..... 303

آبادی کے اجزائے ترکیبی..... 306

مقامی پکوان و مشروبات اور کھانے..... 314

صوفیاء اور ادبی اور ثقافتی شخصیات..... 318

عرس میلے اور مجالس..... 320

روایتی طرز تعمیر و آرائش اور رہن سہن..... 322

لوک و رزمیہ داستانیں، روایات و حکایات..... 328

لوک لباس، زیورات..... 338

جسمانی کھیل اور کھیل تماشے..... 340

مذاہب..... 350

پیشہ ور گھرانے، ذاتیں اور اُن کے رواجی فرائض و معاوضے..... 355

کوہستان کی مقامی زبانیں..... 359

قبریں اور قبرستان..... 362

لباس اور کشیدہ کاری..... 366

آلات موسیقی، اوزار..... 370

کوہستانی لوک ادب.....372
لوک گیت.....378
کوہستانی زبان کے لوک گیت.....382
دربار، درگائیں اور خلے.....384
دنوں اور مہینوں کے بارے میں اعتقادات.....387
متفرق رسوم، اعتقادات.....391
بابرکت سمجھے جانے والے درخت، پودے.....393
چند متفرق روایتی سزائیں.....396
فصلیں.....399
اناج کے مقامی پیمانے.....401
پیدائش کی رسمیں.....406
کوہستان میں شادی کے موقع کے بعض سماجی پہلو.....420
کوہستانی شناہین.....422
لوک ناچ اور کھیل تماشے.....427
اہم جھیلیں، پہاڑ، گلیشیر، ندی نالے اور چراگاہیں.....432

قبائلی علاقہ جات:

سرحد کے قبائلی علاقہ جات.....437
باجوڑ ایجنسی، مالاکنڈ ایجنسی.....441
کرم ایجنسی.....443
قبائلی رسوم ورواج.....447
بدل.....447
شرمالہ.....448
جرگہ.....448

انسائیکلوپیڈیا (سرحد ولیم) کے لکھاریوں کا مختصر تعارف:

قاری جاوید اقبال.....449
مختار علی نیر.....451
رازول کوہستانی.....453
منتخب کوہستانی کہاوتیں اور محاورات.....377
مجلس کا روایتی ماحول.....380
کوہستان کے لوک شعراء.....383
لوک رسوم، اعتقادات.....386
نظرِ بد کے ٹوٹکے.....389
فصل، مال مویشی سے متعلق لوک ریت واعتقادات.....392
نسبی نام، گوت اور روایتی نام.....394
روایتی ویش، کاشت کاری، مقامی کھانے اور مشروبات.....398
زرعی کاموں کی روایتی تقسیم.....400
موسم، موسمی تقسیم، نقل مکانی اور روایتی سرگرمیاں.....404
کوہستان میں شادی کی لوک رسمیں.....409
کوہستان میں موت کی رسمیں.....421
لوک علاج، ٹونے ٹوٹکے، دم درود.....425
عورتوں کے ناچ.....428
کوہستان کی جنگلی حیات.....433
مہمند ایجنسی.....439
اورکزئی ایجنسی.....442
وزیرستان ایجنسی.....445
پختون ولی.....447
میلمستیا.....448
تور.....448

دیباچہ

پاکستان 14، اگست 1947ء کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ وہ علاقے جو آج مملکت پاکستان کا حصہ ہیں نہ صرف دنیا کی قدیم ترین تہذیب وثقافت کے وارث ہیں بلکہ موہنجوداڑو، ٹیکسلا، ہڑپہ اور گندھارا جیسی ہزاروں سالہ قدیم تہذیب وتمدن کے نقوش اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جو طویل سیاسی جدوجہد اور نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا خواب دیکھا اور قائداعظم محمد علی جناح نے اسے تعبیر دی۔ مگر وہ خواب اور تعبیر ہماری منزل نہیں، یہ منزل پر پہنچنے کا راستہ تھا۔ اُس خواب کو حقیقت میں بدلنے اور منزل پر پہنچنے کے لئے اس دھرتی اور اس مٹی سے پھوٹنے والی لوک ریت اور روایات کے اُن راستوں کو اختیار کرنا ہوگا جو ہمارے اسلاف کا خاصہ تھیں۔

پاکستانی تہذیب وتمدن قدیم وجدید کا حسین امتزاج ہے۔ اس علاقے میں اسلام کی آمد نے اس قدیم تمدن، اس کے تہذیبی اور فطرتِ انسانی اور اس کی روحانی قدروں کی نفی نہیں کی بلکہ ان قدروں کے ہم آہنگ اجزاء کو پروان چڑھایا، انہیں زندہ رہنے میں مدد دی اور پاکستانی تہذیب وثقافت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پاکستانیوں کو ایک ایسی وحدت کی لڑی میں پرو دیا کہ آج پاکستان کا ہر علاقہ متنوع، رنگارنگ اور جداگانہ ثقافتی رنگ کے باوجود وحدت کی ایسی لڑی سے منسلک ہے جس کی آبیاری اسلامی روحانی قدروں سے ہوتی ہے۔ اس انسائیکلو پیڈیا میں پاکستانی ثقافت کے ایسے اجزائے ترکیبی کے نقوش کی تفصیل دی گئی ہے جو اس سے قبل کبھی یکجا نہیں کیے گئے۔

لوک ورثہ نے پاکستان کے ثقافتی انسائیکلو پیڈیا کی تیاری میں برسہابرس صرف کیے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کے دشوار ترین علاقوں کا سفر کیا گیا بلکہ ہر علاقے کے لکھاریوں، دانا اور معتبر لوگوں کے ساتھ میٹنگ کر کے انہیں اس کام میں باقاعدہ شامل کر کے اسے موجودہ مقام تک پہنچایا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ کام مکمل ہو گیا ہے درست نہ ہوگا، ابھی اس میں بہتری اور ترمیم واضافے کی بہت گنجائش ہے اور امید ہے کہ اس ماڈل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر علاقے کے لکھاری، دانشور اور محقق قلمی تعاون اور مشوروں سے نوازیں گے۔

ثقافتی انسائیکلو پیڈیا پر کام کے لیے ابتدائی طور پر چند رہنما اصول ترتیب دیئے گئے تھے جن کا مقصد لکھاری کو یہ سمجھانا تھا کہ یہ دیگر انسائیکلو پیڈیا سے فرق نوعیت کا کام ہے اور اس میں تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ فوک لور پر فوکس رکھنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم اپنی اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں لکھاری کی سہولت کے لئے درج ذیل گائیڈ لائن (رہنما اصول) ترتیب دیئے گئے تھے۔

علاقے کا نقشہ اور حدود اربعہ: علاقے کا ایک بہترین نقشہ جو ثقافتی شناخت اور اسکے مخصوص جغرافیائی خدوخال کو سامنے رکھ کر بنایا جائے جیسے ساندل بار، پوٹھوار، تھرپارکر اور چولستان کا نقشہ وغیرہ۔ جو علاقے کی مخصوص لسانی اور ثقافتی شناخت کی حد بندی کو واضح کرتا ہو۔ اور کچھ اعداد وشمار وغیرہ۔ شہروں اور قصبوں کے نام شمالاً جنوباً اور مشرق مغرب میں علاقے، دریا پہاڑ وغیرہ۔

جغرافیہ: جغرافیائی اعتبار سے صرف تین یا چار پیراگراف کافی ہونگے لیکن اس میں مقامی سطح پر چرند پرند، مشہور مقامات، جھیلیں، دربار، درگاہ، دریا، مزار، موسم، فصلیں، جڑی بوٹیاں، درخت اور مقامی خصوصیات وغیرہ۔ جغرافیے کا فوک لور کے حوالے سے بیان پر زور ہونا چاہیے جیسے سوہنی مہینوال کا دریائے چناب یا وارث شاہ کا ملکہ ہانس، ہیر رانجھے کا تخت ہزارہ اور دوسرے کئی طرح کے جغرافیائی ثقافتی حوالے۔

تاریخ: تاریخ کے بارے میں مختصراً دو یا تین پیراگراف ہوں۔ ان میں فوک لور کے پہلو کو نمایاں جگہ دی جائے مثلاً کسی مشہور قصے کے کرداروں کا ذکر، ادبی فنی ثقافتی، تاریخی شخصیات اور مقامات وغیرہ۔ انتہائی اہم تاریخی اور ضروری حوالے اگر ہوں تو انہیں مختصراً بیان کر دیا جائے۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی: آبادی کے بارے میں پیراگراف میں نسلی اور لسانی معلومات درج کی جائیں جیسے بلوچ کافی تعداد میں ہیں۔ فلاں فلاں قبیلے اور فلاں فلاں زبانیں بولتے ہیں ان کے عادات وخصائل وغیرہ اور اعداد وشمار۔

ہر قبیلے پر ایک چھوٹا پیراگراف علیحدہ علیحدہ لکھیں اس کے علاوہ اگر علاقے میں خانہ بدوش قبیلے آتے ہوں تو انہیں بھی شامل کریں۔ قبیلوں اور زبانوں کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کریں۔

مقامی خصوصیات: علاقے کی مشہور مخصوص ثقافتی شناخت کیا ہے۔ مشہور چیزیں مقامی خصوصیات کے زمرے میں آتی ہیں جیسے قصور بابا بلھے شاہ کی وجہ سے یا وہاں کے خاص کھانوں کی وجہ سے۔ اسی طرح اور علاقے مشہور ہیں جیسے کہیں جوتے اور کھیس مشہور ہوتے ہیں کہیں کوئی بہادر آدمی نے نام پیدا کیا ہوتا ہے وغیرہ۔ علاقے کی مخصوص شناخت یا نام کس بناء پر ہے، اس پر زور ہونا چاہیے۔

علاقے کی ثقافتی مشہور شخصیات جیسے دلا بھٹی، عالم لوہار، آدم خان، بالی جٹی، اور مشہور ادبی شخصیات جیسے وارث شاہ، خوشحال خان خٹک وغیرہ۔ ہر شخصیت اور اس کے ہنر یا پیشے کے متعلق الگ پیرگراف میں ذکر کریں۔

عورتوں اور مردوں کے نام۔

مقامی کھانے: یہ باب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۱۔ کھانے کے طریقے، اہم رسم ورواج اور آداب

۲۔ خاص خاص پکوان

۳۔ مہمانداری کے طریقے اور سلیقے

۴۔ مٹھائیاں، پھل اور مشروبات۔

۵۔ میزبانی کے طریقے اور اداب دسترخوان۔

مقامی کھانوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا جائے۔ ان کے اجزائے ترکیبی اور لوک روایت وغیرہ۔ صرف مقامی سطح کے کھانوں کے بارے میں جانکاری مہیا کی جائے جیسے ساگ، بھجی، مٹھائیاں، مشروبات اور دیگر چیزوں کے استعمال کے مقامی

طریقے، خوشی غمی کے خاص پکوان وغیرہ۔

روایتی تعمیر و آرائش اور رہن سہن: یہ باب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہوگا۔

۱۔ لوگوں کا رہن سہن، گھر، تعمیر مکان، سامان آرائش، گھریلو سامان

۲۔ طرز تعمیر عمومی

۳۔ طرز تعمیر خصوصی

۴۔ دیگر تعمیرات کنویں، باولیاں، باغ، تالاب، کاریز، چوپال، حجرے، جھونپڑیاں، تنبو، وغیرہ۔

۵۔ علاقے کی اہم تاریخی اور ثقافتی عمارات وغیرہ۔

علاقے کی روایت، فن تعمیر اور آرائش کے بارے میں مکمل باب اہم چیزوں یا تعمیر کے نقشے اور تصویریں بھی مہیا کی جائیں ۔عمومی گھر کیسے ہیں، علاقے کے بڑے گھر تعمیراتی خصوصیات، حویلیاں وغیرہ۔ فن تعمیر کے مختلف فنون کی تفصیل، مثلاً لکڑی کا کام نقش گری، سجاوٹ کے دوسرے ہنر وغیرہ۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں: مقامی اور روایتی پیشوں پر تفصیل سے ایک باب لکھیں جس میں مقامی ہنرمندوں، کمہار، نائی، موچی، اور دیگر پیشوں اور ان پیشوں سے وابستہ لوگوں کے بارے میں معلومات۔

مثلاً کس پیشے کے لوگ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں ان کا تاریخی پس منظر وغیرہ۔ متعلقہ ہنرمندوں میں پیشوں کے رجحان، اسباب وغیرہ۔ اور علاقے کی دستکاریوں پر الگ الگ پیراگراف لکھئے۔ اس کے علاوہ خواتین گھروں تک محدود ہو کر اگر کوئی ہنر جانتی ہوں اور کام کرتی ہوں تو اس پر معلومات درج کریں۔

رسم و رواج: رسومات اور رسم و رواج کے بارے میں تفصیلی باب جس میں

شادی بیاہ، پیدائش اور موت،

ختنہ کی رسم ان کے علاوہ متعلقہ علاقے کی خصوصی رسم مثلاً،

گھر میں داخل ہونے کی رسم،

چھوٹے بڑے کے بارے میں رسومات، آداب وغیرہ۔

حال دینا حال لینا، میل جول

دوستی و دشمنی کی رسومات

سفر پر جانے کی رسومات،

تعویذ باندھنے کی رسم اور اس طرح کی دیگر رسومات وغیرہ۔

مردوں عورتوں کی گھریلو ذمہ داریاں اور مشاغل

بوڑھوں، بزرگوں کے مشاغل،

بچوں کے مشاغل۔

لوک ساز، گیت اور ناچ: الگ پیراگراف میں فن رقص و موسیقی اور سازوں کے بارے میں عمومی تعارف لکھیں پھر الگ ایک پیرا میں گیت۔ ناچ اور ساز پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ یہ مقامی رقص اور موسیقی کے بارے میں مکمل باب ہو جس میں ہر ساز کے مقامی نام، مشہور رقص اور گیت اور کن تہواروں اور موقعوں پر یہ پیش کئے جاتے ہیں۔ مشہور گیتوں کے مختصر بول، سازوں اور ناچوں کی تصاویر بھی مہیا کریں۔

لوک داستانیں، کہانیاں، باتیں اور روایات: لوک داستانوں، کہانیوں، قصوں اور روایات کے بارے میں تفصیلی باب جس میں مشہور مقامی قصہ کہانیوں کا مختصر خلاصہ دیا جائے۔ مقامی اکھان اور رومان دیئے جائیں، واریں، جگ نامے، رزمیہ داستانیں بیان کی جائیں۔

لوک لباس اور زیورات اور دیگر سامان آرائش: لباس اور زیورات، عورتوں کے لباس:۔ اس باب میں زنانہ اور مردانہ، بچگانہ مقامی روایتی لباسوں کی قسمیں وہ کن خاص موقع پر پہنے جاتے ہیں، عام لباس کیا ہے، بنائے گئے زیورات اور لباس و آرائش کی تفصیلات وغیرہ۔

مردوں کے آرائشی لباس، اسلحہ جات، کلہاڑی، تلوار، ڈھال وغیرہ اور ان کے باندھنے کے طریقے یا دوسرکسی قسم کا آرائشی لباس و اسلحہ وغیرہ۔ عام لباس، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کا لباس،

جانوروں کی آرائش اور زیورات جیسے بیل کے گلے میں پٹے، اونٹ اور گھوڑے کا سامان آرائش وغیرہ۔ بچوں کے لباس، عمومی لباس، خاص مواقع کے لباس۔

لوک علاج، دم درود اور ٹونے ٹوٹکے: لوک علاج مختلف بیماریوں کے لئے مقامی سماج کے علاج، جو کہ معمولی قسم کی جڑی بوٹیوں وغیرہ یا دم درود سے کئے جاتے ہوں، ٹونے ٹوٹکے لوک علاج کی روایت اور قصے کہانیاں وغیرہ۔ منتیں، پیری مریدی، ڈاکٹری، حکمت، سنیاسی علاج۔

عرس اور میلے: ایک باب جس میں چھوٹے بڑے میلے اور تہوار متروک قسم کے میلے، موسمی تہوار بھی موجود ہوں جیسے بیساکھی کا تہوار، اقلیتوں کے میلے، پنجہ صاحب کا میلہ، ایسٹر اور کرسمس وغیرہ۔ خانقاہوں، مزاروں کی تفصیل، ان کی انتظامیہ اور تنظیم کے بارے میں معلومات وغیرہ۔

جسمانی کھیل اور لوک تماشے: بچوں اور بڑوں کے مقامی کھیل اور مختلف لوک تماشے، جیسے نٹ، بازی گر وغیرہ۔ قدیم روایتی سانگی، لوک تھیٹر، نقال، بہروپے۔ نیزہ بازی، کبڈی، کشتی وغیرہ۔

خواتین کے کھیل، اور مشاغل، چغل خوری، بدخوہیاں وغیرہ۔

انسائیکلو پیڈیا میں کوشش کی گئی ہے کہ متعلقہ علاقے کی ثقافت سے متعلق تمام ضروری معلومات مختصراً اور جامع انداز میں بیان کر دی جائیں۔ ساتھ ہی موضوع سے متعلق تصاویر بھی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے فہرست میں ذیلی عنوانات بمعہ صفحہ نمبر دیئے گئے ہیں جبکہ انسائیکلو پیڈیا کے آخر میں اُن تمام ماخذات کو لکھ دیا گیا ہے جن سے استفادہ کر کے

مصنفین نے انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ثقافتی انسائیکلو پیڈیا کی اس سیریز کو اس میں درج معلومات کے حوالے سے حتمی اور مکمل ہرگز نہیں کہا جا سکتا، اس حوالے سے یہ ہماری ابتدائی کاوش ہے اور اس میں موجود تشنگی اور کسی بھی حوالے سے کمی، کوتاہی آئندہ ایڈیشن میں دور کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے لئے ہمیں آپ ہی جیسے لکھاریوں اور اہل علم حضرات کا تعاون درکار رہے گا۔

اس کام میں جو لکھاری ہمارے ساتھ شامل ہیں، میں ذاتی طور پر اور ادارے کی جانب سے اُن کا ممنون ہوں۔ خاص طور پر سرحد کے دشوار گزار علاقوں، قبائلی علاقہ جات پر کام کے حوالے سے، اُن دشوار گزار اور دور دراز علاقوں میں کام کرنا خاص طور پر ایسے علاقے جن سے متعلق آج تک کوئی تحریری مواد دستیاب نہیں، بے حد مشکل کام ہے، جہاں سے متعلق معلومات قاری جاوید اقبال نے قلم بند کیں۔ اسی طرح انڈس کوہستان کا علاقہ بھی انتہائی دشوار گزار علاقہ ہے، وہاں پر کام کے حوالے سے رازول کوہستانی نے اپنا حق ادا کیا۔ ہندکو ثقافت کے سلسلے میں مختار علی سیر صاحب کا تعاون ہمارے ساتھ رہا۔ پروفیسر پریشان خٹک صاحب کا تعاون ہمارے ساتھ رہا۔ میں پشتو اکیڈمی پشاور کا بھی خصوصیت کے ساتھ شکر گزار ہوں۔ آپ تمام حضرات کے قلمی تعاون سے ہی یہ ثقافتی انسائیکلو پیڈیا چھپی ہوئی صورت میں سامنے آیا۔ یقیناً اب بھی اس میں بہتری اور اضافے کی بڑی گنجائش ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ پاکستان بھر کے لکھاری خاص طور پر ثقافت کے حوالے سے لکھنے والے اس کام پر مثبت ردعمل کا اظہار کریں گے اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں گے۔ میری دُعا ہے کہ پاکستان کا یہ ثقافتی انسائیکلو پیڈیا قومی وحدت کی علامت بن جائے اور دنیا جان سکے کہ پاکستانی اپنی منفرد، متنوع اور جداگانہ ثقافتوں کے باوجود محبت اور وحدت کی ایک مضبوط لڑی ''پاکستان'' کا حصہ اور دنیا میں امن، محبت اور بھائی چارے کے فروغ کے پیامبر ہیں۔

عکسی مفتی

ستمبر ۲۰۰۷ء

فوک لور اور ثقافتی اقدار کا شعور

ایسا کون ہے جسے زندگی اور موت، شادی بیاہ، غمی خوشی اور پیدائش وغیرہ کی عمومی رسومات کا علم نہ ہو یا وہ عشق و محبت کے گیتوں، بزرگوں اور سرکردہ لوگوں کے اقوال، شجاعت و بہادری کی لوک داستانوں، تعویز گنڈوں، عام سماجی زندگی کے طور طریقوں جن میں دوپٹہ رنگنا، ڈالی بھجوانا، تعویذ اور قیمتی پتھر پہننا، گھر کی دیواروں پر لپائی کرنا اور لوک میلوں وغیرہ سے واقف نہ ہو، ان سب باتوں کا ہماری لوک زندگی سے گہرا تعلق ہے اور یہ سب لوک ادب کے شعبے کے علم پر مبنی ہے۔

سب کو علم ہے کہ لوک داستانیں کیا ہیں ہم جبلی طور پر ان کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ تاہم جیسے پانی میں مچھلی بغیر کسی کوشش کے رہتی اور تیرتی ہے اسی طرح ہم بھی شعوری طور اپنی لوک زندگی کا ادراک نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوک زندگی اور داستان کی باقاعدہ تعریف ایسی ہی ہے جیسے کسی سے خوراک و لباس کی افادیت معلوم کرنا۔ ایک فلسفی اگرچہ زندگی کی تعریف بتا کر لکھتا ہے تاہم ایک عام آدمی کو صرف زندگی گزارنے سے غرض ہے۔ چنانچہ وہ ان گتھیوں کو سلجھانے کے بجائے صرف اپنی زندگی گزار رہا ہے اور زندگی بہتے پانی کی طرح ایک مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے۔

لوک زندگی کیا ہے؟

جب کوئی سماجی طبقہ کسی مخصوص جگہ پر صدیوں ایک مخصوص طرز سے زندگی گزارتا ہے تو اجتماعی زندگی کا ایک خاص انداز جنم لیتا ہے۔ یہ اجتماعی زندگی اپنے تمام سماجی رویوں، جذبات و احساسات کے ساتھ اس طبقے کی لوک یا عمومی زندگی کا مظہر ہوتی ہے۔ اسکی بیحد اہمیت ہے۔ ایک طرف تو لوک طرز زندگی کسی طبقے کی پہچان ہوتی ہے دوسری طرف وہ اسے دیگر طبقات سے ممتاز بناتی ہے اور اس طبقے کو ایک لڑی میں پروئے رکھتی ہے۔ مشترکہ لوک زندگی کے رویے انسانوں کو نہ صرف اکٹھا رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ وابستگی کا احساس بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ احساس بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی کے دل میں خونی رشتوں کو دیکھ کر جاگتا ہے۔ ایک نظر نہ آنے والا فطری احساس جس کے تحت ایک طبقہ یا کمیونٹی اپنے افراد کو اس رشتے سے وابستہ رکھتی ہے۔ تاہم یہ وابستگی جبری یا شعوری نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ کسی سیاسی قومیت کے احساس کی مرہون منت ہوتی ہے۔ یہ ایک جبلی احساس ہے جو صدیوں کے ایک جیسے سماجی رویوں اور مشترکہ سوچ سے جنم لیتا ہے۔ اسکا وہی مقام ہے جو انسانی جسم میں خون کا ہے۔

ماضی کو محفوظ کرنے کے حوالے سے بھی لوک رویوں کا ایک اہم مقام ہے۔ اسی لئے انہیں مقبول ماضی یا گزشتہ ادوار کی اہم نشانیوں کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ چیزیں زیادہ دیر چلنے والی نہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو جائیں گی۔ بعض لوگ انہیں توہمات کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ تاہم ان کے باقی رہنے یا بقاء کی صلاحیت کی وجہ سے انہیں زبانی یا سینہ بہ سینہ روایات کہا جاتا ہے جو باپ سے بیٹے کو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ لوک رویے یا طریقہ کار محض ادب یا لٹریچر ہے جو کہ زبانی منتقل ہوتا ہے۔ مگر یہ اپنی فہم کیلئے ان افراد کا مرہون منت

ہے جو ادب اور لوک رواج دونوں کا علم رکھتے ہوں۔ دھوتی اور پگڑی باندھنے سے لیکر پختہ اینٹوں سے چنوارے کی تعمیر تک تمام چیزیں لوک ادب اور روایات کا حصہ ہیں۔

لوک رویوں کی زبانی ابلاغ سے تدوین وتبلیغ کی وجہ سے بعض لوگوں نے لوک داستانوں کو زبانی فن کا نام بھی دے دیا ہے۔ تاہم اسکی یہ تعریف تمام تر غیر زبانی چیزوں یعنی رقص، سوت کاتنا اور سماجی رسوم ورواج وغیرہ کا سہارا لیکر ہم پوری انسانی داستان بیان کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس مقصد کیلئے اپنے لاشعور کے پوشیدہ اور اعلیٰ وادنیٰ گوشوں کو کام میں لانا پڑے گا۔ انسانی ذہن کے بعض گہرے اور عمیق پہلوؤں کی سب سے بہتر نمائندگی لوک ادب ہی کرتا ہے۔ لوک ادب کی بڑائی یہ ہے کہ یہ معاشرے کی مجموعی عکاسی کرتا ہے۔

لوک طرز زندگی صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف سماجی زندگی کے رسوم و رواج ہیں بلکہ تمام علوم وفنون شامل ہیں۔ ان میں دریائے سندھ کی کشیدہ وکندہ کشتیاں، مال کوہستان کے ''جاج'' بلوچ شیشے کے کام والے لباس، سندھی اجرک، ہاتھ سے بنی لنگی اور اس قسم کی دیگر بہت سی اشیاء شامل ہیں۔

اسکے علاوہ، دھمال، جوگی کی بین، نٹوں کی ''جنکا حرکات''، بہروپیوں کے سوانگ، مداری کے تماشے اور سندھی ملاکھڑا بھی وادی سندھ کی لوک زندگی کا اہم جز ہے۔

کوئی ماں جب اپنے بچے کو لوری سناتی ہے، جب سکول کے بچوں کو کوئی بھارت بتائی جاتی ہے، جب کوئی قوال قوالی سناتا ہے، یا محفل سماع سجائی جاتی ہے، جب لوگ خوشی کے موقعوں پر گائے جانے والے سہرے اور گیت گاتے ہیں قصہ خواں، بھیراں اور میراثی لوک گیتوں کو چھیڑتے ہیں اور ماں اپنی بیٹی کو سینا پرونا اور کشیدہ کاری سکھاتی ہے، گاؤں کا لوہار اپنے کسی شاگرد کو اوزاروں کا استعمال سکھاتا ہے، کمہار بھٹے میں اینٹیں اور زرگر زیورات بناتا ہے تو ہمیں اُس لوک ریت کے عظیم الشان ورثے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے گزرتا وقت جس کی اہمیت کم نہیں کر سکا۔

لوک رسوم ورواج ایک طبقاتی مظہر ہے۔ یہ کسی ایک آدمی یا گروہ کی اختراع نہیں صدیوں پر محیط ایک مسلسل عمل کے بعد کہیں جا کر ساری انسانیت یا تمام تر طبقے کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ تاہم ہمیں ایک فرق روا رکھنا ہوگا کہ غالب کی غزل یا چغتائی کی مصوری اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود لوک ریت کا حصہ نہیں۔ یہ ایک فرد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی مظہر ضرور ہیں مگر ڈیرہ غازی خان کے چرواہوں کے گیت، داؤد کے چرواہوں کے تربیت، پنجاب کی لڑکیوں کا سوت کاتتے ہوئے ترنجن گانے کا دلربا انداز، خوبصورت رنگوں سے مزین کیلنڈر، ٹرکوں اور تانگوں پر بنی اپنی نوعیت کی انوکھی تصویریں اور پشاور کے قصہ خوانی بازار میں چھیڑی گئی داستانیں سب ہی لوک ریت کے شاہکار ہیں، یہ اجتماعی زندگی کا حصہ اور لوگوں کے ایک گروہ کی تخلیق ہیں جو اس طبقے کے ہر فرد کا ورثہ ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے کسی فن پارے کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے آرٹ کی باریکیوں کا علم اور غالب کی کسی غزل کو سمجھنے کیلئے موسیقی اور اردو ادب سے آشنائی ضروری ہے، بیگم اختر کی کسی غزل کی گائیگی سے لطف اندوز ہونے کیلئے اردو ادب اور کلاسیکی موسیقی دونوں کا علم چاہیے۔ مگر لوک ریت سے لطف اندوز ہونے کیلئے کسی تربیت یا رسمی تعلیم کی ضرورت نہیں یہ ایک خودرو یا قدرتی حس ہے جو بذات خود زندگی کے دامن سے پھوٹتی ہے۔

لوک ریت کی تخلیقات اگرچہ بے نام ہوتی ہیں تاہم وہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایات کی مظہر ہوتی ہیں۔ مگر ان کے

پھیلاؤ کا طریقہ کار اور ان کا ماخذ ہمیشہ زبانی روایات پر مشتمل نہیں ہوتا، یہ بات وادی سندھ کے تہذیبی ورثے کے لئے زیادہ صحیح ہے۔

کوئی لوک گیت چاہے کسی ۱۸ویں صدی کے صوفی شاعر کے قلم کی تخلیق ہو، وہ بھی موجودہ دور میں مکمل طور سے اپنا زبانی وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال جیسی معروف رومانی داستانیں جواب کتابوں میں بھی محفوظ ہیں مگر یہ کتابوں میں نہ بھی محفوظ ہوتیں تو ان کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ کیونکہ وہ زبانی روایات کی صورت لوگوں کے سینوں میں بھی محفوظ ہیں اور میراثی، بھات وغیرہ انہیں اکثر دھراتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی لوک داستان کو اسلام آباد یا کراچی میں کتابی شکل میں محفوظ کرنے کے باوجود بھی اس کی لوک اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

چنانچہ لوک ادب زیادہ تر زبانی روایات پر مشتمل ہے جس نے اسے جہاں پایا اور جیسا پایا محفوظ کرلیا۔ یہ صرف زبانی ادب نہیں بلکہ یہ انسان کی مادی نظریاتی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ چاہے کتاب کی شکل میں نمودار ہو مگر اُسے کتابی شکل میں منجمد نہیں ہونا چاہیے۔ یہ الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی انسانی زندگی کے دیگر ''غیر لفظی'' یعنی (non verbal) پہلوؤں پر محیط ہے۔ اسکی عظمت اس میں ہے کہ یہ انسان اور معاشرے کو ایک شناخت عطاء کرتا ہے اور انہیں مکمل کرتا ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ تاہم نہ تو یہ مکمل طور سے صنعتی ہے اور نہ ہی جدید، اگرچہ اس میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے عجیب بات یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ہونے کے بعض اپنے فوائد ہیں۔ پاکستانی لوک ثقافت اب بھی ایک زندہ روایت ہے جس پر پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد عمل پیرا ہے اور جو عام آدمی کی زندگی کے تمام گوشوں میں بڑی نمایاں نظر آتی ہے مگر لوگوں کو اس لوک روایت کی شان و شوکت کا صحیح ادراک ہی نہیں۔

پاکستان کا لوک ادب صدیوں کی طبقاتی زندگی کا مظہر ہے۔ یہ کسی فرد یا گروہ کی اختراع نہیں بلکہ یہ صدیوں سے جاری بتدریج عمل اور معاشرے کے اجتماعی طور طریقوں کا عکاس ہے۔ یہ اپنے اندر انسانی زندگی کی حکمتوں کو سموئے ہوئے ہے۔ مگر یہ ماضی نہیں۔ بلکہ ماضی حال اور مستقبل میں اپنے ہونے کے شعور کا پرتو ہے۔ انسان نے شعور اور آگہی کی یہ منزلیں صدیوں میں طے کی ہیں۔ لوک رواج نہ صرف انسانوں کو مضبوط رشتوں میں باندھنے بلکہ ابلاغ عامہ کا ایک انتہائی اہم اور موثر ذریعہ بھی ہیں جسکی حقیقت سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں شرح خواندگی پاکستان جتنی کم ہو اور جسکی زیادہ تر آبادی کا انحصار زراعت پر ہو، لوک رواج ایسے معاشرے کے سماجی خدوخال وضع کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انکی اہمیت ابلاغ کے دیگر ذرائع سے بہت زیادہ ہے۔

یہ حقیقت پاکستانی لوک ادب کو ایک عملی چیز بناتی ہے۔ یہ ایک زندہ ورثہ ہے یہ ورثے میں ملنے والی چیزوں نہ کہ وراثت پر مشتمل ہے۔ اس چیز کی نمایاں اہمیت ہے۔ ہمیں اپنے بارے میں شعور کو ہر چیز پر مقدم رکھنا چاہیے۔

نسلی، علاقائی اور جغرافیائی حقائق سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں اور پاکستان سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان پر مبنی ایک کثیر الجہتی معاشرے پر مشتمل ہے تاہم ان سب کو لوک روایات اور مشترکہ رسوم و رواج نے ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ اس کے برخلاف کچھ نظریاتی حقائق بھی ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ پاکستان ملت اسلامیہ کا ایک اہم رکن اور مشترکہ مذہبی اقدار پر مبنی ایک ملک ہے۔ یہ نظریہ کہ پاکستان کا علاقائی تہذیبی ورثہ یا ماضی پر مشتمل ہے جو وقت کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نظریاتی بندھنوں اور دور جدید کی تیز رفتار سائنسی ترقی کا ساتھ نہیں دے پائے گا، غلط ثابت ہو چکا ہے۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ یہ معدوم ہونے کے بجائے ابھرتا ہے اور اکثر تو اہم اور طاقتور سیاسی ایشوز کی شکل اختیار کر لیتا ہے

جنہیں عیار سیاستدان اپنی مطلب برآئی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

علاقائی کلچر کو دبانے اور مذہب اور قومیت کے نام پر انکی نفی کرنے سے اکثر بڑے گھمبیر مسائل جنم لیتے ہیں جن میں طبقاتی بے چینی اور سیاستدانوں کے ہاتھوں استحصال شامل ہیں۔ نیز اُنکے علاوہ علیحدگی پسند تحریکوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سرائیکی صوبہ، سندھو دیش اور بلوچ اور پختونوں کی علیحدگی پسند تحریکیں بھی اسی کا شاخسانہ ہیں۔ من حیث القوم علاقائی تہذیبوں کے بارے میں ہمارا رویہ اور اپروچ منفی سوچ کی عکاس ہے جب تک یہ سوچ ایک روشن خیال اور متحرک سوچ میں تبدیل نہیں ہوتی اس وقت تک پاکستان کے سماجی منظر نامہ میں کوئی ڈرامائی تبدیلی ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ملک کے بیشتر علاقائی سیاسی معاملات میں یہی تہذیبی بحران نظر آتا ہے۔ بہت سارے مسائل جنکا آج لوگوں کو سامنا ہے وہ سماجی و تہذیبی نوعیت کے ہیں۔

علاقائی تہذیبیں پاکستانیوں کے لئے ایک خوشگوار ہم آہنگی اور بھائی چارے والی چیز ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان تہذیبوں کے تنوع میں ہی ہمیں ایک واحدانیت نظر آتی ہے اور یہی اسلامی ثقافت کی روح ہے۔ اسلام علاقائی اختلاف اور ان کے فرق کا خیال رکھتا ہے۔ پاکستان کے تہذیبی منظر نامہ میں اگرچہ کوئی حقیقی تصادم نہیں ہے جن چیزوں کو ہم Mutually exclusive سمجھتے آئے ہیں وہ درحقیقت ایک گہری واحدانیت کے پرتو ہیں جو علاقائی اور نظریاتی دونوں بنیادوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ جغرافیائی بھی ہیں اور نظریاتی بھی۔

انسان کے بے شمار مسائل اس وقت جنم لیتے ہیں جب فی زمانہ سوچ و فکر کے زاویوں کو الگ الگ خانوں میں رکھا جاتا ہے، مثلاً مادی جسم اور روح، زمینی اور الوہی، مادے اور توانائی وغیرہ کو مختلف مظاہر سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں اس وحدانیت کا حصہ سمجھا جائے جو خود انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ کہنا کہ بلوچ اور سندھی، پنجابی سے مختلف ہیں دراصل انکی کسی مخصوص جگہ سے وابستگی کی وجہ ہے۔ یہ درحقیقت اس کیفیت اور اضطراب کا ردعمل ہے جو معاشی ناہمواری اور سیاسی محرومی سے جنم لیتا ہے۔

ہمارے بے شمار مسائل کی وجہ انسانی اقدار کا خیال رکھے بغیر حاصل کی گئی غیر متوازن صنعتی ترقی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی گرانقدر روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے آپ کو روایت کی جڑوں سے علیحدہ کئے بغیر جدید خطوط پر استوار کریں۔

ہمیں نئے نظام اور نئے حالات کے مطابق اپنی گم شدہ روایات کا پتہ چلانا، انہیں قائم رکھنا، آنے والی نسلوں میں ثقافتی اقدار کا شعور اور ان کی اہمیت اجاگر کرنا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ہم یہاں پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا ترتیب دے کر فنون لطیفہ، صنعت و حرفت، اقتصادیات، مذہب، ادب یا معاشرتی و سماجی تاریخ نہیں لکھ رہے بلکہ ہماری کوشش ہے کہ اُن تجربات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جو ہمارے تمدن، ہماری روایات اور ثقافت کی تشکیل کا سبب بنے۔ ہر چند کہ لوک ثقافت تاریخ سے جدا نہیں مگر یہ تاریخ نہیں، یہ ماضی کے ساتھ حال اور مستقبل بھی ہے، اور یہی اہم ہے کہ ہم اپنے فوک لور کو اپنے حال اور اپنے مستقبل سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھیں۔

عکسی مفتی

(عکسی مفتی کے انگریزی مضمون سے ترجمہ کیا گیا)

پشاور

جغرافیہ

پشاور جو مدتوں سے صوبہ سرحد کا دارالخلافہ رہا ہے یہ شہر آج بھی قدیم ثقافتیر روایات اور سماجی احوال کی اقدار میں اپنی قدیم عمارتوں' ہنرمندیوں' قبیلوں اور خاندانوں کے رسم ورواج' کھانے پینے کے مخصوص طور طریقوں' میل جول کے انداز وسلیقوں اور مہمانداری کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں کا امین یہ شہر جس کی عمارتیں، قدیم حویلیاں، بچی کھچی حصار شہر اور دو تین دروازے اس کی عظمتِ رفتہ کی علامات ہیں۔ غرضیکہ پشاور ایک ایسی تہذیب کا گہوارہ ہے جو اپنی ثقافت کے غیر منقطع تسلسل کی بنا پر تاریخ میں ہمیشہ نمایاں حیثیت کا حامل رہے گا۔ یہ شہر اپنی اس انفرادیت میں یکتا ہے کہ اس نے یہاں پر وارد ہونے والی اقوام اور قبائل کی لائی ہوئی تہذیب اور ہنر کو نہایت کشادگی کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لئے۔ اس شہر کے باشندوں نے ہمیشہ مغرب کے کوہساروں اور دروں سے آنے والی اقوام کے لئے اپنے دلوں کو کشادہ رکھا، انہیں خوش آمدید کہا اور ان کی رہائش وطعام کے لئے اپنی مہمانوازی کی خو کو زندہ رکھنے کے لئے قیام گاہوں اور سراؤں کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے ہیں۔

سرزمین خیبر کا پہلا تمدنی شہر ہونے کے ناطے اس کے سینے پر کئی حملہ آوروں کے عروج وزوال کی داستانیں رقم ہیں۔ ''پشاور'' صوبہ سرحد کے عظیم تر رقبے کی حامل تہذیب گندھارا کا مرکزی خطہ رہا ہے۔ گندھارا اور بدھ عہد کی عالیشان عمارتوں' عبادت گاہوں اور درسگاہوں کے کھنڈرات اب تک یہاں موجود ہیں۔ پھر آمد اسلام کے بعد مغلوں کے دور کی شاندار عمارتوں، حویلیوں، مدرسوں اور مساجد نے اس شہر کو اسلامی تہذیب وثقافت سے مالا مال کر دیا۔

پشاور کا رقبہ ثقافتی جغرافیائی لحاظ سے نہایت طویل وعریض رہا ہے۔ یہ خطہ شمال مشرق میں ٹیکسلا' صوابی' بشمول مردان' تخت بھائی' پشکلاوتی (موجودہ چارسدہ ومہمند ایجنسی)' جنوب مغرب میں خیبر وادرکزئی ایجنسی اور کوہاٹ تک پھیلا ہوا شہر تھا۔ جس کا مجموعی رقبہ 6215 مربع میل بنتا ہے جو ڈاکٹر احسان علی' ڈائریکٹر آرکیالوجی کے مطابق اس طرح ہے' مغرب کے درہ خیبر سے مشرق کی طرف دریائے سندھ تک اور مالاکنڈ کی پہاڑیوں سے لے کر جنوب میں کوہاٹ بشمول چراٹ کی پہاڑیوں تک مگر موجودہ سیاسی تقسیم اور پھیلتی ہوئی آبادی کے مطابق یہ شہر محدود ہو کر صرف تین ضلعوں پشاور' نوشہرہ اور چارسدہ پر مشتمل ایک ریجن ہے۔

اس کے مشرق میں ضلع نوشہرہ اور شمال کی جانب چارسدہ ہے۔ پشاور شہر کے تمدنی اور آبادخطہ کے گرد ایک فصیل شہر بنائی گئی تھی جو قدیم وزیری اینٹوں کی دیوار تھی جس کے بیچوں بیچ سولہ بڑے بڑے چوبی دروازے تھے۔ پشاور کی مقامی آبادی اس فصیل کے اندر آباد تھی۔ سرِشام اس شہر کے دروازے بند ہو جاتے اور پھر صبح کی نماز کے وقت کھلتے تھے۔ اس شہر کے اردگرد پھلوں اور پھولوں کے باغات تھے اس وجہ سے اسے پھولوں اور خوشبوؤں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔

پشاور کے شمال مغرب میں دریائے کابل بہتا ہے جو شمال مشرق سے ہوتا ہوا نوشہرہ کے بیچ سے گزر کر اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کے ساتھ مل جاتا ہے۔ پشاور کے شمال مشرق کی جانب موجودہ جی ٹی روڈ اور دلہ زاک روڈ کے دونوں طرف باغات اور کھیت ہیں۔ ان زمینوں پر آباد بستیاں جو مختلف دیہاتوں کے نام سے موسوم ہیں ان کو خالصہ کہا جاتا ہے۔ جن کی زبان ہندکو سے قدرے مختلف لہجہ رکھنے والی مگر اس سے ملتی جلتی ہے۔ یہ سب دیہاتی لوگ ہندکو کے ساتھ ساتھ پشتو بھی بولتے ہیں۔ ان خالصہ والوں کے کل چوراسی گاؤں ہیں۔ ان دیہاتوں میں رہنے والے بزرگ اب تک رہن سہن میں قدیم تہذیب وثقافت کے امین لوگ ہیں۔ ضلع پشاور بحیثیتِ مجموعی مومند اور خلیل قبیلے کا ضلع ہے اگرچہ اس میں اور لوگ بھی آباد ہیں۔

نوشہرہ:

نوشہرہ پشاور کا ایک خوبصورت ضلع ہے جو پشاور کے مشرق کی جانب دریائے کابل کے دائیں کنارے پر آباد چھاؤنی ہے۔ چھاؤنی کے شمال جنوب کی جانب دریائے کابل کے بائیں کنارے پر آباد نوشہرہ کا پرانا قصبہ ہے جسے نوشہرہ کلاں کہتے ہیں۔ چند سال پہلے نوشہرہ چھاؤنی اور نوشہرہ کلاں کو ملانے کے لئے دریا پر کشتیوں کا پل تھا مگر اب ایک خوبصورت پختہ پل تعمیر کر دیا گیا ہے یہیں سے مردان روڈ بھی شروع ہو جاتی ہے۔ نوشہرہ میں دو بڑے بازار ہیں۔ یہاں ہندوؤں اور عیسائیوں کی بھی اچھی خاصی آبادی ہے اور عیسائیوں کے گرجے اور ہندوؤں کے مندر بھی موجود ہیں۔

نوشہرہ کی جامع مسجد مشہور تاریخی مسجد ہے۔ یہاں کا ریلوے سٹیشن جنکشن ہے جبکہ شمالاً جنوباً ایک چھوٹی ریلوے لائن بھی بچھائی گئی ہے جو کہ مردان سے ہوتے ہوئے درگئی تک جاتی ہے۔ نوشہرہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یعنی نیا شہر۔ یہ 1581ء اور 1586ء کے عرصے میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے آباد کیا تھا۔

اس کی آبادکاری کا مقصد مشرق سے مغرب درہ خیبر تک سڑک کی حفاظت تھا۔

نوشہرہ کا جنوب مغربی حصہ پہاڑی ہے۔ نوشہرہ سے متصل آبادیوں میں مشرق کی جانب اکوڑہ خٹک' شیدو، جہانگیرہ اور جنوب مشرق کی طرف خیرآباد کے علاقے ہیں جبکہ جنوب کی جانب نظام پور کا علاقہ ہے۔ جنوب مغرب کی جانب چراٹ کا پہاڑی علاقہ جو کہ فوجیوں کی بہت بڑی تربیت گاہ ہے۔ چراٹ سے نیچے صالح خانہ' ڈاگ اسماعیل خیل' جلوزئی' جڑوبہ اسپین خاک اور ڈاگ بیسود کے علاقے ہیں۔ نوشہرہ کے مغرب کی جانب پیر پیائی اور مہی جبکہ شمال مغرب کی سمت اکبر پورہ کا قصبہ ہے۔ نوشہرہ کے شمال کی جانب رسالپور' خویشگی اور رشکئی کے علاقے اور جنوب کی جانب کاکا صاحبؒ اور مانکی شریف کے مشہور مقامات ہیں۔

حضرت رحمکار المعروف کاکا صاحبؒ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ یہ نوشہرہ میں جہانگیر کے دور میں تعمیر کردہ یہاں کی ثقافتی علامت ہے۔

چارسدہ:

چارسدہ آٹھ بڑے بڑے مضافات پر مشتمل ہے اس وجہ سے اس علاقے کو ہشتنگر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پشاور کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کا پرانا نام پشکلاوتی تھا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلی صدی عیسوی تک گندھارا کا دارالخلافہ رہا جس پر 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے حملہ کیا۔ یہاں پر بدھ عہد میں قائم عظیم درسگاہ تھی جہاں چار ذہین بدھ راہب بدھ مذہب کی تعلیم دیتے تھے۔ سکندر اعظم کے حملہ سے پہلے یہاں پر فارس کے دارایوش سوئم کے مقرر کردہ گورنر کا راج تھا۔ جب سکندر نے حملہ کیا تو اس علاقے کو یونانی نام پیوکی لوئیس کے ساتھ پکارا جانے لگا۔ چارسدہ کے قدیم تاریخی شہر کا تعین موجودہ چارسدہ کے بازار سے پڑانگ تک کا علاقہ ہے جو قدیم تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ ایک شاہراہ بھی تھی اور غالباً یہی وہ چارسدے کا رقبہ تھا جسے یونانیوں نے پیوکی لوئیس کا نام دیا۔ چارسدہ کے جنوب میں بشمول پڑانگ کے دونوں اطراف چارسدہ کا قدیم قبرستان ہے۔ اس قبرستان کو ایشیاء کے چند بڑے قبرستانوں میں شمار کیا جاتا ہے اور چارسدہ اور اس سے ملحقہ دیہات کے لوگ اپنے مُردوں کو اسی قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔

اس قبرستان میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں دفن ہیں۔ یہاں پر محمود غزنوی کے تین پوتے بھی شہید ہوئے اور اسی قبرستان میں دفن ہیں۔

چارسدہ اور ملحقہ ہشتنگر کے لوگ پختون ہیں اور پشتو زبان بولتے ہیں۔

یہ قدیم وادی ہمیشہ سے پشاور کا حصہ رہی ہے۔

چارسدہ کے مشرق کی جانب مردان' جنوب مغرب کی جانب پشاور' جنوب مشرق کی جانب نوشہرہ' شمال مشرق کی جانب غنی ڈھیری' مغرب کی جانب لنڈی کوتل کی پہاڑیاں ہیں۔

چارسدہ کے مشہور مقامات میں رجڑ' اتمانزئی' عمرزئی' تورنگزئی' شیر پاؤ' تنگی' سرڈھیری' بوبک' نستہ اور شبقدر ہیں۔

چارسدہ کے مضافات میں شمال مغرب کی جانب سب سے بڑا شہر شبقدر ہے جہاں پر سکھوں کے دور کا تعمیر کردہ قلعہ شبقدر فورٹ بھی ہے۔ یہاں پر دو اہم پختون قبیلے داؤدزئی اور محمدزئی آباد ہیں۔

مہمندوں کا علاقہ بہت وسیع ہے۔ چارسدہ کے شمالی علاقوں سے لے کر مشرق کی طرف یہ پھیلے ہوئے ہیں۔

چارسدہ کا دوسرا نامور قبیلہ کاکڑ ہے۔ چارسدہ کے مشرق کی جانب منگا درگئی اس کا مشہور گاؤں ہے۔ اس کے جنوب کی طرف نستہ' دوسہرہ اور بوبک بڑے دیہات ہیں۔

چارسدہ شہر کے مغرب کی جانب سردریاب کا مقام ہے۔ سردریاب کا علاقہ لوگوں کے لئے تفریحی مقام ہے۔ جہاں مچھلی کی متعدد دکانیں ہیں۔ دریا کے کنارے پر گھاس پھوس کی جھونپڑی نما دکانیں ہیں۔ ان گھاس پھوس کے چھپروں کے نیچے علاقے کی روایتی زندگی کے مطابق چارپائیوں پر لوگ بیٹھ کر مچھلی کے مزے اڑاتے ہیں۔ تیل میں مچھلی کو پکایا جاتا ہے۔ چارسدہ کے جنوب میں نستہ کے مقام پر دریائے سوات اور دریائے کابل آکر مل جاتے ہیں۔ یعنی یہ مقام دوابہ یعنی دو دریاؤں کے سنگم کا مقام ہے۔ علاقہ چارسدہ کے رجڑ کے مقام پر ایک مخصوص قسم کی دیسی مٹھائی تیار ہوتی ہے جسے رجڑ کی مٹھائی کہا جاتا ہے۔ یہ مٹھائی علاقے میں تیار ہونے والے گڑ کی ڈلی کے موافق ہوتی ہے اس کا رنگ بھی گڑ کی طرح ہوتا ہے۔

شبقدر:

چارسدہ کے تمام دیہاتوں اور قصبوں میں شبقدر کا علاقہ آباد خطہ ہے۔ شبقدر کے شمال مشرق کی جانب مٹہ مغل خیل' منڈہ ہیڈورک' اُبازی اور تنگی کے دیہات ہیں۔ تنگی ہندوؤں کا مرکزی مقام تھا۔ اب بھی یہاں ایک مندر ہے اور ہندو خاندان آباد ہے جبکہ اکثریت مسلمان پختونوں کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ہندو ہری چند کے نام سے آباد ایک گاؤں ہے۔ یہاں پر زیادہ تعداد میں

مہمند قوم کے لوگ اپنی ثقافتی اور تہذیبی بود و باش کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ تاہم تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ان کے طرز زندگی میں نمایاں تہذیبی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ بہرحال چارسدے کا پورا علاقہ جو کہ سرسبز و شاداب وادی کے طور پر شناخت ہوتا ہے۔ یہ علاقہ جسے یونانیوں نے پیوکی لوئیس' لکھا متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور راجدھانیوں کا صدر مقام رہا ہے۔ غالباً یہی وہ چھوٹی چھوٹی آٹھ ریاستیں تھیں جنہیں فارسی زبان میں ہشتنگر کا نام دیا گیا۔ بدھ عہد کے بعد صدیوں تک اس علاقے میں ہندو تہذیب کا اثر رہا مگر جب اس علاقے میں 45ء میں لشکر اسلام حضرت سنانؓ بن سلمہ بن محبق کی سرکردگی میں پہنچا اور ہندو شاہیا کے راجوں کو شکست دی اور پھر آخر میں حضرت سنانؓ بن سلمہ خود بھی شہید ہوئے تو اس کے بعد یہاں پر اسلامی تہذیب کا اثر و رسوخ بڑھتا رہا جبکہ 1001ء میں محمود غزنوی لشکر اسلام کے ساتھ راجہ جے پال کو شکست دینے کے لئے اس علاقے میں داخل ہوا تو اسلام بحیثیت ایک نظام کے یہاں پر چھا گیا۔

چارسدہ کے تمام علاقوں میں مختلف قسم کی سبزیوں کے لہلہاتے کھیت ہیں جبکہ گنے کی کاشت یہاں پر بکثرت ہوتی ہے اور یہاں کے زمینداروں کے کھیتوں میں علاقوں کی سماجی روایت کے مطابق گھانیوں میں گنے کا شیرہ نچوڑ کر اسے ایک کڑائے میں پکا کر گڑ بناتے ہیں۔ گڑ بنانے کا یہ طریقہ صدیوں سے اسی طرح رائج ہے۔ یوں ان تمام رقبوں کو ملا کر پشاور ایک خوبصورت' ثقافتی اور تہذیبی اقدار کی حامل وادی ہے۔ ضلع پشاور کے آگے اور پیچھے دو دریا بہتے ہیں۔ پشاور کے جنوب کی طرف سے دریائے باڑہ اور اس کے شمال کی جانب دریائے کابل ہے۔

دریائے باڑہ خیبر کی پہاڑیوں کی جنوبی وادی باڑہ سے گزر کر پشاور کے جنوبی حصہ کی زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔ جبکہ دریائے کابل خیبر کے علاقے سے ہوتا ہوا پشاور کے شمال میں کئی چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں تقسیم ہو کر نسّہ کے مقام پر دریائے سوات سے مل کر اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کے ساتھ مل جاتا ہے اور یہ دریا پشاور کی شمالی زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔

دریائے باڑہ پشاور کے جنوب سے گزرتا ہوا مشرق کی جانب تارو جبہ کے نزدیک سے گزر کر نسّہ کے مقام پر ہی دریائے کابل سے مل جاتا ہے۔ ضلع چارسدہ میں اگرچہ کافی تعداد میں مومن، خٹک اور دوسرے قبیلے آباد ہیں مگر بحیثیت مجموعی یہ محمد زئی قبیلہ کا ضلع ہے۔ شبقدر میں گگیانی بھی ہیں۔

تاریخ

سرحد کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ پشاور کی تاریخ۔ پشاور وہ تہذیبی اور تمدنی خطہ ہے جسے مغرب اور شمال کی جانب سے وارد ہونے والے حملہ آوروں کا سامنا رہا۔ پشاور کے شمال مغربی دروں یعنی کوہ ہندوکش کے راستے سے داخل ہونے والے فاتحین سکندر اعظم اور پھر لشکر اسلام کی قیادت کرنے والے محمود غزنوی کی آمد اور پھر بعد میں پشاور کے مغربی درہ درہ خیبر کی جانب سے تمام حملہ آور و فاتحین پشاور کی وسیع و عریض وادی میں داخل ہوئے جن میں غزنوی' غوری اور مغل جیسے اہم فاتحین شامل ہیں۔ یہ سب وہ شاہان وقت ہیں جن کے فاتحانہ قدموں کے نشانات آج تک پشاور کی مٹی پر ثبت ہیں۔ آخری فاتحین جو مغرب کی طرف سے آئے وہ احمد شاہ ابدالی اُسکی اولاد اور بارک زئی پشتون تھے۔

پشاور کے قدیم نام:

ہیروڈوٹس کی تحقیق کے مطابق پشاور کی سابقہ حیثیت کے تناظر میں اس کا قدیم ترین نام کسپتروس تھا جو قدیم ہفت اقالیم یعنی ساتویں صوبے پکتیکا کا وہ شہر ہے جہاں سے ہخامنشی دارایوش بادشاہ نے بحیرہ عرب سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے مہم روانہ کی جو اسی شہر کاسپتروس کے قریب دریائے کابل سے امیر البحر ''سکائی لاکس'' کی سربراہی میں روانہ ہوئی۔

چینی سیاح ہیون سانگ نے جب اس خطے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے سیاحت کی تو اس نے اس کا نام پولوشاپولو اور سنسکرت میں پورشاپور لکھا۔ علاوہ ازیں جب پہلا اسلامی لشکر 45ء میں حضرت سنانؓ بن سلمہ بن محبق المعروف اصحاب باباؓ کی سرکردگی میں گندھارا کی سرزمین میں داخل ہوا تو اس وقت اس پوری وادی کو ''روہ'' اور یہاں کے رہنے والوں کو روہیلہ کہتے تھے۔ یہ نام اب کثیر الاستعمال نہیں رہا مگر روہیلہ قوم کے افراد موجود ہیں۔ جبکہ ایک روایت کے مطابق اسے بدھیہ بھی کہا جاتا رہا۔ غالباً یہ نام بدھ دور کے عہد کی علامت ہے۔ وید میں اسے بگرام لکھا گیا۔ مغل شہنشاہ بابر نے جب پشاور کی سیر کی تو بابر نے اسے اپنے روزنامچہ ''توزک بابری میں'' بگرام ہی لکھا۔ پشتو کے عظیم صوفی شاعر رحمان باباؒ نے اپنے کلام میں اسے بگرام ہی بیان کیا ہے۔

ہم نغمے کاندی ہم رقص کہ ہم خاندی

ُ د رحمٰن پہ شعر تر کے دا بگرام

گندھارا کا صدر مقام ہونے کی بنا پر اسے گندھارا بھی کہا جاتا ہے اور وید کے مطابق یہاں کے باشندوں کو گندھاری یوں کہا گیا۔

درہ خیبر کی جانب سے داخل ہونے والے حملہ آوروں کا پہلا پڑاؤ یہی وادی 'پشاور' ہوتی تھی۔ اسی نسبت سے اسے ''پیش آورد'' کہا گیا یعنی ''پہلا مقام'' بعد میں یہ پشاور ہو گیا۔ جو آج تک ایک قدیم ثقافتی' روایتی اور ساجی بندشوں سے جڑا ہوا تاریخی شہر ہے۔ اس شہر کی بنیاد کی کھوج لگانے کے لئے تاریخ کے انتہائی عمیق عہد میں جانا پڑتا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق فارسی کا قدیم ترین بادشاہ کیومرث تھا اس کی اولاد میں سے افروال ایسا جانشین تھا جس کا نسلی سلسلہ چلتا رہا۔ افروال کا بیٹا ہوشنگ پیشدادتھا۔ افروال نے اپنے دور اقتدار میں ہفت اقلیم یعنی پکتیا کا پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ماوراء تاریخ کا دور تھا۔ پھر اسکے بعد جب اس کا بیٹا ہوشنگ پیشدادمسند اقتدار پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے ہند تک تعمیرات کو فروغ دیا۔ ابن خلدون کی اس ساری تاریخی داستان سے گوپل داس کے اس نظریئے کو تقویت ملتی ہے کہ پشاور کو ہوشنگ پیشداد نے آباد کیا تھا جو کہ کیومرث کا پڑپوتا تھا۔ چونکہ ابن خلدون نے ہفت اقلیم پر قبضے کا زمانہ افروال کی سلطنت کا دور قرار دیا ہے یعنی ہفت اقلیم پر قبضہ افروال کے عہد میں ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ قوی امکان ہے کہ اس صوبے کے شہر کاسپتروس کو باقاعدہ طور پر آباد کرنے کے لئے اس کی بنیاد ہوشنگ پیشداد نے رکھ کر اس کا نام پورشاپور' یعنی پھولوں کی سرزمین رکھ دیا۔ اس تحقیقی نقطہ نظر سے اس شہر کو انسانی آبادیوں میں سے ایک قدیم ترین آباد شہر کی حیثیت حاصل ہے۔

وید جو کہ آریاؤں کی مقدس کتاب ہے اس میں گندھارا اور باشندوں کے لحاظ سے گندھاریوں کا ذکر آتا ہے جو کہ پشاور ہی سے منسلک ہے۔ اس کے علاوہ چھٹی صدی قبل مسیح میں لکھے گئے داریوش اول کے سنگی کتبوں میں بھی موجودہ پشاور گندھارا اور اخمینی حکومت کا ذکر ملتا ہے۔ کشان خاندان کے پہلے بادشاہ راجہ کنشک نے پہلی صدی عیسوی میں پشاور کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور یہاں پر بدھ مذہب کی تبلیغ واشاعت اور بدھ تعلیم کو فروغ دینے کے لئے متعدد مقامات پر چھوٹے بڑے معبد اور تعلیم گاہیں تعمیر کیں۔ جن میں موجودہ گنج دروازے کے باہر ہزار خوانی کے مقام پر شاہ جی کی ڈھیری کے نام سے بدھ عہد کی عظیم درسگاہ کے نشانات آج تک کھنڈرات کی صورت موجود ہیں۔

غرضیکہ انسانی تاریخ میں تمدنوں اور تہذیبوں کے آغاز سے جو شہر اور قریئے آباد ہوئے ان میں پشاور سرِ فہرست ہے۔ جو برصغیر ہندوستان اور موجودہ پاکستان کی قدیم محکم' لاڈلی اور پیاری گندھارا تہذیب کا بعد میں گہوارا بنا۔ اگرچہ اس شہر کی ہیئت وصورت میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں مگر اس شہر کی اپنی مٹی سے ابھرنے والی قدروں کا معنوی اور فطری حسن ہر دور میں جلوہ افروز رہا۔

مثال کے طور پر اس شہر کے باشندوں کی سادگی' مہمانوازی' خوش خلقی' ہنرمندی اور پھر مذہبی جوش وخروش اور عقائد میں پختگی وہ قدریں ہیں جو بین الاقوامی حیثیت سے معروف اور عام ہوئیں۔

وسطی ایشیاء سے ہجرت کے عمل سے گزرنے والی اقوام اپنے ساتھ جو بھی ہنر وکسب لے کر آئیں یہاں کی مٹی ان ہنر وکسب کے لئے بڑی زرخیز ثابت ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی ہنر وکسب اس مٹی کا ایک عدیم النظیر حصہ بن گئے بلکہ یہاں کی فضاؤں نے فکری' ثقافتی اور ادبی فنون لطیفہ کی لہر کو وسیع کرنے میں بڑی اعانت کی۔

یہاں پر بدھ عہد کے بعد 700ء میں ہندوؤں کی مختلف راجدھانیاں قائم ہوئیں تو اس وقت بھی پشاور کو اہمیت حاصل رہی اور پشاور ہی کی حدود میں واقع خطہ ہنڈ جو کہ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے وہاں ہندو شاہیا کے آخری تاجدار راجہ جے پال نے اپنا دارالخلافہ بنالیا۔ جسے 976ء میں محمود غزنوی کے والد امیر سبکتگین نے شکست دی تو اس نے پچاس ہاتھی اور دس لاکھ روپیہ بطور تاوان دے کر سبکتگین کے ساتھ صلح کر لی۔ لیکن اس نے بدعہدی کی جس کی سزا دینے کے لئے امیر سبکتگین نے دوبارہ حملہ کیا اور دوبارہ راجہ نے شکست کھائی اور خراج ادا کر کے اپنی جان کی سلامتی چاہی۔ 996ء میں امیر سبکتگین نے وفات پائی۔

ان کی وفات کے بعد جب 999ء میں محمود غزنوی غزنہ کا بادشاہ ہوا تو محمود غزنوی نے 1001ء میں راجہ کو شکست دی۔ راجہ جے پال نے پہ در پہ شکستوں کی وجہ سے آگ میں کود کر خودکشی کر لی۔

اس جنگ کے نتیجے میں غزنوی اور غزنی کے آس پاس سے آئے ہوئے کئی ہنرمند دستکار پشاور آ گئے۔ اس کے علاوہ یہی وہ عہد تھا جبکہ ترکمانستان' سمرقند' بخارا اور وسطی ایشیا کے کئی دوسرے علاقوں نیز ترک وایران اور افغانستان کے ہنر و کسب یہاں پہنچنا شروع ہوئے۔ جنہیں پشاور کی مٹی نے اپنے اندر جذب کر لیا

اور پھر اسلامی تہذیب کا غلبہ پانے لگا۔ حتیٰ کہ ہنر وفنون کے علاوہ یہاں کی تعمیرات میں بھی گندھارا تہذیب کی جگہ اسلامی تہذیب کا رنگ نظر آنے لگا اور مغلوں کی آمد پر مغل اسلامی فنون نے وہ مقام حاصل کیا جو آج تک پشاور کی قدیم رہائش گاہوں' حویلیوں اور مساجد ومدارس میں نمایاں نظر آتا ہے۔

پشاور کی نمایاں ثقافتی حیثیت کا تعین عہد حاضر سے تقریباً نصف صدی پہلے کے پشاور سے ہوتا ہے جبکہ پشاور کے گرداگرد فصیل تھی اور اس فصیل کے تقریباً

ہر فرلانگ یا نصف فرلانگ کے فاصلے پر قدیم مغل طرز کے بنائے ہوئے بڑے بڑے چوبی دروازے تھے۔ اس فصیل کا اب بھی جابجا کچھ حصہ باقی ہے۔ قدیم دروازوں میں اب بھی دو مقامات پر یہ دروازے موجود ہیں جو پشاور کی قدیم ثقافتی حیثیت کے تعین کے لئے کافی شہادت ہے۔ ان دو دروازوں میں سے ایک سرآسیہ کا دروازہ ہے اور دوسرا ٹھنڈی کھوئی کا دروازہ۔

پشاور کی فصیل کے درمیان جابجا کل سولہ درج ذیل دروازے تھے:

(۱) کابلی دروازہ جو قصہ خوانی بازار کے مغرب کے سر پر واقع تھا۔

(۲) باجوڑی دروازہ جو موجودہ نمکمنڈی بازار کے شمالی سر پر تھا اسے پرانے لوگ دو دروازہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مغرب کی طرف کے بازار کی طرف بھی ایک دروازہ تھا۔

(۳) ڈبگری دروازہ' جو موجودہ بازار ڈبگری کے مغربی سر پر تھا۔

(۴) رامداس گیٹ' چھوٹا سا بازار ہے جسے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے مغربی سر پر رامداس نامی ہندو نے بنوایا تھا۔

(۵) سرآسیہ گیٹ' یہ اب بھی آسیہ کے علاقہ مغربی سمت میں موجود ہے۔

(۶) ٹھنڈی کھوئی' دروازہ یہ دروازہ آج بھی موجود ہے۔

(۷) سرکی دروازہ' سرکی بازار کے مشرقی سر پر تھا۔

(۸) کوہاٹی دروازہ' علاقہ کوہاٹی کے سر پر واقع تھا۔

(۹) یکہ توت گیٹ' علاقہ یکہ توت کے جنوبی سر پر واقع تھا۔

(۱۰) گنج گیٹ' علاقہ گنج کے مشرق کی جانب تھا۔

(۱۱) لاہوری دروازہ' علاقہ لاہوری کے مغربی سمت میں تھا۔

(۱۲) ہشتنگری گیٹ' علاقہ چارسدہ کے ہشتنگری کی طرف شروع ہونے والی سڑک پر تھا۔

(۱۳) رامپورہ گیٹ' ہندوؤں کے علاقہ رامپورہ کے سر پر تھا۔

(۱۴) ریتی گیٹ' ریتی بازار کے مغربی سمت میں تھا۔

(۱۵) کچہری گیٹ' موجودہ چوک یادگار کے شمال کی جانب تھا۔

(۱۶) آسامائی گیٹ' موجودہ ہسپتال لیڈی ریڈنگ کے مشرقی دروازے کے سامنے تھا۔

پشاور و مضافات میں باغات بکثرت سے تھے۔ اسی مناسبت سے اس کا پرانا نام پور شاپور تھا جس کا مطلب ہے پھولوں کا شہر۔ پشاور کے چیدہ چیدہ باغات کو تاریخ میں اہم اور نمایاں حیثیت حاصل ہے کیونکہ ان باغات کی وجہ سے پشاور کے حسن و جمال میں ہر دور میں اضافہ ہوتا رہا۔ غرضیکہ پشاور کو وہ لازوال حسن و جاذبیت عطا کی ہے کہ جس کی وجہ سے دنیا کی کئی اقوام یہاں پر آ کر آباد ہوئیں۔ پشاور کے ان باغات میں بعض مشہور باغات کا اب صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے اور بعض وہ ہیں جو آج بھی سرسبز و شاداب ہیں۔

پشاور کے ان باغات کی مغرب سے آئے ہوئے کئی فاتحین و شاہوں نے مدح سرائی کی ہے۔ مغلوں کا بانی شہنشاہ ظہیرالدین بابر توزک بابری میں اس شہر کے بارے میں لکھتا ہے:

''ہم اپنے پڑاؤ کے پاس ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے ہمارے چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ یہاں سرخ دھان نیلے، اودھے، ادھر سفید، گلابی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے بڑے سلیقے سے ایک مسدس بنا دی ہو جس طرف نظر جاتی پھولوں کی بہار تھی۔''

اسی طرح 1809ء میں جب انگریزوں کی طرف سے درانی شہزادے شاہ شجاع کے پاس ایک معاہدے کی غرض سے جو مشن آیا اس کا سربراہ سر ایلفنٹن تھا۔ جس نے پشاور کے قلعہ بالا حصار میں شاہ شجاع کے ساتھ ملاقات کی اور یہیں پر وہ مقیم بھی رہا۔ وہ پشاور کی ہریالی اور اس کے گلزاروں کی عطر بیزیوں سے ایسا متاثر ہوا کہ جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس نے پشاور کی دلاویزی کے بارے میں اپنی ڈائری میں جو تاثرات رقم کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

''بے شمار باغات اور وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے درختوں نے فضا معطر کر رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے ایسی تازگی' نکھار ہندوستان کی دائمی گرمی میں کہیں نہیں نظر آتا' خوبانی' ناشپاتی' آڑو' آلوچہ اور انار کے باغات گلزار بنے نظر آتے تھے جو میں نے اور کہیں نہیں دیکھے تھے''۔

پشاور کے معروف باغات

بیری باغ: یہ پشاور شہر کے جنوب مشرق کی جانب ہزار خوانی روڈ پر واقع تھا۔ یہاں اب رہائشی بستی ہے۔

تیلیوں کا باغ: یہ باغ موجودہ وزیر باغ کے جنوب مشرق کی جانب تھا۔ اب یہاں قبرستان ہے۔

مامارانی کا باغ: ممکن ہے یہ باغ کسی مہارانی نے بنایا ہو اور اسی سے منسوب مہارانی باغ کو پشاور کے لوگوں نے مامارانی کا باغ کہہ دیا ہو۔

چھانڑنی کا باغ: یہ باغ مشہور لکھے ہوئے قدیم دروازے کے عقب میں تھا یہاں پر ہندو اپنے مردے جلاتے تھے۔

باغ بردہ قص: یہاں پانی کا کٹھہ بہتا تھا۔

نذر باغ: قلعہ بالا حصار کے گیٹ کے آگے یہ باغ تھا۔ اب یہاں پٹرول پمپ ہے۔

جناح باغ: قلعہ بالا حصار کے بالکل سامنے یہ باغ جی ٹی روڈ پر اب بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ پرانے لوگ اسے کننگھم پارک کہتے تھے۔ اب اس کا نام بدل کر جناح باغ رکھ دیا گیا ہے۔

شاہی باغ: پشاور شہر کے شمال کی طرف ایک وسیع و عریض احاطے پر واقع یہ باغ مغل دور کے ایک حکمران علی مردان خان نے تعمیر کروایا تھا۔ علی مردان خان کی طرف محض روایت ہی ہے جبکہ مستند دستاویز ایسی کوئی بھی سامنے نہ آ سکی تاہم یہ باغ پشاور کا ایک تاریخی اور ثقافتی ورثہ ہے۔

وزیر باغ: یہ قدیم اور تاریخی باغ پشاور شہر کے جنوب میں واقع ہے جس میں جابجا ایوان اور حوض بنائے گئے تھے۔ یہ باغ سردار فتح محمد خان المعروف وزیر نے 1810ء میں بنوایا تھا۔ فتح محمد خان بارک زئی افغان تھا۔

وائرلیس باغ: یہ قلعہ بالا حصار کے مغرب کی جانب تھا جہاں اب ڈاکٹروں کے فلیٹس بن گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی پشاور کے باغات ہیں جن میں:

باغنچہ جان محمد، ایجرٹن پارک، نمکمنڈی پارک، سر آسیہ پارک، چاچا یونس پارک، ڈگری گارڈن، کمپنی باغ، پنج تیرتھ باغ، گاف گراؤنڈ، آرمی سٹیڈیم، ڈیفنس پارک، گیرژن پارک، باغ ناران مشہور باغات ہیں۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی

صوبہ سرحد اور گندھارا کے صدر مقام پشاور جو کہ مغرب کی طرف سے آنے والی اقوام کا اولین مسکن تھا۔ یہاں کی آب و ہوا کے علاوہ زرخیز مٹی نے آنے والی اقوام کو یہیں پر ابدی پڑاؤ کے لئے آمادہ کیا اور ہنرمندوں، دستکاروں اور تاجروں نے سماجی اور معاشرتی آسودگی کے پیش نظر پشاور کے ساتھ اپنا لازوال رشتہ قائم کر لیا اور پھر اسی خطے اور سرزمین سے اپنی شناخت میں عافیت سمجھی۔ لہٰذا اب ایسی تمام وارد ہونے والی اقوام پشاور کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور اسی سرزمین کی اقوام کہلاتی ہیں۔ تاہم تاریخ میں انتہائی تحقیق اور غور و خوض کرنے کے بعد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام سے پہلے بھی ایسی قومیں تھیں جنہیں پشاور کی حقیقی قومیں کہا جا سکتا ہے جن میں ہندکو قوم بھی ہے جنہوں نے اپنے ممیز سماجی اور ثقافتی رویوں کے ساتھ آنے والی اقوام کا خیر مقدم کیا۔ ان قدیم اقوام میں دو قومیں ایسی ہیں جن کا ذکر وید میں گندھاریوں اور ستاگیدی کے نام سے آیا ہے۔ جن کے بارے میں ہیروڈوٹس نے بھی اسی بات پر اتفاق کیا ہے جبکہ ایک اور قوم جسے وید نے داذیکے لکھا یہ بھی پشاور کی تیسری قوم کے طور پر شناخت ہوتی ہے۔ ستاگیری سے خٹک، اپاریتے سے آفریدی گندماڑے سے یوسفزئی اور داذیکے سے کاکڑ مراد ہیں۔

بعد میں جب محمود غزنوی کے حملے برصغیر ہندوستان کی طرف شروع ہوئے تو ان کے ساتھ یا ان سے پہلے محمود غزنوی کے والد سبکتگین نے راجہ جے پال پر جو دو حملے کئے اس وقت بھی مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے ساتھ پہلی جو قوم وارد ہوئی وہ دلہ زاک قوم تھی اور پھر دلہ زاکوں میں بھی ایک معتبر خاندان قاضیوں کا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمود غزنوی یا ان کے والد امیر ناصر الدین سبکتگین کے حملوں سے پہلے اس سرزمین پر مسلمان تھے۔ اس سلسلے میں لفظ 'اعوان' ہماری تحقیقی امداد کے لئے حقیقت جاننے کی خاطر گرہ کو کھول دیتا ہے۔ کیونکہ جب محمود غزنوی کے ہندو راجاؤں کے خلاف حملے شروع ہوئے تو پشاور اور مضافات کے باشندوں نے ان مسلمان حملہ آوروں کی ہر طرح سے امداد کی تو یہ اسلامی عقیدے کے مطابق مسلمانوں کی امداد کرنے کی بناء پر اعوان کہلائے یعنی مددگار۔ یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین کے مقامی باشندے اکثر اپنے آپ کو اعوان کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پشاور کے قدیم باشندے محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے مشرف با اسلام ہو چکے تھے۔ اس لئے یہاں کے قدیم باشندے چاہے وہ کوئی بھی قومی پہچان رکھتے ہوں عمومی طور پر اپنے آپ کو اعوان لکھتے ہیں۔ ان میں گجر لوگ، جو کہ پیشے کے لحاظ سے گائے اور بھینسوں کے مالک اور ان کا دودھ بیچنے والے ہیں جن کو وید میں ''استاگودے'' لکھا ہے وہ بھی اپنے ساتھ اس بناء پر اعوان لکھتے ہیں کہ یہ لوگ یہاں کے قدیم باشندے تھے انہوں نے مسلمان حملہ

آوروں کی امداد و تعاون کے لئے ہر طرح سے مدد کی۔ (جہاں تک اعوان قوم کی مخصوص نسل کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں میں نے اپنی کتاب ''ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں'' کے صفحہ نمبر 168ء میں پوری تفاصیل دے دی ہیں) مختصراً یہ کہ یہاں کی قدیم قوموں میں گجر اور ملک ہیں جنہیں مجموعی طور پر اعوان ہی کہا جاتا ہے بلکہ ملک اپنی مخصوص شناخت کے لئے ملک لکھنا نہیں بھولتے اور یہ وہی لوگ ہیں جنہیں وید میں ''دادیکے'' لکھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ہیروڈوٹس اور وید کے دیے ہوئے ناموں کے قبیلے الگ الگ ہیں۔ کیونکہ ہیروڈوٹس کے دیئے ہوئے ناموں پر تمام زباندان متفق ہیں کہ وہ خٹک، آفریدی، یوسفزئی اور کاکڑ ہیں، یہ الفاظ یونانی ہیں، جبکہ وید سنسکرت میں لکھا گیا۔

محمود غزنوی کے بعد پھر جو دوسرے سلاطین آئے جن میں غوری، خلجی اور مغل زیادہ قابل ذکر ہیں تو ان کے ساتھ نووارد اقوام نے بھی اس خطے کو اپنا مسکن قرار دیا۔ ان میں غوری پشتونوں کے وہ حکمران ہیں جن میں شہاب الدین غوری نے پہلی بار دہلی میں مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد رکھ دی اور غلجی (خلجی) پشتونوں کے وہ حکمران ہیں۔ جن میں علاؤ الدین غلجی نے پہلی بار تمام برِصغیر کو فتح کر ایک ملک بنایا۔ مغل اور پھر مغل کی مختلف شاخیں ہیں۔ علاوہ ازیں بعض وہ قومیں بھی ہیں جو کہ مشرق یا جنوب مشرق یا شمال مشرق کی طرف سے آ کر یہاں آباد ہوئی ہیں اور وہ اب اپنے پشاوری رہن سہن اور زبان کے لحاظ سے پشاوری ہی کہلاتے ہیں۔ ان میں سیٹھی، صدیقی، اخونزادگان میر اور طاہر خیلی ہیں۔

زبان

پشاور و مضافات کے باشندوں کی قدیم ترین زبان ہندکو ہے۔ خصوصاً پشاور کے مقامی لوگ جو ہندکو زبان بولتے ہیں وہ خالصۃً ہندکو زبان ہے۔ جسے دنیا کی مہذب و متمدن زبان کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب دروں اور کہساروں کے لوگ پشاوریوں کے ساتھ آ کر آباد ہونے لگے تو یہاں کے لوگوں نے انہیں تہذیب و شرافت کی ایسی خُو دی کہ ان لوگوں نے یہاں کی تہذیب کو اپنانے میں فخر محسوس کیا۔ مگر اس کے ساتھ کہساروں اور دروں سے آنے والی اقوام بھی اپنے ساتھ بعض ایسی خاصیتوں کو لے کر آئیں جنہیں پشاور کے مقیم باشندوں نے ان اوصاف کو اپنانے میں شہرت حاصل کی ان میں جرائت و بہادری اور مہمان نوازی کی خو کو انتہاء تک پہنچایا ہے۔ ان اوصاف کے باہمی امتزاج نے پشاور کے لوگوں کو بین الاقوامی حیثیت سے جو شہرت دی ہے وہ ان کے علاقے کے حوالے سے جرأت و شجاعت، شرافت و نجابت، مہمان نوازی، وفا شعاری کی خاصیتیں ہیں، جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو اسی امتزاج و ادغام کی برکت ہے کہ پشاور و مضافات کے رہنے والے ہندکو اور پشتو بڑی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔

جہاں تک ان دونوں زبانوں کی قدامت کا تعلق ہے تو دونوں زبانوں کے محققین نے اپنے اپنے طور پر دونوں زبانوں کی قدامت پر زور دیا ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ دونوں زبانوں کے پیروکار محققوں نے اپنی زبان کے ڈانڈے سنسکرت سے ملائے ہیں اور سنسکرت و پالی زبان کے حوالے ہی سے اپنی زبان کی قدامت کو پیش کیا ہے۔

پشاور کی خالصۃً زبان ہندکو جو خالص پشاور میں بولی جاتی ہے جبکہ خالصہ کے لوگ قدرے مختلف لہجہ کے ساتھ ہندکو بولتے ہیں اس طرح پشاور شہر کے علاوہ تقریباً خالصہ کے چراسی (84) دیہات میں ہندکو بولی جاتی ہے جبکہ اکوڑہ خٹک، خیر آباد اور نظام پور کے بعض علاقوں میں لہجے کی تبدیلی کے ساتھ ہندکو زبان رائج ہے۔ جہاں تک پشتو کا تعلق ہے اس کے متعلق مشہور ماہر آثار قدیمہ اور ماہر لسانیات و تاریخ ڈاکٹر احمد حسن دانی نے تاریخ پشاور میں لکھا ہے کہ یہ دنیا کی قدیم ترین زبان ہے اور نیویارک کے ایک مانومنٹ پر قدامت کے لحاظ سے پشتو دنیا کی زبانوں میں چوتھے نمبر پر ہے یہ اتنی ترقی یافتہ زبان ہے کہ اس میں بے شمار پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم فل موجود ہیں۔ ان اوصاف کو پشتون ضابطہء حیات یا پشتونوی کہتے ہیں۔ جو دنیا کے تمام مذاہب کے اچھے اقدار کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے جو بھی باہر سے آیا اسی ضابطہء حیات کو اپنا کر پشتون کہلائے جانے پر فخر کرنے لگا۔

جہاں تک پشاور کے شمال جنوبی اور جنوب مغرب کے دیہات میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ پشتو زبان ہے۔ ان دیہاتوں میں ہزارخوانی، موسیٰ زئی، بڈھ بیر و مضافات کے علاقے متھرا، ورسک اور مضافات اور چغرمٹی و مضافات، لنڈی رباب، تہکال، ریگی اور سپیق وڑی کے وہ علاقے ہیں جو کہ پشاور کی حدود میں شامل ہیں۔ ان تمام علاقوں میں ایک ہی جیسی پشتو بولی جاتی ہے جبکہ چارسدہ کے تمام دیہات کے لوگ اور نوشہرہ کے دیہات میں امان گڑھ، مانکی شریف، کاکا صاحبؒ، بہی اور چراٹ کے علاقوں میں پشتو بولی جاتی ہے۔ چراٹ و مضافات کے علاقہ میں زیادہ تر خٹک لوگ آباد ہیں جن کی مادری زبان بھی پشتو ہے۔

ہندکو، تاریخ و ثقافت

ہندکو زبان برصغیر کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے جس کی جنم بھومی قدیم گندھارا کی سرزمین ہے۔ یہ سرزمین سرزمینِ گندھارا کے نام سے مشہور ہونے سے پہلے خطہ، دردستان کہلاتی تھی جس کا مطلب مشکل اور خطرناک راستوں اور گھائیوں کے علاوہ درد وغم اور مصیبتوں کا خطہ ہے۔ یہ خطہ جو کہ قندھار سے شروع ہو کر جہلم یا اس سے بھی آگے تک تھا اس میں بے شمار زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ان میں نمائندہ زبان اکرت ہی تھی جسے ہندکو زبان کہا جاتا ہے۔ ہم جب اس زبان کے ڈانڈے قدیم ویدوں سے ملتے دیکھتے ہیں تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس علاقے میں مرکزیت اسی زبان کو حاصل تھی۔ ویدوں کے بارے میں قدیم مورخوں کا خیال ہے کہ یہ تقریباً چار ہزار سال پہلے موجود تھے البتہ ضبط تحریر میں کم از کم پندرہ سو قبل مسیح وجود میں آئے۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس علاقے میں پندرہ سو قبل مسیح تحریر وجود میں آ چکی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب وید تحریر میں آئے تو ان کی زبان ہندکو ہے۔ چونکہ ویدوں کے تحریر میں آنے سے ہی اس علاقے میں زبانوں یا بولیوں کی پہچان ہوئی۔ اس سے ہندکو زبان کے تاریک ادوار کو چھوڑ کر ویدوں کے تحریر میں آنے کے دور کو ہم کسی ہندکو زبان کے اجاگر ہونے کا دور کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر الٰہی بخش اعوان اور دیگر مورخین کے مطابق ویدوں سے پہلے بھی اس علاقے میں ہندکو زبان کی حکمرانی ثابت ہے۔ اگر دردستان کی تاریخ پر غور کریں تو پروفیسر الٰہی بخش اختر اعوان سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ کوئی بھی نمائندہ بات، کتب یا منتر جادو وغیرہ جب تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے تو ماحول سے غافل ہو کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر آج ہم قدیم ویدوں میں ہندکو کو مخاطب دیکھتے ہیں تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ویدوں سے پہلے یعنی دردستانی عہد میں بھی قدیم گندھارا کے علاقے میں ہندکو زبان ہی کی حکمرانی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دردستان کے علاقے میں صرف ہندکو ہی نہیں بلکہ دیگر بے شمار بولیاں بھی موجود تھیں اور یہ وجہ ہے کہ آج بھی وہ علاقے جو قدیم دردستان کا حصہ ہیں یا پھر گندھارا سے تعلق رکھتے ہیں بے شمار زبانوں اور بولیوں کا مرکز ہیں۔ ان علاقوں میں ہندکو کے علاوہ پشتو، شنا، چترالی، بلتی، کوہستانی، سرائیکی، پوٹھوہاری، گلگتی اور گوجری وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ کسی حد تک ہم یہاں کشمیری زبان کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اس دور میں قبائلی دستور کے مطابق قبائل اپنی زبان تک بھی علیحدہ کر لیا کرتے تھے مگر پھر بھی ان تمام زبانوں اور قبیلوں میں کوئی ایک قدر مشترک ہوتی تھی جو ان کو ثقافتی اور سماجی رشتوں میں جکڑ کر یکجا رکھتی تھی۔ اور وہ ایسی زبان ہوتی تھی جو سب میں یکساں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔

ہندکو زبان کی قدامت کے ثبوت میں اس علاقے کی قدیم مذہبی کتب پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں چار مقدس کتابیں اس علاقے میں رائج رہیں ہیں جنہیں ''وید'' کہا جاتا ہے۔ وید کے لغوی معنی ہیں قابل احترام مقدس مذہبی داستانیں اور علمی باتیں۔ عظیم گندھارا میں مندرجہ ذیل چار ویدوں کی حکمرانی ہزاروں سال تک رہی ہے۔

۱۔ رگِ وید: سب سے قدیم ترین مقدس گندھاری کتاب ''رگ'' کے معنی ہیں دُعا، ثنا یا پھر ایک وزن دار مصرعہ۔ اس میں زیادہ تر اس علاقے کے مقدس دیوتاؤں کے حالات اور اُن کی شان میں تعریف و توصیف تحریر ہے جنہیں ''سلوک'' کہتے ہیں۔

۲۔ یجر وید: قدیم زمانے کے دیوتاؤں کے حضور جو قربانیں پیش کی جاتی تھیں اُس وقت جو دُعا پڑھی جاتی تھی یا پھر مختلف قسم کی قربانیاں اور مختلف قسم کی دعاؤں اور قربانیوں کے پیش کرنے کے طریقے درج ہیں۔ جنہیں بعض تاریخ دانوں اور ماہرین لسانیات نے ''منتر'' بھی کہا ہے جس طرح رگ وید کی شکل بھجن کی صورت میں آج بھی موجود ہے اس طرح یجر وید میں درج شدہ منتر بھی کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔

۳۔ سام وید: سام وید اس دور کے دیگر مذہبی امور کی بجا آوری کے طریقے اور کسی حد تک اس دور کے ادب کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کے دیوری دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے حوالے سے جو مذہبی امور بجالائے جاتے اور جو بھجن اور گیت وغیرہ گائے جاتے اُن کے طور طریقے درج ہیں یعنی خاص طور پر مذہبی موسیقی کے آداب شامل ہیں۔ ہم سام کو مذہبی موسیقی کی ہدایت کا مرقع کہہ سکتے ہیں۔ ایک لحاظ سے سام وید اس دور کے لکھنے والوں کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ سام وید ہی کے دور میں موسیقی سے متعلق قدیم کتابوں مین ایک اور وید کا بھی ذکر ملتا ہے جسے ''اپاوید'' کہتے ہیں مگر علماء اسے علیحدہ وید کا درجہ نہیں دیتے بلکہ سام وید کا ہی ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔

۴۔ **اتھر وید:** گندھارا کے علاقے کی چوتھی اور آخری مذہبی کتاب اتھر وید ہے جس میں یاتو (yatu) یعنی ٹونے ٹوٹکے اور جادوگری سے متعلق منتر درج ہیں۔ کہتے ہیں قدیم عہد میں اتھر وید کے پیروکار اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد دیوی دیوتاؤں کا روپ دھار لیتے تھے اور یوں ایک عام شخص کا عقیدہ حقیقی اور غیر حقیقی دیوتاؤں میں اُلجھ کر متزلزل ہو جاتا۔ جب یہ فن عروج کو پہنچا تو ظلم و جبر کی داستانیں بھی عام ہوئیں۔ گھٹیا بڑھیا کا سوال بھی پیدا ہوا۔ اونچ نیچ کے دستور نے بھی رواج پایا، ذات پات کے اصول بھی مرتب ہونے لگے۔ مذہبی طور پر اسی بے سروسامانی کی وجہ سے اس علاقے میں دوسرے مذاہب یعنی بدھ مت اور جین مت کو قدم جمانے کا موقعہ ملا کہ عوام اپنے قدیم مذہب سے بیزار ہو چکے تھے۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ وید کس زبان میں تھے اور وہ زبان کن کن علاقوں پر محیط تھی کیونکہ وید اُس زبان میں تحریر ہوئے جو کہ اس علاقے کی اکثریتی آبادی بولتی تھی یہ دعوی کیونکہ صرف ہندکو زبان ہی کر سکتی ہے کہ اُس زمانے میں ویدوں کی زبان ہندکو تھی اس لئے کہ آج بھی ہندکو زبان میں وید کے عہد کے سینکڑوں الفاظ موجود ہیں اور باقاعدہ بولے جاتے ہیں۔ اب ایک طرف سکوں کے عہد کو اس علاقے میں ایک ہزار قبل مسیح تک خیال کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ویدوں کا عہد ضبط تحریر کے حوالے سے ۱۵۰۰ یا ۱۲۰۰ قبل مسیح متفقہ طور پر قدیم کتب میں ثابت ہے لہذا یہ بات ثابت ہوئی کہ وید جس عہد میں تحریر میں لائے گئے اس عہد کے آگے پیچھے اس سرزمین پر سکے بھی رائج تھے اور اگر یہ ان سکوں کو بے ربط اور ذاتی سمجھ کر ہم خاطر میں نہ لائیں اور جنس کے بدلے جنس اور مال کے بدلے مال کو اولیت دیں تب بھی اس طریقے کا نام "سامانہ" یا "میلہ" ہندکو زبان میں تاحد جو آج بھی رائج ہے۔

قدیم ویدک عہد میں میلوں کا بڑا رواج تھا لوگ کسی مخصوص دن کسی مخصوص مقام پر اکٹھے ہوتے اور اپنی ضرورت کا سامان ایک دوسرے سے بدلتے۔ اس زمانے میں اس قسم کی اکٹھ یا میلے کا نام "سامانہ" ہوا کرتا تھا۔ یعنی سامان کی لین دین۔ آج بھی لوگ میلوں میں سامان ہی خریدتے ہیں۔ جب اس "سامانہ" کو ایک دوسرے سے ملنے سے تعبیر کیا جانے لگا تو پھر اس قسم کی اکٹھ کو میلہ کہا جانے لگا۔ یہ میلہ اور سامان جسے قدیم لفظ آج بھی اسی معنوں میں ہندکو زبان میں رائج ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ سکوں کی ابتداء سے پہلے بھی گندھارا کے علاقے میں نمائندہ زبان ہندکو ہی تھی اس لئے کہ مرکزی اور نمائندہ الفاظ ہندکو ہی کے استعمال ہوتے تھے۔

ہندکو زبان اگرچہ پاکستان کے ایک وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے جس میں صوبہ سرحد کے علاوہ پنجاب کا کچھ حصہ بھی شامل ہے اور اب تو اس زبان کے بولنے والوں کی سندھ میں بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ لیکن اس کی جنم بھومی قدیم گندھارا کی سرزمین ہے جس مین موجودہ صوبہ سرحد کا علاقہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیونکہ سمٹ سمٹا کر اس علاقے میں اپنی شناخت اپنا وجود اور اپنے مزاج کے ساتھ گزشتہ ہزاروں سالوں کی طرح اب بھی بولی جارہی ہے۔

پشاور ڈویژن جس میں پشاور اور مردان کے ضلع شامل ہیں، اس میں ہندکو، پشتو دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔

ہزارہ ڈویژن جس میں کوہستان، مانسہرہ اور ایبٹ آباد شامل ہیں چند دیہات کو چھوڑ کر صرف ہندکو زبان بولی جاتی ہے۔

کوہاٹ ڈویژن جس میں کوہاٹ اور کرک واقع ہے شہروں میں ہندکو اور دیہات میں پشتو بولی جاتی ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن جس میں بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان جس میں بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان شامل ہیں یہاں پر ہندکو سارے ڈیرے اور بنوں کے کچھ علاقے میں بولی جاتی ہے۔

ایک تاریخی حوالے کے مطابق گندھارا وادی پشاور کا پرانا نام تھا جس میں پشاور کے ملحقہ سارے قبائل علاقے بھی شامل تھے اسکی وجہ تسمیہ میں ایک آریا راجہ "گندھاریا" کا ذکر ملتا ہے جس نے اس نام سے پہلی مرتبہ اس علاقے میں ایک ریاست قائم کی تھی اور ہر ایک طویل عرصے تک یہ علاقہ آریائی ایرانی یونانی اور دوسرے کئی قبائل کے حملوں سے پامال اور آباد ہوتا رہا ہے۔ ہر آنے والی قوم چونکہ فاتح ہوتی تھی لہذا اس کے اثرات کا باقی رہنا ایک قدرتی امر ہے۔ اپنی اقوام قبائل اور تہذیبوں کے مخلوط ہونے سے اک نئی تہذیب نے جنم لیا اور ایک علیحدہ ثقافت ہمارے سامنے آتی رہی جو آگے چل کر گندھارا آرٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

قدیم تاریخوں میں اس سرزمین سے گندھارا کا نام پہلی مرتبہ چھٹی صدی قبل مسیح میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ بدھ مت کی قدیم کتاب "انگوترا" اور "مہاوتو" جو کہ زبان کی مشہور و معروف کتابیں ہیں ان میں پہلی مرتبہ گندھارا کا ایک ملک کے حوالے سے نام دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ کتابیں جن میں مہاتما گوتم بدھ کے معجزوں کے ساتھ سوانح عمری درج ہے اور اس علاقے میں اُن ۱۶ بڑی طاقتوں کا ذکر ملتا ہے جو چھٹی صدی کے شروع میں برصغیر میں موجود تھیں بس انہی میں ایک طاقت یا ملک گندھارا بھی تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے "گندھاری" یا "گندھارا"

کا ذکر ملتا ہے مگر یہ ذکر ملک سے زیادہ ایک قوم کا لگتا ہے۔ گندھارا کے مشہور شہروں میں یعنی ۵۵۰ قبل مسیح میں ''تکشا شہر'' (ٹیکسلا) ''پش کلاوتی'' (چارسدہ) اور ''پرشاپورایا پرشاور'' (پشاور) شمار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر پشاور تو اس عہد میں بدھ مت کے عالموں کا مرکز تھا۔ چھٹی صدی میں پہلی مرتبہ گندھارا کا نام آنے سے مقصد ہوا کہ گندھار کا نام چھٹی صدی سے پہلے بھ موجود تھا اور اتنا مشہور و معروف تھا کہ تاریخوں میں مذکور ہوا۔ دوسری مرتبہ ۵۸۶ یا ۵۲۹ قبل مسیح شہنشاہ سائرس (کوروش) یعنی ایران کے شاہی خاندان یخامنشی کے دور میں گندھارا کا حوالے ایک ملک اور سرزمین کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب سائرس نے دریائے انڈس (سندھ) کے مغرب کا علاقہ فتح کیا تو اس میں ایک ملک ''گندار یٹز'' (GANDARITIS) بھی ہے۔ سائرس نے اپنے ملک میں اس علاقے کو شامل کر کے اسے اپنا ساتواں صوبہ بنالیا۔

دارہ اول ''بستان'' (BAHISTAN) کے کتبے کی شق نمبر ۱، ۳ اور ۱۷ میں بھی گندھارا ئی ترتیب اور فتوحات کی وجہ سے بیسویں ستراپی یعنی صوبے کے طور پر موجود ہے۔ اس کتبے کی تاریخ ۵۱۶ قبل مسیح ہے۔ بعض لوگ گندھارا کو ہندوستان ہی کا ایک حصہ سمجھ کر بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں حالانکہ گندھارا ایک علیحدہ سرزمین زبان اور ثقافت ہے جس کے اثرات بعد میں تمام ہندوستان میں بھی پھیلے لیکن گندھارا کبھی بھی ہندوستان کا حصہ یا ہندوستان نہیں رہا۔ درحقیقت ہندوستان کا اطلاق تو اس زمانے میں دریائے سندھ کے مشرقی علاقے پر ہوتا ہے۔ دارا اول کا ایک مشہور کتبہ جو ''پرسی پولس'' (PERSIPOLIS) یعنی تخت جمشید جس کا اسلامی نام ''اسحر'' ہے اس تخت کے چبوترے میں نصب ہے۔ اس کی شق ۱۷، ۸ اور ہر ''نقش اسم'' کے کتبے کی شق نمبر ۲۵ میں دارا کے فتح کردہ علاقے اور اقوام میں صاف طور پر لفظ ''ہندو'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ سندھ (انڈس) کے مشرقی علاقہ یعنی خطہ پنجاب کو کہتے ہیں۔ تخت جمشید کے کتبے کی تاریخ ۵۱۸ اور ۵۱۵ قبل مسیح ہے اور نقش اسم کے کتبے کی تاریخ ۵۱۶ اور ۵۱۵ قبل مسیح ہیں۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ دارا اول نے جب اس طرف کا رخ کیا اور ایک طویل عرصے تک وہ ان علاقوں پر یلغار کرتا رہا اور فتوحات کا سلسلہ آگے ہی آگے بڑھاتا رہا تو گندھارا کے علاقے کو فتح کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کے علاقے کو کہاں تک فتح کیا اور سائرس کی حکومت کی حدود کہاں تک تھیں مگر تاریخوں میں اتنا ضرور ملتا ہے کہ ہنمانشی سلطنت کے ایرانی سے باہر اس طرف دو صوبے یا ستراپی تھیں۔ (۱) موجودہ سندھ (۲) کوہ ہندوکش سے لیکر جہلم کا علاقہ جو گندھارا کے نام سے مشہور تھا اور جس میں موجودہ ضلع پشاور، اٹک اور پوٹھوہار کا پرا علاقہ شامل تھا اور گندھارا کی حدود دریائے سندھ کے پار مغرب میں قائم تھیں۔

دارپوش اول جب اس علاقے پر تسلط حاصل کر لیا تو دریائے سندھ کے بارے میں اسے تجسس ہوا کہ اس علاقے کا یہ سب سے بڑا دریا آخر کہاں جاتا ہے اور کن کن راستوں اور ممالک سے ہوتا ہوا یہ سمندر میں کس مقام پر جا گرتا ہے۔ لہذا اس نے اپنی با چکزار ریاستوں میں سے ''کیریا'' (CARIA) دارالخلافے ''کریڈا'' کے ایک امیر البحر ''اسکائی لیکس'' کو دریائے سندھ کی گزرگاہ کی کھوج لگانے پر مقرر کیا۔ اسکائی لیکس نے دریائے انڈس (سندھ) اور دریائے کابل کو جو اٹک کے مقام پر آپس میں ملتے ہیں اس مقام سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اور سمندر تک اس عظیم دریا کی گزرگاہ کا جائزہ لیا۔ یہ بحری سفر اسکائی لیکس نے ۵۱۷ قبل مسیح میں شروع ہوا اور تقریباً ۵۲۰ قبل مسیح میں مصر کی سرزمین پر جا کر اختتام پذیر ہوا۔ یہاں ہر یہ بات قابل ذکر ہے کہا سکائی لیکس نے اس سفر کو اگرچہ اٹک کے مقام سے شروع مگر وہ اسے ہندوستان نہیں کہتا بلکہ گندھارا کہتا ہے۔ بقول مشہور جغرافیہ دان ''ہیکاٹیئس'' (HECATAEUS) کہ اسکائی لیکس نے یہ سفر ''کسپائرس'' سے شروع کیا تھا جو بالائی انڈس کے نزدیک تھا۔ اگر قدیم تاریخوں اور نقشوں پر غور کیا جائے تو بالائی انڈس کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دریائے انڈس (سندھ) کی بالائی گزرگاہ کے آس پاس گندھارا کا علاقہ تھا جس میں گھندھارا کا بحیثیت ایک ملک اور تہذیب کے ذکر ملتا ہے۔ اور ساتھ ہی علاقے کی واضح طور پر نشاندہی ہوتی ہے کہ عظیم دریائے انڈس اور دریائے کابل کی ابتداء جہاں سے ہوتی ہے وہی گندھارا کا ملک ہے۔ ہیکاٹیس شیر ملی ٹس کا رہنے والا تھا اور اپنی جغرافیائی تصنیف (PERIODOS GEL) میں گندھارا کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے اور یہ کتاب پانچویں صدی قبل مسیح کی تصنیف ہے۔

۶۰۰ قبل مسیح میں شمالی ہند کی سیاسی کیفیت پر ودھا (VIDEHA) خیبر پاس سے جانب افغانستان جسے جلال آباد کا علاقہ کہہ سکتے ہیں اس کا راجہ جنک (JANAKA) کے بارے میں سیاسی کیفیت پر بحث کرتے ہوئے گندھارا کی نشاندہی یوں کرتا ہے کہ اُس زمانے میں بونڑی ریاستیں یا حکومتیں جن کے نام مندرجہ ذیل تھے۔

گندھارا، کیکیا (KEKAYA) مدرا (MADRA) اوشی نارا (USHINARA) متسیا (MATSYA) کورو، پنچالا، کاسی (KASI) کوسالہ (KOSALA)۔ اس ۶۰۰ قبل مسیح کے گندھارا کی تفصیل بتاتے

ہوئے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس وقت گندھارا شمال مغربی پنجاب اور اس سے ملحقہ صوبہ سرحد کے علاقے پر مشتمل تھا۔ اور اس کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اب بھی پنجاب میں گندھارا کے کچھ علاقے شامل ہیں جہاں کے لوگ ہندکو زبان بولتے ہیں۔

چونکہ ایران کی قدیم تاریخوں میں گندھارا کا وجود پایا جاتا ہے اور یہ اتفاقی یا کسی ایک جگہ پر یا مبہم نہیں بلکہ ایک قوم کی حیثیت سے اور ایک ملک کی حیثیت سے کئی قدیم کتبوں میں ملتا ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گندھارا کا لفظ اس سرزمین کے لئے قدیم ایرانیوں کے اس علاقے پر مسلط سے پہلے کی بات ہے کیونکہ جب گندھارا کی سرزمین پر ایرانیوں کا تسلط ہوا تو یہ نام گندھاری ایک قوم کے حوالے سے اور گندھارا ایک ملک کے حوالے سے نہ صرف موجود تھا بلکہ قدیم تاریخیں اسے ایک طاقت کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ ہم دارا کے مقبے کے نقش اسم کی نوح کا ذکر پہلے کر آئے ہیں ایک اور نوح جو قدیم ایران کے شہر شوش سے بھی برآمد ہوئی ہے جو ۵۱۵ قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں بھی گندھارا کو گمبارا کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے افغانستان کے ایک شہر قندھار کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں لیکن اس میں اشکال پایا جاتا ہے وہ اس لئے کہ افغانستان کا شہر قندھار گندھارا کے نام سے بہت بعد تاریخ میں سامنے آتا ہے۔ اسے گندھارا کی بگڑی ہوئی شکل کہہ سکتے ہیں۔

گندھارا میں رائج مذاہب کے پروہتوں پجاریوں پر ایک نظر دوڑائی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا مذہبی لباس اسی رنگ یعنی زرد یا جوگیا ہوتا ہے۔ یہ پھول بھی اپنی ایک خاص خوشبو رکھتا ہے جو بہت ہی کم یا پھر حساس لوگوں کو ہی محسوس ہوتی ہے لہذا اس حوالے سے بھی خوشبو والی روائت صحیح معلوم ہوتی ہے اور یوں اس سرزمین کو ''گندھارا'' یعنی خوشبو والی سرزمین کہہ سکتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گندھارا کی عظیم تہذیب یہاں پر صدیوں قائم رہتی ہے لیکن ایران کے شہنشاؤں کے اختتام پر یعنی آخری شہنشاہ دارا کی سکندر اعظم کے ہاتھوں شکست کے بعد گندھارا پھر صدیوں تک یونانیوں کے زیر تسلط رہتا ہے۔ سکندر اعظم کے حملے اور یہاں کے بادشاہ کی شکست کے بعد گندھارا کی سرزمین پر پیشانیوں اور خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو کر اپنی ساکھ کھو دیتی ہے اور یہ سرزمین چھوٹی چھوٹی کئی ریاستوں یا حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

تاریخ گندھارا کے مصنف لکھتے ہیں:

''تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ مہاتما بدھ نے کبھی گندھارا کی سرزمین پر قدم رکھا ہو مگر مذہبی غلو اور جوش نے یہ عالم کر دکھایا کہ اس سرزمین کے پہاڑ، پہاڑیاں، غار، وادیاں، دریا، چشمے، غیر معمولی شکل کے پتھ اور غیر معمولی بڑے درخت سب ہی کو مہاتما بدھ کی زندگی یا گذشتہ جنم کے واقعات یا بدھ مذہب کے آنے والے واقعات سے منسوب اور منسلک کر دیا اور اس سرزمین کے پہاڑوں، وادیوں اور ہر اہم اور خوبصورت مقام کو بدھ مذہب کی عبادت گاہوں کی تعمیر سے معمور کر دیا۔ جن کے ویرانوں سے آج بھی گندھارا کی سرزمین بھری پڑی ہے اور جو ہو شاہراہ پر دور سے نظر آتے ہیں اور ہر دیکھنے والے کو اپنی داستان عبرت سناتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شاہراہوں پر مہاتما بدھ اور بدھی استواؤں کے بت ہر اہم مقام یا موڑ پر نصب کر دیئے گئے یا پہاڑ کو کاٹ کر یہ شکل بنا دی گئی تھی۔ سوات میں کئی دیو ہیکل بت پختہ سڑک کے کنارے آج بھی سیاحوں کو نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی بت افغانستان میں بامیان کے مقام پر موجود ہیں۔ درحقیقت وہ شاہراہیں ہیں جن پر بدھ مذہب کے پیرو بغرض زیارت سفر کرتے تھے اور قدم قدم پر ان بتوں کو دیکھ کر روحانی تسکین حاصل کرتے تھے۔ درحقیقت مذہبی روایات کی اتنی بڑی اور وسیع نقل مکانی جیسی بدھ روایات کی گندھارا میں ہوئی دنیا میں اور دنیا کے مذاہب میں کہیں واقع نہیں ہوتی۔ اگرچہ مہاتما بدھ کبھی اس سرزمین پر نہیں آئے مگر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مذہبی گلو نے ان کی زندگی اور مختلف جنموں کی ہر روایت کو گندھارا کی سرزمین سے منسلک کر دیا۔

گندھارا اُس بدھ دور میں اتنا آباد و خوشحال تھا کہ اس کے بعد آج تک اسے یا سا دور نصیب نہیں ہوا۔ اس کی بدھ عبادت گاہوں کی سُریلی گھنٹیوں کی آوازوں کے سوا اور کوئی موسیقی نہ تھی اور اس کے بھکشوؤں کے لباس کی زردی کے علاوہ اس ملک کا کوئی اور رنگ نہ تھا۔ بدھوں کے یہ اثرات آج بھی مسلمان فقیروں کے زرد لباس، منکوں کے ہار، کھڑاویں اور سیاہ کاسہ گدائی میں نظر آتے ہیں۔ مسلمان سرمنڈے فقیر بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ کیا اس وقت کبھی یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ ان کے ملک سے بدھوں اور ان کے مذہب اور تہذیب کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور وہ ماضی کی دھندلی تاریخ کا ایک باب بن جائے گا۔

اتنے طویل اقتباس پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ذہن میں گندھارا کی سلطنت کے ایک نقشے کے ساتھ یہاں کی معاشرتی اور سیاسی مذہبی ہر مختلف طور پر روشنی ڈالی جائے اور یہ معلوم ہو کہ عظیم اور قدیم گندھارا میں ہندکو بولنے والوں کی کیا حیثیت تھی۔ کیونکہ ان میں جن کتبوں اور انواح میں جو عبارت پیش کی گئی ہے اس کی امین گندھارا میں پہلے بھی ہندکو بولنے والے تھے اور آج بھی وہی گندھارا کا نام

لیتے ہیں کہ اس کے پرانے باسی ہیں۔

اگر ہم گندھارا کے قدیم علاقے اور خاص طور پر لسانی حوالے سے نقشے کو بغور دیکھیں تو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خالص ہندکو بولنے والے قبیلے جہلم تک دکھائی دیتے ہیں اور یہ تمام کے تمام قبیلے ''آریا'' یا ''جدید پٹھاڑ'' ہیں۔ اسی وجہ سے ۱۹۰۱ء میں وائسرائے ہند کو لارڈ کرزن نے جب صوبہ سرحد کو پنجاب سے جدا کیا تو گندھارا کی سرزمین کو سامنے رکھا جائے جس میں جہلم تک پنجاب کا علاقہ بھی شامل ہے تو ہندکو زبان ہزاروں سالوں سے گندھار اپر حکمرانی کرتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ جو شواہد اس قدیم زبان کے سلسلے میں گندھارا کے قدیم نقشوں کی خاطر ہمیں دستیاب ہوئے ہیں ان مین ہندکو ہی کہ جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اس قسم کے تحقیقی کاموں میں انگریز سب سے آگے ہیں اور بے شک کہ انہوں نے برصغیر پر حکمرانی کرتے ہوئے یہاں کی قدیم تہزیب وتمدن پر بہت کام کیا لیکن افسوس کہ کچھ کام جان بوجھ کر یا پھر احتجاج کے باوجود اُس زمانے کی سایست کی بھینٹ چڑھا ہے۔ بہر حال اب جو گندھارا ہمارے سامنے ہے اس میں بھی ہندکو بولنے والے علاقے موجود ہیں لیکن اگر پورا گندھارا ہوتا تو پھر یقین جانیے کہ نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ گندھارا یونی صوبہ سرحد کے بارے میں ہندوستان کے سیاسی حالات کے مطالعے کی غرض سے انگریزی حکومت نے جو سائمن کمیشن کے نام سے وفد بھیجا تھا اُس نے اس علاقے کی نہ صرف قدامت تسلیم کی تھی بلکہ قدیم گندھارا کی سرزمین کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بھرپور خراج تحسین پیش کیا تھا۔

''شمالی مغربی صوبہ سرحد صرف ہندوستان ہی کہ سرحد نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی سرحد کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں ہندوستان، چین، روس اور افغانستان کی سرحدیں پاکستان سے ملتی ہیں۔ اس لئے عسکری نقطہ نظر سے پوری سلطنت برطانیہ (جو اس وقت نصف دنیا پر پھیلی ہوئی ہے) کے اہم ترین کلیدی مقامات میں سے ایک ہے''۔ دیدوں کے دور سے لیکر آج تک گندھارا کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں رہا ہے۔ قدیم ایام سے ہی روم، مصر، ایران اور چین کی تہذیبیں جب کہ اپنے عروج پر تھیں اور ان تہذیبوں کی عظیم سلطنتیں اگر ایک دوسرے سے رابطے کرتیں تو گندھارا یعنی صوبہ سرحد ہی کے راستے کرتی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان عظیم سلطنتوں اور تہذیبوں کے سنگھم گندھارا کی سرزمین کے ہونے کی وجہ سے ہی گندھارا کی تہذیب نے جنم لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ سب پر چھا گئی کہ اس تہذیب میں دنیا کی ہر تہذیب کی چاشنی محسوس ہوتی تھی۔ ان ممالک کے درمیان تجارتی مال کا لین دین ہوتا ایک دوسرے ملک کی تاریخ تہذیب، ادب، مذہب، عقیدہ اور زبان واقفیت ہوتی یوں صدیوں کے اس میل ملاپ سے گندھارا آرٹ اور وادی سندھ کی تہذیب وجود میں آئی۔

جب ہم گندھارا کا نام لیتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں جو بات آتی ہے وہ بدھ مذہب کا زمانہ ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بدھ راجوں مہاراجہ اشوک اور مہاراجہ کنیشک ہی کے دور میں گندھارا آرٹ اور تہذیب اپنے عروج کو پہنچی۔ اسی لئے ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ گندھارا بدھ مت کا محتاج ہے۔ آرٹ، زبان اور فن کے حوالے سے بدھ مت کے دور ہی میں وہ کچھ ہوا جس نے دنیا بھر میں اسے ایک تہذیب کی حیثیت سے مشہور کیا۔ اس بات میں بھی اشکال پایا جاتا ہے کہ بدھ اس علاقے میں نہیں آیا کیونکہ قدیم تاریخوں میں چودہ بدھ ہو گزرے ہیں اور کئی بدھوں کا گندھارا کی سرزمین پر آنا ثابت ہے۔ بہر حال ہم مان بی لیں کہ مہاتما بدھ نے اس سرزمین کا رخ کبھی نہیں کیا تو بھی یہ فخر گندھارا ہی کو حاصل ہے کہ اس کی سرزمین پر بدھ کا پہلا مجسمہ بنا اور یہیں سے گندھارا کے لافانی آرٹ کی ابتداء ہوتی ہے جو آج بھی پاکستان کے عجائب گھروں کے علاوہ دنیا بھر کے عجائب گھروں میں پھیلا ہوا ہے۔ قبل مسیح اور بعد مسیح میں آنے والے خاص طور پر چینی سیاحوں نے تو یہاں کے ایک ایک شہر میں سینکڑوں بدھ عبادت گاہوں کا تذکرہ کیا ہے جو اپنی جگہ فن اور آرٹ کے نومنہ بھی تھے اور جن سے آج بھی کہیں نہ کہیں دفن شدہ فن پارے برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم تاریخوں سے یہ ثابت ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے بدھ مت اختیار کیا گندھارا ہی کی سرزمین صوابی سے تعلق رکھتا تھا اور یوں دنیا میں بدھ مت کی ابتدا ہوئی۔ ہم بدھ مت کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ زبان ہندکو اگرچہ ویدوں کے عہد یا اس سے بھی پہلے اپنا وجود رکھتی ہے کہ جس اس علاقے کو سرزمین دردستان کہا جاتا تھا اور مختلف ناموں سے گندھارا کی اکثریتی زبان رہی ہے مگر بدھ مت کے عہد میں اس کی پذیرائی یہاں کی دوسری علاقائی زبانوں سے بڑھ کر تھی۔ اصل میں ویدوں کی حکمرانی جب قائم ہوئی تو لسانی لحاظ سے اس کا ضمیر بھی دردستانی زبانوں یا بولیوں سے اٹھا۔ اسی لئے ویدوں میں اُن زبانوں کو زیادہ دخل ہے جو وہاں کی عوامی زبانیں تھیں اور ان میں ہندکو زبان کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ آج بھی ہندکو زبان میں 80 فیصد ایسے الفاظ ہیں جو ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی من وعن یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ رائج ہیں۔

ہندکو اصناف سخن:

ہندکو زبان چونکہ ایک مکمل زبان ہے لہذا اس کا اپنا لوک ورثہ ہے انہی

مخصوص اوزان کی شاعری ہے جو بزرگوں سے سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل سفر کرتی رہی ہے۔ یہاں پر مختصر تعارف کے ساتھ چند اصناف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ٹپہ: ہندکو زبان کی قدیم سخن ہے جس کا مکھڑا ڈیڑھ مصرعے کا ہوتا ہے اور جس کے ڈانڈے رگ وید میں دیئے گئے چندوں سے ملتے ہیں اس کا وزن اگر موسیقی نہ ہو تو تالی سے بھی قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے مکھڑے کا پہلا مصرعہ آدھا ہوتا ہے اور جتنے رکن کا پہلا مصرعہ ہوتا ہے اس کا طاق میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن آج کل کے ٹپوں میں یہ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ ٹپہ قدیم گندھارا کی اکثر پراکرتوں میں تھوڑے بہت فرق سے موجود ہے۔ ٹپے کی ترتیب عموماً تین قسم کی ہوتی ہے بعض یہ صنف تین قسم کے اوزان رکھتی ہے جس میں ہر وزن کو سیلاب کہتے ہیں۔ ٹپے کے ڈیڑھ مصرعے میں ۲۲ سیلابوں یا ارکان ہوتے ہیں۔

چلی دا وے دم مایا
چنگی پہلی جندڑی نوں لا جاندے وے غم مایا

چاربیتہ: چاربیتہ بھی ٹپے کی طرح ہندکو زبان کی قدیم صنف ہے۔ قدیم ویدوں میں بے شمار اوزان کے منت شلوک یا چند ہیں اسی طرح چاربیتہ کے بھی بے شمار اوزان ہیں جواب بھی رائج ہیں۔ ہندکو زبان میں چاربیتہ کا رواج اتنا قدیم ہے کہ بلاخوف وتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ویدوں سے بھی پہلے کی شاعری ہے جس کے اوزان ویدوں میں بھی استعمال کئے گئے۔

چاربیتہ کے مختلف اوزان میں سے ''ملی وزن'' سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ چودہ سیلاب کا ہوتا ہے مگر دوسرا مصرعہ آٹھ سیلاب ہوتا ہے۔ یوں دونوں مصرعے ملا کر مکھڑا ۲۲ سیلاب پر مشتمل ہوتا ہے۔

نتھ اے مچھلی دا تیرے منہ چٹے تے لکدی
تے تُو شہزادی اٹک دی

رڑک: ہندکو زبان کی یہ صنف عموماً لوک گانوں میں بہت استعمال ہوتی ہے۔ شادی بیاہ میں عموماً جوان لڑکے حجروں میں بیٹھ کر پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کسی ایک بات کر پکڑ لیتے ہیں اور پھر بال کی کھال اتارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس بات سے کوئی متعلقہ پہلو نہیں رہتا جس پر بحث نہ کی گئی ہو۔ اچھوتا پہلو پیش کرنے والے کو بڑی داد بھی دی جاتی ہے۔ اس طرح لڑکیوں میں بھی مقابلے ہوتے ہیں اور ان کے لحاظ سے اس کا مجموعہ پندرہ سیلاب کا ہوتا ہے جن میں سے دو سیلاب کا پہلا مصرعہ اور تیرہ سیلاب کا دوسرا مصرعہ ہوتا ہے۔

مہندی

میں مہمان نتانڑ ارب جانڑ دیے کج نہیں کہندی

لٹولا یا ڈھولا: ہندکو کی قدیم اصناف میں ایک ''ڈھولا'' ہے جس کی بنیاد قدیم عہد کی ایک ہندکو لوک کہانی ''لٹولاں باشہ ذاری'' ٹپے کہ جس کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان کے آثار قدیمہ ''کافر کوٹ'' سے بتایا جاتا ہے۔ لٹولا کا سارا مکھڑا ۳۲۱ سیلاب کا ہوتا ہے۔ پہلا اور تیسرا مصرعہ ۹۔۹ سیلاب کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ۷۔۷ سیلاب کا ہوتا ہے۔ البتہ صوتی لحاظ سے الفاظ کے وزن میں تبدیلی ہوسکتا ہے۔ جو لہجے سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے پوری بھی کرلی جاتی ہے۔

جندڑی گل دی گل گئی اوے
صبر دی دیگ تلے
چکڑ دی اک بل گئی اوے
صبر دی دیگ تلے

ابیتی: ہندکو کی اس صنف میں آپبتی بیان کی جاتی ہے۔ آپبتی کا مکھڑا ڈیڑھ مصرعے سے ترتیب دیا جاتا ہے مگر شمار ایک ہی ہوتا ہے۔ مصرعے کے آخر میں شروع کے الفاظ لگانے سے شاعری پر ایک پابندی ضرور ہوتی ہے کہ نفس مضمون کا تقاضا پورا کرے۔ اس صنف میں بعض اوقات مکھڑے کو ڈیڑھ سمجھ کر ایک کے اوزان میں انتر الکھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں مکمل انتر اڈھائی مصرعوں کا ہوتا ہے۔

شہزادی سنڑ یے اج پیار دے شہزادے دی کہاڑی۔ شہزادی سنڑ یے
عشق نگر دی ملک راڑی نالے راجے دی کہاڑی۔ شہزادی سنڑ یے

مستا یا مستہ: مستا کی صنف بہاریہ مضامین زیادہ تر ترتیب سیکے جاتے ہیں۔ خاص طور پر فصل کے پکنے کا گیت ہے مگر اس کی طرز، بول اور خاص قسم کا وزن پر غور کیا جائے تو مستا خوشی کے ہر موضوع پر گایا جاسکتا ہے۔

اساتذہ نے اس کے مکھڑے کو ۹۔۹ سیلابوں کے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ اس کا آخری مصرعہ اگرچہ سیلابوں کے لحاظ سے تو ہم وزن ہے مگر قافیہ اور بعض اوقات ردیف میں بھی علیحدہ ہوتا ہے۔ انتر ۱۹ یا ۱۸ یا ۲۷ سیلابوں کا بھی ہوسکتا ہے۔ مستا کا مکھڑا یوں ہے۔

اوآئیاں مست بہاراں

نکھن ہو کے پیلاں پاواں
اوآوے یا میں جاواں
جاواں کہ نہ جاواں ہو

سٹھنڑی: سٹھنڑی ہندکو کی واحد صنف ہے جس کا تعلق صرف اور صرف مستورات سے ہے۔ یہ قدیم ترین اصناف سخن میں سے ہے۔ سٹھنڑی کی بہت سی بحریں ہیں مگر عام طور پر جو استعمال ہوتی ہیں ان میں پہلی بحر ۵۶ سیلابوں پر مشتمل ہے۔ ان ۵۶ سیلابوں کو چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں مخاطب کا نام ٹانک دیا جاتا ہے اور پھر جو بُرا کہنا ہوتا ہے آخری دو مصرعوں میں کہا جاتا ہے۔ دوسری بحر ۳۶ سیلابوں کی ہوتی ہے جسے تین برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کا مکھڑا بھی تین مصرعوں کا ہوتا ہے۔ پہلی بحر میں انترے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔

جوگا یا بوگا: ہندکو کی اس صنف میں شادی بیاہ کے گیت اور غمی کے موقعہ پر بین وغیرہ منظوم کئے جاتے ہیں۔ یہ صنف موسیقی کے لحاظ سے صرف تال کی محتاج ہوتی ہے۔ جو عام طور پر لکڑی کے ڈنڈے اور لوہے کے بنے ہوئے کڑوں پر ٹکرا کر پیدا کی جاتی ہے۔ اس میں بعض اوقات لمبے لمبے رومانی قصے بھی گائے جاتے ہیں۔ اس کی بحر اور فارسی میں رائج مسدس بحر سے ملتی جلتی ہے۔ اسی لئے موجودہ جوگا چھ مصرعوں کا بنا دیا گیا ہے مگر جوگا مصرعوں سے زیادہ اور کم کا بھی ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ یہ مردانہ طرز ہے اور عام طور پر حجروں میں گائی جاتی ہیں۔

لومہربانو! قصہ سنڑو بختہ ورے دا　　پشوردی ترتی سی ذرا پرے پرے دا
پرشو پورانو اس دخت کہندے آئے　　گندھارا دے اس دل وچ عجب لوک رہندے آئے۔۔۔
اُچے لمے چھدارنے بھشیار آئے لوک
شہ زور، محنتی وفادار آئے لوک

دوہڑا: اس صنف کو گاتے ہوئے کسی ساز کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اب اسے ساز پر بھی گایا جاتا ہے۔ دوھڑے میں صرف غمگین حالات ہی کی عکاسی ہوتی ہے مگر بنیادی طور پر اس میں نا اُمیدی کے ساتھ اُمید اور مایوسی کے ساتھ دلاسے کے مضامین کا بھی تعلق ہے۔ عام طور پر اس کے ۲۴ یا ۳۶ سیلاب ہوتے ہیں۔ یہ کبھی دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی چار پر مگر اس سے زیادہ کبھی نہیں ہوتا۔

گونڑ: لفظ ''گونڑ'' ہمارے ہاں دو معنی استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنی یہ کہ ہندکو زبان میں جو چیز بھی گائی جائے اسے مضموعی طور پر گونڑ کہتے ہیں اور دوسرے معنی میں باقاعدہ ایک صنف کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ یہ صنف ہندکو زبان میں کوئی زیادہ زیادہ قدیم نہیں مگر پھر بھی کم از کم اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب کہ برصغیر میں ہندی نے رواج پکڑا کیونکہ اس صنف کی بناوٹ میں گیت کو۔۔۔۔؟

للو۔ لوری۔ اللہ ہو: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس صنف کا تعلق بچے کو سلانے سے ہے۔ لوری یا للو کے ہندکو زبان میں ۱۰۔۱۰ سیلاب کے مکھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ہندکو زبان کی قدیم کہانیوں میں جو لوریاں سننے میں آتی ہیں اُن کا پہلا مصرعہ ۲۰ سیلاب کا اور دوسرا مصرعہ ۱۰ سیلاب کا ہوتا ہے۔ یوں پورا مکھڑا ۳۰ سیلاب کا ہوا۔ بعض اوقات یہ سیلاب بڑھ بھی جاتے ہیں اسی طرح لوری کا انترا بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اپنی مخصوص اور قدیم دھن سے کچھ بھی باہر نہیں نکلتا۔ یہ لوری کا فن ہے جو اس پر عبور رکھے وہی ہندکو لوری گا سکتا ہے۔

حرفی: ہندکو زبان کی اصناف سخن میں ادبی حیثیت سے چار بیتے کے بعد اگر کوئی دوسری صنف عوام کو چونکاتی ہے وہ حرفی ہے۔ چار بیتے کے مقابلے میں حرفی کی عمر بہت ہی کم ہے مگر حرفی کو ایسے اساتذہ ملے جنہوں نے حرفی کو چار چاند لگا دیئے۔ حرفی میں کل چار مصرعے ہوتے ہیں اور سیلابوں کے حوالے سے اساتذہ حرفی کے ہر مصرعے کو ۲۲ سیلاب بتاتے ہیں۔ یعنی مجموعی طور پر حرفی ۸۸ سیلابوں پر مشتمل ہے۔ بعض اساتذہ ۲۲ کی بجائے ۱۱ بھرے ہوئے سیلاب کا یہ مصرعہ بتاتے ہیں جن سے مجموعی طور پر حرفی ۴۴ سیلابوں کی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حرفی ہمارے اردو فارسی اوزان پر بھی پوری اترتی ہے اور باقاعدہ ایک فارسی بحر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حرفی پیش کی جاتی ہے۔

حرفی دے تختہ نرز اُتے نُہرے عقد ثریا دے جوڑ سکناں
بلکہ سد سکندر دے فاصلوں تکّ ایڑے عقل سے کٹورے نوں توڑ سکناں
جے دیکھاں سنار دا سانڑا دے چٹ کھڑ کے پنجہ مڑوڑ سکناں
عبداللہ تیں دے تیں اس خبیس دے دند بدے شاعر خبیث دے تور سکناں

بعض لوگ ''بارہ ماہ'' کو بھی ہندکو کی عمدہ صنف گردانتے ہیں۔ مگر یہ

غلط ہے بارہ ماہ ایک مضمون ہے جو قدیم گندھارا کی اکثر صنفوں میں پیش ہو سکتا ہے۔ اب ہندکو میں اردو، فارسی کی غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مثلث، مخمس، گیت، آزاد نظم کے علاوہ ہائیکو کا بھی رواج ہوتا جا رہا ہے۔

ہندکو کے چند قدیم شعرا

استاد رحمت خان: پیدائش موضع شیدو ضلع نوشہرہ۔ چاربیتہ کے شاعر تھے۔ ہندکو پشتو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ہندکو کو پشتو ملے ہوئے بھی چاربیتے لکھتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں پشاور آئے اور وہیں رہ گئے۔ موضع ڈھیر کوٹلہ محسن خان میں ۱۶۸۰ میں وفات پائی۔

استاد محمد دین مائیو: پشاور کے رہنے والے تھے ۱۵۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ چاربیتے کے شاعر تھے اور بڑے درویش طبیعت تھے۔ ایک دو سال کی عمر پائی، ۱۶۵۶ء میں وفات پائی۔

استاد ارشاد خان شادا: آباؤ اجداد کا تعلق کوہستان سے تھا۔ استاد شادا کے کلام میں پشتو کے الفاظ بھی ملتے ہیں اس لئے کہ کوہستانی ہندکو میں بھی ایسا ہی ہے۔ استاد شادہ کے والد کوہستان سے مردان آئے ۱۷۶۲ء میں مردان ہی میں استاد شادا پیدا ہوئے او سید احمد شہید بریلوی کی قیادت میں بالاوٹ ہزارہ میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ سال شہادت ۱۸۳۱ء ہے۔

استاد بابا وجیہ: کانی گرام وزیرستان کے رہنے والے تھے۔ بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ ہندکو پشتو میں لکھتے تھے۔ بایزید انصاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ساری عمر مغلوں کے خلاف لڑتے رہے۔ ۱۵۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸۱ء میں وفات پائی۔

استاد فردوس خان فردوسی: پشاور کے رہنے والے تھے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی البتہ تاریخ وفات ان کی قبر کی نوح پر ۱۲۲۴ء ہجری لکھی ہوئی ہے۔ چاربیتہ کے شاعر تھے۔

استاد رجب حق: پشاور میں ۱۷۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ تصوف کے شاعر چار بیتہ اور حرفی کہتے تھے۔ صاحب گدی تھے۔ بے شمار مریدین تھے۔ ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

اُستاد نامور: استاد نامور ۱۷۵۰ء میں پشاور ہی میں پیدا ہوئے۔ پہلوانی اور شاعری کرتے تھے۔ چاربیتہ اور حرفی کہتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔

استاد حاجی گل: پشاور موضع چمکنی کے رہنے والے تھے۔ چاربیتہ کے شاعر تھے۔ ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔

سخن نمانڑا: نوشہرہ کے رہنے والے تھے۔ ملاحی پیشہ تھا۔ چاربیتہ بہت خوب کہتے تھے۔ ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۰ء کو نوشہرہ ہی میں وفات پائی۔

استاد شیر باز خٹک: موضع اکوڑہ خٹک کے رہنے والے تھے، ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اکوڑے کے قبرستان میں اُن کا مقبرہ موجود ہے۔ ۱۸۴۰ء میں فوت ہوئے۔

استاد مرزا عبدلغنی: پیدائش ۱۷۸۰ء ہے۔ چاربیتہ سے ہٹ کر بھی لکھتے تھے۔ فارسی زبان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کا کلام قوال گایا بھی کرتے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔

استاد محمد شفیق متین: ۱۷۹۰ء پشاور میں پیدا ہوئے۔ حرفی کے شاعر تھے۔ بے شمار شاگرد بھی تھے جن میں سے استاد میرا نے بڑا نام پیدا کیا۔ ۱۸۸۴ء میں وفات پائی۔

استاد نظیر احمد ردا: قدیم ہندکو شاعری کے چند ستونوں میں سے ایک حرفی چاربیتہ اور کوڑ کے شاعر ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۷ء کو پشاور میں وفات پائی۔

استاد غلام محمد گاموں: جہانگیر کے رہنے والے تھے۔ آخری عمر پشاور میں گزاری۔ حرفی کے شاعر تھے۔ جہانگیر میں ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۳ء میں پشاور میں وفات پائی۔

استاد رمضان علی رمضو: پیدائش ۱۸۰۵ء پشاور ۱۸۲۵ء سے ہوش سنبھالتے ہی شاعری شروع کی حرفی کے بے بدل شاعر تھے۔ ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔

استاد محمد مستقیم مچھی: پشاور کے موضع ڈھیری باغبان کے رہنے والے تھے۔ کہنا سنگھ کے۔۔۔؟ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ چاربیتہ بڑا اچھا کہتے تھے۔ ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے۔

استاد امام دین ہزاروی: ہری پور ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ موضع تھوکر

میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ تصوف کے شاعر تھے۔ بے شمار چاربیتے لکھے ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔

استاد شیر غلام: اس علاقے کے بڑے مشہور پہلوان تھے۔ پنجاب اور سندھ تک جا کر کشتیاں لڑتے تھے۔ ۱۸۳۶ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ چاربیتہ کے اچھے شاعر تھے۔ ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔

استاد غلام علی ملی: ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ڈھیری باغباناں کے رہنے والے تھے۔ چاربیتہ اور حرفی کے شاعر تھے۔ استاد بچھی کے شاگرد تھے۔ بڑا نام کمایا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔

استاد احمد علی سائیں: ۱۸۴۲ء پشاور میں پیدا ہوئے۔ صوبہ سرحد کے علاوہ پنجاب میں بھی بڑے مقبول تھے۔ بے شمار شاگرد پشاور کے علاوہ پنجاب میں بھی ہیں۔ حرفی کے بے بدل شاعر تھے۔ اسی وجہ سے حضرت علامہ اقبال نے لاہور کے ایک مشاعرے میں آپ کو ''غالب ہندکو'' فرمایا تھا۔ زیادہ عمر راولپنڈی میں گزاری۔ ۱۹۳۷ء کو پشاور میں فوت ہوئے۔

ہندکو زبان و ادب میں اوج کمال حاصل کرنے والے استاد احمد علی سائیں نے اپنی ہندکو شاعری کے ذریعے بڑے فلسفیانہ اور عالمانہ مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ ان کے ہندکو شاعری کے ذریعے ہندکو زبان کو جو بلندی اور ارتقاء حاصل ہوا ہے اس کے لئے آنے والی ہندکو دان نسلیں اپنی زبان و ادب پر ہمیشہ فخر کرتی رہیں گی۔ استاد احمد علی سائیں کی ہندکو ایک شفاف و شستہ زبان کی نشاندہی کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندکو زبان کو جس خالص اور غیر آمیزش شدہ زبان کے طور پر پیش کیا ہے اس سے ہندکو زبان کی اپنی طاقت اور توانائی اور شستگی و ملائمت اور اس کی روانی و فراوانی کا غلبہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

احمد علی سائیں کا عہد 1842ء سے لے کر 1939ء کا ہے۔ ان کو ہندکو زبان ادب کا غالب تصور کیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندکو کے بے شمار محاوروں سے ہندکو شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔

استاد احمد علی سائیں کا ہندکو کا کلام یگانہ و منفرد مقام رکھنے والے صوفیاء کے کلام کے ہم پلہ نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انہیں صوفی شعراء کی فہرست میں بخوبی شامل کیا جا سکتا ہے۔

استاد احمد علی سائیں کے اساتذہ میں استاد رمضان علی رمضو کا مقام اس لئے نمایاں ہے کہ استاد احمد علی سائیں نے اپنے کلام میں استاد رمضو کی حرفیوں کے بے مثال و منفرد ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ مصرعہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

سائیں رمضو استاد دی حرفی تو صدقے کراں میں اپڑا سب دیوان

ترجمہ: میں اپنے استاد رمضو کی ایک حرفی پر اپنا سارا دیوان قربان کر دوں۔

چونکہ ہندکو شاعری کے حوالے سے ان کا مقام ایک بلند و بالا شاعر کی حیثیت سے ہے اور یہ زمانے کا دستور رہا ہے کہ اس کے عہد کے دیگر شعراء ایسی شخصیت کو تنقید و تنقیص کا نشانہ بنانے سے باز نہیں رہتے ہیں۔ جیسا کہ مختار علی نیر نے اپنی کتاب ''تاریخ زبان ادب ہندکو'' میں اس طرف نہ صرف اشارہ کیا ہے بلکہ بڑی وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ اپنے دور کے دوسرے شعراء جوان پر اس طرح تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس طرح غالب کے دور میں مرزا غالب پر تنقید ہوا کرتی تھی سائیں بھی مرزا غالب کی طرح اپنے ادبی دشمنوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور جو لوگ ان کے کلام کا کھوج لگاتے ان پر بے جا تنقید کرتے ہیں۔ انہیں جتانا چاہتے ہیں کہ میں ابھی زندہ ہوں اور جواب دینے کی سکت رکھتا ہوں۔

میں تا کھوجیاں دابی استاد ہیواں تو اے سمجھے سمجھدار ٹورئیں میں
سائیں زندہ دل زنگی رکھناواں دنیا جانڑدی اے زندہ درگورئیں میں

ترجمہ: میں اپنی کھوج لگانے والوں کا بھی استاد ہوں تو سمجھتا ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھتا میں سائیں زندہ دلوں کی سی زندگی گزارتا ہوں ساری دنیا جانتی ہے کہ میں ابھی مرا نہیں جو جس کا دل چاہے کہہ دے۔

استاد سردار خان بردا: پشاور کے شہر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ حرفی کے اساتذہ میں سے تھے۔ احمد علی سائیں کی طرح استاد بردا بھی پنجاب میں مقبول تھے۔ ۱۹۴۷ء میں وفات پائی۔

استاد محمد سرور سرور: ۱۸۴۵ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ حرفی کے شاعر تھے۔ خوب حرفی کہتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔

استاد فضل احمد: ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ چاربیتہ اور حرفی کے شاعر تھے۔ اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔

مضمر تاتاری: پشاور شہر کے اعلیٰ خداداد صلاحیتوں کے مالک ہندکو کے نامور شاعر کی حیثیت سے پہچان رکھنے والے سادہ پوش اور عجز و انکساری کی خو بو رکھنے

ایک قبائلی بزرگ کھجور کے پتوں کی بان (رسی) بناتے ہوئے

Sehr Jalani

ایک دستکار خاتون ٹوکریاں بنا رہی ہے

Sehr Jalani

پشاور کے شہنائی نواز

Kashif Zaman

پٹھان بچے گھوڑا لڑی کھیلتے ہوئے

روایتی قہوے اور روٹی کے ساتھ گپ شپ

پشاور شہر کے فٹ پاتھ ریسٹورنٹ

سرحد کا معروف باب خیبر

پاک افغان سرحد طورخم ۲۰۰۶ء

Sadiq

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین (پشتو اکیڈمی، پشاور)

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی خٹک (پشتو اکیڈمی، پشاور)

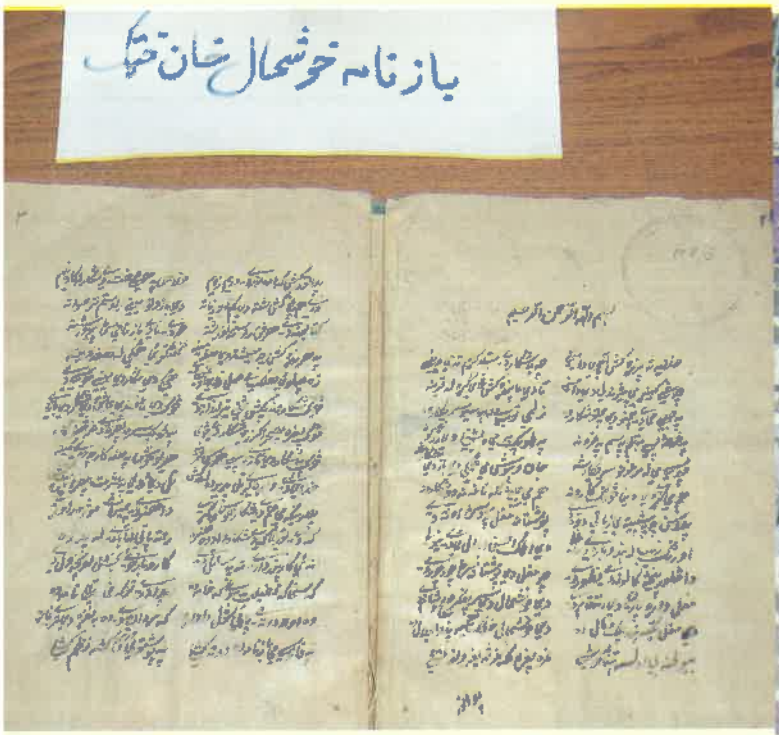

پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی میں محفوظ
خوشحال خان خٹک کے بازنامے کا نادر قلمی نسخہ

پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی میں محفوظ دیوان سکندر خان خٹک
اور دیوان مصری خان لگیانی کے نادر قلمی نسخے

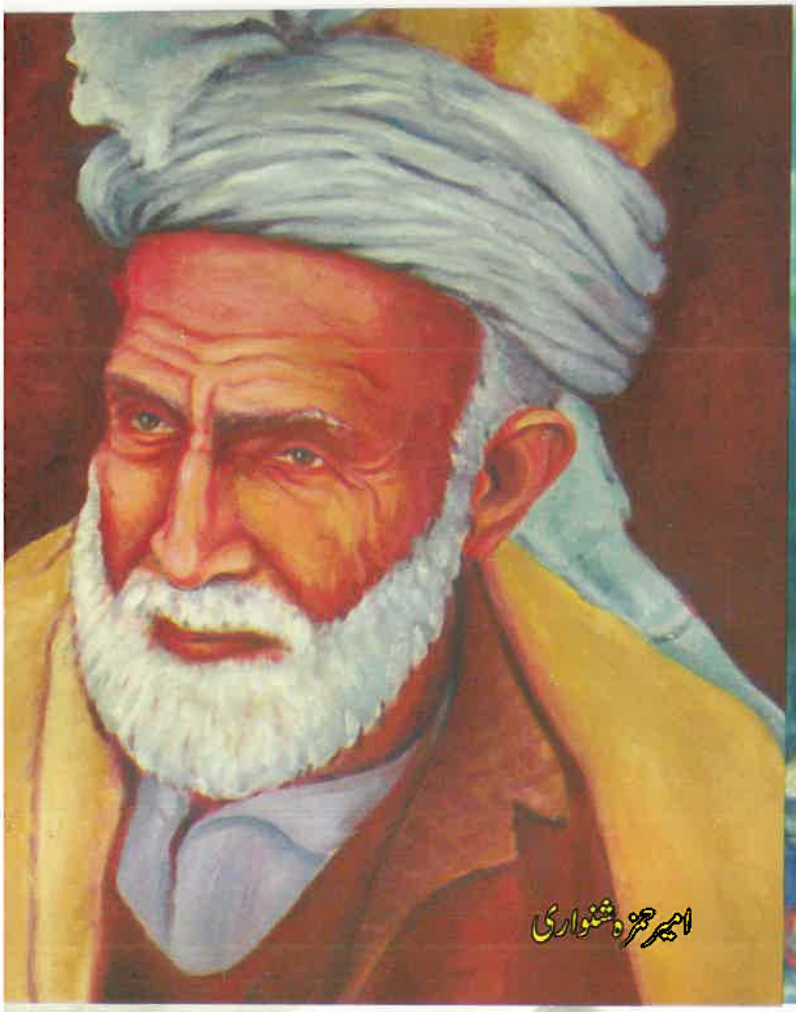

امیر حمزہ شنواری

خوشحال خان خٹک

ملتان خان آفریدی

Pushto Academy

لوک گلوکارہ زرسانگا

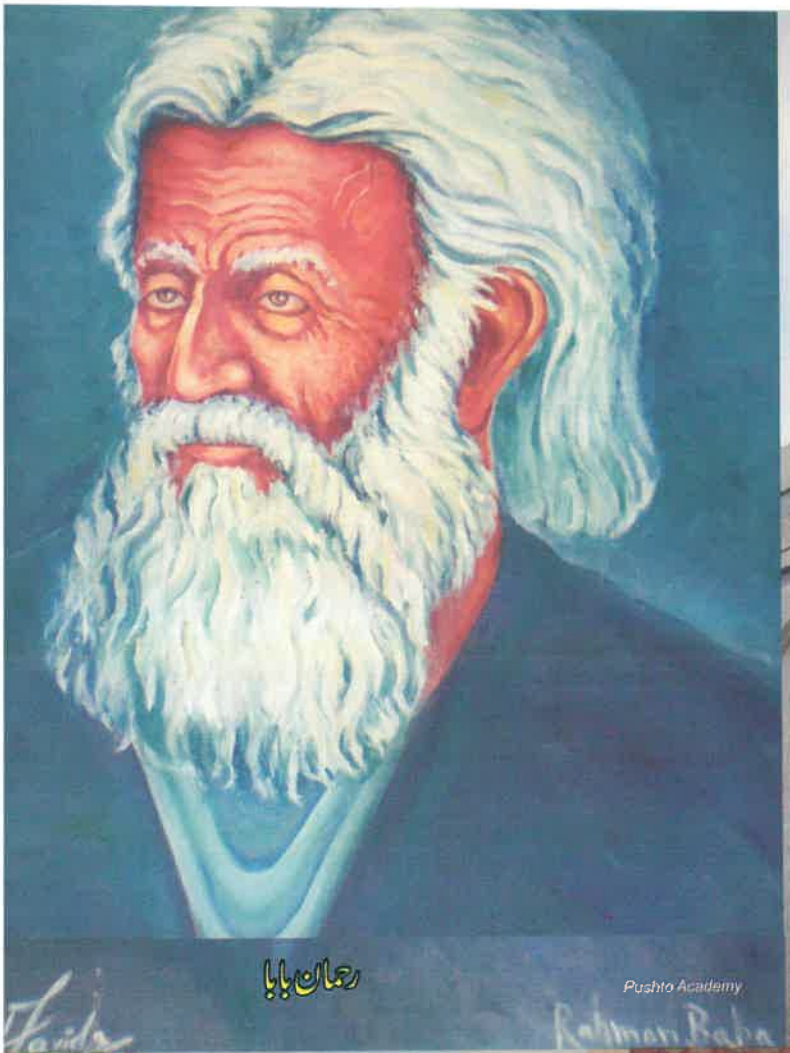

رحمان بابا

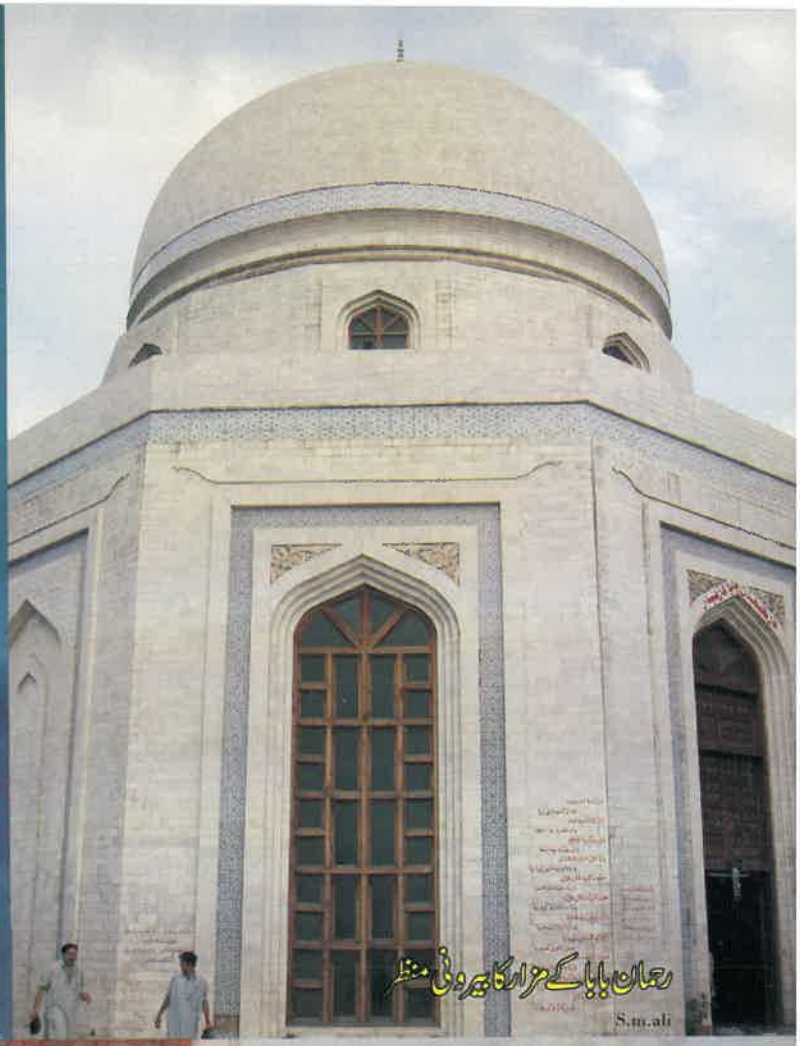

رحمان بابا کے مزار کا بیرونی منظر

S.m.ali

رحمان بابا کے مزار کا اندرونی منظر

S.m.ali

پشاور کے تاریخی اسلامیہ کالج کے دو مناظر

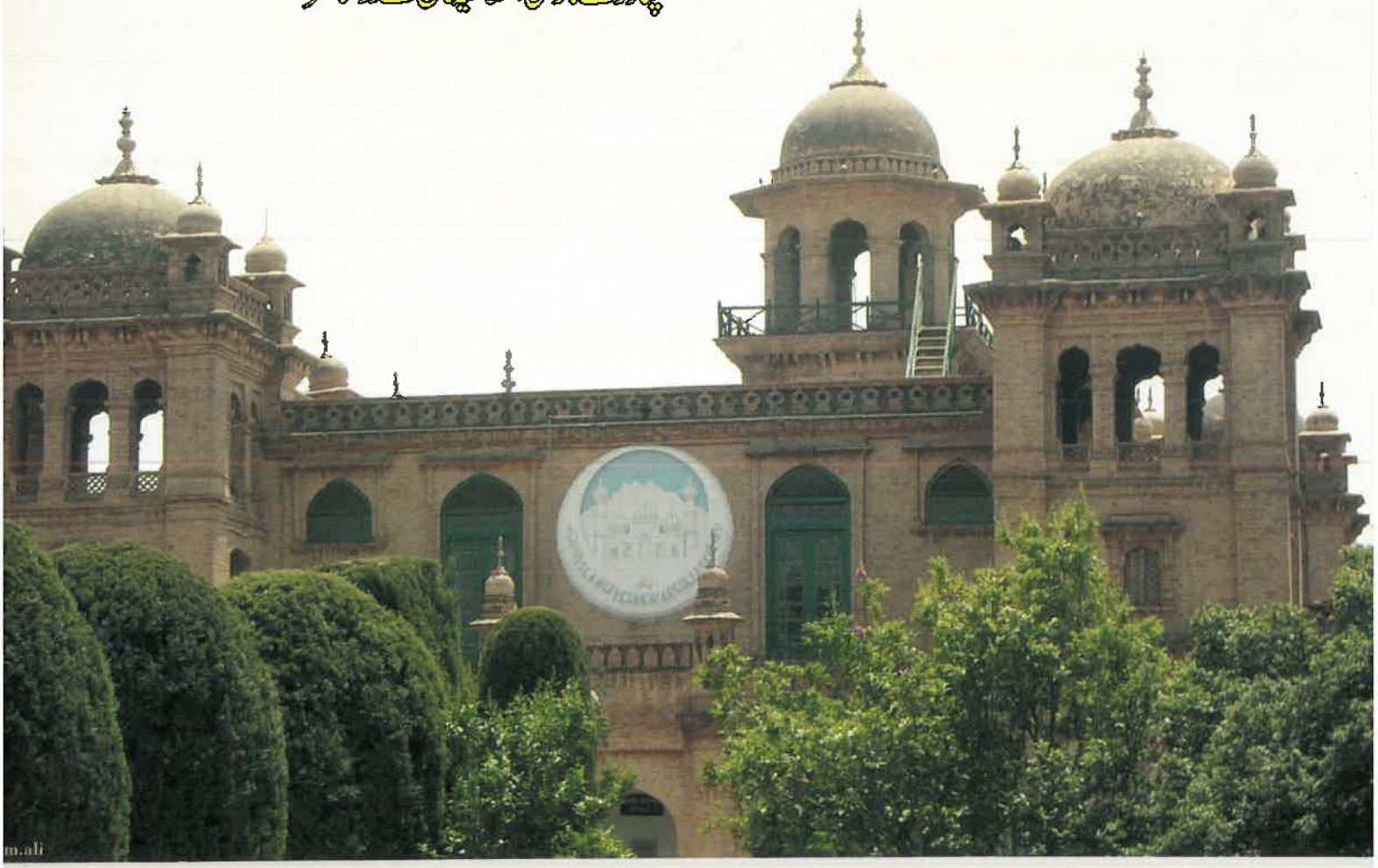

پشاور شہر میں معروف تاریخی کھنڈرات گورگٹھڑی کا صدر دروازہ اور اندرونی منظر

قبائلی جرگے کا ایک انداز

Mohn Sultan

قبائلی بزرگ اپنے گھر کے باہر بیٹھے ہیں

Mohn Sultan

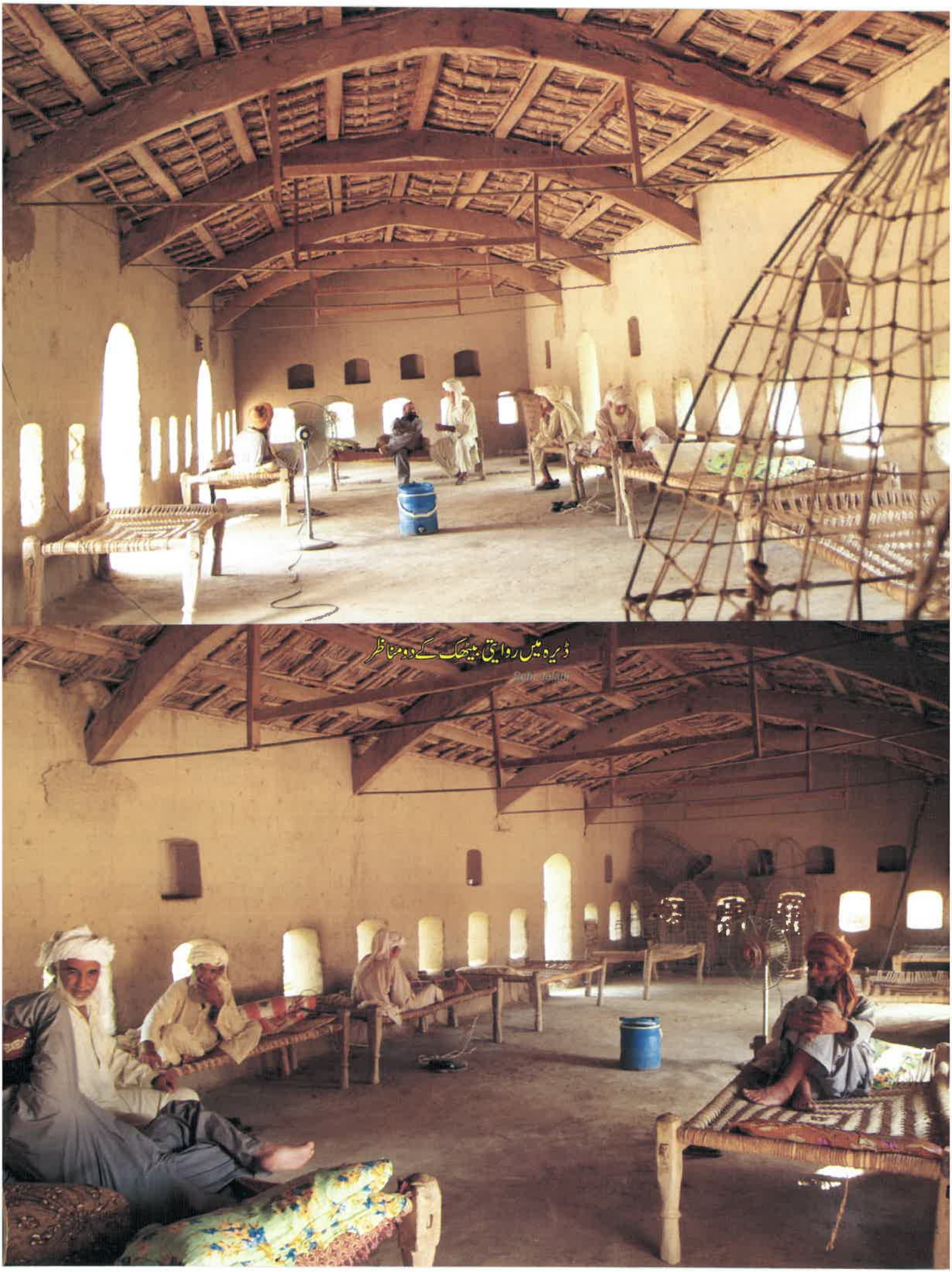

ڈیرہ میں روایتی بیٹھک کے دو مناظر

Sahir Jalali

پشاور کے ایک بازار میں فٹ پاتھ پر روایتی لسی فروش

S.m.ali

پشاور کے ایک بازار میں فٹ پاتھ پر روایتی گوشت کا ایک خاص پکوان فروش

قصہ خوانی بازار میں مٹھائی کی معروف دوکان

قصہ خوانی بازار پشاور میں روایتی قہوہ خانے کے مناظر

S.m.ali

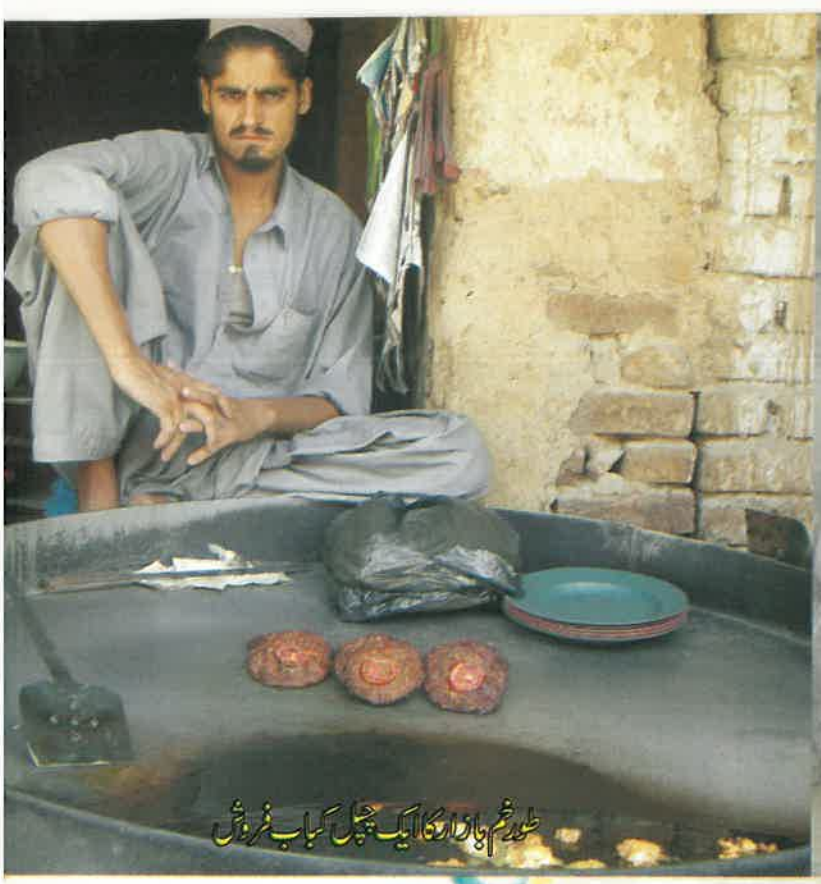

طور خم بازار کا ایک چپل کباب فروش

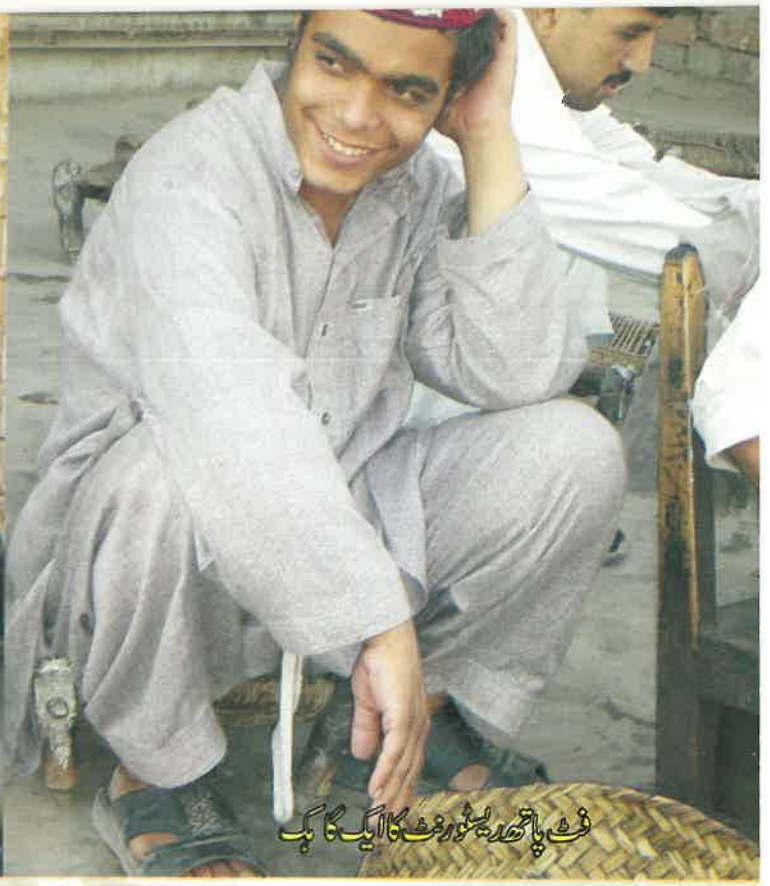

فٹ پاتھ ریسٹورنٹ کا ایک گاہک

چلتا پھرتا قہوہ فروش

S.Arif Ali

پشاوری براس کا کام دنیا بھر میں مشہور ہے

چترالی پٹی کی روایتی واسکٹ اور ٹوپیاں بنانے والا

روایتی انداز سے سجا ہوا ٹرک

شہنائی نواز

Hina

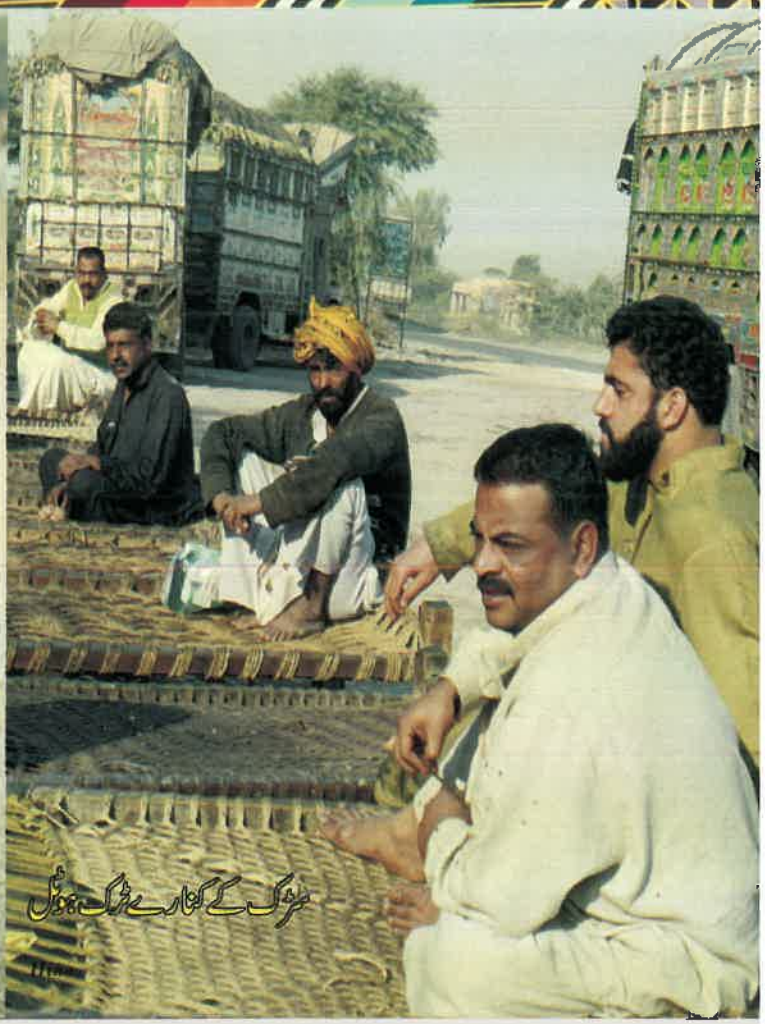

سڑک کے کنارے ٹرک ہوٹل

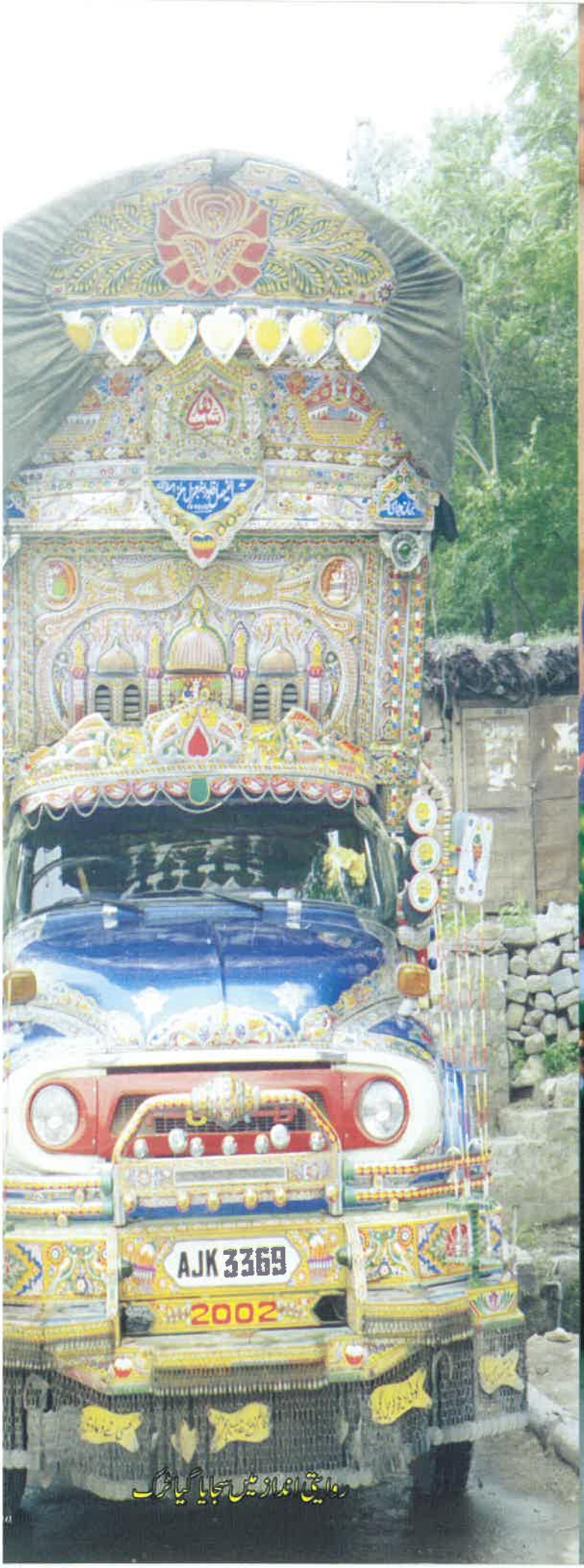

روایتی انداز میں سجایا گیا ٹرک

پٹھان بچی

Hina

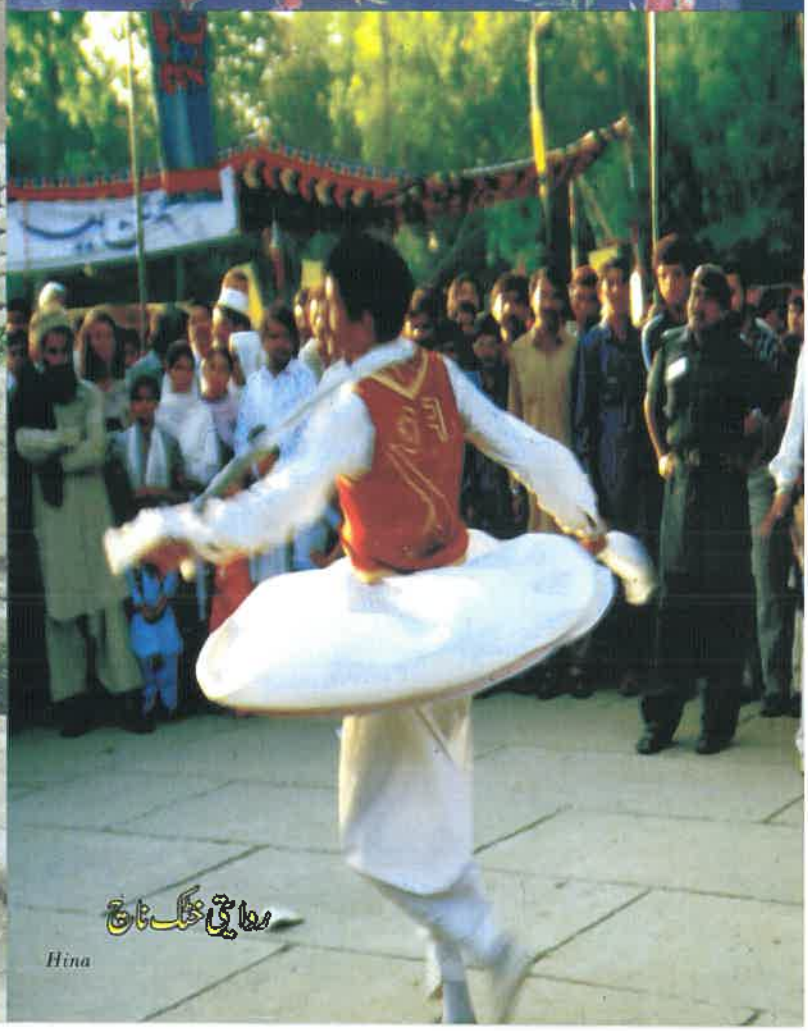

روایتی خٹک ناچ

Hina

خٹک ڈانس کے دو مناظر

Jalani

Bushra Hamid

وادی کالام کے محنت کش

Dilshad Muhammad

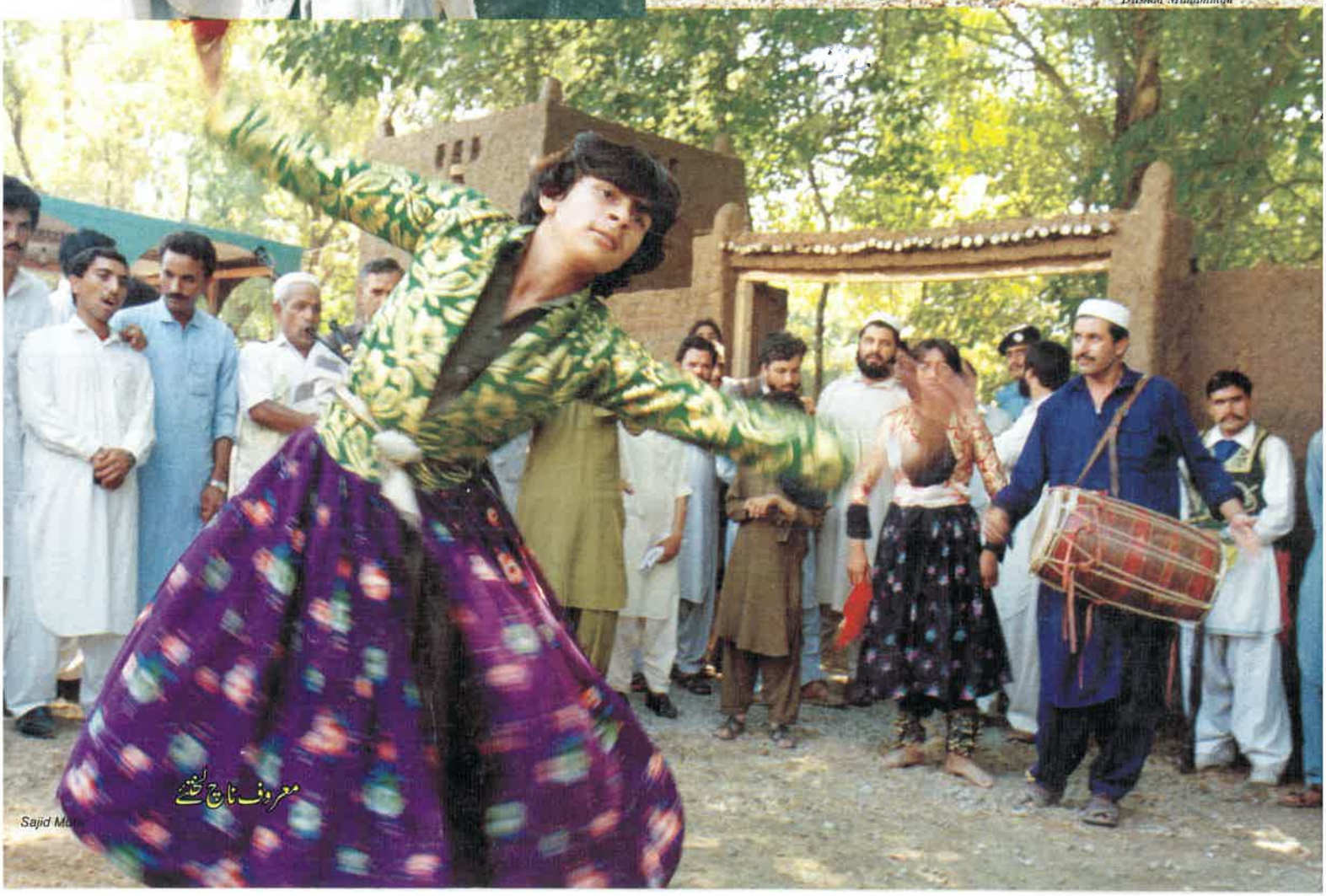

معروف ناچ لنگے

Sajid Ma

والے شاعر بے بدل تھے۔ آپ ایک خوددار، خود شناس ہندکو شاعر تھے۔ ہمعصر شعراء میں قابل احترام حیثیت سے زندہ رہے۔ ساری عمر معاشی کسمپرسی میں گزاری۔ چھوٹے قد کے حامل ہندکو کے غزل گو شاعر تھے۔ ان کا کلام ان کے اندرونی اور باطنی احساسات و جذبات کا عکاس ہوتا تھا۔ پشاور کے بہت سے نامور لوگ ان کے اب تک مداح ہیں۔ اگرچہ ان کی مروجہ تعلیمی حیثیت کا معیار بہت سے ہمعصر شعراء میں ممتاز درجے کا نہیں تھا مگر اس کے باوجود خداداد صلاحیتوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ایسے ایسے مسجع الفاظ کا استعمال کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے صاحب علم و ہنر بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا مقام و مرتبہ اعلیٰ پائے کے شعراء سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

آغا محمد جوش مرحوم: ہندکو شعراء میں آغا محمد جوش کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہندکو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے اور ہندکو شاعری کرنے والے انہیں اساتذہ کے درجے میں شامل کرتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے آغا محمد جوش پشاور کے پکھی گرسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساری عمر رزق حلال کی تمنا کی اور محنت مزدوری کر کے اپنی معاشی ضرورتوں کو پورا کیا اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کا کلام نہایت پختہ اور زود اثر سمجھا گیا ہے۔ ہندکو میں ان کی شاعری کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

غلام رسول گھائل: غلام رسول گھائل ہندکو کے اساتذہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بہت سے شاگرد ہیں جو کہ اپنے کلام میں ان سے اصلاح لیتے تھے۔ تعلیمی لحاظ سے اعلیٰ تعلیمی درجہ نہیں رکھتے تھے مگر کلام کی خوبصورتی میں انہیں لوگ ممتاز حیثیت کے مقام پر رکھتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے غلام رسول گھائل ترکھان تھے اور فارغ اوقات میں اساتذہ کی صحبت نشینی میں رہتے تھے۔ ان کے کلام میں انفرادیت اور حسن و خوبی بدرجہ کمال نظر آتی ہے۔ آپ یقیناً ایک قادر الکلام شاعر تھے اور آنے والے ہندکو دان شعراء کے لئے بہت سے خوبصورت اشعار چھوڑ گئے ہیں۔ ہندکو مشاعروں میں باقاعدگی کے ساتھ حصہ لیتے تھے اور سامعین سے داد تحسین وصول کرتے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے منعقدہ مشاعروں میں انہیں اساتذہ کا درجہ حاصل ہوتا تھا۔

خادم حسین کربلائی: خادم حسین کربلائی چٹے ان پڑھ ہندکو شاعر تھے مگر اللہ کی طرف سے انہیں ایسی خداداد صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں کہ ان کے بل بوتے پر یہ نہایت پرمغز ہندکو شاعری کرتے تھے۔ نہایت ہی سادہ پوش ملنگ طبع انسان تھے۔ پشاور کے جہانگیرہ پورہ بازار میں کباڑ کی دکان تھی جہاں اکثر نامور اور اساتذہ شعراء کا جمگھٹا رہتا تھا۔ صبح ہی سے شعراء یہاں آنا شروع ہو جاتے تھے۔ پشاوری قہوہ چلتا رہتا تھا اور شعروں کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ ناصر علی ناصر اور استاد غلام رسول گھائل جیسے نامور شعراء کے علاوہ متعدد ہمعصر شعراء یہاں پر آتے اور اپنے تازہ کلام پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ خادم حسین کربلائی کے ساتھ نامور شعراء نے شامیں بھی منائی ہیں۔ ان کے کلام میں جو خوبصورتی اور انفرادیت تھی یہ سب خداداد صلاحیتوں سے جڑی ہوئی تھی۔ افسوس کہ ان کے کلام کو جمع نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ان کا نام ہندکو شاعری کے حوالے سے تو زندہ ہے مگر کلام ناپید ہے۔ تاہم ریڈیو پاکستان اور پی۔ٹی۔وی میں منعقدہ مشاعروں میں یہ حصہ لیتے تھے۔

ضیاء الدین: ضیاء الدین ایک ایسے جواں سال ہندکو زبان سے والہانہ محبت و پیار رکھنے والے ہیں جو نہ صرف قول کی حد تک اپنی مادری اور علاقائی ہندکو زبان سے محبت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ عملاً بھی بڑھ چڑھ کر اس کے ارتقاء کے لئے خدمت پر مامور ہیں۔ ضیاء صاحب گندھارا ہندکو بورڈ کے جنرل سیکرٹری ہیں اور اس بورڈ کے ذریعے ہندکو زبان کی صوبے میں ترویج و ترقی کے لئے شب و روز محنت و مشقت میں مصروف ہیں۔

ضیاء الدین کی ہندکو میں مرتب کردہ کتاب ''پیر سائیں'' ایک بہت بڑی قلمی کاوش سمجھی جاتی ہے جبکہ ان کی دوسری ہندکو زبان میں لکھی ہوئی کتاب ''ہندکو دا مقدمہ'' ہے۔ ہندکو زبان میں خود بھی شاعری کرتے ہیں اور ہندکو کے شعراء کے مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ ہندکو میں ان کی شاعری بڑی پختہ اور فہم و ادراک سے بھرپور ہے۔

استاد سائیں غلام دین ہزاروی: چاربیتہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ زیادہ تر مذہبی شاعری کرتے تھے۔ ہزارہ کیا یک ہندکو گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ تصوف کے بھی استاد تھے۔ ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

استاد میر احمد مٹھو: آباؤ اجداد کشمیر سے آئے اور پشاور میں مقیم ہو گئے۔ یہیں پر استاد میر احمد مٹھو چار بیتے کہتے تھے۔ ۱۹۳۲ء پشاور میں وفات پائی۔

مختار علی نیئر: آپ نے ہندکو زبان و ادب کے بارے میں بے مثال اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ عمر کے سن رسیدہ مرحلے میں بھی ہندکو زبان و ادب سے متعلق توانا خدمت میں مصروف ہیں۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں ہندکو کو اہم مقام

دلوانے میں چند تاریخی اقدامات سرانجام دیئے ہیں اور یوں جبکہ ہندکو بولنے والے مقامی لوگ اپنی زبان کے موروثی رشتے سے جدا ہونے لگے تھے تو انہوں نے ہندکو بولنے والوں کو فخر و انبساط کا احساس دیا اور اپنی زبان کی قدر و قیمت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے قلم آرائی کر کے ہندکو ادب کو چار چاند لگا دیئے۔ مختار علی نیئر نے عمر کا بیشتر حصہ اپنی زبان کے حوالے سے صرف کیا اور متعدد کتابیں تصنیف کیں جو گرانقدر تحقیقی عنوانات پر مشتمل ہیں۔

انہوں نے نشر و اشاعت کے اداروں کے ذریعے بھی بہت کام کیا۔ ریڈیو' ٹیلی ویژن' اخبارات و رسائل کے ذریعے ہندکو زبان کی ادبی چاشنی سے اہل قلم کو روشناس کروایا اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ اپنی زبان سے متعلق مثبت سوچ و فکر کے ساتھ اپنے قلمی شغل کو تیز تر کریں۔ جس کی وجہ سے کئی لکھاریوں نے ہندکو زبان و ادب کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ مختار علی نیئر کو بابائے ہندکو کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف میں ''ہندکو نثر دی کہانڑی'' ''تاریخ زبان و ادب ہندکو'' ''ہندکو قواعد تحریر'' ''ہندکو لوک کہانیاں'' ''ہندکو ضرب الامثال'' اور ''قدیم ہندکو'' شامل ہیں۔

انہیں ان کی ہندکو زبان کی قابل قدر خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز بھی دیا۔

استاد محمد عبداللہ: استاد عبداللہ کا دور بہت سے اساتذہ کا دور ہے۔ ان اساتذہ میں سے ساس اور بردہ جیسے قادر الکلام شاعر تھے جنہوں نے پنجاب میں بڑا نام کمایا تھا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ اُن کے کلام میں پنجابی لہجے کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی مگر اس کے برعکس استاد عبداللہ کے کلام کی ۸ سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ خالص ہندکو کہتے رہے۔ حرفی کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ ان کے دور کے اشعار سائیں سے چوٹیں ہندکو تاریخ کا حصہ ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان: پشاور شہر کے اعوان خاندان سے تعلق رکھنے والے ہندکو لکھاری و دانشور ہیں جنہوں نے اپنے مقالات اور تصانیف کی بدولت علمی و فکری حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اقبالیات سے متعلق ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ اردو میں انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور مختلف کالجوں میں اردو کے پروفیسر رہنے کے بعد پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے چیئرمین کی حیثیت سے ملازمت سے فارغ ہوئے مگر ان کی وسیع تر علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر حکومت صوبہ سرحد نے انہیں پبلک سروس کمیشن صوبہ سرحد کا ممبر بنا لیا ہے جہاں وہ سرکاری نوعیت کی خدمت پر مامور ہیں۔

کالم نویسوں کے حلقے میں اس لحاظ سے زیادہ جانے پہچانے کالم رائیٹر ہیں کہ اپنے کالموں کے ذریعے عوامی مسائل سے متعلق قابل حل تجاویز اور مشورے پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں کالموں کے ذریعے وہ مختلف علمی اور سیاسی مباحث بھی بغیر کسی رورعایت کے سپرد قلم کرتے ہیں۔ پشاور کے روزنامہ مشرق میں ''پشاور نامہ'' کے عنوان سے عرصہ دراز تک کالم لکھتے رہے جبکہ آج کل پشاور کے اخبار روزنامہ ''آج'' میں دلپشوری کے نام سے کالم لکھتے ہیں۔ ہندکو زبان و ادب کے فروغ کے لئے بڑی جانفشانی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ گندھارا ہندکو ادبی بورڈ کے چیئرمین ہیں اور ہندکو ادبی بورڈ میں کام کرنے والوں کی راہنمائی کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کی تصانیف' سفر ناموں' خاکہ نگاری' کالم نگاری' پاکستانیات' اقبالیات' ادب و تنقید' تراجم اور متفرقات پر مبنی مطبوعہ کتب کی تعداد چھتیس (36) ہے۔ جبکہ بعض کتابیں زیر طباعت ہیں۔ انہوں نے اپنی قلمی کاوشوں اور ذاتی ذہانت کی بنیاد پر متعدد ادبی اور علمی حلقوں سے ایوارڈ حاصل کئے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان پشاور اور پشاوریوں کی تہذیب و ثقافت کا ایک چلتا پھرتا نمونہ ہیں۔ ہندکو زبان و ادب کے فروغ کے لئے ان کی ثقافتی بنیاد پر کوششیں قابل قدر تحریک سے مشابہ ہیں

مندرجہ بالا قدیم شعراء کے علاوہ کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد زندہ تھے۔ استاد رضا ہمدانی نے جب جدید ہندکو شاعری کی داغ بیل ڈالی تو بھی قدیم ہندکو شاعری کے دلدادہ جدید شاعری یعنی غزل، نظم، قطعہ، رباعی وغیرہ کی طرف راغب نہ ہوئے اور جدید دور میں بھی قدیم شاعری ہی کرتے رہے۔ ان شعرا میں چند قابل ذکر شاعر مندرجہ ذیل ہیں:

استاد حیدر خان حیدر، استاد جمالا، استاد جیلانی، استاد میتی، استاد محمد بخش، استاد عطا محمد بخش بخش، استاد عطا، محمد دردی، استاد ذاکر، استاد ساجن، استاد وحشی، استاد یونس، استاد غلام رسول گھائل، استاد مائل، استاد فارغ ہسو، استاد الحکیم اثر، استاد والذت، استاد اللہ بخش ڈپٹی، استاد آئمہ محمد جوش، استاد خادم کربلائی، استاد مضمر تاتاری، استاد لونگا، استاد نورا، استاد محمد عمر۔

ہندکو نثری ادب:

یوں تو ہندکو نثر کی ابتداء اُس وقت سے ہے جب کہ گندھارا کی عظیم سلطنت میں خطہ ضروشتی میں کتبے لکھے جانے لگے اور سکوں پر عبارتیں ہندکو زبان میں

مسکوک ہونے لگیں لیکن وقت کے ساتھ یہ خطہ اس علاقے میں ناپید ہو گیا۔ پھر نثر کے حوالے سے ایک طویل جمود طاری نظر آتا ہے۔ شاعری تو ویدوں کی طرح سینہ بہ سینہ آتی رہی اس کے لئے اگر لکھنے کی ضرورت محسوس بھی ہوتی تو پھر نثر کا فقدان تھا لہذا نظم کو بھی آس پاس کی وہ زبانیں جو نثر پیدا کر چکی تھیں اُن میں یا نشانیاں وغیرہ سے کام چلتا رہا لیکن مکمل نثر کے لئے ہندکو رسم الخط کی ضرورت بہر حال ایک مسئلہ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں راقم الحروف نے رسم الخط کے بارے میں جدوجہد شروع کی اور ۱۹۶۵ء میں ''ہندکو نثر دی کہانڑی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور یوں ہندکو کے اپنے رسم الخط کی بنیاد پڑی پھر ہندکو کو قواعد کے بارے میں کتاب ترتیب دی گئی اس کے بعد ہندکو کو ضرب الامثال کتابی صورت میں پیش کی۔ رسم الخط کے میدان میں آتے ہی ہندکو نثر میں کام ہونے لگا اور میرے ساتھیوں نے بھی اس رسم الخط میں نثر کی ابتدا کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے روزنامہ انجام میں ہندکو صفحہ شائع ہونے لگا جس میں اس نثر کو متعارف کرایا جانے لگا۔ پھر روزنامہ انقلاب نے ہندکو کو صفحہ شائع کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا ہندکو ماہنامہ ''ہندکو زبان'' کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا اور تا حال یہ مہانامہ شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس رسم الخط میں ۲۰۰ سے زیادہ کتابیں، رسالے شائع ہو چکے ہیں جن میں افسانے، ناول، خاکے، شاعری اور تحقیقی مضامین شامل ہیں۔

اب تک درج ذیل ہندکو لوک کہانیاں منظر عام پر آ چکی ہیں:

۱۔ سیف الملوک: ہزارہ سے تعلق رکھتی ہے اور ہندکو زبان کی دیومالائی قدیم کہانی ہے۔

۲۔ راجہ رسالو: اٹک کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے اور کلاسیکی ادب کا حصہ ہے۔

۳۔ ٹولاں بارتہ زادی: ڈیرہ اسماعیل خان کے قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کہانی ڈیرہ سے لے کر کوہاٹ اور پشاور پر پھیلی ہے۔

۴۔ کنگڑ کنگڑی: قدیم دیومالائی کہانی پشاور کے قدیم عہد سے تعلق رکھتی ہے۔

۵۔ بختہ ورے: چارسدہ پشکلاوتی کے عہد سے تعلق رکھتی ہے ایک آرین کہانی ہے۔

۶۔ ماروبا: افغانستان کے دریائے کنڑ کے علاقے سے کے کر پشاور تک پھیلی ہوئی ایک قدیم رومانی داستان ہے۔

۷۔ جامور: زمانے کا تعین نہیں ہے البتہ پشاور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قسم کی تین کہانیاں اسی نام سے مشہور ہیں۔

۸۔ توتیا موتیا: پشاور کے قریب تپہ خالصہ کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ زمانہ لودھی عہد کا ہے۔

۹۔ رابو چلی: سکھوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہے اور مقام پشاور ہے۔

۱۰۔ بی بی جان: پشاور کی رومانی داستان ہے اور مغل عہد سے تعلق رکھتی ہے۔

۱۱۔ جلالیہ: پشاور کے قریب کوٹلہ محسن خانکے علاقے کی کہانی مغل عہد اکبر۔

۱۲۔ پری چہرہ: پشاور سے تعلق ہے، نادر شاہی حملے کے دوران مغل عہد کی رومانی داستان۔

۱۳۔ اللہ رکھی: خاص شہر پشاور کی رومانی داسان۔ مغل عہد۔

۱۴۔ پنچیکا: ایک دیومالائی رومانی داستان۔

۱۵۔ ڈاڈیاں داسٹھاں داسو: ہندکو ضرب المثل کے پس منظر میں لوک کہانی۔

۱۶۔ دس اس مکی دس اُس مکی: ہندکو ضرب المثل کے پس منظر کی کہانی۔

۱۷۔ جن داسا: ہندکو ضرب المثل کچھ پس منظر کی مزاحیہ کہانی۔

۱۸۔ واہ نی بیوی گدو: ہندکو ضرب المثل کا ایک مزاحیہ قدیم پس منظر۔

۱۹۔ جالو: پشاور سے تعلق رکھنے والی ایک قدیم کہانی جس کی ضرب المثل بھابڑی مشہور ہے۔

قدیم پیشے:

یہاں قدیم ایام سے جو پیشے ان علاقوں میں رائج تھے اُن تمام کا ذکر بھی ہے۔ آج کل ان پیشوں میں اکثر ایسے پیشے بھی ہیں جو یا تو اپنی ہیت بدل چکے ہیں یا پھر ختم ہو چکے ہیں۔

۱۔ **نسوار سازی:** تمباکو، راکھ اور خوشبویات مثل ست پودینہ وغیرہ کو دلڑا کر کے تھوڑی سی نم دے کر بنائی جاتی ہے۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک منہ میں ڈالنے کی اور دوسری عمدہ اور باریک قسم ناک میں کھینچی جاتی ہے۔ یہ پیشہ نہایت ہی قدیم ہے اور ہر دور میں صرف یہاں ہی نہیں بیرون ملک افغانستان، ایران اور مشرق وسطیٰ کی ریاستوں میں اس کی بے پناہ مانگ رہتی ہے۔ اپنے ملک کے ہر صوبے میں بھی پشاور سے منگوائی جاتی ہے۔ پشاور میں نسوار کے باقاعدہ کارخانے کام کرتے ہیں۔ لوگ اپنے ہاتھ سے بھی بنا کر استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ **بادکشی:** یعنی پکھی سازی۔ جہاں جہاں یہ مزری (پٹھہ) پیدا ہوتا ہے ہاتھ سے اس کی پکھی بنائی جاتی ہے۔ عورتیں گھر میں پکھی بنتی ہیں اور مرد ڈنڈی لگاتے ہیں۔ شہر میں بجلی کے پنکھوں کا رواج ہے لیکن دیہات میں اب بھی اس کی مانگ ہے۔

۳۔ **بوریابافی:** پٹھے (مزری) سے زمینی چٹائی اور نماز کے لئے مصلے بنائے جاتے ہیں۔

۴۔ **شانہ سازی:** لکڑی کی کنگیاں بنانا، پلاسٹک کی ایجاد سے تجارت اب ماند پڑتی جارہی ہے۔

۵۔ **چوڑی گری:** شیشے کی چوڑیاں بنانا، ہر دو میں اس کی مانگ رہی ہے اگرچہ ابھی اس کی جگہ پلاسٹک کی چوڑیاں لے رہی ہیں مگر پھر بھی شیشے کی چوڑیاں اب بھی اکثر دیہات اور افغانستان سپلائی ہوتی ہے۔

۶۔ **مس گری:** تانبے کی دھات کے برتن وغیرہ بنانا اور ان پر ہاتھ و نگار بنانا۔ شادیوں میں مس کے ظروف وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ اب مہنگائی کی وجہ سے اور ساتھ ہی اسٹیل کے ظروف کے بننے کی وجہ سے اس کی مانگ کم ہوتی جارہی ہے۔ مگر یہ پیشہ اب بھی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب مس کے ظروف لوگ ڈرائنگ روم میں سجانے کے لئے مہنگے داموں خریدتے ہیں۔

۷۔ **قلعی گری:** مس کے برتنوں پر قلعی چڑھا کر انہیں چمکانا۔ جب تک مس کا کاروبار عام تھا اس کی بھی بڑی مانگ تھی۔ اب یہ پیشہ بھی ختم ہوتا جارہا ہے۔

۸۔ **ظروف سازی:** مٹی کے برتن بنانا اور اس پر روغن چڑھانا، نقش و نگار کرنا وغیرہ، پلاسٹک نے اس کی مانگ بھی مندی کردی ہے۔

۹۔ **نعلبندی:** جب ذرائع آمد و رفت کا زیادہ تر انحصار گھوڑوں کی سواری پر تھا تو جگہ جگہ گھوڑوں کے نعل لگانے والے موجود تھے لیکن اب اس پیشے کے استاد دیہات میں ہیں۔ شہروں میں نظر نہیں آتے کہ یہ جگہ رکشہ، سکوٹر، موٹر سائیکل نے لے لی ہے۔

۱۰۔ **لنگی بانی:** صوبہ سرحد میں پگڑی باندھنا کا زیادہ ہر شخص کا طرہ امتیاز ہوتا تھا۔ ہر قبیلے کی پگڑی کا انداز علیحدہ ہوتا تھا اور پگڑی کو دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص کہاں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پگڑی میں کلے کے اور جو چادر باندھی جاتی ہے اُسے لنگی کہتے ہیں۔ اب یہ رواج دیہات میں رہ گیا ہے لہذا یہ پیشہ بھی دیہات میں نظر آتا ہے۔

۱۱۔ **ازار بندی:** ہندکو ازار کو ناڑا کہتے ہیں۔ یہ ریشمہ اور سوتی ہوتے ہیں اور اکثر عورتیں بناتی ہیں۔ اب بھی ہر جگہ یہ پیشہ جاری ہے۔

۱۲۔ **خیاطی:** یعنی ''درزی گیرا'' اگرچہ ریڈی میڈ کپڑوں کے کارخانے وجود میں آچکے ہیں لیکن خیاطی اب بھی ہر جگہ ہوتی ہے۔

۱۳۔ **پوستین دوزی:** چمڑے کو صاف کرنے اُن کے گرم کپڑے، کوٹ اور شلوکے، چغے بنانا۔ پہلے یہ کام بہت چلتا تھا یہاں تک کہ دوسرے ممالک بھی جاتا تھا لیکن جدید سائنس نے اتنے مصنوعی گرم کپڑے ایجاد کر لئے کہ اب یہ پیشہ ختم ہو چکا ہے۔

۱۴۔ **اُتوکشی:** کپڑے پر لوہے کی تار گرم کر کے نقش نگار ایسی مہارت سے بنانا تاکہ کپڑا جلنے بھی نہ پائے اور کپڑے کی زمین منقش ہو جائے۔

۱۵۔ **تارکش:** گراریوں کو گرم کر کے اس میں تار کو گزارنا تاکہ وہ پتلی ہو کر کمبی ہوتی جائے اب یہ کام مشینوں سے لیا جاتا ہے۔

۱۶۔ **رفوگری:** ہر جگہ اب بھی اس کے استاد ملتے ہیں لیکن مانگ ویسی نہیں ہے۔

۱۷۔ **آہنگری:** لوکاری، شمشیر تلوار، چاکو، چھڑی وغیرہ ب بنانا۔ اب بھی پیشہ عمارتی ہو ہے کی تجارت سے بدل گیا ہے۔ لوہے کے دروازے اور سیے کے جال بنائے جاتے ہیں۔

۱۸۔ **کاغذ سازی:** کچرے کو گوندھ کر دوکانداروں کے لئے کاغذ بنایا جاتا تھا جو اکثر ب اردانہ کے کام آتا تھا۔ پلاسٹک کی مصنوعات نے اس پیشے کو ختم کر دیا ہے۔

۱۹۔ **ابریشم گری:** ریشم کی مانگ اب بھی ہے اور یہ پیشہ خاصا منافع بخش ہے۔

۲۰۔ **نمد سازی:** سردیوں کے لئے چٹائیاں بنانا جسے گلم سازی بھی کہتے ہیں، اب یہ کام کھڈیوں کے ذریعے کہیں کہیں ہوتا ہے۔ اکثر جیلوں میں ہوتا ہے۔

۲۱۔ **مُہر کنی:** نام کی مہر بنانا یا انگوٹھی کے نگ پر نام کھدوانا، اب ناپید ہے۔

۲۲۔ **منکا کی:** قیمتی پتھر کو انگوٹھی میں جڑوانا اب یہ کام زرگر کرتے ہیں۔

۲۳۔ **پاپڑ گری:** بین سے پاپڑ بنائے جاتے ہیں۔اب بھی یہ کام ہوتا ہے۔

۲۴۔ **بندوق سازی:** انگریزی عہد کے بعد یہ پیشہ خاص طور پر اس علاقے میں ممنوع ہو گیا مگر اب بھی آزاد علاقوں میں قائم ہے اور اس کی بڑی مانگ ہے۔

صیقل گری: اسلحہ یا نادر و نایاب دھات کی بنی ہوئی اشیاء کی صفائی ہر جگہ ہوتی ہے۔

۲۷۔ **بارود سازی:** آتشبازی کے لئے پٹاخے وغیرہ بنانا اگرچہ ممنوع ہے مگر ہر جگہ بنتے ہیں۔

۲۸۔ **حلوا گری:** خاص قسم کا حلوہ جو نشاستے سے بنتا ہے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔

۲۹۔ **ڈبگری:** اس حرفے کو کپہ گری بھی کہتے ہیں۔سیال اشیاء مثلاً تیل، گھی وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے چرمی کپے بنائے جاتے تھے لیکن جب سے ٹین کیڈبے اور کنستروں نے بننا شروع کیا، اس کی اہمیت کم ہوتی گئی ۔اب صرف نام ہی رہ گیا ہے۔

۳۰۔ **چپلی سازی:** اب بھی ہر جگہ بکثرت موجود ہے اور اپنی اپنی روایت کے مطابق چپل بنتے ہیں۔

۳۱۔ **سراجی:** چمڑے کے یخ دان پیٹیاں اور اسلحہ لے کے کراس بنانا۔اب بھی ہے۔

۳۲۔ **گڈی بازی:** یہاں کی ثقافتی نشانی موسم گرما میں اکثر پتنگ بازی ہوتی ہے لہذا پتنگ بنانے والے بھی ہر چوک میں اڈا جمائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

۳۳۔ **زرگری:** سونے اور چاندی کے زیورات بنانا۔اب بھی یہ حرفہ قائم ہے۔

۳۴۔ **مصوری:** آج سے ایک صدی پہلے ایسے مصور تجارتی بنیادوں پر لوگوں کی تصویریں بناتے تھے۔فوٹو گرافی کے عام ہونے کی وجہ سے یہ حرفہ اب ناپید ہو گیا ہے۔

۳۵۔ **شکاری:** ایسے شکاری جو تجارتی بنیادوں پر چھوٹے بڑے پرندے، بٹیر، تیتر، چکور اور اسی قسم کے دوسرے جانور زندہ پکڑنا اور بیچنا چاہتے تھے۔اب ناپید ہے کیونکہ یہ کام اب جالوں کے علاوہ دوسرے سائنسی طریقوں سے بھی کیا جاتا ہے۔

۳۶۔ **عطر سازی:** اب بھی اس کی مانگ ہے اور ہر جگہ پیشہ ور موجود ہیں۔

۳۷۔ **موڑا سازی:** اسے مونڈا سازی بھی کہتے ہیں۔پلاسٹک کے رواج نے اس حرفے کو بڑا متاثر کیا ہے۔تقریباً ناپید ہے۔

۳۸۔ **ستارہ گری:** زنانہ لباس پر ستارے ٹانکنا۔اب بھی جاری ہے۔

۳۹۔ **جڑیا گری:** زیورات کو مرصع کرنا اور چھوٹے چھوٹے نقوش بنانا اب بھی جاری ہے۔

۴۰۔ **پٹھیارا توپی:** تندوری نان تیار کرنا اب بھی جاری ہے۔

۴۱۔ **کلہ پزی:** گائے بھینسوں اور دُنبے بکرے کے کلے اور پائنچے وغیرہ صاف کرکے بیچنا۔اب بھی اس پیشے کے لوگ خوب کماتے ہیں۔

۴۲۔ **علاقہ بندی:** زیورات کے لئے ریشمی یا سوتی پٹی بنانا۔کام اب بھی جاری ہے۔

۴۳۔ **نیچہ بندی:** ہندکو بولنے والے علاقوں میں چلم کا استعمال زیادہ ہے۔چلم کے نیچے بنانا اُس پر سیم کی تار سے کام کرنا اگرچہ اب چلم کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے مگر دیہات میں اس کا رواج ہے۔لہذا یہ حرفہ بھی جاری ہے۔

۴۴۔ **خوردہ فروش:** ہر قسم کا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا لے جانا۔ اب بھی جاری ہے۔

۴۵۔ **عطاری:** ہر قسم کا شربت جس میں اسپغول، تخم ملنگا، تخم ریحان وغیرہ ملا کر خاص قسم کے کٹوروں مین بیچا جاتا ہے۔لیکن موجودہ دور میں مشروبات کے کارخانوں کی وجہ سے یہ پیشہ ماند پڑ گیا ہے۔پشاور میں اب بھی دو ایک جگہوں پر ایسا شربت بکتا ہے۔

۴۶۔ **دال گری:** ماش، مونگ، چنا وغیرہ کو رگڑ کر دال بنانا۔اب بھی جاری ہے۔

۴۷۔ **میوہ فروشی:** اس حرفے میں وہ سب فروٹ آتا ہے جو سوکھا ہوا ہوتا

ہے۔ سوکھے میووں (ڈرائی فروٹ) کا کاروبار بھی ہر جگہ ہوتا ہے۔

۴۸۔ جستہ دوزی: جستہ ایک خاص قسم کے چمڑے جیسے "بیشا" کہتے ہیں جو بہت ہی نرم اور ملائم ہوتا ہے۔ اس سے پاؤں کے لئے گرگابی نما پاپوش بنایا جاتا ہے۔ قدیم زمانے یا پھر آج سے تقریباً ۵۰ برس پہلے تک مردوں کے علاوہ عورتیں بھی استعمال کرتی تھیں۔ یہ پاپوش عموماً سردیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کے جسے افغانستان اور روسٹک سپلائی ہوتے تھے لیکن اب اس حرفے کا صرف نام ہی رہ گیا ہے۔ نئی نسل اس کی شکل وصورت سے بھی واقف نہیں ہے۔

۴۹۔ دباغت گری: جانوروں کا چمڑا صاف کرنا اور اُسے رنگنا۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں جب تک حال جانور ذبح ہوتے رہیں گے یہ حرفہ ختم نہیں ہوسکتا۔ لہذا اب اس کی مانگ پہلے سے بھی زیادہ ہے کہ ایسا چمڑا جوتیاں، چپل، پیٹیاں، گھوڑوں اور خچروں کی زین بنانے اور چمڑے کے بخ دان بنانے میں کام آتا ہے۔ لیکن اب اس میں قدرے تبدیلی آگئی ہے کہ اب زیادہ تر کام مشین کرتی ہے۔

۵۰۔ خشت سازی: مٹی کی خمیر گھول کر ایک خاص فرمے کی مدد سے اینٹیں بنانا جو بعد میں بھٹے پر پکا کر استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ قدیم حرفہ ہے اور اب پہلے سے زیادہ اس کی مانگ ہے۔

۵۱۔ کناری بافی: سونے کی اور چاندی کی تاروں سے پٹی بنانا جسے کناری کہتے ہیں اور جو خاص طور پر زنانہ لباس کی آرائش کے کام آتی ہے۔ اب بھی جاری ہے۔

۵۲۔ شمع سازی: یہ حرفہ بھی یہاں کی قدیم صنعت میں شمار ہوتا ہے۔ عہد قدیم سے منادر ہوں کہ مساجد موم بتی کی ضرورت اس علاقے میں ہمیشہ رہی ہے۔ اب بھی جاری ہے۔

۵۳۔ گڑاکو سازی: تمباکو میں گڑ کا شیرا اور راکھ ملا کر ایک کیچڑ سی بنتی ہے جسے گڑاکو کہتے ہیں۔ اگرچہ اب یہ بہت کم ہے لیکن یہ صرفی الحال موجود ہے۔

۵۴۔ قالین بانی: پہلے یہ کام عام تھا لیکن اب اس کے کارخانے بن گئے ہیں لہذا ہاتھ یا کھڈی پر اب قالین نہیں بنائے جاتے۔

۵۵۔ تسبیح سازی: تسبیح سازی یا تسبیح گری۔ بڑا خاص پیشہ تھا، لکڑی کے دانوں سے تسبیاں بنائی جاتی تھیں مگر جب سے پلاسٹک کی تسبیحیں بن کر آنی شروع ہوئی ہیں یہ حرفہ ختم ہوگیا ہے۔

ریتاں (رسوم):

ہندکو بولنے والوں کے معاشرے کا ضمیر چونکہ توہمات سے اُٹھا ہے لہذا ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی بے شمار رسمیں ہیں کہ ہر دور اور ہر مذہب میں روپ بدل بدل کر سامنے آتی رہی ہیں۔ ویدک عہد، جین مت، بدھ مت، یونانیت، ہندو شائیہ اور پھر آخر میں اسلام کی آمد کے باوجود اس علاقے کے رہنے والے اپنی قدیم رسوم کو کسی نہ کسی طریقے سے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس سے ان کی آپس میں بھی اور باہر بھی پہچان ہوتی ہے۔ اب کچھ رسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ورٹونڈنڑا (برڈھونڈنا): مطلب ہوا کہ لڑکی یا لڑکے والے اپنے بچی یا بچے کے لئے اُس کے شریک حیات کے بارے میں سوچیں جس میں عموماً یہ سوچا جاتا ہے کہ جس گھر میں بھی جائیں تو کیا وہ ہم سے برابری میں ہوں گے۔

خیشی (رشتے کی بات کرنا): جب عموماً لڑکے والے فیصلہ کر چکیں تو پھر اپنے لڑکے کا رشتہ لے کر لڑکی کے والدین کے پاس جاتے ہیں جسے خیشی کہتے ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ لفظ "خیشی" فارسی کے لفظ "کویش" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے اپنایا اپنی طرح تو خیشی کے کر جانے کا مطلب ہوتا ہے کہ اپنی طرح کے لوگ ڈھونڈنا یا اپنے جیسے لوگوں کے ہاں اپنے لڑکے کی شادی کی بات کرنا۔ بعض اوقات تو یہ بات سالوں لمبی ہو جاتی ہے اور جب کہیں جا کر بات طے ہوتی ہے اور لڑکی والے "ہاں" کرتے ہیں اس سلسلے میں ہندکو زبان وادب میں باقاعدہ ایک ضرب المثل بھی ہے۔ "جُتیاں کسانڑا" یعنی لڑکی والوں کے ہاں اتنے پھیرے ڈالے کہ جوتیاں گھس گئیں۔ جب فیصلہ ہو جاتا ہے کہ لڑکی کا مہر کیا ہوگا، جائیداد میں کتنا حصہ ہوگا، سونا کتنا ہوگا اور جیب خرچہ کیا ملے گا تو پھر کہیں جا کر منگنی کا مرحلہ آتا ہے۔

منگلوا (منگنی): منگنی کا اہتمام لڑکی اور لڑکے والے دونوں کرتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں اپنے عزیز واقربا کو بلاتے ہیں اور طے شدہ وقت پر لڑکے والے لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں۔ وہاں پر دونوں کے عزیز و اقارب کے درمیان منگنی کا اعلان ہوتا تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ لڑکی اب کسی کی مانگ بن چکی ہے لہذا آئندہ اس پر کسی کا رشتہ نہ آئے۔ عام طور پر اس موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے شربت یا چائے پلائی جاتی ہے مگر متمول لوگ ایسے موقعہ پر

بھی کھانا کھلاتے ہیں۔ اس موقعہ پر لڑکے والوں کی طرف سے نشانی کے طور پر ایک جوڑ اور سونے کا کوئی ایک زیور جو طے شدہ سونے کے زیورات کا حصہ ہوتا ہے لڑکی کو پہنایا جاتا ہے۔ یہ زیور اکثر انگوٹھی ہوتی ہے۔

ونڑ (تہوار): ونڑ تہوار کو کہتے ہیں جیسے عیدین وغیرہ رسم ہے کہ جب بھی معاشرے میں رائج کوئی تہوار آئے گا تو لڑکے والے کچھ فروٹ یا مٹھائی وغیرہ لڑکی والوں کے گھر لے کر جاتے ہیں۔ عام تہوار مندرجہ ذیل ہیں: نکی عید، وڈی عید، رمضان داروزہ کھلوائی، شب برات، اہل شیعہ محرم، اور نو روز کو بھی تہواروں میں شامل کرتے ہیں۔ عید کے تہوار پر باقاعدہ لڑکی کے لئے عیدی بھی بھیجی جاتی ہے جو ایک سو روپے سے لے کر ایک ہزار روپے تک ہو سکتی ہے۔ لڑکی والوں کی طرف سے رمضان شریف میں لڑکے کی روزہ افطاری یعنی کچی سبزیاں، گوشت، چاول، مرغے، فروٹ اور گھی وغیرہ بھیجا جاتا ہے۔ جب تک شادی نہیں ہوتی خواہ کتنا ہی عرصہ گزرے ہو تہوار پر ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ لڑکے والے یا لڑکی والے جب کسی تہوار کے موقع پر ونڑ آئے اور تھوڑا تھوڑا حصے کی صورت میں دوست اقربا وغیرہ کو بھیجا جاتا ہے تا کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ رشتہ تازہ رہے۔

نکاح: عام طور پر لوگ منگنی کر لیں تو پھر نکاح رخصتی کے موقعہ پر ہوتا ہے یا پھر منگنی کی جگہ نکاح ہوتا ہے یا دونوں ہوتے ہیں۔ یہاں پر یہ یاد رہے کہ نکاح ایک فرض ہے صرف رسم ہی نہیں۔ نکاح سوائے کشمیریوں کے سب لڑکی کے گھر میں ہوتے ہیں البتہ کشمیری قوم کے نکاح لڑکے کے گھر میں ہوتے ہیں اور ان کا نکاح کے وکیل لڑکی کے گھر جا کر اس سے اجازت لیتے ہیں۔ نکاح کے وقت لڑکے اور لڑکی کے منتخب ارکان ایک کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ لڑکے وکیل جب اجازت حاصل کر کے نکاح کر کے نکاح خواں کو اطلاع کر دیں اور اسی طرح لڑکے کے وکیل بھی تو پھر کہیں جا کر نکاح خواں لڑکے سے تین بار پوچھتا ہے کہ میں تمہارا نکاح فلاں بنت فلاں سے اتنے مہر اتنے سونے کے زیورات اتنے جیب خرچ اور اتنی جائیداد کے عوض پڑھتا ہوں تمہیں منظور ہے۔ یہ عمل نکاح خواں جو عموماً مولانا صاحب ہوتے ہیں تین بار دہراتے ہیں اور لڑکے کو بھی تین بار جی ہاں یا منظور ہے کہنا پڑھتا ہے۔ جب کہیں جا کر نکاح خوان نکاح پڑھتا ہے اور پھر جمع میں دُعا ہوتی ہے کہ اللہ دولہا دلہن میں اتفاق و اتحاد رکھے اور یہ تمام عمر راضی خوشی رہیں۔ آمین کے بعد عزیز اقربا لڑکی اور لڑکے والوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ مٹھائی کے ساتھ شکر میں ملے ہوئے تل تقسیم کئے جاتے ہیں۔

دوسری طرف دلہن سجی ہوئی اپنی سہیلیوں میں بیٹھی ہوتی ہے اور ڈھولک پر گیت گائے جاتے ہیں۔ لڑکے والے جاتے وقت لڑکی کا گھونگھٹ اٹھا کر اُسے دیکھتے ہیں۔ یہاں پر یہ عرض کرتا چلوں کہ اس وقت دلہن نے جو جوڑا پہن رکھا ہوتا ہے وہ لڑکے والوں کی طرف سے ہی آتا ہے اور ساتھ ہی نشانی کے طور پر انگوٹھی۔ عام طور پر منگنی اور نکاح کی ایک ہی انگوٹھی ہوتی ہے لیکن متمول لوگ ہر موقعہ پر بھی ایک انگوٹھی دے سکتے ہیں۔ ایک رسم یہ بھی ہے کہ جتنی دیر نکاح پڑھایئے اتنی دیر دلہن کے سر پر کھڑے ہو کر کوئی ایک سہیلی قینچی سے کاغذ کی کترن بناتی رہتی ہے۔

چوری دی مہندی: جب لڑکی اور لڑکے والوں کے درمیان شادی کی تاریخ طے ہو جاتی ہے تو پھر برات سے ایک دن پہلے مہندی کی رسم ادا کرنا ہوتی ہے۔ شادیاں اس مشینی دور میں بھی ایک ایک ماہ رچتی ہیں۔ دونوں گھروں کے عزیز اقارب ہر رات اپنے اپنے گھروں سے کھانا وغیرہ کھا کر اکٹھے ہوتے ہیں۔ لڑکے کے گھر بھی لڑکے کے دوست گاتے بجاتے رہتے ہیں اور لڑکیاں بھی ڈھولک پر گیت گاتی ہیں لیکن لڑکی کے گھر صرف لڑکی کی سہیلیاں اور عزیزوں کی لڑکیاں اکٹھی ہو کر گاتی بھی رہتی ہیں اور لڑکی کا جہیز وغیرہ بھی ناپتی رہتی ہیں۔ دونوں گھروں میں شادی سے کئی کئی دن پہلے رونق لگی رہتی ہے ان رونقوں کو دوبالا کرنے کے لئے کوئی موقعہ ڈھونڈا جاتا ہے کہ لڑکی یا لڑکے کے گھر میں کوئی نہ کوئی وقت جو عموماً رات گئے کا وقت چنا جاتا ہے جب کہ لڑکے یا لڑکی والے سو رہے ہوں تو اچانک مہندی لے کر لڑکی والے تو خیر زیادہ نہیں کرتے مگر لڑکے والے آدھمکتے ہیں اور بے سروسامان میں خوب ہنگامہ کرتے ہیں۔ لڑکی کی ساس نندیں وغیرہ سوئی ہوئی دلہن کو اٹھا کر مہندی لگاتی ہیں اور گھنٹہ ڈیڑھ گا بجا کر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اچانک آدھمکنے کو ''چوری دی مہندی'' کہتے ہیں۔

اصلی مہندی: عموماً مہندی کی رسم شادی سے ایک یا دو دنوں کے وقفے میں ادا کی جاتی ہے۔ مہندی پہلے لڑکے والے لاتے ہیں اور پھر لڑکی والے مہندی لڑکے کے گھر لے جاتے ہیں۔ عام طور پر لڑکے کے گھر کی عورتیں خاص طور پر لڑکیوں نے شمعیں جلا کر مہندی کے تھالوں میں لگا کر ڈھولک بجاتی اور گاتی ہوئی لڑکی کے گھر میں داخل ہوتی ہیں۔ مہندی کے تھال زمین پر رکھ کر لڑکیاں تھوڑی دیر ناچتی اور گاتی ہیں۔ ان عورتوں کے ساتھ عموماً دو چار مرد بھی ہوتے ہیں جو انہیں لانے اور واپس لے جانے پر مامور ہوتے ہیں۔ لڑکی والے انہیں کسی علیحدہ جگہ پر بٹھا دیتے ہیں۔ لڑکے کی طرف سے آئی ہوئی بڑی بوڑھیوں کو بڑے اعزاز سے خاص جگہ پر بٹھایا جاتا

ہے۔اس کے بعد لڑکے کے گھر کی آئی ہوئی لڑکیاں گھر میں چھپی ہوئی بیٹھی دلہن کے کمرے میں جاتی ہیں اُس پر بناری ڈالتی ہیں اور اُسے دلہن بنا کر گاتی ہوئی وہاں لے آتی ہیں جہاں تمام عورتیں بیٹھی ہوں۔ یہاں پر ایک اونچی سی چوکی رکھی ہوتی ہے جہاں دلہن کو بٹھا دیا جاتا ہے۔اور پھر باری باری لڑکے والوں کی طرف سے آئی ہوئی خواتین بناری سے باہر نکلے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی پر تھوڑی سی مہندی لگاتی ہیں۔ایک نظر لڑکی کو دیکھتی ہیں۔ جب یہ رسم ختم ہو جائے تو پھر دلہن کو واپس کمرے میں پہنچایا جاتا ہے لڑکی والوں کی طرف سے اس موقعہ پر دودھ سے تواضع ہوتی ہے۔ یہ دودھ خاص قسم کا ہوتا ہے اس میں بادام چھوہارے وغیرہ ملے ہوتے ہیں۔ قائدہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے کی طرف سے آئی ہوئی خواتین میں سے جو کہ بڑی قریبی ہوتی ہیں اُن کے سامنے ایسے ہی دودھ کا بہت بڑا پیالہ آتا ہے وہ ایک ایک گھونٹ پیتی جاتی ہیں اور ساتھ ہی پلانے والے کے ہاتھ میں پانچ، دس، سو، پچاس روپے تھما دیتی ہیں۔اسے ''دودھ وچ پانڑا'' کہتے ہیں اور اس رسم کے بعد انہیں دودھ کے گلاس پیش کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ساتھ آئے ہوئے مردوں کے لئے بھی دودھ کا بندوبست ہوتا ہے۔ اگر دونوں دھڑوں کی مہندی ایک ہی دن ہو تو پھر لڑکے والے شام کو آتے ہیں دودھ پیتے ہیں اور چائے وغیرہ جونہی ان کی واپسی ہوتی ہے لڑکی والے ان کے پیچھے ہی چل پڑتے ہیں۔لڑکے والے رات کا کھانا دیتے ہیں مہندی کے موقعہ پر اگرچہ اب اس بات کی کوئی خاص پابندی نہیں کی جاتی مگر رواج یہ ہے کہ اس موقعہ پر ماش پلاؤ کوفتے اور دہی سے ضیافت کی جاتی ہے۔

لڑکے کے گھر میں وہی کچھ ہوتا ہے جو لڑکی کے گھر میں ہوتا ہے۔سات سہاگنیں لڑکے کے سر میں شرط پوری کرنے کے لئے تیل لگاتی ہیں اور پھر باری باری مہندی لڑکے کو لگائی جاتی ہے۔لڑکی کے گھر میں لڑکے کی بہنیں اور اگر بہنیں نہ ہوں تو پھر رشتہ کی بہنیں چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد وغیرہ لگاتی ہیں۔ یہی رسم لڑکے کے گھر میں لڑکی کی بہنیں یا لڑکی کی رشتہ کی بہنیں ادا کرتی ہیں۔لڑکی والوں کی طرف سے بھی مہندی لگانے اور دودھ پلانے کے بعد باقاعدہ لڑکے کی بہنیں، والدہ اور دوسری وہ سب نزدیکی رشتہ دار جن کی نشاندہی لڑکی والے کراتے ہیں انہیں چادریں اور دوپٹے پہنائے جاتے ہیں اور اسی طرح لڑکے والے کے گھر لڑکی والوں کی نشاندہی پر لڑکے والے پہناتے ہیں۔

داج (جہیز): اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو لڑکی کی ماں کو اُس دن سے اس کی شادی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اور وہ جہاں کہیں سے بھی شادی کے لائق کچھ دیکھتی ہے تو اپنی بیٹی کے لئے محفوظ کر چھوڑتی ہے اس سامان میں ہر قسم کا برتن، کپڑے، فرنیچر، زیور غرضیکہ وہ سب کچھ وہ برسوں جمع کرتی رہتی ہے کہ وہ اپنی لڑکی کو سج دھج سے بیاہے گی پورا ایک گھر کا سامان ہوتا ہے جو لڑکی کے والدین لڑکی کی شادی تک جمع کرتے رہتے ہیں اسے ہندکو زبان میں ''داج'' کہتے ہیں۔

داج دکھانے کے عموماً دو موقع ہوتے ہیں۔ایک موقعہ وہ کہ جب لڑکے والے مہندی لاتے ہیں تو اُس موقعہ پر لڑکی والے بھی موجود ہوتے ہیں اور لڑکے والے بھی لہذا اُس موقعہ پر لڑکی والوں کی طرف سے کوئی ہوشیار عورت لڑکی کی تمام چیزیں ہاتھ میں اٹھا اٹھا کر بتاتی ہے اور ساتھ ہی دلچسپ جملوں میں تعارف بھی کرواتی ہے۔بعض لوگ ایسا نہیں کرتے اور مہندی کے بعد برات سے پہلے لڑکی کا سامان جب لڑکے کے گھر بھیجا جاتا ہے تا کہ لڑکی کے سامان کو عجلہ عروسی میں سجایا جائے تو لڑکے کے ولیمے کے موقعہ پر جب کہ لڑکی والے ولیمہ کھانے آتے ہیں تو دونوں دھڑوں کی خواتین لڑکی کا سارا سامان وغیرہ دیکھتی ہیں اور حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اس نمود و نمائش کے قائل نہیں ہوتے اور اس رسم کو ادا ہی نہیں کرتے مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اس لئے کہ ہر جگہ ''ناک'' کا مسئلہ ہمارے معاشرے کے لئے عذاب بنا ہوا ہے۔اگر یہ رسم نہ ہوتی اور لڑکی لڑکے والے لالچ نہ کرتے تو آج ہمارا معاشرہ کچھ اور ہوتا مگر لوگ لاکھ کہتے ہیں مگر ان رسموں کے ایسے اسیر ہیں کہ وقت پر ان رسموں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

وری: وری اُس سامان کو کہتے ہیں جو لڑکے والے لڑکی کے لئے بناتے ہیں جس میں خاص طور پر زیورات اور کپڑے ہوتے ہیں۔اس کے بتانے کی رسم بھی من وعن وہی ہے یعنی جب لڑکی والے لڑکے کے گھر مہندی لگانے جائیں تو بعض گھرانوں میں اُس وقت بتایا جاتا ہے کہ دونوں دھڑوں کی خواتین موجود ہیں یا پھر ولیمے والے دن اس کی نمائش لڑکی کے سامان کے ساتھ ہوتی ہے۔

عام طور پر ولیمے کے دن ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد دلہن کا جوڑا بدلتا ہے اس میں زیادہ تر جوڑے دلہن لڑکے والوں کی طرف سے بری میں رکھے ہوئے ہی پہنتی ہے۔یوں بھی مکمل زیور اور چیدہ چیدہ کپڑوں کی نمائش ہوتی رہتی ہے لیکن یوں پوری بری دیکھنے میں نہیں آسکتی جن لوگوں نے قابل ذکر اشیا بنائی ہوتی ہیں ان کی عموماً کوشش ہوتی ہے کہ لوگ یہ سب کچھ دیکھیں لہذا وہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کی

نمائش کے مواقع نکالتے ہیں۔

کڑا کڑوی (گھڑا گھڑولی): اگرچہ یہ رسم اب دیکھنے میں نہیں آتی اور ناپید ہوتی جارہی ہے کیونکہ اس رسم کا تعلق علاقے کے آس پاس کے کنوؤں سے ہوتا ہے۔ پہلے تو اس دور میں کنوئیں ہی نظر نہیں آتے ہر طرف ٹیوب ویل اور بورنگ کا رواج ہوگیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ رسم اب ختم ہوتی جارہی ہے اور پھر آج کل کے نوجوان جو نئی تہذیب کے دلدادہ ہیں وہ بھلا اب کہاں کنوئیں ڈھونڈتے پھریں۔

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے تک جب کہ شہروں میں کنوؤں کا رواج تھا۔ رسم کچھ یوں ہوتی تھی کہ شادی کے کپڑے پہننے سے پہلے لڑکا منہ ہاتھ دھوتا اور اس کے لئے خاص قسم کا پانی ہوتا جو لڑکے کے دوست مہیا کرتے اور وہ یوں کہ برات سے پہلے لڑکے کے دوست ایک نئے گھڑے پر سرخ بنارسی ڈالتے اور ڈھول بجاتے بجاتے ناچتے ہوئے آس پاس کے علاقے کے پورے سات کنوؤں پر جاتے اور تھوڑا تھوڑا پانی گھڑیا میں ڈالتے۔ یوں وہ گھڑیا بھر جاتی تو وہ لے کر لڑکے کے گھر واپس آتے۔ لڑکا اُس پانی سے منہ ہاتھ دھوتا اور پھر کپڑے پہنتا۔ یہ رسم کنوؤں کے ختم ہونے کے بعد بھی کچھ مدت قائم رہی یوں کہ لڑکے کے آس پاس کے علاقے کے ساتھ نلکوں سے گھڑیا بھر لاتے تھے لیکن اب آہستہ آہستہ یہ رسم ختم ہوگئی ہے اس لئے کہ سارے ٹیوب ویلوں کا پانی ایک جیسا ہوتا ہے۔

دیہات میں اس رسم پر اب بھی باقاعدگی سے عمل ہوتا ہے کہ وہاں آسانی سے دولہا کے دوستوں کو اب بھی کنوئیں میسر آجاتے ہیں۔ البتہ شہروں میں وہ لوگ جو اس مسئلے میں بڑے شکی ہیں یا پھر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کم علمی ہے وہ لوگ اب بھی نلکوں کے ذریعے ہی سہی اس رسم کی ادائیگی کرتے ہیں۔ عام طور پر جب دولہا کے دوست ''کڑا کڑولی'' کے لئے نکلتے ہیں تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ اب برات تیار ہے کیونکہ لڑکا کپڑے پہننے والا ہے۔ یاد رہے کہ دولہا کو اس کے دوست ہی سجاتے ہیں اور منہ ماتھا بھی دھلاتے ہیں۔ اس لئے وہ کڑا کڑولی کی رسم کو اب بھی کرتے ہیں لیکن اب تو دولہا بھی بیوٹی پارلر جاتا ہے۔

جنج (برات): کڑا کڑولی کی رسم کے بعد لڑکا شادی کے کپڑے پہنتا ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں جب برات کے جانے کا وقت آتا ہے تو دولہا کو مہمانوں میں لایا جاتا ہے اور خاندان کا کوئی بزرگ یا والد دولہے کو سہرا باندھتا ہے، دعا ہوتی ہے۔ یہاں پر ایک رسم جو اب تبدیل ہو چکی ہے اس کا ذکر نہایت ضروری ہے۔

ہر قوم یا قبیلے میں ایک شخص ہوتا ہے جسے ''نائی'' کہتے ہیں اور جو ساری برادری کو شادی غمی کی اطلاعیں دیتا ہے۔ جب دولہا سہرا باندھتا ہے تو لوگ ''ویل'' دیتے ہیں یعنی کچھ مخصوص رقم جو برادری نے طے کی ہوتی ہے یہ رقم پہلے صرف چار آنے (پچیس پیسے) ہوتی تھی پھر بڑھ کر ایک روپیہ ہوگئی۔ نائی ہر ایک سے لیتا جاتا ہے اور نام کا اعلان کرتا جاتا ہے۔ (اے ویل فلانڑے دی) یہ ویل فلاں نے دی ہے پھر یہ طریقہ بدل گیا کہ اس میں وقت ضائع ہوتا تھا۔ اور یوں ہونے لگا کہ مہمان آتے ہیں دروازے پر بیٹھے ہوئے شخص کے پاس ویل جمع کرواتے اور نام لکھواتے جو پھولوں کا ہار پہلے نائی پہناتا تھا وہ نام لکھواتے وقت وصول کرتے۔ آہستہ آہستہ یہ بات بھی بڑھتی گئی ویل ایک روپے سے بڑھ گئی اور پھولوں کے ہار کی جگہ صرف ایک پھول گلاب یا کسی اور چیز نے لے لی۔ لوگ سہرے کے چھپے ہوئے رومال اور ٹافیوں کے پیکٹ وغیرہ دینے لگے لیکن یہ طریقہ کار بہت جلد ختم کر دیا گیا۔ شہروں میں یہ رسم ختم ہے البتہ دیہات میں کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔

جب دولہا سہرا پہن لے تو پھر برات جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ آگے آگے بینڈ باجہ ہوتا ہے، گھوڑے پر دولہا سوار ہوتا ہے (اب اس رسم میں اتنی تبدیلی آگئی ہے کہ دولہے کے لئے ایک موٹر کار سجائی ہوتی ہے جس میں وہ بیٹھتا ہے اور اس کار کو رخصتی کے وقت ڈولی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دولہے کے دوست آگے آگے ناچ رہے ہوتے ہیں یوں یہ برات ناچتی گاتی آتشبازی کرتی ہوئی لڑکی والوں کے گھر پہنچتی ہے۔ دولہا گھوڑے سے اترتا یا پھر موٹر کار سے نکلتا ہے، لڑکی کے گھر کے دروازے پر استقبال کے لئے لڑکی والے کھڑے ہوتے ہیں۔

دُد پلائی (دودھ پلائی): دولہے کے والدین اور دوست دولہے کو لے کر دروازے پر پہنچتے ہیں جہاں لڑکی کی بہن یا والدہ یا کوئی اور اہم خاتون ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لئے کھڑی ہوتی ہے۔ دولہا اس پیالے میں سے تھوڑا سا دودھ پیتا ہے اور پھر باقی پیالہ لڑکے کے دوستوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو ایک ایک گھونٹ پیتے ہیں۔ یہاں پر دولہا دودھ پلانے والی کو ایک سو سے لیکر پانچ سو روپے تک ''دودھ پلائی'' دیتا ہے۔ اگر نکاح پہلے نہیں ہوا تو نکاح کی تیاری ہوتی ہے اور اگر نکاح پہلے سے ہوا ہے تو پھر سب سے پہلے براتیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جب زن و مرد کھانا کھا لیتے ہیں تو عام لوگ چلے جاتے ہیں اور لڑکے کے نزدیکی رشتہ دار وغیرہ رہ جاتے ہیں۔ اب دولہے کو اندر عورتوں میں بلایا جاتا ہے یہاں پر ہر خاندان یا قبیلے کی علیحدہ علیحدہ رسمیں ہوتی ہیں۔ ہم یہاں پر صرف اُن رسموں کا ذکر کریں گے جو تقریباً سارے ہندکو معاشرے میں مشترک ہیں۔

شیشہ (آرسی مصحف): اس رسم میں یوں ہوتا ہے کہ دولہا دلہن کو ایک جگہ بٹھا کر اُن پر سرخ کپڑا ڈال دیا جاتا ہے اور اُن کے درمیان آئینہ رکھ دیا جاتا ہے تا کہ وہ پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو آئینے میں دیکھ لیں۔ دونوں کو بٹھاتے وقت دونوں کے شیشہ دار روکنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کا فریق پہلے نہ بیٹھے۔ یہ بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ ہر فریق کے لوگ اپنے اپنے فریق کو پہلے بیٹھنے سے روکتے ہیں۔ دوسری طرف دولہا دلہن یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اگر پہلی مرتبہ ہی دب گئے تو پھر ساری زندگی بیٹھنے والا اپنے موقف میں ہار مانتا رہے گا جو لوگ اسے صرف ایک رسم سمجھتے ہیں وہ مذاق کے طور پر تو اس کے قائل ہوتے ہیں مگر ساری زندگی اس کے اثرات کے قائل نہیں ہوتے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ لڑکی پہلے بیٹھ جاتی ہے مگر کبھی کبھی لڑکا بھی بیٹھ جاتا ہے۔ جب دونوں بیٹھ چکیں تو شیشے (آئینے) میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ بعض لوگ شیشے کی رسم میں دولہا دلہن سے قرآن شریف کی ایک آیت بھی پڑھواتے ہیں اور دولہا کچھ پیسے شیرنی کے طور پر قرآن پر رکھتا ہے لیکن یہ عام طریقہ نہیں ہے۔ شیشے کے بعد دودھ گلاس میں آتا ہے اور دولہا دلہن ایک دوسرے کو پلاتے ہیں پھر کوئی کھانے کی میٹھی چیز مٹھائی وغیرہ لائی جاتی ہے جو دولہا دلہن اپنے ہاتھ سے ایک دوسرے کو کھلاتے ہیں۔

شیشے کی رسم ادا کرنے سے پہلے جب دلہن کو لایا جاتا ہے تو دلہن کی سہرا بندھائی بھی ہوتی ہے۔ لڑکے والے اپنے ساتھ دلہن کے لئے لائے ہوئے سہرے کی نمائش کرتے ہیں اُسے سات سہاگنوں کے ماتھے سے لگا کر دلہن کو باندھا جاتا ہے۔ اس کے بعد دولہا کو بلایا جاتا ہے۔ یہ سہرا بندھائی خاندان کی بزرگ یا کسی سید زادی سے کرائی جاتی ہے۔ بعض لڑکے والے جب دلہن کو اُس کے کمرے میں بٹھا کر رہے ہوتے ہیں تو وہیں پر سہاگنوں کے ماتھے سے لگا ہوا سہرا باندھ لیتے ہیں۔

سلام کرائی: شیشہ کی رسم کے بعد دولہا کو دلہن کے رشتہ داروں کے پاس لے جایا جاتا ہے تا کہ متعارف بھی ہو جائے اور رشتوں کی پہچان بھی ہو جائے۔ دولہا ہر ایک کو سلام کرتا ہے اور جسے سلام کرتا ہے وہ سلامی کے عوض اُسے کچھ رقم دیتا ہے۔ یہ رقم اک سو سے لے کر ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ خاص طور پر لڑکی کا باپ بھائی اور لڑکی کی ماں ایسے موقعوں پو طلائی انگوٹھی گھڑی اور اسی قسم کے دوسرے بڑے تحفے سلامی میں اپنے داماد کو دیتے ہیں جب سلام کرائی کی رسم ختم ہو جاتی ہے تو پھر جانے کی تیاری ہوتی ہے۔

دلہن کو لے جانے سے پہلے بعض خاندانوں کی اپنی نجی رسمیں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ چونکہ مجموعی نہیں لہذا زیر بحث نہیں لائی جا رہی ہیں۔

ودائیگی (رخصتی): جب سب رسمیں ختم ہو جاتی ہیں تو رخصتی کا وقت آتا ہے۔ دولہا دلہن کے والدین آپس میں ملتے ہیں۔ دولہا اپنے نئے رشتہ داروں سے ملتا ہے۔ دولہن اپنے والدین، بہن بھائیوں، عزیز رشتہ داروں سے ملتی ہے۔ اُس کے بعد اپنی سہیلیوں سے ملتی ہیں جو اُس وقت ''ودائیگی'' کے گیت جو بغیر ڈھولک کے ہوتے ہیں گا رہی ہوتی ہیں۔ اگرچہ خوشی کا موقعہ ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ منظر خاصا رقت انگیز ہوتا ہے۔ دلہن بھی رو رہی ہوتی ہے اور اُس کے والدین، بہن بھائی بھی رو رہے ہوتے ہیں آخر کار ڈولی گھر کے دروازے کے قریب لائی جاتی ہے اور قرآن کے سائے تلے دلہن کو بزرگ اور بھائی سہارا دے کر ڈولی میں بٹھاتے ہیں۔ قدیم عہد میں اس ڈولی کو بھائی چند قدم اٹھاتے بھی تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے کیونکہ اب ڈولی کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے اب تو سجی سجائی موٹر کار ہوتی ہے جس میں دلہن اور دلہا بیٹھتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ رخصتی کے بعد اہل شیعہ ایک رسم مزید کرتے ہیں کہ دلہن کو گھر لے جانے سے پہلے کسی امام بارگاہ پر حاضری دیتے ہیں۔ دلہن وہاں شمع روشن کرتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ دلہن پہلے بی بی فاطمہ زہرا کے در پر حاضری دے اور بعد میں اپنے گھر جائے۔

لڑکے والے دلہن لے کر جب اپنے گھر پہنچتے ہیں تو گھر کے دروازے پر قرآن شریف لئے گھر کا بزرگ کھڑا ہوتا ہے تا کہ نئے گھر میں دلہن قرآن کے نیچے سے ہو کر گزرے۔ لیکن گزرنے سے پہلے دروازے پر ایک دنبے یا بکرے کی قربانی دی جاتی ہے اور دلہن کو اُس قربانی کے اوپر سے گزار کر گھر میں قرآن کے سائے تلے سے ہو کر داخل کیا جاتا ہے۔ دلہن کو اُس کے سجے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے اور یہیں سے دولہن کی شب عروسی شروع ہوتی ہے۔

حاضری (دعوت ولیمہ): برات کے فوراً بعد ہی دوسرے دن حاضری ہوتی ہے یعنی لڑکے کی طرف سے پوری برادری کو کھانے کی دعوت ہوتی ہے۔ اس پروگرام کو لفظ ''حاضری'' سے اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ اس میں عجز و انکساری پائی جائے۔ اس شادی کے سلسلے میں اپنے پرائے برادری نے اپنا قیمتی وقت دے کر جو رونق بخشی ہوتی ہے دراصل حاضری ان خدمات کا شکریہ کے ساتھ اعتراف ہوتا ہے اور اپنی توفیق کے مطابق جو لڑکے والے حاضر کر سکتے ہیں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دراصل ان رسوم میں اکثر ایسی رسومات من وعن یا ترمیم و اضافے کے ساتھ شامل ہیں جو گندھارا تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہیں اور اس علاقے میں آمد اسلام سے

پہلے بھی رائج تھیں جن میں سے ایک ''حاضری'' بھی ہے۔ اسلام کے بعد ولیمہ کی شکل میں یہ حاضری کی رسم ایک شرعی وظیفہ بھی بن گیا۔ لہٰذا کسی بھی شادی میں حاضری ضروری ہے خواہ اُس میں اعلیٰ قسم کا کھانا کھلایا جائے خواہ معمولی مگر حاضری کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

مُو دکھلائی (دلہن کو دیکھنا): جب قوم برادری کے افراد ولیمہ کی دعوت کھا رہے ہوتے ہیں تو اُس وقت لڑکے والے دلہن کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں جو بھی دیکھتا جاتا ہے کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہے بعض لوگ یہ رقمیں ناموں کے ساتھ لکھتے بھی جاتے ہیں۔ اسے ''منہ دکھلائی'' کہتے ہیں۔ یہ رسم لڑکی کے گھر کی سلام کرائی کی طرح ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لڑکا لڑکی کے گھر اُس کے ہر ایک عزیز و اقارب کے پاس جاتا ہے، سلام کرتا ہے اور سلام کرائی وصول کرتا ہے۔ اس کے برعکس لڑکے والے لڑکی جو کہ ایک سجے ہوئے تخت پر بیٹھی ہوتی ہے اس کے پاس جاتے ہیں، گھونگھٹ میں سے چہرہ دیکھتے ہیں اور پیسے دیتے ہیں بعض اوقات اس موقعہ پر جہیز اور بری کی نمائش بھی ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اب تک لڑکی اور لڑکے والے دونوں فریق شادی کی ہر منزل اپنے عزیز اقربا اور برادری کو ساتھ لے کے طے کرتے ہیں لیکن ولیمے کی دعوت کے بعد جو کچھ بھی ہو اب دونوں سمدی گھرانے کرتے ہیں یعنی اس بارے میں اب کسی اجتماع کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے شکریے کے طور پر بھی دعوت ولیمہ دی جاتی ہے۔ اس آخری پروگرام یعنی دعوت ولیمہ میں دلہن کے گھر کے چیدہ چیدہ اشخاص بھی (زن و مرد) شریک ہوتے ہیں۔

چوتھی (لڑکے کی پہلی دعوت): چوتھی کی رسم کچھ یوں ہوتی ہے کہ لڑکی سسرال میں دو دن رہ کر میکے واپس آتی ہے اور ٹھیک چوتھے دن دولہا سسرالی گھر اپنے دوستوں اور والدین کے ساتھ آتا ہے۔ کھانا کھاتا ہے اور پھر دلہن کو لے کر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ یوں تو اس رسم کو چوتھی کی رسم جو شادی سے چار دن بعد ادا ہوتی ہے کہتے ہیں لیکن اب ایسا نہیں ہے کبھی لڑکی چھٹے دن واپس میکے آتی ہے کبھی کبھی آٹھ دن بھی گزر جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ قدیم ایام سے اس رسم کا نام ''چوتھی'' رکھا گیا ہے لہٰذا آٹھویں دن بھی ادا ہو تو اسے چوتھی ہی کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر بھی لڑکی والے دلہن دولہا اور اس کے والدین، بہن بھائیوں کو تحائف وغیرہ دیتے ہیں۔

ان براری: برات کے موقع کی ایک خاص رسم ''ان'' رزق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ویسے رسم کے لحاظ سے کسی حد تک اپنے معنی یعنی اناج کے بھی ہو سکتے ہیں۔ جب برات آتی ہے اور دولہا گھوڑے یا موٹر کار سے اتر کر لڑکی کے گھر تک آ رہا ہوتا ہے تو اوپر کی منزل میں دلہن کی سہیلیاں شکر وغیرہ پھینکتی ہیں اس ہنگامے میں جب کہ دولہا اپنے دوستوں میں گھرا ہوتا ہے۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھڑی دلہن سے اناج کی ایک مٹھی بھی پھینکوائی جاتی ہے اور پھر آخر میں پھولوں کی بارش میں دلہن سے کبھی کبھی پانی کے چھینٹے بھی مروائے جاتے ہیں۔ اس رسم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس گھر میں آنے والا مہمان اک نیا گھر بسا رہا ہے اس گھر کے تعاون سے اللہ کرے کہ اس نئے گھر میں رزق پانی وافر ہو اور میٹھی چیز یعنی شکر کے پھینکنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نیا گھر اولاد نرینہ سے پھلے پھولے۔

ان قراری: اس رسم کا یہ مطلب ہوتا ہے رزق برقرار رہے۔ شادی میں دلہن یوں تو ہر کام کرتی رہتی ہے مگر جب مہندی لگ جائے یعنی جب مایوں بیٹھ جائے جسے ''مایاں'' بھی کہتے ہیں تو پھر اُس کے بعد لڑکی سے باورچی خانے کا کام نہیں لیا جاتا اور ساتھ ہی جھاڑو وغیرہ کا کام بھی دلہن سے نہیں کروایا جاتا۔

لیکن جب رخصتی کا وقت آتا ہے تو جانے سے پہلے دلہن کو گھر کے باورچی خانے میں لے جایا جاتا ہے جہاں پر چولہے کے قریب وہ اپنے ہاتھ سے دیا جلاتی ہے۔ قدیم میں دیئے کا رواج تھا لیکن اب دیئے کی جگہ موم بتی جلا دی جاتی ہے۔ بڑے بوڑھے خاص طور پر مستورات اس رسم کی تفصیل اور مقصد یوں بیان کرتے ہیں کہ دلہن چونکہ اب نئے گھر جاتی ہے پہلے تو اس کا رزق اس گھر میں آتا تھا لیکن وہ اس رسم کے ذریعے یہ دعا کرتی ہے کہ میں چلی بھی جاؤں تو میرے نئے رزق کے ساتھ میرے باپ کے گھر کے رزق میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ لہٰذا اس رسم کو ''ان قراری'' یعنی باہل کے گھر میں بھی رزق کا برقرار رکھنا کہتے ہیں۔

ہندکو لوک کہانیاں

راجہ رسالو:

ہندکو کلاسیکی ادب کی دوسری لوک کہانی جس کے آثار اٹک کے پہاڑی سلسلے اور ہری پور کے علاقے میں موجود ہیں۔ بہادری اور محبت کی لازوال داستانیں اپنے اندر قدیم گندھاری ماحول، عقائد اور تاریخ کو اپنے سینے میں رکھتی ہے۔ اس علاقے کے چھوٹے چھوٹے مہاراجوں کی شہزادیوں سے محبت کی داستان جبکہ محبوبہ کے ساتھ پورے پورے علاقے ہی ملوث ہوتے اور اس حوالے سے خوفناک جنگیں

وقوع پذیر ہوئیں۔

جنگ مہابھارت کے بعد گندھارا کا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ سیالکوٹ کے راجہ سالیایں کا بیٹا جو اپنے سوتیلے بھائی پورن سے بڑا تنگ تھا ایک دن تفریح اور شکار کی غرض سے راجہ سری کپ کی حدود میں گھس آیا اور راجہ سری کپ کی اکلوتی بیٹی کوکلاں کو سہیلیوں کے جھرمٹ میں دیکھ کر اُس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ مگر اب یہ رواج نہ تھا کہ سوات سے لے کر اٹک تک کا راجہ ہوڈی بس شہزادی کوکلاں کو پسند کرتا ہے لیکن شہزادی کوکلاں اسے پسند نہیں کرتی اور وہ رسالو کو چاہنے لگتی ہے۔ راجہ سری کپ شطرنج کا ماہر ہے لیکن محبت کی اس چال کے آگے اپنے آپ کو بے بس پایا ہے۔ وہ رسالو کو ہر طرح سے رسوا اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر رسالو کی قسمت ساتھ دیتی ہے اور وہ ہر آزمائش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ شہزادی کوکلاں کے سویمبر میں شطرنج کی بازی کی جیت رکھ دیتا ہے۔ راجہ موڈی اور رسالو دونوں اس سویمبر میں شریک ہوتے ہیں مگر رسالو راجہ سری کپ سے بازی جیت جاتا ہے۔ سری کپ اسے اپنی توہین سمجھ کر دوسری بازی میں اپنی سلطنت کے ہزارے کے حصے کا داؤ لگاتا ہے۔ رسالو یہ بازی بھی جیت کر اپنی محبوبہ کوکلاں اور ہزارے کی سرزمین پر راج کرنے لگتا ہے اور تربیلا کو اپنا صدر مقام بناتا ہے۔

دوسری طرف جب رسالو کے سوتیلے بھائی پورن کو رسالو کی کامیابیوں کا پتہ چلتا ہے اور پورے واقعات سے آگاہ پڑتا ہے تو وہ راجہ موڈی سے تعلقات پیدا کرتا ہے اور اپنے سوتیلے بھائی رسالو کے خلاف اُسے اُکساتا ہے یہاں تک کہ راجہ موڈی تربیلا پر حملہ کروا دیتا ہے۔ راجہ رسالو بڑی بے جگری سے لڑتا ہے اور راجہ موڈی کو قتل کر دیتا ہے لیکن اسی وقت رسالو کا سوتیلا بھائی پورن جو موڈی کی طرف سے اس جنگ میں موجود ہوتا ہے رسالو کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یوں رسالو کی فوج بھاگ جاتی ہے او پورن رسالو کے محل پر قبضہ کر کے رانی کوکلاں کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے مگر رانی کوکلاں اس کے بدلے۔ دریائے سندھ میں کود جانا پسند کرتی ہے۔ یوں وفا کی یہ کہانی رسالو اور رانی کوکلاں کی موت پر آ کر ختم ہوتی ہے۔

سیف الملوک:

یہ لوک کہانی ہزارہ کے پہاڑی علاقے کاغان سے تعلق رکھتی ہے اور ہندکو زبان کے دیومالائی عہد کی یاد دلاتی ہے۔ اسی لئے اس میں دیوؤں، جنوں اور پریوں کے حوالے ملتے ہیں اور مشترکہ طور پر پنجاب اور سرحد میں مشہور ہے۔ لیکن گندھارا کا کچھ علاقہ اب پنجاب میں شامل ہے لہذا سیف الملوک پر پنجاب میں بھی خاصا کام ہو چکا ہے۔ اس کہانی کے حوالے سے شواہد کے طور پر کاغان میں جھیل سیف الملوک اور اس کے قریب ہی ایک پہاڑ ہے جسے دیو کے پتھر ہو جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے اب بھی موجود ہے۔ محبت کی یہ لازوال داستانیں پنجاب کے ساتھ ہندکو لوک ورثے کا بھی حصہ ہے۔

شولاں باشہ ذاری:

یہ داستان ڈیرہ اسماعیل خان کے قدیم عہد سے تعلق رکھتی ہے کافر کوٹ سے شروع ہو کر کوہاٹ سے ہوتی ہوئی پشاور اور پھر واپس کافر کوٹ کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ اُس زمانے کی داستان ہے جب کہ ذات پات کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اگر پنڈتوں کی بات بھی کوئی نیچ سن لیتا تو اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا جاتا تھا اور کوئی کسی شہزادی کو دیکھ لیتا تو آنکھوں سے محروم ہو جاتا۔ بازار سے جب راجہ اور اُس کی رانی یا شہزادیوں کی سواریاں گزرتیں تو نوکر آنکھیں بند کر لیتے۔

کافر کوٹ کے راجہ کی سواری بازار سے گزرتی جس کے ساتھ اُس کی اکلوتی بیٹی بھی ہوتی۔ مون ایک حلوائی تھا جو سواری کے جلوس کو چوری چھپے دیکھتا اور یوں اُسے شہزادی سے عشق ہو گیا۔ ایک دن وہ اپنی بیقراری کو نہ چھپا سکا، اُس نے ایک خاص قسم کے حلوے کا تھال تیار کیا اور جب راجہ کی سواری گزری تو یہ ایک دم سامنے آ گیا اور حلوے کا تھال شہزادی کو پیش کرنے لگا۔ اونچ نیچ اور چھوت چھات کے اس دور میں بادشاہ اور درباریوں کو سون کی یہ حرکت اچھی نہ لگی لہذا سواری کے گزرنے کے بعد سون کو گرفتار کر کے اندھے قید خانے میں ڈال دیا گیا تا کہ اس کی سزا تجویز ہو۔ راجہ کا مہانتری جو کہ چاہتا تھا کہ راجہ کی اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ شہزادی سے شادی کر کے سلطنت کا وارث بنے گا وہ سون کا خاص طور سے دشمن بن گیا۔ اب جب راجہ کی سواری گزرتی تو شہزادی سون کو اپنی دوکان پر نہ دیکھتی، وہ سمجھ گئی کہ یہ سب کچھ وزیر کا کیا دھرا ہے۔ اُس نے اپنے اتالیق کے ذریعے سون کا پتہ کر لیا اور قید خانے پہنچ کر سون کو آزاد ہونے کی تلی دینے لگی اس لئے کہ شہزادی کو بھی سون سے پیار ہو گیا تھا۔ یہ خبر جب وزیر تک پہنچی تو اُس نے سون کو دربار میں پیش کر کے پنڈتوں کے حکم پر اُس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ لیکن شہزادی سے یہ منظر نہ دیکھا گیا اور وہ اپنی نشست سے اٹھ کر سون کو کہنے لگی، ''تم نے میری چھت میں اپنی آنکھوں کا نذرانہ پیش کیا لہذا آج سے میں تمہاری آنکھیں ہوں گی''۔ اور وہ سون کو لے کر دربار سے نکل گئی۔ دستور کے مطابق اگر اونچی ذات کی لڑکی سے ایسا

کام ہو جاتا تھا تو اُسے ملک بدر کی سزا ملتی تھی لہذا سون اور شولاں شہدی کو ملک بدر کر دیا گیا۔ شولاں اپنے محبوب کو لے کر پشاور کی طرف چل پڑی۔ کہتے ہیں شہزادی کا نام کسی کو سلام نہیں۔ شولا تو شاعری کی ایک صنف تھی جو اس شہزادی نے ایجاد کی۔ وہ راستے میں اپنے محبوب کو جو اشعار سنا سنا کر اس کا حوصلہ بڑھاتی اور اُسے زندہ رہنے کے لئے تیار کرتی۔ وہی باتیں ''شولا'' سکھاتی ہیں۔ شولاں اپنے محبوب کو مہینوں کی منزلیں طے کر کے پنروے آئی اور یہاں وہی ٹولا گا کر اپنے اور اپنے محبوب کے لئے رزق کماتی۔ دوسری طرف راجہ اپنی بیٹی کے غم میں بیمار رہنے لگا۔ وزیر نے اُسے زہر دے کر مار ڈالا اور سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ مگر کچھ ہی مدت کے بعد عوام وزیر کے مظالم سے تنگ آ گئے اور امرا نے یہ فیصلہ کیا کہ شولاں کو ڈھونڈا جائے تا کہ اُسے لا کر تخت نشین کیا جائے اور اس ظالم وزیر سے گلو خلاصی ہو۔ لہذا چاروں طرف بادشاہ کے وفادار لوگوں کو بھیجا گیا تا کہ وہ شہزادی کو پتہ لگائیں۔ ایک وفادار ڈھونڈتے ڈھونڈتے روم پہنچا اور اُس نے بازار میں شہزادی کو ٹولا گا کر بھیک مانگتے دیکھ لیا۔ اُس نے چپکے سے کافرکوٹ اطلاع بھیجی کہ شہزادی کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔ کافرکوٹ سے راجہ کے وفادار اصحاب پشاور ہی پڑے اور یہاں آ کر راجکماری کو مجبور کیا کہ وہ آ کر اپنے پتا جی کی سلطنت کو بن لے اور اس کے بدے سون کی راجکماری کے ساتھ رکھنے کی شرط بھی منظور کر لی گئی۔ مگر جب راجکماری اور سون اپنے ملک پہنچے تو مہانتری جو کہ راجہ بن بیٹھا تھا اس کے مخبروں نے اطلاع دی لہذا اُس نے آبادی سے باہر ہی ان سب کو گرفتار کر لیا اور یوں راجکماری اور سون کو پھر اندھے تہہ خانے میں بند کر دیا۔ اب مہانتری روز اس تہہ خانے میں جاتا اور شہزادی کے سامنے سون پر کوڑے برساتا تا کہ شہزادی مجبور ہو کر وزیر سے شادی کر لے اور یوں وہ سلطنت کا جائز وارث بن بیٹھے۔ لیکن لاکھ سزا کے باوجود نہ تو سون اپنی محبت سے انکار کرتا اور نہ راجکماری مہانتری سے شادی کا اقرار کرتی۔

آخر مہانتری کے اس مظالم سے تنگ آ کر ایک دن سون اور راجکماری نے اس اندھے تہہ خانے کے اندر ہی اپنے دیوتاؤں کو پکارا اور یوں کافرکوٹ میں ایک عظیم زلزلے کے ساتھ آندھی چلی اور سیلاب آ گیا۔ عوام سمجھ گئے کہ دیوتا ہم سے خفا ہو گئے ہیں کیونکہ اُنہی کی مرضی پر راجکماری اور سون دوبارہ اپنے ملک آئے تھے لہذا وہ اس اندھے قید خانے کی طرف دوڑے اور قید خانے کے دروازے توڑ ڈالے۔ اُس وقت تک قید خانہ بھی پانی سے آدھا آدھا بھرا ہوا تھا لیکن مہانتری اپنے جنون میں سون کو کوڑے مارتا تھا۔ لوگوں نے مہانتری کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ سون اور راجکماری کو لیکر نکلے پورا شہر سیلاب کی زد میں تھا۔ لوگ ان دونوں کو بچانے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن شولاں کا خیال ہی کچھ اور تھا اُس کا اس دنیا سے دل بھر گیا تھا۔ اُس نے سون کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور پانی کی طرف جاتے ہوئے سون سے کہا:

''سون مین نے ایک دن کہا تھا نہ کہ اب میں تمہاری آنکھیں ہوں''۔

سون بولا:

''تم اب بھی میری آنکھیں ہو''۔ راجکماری نے ایک دم سوال کیا۔

''تو جدھر میں لے جاؤں چل پڑو گے''۔ سون فوراً بولا:

''کیوں نہیں''۔ راجکماری نے سون سے کہا:

''سون! یہ دنیا بڑی بے وفا ہے۔ یہاں سکون نہیں ہے۔ آؤ ہم ایسی جگہ چلے جائیں جہاں پر اس دنیا والوں کے ہاتھ نہ پہنچیں''۔ اور یوں وہ سون کو لے کر انڈے اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرف چل پڑی۔ کافرکوٹ کے لوگ لاکھ چلاتے رہے، راجکماری اس طرف مت جاؤ، ڈوب جاؤ گی مگر شولاں نے ایک نہ مانی اور سون کو لے کر سیلاب کی گود میں اتر گئی۔ یوں ایک طرف یہ کہانی ختم ہوئی اور دوسری طرف آندھیطوفان اور سیلاب نے اس شہر کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ کہتے ہیں ہر سال جب شولاں پر ظلم کے دن آتے ہیں اس دریا میں سیلابی کیفیت پیدا کر کے اس لازوال پیار کی یاد دلاتی ہے۔

صدیاں گزرنے کے بعد اس کہانی کی دربار گاہیں آج بھی موجود ہیں۔ ایک ہندکو زبان و ادب میں ''شولا'' کی صنف اور دوسرا سون کا پیش کیا ہوا خاص قسم کا حلوہ جو ابھ بھی ڈیرہ اسماعیل خان کا خاص تحفہ ہے اور لوگ خوشی اور محبت میں ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں۔

ماروبا، ماروبئ، محبوبئ:

پشاور گندھارا کا مرکز رہا ہے لہذا اس میں اُس وقت کے شاہی انتظام کا ایک جزو سرنگیں ہوتی تھیں کہ جب بادشاہ پر کوئی وقت پڑے تو ان سرنگوں کے ذریعے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکے یا پھر ان کے ذریعے کم سے کم وقت میں شاہی فرمان دوسرے علاقوں میں پہنچ سکے۔ مگر پشاور کی بار بار تباہی و بربادی کی وجہ سے اور بدلتی ہوئی جدید جنگی حکمتِ عملی کی وجہ سے ایک دور ایسا بھی آیا کہ ان سرنگوں کی ضرورت نہ رہی اور یہ سرنگیں ناپید ہونا شروع ہو گئیں۔ ہندکو زبان کی یہ لوک کہانی اسی قسم کی ایک ویران سرنگ کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

کہتے ہیں افغانستان کے دریائے کنڑ کے مغربی کنارے سے ایک قبیلہ اٹھا اور نقل مکانی کر کے پشاور میں اسی سرنگ کے دہانے پر آباد ہو گیا۔ ماروبئ اس

قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی اور بڑی خوبصورت تھی۔ پش قبیلے کی یہ الڑ دوشیزہ، آس پاس کی آبادی کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی، دور دور تک ماروبئ کے حسن کے چرچے ہونے لگے۔ پشاور کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے اس علاقے میں مٹی لینے آیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کا سامنا ماروبئ سے ہو گیا۔ جب نورنگ اور ماروبئ کی آنکھیں چار ہوئیں تو پھر وہ ایک دوسرے پر فدا ہو گئے۔ سردار نے ماروبئ کی منگنی قبیلے کے ایک جوان سے کر رکھی تھی مگر ماروبئ سلاکو کو قطعاً پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک دن سلاکو نے ماروبئ اور نورنگ کو سرنگ کے قید خانے میں باتیں کرتے دیکھ لیا۔ سلاکو نے قبیلے کی پنچایت میں یہ معاملہ پیش کر دیا۔ پنچایت نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ سلاکو اور ماروبئ کی شادی آٹھ دن کے بعد ہو جائے اور اس وقت تک ماروبئ کو گھر میں قید رکھا جائے۔ نورنگ روزانہ آتا، سرنگ کے دہانے پر دن گزار دیتا مگر ماروبئ نہ آ سکتی۔ جب سردار نے اپنی بیٹی کو اس حال میں دیکھا اور ماروبئ سے سنا کہ وہ سلاکو سے وحشت زدہ ہے تو اس نے پنچایت کے متفقہ فیصلے پر احتجاج کیا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی سلاکو کے کرتوتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اُس نے پنچایت بلالی اور صاف صاف کہہ دیا کہ ماروبئ کو سزا تو دی جائے کہ اُس نے قبیلے سے باہر والے شخص سے پیار کی پینگیں کیوں بڑھائیں لیکن سلاکو نے اُس کی شادی نہ کی جائے اس لئے کہ ماروبئ اُسے پسند نہیں کرتی۔

قبیلے کے لوگوں نے جب سردار کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو وہ سردار کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے سلاکو کے بہکاوے میں آ کر سردار پر حملہ کر دیا۔ سردار کی موت کے بعد قبیلے نے متفقہ طور پر سلاکو کو سردار چن لیا۔ ماروبئ نے جب یہ ظلم دیکھا تو وہ سوچنے لگی کہ اب تو سلاکو کو اُسی سے زبردستی شادی کر کے گالہذا وہ قید خانے سے بھاگی اور سید علی سرنگ کے پہنچ گئی۔ سلاکو سمجھ گیا کہ ماروبئ کہاں ہو گی۔ وہ قبیلے کے لوگوں کو لے کر تہہ خانے کی طرف گیا۔ اُس نے نورنگ اور ماروبئ کو دیکھا مگر وہ دونوں سرنگ کے اندر چلے گئے۔ نورنگ نے دن جلد کرنا چاہا لیکن ماروبئ نے اُسے یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ وہ بڑا ظالم ہے تمہیں جان سے مار دے گا اور مجھے حاصل کر لے گا۔ سلاکو اپنے ساتھیوں سمیت غار کے دہانے پر کھڑا چلاتا رہا۔

''ماروبئ باہر آ جاؤ۔''

''نہیں میں باہر نہیں آؤں گی''۔ سلاکو نے گرج کر کہا

''میں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں باہر آ جاؤ ورنہ یہ غار تمہاری قبر میں تبدیل کر دوں گا''۔ ماروبئ چلاتی:

''میں باہر نہیں آؤں گی۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کرتی''۔ سلاکو کو غصے میں دیوانہ ہو گیا

''ماروبئ یاد رکھ اس بھیانک غار کے سانپ اور بچھو تجھے ڈس ڈس کر میری نفرت کا بدلہ لیں گے۔ تُو موت کو پکارے گی اور موت بھی تجھ سے بھاگے گی''۔ ''ماروبئ نے غار کے جاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہر بات منظور ہے مگر تُو نہیں''۔

سلاکو نے شیطان کی صورت اختیار کر لی اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ غار کا دہانہ پتھروں سے بند کر دو۔ سردار کا حکم ملتے ہی قبیلے والوں نے غار کا دہانہ بند کرنا شروع کر دیا۔ سلاکو اتنا بڑا ظلم کرنے کے بعد بھی مطمعن نہ تھا۔ ماروبئ کے انکار سے جو بے عزتی وہ محسوس کر رہا تھا اُس کا ماروبئ اور نورنگ کو زندہ درگور کرنے کے بعد بھی مداوا نہ ہو سکا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا اور ماروبئ کو پکار رہا تھا۔ مگر ماروبئ برابر انکار کئے جا رہی تھی اور ہر ایک مرتبہ ماروبئ کی آواز آنا بند ہو گئی۔ غار کا دہانہ جو بند ہو چکا تھا۔ لیکن سلاکو کی آواز بند نہ ہوئی۔ وہ برابر ماروبئ پر برس رہا تھا۔ اُسے اب بھی توقع تھی کہ شاید ماروبئ اس کی بان مان لے۔ اِسی اُمید پر وہ بند غار کے آگے چلا رہا تھا۔ اور پھر اچانک ایک بھیانک آواز کے ساتھ پوری زمین لرزنے لگی۔ زلزلے کے خوفناک جھٹکوں نے غار کے پتھروں کو سلاکو اور اُس کے ساتھیوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ یہ زلزلہ اُس وقت تک رہا جب تک کہ سلاکو اور اس کے ساتھی پتھروں کے نیچے دب نہیں گئے۔ کہتے ہیں جب لوگ اس مقام پر پہنچے تو بہت سی لاشیں پتھروں کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ غار کا منہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اُس کے اندر بھی لاشیں تھیں۔ ایک نورنگ کی اور دوسری ماروبئ کی۔

اِس واقعے کے بعد یہاں کی آبادی نے اِس قید خانے کے دہانے کو ''ماروبئ یا محبوبئ دا قید خانہ'' کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام صدیوں سے مشہور ہے۔ قید خانے کے آثار تو گذشتہ چند برسوں میں توسیع شہر کی وجہ سے ناپید ہو گئے مگر اس مقام کو اب بھی ''محبوبئ دا قید خانہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پشاور اور گردونواح میں آباد اقوام

گجر:

جس طرح کہ پشاور کی تاریخ کی قدامت کا تعین نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس خاندان ''گجر'' کے بارے میں قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب سے یہاں پر آباد ہوئے ہیں مگر یہ لوگ بنیادی طور پر وہی لوگ ہیں جنہیں وید نے استا گودے یا

ست گوئے لکھا ہے۔ جس کا مطلب ہے ''سو گائے کے مالک'' یہ گجر خاندان پشاور شہر کے مختلف اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ پشاور کا قدیم ترین خاندان ہے جو اپنی سادہ ثقافتی روایات کے ساتھ زندہ ہے مگر پھر بھی بدقسمتی سے یہ خاندان تاریخ کے اوراق کی زینت نہ بن سکا۔ حالانکہ یہاں کے بسنے والے ہر قوم وقبیلہ اور خاندان کے افراد انہیں اس سرزمین کے قدیم ترین باشندے قرار دیتے ہیں۔ یہ خاندان نسبی لحاظ سے اعوان ہے اور پیشے کے لحاظ سے گجر۔ یہ جب سے یہاں وارد ہوئے ہیں ان کا پیشہ گائے اور بھینس خرید کے ان کا دودھ دھو کر گزر بسر کرنا ہے۔ آج کل کی لغت میں یہ وہی لوگ ہیں جنہیں گوالے کہا جاتا ہے ان کے مکانات سادے' کھلے ہوادار اور مٹی وگارے سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اکثر مکانات کے ساتھ ہی گائے اور بھینسوں کے لئے کشادہ جگہیں مختص ہیں یہ علی الصبح اٹھنے والے محنتی' جفاکش' سادہ پوش وسادہ نوش بندگان خدا ہیں۔ ان کی آپس کی برادری بڑی مستحکم اور یکجا ہے مداومت زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی برادری میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ صدیوں سے مل جل کر اور ایک دوسرے کی غمی وخوشی میں باہمی حصہ لے کر پرانی روایات وثقافت کی حفاظت کرنے والا خاندان ہے۔ اندرون شہر کے محلہ گلاب خانہ' جہانگیر پورہ کے آس پاس علاقہ یکہ توت کے محلہ جٹاں' یکہ توت اور ڈھکی' دالگراں سے اوپر اور کریم پورہ اور اندرون لاہوری گیٹ ان کی قدیم بستیاں ماجی محلہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ہندکو زبان میں بھینس کو مج کہتے ہیں اسی نسبت سے انہیں ماجی یا ماجیان کہا جاتا ہے اور جہاں ان کی بستیاں ہیں انہیں ماجی محلہ کہا جاتا ہے۔ پشاور شہر کے دو علاقوں میں انہیں کی طرف منسوب دو مسجدیں بھی ہیں۔ ایک مسجد علاقہ یکہ توت کے محلہ جٹاں اور ماجی محلہ کے نکڑ پر اور دوسری مسجد علاقہ جہانگیر پورہ میں مسجد ماجیان کہلاتی ہیں۔ یہ لوگ آریائی قبائل کے اسی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ہیں جنہیں ست گوئی یا استاگودے کہا گیا ہے۔ ہیروڈوٹس' بطلیموس اور بابل کی اقوام نے اسی نام سے انہیں یاد کیا ہے۔ یہ لوگ کہاں سے آ کر یہاں آباد ہوئے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ بعض قرائن واحوال سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ غزنی کے آس پاس اپنے اسی پیشے کے ساتھ رہتے تھے اور انہوں نے نقل مکانی اس وقت کی جب امیر ناصر الدین سبکتگین نے ہندی راجاؤں کے خلاف فوج کشی کی تو ان کی فوج میں مختلف قبائل شامل تھے۔ جب راجہ جے پال نے ابتدائی شکست کھائی تو ان قبائل میں اکثر کو پشاور میں آباد کیا۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ ان گجروں نے انہی ایام میں اسلام قبول کیا ہوگا۔ اب تک معلوم تاریخ مین ستاگری کا نام ہیروڈوٹس نے پہلی بار خٹک قبیلے کے لئے استعمال کیا۔ اور اس پر سارے ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے۔ جس میں اکثریت منتشرقین کی ہے۔

جب میں نے اس خاندان سے متعلق تحقیق کا دائرہ وسیع کیا تو پچھلے دو سو سال کے عرصہ میں مجھے اسی خاندان کے گزرے ہوئے بزرگوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔ ان میں عالم گل' عمر دین' سمندر خان' سکندر خان اور عبدالحکیم عرف حکیمو اور حاجی غلام محمد کے بارے میں معلوم ہو سکا۔ اس خاندان میں سے جس گھرانے نے زیادہ شرف وبزرگی حاصل کی وہ حاجی غلام محمد مرحوم کا گھرانہ ہے۔ گجر پیشہ سے ہٹ کر جہانگیر پورہ میں تجارتی کاروبار شروع کیا اور بہت حد تک اپنے اخلاف کو تعلیم وتجارت کی طرف راغب کیا۔ حاجی غلام محمد ایک متمول تاجر کی حیثیت سے علاقے میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے گھرانے سے تہذیب نو کی جو شمع روشن ہوئی اس کے نتیجے میں ان کی اولاد سے تعلیمیافتہ افراد پیدا ہوئے۔ اب یہ خاندان اعوان قوم کے ذیل میں شمار ہوتا ہے۔

اعوان:

متعدد پشاوری لوگ اپنے نام کے ساتھ اعوان لگا کر ایک مخصوص قوم اعوان کے طور پر اپنی شناخت کرواتے ہیں۔ پشاور کے علاوہ اکوڑہ خٹک' ہزارہ اور ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی اعوان قوم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اعوان قوم کے بارے میں تین نظریئے ہیں' ''پہلا نظریہ تو یہ ہے جیسا کہ گجر قوم کے ذیل میں یہ بیان ہوا ہے کہ'' یہاں پر ہر وہ قوم جس نے اسلامی لشکر کی امداد واعانت کی وہ یہ استحقاق رکھتی ہے کہ اپنے نام کے ساتھ اعوان لکھیں جیسا کہ گجر لوگ بھی اپنے آپ کو اسی بناء پر اعوان ظاہر کرتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں''۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس کے ماتحت برصغیر ہندوستان اور خصوصاً صوبہ سرحد کے شمال مغربی علاقوں میں ان کی قدامت پر بحث کی جا سکتی ہے۔ برمنڈر تھ نے اسی نظریئے کی حمایت کرتے ہوئے انہیں بکٹیرین یونانیوں کا وارث کہا ہے۔

مگر یہ لوگ تلفظ کی تبدیلی کے ساتھ اعوان کے بجائے اوان ہیں بعد میں اسے اعوان بنا دیا گیا اس سلسلے میں اعوان قوم کے محقق پروفیسر انور بیگ اعوان نے اس نظریئے کی حمایت کی ہے اور اسے دنیا کی قدیم ترین اقوام میں سے قرار دیا ہے۔

اعوان قوم کا اصلی وطن عیلام یا ایلام تھا جو کہ ایران کے جنوب مغربی صوبے مین ہے یہی وہ عیلام شہر ہے جسے آج کل خوزستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جب یونانیوں کے ساتھ ایرانیوں کی کشمکش شروع ہوئی تو یونانیوں سے تصادم کے نتیجے میں یہاں کے لوگ یونانی تہذیب میں مدغم ہو گئے اس بنا پر انہیں نیم یونانی بھی کہا جانے لگا اور پھر یہ مکرار، ایران، افغانستان اور موجودہ پاکستان کے مختلف شہروں میں آباد ہونے لگے۔ سکندر اعظم کے حملوں اور 327 قبل مسیح میں یہ لوگ پاکستان کے مختلف علاقوں میں موجود تھے جنہوں نے سکندر اعظم کے سامنے اپنی یونانی قوم ہونے کی شناخت کروائی تھی۔

تورات میں لکھا ہے کہ یون اور ھادی دونوں بھائی تھے جو یافث بن نوح علیہ اسلام کی اولاد تھی۔ رگوید میں انہیں یونا لکھا ہے اور سنسکرت کی گرامر کے موجد پانینی نے اسے جمع الجمع کر کے ''یاوانا'' تحریر کیا ہے۔ پشتو تلفظ کے مطابق انہیں اوانی اور اوان لکھا گیا ہے۔

جہاں تک اعوان کا تعلق ہے تو یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت علیؓ کی اس خاتون کی اولاد بتاتے ہیں جو حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد ایک جنگی معرکے کے بعد آپ کی زوجیت میں آئیں۔

محمود غزنوی کے حملوں کے وقت اسلامی لشکر جب برصغیر ہندوستان میں داخل ہوا تو کئی قبائل اور خاندانوں نے ان اسلامی لشکریوں کا ساتھ دیا ان معاون قبائل میں ایک خاندان سیدوں کا بھی تھا اور غالباً یہ وہی سید ہیں جو اپنے آپ کو حضرت علیؓ کی اسی زوجہ کی اولاد ہونے کے ناطے اپنے آپ کو سید کہتے تھے ان کے بزرگ کا نام سید قطب تھا۔ انہوں نے اسلامی لشکر کی پوری طرح مدد کی تو ان کا لقب عون ہو گیا یعنی مددگار۔ تب سے انہیں سید قطب شاہ عون کہا جانے لگا۔ پھر ان کی اولاد اور مرید بھی اعوان کہلائے اور صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ پشاور چونکہ صوبے کا دارالخلافہ ہے اس لئے یہ لوگ یعنی سید قطب شاہ عون کی اولاد اور مرید بھی پشاور آ گئے۔ وہ اعوان جو کہ سید قطب شاہ عون کی اولاد ہیں وہ تو سید اعوان ہیں مگر وہ غیر سید اعوان جو اپنے نام کے ساتھ اعوان لکھتے ہیں وہ یا تو سید قطب شاہ عون کے مریدوں کی اولاد میں سے ہیں یا پھر اوان قوم میں سے ہیں جو کہ یونانی ثابت ہوتے ہیں اور تلفظ کی تبدیلی اوان سے اعوان ہو گئے۔ مختصراً یہ کہ اعوان پشاور کی دوسری بڑی قوم میں سے ہیں یا ایک خاندان ہے جو روز بروز پھیلتا گیا۔

دلہ زاک:

امیر ناصر الدین سبکتگین کے راجہ جے پال پر حملے شروع ہوئے تو اسی وقت سے غزنہ اور آس پاس سے کئی قبیلے ان کے ساتھ آئے اور وہ وادی پشاور و مضافات میں مقیم ہوئے۔ ان میں دلہ زاک قبیلے کے لوگ بھی ہیں جو کہ علمی فضیلت کی بناء پر ممتاز مقام رکھتے تھے۔ سبکتگین نے جب راجہ جے پال پر حملے کئے تو اسی وقت سے پشاور میں باضابطہ طور پر ایک نظام کی صورت میں اسلامی ریاست کے خدو خال نظر آنے لگے تھے اس وقت جو قبیلے امیر ناصر الدین سبکتگین کے ساتھ آئے تھے ان میں دلہ زاک کی اکثریت تھی۔ اس قبیلے کے دو فرد جو باپ بیٹا تھے یوسف اور علی ان دونوں کو سبکتگین نے یہاں پر عہدہ قضاء پر مقرر کیا۔ امیر سبکتگین کے اسی فیصلے کی روشنی میں کوئی ابہام نہیں رہ جاتا کہ 976ء میں وادی پشاور میں اسلامی شریعت کا باضابطہ طور پر نفاذ کا عمل شروع ہو گیا تھا جسے بعد میں دلہ زاکوں کے قبیلے کے لوگوں نے آگے بڑھایا اور انہیں لوگوں کے ذریعے اسلامی تہذیب و اقدار کا فروغ ہوا۔ پشاور شہر کے شمال کی طرف اب بھی دلہ زاکوں کے نام سے ایک گاؤں دلہ زاک موجود ہے جبکہ پشاور سٹی ریلوے سٹیشن سے ان کے گاؤں تک کو جانے والی ساری سڑک کا نام دلہ زاک روڈ ہے۔

قاضی:

پشاور کا ایک معتبر اور علمی فضیلت و برتری کا حامل خاندان ہے۔ پشاور کی تاریخی عمارت گور کھٹڑی اور گھنٹہ گھر کے درمیان بازار کلاں کے پاس ایک محلہ، محلہ قاضی خیلاں کے نام سے ہے جہاں ان قاضیوں کے گھر ہیں۔ پشاور شہر کے علاوہ چھاؤنی کے علاقہ کالی بھاڑی میں بھی قاضیوں کی حویلیاں موجود ہیں ان قاضیوں میں ہندکو وان بھی ہیں اور پشتو بولنے والے بھی ہیں۔ پشاور کے علاوہ نوشہرہ اور مانکی شریف میں بھی قاضی موجود ہیں۔ خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ قاضی ضرور لکھتے ہیں البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ زیادہ قاضی لوگ اپنے نام سے پہلے قاضی لکھتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نام کے بعد قاضی لکھتے ہیں۔

یہ قاضی لوگ اصلاً دلہ زاک ہیں۔ جب ناصر الدین سبکتگین راجہ جے پال کے خلاف حملہ آور ہوئے تو ان کے ساتھ پشاور میں وارد ہونے والی پہلی مسلمان قوم دلہ زاک تھی۔ اس دلہ زاک قوم میں سے یوسف اور علی نامی روحانی پیشواہ اور علم و فضیلت کے حامل باپ بیٹا بھی تھے جو کہ دلہ زاک قوم کے روحانی پیشواہ تھے۔ ان دونوں باپ بیٹے یعنی یوسف اور علی کو امیر سبکتگین نے پشاور میں عہدہ قضاء پر مامور کر دیا۔ بعد میں دونوں باپ بیٹا شہید ہوئے۔ علی کی اولاد قاضی کہلانے لگی اور بعد میں بھی ان کی اولاد ہی میں سے عہدہ قضاء پر مامور ہوئے۔

اللہ بخش یوسفی نے کاغذات مال کے حوالے سے انہیں یوسف زئیوں

قصہ خوانی بازار پشاور میں برٹش راج کے خلاف 1930ء میں لڑنے والے شہداء کی یادگار

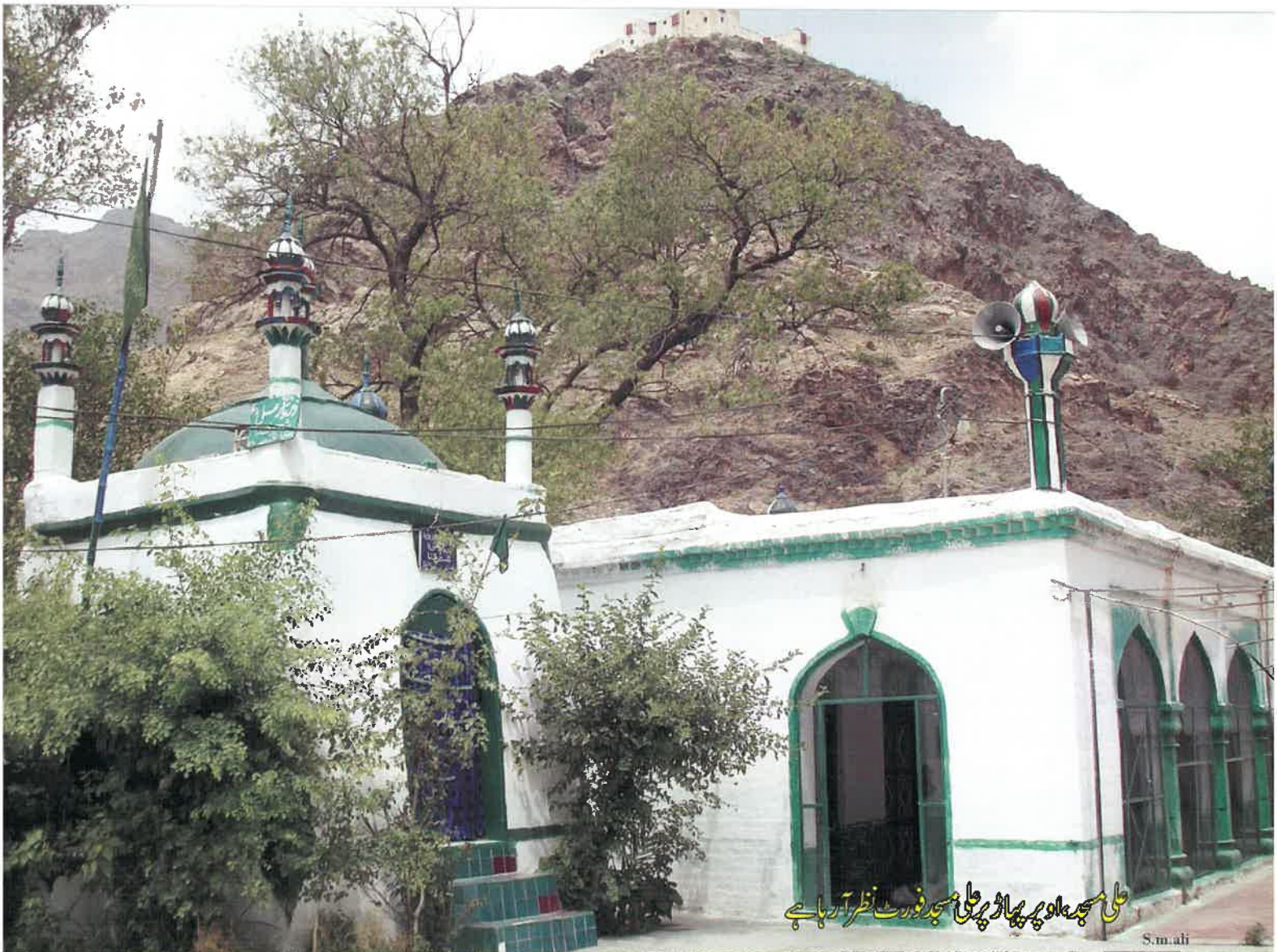

علی مسجد، اوپر پہاڑ پر علی مسجد فورٹ نظر آ رہا ہے

S.m.ali

تحقیق کار علی مسجد کے مہتمم کے ساتھ

S.m.ali

قلعہ جمرود کا بیرونی منظر
S.m.ali

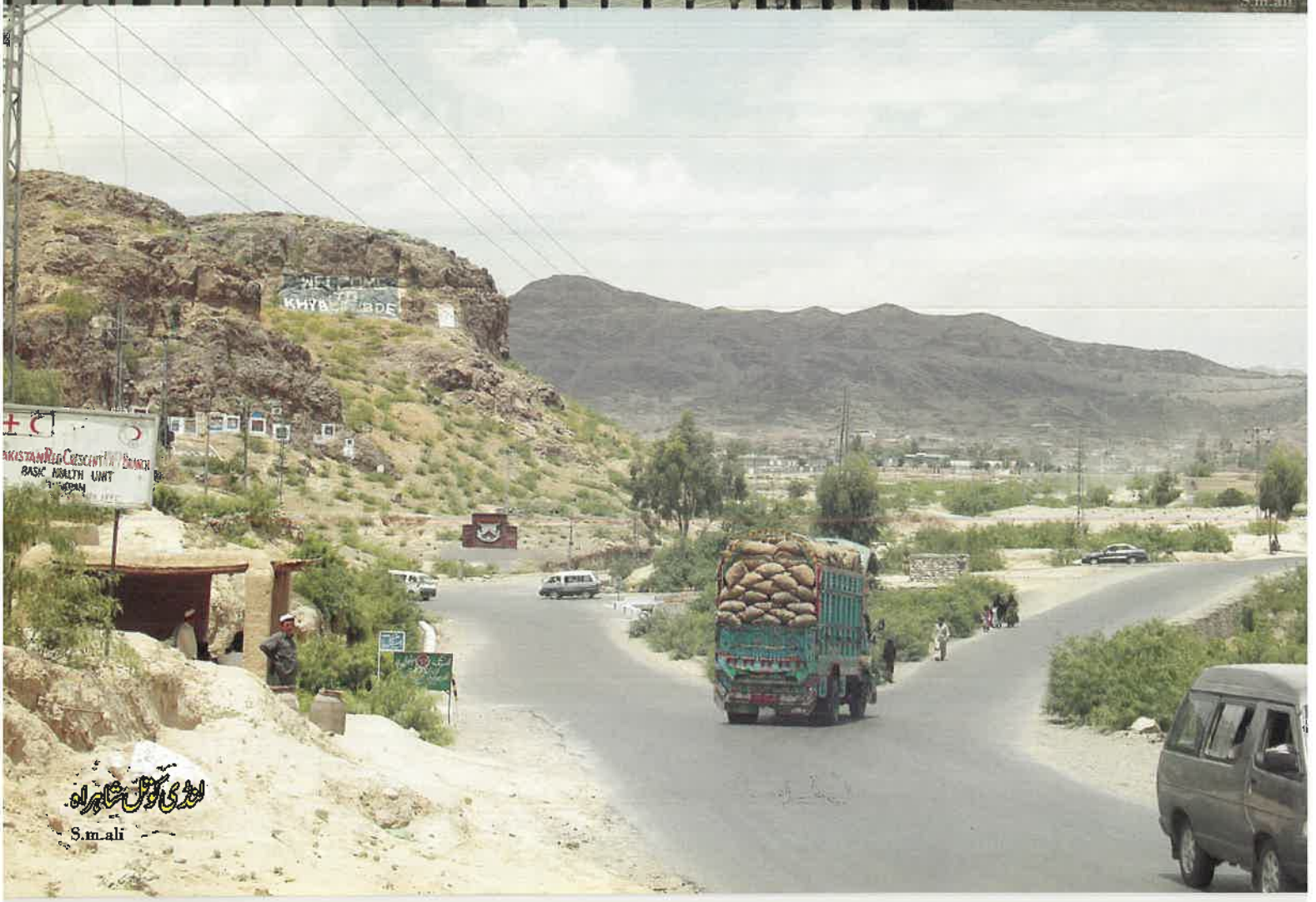
BASIC HEALTH UNIT
لنڈی کوتل شاہراہ
S.m.ali

لنڈی کوتل کے پاس پہاڑ پر مختلف فوجی یونٹوں کے نشانات

پشاور سے طورخم پر انار ریلوے ٹریک نیچے سے پہاڑ سرک جانے کے بعد ہوا میں معلق ہے

مسجد سیّد حسن پیر
S.m.ali

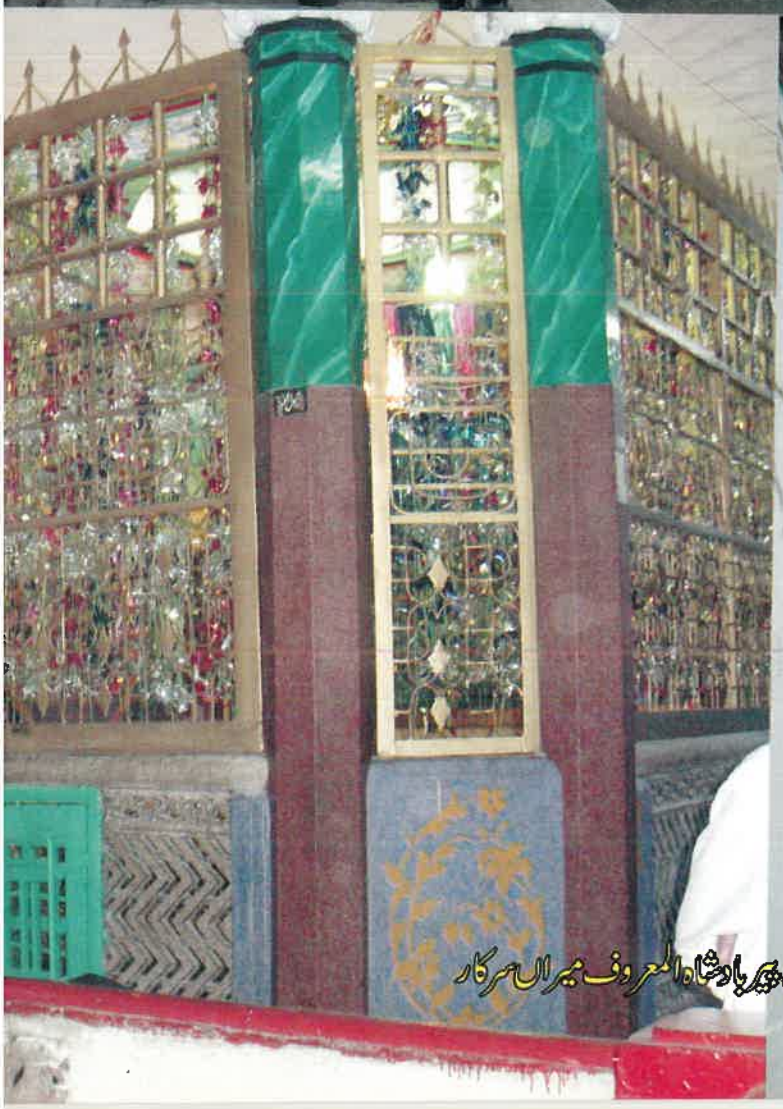
مزار حضرت سیّد حسن پیر بادشاہ المعروف میراں سرکار

S.m.ali

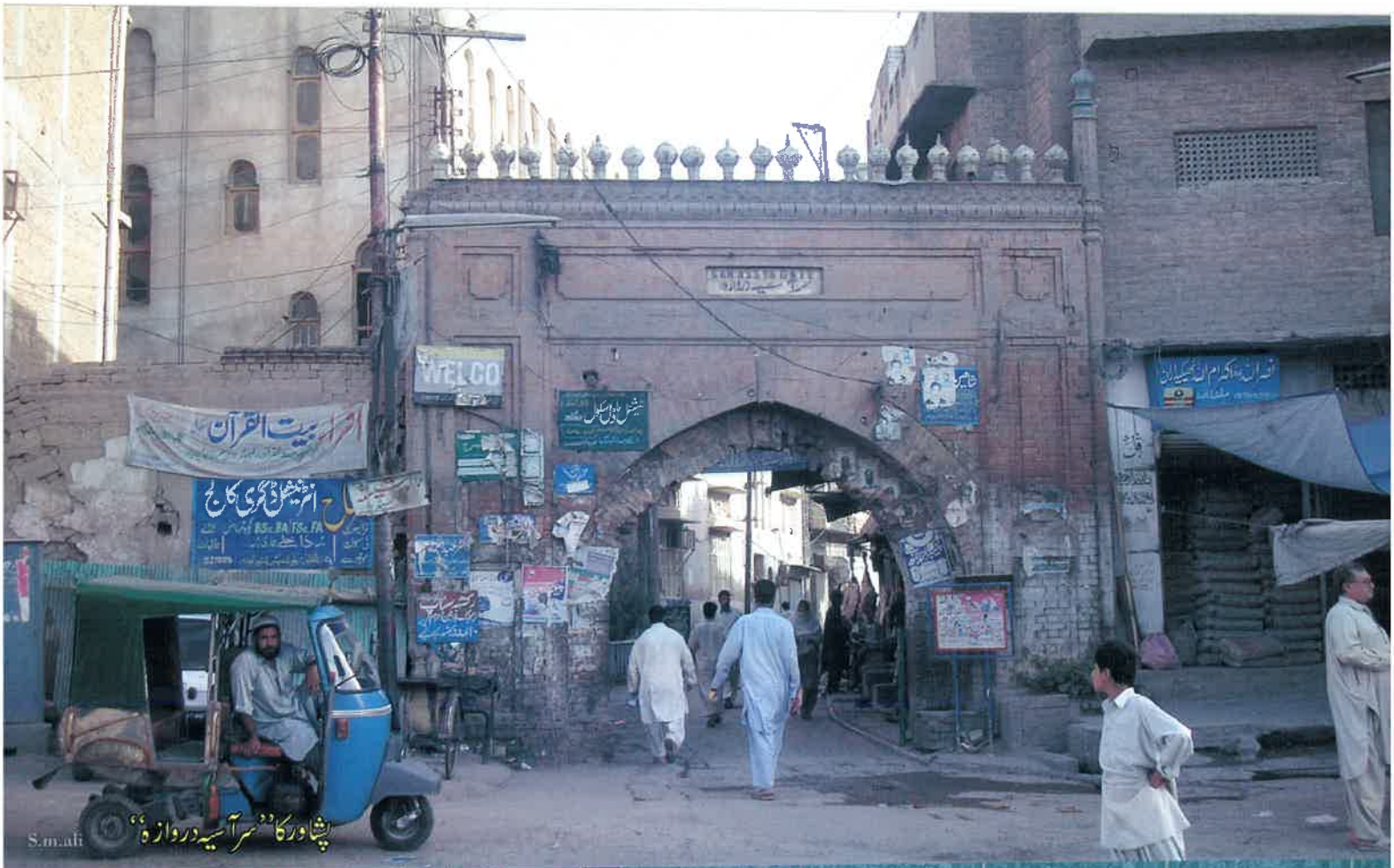

پشاور کا ''سرآسیہ دروازہ''

رحمان بابا کے مزار کے نزدیک ایک تسبیح فروش

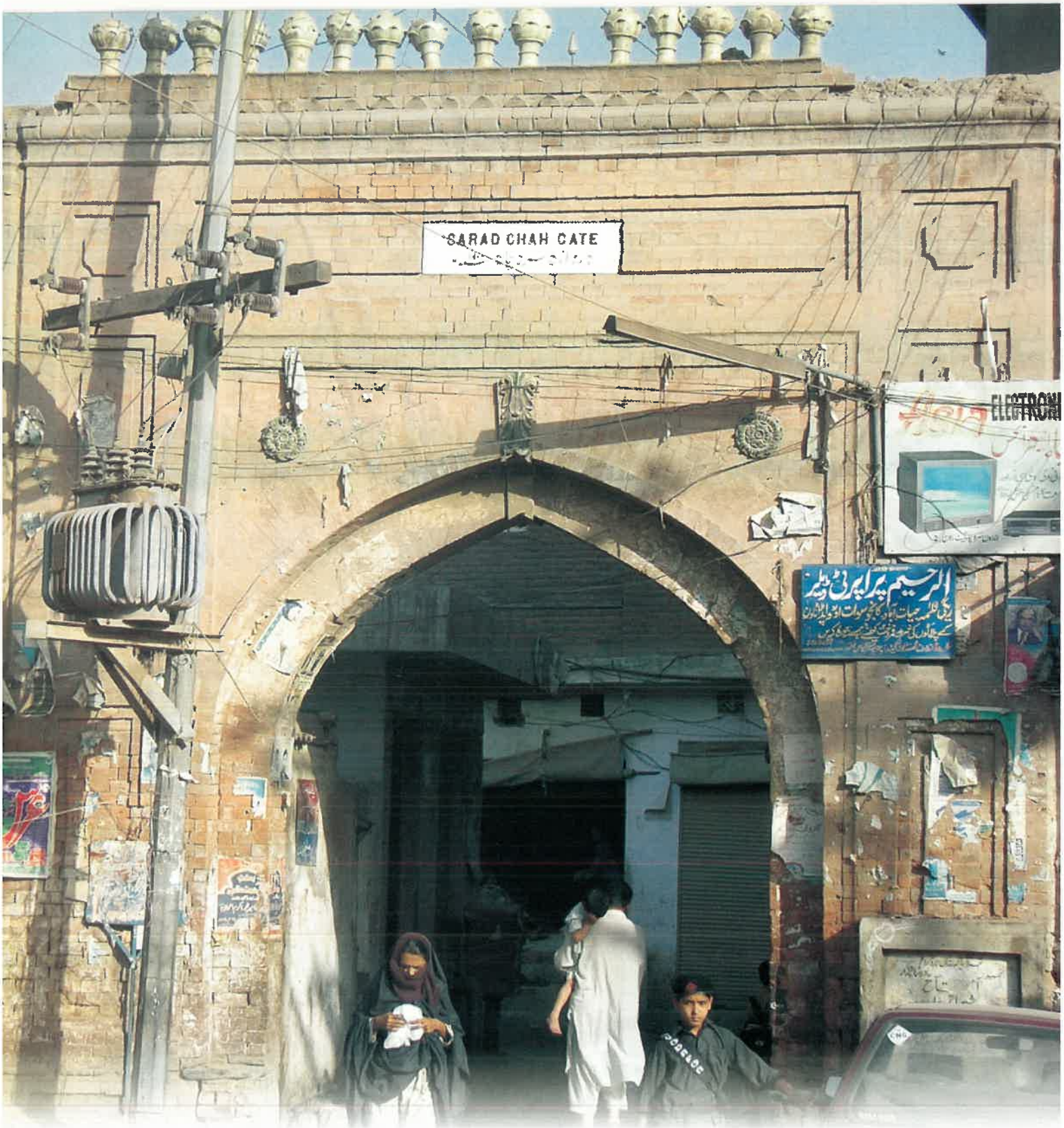

پشاور کا دروازہ "سرچاہ"

S.m.ali

کوہاٹ کا شاہ فیصل گیٹ

S.M.Ali

پشاور میں فٹ پاتھ ریسٹورنٹ

کوہاٹ کے ایک بازار میں پھل فروش

پشاور میں گور کھتڑی کے کھنڈرات

S.m.ali

پشاور میں قدیم سلطان پورہ روڈ پر بیبو کی قبر کے کھنڈرات

S.m.ali

قلعہ بالاحصار پشاور کی ایک قدیم نایاب تصویر

یوسف خیل نواگئی روڈ کی ایک پرانی نایاب تصویر

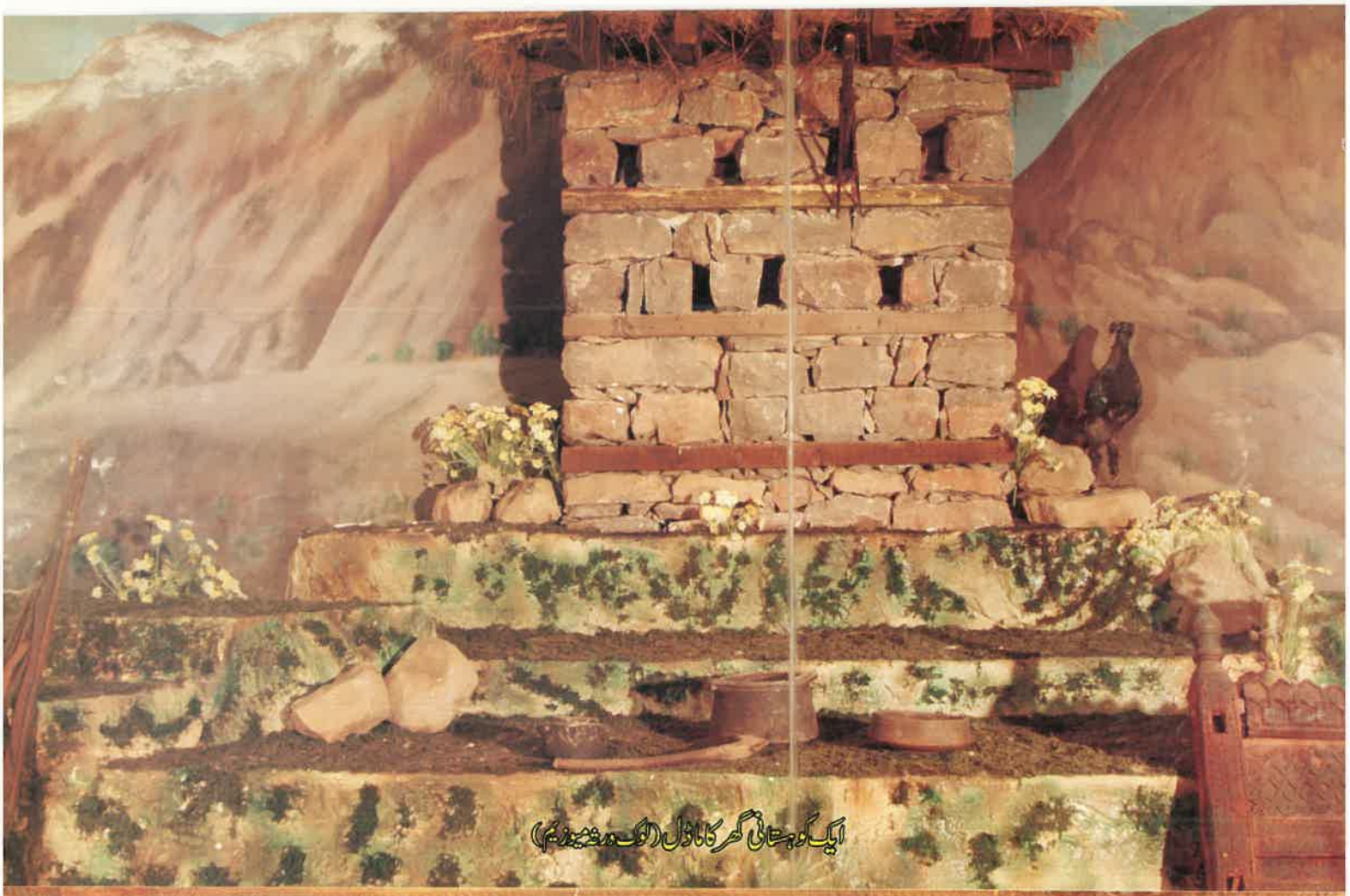

ایک کوہستانی گھر کا ماڈل (لوک ورثہ میوزیم)

سرحد کے ایک قبائلی گھر کا ماڈل (لوک ورثہ میوزیم)

سوات کی طرف جانے والی سڑک (پرانی نایاب تصویر)

خیبر پاس سے اونٹوں کا ایک کارواں گزر رہا ہے (نایاب تصویر)

تاریخی درہ خیبر کی ایک نایاب تصویر

سے ثابت کیا ہے ان کے قول کے مطابق قاضی خیل یوسف زئی کی ایک شاخ امان زئی سے منسوب ہے انہوں نے لکھا ہے کہ امان زئی میں سے ایک بزرگ اتمان تھے جنہوں نے اپنی علمی فضیلت کی بناء پر اخوند کا لقب حاصل کیا اور پھر ان کے بعد محمد غوث ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ پشاور پر جب احمد شاہ ابدالی کی حکومت تھی تو احمد شاہ ابدالی نے محمد غوث کو ان کی علمی فضیلت کی بناء پر عہدہ قضاء پر مامور کیا اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کے دو بیٹے قاضی محمد اکبر اور قاضی اللہ داد باپ کے جانشین مقرر ہوئے اور پھر انہیں کی اولاد میں سے قاضی خیل خاندان وجود میں آیا۔ میری تحقیق کے مطابق قاضی خیل کا تعلق دلہ زاک قوم سے ہے جو کہ دسویں صدی عیسوی میں وجود میں آئے۔

قریشی:

فہر بن مالک بن نصر کی اولاد کو قریش کہتے ہیں۔ بہت سے سلسلوں کے بعد مناف بن قصی' اس خاندان وقبیلہ قریش کا ایک نامور ومعزز شخص تھا' اس کے چار بیٹے تھے۔ عبدالشمس' ہاشم' مطلب اور نوفل۔ پھر ہاشم بن عبد مناف سے عبدالمطلب ہیں جو رحمۃ اللعلمین حضرت محمد ﷺ کے دادا ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ تولیت کعبہ اور بنو مناف کی سرداری عبدالشمس کے پاس تھی مگر وہ بغرض تجارت مکہ میں بہت کم ٹھہرتے تھے۔ اس لئے یہ دونوں ذمہ داریاں ہاشم کے سپرد ہوئیں۔ ہاشم کے بیٹوں میں عبدالمطلب کا مقام ومرتبہ بہت بلند تھا۔ ہاشم کا جب انتقال ہوا تو شیبہ یعنی عبدالمطلب اپنی والدہ کے ساتھ یثرب میں مقیم تھے۔ ہاشم کے انتقال کے بعد ان کے چچا مطلب انہیں یثرب سے مکہ واپس لانے کے لئے یثرب گئے۔ واپسی میں انہیں اپنے پیچھے اونٹ پر سوار کر کے لا رہے تھے ان کے کپڑے میلے کچیلے تھے چہرے سے یتیمی اور معصومیت کے آثار تھے اس لئے راستے میں جو کوئی بھی مطلب سے ان کے بارے میں پوچھتا مطلب جواب میں کہتا ھذا عبدی یعنی یہ غلام ہے۔ تب سے ان کا نام عبدالمطلب ہو گیا۔ جب ان کے چچا مطلب نے انتقال کیا تو کعبہ کی تولیت ان کی ذمہ داری ٹھہری۔ ان کے دس بیٹے ہوئے۔ حضرت عبداللہ ان کو سب سے زیادہ مقرب ومکرم تھے۔ ان کا نکاح بی بی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے ہوا اور پھر اسی جلیل القدر ہستی کے بطن سے چمنستان توحید کا گل معطر کھلا اور اکناف عالم میں اپنی خوشبو پھیلا دی۔ حضرت عبدالمطلب کے دوسرے فرزند حضرت ابوطالب ہیں جن کے فرزند جمند حضرت علی کرم اللہ وجیہ ہیں جنہیں داماد رسول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حسینؓ کے والد اور حضرت فاطمۃ الزہرہ کے شوہر ہیں اسی طرح دوسرے خلفاء اور صحابہ رضوان اللہ چاہے کسی بھی سلسلہ مرتبت سے منسوب ہوں زیادہ تر قریش کے شجرہ صدرہ کو جا کر مل جاتے ہیں۔ نور اسلام جب دنیا میں پھیلنے لگا تو لشکر اسلام جس کی قیادت حضرت سنان بن سلمہ کر رہے تھے چھٹی صدی عیسوی کے نصف میں پشاور کی وادی تک پہنچا اور یہاں ہندو شاہیا کے اقتدار کو ملیامیٹ کر کے اسلام کا جھنڈا نصب کیا۔ علاقہ داؤد زئی میں ہندو مت کے پیروؤں سے مجاہدین اسلام کی جنگ ہوئی اس لشکر میں قریشی خاندان کے صحابہؓ کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ بہت سے صحابہ بشمول حضرت سنانؓ بن سلمہؓ چغرمٹی کے مقام پر شہید ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قریشی خاندان کی آمد کا زمانہ پشاور کے شمال سے 45ھ ہے یوں قریشی جو عربی النسل ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور پشاور میں ان کی آمد کا زمانہ بہت قدیم ہے۔ تجارت ان کا نسبی پیشہ رہا ہے۔ تجارت کے علاوہ اب ہر شعبہ میں ان کا عمل دخل ہے۔ پشاور کے اکثر قصاب اپنے آپ کو قریشی خاندان کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ صنعت وحرفت اور دیگر تجارت کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں بھی قریشی خاندان کے لوگ موجود ہیں۔ مستند تواریخ سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ اصحابؓ کبھی پشاور تک پہنچے تھے۔ البتہ کابل تک پہنچنے کا ثبوت ہے۔ اور اسی طرح بنوں اور نواح تک آنے کا ذکر تاریخ سے ثابت ہے۔ بے شک اصحاب بابا اور دیگر ایسے اشارات سے چغرمٹی کے واقعے کی سی باتیں زبانی کی جاتی ہیں۔

غزنوی:

غزنی خاندان نہیں ایک تاریخی شہر کا نام ہے۔ جو لوگ اس شہر سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے نام کے ساتھ غزنوی لکھتے ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ خاندان غزنہ کی نسبت سے غزنوی ٹھہرا' امیر ناصر الدین سبکتگین جو کہ غزنہ کا فرمانروا تھا تاریخ میں سبکتگین ہی غزنوی خاندان کا پہلا بانی تھا جو کہ الپتگین کا داماد تھا۔ الپتگین سامانیوں کے عہد میں سامانی فرمانروا کی طرف سے سامانیوں کا کماندار تھا۔ اس نے سامانیوں کے فرمانروا ابوبکر لاریک کی حکومت کو ختم کر دیا اور خود غزنہ پر قبضہ کر لیا اور اس طرح غزنہ میں ایک نئی سلطنت کا آغاز ہوا۔ یہی وہ عہد ہے کہ جس میں ہند کے علاقہ میں راجہ جے پال کا پایہ تخت ھنڈ تھا اور بڑی آن بان سے حکومت چلا رہا تھا۔

جب الپتگین فوت ہوا تو اس کے بیٹے یکے بعد دیگرے اس کے جانشین مقرر ہوئے۔ مگر ان میں حکومتی نظم ونسق کو قائم رکھنے کی اہلیت نہیں تھی اس لئے 976ء

میں یہی الپتگین کا داماد غزنہ میں تخت نشین ہوا جس میں حکومتی نظم ونسق چلانے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔اس نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے آس پاس خصوصاً افغانستان اور موجودہ صوبہ سرحد کے پشتون قبائل میں اپنا اثر ورسوخ بڑھایا اور راجہ جے پال پر چڑھائی کی۔اس وقت سے غزنی خاندان کے لوگ اس کے لشکر کے ساتھ آنا شروع ہوئے۔سبکتگین کے بعد جب محمود غزنوی سریر رائے سلطنت ہوا تو اس نے ہندوشہیا کی راجدھانیوں کو ختم کرنے کے لئے ہندوستان پر متعدد حملے کئے اور ان علاقوں میں غزنوی خاندان کے لوگ آباد ہونے لگے۔

خیبر کے راستے سے آنے والے لشکروں کے ساتھ غزنوی خاندان کے لوگ پشاور میں وارد ہوئے اور متعدد لوگ یہاں پر آ کر مستقل طور پر ٹھہر گئے۔تب سے یہ غزنوی خاندان کے لوگ پشاور میں اپنے کاروبار وتجارت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔اب غزنوی خاندان کے متعدد لوگ حکومتی کاروبار میں بھی شریک ہیں اور حکومتی ملازمت میں مشغول ہیں۔

ارمڑ:

پشاور کے گنج گیٹ کے باہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر تین گاؤں پر مشتمل اس قبیلے کی آبادی ہے ان میں ارمڑ پایاں' ارمڑ اور میانہ گاؤں ہیں۔

میانہ ارمڑ قبیلے کے چچیرے بھائی ہیں جن کا مورث اعلیٰ ایک ہی ہے۔

ان کا شجرہ کچھ اس طرح سے ہے کہ سڑ بن کے بیٹے شرخبون (شرف الدین) کی اولاد میں پانچ بیٹے تھے شیرانی' ترین' بڑیچ' میانہ' عمر (ارمڑ)۔ارمڑ کا اصلی نام عمر تھا۔

ایک روایتی داستان کے مطابق اس قبیلے کے لوگ وزیرستان کے مقام کانی گرم میں وزیر محمود کے آس پاس رہتے تھے۔محمود غزنوی جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اسے بہادر اور جنگجو قبائل کی ضرورت تھی۔وزیروں اور محسودوں سے مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ میانہ اور عمر قبیلے کے لوگ بڑے بہادر، وفادار اور جانثار ہیں۔محمود غزنوی اور ان کے مابین بعض شرائط طے ہوئیں ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جنگ میں فتحیاب ہونے کی صورت میں اس قبیلے کے لوگوں میں سے ایک کو وزیر بنایا جائے گا۔جنگ کے دوران اس قبیلے کے لوگ بڑی بہادری سے لڑے اور ایک ایسا قلعہ جہاں گولہ بارود تھا اس گولہ بارود کو آگ لگ گئی جو انتہائی خوفناک آگ تھی اس قبیلہ کے لوگوں نے نہایت مہارت کے ساتھ اس آگ کو بجھا دیا اور قلعہ پر محمود کا جھنڈا لہرا دیا۔محمود غزنوی نے ان کی اس مہارت اور بہادری پر انہیں ارمڑ کا خطاب دیا یعنی آگ بجھانے والے۔پشتو میں 'ار' کا معنی آگ ہے 'مڑ' کے معنی بجھانے کے ہیں۔تب اس قبیلے کا نام ارمڑ ہو گیا۔

واپسی پر جنگی لشکر اس مقام پر پہنچے جہاں ارمڑ کے لوگ آباد ہیں تو یہاں پڑاؤ کیا گیا۔محمود غزنوی چونکہ اس قبیلے کے لوگوں کی بہادری اور مہارت دیکھ چکا تھا اس لئے محمود کو یہ خطرہ ہوا کہ اگر وہ اس قبیلے کے کسی فرد کو وزیر بنالے تو کہیں بعد میں اس کے لئے مشکلات نہ کھڑی کر دے۔چنانچہ محمود غزنوی نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کہ اس شرط کے بدلے میں یہ تمام علاقہ اس قبیلے کے لوگوں کے سپرد کیا جائے اور یہ یہاں پر اپنی زمینیں آباد کریں۔چنانچہ اس قبیلے کے اہل الرائے لوگوں کو جمع کیا گیا اور کہا گیا کہ شرائط میں اگر اس شرط کو واپس لیا جائے تو سلطان محمود کی طرف سے انہیں یہ سارا علاقہ دیا جائے گا۔چنانچہ انہوں نے اس کو منظور کر لیا تب سے یہ لوگ اس سارے علاقے میں ارمڑ کے نام سے آباد ہیں۔

برکی:

انہی ارمڑوں کی ایک ذیلی شاخ برکی بھی ہے یہ لوگ پیشہ ورانہ مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہیں۔

ان کا بھی اپنا اصلی وطن وزیرستان کے علاقہ کا گاؤں کانی گرم ہے اور یہ بھی اسی وقت سے یہاں آ کر آباد ہوئے جب سے ارمڑ کے لوگوں کو یہ زمینیں دی گئی ہیں۔

بایزید انصاری جو کہ وزیرستان کے علاقے کی ایک روحانی بڑی شخصیت اور آفریدی' اورکزئی اور بنگش لوگوں کے قائد اور پیر تھے جنہیں 'پیر روشان' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور مغلوں کے دور میں مغلوں کے ساتھ برسر پیکار رہے ان کا بھی تعلق اس برکی قبیلے یا خاندان سے ہے۔

میانہ:

جیسا کہ شجرہ میں بیان ہوا ہے کہ میانہ بھی شرخبون کے بیٹوں میں سے ایک تھا۔اس کی اولاد میانہ کہلائی اور یہ چونکہ ارمڑ کے چچیرے بھائی ہیں غالباً یہ لوگ بھی محمود غزنوی کے لشکر میں شامل تھے۔اس لئے یہ بھی ارمڑ کے ساتھ ہی تب سے اس علاقے میں رہ رہے ہیں۔ان کے گاؤں کی جداشناخت میانہ کے نام سے ہے اور پشاور کے ایک معتبر قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان تمام کی زبان پشتو ہے۔

ترین:

پشتونوں کی قومی اور قبیلوی زندگی میں شجروں کی تقسیم وترتیب بڑی اہمیت

رکھتی ہے اور ان کے شجرہ ہائے انساب پر ہی ان کی قومی حمیت و وحدت کا دارومدار ہے جو ان کی روایات و اقدار اور زبان، پوشاک اور ثقافت و تہذیب کو ظاہر کرتے ہیں۔ پشاور میں جو پشتون خاندان و قبیلے سکونت رکھتے ہیں اکثر و بیشتر ان کا شجرہ نسب ایک ہی سرچشمہ پر جا کر مل جاتا ہے۔ ان میں ترین قبیلہ بہت قدیم ہے۔ جس کا سرچشمہ سڑ بنی قبیلہ ہے۔ سڑ بن جو کہ قیس عبدالرشید کا بیٹا ہے۔ پشتونوں کے شجروں میں قیس عبدالرشید مرکزیت ہے۔ ان کے شجروں کی تفصیل یہ ہے۔

اس شجرہ نسب کے لحاظ سے ترین شرخبون کی اولاد ہیں جو کہ سڑ بن کا بڑا بیٹا تھا اور جسے تاریخ میں شرف الدین لکھا گیا ہے۔

شرخبون کا بڑا بیٹا شیرانی تھا جو سرداری کا استحقاق رکھتا تھا مگر باپ نے شیرانی کو سند سرداری دینے کی بجائے ترین کو سرداری کی مسند پر بٹھا دیا جس کی وجہ سے باقی بھائیوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ شیرانی اس حق تلفی کی بناء پر اپنے ماموں کاکڑ سے جاملا اسی وقت سے شیرانیوں اور کاکڑوں میں الحاق ہوگیا اور ان کے آپس کی رسوم و رواج اور قبیلوی روایات و ثقافت میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ ترین جس کے پاس سرداری کی آن بان تھی اس کے دو بیٹوں تور اور سپین کی اولاد ترین کے نام سے ہی مشہور ہوئی۔ تیسرے بیٹے کا نام ابدال یا ابدال تھا۔ اس کی اولاد ابدالی یا ابدالی کے نام سے مشہور ہے۔ احمد شاہ ابدالی انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ پشاور میں ترینوں کی آمد کا زمانہ احمد شاہ ابدالی کے دور میں ہی قیاس کیا جا سکتا ہے ہو کیونکہ یہ ابدالیوں کے چچیرے بھائی ہیں۔

خلجی:

پشاور میں آباد اس خاندان کے بارے میں مؤرخین میں متضاد رائے ہیں۔ بعض انہیں غلجی کہتے ہیں۔ فرشتہ کے قول کے مطابق یہ خلجی ہیں جبکہ پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک انہیں غلجی کہتے ہیں جو کہ پٹھان ہیں۔ پروفیسر پریشان خٹک بھی انہیں غلجی پشتون ہی کہتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق ان کا جد اعلیٰ ترک بن یافت تھا۔ ترک بن یافت کے گیارہ بیٹے تھے انہی میں سے ایک بیٹے کا نام خلج تھا اور اسی نسبت سے اس کی اولاد خلجی کہلائی۔ ان کی سکونت غور اور جرجستان کے پہاڑی علاقوں میں تھی ہندوستان میں ان کی آمد کا زمانہ امیر ناصر الدین سبکتگین اور محمود غزنوی کا ہندوستان پر فتوحات حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔

غوری فرمانروا کے دور میں یہ اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے۔ جبکہ چنگیز خان نے اس قبیلے کے سردار خالج خان کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی بعد میں رنجش پیدا ہوئی تو یہ غور اور جرجستان کے پہاڑی علاقوں کی طرف چلا گیا اور اپنی طاقت کو مختلف گروہوں کے ساتھ ملا کر منظم کرنے لگا۔ یہی خالج ہے جس کے بعد غلجی، خلجی کے نام سے متعارف ہوئے۔ خالج خان کو پہلے پہل تو خال خان کہنے لگے پھر اس کی اولاد خالجی مشہور ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خلجی ہوگئے۔

خلجیوں میں جلال الدین فیروز شاہ بڑی قدآور شخصیت تھی اس نے کھری میں سلطان شمس الدین کو قتل کر کے 1299ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ سلطان جلال الدین فیروز شاہ علاؤالدین خلجی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

بعض مؤرخین و محققین کا عندیہ یہ ہے کہ پشتونوں کے غلجی اور ترکوں کے خلجی ایک ہی لوگ ہیں اور یہ خلجی غلجیوں کے رشتے دار ہوئے اور انہوں نے پشتونوں کی زبان و ثقافت کو اپنایا۔

میرا اپنا نظریہ اس نظریئے کے برعکس ہے میں سمجھتا ہوں کہ غلجی جدا ہیں اور خلجی جدا۔

کیونکہ غلجی لوگوں کا رہن سہن اور ان کی طرز معاشرت عمومی اعتبار سے خانہ بدوشی ہے۔ جبکہ خلجی لوگوں کے طرز زندگی اور معاشرت میں تمدنی رکھ رکھاؤ ان کو خانہ بدوشوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ منگولوں سے ان کے رشتے کی قربت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ جس طرح منگول بعد میں تمدنی طرز معاشرت اختیار کر کے مغل تہذیب و ہنر سے پہچانے جانے لگے تو اسی نسبت سے یہ بات قریب قیاس ہے کہ خلجی لوگوں کی بھی تہذیبی اور تمدنی زندگی ان کے ہم پلہ رہی ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر خالج خان کو چنگیز خان نے اپنی لڑکی بیاہ دی تو اسی وجہ سے کہ یہ بھی منگولوں کی طرح ترکی النسل تھے۔

بہرحال خلجی پشاور کا ایک تہذیب یافتہ، تعلیم و ہنر سے مالا مال قابل ذکر خاندان ہے جو کہ صدیوں سے پشاور اور مضافات میں رہ رہے ہیں۔ پروفیسر پریشان خٹک کا کہنا ہے کہ خلجی ایک بگاڑا ہوا نام ہے جو کہ اصل میں غلجی ہے۔ ہندوستان میں پشتونوں کے بہت سے نام بگاڑے گئے جیسا کہ خود پشتون کو پٹھان پکارا گیا۔ بہرحال غلجی یہی خلجی ہیں۔ جو پشتونوں کا سب سے بڑا اور بہادر قبیلہ ہے۔ ہندوستان ایک لمبے عرصے تک مختلف راجواڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ علاؤالدین غلجی پہلا بادشاہ تھا۔ جس نے قندھار سے لے کر چٹاگانگ تک اور راس کماری سے ہمالیہ تک پورے برصغیر کو فتح کر کے ایک ملک بنایا۔

غوری خاندان:

پشاور میں مقیم غوری خاندان جس کی تاریخی حیثیت شاہان غور سے وابستہ ہے اور اس خاندان کی وجہ تسمیہ افغانستان کے ہرات اور قندھار کے وسطی علاقہ غور کی نسبت سے ہے۔ اس علاقہ میں آباد شاہی خاندان کا تعلق سوری قبیلے سے تھا۔ یہ نسلاً پشتون تھے جبکہ سر اولف کیرو کے مطابق یہ ایرانی النسل ہیں۔ غوریوں کا پہلا اسلامی سردار شنب تھا۔ جس نے حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجھہ نے اسے علاقہ غور کا حکمران مقرر کیا تھا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ یہ ضحاک بادشاہ کی نسل میں سے ہیں جب ایران کے بادشاہ فریدون نے اسے شکست دی تو ضحاک خاندان کے افراد کو قتل کر دیا اور کچھ کو جلاوطن کر دیا لیکن دو بھائی سوری اور سام بوجہ ملازمت فریدون کے دربار سے منسلک رہے مگر زیادہ دیر تک وہ یہاں ٹھہرنے سے گریز پا رہتے اور اپنے مصاحبین کی جماعت کے ساتھ نہاوند چلے گئے۔

وہاں سوری نے سرداری سنبھالی اور سام سپاہ سالار لشکر بن گیا۔ سوری نے اپنی بیٹی اپنے بھتیجے سام کے بیٹے سے بیاہ دی جس کا نام شجاع تھا۔ شجاع بعد میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ غورستان کے علاقے میں آ کر امن سے رہنے لگا۔ یہاں شجاع نے اپنی جمعیت تیار کی اور ایرانی لشکر سے لڑتا رہا۔ شجاع کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کو سرداری ملتی رہی یہاں تک کہ شنب کا دور آ گیا جس نے حضرت علیؓ کے پاس حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور سارا اسلامی قبیلہ شنبیوں کے نام موسوم ہو گیا۔ ہارون الرشید کے عہد میں غوری حکمران یحییٰ بن نہاتان شنبی تھا اور جب کابل میں صفاریوں کی حکومت تھی تو اس وقت یحییٰ کا پوتا سوری بن محمد مشہور شخص تھا اور پھر اسی کا بیٹا محمد بن سوری سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر تھا جسے محمود غزنوی نے قید کر کے غور کے علاقے کا حکمران ابوعلی کو بنا دیا مگر غور کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد کے بھتیجے عباس بن محمد بن شنب نے غور پر زبردستی قبضہ کر لیا ابراہیم بن محمود غزنوی پر حملہ آور ہوا تو اس نے اسے گرفتار کر کے غور میں اس کے بیٹے محمد کو حکمران بنا دیا اس کے بعد قطب الدین حسن اس کا جانشین ہوا اور یہی قطب الدین حسن ہی ہندوستان کے غوری حکمرانوں کا جداعلیٰ ہے۔ بعد میں قطب الدین کا بیٹا سام ہندوستان کی طرف چلا گیا۔ مدتوں بعد جب اسے وطن کی یاد ستائی تو اپنے بیوی بچوں سمیت سمندر کے راستے کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہوا مگر سمندری طوفان میں سب غرقاب ہو گئے۔ صرف اس کا بیٹا اعزالدین بچ کر غزنی پہنچا۔ غزنی میں سلطان ابراہیم نے اس کی داستان الم سنی تو اسے اپنا مقرب بنا لیا اور اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کر دیا پھر سلطان ابراہیم کے بعد اس کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے اعزالدین کو غور کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے سات بیٹے ہوئے جو ہفت اختر کے نام سے مشہور ہوئے۔ اعزالدین غوری کی وفات کے بعد اس کے بیٹے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ ملوک بامیا سے مشہور ہوا اور دوسرا گروہ سلاطین غور و غزنی کہلایا۔ طبقہ ثانیہ میں قطب الدین محمد پہلا حکمران ہے جس نے غزنویوں سے باقاعدہ دشمنی کا آغاز کیا۔ نتیجہ کے طور پر قید ہوا اور اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعد میں اعزالدین کے مشہور بیٹے علاؤالدین غوری نے خاندان کا نام روشن کیا اور غزنی پر قبضہ کر لیا اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین غور کا حکمران بنا اس نے بھی غزنویوں پر حملہ کیا اور اپنے ہی ایک لشکری کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ اس کی ہلاکت کے بعد اس کا چچازاد بھائی غیاث الدین فیروزہ کوہ پہنچا اور اپنے بھائی شہاب الدین غوری کو سپہ سالار بنا دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں خراسان، ہندوستان کو فتح کر لیا۔ 1210ء میں غیاث الدین نے انتقال کیا تو اس کے بعد شہاب الدین غوری نے ہندوستان کی فتوحات کو وسعت دی۔ شہاب الدین غوری نے پشاور کے ان مقامات کو بھی فتح کیا جو تاریخی اعتبار سے بگرام، چرشور اور فرسور کے نام سے مشہور تھے۔ ان علاقوں میں غوری خاندان کے لوگوں کو آباد کیا۔ پشاور میں اب تک غوری کے نام سے یہ خاندان آباد ہے۔ پروفیسر پریشان خٹک نے لکھا ہے کہ دشمنوں کے شاہی مؤرخین نے پشتونوں کے ساتھ بے شمار ناروا زیادتیاں کی ہیں۔ اس میں ایک یہ بھی ہے کہ تمام شاہی خاندانوں کو جو صرف اور صرف پشتون ہیں اُن کی نسل کی تبدیلی کی ناکام کوشش کی ہے۔ جس میں غوری پشتون بھی شامل ہیں۔ جس بہادری سے شہاب الدین غوری نے پرتھوی ذریعے سے اپنی شکست کا بدلہ لے کر اُسے بدترین شکست دی۔ اُسی بہادری سے اُس نے پہلی بار دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جو سینکڑوں سال تک قائم رہ۔

پشاور کے بخاری سادات:

برصغیر ہندوستان کے ہندو راجاؤں کے خلاف جب غزنوں کے سلاطین نے یورش شروع کی تو ان کے ساتھ متعدد مسلمان شخصیتیں بھی جذبہ جہاد کے زیر اثر شریک ہوئیں۔ چنانچہ جب محمود غزنوی کے والد امیر سبکتگین نے راجہ جے پال کے خلاف لشکر کشی کی تو یہ حملہ نغرہان سے کنڑ، باجوڑ اور سوات کے پہاڑی علاقوں سے ہوا تھا۔ ان علاقوں میں جو مجاہدین شہید ہوئے ان میں ایک سید جلال الدین جعفر بخاری

گنج علم نامی بھی تھے۔ جن کا مزار مبارک ریاست دیر کے علاقہ تالاش میں ہے۔ ان کا شجرہ مبارک یہ ہے سید جلال الدین گنج علم بن سید امیر علی بن سید محمود مکی بن سید محمد مہدی بن سید حسن عسکری بن سید امام علی نقی بن سید امام محمد تقی بن سید امام علی رضا بن سید امام موسیٰ کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید محمد باقر بن سید امام علی زین العابدین بن سید الشھداء امام حسین علیہ السلام۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر میں امیر سبکتگین کے عہد میں بخاری سادات کا ورود ہو چکا تھا۔ جبکہ پشاور میں بخاری سادات کے ورود کا زمانہ امیر تیمور کا عہد ہے۔ ایک روایت کے مطابق سید جلال الدین سرخ بخاری امیر تیمور کے مرشد تھے اور آپ امیر تیمور کے ساتھ ہی برصغیر ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ آپ بخارا سے تشریف لائے تھے سب سے پہلے بھکر کے مقام پر قیام کیا اور کچھ عرصہ وہاں ٹھہرنے کے بعد ملتان آ گئے اور حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ کے ہاتھ پر سلسلہ سہروردیہ میں بیعت کی۔ بھکر میں قیام کے دوران ہی معروف و مشہور بزرگ سید بدرالدین کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور پھر بہاولپور کے شہر اوچ تشریف لے گئے۔

یہاں دو سادات گھرانے مشہور ہیں ایک بخاری اور دوسرے گیلانی سادات۔ گیلانی سادات کے مورث اعلیٰ حضرت غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے بڑے صاحبزادے سید عبدالوہاب ہیں۔

سید جلال الدین سرخ بخاری کے تین فرزند تھے۔ سید محمد کبیر، سید احمد کبیر، سید بہاؤالدین۔ کتاب الاخبار میں صرف دو بیٹوں محمد اور احمد کا ذکر ہے۔

جبکہ پشاور کے سادات کے شجرے میں چار بیٹے ہیں۔ (1) محمد غوث، (2) احمد کبیر، (3) معصوم علی، (4) جعفر۔

پشاور شہر کے کریم شاہ بخاری جن کا مزار بیرون ہشتنگری گیٹ جی ٹی روڈ پر واقع ہے ان کا تعلق سید محمد غوث کی اولاد سے ہے۔ سید جلال الدین میر سرخ بخاری کی اولاد کے شجروں میں ابہام ہے۔

بہرحال سادات گھرانوں میں بخاری سادات گھرانہ زیادہ نمایاں ہے اور یہ معزز گھرانہ پشاور اور پشاور کے مضافات میں پھیلا ہوا ہے۔

پشاور شہر کے شمال کی طرف دلہ زاک روڈ پر واقع ایک مضافاتی بستی وگہ میں بخاری سادات کثیر تعداد میں ہیں۔

پشاور کے گیلانی سادات:

پشاور میں گیلانی سادات کے گھرانے بھی صدیوں سے آباد ہیں۔ یوں تو آس پاس سے آئے ہوئے متعدد گیلانی سادات ہیں مگر دو بڑے گیلانی سادات گھرانے ہیں جو کئی پشتوں سے یہاں پر آباد ہیں اور پشاور کے مخصوص ثقافتی رنگ میں رچ بس گئے ہیں۔ پشاور کے دیگر خاندان اور گھرانے ان کے نسبی توقیر و تعظیم کے استحقاق کی بناء پر انہیں عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان دو بڑے گیلانی سادات گھرانوں میں ایک حضرت سید شاہ قبول اولیاء رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرا حضرت سید شاہ محمد غوث رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد کا گھرانہ ہے۔ اول الذکر گیلانی سادات کا آبائی مسکن علاقہ ڈبگری ہے اور اسی علاقے میں اب تک تقریباً حضرت سید شاہ قبول اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تقریباً نویں پشت کے اخلاف ہیں جنہیں شاہ قبولؒ والے گیلانی سادات کہا جاتا ہے۔

حضرت سید شاہ قبول اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کا نسبی سلسلہ حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر گیلانی کے چوتھے فرزند حضرت سید عبدالرزاق سے جا کر ملتا ہے۔ آپ کی پیدائش مراکش کے ایک ساحلی گاؤں تنجا میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید عبداللہ تھا۔ پیدائش کے وقت ہی سے آپ نیک بختی، خوش طالعی اور سعادت مندی کی علامت تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی کی منازل بھی طے کیں اور عشق الٰہی میں مستغرق رہنے لگے۔ سن بلوغت میں قدم رکھتے ہی معرفت و وجدان کی منازل طے کرنے کے لئے کراچی میں سید شاہ عنایت کی خدمت میں رہ کر روحانی مراتب حاصل کیں اور پھر خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد کشمیر اور پھر وہاں سے ہزارہ اور پھر 1147 ہجری میں پشاور پہنچ کر یہاں کی سرزمین کو اپنا دائمی مسکن قرار دیا۔ پشاور کے کئی گھرانوں کے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر اسی مقام پر آپؒ کی اولاد کا گیلانی سادات کے حوالے سے ظہور ہوتا رہا۔

دوسرا گیلانی سادات کا گھرانہ وہ ہے جنہیں پشاوری لوگ دور حاضر میں مولوی جی کا گھرانہ یا باری والے سادات کا گھرانہ کہتے ہیں۔ اس گیلانی سادات کے گھرانے کا نسبی سلسلہ حضرت سید شاہ محمد غوث رحمتہ اللہ علیہ سے جا کر ملتا ہے۔ حضرت سید شاہ محمد غوثؒ کے والد ماجد حضرت سید حسن گیلانی ہیں ان کا مزار مبارک پشاور کے جنوبی حصہ سلطان پورہ کوہاٹ روڈ کے پاس ہے۔ سید حسن پیر گیلانی کا سلسلہ نسب چھٹی پشت سے سید عبدالقادر گیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے جا کر مل جاتا ہے۔ سید حسن پیر کے والد ماجد کا اسم گرامی سید عبداللہ گیلانی تھا۔ جو خود بھی ایک مرد خود آگاہ اور کامل بزرگ تھے۔ بغداد کے رہنے والے تھے وہاں سے ہجرت کر کے سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں آ کر مقیم ہو گئے یہیں پر ایک سادات گھرانے میں شادی کی اور اسی مقام پر ہی حضرت سید حسن گیلانی کی پیدائش ہوئی۔ سن بلوغت میں پہنچے تو اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت

A-8844

کی۔اس خاندان کی خصوصیات میں دو خصوصیتیں عام ہیں ایک تو یہ کہ بیٹا باپ کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کر کے خرقہ خلافت حاصل کرتا ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس گھرانے میں ہر عہد میں کوئی عالم دین رہا ہے۔

بہر حال حضرت سید حسن گیلانی رحمتہ علیہ نے شریعت وطریقت وسلوک کی منازل طے کرنے کے بعد کاٹھیاواڑ اور پھر دہلی سے ہوتے ہوئے 1086ھ میں پشاور تشریف لے آئے۔ اس مقام پر پہلے آپ نے یہاں کی ایک بااثر شخصیت نواب محسن خان کی بیٹی سے شادی کی جس کے بطن سے دو فرزند ہوئے دونوں نے جوانی کی عمر ہی میں وفات پائی۔ دوسری شادی حضرت پیر بابا رحمتہ اللہ علیہ کی پڑپوتی سے ہوئی ان کے بطن سے بھی دو فرزند ہوئے ایک حضرت سید شاہ محمد غوث گیلانی اور دوسرے شاہ سید معصوم رحمتہ اللہ علیہ۔ شاہ محمد غوث نے کم سنی میں ہی وفات پائی۔

حضرت سید شاہ محمد غوث نے والد کی طرف سے خرقہ خلافت حاصل کیا اور تبلیغ وارشاد کی غرض سے مختلف علاقوں کے سفر کئے۔ پشاور میں انہیں کی اولاد کا گھرانہ گیلانی سادات کے نام سے عہد حاضر میں ایک معتبر گھرانہ ہے جو اہلیان پشاور کی امیدوں اور عقیدتوں کا مرکز ہے۔ اس گھرانے کے معتبر چشم وچراغ سید محمد امیر شاہ قادری المعروف مولوی جی ہیں جن کا 2004 رمضان المبارک کے مہینے میں انتقال ہوا۔ اب ان کے گدی نشین ان کے صاحبزادے سید نور الحسنین المعروف سلطان آغا ہیں۔

پشاور کے مغل خاندان:

لفظ مغل اور منگول ہم معنی اور مترادف ہے جو کئی ایشیائی قوتوں کے لئے استعمال میں رہا۔ عہد حاضر کے مغل اور ماضی کے منگول ترکی قبائل کی نسل میں سے ہیں جو قد آور، سخت جان اور مشقت پسند لوگ تھے۔ موسمی تغیرات کے ساتھ ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ چراگاہوں اور پناہ گاہوں کی تلاش میں پھرتے تھے۔

ان منگولوں کی جسمانی ہیئت وساخت کے بارے میں پروفیسر پریشان خٹک نے اپنی کتاب ''پشتون کون؟'' میں جو نقشہ مرتب کیا ہے اس کے مطابق:

منگولوں کی شکل وشباہت ذراوٹنی تھی یعنی مضبوط جسم، مونڈھوں میں دھنسا ہوا سر ٹھوڑی پر لٹکتی ہوئی دنیا سے مختلف قسم کی داڑھی۔ اندر کی طرف دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پر طرہ یہ کہ وہ بھیڑ کی کھال کی ٹوپیاں اور بھیڑ کی کھال کا بلوں سمیت ایک پوستین نما کوٹ پہن کر اپنی ظاہری شکل کو اور بھی خوفناک بنا لیتے تھے۔ مضبوط اور بہادر تو تھے ہی انہیں وحشت اور بربریت کی پالیسی کے طور پر تربیت دی جاتی تھی۔

مغل اصل میں ''منگ کر'' سے ہے جس کا معنی بہادر اور نڈر ہے۔ زیادہ وقت سائبیریا کے جنگل میں گزارتے۔ خانہ بدوش قبائل ہونے کی وجہ سے چینیوں نے انہیں ہونگنو ہانو لکھا۔ ہونگنو ہانو یا منگ کر متفرق قبائل کی صورت میں مارے مارے پھرتے رہتے۔ چنگیز خان پہلا وہ منتظم ہے جس نے ان تمام متفرق ومنتشر قبائل میں اشتراک واتحاد کا جذبہ پیدا کیا اور انہیں ایک متحدہ قوم کا درجہ دیا اور پھر ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ منگر قبیلہ جو بعد میں مغل ہوا چنگیز خان اس قبیلے کا سردار تھا جو ایک صاحب فراست زیرک اور غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کا اصلی نام تموچن تھا اور تقریباً 1155ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بڑی ذہانت و مہارت سے خانہ بدوش منگروں کو متحد کیا اور پھر انہیں اس قابل بنایا کہ انہوں نے تموچن کی قیادت میں چین پر دھاوا بول دیا۔ یہ لوگ پیکن تک کے علاقے کو فتح کر کے بہت بڑے رقبے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغرب کی جانب وسیع تر رقبے پر علاؤ الدین محمد خوارزم کے اقتدار کا سورج چمک رہا تھا۔ چنگیز خان نے اسے بھی للکارا چنگیز خان نے اس کے دل میں ایک نفسیاتی دہشت ڈال کر اس کی سلطنت پر بھی حملہ کر دیا اور اس کے دل میں اپنے جابرانہ اور سفاکانہ اقدامات کا ایسا رعب طاری کیا کہ علاؤ الدین محمد خوارزم اس دنیا سے چل بسا۔ بعد میں علاؤ الدین خوارزم کا بیٹا جلال الدین تخت نشین ہوا تو چنگیز خان اور جلال الدین کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ افغانستان سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے تک دونوں کی فوجوں میں گھمسان کی جنگیں لڑی گئیں۔ پروفیسر پریشان خٹک نے لکھا ہے کہ ''خوارزم کے شہزادے جلال الدین کے تعاقب میں جب چنگیز خان افغانستان پہنچا تو یہاں پر حسب معمول افغانوں نے شدید مزاحمت کی اور اپنی روایات کے مطابق مہمان جلال الدین کو بچانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ چنگیز خان اتنا تھک گیا بلکہ گھبرا گیا کہ جلال الدین کے تعاقب میں صرف دریائے سندھ تک پہنچا اور پھر یہیں سے واپس ہوا۔ ہندوستان کا کوئی حصہ اُس کے قبضے میں نہیں آیا جس کے نتیجے میں برصغیر ہندوستان کا بہت بڑا رقبہ اس مغل جنگجو خانہ بدوش چنگیز خان کے زیر نگیں آ گیا۔

اس کے بعد چین میں اپنی فتوحات مکمل کرنے کے بعد چنگیز خان 1227ء میں فوت ہو گیا۔ تو اس کا بیٹا چغتائی تخت نشین ہوا۔ مگر یہ نا اہل ثابت ہوا جس کی وجہ سے افغانستان کے بہت بڑے علاقے پر کرت خاندان نے 1359ء تک

مغلوں کے باجگزار کی حیثیت سے حکومت کی چنانچہ جب ہرات پر کرت خاندان کی حکومت تھی تو غیاث الدین بلبن کے عہد میں چنگیز خان کی ماں کا قریبی رشتے دار تیمور آسمان سیاست پر نمودار ہوا جو ترک قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ سمرقند کے ایک جنوبی قصبے کیش میں 1336ء میں پیدا ہوا۔ جوان ہوا تو چغتائی مغلوں سے اقتدار چھین لیا اور مرکزی ایشیاء میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی اس نے سمرقند کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ تیمور ہرات' سیستان اور قندھار سے لے کر دہلی تک جا پہنچا۔ چین کی طرف بڑھا تو اترار کے مقام پر خون ہو گیا۔ 1404ء میں ظہیر الدین بابر جو کہ تیمور کی اولاد کی پانچویں پشت سے تھا فرغانہ جو کہ بابر کا آبائی شہر تھا وہاں خانہ جنگی کا سماں تھا بابر خانہ جنگی سے تنگ آ کر فرغانہ سے نکل کر کابل میں داخل ہوا اور اسے بغیر لیت ولعل کے وراثت کی بناء پر بادشاہ تسلیم کر لیا گیا اور پھر اس نے تیموری مغل خاندان کی حکومت کو افغانستان کی حدود سے نکال کر پورے برصغیر ہندوستان تک پھیلا دیا۔

دہلی میں مغل خاندان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو جب انگریزوں نے برطرف کر دیا تو 1857ء کے غدر میں مغل خاندان کے ایک گروہ نے تلسی بیگ کی قیادت میں دہلی سے ہجرت کر کے پشاور کی طرف رخ کیا۔ ابتداء میں یہ خاندان پشاور کے قریب چمکنی گاؤں میں مقیم ہوا۔ چمکنی ان دنوں بہت بڑی تجارتی منڈی تھی۔ چمکنی کے بعد یہ لوگ پشاور کے تمدنی خطے میں داخل ہوئے یہ لوگ تہذیبی رکھ رکھاؤ میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور مختلف امتیازی دستکاریوں اور ہنرمندیوں میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اس لئے پشاور کی فضاء انہیں راس آ گئی اور یہاں پر فنون کو فروغ دیا۔ پشاور کے ہنروں اور تعمیرات میں مغل آرٹ کا عکس نظر آنے لگا جو آج تک اسلامی مغل آرٹ کے نام سے زندہ ہے۔

بیگ اور مرزا:

پشاور کے خاندانوں میں بیگ اور مرزا خاندان کے افراد اگرچہ محدود رہے مگر یہ اب تک اسی نام کے ساتھ اپنی خاندانی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔

بیگ کے لغوی معنی سردار اور بڑے کے ہیں۔ ان کے اسلاف کا تعلق ترکستان سے ہے اور یہ لفظ بھی ترکی زبان کا ہے۔ ترکستان میں زمانہ قدیم سے یہ رواج تھا کہ لڑائی کے دوران جو شخص بہادری اور جانثاری کے ساتھ لڑے تو فوج کی سربراہی اسی کے سپرد کی جاتی تھی اور اس جانثاری' جان فروشی اور جرات و بہادری کی بناء پر اسے بیگ کا خطاب دیا جاتا۔ اس بیگ ہی سے بیوگ' بگ اور بک اور بے،

کے الفاظ نکلے ہیں اور بیگ کے علاوہ پشاور میں انہی نسبتی ناموں کے ساتھ بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ ترکستان میں یہ نام صدیوں پرانے ہیں جو خطاب کے طور پر فوجی افسروں کو دیئے جاتے تھے۔ جبکہ ان کی بیگمات کے لئے بیگم' بیگی اور بی بی کے الفاظ پکارے جاتے تھے۔ آج بھی پشاور میں بعض اس قسم کے گھرانوں کی بیگمات کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو ان کے لئے عزت کی علامت ہوتی ہے۔

اسی طرح مرزا کا لفظ بھی عزت اور شاہی خاندان سے مناسبت رکھنے کی علامت ہے ان دونوں خطابات بیگ اور مرزا کا تعلق خاندان مغلیہ کے افراد سے ہے اور مغل خاندان کے لوگ اکثر مرزا کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

پشاور کا برلاس خاندان:

برلاس ترکی قبائل میں سے ایک قدیم قبیلے کا نام ہے۔ بعض انہیں وسطی ایشیائی ریاستوں کے باشندے قرار دیتے ہیں۔

اس خاندان کے لوگ مغلوں کی ایک ذیلی شاخ کے طور پر پشاور میں آباد ہیں۔

برلاس اصل میں ترکی زبان کا لفظ ہے جو کہ وسطی ایشیاء کی کسی ریاست کے ایک گاؤں کا بھی نام ہے لہٰذا علاقے کی نسبت سے یہ خاندان برلاس کے نام سے مشہور ہوا۔

پشاور میں مغلوں کے عہد ہی میں یہ خاندان آباد ہوا البتہ بعد میں اسی خاندان کی ایک اچھی خاصی تعداد رامپور جا کر آباد ہوئی اور کچھ لوگ مشرقی پنجاب کی طرف چلے گئے۔

برلاس خاندان کا مورث اعلیٰ ''اڑوڑ بیگ'' تھا جو پہلے پہل امرتسر میں آباد ہوا۔ اڑوڑ بیگ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام امام بخش برلاس تھا۔ امام بخش برلاس کے چار بیٹے تھے اور ان چاروں بیٹوں کی اولاد مختلف اطراف واکناف میں آباد ہوتی گئی۔ ان لوگوں کا پرانا پیشہ مغلوں کی فوج کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی زین پر تلہ کناری کا کام کرنا تھا اور یہ اس کام میں غیر معمولی ہنر اور مہارت کے مالک تھے۔ بعد میں اس خاندان کے لوگ تعلیم و ہنر کی طرف راغب ہو گئے اور تعلیم کے میدان میں اس خاندان کے لوگوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ برلاس ضرور لکھتے ہیں۔

پشاور کے سوری خاندان:

قبیلوں میں سوری ایک بہت بڑا اور نامور پختون قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کے

نام سے منسوب سوڑی زئی کا گاؤں پشاور سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے جو اصل میں سوری زئی تھا بعد میں سوڑی زئی ہوا۔ اس قبیلے کا مورث اعلیٰ ''بخی تھاران'' تھا جو کہ علاقہ غور میں آباد تھا۔ یہ اصل میں غور کے شنبیوں میں سے تھا امیر شنب علاقہ غورستان کا پہلا امیر تھا اور اسی خاندان میں سے بعد میں بخی تھاران علاقہ غور کا امیر ہوا۔ پھر اس کے پوتے سوری کو امارت غورستان تفویض ہوئی۔ چنانچہ اس کے اعقاب و اخلاف بعد میں سوری کے نام سے موسوم ہوئے امیر سوری کا بیٹا محمد سوری تھا جو کہ غزنوی سلاطین کے عہد میں غورستان کا امیر تھا۔ اس نے اپنے حسن تدبر اور اعلیٰ انتظامی اور سیاسی معاملہ فہمی اور صلاحیتوں کی بناء پر غورستان کو ناقابل شکست بناء دیا تھا اور باوجود بار بار کی یلغار کے غورستان کو غزنوی سلاطین شکست دینے میں ناکام رہے۔ محمد سوری کے بعد اس کے بیٹے اور بھائی علی الترتیب غورستان کے امیر مقرر ہوتے رہے اس سارے عرصہ میں غزنویوں نے بار بار غورستان پر حملہ کیا مگر غورستان کو فتح نہ کر سکے اور پھر آخر کار سوریوں کے ہاتھوں ہی سے غزنویوں کا آفتاب اقتدار غروب ہوا۔ طویل عرصے کے بعد سوری خاندان کا شیر شاہ سوری کی قد آور شخصیت سے یہ خاندان پھر آسمان شہرت پر نمودار ہوا۔ پختون قبیلے سوری کا یہ عظیم فرزند جس کا اصل نام فرید خان تھا اس نے پشتونوں کی منتشر طاقت کو یکجا کیا اور برصغیر ہندوستان کی سلطنت پر چھا گیا اس کے باپ کا نام حسن خان سوری تھا فرید خان 1447ء میں حصار فروزہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس دوران حسن خان سوری ٹانڈہ کا جاگیردار تھا فرید خان سوری نے مغل تاجدار بابر کے عہد میں بہار جا کر محمد شاہ کی ملازمت اختیار کی۔ اس دوران شکار کے موقع پر فرید خان نے اپنی تلوار سے شیر کو مار ڈالا جس پر محمد شاہ نے اسے شیر خان کا خطاب دیا۔ اس کے بعد فرید خان شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہوا۔ جب محمد شاہ نے وفات پائی تو اس کے بیٹے جلال خان نے جانشینی کے بعد شیر شاہ سوری کو اپنا نائب مقرر کیا۔ بعد میں جلال خان اور شیر شاہ سوری کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ نتیجے کے طور پر جلال خان کو اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا اور وہ بھاگ کر بنگال چلا گیا۔ جب مغل بادشاہ ہمایوں تخت نشین ہوا تو شیر شاہ سوری اور ہمایوں کے درمیان جنگیں شروع ہوئیں۔ شیر شاہ سوری نے آگرہ اور دہلی پر قبضہ کر لیا تو ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور وہ کابل چلا آیا تو شیر شاہ سوری پورے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ شیر شاہ سوری انتہائی درجے کا مہربان، مدبر، زیرک، معاملہ فہم، سیاست سے آشنا اور بردبار بادشاہ تھا۔ شیر شاہ سوری نے قابل ذکر اصلاحات کیں۔ شیر شاہ سوری کے دور سے ہی پختون قبیلہ سوری کے نام سے پشاور میں مقیم ہے جو کہ اپنے نام کے ساتھ سوری لکھتے ہیں۔

پوپل زئی:

پشاور کا یہ معزز اور صاحب علم و فضیلت گھرانہ ابدالیوں کی اولاد میں سے ہے۔ یہ لوگ زیرک کے بیٹے پوپل کی اولاد ہیں۔

زیرک جس کا شجرہ ترین سے ہو کر سڑبن سے جا کر مل جاتا ہے۔

پوپل بارک کا چھوٹا بھائی تھا۔ پوپل زئیوں اور بارکزئیوں کے مابین سرداری کے منصب کے حصول کی خاطر شروع ہی سے جنگیں رہی ہیں۔

چونکہ زیرک نے اپنی زندگی ہی میں بارک کو بڑا بیٹا ہونے کے ناطے سرداری کا منصب تفویض کر دیا تھا اور تقریباً پندرہ سال تک وہ قوم کا سردار تھا۔ بعد میں پوپل نے اپنی حکمت عملی سے بارک سے سرداری کا منصب چھین لیا جس کی وجہ سے ان دونوں کی اولاد ایک دوسرے کی حریف رہی اور اس بناء پر یہ دونوں منتشر ہو کر کئی شاخوں میں منقسم ہو گئے۔ پوپل کے تین بیٹے تھے (۱) حبیب (۲) بارد (۳) ایوب۔

حبیب سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس لئے باپ کا جانشین ہوا اور عرصہ دراز تک قوم کی سرداری کے منصب پر فائز رہا اس طرح سرداری پوپل زئی خاندان میں کلیتہً منتقل ہو گئی تھی۔

حبیب باون سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کے چھ بیٹے تھے باپ کی وفات کے بعد بھائیوں کے مابین سرداری کے منصب کے حصول کے لئے زبردست کشمکش شروع ہو گئی اس کے ایک بیٹے بامی کو سردار بنا دیا گیا اس نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ باقی کے تین بیٹے تھے۔ نصرت، گنی اور شہا۔ سرداری کے منصب کے لئے ان تینوں میں سے ایک میں بھی اہلیت نہ تھی اس لئے سرداری کے منصب پر گنی کے بیٹے بہلول کو فائز کیا گیا۔ بہلول کے دو بیٹے تھے معروف اور علی۔ باپ کی وفات کے بعد دونوں یکے بعد دیگرے سردار ہوئے۔ معروف خان کے بیٹے کا نام عمر تھا جو باپ کی وفات کے بعد سردار ہوا۔ عمر کے تین بیٹے تھے اسد اللہ، صالح اور آدم۔ جب عمر فوت ہوا تو سرداری کے منصب پر اسد اللہ فائز ہوا جسے سردار سندو کہتے تھے۔ اسی کی اولاد آگے چل کر سدوزئی مشہور ہوئی جو آج تک ہے۔

پشاور میں پوپلزئی خاندان کی آمد انقلاب روس کے نتیجے میں ہوئی۔ ان کا تعلق افغانستان کے صوبہ قندھار کے علاقہ ''ذاکر شریف'' سے ہے۔ اس خاندان کے اسلاف افغانستان میں عہدہ قضاء پر مامور تھے اور جب یہ خاندان پشاور منتقل ہوا تو عہدہ قضاء و فتویٰ ان میں نسلاً بعد النسل منتقل ہوتا رہا۔ مولانا مفتی محمد امین کے فرزند مولانا مفتی عبدالحئی پشاور کی قدیم مغلیہ دور کی تاریخی مسگران اور دالگران

بازار کے سنگم پر واقع مسجد قاسم علی خان کے خطیب تھے۔ ان کے چھ فرزند تھے عبدالنصیر، عبدالبصیر، عبدالمجید، عبدالحمید، عبدالرحیم اور عبدالقیوم پوپلزئی۔ ان میں سے عبدالمجید اور عبدالحمید بچپن میں جبکہ عبدالنصیر اور عبدالبصیر لڑکپن میں فوت ہو گئے تھے۔ مفتی عبدالرحیم پوپلزئی نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مفتی عبدالقیوم نے بھی بھائی کے شانہ بشانہ تحریک آزادی میں حصہ لیا۔

تاریخی جامع مسجد قاسم علی خان میں اب اسی گھرانہ کی چھٹی پشت میں سے مفتی عبدالقیوم کے فرزند مفتی شہاب الدین خطیب ہیں اور اپنے والد کی جانشینی میں عہدہ قضاء پر مامور ہیں۔

اخونزادگان:

پشاور میں اخونزادگان خاندان کے لوگ عرصہ دراز سے سکونت پذیر ہیں۔ اس خاندان کے ایک نامور بزرگ اخونزادہ مختار علی نیر ہیں۔ جو پشاور کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور ہیں۔ بقول ان کے اخونزادگان سوات کے ایک علاقہ فتح پور سے نقل مکانی کر کے پشاور آئے تھے۔ پہلے پہل یہ خاندان بھی مشرق و شمال مشرق سے آنے والے خاندانوں کی طرح یہاں آئے تو موضع چمکنی میں مقیم ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ پشاور میں منتقل ہوئے۔ بقول مختار علی نیر اخونزادگان کا شجرہ نسب نامور روحانی شخصیت دیوانہ بابا کی اولاد سے مل جاتا ہے۔ تحقیق و جستجو کے بعد جو سراغ مل سکا ہے اس کے مطابق دیوانہ باباؒ اپنے وقت کی نامور روحانی اور علمی فضیلت کی حامل شخصیت تھے۔ ان کا اصلی نام محمد صالح تھا یہ صاحب شریعت و طریقت تھے اور وقت کے جلیل القدر ولی کامل حضرت شیخ عبدالوہاب المعروف حضرت اخون پنجو کے خالہ زاد بھائی تھے۔

بنوری سادات:

پشاور کا علاقہ بھانہ ماڑی بنوری سادات کا مستقل مسکن ہے۔ اس خاندان کا تعلق مشوانی سادات سے ہے جو سادات آفاغنہ کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

اس سادات گھرانے کے مورث اعلیٰ حضرت سید آدم بنوری ہیں اور ان کی اولاد بنور خیل سادات کے نام سے بھی مشہور ہے۔ حضرت سید آدم بنوری کے روحانی فیوض و برکات کا زمانہ 1664ء کا ہے۔ آپ ہندوستان کے قصبہ بانور کے رہنے والے تھے اس وجہ سے یہ بانوری مشہور ہوئے بعد میں بانوری بنوری ہو گئے اور عہد حاضر میں اسی نام کے ساتھ جو کہ علاقے کی نسبت ہے پشاور میں آباد ہیں۔

پشاور میں بنوری سادات کے جو نامور علماء اور فضلاء گزرے ہیں ان میں مولانا سید فضل صمدانی، سید فضل خالق، سید فضل قیوم اور مولانا سید ایوب جان بنوری قابل ذکر ہیں۔ ان میں مولانا سید فضل صمدانی غیر معمولی علمی اور تہذیبی و ثقافتی شخصیت کے حامل شخص تھے ان کا محبوب مشغلہ نایاب کتب کا جمع کرنا، پرانے سکوں کو جمع کرنا، مختلف ظروف و خطوط کو یادگار بنانا تھا۔ مرحوم کی رہائش گاہ واقع بنوری سٹریٹ بھانہ ماڑی میں اب تک ان کی جمع کردہ نوادرات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جو ثقافتی ورثے کے اعتبار سے پشاور کی واحد ایسی جگہ ہے جسے بجا طور پر ثقافتی مقام کا درجہ حاصل ہے۔

پشاور کے قزلباش:

پاکستان کی فوج اور دیگر محکموں میں اعلیٰ منصب و درجہ پر فائز یہ تعلیمیافتہ خوبرو اور تہذیبی نزاکتوں کی نگہداشت کرنے والے افراد قزلباش خاندان کے لوگ ہیں۔

قزلباش خاندان جو کہ پشاور میں نادر شاہ افشار کی اس فوج کا حصہ بن کر آیا تھا جس نے آخری مغل شہزادوں کے دور میں دہلی پر حملہ کیا تھا۔

عزاداری، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی منظرنامے کے مؤلف شاہد نقوی کے مطابق شاہ اسماعیل صفوی اور نادر شاہ افشار کی فوج کے تمام افراد قزلباش کہلاتے ہیں۔ قزلباش کے لغوی معانی سرخ کے ہیں۔ یہ ایران کے وہ شیعہ لوگ ہیں جو کہ نادر شاہ افشار کے عہد میں اس کی فوج کا حصہ بنے۔ ان کی ثقافتی علامت یہ تھی کہ یہ لوگ سروں پر سرخ رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے جس کی وجہ سے عام فہم معنی میں یہ سرخ مشہور ہوئے اور ویسے بھی یہ لوگ اپنی رنگت کے اعتبار سے بھی گلابی سرخی رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی یہ سرخ ہیں اس بناء پر انہیں قزلباش کا نام دیا گیا ہے۔

قزلباش خاندان کے لوگ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہ لوگ شروع ہی سے شہری، سرکاری، درباری اور اہم فوجی عہدوں اور منصب پر فائز رہے۔ ان کی مادری زبان شستہ فارسی ہے اور پشاور میں عرصہ دراز سے مقیم ہونے کے باوجود یہ آپس میں فارسی ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ فارسی کے علاوہ یہ لوگ ہندکو بڑی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہ قدآور، خوبرو اور نفاست پسند لوگ ہیں۔ پشاور کے لوگوں کے ساتھ ان کا میل جول بلاتکلفانہ ہے۔

اپنے مذہبی رسوم کی بجاآوری اور مسلک سے وابستگی ان کا ہمیشہ سے

طرہ امتیاز رہا ہے۔ پشاور میں یہ لوگ صدیوں سے اپنے شیعہ مسلک وعقیدہ کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ پشاور کے قزلباش خاندان میں آغا خان' بابا خان کا خاندان بہت مشہور ہے۔

درانی:

پشاور میں مقیم درانی خاندان اصل میں لفظ درانی کسی جدا اور مخصوص قوم و قبیلہ یا خاندان سے منسوب نہیں یہ ابدالیوں کے ایک قبیلے سدوزئی سے تعلق رکھنے والا خاندان ہے۔

نادر شاہ افشار کے قتل کے بعد جب احمد شاہ ابدالی بادشاہ ہوا تو اس نے اپنا لقب دردوران رکھا جو بعد میں دردوران سے درانی ہوا اور اب تک اس کے قبیلے کے لوگ درانی کے نام سے ہی مشہور ہیں۔

نادر شاہ افشار جس کا اصلی نام طہماسپ قلی خان تھا اس کا تعلق ترک کے ایک قبیلے افشار سے تھا۔ اس لئے اسے افشار کہتے ہیں۔ یہ بہت بہادر اور نڈر قسم کا انسان تھا۔ شروع میں یہ ایک ڈاکو کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ اس کی بہادرانہ صلاحیتوں کے بناء پر ایران کے شہزادہ طہماسپ جو اس کا ہم نام تھا اس نے اسے اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا۔ بہت قلیل عرصے میں فوج میں اس نے اپنا اثر ورسوخ بڑھایا اور پھر جبراً ایرانی سپاہ کا سپاہ سالار بن گیا اور پھر خراسان' سیستان کرمان اور ماندران کے علاقے فتح کر لئے۔ انہیں دنوں ہرات میں ابدالی پختونوں اور قندھار میں خلجی پختونوں کا قبضہ تھا اور ایرانی حکومت سے یہ پختون ٹکر لیتے رہتے تھے۔ طہماسپ خان جو کہ بہادری اور بسالت میں یکتائے زمانہ تھا یہ نادر شاہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس نے ہرات اور قندھار کے دو پختون قبیلوں کو شکست دی۔ جنگ کے دوران اس نے ابدالی قبیلہ کے لوگوں کو بڑی بہادری اور جانثاری کے ساتھ لڑتے دیکھا تو جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس حملہ میں ابدالیوں کی فوج کو منتخب کیا اور پھر یہ دستہ بہت جلد اس کے معتمد اور جانثار سپاہیوں کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ ان ابدالیوں میں سے دو بھائی ذوالفقار خان اور احمد خان بڑے جری اور بہادر تھے۔ نادر ان کی بہادری کے علاوہ ان کی شرافت اور اعلےٰ اخلاق سے بھی بہت متاثر ہوا۔ جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو احمد خان کو ماندران کے علاقے کا منصرم بنا دیا۔ واپسی پر نادر شاہ احمد خان کی اعلےٰ انتظامی اور سیاسی صلاحیتوں سے بڑا متاثر ہوا اور اسے اپنی پسندیدہ پشتون فوج کا سربراہ بنا دیا اور پھر جب نادر شاہ اپنے ایرانی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تو تمام قبائل سرداروں کی متفقہ رائے سے اس بہادر پختون احمد خان کو 1747ء میں قندھار کا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اس کے بعد یہ احمد شاہ کے نام پر مشہور ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے متعدد اصلاحات کیں اور عدل و انصاف اور اپنے فیاضانہ برتاؤ کی وجہ سے پختون فوج اور سرداروں میں بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا اس پر عوام نے انہیں دردوران کا خطاب دیا جس کا مطلب ہے زمانے کا موتی جو کثرت استعمال سے دردوران سے درانی ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی نے ایران اور مغل شہزادوں سے پختون علاقوں کو آزاد کرانے کا عزم کیا۔ چنانچہ غزنی اور کابل کی تسخیر کے بعد احمد شاہ درانی پشاور پہنچا اور چھچ تک کا علاقہ اس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پھر 1749ء میں اس نے ہندوستان کی طرف مزید پیش قدمی کی اور ملتان اور پنجاب کے دوسرے علاقے بھی فتح کر لئے اور پھر 1757ء میں مغل شہزادوں کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا اور پھر دوبارہ قندھار چلا آیا تو مرہٹوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا جن کی گوشمالی کے لئے یہ دوبارہ حملہ آور ہوا اور انہیں شکست دے کر پانی پت کے میدان کی طرف انہیں بھگا دیا جہاں مرہٹوں اور درانیوں کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ احمد شاہ ابدالی (درانی) نے 1773ء میں انتقال کیا تو احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ درانی اس کا جانشین ہوا اس نے پشاور کے قلعہ بالا حصار کو اپنا سرمائی مسکن قرار دیا۔ اس نے پشاور میں درانیوں کو آباد کیا۔ درانیوں کے علاوہ کئی دوسرے خاندانوں کو بھی یہاں لا کر آباد کیا۔ بہرحال احمد شاہ ابدالی کے بعد اس کے بیٹے تیمور شاہ کے عہد سے درانی پشاور میں آباد ہیں۔ اس خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ درانی لگاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض درانی جو کہ افغانستان کے مختلف علاقوں میں آباد تھے ان میں سے بھی اکثر درانی امیر عبدالرحمٰن کے انقلاب کے دوران پشاور منتقل ہو گئے تھے پشاور میں مقیم درانی شستہ ہندکو زبان بولتے ہیں جبکہ یہ لوگ فارسی میں بھی بول چال کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی مادری زبان پشتو کو بحال رکھا۔

بارکزئی:

پشتون قبائل میں بارکزئی قبیلہ بہت قدیم اور معاملہ فہم قبیلہ سمجھا جاتا ہے ان کی اصل ترین ابن شرجون ابن سڑبن سے ہے ان کی اولاد میں ''زیرک'' وہ شخص ہے جس سے اس قبیلے کی بنیاد پڑی۔ زیرک کے چار بیٹے تھے۔ ایک بیٹے بارک کی اولاد ہی بارک کہلائی۔ محمد زئی اور بارکزئی آپس میں چچیرے بھائی ہیں۔ بارکزئیوں کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ نادر شاہ افشار کے قتل کے بعد جب

جانشینی کی بات چلی تو احمد شاہ ابدالی کو قندھار کا بادشاہ بنانے کے ساتھ ساتھ وزارت کے عہدے پر بارکزئی کے قبیلے کے آدمی کا نام تجویز ہوا۔ چنانچہ اسی دور سے ان ابدالیوں یعنی درانیوں کے ساتھ ساتھ بارکزئی قبیلے کے لوگ حکومتی سیاست اور انتظام وانصرام میں شامل دکھائی دیتے ہیں۔ بارکزئی قبیلوں میں پائندہ خیل قبیلہ سب سے زیادہ فائق اور برتر قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کا سردار پائندہ خان تھا اور اس کی اولاد پائندہ خیل کہلائی۔ پائندہ خان عقل وفراست میں غیر معمولی صلاحیت کا مالک تھا۔ وہ سیاسی تدبر میں اہلیت کاملہ کا حامل تھا۔ تیمور شاہ درانی کے انتقال کے بعد جب جانشینی کی بات چلی تو پائندہ خان ہی وہ شخص تھا جس نے اپنے سیاسی اور معاملہ فہم تدبر کے ساتھ تیمور شاہ کی یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والی خاتون کے دو بیٹوں میں سے زمان مرزا کے لئے سب سے بیعت لی اور اس کو تیمور شاہ کا جانشین بنا دیا۔ مگر زمان مرزا نے ایسی نامناسب اور غیر تسلی بخش سیاسی حکمت عملی اپنائی جس کی وجہ سے کئی سردار اس سے متنفر ہو گئے۔ اس نفرت وحقارت کی وجہ سے اسے معزول کرنے کے لئے ایک سازش تیار کی گئی مگر سازش کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی جاسوسوں کے ذریعے زمان شاہ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ زمان شاہ نے پائندہ خان کو قتل کروا دیا اور محمد زئی اور بارکزئی قبیلے کے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس میں پائندہ خان کا بیٹا سردار فتح محمد خان بھی شامل تھا۔ وہ بھاگ کر زمان شاہ کے بھائی محمود شاہ کے پاس پہنچا اور زمان شاہ کے خلاف بغاوت پر اسے اکسایا۔ چنانچہ محمود شاہ نے بارکزئی، محمد زئی اور ابدالیوں کی مدد سے قندھار پر قبضہ کر لیا اور پھر 1800ء میں کابل پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا اور سردار فتح محمد خان کو شاہ دوست کا خطاب دیا اور امور سلطنت میں بہت حد تک اسے با اختیار بنا دیا۔ مگر بعد میں محمود شاہ کے بیٹے کامران کے دل میں سردار فتح محمد خان کے لئے حسد اور کینہ پیدا ہو گیا اور سردار فتح محمد خان کی آنکھیں پھوڑ دیں جس پر سردار فتح محمد خان کے بھائی سردار دوست محمد خان نے کابل پر قبضہ کر لیا اس دوران سردار فتح محمد خان کو محمود شاہ اور اس کے بیٹے کامران نے بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا جس کی وجہ سے پورے علاقے میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی اس دوران سکھوں نے افراتفری سے فائدہ اٹھا کر پشاور پر حملہ کر دیا اور اس وقت سردار یار محمد خان پشاور کا حکمران تھا۔ سکھوں نے یار محمد خان بارکزئی کو اپنا باجگزار بنا دیا۔

بہر حال یہ اپنی حکومت کے دوران ہی پشاور ومضافات میں آباد ہیں۔ پشاور میں یہ لوگ سردار کے نام سے متعارف ہیں اور یہ اپنے نام سے پہلے سردار استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ اپنے نام کے ساتھ بارکزئی لکھتے ہیں۔

سیٹھی:

پشاور کا سیٹھی خاندان متمول اور علم ودانش سے رغبت رکھنے والا خاندان ہے۔ جن کی رہائش گاہیں اور حویلیاں پشاور کے مغل دور کے ثقافتی ورثے یادگار علامت ہیں۔ سیٹھی خاندان کی مختلف شاخیں ہیں۔ مجموعی طور پر اس خاندان کی تمام شاخیں خواجہ یا خواجگان کے ذیل میں آتی ہیں اور متمول وتجارت پیشہ ہونے کی حیثیت سے سیٹھی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس خاندان کی ذیلی شاخیں حسب ذیل ہیں ان تمام شاخوں سے تعلق رکھنے والے اپنے نام سے پہلے خواجہ اور سیٹھی استعمال کرتے ہیں۔ ان سیٹھیوں میں سے روڑ شاخ نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔

قوم خواجگان کی بنیادی تاریخ تو دستیاب نہ ہو سکی کہ یہ لوگ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا نسلی اور نسبی سلسلہ کیا ہے البتہ جیسا کہ دیگر اقوام حملہ آوروں کے ساتھ مغربی دروں سے آتی گئیں۔ یہ بھی انہیں کے ساتھ وسطی ایشیاء یا ترک و ایران کی جانب سے آئے ہوں گے۔

گمان ہے کہ یہ لوگ تیمور لنگ کے ساتھ برصغیر ہندوستان میں داخل ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ان خواجگان کا پہلا مسکن سرگودہا کا علاقہ بھیرہ تھا۔ چونکہ تیمور ہندوستان میں بنوں کے علاقے سے ہوتا ہوا دریائے سندھ کو عبور کر کے ان تمام علاقوں سے گزرا تھا۔ اس لئے اکثر قومیں جو تیمور کے ساتھ آئی تھیں ان کا پہلا پڑاؤ یہی علاقے تھے اور انہیں علاقوں میں یہ وارد ہونے والی قومیں آباد ہوتی گئیں۔ بہر حال بھیرہ جو کہ اس وقت ایک تجارتی منڈی تھی اس لئے یہ تجارت مزاج خاندان وہیں ٹھہر گیا بعد میں انہوں نے وہاں سے نقل مکانی کی اور صوبہ سرحد کے علاقے میں پشاور کے قریب موضع چمکنی میں پہلا پڑاؤ کیا جو کہ اس وقت ایک بہت بڑی تجارتی منڈی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ وہاں سے تمدنی شہر پشاور میں داخل ہوئے اور اس خاندان کے اسلاف نے موجودہ محلہ سیٹھیاں کے بالمقابل محلہ زرگراں میں کوچہ باقر شاہ کے مقام پر پہلا مکان خریدا اور اس میں آباد ہو گئے۔ پشاور میں ان کی نقل مکانی کا زمانہ 1731ء بتایا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ ہندوستان پر محمد شاہ مغل تخت نشین تھا جو اپنے طرز تعیش کی بناء پر محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور تھا اور اس کی طرف سے نواب ناصر خان پشاور کا حکمران تھا جو پشاور ہی میں رہتا تھا اور پشاور میں اس کے نام سے چوک ناصر خان مشہور مقام ہے۔ پشاور میں وارد ہونے والے خاندان خواجگان میں سے ان کا مورث اعلیٰ میاں حافظ فضل احمد ہے۔ اس خاندان کی پشاور میں آباد

تمام شاخیں حسب ذیل ہیں:

سیٹھی، حکیم، روڑ، مانہ، پھلیلی، گرواڑا، جالی اور بھیروی۔

صدیقی: پشاور کا یہ ایک نامور مہذب مقامی خاندان ہے۔ شروع میں یہ خاندان بہت مختصر تھا مغل دور میں اس خاندان کے آباؤ اجداد افغانستان سے پشاور آ کر آباد ہوئے تھے اور یہاں پر تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ لوگ اپنے سلسلہ نسبت کو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جوڑتے ہیں۔ اس نسبتی اعتبار سے صدیقی افغانستان پہنچے اور افغانستان کی سرزمین کو اپنا مسکن بنالیا۔ بعد میں اس خاندان کے اسلاف میں سے ایک بزرگ میاں گل حسن صدیقی اپنے خاندان کے ساتھ پشاور آ کر پشاور کے موجودہ بازار کلاں میں آباد ہو گئے بعد میں میاں گل حسن نے ایک وسیع وعریض حویلی تعمیر کروائی جسے بساط گل حسن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حویلی اب اصلی شکل میں موجود نہیں مگر پشاور کے قدیم باشندے اسی نام سے اس علاقے کو یاد کرتے ہیں۔

میر: یہ پشاور میں ایک مختصر سا خاندان ہے۔ میروں کا خاندان سمرقند سے ہندوستان منتقل ہوا۔ برصغیر ہندوستان میں اس خاندان کا جو سب سے پہلا شخص داخل ہوا تھا اس کا نام میر قطب الدین تھا۔

میر اصل میں امیر سے نکلا ہے اور یہ لفظ وسطی ایشیاء افغانستان اور ہندوستان میں حاکم یا سلطان کے لئے استعمال ہوتا ہے چونکہ اس خاندان کے لوگ سمرقند کے حکمران تھے اس لئے یہ اپنے نام کے ساتھ میر لگاتے ہیں۔ میر رشید سمرقند کا پہلا حکمران تھا۔ میر رشید کے آٹھ بیٹے تھے جو مختلف سمتوں میں پھیل گئے تھے ان میں قطب الدین افغانستان کی طرف آ گیا اور پھر آگے چل کر اس کی اولاد ہندوستان کے مختلف شہروں میں آباد ہوئی۔ انہیں میں سے ایک چھوٹا سا خاندان پشاور میں آ کر آباد ہو گیا۔ اس خاندان کے لوگ اپنا سلسلہ نسب عرب کے خاندان بنو امیہ سے جوڑتے ہیں۔

کشمیری: پشاور کے علاقہ ڈگری کے پاس آسیہ سٹریٹ میں ایک کشمیری محلہ بہت مشہور ہے۔ کشمیر سے آئے ہوئے لوگ اسی محلہ میں آباد ہوئے اور پھر آج تک یہ محلہ انہی کی نسبت سے کشمیری محلہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ گزشتہ تقریباً تین سو سال سے یہاں آباد ہیں۔ پشاور کے گیلانی سادات کے مورث اعلیٰ سید حسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ جب کشمیر تشریف لے گئے تو وہاں پر جن تین بااثر شخصیتوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ان میں سے ایک میر محمد افضل اندرابی بھی تھے جو بعد میں پیر سید حسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ہی پشاور میں آ کر اس جگہ آباد ہو گئے اور پھر اسی جگہ یعنی کشمیری محلہ میں ان کی اولاد پھیلی۔ چونکہ یہ بھی میر ہی تھے۔ اس لئے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ ہو سکتا ہے انہیں کی اولاد میں سے میر بھی ہیں۔

طاہر خیلی: یہ خاندان مندڑ یوسفزئیوں کی شاخ اتمان زئی کی ذیلی خیل، اسماعیل خیل (خیل علی زئی) کے اخلاف میں سے طاہر خان کی اولاد ہے۔

اس خاندان میں سے دو بھائی موتی خان اور اللہ یار خان کی اولاد پشاور میں آ کر آباد ہوئی ہے جبکہ طاہر خیلی اپنی شناخت کے ساتھ اب تک ہزارہ کے علاقہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے تربیلہ کے مقام پر آباد ہیں۔

اس خاندان کے مورث اعلیٰ طاہر خان کے پوتے بلند خان فرزند تاج خان نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ پانی پت کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا تھا۔

جس زمانے میں انگریز برصغیر ہندوستان میں داخل ہوئے اور پشاور کا بھی نظم ونسق سنبھال لیا تو یوسفزئیوں کی اس ذیلی شاخ نے قومی حمیت کے زیر اثر ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور طاہر خیلی شاخ کے چار بھائی موتی خان، اللہ یار خان، عبدالرحمان خان، اکبر خان اپنے علاقے گندھ گڑھ سے نکل کر پشاور کی طرف چلے آئے اور یہاں علاقہ یکہ توت کے اندر پڑاؤ ڈالا اور اس جگہ کا نام اپنے سابقہ علاقے گندھ گڑھ کی مناسبت سے گندھی ویڑ ارکھ دیا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ ان میں سے موتی خان اور اللہ یار خان کی اولاد اب تک یہاں آباد ہے۔ یہاں پر انہوں نے پشاوری تہذیب وثقافت اور ہندکو زبان اپنالی۔

دھوبی: دھوبیوں کا خاندان پشاور میں صدیوں سے اپنے پیشے اور قدیم ثقافتی اور روایتی رسم ورواج کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس خاندان کے چند گھرانے ہیں جو پشاور کے مختلف اطراف میں رہتے ہیں۔ پشاور شہر کے علاقہ جہانگیر پورہ میں دھوبی گلی میں چند دھوبیوں کے مکانات اب بھی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پشاور شہر کے باہر نہروں، چشموں اور ندیوں کے پاس اپنے گھاٹ پر کپڑے دھوتے اور پھر گھروں میں ان کی خواتین کپڑے استری کرتی ہیں۔ ان کے خاندان کی لڑکیاں صرف انہی کے گھرانوں میں بیاہی جاتی ہیں۔ نہ تو یہ باہر سے شادی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے خاندان میں اپنی لڑکی بیاہتے ہیں۔ یہ سب گھرانے مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ خوشی وغمی میں پرجوش طریقے سے حصہ لیتے ہیں یہ پشاور کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ ہمسری نہیں کرتے۔

کمہار: یہ خاندان بھی پشاور شہر کا ایک پیشہ ور خاندان ہے۔ تقریباً چوتھائی صدی پہلے تک پشاور کے اس خاندان کے اسلاف اپنے کام یعنی مٹی کے ظروف بنانے میں منہمک رہتے تھے۔ علاقہ یکہ توت کے محلہ مقرب خان میں ان کمہاروں کے چند گھرانے تھے جو کہ پشاوری زبان و ثقافت کے ساتھ رہتے تھے۔ اب بھی ان کے اخلاف ہیں مگر اب انہوں نے دوسرے پیشوں کو اختیار کر لیا ہے۔

بھٹی: یہ مختصر سا خاندان آج سے پچاس سال قبل تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک کے مقام اخلاص سے پشاور آ کر اپنے مخصوص کسب و پیشہ کے ساتھ آباد ہوا تھا۔ ان کا آبائی پیشہ چھاپہ گری ہے۔ یہ لوگ سیمنٹ کی بوری کے کپڑے کو دھو کر اس پر ٹھاپہ لگاتے تھے اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے آبائی وطن میں کھڈی پر چادریں وغیرہ بھی بناتے تھے۔ ان کے خاندان کا تعلق راجپوت قوم سے ہے اور راجپوتوں کی جادو بنسی شاخ سے منسلک ہیں۔

ملک: اس خاندان کے لوگ پشاور کی زرعی زمینوں کے مالک رہے ہیں۔ ان کے نام سے علاقہ یکہ توت میں ملک پورہ کے نام سے ایک محلہ آباد ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ سے زمینوں اور جائیدادوں کے مالک رہے ہیں۔ شروع میں یہ لوگ اپنی زمینوں کو کاشت کرتے تھے مگر اب دوسرے پیشوں سے منسلک ہو چکے ہیں اور نئی نسل تعلیمیافتہ ہے اور شہری سماجی اور سیاسی زندگی میں بھرپور حصہ لیتی ہے۔ یہ ملک اپنے آپ کو اعوان بھی کہتے ہیں اور اکثر ملک اپنے نام کے ساتھ اعوان بھی لگاتے ہیں۔

فصیل شہر سے باہر اورک آئی، مہمند، خلیل، یوسفزئی، خٹک، امزیدی، شنواری قبائل کے لوگ بکثرت آباد ہیں۔

مقامی خصوصیات

پشاور خطے کی مقامی خصوصیات مقامات کے حوالے سے درج ذیل ہیں:

ہزار خوانی: یہ دیہات پشاور شہر کے جنوب میں آباد ہے اس کا بہت بڑا رقبہ قبرستان پر محیط ہے۔ اسی قبرستان میں پشتو کے عظیم صوفی شاعر رحمان باباؒ کا مزار ہے جو کہ اس علاقے کی سب سے بڑی وجہ شہرت ہے۔ تاہم اس کے علاوہ بدھ دور کی وہ عظیم درسگاہ شاہ جی کی ڈھیری کے کھنڈرات بھی یہیں پر ہیں اور حضرت اخوند درویزہ کا مزار بھی یہیں پر ہے۔

ارمڑ: پشاور کے جنوب مشرق میں آباد وسیع گاؤں ہے اس کی وجہ شہرت ارمڑ قبیلہ ہے جو یہاں آباد ہے اور اسی قبیلے کے نام کی وجہ سے یہ گاؤں مشہور ہے۔ ارمڑ قبیلے کو یہاں پر محمود غزنوی نے آباد کیا تھا اور یہ سب زمینیں اس قبیلے کی جاگیر میں دے دی تھیں۔ ارمڑ کے علاوہ یہاں پر میانہ اور برکی لوگ بھی رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ وزیرستان ایجنسی سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔

چمکنی: پشاور کے مشرق کی طرف واقع اس گاؤں کی وجہ شہرت حضرت میاں محمد عمر رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ جسے پختون پشتو میں سوکنو باباؒ کہتے ہیں۔ یہ گاؤں قدیم دور میں ایک بہت بڑی تجارتی منڈی تھی اور اکثر پنجاب یا شمال مشرق کی طرف سے آنے والی اقوام کا پہلا مسکن یہی مقام ہوتا تھا۔

اکبر پورہ: پشاور کے شمال مشرق کی جانب مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کا بسایا ہوا یہ شہر اب باغوں کا دیہات ہے۔ یہاں پر آڑو، آلوچہ اور خوبانی و ناشپاتی کے ہرے بھرے باغات ہیں۔ یہاں کے پھل پنجاب کے مختلف علاقوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ اس علاقے کی وجہ شہرت شیخ عبدالوہاب المعروف شیخ بچو کا مزار ہے جہاں عقیدت مند بکثرت جاتے اور حاضری دیتے ہیں۔

چراٹ: یہ پشاور ریجن کے ضلع نوشہرہ کا ایک پہاڑی علاقہ ہے جو کہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس علاقے کی وجہ شہرت انگریز دور کی قائم کردہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اسے میجر چرٹ کے نام کی مناسبت سے اسے چراٹ کہا گیا ہے۔ انتہائی بلندی پر واقع ہونے کی بناء پر سرد چھاؤنی ہے۔ سردیوں کے موسم میں یہاں برفباری بھی ہوتی ہے۔ چراٹ سے ملحقہ علاقے پختے، چھیری، صالح خانہ، ڈاگ اسماعیل خیل، کوٹلی، شاہ کوٹ اور جلوزئی ہیں۔ یہ سب خٹک قوم کے علاقے ہیں۔

پیر پیائی: یہ ضلع نوشہرہ اور پشاور ریجن کا دیہات ہے۔ اس گاؤں کی آبادی زیادہ تر بابر قوم پر مشتمل ہے جو اپنے نام کے ساتھ بابر لکھتے ہیں۔ اس گاؤں کی خصوصیت بھی ان بابروں کی وجہ سے ہے۔ اسی گاؤں میں خٹک قبیلہ کی بھی خاصی آبادی ہے۔

کاکا صاحبؒ: ضلع نوشہرہ کے اس گاؤں کی وجہ شہرت حضرت کیسر گل المعروف رحمکار اور کاکا صاحب کا مزار ہے اور انہیں کے نام سے یہ گاؤں کاکا صاحبؒ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر کاکا صاحبؒ کی اولاد میاں کے نام سے

آباد ہے۔ حضرت کاکا صاحبؒ کا تعلق بخاری سادات سے تھا۔ حضرت کاکا صاحبؒ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں جمعہ کے روز 981ھ میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا نام سید شیخ بہادر ایک تھا۔

اکوڑہ خٹک: نوشہرہ کے مشرق کی جانب اکوڑہ خٹک کا شہر آباد ہے یہ خٹک قوم کے مورث ملک اکوڑ خٹک کا آباد کردہ شہر ہے اس کی وجہ شہرت بھی ملک اکوڑ خٹک ہے اور اس کے نام پر یہ گاؤں جو کہ ایک شہر کی مانند ہے مشہور ہے۔ یہاں پر پشتو کے عظیم اور نامور شاعر خوشحال خان خٹک کا مقبرہ ہے۔ خوشحال خان خٹک ملک اکوڑ خان کے پڑپوتے تھے۔

چغرمئی: پشاور کے شمال کی طرف یہ ایک گاؤں ہے جس کی وجہ شہرت یہاں پر اصحاب باباؓ کا مزار ہے۔ اصحاب باباؓ کا اصلی نام حضرت سنان بن سلمہ تھا آپ اسلام کے وہ پہلے جرنیل ہیں جن کی قیادت میں اسلامی لشکر 66ھ میں پہنچا اور یہاں کی ہندو اور بدھ راجدھانیوں کو شکست دے کر اسلام کا جھنڈا لہرایا۔ اصحاب بابا اور دوسرے بہت سے جلیل القدر لوگ یہاں پر شہید ہوئے۔ اس مقام کو اصحاب باباؓ کے مقبرے کی وجہ سے بلند مقام حاصل ہے۔ یہ داودزئیوں کا علاقہ ہے۔

ورسک: یہ پشاور کے شمال مغرب کی جانب ایک اہم مقام ہے۔ یہاں پر دریائے کابل بہتا ہے جس پر سرحد کا پہلا بڑا ڈیم بنایا گیا تھا جس کے ذریعے صوبہ سرحد کے علاقے کو بجلی کی ترسیل ہوتی ہے۔ اس ڈیم کی وجہ سے ورسک کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

پڑانگ: یہ پشاور ریجن کے ضلع چارسدہ کا نہایت ہی اہم مقام ہے۔ یہاں پر ایشیاء کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ اس قبرستان میں متعدد جلیل القدر ہستیاں مدفون ہیں۔ اس قبرستان کی وجہ سے اس علاقے کو خصوصیت حاصل ہے۔

رجڑ: رجڑ بھی چارسدہ کا ایک اہم دیہات ہے۔ یہاں پر مقامی طور پر مخصوص طریقے سے ایک مٹھائی تیار کی جاتی ہے اور یہ مٹھائی رجڑ مٹھائی کے نام سے نہ صرف صوبہ سرحد بلکہ پورے ملک میں مشہور ہے۔

تورنگزئی: ضلع چارسدہ کا گاؤں جسے یہاں کی بزرگ روحانی شخصیت جو کہ حاجی صاحب ترنگزئی کے نام سے مشہور ہے ان کی وجہ سے اس گاؤں کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔

اتمانزئی: اتمانزئی ہشتنگر کا ایک تاریخی شہر ہے۔

شیر پاؤ: شیر پاؤ بھی ایک مشہور قصبہ ہے۔

شبقدر: شبقدر پشاور ریجن کے ضلع نوشہرہ کا ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ یہ ضلع چارسدہ کی تحصیل ہے۔ اس کی وجہ شہرت وہ قلعہ ہے جسے شبقدر فورٹ کہتے ہیں۔ یہ قلعہ 1837ء میں سکھوں کے دور کے گورنر ہری سنگھ نلوہ نے اپنی دفاعی ضرورت کے پیش نظر تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعہ میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت بڑا معرکہ بھی ہوا تھا جس میں سکھوں نے شکست کھائی تھی اور قلعہ پر مسلمان مجاہدین نے قبضہ کرلیا تھا۔ اس کا قدیم نام سکھانو ڈھیرے تھا۔

تہکال: پشاور شہر کے شمال مغرب کی جانب تہکال پایاں اور تہکال بالا کے نام سے دو دیہات ہیں۔ یہ دونوں گاؤں پشاور یونیورسٹی روڈ پر ہیں۔ ان دونوں گاؤں میں پشتون لوگ آباد ہیں۔ یہ گاؤں پشاریوں میں اربابوں کے گاؤں کے نام سے مشہور ہیں اور یہی ارباب یہاں کی وجہ شہرت ہے یہ ارباب لوگ اصل میں خلیل مہمند ہیں۔ مہمند قوم کا ایک ذیلی قبیلہ خلیل ہے۔ اس قبیلے سے تعلق کی بناء پر انہیں خلیل کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ان گاؤں کے وسیع تر رقبہ کے مالک ہیں اور اس حق ملکیت کی بناء عام فہم زبان میں ارباب کہا گیا۔ ارباب کا مطلب ''مالک'' کے ہیں۔ چونکہ ان علاقوں کی زمینوں کے یہ لوگ مالک ہیں اس لئے یہ لوگ اپنے نام سے پہلے ارباب لگادیتے ہیں۔

کارخانو: یہ مقام حیات آباد اور درہ خیبر سے چند کلومیٹر پہلے آتا ہے جسے جدید بستی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر متعدد فیکٹریاں اور کارخانے ہیں مگر اس مقام کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں پر غیر ملکی ہر قسم کے سامان کی جدید قسم کی دکانیں ہیں۔ بڑی بڑی مارکیٹیں ہیں ہر مارکیٹ میں سینکڑوں دکانیں ہیں۔ ان دکانوں اور مارکیٹوں کی وجہ سے آج کل اس مقام کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ پاکستان کے ہر مقام سے لوگ یہاں آتے ہیں اور مال خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سیاح بھی یہاں پر آتے ہیں اور بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

ڈھیری باغباناں: پشاور شہر کے جنوب مغرب کی جانب کوہاٹ روڈ پر یہ ایک قدیم گاؤں ہے۔ جو اس وقت ایک قصبے کی صورت میں ہے۔ یہ قدیم زمیندار پشاوریوں کا گاؤں ہے۔ یہاں قسم قسم کے باغ باغیچے ہوتے تھے۔ ان باغیچوں میں اب بھی متعدد پھولوں کے باغ اور باغیچے موجود ہیں۔ پشاور میں پھولوں کے کام

کرنے والے پھولیارے اس گاؤں کے مقامی باشندے ہیں۔ جن کی پھولوں کی دکانیں پشاور شہر میں مختلف مقامات پر تھیں۔ ان کی دکانوں پر گلاب، چنبیلی، مروہ اور نرگس کے پھول اکثر ملتے تھے۔ اب بھی پشاور کے مختلف مقامات پر اس مقام سے تعلق رکھنے والے پھولیاروں کی دکانیں ہیں۔ ان پھولوں کے باغوں اور ان پھولیاروں کے قدیم مسکن کی وجہ سے یہ مقام ڈھیری باغباناں کے نام سے مشہور ہے۔

کوٹلہ محسن خان: کوٹلہ کا مطلب چھوٹے قلعے کا ہے۔ پشاور کے قدیم اور اہل ثروت لوگ اکثر اپنی حویلیوں کے ساتھ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے قلعے باہر کے حملہ آوروں اور خصوصاً مخالف قبیلوں کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے تعمیر کرتے تھے۔ ان قلعوں میں ارباب محسن خان کا یہ قلعہ اور قلعہ کا دروازہ بہت مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ہی لنڈی ارباب کا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی وجہ شہرت یہی کوٹلہ محسن خان ہے۔

کوٹلہ محسن خان کے دروازے کو قومی ورثہ قرار دے دیا گیا ہے اور محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے اس دروازے کی قدیم طرز کے مطابق مرمت کر کے اسے محفوظ کر لیا ہے۔

بہادر کلے: 'کلے' پشتو کا لفظ ہے جس کا مطلب گاؤں ہے۔ یہ پشاور شہر کے جنوب مغرب کی طرف واقع گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی شہرت پشتو کے عظیم صوفی شاعر حضرت عبدالرحمٰن باباؒ کی جائے ولادت کی بنا پر ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بابا رحمتہ اللہ علیہ 1632ء میں اسی مقام پر پیدا ہوئے۔

حیات آباد: حیات آباد پشاور کی جدید آبادی ہے جہاں پر نہ صرف صوبہ سرحد کے رہائشی مختلف اطراف سے آتے ہیں بلکہ پاکستان کے دیگر صوبوں کے لوگ بھی یہاں پر آباد ہو چکے ہیں۔

مقامی کھانے

پشاور کی سرزمین ایسی زرخیز ہے کہ جہاں ہر قسم کی فصلیں پائی جاتی ہیں۔ موسمی لحاظ سے بھی اس شہر کی آب و ہوا فصلوں کے لئے مناسب ہے۔ پشاور کے آس پاس کے دیہاتوں میں گندم، کپاس، مکئی، باجرہ کے علاوہ ہر نوع کی سبزیاں اور باغات میں ہر قسم کے قدرتی مزے سے بھرپور پھل موجود ہیں۔

اہل پشاور کی خوراک کا زیادہ دارومدار گندم کی روٹی، بیل، بھینس۔ بھیڑ بکری وغیرہ کا گوشت اور ہر قسم کی سبزی ہے۔ پشاور کے لوگ مقامی سبزیوں اور پھلوں کی پیداوار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

صبح کا ناشتہ: پشاور کی پرانی ثقافت یہ رہی ہے کہ گھر کی بڑی عورت صبح کے ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جبکہ مرد چائے کے لئے دودھ والے سے دودھ خریدنے بازار چلے جاتے ہیں اور حسب ضرورت دودھ اور ملائی خرید کر لاتے ہیں۔ نیز نانبائی کی دکان سے پشاور کی خاص قسم کی تکونی روٹی کلچہ لاتے ہیں۔ پشاور کے نانبائی صبح کے ناشتے کے لئے مخصوص روٹی پکاتے ہیں۔ یہ روٹی گندم کے آٹے سے بنائی جاتی ہے۔ اس روٹی پر تل اور سونف خاص طرح سے لگائی جاتی ہے اور تنور میں روٹی پکنے کے ساتھ ساتھ یہ تل اور سونف بھی سرخ ہو جاتی ہے۔

ناشتے کی تیاری تک تمام گھر والے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اگر سردیوں کا موسم ہے تو باورچی خانے میں مٹی کے بنے ہوئے چولہے کے اردگرد بچھی ہوئی تلائیوں پر سب بیٹھ جاتے ہیں چولہے کے آگے چائے پکانے والی خاتون ہوتی ہے۔ لکڑیوں سے چولہے روشن اور گرم ہوتے ہیں۔ چولہے سے اٹھتا ہوا دھواں آنکھوں سے پانی نکالتا رہتا ہے۔

اصلی پشاور کے باشندوں کے ناشتے میں جو چائے تیار کی جاتی ہے اسے شیر کی چائے کہا جاتا ہے۔ جس کے پکانے کا خاص انداز یہ ہے کہ سبز پتی کو پانی میں جوش دیا جاتا ہے جب جوش آ جائے تو اس چائے کے پانی کو دوسرے برتن میں ڈال دیا جاتا ہے اور چائے کی دیگچی میں دودھ ڈال کر اسے ابال دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف چائے کے خاص چمچے سے چائے کے پانی کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے اور جب چولہے پر رکھے ہوئے دودھ پر ابال آ جائے تو اس پانی کو اس طرح سے دودھ میں ڈالتے ہیں کہ چائے کی پتی دودھ میں نہ جا سکے اس طرح جب دودھ اور چائے کی پتی کا پانی مل جاتا ہے چائے کا رنگ گلابی ہو جاتا ہے اور پھر چائے میں چینی یا گڑ ڈال دیا جاتا ہے۔ غریب لوگوں کا گزر اس گڑ کی چائے پر ہوتا ہے۔ چائے تیار ہو جاتی ہے تو اسے پشاور کے خاص بنے ہوئے مٹی کے روغنی اور پھولدار پیالوں میں ڈالا جاتا ہے۔ پشاوری لوگ اسے نیم کاسہ کہتے ہیں اور پھر چائے کے اوپر ملائی ڈال کر اور نانبائی کی دکان سے لائی ہوئی روٹی کے ساتھ چائے کے گھونٹ سے یہ روٹی کھائی جاتی ہے۔

بعض گھرانوں میں رات کی بچی ہوئی ترکاری بھی استعمال ہوتی ہے۔ تاہم اگر کسی گھر میں کوئی مہمان ہو تو مہمان کی مہمانوازی کی خاطر گھر میں توے پر پراٹھے پکالئے

جاتے ہیں اور ساتھ انڈے گھی میں پکا لئے جاتے ہیں مگر چائے کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے۔

بعض گھرانوں میں صبح کے ناشتے میں انڈوں کے علاوہ مکھن کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ اکثر بچے ملائی اور مکھن میں چینی ملا لیتے ہیں اور روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں اور نوالے کے اوپر چائے کا گھونٹ بھی پیتے جاتے ہیں۔

اس قسم کا ناشتہ ہر پشاوری کے گھر میں تیار ہوتا ہے تاہم پچھلے بیس سال کے عرصہ میں اب پشاوریوں کے ناشتے میں بہت حد تک فرق آ چکا ہے اب شیر کی چائے بہت کم گھرانوں میں پکائی جاتی ہے زیادہ تر گھرانوں میں سیاہ پتی کی چائے تیار ہوتی ہے تاہم ایک بات جو تسلسل پذیر ہے وہ یہ کہ ہر پشاوری گھر میں چاہے گرمی ہو یا سردی چائے ضرور بنتی ہے اور ہر بچہ بوڑھا' مرد عورت چائے استعمال کرتا ہے۔

پشاور کے علاوہ مضافات میں بھی ناشتے کا وہی طریقہ رائج ہے جو شہر میں ہے۔ البتہ گاؤں کے گھرانوں میں اگر گرمی کا موسم ہو تو لسی استعمال کی جاتی ہے اور چائے کا گاؤں میں شروع ہی سے سیاہ پتی کی چائے بنانے کا رواج ہے اور گاؤں میں ہر گھر میں توے پر پراٹھا پکایا جاتا ہے۔ البتہ مزارعوں اور غریب دیہاتیوں میں پراٹھا بہت کم پکتا ہے وہ توے پر روٹی پکا کر ناشتے میں استعمال کرتے ہیں۔ گاؤں میں صبح کا ناشتہ صبح کی نماز کے فوراً بعد کیا جاتا ہے اور ناشتے کے بعد زمینوں پر کام کاج کے لئے چلے جاتے ہیں۔

شہروں اور دیہاتوں میں خواتین ناشتے کے فوراً بعد گھر کی صفائی میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد قدیم گھرانوں کی خواتین گندم کو پیسنے کے لئے چکی چلاتی ہیں اور چکی سے دوپہر کے کھانے کے لئے آٹا تیار کرتی ہیں۔ یہ خاص کر زمینداروں کی خواتین میں رواج تھا۔ جبکہ پشاور کے غریب گھرانوں کی خواتین گھروں میں دوسرے کام بھی کرتی ہیں۔ مثلاً دوپٹوں پر کناری لگانا' پختہ داں بنانے کے لئے چمڑے لگے ہوئے تختوں پر آر اور دھاگے سے پھولوں پر کام کرنا' جوتوں کے تلووں پر آر اور تار سے کام کرنا اور اس کے عوض اپنے گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دکانداروں سے کمائی وصول کرنا ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مشغول ہو جاتی ہیں۔

دوپہر کا کھانا: پشاور و مضافات میں دوپہر کے کھانے کا وقت دن کے بارہ بجے سے شروع ہو جاتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کا رواج یہ ہے کہ اس کھانے کے لئے گھرانے میں ضروریات کے مطابق سالن تیار کیا جاتا ہے۔ سبزی گوشت یا دال جو بھی ہو دوپہر کے کھانے کے لئے تیار کیا جاتا ہے یہ کھانا عام طور سے مٹی کی بنی ہوئی ہانڈی میں تیار کیا جاتا ہے اور روٹی یا تو باہر سے منگوائی جاتی ہے یا تندور میں گوندھے ہوئے آٹے کے پیڑے بھجوا کر وہاں پکوائی جاتی ہے یا گھر پر ہی لوہے کے توے پر روٹی پکائی جاتی ہے۔ پشاوریوں کے دوپہر کے کھانے میں پودینے کی چٹنی کو دہی میں ملا کر استعمال کرنے کا بھی رواج عام ہے جبکہ دیہاتوں میں پیاز کا استعمال عام ہوتا ہے۔

اگر کوئی مہمان ہو تو اس کی مہمانداری کے لئے پشاوریوں کے قدیم گھرانوں میں یہ رواج تھا کہ مہمانوں کے لئے انڈے دیسی گھی میں مرچ اور نمک ڈال کر تیار کئے جاتے ہیں اور تندور سے دیسی گھی کے پراٹھے پکوائے جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں مہمانوں کی مہمانوازی کے لئے مرغی کا شوربا اکثر تیار کیا جاتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں دیہاتوں میں کھانے میں دیگر گھریلو پکی ہوئی ترکاریوں کے ساتھ ساتھ لسی اور مکئی کی روٹی سے بھی مہمانداری کی جاتی ہے۔ شہری گھرانوں میں دوپہر کے کھانے کے بعد قہوہ کی چائے پینے کا رواج عام ہے جبکہ دیہاتوں میں عام طور سے سیاہ پتی اور دودھ کی چائے کا رواج ہے۔

شام کی چائے: قدیم زمانے ہی سے رواج ہے کہ دوپہر کے تین بجے کے بعد اور شام سے پہلے پہلے تقریباً ہر گھر میں سیاہ پتی کی بنی ہوئی دودھ والی چائے بنائی جاتی ہے اور تمام گھر کے افراد یہ چائے مقامی بنی ہوئی مٹی کی پیالیوں یا کنڈے والے کپ میں پیتے ہیں۔ اکثر بچے اس چائے کے ساتھ دوپہر کی بچی ہوئی روٹی بھی کھاتے ہیں' جبکہ بوڑھے مرد اور بوڑھی خواتین بھی چائے کے ساتھ روٹی استعمال کرتے ہیں۔

عام طور سے پشاوریوں کے گھرانوں میں مہمان بھی اسی وقت آتے ہیں اور ان کی خاطر تواضع بھی اسی قسم کی چائے سے کرتے ہیں البتہ چائے کے ساتھ باہر سے بیکری کے بنے ہوئے کلچے اور خطائی بھی پیش کی جاتی ہے۔ کچھ زمانہ پہلے رواج تھا کہ شام سے پہلے پشاوریوں کے گھروں میں مکئی کے بھنے ہوئے دانے کھائے جاتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گھر میں مکئی کے دانے موجود ہوں تو یہ دانے بچوں کے ہاتھ جگہ جگہ پر بنی ہوئی بھٹیوں پر بھیجے جاتے تھے جہاں بھٹیارن بھٹی پر بھونتی تھی۔

اگر گرمی کا موسم ہو تو گڑھ کا شربت بھی بنا کر پیا جاتا ہے۔ جبکہ دیہاتوں میں گرمی ہو یا سردی سیاہ پتی کی چائے خواہ مخواہ پی جاتی ہے۔

رات کا کھانا: پشاور شہر میں رات کے کھانے کا وقت عشاء کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت پشاور کے لوگ دوپہر کا بچا ہوا سالن ہی روٹی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ اکثر بوڑھے لوگ اور بچے رات کو دودھ پی لیتے ہیں۔ روٹی عموماً گھروں میں ہی پکتی ہے۔

گاؤں کے لوگ اکثر عشاء سے پہلے ہی روٹی کھا لیتے ہیں یہ لوگ زیادہ تر گندم کی روٹی کی بجائے مکئی کی روٹی کھاتے ہیں۔

بیماروں کا کھانا: پشاور اور مضافات میں رواج ہے کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کے لئے گندم کی روٹی ممنوع قرار دی جاتی ہے ان کا خیال ہے کہ گندم کی روٹی سے بخار بڑھ جاتا ہے اس لئے ایسے مریضوں کو چاولوں میں مونگ کی دال پکا کر دیسی گھی ملی ہوئی کھچڑی بنا کر دی جاتی ہے یا پھر گندم کو پیس کر دلیہ پکا کر اس میں چینی یا گڑ ڈال دیتے ہیں اور وہ دلیہ مریض کو پیش کیا جاتا ہے یا پھر سا گودانہ کی کھیر بنا کر دی جاتی ہے یہ تمام ہلکی غذائیں ہوتی ہیں جو کہ مریض کے لئے مفید سمجھی جاتی ہیں۔

شادی کا کھانا: پشاوریوں کے ہاں شادی کے کھانے پکانے اور مہمانوں کو کھلانے کا رواج عام ہے۔ یہ کھانا لڑکی والے اور لڑکے والے دونوں کے گھروں میں پکتا ہے۔ لڑکی والے گھر میں اس وقت کھانا دیا جاتا ہے۔ جب رات گئے برات لڑکی کے گھر پہنچتی ہے یہ کھانا سادہ بھی ہو تو تین اقسام پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں گوشت چاول' میٹھے چاول اور قورمہ ہوتا ہے۔ یہ سب کھانا شہر کے باورچی بڑی بڑی مس کی بنی ہوئی دیگوں میں پکاتے ہیں۔ یہ دیگی خاص مہارت کے ساتھ یہ کھانا پکاتے ہیں جو بڑا لذیز ہوتا ہے۔ پشاوری لوگ اسے ''تین چھتیا'' کھانا کہتے ہیں یعنی گوشت چاول' میٹھے چاول اور قورمہ اس سالن کو کہتے ہیں جس میں گوشت اور چنے کی دال ہو۔ یہ قورمہ سرخ چاولوں کے اوپر ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ اس کھانے کو برات کا کھانا کہتے ہیں۔

دوسرے روز لڑکے کے گھر میں اسی قسم کا کھانا پکتا ہے اور سب مہمان یہ کھانا کھاتے ہیں۔ اس کھانے کو ''حاضری کا کھانا'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ولیمے کا کھانا۔

دیہاتوں میں لڑکی والے گھر میں برات کو کھانا نہیں دیا جاتا۔ دیہاتوں میں برات اکثر دوپہر کے بعد لڑکی کے گھر پہنچتی ہے اور نکاح کے بعد لڑکی والے گھر میں مہمانوں کی تواضع اکثر چائے اور مٹھائی سے کی جاتی ہے۔ البتہ دوسرے روز ولیمے کا کھانا لڑکے والے دیتے ہیں۔ یہ کھانا لڑکے والے حسب استطاعت دیتے ہیں۔ غریب گھرانوں میں موٹے چاول پکائے جاتے ہیں اور اوپر قورمہ ڈالتے ہیں۔ دیہاتوں میں اس کھانے کا رواج یہ ہوتا ہے کہ کھجور کے پٹھے کی بنی ہوئی پھوڑیاں بچھا دی جاتی ہیں اور ان پر چاول ڈال دیئے جاتے ہیں مردوں کی ٹولیاں ان پھوڑیوں کے اردگرد بیٹھ کر یہ کھانا کھاتی ہیں۔

پشاور شہر میں کھانا کھانے کا یہ انداز نہیں ہے غریب ہو یا مالدار ان کے ہاں تمام مہمان ایک کپڑے کے بنے ہوئے دسترخوان کے اردگرد بیٹھ جاتے ہیں اور پھر ہر چار آدمیوں پر مشتمل ٹولی کے لئے مس کی بنی ہوئی چاولوں کی غوری رکھ دی جاتی ہے۔ جبکہ ایک صاف شفاف مٹی کی بنی ہوئی روغنی پلیٹ میں میٹھے چاول اور ایک نیم کاسہ یعنی پیالہ میں قورمہ رکھ دیا جاتا ہے اور پھر مہمان حسب ضرورت چاولوں پر قورمہ ڈال کر کھانا کھاتے ہیں۔

تنور کی روٹی: اگرچہ اب پشاوریوں کے رواجی حالات بہت بدل چکے ہیں مگر پھر بھی بعض گھرانوں میں وہ رواج اب بھی بہ تسلسل چلے آ رہے ہیں جو کہ اہلیان پشاور کی حقیقی ثقافتی اور روایتی زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ تاہم آج سے پچیس سال پہلے عام رواج تھا کہ اگر ہر گھر میں تنور نہ بھی ہو محلے کے اکثر گھروں میں ایک مٹی کی تنوری ہوتی تھی جس میں دوپہر اور شام کے وقت گھر کی عورتیں روٹیاں پکاتی تھیں۔ گوندھے ہوئے آٹے کو لے کر تنوری والے گھر خواتین پہنچ جاتی تھیں ساتھ ہی وہ تنوری میں جلانے کے لئے ایندھن بھی لیجاتی تھیں۔ اکثر یہ ایندھن گائے اور بھینس کا سوکھا ہوا گوبر ہوتا تھا۔ تنوری پر پکی ہوئی گندم کے آٹے کی روٹی کی لذت منفرد ہوتی تھی۔

مضافات کے دیہاتوں میں اس قسم کی تنوری کی روٹی کا رواج اب بھی موجود ہے۔

موسمی خوراک: جب گرمی کا موسم ہوتا ہے تو پشاور کے مضافات میں آڑو' آلوچہ' خوبانی' ناشپاتی اور کہیں کہیں انگور کے باغات میں نہایت لذیذ اور میٹھے پھل ہوتے ہیں۔ اس لئے عموماً گرمیوں کے موسم گھرانے کے بوڑھے لوگ مرد و خواتین ان پھلوں کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں۔ پشاور کے آڑو نہایت لذیذ و تازہ ہوتے ہیں زیادہ تر لوگ ان آڑوؤں کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں تاہم خربوزے اور انگور کے ساتھ بھی روٹی کھائی جاتی ہے۔

دیہات میں بھی ان پھلوں کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے مگر زیادہ تر

دیہاتی ٹھنڈی لسی کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں یہ لوگ پیاز کی گڈی پر سے چھلکا اتار کر پیاز کو دانتوں تلے چباتے ہیں اور روٹی کے نوالے کے ساتھ ساتھ لسی کا گھونٹ بھی پیتے ہیں اور یوں اس طرح اپنا پیٹ نہایت سادہ خوراک کے ساتھ پالتے ہیں۔

زچہ کی خوراک: جب کسی گھر میں بچہ جنے تو پشاوریوں کے ہاں زچہ کو معمول کا کھانا نہیں دیتے بلکہ زچہ کے لئے اچھوانی کا خاص مشروب تیار کیا جاتا ہے۔ خاص مقدار آٹا لے کے ایک دیگچی میں اسے دیسی گھی کے ساتھ سرخ کیا جاتا ہے اور جب آٹا سرخ ہو جاتا ہے تو اس میں عموماً گڑ ملا لیا جاتا ہے۔ جب یہ پانی آٹے میں پوری طرح حل ہو جاتا ہے تو یہ خاص قسم کی مقوی شے بن جاتی ہے اور اسے ایک پیالے میں ڈال کر زچہ کو دی جاتی ہے۔ یہ زچہ کے لئے ایک دن کی خوراک ہوتی ہے۔

چہلم کا کھانا: پشاوریوں کے ہاں جب کوئی موت واقع ہو جائے تو میت والے گھر میں تین دن تک کھانا نہیں پکتا اور اس ماتمی گھر میں گھر کے افراد اور دیگر مہمانوں کے لئے آس پاس کے پڑوسی یا قریبی رشتے دار اپنے گھروں سے سالن پکوا کر اور روٹیاں بھجواتے ہیں تاہم یہ دستور اب بہت کم رہ گیا ہے اور میت کے دفنانے کے پہلے دن ہی سے دفن کرنے کے بعد میت والے گھر کھانا پکتا ہے تاہم قدیم گھرانوں میں اول الذکر رواج اب تک موجود ہے۔ البتہ ایک شے جو اب تک عام ہے وہ چہلم کا کھانا ہے جو عموماً مرنے والے کے چالیسویں روز کا کھانا ہوتا ہے اس روز ماتمی گھر میں پہلے ختم قرآن ہوتا ہے اور محلے کی مسجدوں کے ملا آ کر ختم قرآن پاک کرتے ہیں اور پھر میت کی مغفرت کے لئے اور لواحقین کے صبر کے لئے دعا کی جاتی ہے اور اس کے بعد کھانا شروع ہو جاتا ہے مرنے والے کے قریبی رشتے دار اور دیگر احباب اس چہلم کی رسم میں شریک ہوتے ہیں۔ چہلم کا یہ کھانا بھی چاولوں کی صورت میں ہوتا ہے جو بڑی بڑی دیگوں میں دیگی پکاتا ہے یہ رواج عموماً مضافات کے دیہات میں بھی ہے۔

ختنہ کی روٹی: قدیم پشاوریوں میں بچے کے ختنے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب ان کے ہاں لڑکا پیدا ہو تو بڑی خوشی مناتے ہیں اور جب بچہ بڑا ہونے لگتا ہے تو اس کے ختنے کا اہتمام کیا جاتا ہے قدیم گھرانوں میں یہ ختنہ خاندان کا مقرر شدہ نائی کرتا ہے جو گھر آ کر ختنہ کرتا ہے۔ ختنہ سے پہلے دوپہر کو مہمان اکٹھے ہوتے ہیں اور انہیں کھانا کھلایا جاتا ہے یہ کھانا بھی چاولوں پر مشتمل ہوتا ہے جو کہ بڑی بڑی دیگوں میں دیگی لوگ پکاتے ہیں اور پھر اسی کھانے کے بعد ختنے کی رسم ادا ہوتی ہے۔

خاص تہواروں کے پکوان: ''چوری'' پشاوریوں کے ہاں مذہبی حوالے سے یہ ایک خاص قسم کی چوری تیار کی جاتی یہ ہر سال صفر کے مہینے کے آخری بدھ کے روز اس طرح تیار کی جاتی ہے کہ پہلے گندم کے آٹے کو اچھی طرح گھی کے ساتھ گوندھ لیا جاتا ہے اور پھر توے پر بڑی بڑی روٹیاں تیار کی جاتی ہیں جب یہ روٹیاں سرخ ہو جاتی ہیں تو زمین پر بچھی ہوئی چٹائیوں کے اوپر صاف ستھری چادریں ڈال کر اس پر یہ روٹیاں رکھ دی جاتی ہیں اور گھر کے تمام افراد بیٹھ کر خصوصاً سارے بچے بڑے شوق کے ساتھ ان روٹیوں کو ہتھوڑیوں یا ان لکڑی کے بنے ہوئے مشتوں کے ساتھ جنہیں موچی چپلی بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں کے ساتھ اچھی طرح کوٹتے ہیں۔ جب تمام روٹیوں کو کوٹ لیا جاتا ہے تو اپنے ہاتھوں سے ان کوٹے ہوئے ٹکڑوں کو رگڑ لیا جاتا ہے جس سے یہ ٹکڑے میدہ ہو جاتے ہیں جب مزید ٹکڑے رہ جاتے ہیں تو دوبارہ ان ٹکڑوں کو کوٹتے ہیں اس مشق سے چوری تیار ہو جاتی ہے تو اس میں شکر یا چینی ملا دی جاتی ہے۔ اس چوری پر فاتحہ دیا جاتا ہے اور اس کے بعد یہ محلے اور رشتے داروں میں بانٹی جاتی ہے اور گھروں میں ذخیرہ بھی کی جاتی ہے۔ صبح ناشتے کے وقت اور دیگر اوقات میں چائے کے ساتھ بھی کھائی جاتی ہے۔

دیگچہ کھیر: پشاوریوں کے گھرانوں خاص کر اہل تشیع کے ہاں ایک خاص مذہبی تہوار کے حوالے سے بڑے سے دیگچے میں کھیر پکائی جاتی ہے۔ یہ کھیر انتہائی اہتمام کے ساتھ تیار کی جاتی ہے جو عموماً چھوٹے چاولوں میں دودھ ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ اس میں کھوپرا، بادام اور پستہ وغیرہ ملایا جاتا ہے۔ یہ کھیر بڑی مقدس سمجھی جاتی ہے اور صفر کے مہینے کے آخری بدھ کے روز یہ دیگچہ تیار کیا جاتا ہے اور قریبی رشتے داروں اور دوست واحباب کو باضابطہ طور پر دعوت دی جاتی ہے۔ کھیر کا دیگچہ جب تیار ہو جاتا ہے تو اس کے گرد بیٹھ کر پڑھائی کی جاتی ہے اور اس کے بعد پلیٹوں میں ڈال کر ہر ایک کو دی جاتی ہے۔ یہ اصل میں نذر کے طور پر تیار کی جاتی ہے۔

ٹکیاں: پشاوریوں کے گھرانے میں ایک مذہبی تہوار کے حوالے ہی سے ایک اور خاص قسم کی روٹی اور حلوہ تیار کیا جاتا ہے جسے پشاوری ٹکیوں کی نیاز کہتے ہیں۔ یہ اس طرح سے تیار کی جاتی ہے کہ گندم کے آٹے کو چھان لیا جاتا ہے اور پھر گڑ کا شیرہ علیحدہ تیار کر کے اس آٹے میں ملا دیا جاتا ہے اس شیرے کے پانی میں آٹا گوندھ دیا

جاتا ہے۔ ہر گھرانہ نیاز کے وقت وزن طے کر لیتا ہے مثلاً کوئی سوا پاؤ آٹا' سوا پاؤ گھی اور سوا پاؤ گڑ یا اس سے زیادہ ہو تو ہر ایک چیز کی مقدار بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔ جب یہ آٹا تیار ہو جاتا ہے تو پھر ایک کڑاہی میں گھی کو گرم کیا جاتا ہے اور پھر آٹے کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تیار کر کے گھی میں ڈال کر انہیں پکایا جاتا ہے۔ ان ٹکیوں کے ساتھ ساتھ حلوہ علیحدہ تیار کیا جاتا ہے اور پھر ان ٹکیوں پر تھوڑا تھوڑا حلوہ ڈال کر ہر ایک کو دیا جاتا ہے۔ یہ ٹکیوں کی نیاز ہوتی ہے جو اہل پشاور حضرت امام جعفر صادق کے نام کی دیتے ہیں۔ ٹکیاں تقسیم کرنے سے پہلے ان پر حضرت امام جعفر کا فاتحہ دیا جاتا ہے۔ یہ ٹکیاں گھی میں پکا کر مٹی کی بنی ہوئی سینک میں رکھی جاتی ہیں اور اس سینک کو بھی بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اہلیان پشاور رجب کے مہینے کی بائیسویں تاریخ کو یہ نیاز دیتے ہیں۔ جسے بائیسویں کی نیاز بھی کہتے ہیں۔

حلوہ: پشاور شہر و مضافات میں اسلامی مہینے شعبان کی پندرہ تاریخ کو شب برات کے موقع پر مذہبی تہوار کے حوالے سے گندم کے آٹے کو میدہ کر دیتے ہیں اور پھر اس میدہ آٹے کو گوندھ کر توے پر پراٹھے پکائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی سوجی کا حلوہ علیحدہ تیار کیا جاتا ہے جب حلوہ اور پراٹھے تیار ہو جاتے ہیں تو فاتحہ دیا جاتا ہے اور پھر یہ پراٹھے اور حلوہ اپنے قریبی رشتے داروں میں اور ہمسایوں میں باہمی طور پر بانٹ دیئے جاتے ہیں اور خود بھی تناول کیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہوتی ہے کہ پندرہ روز کے بعد رمضان المبارک کے مہینے میں روزے شروع ہو جائیں گے۔ قدیم پشاوریوں میں یہ بھی رواج ہے کہ وہ حلوہ اور پراٹھوں کے ساتھ ساتھ اس روز مسور کی دال بھی پکاتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک خاص قسم کا پکوان ہے جسے حلوہ اور دپڑاں کہا جاتا ہے جس کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔

تیرہ تیزی کی کھیر: پشاوریوں کے ہاں صفر کے مہینے کی تیرہ تاریخ کو کھیر پکائی جاتی ہے۔ قدیم گھرانوں میں یہ کھیر بڑے اہتمام کے ساتھ بنائی جاتی ہے دودھ میں بادام' پستہ' کھوپرا اور دیگر خشک پھل ڈالے جاتے ہیں اور چینی کی یہ کھیر پکائی جاتی ہے اس موقع پر کمہار خوبصورت مٹی کی ایسی ہانڈیاں بناتے ہیں جن کے اوپر نقش و نگار کے لئے رنگ اور روغن استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہانڈی چھوٹی بھی ہوتی ہے اور بڑی بھی۔ پھر ان ہانڈیوں میں یہ پکی ہوئی کھیر ڈال دی جاتی ہے۔ گھر کے بچے چھوٹی چھوٹی ہانڈیوں میں یہ کھیر ڈالتے ہیں اور جھوم جھوم کر کھاتے ہیں۔ تاہم اب ان ہانڈیوں کا رواج تو کم ہو گیا ہے اور پلیٹوں میں یہ کھیر ڈالی جاتی ہے اس پکوان کو تیرہ تیزی کی کھیر کہا جاتا ہے۔

خاص خاص پکوان

چپلی کباب: صوبہ سرحد اور خصوصاً پشاور کا علاقائی حیثیت رکھنے والا چپلی کباب یہاں کا ثقافتی پکوان ہے۔ گائے یا بھینس کے گوشت کے قیمے' مکئی کے آٹے' پیاز' ٹماٹر اور کئی قسموں کے مصالحہ جات کے امتزاج سے ایک خاص انداز میں گائے یا بھینس کی چربی کے روغن میں یہ چپلی کباب بڑی بڑی کڑاہیوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ اس چپلی کباب کی تیاری میں اول سے لے کر آخر تک ہاتھ کی مہارت سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے چپلی کباب کہا جاتا ہے۔ یہ ایک لذیذ اور سستہ پکوان ہے۔ پشاوریوں کے گھرانوں میں یہ عموماً استعمال ہوتا ہے اگر کسی روز گھر میں کھانا نہ پکے تو یہ چپلی کباب ہی منگوا کر روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ مہمانوازی بھی اس چپلی کباب کے پکوان سے کی جاتی ہے۔ یہ چپلی کباب تیار کرنے والے کو کبابی کہا جاتا ہے۔ پشاور کے بعض کبابیوں نے اس پکوان میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

شولہ: پشاوریوں کے گھروں میں موٹے اور ڈکرہ چاولوں سے یہ پکوان خاص مہارت کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔ جو اکثر پشاوری خواتین گھروں میں خاص مہارت کے ساتھ تیار کرتی ہیں۔ یہ زود ہضم اور لذیذ پکوان ہے جسے پشاوری شولہ کہتے ہیں۔ یہ قدیم زمانے سے لے کر اب تک تسلسل سے تیار ہو رہا ہے۔ شولہ پشاوریوں کا مقامی روایتی پکوان ہے۔

یہ شولہ کھچڑی سے زیادہ نرم ہوتا ہے اور ڈکرہ چاولوں کے ساتھ مونگ یا مونگ کی دال ملا کر شوربے میں تیار کیا جاتا ہے۔ جس شوربے میں تیار کیا جاتا ہے اس میں مختلف مرچ مصالحے ڈالے جاتے ہیں۔ پشاور کے مرد و زن اور بچے اور بوڑھے یکساں طور پر اسے بڑے شوق کے ساتھ نوش کرتے ہیں۔ یہ شولہ اکثر بڑے گوشت کے شوربے میں تیار کیا جاتا ہے۔ پشاور شہر کے بعض مضافاتی دیہاتوں میں شادی کے موقع پر ولیمہ کی تقریب میں بھی اسی قسم کا شولہ بڑی بڑی دیگوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ اور ولیمہ میں شریک مہمانوں کی تواضع بھی اسی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

چلا پلاؤ: پشاور کا یہ ایک خاص پلاؤ ہے جسے قدیم پشاوری لوگ ''چلا پلاؤ'' کہتے ہیں۔ اسے چلا پلاؤ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ لذت کی بنا پر ضرورت سے زیادہ کھا لیا جاتا ہے۔ یہ پشاوریوں کے گھروں میں عموماً خواتین پکاتی ہیں جبکہ مختلف تقاریب کے موقع پر بھی بڑی بڑی دیگوں میں باورچی خاص مہارت کے ساتھ یہ پلاؤ پکاتے ہیں۔ چاولوں میں موٹا چنا اور موٹا میوہ ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ پشاوریوں کے گھروں

میں ختم قرآن پاک اور دیگر تہواروں کے موقع پر یا میت کے چہلم کے روز یہ پلاؤ تیار کیا جاتا ہے۔ محرم کی دسویں، بارہ ربیع الاول اور دوسرے مواقع پر یہ پلاؤ تیار کیا جاتا ہے۔ پشاور کے لوگ عموماً اسے ''چنا میوہ کا پلاؤ'' بھی کہتے ہیں۔ یہ پلاؤ گوشت میں بھی پکتا ہے اور گوشت کے بغیر بھی۔

سری پائے: پشاور میں سری پائے کے شوربے کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ پشاور کا یہ قدیم پکوان پشاور کی قدیم دکانوں میں ایک مخصوص روایتی انداز میں پکایا جاتا ہے۔ یہ پکوان مٹی کے ایک بہت بڑے مٹکے میں خاص مہارت کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے جو کہ مٹی کیچڑ کے بنے ہوئے بڑے چولہے پر لکڑیوں کے ایندھن پر تیار کیا جاتا ہے۔ پشاوری لوگ اس پکوان کو ''پانچے'' کہتے ہیں اور یہ پکوان بنانے والے کو پانچے والا کہتے ہیں۔ ان پائے فروشوں کی قدیم دکانوں میں لوگ چٹائیوں پر بیٹھ کر مٹی کے بنے ہوئے برتنوں میں مزے لے لے کر نوش کرتے ہیں۔ یہ ایک نہایت مقوی پکوان ہے جو کہ اہلیان پشاور کا صدیوں سے روایتی اور کم خرچ پکوان سمجھا جاتا ہے۔

اکثر لوگ رات کی بچی ہوئی باسی روٹی کو اس پکوان کے شوربے میں بھگو کر اور خوب نرم کر کے کھاتے ہیں جبکہ یہ پائے فروش اس شوربے میں روٹی ڈال کر اسے نرم کرتے ہیں اور جب ملغوبہ تیار ہو جاتا ہے تو گاہک کی فرمائش پر اس پر پائے اور سر کا گوشت ڈال دیتے ہیں۔ اسے پشاوری لوگ ''کلہ'' کہتے ہیں۔

میٹھی حلیم: سردیوں کے موسم میں پشاور کا یہ خاص پکوان مقوی اور غذائیت کا حامل پکوان ہے۔ زمانہ قدیم سے قصہ خوانی بازار کے عقب میں بنتا رہا ہے۔ یہ بڑی مہارت کے ساتھ مٹی کے مٹکے میں تیار کیا جاتا ہے۔

گوشت کو ٹکڑے کر کے اور گندم کو بھگو کر ایک بڑے مٹکے میں پانی ڈال کر اس میں اجناس ڈال دیئے جاتے ہیں اور پھر ساری رات اسے آگ کے بڑے چولہے پر رکھ کر پکایا جاتا ہے۔ صبح سویرے یہ پکوان تیار ہو جاتا ہے۔ پھر اس حلیم میں لوگ انڈے، گھی اور چینی ملا کر ناشتے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ نہایت لذیذ، مقوی اور گرم پکوان ہوتا ہے جسے میٹھی حلیم کہا جاتا ہے۔

عکھوہ/اکھموہ: یہ پشاوریوں کے ہاں ایک ایسا پکوان ہے جس کا تعلق منت اور نیاز سے ہے۔ جب کسی کی آنکھیں دکھتی ہوں یا آشوب چشم اور علاج بسیار کے باوجود آنکھیں ٹھیک نہ ہوں تو آنکھوں کی شفایابی کے لئے یہ منت مانی جاتی ہے کہ اگر آنکھیں ٹھیک ہو جائیں تو اکھوے پکا کر غازی میاں کے نام کی نیاز دی جائے گی۔

یہ پکوان تیار کرنے کے لئے سوا سیر گندم کے آٹے میں مقدار کے مطابق گھی ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اسی آٹے کو گوندھ لیا جاتا ہے۔ جب آٹے میں سختی پیدا ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لئے جاتے ہیں ہر پیڑے کو ہتھیلی پر رکھ کے اس کے بیچ میں دوسرے انگوٹھے کو دباتے ہیں اور پیڑے کو چراغ نما بنا لیتے ہیں اور پھر کڑاہی میں گھی ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیتے ہیں۔ جب گھی گرم ہو جاتا ہے تو اس میں یہ عکھوہ ڈال دیتے ہیں۔ جب یہ سرخ ہو جاتے ہیں تو اسے نکال کر دوسرے برتن میں گڑ یا چینی کا شیرہ بنا لیتے ہیں اور پھر اس پکے ہوئے عکھوے کو میٹھے شیرے میں ڈبو کر باہر نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد آٹے کے پیڑے کا ایک دیا بنا لیا جاتا ہے اس میں تیل ڈال دیتے ہیں اور روئی کی بتی بنا کر اس میں رکھ کر جلاتے ہیں اور پھر ان عکھوہ پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور آس پاس کے پڑوسیوں اور بچوں کو کھلاتے ہیں اور اہل خانہ خود بھی کھاتے ہیں۔

کنچکاں: جب بچوں کو چیچک یا خناق کے دانے اور پھوڑے ہو جاتے ہیں اور جب بچہ تندرست ہو جاتا ہے تو اس موقع پر میٹھے چاول پکائے جاتے ہیں۔ اکثر گھرانوں میں یہ میٹھے چاول گڑ کے ہوتے ہیں۔ پھر تندرست شدہ بچہ کو نہلا کر یہ میٹھے چاول بچوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں اس پکوان کو کنچکاں کہتے ہیں۔

سحری کا ناشتہ: رمضان المبارک کا مہینہ مسلمان گھرانوں کے لئے نہایت ہی مقدس و بابرکت ہوتا ہے اور جب رمضان کے مہینے کا چاند نکلتا ہے تو اسی رات سے روزوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مسلمان رات کے آخری پہر سے تھوڑا پہلے سحری کا ناشتہ کرتے ہیں۔ یہ کھانا عموماً اس طرح ہوتا ہے کہ گھر میں ہی شہری اور دیہاتی خواتین پراٹھے پکاتی ہیں اور رات کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں۔ پشاور کے لوگ گڑ یا شکر سے پراٹھے کھاتے ہیں اور اس کے بعد شہری لوگ عموماً قہوہ پیتے ہیں اور دیہاتی لوگ دودھ والی چائے اور پھر اذان سحر سے روزہ شروع ہو جاتا ہے۔

افطار اور کھانا: شام جب مغرب کی اذان کے ساتھ روزہ افطار ہوتا ہے تو گرمیوں میں ٹھنڈے مشروب، گڑ یا چینی کے شربت سے روزہ افطار کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ اگر سردیاں ہوں تو افطار چائے اور پکوڑوں یا مٹھائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور پھر مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھایا جاتا ہے۔ سب لوگ ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر کھانا تناول کرتے ہیں۔

عیدین کے دن کا ناشتہ: پشاور کے لوگوں میں عیدین کے روز کا ناشتہ عموماً سیویوں سے کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں صبح سویرے سیویاں پکتی ہیں اور سیویوں کے اوپر دودھ، ملائی اور شکر ڈال کر کھاتے ہیں۔ سیویوں کے ناشتے کے بعد عیدگاہ میں مرد حضرات نماز عید کی ادائیگی کے لئے چلے جاتے ہیں اور نماز کے بعد گھر واپس آ کر سب مل کر قہوہ نوش کرتے ہیں۔

پیشے اور دستکاریاں

جہاں جہاں انسانی بستیاں ہیں وہاں انسانی اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت ایسے پیشے بھی رائج ہیں جن کے ذریعے معاشرتی باہمی حیات کا سراغ ملتا ہے۔ صوبہ سرحد کا اکثر علاقہ جو کہ گندھارا کی سرزمین پر مشتمل ہے اور گندھارا تہذیب نے انسانی معاشروں میں جو ارتقاء پیدا کیا ہے اس کا بڑا حصہ ان پیشوں سے متعلق ہے جن کی وجہ سے گندھارا تہذیب اور تمدن ارتقا پذیر رہا ہے۔ پشاور کی سرزمین جو کہ اس اعلیٰ اور پختہ تہذیب کے لئے مرکزی خطہ رہا ہے تو یہاں پر گندھارا دور ہی سے اس قسم کے پیشے پنپتے رہے بلکہ جیسا کہ پشاور کے تاریخی تناظر میں نظر آتا ہے کہ گندھارا تہذیب سے بھی ہزاروں سال پہلے ہی سے پشاور کی تمدنی حیثیت کا تعین ہوتا ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین پشاور ان پیشوں سے شروع سے ہی منسلک رہی ہے۔ بلکہ اس شہر پشاور کے موجودہ نام ہی کو لے لیجئے یعنی پیشہ ور، تاریخوں میں تو یہ بھی لکھا گیا ہے کہ لفظ پشاور بجائے خود اس بات کی طرف مستند اشارہ رکھتا ہے کہ مختلف پیشہ وروں اور ہنرمندوں کی آماجگاہ اور اس جگہ پیشوں اور ہنروں نے سازگار ماحول کے ماتحت ترقی کی ہے۔ بہرحال انسانوں کی بستیوں اور معاشروں کے ارتقاء کا دار و مدار مختلف پیشوں اور دستکاریوں پر ہوتا ہے۔ خوراک کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور خوراک کے حصول کے لئے زمین کا ہونا اور زمین کو قابل کاشت بنانا بنیادی چیز ہے۔ انسانی دماغ نے بدلتے ہوئے تقاضوں کے موجب ہنروں اور پیشوں میں تبدیلی دکھائی ہے۔ پروفیسر ڈی آر بھنڈ کر نے کہا ہے کہ پیشے اور معاشرتی مشاغل بدلتے بھی رہتے ہیں مگر یہاں پر پیشے بدلنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پیشوں کی ہیئت ہی کلیتہً بدل جاتی ہے بلکہ پیشوں میں ترقی کا عنصر ہی پیشوں میں تبدیلی پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے اور جوں جوں پیشوں میں تبدیلی آتی ہے اسی حد تک پیشہ ور کا طبقہ بھی دوسرے نام سے متعارف ہو جاتا ہے۔

کاشتکار: پشاور شہر سے باہر جتنی بھی زمینیں ہیں وہ نہایت زرخیز زمینیں ہیں۔ ان زمینوں کے مالکان جو پشاور کے ملک کہلاتے ہیں انہوں نے اپنی زمینوں کو ہمیشہ کاشت و زراعت کے قابل بنا کے رکھا ہے۔ ان زمینوں پر ان ملکوں اور زمینداروں نے بڑی محنتیں کیں اور ان پر بیلوں کے ذریعے ہل چلائے۔ یہ لوگ نہ صرف زراعت کے کام کو اچھی طرح جانتے تھے بلکہ موسموں کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتے ہیں، موسمی پیداوار میں بھی تجربہ رکھتے تھے اس کے ساتھ ہی یہ لوگ اپنے مال مویشی کو پالنے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

یہ ملک لوگ اپنے ان پیشوں اور زمینداری کی وجہ سے باعزت مقام پاتے تھے جو کہ اپنی زمینوں کے حاصلات کو منڈیوں تک پہنچا کر منافع بخش مال حاصل کرتے تھے۔ ان کی زمینوں پر جو مزارع کام کرتے تھے ان کی محنت کو بھی یہ قابل قدر جان کر ان کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرتے۔ یہ بھی انکا ایک فن تھا کہ مزارعوں سے بہتر سلوک کر کے زمینوں کی نگہداشت کرتے تھے۔

ترکھان: یہ پیشہ کاشتکاری سے قریب تر ہے اس لئے کہ زمین پر ہل چلانے کے لئے جو اوزار تیار کیا جاتا تھا اس کا زیادہ تر حصہ لکڑی کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ زمینوں کو پانی دینے کے لئے کنوؤں کے پانی کا بھی استعمال ہوتا اور کنوؤں کی تمام مشینری لکڑی ہی کی بنی ہوتی تھی اور ترکھان ہی وہ پیشہ ور شخص ہے جو کہ یہ تمام چیزیں بناتا۔ درانتی اور کھرپہ کے دستے لکڑی ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لکڑیوں کے کاٹنے اور لکڑی کو چیرنے کے لئے جو اوزار استعمال ہوتے ہیں ان کے دستے بھی لکڑی ہی کے بنے ہوتے۔ یہ سب کام ترکھان ہی کرتا اور اس کے معاوضے میں فصل پکنے کے بعد اس کی حاصلات میں سے اس کا حصہ اسے پہنچا دیا جاتا تھا۔ اب بھی بعض دیہات میں یہی رواج ہے مگر عام طور پر اب ترکھان کو اس کے کام کا معاوضہ روپوں کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ترکھان کے کام کی اہمیت بڑھتی گئی ہے۔ ترکھان گھریلو ضروریات کی چیزیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ تیار کرتا، گھڑے رکھنے کے لئے گھڑونچی بناتا، بیٹھنے کے لئے چوکی تخت بناتا، سیڑھیاں تیار کرتا، چارپائیاں بناتا۔ اسی طرح جب ترکھان میز اور کرسیاں بنانے لگا تو دوسرے طبقے میں منتقل ہوا یعنی فرنیچر بنانے والا۔

یعنی جب ترکھانوں نے انگریزی طرز کے جدید فرنیچر بنانے شروع کئے تو وہ فرنیچر میکر بن گیا۔ پشاور اور مضافات میں فرنیچر اور لکڑی کے دوسرے سامان بنانے کے لئے جو لکڑی عموماً استعمال کی جاتی ہے وہ شیشم کی لکڑی ہے۔ عمارتوں کے

لئے دروازے، کھڑکیاں اور روشندان تیار کرنا بھی ترکھان کے پیشے کے ذیل میں آتے ہیں۔

لوہار: لوہار کا پیشہ بھی نہایت قدیم ہے۔ سب سے پہلے کاشتکاری اور زراعت کے کام میں استعمال ہونے والے اوزار کو لے لیجئے مثال کے طور پر ہل کا بھالا' درانتی کا بھالا' کھڑے کا بلیڈ' اسی طرح ہتوڑی' ہتھوڑا' تیشہ' بیلچہ' آری وغیرہ یہ سب لوہار کی کاریگری کے حاصلات ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بالٹی اور لوہے کے چولہے سب لوہار ہی بناتا ہے۔

قدیم دور میں رواج یہی ہوتا تھا کہ لوہار کو کام کا معاوضہ فصل میں سے ملتا تھا۔ مگر زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ لوہار کے کام میں بھی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔

کمہار: مٹی کے برتن بنانے کمہار کی کاریگری سے تیار ہونے والی چیزیں ہر گھر کی ضرورت رہی ہیں۔ گھریلو استعمال کے لئے پانی کے گھڑے' مٹی کے بڑے اور چھوٹے مٹکے' پیالے اور نیم کاسے' مٹی کی تھالی اور پلیٹیں' چھوٹی اور بڑی سینکیں' اسی طرح گھریلو استعمال کی چھوٹی تنوریاں اور نانبائی کی دکانوں کے لئے بڑے بڑے تنور بنانا یہ سب کمہار کی دستکاری اور ہنرمندی کا کرشمہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کمہار کے ہنر میں بھی ترقی رونما ہوئی تو گھریلو آرائش وزیبائش کے لئے نہایت ہی خوبصورت اشیاء مٹی سے بنا کر انہیں بھٹی میں خشک کر کے اور پھر ان پر مختلف رنگوں کی آمیزش سے برشوں کے ساتھ بیل بوٹے سے سجاوٹ کرنا کمہار کے فن و ہنر کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ قدیم دور سے لے کر آج تک یہ فن ترقی پذیر ہے اور نت نئے نمونوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ اب بہت حد تک مٹی کے برتنوں کی جگہ پلاسٹک کے برتن تیار ہونے لگے ہیں۔ تاہم انسانی فطرت کے قریب تر ہونے کی بناء پر مٹی کے برتنوں کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے اور ہر شہر' قصبہ اور گاؤں میں کمہار کا ہونا لازمی ہے۔

موچی: موچی کا لفظ گائے' بھینس وغیرہ کے چمڑے سے جوتے بنانے کے پیشہ سے منسوب ہے۔ انسانی معاشرے میں اس کی بہت ضرورت رہی ہے۔ قدیم دور سے ہی انسان نے جہاں اپنے بدن کو ڈھانپنے کے لئے کپڑے کی ضرورت کو محسوس کیا وہاں اپنے پاؤں کو زمین کی دھول اور حشرات الارض سے محفوظ رکھنے کی خاطر جوتے کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ابتداء میں کھڑاؤں کا استعمال ہوا۔ وہ پاؤں کے برابر لکڑی کا ٹکڑا ہوتا تھا جس کے اوپر نوار کی پٹی کا استعمال کیا گیا۔ پھر اس میں ترقی ہوئی اور قسم قسم کے جوتے تیار ہونے لگے اور جوتے بنانے والے کو موچی کا نام دیا گیا۔ پشاور کے موچی نہایت اہتمام کے ساتھ جوتے تیار کرتے ہیں اور آج کل تو پشاور کے موچی پشاوری چپلی تیار کرنے میں نہایت تجربہ رکھنے والے کاریگر اور دستکار سمجھے جاتے ہیں۔ قدیم ثقافتی پیشوں اور جدید حالات میں اس چپلی سازی کے پیشے کو یکساں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ پشاور کے تاریخی بازار جہانگیر پورہ، محلہ جنگی' گلاب خانہ اور نمک منڈی میں موچیوں کی دکانیں ہیں۔ ان چپلیوں میں دو قسم کی چپلیاں بہت مشہور ہیں۔ ان میں ایک بند چپلی ہوتی ہے اور دوسری نتھ والی چپلی۔ نتھ والی چپلی آگے سے کھلی اور ہوادار ہوتی ہے۔ یہ سارا کام موچی اپنے ہاتھ کی کاری گری سے کرتا ہے۔ اس میں ایک آر' مشتہ اور رمی ہتھوڑی اور پتھر کی ایک سیل استعمال ہوتی ہے اس کے بنانے میں لیوی، جسے پشاوری شریش کہتے ہیں استعمال کی جاتی ہے اور چپلی کو دھاگے سے سیا جاتا ہے۔

مسگر: پشاور کے یہ دستکار بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں اور پشاور قصہ خوانی بازار کے مشرقی سرے سے متصل شمال کی طرف بازار مسگران مشہور بازار ہے جہاں تانبے سے مختلف قسم کی گھریلو استعمال اور سجاوٹ کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔ برتنوں میں دو قسم کے تانبے کے برتن ہوتے ہیں (1) عام گھریلو استعمال کے برتن' (2) نمائشی اور سجاوٹ کے برتن۔ عام گھریلو برتنوں پر صرف ٹھپہ کا کام کیا جاتا ہے اور برتنوں کے اوپر مختلف نمونے کندہ ہوتے ہیں جبکہ سجاوٹ کے فیشنی برتنوں پر یہ ہنرمند دستکار بڑی مہارت کے ساتھ چتر کاری کرتے ہیں۔ اس کام میں یہ اوزار استعمال کرتے ہیں:

(1) فولادی قلم　　(2) چھوٹی ہتھوڑی　　(3) پرکار

تانبے کے کام میں مسگر پہلے سے کوئی نقشہ تیار نہیں کرتے بلکہ یہ کام وہ اپنی ذہنی اختراع سے کرتے ہیں اور برتنوں اور دیگر اشیاء پر نت نئے نمونے کندہ کرتے ہیں۔ یہ مغلیہ دور کا مقبول ترین ثقافتی فن ہے۔ عام طور پر تانبے کے ان برتنوں پر مغلیہ دور کے بادشاہوں کے تاج' ملبوسات' اور دیگر مصوری کے ثقافتی طور طریقوں کی نقاشی کی جاتی ہے۔ جبکہ آجکل اس فن کے جدید نمونے تیار کئے جا رہے ہیں۔ چونکہ تانبے کے استعمال میں انسانی صحت کے قیام و دوام کا راز ہے اسی لئے اس دھات کو حکیم بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ تانبے کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے ان پر قلعی کا چڑھانا ضروری ہوتا ہے جو قدیم ترین فن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سے یونانی سکہ رائج ہوا تب سے تانبے کا استعمال شروع ہوا۔ چونکہ یہاں پر

327 قبل مسیح سے یونانی اثرات پہنچ چکے تھے لہٰذا اسی وقت سے یہاں یونانی سکہ بھی مروج ہو چکا تھا۔ اس اعتبار سے تانبے کے کام کو یونانی ثقافت کا حصہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کو بطور فن اور پیشہ کے مغل دور میں ارتقاء حاصل ہوا۔ پشاور میں اس فن سے متعلق جتنے بھی پیشہ ور آئے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق افغانستان سے ہے جو وہاں سے یہ فن لے کر یہاں وارد ہوئے اور پھر پشاور کے لوگوں میں اس فن کی پذیرائی کے جذبے کو دیکھ کر نو وارد ہنرمندوں اور پیشہ وروں نے یہاں تانبے اور مس کے مختلف نمونے ایجاد کئے اور اس سرزمین کو اپنے ہنر اور پیشے کے لئے مرکز بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ پشاور کے ہر گھر میں تانبے اور مس سے بنے ہوئے مختلف قسم کے برتنوں کے استعمال کا رواج تسلسل سے چلا آ رہا ہے جن میں بڑی بڑی دیگیں، دیگچے چھوٹی دیگچیاں، تھالیاں، چمچے اور چمچ، گلاس، جگ، کوزے، لوٹے، کفگیر، استادے تھوکدان، گلدان، چناڑیاں، مٹکے، گھڑے، حمام اور سماوار وغیرہ شامل ہیں۔ لڑکی کی شادی کے موقع پر جہیز میں اس قسم کا سامان دینا فخر سمجھا جاتا ہے۔ بیرونی ملکوں کے سیاح یہ سامان شوق سے خریدتے ہیں اور اس صنعت میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔

ڈبگر: نصف صدی قبل پشاور کے یہ ہنرمند پیشہ ور بڑے مشہور و معروف تھے۔ پشاور کا ''ڈبگری بازار'' اور ''ڈبگری دروازہ'' ان پیشہ وروں کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں کے یہ ہنرمند لوگ گائے اور بھینس کی جھلی اور چمڑے سے تیل کے بڑے بڑے کپے بناتے تھے۔ ان تیل کے کپوں کو ڈب اور ان کے بنانے والے کو ڈبگر کہا جاتا تھا۔ اب یہ ہنر مفقود ہے البتہ اس کی تاریخ موجود ہے۔ یہ ڈب نہ صرف بڑے سائز کے بلکہ چھوٹے سائز کے بھی بنائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی تیل کی کپیاں بھی یہ لوگ بناتے تھے جو عام گھروں میں سرسوں کے تیل کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ یہ پیشہ پشاور کے قدیم پیشوں میں قابل ذکر ہے۔ یہی ڈبگر گائے اور بھینس کی جھلی سے بڑے بڑے نقارے، ڈھولک اور طبلے بھی بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈبگری بازار میں اب تک طبلہ نواز، ناچ گانے والے اور میراثی لوگوں کے بالاخانے ہیں اور پشاور کے لوگ انہیں شادی بیاہ کے موقع پر یہیں سے لے جاتے ہیں۔ عام طور سے پشاور کے لوگ ان میراثیوں کو ڈھولکی سرنے والے کہتے ہیں۔

جست دوزی: جست چمڑے کے بنے ہوئے ہلکے سلیپر کو کہتے ہیں اور یہ سلیپر بنانے والے جست دوز کہلاتے ہیں۔ اس کو ہندکو میں جست دوزی کہتے ہیں۔ پشاور کے موجودہ کپڑے کے مشہور کوچی بازار کو آج سے تقریباً 20 سال قبل بازار جست دوزاں کہتے تھے۔ یہ پیشہ بھی مفقود ہو چکا ہے۔ پشاور کا یہ ہنر اور پیشہ یہاں کے ثقافتی پیشوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے اسی وجہ سے یہ پورا بازار ''بازار جست دوزاں'' کے نام سے موسوم تھا۔

کلاہ دوزی: پشاور کے معمر اور باوقار لوگوں کا پہناوہ کلاہ ہوتا تھا جس پر شملے دار پگڑ باندھا جاتا تھا۔ پشاور کے معمر اور بزرگ لوگ بزرگی کی علامت کے طور پر سر پر کلاہ پہنتے اور کلاہ پر شملے دار لنگی باندھتے تھے۔ یہ رواج اب بھی موجود ہے اور بعض گھرانوں کے معمر بزرگ یہ کلاہ اور لنگی کا پہناوا استعمال کرتے ہیں۔ پشاور کے بازار گھنٹہ گھر، کریم پورہ بازار اور جھنڈا بازار میں اس پیشہ کے دستکار بکثرت ہیں۔ اگرچہ اب یہ دستکار بہت کم رہ گئے ہیں۔ کلاہ دوز خاص مہارت کے ساتھ کلاہ بناتے ہیں۔ اسے بنانے کے لئے کپڑے کی تہہ میں ایک سلائی کے ساتھ روئی بھرتے ہیں جس سے اس میں سختی پیدا ہو جاتی ہے پھر خاص قسم کی ٹوپی بناتے ہیں جس پر طلہ کیا جاتا ہے اور اندرونی حصہ میں مختلف قسم کا اعلےٰ اور دوسرا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔ لوگ حسب استطاعت خریدتے ہیں اور پھر اس پر شملے دار لنگی باندھتے ہیں۔ شہری اور دیہاتی لوگ اس کلاہ لنگی کو یکساں استعمال کرتے ہیں۔

چھاپہ گری: پشاور کا یہ ثقافتی پیشہ بھی انتہائی شہرت کا حامل ہے۔ اس کام کے دستکار کو چھاپہ گر کہتے ہیں۔ بازار گھنٹہ گھر، مینا بازار اور کریم پورہ بازار میں چھاپہ گروں کی دکانیں ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اب اس دستکاری میں بھی کمی آ گئی ہے۔ لیکن یہ کام ختم نہیں ہوا۔ یہ چھاپہ گر سفید کپڑے پر مختلف قسموں اور رنگوں کے ٹھپے لگاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کاریگروں کو ٹھپہ گر بھی کہتے ہیں۔ پھول، بوٹے اور دیگر دیدہ زیب ڈیزائن لکڑی کے بنے ہوئے بلاکوں پر کندہ ہوتے ہیں جن سے حسب منشاء رنگ لگا کر کپڑے پر ٹھپہ لگاتے ہیں۔ پھر ان ٹھپوں کے چھاپوں پر عورتیں ریشم کے مختلف رنگوں کے دھاگوں سے کڑھائی کرتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اس دستکاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شہری اور دیہاتی خواتین اس کام میں یکساں دلچسپی لیتی ہیں اور چھاپوں پر کناری اور گوٹہ بھی کرتی ہیں۔

پشاور میں اس کام کا آغاز پنڈی گھیب ضلع اٹک کے مقام اخلاص سے آئے ہوئے ایک بھٹی خاندان نے کیا تھا۔ ان کا آبائی پیشہ ہی یہی تھا۔ اب بھی پشاور میں اسی خاندان کے اخلاف نے اس پیشہ کو سنبھالا ہوا ہے۔ جبکہ پشاور کے مقامی لوگوں نے بھی اس پیشہ میں خاطر خواہ مہارت حاصل کر لی ہے۔ یہ بھٹی

خاندان شروع میں اپنے آبائی وطن میں کھڈی پر چادریں وغیرہ بھی بناتے تھے۔ بھٹی خاندان کے یہ لوگ جو اس پیشے سے منسلک ہیں اپنے آپ کو راجپوت خاندان سے جوڑتے ہیں۔

نعلبندی: پشاور میں اس پیشہ سے تعلق رکھنے والے مخصوص خاندان کے لوگ ہیں۔ خاندانی طور پر اس پیشہ کے لوگ آپس میں موروثی بندش رکھتے ہیں۔ جب گھوڑوں کا عام رواج تھا تو نعلبندوں کی دکانیں جگہ جگہ تھیں جو گھوڑوں کے سموں کے نیچے لوہے کے بنے ہوئے نعل خاص مہارت سے لگاتے تھے۔ چونکہ پشاور اور گردونواح میں تانگوں کا رواج اب بھی ہے اس لئے پشاور کے بیرونی احاطہ میں نعلبندی کی دکانیں موجود ہیں اور یہ پیشہ تسلسل سے زندہ ہے۔ اس پیشے سے منسوب پشاور کے تاریخی بازار قصہ خوانی کے پاس ایک محلہ ''ڈھکی نعلبندی'' کے نام سے اب تک موجود ہے۔

بوریابافی: سرکنڈوں یعنی مزری سے چٹائی اور مصلے وغیرہ بنانے کے پیشے کو بوریا بافی کہتے ہیں۔ پشاور کے مختلف مقامات پر یہ پیشہ موجود تھا۔ اب بھی پشاور کے علاقہ اندرون لاہوری گیٹ اور ڈگری بازار میں یہ مصنوعات دستیاب ہیں۔ جبکہ قدیم بازار پھوڑ گراں میں یہ مصنوعات تیار کی جاتی تھیں اور وہاں ہر جگہ سرکنڈہ جسے پشاوری ''پٹھہ'' کہتے ہیں اس کی بڑی بڑی دکانیں موجود ہیں۔

پکھی گری: پشاور میں اس صنعت کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے۔ ریتی بازار کے پاس محلہ پکھی گراں اس پیشے سے منسوب ہے جہاں مزری یعنی پٹھے سے بنے ہوئے ہاتھ کے پنکھے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس پیشے اور دستکاری کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ اب سے چالیس سال پہلے پشاور کے اکثر گھروں میں پشاوری خواتین گھروں میں چھوٹی اور بڑی پکھیاں بناتی تھیں جن پر مختلف قسم کے ڈیزائن بنائے جاتے تھے۔ یہ کام غربا کے علاوہ بڑے گھرانوں کی خواتین بھی اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کرتی تھیں۔ پکھی گراں خواتین سے یہ پکھیاں لے جاتے اور انہیں اس کام کی مزدوری دیتے اور پھر دکانوں پر خود ڈنڈی لگاتے تھے۔ بجلی کے پنکھوں کی وجہ سے یہ پیشہ اتنا عام نہیں رہا تاہم اب بھی اکا دکا دکانیں موجود ہیں جو اس روایتی پشاوری دستکاری کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

چوڑی گراں: چوڑی گری کے پیشے سے منسوب پشاور میں ایک محلہ ''محلہ چوڑی گراں'' اب تک موجود ہے۔ شیشے سے چوڑی بنانے کو چوڑی گری کہتے ہیں۔ چوڑیوں کے استعمال کا رواج ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ اب شیشے کی جگہ زیادہ تر پلاسٹک استعمال کیا جاتا ہے لیکن اچھی اور عمدہ چوڑی شیشے کی چوڑی ہی کو سمجھا جاتا ہے۔

کنگھی سازی: پشاور میں اس پیشے اور صنعت کو بھی خاصی شہرت حاصل ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک لکڑی سے بنی ہوئی مختلف انداز کی یہ کنگھی بنتی تھی جسے شانہ سازی بھی کہتے تھے۔ شانہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنے کنگھی کے ہیں۔ پشاور کی قدیم خواتین اب بھی لکڑی کی مستطیل شکل کی بنی ہوئی اس قسم کی کنگھی استعمال کرتی ہیں۔ اگرچہ پہلے کی طرح اب یہ پیشہ نہیں رہا مگر ختم نہیں ہوا۔

پوستین دوزی: پوست چمڑے کو کہتے ہیں اور چمڑے کی صنعت کو پوستین دوزی کہا جاتا ہے۔ اس پیشے کے لوگ چمڑے کو صاف کر کے ان کے کپڑے، چغے اور موزے بناتے تھے۔ پشاور میں اس پیشے کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے اب یہ پیشہ ماند پڑ گیا ہے۔

ازار بندی: پشاور کے لوگ ہندکو زبان میں ازار بند کو ناڑا کہتے ہیں۔ ازار بند بنانے کے پیشے کو ازار بندی کہتے ہیں۔ یہ کام پشاور کے گردونواح کی دیہاتی عورتیں اپنے گھروں میں کرتی ہیں۔ یہ ازار بند سوت اور ریشم سے بنائے جاتے ہیں اس کا رواج اب تک ہے اور دیہاتی عورتیں یہ ازار بند بنا کر دکانداروں کو فروخت کرتی ہیں۔

تنور سازی: پشاور کے بڑے بڑے مٹی کے بنے ہوئے تنور بہت مشہور ہیں۔ اس پیشے سے منسوب پشاور کا ایک محلہ ''محلہ تنور سازاں'' اب تک موجود ہے جہاں اس پیشے سے منسلک پیشہ ور رہتے تھے۔ اب اس محلے میں کوئی بھی اپنے پیشے کے حوالے سے موجود نہیں البتہ پشاور کے مضافاتی دیہات موسیٰ زئی اور ہزار خوانی میں یہ تنور بنانے والے موجود ہیں۔ ایک تنور کئی دنوں میں خاص مہارت کے ساتھ تیار ہوتا ہے۔

لنگی بانی: پشاور کے قدیم اور معزز گھرانوں میں سر پر لنگی باندھنے کا رواج عام تھا۔ بلکہ یہ لنگی خاندانی وقار کا ایک نمایاں حصہ ہوتا تھا۔ اگرچہ اب اس کا استعمال بہت کم ہو چکا ہے مگر پھر بھی یہ خاندانی وقار کا مستقل حصہ ہونے کی وجہ سے اہم پیشہ ہے۔ اکثر یہ لنگی کلاہ کے اوپر لوگ بڑے طمطراق کے ساتھ باندھتے تھے۔ جبکہ اکثر لوگ بغیر کلاہ کے بھی یہ لنگی باندھتے تھے۔ یہ ایک چادر ہوتی ہے جسے خاصی مہارت کے ساتھ بنایا جاتا ہے۔ اس کا رنگ زیادہ تر آسمانی ہوتا ہے جبکہ سیاہ اور کری رنگ کی لنگی بھی بنائی جاتی ہے۔ پشاور میں لنگی فروشاں کا ایک خاندان اب تک موجود ہے اور

قصہ خوانی بازار اور بازار کٹڑہ کے پاس ان لنگی فروشوں کی دکانیں ہیں۔ زیادہ تر صدیقی خاندان کے لوگ یہ کاروبار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قدیم ایران کا ایک قبیلہ شال باف اور دوسرا محمد زئی قبیلہ کے لوگ شروع میں یہ کام کرتے تھے۔ شال کے معنے چادر کے ہیں۔ شال باف چادر بنانے والے یعنی پیشے کے لحاظ سے اس قبیلے کو یاد کرتے ہیں۔

چڑوے کوبان: پشاور کے لوگ چاولوں کی ایک خاص قسم کو چڑوے کہتے ہیں اسے اچھی طرح کوٹ کر چاول کو چھلکے سے علیحدہ کیا جاتا ہے بعد میں ان چھوٹے چاولوں کو بھون کر ان کی پھلیاں بنائی جاتی ہیں۔ اس پیشے کی نسبت سے ایک علاقہ چڑوے کوباں بہت مشہور ہے اور اس پیشے سے منسلک یہ لوگ یہاں کے باشندے تھے۔ یہ پھلیاں پشاوری لوگ خوشیوں اور ختم قرآن کے موقع پر بانٹتے ہیں۔ اب بھی اس کا رواج موجود ہے یہ پھلیاں میٹھی بھی ہوتی ہیں اور پھیکی بھی۔

سراجی: سراج کے معنے گھوڑے کی زین بنانے والے کے ہیں۔ پشاور میں یہ پیشہ بہت مشہور رہا ہے۔ اس پیشے کی مناسبت سے بازار چوک یادگار کے پاس ایک چھوٹا سا بازار سراجاں موجود ہے اور چمڑے سے خوبصورت زین، پیٹی اور دوسری چیزیں بناتے ہیں۔

زرگری: پشاور کے زرگر بہت مشہور ہیں جو سونے اور چاندی کے مختلف قسموں کے زیورات بناتے ہیں۔ چوک یادگار کے پاس ''بازار اندر شہر'' میں ان زرگروں کی قدیم وجدید دکانیں ہیں۔

چڑی مار: چھوٹے پرندے مثلاً بٹیر، چکور، چڑی، تیتر اور کبوتر کو یہ چڑی مار زندہ پکڑ کر دکانوں میں لاکر فروخت کرتے ہیں۔ پشاور شہر میں اس پیشے سے منسوب ایک محلہ ''محلہ چڑی مار'' بہت مشہور ہے جو کہ اندرون کوہاٹی گیٹ میں ہے اور اب اسی مقام پر ان چڑی ماروں کی دکانیں ہیں جہاں ہر قسم کے پرندے موجود ہیں۔

مُوڑا سازی: یہ کام بھی پشاور کے مُوڑا گر کرتے تھے یعنی بیٹھنے کے لئے مُوڑے بناتے تھے۔ اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے مگر اب بھی کچھ لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں۔

نیچہ بندی: پشاور و مضافات میں چلم کا عام رواج ہے اور دیہات کے حجروں میں چلم مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے۔ اس پیشے سے منسلک لوگ بانس کی لکڑی سے چلم کے نیچے بناتے اور پھر اس پر سیم کی تار نہایت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ لپیٹتے تھے۔ یہ کام نیچہ بندی کہلاتا ہے۔ ان نیچہ بندوں کی دکانیں بازار جہانگیر پورہ میں ہوتی تھیں۔ اب اس پیشے سے منسلک افراد کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔

بخدان دوزی: یہ ہنر صدیوں سے علاقے کی شناخت رکھتا ہے۔ گھوڑے کے چمڑے اور سفیدے کی لکڑی سے چھوٹے بڑے بکس تیار کرنے والے کو ''بخدان دوز'' کہتے ہیں۔ بکس کے اوپر نیچے اور آس پاس سب جگہ لکڑی استعمال ہوتی ہے اور لکڑی کے اوپر لیوی کے ساتھ سائز کے مطابق چمڑہ چسپاں کر دیا جاتا ہے اور پھر گھروں کی خواتین کے پاس یہ تختے بھیج دیئے جاتے ہیں جو خاص مہارت سے آر کے ساتھ دھاگے سے ان تختوں پر منقش ڈیزائنوں کو کاڑھتی ہیں اور بعد میں کاریگر انہیں آپس میں آر کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ یہ سارا کام ہاتھ کی کاریگری سے ہوتا ہے اور سارے عمل میں آر اور موٹا دھاگا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بڑا محنت طلب کام ہے۔ پرانے گھروں میں اب بھی انہیں بکسوں یعنی بخدانوں میں لوگ کپڑے وغیرہ رکھتے ہیں۔ ان بکسوں میں کپڑے محفوظ رہتے ہیں۔ پشاور کے بازار قصہ خوانی کے عقب میں یہ کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اب اس کام کی اکا دکا دکانیں ہیں۔ یہ کام محنت طلب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مہنگا ہے اس لئے اب چمڑے کے بجائے ریکسین کے ساتھ یہ کام ہوتا ہے۔

کشیدہ کاری: شالوں، چادروں اور کپڑوں کے جوڑوں پر مختلف نمونے بنا کر ان پر مختلف ریشمی دھاگوں سے کام کرنے کو کشیدہ کاری کہتے ہیں۔ پشاور میں زیادہ تر گھروں کی خواتین اور لڑکیاں گھروں میں یہ کام کرتی ہیں۔ لکڑی کے ایک فریم کو کپڑے کے اوپر نیچے رکھ کر اور کپڑے کو اچھی طرح پھنسا کر سوئی میں دھاگہ یا ریشم پرو کر بیل بوٹے کے چھاپے پر کڑھائی کی جاتی ہے۔ گھروں میں کام کرنے والی خواتین کی ان دستکاریوں کو دکاندار خرید کر دکانوں پر بیچتے ہیں۔ شادی بیاہ کے مواقع پر خواتین گھروں میں اس قسم کی دستکاریوں میں مصروف رہتی ہیں اور اس طرح اچھا خاصا جہیز تیار کر لیتی ہیں۔ قدیم گھرانوں میں اب بھی یہ رواج موجود ہے۔

قریشیہ: کشیدہ کاری کی طرح یہ ہنر بھی پشاور کے گھروں میں خواتین و بچیاں اپنائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اب یہ رواج بہت کم ہو گیا ہے مگر ختم نہیں ہوا۔ یہ ایک لوہے کی بنی ہوئی کنڈے والی سلائی ہوتی ہے نیچے سے اس میں دھاگہ یا ریشم پھنسا کر اس کے ساتھ مختلف نمونے کے کام کئے جاتے ہیں۔ ان میں پلنگ کی چادریں، میز پوش اور دیگر سجاوٹ کے سامان پر یہ کام بہت مشہور ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر اس کام کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔

مہر کنی: یعنی مہر کو کندہ کرنا۔ اس پیشے کی مناسبت سے ''محلہ مہر کندہ'' اب تک معروف محلہ ہے۔ لوگ بڑے شوق سے اپنی انگوٹھی کے پتھر پر اپنا نام یا دستخط کندہ کرواتے ہیں۔ یہ کام کرنے والے مہر کندان کہلاتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک شاہانہ قسم کا انداز ہے۔ پرانے وقتوں میں بادشاہ اور امراء لوگ اپنی انگوٹھی کے نگ میں اپنا دستخط کندہ کروالیتے تھے اور جب کسی فرمان یا دستاویز پر دستخط کرنا مقصود ہوتا تو انگوٹھی کے نگ پر سیاہی لگا کر دستخط کی جگہ مہر ثبت کر دیتے تھے۔ ان بادشاہوں اور امراء کے لئے نگ کو کندہ کرنے والے مخصوص پیشہ ور لوگ ہوتے تھے جنہیں مہر کندان کہتے تھے۔ پھر یہ رواج شوقین لوگوں میں بھی منتقل ہونے لگا اور وہ بھی اپنی انگوٹھیوں کے نگوں پر اس قسم کا کام کندہ کروانے لگے تو یہ کاریگر بھی عام ہو گئے مگر اب اس کام کے کاریگر نایاب ہیں اور اب یہ کام دیگر قسم کی مہروں بنانے والوں میں منتقل ہو گیا ہے جو جگہ جگہ عام ہے۔

درزی: ہر علاقے کی طرح پشاور و مضافات میں بھی درزی کی دکانیں ہیں جو سلائی مشین کے ساتھ شلوار، قمیض، واسکٹ، کوٹ وغیرہ نہایت عمدہ طریقے سے بناتے ہیں۔ یہ دستکار پشاور کے ہر بڑے بازار اور گلی کوچے میں موجود ہیں۔ شادی بیاہ اور عیدین کے موقع پر ان دستکاروں کے پاس بکثرت کام ہوتا ہے۔

ویکس پینٹنگ: یہ دراصل السی کے بیج سے نکالے گئے تیل سے بننے والا ایک مصالحہ ہے۔ السی کے بیج سے نکالے ہوئے تیل میں چاک کا پوڈر ملا لیا جاتا ہے اور ایک فارمولے کے تحت لیکوئیڈ تیار کیا جاتا ہے جو نہایت گاڑھا گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ہوتا ہے اس کو ویکس کا نام دیا گیا ہے۔ اس ویکس کی تار کے ذریعے ریشمی کپڑے پر بنائے جانے والے بیل بوٹے اور پرندوں کی شکلوں اور تصویروں کو ویکس پینٹنگ کہا جاتا ہے۔

مغل بادشاہوں اور شاہی خاندان کے لوگوں کے گھروں اور محلات کے در و دیوار کے پردوں اور تکیہ کے غلافوں پر ویکس کا کام ہوتا تھا جسے بڑی پذیرائی حاصل ہوتی تھی۔ اس وقت ویکس کے بجائے ابرک استعمال کی جاتی تھی اور رنگ برنگ ابرک سے پردوں، تکیہ کے غلافوں اور ریشمی رومالوں پر کام کیا جاتا تھا۔ مغلیہ دربار میں اس کام کے ہنرمندوں اور دستکاروں کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔

پشاور میں یہ کام سترہویں صدی یعنی اورنگزیب عالمگیر کے دور میں شروع ہوا مگر بعد میں یہ فن دستکاری مفقود ہو گیا تاہم ایک خاندان کے اسلاف نے اس کام کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس میں یہ جدت پیدا کی کہ ابرک کے بجائے السی کے بیج کے تیل اور چاک کے پوڈر کو ملا کر لیوی یا شریش کی طرح کا چکنا اور گاڑھا مواد تیار کیا۔ یہ کام کرنے کے لئے کاری گر اس مواد کو اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی پشت پر حسب ضرورت رکھ لیتے ہیں اور پھر لوہے کی ایک سلاخ کے ذریعے اس میں سے اٹھا کر اس کی تار کے ذریعے کام اس طرح کیا جاتا ہے کہ ریشمی رومال کو ہاتھ میں لے کر نیچے سے ہاتھ کی درمیان کی انگلی کو بڑی مہارت کے ساتھ چلایا جاتا ہے اور سلاخ کے ذریعے ویکس کی تار کو چلایا جاتا ہے اور حسب خواہش بیل بوٹے یا مور، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ جب پھول، بیل بوٹے اور جانور کی صورت بن جائے تو اس پر حسب خواہش رنگوں کے پوڈر کو چھوٹے سے برش کے ذریعے لگایا جاتا ہے۔

دستکاری کا یہ ہنر صرف پشاور کے ایک خاندان سے منسلک ہے اور اسی خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ میاں محمد نے اس فن کو اپنے خاندان میں زندہ رکھا اور اس کی آبیاری کی۔ پھر ان کے بیٹے شیر محمد اور شیر محمد کے بعد میراں بخش اور احمد بخش نے اس فن کو آگے بڑھایا اور ان سے ہوتے ہوئے عہد حاضر کے ریاض احمد اور ان کے بچوں تک یہ فن منتقل ہوا۔

ادبی و ثقافتی شخصیات

خوشحال خان خٹک: خوشحال خان خٹک ضلع پشاور کے شمال مشرق میں نوشہرہ کے قریب اکوڑہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس قصبے کو خوشحال خان کے جد امجد ملک اکوڑی نے آباد کیا اور اسی کے نام سے منسوب ہوا۔ دریائے کابل کے کنارے یہ چھوٹا سا گاؤں اٹک کے اس پار دریائے سندھ اور دریائے کابل کے سنگھم سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی قصبہ خوشحال خان کا مولد بھی ہے جہاں اس نے ہوش سنبھالا، تعلیم و تربیت پائی اور ادب و فن کا شعور حاصل کیا۔ یہی گاؤں اسکی عسکری سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا اور اسی کی خاک کا دامن اس بطل حریت، خزینۂ ادب و حکمت اور معدنِ علم و دانش کی آخری آرامگاہ بھی ہے۔ جہاں اس کا مزار تین صدیاں گزر جانے پر بھی آج تک مرجع خدائق بنا ہوا ہے۔

خوشحال خان کے آخری اشعار جو ایک وصیت کے طور پر اس نے چھوڑے ان میں اپنے لواحقین اور پیروؤں کو ہدایت کی گئی ہے کہ:

''میری قبر ایسی جگہ بنانا جہاں میری خاک پر مغلوں کا سایہ

تک نہ پڑے اور مغل شہسواروں کی گرد میرے مرقد تک نہ پہنچے اور میری قبر کی بے حرمتی نہ ہو"۔

پشتو زبان کا یہ بے مثل وصاحب سیف وقلم شاعر، شہباز خان خٹک کا نامور بیٹا تھا، جو شہنشاہ شاہجہان کے دربار کا بہت بڑا منصبدار اپنے قبیلے کا سردار اور حکومت کا پشتنی وظیفہ خوار تھا۔ شہباز خان کا والد یحییٰ خان شہنشاہ جہانگیر اور یحییٰ خان کا والد ملک اکوڑے خان شہنشاہ اکبر کے عہد سے منصبدار چلے آتے تھے۔ خوشحال خان اوائل عمر ہی میں اپنے والد کے ساتھ قبیلوی لڑائیوں میں حصہ لیتا رہا۔

شہباز خان کے بعد قبیلے کی سرداری اور مغل سرکار کی منصب داری خوشحال خان کو ورثے میں ملی شاہجہان کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے زمام حکومت سنبھالی تو بھی خوشحال خان کا منصب بحال رہا اور وہ متعدد جنگوں میں شریک ہو کر مغل سرکار کے تاج وتخت کی وفاداری کے لئے نہایت بے جگری سے لڑا اور فتوحات حاصل کر کے لوٹا۔

انہی دنوں خوشحال خان اور شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے مابین چند غلط فہمیوں کی بنا پر خوشحال خان کے مصائب اور ابتلا کا دور شروع ہوا۔ اس لگائی بجھائی میں شہنشاہ کے چند منہ چڑھے سازشی حکام کا ہاتھ تھا، جن میں خوشحال کے چچا بہادر خان اور فیروز خان بھی شامل تھے۔ خوشحال خان کے دیرینہ مخالف امیر خان خوانی صوبہ دار کابل اور اس کے نائب عبدالرحیم نے اس سازش کو کامیاب بنانے اور خوشحال کو شہنشاہ کی نظروں میں معتوب بنانے میں انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا۔

امیر خان خوانی صوبہ دار کابل نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر سے محصول راہداری کے نفاذ کے لئے بعض زمینداروں کی گرفتاری کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح پرانے حریف خوشحال خان کو ملاقات کے بہانے پشاور بلا کر گرفتار کر لیا اور اس کے پاؤں میں پانچ سیر وزنی بیڑیاں ڈال دیں۔

گرفتاری کے بعد اُسے پشاور سے دہلی اور دہلی سے قلعہ رنتھبور میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ تین سال تک قید رہا۔ قید وبند کے دوران اس نے جو معرکے کی نظمیں، غزلیں لکھیں وہ پشتو شاعری کا شاہکار ہیں اور حسیات میں انہیں بڑی اہمیت حاصل ہے مثلاً

مجھکو ناحق قید کر رکھا ہے اورنگزیب نے
بے گناہی درحقیقت بن گیا میرا قصور
دشمنوں نے اس بہکایا ہے کچھ اس طور سے
آ گیا ہے ان کے بھرے میں یہ عاقل بے شعور
اپنے ناکردہ گناہوں سے بھی میں واقف نہیں ہے
وفا بھی بے وفائی بادشاہوں کے حضور
میں نے جس اخلاص سے مغلوں کی خدمت کی سدا
اس طرح ہرگز نہ کی ہو گی کسی افغان نے
حاکموں کا شیوہ گرچہ عدل ہونا چاہیے
وہ مگر احکام اسلامی لگے کب ماننے
مل رہا ہے طرفہ یہ میری وفاؤں کا صلہ
سچ تو یہ ہے مجھکو مارا ہے میرا احسان نے
وہ دن خدا دکھائے کہ جاؤں شکار کو
میرے عزیز رینو وہ ادیں ہوں ہمرکاب
ہم کس رہے ہوں زینوں کو گھوڑوں کی پیٹھ پر
اور ساتھ ساتھ کتوں کے جوڑے ہوں لاجواب
جس سمت جا رہے ہوں ہرن بھاگتے پھریں
اے کاش پھر نصیب ہوں کھوئے ہوئے سے خواب
عثمان آگے باقی سپاہی جلو میں ہوں
یحییٰ دبار کرتے ہوں ساحل پر انتظار
لادن پھر ان کے واسطے صحرا سے لوٹ کر
گہرے سیاہ رنگ کے تیتر کا میں شکار
اپنے عزیز صدر کی معصوم حرکتیں
آنے ہی گھر میں زحمتِ منزل کو دیں اُتار

خوشحال خان کی تمام عمر جنگ وجدل میں گزری، ابتدا میں وہ یوسف زیوں اور بنگشوں سے قبیلوی جنگیں لڑتا رہا پھر مغلوں کی اسیری کے بعد رہائی پائی تو باقی عمر مغلوں سے برسر پیکار رہا لیکن شاعری اور شکار سے اُسے والہانہ عشق تھا۔ جنگ سے ذرا فراغت پاتا تو شاعری کرتا یا شکار کے لئے پہاڑوں اور جنگلوں میں نکل جاتا۔

بچپن ہی سے اُسے سیر وشکار کا ایسا جنون تھا کہ اکثر وبیشتر حصول تعلیم کے لئے مدرسہ جانے کے بجائے شکار پر جانے کو ترجیح دیتا۔ شکار کے لئے باز یا شاہین پالنا اس کا نہایت مرغوب مشغلہ تھا اور اس مشغلے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اس نے ایک کتاب باز نامہ لکھ ڈالی جس میں اس پرندے کی بیماریوں اور ان کے علاج

معالجے کا بیان بھی ہے اور اس کی غیور فطرت، شیر چشمی، خوداری اور دوسری صفات کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

خوشحال سے پہلے قدیم فارسی شعراء اور پشتو شعراء نے شاہین کو ظالم، وحشی، حریص اور خونخوار جانور کے طور پر پیش کیا ہے۔ خوشحال خان پہلا شاعر ہے جس نے اس میں مثالی صفات دریافت کیں اور اسے انسان اور مرد مومن کے لئے قابل تقلید قرار دیا۔

میں ہوں شہباز کوہستان روہ کا　　اڑانیں میری لاحاصل نہیں ہے
میں اپنے صید پر جھپٹوں گا جس دم　　اُچک لوں گا اُسے شہباز بن کر

میرے افکار ہر دم بن کے شہباز　　مسرت کے لئے ہیں محو پرواز
خدا پہنچا دے گا صیدان کو　　نہیں جائے گی خالی یہ تگ و تاز

مگر میں شاہیں ہوں اوج پر ہیں میری نگاہیں
شکار اپنے سے شاد ہوں میں
الم ہے اتنا مجھے کہ کوئی یہاں میرا ہمنوا نہیں ہے

پھر میری قوم کے جوانوں نے　　اپنے ہاتھوں کو کر لیا ہے سرخ
جیسے شاہین صید سے اپنے　　تیز پنجوں کو سرخ کرتا ہے

میں خوشحال کہسار کا باز ہوں
جو مغلوں کے پنجرے میں مجبوس تھا

خوشحال خان کی تصانیف سے وہ ایک عالم فاضل اور جملہ علوم متداولہ کا ماہر معلوم ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، منطق، طب، حکمت، تاریخ، موسیقی، مصوری اور فلکیات کے علاوہ شہسواری، تیغ زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی، پیراکی اور شکاریات پر بھی اسے مکمل دسترس حاصل تھی۔ کلیات کے ایک قصیدے کے اشعار ہیں، وہ کہتا ہے:

''میری طبیعت وہبی ہے، اکتسابی نہیں۔ اس لئے مجھے املا تک کے استعمال کا علم نہیں، ایک گھنٹہ درس میں گزارتا تو بیس گھنٹے شکار میں، مجھے شکار کسب کمال کے لئے چھوڑتا تھا اور یہی نہیں میں نے دنیا بھر کے علوم و فنون کی تحصیل کر لی ہوتی اگر شکار کے شغل اُس قدر میں منہمک نہ رہتا''۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کو شکار کا جنون تھا اس لئے مکتب کی باقاعدہ تعلیم مکمل طور پر حاصل نہ ہو سکی، جس قدر علوم و فنون میں کمال حاصل کیا وہ سب بعد میں ذاتی مطالعے اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔

خوشحال کے بقول خود جیسا کہ اس نے اپنی کتاب ''بیاض'' میں اپنے خودنوشت حالات لکھے ہیں اور حواس کے پوتے افضل خان نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ مرصع'' میں نقل کئے ہیں اس نے بیس (20) برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی زندگی کے محور یہ تین مشغلے رہے ہیں:

- شاعری
- شیر و شکار
- جنگ و جدل

خوشحال کی تصانیف کی تعداد ۲۰۰ اور ۳۵۰ تک مختلف محققین کے مطابق بتائی ہے۔ خوشحال کے پشتو زبان و ادب اور شاعری پر جو عظیم احسانات ہیں اس سے پہلے یا بعد میں آج تک کسی پشتون اہلِ قلم نے نہ تو اتنی کتابیں لکھی ہیں اور نہ ہی اس قدر مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پشتو رسم الخط کو نئے زاویے سے ترتیب دے کر پشتو زبان و ادب کے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں۔

خوشحال کی جو تصانیف اب تک منظر عام پر آچکی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ دیوانِ خوشحال خان خٹک:

جس میں تنظیم، غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مخمس، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند اصناف سخن میں شاعری کی گئی ہے نیز فارسی غزلیں بھی اسی کلیات کا حصہ ہیں۔

۲۔ بازنامہ (نظم): شہباز کے امراض اور ان کا علاج نیز انہیں سدھارنے کے طریقے خورات اور عادات وغیرہ کا بیان ہے۔

۳۔ صحت البدن (نظم): یہ کتاب حفظان صحت اور طب سے متعلق ہے۔

۴۔ ہدایہ: فقہ اسلامی پر عربی کی مشہور کتاب ہدایہ کا پشتو ترجمہ ہے۔

۵۔ آئینہ: فقہ کی کتاب کا عربی سے پشتو ترجمہ ہے۔

۶۔ فضل نامہ (مثنوی): چھوٹی بحر کی مثنوی جو مذہبی و فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

۷۔ **سوات نامہ (مثنوی)**: چار سو اشعار کی مثنوی جس میں سوات و سفر سوات کے حالات ہیں۔

۸۔ **فرخنامہ**: مناظرہ شمشیر و قلم

۹۔ **فراقنامہ (نظم)**: حسیات کا مجموعہ جو غزلوں، نظموں اور مثنویات پر مشتمل ہے۔

۱۰۔ **دستارنامہ (نثر)**: نثر کی نہایت اہم تصنیف جس میں متفرق نثری مضامین سیاست، اخلاق، تصوف، فنون سپاہگری اور فنونِ لطیفہ شامل ہیں۔

۱۱۔ **بیاض (نثر)**: خوشحال کے خودنوشت حالات زندگی۔

۱۲۔ **زنجیری (نثر)**: پشتو شارٹ ہینڈ جو خوشحال کی اپنی ایجاد ہے اور ایک کتاب کی صورت میں ہے۔ کچھ ایسی کتابیں بھی یہی خوشحال خان سے منسوب کی گئی ہیں جن کے متعلق محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ الفنٹن نے افغانوں کی عہد قدیم سے خوشحال خان عہد تک کی تاریخ اور ''انوار سہیلی'' کے پشتو ترجمہ کو بھی خوشحال خان سے منسوب کیا ہے۔ جب کہ میجر راورٹی کی رائے میں یہ دونوں کتابیں خوشحال خان کی نہیں ہیں اسی طرح خوشحال خان کے پوتے افضل خان کی ضخیم تاریخی کتاب ''تاریخ مرصع'' کو بھی منشرقین خوشحال خان کی کاوش کا نتیجہ سمجھتے ہیں جسے ان کے مطابق افضل خان نے مرتب کیا یا اس کے کچھ حصے لکھے اور بعض کے نزدیک اس کتاب کا غالب حصہ خوشحال خان کا لکھا ہوا ہے اور کچھ حصہ خوشحال کی خودنوشت سوانح ''بیاض'' کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔

خوشحال خان کی دیگر بے شمار تصانیف کے متعلق عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یا تو وہ آخری عمر میں جبکہ پریشان حالی کے عالم میں مغلوں کے عقاب سے بچنے کے لئے در بدر پھرتا رہا۔ ان کتابوں کے مسودات اس نے کسی کی تحویل میں دے دیئے تھے جو اس سے ضائع ہو گئے یا وہ خود اس افراتفری میں انہیں محفوظ نہ رکھ سکا اور پھر اس کے خاندان میں یہ نوادرات کسی فرد کی بے احتیاطی کی نذر ہو گئے۔ بہر حال ان کی تلاش جاری ہے اور محققین کو یقین ہے کہ وہ کبھی ضرور اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بہر حال چونکہ ان تصانیف کے متعلق اس کے اہل خاندان کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں اس لئے اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

خوشحال خان نے بقول اس کے بیس برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی ولادت ۱۰۲۲ھ میں ہوئی اور انتقال ۱۱۰۰ھ میں اس طرح ۷۸ برس عمر پائی اور ۵۸ برس تک مسلسل حق قلم ادا کرتا رہا۔ اس کی ساری زندگی میدانِ جنگ میں گزری، اوائل عمر میں مغلوں کے لئے لڑتا رہا بعد میں مغلوں سے اُن بن ہو گئی تو ان کے خلاف نبرد آزما رہا۔ علاوہ ازیں شکار اس کا محبوب مشغلہ تھا، بچپن ہی سے اُسے شکار سے اتنی رغبت تھی کہ عام حالات میں شاید ہی کوئی دن شکار کے بغیر گزرا ہو۔ پھر شکار کے سلسلہ میں باز پکڑنا، انہیں سدھانا، شکاری کتے پالنا، ان کی نگہداشت کرنا، شہبازوں کے خوراک اور ان کے علاج معالجے پر توجہ دینا ایسی مصروفیات تھیں جس کے لئے اسے خاصا وقت دینا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود اپنے تیسرے مشغلے شعر و ادب کی تخلیق سے بھی کبھی غافل نہیں رہا بلکہ اس کی تصانیف کی کثیر تعداد اور رنگا رنگی سے اس کے ادبی ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے اس کے باقی تمام مشغلوں پر ادبی شوق غالب تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ جنگ ہوئی اور شکار کی شب و روز کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وہ اتنا کچھ لکھنے کے لئے کیسے وقت نکال لیتا تھا۔ ان حقائق پر غور کیا جائے تو بجز اس کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ ایک خلاق ذہن و فکر کا مالک تھا اور شعر و ادب کی تخلیق سے اُسے جنون کی حد تک رغبت تھی۔

غالب کی طرح خوشحال جدید پشتو نثر کا بھی بانی ہے۔ اس کی طرح اس نے پشتو نثر کو نیا موڑ دیا، اُسے مقفیٰ سجع تکلفات سے چھڑا کر بے تکلف، سادہ اور عام فہم اسلوب دیا اور اس طرح اس پر ترویج و ترقی کے راستے کھول دیئے۔ یہی نہیں بلکہ پشتو رسم الخط کو بھی روایتی الجھنوں سے نکال کر روزمرہ استعمال کے لئے اس میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔ اسی لئے خوشحال کو بابائے پشتو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن غالب کی طرح خوشحال بھی چونکہ ایک عظیم شاعر تھا اس لئے اس کی شاعرانہ عظمت و شہرت کے سامنے اس کی نثری خدمات اور احسانات دب کر رہ گئے اور اس کے نثری کارناموں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔

خوشحال کی شاعری تاریخی شعور کی شاعری ہے، وہ ایک سچا اور کھرا حقیقت پسند شاعر ہے۔ اس کی بے رحم تنقید نے نہ صرف یہ کہ دشمنوں کو معاف نہیں کیا بلکہ اپنی کمزوریوں، غلطیوں اور غلط روی کو بھی ہدفِ تنقید بنانے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس کی شاعری اپنے عہد کی بلاشبہ ایک منظوم تاریخ ہے جس میں اس نے بڑی صاف گوئی، بے باکی اور سچائی سے سارے واقعات ایک مورخ کی طرح کسی قسم کے مبالغے یا تعصب کے بغیر بالکل واشگاف بیان کئے ہیں۔ اپنے مخالفین کی

کمینگیوں کی جہاں مذمت کی ہے وہاں ان کی خوبیوں کی تعریف بھی کی ہے۔ اسی طرح جہاں اپنی ہوش مندی او دانش مندی کا ذکر کیا ہے وہاں اپنی حماقتوں کو بھی واشگاف طور پر ظاہر کیا ہے، اپنی عیاشیوں کو بھی نہیں چھپایا، اپنے آمرانہ فیصلوں کے غلط نتائج کا بھی اعتراف کیا ہے، اپنی بری عادتوں اور فرعون سامانی کو بھی برملا بیان کیا ہے، اپنی قوم اور اپنے میٹوں کی غداری، لالچ اور سود ابازی کے واقعات پوری تفصیل سے بتائے ہیں اور بعض اشعار میں اس نے اپنے ایسے ایسے ننگے اور فحش تجربات کو اتنی معصومیت سے واضح طور پر پیش کیا ہے جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات ہی نہ ہو۔

خوشحال اپنی زندگی میں اچھے بُرے ہر تجربے سے گزرا ہے اور یہ اس کی اخلاقی جرات اور صداقت کے اظہار کا کمال ہے کہ اس نے اپنی بڑی سے بڑی کمزوری کو بھی پردہ اخفا میں رکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کی فطرت بری نہیں وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ جل شانہ سے عفو اور کرم کا طالب ہے۔ وہ ہمیشہ مذہبی احکام کا سختی سے پابند رہا ہے اور آخر میں وہ ہمیں ایک ایسے صوفی باصفا کے روپ میں نظر آتا ہے جو برے اعمال سے تائب ہو کر خالق حقیقی سے لو لگائے فنافی اللہ کے مقام پر نظر آتا ہے۔

تو ازل سے تا ابد موجود　　منبع ہر شے کا ہے ترا ہی وجود
تو نگہدار رہ کہ تیرے سوا　　اور کوئی نہ ہو میرا معبود
دائم و قائم اے قدیم خدا　　تیرا عرفان تری صفات میں ہے
راہِ حق پا کے کامران ہوا　　عشق تیرا مری نجات میں ہے

خوشحال کی علمی ادبی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اپنی گوناگوں خصوصیات اور صلاحیتوں کے پیشِ نظر اتنا عظیم فنکار ہے کہ پورے ایشیا میں اس کا ثانی پیدا کرنا محال ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نے سب سے پہلے انسان کامل کا تصور، خودی کا فلسفہ اور شاہین کا سمبل پیش کیا اور قوم کو بیدار کرنے کے لئے اس نے تین ستونوں پر اپنی شاعری کی عمارت اٹھائی۔ خوشحال کے خودی کے فلسفے اور شاہین کی علامت کو اسی کے پیش کردہ صفات و خصوصیات کے ساتھ اپنایا اور ان سے ملت خوابیدہ کو بیدار کرنے کے لئے خاطر خواہ کام کیا۔

رحمان بابا: رحمان بابا کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے علاوہ ان کی زندگی کے بعض نہایت اہم گوشے بھی اقداذ زمانہ کی ستم ظریفی سے کچھ ایسی تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں جہاں تاریخ گنگ اور تحقیق سرنرابو ہے۔ اب تک محققین محض قیاسات، روایات اور بزرگوں کی خاندانی یاداشتوں کے سہارے بعض تاریخی واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوہ کندن وکاہ برآوردن کوششوں کے بھروسے کچھ منطقی نتائج تک رسائی کر پائے ہیں جو ان اہلِ علم کے اپنے اپنے نکتہ نظر سے اختلافات کا پلندہ بن کر رہ گئے ہیں۔ تاہم اب تک جتنا کام بھی ہوا ہے وہ اس اعتبار سے قابل تحسین ہے کہ ان مہم جو حضرات نے برسوں کی محنت و ریاضت سے گمنامی کے ٹیلوں اور منوں ٹنوں گرد و غبار کو صاف کر کے ان نقوش کو اجاگر کر دیا ہے جو اس منزل کے نئے آنے والے مسافروں کے لئے نشانِ راہ کا کام دیں گے، اس ضمن میں فاضل مستشرین اور ملکی محققین نے اپنی تحقیق کی روشنی میں جو قیمتی ترکہ ہمارے لئے چھوڑا ہے اسے ہم مختصراً یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

محمد ہوتک بابا اپنی کتاب پتہ خزانہ (مخفی خزانہ) میں لکھتے ہیں:

''رحمان بابا کا نام عبدالرحمان اور قوم مہمند ہے۔ ان کے والد کا نام عبد الستار مہمند تھا۔ رحمان بابا ۱۰۴۲ء ہجری میں پشاور کے ایک گاؤں ''بہادر کلی'' میں پیدا ہوئے۔ فقا اور تصوف کی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک جید عالم ملا محمد یوسف یوسفر کی سے حاصل کی۔ اس کے بعد کوہاٹ جا کر جذب و سلوک کی منزلیں طے کیں اور جوانی ہی میں اللہ اور اس کے رسول کے عشق میں دنیا اور لذات دنیا کو ترک کر کے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ ۱۱۱۸ء ہجری میں وفات پائی، مضع ہزاخوانی میں دفن ہوئے جہاں آج تک اُن کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے''۔

مشہور مستشرق پادری بیوز کے مطابق:

''رحمان بابا مہمند قبیلے کی شاخ ابراہیم خیل سے تعلق رکھتے ہیں''

پروفیسر عبدالحمید افغانی کے نزدیک:

''رحمان بابا غوریا خیل مہمند تھے''

نامور مستشرق میجر راورٹی کی تحقیق کے مطابق:

''رحمان بابا پتہ مہمند کے ہزار خوانی گاؤں میں بود و باش رکھتے تھے۔ ان کی بیٹی کے رشتے سے نواسے نواسیاں ایک چھوٹے سے گاؤں بہادر کلی میں آج بھی موجود ہیں لیکن اُن کے بیٹے کی اولاد بالکل معدوم ہے''

رحمان بابا کی اولاد کے متعلق یہ تحقیق کہاں تک درست ہے اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ کسی ذریعے سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دوسرے صوفی شعراء اور اکابرین کی طرح رحمان بابا کی جذب دستی کی زندگی اور صوفیانہ کلام پر اس عہد کے حاسد اور کم فہم ملاؤں نے انہیں کفر و ارتداد کے فتوں سے نوازا اور ان کا حقہ پانی بند کر دیا، ان کی زندگی جیرن کر دی لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز اپنی دھن میں لگے رہے۔ پروفیسر افغانی اور اورٹی دونوں نے رحمان باب

کے خلاف عصر علما کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے موسیقی سے رحمٰن بابا کی رغبت اور رباب کے تاروں سے ان کے سازِ دل کی ہم آہنگی اور اس سے اُن کی والہانہ محبت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ وہ عشق ربانی میں اس قدر ڈوب گئے تھے کہ اکثر عالمِ استغراقے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے۔ اُن کے دیوان کے متعلق تمام محققین کی یہی رائے ہے کہ اپنا کلام جمع کرنے کا اُن کو ہوش نہ تھا جو کچھ کہتے ان کے معتقد دوست احباب آ کر لے جاتے جنہوں نے بعد میں اپنے اپنے طور پر دیوان مرتب کر کے چھپوائے۔ اس سلسلے میں چونکہ مختلف دوستوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کی اس لئے ان کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ بعض غزلیں ایک دیوان میں ہیں، دوسرے میں نہیں ہیں، بعض غزلوں میں کچھ شعروں کا اضافہ بھی کسی ایک دیوان میں نظر آتا ہے جو مرتب کی فیاضی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ بہت سی غزلیں ایسی بھی ہیں جو ان کے نام سے زبان زدِ عوام ہیں لیکن ان کے دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ ''پختانہ شعراء'' میں بعض محقق مورخین کے حوالے سے لکھا ہے ''رحمان بابا نے اپنی زندگی میں خود اپنا دیوان جمع اور مرتب کیا لیکن بعد کے محققین اسے تسلیم نہیں کرتے اور روایت کے اعتبار سے بھی جب ہم ان کی مجذوبانہ زندگی کو دیکھتے ہیں تو ان روایات میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔

رحمان بابا کا گھرانہ غریب تھا لیکن اُن کے چچیرے بھائی بڑے زمیندار اور گاؤں کے معتبر خان تھے اس لئے آپ کی ان کے ساتھ بنتی نہیں تھی۔ وہ آپ کو ہمیشہ سبک نظروں سے دیکھتے اور انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ شب و روز یادِ الٰہی میں مست اور فکرِ سخن میں مگن رہتے۔ دنیاداری سے آپ کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ہر وقت آپ کے گرد معتقدین کا جمگھٹا لگا رہتا۔ یہ بات آپ کے تربروں کو ایک آنکھ نہ بھاتی اور انہیں آوارہ اور ننگ خاندان کہتے اور انہیں پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہ کرتے۔ جب ان کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ گئیں تو آپ نے اپنے باپ دادا کی ہری بھری کھیتوں کو چھوڑ کر صرف اپنا باب سنبھالا جو انہیں بہت عزیز تھا اور تنہائی میں گم غلط کرنے کا ایک ذریعہ تھا اور پشاور کے قریب موضع ہزار خوانی میں اُٹھ آئے۔ آپ کی ایک غزل کا مقطع اس حادثے کی یادگار ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''گدا اور شاہ ایک گاؤں میں نہیں رہ سکتے کہاں عزیز خان کہاں درویش عبدالرحمٰن''

پشتو کے عظیم شاعر رحمان بابا بھی ایسے ہی صاحب طرز شاعر تھے جو دوسرے تمام قدیم پشتون شعرا سے اپنا الگ مکتبہ فکر رکھتے تھے اور یہ ایسا موثر مکتبہ فکر تھا جو گزشتہ تقریباً سو برس سے آج تک زندہ پائندہ ہے۔ اس عرصے میں ان کے مابعد کے ہزاروں شعراء اس سکول سے کسب فیض کرتے چلے آئے ہیں یہاں تک بابائے پشتو خوشحال خان خٹک جو خود اپنے منفرد مکتبہ فکر کے بانی تھے ان کے بیٹے عبدالقادر خٹک بھی ''سبک رحمان'' یعنی رحمان بابا کے سکول کے پیرو تھے۔ ان کی بنیادی تعلیم اپنی عالمگیر انسانی قدروں کی حامل ہے جو دنیا کے تمام باشعور شعراء کا خاصہ رہا ہے۔ رحمان سکول میں خودی کی تعلیم اور عالمگیر انسانی مساوات کا درس دیتے، انسانی اقدار کا احساس ہے جن کا اظہار وہ فنکارانہ طور پر مختلف انداز میں کرتے ہیں:

جو آنسو ایک بار آنکھ سے گر جائے　　گمان نہ کر کہ واپس آ گا

ہر روز دیکھتے ہو نئی دھوپ ہوتی ہے　　جو ایک بار گر جائے وہ پھر نہیں اٹھ سکتا

حسین چہروں اور سایہ زلفوں کے عاشق　　کفر و اسلام کو کب خاطر میں لاتے ہیں

رحمان بابا غزل کے شاعر ہیں۔ غزل پشتو کی اپنی صنف سخن نہیں۔ شاعری کی طرح پشتو شاعری میں بھی ایک مہماں کی طرح وارد ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پشتو کی تمام ملی اصناف سخن پر چھا گئی۔ رحمان بابا کے کلام میں خوشحال خان جیسی گھن گرج نہیں۔ وہ غزل کے مزاج شناس ہیں۔ غزل جس کومل لہجے، دھیمے سروں، نرم و نازک احساسات اور مترنم الفاظ کی متقاضی ہے۔ وہ تمام خوبیاں ان کے ہاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

رحمان بابا کا طبعی میلان تصوف کی طرف تھا۔ اس کے لئے انہیں غزل ہی کا سانچہ موزوں نظر آیا۔ آپ کی انفرادیت پسند طبیعت نے کسی کی تقلید گوارہ نہ کی، اپنے لئے بالکل جداگانہ لہجہ اور نیا اسلوب اپنایا، وہ صوفی شاعر تھے۔ تصوف جو ایشیائی شاعری کا محبوب موضوع رہا ہے آپ کی غزل کا طرہ امتیاز ہے۔ پشتو غزل کو سب سے پہلے مرزا خان انصاری نے تصوف کی چاشنی سے آشنا کیا۔ مرزا کا عہد ۱۵۴۰ء ہے وہ پیرو روخان کے مکتبہ خیال کے ایک نام آور شاعر، مبلغ اور عالم دین تھے۔ پیرو خان اگرچہ خود شاعر تھے تاہم وہ پشتو، عربی، فارسی، ہندی زبانوں کے عالم اور بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ اپنے وقت کے بڑے صوفی اور عالم تھے اور تصوف میں وحدت الجرجوری نظریہ کے قائل تھے۔ مرزا خان انصاری جو پیرو خان کے مرید خاص اور صوفی تھے انہوں نے پشتو غزل میں تصوف کو جگہ دے کر ایسی راہ نکالی جس سے بعد کے شعرا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ تصوف کے آتے ہی پشتو غزل میں ساز و سوز، وقار، تمکنت اور پاکیزگی آ گئی اور اس کی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔

مولانا عبدالقادر مرحوم کا قول ہے:

''پشتو شاعری کی تاریخ میں رحمان بابا سے زیادہ شہرت اور ہر دلعزیزی آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ملک کے مرد وزن، بڑے چھوٹے، عالم اور جاہل مختصر یہ کہ ہر کس و ناکس رحمان بابا کا نام جانتا ہے۔ اس کی پوری رباعی نہ سہی ایک آدھ شعر تو اسے ضرور یاد ہوگا۔ ہر محفل ان ہی کے کلام سے روشن ہوتی ہے۔ قوم کی زندگی کی ہر کیفیت کسی نہ کسی پیرائے میں ان کے کلام میں موجود ہوتی ہے۔ کتنے ہی مصرعے ضرب الامثال بن کر زبان زد عام ہیں''۔

سید ضیاء جعفری: صوبہ سرحد کے صوفی منش اور قادر الکلام رباعی و غزل گو شاعر سید ضیاء جعفری کا شمار درویش صفت وصوفی مزاج شعراء میں ہوتا ہے۔

سید ضیاء جعفری کا اصلی نام سید عنایت علی شاہ، تخلص ضیاء اور نسبی سلسلہ جعفری تھا۔ ان کی جائے پیدائش ضلع کیمبل پور کا ایک گاؤں جاتلی ہے۔ بعض سوانح نگاروں نے ان کی جائے پیدائش جاتری لکھا ہے۔ والد کا نام سید عنایت علی شاہ تھا۔

آپ 1905ء میں جاتری یا جاتلی میں پیدا ہوئے۔

ان کے مجموعہ کلام ''صبوحی'' نے بڑی شہرت حاصل کی۔ قادر الکلام شاعر ہونے کی بناء پر انہیں اپنے ہمعصر شعراء اور ادباء نے ''خیام سرحد'' کہا ہے۔

رضا ہمدانی اور فارغ بخاری: ان دونوں نامور مرحوم شاعروں اور ادیبوں کا اکٹھا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ساری زندگی ان دونوں کی رفاقت کو دوام حاصل رہا ہے۔ رضا ہمدانی اور فارغ بخاری رشتے میں بھی سالہ بہنوئی ہیں' دونوں اب اس جہان فانی میں نہیں ہیں مگر شعر وادب کے حوالے سے ان کے ذکر کے بغیر ادبی انصاف کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ شعر وادب کے میدان میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

سنگ میل کے اجراء میں ان دونوں کی ادبی کاوشیں ان کی ادبی خدمات کی ایک نمایاں علامت ہے۔

پروفیسر شوکت واسطی: ان کا اصلی نام صلاح الدین، تخلص شوکت اور واسطی خاندانی نسبت ہے۔ آپ شعر وادب کے میدان کے شہسوار ہیں۔ صوبہ سرحد کے مختلف مقامات پر کالجوں میں خدمات انجام دیتے رہے اور پھر سرحد ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیرمین کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے۔ پشاور میں انہوں نے ادارہ علم وفن کے نام سے ایک ادبی ادارے کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے پرانے ادیبوں اور شاعروں کو مدت دراز کے بعد ایک ادبی نشست گاہ میسر آئی۔ شوکت واسطی کے اس ادارے نے نئی نسل کے کئی لوگوں کو شعر وادب کے ذوق کے اظہار کا حوصلہ دیا۔ پروفیسر شوکت واسطی نے اس ادارے کے زیر اہتمام مختلف مقامات پر مشاعرے اور تنقیدی محفلیں منعقد کرائیں۔ اس ادارے کے تحت تین اہم ابتدائی کتابیں شائع ہوئیں' غزلیات میں نیا پرانا لہجہ' نظم میں ادیب جلے لہولہو' اور لغت میں خاصہ خاصان رسل' ان تمام مجموعوں میں نامور شعرا کا کلام شائع ہوا۔

محسن احسان: پشاور میں انگریزی کے پروفیسر رہے ہیں۔ ان کا شمار صوبہ سرحد کے نامور شعراء اور ادباء میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں شاعری کرتے ہیں۔ ادبی اور علمی محافل میں ان کو مقدم حیثیت دی جاتی ہے۔

خاطر غزنوی: نہایت ممتاز حیثیت کے شاعر ولکھاری ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ عمر میں اسی سال سے اوپر ہو چکے ہیں مگر ولولے اور جوش ادب جوان ہیں۔ ان کے دم خم سے یہاں کے ادیب اور شاعر یکجا ہیں۔ ہر ماہ ان کی رہائش گاہ پر ادبی تنقیدی محفل ہوتی ہے جس میں مشاعرے کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پشاور میں ہی نہیں بلکہ پشاور سے باہر بھی کوئی ادبی نشست یا مشاعرہ ان کی شرکت کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ اردو کے علاوہ ہندکو میں بھی شاعری کرتے ہیں۔

شمیم بھیروی: انہوں نے افسانہ نگاری میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ افسانے کے علاوہ غزل' قطعے' نظم' رباعی' ترجمے اور تنقید میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ انہوں نے بمبئی اور بنگال میں بھی عمر کا کچھ حصہ گزارا۔ آپ سیٹھی خاندان سے تعلق ہونے کی بناء پر اپنے نام کے آخر میں بھیروی لکھتے تھے کیونکہ سیٹھی خاندان کا برصغیر ہندوستان میں پہلا پڑاؤ بھیرہ تھا۔ علاقے کی نسبت سے یہ بھیروی لکھتے تھے جبکہ تخلص شمیم ہے۔

محمد یونس سیٹھی وفا: آپ کا تعلق پشاور کے نامور اور معتبر سیٹھی خاندان سے ہے۔ وفا آپ کا تخلص ہے۔ آپ کی علم وادب کے علاوہ تحریک پاکستان کے سلسلے میں خدمات قابل ذکر ہیں۔ آپ پاکستان کے نشریاتی اداروں سے وابستہ رہے ،اندرون ملک اعلیٰ اور بیرون ملک سفارتی عہدوں پر فائز رہے' مادری زبان ہندکو ہے جبکہ پشتو' اردو' فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے مشاغل سے وابستہ رہے۔ یکم اپریل 1922ء

پشاور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے تعلیم کے مشاغل کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔ کالج میں تعلیم کے دوران ڈرامہ اور ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔

آپ گندھارا تہذیب وتمدن سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور قدیم وجدید کے درمیان ایک ایسی علامت ہیں جو عہد حاضر کی نسل اور آنے والی نسلوں کے لئے راہنما کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ کی تصانیف میں' سرود کوہسار (پشتو ٹپوں کا نثر اور نظم میں ترجمہ) صبح جمال (تحریک پاکستان کی جامع تاریخ) نوائے روم (مثنوی مولانا روم کے منتخب حصوں کا منظوم ترجمہ مع تشریح جلد اول ودوم)، حرف وفا (شعری مجموعہ) مناجات وفا (فارسی مثنوی) ہدیہ وفا (حمد ونعت ومنقبت کا مجموعہ) شامل ہیں۔

نذیر مرزا برلاس: نذیر مرزا برلاس مرحوم نامور نظم گو شاعر اور نہایت دلکش نظموں کے ذریعے نوجوانوں کے لئے ایک راستہ متعین کیا۔ ''طرح نو'' کے نام سے ان کی کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ فارسی زبان کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ایران سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور گورنمنٹ کالج میں فارسی کے لیکچرار رہے ہیں۔ دائرہ ادبیہ' دبستان اور انجمن ترقی اردو اور پھر ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے ان کا تعلق رہا۔

یوسف رجا چشتی: فوج میں اعلےٰ عہدے پر فائز رہے۔ اردو شاعری میں ملکہ حاصل ہے۔ یہ شعری بحروں کی تقطیع پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام نہایت شستہ اور اعلےٰ سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر شوکت واسطی کے دیرینہ ساتھیوں میں سے ہیں اور جب ادارہ علم وفن کی بنیاد رکھی گئی تو اس ادارے کے قیام میں انہوں نے گرانقدر کردار ادا کیا۔

محمود الحسن کوکب مرحوم: اردو' فارسی، عربی اور انگریزی میں لکھنے والے شاعر تھے۔ میٹرک تک تعلیم پشاور کے اسلامیہ ہائی سکول سے حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد لکھنو کے مدرسہ عالیہ سے دینی تعلیم کی سند حاصل کی۔

اٹھارہ یا انیس سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں مختلف طریقوں سے نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کے لئے ترغیب دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے شعراء حضرات نوجوانوں کے لئے ایسی نظمیں لکھتے تھے جن کے ذریعے نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کے لئے آمادہ کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے شاعروں کا اہتمام محمود الحسن کوکب کیا کرتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے اس لئے جب یہ نظم کہی۔

لازم ہے پاس عزت وناموس ونگ
قائم وطن میں کیجئے قومی محاذ جنگ

تو انہیں سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ایک نیا محکمہ ٹرائبل پبلسٹی کے نام سے قائم کیا۔ محمود الحسن کوکب کو اس محکمے میں ریسرچ آرگنائزر مقرر کیا گیا۔ اس محکمے میں بھی مشاعروں کے انعقاد کی ذمہ داری محمود الحسن کوکب کو سونپی گئی تاکہ قبائل میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو۔ انہوں نے پشاور میں ایک تعلیمی ادارہ ''انجمن تعلیم القرآن'' کے نام سے قائم کیا جس میں بچوں کو پانچویں درجے تک تعلیم مفت دی جاتی۔ اس مدرسے کے قیام کے سلسلے میں انہوں نے مخیر حضرات کو چندہ دینے کی ترغیب دی اور والدین کو بھی بچوں کو اس مدرسے میں تعلیم دلوانے کے لئے آمادہ کیا۔

جب پشاور میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا تو اس کے پہلے پہلے شاعر' فیچر نویس اور مقرر آپ ہی تھے۔

ان کے کلام میں حسرت ویاس کے سوز وگداز کی بجائے زندگی کو امید سے قریب کرنے اور ولولہ پیدا کرنے کا پیغام ملتا ہے۔

خزاں نہیں نہ سہی یہ بہار بھی تو ہے　　چمن پہ رنگ گلوں پہ نکھار بھی تو ہے
گھنیری زلفوں کے سائے اگر نہیں نہ سہی　　نصیب سایہ دیوار یار بھی تو ہے

پروفیسر سید اشرف بخاری مرحوم: نہ صرف پشاور بلکہ صوبہ سرحد کے طول وعرض کے نامور ومعروف ادیبوں اور نقادوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا طرز تکلم اور انداز خطابت منفرد اور دلنشین تھا۔ اس لحاظ سے پشاور کے مقررین کی صف میں درجہ اولیٰ کے مالک تھے۔ دوستی اور محبت میں یکتائی کے درجے پر آتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے ہر ایک کے مقام ومرتبے کے مطابق تعلق داری رکھتے تھے۔ پشاور کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی منعقد ہونے والی ادبی اور ثقافتی مجالس ومحافل میں ان کی شرکت محفل میں زعفرانی رنگ پیدا کرنے کا موجب ہوتی تھی۔ سید اشرف بخاری دوسروں کا احترام کرنا اور اپنی ذات کے لئے واجب الاحترام مقام کا تعین کرنا بخوبی جانتے تھے۔ ریڈیو' ٹیلیویژن پر ان کے ادبی' مذہبی اور ثقافتی پروگرام لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ اخبار میں سیاسی' سماجی' ادبی اور تنقیدی مضامین لکھتے تھے۔ آپ کا شمار ادارہ علم وفن کے بانی ممبروں میں ہوتا ہے۔ سید

اشرف بخاری پشاور شہر کے شمال کی جانب واقع قصبہ وڈپگہ کے معتبر بخاری سادات گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ بخاری صاحب پیشے کے لحاظ سے معلم تھے۔ اردو کے نامور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ ایبٹ آباد بورڈ آف انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے گوشہ عافیت کی زندگی اختیار کر لی تھی اور زیادہ تر وقت مطالعہ اور نگارشات میں گزارا۔ ان کے مطالعہ کا خاص پہلو تصوف تھا۔

سید مظہر گیلانی مرحوم: سید مظہر گیلانی مرحوم گیلانی سادات خانوادے سے تھے۔ پشاور کے اہل قلم، نثر نگاروں اور شاعروں میں ممتاز حیثیت کے حامل شاعر اور ڈرامہ نگار تھے۔ قدیم اور وضعدار اہل ادب و قلم اب تک ان کو ممتاز اور اعلےٰ درجے کا شاعر و ڈرامہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان پشاور کے لئے ان کی ڈرامہ نگاری ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان کا مشہور ڈرامہ ہند کو زبان میں قہوہ خانہ ہے۔ جس کے ذریعے انہوں نے پشاور کے گھرانوں کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن اور روزمرہ کی بول چال کی عکاسی کی ہے۔ سید مظہر گیلانی اردو اور ہندکو میں نثر لکھنے کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے۔ انہیں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں میں خاندانی اور ادبی لحاظ سے محترم مقام حاصل تھا۔

آقائے ابوالکیف کیفی: پشاور شہر کے نامور شاعر و قلمکار مرحوم آقائے ابوالکیف کیفی ایک ایسی وجیہہ و باوقار صاحب سخن و قلم شخصیت کے حامل شخص تھے جنہیں اللہ تعالےٰ نے شعر گوئی، سخنوری میں ملکہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں رعب و تمکنت کا جلال بھی دے رکھا تھا۔ مگر وقار و تمکنت کے باوصف وہ ملنساری و شگفتہ گفتاری میں بھی باکمال انسان تھے۔ ان کی شخصیت اور پرتکلف پوشاک کو دیکھ کر زمانہ گذشتہ کے درباری امراء و شاہان وقت کے مصاحبین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی آواز میں بھی ایک جلال تھا۔ شعر گوئی کے حوالے سے اہلیان پشاور کے علمی اور ادبی حلقوں میں نمایاں اور باعزت مقام رکھتے تھے۔ غزل گوئی کے علاوہ ان کی شاعری کا متعدد حصہ پشاور کی روحانی شخصیت اور ولی اللہ بزرگ حضرت سید شاہ قبول اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی منقبت میں اور حضرت سید شاہ قبول اولیاء کی اولاد کی توصیف میں ہے۔ شاعر ملت ان کا خطاب تھا۔ آقائے ابوالکیف کیفی، چھڑی بدست، شیروانی پوش، سر پر سیاہ قراقلی پہنے، خوش وضع اور باذوق پشاوریوں میں ایک قابل احترام بزرگ اہل قلم اور سخنور شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر و قلمکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور تاجر بھی تھے۔ پشاور کے بارونق بازار دالگراں میں کیفی مارکیٹ کے نام سے ان کی تعمیر کردہ مارکیٹ قدیم ثقافتی تعمیر کا ایک گرانقدر نشان بھی ہے۔ آپ کے پردادا حافظ نذر محمد چشتی بخارا کے رہنے والے تھے اور تجارتی مقاصد کے تحت بخارا سے ہجرت کر کے پشاور آ گئے اور پھر پشاور کے علاقہ جہانگیر پورہ کے محلہ گلبادشاہ جی میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی محلے میں کیفی صاحب 6 فروری 1910ء کو پیدا ہوئے۔ جب کیفی صاحب جوان ہوئے تو انہوں نے بھی ابتداء میں والد کے کاروبار میں عملاً حصہ لیا اور اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان نمایاں حیثیت کے ساتھ پاس کیا۔ بعد میں گورنمنٹ کالج پنجاب لاہور سے بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ بی۔ اے کے ساتھ ساتھ انہوں نے علوم السنہ شرقیہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات بھی پاس کئے۔ جبلی طور پر شاعر تھے۔ سکول کے زمانے ہی سے شعر کہنے اور لکھنے لگے تھے۔

1930ء میں شادی کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ان کا اصلی نام عبدالسلام تھا مگر جب شاعری شروع کی اور صحافت کے پیشے سے منسلک ہوئے تو قلمی نام ابوالکیف کیفی سرحدی رکھ لیا اور اس نام سے لوگوں میں متعارف ہوئے۔

انہوں نے پشاور سے پہلا ماہنامہ سفیر سخن کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے کے معاون ایڈیٹر پشتو کے نامور ادیب و قلمکار مولانا عبدالقادر تھے جبکہ رسالے کی سرپرستی صاحبزادہ سر عبدالقیوم کرتے تھے۔ یہ رسالہ 1939ء تک جاری رہا بعد میں روزنامہ سفیر کا اجراء کیا جو 1947ء تک جاری رہا۔

کیفی صاحب کی شاعری میں حسن و جمال، قدرت کی رعنائیوں اور کائنات کی دلکشیوں کے ساتھ ساتھ تصوف اور سلوک کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

آپ مورخہ 24 اکتوبر 1983ء میں 73 برس کی عمر پا کر وفات پا گئے۔ آپ کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلےٰ خان عبدالقیوم خان نے شاعر ملت کا خطاب دیا تھا۔ کیفی صاحب سرحد چیمبر آف کامرس کے پہلے منتخب صدر تھے۔

ناصر علی سید: پشاور کے اہل قلم اور حلقہ شعر و ادب میں ان کا نام اور کام توصیفی مقام رکھتا ہے۔ کوئی بھی ادبی اور شعری نشست ان کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ ضخیم الجثہ اور ہنس مکھ شخصیت کے حامل ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ خود علم و ادب کے شہسواروں میں شامل ہونے کے علاوہ علم دوست انسان ہیں۔

پشاور وصوبہ سرحد کے دیگر علاقوں میں اہل قلم کی حیثیت سے ان کی ایک خاص ادبی' قلمی اور ثقافتی پہچان ہے۔ اردو اور ہندکو زبان میں شعر کہتے ہیں۔

ضلع نوشہرہ کے علاقے اکوڑہ خٹک سے تعلق رکھتے ہیں اور اکوڑہ خٹک کے سادات گھرانے کے فرزند ہیں۔ کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں' اخبارات میں سماجی' سیاسی' ادبی اور ثقافتی موضوعات پر لکھنے والے کالم نویس بھی ہیں اور اکثر ادبی اور ثقافتی تقریبات میں سٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دینے کے فن میں انہیں منفرد مقام حاصل ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پشاور کے اکثر ہندکو اور اردو پروگراموں میں کمپیئر کی حیثیت سے ان کا تعارف محتاج بیان نہیں۔

مشتاق شباب: ڈرامہ' افسانہ اور مختلف موضوعات وعنوانات سے متعلق مضامین نویسی میں ملکہ رکھنے والے پشاور کے اس اہل قلم فرزند مشتاق شباب کی عمر کا عرصہ حیات الیکٹرانک میڈیا میں صرف ہوا ہے۔ ریڈیو پاکستان سے عرصہ دراز تک منسلک رہنے کے بعد مشتاق شباب جب ریٹائر ہوئے تو بوقت ریٹائرمنٹ تک وہ متعدد تجربات ومشاہدات کو اپنی ذات میں جمع کر چکے تھے۔ ریڈیو پاکستان پشاور کے کہنہ مشق پروڈیوسر ہونے کے ناطے ہر موضوع سے متعلق گہری معلومات رکھتے ہیں۔ اسلامی' ادبی اور ثقافتی موضوعات پر مکمل عبور رکھنے والے مشتاق شباب نے شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو اہل سرحد میں ایک سچے اور کھرے قلم کار کی حیثیت سے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں پہچانے جانے لگے تھے۔ انہوں نے سرکاری ملازمت کے دوران اپنے علمی وادبی مقام کو ارتقائی منازل پر ڈال دیا تھا اور پے در پے قلمی تجربات کی روشنی میں تحریر پروڈرامہ نگاری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

کالج میں زمانہ طالبعلمی ہی سے ڈرامہ اور آرٹس سے متعلق مصروفیات سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ کالج میں گندھارا ڈرامہ سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور گندھارا آرٹس کونسل پشاور کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے علاوہ ینگ تھنکرز فورم کے جنرل سیکرٹری اور رائٹرز کونسل کوئٹہ کے پریذیڈنٹ رہے۔ حلقہ احباب ذوق پشاور کے سیکرٹری اور اباسین آرٹس کونسل میں ڈرامہ ایڈوائزر' رائٹرز ایکوئیٹی پشاور کے جنرل سیکرٹری اور اباسین آرٹس کونسل پشاور کے آنریری سیکرٹری بھی رہے۔ ریڈیو پاکستان میں ملازمت کے دوران دوسرے ممالک کی کئی نامور شخصیتوں اور سربراہان مملکت کے ساتھ ان کی نشستیں رہی ہیں اور ریڈیو پاکستان کے تجربہ کار پروڈیوسر کی حیثیت سے ان کے انٹرویوز کئے۔

آپ 1942ء میں پشاور کے ایک مقامی گھرانے میں پیدا ہوئے اور عمر کے ساتھ ساتھ خالصتاً پشاوری مزاج میں پروان چڑھتے گئے۔ انہوں نے جن زبانوں میں تحریر وتقریر میں ملکہ حاصل کیا ان میں انگریزی' اردو' پشتو اور پنجابی زبانیں قابل ذکر ہیں۔

پروڈکشن میں متعدد کورس کئے اور اپنی پیشہ ورانہ مہارتوں میں ممتاز مقام حاصل کیا جس کی وجہ سے انہیں اعلیٰ کارکردگی پر محکمہ کی طرف سے قابل قدر ایوارڈز بھی دیئے گئے۔

پشاور کے علاوہ ملتان اور کوئٹہ میں بھی پیشہ ورانہ خدمات انجام دیں۔ ان کی تصانیف میں ''ترقی اور احباب'' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ''خمیازہ'' (سید مظہر گیلانی مرحوم کی نظموں کی پشتو میں ترجمہ) ''ہنگری کی لوک کہانیاں'' (انگریزی سے اردو میں ترجمہ) ''بیانیا'' (چھوٹی چھوٹی کہانیاں) ''نغمہ رفتہ'' (مظہر گیلانی کی نظموں کی ایڈیٹنگ) قابل ذکر ہیں۔

نذیر تبسم: تبسم فشانی کے جلو میں زندگی کے شب وروز بسر کرنے والے میدان شعر وادب کے جانے پہچانے پشوری سپوت ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں سینئر پروفیسر ہیں۔ پشاور میں جب ادیبوں اور شاعروں کے اجتماع ومجلس کے لئے ادارہ علم وفن قائم ہوا تو نذیر تبسم اس ادارے کے بانی رکن تھے۔ پشاور کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی جو ادبی محافل اور مشاعرے منعقد ہوتے ہیں نذیر تبسم کی شرکت ان میں یقینی ہوتی ہے۔ آپ ایک منجھے ہوئے شاعر وادیب اور اہل قلم ہیں۔ ان کی باتوں میں حد درجہ مٹھاس اور ادبی تہذیب کا رنگ نظر آتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر ان کے اکثر پروگرام ناظرین دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

ماجد سرحدی: پشاور کے اہل قلم حضرات میں جانے پہچانے ماجد سرحدی خالصتاً پشاوری تہذیب وثقافت کے حامل انسان ہیں۔ تخلیق انٹرنیشنل کے نام سے ادبی حلقوں کی پذیرائی کرنے کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کے جذبوں کو بھی فروغ دے رہے ہیں۔ ان کا اصل نام ماجد ریاض انصاری اور ادبی نام ماجد سرحدی ہے۔ ماجد سرحدی پشاور میں 10 جون 1944ء میں تحریک پاکستان کے نمایاں کارکن ریاض احمد انصاری کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی کے خیبر کالج سے بی۔ اے' ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور کسٹمز اینڈ سینٹرل ایکسائز وسیلز ٹیکس میں سرکاری ملازمت کی اور یہاں سے اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے فارغ ہوئے۔

ماجد سرحدی آج کل پشاور میں تخلیق انٹرنیشنل کے فورم پر پشاور کے ادیبوں اور شاعروں کی مجلسیں منعقد کر رہے ہیں جن میں بالخصوص مشاعرے کا

اہتمام ہوتا ہے۔ ماجد سرحدی کی مطبوعات حسب ذیل ہیں، یہ کیسا انصاف ہے (مجموعہ کلام)، چٹکتی کلیاں (باتصویر منظوم کہانیاں)، پیکج رولز (کتابچہ)۔

ڈاکٹر صلاح الدین: پاکستان ٹیلی ویژن کے مختلف سنجیدہ پروگراموں کے کمپیئر کی حیثیت سے جانے پہچانے ڈاکٹر صلاح الدین ادبی اور اہل قلم حلقوں میں قابل عزت مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ضلع جھنگ کے بھٹی خاندان سے ہیں جو کہ فکر روزگار میں پشاور آئے اور یہیں کے ہو گئے۔ ڈاکٹر صلاح الدین پشاور ہی میں پیدا ہوئے اور پشاور یونیورسٹی کے خیبر میڈیکل کالج سے ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ان دنوں پشاور کے تاریخی اور بڑے ہسپتال پوسٹ گریجویٹ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں سینئر ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کا حلقہ اثر ثقافتی اور لسانی تحریکوں سے وابستہ ادیبوں اور اہل قلم سے منسلک ہے۔ اخبارات میں سیاسی، ادبی اور ثقافتی موضوعات پر لکھنے والے کالم رائیٹر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ گندھارا ہندکو ادبی بورڈ کے متحرک عہدیدار ہیں اور ہندکو زبان و ادب کے فروغ کے لئے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر گرانقدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ خاندانی اور گھریلو روزمرہ زندگی میں پنجابی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جبکہ عام طور پر پشاوری ہندکو میں بات چیت کرنے کے علاوہ پشتو بھی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہ اپنی ذات میں ایک ایسے باکمال لکھاری ہیں جو کہ ہندکو دانوں اور پشتونوں دونوں لسانی اور ادبی حلقوں میں قابل احترام حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اپنے اخباری کالموں میں معاشرتی اور سماجی عوامی مسائل کے حل سے متعلق مفید اور قابل عمل تجاویز پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریروں کو عوام میں مقبولیت کا حاصل ہے۔

قدسیہ قدسی: قدسیہ قدسی کا تعلق پشاور کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور بی۔ایڈ کے امتحانات پاس کر کے سرکاری سکولوں میں بحیثیت معلمہ خدمات انجام دینے کے بعد قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کر لی۔ اہل ادب و شعر اور صاحبان تصنیف میں ممتاز مقام رکھنے والی خاتون ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتی ہیں۔ پشاور کے ادبی اور فنی ادارے ادارہ علم و فن کے مبتدی اراکین میں سے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے علمی، ادبی اور ثقافتی پروگراموں میں گاہے بگاہے حصہ لیتی ہیں۔

قدسیہ قدسی کے شعری اور افسانوی مجموعے اور سفرنامے درج ذیل ہیں، صدا بصحرا (شعری مجموعہ اردو)، کنڈے کنڈے وادی (افسانوی مجموعہ ہندکو)، الخلیل والخلیل (سفرنامہ)، گرد سفر (سفرنامہ)۔

اردو کے علاوہ ہندکو زبان میں بھی بڑی اچھی شاعری کرتی ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش 15 اپریل 1950ء ہے، پشاور ان کی جنم بھومی ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر احسان علی: پشاور ریجن کے ضلع چارسدہ میں چارسدہ مردان روڈ پر ایک گاؤں مانی خیل ڈاکٹر پروفیسر احسان علی کی جائے پیدائش ہے جہاں آپ 3 فروری 1959ء میں غلام نبی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی اور پھر پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے آرکیالوجی اور ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد پشاور یونیورسٹی کے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے شعبے میں مکمل مہارت حاصل کی اور اسی شعبے میں دائرہ تحقیق کو وسیع تر کیا اور پھر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر احسان علی ان چند ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں اپنے مضمون کے ساتھ والہانہ محبت اور تندہی سے کام کرنے کی عادت ہے۔ ڈاکٹر احسان علی کی یہ خوبی انہیں ممتاز کرتی ہے کہ وہ خود بھی آثار قدیمہ سے متعلق دریافتوں اور نگارشات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اس وقت ڈائریکٹر آثار قدیمہ، صوبہ سرحد اور پشاور میوزیم کے انچارج بھی ہیں۔

ڈاکٹر احسان علی انگلینڈ سے ایم۔اے فیلڈ آرکیالوجی 1989ء میں کیا اور یو۔کے کی یونیورسٹی آف کیمبرج سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی نمایاں اور اپنے شعبے میں اعلےٰ خدمات کے طور پر انہیں ملک اور بیرون ملک اعلےٰ اعزازات دیئے گئے اور مختلف یورپی ممالک بشمول امریکہ کے دورے کئے جس سے ان کی اپنے شعبے میں ممتاز حیثیت میں مزید اضافہ ہوا۔

ان کی اپنے شعبے سے تعلق رکھنے والے موضوعات سے متعلق متعدد تصانیف ہیں جو علمی تحقیق اور تجربے پر مشتمل ہیں۔

عزیز جاوید: عزیز جاوید بنیادی طور پر شعبہ درس و تدریس سے وابستہ رہے، اپنی اس ذمہ داری کے ساتھ ساتھ تصنیف کے سلسلے سے بھی منسلک رہے۔ آپ نے پشاور کے ادبی اور ثقافتی حلقوں کو فعال کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور انہی کاوشوں کی وجہ سے پشاور کے ادبی ادارے اباسین آرٹس کونسل کے سیکریٹری بھی رہے۔ آپ کی تصانیف میں چند نمایاں کتب ہیں جن میں ''حاجی صاحب تورنگزئی'' جس پر آپ کو حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ امتیاز بھی ملا، اس کے علاوہ ''قائداعظم اور سرحد''، ''پاکستان کی نامور خواتین'' اور ''تحریک آزادی'' قابل ذکر ہیں۔

شیر محمد درانی: شیر محمد درانی مرحوم مسگری کے فن و ہنر کے استاد تسلیم کئے جاتے ہیں اور عہد حاضر میں اندرون ملک اور بیرون ملک ان کے متعدد شاگرد پھیلے ہوئے ہیں اور فن مسگری میں ہنرمندوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

شیر محمد درانی مغلیہ استادہ بنانے میں ماہرانہ صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ مس سے استادہ بنا کر اس پر نقوش بھی خود ہی کندہ کرتے تھے۔ یہ تمام کام اپنے ہاتھوں کی مہارت سے کرتے تھے۔ شیر محمد درانی افغانستان کے درانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی چھوٹی عمر میں افغانستان سے پشاور آ گئے اور یہیں پر اپنے فن کا آغاز کیا اور پشاور ہی میں شادی کر کے خاندان آباد کیا۔ شروع میں ان کی مسگری کی دکان قصہ خوانی کے بازار مسگران میں تھی مگر بعد میں یہ پشاور کے معروف علاقے جہانگیر پورہ میں آ کر آباد ہو گئے اور وہیں پر مسگری کی دکان کھول لی جہاں صرف مس کی دھات سے مختلف ظروف بنائے جاتے تھے۔ انہوں نے یہ فن اپنے بچوں میں منتقل کیا اور تقریباً سو سال کی عمر پا کر وفات پائی۔

اس وقت ان کے بیٹے نگاہ حسین درانی بقید حیات ہیں جنہوں نے لوک ورثہ کے ذریعے اس فن کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح ایک چابکدست، ہنرمند دستکار ہیں۔ اپنے ہنر اور دستکاری میں کمال مہارت حاصل کی اور حکومت پاکستان نے انہیں ان کی اپنے فن میں اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور پر تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا ہے۔

پشتون اہل قلم شاعر اور ادیب

امیر حمزہ خان شنواری: پشتو شعر و ادب کے حوالے سے امیر حمزہ خان شنواری مرحوم کا نام ہمیشہ قدآور، معتبر اور قابل احترام بزرگان سلف میں رہے گا۔ ان کے کلام میں عرفان و حقیقت کشائی کا وصف موجود ہے۔ پشتو غزل کے اعتبار سے انہوں نے جو سخنوری کی ہے وہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اوج کمال تک پہنچا ہوا کلام نظر آتا ہے۔ امیر حمزہ خان شنواری ایک متحرک راہنما شمار ہوتے ہیں۔ پشتو زبان و ادب کے سخنوروں میں ان کا مقام و مرتبہ السابقون الاولون میں سے ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں شعر گوئی کا جو اعلیٰ ملکہ عطا کیا تھا یہ بہت کم لوگوں کا حصہ بن سکا ہے۔ تصوف کی طرف امیر حمزہ خان شنواری کا رجحان شروع ہی سے رہا ہے اس لئے ان کے پشتو کے کلام میں تصوف و روحانیت کا جو امتزاج پایا جاتا ہے اس سے یہ اپنے ہم عصر شعراء و ادباء میں ایک منفرد اور جدا مقام رکھنے والے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ بہت سے پشتون گلوکاران کے کلام کو گاتے ہیں۔

امیر حمزہ خان شنواری کا تعلق خیبر ایجنسی کے ایک گاؤں لواڑگی سے ہے اور وفات کے بعد ان کی آخری آرامگاہ بھی اسی مقام پر ہے۔

پشتونوں کے چمنستان سخن اور ادبستان شعر و قلم میں امیر حمزہ شنواری کے کلام کے مجموعوں کا اضافہ پشتو زبان و ادب کے فروغ کے لئے ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔ امیر حمزہ خان شنواری پشتونوں کے لئے ایک مایہ ناز شخصیت کے حامل شاعر بے بدل ثابت ہوئے ہیں۔ آپ پشتون زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت کے جیتے جاگتے نمائندے ہیں۔ مزاجاً فقیر طبع اور روحانی اور اہل تصوف بزرگوں کی صحبت سے فیض یافتہ انسان تھے۔ پشاور کی عظیم روحانی بزرگ ہستی حضرت عبدالستار باچا سے روحانی رشتہ تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ امیر حمزہ خان شنواری حضرت عبدالستار باچا کے انتقال کے بعد ان کے مزار سے وابستہ ہو کر حلقہ مزار بن گئے تھے اور زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے مزار سے وابستہ رہے۔

امیر حمزہ خان شنواری کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں پشتو کے عظیم نقاد اور نثر نگار ایاز داؤدزئی کا کہنا ہے کہ حمزہ شنواری ایک ترقی پسند مسلمان، ترقی پسند پٹھان اور ترقی پسند صوفی منش انسان تھے۔ تصوف کے ساتھ ان کا تعلق محض عقلی حیثیت سے نہیں تھا بلکہ عملاً بھی ان کا تصوف سے تعلق تھا۔

عبدالغنی خان: پشاور کے ضلع چارسدہ کے گاؤں اتمانزئی کے معروف سیاسی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بناء پر نوجوانی کے ابتدائی دور میں سیاسی زینے کی سیڑھی پر قدم رکھا مگر سیاسی معاملات کے پر پیچ و ناخوشگوار حالات و واقعات کی وجہ سے انہوں نے سیاست سے گریز اختیار کیا۔ اگرچہ جب آتش جوانی عروج پر تھی تو اپنے سیاسی گھرانے کے ماحول سے بے اعتنا نہ رہے اور انہوں نے ''پختون زلمے'' کے نام پر پختون نوجوانوں کو یکجا کیا اور اپنے والد کی سرخپوش تحریک اور ہندوستان کی ہندو نیشنلسٹ پارٹی' کانگرس کے زیر سایہ پختون زلمے کے قافلے کے امیر قافلہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے لئے میدان سیاست میں مسلم لیگ سے نظری بعد و تضاد کی بناء پر بہت سے مسائل پیدا ہوئے جس سے عبدالغنی خان نے اپنے لئے جو راہ منتخب کی وہ سیاست سے ہٹ کر سخن و شعر اور فنون لطیفہ کی جولا نگاہ میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا مثبت، نتیجہ خیز اور شخصیت ساز راہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے فن مصوری اور پشتو زبان میں شاعری کو عروج تک پہنچانے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو

استعمال کیا جو ان کی شخصیت کے لئے مقبول اور پسندیدہ شغل ثابت ہوا۔

اگر چہ ادب اور شاعری کا ذوق ان میں بچپن ہی سے تھا اور انہوں نے بقول غنی خان بحوالہ کتاب ''پہ خپل شکل سرگندیگم'' تیرہ چودہ سال کی عمر میں ''جینگلو مینگلو'' کتاب لکھی جس میں ان کی ابتدائی دور کی شاعری ہے۔

عبدالغنی خان وجدانی شاعری کے قائل بھی ہیں اور انہوں نے وجدانی شاعری کی بھی جو کہ ایک قدرتی اور فطری طریقہ اظہار ہے۔

عبدالغنی خان کی شاعری جن انسانی اقدار و جمالیات کا احاطہ کرتی ہے اس کا اظہار انہوں نے اپنے ان شعری مجموعوں میں کیا ہے ''د پنجری دغار' 'دغنی پلوشے' پانوس' 'دغنی کلیات''۔

جبکہ انہوں نے اردو میں جو نثری کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے ''گڈے وڈے'' یہ ایک طنز نگاری کی نثری کتاب ہے۔

عبدالغنی خان شاعری کے علاوہ ایک معروف مصور اور نقاش و سنگتراش بھی تھے اور اس فن میں انہوں نے کمال مہارت حاصل کی تھی۔ انہوں نے یورپی اور ایشیائی تہذیب کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے دونوں تہذیبوں کے بارے میں جستہ جستہ اظہار کیا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں میں پشتون گلوکاروں کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شاعری عوام تک پہنچتی ہے تو ایک تاثراتی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ کانوں کو بھلی لگتی ہے اور دلوں پر اثر کرتی ہے ان کی شاعری میں جام و مینا اور مے کا اظہار ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری کو مطلقاً عوامی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ عبدالغنی خان دسمبر 1914ء میں قد آور سیاسی اور قومی شخصیت خان عبدالغفار خان کے ہاں پیدا ہوئے اور 16 مارچ 1996ء میں وفات پائی۔ عبدالغنی خان پشتو قوم کے ادبی اور نثری سرمائے کے فروغ کے قابل قدر نمائندہ تھے۔

اجمل خٹک: ایک معتبر نام جو کہ صوبہ سرحد کی تاریخ کی پیشانی پر جگمگانے والا ایسا قد آور اور روشن نشان ہے جس کی زندگی کا اکثر حصہ سیاست کے میدان میں حرکت پذیر نظر آتا ہے مگر اجمل خٹک کی سیاسی زندگی کے پس منظر میں ان کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے متعلق جب پردہ کشائی کی جاتی ہے تو صوبہ سرحد کی ادبی، علمی اور ثقافتی قد آور شخصیتوں میں یہ درجہ اولیٰ اپنی ذات میں سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظریاتی سیاست کے فروغ میں انہوں نے جو بیباکانہ کردار ادا کیا ہے اس کے پیچھے بھی ان کا علمی اور فکری ذخیرہ مخفی و مستور ہے۔ ناقابل فراموش بزرگ ہستی اجمل خٹک کا تعلق ضلع نوشہرہ کے علاقے اکوڑہ خٹک سے ہے۔ عہد حاضر کے پشتون و غیر پشتون شعراء اور ادباء انہیں دائرہ عزت و احترام سے کسی بھی صورت میں باہر نہیں رکھتے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تخلیقی صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں ان کا اظہار انہوں نے علم و ادب اور شعر و سخن کے میدان میں رہ کر کیا ہے۔ زیادہ تر رجحان پشتو زبان و ادب کے فروغ سے متعلق ہے اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ پشتو میں ہے۔ یہ منظوم کلام کہنے کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ زندگی کے ہر موضوع' ادب' تاریخ و ثقافت' فلسفہ و تصوف سے متعلق انہیں لکھنے میں ملکہ حاصل رہا ہے۔ سیاست میں ایک خاص نظریہ رکھنے کے باوجود عام انسانی رویوں اور ادبی حیثیت میں آفاقی انسان کے طور پر زندگی کی سانسیں لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبانی تخصیص یعنی پشتو زبان سے قبائلی اور علاقائی تعلق رکھنے کے باوجود اردو میں بھی کچھ غزلیات کہی ہیں۔ اجمل خٹک، خٹک قبیلے کی جس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں وہ خان خیل خٹک ہے۔ خان خیل خٹک خوشحال خان خٹک کی اولاد کو قرار دیا گیا ہے۔

اجمل خٹک کی صحافتی زندگی کا دور 1948ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ پشتو کے نامور شاعر سمندر خان سمندر' کی وساطت سے ریڈیو پاکستان پشاور سٹیشن پہنچے اور پھر انہیں سکرپٹ رائیٹر کی حیثیت سے وہاں لے لیا گیا۔

اجمل خٹک ریڈیو پاکستان پشاور میں سکرپٹ لکھنے پر مامور ہو گئے۔ ہر مہینے دو ڈرامے' خطوں کے جواب اور پشتو گانے لکھنے تھے، بعد میں ان کی کاوشوں سے ریڈیو پاکستان پشاور کے لئے پشتو کے گلوکاروں کو جمع کیا گیا جن میں خواتین اور مرد گلوکار شامل ہیں۔ ان میں بنوں کی گلنار بیگم' احمد خان، بادشاہ زرین جان اور سبز علی خان ان کی دریافت ہیں جو کہ پشتو ٹپوں میں گلوکاری کرنے والے گلوکار تھے۔

اجمل خٹک ریڈیو کے لئے میوزیکل فیچر لکھتے تھے۔ اجمل خٹک پشتو کے نامور ڈرامہ نگاروں میں بھی مقبول لکھنے والے ہیں۔ ریڈیو پر ان کا پہلا ڈرامہ ''انتقام'' نشر ہوا۔ انہوں نے پشتون معاشرے اور ثقافت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادبی رجحانات کی بھی اپنے ڈراموں میں نمائندگی کی۔

اجمل خٹک کے شعری مجموعوں میں ان کی شاعری کا مجموعہ ''د غیرت چغہ'' شاعری کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں پشتون قومیت کے اظہار کے علاوہ فنی اور موضوعاتی مٹھاس بھی ہے۔

ان کے مجموعہ جات میں ''غیرت چغہ'' کے علاوہ دیگر مجموعہ کلام یہ ہیں ''با تورتہ عقیدت'' ''دوقت چغہ'' ''گلونہ تکلونہ'' ''خوندرنگ'' اور ''گل پرھر''۔

قید و بند کے زمانے کی یادداشتوں پر مبنی پشتو میں نثری کتاب ''دازہ پاگل

دوم'' اپنے ہمعصر شعراء کے کلام کے فکری رجحانات کے بارے میں فنی دریافتوں پر مشتمل کتاب ''ژوند اور فن'' قابل مطالعہ کتاب ہے۔ اخباری کالموں پر مشتمل کتاب کا نام ''کچکول'' ہے۔ اردو میں جو شاعری کی اس کے مجموعہ کا نام ہے ''جلا وطن کی شاعری''۔ ''سری غونچی'' ادبی مقالہ کا نام ہے اور ''دافغان ننگ'' بعض زندگی کے کرداروں کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے سے متعلق افسانوی طرز تحریر ہے۔ اجمل خٹک ہمارے پشتو ادب اور شعر کے فروغ میں ایک متحرک کردار ہیں جن کی فکری اور عملی کاوشوں پر ہر آنے والا محقق ادیب اور مورخ انہیں خراج تحسین پیش کرتا رہے گا۔

اجمل خٹک' اکوڑہ خٹک میں خوشحال خان خٹک کے قبیلے میں 1925ء میں حکمت خان کے ہاں پیدا ہوئے۔

عبداللہ جان اسیر: پشتو زبان وادب سے تعلق رکھنے والے رفقاء باد پاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بچپن ہی سے شعروادب کی طرف رجحان تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے انہیں شعر کہنے کی خداداد صلاحیت ودیعت ہوئی۔

ہمعصر اساتذہ شعراء نے انہیں فارسی کی بجائے پشتو میں طبع آزمائی کا مشورہ دیا تو اس کے بعد پشتو میں شعر کہنے لگے۔ اگرچہ تعلیم کے میدان میں یہ پیچھے رہے اور ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ تعلیمی سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے تاہم معلّمی کے پیشے کو اختیار کرنے کے لئے ضروری تربیتی کورس مکمل کر کے سکول میں استاد ہوگئے۔ تحریک آزادی کے دنوں میں خدائی خدمت گار تحریک میں شامل ہوگئے اور اس طرح انہوں نے پشتون قوم میں آزادی کی لہر دوڑانے کے لئے انقلابی شعر کہے۔

انہیں اپنے ادبی اور قلمی سفر میں صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی معاونت بھی حاصل رہی۔ بعد میں کچھ ایسے سیاسی حالات رونما ہوئے کہ انہوں نے خدائی خدمت گار تحریک سے استعفیٰ دے دیا اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر شب و روز تحریک پاکستان کے لئے کام کرنے لگے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کے مشورے سے دہلی چلے گئے اور وہاں تحریک پاکستان کے لئے خدمات انجام دینے لگے۔ اسی دوران آل انڈیا ریڈیو دہلی میں شعبہ خبر سے منسلک ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ لاہور آ گئے اور پھر 1949ء میں کراچی ریڈیو سٹیشن کے پشتو شعبہ خبر سے جڑ گئے اور پھر سماجی فلاح و بہبود سے متعلق دیہی ایڈ پروگرام میں افسر تعلقات عامہ مقرر ہوگئے۔ 1961ء میں عبداللہ جان اسیر کو سنٹرل پبلک سروس کمیشن میں ایڈیٹر منتخب کر لیا گیا۔ انہوں نے محکمہ ٹرائبل پبلسٹی آرگنائزیشن کوئٹہ سے پشتو ماہنامہ ''اولس'' جاری کیا۔ 1962ء میں ان کا تبادلہ پشاور ہوگیا اور ''جمہور اسلام ماہنامہ'' کے ایڈیٹر ہوگئے۔ 1965ء میں یہ ملازمت سے ریٹائرڈ ہوگئے۔ عبداللہ جان اسیر ایک اچھے قلمکار' ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگار بھی تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''دسپرلی گل'' اور دوسرا شعری مجموعہ ''وزڑہ قطرے'' ہے۔ جبکہ پشتو ڈرامہ کی مشہور کتاب ''درس عبرت'' ہے۔ اور اردو ناول ''امیر علی ٹھگ'' اور ''زمین سے نیچون تک'' ہے۔ انہوں نے 13 نومبر 1978ء میں وفات پائی۔

قلندر مہمند: پشتون اہل قلم میں ایک پراثر اور جادوئی شخصیت کے حامل قلندر مہمند نہ صرف پشتون اہل قلم کے لئے بلکہ پشتو' اردو اور ہندکو تمام اہل قلم کے لئے محترم و معظم مقام رکھنے والے نثر نگار اور شاعر تھے۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے پشتون اہل قلم میں ایک ممتاز منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ ان کا اصل نام حبیب الرحمٰن اور والد کا نام سیف الرحمٰن صاحبزادہ ہے۔ قلندر ان کا تخلص ہے اور مہمند ان کی قومی اور قبائلی نسبت ہے۔

یکم ستمبر 1930ء کو بازید خیل گاؤں میں پیدا ہوئے' مہمندوں کی شاخ علی زئی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایم۔اے انگریزی اور ایل۔ایل۔بی تھے۔ پشتو فاضل اور منشی فاضل کے امتحان پاس کئے۔ ان کی تصانیف و تالیفات کی تعداد بارہ ہے۔ جن میں ان کی شاعری کا مجموعہ ''سباؤن'' شامل ہے۔ جبکہ دیگر کتابوں میں ابوالقاسم' خیبر البیان کا تنقیدی مطالعہ' ارسطو نظموں کی تشریح ہیں۔ پٹہ خزانہ فی المیزان' درحمان بابا کلیات' دمحمد قدر' سندی لوبہ او ادب' دزکی قبضہ وغیرہ مشہور ہیں۔

ان کا گراں قدر تحقیقی کارنامہ پشتو لغت کی ترتیب ہے جو کہ ''دریاب'' کے نام سے ہے۔ اسی طرح ''دقصہ خوانے گپ'' کے نام سے بھی ایک کتاب ہے۔ ان ادبی اور علمی کارناموں کے علاوہ صحافت میں بھی قلندر مہمند ید طولیٰ رکھتے تھے اور بطور ایڈیٹر بھی کام کیا۔ آپ کالم نویسی اور اداریہ نویسی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور روزنامہ مشرق' روزنامہ شہباز' انقلاب اور خیبر میل میں بھی صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔

انہوں نے 73 سال کی عمر میں 4 فروری 2003ء کو وفات پائی۔

ہمیش خلیل: پشتو ادب اور ثقافتی سرگرمیوں میں ہمیش خلیل کا پشتون اہل قلم میں ایک درخشاں مقام ہے۔ آپ ایک ہوشمند ذہن و دماغ کے حامل بزرگ لکھاری ہیں۔ ہمیش خلیل صاحب نے قدیم لوگوں کے ادبی ذخائر کو جمع کرنے اور ان کی تحریروں کو منظوم شکل دے کر طبع کرنے کا جو نیا انداز اختیار کیا اسے پشتو ادب میں

ایک بہت بڑا اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمیش خلیل پشتو کے ایک معروف ادیب و شاعر اور لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ عہد شباب میں صوبہ سرحد کی مخصوص سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ انہوں نے قومی پختون پارٹی جو بعد میں خدائی خدمتگار یا سرخپوش کے نام سے متعارف ہوئی کے پلیٹ فارم سے سیاست میں حصہ لیا۔ اگرچہ ان کی زندگی اور فن کے بارے میں پشتو میں ایک کتاب معروف لکھاری حنیف خلیل نے ان کی زندگی ہی میں مرتب کی ہے اور ان کے ہمعصر پشتون ادیبوں اور قلمکاروں کے ان کے بارے میں خیالات و افکار کو بھی جمع کیا ہے جو بہت کم کسی اہل قلم' ادیب' شاعر' افسانہ نگار کی زندگی میں ہوا ہے۔ ہمیش خلیل کے مطابق وہ 11 اپریل 1930ء میں تہکال بالا پشاور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان کے علاقے جلال آباد کے پاس مرزا خیل قوم کی آبادی سے تھا جو کہ نقل مکانی کر کے پشاور کے نزدیک گاؤں تہکال بالا میں آ کر آباد ہو گئے۔ مرزا خیل مہمند قبیلے کی ایک شاخ ہے۔ اس لحاظ سے ہمیش خلیل کا تعلق مہمند قبیلے سے ہے۔ ان کا اصل نام ہمیش گل تھا اور شاعری میں بھی یہ ہمیش ہی تخلص استعمال کرتے تھے۔ ہمیش گل صوابی کے بھی ایک لکھاری اور ادیب کا نام تھا جو اس نام سے مضامین لکھتا تھا۔ چنانچہ اس نام کی مناسبت سے لوگوں میں الجھن پیدا ہونے لگی اور یہ امتیاز مشکل ہو گیا کہ یہ مضامین کس ہمیش گل کے ہیں۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لئے انہوں نے اپنا نام بدل کر ہمیش خلیل رکھ لیا۔

ہمیش خلیل نے زندگی کے ابتدائی دور میں سرکاری ملازمت بھی اختیار کی مگر سرکاری ملازمت کو اپنی ادبی سرگرمیوں کی راہ میں ایک رکاوٹ جان کر ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور پھر ایک ہفتہ وار رسالے جمہوریت کے ایڈیٹر ہو گئے۔ بعد میں اپنا ہفتہ وار رسالہ ''دوران'' جاری کیا اور نصر اللہ خان نصر کی معیت میں دارالتصنیف کے نام سے ادارہ قائم کر لیا۔ اس ادارے کے زیر اثر انہوں نے نامور ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں کے نایاب قلمی نسخے دریافت کر کے انہیں قابل اشاعت بنایا اور ان کے بارے میں تحقیقی کام کو وسعت دی۔ بقول ہمیش خلیل انہوں نے بارہ کلاسیکی دیوان دریافت کئے۔ انہوں نے فارسی زبان کے نسخے ''اخلاق نامہ'' کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے بنج گنج کے ایک نسخے ''نان حق'' کا بھی فارسی سے پشتو میں منظوم ترجمہ کیا۔ خوشحال خان خٹک کے سوات نامہ میں اسی (80) اشعار کا اضافہ کیا۔ افضل خان خٹک کا نثری قلمی نسخہ ''باز نامہ'' دریافت کر کے اس قلمی نسخے کی طباعت کی۔ اشرف خان کے ''ہجری'' کے فارسی دیوان کی دریافت کی اور اسے کتابی شکل میں ترتیب دے کر قابل اشاعت بنایا۔ پشتو کے قدیم شاعر بیدل کے دیوان کی طباعت کی۔ غرضیکہ یہ پہلے پشتون محقق ہیں جنہوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ قدیم پشتون اہل قلم اور اہل دیوان کے قلمی نسخے دریافت کئے اور انہیں مناسب حال اضافتوں اور مقدموں کے ساتھ قابل اشاعت بنایا۔

ہمیش خلیل کے اپنے اشعار کے مجموعے ''نغمہ زار'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کے مجموعہ کلام میں ''سندرے او خابونہ اور خاردنہ'' ہے قدیم اور جدید شعراء پر انہوں نے ''تذکیرہ'' دو جلدوں میں مکمل کی۔ افسانوں کے مجموعوں میں ''چہار گل'' مشہور کتاب ہے۔ اس وقت پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کے زیر انتظام پشتو کے چہار بیتوں کی تالیف کر رہے ہیں۔ انہیں ان کی ادبی اور قلمی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔

ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک: پشاور یونیورسٹی میں پشتو اکیڈیمی کے چیئرمین راج ولی شاہ خٹک کا تعلق پشاور ریجن کے معروف پٹھان قبیلے اکوڑہ خٹک سے ہے اور چراٹ کی برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں بسائی جانے والی بستی ڈاک اسماعیل خیل کے رہائشی ہیں۔ پشتو زبان و ادب کے علاوہ اردو اور انگریزی زبان و ادب میں بھی اچھی مہارت رکھنے والے خٹک پٹھان ہیں۔ شائستگی و متانت اور میل ملاپ ان کی طبعی خصوصیات میں نمایاں ہیں۔ پٹھانوں کے شجرہ نسب کے بارے میں متعدد تحقیقی مقالے ان کی گرانقدر خدمت ہے۔ راج ولی خٹک کا حلقہ اثر کئی جہتوں میں بکھرا ہے۔ حکومتی عہدے اور ذاتی قبائلی تعلق کی بناء پر پشتو زبان و ادب کے فروغ سے متعلق خدمات انجام دینے کے علاوہ غیر پشتون لوگوں سے بھی ان کے دوستانہ مراسم ہیں۔ اس بناء پر ان کی شخصیت نے ہر دلعزیزی کا مقام حاصل کیا ہوا ہے۔ رواداری و ملنساری کے مخصوص تہذیبی رویئے نے انہیں معین دائروں سے باہر نکال کر آفاقی انسان بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نسلی اور لغوی امتیازات کی قید سے آزاد ہو کر ہر صاحب علم و ادب اور تاریخ و ثقافت کے بارے میں لکھنے اور پڑھنے والے شخص کو قدر و منزلت کے مقام سے باہر نہیں رکھتے۔ اس امتیازی خو بو رکھنے کی وجہ سے ہر علمی و ادبی محفل میں ان کی شرکت یقینی ہوتی ہے۔

راج ولی خٹک کی جنم بھومی خٹک قبیلے کا مسکن ڈاک اسماعیل خیل ہے اور قدیم شاہ کے ہاں 24 جنوری 1952ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پشتو میں 1977ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر 1985ء میں پشاور یونیورسٹی سے ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے پشتو زبان و ادب اور صوبہ سرحد کے ثقافتی و تاریخی موضوعات پر تقریباً دس کتب لکھی ہیں جبکہ

متعدد تخلیقی اور تحقیقی نوعیت کے مقالہ جات سپرد قلم کئے اور مختلف حکومتی اور غیر حکومتی تعلیمی و ادبی تنظیموں اور اداروں سے ایوارڈ حاصل کئے۔

محترمہ زیتون بانو: پشاور کے پختون گھرانے سے تعلق رکھنے والی محترمہ زیتون بانو ایک ایسی قابل احترام خاتون اہل قلم ہیں جنہیں صوبہ سرحد کے ادبی اور ثقافتی ادارے بجا طور پر عزت کا مقام دیتے ہیں۔ آپ ایک بزرگ اہل قلم خاتون ہیں جو نئے لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ ایک بہترین ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، مقالہ نگار، ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ پشتو ان کی مادری زبان ہے۔ ادبی اظہار کے لئے انہوں نے پشتو زبان کو ذریعہ بنانے کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی قلمی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے شوہر تاج سعید مرحوم بذات خود ایک نامور اہل قلم اور معروف ادیب تھے جن کا تعلق ساری زندگی میڈیا سے رہا ہے۔ وہ ریڈیو پاکستان پشاور میں سکرپٹ رائٹر تھے۔ ادب پاروں کی تخلیق میں ان دونوں کی ادبی اور قلمی مساعی قدر و منزلت کی حامل ہے۔ محترمہ زیتون بانو پشاور میں 12 جون 1938ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی مطبوعہ نگارشات میں، ''ہندارہ'' (پشتو)، ''مات بنگڑی'' (پشتو)، ''جوندے غمونہ'' پشتو)، ''خوبونہ'' (پشتو)، ''کچکول'' (ڈرامہ)، ''شیشم کا پتا'' (اردو)، ''زندہ دکھ'' (اردو)، ''وقت کی دہلیز'' (اردو)، ''برگ'' (اردو)، ''مہتابہ'' (زیر طبع)، ''آئینہ اور چہرے'' (ڈرامے) اور، ''برگد کا سایہ'' (افسانے) زیر اشاعت ہیں۔

پشاور کے نامور مصور و خطاط

تہذیبی، ثقافتی ورثوں میں مصوری اور خطاطی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جب اور جہاں بھی ثقافتی ورثوں سے متعلق ذخیروں کی دریافت ممکن ہوئی ہے اس میں مصوری اور خطاطی کے فن پاروں اور نادر قلمی نسخوں اور مخطوطات کو اولیت کا درجہ حاصل رہا۔ دنیا کے ہر خطے میں ثقافتی ورثے کی قدر و قیمت بڑھانے میں مصوروں کے فن پاروں اور خوش نویسوں کے خطاطی پر مبنی نسخوں کا بہت عمل دخل رہا ہے۔ پشاور کی سرزمین جہاں ہنر و فن کے دیگر ماہرین کے لئے موزوں اور مناسب خطہ ثابت ہوئی ہے وہیں اس میں ایسی شخصیات نے جنم لیا ہے جو آج بھی ایسے نادر زمانہ مصور موجود ہیں جو قد آور بین الاقوامی شخصیات کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان چند شخصیتوں میں ایک لازوال قدر و قیمت کی حامل شخصیت گل جی کی ہے۔

گل جی: پشاور کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ فن مصوری میں قدرت و کمال رکھنے والی اس بین الاقوامی شخصیت گل جی کی جنم بھومی سرزمین پشاور ہے۔ گل جی نے اپنے فن مصوری کو اوج کمال تک پہنچا کر جو عالمی شہرت حاصل کی ہے، بہت کم لوگوں کے حصے میں اس طرح کی شہرت آتی ہے۔ گل جی کا اصلی نام عبدالحمید اسمٰعیل ہے۔ گل جی کے نام سے شہرت پائی اور دنیا اب انہیں گل جی کے نام سے ہی جانتی ہے۔ پشاور میں 1926ء میں پیدا ہوئے، یہ فن انہیں موروثی طور پر منتقل ہوا ہے کیونکہ گل جی کے دادا یہاں کے نامور پینٹر تھے اور گل جی کے والد انجینئر تھے۔ گل جی نے ابتدائی سکول تک تعلیم پشاور میں ہی حاصل کی۔ بعد میں اعلےٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں عظیم درسگاہ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں سے بی۔ ایس۔ سی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ 1947ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی (ہائیڈرالک) کیا اور پھر 1948ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی (سائل مکینک) کورس مکمل کیا۔ 1950ء میں سٹاک ہوم (سویڈن) سے ڈیزائن انجینئرنگ کی اور پھر یونائیٹڈ نیشن اکنامک ڈویژن میں بطور انجینئر ملازمت اختیار کی۔ بعد میں اٹاوا (کینیڈا) کے پاکستانی سفارت خانے میں فرسٹ سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1953ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر سنٹرل انجینئرنگ اتھارٹی حکومت پاکستان مقرر ہوئے اور منگلا ڈیم اور ورسک ڈیم کی تعمیر میں مشیر انجینئر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ ورسک ڈیم میں ہی ان کی بنائی ہوئی تصاویر کی پہلی نمائش کا انعقاد ہوا جو نہایت ہی کامیاب اور نتیجہ خیز نمائش ثابت ہوئی اور اس نمائش سے ہی گل جی کی مصوری سے متعلق فنکارانہ صلاحیتوں کا بہتر طور پر علم ہوا اور اس طرح گل جی کے اندر چھپے ہوئے فنکار کی پردہ کشائی ہوئی۔

گل جی کی بنائی ہوئی تصاویر کی دوسری نمائش 1957ء میں نیاگرا فال کینڈا میں ہوئی۔ 1957ء میں ہی انہوں نے کابل کے بادشاہ ظاہر شاہ کے خاندان کی تصاویر بنائیں اور 1965ء میں ایران کی ملکہ فرح دیبا پہلوی ولی عہد اور شہزادی کی تصاویر بنائیں۔ صدر امریکہ آنجہانی رچرڈ نکسن کے دورہ پاکستان کے موقع پر ان کی مختلف تقریبات کے حوالے سے تصاویر بنائیں اور 1969ء میں جاپان کے صدر مقام ٹوکیو میں منعقدہ بین الاقوامی نمائش EXPO-70 میں گل جی کے فن پاروں کی نمائش ہوئی۔

1970ء میں ان کو اپنے فن میں کمال مہارت حاصل کرنے پر صدارتی

تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ 1975ء میں گل جی نے سعودی عرب کے شاہ فیصل بن عبدالعزیز کی تصویر ''موزیک ورک'' میں بنائی جو قیمتی اور نادر پتھروں سے مزین تھی۔ 1974ء میں پاکستان کے تاریخی اور ثقافتی شہر لاہور میں منعقد ہونے والی پہلی مسلم کانفرنس کا خوبصورت و جاذب مونوگرام ڈیزائن کیا۔

1982ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں ستارہ پاکستان سے نوازا گیا۔ 1988ء میں گل جی نے پہلی کل پاکستان تصویری نمائش 87ء منعقدہ کراچی میں قائداعظم ایوارڈ حاصل کیا۔ 1993ء میں انہیں انٹرنیشنل روٹری ایوارڈ دیا گیا۔ 1994ء میں اسلامی تنظیم ECO کی جانب سے بیسٹ آرٹسٹ آف دی مسلم ورلڈ کا گرانقدر اور عظیم المرتبت ایوارڈ دیا گیا۔ 1995ء میں گل جی کو حکومت پاکستان کی جانب سے ہلال امتیاز کا اعزاز دیا گیا۔

محمد شریف جانباز: پشاور کے اساتذہ آرٹسٹوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مصوری اور خطاطی کے حوالے سے انہیں پشاور کا نامور خطاط اور مصور تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے بزرگوں کا تعلق مہمند قبیلے کی ایک شاخ یوسف خیل سے تھا۔ محمد شریف جانباز 1912ء میں تحصیل گورگٹھڑی سے متصل علاقے محلہ شاہ معصوم میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حاجی محمد ظریف تھا۔ ان کے اسلاف افغانستان سے ہجرت کر کے پشاور آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ محمد شریف جانباز نے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 سے مڈل تک کی تعلیم حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس سکول میں یگانہ روزگار اور عالم اسلام کی نابغہ شخصیت علامہ عنایت اللہ خان المشرقی پرنسپل تعینات تھے اور پشاور ہی میں انہوں نے نیم عسکری تنظیم خاکسار تحریک کے نام سے شروع کی۔ جب خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی گئی تو علامہ مشرقی کے بہت سے شاگرد اس منظم تحریک میں شامل ہو کر غلبہ اسلام کے موقف کی بنیاد پر اپنے اندر عسکری نظم و ضبط پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ محمد شریف جانباز بھی بحیثیت نوجوان علامہ صاحب کی اس تحریک میں بھرپور طور پر شامل ہو گئے۔ ان کے ولولے اور جذبے کو دیکھتے ہوئے علامہ مشرقی نے انہیں جانباز یعنی جان لڑا دینے والے کا خطاب دیا جو کہ بعد میں ان کے نام کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔ ان کے والد انقلاب روس کے بعد کافی عرصہ تک پشاور کے دیگر تاجروں کے ہمراہ بخارا جیل میں قید رہے۔ والد جب رہا ہو کر واپس پشاور آئے تو انہوں نے جانباز کو بمبئی بھجوا دیا جہاں وہ ایک تجارتی فرم میں بطور منشی کام کرنے لگے۔ بمبئی کی آب و ہوا ان کی صحت کے لئے موافق نہ تھی جس کی وجہ سے ان کی صحت پر برے اثرات مرتب ہونے لگے۔ ایسی صورتحال میں والد نے انہیں پشاور بلوا لیا۔ یہاں آ کر انہوں نے ڈرائیونگ سیکھ لی اور معروف کانگرسی لیڈر مہر چند کھنہ کے ہاں ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ بعد میں انہیں بمبئی کی یادیں ستانے لگیں تو دوبارہ بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد لاہور چلے آئے۔ یہاں انہوں نے فرنیچر کی پالش کا کام سیکھا اور پھر میکلوڈ روڈ پر ایک فرنیچر کے کارخانے میں ملازم ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات لاہور کے باصلاحیت اہل فن کشن لعل نامور پینٹر سے ہوئی اور ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ کشن لعل سے مصوری کا فن سیکھنے کے بعد پشاور چلے آئے اور یہاں ایک دکان لے کر سائن بورڈ، پورٹریٹ اور بینرز بنانے لگے۔ بعد میں سینما روڈ پر انہوں نے تھیٹر کے پردے اور فلموں کے بورڈز سہگل آرٹ پریس کے نام سے بنانے شروع کر دیئے۔ سہگل ان کے ایک شاگرد کا نام تھا جس سے ان کی بے پناہ شفقت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کاروبار کا نام بھی سہگل آرٹ پریس ہی رکھا۔ فن مصوری میں کمال حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مشہور زمانہ مصور جیکل مائیکل کی شاگردی اختیار کی۔ فن کو کمال اوج تک پہنچانے کے بعد پشاور کے مختلف سینماؤں میں ملازمت اختیار کر لی جہاں فلموں کے رنگین پوسٹرز ڈیزائن کرتے تھے۔ 1945ء میں ان کو اصفہانی ٹی کمپنی کے سائن بورڈز اور ہورڈنگز بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اس کام میں انہوں نے بڑی محنت اور دیانت کا ثبوت دیا۔ مختلف اخبارات میں تصاویر کی چھپائی کے لئے بلاک بھی بناتے رہے۔ 1956ء میں مقامی آرٹسٹوں کی ایک نمائش کے موقع پر ان کی بنی ہوئی دو تصاویر پر انہیں انعام دیا گیا۔ محمد شریف جانباز کے متعدد شاگرد رہے ہیں جنہوں نے اس فن میں بڑی سبقت حاصل کی اور نام کمایا۔ آپ نے 25 مئی 1997ء کو پشاور میں انتقال فرمایا۔

پروفیسر شفیع صابر: پشاور کے پڑھے لکھے اور اہل قلم لوگوں میں جانی پہچانی شخصیت کے حامل پروفیسر شفیع صابر پشاور میں 1920ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام میاں امام الدین تھا جو کہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ ان کا تعلق صوبہ پنجاب سے تھا۔ 1850ء میں میاں امام الدین نے پنجاب سے ہجرت کی اور پشاور چھاؤنی میں آ کر کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔ پروفیسر شفیع ان کے فرزند تھے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فن خطاطی کے ماہر اساتذہ ایم ایم جمیل اور ایم ایم شریف سے خطاطی کی تربیت حاصل کی۔ یہ ابتداء میں مختلف اخبارات و رسائل میں کاتب کی حیثیت سے کتابت کرتے رہے اور پھر 1942ء میں اپنے ہفت روزہ ''فلمی دنیا'' کا اجراء کیا۔

The Walled City of PESHAWAR, NWFP, Pakistan

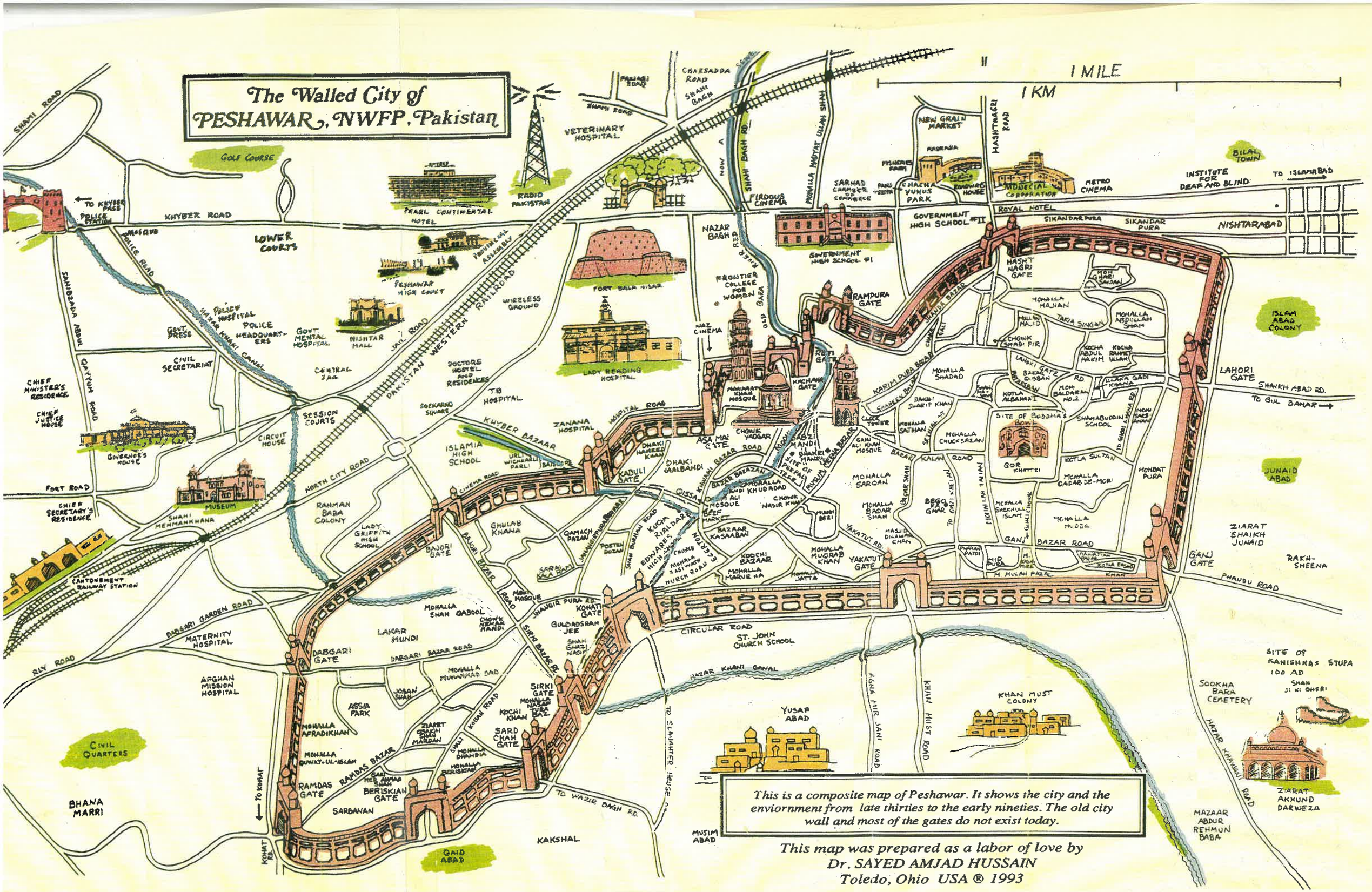

This is a composite map of Peshawar. It shows the city and the enviornment from late thirties to the early nineties. The old city wall and most of the gates do not exist today.

This map was prepared as a labor of love by
Dr. SAYED AMJAD HUSSAIN
Toledo, Ohio USA ® 1993

انہوں نے منشی فاضل، ادیب فاضل اور پشتو آنرز کے بعد بی۔اے کے امتحانات پاس کئے اور پھر ایم۔اے انگریزی اور ایم۔اے اردو کے امتحانات امتیازی حیثیت کے ساتھ پاس کر کے گولڈ میڈل حاصل کئے اور 1950ء میں انہوں نے پہلا نجی تعلیمی ادارہ فارورڈ سکول اینڈ کالج کے نام سے شروع کیا جو نہایت ہی کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ پشاور و مضافات کے متعدد طلباء نے یہاں سے علم حاصل کیا اور یہاں سے تعلیم پا کر اعلےٰ امتحانات پاس کرنے کے اہل ہوئے۔ انہوں نے متعدد مقالہ جات لکھے اور پھر صوبہ سرحد کی نامور شخصیات سے متعلق ایک جامع کتاب مرتب کی جو ان کا ایک بہت بڑا قلمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''تاریخ صوبہ سرحد'' مرتب کی۔ بزرگان سلف میں سے حضرت پیر بابا کی کتابوں پر انہیں اباسین آرٹس کونسل کی طرف سے انعام دیا گیا۔ حیات محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بہادر شاہ ظفر، داستان خیبر، قائداعظم اور صوبہ سرحد، سفرنامہ حج و زیارات بھی ان کے عظیم قلمی اور تحقیقی کارنامے ہیں۔ ان کا طویل علالت کے بعد 9 اگست 2005ء کو انتقال ہوا۔

ایم ایم شریف آرٹسٹ: پشاور کے معروف سینما روڈ پر ایک قدیم دکان ایم ایم شریف آرٹسٹ کے نام سے موسوم ہے۔ ایم ایم شریف ایک ایسا نام ہے جو کہ خطاطی اور مصوری کے حوالے سے معتبر سمجھا جاتا ہے۔ ایم ایم شریف ایک قد آور، بذلہ سنج، سخنوروں کے دوست اور ایسے جی دار فنکار تھے جن کے فنی شاہکار آج تک لوگوں میں پسندیدہ اور مقبول حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ایسے خطاط تھے جنہوں نے اپنے ہاتھ سے کتابت کے ایسے نادر نمونے تیار کئے جو بعد میں ایک کتاب کی صورت میں ''ید بیضا'' کے نام سے متعارف ہوئے اور اب یہ کتاب اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے عملی مشق کا ایک ذریعہ بن گئی ہے۔ ایم ایم شریف، راولپنڈی میں محمد عبداللہ کے گھر 1901ء میں پیدا ہوئے۔ خاندانی تعلق راجپوت خاندان کی شاخ منہاس سے تھا۔ خوشنویسی کا فن سیکھنے کے لئے مولوی محمد سلطان خوش نویس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ یہ دور 1918ء کا تھا۔ جب اس فن پر مکمل عبور حاصل کر لیا تو پھر لاہور منتقل ہوئے جہاں ابتدا میں دین محمدی پریس اور بعد میں گیلانی پریس میں بطور کاتب کام شروع کیا۔ ان کے فرزند کے مطابق 1929ء میں یہ پشاور منتقل ہوئے۔ پشاور میں ان کی آمد کا سبب ان کی خرابی صحت تھی۔ انہیں تپ دق کا مرض لاحق ہو گیا تو ڈاکٹروں نے تبدیلی ہوا کا مشورہ دیا۔ چنانچہ چند روز کے لئے پشاور آ گئے۔ یہاں کی آب و ہوا ان کی صحت کے لئے موافق اور خوشگوار ثابت ہوئی تو پھر اسی شہر کے باسی ہو گئے۔

پشاور آ کر انہوں نے بمقام جنگی محلہ سرائے ہری جگن میں اشرف آرٹ پریس کے نام سے اپنا پریس شروع کیا۔

1944ء میں انہوں نے سینما روڈ پر ایک دکان لے لی اور وہاں کتابت و خطاطی کا کام شروع کیا۔ 1948ء میں پشاور میں قائداعظم کی آمد پر انہوں نے قائد کو خوشنویس یونین کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا۔ بہت سی نامور ادبی، فنی اور حکومتی شخصیات کی طرف سے ان کے فن پاروں کو پذیرائی حاصل رہی۔ انہوں نے 23 جنوری 1999ء کو طویل علالت کے بعد 78 سال کی عمر میں وفات پائی۔

صاحبزادہ فضل ودود: پشاور کے مغرب میں موجودہ خیبر اور یونیورسٹی روڈ کے دائیں جانب تہکال بالا گاؤں میں 1914ء میں صاحبزادہ صاحب پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی جمعہ خان تھا جو کہ علاقے کے ایک جید اور باعمل عالم دین کے طور پر متعارف تھے۔ صاحبزادہ فضل ودود نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد میں اعلےٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے غورغشتی ہزارہ چلے گئے۔ وہاں نامور علماء دین سے تعلیم حاصل کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر مدون علوم اسلامیہ میں کمال حاصل کیا۔ 1938ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پشتو آنرز کیا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو اپنے علاقے تہکال بالا کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے لگے۔ انہیں خوشنویسی کا شوق پیدا ہوا تو موضع سوڈیزئی کے معروف خوشنویس مولانا محمد عمر کے ہاں شاگردی اختیار کی اور جب اس فن میں ید طولیٰ حاصل کر لیا تو پشاور کے معروف کتب خانے ادارہ اشاعت سرحد میں خطاطی شروع کر دی۔ انہوں نے امامت مسجد کے علاوہ ذریعہ معاش کے طور پر ملازمت اختیار کی۔ بعد میں وہ دہلی چلے گئے جہاں نامور ادیبوں اور عالموں سے ملاقاتیں ہوئیں جن سے انہوں نے ادبی میدان میں کام کرنے کی ترغیب پائی اور پھر دیوان عبدالعظیم بابا کو سلیس الفاظ میں معانی و تشریح کے ساتھ مدون کیا۔ پھر وہ دہلی سے فتح پور سیکری چلے گئے جہاں دارالعلوم اسلامیہ فتح پوری سے سند فراغت حاصل کی۔ 1946ء میں دوبارہ پشاور آئے اور پھر 1954ء میں پشاور یونیورسٹی میں جب مولانا عبدالقادر اور اسلم خٹک کی مشترکہ کوششوں سے پشتو اکیڈمی قائم ہوئی تو مولانا عبدالقادر نے ان کی فنی مہارتوں سے آگاہی کی بناء پر انہیں پشتو اکیڈمی میں ہیڈ کاتب مقرر کر دیا اور پھر 1974ء میں جب پشتو اکیڈمی سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے تفسیر ودودی کی پشتو میں کتابت کی۔ ان کو بذات خود بھی دینی اور ادبی موضوعات پر لکھنے میں ملکہ حاصل

تھا اس لئے مشہور عصری مجلوں میں ان کے دینی اور ادبی موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان مشہور مضامین میں سید جمال الدین افغانی اور سید احمد شہید کے بارے میں مضامین بھی شامل ہیں جو کہ پشتو مضامین میں شامل نصاب رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کیا اور ان کی اچھی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کے تین بیٹے ڈاکٹر فضل ودود، انجینئر، لطف الودود اور احسان الودود ہیں۔ صاحبزادہ فضل ودود نے ہمیشہ محنت مزدوری کر کے رزق حلال کمایا اور بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور نگہداشت کی۔ صاحبزادہ صاحب کا انتقال 30 مارچ 1983ء کو اپنے گاؤں تہکال بالا میں ہوا۔

صاحبزادہ فضل محمود: صاحبزادہ فضل محمود، صاحبزادہ فضل ودود کے برادر خورد تھے۔ آپ بھی اپنے گاؤں تہکال بالا کے محلہ حسن خیل میں 1916ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح ابتدائی تعلیم اپنے والد جمعہ خان سے حاصل کی اور پھر مولانا محمد عمر سے خوشنویسی کی تعلیم حاصل کی۔ اچھے خوشنویس ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے سرگرم رکن بھی رہے۔ ابتداء میں خدائی خدمت گار تحریک سے وابستہ ہوئے اور کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ 1941ء میں جبکہ ان کے بھائی دہلی میں تھے، صاحبزادہ فضل محمود بھی اپنے بھائی کے پاس دہلی چلے گئے جہاں پشتو جریدے ''نن پرون'' میں بطور کاتب کام کیا۔ 1946ء میں پشاور واپس آ گئے اور پشاور میں مختلف جرائد اور کتابوں کی کتابت کی۔ انہوں نے ایک پریس میں بطور کاتب کام شروع کیا مگر ایک بیماری کے سبب فن کتابت کو ترک کرنا پڑا اور کاروبار کی طرف متوجہ ہوئے۔ صاحبزادہ فضل محمود نے 14 اکتوبر 1993ء کو وفات پائی۔

حسن ہمدانی: گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول جسے اب گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول نمبر 3 کہا جاتا ہے، حسن ہمدانی صاحب وہاں ڈرائنگ ماسٹر کی حیثیت سے اس وقت تعینات ہوئے جب وہ لاہور میں استاد اللہ بخش سے آرٹ حاصل کر کے پشاور پہنچے۔ حسن ہمدانی پشاور میں 1910ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید نبی حسن تھا۔ سید نبی حسن کی رہائش گاہ لاہور کے موچی دروازہ میں تھی۔ ان کا آبائی پیشہ آسٹریلیا میں اونٹوں کی تجارت تھی۔ بعد میں سید نبی حسن ہمدانی بیسویں صدی کے اوائل ہی میں لاہور سے پشاور آ کر مقیم ہو گئے اور ڈھکی نعلبندی قصہ خوانی بازار میں رہنے لگے۔ حسن ہمدانی کی عمر نو برس کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے تعلیم کی طرف توجہ دی اور ابتدائی تعلیم پشاور میں ہی حاصل کی، بعد میں بمبئی چلے گئے اور آرٹ کے معروف ادارے جے جے سکول آف آرٹ سے ڈرائنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا اور پھر اسی فن میں عملی تعلیم لاہور میں استاد اللہ بخش سے حاصل کی۔

بلیک اینڈ وائٹ فلموں کو برش سے رنگین کرنے کا ابتدائی تجربہ ان سے ہی رائج ہوا۔ یہ نیل ڈرائینگ میں بڑے ماہر سمجھے گئے ہیں۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن سے تصویریں بنایا کرتے تھے اور اس فن میں کوئی دوسرا شخص ان کا ثانی نہیں تھا۔ آپ لیف (Leaf) آرٹ میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے سوات کے جہانزیب کالج میں بھی بطور ڈرائینگ ماسٹر کام کیا اور والی سوات میاں جہانزیب کا پورٹریٹ بنایا اور اُن سے انعام حاصل کیا۔ پھر 1958ء میں خیبر میڈیکل کالج میں بطور ماڈل آرٹسٹ خدمات دیتے رہے۔ 1963ء میں یہاں سے ریٹائر ہو کر کھاریاں اور وہاں سے شیخوپورہ چلے گئے جہاں 1972ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

معتبر روحانی اور علمی شخصیات

حاجی صاحب ترنگزئی: صوبہ سرحد کی معروف ہر دلعزیز بزرگ روحانی شخصیت حاجی صاحب ترنگزئی کی روحانی طاقت کے زیر اثر انگریزوں کے تسلط سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی خاطر صوبے کے ہر حصے سے لوگ ان کے حلقے میں شامل ہوئے۔ بہت سے وہ لوگ جو تحریک آزادی یا تحریک پاکستان میں شریک تھے، ان سے انٹرویو کے دوران حاجی صاحب کے بارے میں گراں قدر معلومات ملیں۔

حاجی صاحب ترنگزئی کا تعلق ضلع چارسدہ کے ایک گاؤں ترنگزئی سے ہے اسی لئے آپ اپنے گاؤں کی نسبت سے حاجی صاحب ترنگزئی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کا اصلی نام فضل واحد تھا اور لقب فخر المجاہدین شیخ الافاغنہ تھا۔ ان کا نسبی سلسلہ اسی موضع ترنگزئی کے پیروں سے تھا جو کہ پیر بودلہ کی نسل میں سے تھے۔ حاجی صاحب ترنگزئی 1848ء میں ترنگزئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم کے بعد حضرت اخون سوات صاحب کے خلیفہ حضرت نجم الدین صاحب المعروف ہڈہ ملا صاحب کی خدمت میں بمقام چمرکنڈ حاضر ہوئے اور وہاں ان کے روحانی حلقے میں داخل ہو کر ان کے مرید ہوئے اور بہت عرصہ یہاں ٹھہر کر مجاہدات و مراقبات کر کے سلوک کی منازل طے کیں اور ساتھ ہی اپنے پیر و مرشد کے ساتھ مل کر فرنگیوں کے خلاف جہاد میں مصروف ہوئے۔ پیر و مرشد کی وفات کے بعد آپ نے اپنے گاؤں ترنگزئی میں سلسلہ رشد و ہدایت شروع کیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ آ کر آپ سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے لگے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے روحانی تعلیمات کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے لئے لوگوں میں جذبہ

پیدا کرنے کی خاطر مختلف دیہاتوں اور علاقوں کا دورہ کیا اور دینی مدارس کی بنیاد رکھی۔ بہت سے علماء کرام آپ کی تحریک میں شامل ہوئے۔ انگریز حکومت نے حاجی صاحب کی اس دینی تحریک کو اپنے لئے زبردست خطرے کا باعث سمجھا اور 1910ء میں آپ کو بمعہ ساتھیوں کے گرفتار کر لیا۔ بعد میں حاجی صاحب ترنگزئی کو تو ضمانت پر رہا کر دیا مگر دیگر ساتھیوں کو تین تین سال کی قید کا حکم سنا دیا۔ اس اذیت ناک کیفیت کا حاجی صاحب ترنگزئی نے استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنے دینی، روحانی اور آزادی کے نصب العین کے حصول کے لئے کوششیں جاری رکھیں۔ روز بروز آپ کی سرکردگی میں منزل مقصود کی جانب رواں دواں رہنے والے قافلہ حریت میں لوگوں کا اضافہ ہوتا رہا جس سے انگریز حکومت بہت زیادہ پریشان ہوئی تو انگریزوں نے حاجی صاحب کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری کر دیئے۔ جب حاجی صاحب ترنگزئی کو انگریزوں کے اس اقدام کی خبر ہوئی تو آپ اپنے تین بیٹوں اور بعض وفادار ساتھیوں کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں سے علاقہ غیر مہمند قبائل کی پہاڑیوں کی طرف کوچ کر گئے۔ جب انگریزوں کو آپ کی علاقہ غیر کی طرف ہجرت کرنے کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کا تعاقب کیا مگر حاجی صاحب اور ان کے خاندان کے لوگ اور رفقاء ان کی دسترس سے نکل چکے تھے جس پر انہوں نے طیش میں آ کر حاجی صاحب ترنگزئی کی تعمیر کردہ مسجد کی دیواروں کو شہید کر دیا اور آپ کی زمین کو نیلام کر دیا۔ ادھر حاجی صاحب نے ہجرت کے بعد تمام آزاد قبائل میں اپنا روحانی اثر و نفوذ بڑھایا جس کی وجہ سے آزاد قبائل کے بہت سے علماء اور ملک و خوانین آپ کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں آپ بونیر سے نکل کر سوات آ گئے مگر وہاں آپ نے اپنی تحریک کے لئے فضا کو غیر موافق سمجھا اس لئے آپ دیر کے علاقے کی طرف چلے گئے۔ وہاں نواب دیر نے رسماً آؤ بھگت کی مگر انگریزوں کے خلاف آمادہ بہ جہاد ہونے سے معذوری ظاہر کر دی جس کے بعد آپ اور آپ کے ساتھی علاقہ غیر مہمندوں کے علاقے میں چلے گئے اور وہاں چرکنڈ میں مجاہد آباد کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔ اس مقام سے آپ نے قبائل کی طرف مختلف وفود بھیجے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریک کو مضبوط کرنے کیلئے منصوبہ بندی کی۔ اس معاملے میں آپؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے پیر و مرشد حضرت ہڈہ صاحب کے روحانی تعلق داروں اور خلفاء کو دعوت نامے لکھے۔ جن اصحاب کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے دعوت نامے بھیجے ان کے اسما گرامی یہ ہیں: ملا صاحب چکنور، ملا صاحب تگاؤ، ملا صاحب ماکڑہ، ملا صاحب سرکائی، بادشاہ صاحب اسلام پور اور استاد صاحب ہڈہ شریف۔ ان تمام نے آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ ان کے علاوہ مہمند قبائل کے قبیلے موسیٰ خیل صافی، کوڈاخیل، قندھاری، علیم زئی اور ترک زئی کے سردار بھی آپ کی دعوت پر مجاہد آباد پہنچ گئے۔ یہاں ان علماء اور قبائلی سرداروں نے حاجی صاحب کی تحریک میں بھرپور حصہ لینے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ حاجی صاحب مہمندوں میں مستقل سکونت اختیار کریں اور آپ کو مکمل یقین دہانی کروائی کہ وہ ہر حال میں انگریزوں کے خلاف تحریک میں حصہ لیں گے اور حاجی صاحب کو اپنے کردار سے مایوس نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں حاجی صاحب اور ان قبائل و مشائخ کے درمیان وفا نبھانے کے لئے ایک تحریری معاہدہ بھی ہوا اور پھر اس معاہدے کی روشنی میں حاجی صاحب غازی آباد میں مقیم ہو گئے۔ غازی آباد کا قدیم نام سرخ کمر ہے جو ایک خشک پہاڑی کا نام ہے۔ اس پہاڑ کے تین اطراف میں بلند و بالا پہاڑ ہیں اور صرف ایک چشمہ تھا مگر جب حاجی صاحب ترنگزئی یہاں پر مستقل مقیم ہوئے تو حاجی صاحب اور ان کے ساتھیوں کے مجاہدانہ اور اخلاص پر مبنی کردار کی وجہ سے اللہ نے مدد کی اور حاجی صاحب کی دعا سے چشمے کا پانی وافر ہو گیا اور ارد گرد کی زمینیں سیراب ہونے لگیں۔ اس مقام پر حاجی صاحب کی انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے بند باندھنے کے لئے انگریزوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق قبائل کے مابین پھوٹ ڈالنے کے لئے سازشیں کیں مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ انگریزوں نے ایک دوسری چال یہ چلی کہ 1926ء میں مہمندوں کے علاقے میں سڑکیں تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ترنگزئی نے قبائل کو اکٹھا کیا اور انہیں انگریز کی اس نئی چال کے پس منظر سے آگاہ کیا۔ قبائل نے حاجی صاحب کے ساتھ انگریزوں کے خلاف اٹھائے جانے والے ہر قدم پر ان کی حمایت کا عہد و پیمان کیا۔ ادھر انگریز بھی غافل نہ تھے۔ اس سے پہلے کہ مسلمان مجاہدین ان پر حملہ آور ہوں انہوں نے خود مسلمان مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ 1927ء میں ہوا۔ اس حملے کی تاب نہ لا کر کئی قبائل نے انگریزوں کے پاس آ کر پناہ لی اور پھر چار سال تک یہ جھڑپیں جاری رہیں۔ 23 اپریل 1930ء میں پشاور کے بازار قصہ خوانی میں نہتے مسلمانوں پر انگریزوں نے گولی چلا دی جس کے نتیجے میں متعدد مسلمان شہید ہوئے اور کئی زخمی ہو گئے۔ آخر کار انگریز ایک معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس معاہدے کے تحت یہ شرائط طے پائیں کہ حکومت برطانیہ ایسا کوئی اقدام نہ اٹھائے گی جس سے یہ شک پیدا ہو کہ برطانیہ اس علاقے پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی ہے اور حاجی صاحب کے پیروکار حکومت برطانیہ کے حمایتیوں سے کوئی تعرض نہیں کریں گے مگر انگریز حکومت اپنے وعدے پر قائم نہ رہی اور 1932ء میں پھر سڑک کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس پر حاجی صاحب نے بادشاہ گل صاحب کی زیر

قیادت پندرہ سو مجاہدین کا لشکر تیار کیا۔ انگریزوں نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے اپنا توپ خانہ اور مسلح دستے روانہ کر دیئے۔ مجاہدین اور انگریز دستوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی اور انگریز صلح پر مجبور ہو گئے اور پھر اس شرط پر معاہدہ ہو گیا کہ انگریز سڑک تعمیر نہیں کریں گے مگر انگریزوں نے سڑک کی تعمیر کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور پھر معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 1935ء کے بجٹ میں منصوبے کی منظوری کے لئے مرکزی اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش کر دیا۔ ڈاکٹر خان صاحب مرحوم نے اس منصوبے کی مخالفت کی اور بھاری اکثریت کے ساتھ یہ منصوبہ نامنظور ہوا مگر اسمبلی کی کارروائی سے بالا بالا وائسرائے نے خصوصی طور پر اپنے اختیارات استعمال کر کے سڑک کی تعمیر کے منصوبے کی منظوری دی۔ اس پر حاجی صاحب نے مجاہدین کا ایک بھاری لشکر تیار کیا اور ان کے بیٹے بادشاہ گل کی قیادت میں لشکر انگریزوں کے خلاف نکل پڑا۔ اس لشکر میں بہت سے علاقوں سے مجاہدین شامل ہوئے۔ بادشاہ گل لشکر کو لے کر دریائے سواتی کو عبور کر کے آگرہ پہنچ گیا اور انگریزوں کو کھڑپہ کی سڑک تعمیر کرنے سے روک دیا۔ کھڑپہ کے مقام پر انگریزوں سے جھڑپ بھی ہوئی اور بہت سے مسلمان یہاں شہید ہوئے مگر انہوں نے اپنی ہمت کو برقرار رکھا اور انگریزوں کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل سے باز رکھا۔ غرضیکہ حاجی صاحب ترنگزئی اور ان کے مجاہدین ساری عمر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر برسرپیکار رہے اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کی راہ میں دیوار بنے رہے۔

آخر کار یہ مجاہد اعظم اور سرفروشی کے جذبے سے سرشار زیرک انسان 10 شوال 1356ھ بمطابق 16 دسمبر 1937ء کو بروز منگل بمقام غازی آباد وصال پا گیا۔

مولانا سید فضل صمدانی: سکھوں کے اختیار و اقتدار کے دور میں ان کے خاندان کے کچھ لوگ سرحد میں آ کر آباد ہو گئے۔ سرحد کے وہ افغان قبائل جن کی اسلام اور سادات خاندان سے عقیدت منفرد مقام رکھتی ہے انہوں نے اپنی اس دینی حمیت اور سادات دوستی کی بناء پر اس خاندان کے ان افراد کی بڑی پذیرائی کی جو نقل مکانی کر کے سرحد میں آ کر آباد ہوئے۔ بنوری خاندان کے ان افراد نے اپنے مقام و مرتبے کے مطابق سرحد میں تبلیغ و ارشاد کا کام جاری رکھا اور جاہلانہ رسوم و رواج کی بیخ کنی کے لئے اپنی دینی سرگرمیوں اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی خاندان کے کچھ لوگ کوہاٹ میں اور کچھ پشاور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ مولانا فضل صمدانی مرحوم کی رہائش گاہ پشاور کے علاقہ بھانہ ماڑی میں تھی جو آج تک قائم و دائم ہے۔

بقول سید فاروق بنوری ان کے والد سید فضل صمدانی 1886ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام فضل ربانی ہے۔ بچپن ہی سے علوم دینیہ کی طرف راغب ہوئے اور مولانا شاہ رسول، مولانا غازی الدین اور قاری دلاور سے اکتساب علم کیا اور پھر 1341ھ کے بعد اپنے مدرسے دارالعلوم رفیع الاسلام کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ دور تھا کہ جس میں دینی علوم کے مدارس کا قیام انتہائی جان جوکھوں کا کام تھا۔ چنانچہ دارالعلوم رفیع الاسلام میں حصول علم کی تڑپ رکھنے والے طلباء بڑی رغبت سے حصول علوم دینیہ میں مشغول ہو گئے۔ اس مدرسے کے اپنے قواعد و ضوابط اور نظم و نسق تھے۔ ہر طالب علم کے لئے لازم تھا کہ وہ مدرسے کے ضوابط اور نظم و نسق کی پابندی کرے۔ مدرسہ رفیع الاسلام کے طلباء کا لباس دوران درس سفید قمیض و شلوار اور سیاہ شیروانی اور سرخ ترکی ٹوپی ہوتا تھا۔ یہ لباس وضع و قطع دارالعلوم رفیع الاسلام کی پہچان تھی۔ اس مدرسے سے بڑے جید اور نامور علماء نے اکتساب علم کیا اور یہاں سے فراغت پائی۔ مولانا سید فضل صمدانی سیاسی نظریئے میں مسلم لیگ کے ہمنوا تھے۔ ابتداء میں وہ جمعیت العلمائے ہند کے سرکردہ زعماء میں سے متحرک شخصیت کے حامل تھے۔ وہ صوبائی سطح پر جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران انہوں نے سیاست میں دینی روایات کی تابندگی کے لئے ہمہ وقت جدوجہد کی جس کی وجہ سے مذہب و سیاست دونوں میں ان کی شخصیت میں انفرادیت پیدا ہونے لگی۔ قدرت نے انہیں گہری بصیرت اور پیچیدہ معاملات کو سلجھانے کا لازوال ملکہ عطا کیا ہوا تھا۔ دینی حمیت کی بناء پر ہی انہوں نے کسی بھی موقع پر ہندو سیاست سے سمجھوتا نہیں کیا۔ چنانچہ جب امروہہ میں جمعیت العلمائے ہند کا اجلاس ہوا جس میں کئی علماء نے ہندو کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کا لائحہ عمل بنایا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ مسلمان کبھی بھی مشرک کا ہمنوا نہیں ہو سکتا جمعیت العلمائے ہند سے استعفیٰ دے دیا اور پھر مولانا شبیر احمد عثمانی کی قائم کردہ جمعیت العلمائے اسلام میں شامل ہو گئے اور اس طرح انہوں نے مسلم لیگ کے نظریئے کی پذیرائی کی۔

مولانا سید فضل صمدانی نے اپنے حجرے میں بہت بڑا کتب خانہ اور میوزیم قائم کر رکھا تھا جو آج تک قائم ہے۔ ان کا کتب خانہ مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے بڑے ذخیرے پر مشتمل ہے جبکہ میوزیم میں نایاب نوادرات ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کی بڑی لائبریری میں آج تک اُن کی عطیہ کردہ مطبوعہ اور قلمی کتب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پشاور کے میوزیم میں ان کے ذاتی جمع شدہ نوادرات موجود ہیں۔ اسی طرح

کراچی کے نیشنل میوزیم میں بھی ان کے جمع کردہ قلمی پرانے نسخے اور ظروف موجود ہیں جو انہوں نے ممتاز حسن، سیکرٹری خزانہ کی وساطت سے اس میوزیم کو دیئے۔ انہوں نے 18 دسمبر 1979ء بروز جمعۃ المبارک وفات پائی۔

سید محمد امیر شاہ گیلانی المعروف مولوی جی سرکار (مرحوم):

بزرگانہ طمطراق، درویشانہ بے نیازی اور قلندرانہ مستی رکھنے والے پشاور کے گیلانی سادات گھرانے کے فرزند سید محمد امیر شاہ قادری گیلانی المعروف مولوی جی سرکار اہلیان پشاور کے لئے ایسی دینی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی اوصاف کی حامل شخصیت تھی جن سے پشاور کے امیر و گدا، عالم و تاجر، فقیر و شاہ، مرد و زن کی عقیدتیں وابستہ تھیں۔ آپ نے دینی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق و اصول کے علوم کے حصول کے لئے تندہی سے جدوجہد کی اور پھر ان علوم کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے تا زندگی ہمہ تن مشغول رہے۔ آپ نے دینی علوم سے متعلق جو کتابیں لکھیں ان میں ابتدائی تحقیقی اور قلمی کوششوں ''علماء و مشائخ سرحد'' تین جلدوں پر مشتمل کتب نے بڑی شہرت حاصل کی۔ جبکہ ان کی دوسری کتاب ''حفاظ سرحد'' علمی اور تحقیقی میدان میں مزید اضافہ تھا۔ اہلیان پشاور کے لئے آپ کی ذات ایک سرپرست اور روحانی راہنما کے درجے پر فائز تھی۔ آپ پشاور اور پشاوریوں سے بے پناہ محبت رکھنے والے مخلص اور مشفق انسان تھے۔ پشاور کے لوگوں کے چھوٹے موٹے گھریلو تنازعات کو نمٹانے میں آپ کا کردار پشاوری تہذیب و ثقافت کا ایک نمایاں نشان تھا۔ آپ جو بھی فیصلہ کرتے طرفین کے لئے قابل قبول ہوتا تھا کیونکہ آپ کا فیصلہ غیر جانبداری اور طرفین کے مفادات اور صلح جوئی پر مبنی ہوتا تھا۔ آپ میں ضعیفی اور پیری میں بھی جوانوں کی سی ہمت تھی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا جنازہ پشاور کی تاریخ میں اس عظیم الشان جلوس کا منظر پیش کر رہا تھا جس کی نظیر اس سے پہلے پشاور کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ کی آخری آرامگاہ حضرت سید حسن پیرؒ کے روضہ اقدس کے احاطے میں ہے۔

مولانا مقدار الدین شاکر: عربی، فارسی، اردو اور پشتو کے نامور عالم و فاضل اور ایسی شخصیت کے حامل عالم دین جن کے مزاج و اطوار میں متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شرم و حیا کے ایسے پیکر تھے کہ راستے میں چلتے ہوئے بھی اپنے چہرے کو نقاب پوش رکھتے تھے۔ ذاتی طور پر پشاور ریجن کے ضلع نوشہرہ کے گاؤں کاکا صاحب سے تعلق رکھتے تھے اور نامور دینی اور عرفان و تصوف میں اعلیٰ مقام پر فائز ہستی حضرت رحمکار المعروف کاکا صاحبؒ کے خلفاء کے خاندان سے تعلق رکھنے کی بناء پر انہیں کاکا صاحب کے میانڑوں میں سے بھی سمجھا جاتا تھا۔ پشتو زبان و ادب سے مادری تعلق ہونے کے باوجود اردو میں ایسی روانی اور شائستگی سے گفتگو کرتے کہ لوگ انہیں لکھنؤ کا باشندہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسے دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ ابتدائی دور میں ہندوستان ہی کی کسی جامع مسجد کے خطیب تھے۔ زور خطابت اور محتاط سخنی میں علماء میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ پشاور کے نامور خاندان کی ایک بزرگ ہستی حاجی عبدالمجید انہیں ہندوستان سے پشاور لے کر آئے۔ آپ پشاور کے ایک قدیم محلہ پھوڑ گراں میں چھوٹی سی مگر نہایت ہی تاریخی اور مذہبی ثقافت کی حامل مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے لگے اور مسجد کے ساتھ ہی چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ملک کے نامور عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اس لئے مولانا موصوف جب بھی پشاور تشریف لاتے تو کراچی واپس جانے سے پہلے صبح کا درس قرآن مولانا مقدار الدین کی مسجد پھوڑ گراں میں آ کر دیتے تھے۔ مولانا مقدار الدین پاکیزہ سیرت و کردار کے حامل ایسے سادہ، پشاوری وضعداری اور تہذیب و ثقافت کے حامل عالم دین اور اہل قلم اور زور خطابت رکھنے والے انسان تھے کہ نہ صرف پشاور بلکہ صوبہ سرحد کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے صاحبان علم اور اہل ثروت ان کے سامنے مودب کھڑے رہتے۔ آپ عربی، فارسی اور اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ راقم الحروف کو ایسی باکردار صاحب علم اور اہل قلم وضعدار ہستی کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر کے تفسیر بیضاوی، فقہ کی کتاب ھدایہ اور عربی ادب میں دیوان متنبی اور حماسہ کا درس لیا۔ مولانا مقدار الدین 1920ء میں پیدا ہوئے اور 76 سال کی عمر میں 1996ء میں وفات پائی۔

مولانا نجم الحسن کراروی: پشاور کے اہل تشیع علماء میں مولانا نجم الحسن کراروی کا نام معتبر اور جانا پہچانا ہے۔ آپ قدیم و جدید علوم کے بحر ذخار میں سے تھے۔ عالم باعمل ہونے کے ناطے آپ اہل تشیع اور سنیوں میں یکساں مقبول تھے۔ آپ الہ آباد میں 1919ء میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا اور ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہی حاصل کی۔ مذہبی تعلیم کے حصول کے لئے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں مدرسۃ الواعظین میں مذہبی علوم سے تعلق رکھنے والی کتابیں ازبر کیں۔ اس کے بعد مزید اعلیٰ مذہبی تعلیم کے لئے نجف اشرف چلے گئے اور وہاں سند اجتہاد حاصل کی۔ یہ سند انہوں نے سات سال کی مسلسل محنت سے حاصل کی۔ حصول علم کے بعد آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور تعلیم و تدریس کا پیشہ

اختیار کر لیا۔ جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی تو انہوں نے بھی مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ اور خود مختار مملکت کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اسی دوران جب صوبہ سرحد میں استصواب رائے کی بنیاد پر ریفرنڈم کی نوبت آئی تو مولانا صاحب راجہ صاحب محمود آباد اور قائداعظم کی خواہش پر صوبہ سرحد چلے آئے اور پشاور کو اپنا مرکز بنا کر ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں رائے دہی کی راہ ہموار کرنے کے لئے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور لوگوں کو پاکستان کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ 1947ء میں جب پاکستان وجود میں آ گیا تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل طور پر پشاور میں مقیم ہو گئے۔ انہوں نے یہاں مذہبی علوم کا بنظر غائر مطالعہ جاری رکھا اور شیعہ مسلک کے لوگوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یگانگت کے لئے انہوں نے اتحاد بین المسلمین کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے دینی فہم و ادراک سے کام لیا جس سے بہت حد تک اتحاد بین المسلمین کی فضاء قائم رہی اور بھائی چارے کے جذبے کو فروغ حاصل رہا۔ کوچہ رسالدار میں اہل تشیع کی جامع مسجد میں امامت اور خطابت کے فرائض انجام دینے لگے۔

انہوں نے تقریباً تین سو کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ''چودہ ستارے'' وہ معروف کتاب ہے جو کراچی یونیورسٹی کے علاوہ عالم اسلام کی قدیم درسگاہ جامعۃ الازھر میں بھی شامل نصاب ہے۔ اس کے علاوہ سات جلدوں پر مشتمل ان کی معروف تصنیف ''تاریخ اسلام'' ہے جو کہ دقیق النظر تحقیق پر مبنی ہے۔ ان کی ایک مطبوعہ کتاب ان کی شاعری کا مجموعہ ہے جو ان کے مذہبی رجحانات اور معرفت و سلوک کے روحانی مسلک کی عکاسی کرتی ہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں ان کی دینی اور قلمی خدمات پر ستارہ امتیاز سے نوازا تھا۔ یہ اعزاز انہیں ان کی وفات کے بعد دیا گیا تھا جو کہ ان کے جانشین اور عالم دین فرزند ارجمند مولانا فخر الحسن کراروی نے وصول کیا۔ مولانا نجم الحسن کراروی نے یکم جولائی 1982ء میں وفات پائی۔

مبارک سلطان مرحومہ المعروف ''آپا'': پشاور کی خواتین نے بھی پشاوری تہذیب وثقافت کے احیاء وارتقاء اور مذہبی روایات کی تابندگی کے لئے ایسا ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام زندہ ہے۔ پشاور کی ایسی ہی ایک نامور خاتون مبارک سلطان العروف آپا بھی تھیں۔ خاندان اور علاقے کے تمام لوگ انہیں ''آپا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے گھر کا دروازہ ہر بڑے چھوٹے مرد وزن کے لئے کھلا رہتا۔ آپا مذہبی روایات واقدار کا ایک زندہ نشان تھیں۔ وہ روزانہ دس سپارے تلاوت کرتیں۔ دعاؤں اور خیر و برکت کے حصول کے لئے متعدد لوگ ان کے پاس پہنچتے۔ وہ ہر ایک حاجت مند کے لئے خلوص دل کے ساتھ دعائیں کرتیں، انہوں نے جس کے لئے جو بھی خیر کی تمنا کی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبولیت کا درجہ دیا۔ انہوں نے زندگی میں افلاس وغربت کی تکلیفوں میں رہنے کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے اور اکلوتی بیٹی کی تعلیم وتربیت بہترین اور انوکھے انداز سے کی۔ پشاور کی بعض نامور خواتین خصوصیت کے ساتھ آپا کو اپنی ماں کا سا درجہ دیتی تھیں۔ ان میں ریڈیو پاکستان پشاور کی معروف لکھاری اور سینئر پروڈیوسرز بیدہ عصمت' نامور فلمکارہ اور شاعرہ محترمہ قدسیہ قدسی اور مسلم لیگی خاتون لیڈر محترمہ نگہت سجاد اور کزئی قابل ذکر ہیں جنہیں آپا اپنی بیٹیوں کا سا مقام دیتی تھیں اور یہ بھی ہر مصیبت وتکلیف کے موقع پر آپا کے حضور آتیں اور ان سے دعاؤں کی درخواست کرتیں اور خیر و برکت سمیٹ کر لے جاتیں۔ متعدد نامور جید علماء کرام بھی آپا کے پاس حاضر ہوتے اور دعاؤں کی درخواست کرتے۔ صوبہ سرحد کے جید عالم دین اور پشاور کینٹ کی سنہری جامع مسجد کے خطیب علامہ مقدار الدین شاکر فاضل دیوبند اکثر تشریف لاتے اور آپا سے ملتے جبکہ ملک کے معروف عالم دین اور سکالر ڈاکٹر غلام مرتضےٰ ملک لاہور سے پشاور آ کر آپا جی سے ملنے کے لئے ان کی رہائش گاہ واقع جہانگیر پورہ میں تشریف لائے اور آپا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور دعا کی درخواست کی۔ آپا چند روز بیمار رہیں اور 11 جنوری بمطابق 15 شوال 2001ء شب 4 بجے وفات پائی۔

مزار شریف غازی بابا وڈپگہ: پشاور کی بیرونی بستی بجانب شمال سات کلومیٹر کے فاصلے پر دلہ زاک روڈ پر علاقہ خالصہ کا ایک مشہور سرسبز وشاداب گاؤں وڈپگہ ہے جو بخاری سادات کے گھرانے کی پہچان ہے۔ موضع وڈپگہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پر سولھویں صدی کی معروف برگزیدہ ہستی حضرت غازی بابا رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے، حضرت غازی بابا کا اصلی نام سید فتح محمد شاہ بخاری ہے۔ آپ غازی بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہاں کے بخاری سادات کے بزرگان سلف میں سے ان کے جد امجد ہیں۔ حضرت غازی بابا طریقت وسلوک میں سہروردی سلسلہ سے تعلق رکھنے والے بخاری سید زادے تھے۔

سید فتح محمد شاہ المعروف غازی بابا رحمتہ اللہ علیہ کا شجرہ نسب وطریقت دونوں پندرھویں پشت میں برصغیر پاک وہند کے صوفی عارف باللہ بزرگ حضرت سید جلال الدین بخاری سہروردی المعروف مخدوم جہانیان رحمتہ اللہ علیہ اوچ شریف بہاولپور سے جاملتا ہے۔

آپ وڈپگہ میں 1562ء بمطابق 986ھ میں تشریف لائے اس وقت یہ علاقہ تپہ خالصہ کی ایک چھوٹی سی بستی تھی جو آپ کے دم قدم سے جگمگا اٹھی اور دور دراز سے لوگ بعقیدت یہاں حاضر ہونے لگے، آپ کے روحانی اور عرفانی فیض سے یہ مقام وڈپگہ کے نام سے مشہور ہوا، وڈپگہ کا مطلب عزت وناموس والے لوگ کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ بستی اس سید زادے، صوفی وعارف بزرگ اور ان کے حلقے اور اولاد سے تعلق کی بناء پر وڈپگہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت غازی بابا نے اس مقام پر ستائیس برس تک اس علاقے کو اپنے روحانی فیوض وبرکات سے منور کیا اور اپنے تبلیغی مشن کو جاری رکھتے ہوئے 1589ء بمطابق 1013ھ میں وصال فرمایا، آپ کی قبر مبارک پر ایک عالی شان گنبد تعمیر کیا گیا ہے اور ہر سال ماہ ذی الحجہ کی نوچندی جمعرات کو عرس مبارک ہوتا ہے جس کا اہتمام یہاں کے بخاری سادات کرتے ہیں، اس موقع پر علماء کرام وعظ فرماتے ہیں اور نعت خوان حضرات نعتیہ کلام پیش کرتے ہیں، آپ کے ہاں سات فرزند تولد ہوئے جو کہ سب کے سب حفاظ قرآن اور جامع شریعت اور طریقت تھے۔

مولانا سعید الدین شیر کوٹی: مولانا سعید الدین شیر کوٹی کا بنیادی تعلق ہندوستان کے ضلع بجنور کے قصبہ شیر کوٹ سے ہے اور اسی علاقائی نسبت سے مولانا شیر کوٹی کے نام سے معروف ہیں۔ آپ شیر کوٹ میں 10 جون 1931ء میں مولانا محمد عماد الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے دار العلوم دیوبند میں دینی علوم کا درس لیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد ادریس کاندھوی، قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی اور مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، قابل ذکر ہیں۔ مولانا موصوف نے 1366ھ میں دار العلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی اور فاضل دیوبند بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا صاحب کے والد مولانا محمد عماد الدین کے گھرانے نے ہندوستان سے ہجرت کی کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا، اور پھر 1948ء میں پشاور آ گئے۔ یہاں محلہ جنگی عقب قصہ خوانی بازار سرحد پریس کے نام سے چھاپہ خانہ کا کاروبار شروع کر دیا۔ والد کے ساتھ مولانا سعید الدین شیر کوٹی نے بھی شب و روز محنت کر کے کاروبار کو ترقی دی، اور ساتھ ہی قصہ خوانی بازار کے محلہ ڈھکی نعلبندی میں کتب خانہ انصاریہ کے نام سے کتابوں کا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ مولانا موصوف نے درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا، اردو کے ساتھ علاقائی تعلق کے ساتھ ساتھ معنوی وابستگی بھی تھی اس لئے پشاور کے نوجوانوں میں علوم شرقیہ کے فروغ کیلئے اردو فاضل کی کلاسیں بھی لینا شروع کیں۔

ان کی معروف تصانیف میں ''مخزن بلاغت''، ''فن خطابت''، ''گلدستہ تعلیم الاسلام''، ''تعلیم القرآن'' اور ''بچوں کے لئے اچھی باتیں'' شامل ہیں۔

پشاور کے نامور گلوکار اور قوال

میراں بخش قوال: پشاور شہر کے نامور قوال وگلوکار میراں بخش پشاور کے معروف محلہ ڈوماگلی کے رہنے والے تھے جو اب قصاب محلہ کے نام سے موسوم ہے۔ میراں بخش اپنے عہد کے نامور گلوکار وقوال تھے جنہیں ہندکو، اردو، فارسی، پشتو اور پنجابی زبانوں پر ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے فن کو اُس اوج کمال پر پہنچایا کہ افغانستان کے بادشاہ امیر امان اللہ خان نے گلوکاری اور قوالی میں انہیں پروفیسر کا خطاب دیا۔ میراں بخش پشاور میں سنگیت کی دنیا کے ایک بیش بہا ہیرا تھے جن کا نام آج بھی ہر آنے والے گلوکار کے لئے معتبر ہے۔

نور جہاں اور مس دلاری: پشاور شہر سے تعلق رکھنے والی یہ دو ایسی گلوکارائیں تھیں جن کی آوازیں، پنجاب اور ہندوستان کے تاریخی شہروں یوپی، سی پی، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش میں گونجتی رہی ہیں اور گلوکاری سے تعلق رکھنے والوں کی آوازیں ان کے گائے ہوئے سنگیت سے ہم آہنگ رہی ہیں۔

حاجی عبدالکریم درانی: حاجی عبدالکریم درانی خاندان کا معروف گلوکار تھا جو اپنی آواز میں صدائے بلبل سے ہم آہنگی رکھنے کی بناء پر صوبہ سرحد میں ماسٹر عندلیب کے نام سے مشہور تھا۔ انہیں موسیقی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ یہی شوق انہیں پشاور سے دہلی لے گیا جہاں یہ دہلی کے معروف استاد گائیک تان رس خان کے بیٹے امراؤ خان کے شاگرد ہوئے اور ان سے فن موسیقی کی تمام تانیں ازبر کیں اور اس وقت تک دہلی میں قیام کیا جب تک کہ فن گلوکاری میں کمال حاصل نہیں کر لیا۔ جب فن موسیقی کے تمام اسرار ورموز پر کمال حاصل کر لیا تو پشاور آ گئے اور قصہ خوانی بازار کے محلہ گلفروشاں میں ایک بالا خانہ لے کر اسے مرکز گلوکاری بنا لیا اور ساتھ ہی یہاں آلات موسیقی کا چھوٹا سا کارخانہ بھی قائم کر لیا۔ استاد عبدالکریم درانی کے دو شاگرد گلوکار ہدایت اللہ اور صوبے کے جانے پہچانے موسیقار خالد ملک حیدر ہیں۔ خالد ملک حیدر نے فن موسیقی کے بارے میں بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں جبکہ ہدایت اللہ کو فن موسیقی میں اعلےٰ خدمات پر حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا ہے۔ ہدایت اللہ پشتو، اردو اور ہندکو میں گاتے ہیں۔ ان کے گائے ہوئے سنگیتوں میں ہندکو میں گایا ہوا قصہ خوانی بازار کے بارے میں گانا بہت مشہور ہے

جس کے یہ بول بہت مشہور ہیں "قصہ خوانی دے بازار وچ عجب لہر ہوندی اے"۔

عنایت علی سلطان: علم موسیقی پر عبور رکھنے والوں میں استاد عنایت علی سلطان بھی ایک بڑا نام ہے جنہوں نے گلوکاری اور قوالی میں بڑا نام کمایا۔ انہوں نے علم موسیقی کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے متعدد شاگرد ہیں۔

استاد پشورا خان: استاد پشورا خان موسیقی میں ایک قابل احترام نام ہے۔ یہ ہمہ گیر شخصیت کے حامل اور اپنے فن میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ پشاور شہر کے گھنٹہ گھر بازار میں ان کا بالا خانہ تھا۔ پشاور کے لوگ انہیں خان کے نام سے پکارتے تھے۔ ریڈیو پاکستان پشاور کے نامور گلوکاروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پشورا خان نے کلاسیکل موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے شروع کی بعد میں بھائی لعل خان امرتسر والے سے حاصل کی۔ غزل گانے میں ان کا مقام ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے بیٹوں میں بڑے بیٹے نثار حسین قادری بڑے اچھے طبلہ نواز تھے' اس وقت ان کے بیٹے نجف علی فن گلوکاری میں معروف حیثیت رکھتے ہیں، جو گلوکار ہونے کے علاوہ میوزک ڈائریکٹر بھی ہیں۔

گام قوال: پشاور شہر کے گھنٹہ گھر بازار میں ان کا بالا خانہ تھا۔ اپنے عہد کے ایک منفرد گلوکار اور قوال گزرے ہیں اور پشاور شہر کے لوگوں میں معروف حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے بیٹوں میں غلام رسول گام بھی اچھے اور مشہور قوال گزرے ہیں۔ پشاور کے قدیم گھرانوں میں گام قوال کا نام اب بھی زندہ ہے۔

رفیق شنواری: رفیق شنواری نے پشتو گائیکی کو منفرد انداز دیا۔ انہوں نے زیادہ تر امیر حمزہ شنواری کے پشتو کلام کو پیش کیا ہے۔ رفیق شنواری مرحوم امیر حمزہ خان شنواری کے ساتھ اس لحاظ سے بھی عقیدت رکھتے تھے کہ امیر حمزہ خان شنواری اور رفیق شنواری دونوں ستار باجا کے حلقہ ارادت میں بھی شامل تھے۔ 1947ء سے پشتو سنگیت کی دنیا میں شامل ہوئے اور پھر 1990ء تا دم آخر موسیقی کو کمپوز کرنے میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔

خیال محمد: پشتو گائیکی میں خیال محمد نے جتنی گلوکاری کی ہے غالباً کسی اور نے نہیں کی۔ یہ قدیم و جدید دور کے پشتو غزل گو شاعروں کا کلام گانے میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں طلسماتی عنصر شامل ہے۔ آپ اپنی منفرد آواز و گائکی کی بنا پر پشتو گائیکوں میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں۔

پشاور کے نامور پہلوان

پشاور کا نامور بدمعاش "مچلے وال": معاشروں میں بعض ایسے علامتی نام بھی ہوتے ہیں جن کے پیچھے چھپی ہوئی شخصیت ایسے عجیب المفہوم خصائل سے مرکب ہوتی ہے جو بیک وقت معاشرتی برائیوں اور جرائم کا بھی مجموعہ ہوتی ہیں اور ان بدنامیوں' برائیوں اور جرائم سے جڑی ہوئی خیر خواہیاں بھی ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ اسی نوعیت کی پشاور کی ایک شخصیت جو نیکی اور بدی دونوں اوصاف کی ترجمان ہے وہ ہے پشاور کے نامور پہلوان اور بدمعاشوں میں سے "مچلے وال" پہلوان اور بدمعاش۔ اس کا اصلی نام خدا بخش تھا۔ اس کی دہشت و منہ زوری کی بنا پر لوگ اسے مچلے وال کہتے تھے۔ یہ اپنے وصف بدمعاشی میں اتنا معروف ہو گیا تھا کہ پورے ملک میں اس کا نام پھیل گیا تھا۔ پشاور کے قدیم علاقے چوک شادی پیر کے کوچہ چاچا یونس میں پیدا ہوا تھا۔ بدمعاشوں کے اپنے اڈے ہوتے تھے۔ اس کا اڈہ کریم پورہ میں ایک بالا خانہ تھا۔ جس کے ساتھ اس کا کوئی تصادم ہو جائے اس کی خیر نہیں ہوتی تھی چاہے وہ کتنا ہی با اثر کیوں نہ ہو۔ یہ اتنا طاقتور تھا کہ مدمقابل کا اپنے بازو کے نیچے گلا مروڑ کر اس کا کام تمام کر دیتا تھا۔ اس کے باوجود یہ بہت سے بے نوا لوگوں کے لئے محافظ بھی تھا۔ جو اس کی پناہ میں آ جاتا تھا وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے پشاور کی انتظامیہ بڑی نالاں تھی۔ علاقے کی پولیس کے لئے یہ ایک دردسر بنا ہوا تھا۔ کابلی دروازے کی پولیس چوکی کا سربراہ ایک ہندو تھانیدار تھا جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتا تھا کہ کسی طرح اسے پکڑ کر جیل میں بند کر دے۔ اگرچہ مچلے وال متعدد مرتبہ جیل بھی گیا مگر اس کے خلاف کوئی شخص گواہی دینے کو اپنی موت کو دعوت دینا سمجھتا تھا۔ اس لئے یہ جیل سے باہر آ جاتا تھا۔ خاطر غزنوی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ یہ ہندو تھانیدار کریم پورہ بازار میں گشت کر رہا تھا، مچلے وال نے اپنے بالا خانے سے اسے آواز دے کر کہا تھانیدار صاحب! یہاں سے کیسے گزر ہو رہا ہے؟ اس نے کہا کہ تجھے دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ مکالمے پر اس نے کہا کہ اگر مجھے دیکھنے کے لئے آئے ہو تو پھر اوپر آؤ تا کہ قہوہ پلاؤں۔ اس پر تھانیدار اوپر بالا خانے پر چڑھ گیا۔ مچلے وال نے اپنے داؤ پیچ سے اس کی گردن دبوچ کر اس کا کام تمام کر دیا اور لاش اوپر سے نیچے پھینک دی۔ انتظامیہ نے اس کے قتل میں مچلے وال کو گرفتار کر لیا اور پھر عدالت کی طرف سے اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا جس پر عملدرآمد کرتے ہوئے اسے پھانسی دے دی گئی

اور یوں یہ کردار ختم ہوگیا۔ یہ ایک ایسا کردار تھا کہ اس پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔ اس کے بارے میں ایک مشہور فلم بنائی گئی تھی جس کا نام تھا "مچلے خان"۔

لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مچلے وال کو پھانسی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ پشاور کے پاگل خانے میں بحالت قیدی فطری موت مرا تھا۔ بزرگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ مچلے وال نے صرف ایک قتل کیا تھا۔ مرنے والے کا نام عمر تھا اور اسے عمرا کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے ایک مرتبہ شراب پی رکھی تھی اور نشے میں دھت ہوکر مچلے وال کو گالیاں دیتے ہوئے قصہ خوانی بازار سے ہوتا ہوا مچلے وال کے بالا خانے کے نیچے پہنچا اور مچلے وال کو گالیاں دیتا رہا۔ مچلے وال اپنے بالا خانے سے اترا اور اپنے مخصوص انداز میں اپنی بانہوں میں اس کی گردن دبوچ کر بالا خانے پر لے گیا اور پھر اس کی گردن مروڑ دی اور لاش کو اوپر سے نیچے پھینک دیا۔ اس پاداش میں مچلے وال کو گرفتار کیا گیا۔ وہ بعد میں پاگل ہونے کی وجہ سے پاگل خانے میں رہا اور یہیں پر مر گیا۔

گل محمد المعروف گلہ تنگڑ: پورا نام پہلوان گل محمد المعروف گلہ تنگڑ۔ علاقہ گنج اندرون چوک میں پیدا ہوا۔ تقریباً سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ علاقے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ پشاور کے بدمعاشوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ پہلوانی میں استاد پہلوان فجہ کے شاگرد تھے اور پہلوانی اور کشتی کے مختلف اور موثر داؤ پیچ ان سے ہی سیکھے تھے۔ استاد فجہ معروف استاد پہلوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ گل محمد اور مچلے وال ان کے معروف شاگردوں میں سے تھے۔ بدمعاشی کے دور میں ان کو بعض للکارنے والوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا جس کی وجہ سے انہیں جیل بھی جانا پڑا اور کئی سال تک جیل کاٹنی پڑی مگر عمر کے سنجیدہ حصے میں انہوں نے اس سے بھی توبہ کر لی تھی اور پھر آخری ایام میں گھر میں گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ آج بھی لوگ انہیں گلہ تنگڑ کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ ان کے بیٹے نذیر احمد اعوان کا کہنا یہ ہے کہ ہماری عمر میں ہمیں یاد نہیں کہ انہوں نے کسی پر کوئی ظلم اور زیادتی کی ہو بلکہ انہوں نے ہمیں بھی پاکیزہ اور اعلیٰ اقدار و روایات کے مطابق زندگی گزارنے کی نصیحت کی۔ وہ ایک خوددار اور بہادر انسان تھے۔

پہلوان پیر بخش: پہلوان پیر بخش محلہ اندرون آسیہ گیٹ پشاور کے نامور پہلوانوں میں سے تھے۔ وہ نہایت ملنسار، خوش اطوار اور خوش پوش و خوش خوراک شخصیت کے مالک تھے۔ ورزش اور کشتی کے ساتھ ان کی وابستگی ساری عمر رہی۔ وہ رہنے والے اندرون آسیہ گیٹ کے تھے مگر کاروباری لحاظ سے ان کی تمام عمر پشاور کے بازار جہانگیر پورہ میں گزری ہے جہاں پہلوان پیر بخش کا گرم حمام بہت مشہور تھا۔ اسی مناسبت سے علاقے کے لوگ انہیں پہلوان سقاوے والا کہتے تھے۔ وہ بزرگ جن کی طبیعت میں مزاح اور فنون لطیفہ کی حس ہوتی تھی وہ ان کے حمام میں طرح طرح کے علمی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر گفتگو اور بحثیں کرتے تھے۔ پہلوان پیر بخش کی ایک اپنی ہی جداگانہ شخصیت تھی۔ وہ ہر ایک سے ان کے مزاج کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی خانگی زندگی میں بڑا مشفقانہ ماحول برقرار رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کو ایسے ماحول سے دور رکھا جو ان کی زندگی میں برے اثرات پیدا کر سکتا ہو۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت نہایت ہی مشفق اور مہربان باپ کی طرح کی ہے اور انہیں اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب رکھا۔

پہلوان پیر بخش کی ثقافتی زندگی کا مخصوص پہلوان کا کشتی لڑنا ہے۔ کشتی پشاور کے لوگوں کا قدیم ثقافتی کھیل ہے۔ اس کھیل میں پیر بخش مرحوم عرف پہلوان سقاوے والا نامور پہلوان گزرے ہیں۔ پہلوان پیر بخش نے 19 مارچ 2005ء کو وفات پائی۔

پشاور کے مزارات

مزار مبارک اصحاب باباؓ: پشاور کے علاقہ داؤدزئی میں موضع چغرمٹی کے مقام پر حضرت سنان بن سلمہ بن محبق ؓ کا مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے جسے لوگ اصحاب باباؓ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت سنان بن سلمہؓ جلیل القدر صحابی رسولؐ پاک اور مجاہدین اسلام کے ساتھ پشاور کے اس مقام چغرمٹی پر ہندو راجاؤں کے ساتھ جنگ کے دوران اسلام کا جھنڈا لہرا کر 66ھ میں شہید ہوئے اور آج جس مقام پر ان کا یہ طویل مقبرہ بنا ہوا ہے یہ درحقیقت کئی اصحاب رسولؐ اور مجاہدین اسلام کا مشترکہ مقبرہ ہے۔ اس لحاظ سے اس مقبرے اور مزار کو بڑی شان و شوکت حاصل ہے کہ جس کے نیچے اتنی مبارک شان و عظمت والی شخصیات مدفون ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو اس مزار پاک سے بڑی عقیدت ہے۔ حضرت سنان بن سلمہ بن محبق جلیل القدر صحابی رسولؐ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و فاضل اور اسلامی لشکر کے تجربہ کار جرنیل و سپاہ سالار تھے۔

جب خراسان کا علاقہ فتح ہوگیا تھا تو حضرت زیادہؓ کو حاکم خراسان مقرر کیا گیا۔ یہ دور حضرت عثمانؓ کا تھا جنہوں نے اسلامی لشکر کو مختلف سمتوں میں روانہ کیا تھا۔ تمام اطراف کے اسلامی لشکروں کے سپاہ سالاروں نے توحید کے پیغام کو چپہ

چپہ تک پہنچانے کی خاطر زندگی اور موت کے مخمصے سے آزاد ہوکر ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است کے نظریئے کے تحت اپنی جائے مولود سے کوسوں دور جا کر توحید کے جھنڈے گاڑے' انہی سپاہ سالاروں میں اسلام کے ایک مجاہد جرنیل حضرت عبداللہ ابن سوارؓ تھے جو قلات کے مقام پر اپنے دیگر مجاہدوں اور غازیوں کے ساتھ شہید ہوئے۔ چنانچہ اس واقعے کے بعد 66ھ میں حاکم خراسان حضرت زیادؓ نے حضرت عبداللہ ابن سوار کے مشن کی تکمیل کی خاطر حضرت سنان بن سلمہ بن محبقؓ کو اسلامی لشکر کا سپاہ سالار بنا کر ہندوستان کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ آپؓ نے سب سے پہلے مکران کے علاقے میں بغاوت کو کچلا اور اسلامی جھنڈا لہرا کر پیشقدمی کی اور کچھ عرصہ کے بعد قلات اور کوئٹہ کا علاقہ فتح کرلیا۔ یہاں پر انہوں نے مضبوط اسلامی حکومت کی بنیادیں رکھیں اور پھر اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے کوہاٹ پہنچے اور کوہاٹ میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد پشاور کی وادی میں داخل ہوئے۔ پشاور کو فتح کرنے کے بعد حضرت سنان بن سلمہ کا اسلامی لشکر علاقہ داؤدزئی میں وارد ہوا اور پغرمٹی کے مقام پر کفار سے خونریز جنگ لڑی اور اسلام کا جھنڈا لہراتے ہوئے حضرت سنان بن سلمہ بن محبقؓ اور ان کے دیگر مجاہدین بڑی تعداد میں شہید ہوئے۔ ان تمام شہداء کو یہاں پر دفن کیا گیا۔ اس مزار کو لوگ مزار اصحاب بابا کے نام سے یاد کرتے ہیں اور بڑی تعداد میں عقیدت مند مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

مزار شاہ ولی قتال: 1001ء سے محمود غزنوی کے حملے برصغیر میں ہندو مہاراجوں اور راجوں کی راجدھانیوں پر شروع ہوگئے تھے۔ سبکتگین کے بعد محمود غزنوی کا پہلا ہدف اس علاقے کے طول وعرض تک پھیلی ہوئی راجہ جے پال کی سلطنت تھی اور اس علاقے میں اسلامی لشکر کے ساتھ بہت سی جلیل القدر ہستیاں آئیں اور اسلامی جذبے سے سرشار ہوکر لڑیں اور جام شہادت نوش کیا۔ انہیں کے جذبہ جہاد و شہادت کی بدولت برصغیر میں اسلامی سلطنت کی نہ مٹنے والی بنیاد رکھی گئی۔ قصہ خوانی بازار کے عقب میں ایک محلہ شاہ ولی قتال کے نام پر ہے۔ یہ محلہ ایک بزرگ کی زیارت گاہ کے نام سے ہی منسوب ہے جسے شاہ ولی قتال کہتے ہیں۔ گرچہ اس بارے میں بڑی تحقیق و جستجو کی لیکن کوئی قابل یقین بات سامنے نہ آسکی البتہ سید امجد حسین بخاری نے اپنی کتاب ''عالم میں انتخاب'' پشاور میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے مطابق جب قصہ خوانی بازار میں دریائے باڑہ بہتا تھا تو یہ مقام اس دریا کا کنارہ تھا اور یہاں پر ان شہداء کی قبریں تھیں۔ بقول سید امجد حسین یہ مقام سیدوں کی قتل گاہ تھی۔

1847ء میں پہلی مرتبہ جب کرنل لارنس نے پشاور کا چارج سنبھالا تو لکھنو سے اپنے ساتھ ترجمان کے طور پر ایک سید زادے کو لائے جن کا نام آغا سید میر جعفر تھا جو فارسی کے مترجم تھے۔ آب وہوا کی موافقت سے یہیں کے ہو رہے۔ انہوں نے اسی مقام پر قیام کیا اور روحانی فیوض و برکات سے لوگوں کو فیضیاب کیا۔ کرنل لارنس جب دوبارہ حاکم پشاور مقرر ہوکر آئے تو آپ کے گرد دائرہ مریدان کا وسیع حلقہ دیکھ کر مراعات سے نوازا۔ سید جعفر شاہ مسلکاً شیعہ تھے لیکن شیعہ سنی دونوں ہی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے 1864ء میں کوچہ گل بادشاہ جی میں ایک امام بارگاہ تعمیر کروائی۔ وفات کے بعد ان کو اسی مقام زیارت شاہ ولی قتال کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ محرم کی آٹھویں تاریخ کو اس مقام پر جلوس آتا تھا اور اسی دن کو ان کا عرس کا دن ٹھہرایا گیا۔ بعد میں یہ جلوس یہاں آنا بند ہوگیا اور پھر انہیں کی قبر کو شاہ ولی قتال کا نام دے دیا جو اب تک چلا آرہا ہے۔

مزار حضرت اخون پنجو باباؒ: موجودہ ضلع نوشہرہ کے شمال مغرب کی جانب ایک قصبہ اکبر پورہ کے نام سے آباد ہے۔ اس کا پرانا نام مصری پورہ تھا۔ یہاں پر جلیل القدر روحانی شخصیت حضرت شیخ عبدالوہاب کا مزار مبارک مرجع خاص وعام ہے۔ حضرت عبدالوہاب شیخ پنجو کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ 937ھ میں پیدا ہوئے اور 1040ھ میں وفات پائی۔ ان کے والد کا نام برہان الدین المعروف سید غازی باباؒ تھا جو کہ سید عبدالمالک ملقب بہ مصحف کے فرزند تھے۔ ان کا شجرہ حضرت امام حسینؓ سے جا کر ملتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حسینی سید تھے۔ ابتداء میں ان کے آباؤ اجداد عرب سے منتقل ہوکر وھکینڈ میں سنبھل کے علاقے میں آباد ہوگئے تھے۔ 936ھ میں جب بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی تو حضرت غازی بابا علاقہ چھچ سے ہوتے ہوئے موضع ترکئی موجودہ ضلع صوابی میں آکر آباد ہوگئے اور یہاں پر انہوں نے ایک جلیل القدر بزرگ دیوانہ بابا کی خالہ سے شادی کرلی۔ یہیں پر ہی شیخ عبدالوہاب المعروف شیخ پنجو پیدا ہوئے۔ جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی تو یوسف زئی قبیلہ کے سردار خان گجوسوری خاندان سے باغی ہوگئے۔ اس وجہ سے غازی بابا نے وہاں سے نقل مکانی کرکے پشاور کی طرف رخ کیا اور پشاور کے قریب ایک دیہات ''چوہا گوجر'' میں پڑاؤ کیا۔ اس وقت ہمایوں کے بھائی کامران نے پشاور پر قبضہ کرلیا تھا۔ حضرت غازی بابا نے اپنے بیٹے عبدالوہاب کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی اور ایک بہت بڑے عالم دین کے سپرد کردیا۔ عبدالوہاب نے ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور وہیکنڈ

میں قیام کر کے حصول علم کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ تعلیم کے بعد وہ واپس چوہا گوجر پشاور آ گئے۔ بعد میں ان کے والد بمعہ اہل خانہ چوہا گوجر سے منتقل ہو کر پشاور میں بالا حصار کے شمال مغرب کی طرف جبہ کے مقام پر آ گئے جہاں آج کل ریڈیو پاکستان پشاور کی عمارت ہے۔ 989ھ میں اسی مقام پر حضرت اخون پنجو کے والد غازی بابا اور ان کی والدہ نے وفات پائی اور بالا حصار کے مغرب کی طرف ان کے مقبرے بنائے گئے۔

مزار حضرت اخوند رویزہؒ: حضرت اخوند رویزہ کا اصلی نام عبد اللہ المعروف اللہ داد تھا۔ اخوند رویزہ ان کا لقب تھا۔ 940ھ میں قصبہ مندیزو میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار جلیل القدر علماء اور نامور روحانی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کا مزار گنج دروازے سے باہر پشاور شہر کے جنوب مشرق کی طرف موضع ہزار خوانی میں ہے۔ ان کی مشہور کتاب 'تذکرۃ الابرار' تاریخی حوالے سے ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم کے مدارج بھی طے کئے تھے اور مشہور و معروف دینی اور روحانی بزرگ حضرت شیخ الاسلام سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ اور کبرویہ میں بیعت کی اور پھر حضرت پیر باباؒ نے انہیں ان سلسلوں میں خلعت خلافت عطا کی۔ تدریس و تعلیم کے پیشے سے منسلک ہونے اور علمی فضیلت کی بناء پر انہیں اخوند صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے والد کا نام گدائی تھا جنہیں اخوند گدائی کہتے تھے۔ حضرت گدائی کے آباؤ اجداد کا تعلق ننگر ہار سے تھا۔ جب یوسف زئی قبیلہ کے لوگ کابل سے براستہ ننگر ہار پشاور اور گرد و نواح میں وارد ہوئے تو حضرت اخوند رویزہ کے دادا جن کا نام سعدی تھا وہ بھی ان کی ہمرکابی میں ننگر ہار سے ''مندیزو'' میں آ کر آباد ہو گئے تھے اور اسی مقام پر حضرت اخوند رویزہ کے والد گدائی پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کے والد منڈیزوی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کی والدہ کا تعلق ننگر ہار کے علاقہ پاپین سے تھا اس لئے ان کا نسبتی نام ننگر ہارے بھی تھا، علاوہ ازیں ننگر ہار کے قصبہ پاپین سے نسبت کی وجہ سے انہیں پاپینے بھی کہا جاتا رہا۔ حضرت اخوند رویزہ نے جن اساتذہ سے علوم ظاہریہ حاصل کیا ان میں سید مصر احمد پاپینے، ملا محمد زنگی، اور ملا سنجر پاپینی زیادہ مشہور ہیں۔ علوم ظاہریہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے علوم باطنی اور تصوف میں بھی کمال حاصل کیا اور ملا سنجر پاپینی کے توسط سے معرفت و سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے سید علی ترمذی المعروف پیر بابا تک رسائی حاصل کی۔ یہ جب حضرت پیر بابا کے پاس پہنچے تو روحانی علوم، طریقت و سلوک کی منازل طے کرنے کی تڑپ نے انہیں بے قرار کیا ہوا تھا۔ جب حضرت پیر بابا نے ان کی یہ بے قراری محسوس کی تو مسکرا دیئے اور پھر فرمایا' شیخ کامل افغاناں گشتہ' یعنی افغانوں کے شیخ کامل بن گئے۔

حضرت پیر بابا نے انہیں تصوف کے موضوع پر بعض مشہور کتب کا درس بھی دیا جن میں سے جام جہاں نما، دیوان انوار المعات' اور سوانح قابل ذکر ہیں۔ آپ نے 1048ھ میں وفات پائی۔

مزار سخی شاہ مردان: یہ مزار علاقہ آسیہ اور رامداس کے وسط میں واقع ہے۔ عام طور پر لوگ اسے مزار عصائے شاہ مردان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا اصلی نام سید ابوالنصر ہے جو مغل بادشاہ ہمایوں کے مرشد تھے اور ہمایوں کے دور ہی میں ان کا انتقال ہوا تو ہمایوں نے ان کا تابوت بطور امانت اپنے محل میں رکھا۔ رات کو ہمایوں کو خواب میں سید ابوالنصر المعروف سخی شاہ مردان آئے اور فرمایا کہ مجھے اس مقام پر دفن کیا جائے جہاں حضرت علی کا نیزہ گڑا ہوا ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ پشاور کے اسی مقام پر یہ نیزہ گڑا ہوا ہے۔ چنانچہ آپ کا تابوت بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس مقام پر لایا گیا اور پھر نیزے کو تابوت کے اوپر رکھ کر اس مقام پر تابوت دفن کر دیا گیا۔ مزار پر ہر سال یوم نوروز 21 مارچ کو صبح کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جھنڈا لہرایا جاتا ہے اور پورے دن جشن کا سا سماں ہوتا ہے، لنگر تقسیم ہوتا ہے اور لوگ یہاں پر نیازیں تقسیم کرتے ہیں۔ اب تک اس مزار کی نگرانی انہی ہاشمی سادات کے پاس ہے جن کے بزرگ اور جد امجد کو مغل بادشاہ ہمایوں نے حکم نامے کے تحت اس مزار کے نظم و نسق پر مامور کیا تھا۔

حضرت شادی پیرؒ: کریم پورہ بازار سے متصل چوک شادی پیر مشہور جگہ ہے اور اسی مقام پر حضرت شادی پیر کا مزار ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپؒ حضرت بری امامؒ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ رجب کے مہینے میں آپ کا عرس ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی شادی نہیں ہوئی ہوتی یہاں آ کر شادی کے لئے دعا کرتے ہیں اور منت مانگتے ہیں اور جب شادی ہو جاتی ہے تو یہاں پر نیاز دیتے ہیں۔

مزار حضرت شیخ حبیب پشاوری: پشاور شہر کے جنوب کی طرف بمقام قدیم سلطان پورہ موجودہ وزیر باغ کے جنوب مغرب کی جانب حضرت شیخ حبیب کا مزار مبارک مدتوں سے مرجع خاص و عام ہے۔ اس مزار کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ مزار کے احاطہ میں متعدد ممتاز ہستیوں کی قبریں ہیں اور آس پاس

ملحقہ قبرستان بھی قبرستان شیخ حبیب کے نام سے موسوم ہے۔ مزار مبارک کے ساتھ ہی قدیم چھوٹی سی مسجد تھی۔ زمانہ حاضر کی تعمیرات کے مطابق وسیع خطے پر مشتمل مسجد تعمیر ہوئی ہے۔

حضرت شیخ حبیبؒ اگرچہ پیدائشی لحاظ سے سرہندی ہیں کیونکہ ان کی ولادت ہندوستان کے شہر سرہند میں 987ھ میں ہوئی۔ چونکہ آخری دور پشاور میں گزرا اور پشاور ہی میں 1093ھ میں وفات پائی اور پھر بخاک پشاور ہی مدفون ہوئے تو اس مناسبت سے پشاوری مشہور ہوئے۔ حضرت شیخ حبیب رحمتہ اللہ علیہ نے صوبہ سرحد کے متعدد علاقوں میں اپنے پیر طریقت کے سلسلہ نقشبندیہ آدمیہ کو پھیلانے میں محنت شاقہ سے کام کیا اور پھر 1093ھ میں آپؒ نے پشاور میں وصال فرمایا۔ حضرت شیخ حبیب پشاوریؒ کا مزار آج بھی مرجع خاص وعام ہے۔

مزار پیر سید حسن گیلانی: حضرت پیر سید حسن گیلانی کا مزار پشاور شہر سے متصل کوہاٹ روڈ پر اس پرانی جرنیلی سڑک پر واقع ہے جو شیر شاہ سوری نے تعمیر کی تھی اور یہی وہ سڑک ہے جہاں سے شاہی قافلے گزر کر دہلی تک جایا کرتے تھے۔ حضرت پیر سید حسن گیلانیؒ کا مزار مرجع خاص وعام ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب چھٹی پشت سے سید عبدالقادر جیلانی (گیلانی) قدس سرہ سے جاملتا ہے۔

آپ کے والد ماجد کا نام سید عبداللہ ہے جو بغداد کے رہنے والے تھے۔ بعد میں نقل مکانی کرتے ہوئے سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں مقیم ہو گئے اور ایک سادات گھرانے میں شادی کر لی اور وہیں پر سید حسن گیلانی کی ولادت ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام محمد فاضل ہے۔

سید حسن گیلانی نے اپنے والد ماجد کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلعت خلافت حاصل کی۔ ان کے خاندان کی روایت ہے کہ بیٹا باپ سے قادریہ سلسلہ میں بیعت کرتا ہے۔

حضرت پیر سید حسن القادریؒ کی تاریخ پیدائش 1023ھ ہے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد کچھ عرصہ ٹھٹھہ ہی میں ذکر وفکر اور عبادت وریاضت اور مراقبات میں گزارا۔ بعد میں اپنے بھائی کی معیت میں ٹھٹھہ سے کاٹھیاواڑ کے علاقے میں تشریف لے آئے اور تبلیغ دین واصلاح اعمال کا سلسلہ شروع کر دیا پھر دہلی اور دہلی سے لاہور تشریف لے آئے اور اس کے بعد 1085ھ سے 1086ھ میں پشاور تشریف لے آئے اور اسی مقام پر جہاں آپ کا مزار مبارک ہے قیام فرمایا۔ جب آپ پشاور تشریف لائے تو پشاور کے ہر حصے میں اولیاء اللہ کا قیام تھا جو مختلف مقامات پر چلہ کشی اور ذکر ومراقبہ میں زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ حضرت پیر سید حسن گیلانیؒ کی شخصیت پاکیزہ اور تقوی سے لبریز تھی۔ سلطان پورہ کے ساتھ نواب محسن خان کا قلعہ کوٹلہ محسن خان تھا۔ یہ علاقہ اب تک کوٹلہ محسن خان کے نام سے مشہور ہے اور آس پاس کی زمینیں نواب محسن خان ہی کی تھیں۔ نواب محسن خان آپ کے تقوی اور پاکیزہ کردار اور علم و معرفت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی بیٹی حضرت پیر حسن گیلانی کے نکاح میں دے دی جس کے بطن سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ان میں سے بڑے فرزند ارجمند کا نام زین العابدین ہے جو علم حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ جوانی ہی میں دونوں فرزند وفات پا گئے۔ حضرت پیر سید حسن گیلانیؒ کی دوسری شادی حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا کی پڑپوتی سے ہوئی۔ اس سیدانی بیوی کے بطن سے بھی دو فرزند پیدا ہوئے ایک حضرت شاہ محمد غوثؒ جن کا مزار مبارک لاہور (پنجاب) میں ہے اور دوسرے شاہ سید معصوم ہیں جو کم سنی میں ہی وفات پا گئے۔

آپ کے مزار کے ساتھ ہی آپ کی بنائی ہوئی مسجد ہے جو قدیم دور سے مسجد سلطان پورہ کے نام سے موسوم ہے۔ مزار کے احاطے سے باہر مشہور تالاب ہے جہاں عقیدت مند آ کر بچوں کو نہلاتے ہیں اور صحت یاب ہوتے ہیں۔ مزار کے احاطے سے باہر عام قبرستان سے متصل ایک خانقاہ ہے جہاں عبدالرقیب المعروف سائیں جرمن کا ڈیرہ ہے۔ سائیں جرمن ایک مست فقیر درویش اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ فقیری مسلک پر قائم ہیں۔

حضرت پیر سید حسن گیلانیؒ نے بروز جمعۃ المبارک 21 ذی القعدہ 1115ھ میں وصال فرمایا۔

مزار حضرت شیخ جنید پشاوریؒ: حضرت شیخ جنیدؒ جو شیخ جنید بابا پشاوری کے نام سے موسوم تھے سلسلہ عالیہ قادریہ کے مشاہیر میں اوپر کے درجہ عرفانی پر فائز تھے۔ اسی لئے آپ کو قطب الاقطاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا مزار پشاور شہر کے مشرق کی طرف موجودہ گنج گیٹ اور لاہور گیٹ کے درمیان بیرونی احاطے میں واقع ہے۔ اب یہ علاقہ آباد ہے اور شیخ آباد کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم زمانے میں شہر کے اس حصہ کو قلعہ تمن کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مزار کے احاطے ہی میں قدیم مسجد تعمیر کروائی گئی تھی۔ اب یہ جامع مسجد ہے اور مزار کے ساتھ ساتھ مسجد کو بھی ازسرنو تعمیر کیا گیا ہے۔ آپ کا لقب شیخ الاسلام شیخ جنید ثانی تھا۔

آپ رجب کی 27 تاریخ 1069ھ میں بمقام حیدر آباد (سندھ) پیدا

ہوئے۔ آپ نے 1103ھ میں شیخ المشائخ میاں عبدالحیٔ المقلب سید حبیب علوی سے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں حیدرآباد کے مقام پر بیعت کی اور اپنے مرشد کی صحبت میں گیارہ سال تک فیض حاصل کیا اور پھر 1114ھ میں خرقہ خلافت حاصل کیا۔ بعد میں اپنے پیر بھائی شیخ احمد داؤدزئی کے ہاتھ پر سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کی۔ اس وقت شیخ احمد داؤدزئی ملتان میں مقیم تھے۔ حضرت شیخ جنیدؒ بعد میں بلوچستان، قندھار، غزنی اور کابل کے راستے پشاور تشریف لائے۔ ان سے پہلے شیخ احمد داؤدزئی پشاور تشریف لا چکے تھے اور ارشاد و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ 1124ھ میں حضرت شیخ احمد داؤدزئی نے جب وفات پائی تو ان کی گدی پر حضرت شیخ جنید پشاوریؒ تشریف فرما ہوئے اور شیخ المشائخ سیر الاعظم محمد یحییٰ المعروف حضرت جی صاحب اٹک سے تجدید بیعت کی اور کئی صاحب المرتبت لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور مرتبہ عالیہ پر فائز ہوئے اور سلسلہ جنیدیہ دور دراز تک پھیلنے لگا اور اب تک ان کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ حضرت شیخ جنید پشاوریؒ عمر کے آخری حصے میں گنج کے علاقہ میں مقیم ہوئے اور اسی مقام پر 28 شوال المکرم جمعۃ المبارک کے دن نماز جمعہ کے بعد وفات پائی۔

مزار مبارک حضرت میاں محمد عمر چمکنیؒ: حضرت میاں محمد عمرؒ کا مزار مبارک پشاور سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر جی۔ ٹی روڈ پر واقع ایک قدیم مضافاتی گاؤں چمکنی میں ہے اور گاؤں کی نسبت سے آپ کا نام گرامی حضرت میاں عمر چمکنی مشہور ہے۔ پختون لوگ اس گاؤں کو پشتو کے رسم الخط میں لکھتے ہیں اور اسی تلفظ کے ساتھ (سمکنی) کہتے ہیں۔ اس گاؤں میں رہنے والے اکابرین اپنے نام کے ساتھ مقامی نسبت کے لئے چمکنی ضرور لکھتے ہیں۔ چمکنی پشاور کا قدیم ترین اور معروف گاؤں ہے لیکن اس کی وجہ شہرت حضرت میاں محمد عمر کی جائے سکونت اور پھر ان کی وفات کے بعد اس مقام پر ان کا مزار مبارک ہے۔

آپ پشتونوں کے مورث اعلیٰ سڑبن کی اولاد میں سے مشہور قبیلے ترکلان کی ذیلی شاخ موسیٰ خیل قبیلے کی ایک شاخ ایمل خیل کی قوم میاں خیل میں سے ہیں۔ اس نسبت سے آپ کو میاں عمر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے حضرت میاں محمد عمر نے حضرت شیخ المشائخ شیخ سعدیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر ان کے دو نامور خلفاء سید محمد قطب بنوری اور سر الاعظم حضرت محمد یحییٰ المعروف حضرت جی اٹک سے روحانی فیوض حاصل کئے۔

حضرت میاں محمد عمر کی پیدائش تذکرہ نویسوں کے مطابق فرید آباد ضلع لاہور میں 1084ھ میں ہوئی اور پھر تقریباً 1061ھ یا 1098ھ میں چمکنی سکونت اختیار کی۔ 1105ھ میں حضرت شیخ سعدیؒ کے ہاتھ سلسلہ نقشبندی میں بیعت کی۔ حضرت میاں محمد عمر صاحب طریقت اور پابند شریعت بزرگ تھے۔ آپ کی کچھ مشہور تالیفات بھی ہیں ان میں توضیح المعانی، دپختو نسب نامہ المعالی، خزینۃ الاسرار، شمائل نبوی، مشہور تالیفات ہیں۔

حضرت میاں محمد عمر چمکنیؒ نے یکم رجب بروز جمعرات 1190ھ میں وفات پائی اور چمکنی میں ان کا مزار مبارک آج تک عقیدت مندوں کے لئے روحانی تسکین کا باعث ہے۔

مزار حضرت شیخ عبدالغفورؒ پشاوری: حضرت شیخ حافظ عبدالغفور جنہیں حافظ عبدالغفور بابا پشاوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کا مزار پشاور چھاؤنی میں مچنی روڈ پر ضلع کچہری کے ساتھ موجود تھانہ شرقی کے بالمقابل واقع ہے۔ آپ کے پیر طریقت حضرت شیخ سعدی بخاریؒ تھے جن کا مسکن لاہور میں تھا۔ حضرت شیخ عبدالغفور نے گیارہ سال تک اپنے پیر طریقت کی خدمت کی اور پھر انہیں چاروں سلسلوں قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ میں خلافت عطاء کی گئی اور پھر دین اسلام کی تبلیغ کے لئے پشاور تشریف لے آئے۔ آپ کے اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا اور آپ نے قرآن مجید کشمیر ہی میں حفظ کیا اور درس نظامی کے علوم میں وہیں سے فراغت پائی۔

آپ کے بارے میں حضرت پیر سید حسن گیلانیؒ کے فرزند حضرت شاہ محمد غوثؒ اپنی کتاب ''شرح صحیح بخاری'' میں ایک خاص باب میں فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالغفور تمام رات نقشبندیہ طریقے ''حبس دم'' کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے تھے اور ساری رات مراقبے میں گزارتے تھے۔ حضرت شیخ حافظ عبدالغفور پشاوریؒ نے اورنگزیب عالمگیر کے دور میں 1116ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار آج بھی عقیدت مندوں کے لئے مرجع خاص ہے۔ ان کے مزار کے ساتھ ہی ان کے استاد حضرت شیخ حافظ محمد اسماعیل غوری کا بھی مزار ہے اور مزار کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔ ان کی اولاد پشاور سے کچھ فاصلے پر واقع موضع بالو میں اب تک موجود ہے۔

مزار حضرت سید شاہ قبول اولیاؒ: پشاور کے علاقہ ڈبگری میں ڈبگری نہر کے کنارے سید شاہ قبول اولیاءؒ کا مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے۔ اس مقام پر ایک پوری آبادی شاہ قبول کالونی کے نام پر موجود ہے۔ یہاں زیادہ تر گھرانے حضرت سید شاہ قبول اولیاءؒ کی اولاد گیلانی سادات کے ہیں۔ آپ کے روضہ مبارک کے قرب و جوار میں ان کے خلفا اور سادات کے مقبرے بھی ہیں۔

حضرت سید شاہ قبول اولیاءؒ کے اسلاف کا تعلق جزیرۃ العرب کے ایک

مقام "نجا" سے ہے۔ آپ اس مقام پر 1101ھ میں سید عبداللہ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت محبوب سبحانی شاہ عبدالقادر گیلانی کے چوتھے نور چشم سید عبدالرزاق کی وساطت سے سید عبدالقادر گیلانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔

آپ نے پشاور میں علاقہ ڈبگری کے مقام پر وصال فرمایا اور اسی مقام پر آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے ایک کا نام سید میر مرتضیٰ ہے اور دوسرے کا نام سید علی اکبر۔ آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد آپ کے جانشین سید مرتضیٰ ہوئے۔

مزار حضرت رحمان باباؒ: پشاور شہر کے جنوب مشرق کی سمت بیرون کنج دروازہ موضع ہزار خوانی کے بیرونی حصہ میں پشتو کے عظیم صوفی شاعر اور مرد درویش حضرت عبدالرحمٰن المعروف رحمان باباؒ کا مزار ہے جو پٹھانوں میں یکتائے زمانہ صاحب طریقت و شریعت، سخن و شعر اور کردار باصفا کے مالک تھے۔

رحمان باباؒ 1632ء میں کوہاٹ روڈ پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالستار تھا۔ رحمان بابا کا تعلق مہمندوں کے آئیک قبیلہ خلیل خیل سے تھا۔ غربت و مفلوک الحالی میں بچپن گزرا۔ حصول تعلیم کی تڑپ تھی جس کے لئے انہوں نے ملا محمد یوسفزئی سے تصوف اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کوہاٹ چلے گئے اور وہاں کے عالموں سے تحصیل علم ظاہری اور باطنی کے شوق کی تکمیل کی۔ جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی عشق الٰہی میں گرفتار ہو گئے اور پھر ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی اور اپنی شاعری کے ذریعے فقر و قناعت کی طرف لوگوں کو راغب کرتے رہے۔

رحمان بابا چشتیہ سلسلہ سے منسلک تھے اور تصوف کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ وہ اکثر عالم استغراق میں رہتے تھے اور زار و قطار روتے رہتے جس کے باعث ان کے چہرے پر آنسوؤں کی گہری لکیریں پڑ گئیں تھیں۔

رحمان بابا کی جائے پیدائش اگرچہ بہادر کلی ہے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ ہزار خوانی میں گزارہ۔ چنانچہ وہیں پر 1706ء میں وصال ہوا اور ہزار خوانی کے قبرستان ہی میں آسودہ خاک ہوئے۔

مزار حضرت خواجہ عبدالشکور ملنگ باباؒ: حضرت خواجہ عبدالشکور المعروف ملنگ بابا کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ ملنگ بابا کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ ہر سال شوال کے مہینے کی چار تاریخ کو ان کا سہ روزہ عرس مبارک ہوتا ہے۔ اس موقع پر ملک بھر سے ان کے مرید اور عقیدت مندان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ آپ نے عمر کا بیشتر حصہ اجمیر شریف میں حضرت شیخ المشائخ قطب العارفین معین الدین چشتیؒ کے مزار پر گزارا۔ مزار پر خدمت گزاری کے علاوہ عبادت و ریاضت کرتے، باقاعدگی کے ساتھ فجر کی اذان دیتے اور نماز کے لئے امامت فرماتے۔ اجمیر میں قیام کے دوران بیگمی دالان میں سکونت اختیار کی۔ حضرت معین الدین چشتی کے سلسلہ چشتیہ سے منسلک رہے اس لئے آپ ملنگ بابا چشتی کے نام سے متعارف ہوئے۔

حضرت ملنگ بابا صاحب چشتی یوسفزئیوں کے مشہور قبیلہ کندا خیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کو ملک احمد شیخ ملی کے زیر انتظام کنڈ خیل قبیلے کے لئے سوات میں پیر خانہ کے نام سے جگہ دی گئی جس میں ساٹھ گاؤں ہیں۔ ان میں مشہور مقامات اجمیر، ولند اور بلکانی ہیں۔

خواجہ شاہ عبدالشکور المعروف ملنگ بابا 1902ء میں بلکان شریف میں پیدا ہوئے۔ اس نسبت سے آپ بلکانی کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید مکمل کیا اور فن تجوید میں مکمل مہارت حاصل کی۔ بچپن ہی سے رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا پاکیزہ جذبہ تھا۔ ہمعصروں کو اچھی اور نیک باتیں بتاتے۔ آپ کی عمر چھ سال ہی تھی کہ دادا حضرت تازہ گل کا انتقال ہوا۔ والد صاحب ان کو بلکان سے چکیسر لے آئے۔ دو سال کے بعد والد ماجد کا بھی انتقال ہو گیا۔ بعد میں والدہ محترمہ آپ کو لے کر دوبارہ چکیسر آ گئیں۔ آپ نے پورے ہندوستان اور پھر آسام، برما، تبت اور چین کا پاپیادہ سفر کرتے ہوئے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد سرزمین شام، حجاز، یمن، بحرین اور پھر بیت المقدس اور وادی انبیاء، بی بی حضرت مریمؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے مقامات کی زیارت سرزمین فلسطین میں کی۔

حضرت بابا جی المعروف ملنگ بابا نے 21 اکتوبر 1976ء بمطابق 4 شوال المکرم 1397ھ بروز بدھ 9 بجے صبح بمقام عقب بالا حصار داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی مقام پر دفن کئے گئے۔ حال ہی میں سڑک کی توسیع کے منصوبے کے تحت آپؒ کے جسد خاکی کو وہاں سے نکال کر جی ٹی روڈ کے مقام پر سپرد خاک کیا گیا اور عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

مزار سید عبدالستارؒ المعروف حضرت بادشاہ جان: بیرون ڈبگری دروازہ مزار سید عبدالستار شاہ المعروف حضرت بادشاہ جان مرجع خاص و عام ہے۔ مزار کے احاطے ہی میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ آپ کا تعلق ہزارہ کے علاقہ

الائی سے تھا۔ آپ پیر باباؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت پیر بابا کی اولاد میں سے سید مسعود کے فرزند سید پیر امام تبلیغ وارشاد کے لئے ہزارہ کے علاقہ الائی میں چلے آئے تھے۔ آپ حضرت پیر بابا کی دسویں پشت سے ہیں۔ سید واقف شاہ جو مزار کے سجادہ نشین ہیں بادشاہ جان کی ایک بہن کے فرزند ارجمند ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی حصول علم کی تڑپ لئے ہوئے رخت سفر باندھا اور گھر سے نکل پڑے۔ سب سے پہلے پنجاب گئے، وہاں سے سید اجمیرؒ کی زیارت کے لئے اجمیر شریف چلے گئے پھر پشاور تشریف لائے اور پشاور سے پیر بابا کی زیارت کے لئے بنیر چلے گئے۔ وہاں علم وعرفان اور فقر و درویشی کے راستے پر چلنے کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد 1905ء میں بٹ خیلہ سوات چلے آئے اور وہاں پر سید یعقوب شاہ نقشبندی کے ہاتھ پر سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کی۔ 1921ء میں دوبارہ کشمیر چلے گئے اور وہاں سید رسول شاہ کی معیت میں عبادت وریاضت میں مشغول ہو گئے۔ 1925ء میں پشاور تشریف لے آئے اور اسی مقام پر جہاں آپ کا مزار مبارک ہے معرفت الٰہی کی دولت کو تقسیم کرنے لگے۔ یہاں آپ کے بہت سے ایسے لوگ مرید ہونے لگے جو اپنے علمی اور ادبی کارہائے نمایاں کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں پشتو کے عظیم شاعر امیر حمزہ شنواری قابل ذکر ہیں۔

حضرت سید عبدالستار المعروف حضرت بادشاہ جان نے ذی القعد کی 20 تاریخ کو 1376ھ بمطابق 1902ء اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ اس وقت مزار کے سجادہ نشین سید حکیم شاہ باچا ہیں جو کہ سید واقف شاہ کے فرزند ارجمند ہیں۔

قبریں اور قبرستان

بیرون پشاور دو بڑے قبرستان ہیں۔ ایک بیرون گنج دروازہ جنوب مشرق کی جانب ہزار خوانی گاؤں تک پھیلا ہوا قبرستان ہے جہاں تین اہم بزرگوں کے مزار بھی ہیں۔ پشتو کے نامور صوفی شاعر رحمٰن باباؒ کا مزار اس قبرستان کے وسط میں ہے۔ رحمان بابا کے مزار کی مناسبت سے یہاں کے پشتون اس قبرستان کو 'رحمٰن بابا ادیرہ' بھی کہتے ہیں۔ پشتو میں 'ادیرہ' قبرستان کو کہا جاتا ہے جبکہ پشاوری لوگ اس قبرستان کو 'سوکا باڑہ' قبرستان کہتے ہیں۔ یہاں سے دریائے باڑہ کا نالہ گزرتا ہے اس مناسبت سے اسے سوکا باڑہ کہا جاتا ہے۔ رحمان بابا کے مزار کے مشرق کی جانب علمی اور روحانی فضیلت کی حامل شخصیت حضرت اخوندرویزہ باباؒ کا مزار ہے۔ اس مزار کے آس پاس سب قبریں ہیں۔ حضرت رحمان بابا کے مزار کے شمال کی جانب شیخ حیدر باباؒ کا مزار ہے، اس کے بھی آس پاس سب قبریں ہیں۔ اس سارے احاطے کو ملا کر ہزار خوانی قبرستان بھی کہا جاتا ہے۔

دوسرا بڑا قبرستان بیرون کوہاٹی دروازہ جنوب کی طرف واقع وزیر باغ کے جنوب مغرب کی جانب ہے۔ یہاں پر بھی ایک روحانی بزرگ شخصیت حضرت شیخ حبیبؒ کا مزار ہے اس مزار کے گرد یہ قبرستان واقع ہے۔ اس مناسبت سے پشاور کے لوگ اس قبرستان کو شیخ حبیب قبرستان کہتے ہیں۔ یہاں پر درانی حکمرانوں کے عہد کا بنا ہوا ایک خوبصورت دروازہ تھا۔ دروازے کے اوپر اور طرفین میں خوبصورت تحریریں کندہ تھیں، اسے لکھا ہوا دروازہ کہا جاتا تھا۔ پشاور کے لوگ اس دروازے کے عقب کے قبرستان کو لکھا ہوا دروازہ قبرستان بھی کہتے تھے۔

پارسی قبرستان: یہ قبرستان پشاور چھاؤنی کے احاطے میں موجودہ سنہری مسجد روڈ پر بائیں جانب پارسیوں کے قبرستان کے نام سے واقع ہے جہاں پارسی مذہب کے لوگ اپنے مردوں کو دفناتے ہیں۔ یہ اب عموماً پختہ قبریں بناتے ہیں۔

گورا قبرستان: یہ مسیحی لوگوں کا قبرستان ہے اور انگریزوں کے دور سے یہاں پر عیسائی لوگ اپنے مردوں کو دفناتے ہیں۔ یہ قبرستان جہاں سے خیبر روڈ شروع ہوتی ہے وہیں سڑک کے دائیں کنارے پر ایک بڑے احاطے پر مشتمل ہے جو کہ گورا قبرستان کے نام سے مشہور ہے۔ ان معروف قبرستانوں کے علاوہ بھی آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے مختلف اطراف میں قبرستان بنائے گئے ہیں۔

رسوم ورواج

علاقائی اور قومی ثقافت میں بیاہ شادی کی رسومات نمایاں ثقافتی پہلو کی حامل ہوتی ہیں۔ پشاور میں بیاہ شادی کے طور طریقے یہاں کی مضبوط ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ پشاور میں بعض ایسے قدیم پیشوں سے منسلک خاندان جو پیشوں کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں وہ اپنے اپنے خاندانوں ہی میں رشتے طے کرتے ہیں جیسے دھوبی، گجر اور شیخ برادری کے لوگ لیکن بدلتے ہوئے جدید تقاضوں کے تحت ان برادریوں میں بھی یہ قدیم رشتے داریاں بدل چکی ہیں اور اب باہر کے خاندانوں اور برادریوں میں بھی رشتے داریاں قائم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی جاتی۔ اکثر لڑکے والے ہی لڑکی والوں سے رشتہ مانگتے ہیں اور دونوں گھروں کی رضامندی کے اظہار کے بعد رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

منگنی: باقاعدگی کے ساتھ منگنی کی رسم ہوتی ہے اور لڑکے والے لڑکی کے گھر جا کر دودھ پیتے ہیں۔ دودھ کا پینا منگنی کا باقاعدہ اعلان ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد

نشانیوں کا تبادلہ ہوتا ہے جو سونے کی انگوٹھی کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ منگنی عرصہ دراز تک قائم رہتی ہے اور اس دوران لڑکی اور لڑکے والے شادی کے لوازمات اکٹھے کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

دینڑ: عرصہ منگنی کے دوران مختلف مہینوں کی مناسبت سے چاند کی تاریخوں کے لحاظ سے لڑکے والے لڑکی والوں کے گھر میں مختلف تحائف اور اشیاء بھیجتے رہتے ہیں جس میں مٹھائی، پھل اور مخصوص مہینے کے مطابق حسب رسم مختلف اشیاء ہوتی ہیں۔ اسے پشادریوں کی مخصوص ہندکو زبان میں ''دینڑ'' کہتے ہیں۔ پھر لڑکی والے اس ''دینڑ'' کی چیزوں کو اپنے رشتے داروں میں بقدر حساب بھیجتے ہیں جو قرابت داروں کے آپس میں میل ملاپ کی علامت ہوتا ہے اور جس گھر میں اس ''دینڑ'' کی چیزیں جسے ''بخرہ'' یا ''پاجی'' کہتے ہیں نہ پہنچیں تو متعلقہ رشتے دار اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنے رشتے داروں میں شمار نہیں کیا گیا۔ قدیم روایات کے مطابق کئی آپس کی رشتے داریاں محض اس لئے منقطع ہو جاتی تھیں کہ انہیں اس بخرہ یا پاجی میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ دینڑ میں شعبان کے مہینے کے شب برات کا دینڑ، صفر کے مہینے کا تیزی کا دینڑ جسے چوری روزے کا دینڑ بھی کہتے ہیں اور عیدین کا دینڑ نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ شادی تک چلتا رہتا ہے۔

شادی کی تیاری: جب شادی کے لئے تاریخ مقرر کی جاتی ہے تو لڑکے کے گھر کی طرف سے لڑکے کے والدین اور چند دیگر بزرگ مرد و خواتین شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے لڑکی کے گھر جاتے ہیں۔ اس رسم کو پشادری لوگ ''ویا منگواں'' کہتے ہیں۔ باہمی رضامندی کے ساتھ تاریخ طے ہو جاتی ہے جو چاند کے مہینے کی طاق تاریخوں میں سے ہوتی ہے۔ ان میں چاند کی گیارہ، سترہ، اکیس اور ستائیس تاریخوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ مقرر ہونے کے ساتھ ہی شادی کی باضابطہ تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک مقرر تاریخ کو دونوں گھروں میں ختم قرآن پاک کی تقریب ہوتی ہے جو شادی کی رسم کا افتتاح ہوتی ہے۔ اس کے بعد شادی کے لئے دعوتی ٹولیاں بن جاتی ہیں جو قریبی رشتے دار عورتوں اور لڑکیوں پر مشتمل ہوتی ہیں اسے ''سدہ'' کہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سدہ کسی پیر خانے میں جاتا ہے اور وہاں سے دعائے خیر کے بعد روزانہ اپنے مختلف عزیزوں کے گھروں میں یہ سدے کی ٹولیاں جاتی ہیں جہاں مختلف مشروبات اور دیگر انواع و اقسام کے لوازمات سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ ہر گھر سے روپوں کی شکل میں سدہ دیا جاتا ہے جو تکرار کے بعد قبول کیا جاتا ہے۔ یہ سدے کی رقم حسب مراتب رشتے داری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کے قریبی رشتے دار لڑکی کو اپنے گھر میں بطور مہمان بلاتے ہیں اور بھرپور طریقے سے لڑکی کی الوداعی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ ان میں لڑکی کے ماموں، چچا، خالہ اور پھوپھی کے گھر شامل ہوتے ہیں۔ بعض ایسے رشتے دار جن کے ہاں میت ہو چکی ہو اور وہ شادی کی تقریبات میں شامل ہونے سے معذور ہوں تو لڑکے کے گھر کی طرف سے میت والے گھر میں مختلف اشیاء یا ایک وقت کا پر تکلف کھانا بھیجا جاتا ہے جسے ''عذر'' کی روٹی کہتے ہیں۔ لڑکے کے گھر میں روزانہ رات کو محفلیں سجتی ہیں جسے محفل ہی کہتے ہیں۔ ان محافل میں نوجوان لڑکے بالے رات گئے تک ناچتے گاتے ہیں اور اس طرح اپنی طرف سے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

مایوں کی رسم اور بارات: شادی والی رات سے پہلے لڑکی اور لڑکے دونوں کے گھروں میں ''مایوں'' کی رسم ہوتی ہے۔ یہ بارات سے ایک رات پہلے ہوتی ہے۔ پہلے لڑکے والے کے گھر سے عورتیں لڑکی کے گھر جا کر لڑکی کو مہندی اور تیل لگاتی ہیں اور لڑکی پر چادر جسے ''لسا'' کہتے ہیں ڈال کر گاتی ہیں۔ پھر لڑکی کے گھر سے عورتیں لڑکے کے گھر جاتی ہیں اور اسی نوعیت کی رسم ادا کرتی ہیں۔ دوسرے روز بارات کی رات کو لڑکے کے گھر میں محفل سماع ہوتی ہے جس میں نامور قوال قوالی کرتے ہیں۔ بعض گھرانوں میں طوائفوں کو بھی بلایا جاتا ہے۔ اس قسم کی محفل کو عموی طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا اور باوقار اور دیندار بزرگ لوگ اس محفل میں شریک نہیں ہوتے۔ اسی رات کو بینڈ باجے والوں کو بلایا جاتا ہے اور دولہا کے یار دوست اور رشتے دار جوان بانکے ایک تانبے کے گھڑے میں سات کنوؤں یا نلکوں سے پانی بھر دیتے ہیں اور پھر گھڑے پر ریشمی سرخ رومال ڈال کر بینڈ باجوں کی دھنوں میں علاقے میں پھراتے ہیں۔ اس رسم کو ''گھڑا گھڑولی'' کہتے ہیں۔ پھر رات کے تقریباً گیارہ بارہ بجے برات نکلتی ہے۔ دولہا کے سر پر بڑا سا موتیوں اور تلے سے بنا ہوا سہرا سجایا جاتا ہے اور خاندان کا نائی کھڑے ہو کر قریبی رشتے داروں سے ''ویل'' جمع کرتا ہے اور ساتھ رشتے دار کا رشتہ با آواز بلند پکارتا ہے بارات جب تیار ہو جاتی ہے تو دولہا سجے سجائے گھوڑے پر بیٹھ جاتا ہے اور سب سے پہلے دولہے کی بہن گھوڑے کی باگ کو پکڑتی ہے تو دولہا بہن کو باگ پکڑائی کی رسم کے طور پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اس کے بعد بارات لڑکی کے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے اور لڑکے والے راستے میں ناچتے کودتے اور خوش و خرم لڑکی کے گھر پہنچتے ہیں۔ لڑکی کے گھر میں سب سے پہلے نکاح پڑھا جاتا ہے اور پھر اس مسنون نکاح کے بعد دولہا اور دلہن میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ حاضرین میں شکر یا چینی ملے ہوئے تل بانٹے جاتے ہیں۔

نکاح کے بعد لڑکی والے لڑکے والے مہمانوں کو حسب استطاعت بارات کی روٹی دیتے ہیں جو زردہ سفیدہ پلاؤ اور قورمہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ روٹی کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونے لگتے ہیں۔ صرف قریبی رشتے دار ہی ٹھہرے رہتے ہیں اور پھر رات گئے دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر دلہن کو قرآن پاک کا نسخہ دیا جاتا ہے جو دلہن بڑے احترام سے چوم کر گود میں رکھ لیتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ دلہن بحیثیت مسلمان کوشش کرے گی کہ اپنی زندگی کو قرآن کے تابع رکھ کر اپنے نئے گھر کو اپنا گھر سمجھے گی اور اہم معاملات میں قرآن پاک ہی سے راہنمائی حاصل کرے گی۔ جو مسلمان لڑکیاں قرآن پاک کے مبارک تحفے کے اس فلسفے کو جانتی ہیں وہ اپنے خاوند کے گھر میں خوشحال زندگی بسر کرتی ہیں اور وفاشعاری کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں اور اس قسم کے گھر شاد اور آباد رہتے ہیں۔

ولیمہ: دوسری صبح لڑکے کے گھر میں دوپہر کو ولیمے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور لڑکے کے گھر میں عورتوں کی گائیک پارٹی کو بلایا جاتا ہے جسے ''ڈومڑی'' کہتے ہیں۔ یہ دومڑی طبلے کی تھاپ پر گانا گاتی ہیں۔ مردوں کی محفل میں مہمان آتے ہیں اور دوپہر کا کھانا کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس ولیمے کی روٹی کو ''حاضری'' کہتے ہیں جس میں ہر عام و خاص شرکت کرتا ہے۔ ولیمے کی شام کو ہی ''گانا کھلائی'' کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے اور پھر تمام مہمان سوائے قریبی لوگوں کے رخصت ہو جاتے ہیں۔

چوتھے کی روٹی: ولیمے کے دن کے بعد دوسرے روز دلہن اپنے میکے جاتی ہے اور پھر چوتھے روز لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کے قریبی رشتے داروں اور قریب ترین دوستوں کو لڑکی کے گھر میں رات کو مدعو کیا جاتا ہے اور ایک پرتکلف دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔ اسے چوتھے کی روٹی یا لڑکوں کی روٹی کا نام دیا جاتا ہے اس موقع پر جوتی چرائی کی رسم بڑی اہمیت رکھتی ہے یعنی لڑکے کی جوتی چھپالی جاتی ہے اور جب تک لڑکا دلہن کے بھائی یا بہن کو کچھ رقم ادا نہیں کرتا جوتی نہیں دی جاتی اور پھر اختتام پر دلہن اپنے دولہا کے گھر آ جاتی ہے۔ اس دعوت کے اختتام کے ساتھ ہی شادی کی تمام تقریبات و رسومات اختتام پذیر ہو جاتی ہیں اور سب مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔ اختتام رسومات کے علاوہ شادی کے دوران لڑکی اور لڑکے کے گھروں میں عورتیں اور لڑکیاں اظہار مسرت کے لئے ٹولی کی صورت میں گانے گاتی ہیں۔ ڈھولکی شادی والے گھروں میں آ جاتی ہیں اور پھر عورتیں اور لڑکیاں ڈھولکی کی تھاپ پر گاتی ہیں۔ ان میں قدیم گانے بھی ہوتے ہیں اور جدید بھی۔ شادی کے موقع پر بڑی بوڑھی عورتیں بھی اکٹھی ہوتی ہیں اور وہ سیٹھڑیاں گاتی ہیں جو خاص صنف کے تحت کہی جاتی ہیں۔ دو ٹولیوں کی صورت میں مدمقابل بیٹھ کر عورتیں یہ گاتی ہیں اور ایک دوسرے کو سیٹھڑیاں سناتی ہیں۔ ان سیٹھڑیوں میں عموماً گالی گلوچ بطور مزاح استعمال کیجاتی ہے۔ اس لئے یہ صرف ادھیڑ عمر عورتیں ہی گاتی ہیں اور ان کی اسی نوعیت کی محفل میں کم عمر لڑکیوں کا بیٹھنا ممنوع ہوتا ہے یہ ادھیڑ عمر عورتوں کی مزاح کا ایسا انداز ہے جس کی وجہ سے شادی میں ان معمر عورتوں کی شرکت شادی کی خوشی میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔

دیہات میں شادی: پشاور کے مضافات کے دیہاتوں میں پٹھانوں کی شادی کی تیاریاں بھی بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ بعض دیہاتوں میں منفرد قسموں کے رواج ہیں۔ دیہاتوں میں بارات دوپہر کے بعد ہوتی ہے اور لڑکے والے لڑکی کے گھر میں عصر کے وقت پہنچتے ہیں جہاں سب سے پہلے نکاح مسنونہ کی رسم ہوتی ہے۔ یہ نکاح عموماً مسجد میں ہوتا ہے جہاں دولہے کے قریبی رشتے دار، باپ اور گواہ بیٹھتے ہیں۔ مسجد کے احترام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اس لئے عام لوگ نکاح کے وقت مسجد میں داخل نہیں ہوتے۔ مسجد کے امام نکاح پڑھاتے ہیں۔ نکاح ہو جانے کے بعد مولوی صاحب دعا کرتے ہیں اور پھر اس دعا کے بعد شیرینی تقسیم ہوتی ہے اور بارات کے ساتھ آنے والے اور لڑکی کی طرف سے شریک ہونے والے مہمانوں کی چائے اور مٹھائی سے تواضع کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ڈولی میں دلہن کو رخصت کرنے کا وقت قریب آ جاتا ہے تو لڑکے کو ایک چھوٹی سی چارپائی پر بٹھا کر اسے اچھالتے ہیں۔ اس رسم سے لڑکا اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے اس لئے وہ پہلے ہی سے چارپائی کے بان کو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیتا ہے تاکہ چارپائی سے گر نہ جائے۔ اس رسم کے بعد دلہن کو سسکیوں اور آہوں کے ساتھ والدین کے گھر اور گاؤں سے رخصت کیا جاتا ہے اور پھر دوسرے روز لڑکے کے گھر میں حسب استطاعت ولیمہ کی روٹی دی جاتی ہے۔ ولیمہ کی یہ روٹی زیادہ تر پلاؤ، زردہ اور قورمے پر مشتمل ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگ اور دیگر احباب اور رشتے دار ولیمے کی دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔

پیدائش کی رسم: گھر آباد ہو جانے کے بعد لڑکی کے سسرال والوں کو خصوصاً اور میکے والوں کی عموماً اولاد نرینہ کی تمنا ہوتی ہے اور شادی کے چند روز بعد ہی سے لڑکی کی ساس اور نندوں کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ گھر کی بہو حاملہ ہوئی ہے کہ نہیں۔ مختلف زاویوں سے لڑکی کا جائزہ لیا جاتا ہے اور جب دلہن حاملہ ہو جاتی ہے تو وارے نیارے ہوتے ہیں۔ دلہن پر ساس کی طرف سے کچھ پابندیاں لگ جاتی ہیں بھاری شے نہ اٹھائے، ایسی کوئی چیز نہ کھائے جو حاملہ کے لئے نقصان دہ ہو، ایسی ویسی محفلوں

میں نہ جائے جس کی وجہ سے حمل پر برا اثر پڑتا ہو۔ حمل ٹھہر جانے کے بعد یہ جائزے بھی شروع ہو جاتے ہیں کہ لڑکا ہوگا یا کہ لڑکی۔ زچہ کو توانائی والی خوراک دی جاتی ہے دودھ' کھوپرا' بادام' چار مغز وغیرہ۔ جب زچگی کے دن قریب آنے لگتے ہیں تو خاندان کی دائی کے چکر لگنے شروع ہو جاتے ہیں تاکہ وہ حاملہ کی حالت سے باخبر رہے۔ دائی وقتاً فوقتاً آ کر زچہ کو ہدایات دیتی رہتی ہے۔

پیدائش کا وقت: خدا خدا کر کے بچے کی پیدائش کا دن آ گیا دائی اپنے خاص ہنر سے اپنا فریضہ انجام دیتی ہے۔ خدا کے فضل سے بچہ پیدا ہوا، رونے کی آواز آئی، ساس دوڑتی ہوئی آئی یہ دیکھنے کے لئے کہ بچہ ہے یا بچی۔ خوش قسمتی سے بچہ ہے تو گھر میں مبارکبادیں شروع ہو گئیں اور گھر کے بزرگ کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت گھر میں آ گئی ہے۔ اگر بچہ پیدا ہو تو دائی کے بھی وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ گھر والے اور آنے والے قریبی مہمان دائی کو نوٹوں سے نوازتے ہیں اور دائی بھی خوب سمیٹتی ہے اور پھر بچے کے کان میں مولوی صاحب آ کر اذان دیتے ہیں۔ پہلے تین چار روز زچہ کو نرم اور مقوی غذائیں دی جاتی ہیں اور دائی بھی مسلسل آتی ہے۔ بچہ اور بچے کے کپڑوں کی صفائی دھلائی کرتی ہے بعد میں کبھی کبھی آتی ہے۔

سر دھونا اور نہانا: زچہ ساتویں روز' پندرہویں روز' اکیسویں روز اور پھر آخر میں چالیسویں روز سر دھوتی ہے اور نہاتی ہے اور پھر اس چالیسویں روز دائی اپنا حصہ لے کر اگلے بچے تک رخصت ہو جاتی ہے۔ چالیسویں روز زچہ نہا دھو کر کسی پیر خانے یا مزار پر جاتی ہے اور پیر صاحب یا زیارت کے مجاور بچے کی زندگی اور نیک بختی کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں بھی تقریباً تقریباً یہی رسم و راج ہیں البتہ لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور فائرنگ کی جاتی ہے۔

عقیقہ کی رسم: بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کچھ دنوں بعد عقیقہ کی رسم ادا کی جاتی ہے یعنی سر مونڈھنے کی رسم جو کہ مذہبی نوعیت کی ہے۔ اگر بچہ ہے تو دو بکرے ذبح کئے جاتے ہیں اور اگر بچی ہے تو ایک بکرا اور پھر گوشت بانٹ دیا جاتا ہے۔

ختنے کی رسم: ختنہ کی رسم مسلمان گھرانے کے لئے نہایت غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس سے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق نمایاں ہوتا ہے۔ قدیم لوگوں میں ختنہ کی رسم کو بھی شادی کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ بچہ ذرا بڑا ہونے لگے تو ختنہ کا اہتمام کیا جاتا ہے پشاوری گھرانوں میں یہ ختنہ بھی گھرانے کا نائی ہی کرتا ہے اور اس روز قریبی رشتے داروں کو دعوت دی جاتی ہے۔ بچے کو صبح ہی سے بھنگ پلا دی جاتی ہے اور پھر اسے نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور ختنہ کی رسم سے پہلے والد اور چند ساتھی بچے کو کسی مزار پر دعا کے لئے لے جاتے ہیں اور پھر واپسی پر شام سے پہلے نائی خاص مہارت کے ساتھ ختنہ کرتا ہے۔ اس موقع پر قریبی رشتے دار اور گھر والے نائی کو پیسے دیتے ہیں اور گھر والوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پھر نائی چند روز تک روزانہ بچے کے زخم پر پٹی رکھنے کے لئے آتا ہے اور یوں یہ ختنہ کی رسم بھی بخیر و خوبی ادا ہو جاتی ہے۔

موت کی رسمیں: موت برحق ہے۔ جو بھی ذی روح ہے آخر اس نے مرنا ہے۔ پشاور میں جب کوئی زن و مرد مرنے لگتا ہے تو آخری وقت میں قریبی لوگ قرآن پاک کی سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں تاکہ مرنے والے پر یہ وقت آسان ہو جائے اور اسے اس طرح لٹاتے ہیں کہ منہ خانہ کعبہ کی طرف ہو، منہ میں شہد کے چمچ ڈالتے ہیں۔ جب موت واقع ہو جائے تو ہاتھ سے آنکھیں بند کر دیتے ہیں اور ٹھوڑی اور سر کے درمیان کپڑا باندھ دیتے ہیں اور ساتھ ہی دونوں پاؤں کے انگوٹھے بھی باندھ دیئے جاتے ہیں۔ تمام رشتے دار رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ میت والے گھر آس پاس کے لوگ اور رشتے دار آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بین کئے جاتے ہیں' پیٹا جاتا ہے' باہر گلی کوچے یا حجرے میں مرد حضرات جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

دفنانے کی رسم: مرد میت کے لئے سفید لٹھے کا کفن تیار کیا جاتا ہے اور اگر عورت ہے تو سفید کفن کے ساتھ سرخ دوپٹہ بھی اوڑھاتے ہیں۔ کفن پر کلمہ طیبہ یا شش کلمے گہری سیاہی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ کفن دینے سے پہلے ایک خاص تختے پر نہلایا جاتا ہے اور پھر تکفین کی جاتی ہے۔

جنازہ: جنازے کی خاص چارپائی پر مردے کو ڈالا جاتا ہے اور پھر اس کے اوپر پھولوں کی چادر ڈالی جاتی ہے۔ اگر عورت ہو تو اس کے لئے چارپائی پر ایک بنجرہ ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس پر جنازے کی چادر اور پھولوں کی اوڑھنی ڈال دی جاتی ہے اور پھر جنازے میں شریک لوگ جنازے کی چارپائی اٹھا کر قبرستان کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہے راستے میں کلمہ شہادت کا ورد ہوتا ہے۔

نماز جنازہ اور تدفین: قبرستان عموماً ہر خاندان کا اپنا اپنا ہوتا ہے جہاں پہلے ہی سے گورکن قبر کھود چکا ہوتا ہے۔ دفنانے سے پہلے جنازہ گاہ میں نماز جنازہ ادا ہوتی ہے۔ اس کے بعد قبر کے دھانے پر چارپائی لائی جاتی ہے اور میت کو قریبی رشتے دار قبر میں اتار کر اسے بڑے اہتمام کے ساتھ قبر میں رکھتے ہیں اور پھر ایک گڑھے کے اوپر مٹی کی بنی ہوئی بڑی بڑی اینٹیں رکھتے ہیں۔ جب ہر طرف سے ڈھک

جائے تو سب مل کر مٹی ڈالتے ہیں۔ قبر تیار ہو جائے تو مولوی صاحب تلاوت کلام پاک کرتے ہیں اور تلاوت کے بعد دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ دفنانے کے بعد سب لوگ واپس گھر آ جاتے ہیں۔ مرد حضرات باہر چارپائیوں پر بیٹھ کر مرنے والے کے لئے دعائے مغفرت میں شریک ہوتے ہیں۔ تین دن تک میت خانہ اسی طرح رہتا ہے اور آس پاس کے لوگ تین دن تک میت کے گھر والوں اور ان کے قریبی مہمانوں کے لئے کھانا بھیجتے ہیں۔ اگرچہ اب ایسا بہت کم ہے بلکہ پہلے ہی روز سے میت کے گھر والے ہی کھانا تیار کرتے ہیں مگر دیہاتوں میں ابھی تک یہی رواج ہے۔

سوئم: تیسرے روز شام سے پہلے تمام قریبی رشتے دار اکٹھے ہوتے ہیں اور سوئم کی رسم اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مختلف انواع واقسام کے کھانے تیار کئے جاتے ہیں۔ انہیں دسترخوان پر رکھ کر سب لوگ اردگرد بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن کی تلاوت کے بعد دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ چالیس روز تک گھر میں خواتین رشتے داروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

دستار بندی: سوئم کی فاتحہ کے موقع پر ہی سب گھر کے بڑے مرد وزن جمع ہوتے ہیں اور مرحوم (اگر والد ہے) کے بڑے بیٹے کے سر پر خاندان کا بڑا دستار باندھتا ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اب مرحوم کے بعد یہ اپنے گھر کا بڑا اور جانشین ہے۔

چہلم: چالیسویں روز چہلم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اکثر گھرانوں میں چالیسویں روز بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا جاتا ہے اور پھر شام سے پہلے سب اکٹھے ہو کر مرنے والے کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور جو کھانا تیار ہوتا ہے وہ سب تناول کرتے ہیں۔ زیادہ تر یہ کھانا پلاؤ اور زردہ ہوتا ہے۔

دیگر رسومات: پشاور و مضافات میں ان متذکرہ رسوم ورواج کے علاوہ کچھ اور بھی رسمیں ہیں ان میں زیادہ تر مذہبی تناظر میں ادا کی جاتی ہیں۔ ان رسموں میں پشاور کے لوگ نہایت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور مذہبی حوالے سے ان رسموں پر کاربند ہونا ضروری خیال کرتے ہیں اور اپنے لئے اور اپنے فوت ہونے والے بزرگوں کے لئے نجات کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔

شب برات: ہر سال پندرہ شعبان کی رات کو شب برات نہایت تزک و احترام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ اس رات کو پشاور کے لوگ حلوہ اور پراٹھے بڑے اہتمام کے ساتھ پکاتے ہیں اور پھر اس پکوان پر فاتحہ پڑھ کر اپنے مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ رات کو ہر گھر میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے اس رات کو آتش بازی کی جاتی تھی اور پٹاخے چھوڑے جاتے تھے۔ آتشی بارود اور پٹاخوں کی دکانیں کوہاٹی دروازے سے باہر بنائی جاتی تھیں جہاں پشاور کے لڑکے بالے یہ آتشیں بارود خریدتے تھے۔ اس آتش بازی کے مظاہرے میں ہر گھرانا شریک ہوتا۔ جو حلوہ اور پراٹھا پکتا وہ قریبی رشتے داروں اور ہمسایوں میں بانٹا جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس رات کو ہر گھرانا اپنے بڑے بزرگ مرد وزن کے پاس حاضر ہوتا اور کم عمر لوگ بڑی عمر کے مرد وزن کے پاس جا کر سال بھر میں سرزد ہونے والی غلطیوں پر معافی مانگتے۔ اس رات کو روٹھے ہوئے لوگ آپس میں آ کر ملتے اور اس طرح اس نجات والی رات کو تمام گلے شکوے دور ہو جاتے۔ نیک اور پارسا لوگ ساری رات عبادت میں گزارتے ہیں اور اللہ سے اپنے لئے اور فوت ہونے والے لوگوں کے لئے دعائے مغفرت مانگتے ہیں۔ بزرگ مرد وزن اور نیک لوگ 14 اور 15 شعبان کا روزہ بھی رکھتے ہیں۔

عیدین: مسلمان گھرانوں میں عیدالفطر اور عیدالضحیٰ کی رسومات مذہبی جوش و خروش کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ پشاور کے لوگ شروع ہی سے اپنے انداز میں ان مذہبی رسومات کو ادا کرتے ہیں۔ رمضان المبارک کے بعد جب شوال کے مہینے کے چاند کا اعلان ہو جاتا ہے تو اسی وقت پشاور کے لوگوں میں جوش وخروش پیدا ہو جاتا ہے۔ علی الصبح ہر گھر میں سویاں تیار ہونے لگتی ہیں اور پھر مرد حضرات نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر نماز عید کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ سویوں پر گھر کا بڑا یا بڑی فاتحہ دیتی ہے اور پھر سب مل کر سویاں تناول کرتے ہیں اور پھر مساجد میں عیدالفطر کی نماز کے لئے چلے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا اجتماع عیدگاہ میں ہوتا ہے۔ سب لوگ مل کر اللہ پاک کے حضور نماز ادا کرتے ہیں اور عید کا خطبہ سنتے ہیں۔ خطبے کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے اور پھر سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عید ملتے ہیں۔ گھر کے سب افراد ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر عید مبارک کہتے ہیں اور پھر کم عمر لوگ خاندان کے بڑے افراد کو عید ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو روپوں کی صورت میں عیدی دی جاتی ہے۔ جگہ جگہ عید میلے لگتے ہیں۔ چھوٹے بچے اور جوان ان میلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

عیدالضحیٰ کے موقع پر بھی اسی طرح کے جوش وخروش کا مظاہرہ ہوتا ہے اس موقع پر نماز عید کے بعد حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی سنت کو

زندہ رکھنے کے لئے حلال جانوروں کی قربانی کرتے ہیں اور قربانی کا گوشت غربا و مساکین کے علاوہ رشتے داروں میں بانٹا جاتا ہے۔

بائیسویں کی نیاز: اسلامی مہینے رجب المرجب کی بائیسویں تاریخ کو پشاور کے لوگ ایک نیاز دیتے ہیں۔ اس روز پشاوریوں کے گھرانوں میں حضرت امام جعفر صادق کے نام کی نیاز دی جاتی ہے۔ یہ نیاز اس طرح سے ہوتی ہے کہ گڑ یا چینی کو پانی میں ڈال کر اس کا شیرا تیار کیا جاتا ہے اور پھر اس میٹھے پانی سے آٹا گوندھا جاتا ہے اور پھر اس گوندھے ہوئے آٹے کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تیار کر کے گھی میں انہیں پکا لیا جاتا ہے اور مٹی کے کونڈے میں رکھی جاتی ہیں۔ سوجی کا حلوہ علیحدہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس پکوان پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ قریب کے رشتے داروں اور احباب کو دعوت دی جاتی ہے اور بڑے ادب و احترام کے ساتھ یہ نیاز تبرکاً کھائی جاتی ہے۔ یہ نیاز اسی جگہ پر بیٹھ کر کھائی جاتی ہے، اسے باہر نہیں نکالا جاتا۔ اب اس نیاز کے طریقے میں کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور وہ شد و مد نہیں جو پہلے تھی۔ اب بائیسویں کے علاوہ مہینے کے آخر تک 29 یا 30 سے پہلے پہلے بھی نیاز دی جاتی ہے۔

دیگچے کی رسم: ہر سال اسلامی مہینے صفر کے آخری بدھ کے روز پشاوریوں کے اکثر گھرانوں میں خصوصاً اہل تشیع کے گھروں میں دیگچے کی نیاز کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ بڑے سے دیگچے میں نہایت اہتمام کے ساتھ کھیر پکائی جاتی ہے۔ کھیر جب پک جاتی ہے تو دیگچے کے گرد پڑھا جاتا ہے اور دعا کی جاتی ہے۔ اکثر یہ دیگچہ منت کا ہوتا ہے اور منت پوری ہونے پر یہ دیگچہ دیا جاتا ہے۔ قریبی رشتے داروں اور احباب کو اس موقع پر دعوت دی جاتی ہے۔ رشتے دار بڑے اہتمام کے ساتھ آتے ہیں اور اس نیاز میں شرکت کرتے ہیں۔

چوری روزہ: صفر کے مہینے ہی میں بدھ کے روز پشاوریوں کے گھروں میں گندم کے آٹے کی بڑی بڑی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ ان روٹیوں کو روٹ کہتے ہیں اور پھر ان روٹیوں کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کیا جاتا ہے اور پھر اس میں گڑ یا چینی، کھوپرا، چھوارے اور پستہ وغیرہ ملا لیا جاتا ہے۔ یہ چوری تیار ہو جاتی ہے تو فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور قریبی رشتے داروں اور پڑوسیوں میں یہ چوری بانٹی جاتی ہے اور خود بھی بہت دنوں تک یہ چوری کھائی جاتی ہے۔

بارہ ربیع الاول: یہ دن نہایت ہی محترم ہے کہ یہ روز سرکار دو عالم رحمتہ اللعلمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے۔ مسلمان گھرانوں میں اس دن بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ پشاور میں اس دن نہایت تزک و احترام سے منایا جاتا ہے اور مذہبی جوش و خروش کے ساتھ اس دن کی مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ جگہ جگہ جلسے اور جلوس منعقد ہوتے ہیں۔ میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں۔ علماء کرام اور واعظین تقاریر کرتے ہیں۔ نعت خوان ٹولیاں نعتیں پڑھتی ہیں۔ پشاور کے گھروں میں قسم قسم کے پلاؤ اور کھانے پکتے ہیں اور ختم قرآن پاک کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ نوافل ادا کرتے ہیں۔ کاروبار سے چھٹی ہوتی ہے۔ پشاور میں شام کے وقت ایک بہت بڑا جلوس نکلتا ہے۔ اس جلوس میں مختلف مذہبی جماعتیں اور اہل سادات کی ٹولیاں ہوتی ہیں۔ نعت خواں حضرات اور قوال نعتیں پڑھتے ہیں اور قوالیاں کرتے ہیں۔ سارے راستے ذکر الٰہی کا ورد کیا جاتا ہے۔ پشاور شہر کے تقریباً تمام بڑے بڑے بازاروں سے یہ جلوس گزرتا ہوا قصہ خوانی کے بازار میں پہنچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

گیارہویں شریف: ربیع الثانی کا مہینہ غوث اعظم پیران پیر دستگیر حضرت محی الدین جیلانی کی وفات کا مہینہ ہے۔ اہل پشاور اس مہینے کی گیارہ تاریخ کو پیران پیر حضرت غوث اعظم کے نام کی نیاز دیتے ہیں جسے گیارہویں شریف کہتے ہیں۔ اہل عقیدت کے ہاں گیارہویں شریف کا غیر معمولی اہتمام ہوتا ہے۔ بکرے اور دنبے ذبح ہوتے ہیں اور دیگوں میں پلاؤ پکتا ہے۔ بڑی تعداد میں مدعوین جمع ہوتے ہیں۔ ختم قرآن پاک ہوتا ہے۔ واعظین سیرت غوث اعظم بیان کرتے ہیں۔ سادات کے گھرانوں میں اس گیارہویں شریف کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔

عاشورہ: اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ محرم الحرام کا ہے۔ اس مہینے کی دسویں تاریخ کو میدان کربلا میں نہایت ہی دردناک سانحہ رونما ہوا کہ اس روز سرکار دو جہاں کے نواسہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے لخت جگر اور حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے فرزند ارجمند حضرت امام حسینؓ اور ان کے گھر والوں اور ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ دن تاریخ کے دھارے کو بدل دینے کا دن ہے۔ پشاور کے لوگ اور مضافات میں رہنے والے اس دن کو نہایت غم و اندوہ کے ساتھ مناتے ہیں۔ اہل تشیع حضرات زنجیر زنی اور سینہ کوبی کرتے ہیں۔ مختلف امام باڑوں سے ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں۔ ذوالجناح اور علم نکالے جاتے ہیں۔ واعظین حضرت امام حسینؓ اور دیگر شہداء کربلا کے حضور عقیدتوں کو نچھاور کرتے ہیں اور سیرت امام حسین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

اس روز پشاوریوں کے گھروں میں خاص اہتمام ہوتا ہے۔ پلاؤ پکتا ہے اور ختم قرآن پاک ہوتا ہے اور نیاز دی جاتی ہے۔

تیزی: یہ بھی صفر کے مہینے کا ایک تہوار ہے۔ صفر کے مہینے کی تیرہ تاریخ کو پشاور کے لوگ کھیر پکاتے ہیں جسے تیرہ تیزی کی کھیر کہتے ہیں۔ کمہار لوگ اسی موقع پر مٹی کی مختلف سائز کی ہانڈیاں بناتے ہیں اور پھر ان ہانڈیوں پر مختلف رنگوں کے نمونے بناتے ہیں۔ چھوٹے بچے چھوٹی ہانڈیاں خریدتے ہیں اور ان ہانڈیوں میں کھیر ڈال کر کھاتے ہیں۔

نوروز کی رسم: ۲۱ مارچ کو پشاور کے لوگ اور خاص کر اہل تشیع جشن نوروز کی تقاریب منعقد کرتے ہیں۔ تقریباً ہر اہل تشیع کے گھر میں کئی قسموں کے کھانے اور پلاؤ پکتے ہیں اور آپس میں بانٹتے ہیں اور پھر شام کے وقت جلوس نکالا جاتا ہے جس میں ناچتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ قوال حضرات قوالیاں کرتے ہیں اور نعت خواں نعتیں پڑھتے ہیں۔ جلوس میں شیعہ برادری کے علاوہ سنی لوگ بھی بکثرت شریک ہوتے ہیں۔ اس دن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تخت خلافت پر متمکن ہونے سے منسوب اور کیا جاتا ہے اسے جشن نوروز کا نام دیا جاتا ہے۔ ویسے تاریخی اعتبار سے جشن نوروز کا تصور بہت قدیم اور شاہان فارس کی طرف سے بہ تسلسل چلا آ رہا ہے۔

بی دستی کی نیاز: گندم کے آٹے میں دیسی گھی ڈال کر آٹے کو گوندھ لیا جاتا ہے اور پھر جب آٹے میں سختی پیدا ہو جائے تو موٹی موٹی روٹیاں بنا کر توے پر انہیں پکا لیا جاتا ہے جنہیں روٹ کہتے ہیں۔ پھر ان پکے ہوئے روٹوں کو ہاتھ کی ہتھیلیوں سے رگڑ رگڑ کر چوری بنا لیتے ہیں۔ اس چوری میں شکر یا چینی ملا کر اس کے اوپر بی دستی کے نام کی فاتحہ پڑھتے ہیں اور پھر اس چوری کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کو بی دستی کی نیاز کہتے ہیں۔

بی بی آس کی نیاز: پشاوریوں کے گھروں میں عموماً ایک نیاز بی بی آس کے نام کی دی جاتی ہے جس کا بہت اہتمام ہوتا ہے۔ کسی بھی کام کے سلسلے میں منت مانی جاتی ہے اور پھر منت پوری ہونے پر یہ نیاز اس طرح دی جاتی ہے کہ سوا سیر یا ڈھائی سیر حسب استطاعت یا منت گندم کا آٹا گوندھ لیتے ہیں گوندھنے سے پہلے حسب مقدار سرسوں کا تیل آٹے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر اس آٹے کی موٹی موٹی روٹیاں پکا کر روٹ بنا لئے جاتے ہیں۔ ان روٹوں کو ہاتھوں میں رگڑ کر چوری بنالی جاتی ہے اور پھر اس چوری میں شکر ڈال دی جاتی ہے۔ اس نیاز میں صرف خواتین شریک ہوتی ہیں اور مردوں کا بیٹھنا ممنوع ہوتا ہے حتیٰ کہ بچہ بھی اس نیاز میں شریک نہیں ہو سکتا۔ تمام شریک خواتین بی بی آس کے نام کی فاتحہ پڑھتی ہیں اور پھر اس وقت جس کے دل میں جو ارادہ ہو اس کے لئے منت مانگ لیتی ہیں کہ اگر ان کا کام ہو جائے تو وہ بھی اسی طریقے سے بی بی آس کے نام کی نیاز دیں گی۔ فاتحہ اور منت مانگنے کے بعد ہر شریک خاتون لگن میں سے یہ چوری ڈال کر کھاتی ہے۔ ایک خاص بات اس میں یہ ہے کہ جو عورت منت ماننا چاہتی ہو وہ اس چوری میں سے ایک گول لڈو بنا لیتی ہے اور پھر یہ لڈو کھاتی ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس خاتون نے اپنے کام کے لئے منت مان لی ہے۔

ٹھوٹھوں کی نیاز: اہلیان پشاور کے اکثر گھرانوں میں کھیر پکا کر اسے مٹی کے بنے ہوئے پیالوں میں ڈال دیتے ہیں اور کھیر کو ٹھنڈا کر لیا جاتا ہے یہ گیارہ پیالے ہوتے ہیں جو کہ گیارہ اماموں کے نام کے ہوتے ہیں۔ گھر والوں سمیت گیارہ لوگ ان پیالوں کو کھاتے ہیں۔ اس سے پہلے گیارہ اماموں کے نام کی فاتحہ دی جاتی ہے پھر ان گیارہ حاضر لوگوں میں سے کوئی اگر منت مانتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں بھی یہ نیاز دوں گا یا دوں گی تو منت ماننے والے کو یہ پیالہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر منت اور نیاز دینے کا پکا ارادہ کر کے کھانا پڑتا ہے۔ اسے ٹھوٹھوں کی نیاز کہتے ہیں۔

کونگڑیاں: جب کسی گھرانے میں بچہ پیدا ہو تو اس وقت مکئی کے دانوں کو پانی میں ابال کر ان پر شکر ڈال دیتے ہیں جسے اہلیان پشاور "کونگڑیاں" کہتے ہیں آس پڑوس کے بچے ان دانوں یعنی کونگڑیوں کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

اکھوہ: یہ پشاوریوں کے ہاں ایک ایسا پکوان ہے جس کا تعلق منت اور نیاز سے ہے۔ جب کسی کی آنکھیں دکھتی ہوں یا وہ آشوب چشم کا شکار ہو اور علاج بسیار کے باوجود آنکھیں ٹھیک نہ ہوں تو آنکھوں کی شفایابی کے لئے یہ منت مانی جاتی ہے کہ اگر آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی تو اکھوے پکا کر غازی میاں کے نام کی نیاز دی جائے گی۔

یہ پکوان اس طرح پکتا ہے کہ سوا سیر گندم کے آٹے میں مقدار کے مطابق گھی ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس آٹے کو گوندھ لیا جاتا ہے۔ جب آٹے میں سختی پیدا ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لئے جاتے ہیں۔ ہر پیڑے کو ہتھیلی پر رکھ کے درمیان سے دوسرے انگوٹھے سے دباتے ہیں اور پیڑے کو چراغ نما بنا لیتے ہیں اور پھر کڑاہی میں گھی ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیتے ہیں۔ جب گھی گرم ہو جاتا ہے تو اس میں یہ اکھوہ ڈال دیتے ہیں۔ جب یہ گھی میں سرخ ہو جاتے ہیں تو نکال لیتے ہیں اور دوسرے برتن میں گڑ یا چینی کا شیرا بنا لیتے ہیں اور پھر اس پکے ہوئے اکھوے کو میٹھے شیرے میں ڈبو کر باہر نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد آٹے کے پیڑے کا ایک دیا بنا لیا جاتا ہے۔ اس میں تیل ڈال دیتے ہیں اور روئی کی بتی بنا کر اس میں رکھ کر جلاتے ہیں اور پھر ان اکھوؤں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور آس پاس

کے پڑوسیوں اور بچوں کو کھلاتے ہیں اور اہل خانہ خود بھی کھاتے ہیں۔

کنچکاں: اگر بچوں کو چیچک یا خسرے کے دانے اور پھوڑے ہو نکل آتے ہیں تو جب بچہ تندرست ہو جاتا ہے تو اس موقع پر میٹھے چاول پکائے جاتے ہیں۔ اکثر گھرانوں میں یہ میٹھے چاول گڑ کے ہوتے ہیں۔ پھر صحت یاب ہونے والے بچے کو نہلا کر یہ میٹھے چاول بچوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس پکوان کو کنچکاں کہتے ہیں۔

میلے، تہوار اور عرس

جھنڈوں کا میلہ: پشاور کے قدیم ثقافتی میلوں میں جھنڈوں کا میلہ ناقابل فراموش میلہ ہے۔ یہ سردیوں میں ماگھ کے دنوں میں لگتا تھا۔ اس میلے کو پشاور کے شہری اور دیہاتی، پشتون اور غیر پشتون یکساں دلچسپی اور اجتماعیت کے ساتھ عیدین کے میلوں کی طرح مناتے تھے۔ اب تقریباً بیس پچیس سالوں سے یہ میلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس میلے کا مرکز پشاور شہر ہوتا تھا اور گردونواح کے تمام لوگ اس روز پشاور میں جمع ہوتے۔ یہ میلہ سخی سرور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سخی سرور کا اصلی نام احمد تھا جو سخی سرور سلطان کے نام سے مشہور ہوئے۔ ڈیرہ غازی خان میں سخی سرور کے عرس کے دنوں میں ہی پشاور میں جھنڈوں کے میلے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں اور لوگ اس میلے کی ڈھولک بجا کر محلہ محلہ اور گلی گلی منادی کرتے۔ سب سے پہلے یہ میلہ مکڑی گودام کے پاس لگتا تھا بعد میں یہ میلہ شاہی باغ اور چوک یادگار کے پاس لگتا تھا۔

میلہ عیدین: عیدالفطر اور عیدالاضحی دونوں مذہبی تہوار پشاور کے لوگ بڑی گرمجوشی اور مذہبی جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ عیدالفطر کا تہوار رمضان المبارک کے مہینے کے بعد شوال کی پہلی تاریخ کو تین روز تک منایا جاتا ہے جبکہ عید الاضحی کا تہوار ذی الحج کی دس تاریخ سے شروع ہو جاتا ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحی دونوں تہواروں کے موقعوں پر پشاور میں تین روز تک مسلسل میلہ لگتا ہے۔ اب بھی یہ تہوار اسی روایت کے ساتھ منائے جاتے ہیں لیکن پہلے شاہی باغ میں قطار در قطار پشاور کی دیسی مٹھائیوں کی دکانیں سج جاتی تھیں۔ جگہ جگہ بچوں کے جھولے نصب ہو جاتے، سیخ کباب، سیخ تکہ، پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکانوں پر رش قابل دید ہوتا تھا۔ بچے بوڑھے اور جوان نئے اور رنگ برنگ کپڑے پہنتے۔ نئی چپل بنتے اور پگڑ باندھتے اور اس خوشی میں شریک ہوتے۔

عیدالفطر کی تیاریاں اکیس رمضان المبارک سے شروع ہو جاتیں۔ حلوائی شب و روز دکانوں کو سجانے کے لئے مٹھائیوں کے نمونے بناتے، چپلوں اور کپڑوں کے بازاروں میں اژدھام لگ جاتا۔ عیدالفطر کے پہلے روز ہر پشاوری سویاں پکاتا ہے اور سب سے پہلے ان سویوں فاتحہ کر پڑھتا ہے اور پھر قریبی رشتے دار اور ہمسائے آپس میں ان سویوں کا تبادلہ کرتے۔ محلے کی مسجد میں ہر پشاوری گھرانے سے سیویاں جمع ہو جانا شروع ہو جاتی ہیں۔ مرد عیدالفطر کی نماز کے لئے جامع مساجد میں چلے جاتے ہیں۔ گھر میں آ کر بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ اسی طرح گرمجوشی اور مذہبی روایت کے ساتھ عید ملی جاتی ہے۔ ہر گھر میں نئی نویلی دلہنیں اور بچیاں نئے کپڑے اور زیورات پہنتی ہیں اور مہندی بڑے اہتمام کے ساتھ لگاتی ہیں۔ چوڑیاں اور دوسری چیزیں سوغات میں بانٹی جاتیں ہیں۔ بزرگ لوگ چھوٹوں کو عیدی میں پیسے دیتے ہیں، عزیز رشہ دار اور یار دوست ایک دوسرے کو ملنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بچے اور جوان میلوں کے مقامات پر چلے جاتے ہیں۔

عیدالاضحی کے موقع پر بھی یہی کیفیت ہوتی ہے البتہ عیدالاضحی کے موقع پر نماز عید کے بعد گائے بھینسوں، دنبوں، بکروں اور اونٹ کی قربانی کا عمل شروع ہو جاتا ہے جو مسلسل عید کے تین دن تک جاری رہتا ہے۔ پشاوری لوگ عید قربان پر قربانی کا گوشت مساکین وغرباء کے علاوہ رشتے داروں کے ہاں ضرور بھجواتے ہیں چاہے یہ رشتے دار کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں گوشت ضرور پہنچایا جاتا ہے۔

میلہ نوشوھادی دا: یہ میلہ پشاوریوں میں ایک خاص مذہبی مسلک اور عقیدت سے منسوب ہے اور اس میلے کا نہ کوئی خاص مقام ہے اور نہ کوئی معین وقت ہے۔ اس میلے کی نسبت اللہ کے ایک ولی حضرت نوشوھادی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف ہے۔ ان کا مزار پنجاب کے ضلع گجرات میں ہے۔ ان سے جی ٹی روڈ پر بالمقابل گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1، ایک تکیہ منسوب ہے۔ اس مقام پر ایک مسجد بھی، مسجد نوشو کے نام سے تعمیر ہو چکی ہے۔ اس میلے کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ کسی بھی مقام پر ان کے مرید لکڑیوں کی ایک بہت بڑی چوکھٹ بنا لیتے ہیں اور ایک خاص منادی شدہ دن لوگ یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ پہلے نوشوھادی کا گڑ مریدوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ چوکھٹ کے اردگرد بیٹھ جاتے ہیں۔ قوالوں کی ٹولیاں بھی موجود ہوتی ہیں جو سب سے پہلے قوالی کرتے ہیں۔ مریدین بڑے انہماک کے ساتھ قوالی سنتے ہیں۔ اس موقع پر لنگر بھی تقسیم ہوتا ہے۔ قوالی کے دوران جو مرید زیادہ وجد میں آ جائے اور حال سے بے حال ہو جائے تو اس کی ٹانگوں کو رسی سے باندھ دیا جاتا ہے اور پھر اسے دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ وہ قوالی کے دوران طبلے کی تھاپ پر الٹی حالت میں خوب جھومتا ہے۔ جب ایک تھک جائے تو پھر دوسرے کو لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس حالت میں

کچھ بیمار لوگ بیماری سے شفایاب بھی ہو جاتے ہیں اور اس تکلیف دہ عمل کے بعد سبک بدن بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ خالصتاً ایک عقیدے کا حامل میلہ ہے جو مخصوص لوگ ہی مناتے ہیں۔ اس کا کوئی معین وقت اور مقام نہیں ہے۔ میلہ نوشوھادی سے متعلق پشاور میں خاص ایک دو گروہ ہیں جو اس میلے کی بابت پوری طرح جانتے اور وہی لوگ اس میلے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ میلہ اب بھی منعقد ہوتا ہے۔

میلہ دسہرا: یہ میلہ سکھوں سے منسوب ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے پشاور میں سکھ آبادی یہ میلہ بڑے جوش وخروش سے مناتی تھی۔ بچے نئے کپڑے پہن کر جلوس نکالتے اور بازاروں اور محلوں میں گشت کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ میلہ ختم ہو چکا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے پشاور کے میلوں میں شمار ہوتا ہے۔

ہولی: یہ تہوار ہندوؤں سے منسوب ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندو اس تہوار کو بڑی شان سے مناتے تھے۔ اب تک جہاں ہندو آباد ہیں وہ اپنے طور پر اس تہوار کو مناتے ہیں اور اپنے احاطے میں جلوس نکالتے ہیں۔

لوئی: پشاور میں اس تہوار کا بھی بڑا چرچا تھا۔ لوئی ایک موٹے بنے ہوئے کمبل کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ہندوؤں کا تہوار ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندو اس تہوار کو بڑی شان سے مناتے تھے۔ یہ تہوار ہندو بہار کے موسم میں مناتے ہیں۔ اس کے لئے ہندوؤں نے پندرہ مارچ کی تاریخ مقرر کر رکھی تھی جو اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ سردیوں کے موسم کو الوداع کہا جا رہا ہے۔ ہندوؤں کے گھروں کی کھڑکیاں اور روشندان سردیوں کے موسم میں موٹے اور گرم کپڑے سے بند ہوتے تھے، اس تاریخ کو یہ موٹے کپڑے ان پر سے ہٹا دیئے جاتے اور ہر ہندو اپنے گھر کے دروازے کے باہر اسے ڈھیر کر کے آگ لگا دیتا تھا۔ اور پھر ہندو اسی آگ اور دھوئیں میں ایک دوسرے سے بڑے پرتپاک اور مسرت آمیز انداز میں ملتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ رات کو گانے بجانے کی محفلیں بھی سجتی تھیں۔ ہندوؤں کے یہاں سے رخصت ہونے کے ساتھ ہی پشاور سے یہ میلہ اور تہوار بھی رخصت ہو گیا۔

کرسمس: ملک کے دوسرے حصوں کی طرح پشاور میں بھی یہ تہوار عیسائی بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ یہ تہوار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے دن سے منسوب ہے۔ عیسائیوں کی عبادت گاہ گرجا گھروں کو خوب سجایا جاتا ہے جہاں رات گئے تک عبادت کی جاتی ہے۔ رات کے بارہ بجے بیک وقت تمام گرجا گھروں میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں جو نئے سال کی آمد کی نوید ہوتی ہے اور پھر تمام دعائیں کرتے ہیں۔ عیسائی آبادیوں میں میلہ لگتا ہے۔ مرد وزن اور بڑے چھوٹے تمام عیسائی نئے کپڑے پہنتے ہیں اور ایک دوسرے کے گھروں میں جا کر تحائف کے تبادلے کرتے ہیں۔

ایسٹر: عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی یاد میں یہ تہوار عیسائی آبادیوں میں اب تک منایا جاتا ہے اور عید کی طرح اس تہوار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عیسائی گرجا گھروں میں عبادت کرتے ہیں اور خدا کے حضور نذرانے پیش کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے کھانے پکاتے ہیں اور (تمثیل) کے ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ یہ عیسائیوں کے نزدیک بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ پشاور کے مختلف مقامات پر عیسائی یہ دن مناتے ہیں۔ بڑا میلہ سینٹ جان ہیرون کوہاٹی گیٹ میں لگتا ہے۔

چمکنی کا میلہ: عیدالفطر کے تیسرے روز پشاور سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر جی ٹی روڈ کے پاس مزار میاں عمر کے پاس چمکنی گاؤں میں یہ میلہ لگتا ہے۔ شہر کے لوگ اس روز چمکنی مزار پہنچ کر حضرت میاں عمر پر حاضری دیتے ہیں۔

شیخ بچو کا میلہ: عیدالفطر کے چوتھے روز جی ٹی روڈ کے پاس اکبر پورہ گاؤں میں حضرت شیخ بچو کے مزار پر یہ میلہ لگتا ہے۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں شہر سے اس مقام پر پہنچتے ہیں اور مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

میلہ وزیر باغ: پشاور شہر کے مقام وزیر باغ میں جو کہ درانیوں کے دور میں فتح محمد خان وزیر نے تعمیر کروایا تھا۔ پشاوری یکم مارچ کو میلہ منعقد کرتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے کر وزیر باغ چلے جاتے تھے اور سارا دن وہاں گزارتے تھے۔ یکم مارچ کے علاوہ ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ میں بھی یہاں میلہ لگتا تھا اور پشاوریوں کے گھرانے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

عرس شریف حضرت شاہ قبول اولیاءؒ: ہر سال مئی کے مہینے کی آخری جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے روز تین روزہ عرس کا اہتمام بمقام مزار حضرت سید شاہ قبول اولیاء رحمتہ اللہ علیہ بڑے اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگ دور دراز سے عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے عرس میں گرمجوشی کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ ختم قرآن پاک کے ساتھ ساتھ نعت خوانی اور قوالیوں کی محافل منعقد ہوتی ہیں اور واعظین حضرت سید شاہ قبول اولیاءؒ کی سوانح کے بارے میں وعظ کرتے ہیں۔ بڑے نامور قوال ملک کے مختلف حصوں سے آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عرس کی تقریبات ہر روز نماز

عصر کے بعد شروع ہوتی ہیں جو کہ ساری ساری رات جاری رہتی ہیں۔

عرس و میلہ کاکا صاحبؒ: نوشہرہ کے ایک گاؤں کاکا صاحب جو حضرت رحمکا المعروف کاکا صاحبؒ کے نام سے منسوب گاؤں ہے اور اسی مقام پر حضرت کاکا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مزار بھی ہے ہر سال اسلامی مہینے رجب میں یہاں پر کاکا صاحب کا میلہ و عرس منعقد ہوتا ہے اس موقع پر نہایت گہما گہمی ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگ علاقہ غیر سے یہاں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ عقیدت مند پشاور و گردونواح سے بھی آ کر حاضری دیتے ہیں اور میلے کو چار چاند لگاتے ہیں۔ بازار لگتے ہیں۔ یہاں پر بان کی بنی ہوئی ٹوکریاں اور شیشے کی چوڑیوں کی دکانیں بکثرت ہوتی ہیں جو لوگ بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی دکانیں بھی سجائی جاتی ہیں۔

میلہ و عرس شیخ بابا پہی: جی ٹی روڈ پشاور پہی کے مقام پر شیخ بابا المعروف پہو باباؒ کا مزار ہے۔ ہر اتوار کے روز بادی مرض کے بیمار لوگ مزار پر حاضری دیتے اور دعا کرتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ ان کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع پر بازار لگتا اور کھانے پینے اور دیگر اشیاء کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ یہ میلہ ہر سال اسلامی مہینے کی 2 شوال اور پھر ذوالحجہ کی 3 تاریخ کو لگتا ہے۔

میلہ فقیر فتح شاہ: گنج دروازہ کے باہر ارمڑ میانہ کے مقام پر فقیر فتح شاہ کے نام سے منسوب میلہ سال میں دو مرتبہ منعقد ہوتا تھا۔ (عید الفطر کے چوتھے روز شوال کی 4 تاریخ کو اور پھر ذوالحجہ کی 14 تاریخ کو) اب یہ میلہ متروک ہے۔ مگر پھر بھی لوگ جمع ہوتے ہیں۔

حضرت اخوندرویزہ: ماہ محرم کی دسویں تاریخ کو لوگ حضرت اخوندرویزہ کے مزار پر بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔

حضرت اخوندرویزہ عالم فاضل روحانی شخصیت تھے۔ آپؒ حضرت پیر بابا رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ خاص تھے۔ انہوں نے بایزید انصاری کی تحریک روشنائی کے خلاف پیر باباؒ کے ساتھ نمایاں کردار ادا کیا اور بایزید انصاری کے عقائد کو علمی دلائل کے ساتھ رد کیا۔ ان کی تصنیف تذکرہ الابرار والاشرار تاریخی نوعیت کی دستاویز ہے۔ وہ بچے جو کہ پڑھائی میں جی نہیں لگاتے اور کند ذہن ہوتے ہیں ان کو والدین حضرت اخوندرویزہ کے مزار پر لے جاتے ہیں اور وہاں دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ان بچوں کے ذہن کشادہ ہو جاتے ہیں اور وہ پڑھائی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ چونکہ حضرت اخوندرویزہ خود بھی عالم اور فاضل زمانہ تھے اس لئے اس اثر کی بناء پر کند ذہن لوگ علمی اثر قبول کر لیتے ہیں۔

فن تعمیر

عام رہائش: پشاور شہر کے عام شہریوں کے قدیم طرز کے مکانات کے نمونے آج تک بعض علاقوں اور محلوں میں پائے جاتے ہیں جو شہر پشاور کے مخصوص فن تعمیر کی یادگار ہیں۔ ان مکانات میں بعض اہل ثروت کے بڑے بڑے لکڑی کے دروازوں والے اور کھلی ڈیوڑھی پر مشتمل دو دو تین تین منزلہ مکانات ہیں جنہیں حویلی کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے مکانات گنج کے علاقہ کے اندر اب تک موجود ہیں جہاں زیادہ تر قزلباشوں کے مکانات ہیں۔ متمول لوگوں کے مکانات کی طرز تعمیر کچھ اس طرح تھی کہ برلب گلی یا سڑک بڑے بڑے لکڑی کے بنے ہوئے دروازے ہوتے تھے۔ دروازوں پر چتر کاری ہوتی تھی جو گندھارا آرٹ کا حصہ ہے۔ چتر کاری کے نمونوں کے ساتھ ساتھ لوہے کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چرخیاں چسپاں ہوتی تھیں جو مالک مکان کی شان و شوکت کا پتہ بتاتی تھیں۔ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑی ڈیوڑھی ہوتی تھی جو آج کل کے کمرے کے رقبے پر مشتمل ہوتی تھی' ڈیوڑھی کو پار کیا جائے تو ایک دوسرے دروازے کی چوکھٹ آتی تھی اور اکثر پھر دائیں یا بائیں مڑتے وقت ایک اور چوکھٹ نظر آتی تھی جس کو پار کر کے آدمی مکان کے کھلے صحن تک پہنچ جاتا تھا۔ صحن کے چاروں طرف اونچائی پر کمرے بنائے جاتے تھے جن میں داخل ہونے کے لئے لکڑی کے تختوں یا اینٹوں کی دہلیزیں ہوتی تھیں جو تین یا چار سیڑھیوں پر مشتمل ہوتیں۔ ہر کمرے کا ڈبل یا سنگل لکڑی کا نقشین دروازہ ہوتا۔ کھلے کھلے کمروں میں قالین، دری یا اون سے بنے ہوئے گلم بچھے ہوتے تھے' کمرے کی چھتوں کے نیچے لکڑی کے تختے جڑے ہوتے جن پر حسب منشاء روغن کر دیا جاتا تھا۔ اکثر چھت کے ساتھ پرانے فانوس بھی لٹکائے جاتے تھے۔ دیواروں پر چونے اور ریت کو ملا کر پلستر کیا جاتا تھا اور ہر کمرے میں مغل آرٹ کا نمونہ پیش کرنے والے خوبصورت چینی خانے بنوائے جاتے تھے جو الماری کا کام دیتے تھے اور ان میں اکثر چینی کے بنے ہوئے برتن سجائے جاتے تھے۔ درمیان کا صحن کھلا ہوتا تھا اور اوپر کی منزل پر گز ڈیڑھ گز کی بلندی پر تختوں کا بنا ہوا منگ بنوایا جاتا تھا جہاں خوبصورت لکڑی استعمال کی جاتی تھی جبکہ بعض جگہوں پر صحن کو بھی پوری طرح چھت دیا جاتا تھا اور درمیان میں تختوں اور لوہے کی پتریوں کا بنا ہوا منگ رکھ دیا جاتا تھا جو نیچے کے کمروں میں سورج کی روشنی پہنچانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ نیچے کے چوطرفہ

کمروں کے باہر کے حصوں میں عروسیاں بنی ہوتی تھیں انہیں پشاوری بستے کہتے تھے اور آسانی سے ان بستوں کو چڑھا بھی دیا جاتا تھا اور گرا بھی دیا جاتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں کمروں میں ہوا پہنچانے کے لئے یہ بستے چڑھا دیئے جاتے تھے پھر اوپر کی منزل پر اینٹوں کا فرش بنایا جاتا تھا اور دوسری منزل پر اکثر آدھے حصے میں اوپر کی منزل بھی ہوتی تھی جسے بالا خانہ کہتے تھے۔ سامان وغیرہ رکھنے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ ہوتا تھا جو سٹور کا کام دیتا تھا اسے کھڈلا کہتے تھے۔ اکثر ان حویلیوں کی نچلی منزل کے نیچے تہ خانہ بنایا جاتا تھا جہاں گھپ اندھیرا ہوتا اور گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے کھانے کے بعد یہاں لوگ آرام کرتے جو انتہائی ٹھنڈا ہوتا تھا یہ قدرتی انتظام تھا اس کے علاوہ وہ کمرے جو گلی یا بازار کی سڑک کی طرف کھلتے تھے وہاں بھی عروسیاں یعنی بستے ہوتے تھے اور اکثر کمروں کے ان حصوں والی عروسیوں کے آگے کانے کی بنی ہوئی چک لٹکائی جاتی تھیں جو پردے کا کام دیتی تھیں اور ساتھ ہی ان کے سوراخوں سے قدرتی ہوا بھی آتی تھی۔ اسی طرح عام آدمیوں کے چھوٹے موٹے مکانات بھی اسی نوعیت کے بنے ہوتے تھے فرق صرف یہ ہوتا کہ غریب لوگوں کے مکانات چھوٹے اور مٹی کے بنے ہوتے دیواروں میں لکڑیوں کے سہارے لگائے جاتے تھے جو دیواروں کو مضبوط رکھتے اور آج کل کی اصطلاح کے مطابق لنٹر کا کام دیتے تھے۔ ان مکانات کے اوپر کے حصے میں لیٹرین بنائی جاتی تھی اور اس سے متصل ہی غسل خانہ بھی بنا ہوتا تھا جہاں پر کچے گھڑوں اور مٹکوں کا پانی موجود رہتا تھا۔ عام طور سے ہر گھر میں مٹی کے گھڑوں کے لئے گھڑونچی بنی ہوتیں جو لکڑی کی ہوتی اور اس پر یہ گھڑے رکھے جاتے تھے البتہ پشاوریوں کے گھروں میں مس یعنی تانبے کے بنے ہوئے گھڑے بھی استعمال ہوتے تھے لیکن پانی کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے عام طور سے مٹی کے بنے ہوئے گھڑے استعمال کئے جاتے تھے۔ اسی طرح عام لوگوں کے گھروں میں کھانے پینے کے برتن مٹی کے ہوتے تھے جو کمہار خاص مہارت کے ساتھ بنا کر بیچتے تھے۔ کمہار اکثر یہ برتن گدھوں پر لاد کر محلہ محلہ اور گلی گلی بیچا کرتے تھے۔ ایک قابل ذکر بات ان مکانات میں یہ تھی کہ اکثر ان رہائش گاہوں کے اوپر کے حصے میں ہمسائے کے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم رکھنے کی خاطر ایک چھوٹی سی کھڑکی بنائی جاتی تھی جسے پشاوری ''باری'' کہتے تھے ان کھڑکیوں کے ذریعے اکثر کھانے پینے کی اشیاء کے تبادلے کرتے اور ایک دوسرے کی غمی و خوشی کے موقع پر آمد و رفت رکھتے جس سے آپس میں اخوت و بھائی چارہ کی خو بڑھتی رہتی تھی۔ یہ ہمسائے بلا امتیاز ایک دوسرے کے لئے پشت پناہ ہوتے تھے اور انکے رشتے آپس میں قریبی رشتے داروں سے بھی زیادہ پختہ اور لازوال ہوتے تھے۔ اس قسم کے ثقافتی تعلقات کی نوعیت کو ظاہر کرنے والی کھڑکیاں اب بھی پشاور کے قدیم گھرانوں میں موجود ہیں۔

قدیم رہائش گاہیں، حویلیاں اور یادگار عمارتیں: جس طرح پشاور ایک قدیم تاریخی شہر ہے اسی طرح پشاور کی بعض رہائش گاہیں، یادگاریں، مساجد، باغات، مندر اور پکوڑے وغیرہ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ پشاور کی تاریخی اور قابل ذکر رہائش گاہوں اور حویلیوں میں سیٹھیوں کے مکانات یہاں کے قدیم تاریخی اور ثقافتی فن تعمیر کا شاہکار ہیں۔ پشاور کی قدیم گورگٹھڑی کی عمارت اور گھنٹہ گھر کے درمیان بازار کلاں میں ایک پورا محلہ سیٹھیوں کے نام سے منسوب ہے۔ جسے محلہ سیٹھیاں کہتے ہیں۔ اس محلے میں سیٹھیوں کی یہ حویلیاں اور مکانات ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لئے وجہ نظارہ ہیں اس سلسلے میں سیٹھی خاندان کے ایک متمول اور خدا ترس بزرگ سیٹھی کریم بخش مرحوم کی حویلی دیکھنے والوں کو ماضی کے تعمیراتی فن کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہ حویلی اب تک اپنی قدیم شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے۔ بیرونی چند سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ایک بہت بڑا گیٹ سیاحوں کو خوش آمدید کہتا ہے گیٹ کے اندر ایک کشادہ صحن ہے جس کے عین وسط میں ایک حوض ہے صحن کے گرداگرد دالان بنے ہوئے ہیں۔ ہر دالان ایک خاص اونچائی پر واقع ہے جس پر پہنچنے کے لئے چند سیڑھیوں کو عبور کرنا پڑتا ہے ان دالانوں کے اوپر بھی گرداگرد پرانی عروسیوں اور بستوں والے کمرے ہیں۔ حویلی میں لکڑی زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ بیرونی دروازے سے داخل ہونے کے بعد بائیں طرف کا کمرہ جو عام نشست گاہ ہے چند سیڑھیوں کو عبور کر کے اس میں داخل ہونا پڑتا ہے اس کمرے کی چھت کے ساتھ قدیم فانوس لٹکے ہوئے۔ ہیں اس کی دیواریں منقش ہیں اور دیواروں پر خطاطی کے رنگین نمونے ہیں۔ جابجا شیشے کا کام ہے اس کمرے کے بالمقابل ایک اور بڑا سا کمرہ ہے اور اوپر خوبصورت اور دیدہ زیب بالکونی بنی ہوئی ہے۔ اوپر کے کمرے تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں عبور کی جاتی ہیں یہ ساری عمارت قدیم مغل طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس حویلی کے علاوہ دیگر سیٹھیوں کے مکانات بھی اسی قسم کی طرز تعمیر پر مشتمل ہیں۔ پشاور کے علاقہ کریم پورہ کے مختلف محلوں اور آسیہ میں ہندوؤں کے مکانات بھی یہاں کی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں علاقہ یکہ توت میں سید امیر شاہ کی حویلی یہاں کی قدیم حویلی کا نمونہ پیش کرتی ہے یہ حویلی سادات گھرانے کا پروقار ورثہ ہے۔ یہ بارکوں والی حویلی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس حویلی کے شمال مشرق کی جانب ایک بڑا سا گیٹ ہے جو پرانی طرز کا ہے۔ اس دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب مستطیل قسم کا ایک

بڑا سا حجرہ نما کمرہ ہے جس کے آخر میں چھوٹی چھوٹی بارکیں بنی ہوئی ہیں جو سڑک کے کنارے کی طرف کھلتی ہیں یہ عام نشست گاہ ہے جس کی چھت پرانی لکڑیوں اور شہتیر کی بنی ہوئی ہے اس بڑی نشست گاہ کے آخری سرے جنوب مشرق کی طرف اندرونی دروازہ ہے جو زنان خانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس حویلی کا تمام بیرونی حصہ مٹی اور لکڑی سے بنا ہوا ہے۔

حویلی فضل صمدانی: ایک اور عمارت بھانہ ماڑی میں مولانا فضل صمدانی مرحوم کی حویلی ہے اس حویلی کے اوپر کے کمرے میں مولانا مرحوم کی جمع کی ہوئی پرانی اور نادر کتب اور دیگر نوادرات ہیں۔ اس حویلی کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جو بنوری خاندان سے منسوب ہے۔

سرائیں: پشاور کے بعض علاقے جو اب سراؤں کے نام سے منسوب ہیں ان محلوں اور علاقوں میں بڑی بڑی سرائیں ہوتی تھیں جن کے اندر چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوتے تھے۔ پشاور کے بازار قصہ خوانی کے عقب میں بابو حیدر کی سرائے بڑی مشہور تھی اب اس علاقے کو بابو حیدر روڈ کہتے ہیں۔ اسی طرح محلہ جنگی اور جہانگیر پورہ کے وسط میں محلہ سرائے کالا خان بہت مشہور محلہ ہے جو پرانی سرائے کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح سرائے جھکت سنگھ، سرائے مرلی لال، سرائے رین بسیرا، سرائے جگن ناتھ پشاور کی بہت مشہور سرائیں تھیں اس کے علاوہ موجودہ شاہین بازار میں گل حسن کی بساط کے نام سے ایک پرانی حویلی تھی جو اب موجود نہیں۔

قدیم اور یادگار عمارت گور کھٹڑی: پشاور میں بدھ عہد کے ابتدائی دور کی ایک عظیم اور تاریخی عمارت جو عظیم ثقافتی ورثے کے طور پر اب تک قائم ہے یہ عمارت گور کھٹڑی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تاریخی اور بدھ مت کی یادگار عمارت گور کھٹڑی شاہان بدھ عہد کی تعمیر کردہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عجیب وغریب عمارت ہے جو پشاور شہر کے انتہائی بالائی مقام مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہ مستطیل قسم کی عمارت شرقاً غرباً دو بڑے بڑے قدیم دروازوں پر مشتمل ہے۔ عمارت کا غربی دروازہ جو شہر کے مشرق کی طرف ہے صدر دروازہ کہلاتا ہے جس میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف کچھ فاصلے پر ایک قدیم مندر کی عمارت ہے۔ اس مندر کے سامنے ایک تالاب ہے عمارت کے گرداگرد اندر کی طرف چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے گئے ہیں اس عمارت ''گور کھٹڑی'' کی وجہ تسمیہ میں اس روایتی داستان کو معقول وجہ کا درجہ حاصل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مندر کے سامنے ایک گورکھ ناتھ نامی ہندو سادھو کی حکمت کی دکان تھی۔ چونکہ ہندکو میں دکان کو ہٹی کہا جاتا ہے اس لئے یہاں کے رہنے والے لوگ اس مقام کو گورکھ دی ہٹی کہنے لگے۔ عرصہ گزرنے کے بعد یہ الفاظ تبدیل ہو کر گورکھ دی ہٹڑی ہو گئے اور پھر اس کے بعد اسے گور کھٹڑی کہا جانے لگا اور یہ عمارت آج تک اس نام سے مشہور ہے۔ اس تاریخی عمارت کو ہر دور میں اہمیت حاصل رہی ہے گور کھٹڑی کی عمارت کو دیکھنے کا شوق مغل شہنشاہ بابر کو بہت زیادہ بے چین رکھتا تھا ہر چند کے بابر جب پہلی مرتبہ پشاور پہنچا تو اس نے اس عمارت کو دیکھنے کا عندیہ ظاہر کیا ۱۵۰۵ء میں جب مغل شہنشاہ بابر نے کابل کو فتح کر لیا تو علاقے کا جائزہ لینے اور مال غنیمت جمع کرنے کی غرض سے براستہ درہ خیبر جمرود کے مقام پر پڑاؤ کیا اور یہیں سے پشاور تفریح کے لئے آیا۔ اس وقت بابر کے ساتھ بطور راہبر سعید بگرامی تھا۔ بابر نے بگرامی کے سامنے گور کھٹڑی کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا جو گور کھٹڑی کی عمارت کے ظاہری اور خفیہ راستوں کے بارے میں بخوبی جانتا تھا لیکن بگرامی نے اس عمارت کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور اس وقت بابر یہ عمارت نہ دیکھ سکا ابو سعید بگرامی کی اس تجاہل عارفانہ حرکت کے بارے میں بابر کو علم ہو گیا تھا لیکن اس نے آئندہ کسی موقع پر اس عمارت کو دیکھنے کے منصوبے کو التواء میں ڈال دیا چنانچہ بابر جب پنجاب کی مہم سے فارغ ہو کر دریائے سندھ کو عبور کر کے پشاور پہنچا تو پھر یہاں چند روز قیام کے دوران بابر نے گور کھٹڑی کا تفصیلی مشاہدہ کیا۔

گور کھٹڑی کی عمارت کو بعض حکمرانوں نے رہائش کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۲ء سکھوں کے دور میں جب اطالوی نژاد اویطیا ئیل نامی گورنر یہاں مقرر ہوا تو گور کھٹڑی کی عمارت کو اس نے اپنی رہائش کے لئے گورنر ہاؤس کے طور پر اختیار کیا اور اس کے بوسیدہ حصوں کی مرمت کروائی۔ ۱۹۹۸ء کے اواخر میں گور کھٹڑی کی عمارت کی تاریخی حیثیت بحال و برقرار رکھنے کے لئے صوبہ سرحد کے چیف سیکرٹری نے ذاتی دلچسپی لے کر اس شاہکار کو بچانے کے لئے سرکاری سطح پر احکامات جاری کئے اور محکمہ آثار قدیمہ کو اس عمارت کے اندر کھدائی کے کام کے لئے احکامات جاری کئے اور اس عمارت کے شمال مشرقی حصے میں کھدائی کا کام شروع ہوا جس کے نتیجے میں بعض تاریخی آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس عمارت کی اہمیت وحیثیت کے مطابق یہاں ایک میوزیم لائبریری اور پارک قائم کرنے کے احکامات بھی جاری کئے۔

جامع مسجد مہابت علی خان: مہابت علی خان مغلیہ دور میں پشاور کا معروف گورنر تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں جب وہ پشاور کا حاکم بنا تو اس دوران پشاور

کے آسامائی دروازے کے اندر عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کروائی جو آج تک مسجد مہابت خان کے نام سے پشاور کی سب سے بڑی تاریخی مسجد کہلاتی ہے۔ اونچے میناروں اور بڑے گنبدوں والی سنگ مرمر سے بنی ہوئی یہ مسجد مغل دور کا تعمیراتی شاہکار ہے۔ یہ مسجد ایک پرانی یادداشت کے مطابق ۱۶۵۸ء سے ۱۶۶۲ء کے دوران تعمیر ہوئی۔ شمالاً جنوباً دو بڑے دروازے اور عین وسط میں ایک تالاب ہے۔ مسجد کے احاطے کے اندر گرداگرد شمالاً جنوباً چھوٹے چھوٹے کمرے ہوسٹل کے طور پر بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کی چھت پر پرانی طرز کے فانوس لٹکائے گئے ہیں جو آج تک محفوظ ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ مسجد اورنگزیب بادشاہ کے عہد میں ۱۶۷۰ء میں تعمیر ہوئی مسجد کا ایک دروازہ مشرقی سمت کی طرف بھی ہے۔ مسجد کے نیچے تہ خانہ نما ایسی اعرابیں بنائی گئی تھیں جہاں سے اس وقت باڑہ دریا کا پانی سیلابی شکل اختیار کرتا تو ان اعرابوں کے ذریعے پانی کو نیچے سے دوبارہ باڑہ کے دریا میں پہنچانے کا انتظام تھا تاکہ مسجد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ جب رنجیت سنگھ نے پشاور پر حملہ کیا تو سکھ حاکم نے پشاور کے قدیم ثقافتی ورثوں کو اجاڑ ڈالا اسی دور میں اس تاریخی مسجد کے مینار بھی شہید ہوئے جو بعد میں پھر بنا دیئے گئے۔

محلے اور دیہات کی قدیم مساجد: اب سے تقریباً 25 یا 30 سال پہلے پشاور کے ہر محلے میں قدیم طرز کی مساجد ہوتی تھیں۔ جو عموماً 2 یا 3 مرلہ رقبہ پر مشتمل ہوتی تھیں۔ مسجد نہایت سادہ تعمیر کی ہوتی تھی۔ مسجد کی چھت لکڑی کی ہوتی تھی جس کے اوپر پھوڑ یا سرکنڈے ڈال دیئے جاتے تھے اور پھر ان پر خشک گھاس بچھا کر اوپر مٹی ڈال کر اسے ہموار کر دیا جاتا۔ دیواریں کچی اینٹوں کی بنائی جاتیں جن پر مٹی کی لیپائی کر دی جاتی اور قبلے کی دیوار کے عین وسط میں محراب بنا لیا جاتا۔ باہر کی طرف کی دیوار میں درمیان کے لکڑی کے چھوٹے سے دروازے کے دائیں اور بائیں عروسیاں ہوتی تھیں جنہیں سردیوں کے موسم میں بند کر لیا جاتا تھا اور گرمیوں کے موسم میں ہوا کے لئے کھول دیا جاتا تھا۔ چھت کو مضبوط کرنے کے لئے لکڑی کے شہتیر بیچ میں کچھ کچھ فاصلے پر کھڑے کر دیئے جاتے تاکہ چھت مضبوط ہو۔ کمرے کے ساتھ ہی امام صاحب کی رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ بنا لیا جاتا تھا۔

باہر صحن ہوتا تھا' اور گلی کی دیوار کے ساتھ ایک چبوترہ بنا لیا جاتا جہاں پر چڑھ کر مؤذن اذان دیتا۔ فرش عموماً کچے گارے کا ہوتا تھا جس پر لیپائی کر دی جاتی۔ باہر کی دیوار کے عموماً بائیں طرف اندر جانے کے لئے دروازہ ہوتا تھا اور دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک یا دو استنجا کی جگہ ہوتی۔ استنجے کے لئے مٹی کے بنے ہوئے کوزے استعمال کئے جاتے تھے۔ پانی کو جمع کرنے کے لئے ایک ٹینکی لمبوترے سائز میں بنائی جاتی جسے ڈگی کہا جاتا۔ یہ ڈگی اینٹوں کی ہوتی جس کے اندر اور باہر ریت اور سیمنٹ استعمال ہوتی تھی تاکہ پانی صاف رہے۔ وضو کے لئے بھی ڈگی کے سامنے ایک فرشی پختہ ہوتا تھا اور ڈگی میں وضو کے لئے دو یا تین سوراخ کر کے ان سوراخوں میں لوہے کی چھوٹی چھوٹی بنی ہوئی نلی لگا دی جاتی اور ان کو بند کرنے کے لئے ربڑ کی نلیاں ٹھونس دی جاتیں یہاں لوگ وضو کرتے' ڈگی کو پانی سے بھرنے کے لئے عموماً ہر مسجد میں ایک کنواں کھود لیا جاتا جس کی عموماً گہرائی پندرہ یا بیس فٹ ہوتی۔ چمڑے کے بنے ہوئے بُوکے سے پانی نکال کر ٹینکی کو بھر لیا جاتا۔ بعض مساجد کے فرش اینٹوں کے بنائے جاتے تھے۔

مندر رتن ناتھ: ہندوؤں کا یہ مندر اس وقت پشاور کے جھنڈا بازار کے ایک کوچہ میں وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پختہ اور جدید طرز کا بنا ہوا دو حصوں پر مشتمل مندر ہے۔ ایک حصے میں ہندوؤں کی عبادت گاہ اور دوسرے حصے میں باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے قیام و طعام کا بندوبست ہوتا ہے۔ یہ پشاور میں ہندوؤں کا سب سے بڑا مندر ہے۔ یہ مندر رتن ناتھ سے منسوب ہے جسے ہندو درگاہ پیر رتن ناتھ کہتے ہیں۔ مندر رتن ناتھ کی عبادت گاہ کے حصہ میں ان بارہ گروؤں کی سمادیاں بھی بنی ہوئی ہیں جنہوں نے پشاور میں چلہ کشی کی تھی' ہندو ہر شام کو انسمادیوں پر پھول چڑھاتے ہیں عبادت گاہ کے سامنے والی عمارت میں بھارت سے آئے ہوئے ہندوؤں کے قیام و طعام کا انتظام ہوتا ہے۔ بہرحال پشاور کا یہ سب سے بڑا مندر ہے جس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اور ہندو باقاعدگی کے ساتھ یہاں بلاخوف و خطر عبادت کرتے ہیں۔

مندر بابا کالورام: یہ مندر اب بھی آسیہ پارک کے سامنے موجود ہے۔ اس کے اردگرد اب کریسچن آبادی رہ رہی ہے۔ مندر کی یہ عمارت انتہائی بوسیدہ اور خستہ ہو چکی ہے اور اب آثار قدیمہ کی شکل میں تاریخ گم گشتہ کا پتہ دیتی ہے۔

مندر سنگی گراں: علاقہ آسیہ میں محلہ سنگی گراں میں ایک پرانا مندر ہے جو اب ایک مکان کی شکل میں بدل گیا ہے اور ایک خاندان اس میں رہائش پذیر ہے۔ یہ محلہ سنگی گراں اس ہندو آبادی پر مشتمل تھا جہاں کے لوگ پتھر تراشنے کا کام کرتے تھے اسی وجہ سے یہ محلہ سنگی گراں کے نام سے موسوم ہے۔ اس مندر کی دیواروں پر ان ہنر مند ہندوؤں نے شری گنیش مہاراج کی تصویریں تراشی تھیں جو اب موجود نہیں۔

مندر جوگن شاہ: محلہ جوگن شاہ بہت قدیم اور مشہور ہے یہاں جوگن شاہ گرو

کے نام پر مندر قائم تھا اس مندر کی باہر کی دیواروں پر شیروں اور ہاتھیوں کی اشکال تراشی ہوئی تھیں جو اب تک موجود ہیں۔

قلعہ بالا حصار: قلعہ بالا حصار کی ابتدائی تعمیر کے سلسلے میں تاریخ بالکل خاموش ہے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر اس شہر پشاور کی بنیاد اوشہنگ شیداد نے رکھی ہے تو اسی نے اپنے آباء واجداد کی پیروی میں اس شہر کے لئے قلعہ کی بھی بنیاد رکھی ہوگی۔ تاریخی کڑیوں کو ملایا جائے تو اس امر پر بوجوہ اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ قلعہ بالا حصار کی ابتدائی تعمیر بھی اوشہنگ شیداد نے ہی کی ہے کیونکہ ابن خلدون کے مطابق کیومرث نے شہروں اور قلعوں کی تعمیر شروع کر دی تھی اور کیومرث ہی کی مخالفت میں اوشہنگ شیداد بھی ہے جو خطہ فارس کے ہفت اقلیم یعنی ساتویں صوبے کے اس خطے کو شہر کی حیثیت دیتا ہے۔ شہر کو محفوظ رکھنے یا دفاعی نقطہ نظر سے اس نے پشاور شہر کے اس حصہ میں جو قدرے بلند ٹیلے پر تھا یہاں قلعہ کی تعمیر کی ہوگی۔ اس وقت کے تعمیراتی رواج کے تحت چاہے قلعہ اور اس کا حصار کسی بھی شکل میں ہو لیکن اس کی بنیاد اوشہنگ نے رکھی ہوگی اور پھر یہ بھی حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ پشاور کا یہ شمالی حصہ ہی قدیم شہر باگرام تھا۔ بعد میں جو بھی سلاطین بادشاہان وقت آئے انہوں نے اس قلعے کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس کی توسیعی تعمیر ہوتی رہی۔ اس لحاظ سے یہ واحد ایسی عمارت ہے جسے پشاور کی قدیم ترین ثقافتی شناخت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

قلعہ بالا حصار سے متعلق ایک چھوٹا سا کتابچہ Booklet میجر محمد نواز نے ترتیب دیا ہے اور موجودہ قلعہ بالا حصار کا عرصہ حیات بطور شناخت دو ہزار سال بتایا گیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے ملک کے ممتاز آرکیالوجسٹ ڈاکٹر احمد حسن دانی کی کتاب ''پشاور۔ صوبے کا تاریخی شہر'' کے حوالے سے بتایا ہے کہ چینی سیاح ہیون سانگ جنہوں نے 630ھ میں اس علاقے کی سیاحت کی تھی قلعہ بالا حصار کے بارے میں شاہی محل کے الفاظ استعمال کئے تھے۔

قلعہ بالا حصار پشاور شہر کے شمال مغربی نکڑ پر واقع ہے جس کی جنوبی حد پشاور کے قدیم ہسپتال لیڈی ریڈنگ کی شمالی دیوار سے بالکل متصل ہے قلعہ کے باہر گرداگرد پکی اینٹوں کی مضبوط دیوار ہے اس کا بڑا گیٹ شمالی حصہ میں ہے اور اسی گیٹ سے اس کے اندر داخل ہونے کا راستہ ہے۔ قلعہ کے تین اطراف شمال، مشرق اور جنوب میں پشاور شہر کی آبادی ہے جبکہ مغرب کی جانب چھاؤنی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔

قلعہ جمرود: پشاور کے مغرب کی جانب جمرود کے مقام پر پشاور کے سکھ گورنر سردار نلوہ سنگھ کی طرف سے تعمیر کردہ یہ قلعہ سکھ دور کی دفاعی تعمیرات کا ایک یادگار قلعہ ہے۔ سردار نلوہ سنگھ نے جب پشاور پر مکمل قبضہ کر لیا تو ملک گیری کی ہوس اور سکھوں کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کے منصوبے کے تحت کابل پر قبضہ کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اس نے اپنی حکمت عملی سے پشتونوں پر تسلط حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور دفاعی نقطہ نظر سے پشاور سے کچھ فاصلہ پر جمرود کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا جسے وہ اپنی رہائش گاہ کے طور پر بھی استعمال کرنے لگا تھا اور اسی قلعہ جمرود میں کابل کی طرف پیشقدمی کے لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔ یہ قلعہ جمرود پشاور کا دوسرا اہم قلعہ تھا جہاں سکھوں کی فوج کا ایک بڑا حصہ بھی رہنے لگا تھا۔ غرضیکہ یہ قلعہ سکھوں نے پشاور پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے، کابل پر یلغار اور مخالف فوجوں سے شہر کو محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ (تاریخ گنڈا سنگھ)

گورنر ہاؤس: یہ ایک وسیع و عریض عمارت ہے جہاں صوبے کے گورنر کی رہائش گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے عملے کے دفاتر ہیں۔ پشاور چھاؤنی کے احاطے میں قدیم جیل پل سے چھاؤنی کی طرف یہ شاندار عمارت بنائی گئی ہے۔

یہ عمارت ایک اونچے ٹیلے پر بنی ہوئی ہے۔ راقم کی تحقیق کے مطابق یہ انتہائی قدیم ٹیلہ ہے اور غالباً یہی وہ مقام ہے جہاں مغل شہنشاہ درہ خیبر کے راستے پشاور پہنچا تو اس مقام سے اُس نے پشاور کا نظارہ کیا تھا جس کے بارے میں وہ تزک بابری میں بیان کرتا ہے۔ 1901ء میں جب صوبہ سرحد کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس مقام پر گورنر ہاؤس رومن طرز تعمیر کے مطابق تعمیر کیا گیا۔

شاہی مہمان خانہ: یہ سرکاری افسران کی قیام گاہ ہے جو انگریز دور کے گورنر سر جارج کنگھم نے 1842ء میں تعمیر کروائی تھی۔

یہ دو منزلہ عمارت 20 کمروں پر مشتمل ہے اسے موسمی لحاظ کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈی اور سردیوں میں گرم رہتی ہے۔ اس میں 17 کمرے بیڈ رومز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک بڑا لاؤنج اور ایک ڈرائینگ روم ہے۔ ہر کمرے کے سامنے بالکنی ہے۔ باہر کی طرف ایک وسیع و عریض خوبصورت لان ہے۔ اس عمارت کے احاطے میں خوبصورت برگد کے سرسبز درخت قدرتی منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں اس عمارت کی دیکھ بھال کرنے کے لئے چند سرونٹ کوارٹر بھی تعمیر کئے گئے ہیں جہاں ملازمین، رہائش پذیر ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد اس عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔

پشاور کا عجائب گھر: پشاور میں گورنر ہاؤس کی عمارت کے بالمقابل عجائب گھر

کی شاندار عمارت ہے جو مغل طرز کی تعمیر کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ پاکستان کا چوتھا اہم عجائب گھر ہے۔ اس عجائب گھر میں بدھ دور کے بنائے ہوئے گوتم بدھ کے بڑے بڑے مجسموں کے علاوہ پتھروں پر کندہ گوتم بدھ کی تاریخ کو محفوظ کر لیا گیا ہے جو کہ گندھارا فنون و آرٹ کا زندہ جاوید نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ اس عجائب گھر میں گندھارا عہد کے نوادرات جو کہ مختلف تاریخی مقامات کی کھدائی سے دستیاب ہوئے ہیں ان نوادرات کے علاوہ اسلامی اور مغل عہد کے نوادرات جس میں سکے' ملبوسات' سامان حرب' زیورات اور نایاب کتب اور تاریخی و قدآور شخصیات سے متعلق دستاویزات کو بھی رکھا گیا ہے۔

اس عمارت کی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ مغل عہد کی عمارت اور یورپ کے گرجا گھروں کی بناوٹ کا اس میں امتزاج ہے۔ ساری عمارت سرخ اور دیدہ زیب اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ یہ عمارت ایک بڑے مستطیل شکل کے ہال اور ہال کے چاروں طرف دو منزلہ گیلریوں اور راہداریوں پر مشتمل ہے۔ اطراف کی گیلریاں عمارت کے اندرونی حصہ کو جاذب نظر بنا رہی ہیں یہ 1971ء میں تعمیر کی گئی ہیں۔

مقبرہ پری چہرہ: یہ نادر شاہ افشار کی محبوبہ تھی جو حسن و شباب کا مجسمہ اور حسن و جمال میں باکمال ہونے کی وجہ سے پری چہرہ کے نام سے موسوم تھی۔ نادر شاہ اسے بہت پیار کرتا تھا اور ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ پری چہرہ کو بھی نادر شاہ سے دلی لگاؤ تھا۔ نادر شاہ جب دہلی پر حملہ کرنے کی غرض سے قندھار سے روانہ ہوا تو براستہ کابل و خیبر پشاور میں داخل ہوا۔ پشاور میں اس وقت تخت دہلی کے آخری مغل تاجدار محمد شاہ رنگیلہ کی طرف سے حاکم پشاور نواب ناصر خان تھا جس کے حسن انتظام و انصرام کی وجہ سے پشاور نادر شاہ افشار کی طوفانی فوجوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا۔ نادر شاہ جب پشاور پہنچا تو نواب ناصر خان نے خیر سگالی کے جذبوں کے ساتھ باب پشاور کوتلہ محسن خان کے پاس نادر شاہ کا استقبال کیا اور شہر کی چابیاں اس کے حوالے کیں۔ نادر شاہ نواب ناصر خان کے اس حسن سلوک کی وجہ سے پشاور میں چند روز ٹھہرا اس موقع پر اس کی محبوبہ پری چہرہ راستے کے سفر کی تھکان کی وجہ سے بیمار پڑ گئی تھی اور وہ مزید سفر کرنے کے قابل نہ تھی۔ نادر شاہ نے بھی پری چہرہ کو دہلی کے پُر خطر سفر میں ساتھ رکھنا اس کی صحت کے خلاف سمجھا اور اسے علاج معالجے کی غرض سے نواب ناصر خان حاکم پشاور کے سپرد کیا اور اس کی تیمارداری کی خاص ہدایات دیں اور خود دہلی پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہو گیا۔ نادر شاہ کے بعد پری چہرہ کی صحت روز بروز مدھم پڑتی گئی اور باوجود علاج بسیار کے اس کا شباب اور حسن غروب آفتاب کی طرح ڈھلتا گیا اور اسی کیفیت میں پری چہرہ وفات پا گئی۔ نواب ناصر خان نے پری چہرہ کو شاہی مہمان خانہ اور شاہی دربار کے بالکل سامنے دفن کر دیا نادر شاہ کو جب پری چہرہ کی وفات کی اطلاع ملی تو وہ بہت افسردہ ہوا۔ دہلی فتح کرنے کے بعد پشاور ٹھہرا اور اسی مقام پر اپنی محبوبہ پری چہرہ کا شاندار مقبرہ تعمیر کروایا اور کابل قندھار اور ایران سے قیمتی پتھر منگوا کر اس مقبرے کی تعمیر کی اور ساتھ ہی ایک بہت بڑے احاطے میں آس پاس باغ تعمیر کروا دیا یہ تاریخی مقام اتنا مشہور ہوا کہ اس سارے علاقے کو لوگ پری چہرہ کے نام سے یاد کرنے لگے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ پری چہرہ کا یہ مقبرہ لوگوں کی دستبرد کی وجہ سے اجڑتا گیا۔ اب یہ مقبرہ بے نشان مقبروں کی طرح بن گیا ہے اور اس میں استعمال ہونے والے پتھروں کا کوئی حصہ باقی نہ بچ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اس اہم تاریخی مقام کی تاریخ سے لوگ اب تک ناواقف ہیں۔

اٹک پل: ضلع نوشہرہ کے خیر آباد گاؤں اور نظام پور کے اتصال کے مقام پر دریائے سندھ پر اٹک کے مقام پر بنا ہوا یہ پل ''اٹک پل'' کے نام سے معروف ہے، یہ پل دو منزلہ ہے، اوپر کی منزل پر ریل گاڑی کی پٹڑی بنی ہوئی ہے اور اس سے نیچے عام گاڑیوں کے عبور کرنے کیلئے سڑک تعمیر کی گئی ہے۔

یہ پل 1880ء میں بننا شروع ہوا اور ستمبر 1881ء میں باضابطہ طور پر تعمیر کا کام شروع ہوا۔ 1882ء میں اس پل کیلئے پہلے دو سپین تعمیر کئے گئے جو 1882ء میں مکمل ہوئے، تیسرا لوہے گاڈروں کا سپین 25745 فٹ لمبا تھا یہ اُسی سال نومبر اور دسمبر میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اسے 12 مئی 1883ء کو آمد و رفت کیلئے کھول دیا گیا۔

5 مئی کو اس پل کے اوپر سے پہلی مرتبہ انجن گزارا گیا اور 24 مئی 1883ء کو مکمل ریل گاڑی پشاور سے کلکتہ روانہ ہوئی۔ ایک تخمینہ کے مطابق اس پل کی تعمیر پر اکتیس لاکھ پچاس ہزار روپے کی لاگت آئی۔

اب پُرانے پُل سے شمال کی جانب دو اور پُل تعمیر کئے گئے ہیں۔ جن پر گاڑیوں کی آمد و رفت ہوتی ہے اور پرانے پُل پر سے صرف ریل گاڑی گزرتی ہے۔

لوک داستانیں اور کہانیاں

محبوبہ: محبوبہ جو پیکر حسن و جمال تھی پشاور کے ایک سردار نامسلم کی بیٹی تھی۔ نامسلم نے متعدد شادیاں کر رکھی تھیں مگر اولاد نرینہ سے محروم تھا اس کے ہاں لڑکیاں ہی پیدا ہوتی رہیں جنہیں یہ نامسلم سردار قتل کروا دیتا تھا اس کی آخری بیوی کے ہاں

بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی ماں نے اس کا نام محبوبہ رکھ کر بادشاہ سے اسے چھپا دیا جب محبوبہ دس سال کی ہوئی تو اس کے باپ نامسلم کی نظر اس پر اس وقت پڑی جب وہ محل کے باغیچہ میں ماں کے ہمراہ ٹہل رہی تھی۔ نامسلم اس لڑکی کے حسن و جمال سے بڑا متاثر ہوا۔ اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ اسی کی بیٹی ہے۔ بادشاہ نامسلم نے اس بات کو راز میں رکھنے کے لئے پشاور کے جنوب مشرق کی جانب ایک بھول بھلیوں والا تہہ خانہ بنوا کر اس میں اپنی بیٹی محبوبہ کی سکونت کا بندوبست کر دیا اور اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازمہ مقرر کی جس کا نام خوارمشے تھا' محبوبہ جب تہہ خانے کے اوپر والی منزل پر ٹہل رہی تھی تو اس کی دیوار کے نیچے لیٹے ہوئے ایک فقیر کی نظر اس پر پڑ گئی جو اس کے حسن و جمال سے بے حد متاثر ہوا اس فقیر کے ذریعے یہ بات مشہور ہو گئی۔ دوسرے شہر میں خونخوار نامی بادشاہ کی حکومت تھی جو نامسلم کا بھائی تھا اس کے سات بیٹے تھے جن کے دل میں محبوبہ کو حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ بڑا لڑکا یہاں پہنچا بادشاہ نامسلم نے یہ شرط رکھی کہ جو اس تہہ خانے کی بھول بھلیوں کو عبور کر کے شہزادی تک پہنچے گا اس کی شادی محبوبہ سے کر دی جائے گی اور بصورت دیگر اسے قتل کر دیا جائے گا۔ خونخوار بادشاہ کے چھ بیٹے اس خواہش کو لے کر یہاں پہنچے مگر تہہ خانے کی بھول بھلیوں میں راستہ بھولتے گئے اور قتل ہوتے گئے آخر میں اس کا ساتواں بیٹا جلات یہاں پہنچا جو خود بھی حسین و جمیل اور خوبصورت ترین نوجوان تھا اس نے شہزادی تک پہنچنے کے لئے مہمندی سنار کی مدد حاصل کی اور خوبصورت زیورات بنانا سیکھ لئے۔ مہمندی سنار کی والدہ بھی شہزادی کی ملازمہ تھی اس کے ذریعے جلات خان نے ایک خوبصورت ہار بنا کر شہزادی کے لئے بھیجا جو شہزادی کو بہت پسند آیا۔ شہزادی نے بڑھیا سے اس ہار بنانے والے زرگر کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ یہ ہار میری اس بیٹی نے بنایا ہے جو دوسرے شہر میں رہتی ہے جہاں اس کی شادی ہو چکی ہے۔ شہزادی نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس پر بڑھیا بہت گھبرائی مگر جلات خان نے اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ میں عورتوں کا لباس پہن کر تیرے ساتھ محل میں شہزادی کے پاس جاؤں گا جو مجھے تیری بیٹی سمجھے گی۔ دوسرے روز ایسا ہی ہوا اور جلات عورتوں کے لباس میں شہزادی کے پاس گیا شہزادی بڑھیا کی بیٹی (جلات خان) سے مل کر بے حد متاثر ہوئی۔ دوسرے روز بڑھیا آئی اور جلات خان کو واپس لے گئی۔ جلات خان شہزادی سے مل کر اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اب جلات خان بہت بے چین رہنے لگا اور شہزادی کے بغیر جینا اس کے لئے محال ہو گیا مہمندی زرگر نے ایک ترکیب سوچی اس نے ایک مصنوعی کھوکھلا شیر بنا دیا جس کے اندر جلات خان کو بٹھا دیا اور یہ شیر مہمندی سنار نامسلم بادشاہ کے پاس لے گیا جسے چابی دی گئی تو یہ شیر کرتب دکھانے لگا بادشاہ مہمندی زرگر کی یہ ایجاد دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس شیر کے بارے میں شہزادی کو بھی اطلاع ہوئی تو اس نے اس شیر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ شہزادی اور اس کی سہیلیاں رات گئے تک اس شیر کے کرتب دیکھتی رہیں اور پھر سو گئیں شہزادہ جلات خان آدھی رات کو شیر سے باہر نکلا اور محبوبہ کی انگوٹھی اتار لی اور اس کا دوشالہ اتار کر اپنا دوشالہ اس پر ڈال دیا اور پھر شیر میں داخل ہو گیا۔ شہزادی کی آنکھ کھلی تو ہاتھ انگوٹھی سے خالی تھا اور دوشالہ اس پر نہیں تھا اس نے اپنی سہیلیوں کو اٹھایا اور اس بدلی ہوئی صورتحال کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ تلاش و جستجو کے بعد دوبارہ سب سو گئیں شہزادی بظاہر تو سو رہی تھی مگر حقیقت میں بیدار تھی۔ شہزادہ جلات خان دوبارہ شیر سے باہر نکلا اور شہزادی محبوبہ کی ٹھوڑی چوم لی اور جب شیر میں داخل ہونے لگا تو شہزادی نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ اب تمہاری موت آ چکی ہے تو نے یہ کیا حرکت کی۔ اس پر شہزادہ جلات نے جواب دیا کہ اس سے پہلے میرے چھ بھائی یکے بعد دیگرے اپنی جان دے چکے ہیں اس لئے اب میرے لئے موت اور زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی اور پھر اپنے چھ بھائیوں کے قتل کا سارا واقعہ شہزادی کو سنایا شہزادی جلات خان کے حسن و جمال سے مرعوب ہو چکی تھی چنانچہ شہزادی نے شہزادہ جلات کو اس محل (تہہ خانہ) کے بھول بھلیوں کے تمام راستوں کے راز سے آگاہ کر دیا اور دوسرے روز مہمندی اپنا کاٹھ کا شیر واپس لے گیا۔

ادھر شہزادہ جلات نے حفظ ماتقدم اور ممکنہ خطرات کے پیش نظر اپنے باپ کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ فوجیں لے کر بادشاہ نامسلم پر چڑھائی کر دے اور پھر خود دربار میں جا کر بھول بھلیوں والے تہہ خانہ میں داخل ہونے اور شہزادی کو حاصل کرنے کے لئے نقارہ بجا دیا اور پھر تہہ خانے کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔ شہزادی بھی اس کے انتظار میں ایک جھنڈ میں تیار بیٹھی تھی جبکہ مہمندی محل کی ایک دیوار کے نیچے برق رفتار گھوڑا لے کر تیار کھڑا تھا' جلات خان شہزادی کو لے کر تہہ خانے سے باہر نکلا تو بادشاہ نامسلم یہ منظر دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ ایک خاص منصوبے کے تحت ہوا اس لئے اس نے جلات خان کو گرفتار کرنا چاہا مگر وہ مہمندی کے گھوڑے پر شہزادی کو بٹھا کر بھاگ گیا ان کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر مہمندی بھی تھا ان تینوں کا نامسلم بادشاہ کے سپاہیوں نے تعاقب کیا دوسری جانب جلات خان کا باپ خونخوار بھی پیغام ملتے ہی فوجوں کو لے کر پشاور کی جانب برق رفتاری کے ساتھ چل پڑا تھا اور راستے ہی میں انہیں شہزادہ جلات' شہزادی اور مہمندی مل گئے۔ اتنے میں نامسلم کے سپاہی بھی پہنچ گئے دونوں کی فوجوں کے درمیان معرکہ ہوا اور بہت

سے لوگ مارے گئے آخر نامسلم کو شکست ہوئی اور خونخوار نے نامسلم کو گرفتار کر لیا اور شہزادہ جلات اور شہزادی محبوبہ ہمیشہ کے لئے ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیئے گئے۔ اس واقعے کو سینکڑوں سال گزر گئے مگر پشاور میں موجود یہ تہہ خانہ جسے لوگ محبوبے تہہ خانہ کہتے ہیں اس داستان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

بیگم جان المعروف بیجو: پشاور شہر کے جنوب میں نزد وزیر باغ موجودہ قبرستان شیخ حبیب کے بیرونی احاطہ میں برلب سڑک ایک برج جو آج بھی خستہ حالت میں بیجو دی قبر کے نام سے موجود ہے۔ یہ اپنے پس منظر میں ایک درانی بادشاہ کی رومانوی داستان رکھتا ہے اگرچہ یہ نام قدیم زمانہ سے پشاور کے لوگوں میں سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا اور آج بھی پشاور کے قدیم گھرانے کے بچے بوڑھے مرد و زن بیجو دی قبر کے نام سے اس برج کی شناخت کرتے ہیں لیکن اس برج سے وابستہ رومانوی داستان سے بہت کم لوگ باخبر ہیں۔ یہ قدیم آثار تیمور بادشاہ جو احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تھا اور باپ کی وفات کے بعد بموجب نصیحت 1773ء میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا اس کی ایک بیوی مغل شہزادی تھی جبکہ اسی کے ہاں ایک دوشیزہ حرم میں لونڈی کی حیثیت سے پرورش پا رہی تھی۔ اس لونڈی نے جس کا نام بیگم جان تھا اپنے حسن و جمال اور عقل و ذہانت کی وجہ سے بادشاہ کے دل میں اور اس کی جلوت و خلوت میں مقام حضوری حاصل کر لیا تھا اور دوران حکمرانی بادشاہ اکثر حکومتی معاملات میں اس سے مشورے بھی طلب کرتا رہتا تھا۔ بادشاہ تیمور کے ساتھ بیگم جان کی یہ قربتیں بادشاہ کی مغل بیوی اور اس کے خاندان، ملازمین اور مصاحبین کے لئے ایک دل میں چبھنے والا کانٹا تھا۔ بیگم جان کی حاکم وقت تیمور کے ساتھ ان خاص صحبتوں نے ملکہ کے دل میں اس کے لئے انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے محل کے اندر بیگم جان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بیگم جان کے ساتھ بادشاہ کی اتنی بے پناہ محبت تھی کہ بادشاہ اسے پیار سے بیگم جان کی بجائے بی بو کہہ کر پکارتا تھا لیکن بادشاہ کی مغل ملکہ اور اس کے نوکر چاکر حسد کی وجہ سے اسے بی بو کی جگہ بی جو کے نام سے یاد کرتے تھے اسی وجہ سے اس کا نام بی بو کی بجائے بیجو پڑ گیا۔ جب محل میں بیگم جان کے خلاف طرح طرح کی سازشیں ہونے لگیں تو بیگم جان بھی اس معاملے سے بے خبر نہ تھی وہ اپنی ذہانت اور فہم و فراست کی وجہ سے ہر سازش کے جال میں پھنس جانے سے بچ جاتی تھی۔ مغل خاندان کے اکابرین بھی تیمور شاہ اور بیگم جان کے درمیان قائم ہونے والے اس تعلق کو اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے کیونکہ بیگم جان بھی اپنی عقل و ذہانت کے بل بوتے پر بادشاہ کو مغل خاندان کے چنگل سے آزاد رکھنے کے لئے مشورے دیتی رہتی تھی جس کی وجہ سے مغل خاندان کے بااثر لوگوں کی حکمت عملی کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اس لئے اب ان تمام کی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح بیگم جان کو اپنے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ ان مغل اکابرین نے ایک دلالہ کو بادشاہ کی مغل ملکہ کے پاس تعینات کر دیا جو ملکہ کے دل میں بیگم جان کے خلاف نفرت اور عداوت پیدا کرتی رہتی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملکہ بھی اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ بیگم جان کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دیا جائے اس ارادہ اور نیت کے ساتھ ملکہ نے ایک مشروب تیار کیا جس میں زہر ملا دیا اور بیگم جان جبکہ بادشاہ کے حضور جا رہی تھی تو راستے میں اسے روک کر ملکہ کے حضور پہنچا دیا گیا۔ ملکہ نے کہا بیگم جان اگر میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو حکم عدولی تو نہیں کرو گی۔ بیگم جان نے کہا کہ ملکہ عالیہ آپ کا حکم مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔ ملکہ نے کہا کہ پھر میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ اس پیالے میں پڑے ہوئے مشروب کو پی جا بیگم جان سمجھ گئی کہ اب اس کی موت کا وقت آ گیا ہے بیگم جان نے خواہش ظاہر کی کہ میں آخری مرتبہ اپنے بادشاہ تیمور کو ملنا چاہتی ہوں ملکہ نے کہا مل سکتی ہو لیکن اس پیالے کے پی لینے کے بعد۔ بیگم جان بھی محبت و وفا کی دہلیز پر قربان ہونے کے لئے زہر کا یہ پیالہ صبر و شکر کے ساتھ پی گئی اور پھر ہمیشہ کی نیند سو گئی اور آخری بار بادشاہ نے بیگم جان جو بادشاہ کی چہیتی بی بو تھی اس وقت دیکھا جب وہ سوئے دار سے ہو کر کوئے یار پہنچی تھی۔ بادشاہ نے اپنی اس چہیتی خوبصورت و باوقار اور ذہین و فطین بی بو کی قبر اسی جگہ پر تیار کروائی جہاں اب بیجو کی قبر کے نام سے موسوم ایک برج کھنڈر کی صورت میں موجود ہے اور جو ایک لازوال تاریخی اور رومانوی داستان کی یاد دلاتا ہے۔

شاہ بوڑہی اور رستم: یہ لوک داستان پشاور ریجن کے ضلع چارسدہ کی حدود میں واقع حصار بہلول کے نزدیک کلپانی ندی کے پار ایک گاؤں عمر خیل کی ایک لڑکی شاہ بوڑہی اور خوبرو نوجوان رستم کی رومانی داستان ہے۔ عمر خیل گاؤں دلہ زاک قوم کا مشہور گاؤں ہے اس داستان کا تعلق مغل شہنشاہ بابر کے عہد سے ہے۔ بابر جب سکیانی قوم کے سردار ملک حمزہ کی دعوت پر فتح مندی کا نقارہ لے کر اس علاقے میں پہنچا تو سکیانی قوم کے سردار ملک حمزہ نے بابر سے کہا کہ مجھے تو اپنا بدترین دشمن دلہ زاک قبیلہ ہی نظر آتا ہے اور پھر دلہ زاکوں میں سے عمر خیل قبیلے کے لوگ ہمارے لئے زیادہ خطرے کا باعث ہیں کیونکہ ہمارے تجارتی قافلے اس شاہراہ سے گزر کر اپنا سامان جب ہندوستان لے جاتے ہیں تو اس قبیلے کے لوگ ان قافلوں کو لوٹتے ہیں ا

وران پر راستہ تنگ کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے ان تجارتی قافلوں کو پریشانی لاحق ہوتی ہے چنانچہ بابر نے سب سے پہلے دلہ زاکوں اور خاص کر عمر خیل قبیلے اور گاؤں کے لوگوں کی گوشمالی کا ارادہ کرلیا اور اشتغر کے دریا کو عبور کر کے حصار بہلول پہنچا اور علے الصبح ہی عمر خیل والوں پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ لوگ اصل حقیقت سے بعد میں آگاہ ہوئے۔ سویرے سویرے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی شور وغوغا برپا ہوا اس روز جبکہ مغل فوج نے گاؤں پر حملہ کیا رستم جو کہ شاہ بوڑہی کا شوہر تھا بیمار تھا اور بستر سے اٹھنے کے قابل نہ تھا۔ جب لوگوں نے آ کر کہا کہ مغل فوج گاؤں پر حملہ آور ہوئی ہے اور گاؤں کے بہت سے لوگ مارے گئے ہیں تو شاہ بوڑہی نے اپنے شوہر رستم سے گاؤں سے نکل جانے کا کہا۔ مگر رستم نے کہا کہ وہ اس قابل نہیں کہ چل سکے اس لئے اگر وہ جانا چاہتی ہے تو گاؤں کو چھوڑ کر کسی محفوظ مقام پر چلی جائے مگر شاہ بوڑہی ایک وفا شعار اور غیرت مند قوم کی بیٹی تھی یہ بات اس کی غیرت اور وفا کے خلاف تھی کہ وہ شوہر کو ایسی حالت میں چھوڑ کر خود جان بچاتے ہوئے گاؤں سے نکل جائے اور شوہر کو بے بس ولاچار حالت میں موت کے منہ میں چھوڑ جائے۔ اس نے شوہر کو کہا کہ میں تجھے اس حالت میں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گی بلکہ جس حد تک ہو سکے گا دفاع کروں گی۔ چنانچہ اس نے شوہر کی چارپائی کو درختوں کی شاخوں کی فصیل نما چھپر میں ڈال دیا اور خود تلوار کمر سے باندھ کر اور تیر کمان لے کر چوبی جنگلے والے چھپر کے دروازے میں کھڑی ہو گئی اور جب مغل فوج کے سپاہی اس کے دروازے کی طرف بڑھے تو اس نے تیر پھینکنا شروع کر دیئے اس کے تیروں کے نشانے سپاہیوں کے سینے تھے یہ جس فوجی کی طرف تیر پھینکتی اس کے سینے سے پار ہو جاتا۔ کئی فوجی اس کے تیروں کی زد میں آ کر مر گئے جس سے فوج میں کھلبلی مچ گئی اور یہ آوازیں آنے لگیں کہ اس چھپر میں کوئی ناگہانی آفت ہے جس نے تباہی مچادی ہے سب فوجی اس چھپر کی طرف بڑھے اور تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور اس چھپر کا محاصرہ کرلیا جب اندر سے تیر آنا بند ہو گئے تو لوگوں نے اندر گھس کر دیکھا کہ ایک عورت زخموں سے چور آخری سانسوں میں ہے اور چارپائی پر بھی ایک شخص تیروں سے چھلنی پڑا ہے جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی تو اس نے اپنا ایک قاصد فوراً فوج کے سپہ سالار کی طرف بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اس عورت کو قتل نہ کیا جائے بلکہ بادشاہ کے حضور پیش کیا جائے مگر اس عرصے میں یہ بہادر نڈر، خوبرو اور وفا شعار اور قوم وقبیلے کی ناموس کی محافظ خاتون دم توڑ چکی تھی۔

بادشاہ نے جب اس بہادر خاتون کی موت کی خبر سنی تو اسے بے حد افسوس ہوا اور اس عورت کی بہادری اور تجربہ کاری پر اسے خراج تحسین پیش کیا اس ایک خاتون کی بہادری کی وجہ سے پورے قبیلے کو مغلوں میں عزت وتعظیم کے ساتھ پکارا جاتا تھا اور جب بھی بابر کے سامنے عمر خیل قبیلے کا ذکر چھڑتا تو وہ اس قبیلے کی بہادری اور اس نڈر خاتون کی بہادری کا تذکرہ کرتا۔ یہ بہادر خاتون شاہ بوڑہی عمر خیل قبیلے کے ایک شخص عبدالرحمٰن عمر خیل کی بیٹی تھی جب وہ پیدا ہوئی تو اس کا نام شاہ بوڑہی رکھا گیا۔ یہ نہایت خوبصورت، متناسب بدن والی حسین وجمیل لڑکی تھی جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو اسی وقت سے ان کھیلوں اور فنون حرب میں دلچسپی لینے لگی جو کہ لڑکوں کے کھیل تھے جب جوان ہوئی تو لڑکیوں کے ماحول کے بجائے لڑکوں کے ماحول کو پسند کرنے لگی۔ کپڑے بھی مردانہ زیب تن کئے اور بہادر لڑکوں کی طرح گھڑ سواری، شمشیر زنی، تیراندازی اور نیزہ بازی کے فنون میں مہارت حاصل کی۔ وہ مردانہ ماحول میں ایسی رچ بس گئی کہ اس ماحول میں رہ کر وہ اپنی نسوانیت سے بے خبر ہو گئی۔ وہ ہر مردانہ مجالس ومحافل اور جرگہ اور معرکہ میں حصہ لینے لگی لوگ بھی اس کی مردانہ وار بہادری اور چابکدستی پر اس کی عزت وتعظیم کرتے۔ وہ جہاں بھی شبخون مارتی کامیاب ہوتی۔ ان اوصاف وفضائل کی بناء پر دلہ زاک کے ہراول دستے کی سالار مقرر کر دی گئی۔

مردانہ ماحول اور مردانہ معرکہ آرائی میں وہ اس قدر آگے نکل چکی تھی کہ اسے کسی بھی لمحے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں خیال تک نہ آتا بلکہ اگر کبھی کوئی ایسا تذکرہ ہوتا تو وہ اسے پسند نہ کرتی اور اس قسم کی باتوں سے کتراتی تھی۔ یہ نہایت جاہ وحشم اور دولت وثروت، غلاموں اور کنیزوں کی مالک لڑکی تھی۔

اسی قبیلے میں اس لڑکی کی حیثیت کے مساوی ایک لڑکا رستم تھا جو ہر لحاظ سے ہم پلہ اور خوبرو جوان تھا۔

ایک روز شاہ بوڑہی کے چند غلام فرار ہو گئے تو یہ اپنے چند رشتے داروں کے ساتھ ان غلاموں کے تعاقب میں روانہ ہوئی اس موقع پر اس کے ساتھ رستم بھی تھا اس نے غلاموں کو پکڑنے کے لئے راستے میں دو دو آدمی ذرا فاصلے پر تعینات کئے آخر میں صرف وہ اور رستم رہ گئے۔

رستم چونکہ خود بھی ایک بہادر، نڈر اور آلاتِ جنگ کے استعمال سے پوری طرح باخبر جوان تھا اور باوجود اس کے کہ شاہ بوڑہی کی نسوانیت بیزار طبیعت سے باخبر تھا۔ کئی دفعہ اس کے دل میں شاہ بوڑہی کا رشتہ مانگنے کی امنگ پیدا ہوتی رہی تھی مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ شاہ بوڑہی شادی کے لئے تیار نہ ہوتی تھی جوان کے رشتے کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

اسی رات جبکہ دونوں تنہا تھے رات گزارنے کے لئے دونوں نے یہ طے

کیا کہ وہ باری باری پہرہ دیں گے۔ رستم پہلے سو گیا اور شاہ بوڑہی پہرہ دینے لگی۔ جب آدھی رات ختم ہوگئی تو اس نے رستم کو بیدار کیا اور خود سو گئی' چاندنی رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شاہ بوڑہی کے خوبصورت چہرے پر اپنی کرنیں بکھیرنے لگا تو رستم کو پوری طرح اس چاند کی کرنوں میں شاہ بوڑہی کی نسوانیت کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے آسمان کے چاند کے سامنے زمین کا چاند آ گیا ہو۔ اب رستم کے دل میں ہلچل پیدا ہونے لگی۔ دل میں محبت کے جذبے مچلنے لگے' شاہ بوڑہی کے حسن بے نظیر نے اس کے دل کو پوری طرح اپنی مٹھی میں بند کر لیا تھا اور وہ اب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور زندگی اور موت سے بے پرواہ ہو کر شاہ بوڑہی پر آج فتح حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کی ایک بھی حرکت پر شاہ بوڑہی کے کمان سے نکلا ہوا تیر اسے ڈھیر کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے تو یہ کام کیا کہ شاہ بوڑہی کے تیر' اس کا کمان اور خنجر اس کے پاس سے اٹھا کر دور رکھ دیا تا کہ یہ اس کی پہنچ باہر ہو جائیں۔ جب اسے پوری طرح نہتا کر دیا تو رستم شاہ بوڑہی کی طرف بڑھا اور سوئی ہوئی شاہ بوڑہی کے رخسار پر اپنا منہ رکھ دیا اور اسے اپنے دانتوں کے درمیان اتنا زور سے کاٹا کہ دانت رخسار میں گڑ گئے اور خون بہنے لگا۔ شاہ بوڑہی درد سے تلملاتی ہوئی اٹھی تو رستم اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ رہا تھا۔ شاہ بوڑہی نے اپنے تیر و کمان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہاں کچھ نہ پایا وہ سخت حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ شاہ بوڑہی نے اپنے رخسار پر ہاتھ رکھا تو رخسار سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ سخت شرمندہ اور خجل ہوئی کہ اب وہ اس داغ کو لے کر کیسے گاؤں جائے گی اور لوگوں کا سامنا کیسے کرے گی۔ اسے احساس ہوا کہ رستم نے اسے جو گھاؤ دیا ہے یہ زندگی بھر کبھی بھر نہ سکے گا اب اسے یہ بھی احساس ہوا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اگر کسی نے اس پر فتح حاصل کی تو وہ رستم ہے۔ اسی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ گھر پہنچی مگر اب وہ پہلے جیسی شوخ و طرار لڑکیوں کی طرح کھیلنے کودنے والی شاہ بوڑہی نہ تھی۔

ادھر رستم کو بھی خوف لاحق ہوا کہ اس نے جو حرکت کی ہے اس کا نتیجہ بڑا ہولناک ہے وہ کئی روز تک گاؤں واپس نہ آیا اس واقع کو چھپانے کے باوجود گاؤں والوں پر آشکار ہو گیا اب شاہ بوڑہی شرم کے مارے گھر سے باہر قدم نہ رکھتی تھی اور گھر میں قید ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے دل میں رستم کو قتل کرنے کے منصوبے بنانے لگی مگر پھر معاً اسے یہ خیال آیا کہ وہ رستم کو کیوں قتل کرے رستم نے تو اس کے چہرے پر سے مصنوعی مردانگی کے نقاب کو ہٹا کر اس کے اصلی نسوانیت کے چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔ اب اس کے نسوانیت کے سوئے ہوئے جذبے بیدار ہونے لگے۔ اس نے دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ جس رستم نے بہادری کے ساتھ میری نسوانیت پر سے مصنوعی مردانگی کے پیرہن کو تار تار کیا ہے اور خود کو فاتح ثابت کر دیا ہے تو وہی اس چیز کا حقدار ہے کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے۔ چنانچہ شاہ بوڑہی نے یہ عزم کر لیا کہ وہ رستم کے ساتھ شادی کرے گی۔ شاہ بوڑہی کے اس ارادے کو اس کی ماں بھانپ گئی اور وہ دل ہی دل میں خوش بھی ہوئی کہ شاہ بوڑہی نے قبیلے کے ایک ہم پلہ جوان کا انتخاب کیا ہے۔ دوسری جانب رستم کو بھی شاہ بوڑہی کے ان نیک ارادوں کا علم ہوا تو پھر دونوں خاندانوں کے درمیان رشتے کی بات چلی اور دونوں خاندان کے لوگوں نے بخوشی اس رشتے کو قبول کر لیا اور پھر بڑی دھوم دھام کے ساتھ شاہ بوڑہی اور رستم کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد شاہ بوڑہی نے مردانہ لباس کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا جس کی وجہ سے اس کا نسوانی حسن اب پوری آب و تاب کے ساتھ نکھرنے لگا اور پھر دونوں میاں بیوی معرکوں میں اپنی بہادری کا جوہر دکھاتے پھر آخر کار مغل فوج کے سپاہیوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کرتے ہوئے خود بھی شاہ بوڑہی نے بہادری اور جانثاری کے ساتھ جان دے دی۔

صاحبزادگئے اور نعمان: درہ خیبر کے راستے سے سردیوں کے آغاز میں کوچیوں کے اونٹوں کے قافلے افغانستان سے پشاور آنا شروع ہو جاتے۔ ان قافلوں میں تجارت کا سامان ہوتا جو یہ کوچی سوداگر افغانستان سے پشاور لاتے۔ ان میں خشک میوہ جات' ہینگ' قالین وغیرہ ہوتے۔ ان کوچیوں کے قافلے پشاور سے باہر قیام کرتے اور سردیاں ان مقامات پر خیمے گاڑ کر گزارتے۔ اسی قسم کا ایک قافلہ جو خیبر کے راستے سے پشاور کی حدود میں داخل ہوا تو موجودہ پشاور یونیورسٹی کے پاس واقع ریگی کے مقام پر ملازئی کے گاؤں سے باہر اس قافلے نے قیام کیا اور ان کے خیمے لگ گئے۔ اس قافلے میں کوچیوں کی عورتیں اور مال مویشی بھی تھے۔ جس میدان میں یہ کوچی خیمہ زن تھے وہاں زندگی کے آثار نظر آنے لگے رات کو ان کے خیموں میں چولہے جلتے جس کی وجہ سے روشنی کی کرنیں اس میدان میں عجیب اور دلکش حسن پیدا کر دیتیں ہر طرف روشنی بکھری ہوتی اور آگ کی حرارت سردی سے بچنے کا سامان پیدا کر دیتی۔ دن کے وقت ان کے مال مویشیوں کے چرنے اور ان کے مردوں کی محفلوں سے رونق لگی رہتی۔ اسی قافلے میں کوچیوں کی ایک لڑکی صاحبزادگئے جو مکمل حسن و جمال کی مرقع تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی بھیڑوں کو ملازئی کے لوگوں کے کھیتوں میں چرانے کے لئے لے جاتی۔ بھیڑیں اور بکریاں تو زمینوں پر چرتی رہتیں اور صاحبزادگئے دھوپ میں بیٹھ کر اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کی مینڈھیاں سنوارتی رہتی۔

اسی گاؤں ملازئی کے ایک خان الماس کے ہاں ایک لڑکا جو کہ 1917ء میں پیدا ہوا تھا اور ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر میٹرک تک کی تعلیم شہر میں پائی وہ اب جوانی میں قدم رکھ چکا تھا اس کا نام نعمان تھا۔ وہ ایک خوبرو اور تنومند نوجوان تھا اور ملازئی میں اس کے باپ کے کھیت اور زمینیں تھیں۔ ایک صبح جبکہ وہ اپنے کھیتوں میں ٹہل رہا تھا تو اس کی نظر صاحبزادگے پر پڑ گئی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو نعمان نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی ازل سے اس کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ ادھر صاحبزادگے نے بھی کچھ اسی طرح محسوس کیا اور دونوں محبت کے جذبے کے بھنور میں پھنس گئے۔ اب نعمان اس کوچی لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا مگر دونوں کے بیچ میں قبائلی روایات دیوار بن کر کھڑی تھیں۔

نعمان نے صاحبزادگے کے والدین کے پاس شادی کا پیغام بھجوایا مگر انہوں نے رد کر دیا پھر گاؤں کے بزرگوں کا جرگہ بھیجا گیا مگر کوچی لوگ نہ مانے۔ اب نعمان اور صاحبزادگے کے لئے ہر آنے والا دن جاں لیوا تھا اور ایک دوسرے سے جدا ہو کر زندگی گزارنے کا تصور بھی ان کے لئے موت کا پیغام تھا۔

آخر بات یہاں تک پہنچی کہ وہ قبائلی روایات کی حدود کو پھلانگ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ملازئی گاؤں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ملازئی گاؤں اور باہر میدان میں کوچیوں کے خیموں تک چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ صاحبزادگے نعمان کے ساتھ چلی گئی۔ نعمان صاحبزادگے کو لے کر ایبٹ آباد چلا گیا اور وہاں کے ڈپٹی کمشنر کے روبرو حاضر ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ شادی کر لینے کا بیان دے کر قانونی طور پر میاں بیوی کے رشتے کو تسلیم کروالیا۔ قانونی اور مذہبی طور پر دونوں اب میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی کو پر کیف انداز میں گزار رہے تھے۔ صاحبزادگے نے کوچیوں والے پیرہن کو ترک کر کے شہری خواتین کا لباس زیب تن کیا۔ بناؤ سنگھار کے وہ تمام طریقے اختیار کر لئے جو تمدنی عورتوں کا سلیقہ ہوتا ہے۔ اس سے صاحبزادگے کا حسن بے تاب ہو کر اس کے وجود سے باہر نکل پڑا۔ وہ زمین پر چلتے پھرتے بھی ستاروں اور مہر و ماہ کی سلطنت کی ملکہ نظر آتی تھی۔ وہ آفاق کی دنیا کی ایک جل پری تھی اس کا شوہر نعمان اس کے پر کیف شباب کو دیکھ کر اس پر مرمٹتا تھا۔

چند ماہ کے بعد نعمان نے صاحبزادگے کو کہا کہ اب گاؤں چلتے ہیں۔ اس کے خیال میں معاملہ اب سرد ہو چکا ہوگا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ کوچیوں کے خیموں میں وہ روایت شکنی کر کے جو چنگاری چھوڑ آیا تھا اس کے شعلے روز بروز بلند ہو رہے تھے اور اب ان شعلوں نے آسمان کے بادلوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر بادلوں کو بھی آگ برسانے پر آمادہ کر لیا تھا۔

نعمان صاحبزادگے کو لے کر جب اپنے گاؤں کے پاس پہنچا تو کوچیوں کے خیمے اسی طرح گڑے ہوئے تھے اور خیموں میں صاحبزادگے کے نعمان کے ساتھ بھاگ جانے کی کیفیت سے پیدا ہونے والے غیظ و غضب نے ہر خیمے میں موجود مرد و زن کے چہروں کو انگارے کی طرح سرخ کر رکھا تھا۔ ہر دل کے اندر نعمان سے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے آگ بھڑک رہی تھی۔ یہ خانہ بدوش اتنی آسانی سے اپنی قبائلی عزت و ناموس کی بربادی کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ صاحبزادگے کے ماں باپ اور دیگر خانہ بدوش مرنے مارنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ کوچیوں نے ہر چال آزمائی کہ کسی طرح وہ اپنی بے عزتی کا نعمان کے خاندان والوں سے بدلہ لیں مگر نعمان کا خاندان بھی کوئی معمولی خاندان نہ تھا۔ لہٰذا کوچیوں نے مجبوراً قانون کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے حکومت افغانستان کو بھی درخواست دے کر اس معاملے میں ملوث کر لیا اور لکھا کہ نعمان نے ہمارے قبائلی اور قومی رواج اور روایات سے بغاوت کر کے خانہ بدوشوں کی زندگی کو موت کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت افغانستان نے حکومت برطانیہ کو یہ سنگین معاملہ بھیج دیا۔ حکومت برطانیہ کی مداخلت سے نعمان اور اس کے گھرانے کو جیل بھیج دیا گیا۔

باقاعدہ عدالت میں مقدمہ شروع ہوا جب عدالت میں پہلی پیشی تھی تو صاحبزادگے بھی پیش ہوئی جو کہ شہری زیب و زینت اور لباس میں ملبوس تھی۔ جب صاحبزادگے کی ماں نے بیٹی کو اس حالت میں دیکھا تو وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح صاحبزادگے کی طرف بڑھی اور اس کا لباس نوچنے لگی لوگوں نے مداخلت کر کے ماں کو بیٹی سے دور کیا۔

عدالت نے بقول خاطر غزنوی ایک خاص قانونی ضابطے کے تحت صاحبزادگے کو حکومت افغانستان کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ صاحبزادگے نے بڑی آہ و بکاء کی روئی پیٹی مگر حکومتی تعلقات اور قانونی ضابطوں کی پابند حکومتوں نے ایک نہ سنی اور خانہ بدوش صاحبزادگے کو طورخم کی سرحد کے پار افغانستان کے پہاڑوں کے پیچھے لے گئے۔

ان دنوں صاحبزادگے نعمان کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی اس نازک صورتحال کا بھی کسی نے احساس نہ کیا۔

دوسری طرف نعمان نے جب یہ فیصلہ سنا تو وہ زندہ درگور ہو گیا۔ جیل کی سختیوں کو جھیل کر جب باہر نکلا تو سخت بیمار ہو گیا اسے ٹی بی کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اسے کھانسی کے دورے پڑنے لگے جب وہ سخت بے حال ہو جاتا تو اس کیفیت میں

اس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلتے:

ہائے کو چیے غرق دکڑم

ہائے کو چی لڑکی تو نے مجھے غرق کر دیا۔

سال کے اندر اندر نعمان دل میں صاحبزادگئے کی یاد لئے اس دنیا سے چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ بعد میں صاحبزادگئے کے ہاں نعمان کی نشانی ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام صاحبزادگئے نے نعمان ہی رکھا۔

اس کے بعد صاحبزادگئے کے والدین نے صاحبزادگئے کی شادی اس کی مرضی کے خلاف اس کے پہلے منگیتر سے کر دی۔

صاحبزادگئے اور نعمان کی اس محبت اور پھر جدائی کے ضمن میں شاعروں نے پشتو زبان میں ٹپے لکھے جو آج بھی گیتوں کی صورت میں گائے جاتے ہیں۔

حکم جان اور نصر اللہ: حکم جان پشاور کے ضلع چارسدہ کے ایک گاؤں عمرزئی کے مناف خان کی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ مناف خان کا ایک جگری دوست الف خان تھا۔ الف خان کا ایک اکلوتا بیٹا نصر اللہ تھا۔ نصر اللہ نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور موضع تنگی میں پٹواری کی حیثیت سے تعینات ہوا۔ الف خان نے اپنے دوست مناف خان سے اپنے بیٹے کے لئے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا۔ مناف خان نے بخوشی آمادگی ظاہر کر دی اور اس طرح اس خوبرو لڑکی حکم جان کی شادی مناف خان کے بیٹے نصر اللہ سے ہوگئی۔ حکم جان ایک وفا شعار بیوی ثابت ہوئی۔ ابتدائی دن بڑی ہنسی خوشی گزرے پھر نصر اللہ نے دوسری شادی کر لی اور اس طرح حکم جان کے گھر اس کی سوکن آ گئی۔ دونوں عورتوں میں حالات کشیدہ ہو گئے اور گھر میں آئے روز دنگا فساد رہنے لگا۔ نصر اللہ کی پوری توجہ دوسری بیوی کی طرف رہنے لگی اور حکم جان سے وہ بے رخی برتنے لگا۔ نئی بیوی نے بھی اس کا پوری طرح فائدہ اٹھایا اور وہ نصر اللہ کو حکم جان کے خلاف بھڑکاتی رہتی۔ نصر اللہ بھی کانوں کا کچا تھا وہ نئی بیوی کی سازشوں کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ حکم جان پر بدچلنی کا الزام دھر دیا گیا۔ نصر اللہ نے بغیر تحقیق و تفتیش کے حکم جان کو بدچلن مان لیا اور یہ طے کر لیا کہ اس بدچلن عورت کے لئے اس کے گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ اب نصر اللہ حکم جان کو راستے سے ہٹانے کے لئے تدبیریں سوچنے لگا۔ چونکہ نصر اللہ ملازمت کے سلسلے میں تنگی جاتا تھا اور کبھی کبھی وہاں ٹھہر بھی جاتا تھا۔ نصر اللہ نے حکم جان کے خلاف ایک سازش تیار کر لی۔ اس نے حکم جان کو کہا کہ مجھے ملازمت کے سلسلے میں تنگی جانا پڑتا ہے اور سرکاری کاموں کی زیادتی کی وجہ سے رات کو بھی کبھی کبھی وہیں ٹھہرنا پڑتا ہے اس لئے میں نے تمہارے لئے تنگی میں ایک گھر لے لیا ہے اور تم ادھر اس گھر میں رہو گی۔

حکم جان نے جب یہ سنا تو وہ بڑی خوش ہوئی اور خوشی خوشی نصر اللہ کے ساتھ تنگی جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ دونوں عمرزئی سے تنگی کے لئے روانہ ہوئے۔ حکم جان خوشی سے پھول نہیں سما رہی تھی۔ دوران سفر حکم جان نے محسوس کیا کہ اس کا خاوند آج غیر معمولی طور پر کسی سوچ میں غرق ہے۔ اس نے نصر اللہ سے پوچھا مگر اس نے جواب نہ دیا اور خاموشی سے راستے پر چلتا رہا۔ نصر اللہ کی اس کیفیت سے حکم جان کو خطرے کی بو محسوس ہوئی مگر وہ اپنے ذہن سے برے وسوسے جھٹک کر چلتی رہی۔ جب نصر اللہ اور حکم جان پیر تورہ بابا کی خانقاہ کے قریب پہنچے جو عمرزئی سے ایک میل کے فاصلے پر ہے تو اچانک شام کے دھندلکے اندھیرے میں دو آدمی جو مسلح تھے نمودار ہوئے اور انہوں نے کرخت آواز میں انہیں رکنے کا حکم دیا۔ حکم جان جسے پہلے ہی شک ہو چکا تھا اب اس کا شک یقین میں بدل گیا اور وہ ایک ٹیلے کی طرف دوڑی وہ دونوں آدمی بھی اس کے پیچھے لپکے اور حکم جان کو اس ٹیلے سے دھکا دے کر گرا دیا اور وہ ہلاک ہو گئی۔ اس مقام کو کھی کندہ کہتے ہیں۔ حکم جان کو قتل کرنے کے بعد اس کے شوہر نصر اللہ اور دو دوسرے قاتلوں نے مل کر حکم جان کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے اسے ایک بوری میں بند کر دیا اور ساتھ کچھ بھاری پتھر بھی ڈال دیئے اور لاش کو دریا میں پھینک دیا۔ اس دریا کو جندی کہتے ہیں۔ دریا میں بوری پھینک کر خود بھاگ گئے۔ لاش کی بوری اللہ کی حکمت سے دریا میں تیرتی رہی اور ایک جگہ کنارے پر لگ گئی۔

عمرزئی کے ہی ایک خان ہدایت اللہ خان کے ایک ملازم کو کسی طریقے سے اس واقعہ کی بھنک پڑ گئی تھی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لاش دریا کے کنارے پر فلاں جگہ ہے۔ وہ راتوں رات ایک آدمی کے ساتھ اس مقام پر پہنچا مگر قاتلوں نے اس کے آنے سے پہلے ہی لاش کو یہاں سے غائب کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ اس کی بیٹی حکم جان اسے کہہ رہی ہے کہ وہ فلاں کنویں میں ہے۔

یہ وہ کنواں تھا جو ویران پڑا تھا اور حاجی صاحب ترنگزئی کے نام سے منسوب ہے۔ جسے چاہ حاجی صاحب تورنگزئی کہا جاتا تھا۔ حکم جان کی ماں کی نشاندہی پر لوگ وہاں پہنچے اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ حکم جان کی لاش ایک بوری میں بند اس کنویں میں پڑی تھی۔

پولیس میں رپورٹ لکھا دی گئی اور تفتیش پر پولیس نے نصر اللہ اور دو دوسرے قاتلوں سلیم خان اور شالے کو گرفتار کر لیا عدالت میں مقدمہ چلا تو ان کو قید کی سزا ہوئی۔

لوک ،لباس ،زیورات و دیگر سامان آرائش

جب خالصۃً پشاوری ثقافت کی بات کریں تو اس سے مراد پشاور کا وہ خاص تمدنی حدود اربعہ ہوگا جس کی حدیں پشاور کے چاروں اطراف میں تعمیر شدہ حصار شہر کے اندر محدود تھیں۔ لہٰذا پشاور کی قدیم ثقافت سے منسلک لوگ وہی ہیں جو اس شہری رقبے میں آباد ہیں ان کے لباس و زیبائش کے طور طریقے اب تک وہی ہیں جو صدیوں سے رائج ہیں۔ اگرچہ آبادی میں اضافے کی وجہ سے اب شہری آبادی کا بہت بڑا حصہ اس شہری رقبے سے باہر کی طرف بھی منتقل ہو چکا ہے اور انہوں نے شہر کی حدود سے باہر مختلف ناموں کی بستیاں بسالی ہیں اور جدید طرز کے مکانات تعمیر کر کے سکونت اختیار کر لی ہے ان آبادیوں کو بھی پشاور کی شہری آبادی میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مگر لباس و اطوار میں یہ شہری لوگ اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں اس شناخت کا ایک بڑا ذریعہ ان کی زبان ہندکو بھی ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے شہری حدود کے اندر ہندو بھی آباد تھے جن کے اپنے مذہبی حوالے اور جداگانہ رہن سہن تھا۔ لباس میں یہ لوگ دھوتی استعمال کرتے تھے جبکہ مسلمان شروع سے ہی دھوتی کے بجائے شلوار پہنتے چلے آرہے ہیں۔

مردانہ لباس: پشاور شہر کے لوگ شلوار اور کرتہ قمیض استعمال کرتے تھے۔ شلوار اکثر سفید لٹھے کی استعمال کرتے جبکہ قمیض مختلف رنگوں کے کپڑے کی بنائی جاتی تھی۔ قمیض کالروں والی بھی ہوتی تھی اور کالروں کے بغیر بھی۔ آستین اور سینے کے پاس بٹن لگائے جاتے ہیں البتہ بڑے گھرانے کے نوجوان آستینوں اور کالروں کے نیچے اسٹڈ استعمال کرتے اور بعض اونچے گھرانے کے لوگ سونے کے بٹن بھی استعمال کرتے۔ آج سے تقریباً 25 قبل لوگ کرتہ اور چھوٹا کوٹ استعمال کرتے۔ شہر کے وہ زمیندار جو زمینوں کی کاشت کرتے ان کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ شلوار اور بڑے سائز کی قمیض بناتے۔ سردیوں میں کھدر کا لباس اور گرمیوں میں سادہ لٹھہ کی کھلے پائنچوں والی شلوار استعمال کرتے۔ ان کے لباس کی آستین کھلی ہوتی تھی جس میں بٹن نہیں ہوتے تھے تاکہ ہل چلاتے وقت یہ آسانی سے اوپر اٹھا سکیں۔ شہری لوگ شلوار تو لٹھے کی پہنتے مگر قمیض کے لئے قیمتی کپڑا استعمال کرتے جو زیادہ تر بوسکی یا پالین کے کپڑے کی ہوتی تھی۔ کاروباری لوگ مثلاً دودھ فروش، گوالے یا نانبائی کام کے وقت لنگی بھی باندھ لیتے اور اوپر ململ کے کپڑے یا لٹھے کی بنی ہوئی کرتی پہن لیتے یہ رواج اب بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

وہ نوجوان جو دفتروں میں کام کرتے وہ فرنگیوں کے دور سے پتلون استعمال کرتے جو کہ اُس دور میں سرکاری لباس ہوتا تھا۔

زمیندار گھرانے کے لوگ بالکل سیدھا سادا اور ڈھیلا ڈھالہ کھلے پائنچوں اور کھلی آستین والا لباس استعمال کرتے۔ سر پر پگڑی باندھتے اور کندھے پر چار یا پانچ گز کی لمبی چادر رکھتے۔ یہ ان کے زمیندار ہونے کی علامت ہوتی تھی۔ پشاور کے بااثر اور سن رسیدہ لوگ سر پر کلاہ پہنتے اور کلا پر مشدی باندھتے، ہاتھ میں قبضے دار چھڑی جسے بینت کہتے رکھتے تھے۔ اکثر لوگ سروں پر قراقلی استعمال کرتے جو کہ بھیڑوں کی کھال سے بنائی جاتی ہے۔ سردیوں کے موسم میں سنجیدہ گھرانے کے لوگ شیروانی پہنتے جو زیادہ تر سیاہ گرم کپڑے کی ہوتی۔ شیروانی کا استعمال اب بھی ہے بلکہ اسلامیہ کالج کا یونیفارم ہی سیاہ شیروانی ہے۔ عموماً علماء دین مسجد میں امامت کے وقت سردیوں میں شیروانی پہنتے ہیں۔

جوتی: پشاور کے قدیم لوگ جوتی کا استعمال زیادہ کرتے اس چمڑے کی ہلکی پھلکی جوتی کے اوپر طلائی تار چڑھا دی جاتی۔ یہ آسانی سے پہنی اور اتاری جاسکتی ہے۔ اب اس کا استعمال بہت کم رہ گیا ہے۔ پہلے پشاور میں اس کے کاریگر بہت زیادہ ہوتے تھے۔ اس جوتی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کا دایاں اور بایاں نہیں ہوتا تھا بلکہ دونوں پاؤں کے لئے اس کا جوڑا یکساں بنایا جاتا تھا۔

پشاوری چپلی: پشاور کی دستکاریوں میں پشاوری چپلی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ صدیوں سے یہ چپل مرد استعمال کرتے آرہے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک بند چپلی جو آگے سے لمبوتری ہوتی ہے اور اس کے پیچھے ایک سوراخ دار تسمہ ہوتا ہے جسے ایک بکسوئے کے ساتھ لگی ہوئی میخ نما میں پاؤں کے سائز کے مطابق باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ عموماً ہر جوان و بچہ اور معمر شخص پہنتا ہے۔ دوسری چپلی پنجے کی طرف کھلی ہوتی ہے اسے پنجے دار چپلی کہتے ہیں۔ وہ کھلنڈرے جوان جو لباس میں پُر تکلف ہوتے ہیں وہ یہ چپلی استعمال کرتے ہیں اور اوپر سے طلائی کام کرواتے ہیں۔ وہ ایسی چپلی خاص اس انداز سے تیار کرواتے ہیں اور موچی کو ہدایت کرتے ہیں کہ ایسا چمڑا استعمال کریں کہ پہن کر جب وہ چلیں تو اس میں سے چوں چوں کی آواز آئے یہ آوارہ منش نوجوانوں میں مقبول ہے اور شرفا اس کو پسند نہیں کرتے۔

مندری: پشاور کے بڑے گھرانوں کے مرد حضرات انگلیوں میں سونے کی مندری

جسے انگوٹھی کہا جاتا ہے استعمال کرتے ہیں۔ انگوٹھی کے اوپر عموماً سرخ رنگ کا نگ جڑا ہوتا ہے۔

واسکٹ: آج کل واسکٹ کا رواج عام ہے جہاں تک اس کی بناوٹ کا تعلق ہے پرانے دور میں یہ لٹھے کی ہوتی تھی کیونکہ اکثر کاروباری اور زمیندار لوگ اس قسم کا پہناوہ کرتے کے اوپر پہن لیتے تھے۔ جس کے دونوں طرف جیبیں بنائی جاتی تھیں اس واسکٹ کا مقصد جیبوں میں پیسے وغیرہ کو محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ اب لٹھے کے بجائے کپڑے کا واسکٹ بہت مقبول ہے اور لوگ کوٹ کے بجائے مختلف گرم کپڑوں کی واسکٹ بنوا کر پہنتے ہیں۔ کپڑے کا رنگ مختلف ہوتا ہے اس میں سیاہ' سفید' دھاری دار' نیلا' نسواری وغیرہ شامل ہے۔ پشاور کے بعض لوگ چترالی پٹی سے بنی ہوئی واسکٹ بنوا کر استعمال کرتے ہیں۔

ٹوپی: پشاور کے خاص طبقہ کے لوگ قراقلی ٹوپی کا استعمال کرتے تھے مگر اب رواج بہت حد تک بدل گیا ہے اور زیادہ تر لوگ چترالی پٹی سے بنی ہوئی گرم ٹوپی استعمال کرتے ہیں جو اوپر سے تھالی نما ہوتی ہے۔ یہ گرم ہوتی ہے اور سر پر سج بھی جاتی ہے چترالی پٹی کی واسکٹ اور چترالی ٹوپی ایک پروقار مردانہ لباس ہے۔

تلے دار ٹوپی: عموماً سفید کپڑے کی گول ٹوپی ہوتی ہے جس پر نیچے کی طرف اور سر کے اوپر کناروں پر طلائی کا کام کیا جاتا ہے۔ پشتون بچے جو ٹوپی استعمال کرتے ہیں اُس پر تمام کا تمام کام طلائی کی تار کا ہوتا ہے۔ مذہبی لوگ عموماً یہی ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔

اون کی ٹوپی: اب سے دس سال پہلے تک گھروں میں بچیاں اون سے سلائیوں پر طرح طرح کے ڈیزائن دار پہناوے بناتی تھیں۔ اسی نوعیت کا ایک کام ٹوپی کی بُنائی کا بھی ہوتا تھا یعنی وہ سلائیوں پر اون کی ٹوپیاں بناتی تھیں جو چترالی ٹوپی کے نمونہ پر ہوتی تھیں لوگ بڑے شوق سے یہ ٹوپیاں استعمال کرتے تھے اور خواتین یہ ٹوپیاں بنا کر دکانداروں کو بھیج دیتی تھیں اور دکاندار انہیں اس کا معاوضہ دیتے تھے۔ اس سے گھر کی جوان بچیاں محنت مزدوری سے پیسہ بھی کما لیتی تھیں جوان کے جہیز کی تیاریوں میں ممد و معاون ہوتا تھا اب بھی یہ پہناوہ موجود ہے۔

کُرتی: یہ واسکٹ نما پہناوہ زیادہ تر مرد حضرات گرمیوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ کپڑے کی ہوتی ہے اور سردیوں میں لٹھے یا کسی اور گرم کپڑے کی بنائی جاتی ہے۔ اس کے دونوں طرف اور اندر کی طرف جیبیں بنائی جاتی ہیں۔ جیبوں کے اوپر عموماً زنجیری لگا دی جاتی ہے۔ زمیندار اور کاروباری لوگ خاص کر یہ کرتی پہنتے ہیں جبکہ عام لوگ بنیان استعمال کرتے ہیں۔

تعویذ: تعویذ عموماً وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو مختلف کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لیتے مثلاً پشاور کے پہلوان جو اکھاڑے میں مدمقابل کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں وہ بزرگ اور عالموں سے کلام پاک کے تعویذ لکھوا کر اسے چاندی کی ڈبیہ میں بند کروا کر موٹے ریشمی سیاہ دھاگے سے باندھ کر گلے میں ڈال لیتے ہیں یہ لوگ اس تعویذ کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اس تعویذ کی برکت سے مقابلہ جیت جائیں گے۔ پشاور کے پہلوان اور دیگر کھلاڑی لوگ اس کا استعمال التزام سے کرتے ہیں۔

زیورات: پشاور کے لوگوں کی خواتین میں شروع ہی سے زیورات کے استعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اہل پشاور اپنی خواتین کو زیورات سے ہر وقت سجا یا رکھتے تھے اب بھی اہلیان پشاور میں زیورات کے استعمال کا رواج بڑا مقبول ہے۔ قدیم خواتین سونے کے زیورات کے علاوہ چاندی کے زیورات بھی بڑے شوق سے پہنا کرتی تھیں۔ قدیم زمانے میں چونکہ سونا سستا ہوتا تھا اس لئے بڑے بھاری بھاری سونے کے زیورات استعمال کئے جاتے تھے۔ خواتین جو زیورات استعمال کرتی ہیں ان میں بہت سے قدیم زیورات ایسے بھی ہیں جو آج تک مروج ہیں۔ پشاور کے لوگ آج بھی جب اپنی لڑکی کا رشتہ طے کرتے ہیں تو زیورات کا وزن اور تعداد پہلے ہی سے طے کر لیتے ہیں اور شادی کے موقع پر دولہا کے والدین یا سرپرست کو یہ زیورات حاضر کرنا پڑتا ہے۔ جو زیورات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں وہ یہ ہیں:

کندن دونڑیں: یہ سر کا زیور ہے جسے سر کے اگلے حصے یعنی ماتھے کے اوپر باندھتے ہیں۔ یہ ایک چوڑی دیدہ زیب لڑی ہوتی ہے جس میں تین ٹیکے ہوتے ہیں جو لڑی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ پشاوری اسے کندن دونڑیں کہتے ہیں۔

تاج: یہ تاج کی طرح کا زیور ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک سادہ تاج جو ٹیکے کے بغیر ہوتا ہے اور دوسرا ٹیکے والا ہوتا ہے۔ معتبر اور اہل ثروت لوگ شادی کے وقت لڑکی کو پہناتے ہیں۔

جھومر: سر کے ایک طرف یعنی بائیں طرف کا ٹیکہ ہوتا ہے جسے جھومر کہتے ہیں یہ بالوں کے ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے۔

ٹیکہ: یہ لمبی سی زنجیر کے ساتھ جڑا ہوتا ہے جو کہ ایک کوکے کے ساتھ بالوں میں

ٹانک دیا جاتا ہے اور ٹیکہ ماتھے پر لٹکا ہوتا ہے۔ نہایت خوبصورت زیور ہے۔ دولہن اکثر استعمال کرتی ہیں۔ موجودہ عہد میں اب اس کی شکل بدل گئی ہے اور سائز چھوٹا ہوگیا ہے اب اسے بندیا کہتے ہیں۔

مگھر اور جھمکے: یہ کانوں کے زیورات ہیں۔ دونوں کانوں میں سوراخ کر کے ان میں یہ مگھر لٹکا دئے جاتے تھے جو بڑے بڑے سائز کے ہوتے تھے۔ جھومکے بھی عام زیورات میں شامل ہیں یہ گول ٹکیہ کی طرح ہوتا ہے جس کے نیچے دو یا تین کٹوری کی طرح چھوٹی چھوٹی بنی ہوتی ہیں۔

بالیاں: بالیاں زیورات کی وہ قسم ہے جو گولائی کی شکل کا سادہ سا زیور ہے۔

نتھ: ناک میں ڈالنے کے لئے جو زیور ہے اسے نتھ کہتے ہیں۔

نتھنی: یہ بھی ناک کا زیور ہے جو کہ نتھ سے ذرا چھوٹی ہوتی ہے۔

کوکا: یہ ناک میں ڈالا جاتا ہے اور ہر عورت اور لڑکی ناک میں سجاتی ہے۔

گلوبند: یہ گلے کا زیور ہے جو کہ گلے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے اس کو پیچھے کی طرف ریشمی تار کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔

رانی ہار: یہ سونے کا بھی ہوتا ہے اور صرف موتیوں کا بھی ہوتا ہے اسے گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ یہ بڑے گھرانے کی خواتین پہنتی ہیں اس لئے اسے رانی ہار کہتے ہیں۔

پونڈوں کا ہار: یہ خالصتہً سونے کا بنا ہوتا ہے۔ سونے کی لڑی کے ساتھ پونڈ لٹکا دیئے جاتے ہیں اس لئے اسے پونڈوں کا ہار کہتے ہیں۔

پنج انگلاں: یہ ہاتھ کا زیور ہے پانچ انگوٹھی کے ساتھ ایک لڑی جڑی ہوتی ہے۔

مندری: یہ ہاتھوں کی انگلیوں میں پہننے کا زیور ہے اوپر نگ جڑا ہوتا ہے یہ خواتین کے علاوہ مرد بھی استعمال کرتے ہیں۔

چوڑی: یہ کلائی کا زیور ہوتا ہے جو کہ کلائیوں میں ڈالا جاتا ہے یہ حیثیت کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔

کڑے: یہ بھی کلائی کا زیور ہے جو کہ چوڑی سے بھاری ہوتا ہے اسے کلائیوں میں ڈال کر مروڑ دیا جاتا ہے۔

گوکھرو کڑے: یہ بھاری اور خالص سونے کے ہوتے ہیں اور کلائی میں ڈالے جاتے ہیں۔

فیشنی کڑے: یہ سونے کے وہ کڑے ہیں جو کہ ڈیزائن والے ہوتے ہیں اور اوپر موتی جڑے ہوتے ہیں۔

پازیب: یہ پاؤں میں ڈالنے کے لئے استعمال ہونے والا زیور ہے جو عموماً چاندی کی ہوتی ہے جبکہ اہل ثروت گھرانے کی خواتین سونے کی استعمال کرتی ہیں۔

جسمانی کھیل تماشے

کبڈی: پشاور کے مضافات میں دیہاتی زندگی میں کبڈی کو اب بھی بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے اور شام سے پہلے گاؤں کے نوجوان اکثر باہر میدانوں میں کبڈی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ یہ روایتی کھیل جو نوجوانوں کی سانس کی ایک مشق کے علاوہ ورزشی کھیل بھی ہے اب بھی بالالتزام کھیلا جاتا ہے۔

چینجو: چینجو کا کھیل بچے کہیں کہیں کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چینجو کا کھیل اس طرح ہے کہ زمین پر چاک سے مختلف خانے بنائے جاتے ہیں اور ایک کے بعد دوسرے خانے میں کوئی ڈبیا یا ٹھیکرہ پھینکا جاتا ہے بشرطیکہ وہ لکیر پر نہ آئے اور پھر ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پاؤں کے ذریعے پھلانگتے ہوئے بچے اس خانے تک پہنچ کر ڈبیا کو پاؤں کی ٹھوکر سے باہر نکالتے ہیں اس طرح سب خانے مکمل ہونے پر مدمقابل جیتنے والے کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے طے شدہ منزل تک لے جاتا ہے۔

کشتی: کشتی یہاں کے لوگوں کی ثقافتی اور ورزشی کھیل ہے۔ اس کھیل میں پشاور کے بہت سے پہلوانوں نے ناموری حاصل کی ہے باقاعدگی کے ساتھ پہلوانوں کے مقابلے اکھاڑوں میں ہوتے تھے پشاور میں جابجا یہ اکھاڑے قائم تھے اور لوگ شام سے پہلے بڑے شوق سے ان اکھاڑوں پر پہلوانوں کی ورزشی کشتی دیکھنے جاتے۔ اب بھی بعض مقامات پر یہ کشتیاں لڑی جاتی ہیں۔ پہلوان ان اکھاڑوں کا بے حد احترام کرتے کیونکہ یہ اکھاڑے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے۔

یہ کھیل مقابلتہً اس طرح کھیلا جاتا ہے کہ دو مدمقابل پہلوان اکھاڑے میں داخل ہوتے اور مختلف داؤ پیچ سے کشتی لڑتے ہیں ان داؤوں کے مختلف نام ہیں مثلاً دھوبی، ڈھاک، قلہ زن اور یک دستی۔ دھوبی داؤ بازو کو دبا کر

آزمایا جاتا ہے' ڈھاک کے ذریعے گردن کو مروڑا جاتا ہے' قلعہ زن بازو اور ٹانگ۔ کے ذریعے کھیلا جاتا ہے اور یک دستی ہاتھ اور کہنی کے داؤ کو کہتے ہیں۔

کبوتر بازی: زمانہ حال میں کبوتر بازی کا مشغلہ اب اس حیثیت میں نہیں رہا جو آج سے بیس پچیس سال پہلے تھا لیکن پشاور کے مستقل تہذیبی اور ثقافتی حیات آج بھی تسلسل سے کبوتر بازی کے اس مشغلے سے مربوط ہے۔ قدیم زمانے سے پشاور کا ہر محلہ اور علاقہ اپنے چند کبوتر بازوں کی شہرت کے سبب ایک پہچان رکھتا تھا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے تک ہر نسل کا کبوتر باز مسگراں (قصہ خوانی) کے شمال میں بٹیر بازاں بازار میں دستیاب ہوتا تھا لیکن اب یہ کاروبار پشاور شہر کے جنوب میں کوہاٹی گیٹ کے اندر ہو رہا ہے جہاں کبوتروں کے علاوہ دیگر پرندے بھی دستیاب ہیں۔ کبوتر بازی کا مشغلہ قطعی طور پر لوگوں کے شوق پر انحصار کرتا ہے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ پشاور کے بعض گھرانوں میں یہ شوق بعد نسل منتقل ہو کر موروثی شوق اور مشغلہ بنتا گیا لیکن اب اس شوق اور مشغلے کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ لکھاری بشیر حسین امام کے کبوتر بازی کے کھیل کے بارے میں ایک سروے رپورٹ کے مطابق کبوتر بازی کا کھیل پاکستان بننے سے پہلے برصغیر جنوبی ایشیاء میں ہندوستان کے ملک لکھنو کے نوابوں کا تھا' جو کبوتر پالتے اور پھر سدھاتے اور لڑاتے بھی تھے۔ مشہور تھا ان کے مختلف علاقوں میں یہ شوق منتقل ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں اور شہروں میں کبوتر بازی کا مشغلہ روز افزوں بڑھتا رہا لیکن پشاور کے لوگوں نے کبوتر بازی کو اپنی روایتی اور تہذیبی زندگی کا حصہ بنا لیا' کبوتر ایک معصوم' خوبصورت اور وفادار جانور ہے۔ بادشاہوں کے زمانے میں کبوتر کو پیغام رسانی کے لئے پالا جاتا تھا۔ جسے خاص تربیت دے کر دور دراز کی مسافت تک پیغام رسانی کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ قدرت نے کبوتر کے پروں میں میلوں اونچائی اور دور دراز تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کر رکھی ہے کبوتر جب اڑتے ہیں تو ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے جو فرحت انگیز ہوا پھیلتی ہے اس سے انسانی طبیعت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بعض حکماء تو اکثر مریضوں کو کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے آنے والی ہوا کو حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں کبوتر کا گوشت اور اس کی یخنی بھی حکماء کی طرف سے فالج زدہ مریضوں اور سینے کے امراض میں مبتلا مریضوں کے لئے مفید ہے۔ کبوتر بازی یعنی کبوتر کے خیل اڑانے کے لئے دو اوقات کبوتر باز مقرر کرتے ہیں۔ شام کو سورج ڈھلنے سے پہلے اور علی الصبح جب سورج طلوع ہو رہا ہوتا ہے کبوتر باز اپنے گھروں کے اوپر چبوتروں سے کبوتر اڑاتے ہیں یہ کبوتر ایک ایسے جال کو لہرا کر کبوتر باز اڑاتے ہیں جنہیں یہ اپنی بولی میں چھیکا یا تپا کہتے ہیں اور اس موقع پر ہاھو کے ایک خاص آواز اور سیٹی کے ساتھ کبوتر باز اپنی خیلوں کو اڑاتے ہیں۔ پشاور کے گرد و نواح میں بعض دیہات میں اعلیٰ نسل کے کبوتر پائے جاتے ہیں جنہیں خاص مہارت سے پکڑا جاتا ہے۔ ان کبوتروں کی اقسام حسب ذیل ہیں:

رنگین' کپور' شیرازی' خال' جوگیے' میازاغ' قمریا' پوئی' خال گلدار' خال چپ' شیرازی گلدار' چپ گلدار' شیرازی چپ' چواچندن' مولا' زرد' تانبڑے' بھاتے' بہروپیے' یا ہو' چوٹی دار۔

رنگ کبوتر: زرد' لال' کیتھی' سبز' اگرائی' کالے' بینگن' سفید' کپور' دوباز۔

سبز پرے (دیسی): نیلے' لال بند' بمنے' نقطے' گھاگرے' ناری گھاگرے' خیرے۔

گائی کبوتر: آوارہ کبوتر' یہ جنگلی کبوتروں میں مل کر رہتا ہے۔

اصیل کبوتر: یہ بلند پرواز کبوتر ہیں ان کی اقسام لال سرے' کل سرے' جونسرے' سفید' سبز شاہ جہاں پوری' گلدار' تانبڑے' قاصد' کالے' نیلے لقے' دوباز۔

پشاور کے مشہور کبوتر باز: اس وقت ایک رپورٹ کے مطابق سید عابد شاہ بہت شوق سے کبوتر بازی کے مشغلے کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور شہر سے باہر جی ٹی روڈ پر واقع ناصر پور گاؤں میں کبوتروں کے ڈربے بنائے جاتے ہیں ان کے پاس تقریباً ایک ہزار نایاب کبوتروں کی اقسام دستیاب ہیں۔

بچوں کے کھیل

گیند گیٹا: یہ کھیل اس طرح ہوتا ہے کہ چار' دو یا تین بچیاں یا لڑکیاں گول دائرے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ عموماً لکڑی کے بنے ہوئے چوکور ٹکڑے جن کی تعداد چار ہوتی ہے زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ سب سے پہلے بچیاں اپنی اپنی باری طے کر لیتی ہیں اور پھر ایک بچی کھیل اس طرح شروع کرتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں گیند ہوتا ہے گیند کو اوپر کی طرف اچھالا جاتا ہے اور اسی دوران زمین پر پڑے ہوئے ایک لکڑی کے ٹکڑے جسے گیٹا کہتے ہیں اٹھاتی ہے اور پھر گیند زمین سے اچھلتا ہے تو اسے اپنے گیٹے والے ہاتھ میں جھپتی ہے۔ پھر اس دوسرے اور تیسرے اور چوتھے گیٹے کو اٹھاتی ہے پھر دوسرے راؤنڈ میں دو گیٹے اٹھاتی ہے پھر تیسرے راؤنڈ تین گیٹے اور چوتھے

راؤنڈ میں چار گیٹے ایک ساتھ اٹھاتی ہے۔ کھیل کے اس دوران میں گیند کا جپتا خطا ہو جائے یعنی گیند ہاتھ میں نہ آئے تو وہ لڑکی ہار جاتی ہے۔ اگر چاروں مرتبہ کامیاب ہو جائے تو آخر میں بائیں ہاتھ کو زمین پر اس طرح رکھتی ہے کہ انگوٹھا اور انگشت شہادت زمین پر ہوتی ہے اور ہاتھ اوپر سے جھونپڑی نما بن جاتا ہے پھر لڑکی پوچھتی ہے کہ کونسا کتا' باقی لڑکیاں ایک گیٹے پر ہاتھ رکھ کر بتاتی ہیں کہ یہ کتا' تو کھیلنے والی لڑکی گیند کو اوپر اچھال کر اسی کتے کو ہاتھ کی انگلی سے دھکیلتی ہے اور پھر گیند کو ہاتھ میں جپتی ہے اگر خطا ہو جائے تو لڑکی ہار جاتی ہے اور پھر اسی طرح چاروں گیٹوں کو ہاتھ کے نیچے سے گزارتی ہے اور گیند کو اچھال کر جپتی ہے۔ شروع میں یہ بھی فیصلہ کیا جاتا ہے کہ دس یا بیس راؤنڈ ہوں گے اگر کوئی لڑکی تمام راؤنڈ بخوبی طے کر لے تو وہ کامیاب ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر دوسری لڑکی اور پھر تیسری لڑکی اپنی باری کرتی ہے۔

دوڑ لگانا: یہ بچوں کا ایک ورزشی کھیل ہے اور عموماً پشاور کے دیہات میں دوڑ لگائی جاتی ہے یہ اس طرح ہوتا ہے۔

دوڑ میں شریک لڑکے کسی ایک مقام پر نشانی رکھ دیتے ہیں اور اس مقام تک دوڑتے ہیں جو سب سے پہلے اس مقام تک پہنچ جائے وہ جیت جاتا ہے۔ اس کھیل کے ذریعے دم کو پختہ کرنے کی مشق کی جاتی ہے۔

گیٹی چھپانڑی جمعرات آئی اے: یہ پشاور شہر کے محلوں میں رہنے والے چھوٹے بچوں کا کھیل ہے۔ اسے کھیلنے کے لئے بچے گول دائرے میں سر نیچے کر کے بیٹھ جاتے ہیں ایک بچہ اٹھتا ہے جو اس کھیل کو شروع کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا ہوتا ہے جس کے آگے گانٹھ بنالی جاتی ہے تاکہ اس میں سختی پیدا ہو جائے یہی بچہ ایک گیٹی کسی بچے کے پیچھے رکھ کر چکر لگاتا ہے اور کہتا ہے۔

گیٹی چھپانڑیں جمعرات آئی اے
جڑا اگے پچھے تکے اس دی شامت آئی اے

یہ بچہ منہ سے یہی الفاظ نکالتا ہے اور دائرے کے گرد اس وقت تک چکر لگاتا رہتا ہے جب تک کہ وہ بچہ جس کے پیچھے گیٹی رکھی ہو وہ یہ گیٹی اٹھا نہ لے۔ جب دوسرا بچہ جس کے پیچھے گیٹی ہو وہ یہ گیٹی اٹھا لیتا ہے تو وہ پھر اسی طرح چکر لگانا شروع کرتا ہے اور وہ یہ کپڑا ابھی ہاتھ میں لے کر پہلے والے بچے کے پیچھے بھاگتا ہے پہلے والا بچہ اگر جان بچالے اور دوسرے والے بچے کی خالی نشست پر بیٹھ جائے تو یہ دوسرا بچہ پھر یہ گیٹی اور کپڑا کسی اور بچے کے پیچھے رکھ دیتا ہے اور یہی الفاظ دھراتا ہے۔

گیٹی چھپانڑیں جمعرات آئی اے
جڑا اگے پچھے تکے اس دی شامت آئی اے

پھر وہ بچہ جس کے پیچھے یہ گیٹی اور کپڑا ہو تو وہ اس گیٹی اور کپڑے کو اٹھا لے تو وہ پھر اسی طرح یہی عمل دھراتا ہے ہاں ایک بات ہے جب وہ بچہ جس کے پیچھے یہ کپڑا اور گیٹی پڑی ہو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پہلے والے بچے کے پیچھے بھاگے اور اس کو اپنی خالی نشست پر بیٹھنے سے پہلے کپڑے کی گانٹھ مارنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ بھاگنے والا بچہ ہار جاتا ہے۔ یہ کھیل اسی طرح جاری رہتی ہے۔

نیلی پری آ جا: یہ لڑکیوں کا کھیل ہے جس میں دس لڑکیاں حصہ لیتی ہیں۔ چار چار لڑکیاں مخالف سمتوں میں بیٹھ جاتی ہیں جبکہ دو لڑکیاں طرفین سے لیڈر بن جاتی ہیں اور وہ دائیں بائیں مخالف سمتوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں اپنی اپنی ٹیموں کا نام رکھ لیتی ہیں نیلی پری' سبز پری یا لال پری۔

مخالف سمت کی لڑکیاں ایک دوسرے کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہیں دونوں ٹیموں میں سے یہ آواز آتی ہے:

نیلی پری آ جا چھپ چھپ کے آ جا　　تپہ مار کے چلی جا کسی کو پتہ نہ چلے

مخالف میں سے ایک لڑکی تھپڑ مار کر چلی جاتی ہے اور پھر اپنی نشست پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیڈر لڑکی پوچھتی ہے کس نے تھپڑ مارا اگر وہ لڑکی درست بتا دے تو اس ٹیم کی لڑکیاں ایک قدم آگے ہو جاتی ہیں۔ یہی عمل دھرایا جاتا ہے اور ایک ایک قدم آگے بڑھایا جاتا ہے جو ٹیم زیادہ قدم بڑھالے وہ جیت جاتی ہے۔

پینگ: پشاور کے وہ گھر جہاں اکثر بیریوں کے درخت ہوا کرتے تھے بیری کے درخت کی ٹہنیوں میں رسی کی پینگ بنالی جاتی تھی اوپر سے مخالف سمتوں میں دو ٹہنیوں پر رسی مضبوط باندھ لی جاتی ہے اور نیچے دونوں طرفوں سے رسی کو گول کر کے اس میں کوئی مضبوط ڈنڈا یا تختہ لگا دیا جاتا اور پھر محلے کی بچیاں یہاں آ کر پینگ جھولتی تھیں۔ اب بھی بعض کھلے صحن والے گھروں میں یہ کھیل موجود ہے۔

گھوڑ دوڑ: یہ کھیل رئیسوں کا ہے تاہم عام لوگ بھی اس میں حصہ لیتے۔ پشاور کے ریس کورس گراؤنڈ میں اب سے کوئی تیس سال قبل ہر اتوار کے روز گھوڑوں کی ریس ہوتی جسے پشاوری لوگ گھوڑ دوڑ کہتے۔ اس میں ایک تو وہ لوگ ہوتے جو کہ شائقین ہوتے جو صرف اس ریس کو دیکھنے کے لئے جاتے اور دوسرے وہ لوگ جو کہ اس کھیل میں باقاعدہ حصہ لیتے اور شرطیں لگاتے۔ فربہ اور مستعد گھوڑے میدان میں

آتے جن پر گھوڑ سوار بیٹھے ہوتے۔ انہیں جیکی کہتے۔ گھوڑوں پر بھی نمبر ہوتے اور جیکی نے جو لباس پہنا ہوتا اس پر بھی نمبر ہوتا یعنی ہر گھوڑے کا اپنا اپنا نمبر ہوتا ایک خاص مقام متعین کر دیا جاتا جہاں تک گھوڑوں کی ریس ہوتی۔ کھیل میں باقاعدہ شریک ہونے والے اپنے اپنے نمبر کا گھوڑا طے کر لیتے اور پیسے جمع کروا دیتے پھر یہ ریس سیٹی بجنے پر شروع ہو جاتی۔ متعین مقام پر جو گھوڑا سب سے پہلے پہنچ جائے اس نمبر والے شخص کو کامیاب قرار دیا جاتا ہے اور وہ ہزاروں روپے حاصل کر لیتا۔

تیراکی: پشاوری لوگ اکثر چھٹی کے روز اکٹھے ہو کر سیر کے نام سے ایک پارٹی کا اہتمام کرتے جو اکثر پشاور سے باہر، سخی کے چشمے، گور ڈبی کٹورے کے کنویں اور باغیچہ جان محمد کے مقام پر ہوتی۔ لوگ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے اور وہیں پر پکانے کا اہتمام بھی کرتے اور وہاں پر قدرتی چشموں میں تیراکی کا مظاہرہ کرتے۔ یہ سیر کی پارٹیاں گرمیوں کے موسم میں منعقد کی جاتیں۔ تاہم عام دنوں میں بھی پشاور کے نوجوان گرمیوں کے موسم میں ان چشموں پر اور پشاور کے بیرونی احاطوں، بیرون سرکی گیٹ بیرون یکہ توت وغیرہ میں بہنے والی نہر پر تیراکی کے لئے جاتے اور پانی سے کھیلتے۔

لوڈو: یہ کھیل بھی گھر گھر کھیلا جاتا ہے اور بہت مقبول ہے۔ یہ کھیل قدیم کھیل پچیسی کی دوسری شکل ہے۔ پچیسی زمین پر دائرہ بنا کر اور اس میں خانے بنا کر کھیلی جاتی تھی۔ جبکہ لوڈو بازار میں گتے پر پرنٹ کی ہوئی شکل میں دستیاب ہے۔ اس کے چار حصے ہوتے ہیں نیلا، پیلا، ہرا اور سرخ۔ ہر حصے میں چار چار خانے ہوتے ہیں ہر خانے کے رنگ کے مطابق اسی رنگ کی گیٹیاں ہوتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر رکھتے ہیں۔ چار آدمی کھیلتے ہیں بچے، بڑے، مرد و خواتین سب کھیلتے ہیں۔ یہ ایک پانسہ کے ساتھ جو سفید چوکور چھوٹا دانا ہوتا ہے جس کے چاروں اطراف ایک، دو، تین، چار، پانچ اور چھ نشان بنے ہوتے ہیں کھیلتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بوتل میں اسے ہلا کر پھینکتے ہیں۔ جب تک چھ نہ آ جائے کسی کی بھی گیٹی اپنے خانے سے نہیں نکلتی۔ جب چھ آ جائے تو اس خانے سے باہر اپنے طے شدہ نشان پر یہ گیٹی رکھ لی جاتی ہے اور پھر جتنے بھی نمبر آئیں اسی قدر آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اکثر پیچھے آنے والی گیٹی اگلی گیٹی کو مات بھی دیتی ہے جس پر گیٹی کو واپس اپنی جگہ پر رکھ لیا جاتا ہے۔ جو سب سے پہلے تمام گیٹیوں کو بیچ میں بنے ہوئے نشان تک لے جانے میں کامیاب ہو جائے وہ کامیاب کھلاڑی ہوتا ہے۔

بغدر اٹھانا: یہ تفریحی اور ورزشی کھیل پشاور کے آس پاس دیہات میں کھیلا جاتا ہے خصوصاً خالصہ کے دیہات میں یہ کھیل بہت مقبول ہے۔ درخت کا ایک تنا کاٹ لیا جاتا ہے جس کی لمبائی تقریباً ڈھائی فٹ اور چوڑائی مربع فٹ ہوتی ہے۔ اس کو درمیان سے گولائی میں کھود کر ایک ہینڈل بنا لیا جاتا ہے اور پھر اسے زمین پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک شخص آگے آ کر اپنی مہارت کا ثبوت اس طرح دیتا ہے کہ وہ اس لکڑی کو جو خاصی بھاری ہوتی ہے ہینڈل سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں اٹھا کر سر تک لے جاتا ہے اور اوپر اٹھا کر پکڑے رکھتا ہے۔ جتنی دیر اسے پکڑے رکھے اس کا وقت نوٹ کر لیا جاتا ہے مگر اسی دوران یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ نہ ہاتھ لرزے اور نہ لکڑی ہلے پھر اسی طرح دوسرا اٹھاتا ہے۔ کھیل میں شریک سب لوگ اپنی اپنی باری پر یہ اٹھاتے ہیں جو زیادہ وقت تک اسے اٹھائے رکھے اسے کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔

اس کھیل کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ لکڑی کا تنا گاؤں کے خان یا بڑے کے حجرے میں پڑا رہتا ہے اور اسی مقام پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ گاؤں وڈپگہ میں اس کھیل کا مقام سید عبدالرحمٰن شاہ کا حجرہ تھا۔ اس گاؤں میں اس کھیل کے بڑے دھنی اور ماہر گزرے ہیں۔

لوک کھیل تماشے

بندر اور ریچھ کا تماشا: عموماً وہ خانہ بدوش لوگ جو کہ شہر سے باہر کچی بستیوں میں رہتے تھے۔ جنہیں جنگڑ کہتے ہیں۔ ان خاندانوں کے مرد بندر اور ریچھ پالتے تھے۔ جنہیں وہ سدھاتے اور مختلف حرکتوں کی مشق کرواتے تھے پھر بندر اور ریچھ کو رسی سے باندھ کر شہر کی گلیوں میں پھراتے ان کے ساتھ ایک بچہ بھی ہوتا ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور ڈگڈگی ہوتی جس محلے میں جاتے ڈگڈگی بجا کر بچوں کو اکٹھا کرتے۔ جب بچے اکٹھے ہو جاتے بلکہ بڑی عورتیں بھی گھروں کی کھڑکیوں اور عروسیوں میں سے اس کرتب کو دیکھتیں وہ بندر یا ریچھ کو سب سے پہلے کہتا کہ سب کو سلام کرے، بندر یا ریچھ دائیں یا بائیں ہاتھ کو سر کی طرف اٹھاتا پھر کرتب دکھانے والا بندر یا ریچھ کا ناچ پیش کرتا یہ بندر یا ریچھ کرتب دکھانے والے کے ڈنڈے کے اشارے کے ساتھ ساتھ ناچتا اور چھلانگیں لگاتا آخر میں کرتب دکھانے والا بندر یا ریچھ کو کہتا کہ اب اپنا پیٹ پالنے کے لئے تماشہ دیکھنے والوں سے خیر خیرات مانگے جس پر یہ بندر یا ریچھ ایک خاص انداز سے ہاتھ پھیلاتا اور منہ کو اوپر کی طرف کرتا اس پر بچے اس کرتب دکھانے والے کو پیسے دیتے یا خواتین آٹا، گڑ یا کوئی اور چیز اسے دیتیں۔

مجمے باز:

یہ عموماً وہ شعبدے باز لوگ ہوتے ہیں جو کہ بازاروں کے فٹ پاتھوں پر شعبدے بازی دکھا کر دیسی دوائیاں بیچتے ہیں۔ ان کے پاس پٹاری میں سانپ ہوتا ہے اور یہ بانسری بجا کر یا ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ اچھا خاصا مجمع لگ جاتا ہے تو یہ سانپ کے ساتھ مختلف حرکتیں کرتے ہیں۔ اس طرح لوگ زیادہ سے زیادہ جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سانپ کی طاقت اور زہریلے ہونے کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ اب ان کے پاس ایک زہریلہ اژدہا ہے جسے وہ بتائیں گے مگر اس دوران وہ مجمع کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور پھر شیشیوں میں بھری ہوئی دوائی کے اوصاف گنانا شروع کر دیتے اور اس طرح پھر لوگوں سے پیسے بٹور کر یہ دوائیاں بیچتے ہیں۔

ڈوم اور ڈھولکی سرنے والے:

جس محلے میں کوئی تازی تازی شادی ہوئی ہو یا بچہ جنا ہو بچے کا ختنہ ہوا ہو یا منگنی ہوئی ہو۔

تو ایسے موقع پر گانے بجانے والی ٹولیاں گلیوں اور محلوں میں خوشی والے گھر کے سامنے بیٹھ کر گاتی ہیں۔ ان کے پاس باجا' طبلہ' چمٹا ہوتا ہے وہ شہری لوگ جو ہندکو بولتے ہیں ایسی پارٹی کو ڈوم کہتے ہیں جبکہ پشتون لوگوں میں یہ ڈھولکی سرنے والے مشہور ہیں۔

ڈوم پارٹی کے ساتھ ایک ہجڑا بھی ہوتا ہے جو عورتوں جیسی حرکتیں کرتا ہے اور گانے کے ساتھ ساتھ ناچتا بھی ہے۔ ڈھولکی سرنے والے زیادہ تر پشتو میں گاتے ہیں اور ناچنے والا لچتے ہوتا ہے۔ یہ گانا گاتے ہیں' ڈھول بجاتے ہیں باجا بجاتے ہیں اور خوشی والے گھر میں سے مرد و خواتین انہیں پیسے اور روپے دیتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیسہ روپیہ وصول کریں اس لئے یہ نہایت ڈھیٹ ہو کر پیسہ روپیہ مانگتے رہتے ہیں اور بڑی مشکل سے یہ اٹھتے ہیں۔ اسی قسم کی متعدد ٹولیاں ہوتی ہیں اب یہ بہت کم ہو گیا ہے۔

لوک ساز، گیت اور ناچ

پشاور جو قدیم تہذیبی اور ثقافتی خطہ ہے یہاں یہ فنون لطیفہ اپنے خاص روایتی انداز سے مروج ہیں۔ پشاور کی اپنی مخصوص موسیقی ہے اور لوگ خوشیوں کے موقعوں پر اس کا اظہار اپنے روایتی انداز میں کرتے ہیں۔

پشاور اور مضافات کے علاقوں میں بیاہ شادیوں کے موقعوں پر جو گیت گائے جاتے ہیں ان میں ٹپہ' ماہیا' سہرا' چاربیتہ' ڈھولا' لودی' بلہاریاں' سٹھنڑی وغیرہ بڑے مقبول اصناف ہیں۔ یہ پشتونوں کے علاقوں میں پشتو میں اور شہری ہندکو دانوں کے علاقے میں ہندکو میں گائے جاتے ہیں۔

ہندکو شہری علاقوں میں اس قسم کے گیت لڑکیاں اکٹھی ہو کر مایوں کے وقت یا بعد میں آپس میں اکٹھی ہو کر ڈھولک' لگن یا تھال بجا کر گاتی ہیں۔ جبکہ میراثی گھرانوں کی ٹولیاں جنہیں ڈومنیاں کہتے ہیں وہ آلات موسیقی طبلہ' ڈھولک' باجے اور تلیوں کے ساتھ گاتی ہیں۔

ہندکو ٹپہ: آپس میں آمنے سامنے بیٹھ کر ٹپہ اس طرح گاتی ہیں:

ٹپے یاں دی اے وادی میں کڑی پشور شہر دی
ٹپیوں تو نہ ہاری
چٹا کوکڑ بنیرے یاں تے کاسنی روپٹے والی اے
منڈہ عاشق تیرے تے
پچھواڑے دس دے یو تھوڑی تھوڑی سمجھ پیندی اے
میرا رشتہ منگ دے یو
پچھی پری اے کواباں دی تو پتر منشی دا
میں تی واں نواباں دی
پچھی پری اے کو اباں دی عشق اچ فرق نائی
منشی تے نواباں دی
آلو مٹر پکائے ہوئے نے ساڈے کولو بٹھ چنگے
جڑے سینے نال لائے ہوئے نے
چٹی چینک چا والی میں مندری تاں دینا
کڑی لا دتے باں والی
لنگری وچ کٹ پتہ میرے کولو کی منگ نا اے
میری ماں کولو منگ رشتہ
آسمانی ست تارے اساں منڈا او لینڑا
جڑا سہرے وچو اکھ مارے
آسمانی پنج تارے اساں کڑی او لینڑیں
جڑی لہنگے وچو لت مارے

پچھی پری ہوئی اے زیفل دی بوے اگو لنگ جاندے
ٹلی مار کے سیکل دی
باغے وچ آیا کرو شیشہ کنگھی میں دیساں
ذرا بودی سنوارا کرو
باغے وچ وس دے یو گڑاں والی چا پی کے
چاواں پی کے وڈیا یاں وس دے یو
باغے وچ آیا کرو جدو اسی سو جائیں
ساڈی کھیاں اڈایا کرو
پچھواڑے کھو مایا مٹی دا بت بنڑے یا
وچ دکھیا روح مایا

جیوے بندڑاں:

جیوے بندڑاں تو میں واری یاں عمراں ساری یاں
جیوے بندڑاں عمراں ساری یاں
تیری مہندی تو میں واری یاں مہندی والے تو بل ہاری یاں
جیوے بندراں عمراں ساری یاں
تیری کوڑی تو میں واری یاں کوڑی والے تو بل ہاری یاں
جیوے بندڑاں
تیرے گانے تو میں واری یاں گانے والے تو بل ہاری یاں
جیوے بندڑاں

سووے وے چڑے والے یا:

سووے وے چڑے والے یا میں کہنی یاں
کر چھتری دی چھا کہ چھادیں بیبیاں
سووے دے چڑے والے یا دولنڑی یاں
میلہ دیکھنو آیاں کر ما والی یاں
سووے رتے چڑے والے یا پھل گوپی دا
گوپی لائی بہار کہ فیش ٹوپی دا
سووے دے چڑے والے یا پھل توری دا
توری گلاں مروڑی کہ نخرہ گوری دا
سووے دے چڑے والے یا پھل کیکراں دے
کیکراں لائی بہار کہ میلے نتراں دے

کالا ڈوری یا:

کالا ڈوری یا کونڈے نال اڑ پیوے
کہ چھوٹا دیورا بھابی نال لڑ پیوے
کالا ڈوری یا
قمیصاں چھیٹ دی یاں ملتانو آیاں نے
سساں پیڑی یاں جنہاں گلو لو وا یاں نے
قمیصاں چھیٹ دی یاں ملتانو آیاں نے
ماواں آپڑی یاں جناں دیصاں لایاں نے
ککڑی او لے ساں جڑی کڑکڑ کر دی اے
میں سورے نی جانڑاں سس بڑبڑ کر دی اے
ککڑی او لیزیں جڑی آنڈے دیندی اے
میں سورے نی جانڑاں سس تانے دیندی اے

منڈا اور پیا منگ داوے:

چڑے یاں دی دال کراری میں واری
منڈہ اور پیا منگ دا دے
چائے بی دے دتی یاں بسکٹ بی دے ری یاں
منگ دے پرچ پیالی
میں واری منڈہ اور پیا منگ دا دے
پلنگ بی دے ری یاں پیڑا بی دے ری یاں
منگ دے میم کنواری
میں واری منڈہ اور پیا منگ دا دے

سہرا:

کھڑے تے چمکاں مارے منڈے یا تیرا سہرا
حوراں پریاں مل کے سجایا منڈے یا تیرا سہرا
کھڑے تے چمکاں مارے منڈے یا تیرا سہرا
تیرے یار بیلی آندے کوئی نچ دے کوئی گاندے
نالے خوشیاں دے زمانے

مکھڑے　　تے　　چمکاں　　مارے
تیرا سہرا عرشوں آیا حوراں پریاں مل کے سجایا
کوئی آسمانی پوری جدو سہرا سجیا نوری
مکھڑے　　تے　　چمکاں　　مارے

لڑکیوں کے ناچ: لڑکیاں جب بیاہ شادی کے موقع پر شادی والے گھر میں گیت اور گانے کی محفل میں شریک ہوتی ہیں تو ناچتی ہیں یہ ناچ اور رقص کبھی تو اجتماعی ہوتا ہے اور کبھی انفرادی اور باری باری ناچتی ہیں۔ وہ طبلے کی تھاپ پر ناچتی ہیں جب یہ لڑکیاں ناچتی ہیں تو شادی والے گھر کی بڑی خواتین ان کے سر پر روپے رکھتی ہیں عموماً ناچ اور رقص میں وہ لڑکیاں حصہ لیتی ہیں جو دولہے یا دلہن کی قریبی رشتے دار ہوتی ہیں۔

کنجریوں کے ناچ: پشاور میں اب سے 20 سال پہلے کنجریوں کے ناچ اور گانے کا رواج عام تھا۔ تاہم اسے پروقار اور سنجیدہ گھرانے اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ایسی محفلوں میں زیادہ تر اوباش اور بدمست لوگ زیادہ حصہ لیتے تھے۔ یہ کنجریاں عموماً پیشہ ور ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ گانے والوں کی پارٹیاں ہوتی تھیں۔ یہ کنجریاں عموماً دولہے کے گھر میں برات والی رات کو محفلیں سجاتیں پہلے سے رقم طے کر لی جاتی اور پھر یہ کنجریاں جو عموماً نوخیز عمر ہوتیں پاؤں میں گھنگرو باندھ کر طبلے کی تھاپ پر خود بھی گاتیں اور گانے والی پارٹی بھی گاتی ہے۔ یہ کنجریاں بڑے ناز و ادا کے ساتھ ناچتیں۔ یہ محفل بڑی ہنگامہ خیز ہوتی اور جب برات دلہن کے گھر روانہ ہوتی تو راستے میں بھی یہ کنجری ناچتی رہتی اور روپے اکٹھے کرتی رہتی اور پھر دلہن کے گھر پہنچ کر بھی یہ ناچتی رہتی۔ بیاہ شادی کے علاوہ بھی ان کنجریوں کی محفلیں جمتی رہتیں۔

ہجڑوں کے ناچ: پشاور میں گانے والی پارٹیاں جنہیں ڈوم یا ڈھولکی سرنے والے کہا جاتا تھا۔ بیاہ شادی والے گھر کے باہر شادی کے بعد کئی کئی دنوں تک یہ دروازے کے سامنے بیٹھ جاتے اور طبلہ اور باجے پر گانا شروع کر دیتے۔ ان کے ساتھ ایک ہجڑا ہوتا جو تالی بجا بجا کر ناچتا اور گاتا رہتا۔ شادی والے گھر کی خواتین اوپر کی کھڑکیوں اور عروسیوں سے ہجڑے کے ناچ اور حرکتوں سے محظوظ ہوتے اور اوپر سے روپے اور پیسے پھینکتے تو یہ ہجڑا آواز نکالتا 'پھوپھی کی ویل' ماسی کی ویل' تیرا بچڑا جیوندا روے' پشاور میں ڈوموں کی ان پارٹیوں میں عمر رسیدہ ایک ہجڑا جسے گلا ہجڑا کہا جاتا بہت مشہور تھا جب گانے والی پارٹی کا لیڈر مجید اڈوم بہت مشہور تھا۔

ڈومنی: یہ گانے والی عورتوں کی پارٹی کا نام ہے یہ وہ گانے والی خواتین ہیں۔ جو میراثیوں کے گھرانوں کی عورتیں ہوتیں ہیں۔ ہر گھرانے کی اپنی اپنی ڈومنی ہوتی جو پورے خاندان میں مشہور ہوتی۔ ان کے پاس گانے بجانے کے پورے آلات ہوتے۔ طبلہ کی جوڑی' باجا' بانسری اور پیتل کی ایک ٹلی' یہ لوک گیت بھی گاتیں اور فلمی گانے بھی گاتیں۔ لڑکی اور لڑکے کے گھر میں اکثر مایوں کے دن یہ پارٹی سجائی جاتیں۔

ڈھولکی سرنے: پشاور کے دیہات یا ان محلوں میں جہاں پشتون لوگ رہتے ہیں جب پٹھان گھرانوں میں شادی بیاہ کی محفلیں ہوتی ہیں تو ڈھولکی سرنے والے جاتے جو شہنائی بجاتے ان کے ساتھ جو ناچنے والے لڑکے ہوتے انہیں لختے کہا جاتا ہے۔ شہنائی کے علاوہ ڈھولک اور باجا بھی ان کے پاس ہوتا اور گانا بھی گایا جاتا اور ساتھ ہی لختے ناچتا بھی رہتا۔ اب بھی پٹھان گھرانوں میں یہ رواج موجود ہے۔ یہ پارٹیاں پشاور کے معروف بازار ڈبگری میں دستیاب ہوتی ہیں جن کے پاس طبلہ' باجا' سارنگی' ڈھول' شہنائی اور رباب ہوتا ہے۔

کلی ناچ: یہ جوان لڑکیوں کا ناچ ہے جو خوشی کے موقعوں پر لڑکیاں اس طرح ناچتی ہیں کہ دو لڑکیاں آپس میں آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور ہاتھوں کی قینچی بنا کر دائیں ہاتھ میں دائیاں ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں بائیاں ہاتھ پکڑ لیتی ہیں اور ہاتھوں کی چار انگلیاں باہمی پھنساتی ہیں اور پھر اسی حالت میں ایک دوسرے کے سہارے پیچھے کو جھک جاتی ہیں۔ پاؤں کو پاؤں کی سیدھ میں ملا کر اس طرح گھومتی ہیں جیسے کوئی بے جان و بے روح چیز ہوں ان کی چٹیاں اڑ اڑ کر اس طرح افقی رخ پر سیدھی ہو جاتی ہیں جیسے کہ کسی سخت چیز کی بنی ہوئی ہوں۔

دھمال: یہ مردوں کا ناچ ہے جو اکثر بزرگوں اور پیروں کی خانقاہوں اور مزاروں کے سامنے ناچا جاتا ہے یہ ڈھول کی تال پر ناچا جاتا ہے۔ دھمال کے ساتھ گیت گانا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ ناچ' بوڑھے' جوان اور بچوں کے لئے یکساں ہوتا ہے جوں جوں ڈھول کی تال بجتی ہے دھمال میں مستی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس میں پاؤں کو اوپر نیچے مارا جاتا ہے۔ سر ہلایا جاتا ہے اور کبھی آگے کبھی پیچھے حرکت کی جاتی ہے۔ عرس کے موقعوں پر بازاروں میں مریدوں اور فقیروں اور عقیدت مندوں کا جو جلوس ہوتا ہے اس موقع پر بھی ڈھول بجتا رہتا ہے اور فقیر' ملنگ لوگ دھمال ناچتے رہتے ہیں اور اسی حالت میں جلوس مزار کے احاطے میں پہنچتا ہے۔

پشاور و گردونواح اور دیہات میں گانے کے لئے جو ساز استعمال ہوتے ہیں ان میں:

طبلہ، سارنگی، باجا، رباب، ڈھول، شہنائی، بانسری، ڈفلی، دف، نقارہ اور مرلی وغیرہ مشہور ہیں۔

محاورے: پشاوری اکثر محاوروں کے ذریعے اپنے مدعا بیان کرتے ہیں جنہیں متلاں کہا جاتا ہے۔ ان میں مختصر اور ذو معنی فقروں کو استعمال کر کے اس کے پس منظر میں چھپی ہوئی بات کو بیان کرتے ہیں۔ بزرگ مرد و زن کو یہ متلاں بہت ازبر ہوتی ہیں اور موقع محل کے مطابق یہ استعمال کرتے ہیں۔

نڈھوئی تے منہ چوئی	یہ اس کے لئے محاورہ بولا جاتا ہے جو کھائے زیادہ مگر صحت پر کوئی اثر نہ پڑے۔
ساڈے کار کاج اے تے لوگ ساڈے محتاج اے دیگاں نوں تا کونڈے لگے دن تے ٹوکی دی آواز اے	جس گھر میں شادی یا کوئی خوشی کی تقریب ہو اور ڈھول بج رہا ہو مگر کھانے کو کچھ نہ ملے تو اس موقع پر یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
مویا مویا جٹ تے اس دی یاں بھاں بھی بیچ ست	یعنی جو آدمی دولت مند ہو تو اس کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ مر کر بھی اس کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔
شہر دی چڑی تے گراں دی کڑی	شہری لوگوں کی ہوشیاری اور دیہات کی سادگی کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
ھکوڈ کما دو گنا کنوں رکھاں کنوں پنا	جو اندر سے ایک ہو مگر دکھاوے کے لئے بکھرے ہوں تو اس کے لئے یہ محاورہ مستعمل ہے۔
ایا نزاں گل کرے تے سیانزاں قیاس کرے جس دے کار اچ دانڑیں اس دے کملے بھی سیانڑیں	یعنی عقلمند کا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ مطلب ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔
او کیڑی گلی جتھے بی بو نہ کھلی	ہوشیار آدمی کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
کولیاں دی دلالی اچ ہتھ بی کالا منہ بی کالا	جب ہاتھ کچھ نہ آئے تو یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
چوچی نوں کہ جنواں لڑیاں گگری تو پے بندی اے تیا ڑی گلاں سنو کے راتی چوچنوں پچھاندی اے	بہو کے بارے میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ دن کو اپنا غصہ ضبط کرتی ہے اور رات کو ساری باتیں اپنے خاوند کو کر کے اسے مشتعل کرتی ہے۔
جتھے دی کھوتی اتھے آ کھلوتی	اپنی حیثیت کو یاد دلانے کے لئے۔
نچ بڈی کنجری لوگ دے دی نکا ٹکا میں نہ دے واں دمڑی	جب کسی کی بات کسی پر کوئی اثر نہ کرے تو یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
ہک تا وہنی سوزیں تے اتو وہنی سوتی لتھی	طنز ہے یعنی ایک تو بدصورت اوپر سے نخرے بھی۔
ہاتھی پھرے گراں گراں جس دا ہاتھی اس دا ناں	جب اولاد اچھی نکل آئے تو اس کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
بچہ تلے چوس اتے پلہ وچ اللہ ہی اللہ	ظاہری شان و شوکت کے لئے۔
لکیاں لیغاں وچ تے کھلیاں دیساں وچ	بات راز داری میں ہوئی مگر پھر عام ہو گئی۔
غلاف خانے دی یاں کڑیاں اناں دے ہتھاں اچ چھریاں اناں دے نیرے نیرے دی دے ناں دے گوڈیاں دے کشیدے بازاراں دی گلی نکڑی وڈی اچھل کلی	غلاف خانہ پشاور شہر کا وہ محلہ ہے جہاں بڑے تیز و طرار لوگ رہتے ہیں ان کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ پشاور شہر کا ایک محلہ جس کا نام بازاراں دی گلی ہے وہاں رہنے والے لوگ بڑے معتبر ہیں ان کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

پہیلیاں: اسے پشاوری لوگ بجارتاں کہتے ہیں یعنی چھوٹی سی بات ہوتی بڑے جملے میں ادا کی جاتی ہے اور صرف اشارے میں بات ہوتی ہے۔

بجارت	جواب
آر ڈنڈا پار ڈنڈہ وچ ٹل مظلیاں او	ہرٹ اور اس کے ساتھ باندھے ہوئے مٹی کے ڈولے۔
کونجاں دیون بچے ندی نہاون چڑیاں	
ادھ گز داتول کدی کلی کدی پھول	چھتری۔
اتنی جی بگنی بگ بگ کرے حسن پیارا کھڑ کھڑ کرے	چلم۔
اتنی جی گگنی وچ میڈا پیا	اخروٹ۔
تھلے تے پرھلہ ہل دا جاوے کونجاں پاون شور مسافر ہل دا جاوے	جنازہ۔
تو چل تے میں آیا تیرا پیو میرا ہمسایہ	دروازہ۔
ہک کڑی دا لمبا بودا	سوئی دھاگہ۔

ہک کڑی اے اس دا میرا ناں ماردی اے کوڑا جاندی اے گراں	بندوق۔
ہک چیز اے سارے تیاڑی پھردی اے راتی ہک جگہ تل کے سو جاندی اے	جوتی۔
چار اڑے چار کھڑے ھک ھک دے منہ وچ دو دو وڑے	چارپائی۔
پھٹے منہ اس وڈی دا جس نے پائی جدائی شاباشیر اس نکی دا جس نے میل وسائی	قینچی اور سوئی۔
کالا کتا بوئے تے ستا	تالا۔
ہک برفے وچ دورناں	مونگ پھلی۔
ہری سی من پری سی لولاک موتی جڑی سی لالہ جی کے باغ میں دوشالہ لے کے کھڑی سی	چھلی۔
ڈنگی پنگی لکڑی کشمیر جا کے نکلی	سڑک۔
ہک ڈبہ اس وچ بارہ ڈبے ہک ڈبے وچ تیس تیس دانڑے	سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیس دن۔
تھلے تے پرتھلہ اتے لال مغل کھلا	لالٹین۔
لونڈی دا سر پھٹا تے سب نے دیکھا بیوی دا دل پھٹا تے کسے نئی دیکھا	مطلب یہ ہے کہ عزت مند لوگ ہر بات سہہ جاتا ہے جبکہ بے عزت لوگ ذرا سی بات پر بھی آسمان سر پر اٹھالیتا ہے۔
اتنا نہ پکا کہ باسی تر کا	جتنا ضروری ہو اتنا کام ہو۔
اللہ گنجے نوں ناخن نہ دیوے۔	کم ظرف آدمی کے لئے یہ محاورہ مستعمل ہے۔
نہ منہ نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا	بدصورت کے لئے ہے۔
شکل جناں دی تے نخرہ پریاں دا	نازک طبیعت کے لئے۔
کھوتی چڑی پہاڑ تے سرخی پوڈر لا کے کھوتا مارے سیٹیاں پینٹ سوٹ پا کے	شوخی مار عورت و مرد کے لئے یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔
پتر پیٹ دا پیسہ جیب دا	مطلب ہے کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔
سر وڈے سرداراں دے تے پیر وڈے گنواراں دے	عزت مند اور کمی کمین لوگوں کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
پیڑ انگلے دا نا نوائی تے نوئی چک کے روٹی لائی	جب لڑکی کا رشتہ کسی کو دینا پسند نہ ہو تو اس کے لئے یہ محاورہ مستعمل ہے۔
شاموگئی بازار تے نڈو بہہ ریا	کنجی اور تالے کے لئے۔

مستہ: یہ بھی ہندکو زبان کی ایک مقبول اور قدیم صنف ہے یہ گیت فصل کے پک جانے پر دیہات میں مختلف حجروں میں گایا جاتا ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ دو چار حجروں کے لوگ اکٹھے ہو کر فصل کو کاٹتے ہیں اور جب فصل کٹ جاتی ہے تو پھر تمام حجروں کے لوگ اکٹھے ہو کر اجتماعی گیت گاتے ہیں اور ساتھ ہی رقص کرتے ہیں اور اپنے وجود کو تھرکاتے ہیں:

او آئیاں مست بہاراں خش ہو کے پیلاں پاواں
او آوے یا میں جاواں جاواں کہ نہ جاواں ہو

اسی تال پر لوگ اپنے ڈھولک' سرنے اور رباب کو اٹھائے اپنے اپنے حجرے میں چلے جاتے ہیں اور پھر ہر ٹولی اپنے اپنے حجرے میں روانہ ہوتی ہے تو ڈھول پیٹتے' رباب کی تاروں کو چھیڑتے اور سرنے بجاتے اور ناچتے اور دھمال ڈالتے ہوئے اپنے حجروں میں پہنچتے ہیں۔ ہر ٹولی کا اپنا اپنا میراثی یعنی گانے والا بھی ہوتا ہے جو سر اور لے کے ساتھ آواز اٹھاتا ہے۔ پورا گاؤں اسی گیت سے محظوظ ہوتا ہے حتی کہ گاؤں میں گھروں کی عورتیں بھی اپنے گھروں کے آنگنوں میں تال پر ناچتی اور گاتی ہیں۔ بعض گھروں میں دو چار گھروں کی خواتین اکٹھی ہو کر یہ گیت گاتی ہیں۔

دوھڑا: یہ ایک ایسی صنف کا گیت ہے جس میں کسی ساز کی ضرورت تو نہیں ہوتی تاہم محفل کو گرمانے اور رنگین بنانے کے لئے پس منظر میں رباب کی تاروں کو چھیڑا جاتا ہے۔ دوھڑے میں عموماً یاس انگیز اور غمزدہ مضامین ہوتے ہیں۔ دوھڑا کبھی دو مصرعوں کا ہوتا ہے اور کبھی چار مصرعوں کا۔ جب آدمی غم واندوہ کی کیفیت میں ہو تو دوھڑا گایا جاتا ہے۔ اس میں تصوف کے موضوعات اور مسائل بھی شامل ہوتے ہیں۔

سیٹھنڑی: یہ ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق مستورات کے گانے سے ہے اور مستورات بھی وہ جو کہ گھرانے کی ادھیڑ عمر خواتین ہوں۔ اس میں واہیاتی اور گالی گلوچ شامل ہے مگر اسے بیاہ شادیوں کے موقع پر بڑی مقبولیت حاصل ہے کہ اس سے بیاہ شادی کے گھروں میں دھوم دھام ہوتی ہے اور خوشیوں میں اس مزاح کو شامل کر کے خوشیوں کو دوبالا کیا جاتا ہے۔ جب ادھیڑ عمر خواتین یہ سیٹھنڑی گاتی ہیں تو جواں لڑکیوں کے لئے ان کے پاس بیٹھنا ممنوع سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ گیت کی ایسی صنف ہے کہ اسے گاتے ہوئے گالیوں اور عیب ثواب اور جھوٹ موٹ کے الزامات لگاتی ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی والے گھروں کی سیٹھنڑی گانے والی مستورات لڑکے والوں کو اور لڑکے والے گھروں کی سیٹھنڑی گانے والی مستورات لڑکی والوں کو

نشانہ بناتی ہیں۔ جس شخص' عورت یا مرد کو نشانہ بنایا جاتا ہے سیٹھنڑی گاتے وقت اسی گیت میں اس کا نام بھی شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مکھڑا تین مصرعوں کا ہوتا ہے تاہم ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگرچہ سیٹھنڑی میں گالی گلوچ اور عیب ثواب کی باتیں ہوتی ہیں اور مخاطب کو خوب نشانہ بنایا جاتا ہے مگر کوئی بھی مخاطب پارٹی یا فرد اسے برا نہیں سمجھتا بلکہ اس مزاح سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اسے بیاہ شادی والا گھر اپنے گھر کی خوشی میں اضافے کا باعث گردانتا ہے کہ اس سے رونق افزوں ہوئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شادی ہو رہی ہے اب اس کا رواج بہت کم ہے کیونکہ سیٹھنڑی گانے والی مستورات اب بہت کم رہ گئی ہیں تاہم قدیم رسومات میں دلچسپی رکھنے والے گھرانوں میں اب بھی یہ سیٹھنڑی زندہ ہے اور اس کے مزاح سے لطف اندوز ہونے کے موقع کو گنوایا نہیں جاتا۔

جوگا: اس میں شادی بیاہ کے گیت اور بین وغیرہ منظوم کئے جاتے ہیں۔ اکثر اس میں طویل قصے ایک ہی لے کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ اس میں صرف تال ہوتی ہے یہ تال عموماً لکڑی کے ایک ڈنڈے اور لوہے کے بنے ہوئے کڑوں میں ٹکرا کر پیدا کی جاتی ہے اکثر جوگی لوگ جنہوں نے اپنے ہاتھ کی کلائی میں یہ کڑے پہنے ہوتے ہیں وہ ڈنڈے کو ان کڑوں سے ٹکرا کر گاتے ہیں اسی مناسبت سے اس کا نام جوگا ہے۔

للولوری' اللہ ہو: یہ صنف بچوں کو لوری کے لئے مستعمل ہے یہ دراصل بچوں کو لے اور منظوم لفظوں کے ساتھ دعا دینے کی صنف ہے۔ اکثر جب مائیں یا نانی' دادی بچوں کو سلاتی ہیں تو لوری دیتی ہیں اور ساتھ ہی آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ بھی مارتی ہیں تاکہ بچہ سو جائے۔ زیادہ تر مائیں ہی اپنے بچوں کو لوری دیتی ہیں۔

اللہ ہو' للوللو للوللو للو۔

للوللو کہتے ہوئے آواز میں اتار چڑھاؤ پیدا کیا جاتا ہے۔

ٹپہ: ہندکو اور پشتو زبان کا مشترکہ گانا ہے ٹپہ قدیم صنف ہے۔ ٹپہ بیاہ شادیوں کے موقعوں کے علاوہ دیگر خوشیوں کی تقریبات میں بھی گایا جاتا ہے یہ ڈیڑھ مصرعہ کا ہوتا ہے پہلا مصرعہ آدھا ہوتا ہے اس آدھے مصرعہ میں زیر بحث مسئلے کی تمہید باندھی جاتی ہے اور دوسرے مصرعہ میں تفصیل بیان ہوتی ہے دوسرے مصرعہ میں عموماً زیر بحث مسئلے کی الجھنوں کو سلجھایا جاتا ہے۔ ٹپوں میں پیار و محبت' عشق و الفت' ہجر و وصال' طنز و مزاح اور تجربات زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے ٹپہ تین قسم کے اوزان پر مشتمل ہوتا ہے اس کے ہر رکن کو سیلاب کہتے ہیں ٹپے کے ڈیڑھ مصرعہ میں 22 ارکان ہوتے ہیں۔ مگر کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے:

چلمے داوے دم لہایا
چنگی پہلی جندڑی نورا جاندے وے غم لہایا

ترجمہ:- چلم کا ایک سوٹا لگوایا۔
جو زندگی ٹھیک ٹھاک طرح سے گزر رہی تھی خواہ مخواہ اسے غموں میں مبتلاء کر دیا۔

چاربیتہ: چاربیتہ کا مطلع سر یا بند چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور پھر چار چار مصرعوں کی کئی کلیاں ہوتی ہیں۔ اسے پشتو میں ''کڑے'' اور ہندکو میں کلی کہتے ہیں۔ مطلع کے بعد جہاں بھی کلی ختم ہو وہاں پر سر کو دھرایا جاتا ہے مگر اس شروع کا ربط کلی کے دوسرے مصرعوں کے ساتھ لازمی ہوتا ہے۔ یہ بہت قدیم صنف ہے اور اس صنف کے بڑے بڑے نامور شعراء پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے چاربیتہ کے کلام منظوم کئے ہیں۔ چاربیتوں میں موسیقی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ چاربیتہ کا تعلق راگ کے ساتھ ہے بعض ایسے چاربیتہ ہیں جنہیں منظوم کرتے وقت راگ پہلے ہی سے بنائے جاتے ہیں اور بعض چاربیتے وہ ہیں جنہیں منظوم کرنے کے بعد ان کے راگ بنائے جاتے ہیں۔ چاربیتہ کا پہلا مصرعہ چودہ سیلابوں کا ہوتا ہے اور دوسرا مصرعہ چودہ سیلابوں سے کم کا ہوتا ہے۔

حرفی: حرفی ہندکو زبان کے اصناف سخن میں اہم ادبی حیثیت کا مقام رکھتی ہے اور چاربیتہ کے بعد اسے اہم درجہ حاصل ہوا ہے۔ حرفی میں زندگی میں پیش آنے والے ہر قسم کے واقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ حسن و عشق' ہجر و وصال' جام و ساغر' میکدہ و مینا' تصوف' حرب و ضرب' فلسفہ موت و حیات' زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کی کیفیات غرضیکہ ہر قسم کے انسانی جذبات و احساسات کا حرفی میں اجتماع ہے۔ مختار علی نیئر نے اپنی کتاب ''تاریخ زبان و ادب'' میں حرفی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ادب کے دور ثانی میں حرفی بالکل ہی فارسی اور عربی کی گود میں بیٹھی معلوم ہوتی ہے۔ حرفی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حرفوں کی کڑی یا حرفوں کی لڑی۔ یہ ہوتے تو بہت کم الفاظ ہیں مگر معانی کے اعتبار سے دفتروں کے دفتر ان میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ حرفی کے چار پائے والے تخت پر اسے ہی بٹھایا جائے جو کہ تخت پر بیٹھنے کی اہلیت رکھتا ہو اسی لئے اساتذہ نے حرفی میں سنجیدہ اور پروقار مضامین باندھے ہیں۔

حرفی کے کل چار مصرعے ہوتے ہیں اور سیلابوں کے حوالے سے ہر مصرعے کو ۲۲ سیلاب میں بتایا ہے اس طرح مجموعی طور پر پوری حرفی ۸۸ سیلابوں کی

ہوتی ہے بعض اساتذہ نے بائیس کی بجائے ہر مصرعے کے گیارہ سیلاب بتائے ہیں جس سے مجموعی طور پر حرفی ۴۴ سیلابوں کی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حرفی اردو اور فارسی اوزان پر بھی پوری اترتی ہے اور باقاعدہ ایک بحر کی شکل اختیار کر لیتی ہے مثلاً:

حرفی دے تختہ نرز اتے مہرے عقد ثریا دے جوڑ سکناں
بلکہ سد سکندر دے فاصلوں تک آپڑے عقل دے کھوڑے نوں توڑ سکناں
جے ویکھاں سنسار دا سامنڑاں وے پٹ اکھیڑ کے پنجہ مروڑ سکناں
عبداللہ تیں دے تیں اس خسیس دے دند بدلے شاعر خیس دے توڑ سکناں

قوالی: قوالی ایک قدیم صنف ہے۔ پشاوریوں کے ہاں قوالی کو بڑی مقبولیت حاصل ہے ہر بیاہ کے موقع پر بارات والی رات لڑکے کے گھر میں قوال پارٹی کو بلایا جاتا ہے اور ان کے لئے مخصوص جگہ بنائی جاتی ہے۔ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پشاور میں اس صنف کو گانے والے بڑے نامور قوال گزرے ہیں ان میں پشورا خان اور گام قوال بہت معروف قوال تھے۔ شادی بیاہ کے علاوہ مختلف خوشیوں کے موقعوں پر بھی قوالی کی مجالس گھروں میں ہوتی تھیں جواب بہت کم رہ گئی ہیں۔

درگاہوں اور بزرگوں کے مزاروں پر سالانہ عرس کے موقعوں پر قوالی کی محافل ہوتی ہیں اور لوگ دور دراز سے آ کر قوالی کی ان محفلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نوشوہادی کی محفل میں بھی قوالی کی محفلیں ہوتی ہیں۔

رڑک: رڑک بھی ایک ایسی صنف سخن ہے جس کے عموماً گنے چنے بند ہوتے ہیں اور یہ رڑک گانے کے طور پر ہندکو زبان میں گاہ جانے والی صنف ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر لڑکے پارٹیوں میں تقسیم ہو کر اس طرح گاتے ہیں کہ ایک بات یا واقعہ کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر اس پر سے اچھی طرح بال کی کھال اتارتے ہیں یہاں تک کہ اس بات سے متعلق کوئی پہلو باقی نہیں رہتا رڑک کے لڑکیوں میں بھی مقابلے ہوتے ہیں۔ یہ پندرہ سیلاب پر مشتمل ہوتا ہے پہلا مصرعہ دو سیلاب کا ہوتا ہے اور دوسرا تیرہ کا۔

رڑک اصل میں دیہاتی عورتوں کی ایجاد ہے کہ جب دیہات میں گائے، بھینس کا دودھ دھولیا جاتا ہے تو پھر اس میں سے مکھن نکالنے کے لئے بلویا جاتا ہے، دیہات کی خواتین یہ بلونا گھر ہی میں کرتی ہیں ایک بڑا سا مٹی کا مٹکا ہوتا ہے جس میں بڑی سی مدانی دھو کر بلویا جاتا ہے مٹکے کو بیچ میں رکھ کر آمنے سامنے دو عورتیں بیٹھ جاتی ہیں اور ایک رسی میں مدانی کو پھنسا کر اسے ہلاتی رہتی ہیں اس عمل کو ہندکو زبان میں رڑک کہتے ہیں اسی سے یہ گیت منسوب ہے۔ عورتیں مکھن بھی بلوتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ گیت بھی گاتی رہتی ہیں اور یہ گیت اس وقت تک گاتی ہیں جب تک کہ دودھ سے مکھن نہ نکل آئے۔

ڈھولا: یہ ہندکو گیت کی ایک قدیم صنف ہے جس کا تعلق قدیم ہندکو داستان سے ہے جس کا معاشقہ ایک حلوائی سوہن لال سے ہو گیا۔ عام آدمی کا اونچی ذات کے گھرانے کی لڑکی سے یہ معاشقہ غیر معمولی نوعیت کا واقعہ تھا کیونکہ نچلی ذات والے لوگوں کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اونچے گھرانے کی لڑکیوں کو آنکھ بھر کر بھی دیکھ پائیں مگر سوہن لال نے کمال جرات سے ڈھولا باشہ زادی کو آنکھ بھر کر دیکھا ہی نہیں بلکہ اس کے دل میں محبت کا تیر ایسا پھینکا کہ اس کا دل محبت بھری آنکھ کے لئے فرش راہ ہو گیا۔ آخر اس کا خاتمہ ایک افسوسناک کردار پر اس طرح ہوتا ہے کہ مہاراجہ سوہن لال کو قید خانے میں ڈال کر اس کی آنکھیں پھوڑ دیتا ہے مگر شہزادی ڈھولا جو کہ سوہن لال کی محبت میں دیوانی ہو چکی تھی وہ کسی طرح سوہن لال کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اسے لے کر ڈیرہ اسماعیل خان کے کافر کوٹ سے فرار ہوتی ہے اور راستے کی صعوبتیں اور تکالیف برداشت کرتے ہوئے سوہن لال کو لے کر پشاور پہنچ جاتی ہے وہ راستے میں سوہن لال کو تسلیاں دیتی ہے اور زندگی بھر ایک ساتھ رہنے کا وعدہ کرتی ہے یہ ساری باتیں ڈھولا باشہ زادی منظوم پیرائے میں کرتی ہے ان باتوں میں امید بھی ہے اور ناامیدی بھی، تسلیاں اور دلاسے بھی ہیں اور قسمت کے گلے اور شکوے بھی، مصیبتوں بھری فریادیں بھی ہیں اور اچھے دنوں کی امیدیں بھی، یہ ساری باتیں ڈھولا میں آتی ہیں۔

اس ڈھولا کا سارا مکھڑا 32 سیلاب کا ہے پہلا اور تیسرا مصرعہ 9-9 سیلاب کا اور دوسرا اور چوتھا مصرعہ 7-7 سیلاب کا۔

لوک علاج

پشاور ایک سرسبز و شاداب وادی کے طور پر مشہور تھا جہاں کی زرخیز زمین مختلف پھلوں پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی پیداوار کے حوالے سے مشہور تھی۔ یہی پودے، پھول اور پھل مختلف انسانی بیماریوں کے علاج کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ پشاور میں ان جڑی بوٹیوں کی متعدد دکانیں ہیں جو قصہ خوانی بازار میں واقع ہیں جنہیں پنسار کہا جاتا ہے۔ پشاور میں نامور حکماء اور اطباء گزرے ہیں جگہ جگہ ان اطباء اور حکماء کی دکانیں تھیں جو علاج و معالجے سے متعلق نہایت ماہر اور تجربہ کار سمجھے جاتے تھے اب بھی ان مشہور حکماء کے اخلاف یہی حکمت و طب کا کام کرتے ہیں اور

دیسی طریقہ سے انسانی بیماریوں کا علاج تجویز کرتے ہیں۔ دیسی جڑی بوٹیوں کے علاوہ پشاور و مضافات اور اضلاع کے لوگ بزرگوں کے مزاروں سے متعلق بھی خاص عقیدہ رکھتے ہیں اور بیماریوں کے علاج کے لئے ان بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دے کر اور ان مزاروں اور خانقاہوں میں جاری چشموں اور حوضوں کے پانی میں نہانے یا منہ ہاتھ دھونے اور ان کے مزاروں کی مٹی اور جھاڑو کو بدن پر لگانے اور پھیرنے سے شفا پانے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دم درود اور تعویذ گنڈوں سے بھی علاج معالجے پر لوگوں کا اعتقاد ہے۔

دیسی جڑی بوٹیوں سے علاج

سونف، اجوائن اور عرق: پشاور کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں سونف، اجوائن اور مختلف قسم کے عرق مثلاً عرق گلاب، چہار عرق، سونف کا عرق اور عرق قیصر یہ نہ ہو۔ یہ تمام اشیاء زیادہ تر پیٹ کے علاج کے لئے مفید ہیں۔ ہاضمہ کی خرابی ہو، تبخیر گیس ہو یا معدہ کی جلن وغیرہ اس کے لئے گھر میں موجود یہ جڑی بوٹیاں اور عرق دیئے جاتے ہیں جس سے آدمی شفا پاتا ہے خصوصاً بچوں کے لئے تو یہ نہایت ہی مفید اور اکسیر ہیں۔

بخار: بخار کے لئے دیسی طریقہ علاج یہ ہے کہ دودھ کو اچھی طرح گرم کر کے اس میں شکر ملا دی جاتی ہے۔ یہ سردی کے بخار کا علاج ہے، مریض کو شکر ملا کر گرم دودھ پلا دیا جاتا ہے اور پھر لحاف یا گرم موٹا کمبل مریض پر ڈال دیا جاتا ہے۔ پسینہ آنے سے بخار ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر بخار پرانا ہو جائے تو شہترہ جڑی بوٹی کا پانی پلایا جاتا ہے۔ دو تین مرتبہ یہ پانی پینے سے بخار ختم ہو جاتا ہے۔

دماغی قوت کے لئے: دماغی قوت کی بحالی اور حافظے کی تیزی کے لئے بادام، خشخاش اور چار مغز کوٹ کر دودھ میں ملا دیا جاتا ہے دودھ کو جب ابال آ جائے تو اس میں چینی ملا کر پیا جاتا ہے اس سے دماغ تیز اور حافظہ مضبوط ہوتا ہے۔

خارش اور جگر کی گرمی کا علاج: ایک بوٹی جس کا نام دھمیا ہے اسے پانی میں ابال کر نچوڑا جاتا ہے اور پھر اس کا پانی مریض کو دیا جاتا ہے اس سے جگر کی گرمی بھی دور ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی بدن کی خارش بھی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ مصفی خون ہے۔

بخار، نزلہ اور زکام کا علاج: ایک بوٹی جس کا نام گوکھرو ہے اسے پشتو میں مالکنڈیز بھی کہتے ہیں۔ بخار، نزلہ اور زکام کے علاوہ اور بھی کئی دوسری بیماریوں کا اس سے علاج کیا جاتا ہے۔

پیٹ کے درد کا علاج: پیٹ میں درد ہو تو تنبہ کے گودے کو کوٹ کر اس میں اجوائن ملا کر پھکی بنا کر کھلائی جاتی ہے اس سے پیٹ کا درد دور ہو جاتا ہے اور کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہے اور پیٹ میں پیدا ہونے والی گیس بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسے اس طرح بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ اس تنبہ کے گودے میں اجوائن کو دھنسا دیا جاتا ہے اور پھر اسے ہوا میں خشک کر کے اس میں سے اجوائن کو نکال دیا جاتا ہے اور پھر اس گودے کو کوٹ کر اس میں کالا نمک کوٹ کر ملایا جاتا ہے۔ اسے پیٹ اور معدے کے ہر قسم کے درد کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے۔ کسی بچے کے پیٹ میں درد ہو یا اسے ہچکس کی شکایت ہو تو اس کے لئے دیسی طریقہ علاج یہ ہوتا ہے کہ سونف اور اجوائن کو پانی میں ڈال کر پانی کو ابال لیا جاتا ہے جب پانی آدھا رہ جائے تو اس میں بارنگ ڈال دیا جاتا ہے اور پھر پانی کو جب دوسرا ابال آ جائے تو چولہے سے اتار کر اسے ٹھنڈا کر کے بچے کو پلا لیا جاتا ہے اس سے بچے کے پیٹ کا درد یا ہچکس ختم ہو جاتی ہے۔

سانپ کے کاٹے کا علاج: سانپ کاٹ لے تو اس کے زہر کو بے اثر کرنے کے لئے بس کھیرا نامی بوٹی سے علاج کیا جاتا ہے یہ بوٹی مکئی کے کھیت میں پیدا ہوتی ہے یہ نیولے کی خوراک بھی ہے یہی وجہ ہے کہ نیولے پر سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا یہ مصفی خون بھی ہے اور جلد کی بیماری کا علاج بھی ہے۔

ٹی بی کا علاج: کسی کو ٹی بی ہو جائے تو اس کا دیسی علاج یہ ہے کہ ایک بوٹی جس کا نام پسری ہے یہ دراصل ایک بیج ہوتا ہے جس کو سائے میں رکھ کر خشک کر لیا جاتا ہے پھر اسے کوٹ کر شہد میں ملا کر اس کا معجون تیار کر کے اسے چالیس روز تک دھوپ میں رکھا جاتا ہے اس کے بعد مریض کو دیا جاتا ہے اس سے ٹی بی کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں یہ روزانہ دو تین ماشہ کی خوراک ہوتی ہے۔

سر دردی کا علاج: سر درد کے لئے دیسی طریقہ علاج یہ ہے کہ است خطوز بوٹی ہے چھ ماشہ وزن کی لے لیں اور آدھ سیر پانی میں اسے ابال دیں جب پانی آدھا رہ جائے تو اس میں میٹھا ڈال دیا جائے اور پھر ایک چھوٹی پیالی پی لی جائے سر دردی ٹھیک ہو جاتی ہے۔

ٹوٹی ہوئی ہڈی کا علاج: ہڈی ٹوٹ جائے تو اس کا دیسی طریقہ علاج یہ ہے کہ ہلدی کو پیس کر اسے تلوں کے تیل میں ڈال لیا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کی جگہ پر اس کا لیپ کر لیا جاتا ہے اور پھر اس پر زنانہ بالوں کو رکھ کر اس جگہ پر پٹی باندھ لی جاتی

ہے یہ عمل چند مرتبہ کرنے سے افاقہ ہو جاتا ہے۔ ہڈیوں اور پٹھوں کے علاج کے سلسلے میں پہلوانوں کا سہارا بھی لیا جاتا ہے یہ پہلوان کشتی کے داؤ پیچ جاننے کے علاوہ ہڈیوں اور پٹھوں کے درد اور ہڈی جوڑنے کے سلسلے میں بھی ضروری معلومات رکھتے ہیں۔ یہ طریقہ علاج اب بھی مقبول ہے۔

قبض کا علاج: تھوڑی سی سونف لی جائے اور دو حصہ بارنگ لیا جاتا ہے اسے پانی میں ڈال کر پانی کو ابال دیا جاتا ہے پھر یہ پانی دو تین مرتبہ پی لیا جاتا ہے۔

کھانسی کا علاج: کھانسی ہو جائے تو بارنگ کو عرق گلاب میں ملا کر اسے آگ پر ابال دیا جاتا ہے اور پھر اس میں چینی ڈال کر مریض کو پلایا جاتا ہے اس سے کھانسی ختم ہو جاتی ہے اس کے علاوہ ملٹھی کو بھی ابال کر اس کا پانی پلایا جاتا ہے یا ملٹھی کوٹ کر کھلائی جاتی ہے۔

دمہ کا علاج: جب کسی کو دمہ کا مرض لاحق ہوتا ہے تو اسے دھتورا دیا جاتا ہے، ایک نشہ آور بوٹی ہے۔

بچھو کے کاٹے کا علاج: بچھو کاٹ لے تو کیکر کے درخت کے پتوں کو چلم کی ٹوپی میں تمباکو کی طرح جلا کر چلم کے سوئے لئے جاتے ہیں اس سے بچھو کا زہر زائل ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے دوسرا علاج یہ بھی ہے کہ فوراً پیاز کی گڈی پر سے چھلکا دور کر کے اسے چبایا جاتا ہے۔

گلے کی بیماری کا علاج: جب کسی کا گلہ پک جائے یا خراش ہو تو چھوٹی الائچی، قول ڈوڈے اور طباشیر کو کوٹ کر سفوف بنا لیا جاتا ہے اور گلے میں وقفے وقفے سے لگاتے ہیں اس کے علاوہ نمک ملا پانی کے غرغرے بھی کرنے سے گلہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

فالج کا علاج: جب کسی کو فالج یا لقوے کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے تو اسے تیل کی مالش کر کے کبوتر کے گوشت کی یخنی پلائی جاتی ہے تا کہ اس کے بدن کو گرمی ملے اور وہ حرکت کرنے کے قابل ہو سکے اور لقوے کی جگہ کو کپڑا گرم کر کے اس کی حدت پہنچائی جاتی ہے جس سے منہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

کمر یا گھٹنوں کے درد کا علاج: جب کسی کی کمر یا گھٹنوں میں درد ہو تو روغن گل یا زیتون کے تیل کی مالش کی جاتی ہے درد میں افاقہ ہو جاتا ہے۔

ٹونے ٹوٹکے، دم درود سے علاج

سر درد کا علاج: اس کے لئے روحانی طریقہ علاج یہ ہے کہ محلے کی مساجد کے آئمہ یا دیگر بزرگوں کے پاس جا کر دم درود کروایا جاتا ہے جس سے سر کا درد ٹھیک ہو جاتا ہے اس کے علاوہ تعویذ اور گنڈہ سے بھی سر کا درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

خارش کا علاج: بیرون ہشتنگری ایک بزرگ سید کریم شاہ کا مزار ہے وہاں ایک کنواں جسے چاہ کریم شاہ کہا جاتا ہے جب کسی مرد و خاتون یا بچہ یا بچی کو خارش کی یا جلد کی بیماری لاحق ہو تو اس کنویں کے پانی سے نہایا جاتا ہے جس سے افاقہ ہو جاتا ہے۔

پٹھوں اور ہڈیوں کے درد: جس کسی مرد و خاتون یا بچہ کو ہڈیوں اور پٹھوں کا عارضہ لاحق ہو تو بالمقابل شرقی تھانہ حاجی عبدالغفور باباؒ بزرگ کے مزار پر جاتا ہے اور وہاں مزار پر پڑے ہوئے جھاڑو سے بدن کو جھاڑتا ہے۔ ہر اتوار کو یہ حاضری دینی پڑتی ہے تو افاقہ ہو جاتا ہے ان کے علاوہ ڈاگ اسماعیل خیل چراٹ روڈ پر میاں بابرؒ کا مزار ہے وہاں بھی حاضری دی جاتی ہے۔

پھاوڑوں اور غدودوں کا علاج: جب کسی کے بدن پر کسی جگہ پر اوڑایا غدود ہو جائے تو شبقدر کے مقام پر فولاد باباؒ کے مزار پر حاضری دی جاتی وہاں مجاور لوگ دم ڈالتے ہیں لوگ تندرست ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ پشاور کے باہر ہزار خوانی کے مقام پر شاہ حیدر باباؒ کے مزار پر بھی حاضری دی جاتی ہے اور وہاں سے مٹی لا کر پھاوڑے یا غدود پر لگا دی جاتی ہے لوگ شفایاب ہو جاتے ہیں۔

بخار کا علاج: جب کسی بچے کو بخار ہو جائے اور علاج کے باوجود تندرست نہ ہو تو کوہاٹ روڈ پر سید حسن پیرؒ کے مزار پر حاضری دی جاتی ہے اور وہاں پانی کے حوض پر بچے کو نہلایا جاتا ہے بچہ تندرست ہو جاتا ہے۔

موکوں کا علاج: بدن کے کسی حصہ پر موکا نکل آئے تو پشاور کے ایک محلہ چاہ کالا میں شانولی پیرؒ کے مزار پر حاضری دی جاتی ہے اور وہاں چراغ میں تیل سے انگلی تر کر کے موکا پر لگایا جاتا ہے دو چار مرتبہ ایسا کرنے سے موکا خشک ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

کند ذہن کا علاج: کسی مرد و زن پر جنات کا سایہ ہو جائے تو مختلف عاملوں کے پاس جا کر دم درود کروایا جاتا ہے یہ عامل لوگ تعویذ اور گنڈوں سے بھی علاج کرتے ہیں۔

بچھو اور زنبور کے کاٹنے کا علاج: بچھو یا زنبور کاٹ لے تو مختلف بزرگ جن کے پاس عامل لوگوں کا اجازہ ہوتا ہے دم درود پھونکتے ہیں اس سے زہر اثر نہیں کرتا۔

ناف اٹھوانا: کسی کو کھانے کی اشتہاء نہ ہو اور طبیعت مضمحل رہتی ہو تو کہتے ہیں کہ اس کی ناف ٹل گئی ہے اس سلسلے میں بعض تجربہ کار لوگ جو ناف کو جگہ پر لانے کا تجربہ رکھتے ہیں ان کے پاس حاضری دی جاتی ہے وہ مریض کو چت لٹا کر ہاتھ کے پنجے سے ناف کی جگہ پر دباؤ ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی کلام پاک بھی پڑھتے ہیں اور دم کرتے ہیں پھر مریض کو سر کی طرف سے اٹھا کر اس کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں کے پنجے کو پاؤں کے انگوٹھوں تک اس طرح پہنچائے کہ ٹانگیں بالکل سیدھی رہیں جب مریض ایسا کر لیتا ہے تو ناف اپنی جگہ پر آ جاتی ہے۔

فالج کا علاج بذریعہ حمام: پشاور کی ثقافتی زندگی میں حماموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہاں کا ایک مشہور حمام ایجرٹن روڈ پر ہے۔ ان گرم حماموں کے ذریعے فالج زدہ لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے اور اکثر نامور اطباء اور حکماء بھی یہ علاج تجویز کرتے ہیں۔ یہ ایک کشادہ عمارت ہوتی ہے جہاں چھوٹے چھوٹے نہانے کے غسل خانے بنے ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے پانی کے پائپ اس آگ کی بھٹی سے گزرتے ہیں جس کی وجہ سے پانی ہر وقت گرم رہتا ہے جب کسی کو فالج ہو جائے تو یہاں مریض کو لایا جاتا ہے سب سے پہلے مریض کو اس گرم کمرے سے پہلے ایک بیرونی کمرے میں ٹھہرایا جاتا ہے جو کہ نیم گرم ہوتا ہے یہاں پر مریض کو ایک نکر پہنا دیا جاتا ہے اور باقی کپڑے اتار دیتا ہے اس کے پورے بدن پر نہایت مہارت سے تیل کی مالش کی جاتی ہے تاکہ سوئی ہوئی رگیں پھول جائیں کچھ دیر بعد پھر مریض کو گرم ترین کمرے میں لے جایا جاتا ہے جہاں وہ گرم پانی سے نہاتا ہے جب نہا لے تو بدن کو خشک کر کے دوبارہ بیرونی نیم گرم کمرے میں لایا جاتا ہے تاکہ فوری طور پر ہوا نہ لگ جائے مریض کچھ دیر وہاں رہتا ہے اور یہاں پر اسے گرم حلوہ کھلایا جاتا ہے۔ پھر اسے گرم کپڑے میں ڈھانپ کر باہر نکالا جاتا ہے دو تین مرتبہ حمام کرنے سے فالج کا مرض ختم ہونے لگتا ہے۔ یہ حمام سردی گرمی دونوں موسموں میں کھلے ہوتے ہیں۔

سرحد کی لوک کہانیاں / داستانیں

موسیٰ خان گل مکئی: حافظ محمد ادریس موسیٰ خان اور گل مکئی کی کہانی کو پشتو کے مشہور شاعر ملا نعمت اللہ مرحوم نے منظوم کر کے اس پر دوام کی مہر ثبت کر دی ہے۔ کہانی کا تعلق یوسف زئی پٹھانوں کی روایات سے ہے۔ جو پٹھانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے اور جن کی آبادی زیادہ تر مردان اور صوابی کے علاقہ میں ہے۔

ایک تھا بادشاہ، اس کا نام تھا عیسیٰ خان۔ وہ قبیلہ یوسف زئی کا سردار تھا۔ اس کی حکومت ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے پایہ تخت کا نام تواتر ین تھا جس کے خرابہ پر آج کل تحصیل صوابی ضلع مردان میں غروبک نامی گاؤں آباد ہے۔ عیسیٰ خان کے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا مگر اولاد کی دولت سے محروم تھا اس زمانہ میں شیخ رحمکار رحمۃ اللہ علیہ المعروف کاکا صاحبؒ ایک مشہور بزرگ تھے جن کی عقیدت کا دم سب لوگ بھرتے تھے۔ اور ایک عالم اُن کی بارگاہ سے اپنی حاجتیں پوری کراتا تھا۔ عیسیٰ خان بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اولاد کے لئے دعا کی التجا کی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مرید باصفا حضرت شیخ کے لئے انجیر کے دانے لے آیا حضرت شیخ نے عیسیٰ خاں کی طرف بڑھائے اس نے صرف دو دانے اُٹھا لئے اور کہا حضور گرمی کا موسم ہے میرے لئے یہی دو دانے کافی ہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا، جاؤ دو اُٹھا لئے تو دو ہی سہی۔ دعا مستجاب ہوئی اور تھوڑے عرصہ میں عیسیٰ خان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام موسیٰ خان رکھا گیا۔

جب شاہ دوراں خان عیسیٰ خاں کا ولی عہد شہزادہ موسیٰ خاں اس قابل ہوا کہ اسے تعلیم دلوائی جائے تو گو اپنی حکومت میں علما کی کمی نہ تھی لیکن شہزادہ کی تعلیم کے لئے کسی ایسے استاد کی ضرورت تھی جو اپنے وقت کا امام رازی یا کم از کم ابن جوزی ضرور ہو۔ عیسیٰ خاں کی حکومت کی سرحد پر ایک دوسرا بادشاہ حکمراں تھا جس کے دارالحکومت کا نام سپین ترین تھا۔ وہاں ایک بزرگ عالم دین کا قیام تھا جس کے حلقہ درس سے فیض پانے کے لئے دور دور سے شاگرد آتے تھے۔ اس کی درسگاہ میں لڑکے اور لڑکیاں باہم مل کر درس لیتے تھے۔ اور اس گنجینہ علم و معرفت سے یکساں طور پر سیراب ہوتے تھے۔ چنانچہ شہزادے کو اسی عالم کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجا گیا وہ روزانہ صبح سویرے سبق پڑھنے کے لئے سپین ترین چلے جاتے اور دوپہر کو اپنے گھر واپس آ جاتے۔

گھبرائیے نہیں یہ کہانی ہے اور جنگ و عشق کی طرح کہانی میں بھی سب کچھ جائز ہے۔ دراصل آپ کو شاہ دوراں، شہزادہ، ولیعہد اور پایہ تخت وغیرہ کے شان دار الفاظ نے ڈرا دیا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ہمارے ہاں جو شخص بھی اپنے ڈیرے کا مالک ہوتا اور اس میں دو تین ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں اور ایک میلا کچیلا حقہ رکھ سکتا وہ کہانی میں جا کر شہنشاہ کشورستان بن جاتا۔

مولانا کے درس میں جہاں بیسیوں شاگرد اور شاگردنیاں ہوتی تھیں وہاں

اسی گاؤں کے بادشاہ، شاہ مست خاں کی صاحبزادی گل مکئی بھی آ کر شامل ہوتی تھی اور دوسرے شاگردوں سے نسبتاً ممتاز جگہ پر بیٹھتی تھی۔ سبق اور کھیل ہی کھیل میں موسیٰ خان اور گل مکئی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ اور چپکے چپکے دلوں کا سودا طے ہو گیا۔

عشق اور وہ بھی بچپن کا عشق یہ آگ بھلا کہیں چھپائے چھپ سکتی ہے ہم مکتبوں میں دونوں کے عشق و محبت کے چرچے شروع ہوئے بات آہستہ آہستہ درسگاہ سے باہر نکل گئی۔ اور سارے گاؤں میں پھیل گئی جب گل مکئی کی والدہ کو معلوم ہوا کہ لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے ہیں تو اس نے بچی کو مدرسے سے اُٹھا لیا اور خاندانی رواج کے مطابق اُسے پردے میں بٹھا دیا۔ عشق کی تکمیل شاید اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اسے خاردار جھاڑیوں میں سے گزار کر بچائے گل مکئی پردے میں کیا بیٹھی کہ موسیٰ خاں کی قسمت کا ستارہ غروب ہو گیا۔ اب وہ روزانہ پڑھنے کے لئے مکتب آتا مگر اس کی نظریں جن نقوش کی متلاشی تھیں وہ کتاب میں نہیں مل سکتے تھے گو مصحف الٰہی اس کے سامنے پڑا رہتا مگر جیسا کہ آزمودہ کار بزرگوں نے کہا ہے مجاز حقیقت کا پُل ہے وہ اس حقیقت تک مجاز کے پُل کے ذریعے پہنچنا چاہتا تھا اور یہ پُل اس کی بدقسمتی سے ٹوٹ چکا تھا۔

اس نے گل مکئی کا رُخ انور دیکھنے کیلئے بہتیرے جتن کئے مگر کامیابی نہ ہوئی گل مکئی پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ وہ گھر کے دروازے تک بھی نہیں آ سکتی تھی۔ آخر کار اُسے ایک ترکیب سوجھی مکتب کے پاس ہی ایک بڑھیا کا مکان تھا جسے گاؤں بھر کے بچے نانی اماں کہتے تھے موسیٰ خاں نے اس سے مراسم بڑھائے کچھ تحفے تحائف پیش کئے اور پھر اپنے عشق کی داستان سُنا کر بڑھیا سے امداد کی التجا کی۔

افسانوی دنیا میں بڑھیوں سے اور کوئی کام ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ نامہ و پیام کیلئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ بڑی بی نے اس اہم کام کا بیڑا اُٹھایا اور پیام رسانی پر رضامند ہو گئی۔ گل مکئی نے بھی موسیٰ خان کے نیاز نامے کا جواب محبت نامے سے دیا اور نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ گو دونوں ملاقات سے محروم تھے عشق میں کامیابی کی پہلی سیڑھی رازداری ہے مگر یہ بیماری کچھ اس قسم کی ہے کہ انسان جب تک اپنی داستان دوسروں پر افشا نہ کرے چین سے بیٹھ نہیں سکتا اور دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے جہاں کہیں موقع پاتا ہے اپنی واردات الف سے لے کر ی تک سناتا ہے چنانچہ موسیٰ خاں نے بھی گل مکئی کے خطوط دوستوں کو سنانے شروع کئے اور آج کل کے دوست تو خیر جیسے بھی ہیں لیکن اس زمانہ کے دوستوں کی حالت سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔ ایک دن کسی نے موقع پا کر گل مکئی کا ایک خط اڑا لیا۔ اور لے جا کر سیدھا اس کے باپ، شاہ مست خاں کے ہاتھ پر رکھ دیا شاہ مست خاں نے دیکھا تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی میری بیٹی اور اغیار سے راز و نیاز! بخدا اس توہین کو برداشت کیا جا سکتا۔ پہلے تو اس نے گھر جا کر بیوی اور بیٹی کی خوب خبر لی پھر لوگوں کو جمع کر کے فیصلہ کیا کہ رات کے پردے میں تواترین پر دھاوا بول دیا جائے۔ اور اس سے گاؤں کی بے حرمتی کا بدلہ لیا جائے۔ فوراً ڈھنڈورا پٹوایا گیا۔ اور جو شخص بھی ہتھیار اُٹھانے کے قابل تھا وہ گاؤں کے مرکزی مقام پر پہنچ گیا اور چند لمحوں میں اچھا خاصا لشکر جمع ہو گیا۔ ادھر عیسیٰ خان کو معلوم ہوا کہ سپین ترین والے شبخون کے لئے آ رہے ہیں تو اس نے بھی اپنا لشکر آراستہ کیا دونوں لشکر میدان میں نکل آئے قبائلی عصبیت کے نام پر خوں ریزی شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر میں طرفین کے کئی آدمی مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے علماء اور مشائخ نے سنا تو وہ قرآن مجید سروں پر اُٹھا کر آ گئے اور خدا اور رسول کے واسطے دے دے کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور اس طرح ان کی برکت سے خوں ریزی کا سلسلہ پھیلنے سے رُک گیا۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر گیا۔ ایک دن موسیٰ خاں کا ملازم شاہ مست خاں کے علاقہ میں گائیں چرانے کے لئے چلا گیا اتفاق سے اس کا بھتیجا سہیل خاں بھی شکار کے لئے نکل آیا تھا۔ سہیل خان گل مکئی کا منگیتر تھا اس لئے وہ تواترین کے ہر آدمی کو اپنا رقیب سمجھتا۔ سہیل خان نے بُرا بھلا کہہ کر گوالے کو وہاں سے نکال دیا۔ اُس نے آ کر موسیٰ خان سے شکایت کی۔ موسیٰ خان اپنے رقیب کے ہاتھوں اپنے ملازم کی توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا فوراً تلوار اٹھائی اور چراگاہ میں پہنچ کر سہیل خان کو مقابلہ کے لئے للکارا سہیل خان نے بپھرے ہوئے شیر کو آتے دیکھا تو فوراً نرم پڑ گیا اور کہنے لگا بھئی بات یہ ہے کہ یہاں گاؤں کی دوشیزائیں بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے آتی ہیں اس لئے میں نے کسی غیر مرد کا آنا مناسب نہ سمجھا۔ ورنہ بھلا میری یہ مجال ہو سکتی تھی کہ کوئی ایسی حرکت کرتا۔ جو آپ کو ناگوار خاطر ہوتی یہ سُن کر موسیٰ خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ نرم فقروں نے آگ پر پانی کا کام دیا دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور دوستی کا وعدہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے لیکن بھلا جہاں عورت ناقصاص کا ہاتھ ہو وہاں دوستی کیوں کر ہو سکتی ہے البتہ اس طرح ایک ہوشیار دشمن دوستی کے پردے میں اپنے رقیب سے مطلب برآری ضرور کر سکتا ہے سہیل چاہتا تھا کہ موقع پا کر موسیٰ خان کا کانٹا سامنے سے دور کر دے۔ اور موسیٰ خاں کا خیال تھا کہ آمد و رفت کے لئے رستہ بنا کر گل مکئی کو اڑا لے جائے۔

کچھ عرصہ کے بعد سہیل کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ موسیٰ خاں کو بھی دعوت دی گئی اور یہ تجویز ہوئی کہ جب فائرنگ ہو تو موسیٰ خاں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ خوں بہا دینا پڑے گا، دے دیا جائے گا۔ عشا کے وقت سب

مہمان حجرے میں جمع تھے ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی اتنے میں ایک چھوٹے بچے نے آکر موسیٰ خاں کے کان میں کچھ کہا موسیٰ خاں موقع پا کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ مکان کے پچھواڑے باغ میں گل مکئی کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی وہاں انگور کی بیل کے سایہ میں مدت کے بچھڑے ہوئے دو دل ایک دوسرے سے ملے۔ گل مکئی نے التجا کی کہ انہیں راتوں رات علاقہ سے دور کہیں نکل جانا چاہیے موسیٰ خاں بھی راضی ہو گیا اور یہ دونوں درختوں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے گاؤں سے باہر نکل گئے۔ ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ گھر میں دلہن کی ڈھنڈیا مچ گئی سہیل خان نے سنا تو اس کو فوراً موسیٰ خاں کا خیال آیا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ موسیٰ خاں بھی غائب ہے چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے اور آخر کار سہیل خاں نے ان کو جالیا موسیٰ خاں اس کے ساتھ خود مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن گل مکئی نے نہ مانا خود مردانہ وار آگے بڑھی اور اس پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ سہیل خاں وہیں ختم ہوا اور گل مکئی موسیٰ خاں کی رفاقت میں تواترین پہنچ گئی۔

آدم درخانئ: سوات کی فراخ و جوان وادی، سرسبز و شاداب چراگاہیں، اور نرگسوں سے معمور کھیت، آدم خاں کے ملکوتی نغموں میں ڈوبے ہوئے، کھوئے ہوئے کسی جنت گم گشتہ کے حصے معلوم ہوتے۔ جب آدم خاں کی راگ بھری انگلیاں رباب کے تاروں سے مس ہوتیں تو ساکت و خاموش تاروں میں جیسے ہزاروں حوریں گانے لگتیں، سینکڑوں کوئلیں اور پپیہے ہجر و فراق کی داستانیں سنا سنا کر نرگستانوں میں آگ لگا دیتے جس سے سوات کی چراگاہیں افسردہ ہو جاتیں اور شاداب وادیوں کی جوانی جھلس کے رہ جاتی۔ پنگھٹ پہ جاتی ہوئی الھڑ دوشیزائیں راستہ چلنا بھول جاتیں، ان کے قدم رک رک جاتے، اور اکثر کے سروں اور کولھوں پر رکھے ہوئے پانی کے گھڑے زمین پر گر کر ان کے ارمانوں کی طرح چور چور ہو جاتے۔ ان کی رگ رگ میں رومانی ٹیسوں کا الاپ گدگدی کرنے لگتا، ان کی انگلیں زخمی پنچھیوں کی طرح رقص بسمل میں مگن ہو جاتیں۔

آدم خاں کے رس بھرے نغموں کے ساتھ اس کی بھرپور جوانی اور صدف ایسی آنکھوں کی چمک دمک، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرے کے دلکش نقوش اور شمشاد ایسے قد کی رعنائی کا شہرہ ''بازدرہ بالا'' کی حدود سے نکل کر سارے سوات میں پھیل چکا تھا یہ سارا سوات اس گاؤں کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ لوگ کہتے:

''حسن خاں ملک کتنا خوش نصیب ہے کہ اللہ نے اسے مال و دولت کیساتھ ساتھ آدم خاں ایسا بیٹا بھی عطاء کیا ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا''۔

آدم خاں، گاؤں کی ہر لڑکی کا محبوب، سینکڑوں کنواریوں کے دل اس کے رباب کے تاروں میں الجھے رہتے لیکن آدم کو کسی سے بھی عشق نہ تھا۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا اسے اگر عشق تھا تو اپنے رباب سے وہ رباب کے تاروں کے ساتھ باتیں کرتا، نئی نئی باتیں، انوکھے انوکھے راز و نیاز، اس کیا نگلیاں ہر لحہ تاروں کے ساتھ کھیلتی رہتیں اس کی آواز ہر وقت کسی ابدی نغمے کے سراغ میں بھٹکتی رہتی۔ وہ آنکھیں بند کئے ہر وقت نغمے کے پُرشور سمندر میں چلا جاتا، اپنی منزل متعین کئے بغیر کشتی، ساحل اور ناخدا سے بے نیاز ایسی جل پری کی تلاش میں جو نغمے سے زیادہ دلکش اور زہرہ و مشتری سے زیادہ حسین و جمیل ہو۔ اس کے ذہن و تخیل پر ایک ایسی تصویر مرتسم ہو چکی تھی جسے وہ اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ ہر لحہ اس تخیلی پیکر کو نغموں کے خواب زاروں میں محوِ گلگشت دیکھتا، اسے خواب میں بھی اسی کا خیال آتا۔

ماں باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جیتے وہ اس کی شہرت اور تعریف سن کر اللہ کا شکر بجالاتے، اب ان کے دل میں ایک آرزو تھی۔ آدم خاں کی شادی لیکن آدم خاں کی شادی اس پیکر تخیل کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماں باپ کو سخت صدمہ ہوا، وہ آدم خاں کے انکار کے پس منظر سے بے خبر تھے انہیں آدم کے خیالی عشق کی خبر نہ تھی، اور جب آدم کے دو راز دار دوستوں نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا کہ وہ تو اپنے خوابوں کی ملکہ کے ساتھ ہی شادی کرے گا تو انہوں نے اس کو بڑے تعجب سے سنا۔ وہ سمجھے شاید آدم کو رباب نوازی کے بے پناہ شوق نے پاگل بنا دیا ہے۔

ایک دن جب آدم خاں رباب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا تو اس کے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں پڑیں جیسے کسی نے رس گھول دیا ہو۔ جب وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا پڑوس کے گاؤں ''بازدرہ پایاں'' سے آئی ہوئی مہمان بڑھیا اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ طاؤس خاں کی اکلوتی مہ جبیں لڑکی ''درخانئ'' کے حسن و جمال کی تفسیر میں محو تھی، آدم خاں کو دیار محبوب سے آئی ہوئی ہستی سے ایک گونہ انس پیدا ہو گیا، اسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ تمام باتیں اسی کی محبوبہ کی ہو سکتی ہیں اور آدم نے بڑھیا کے سامنے درخانئ کے خدوخال بیان کرنا شروع کئے۔ جب اس نے بائیں رخسار کے تل اور پیشانی کے دلکش نشان زخم کا پتہ دیا تو بڑھیا نے قسم کھا کر کہا ''آدم بیٹا! تم نے درخانئ کو ضرور دیکھا ہے'' لیکن آدم نے کہا: ''خالہ میرا خواب سچا ہے میری محبت ازلی و ابدی ہے میرا عشق پاکیزہ ہے۔''

بڑھیا نے آہ سرد کھینچ کر کہا: ''لیکن بیٹا! یہ سب کچھ بے سود ہے۔ درخانئ کی منگنی تو ایک خان پایاؤ کے ساتھ ہو چکی ہے''۔ بڑھیا کے ان الفاظ نے آدم کی دنیا تہ و بالا کر دی، اس پر دیوانگی نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ رباب کے ساتھ اس کا انس بڑھ

گیا۔ اب تو اس نے رباب کے تاروں کو زبان دے دی تھی۔

کہتے ہیں عشق کی آگ دونوں طرف سلگتی ہے۔ بڑھیا واپس اپنے گاؤں گئی تو اسے درخانئی سے آدم کے خوابوں اور اس کی بے پناہ محبت کا ذکر کیا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب درخانئی نے بھی جواباً بڑھیا کے سامنے اپنے خواب بیان کئے۔ آدم خان کی شکل وصورت بتائی اور اس کے رباب کے آتش ریز نغموں کا ذکر کیا۔

دُرخانئی ہر رات خوابوں کی سرسبز وشاداب وادی میں آدم کو کسی ندی کے کنارے رباب بدست دیکھتی اور جب رباب کے نغمات اپنے عروج پر ہوتے تو درخانئی کسی اسپرا کی طرح آسمانی ناچتی ہوئی رباب کے ملکوتی نغموں میں گھل جاتی اور جب آدم خاں رباب کے تاروں سے مضراب الگ کر لیتا تو درخانئی اس میٹھے اور بہشتی خواب سے ایک دم بیدار ہو جاتی اور پھر اس کے کانوں میں آدم کے ٹپوں کا الاپ اور نغمے پہروں گونجتے رہتے۔

جب آدم خان کو درخانئی کی محبت کا علم ہوا تو اس کے سمندر شوق پر تازیانہ لگا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں ہر لمحہ رباب بدست رہنے لگا۔ بڑھیا نے درخانئی کا پیغام محبت اور پھولوں کا تحفہ آدم خاں کو دیا، اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ عنقریب ایک شادی کی تقریب میں یہاں آنے والی ہے اور پھر شادی کی تقریب پر آدم نے اپنے فن نہیں بلکہ اپنے پرخلوص عشق، اپنے شوق ومحبت اور سوز وگداز کا مظاہرہ کیا ساری محفل پر جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ آدم و درخانئی کے خلوص ومحبت کا جادو، اور جب درخانئی پر آدم کی نظر پڑی تو اس کے خواب وخیال کی شہزادی عالم ہوش و بیداری میں اور بھی نکھری ہوئی معلوم ہوئی۔ آدم کے جذبات شوق نے رباب کے تاروں میں جان ڈال دی اور اس نے محبوب کا گیت محبوب کے حضور میں بصد شوق ونیاز پیش کیا۔

درخانئی کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ اب اس کا علاج درخانئی کے پاس ہی تھا۔ اس کے رازدار دوستوں، مہر و اور بالو سے اپنے دوست کی یہ حالت نہ دیکھی جا سکی اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح آدم کو دیار محبوب میں پہنچا دیا۔ پھر ایک رات ستاروں بھری رات میں محبت کے یہ دو پیکر اکٹھے ہوئے، دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال آنسوؤں کے موتیوں اور اشکوں کے ہاروں سے کیا، ٹھنڈی آہوں کے گیتوں سے ایک نے دوسرے کو خوش آمدید کہا اور ایک لمحے تک دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے کو خراج محبت پیش کیا جب آہوں کے بادل چھٹے، اشکوں کا مینہ تھما تو عشق ومحبت کے یہ دونوں افق مسکرائے۔

''میرے خوابوں کی شہزادی! تو آخر کب تک میرے خیالوں کی طرح آوارہ پھرتی رہے گی، آنغموں کی طرح میرے رباب کے تاروں میں ڈھل جا، مضراب کی طرح میری انگلیوں کے پوروں میں پیوست ہو جا، اب جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔''

''میرے مغنی محبوب! میں تیرے نغموں کی دنیا میں کھو جانے کے لئے بیتاب ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں، رباب اور نغمے کی طرح، مضراب اور تاروں کی طرح، اے میرے چاند، دنیا میرے لئے تاریک رات کی مانند ہے میں چکور کی طرح تجھے ہر طرف تلاش کرتی رہتی ہوں لیکن ہر قدم پر دام بکھرے ہوئے ہیں۔

لیکن درخو پیاری، تیری منگی؟ تیرا بیاہ؟ کیا مجھ سے میرا رباب چھین لیا جائے گا؟ میرا گلا گھونٹ کر میرے ٹپون اور الاپوں کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا؟ کیا میرے نغمے بے سوز کر دئے جائیں گے؟ کیا میرا رباب جلاہے کے حوالے کر دیا جائے گا؟ کیا یہ سچ ہے درخانئی؟ پیاری درخو؟''

میرے مغنی محبوب! سُریلے نغمے گانے بند کر دے، کیا تجھے اپنے رباب پر اعتماد نہیں رہا؟ رباب کے ساتھ ساتھ تمہارے پاس بندوق بھی تو ہے جب مضراب سے کام نہ چل سکے تو اس کی جگہ کارتوس لے لیتے ہیں یہی ایک یوسف زئی پٹھان کی جرات وہمت کا تقاضا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ رباب ٹوٹ سکتا ہے لیکن انا ڑی انگلیوں سے سر نہیں کیا جا سکتا۔''

ستاروں کی گردش نے ہوا کے جھونکے کی طرح تاروں بھری رات کے رومان کو درہم برہم کر دیا! دو دلوں نے ابھی راز ونیاز ختم بھی نہ کئے تھے کہ مرغ سحر نے اذان دی۔ درخانئی کے گھر کے صحن میں بندھی ہوئی بھیڑوں نے ممیانا شروع کر دیا اور یہ دونوں متوالے ایک دم جیسے گہری نیند سے چونک اٹھے۔ درخانئی کے دل سے بھیڑوں کے لئے بددعا نکلی۔

''اے میرے باپ کی بھیڑو، تمہارے گلے میں ناسور پڑ جائے''۔

نامراد محبت آدم خان نے سب کے لئے دعائیں کیں، ہر ایک کی ڈھارس بندھائی، لیکن اس کے اپنے آنسوؤں کے تار کوئی روکنے والا نہ تھا اُس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا، اسے کسی نے ایسا عمل نہ بتایا جس سے اس کی محبت کا خاموش رباب چہک اُٹھتا، لیکن اس کی رازدار بڑھیا نے اسے تسلی دی، ''آدم خاں! پختون ہو، جوان، ہمت سے کام لو، درخانئی تمہاری ہی ہے، وہ ضرور تمہیں ملے گی۔''

درویشوں اور ملنگوں کی آمد اور کرامات کا شہرہ طاؤس خاں تک بھی پہنچا۔ بڑھیا نے طاؤس خاں سے کہا: ''خاں، خدا اور اس کے درویشوں کے پاس بہت کچھ ہے، کہتے ہیں یہ درویش بڑے پہنچے ہوئے ہیں، شاید اُن کی دعا سے ہماری

پھولوں کی ڈالی جیسی بچی پر اللہ رحم کردے وہ تو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے"۔

جب طاؤس خاں راضی ہو گیا تو بڑھیا نے درخانئی کو خوشخبری سنائی، "بیٹا، تمہارے اور بل سے گرا ہوا گلاب کا پھول ابھی تمہارے ہاتھ آنا چاہتا ہے۔ اسے ہوشیاری سے اپنے بالوں میں سنوار لینا۔ بڑے زور کی آندھی چل رہی ہے۔ اب کے یہ پھول گر گیا تو آئندہ کبھی اس کی ایک پتی بھی نہ پاسکو گی۔"

دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آدم خاں ہزاروں عقیدتیں لئے درمحبوب کی طرف روانہ ہو گیا، اس وقت اس کا انگ انگ نغموں بھرا رباب بنا محبت کے گیت الاپ رہا تھا، وہ سبزے کو روندتا پھولوں کو مسلتا، جھومتا، منزل شوق طے کر کے درخانئی کے سامنے جا پہنچا۔

درخانئی، نرگستان سوات کی نرگس بیمار، پژمردہ کلی، کملایا ہوا پھول، خزاں گزیدہ پتی، مرجھائی ہوئی ڈال، بستر پر پڑی تھی، جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے ایک دوسرے کو آنسوؤں کے ہیروں کا ہدیہ پیش کیا، محبت کے چمکتے ہوئے ہیرے، پیار کے آبگینے اور ان آنسوؤں نے خموشی میں ایک دوسرے کو ہزاروں داستانیں سنا ڈالیں، درخانئی کی پھول ایسی جوانی آدم خاں کی روح میں کانٹا بن کر پیوست ہو گئی۔ اس کے دل میں ایک تیر لگا۔ معاً اس کا ہاتھ سینے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دل کو تھام لیا۔ اس کی زبان نے اس کے دل کا ساتھ دیا اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ بیہوش ہو گیا۔ طاؤس خاں کی دور رس نگاہیں معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ تلوار کے ایک ہی وار میں آدم خاں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، لیکن بڑھیا نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور کہا، "دانشمندی کا تقاضا ہے کہ اس بات کو اسی جگہ دبا دیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بہ نہ ٹوٹے"۔

آدم خاں کے حواس بجا ہوئے تو وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ طاؤس خاں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے گرج رہا تھا۔ "لڑکے، اسی وقت میرے گاؤں سے نکل جا"۔ آدم خاں کو ایسا محسوس ہو جیسے کسی نے اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دے دیا ہو، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا سے پیاسا لوٹ جانے پر مجبور کیا گیا ہو، بھر گلزار سے اس نے اپنی پگڑی پر سجانے کے لئے ایک پھول توڑنا چاہا ہو لیکن اس کے ہاتھ توڑ دیئے گئے ہوں، وہ اپنے گاؤں واپس آ گیا، بلکہ وہاں لایا گیا آدم خاں نہیں بلکہ اس کا قالب بے جان، اس کی روح دیار محبوب میں نغمے کی طرح آوارہ پھرتی رہ گئی اور جسم بے نغمہ رباب کی مانند حسن خاں کے گھر!

اب اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی تھی، خوبصورت دنیا کی ہر رعنائی و زیبائی سے حتیٰ کہ اپنے رباب سے بھی، اس کے نغموں سے بھی، اور جب ایک دن اچانک اس کی نظر رباب پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اسے اپنا تربور سمجھنے لگا اور فرط غیظ سے کلہاڑی کے ساتھ رباب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی ماں باپ کی محبت نے یہ دکھ برداشت نہ کیا، لاکھ تدبیریں کیں، علاج معالجہ کرایا، گنڈے تعویذ سے کام لیا، لیکن آدم خاں کا مرض بیکراں ہوتا گیا۔ جب حسن خاں کو یقین ہو گیا کہ اس کا اکلوتا بیٹا، اس کا حقیقی وارث اور اس کے قبیلے کا نگہبان ہاتھ سے جا رہا ہے تو وہ بہت مضطرب ہوا اور یہ طے پایا کہ کسی نہ کسی طرح آدم خاں کو گاؤں کی حسین ترین لڑکی گلناز دکھائی جائے ممکن ہے سوکھی ندی میں پانی آ جائے، آدم کے عشق کا بھڑکتا ہوا الاؤ ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ درخانئی کو بھول جائے۔

پنگھٹ کے رومانی ماحول میں نقرئی قہقہوں کے سنگیت کا ہجوم تھا، چوڑیوں کے مدھر نغمات میں کائنات ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی، سرخ و سفید باہوں کی کہکشائیں مست الھڑ لڑکیوں کا جھرمٹ اور اس میں گلناز کا مرمریں پیکر جیسے نرگستان سوات کی شہزادی گھڑی دو گھڑی کے لئے نرگس کے شبستاں سے باہر ٹہلنے آ گئی ہو، لانبی پتلی پتلی گندھی ہوئی سیاہ بالوں کی مینڈیاں، دھڑکتے ہوئے دل کی طرح لرزتا ہوا سونے کا پیروان، دلکش اور بل پر سجے ہوئے خودرو پھول، جس نے دیکھا مبہوت ہو گیا، لیکن آدم خاں کو گلناز کے اس حسن نے بالکل متاثر نہ کیا۔ اس کا معیار حسن و محبت بہت اونچا تھا۔ فرشتوں کے تقدس اور حوروں کی صباحت سے بھی اونچا۔

گلناز کے خدوخال، اس کے جسم کے خطوط کی شوخ محرابیں، اس کے تیکھے نقوش کی ایمان ربائی، کوئی چیز بھی آدم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس نے جیسے دیکھا ہی نہیں اس کی محویت، خاموشی اور خود فراموشی کی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ نرگس کی ہر آنکھ میں اسے درخانئی ہی کی تصویر نظر آئی، لالہ صحرائی کے احمریں پیالے میں درخود کھڑی اسے بلا رہی تھی، وہ ہر بار اس تخیلی پیکر کی طرف لپکتا اور ہاتھ پھیلا کر رہ جاتا۔ درخانئی فضاء میں تحلیل ہو جاتی اور آدم کے سینے پر داغ چھوڑ جاتی اور فضا کا ہر ذرہ نرگس کی آنکھ سے آدم کی دیوانگی کا تماشا کرتا۔

ہجر و فراق کے طویل لمحے طویل تر ہوتے گئے، آدم خاں کی دیوانگی کا رنگ پختہ تر ہوتا گیا آخر ایک دن بازدرہ میں اس خبر نے کہرام مچا دیا کہ "آدم خاں مر گیا" کسی نے کہا ہمارا مغنی مر گیا، کسی نے کہا، عاشق صادق مر گیا اور کسی نے کہا شہزادی درخانئی کا رباب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، اب کون نغمے سنائے گا؟"

بازدرہ میں نغمے مر گئے، اور بین زندہ ہو گئے، درخانئی رنگین پایوں والے

پلنگ پر دراز، روئیں روئیں میں آدم خاں کو بسائے ہر لمحہ اسی کے خواب دیکھتی رہتی۔ بڑھیا اس کے سرہانے بیٹھی رہتی، اپنے باپ طاؤس خاں کی بھری بستی میں یہی ایک ہمدرد اور اس کے دکھ درد کو جاننے والی تھی، لیکن غریب بڑھیا کی کوئی سننے والا نہیں تھا، اس کے کہنے پر کوئی کان ہی نہ دھرتا تھا۔ درخانئی کے لئے تو اس کی ماں کی ممتا بھی مر چکی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا تھا۔ ماں کی ممتا پر باپ کے شملے کی غیرت اور قبیلے کی روایتی عزت غالب آچکی تھی، اب درخانئی کا آخری سہارا اس کے خواب ہی تھے، اس نے خواب میں دیکھا:

ایک بے حد خوبصورت باغ ہے جہاں وہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے۔ یکا یک باغ کے ایک گوشے سے رباب کے نغمے ابھرنے لگے۔ جب درخو نے اس طرف رخ کیا تو سرو وشمشاد کے ہجوم میں ایک بڑے تالاب کے بیچ، چاندی کی کشتی میں آدم خاں بیٹھا رباب پر درخو کے گیت گاتا دکھائی دیا، اس نے درخو کو دیکھ کر اپنی آغوش وا کر دی اور درخانئی جل پری کی طرح پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی آدم کی آغوش میں کھو گئی۔ آدم نے کہا ''بس درخو، اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، ہم اس کشتی میں ہی رہیں گے، یہیں اپنے لئے نیا گاؤں بنائیں گے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہو گیا، ایک خوفناک طوفان آیا، اور کشتی الٹنے لگی۔ درخانئی نے ایک چیخ ماری اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے سرہانے بڑھیا کو پایا جو اسے تسلی دے رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے لپٹ کر رونے لگی، میرا آدم کہاں ہے خالہ؟ اس کی کشتی ڈوبی تو نہیں؟''

بڑھیا نے کہا ''درخانئی بیٹا! آدم خان تمہارے ماں اور باپ کی ضد پر قربان ہو گیا، وہ اس دنیا سے چلا گیا، آدم نے تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ درخو بیٹی، اور جیسے درخانئی کا کسی نے گلا گھونٹ دیا، اس کے منہ سے صرف ''آدم خاں'' نکلا۔ اس نے اپنا سر تکئے میں چھپا لیا، ایک طویل عرصے تک اس نے سر نہ اٹھایا تو بڑھیا کو فکر لاحق ہوئی جب اس نے اسے جھنجھوڑا تو وہ آدم خاں کے پاس جا چکی تھی۔

کہتے ہیں جب درخانئی کو قبر میں اتارا گیا تو تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا گویا قبر میں دو لاشیں جمع ہو گئی ہیں، جب دوسری لاش کے منہ سے کفن ہٹایا گیا تو وہ آدم خاں کی لاش تھی۔

آدم خاں اور درخانئی کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔ آدم کے مزار کے درخت کی لکڑی کا مضراب نغمہ و موسیقی کے ہر شائق کی انگلیوں میں جادو بھر دیتا ہے۔ عشق و نغمہ کے ان شہیدوں کی یہ کرامت ہے۔

یوسف کڑہ مار: سرسبز و شاداب چراگاہوں، سونا اگلتی کھیتوں اور دودھ بھرے تھنوں والی سینکڑوں بھیڑوں کے باوجود حسین کاکا ہمیشہ مغموم رہتا۔ اس کی ضرب المثل خوشحالی اور مہماں نوازی کے افق پر یاس و اندوہ کے بادل ہر وقت چھائے رہتے۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ثمر دار باغات میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا نخل زندگی بے ثمر تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ ان چراگاہوں میں کوئی ایسا بچہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا دیکھے جسے حسین کاکا کا وارث کہا جائے۔ اس وقت اس کے دل سے ہوک اٹھتی جب وہ یہ خیال کرتا کہ اس کے مالا مال کھیت اس کی حقیقی اولاد کی بجائے اس کے ''تربوروں'' یعنی ایک دادا کی اولاد کے قبضے میں چلے جائیں گے اور جب وہ آئینے میں اپنے سفید بال اور گھنی براق داڑھی دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتا ساٹھ سال کی طویل مدت سے اس کے گھر کی چار دیواری نے کسی بچے کے رونے کی آواز نہ سنی تھی اور وہ دل ہی دل میں قدرت سے گلہ کرتا، احتجاج کرتا۔ وہ بظاہر بشاش رہتا تاکہ اس کے ''تربور'' اس کی اس کمزوری کو بھانپ نہ لیں۔ اگر کوئی اس سلسلے میں اس کے ساتھ ہمدردی جتاتا تو وہ ہنس کر کہتا خدا کی مرضی اسی طرح ہے، اس کے بھید ہم کیا جانیں۔ اسی میں کوئی بھلائی ہو گی۔ لیکن یہ غم اسے گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی بے اولادی پر کڑھ رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پیروں فقیروں کے پاس اور خانقاہوں پر زیارت کے بہانے گیا، دعائیں کیں، منتیں مانیں اور جب ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے نخل تمنا میں پھل آنے والا ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ آخر وہ گھڑی آ پہنچی جب حسین کاکا کے گھر کی دیواروں نے ایک حسین و جمیل بچی کے رونے کی آوازیں سنیں۔ لڑکی کا نام بُندی رکھا گیا، دشمنوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ لڑکی ہی تو ہے۔ اصل وارث تو لڑکا ہوتا ہے۔ لیکن حسین کاکا بڑا خوش تھا۔ اس نے لڑکی کو سو لڑکوں کے برابر سمجھا اور قدرت کو اس کی قدر دانی پسند آئی۔ دوسرے سال بُندی کے لئے قدرت نے ایک بھائی بھیج دیا، چاند ایسا لڑکا۔ اس دن حسین کاکا نے دل کھول کر بندوق کے فائر کئے، دوست احباب اور اپنے پرائے سبھوں نے حسین کاکا کی خوشحالی میں اتنے فائر کئے کہ دور دور کے لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید دو قبیلوں میں جنگ ہو رہی ہے۔

بچہ بڑا خوبصورت اور پیارا تھا۔ جس نے دیکھا اس نے کہا یوسف ثانی ہے۔ آخر حسین کاکا نے اس کا نام یوسف ہی رکھ دیا۔ بچپن کے دن ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئے۔ باپ نے اسے مدرسہ بھیج دیا اور جب اس نے شباب میں قدم رکھا تو حسن و صورت کے علاوہ علم کے زیور سے بھی آراستہ ہو چکا تھا۔ اس کے حسن و

رعنائی کا شہرہ دور دور پہنچ چکا تھا، یوسف زئی قبیلے کے اس جوان رعنا کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ترلاندی گاؤں میں لوگوں کے لئے ایک خاص کشش پیدا ہوگئی۔ شکار کے لئے جو بھی کڑہ مار جاتا ترلاندی میں ضرور پڑاؤ کرتا۔ حسین کاکا کا حجرہ ایسے مہمانوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا۔

حسین کاکا کب تک زندہ رہتا؟ اس کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا، لیکن وہ مرتے وقت بڑا خوش تھا۔ اُسے اطمینان تھا کہ جان دیتے وقت اس کے دونوں ہاتھ یوسف اور بُندی کے ہاتھ میں ہیں۔ اپنے وارثوں کے ہاتھ میں۔ اب وہ لاوارث نہیں تھا بلکہ مال و دولت کے ساتھ ساتھ اس کا ایک شمشاد قد بیٹا بھی تھا۔ جو اسے اپنے ہاتھوں قبر میں اتارے گا اور اس کی ایک لڑکی بھی تھی جو بابا، بابا کر کے اس کی میت پر روئے گی۔ اس کا جنازہ بڑے اہتمام سے اٹھایا جائے گا۔ اس کے پیچھے خیرات اور صدقہ دینے والے موجود تھے۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کا لڑکا اپنے باپ کی میت کے ساتھ اس کے شایان شان سلوک کرے گا۔

حسین کاکا کی موت کے بعد یوسف آزاد تھا بلکہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ زمینداری کی دیکھ بھال، مال جائیداد کا تحفظ، تربوروں اور دشمنوں کی سازشوں اور شرارتوں کا سدباب، ان تمام الجھنوں نے یوسف کو بڑی حد تک سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے وہ کس طرح عہدہ برآہ ہو سکتا ہے۔ وہ ذہین تھا، عقلمند تھا، سارے قبیلے میں اس کی خوش اخلاقی ضرب المثل بن چکی تھی۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح آوارہ نہیں تھا اور نہ اسے آوارگی پسند تھی۔ وہ اُن کے ساتھ کھیل کود میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے ساتھی جب تفریح میں مصروف ہوتے تو یہ ان سے الگ تھلگ ایک طرف کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ یوسف کی اسی خلوت پسندی نے اسے یکہ یوسف مشہور کر دیا تھا یعنی تنہا رہنے والا یوسف۔ اس کم گوئی نے اگرچہ یوسف کو ایک حد تک مضمحل بنا دیا، لیکن اس نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال لی۔ ایکا ایکی اسے شکار سے دلچسپی ہوگئی۔ دُور دُور سے جو لوگ بھی کڑہ مار کو شکار کے لئے آتے اور یوسف کے حجرے میں شب بسر کر کے صبح شکار کو روانہ ہوتے یوسف بھی ان کے ساتھ ہوتا اس غرض کے لئے اس نے چست و چالاک کتے پالے۔ وہ کتوں کی بڑی خبر گیری کرتا۔ اس نے ان کے پاؤں کے لئے چاندی کے گھنگرو بنوائے، جب صبح ہوتی اور وہ کتوں کو ساتھ لے کر کڑہ مار کی طرف جاتا تو گھنگروؤں کی آواز دُور دُور تک سنائی دیتی۔ لوگ سمجھ جاتے کہ یوسف شکار کو جا رہا ہے۔

یوسف کے گاؤں اور شکار گاہ میں تین میل کا فاصلہ تھا۔ راستے میں ایک گاؤں سکندر آباد پڑتا۔ ''شیر بانو'' اسی گاؤں کے ملک کی بیٹی تھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، کڑہ مار کے دامن میں بسنے والی ہزاروں لڑکیوں میں ایک۔ جب یوسف صبح کی ملگجی فضا میں شکار گاہ کی طرف جاتا اور کتوں کے نقرئی گھنگرو اپنی موسیقی چاروں طرف بکھیرتے تو لوگ دروازوں، منڈیروں، گلیوں اور حجروں میں کھڑے ہو کر ترلاندی والے حسین کاکا کے شمشاد قد بیٹے یوسف خان کو دیکھتے، اسے خوش آمدید کہتے۔ وہ ہر ایک کو سلام کرتا، ہاتھ ملاتا، خیریت پوچھتے شکار گاہ کی طرف چلا جاتا۔

ایک دن جب گھنگروؤں کی خوش آہنگی کو ہوا نے چاروں طرف بکھرا تو شیر بانو کے دل میں بھی یوسف کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور جب اس نے یوسف کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کے انگ انگ نے یوسف کو قبول کر لیا۔ اس کے دل میں ایک کسک سی پیدا ہوئی اس کا رواں رُواں تپے الاپنے لگا، اس کے دل کی شاداب وادی میں نئی آرزوئیں اور امنگیں ''اتن ناچ نا چنے لگیں۔ اس نے ایک دولت پائی تھی۔ لیکن اپنا آپ کھو چکی تھی۔ یوسف جا چکا تھا۔ ایک کوندا تھا جو لپکا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا غائب ہوگیا۔ وہ سدھ بدھ بسرائے بت کی طرح خاموش کھڑی یوسف کے قدموں کے نقوش میں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ نہ معلوم کب تک کھڑی رہی۔ اگر اس محویت کے طلسم کو اس کی ماں کی گرج دار آواز نہ توڑتی تو شاید وہیں کھڑی رہتی اور پھر اس کا معمول ہوگیا۔ ہر صبح وہ اٹھتی، گھنگروؤں سے اس کے دل کے رباب کے تار جھنجھنا اٹھتے، وہ یوسف کو دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتی، یوسف بے نیازانہ گزر جاتا۔ شیر بانو کے طرز روش پر اس کی ماں کا ماتھا ٹھنکا، اس نے اپنے شوہر سے شیر بانو کی محبت کا ذکر کیا۔

ایک دن جب دوپہر کی تپش اپنے شباب پر تھی، شیر بانو یوسف کے خیال میں محو چارپائی پر دراز چھت کی کڑیاں گن رہی تھی، پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پر افشاں کی طرح چمک رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا، وہ بے اختیار دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھولا تو ایک بھولی بھالی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی، اس کے خدوخال میں یوسف کے نقوش جھلکتے تھے۔

''کیا بات ہے بہن؟ تم کون ہو؟ آؤ بیٹھو'' شیر بانو نے نو دار لڑکی کا بڑے پیار سے استقبال کیا۔

''پیاسی ہوں بہن، پانی پلا دو''۔ خشک دہن لڑکی نے بڑی منت سے کہا اور شیر بانو دوڑ کر لسی کا بھرا ہوا پیالہ لے آئی۔ لڑکی کا حلق تر ہوا تو گویا زندگی اس کے چہرے پر نکھر آئی۔ اس نے ممنون آنکھوں سے شیر بانو کی طرف دیکھا اور رخصت چاہی۔ شیر بانو نے اسے بہ اصرار بٹھا لیا۔ اس نے اس لڑکی سے یوسف کی خوشبو سونگھی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کو یوسف کے ساتھ ضرور کچھ نسبت

ہے۔ ''بہن کہاں سے آرہی ہو۔ اتنی نڈھال کیوں ہو؟ شیر بانو نے کریدتے ہوئے پوچھا'' ۔تمہارا نام کیا ہے؟

''مجھے بندی کہتے ہیں۔ میرا بھائی یوسف ہر روز شکار کھیلنے کڑہ مار جاتا ہے۔ میں اسے دوپہر کا کھانا پہنچانے جایا کرتی ہوں، ابھی ابھی ادھر ہی سے آرہی ہوں۔ پیاسی تھی۔ مجبوراً تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا''۔

''کون یوسف، ترلاندی والے حسین کا کا کا بیٹا؟'' یہ کہتے ہوئے شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا۔

''ہاں بہن وہی'' بندی نے جواب دیا اور شیر بانو کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ ''بندی بہن، یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تھوڑی ستا لو۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے، چلی جانا اور ہاں یوسف خان کو جب بھی کھانا دے کر لوٹو یہاں گھڑی دو گھڑی دم لے لیا کرو۔ خوش قسمت ہو بندی بہن جو یوسف جیسا بھائی رکھتی ہو''۔ اور باتوں ہی باتوں میں شیر بانو نے بندی سے یوسف کے متعلق بہت کچھ پوچھ لیا۔

شیر بانو بڑی خوش تھی، اس نے گھر بیٹھے محبوب کو پالیا تھا۔ بندی ہر دوپہر کو آتی اور شیر بانو اس سے یوسف کے متعلق ہی پوچھتی رہتی۔ جب یوسف کا ذکر ہوتا شیر بانو مسکراتی، اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ ذکر حبیب سے اس کے چہرے پر بہار کھل جاتی۔

بندی کی زبانی جب پہلے پہل یوسف نے شیر بانو کی محبت اور اس کی والہانہ پرستش کا قصہ سنا، تو اس کے دل میں بھی میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی۔ اسے پہلی بار اپنے روزمرہ کے اشغال میں کوئی داخل ہوتا محسوس ہوا۔ دوسرے دن جب شکار سے واپسی پر یوسف کی بے چین نگاہوں نے گاؤں کے ذرے ذرے کا جائزہ لیا تو یکبارگی اس کی نظر ایک موڑ پر جا کر رُک گئی۔ پُرشوق آنکھوں نے اس کا استقبال کیا، ہنستے ہوئے چہرہ نے اسے خوش آمدید کہی اور اس کی باز جیسی چمکتی اور کٹیلی نگاہوں کی مہمانی کسی نے اپنے دل وجگر سے کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت کے پیغام دیئے، عہد و پیمان کی گرہیں پڑیں۔ یہ میٹھی میٹھی آنچ دونوں طرف سلگنے لگی۔ محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں، اب یوسف صرف شکاری ہی نہیں شکار بھی تھا۔

ایک صبح حسب معمول یوسف کڑہ مار شکار کو گیا۔ سکندر آباد میں وہ دونوں بے چین نگاہوں نے سر راہے ایک دوسرے کو سلام کیا۔

یوسف مار میں پہنچ کر اپنے روزمرہ کے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ وہ بظاہر شکار میں مصروف کڑہ مار کی جھاڑیوں اور چٹانوں میں محو تک و دو تھا لیکن اس کا دل محبوب کے خیال میں محو تھا۔ گویا وہ چٹانوں، پتھروں اور کنگروں کے آس پاس شیر بانو کو تلاش کر رہا تھا۔ ہر پتھر پر اس فرہاد کو اپنی شیریں کی تصویر نظر آتی اور ایک لمحے کے لئے تو وہ اسے سچ مچ شیر بانو ہی سمجھ لیتا، اس کی طرف لپکتا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہوتا کہ یہ خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی اُدھیڑ بن میں اس کا پاؤں ایک چٹان سے پھسلا اور کڑہ مار کے آسمان بوس کنگر سے وہ ایک ایسی کھائی کی طرف تیزی سے گرنے لگا جس کی تہ میں موت اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن فضا میں کوئی چیز بھی اسے گرنے سے نہ روک سکی۔ آخر پتھروں کے سینے کو چیرتے ہوئے ایک درخت نے اسے سہارا دیا۔ اس نے بڑی مستعدی سے اس کی شاخ کو پکڑ لیا، وہ ہوا میں معلق تھا۔ اگر شاخ کو چھوڑ دے تو نیچے بھانک کھائی منہ کھولے اس کی منتظر تھی اور نہ چھوڑے تو کب تک لٹکا رہے۔

مشرق کا کیمیا گر مغرب میں بیٹھ کر سونا بنانے لگا، افق کے کنارے طلائی ہو گئے اور در و دیوار پر گندھک ایسے سائے پھیل گئے، تو شیر بانو یوسف کے انتظار میں زلیخا کی طرح چشم براہ ہو گئی۔ آج وقت جا رہا تھا، لیکن یوسف کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اتنے مین دور گھنگروؤں کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھولنا شروع کیا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا، یوسف آ گیا، لیکن یوسف کہاں تھا؟ البتہ اس کے کتے بڑی پریشان حالت میں گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ آج ان کی آواز میں فریاد تھی۔ شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا۔ ''خدا خیر کرے! یا اللہ میرے یوسف کی خیر ہو!'' اندھیرا چاروں طرف مسلط ہو گیا۔ شیر بانو نے رات جیسے انگاروں پر لوٹتے لوٹتے کاٹی۔ تمام رات یوسف کے کتے بڑی بھیانک آوازوں سے بھونکتے ہوئے آتے جاتے۔ شیر بانو سمجھ گئی کہ یوسف پر ضرور کوئی افتاد پڑی ہے۔

صبح کے سفید و براق پرندے نے ابھی اپنے اجلے اجلے پروں کو پوری طرح کھولا بھی نہیں تھا، فضا ابھی ملگجی ہی تھی کہ شیر بانو کے کان میں پھر کتوں کی آواز آئی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کوٹھے پر آئی کتوں کے پیچھے پیچھے بندی اور اس کی ماں ہانپتی کانپتی جا رہی تھی۔ شیر بانو کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹا جا رہا تھا۔ اس کی رگ رگ میں الاؤ دہک رہے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے ہو لی۔

یوسف کو کڑہ مار کے کنویں میں لٹکتا دیکھ کر ماں نے سینہ پیٹ لیا۔ بہن نے سر کے بال نوچ لئے اور شیر بانو تو جیسے بے روح مورتی تھی۔ یوسف لٹک رہا تھا، اس کی زندگی اور موت کے درمیان درخت کی صرف ایک شاخ حائل تھی۔ ''اگر یہ درخت بھی نہ ہوتا!'' شیر بانو نے سوچا ''تو میرا یوسف موت کے بھیڑیئے کے جنگل میں ہوتا اور موت کا بھیڑیا کسی پر رحم نہیں کرتا''۔ اس خیال کے آتے ہی جیسے اس کے بدن سے کسی نے خون نچوڑ لیا، اس کا انار جیسا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ یوسف نے ماں سے گلہ کیا، ''ماں تمہاری ممتا کو کیا ہو گیا تھا۔ اسے میری تکلیف کا احساس کیوں نہ ہوا؟''

''بیٹے میں نے تمام رات آنکھوں میں گزاری''۔ ماں نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ ''اچھا تو بتاؤ ماں گزشتہ رات کتنی دفعہ بادل گھر کر آئے؟ لیکن یوسف کو ماں کے جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ اس نے دوبارہ سوال کیا، لیکن اسے ماں کے جواب میں حقیقت کا سونا دمکتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ اس کی ناکام آنکھوں نے اپنی معصوم بہن سے پوچھا اور جب وہاں سے بھی اسے مایوسی ہوئی تو اس کی مایوس آنکھیں شیر بانو سے چار ہوئیں جہاں ں خلوص اور محبت کے علاوہ شب فراق کی کلفتوں کے بے شمار افسانے بھی تھے۔ اس کے آنسوؤں میں ہجر و فراق کی کلفتوں اور صعوبتوں کے دریا بند تھے۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ شیر بانو کے مرمریں ہاتھوں نے اپنے سر کی چادر یوسف کی طرف پھینکی۔ ماں کی ممتا، بہن کے خلوص اور عشق و محبت کی کشش نے مل کر یوسف کو نئی زندگی عطا کی۔

محبت ذرے سے آفتاب اور قطرے سے سمندر بن چکی تھی۔ آخر وہ دن آیا کہ یوسف کی ماں شیر بانو کا رشتہ مانگنے گئی۔ ترلاندی کے بڑے ملک حسین کا کا کے شمشاد قد بیٹے اور اکلوتے وارث یوسف کے رشتے کو بھلا کون ٹال سکتا تھا؟ شیر بانو بھی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، والدین نے سوچا جوڑا موزوں ہے لیکن تقدیر کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اسے دونوں کا خلوص اور محبت ابھی گوارا نہ تھا۔ شیر بانو کے چچیرے بھائی اس رشتے کے مخالف تھے۔ وہ شیر بانو پر خود قبضے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں ں نے چچا سے کہا: ''کہ اشیر بانو یوسف زئیوں کی ناک ہے اور قبیلے کی ننگ و ناموس۔ یہ ہمارے قبیلے کی تمام عورتوں کے سر کا قیمتی دوپٹہ ہے جسے ہم معمولی قیمت پر نہیں دیں گے اور قبیلے کی رسم کے مطابق شیر بانو کی قیمت طلب کی گئی تو وہ یوسف کے مال و ملک سے کہیں زیادہ تھی۔''

عشق و محبت کے سوز سے نابلد لوگوں کی ذہنیت پر یوسف اور شیر بانو کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی، لیکن صدیوں کی قومی روایات اور قبیلے کی مقدس رسوم کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہی بنی۔ حُسن و عشق کے درمیان قبیلے والوں نے سونے کی دیوار کھڑی کی دی تھی۔ پیار بھرے دو دلوں میں مال و زر کی ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی تھی جسے مال و زر ہی پاٹ سکتے تھے۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے یوسف کو کمر ہمت باندھنا پڑی، وہ ماں کی کوکھ کو جلتا، بہن کی محبت کو سلگتا اور شیر بانو کی امنگوں کو سسکتا ہوا چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

اکبر اعظم کی فوج دریا موج میں یوسف نے تھوڑے ہی دنوں میں بڑا نام پیدا کر لیا اسے سپاہی سے افسر بنتے دیر نہ لگی۔ چند دنوں میں اس نے ترقی کر لی۔ یوسف کی ماں اور بہن، ناز و نعم کی پلی بہن اس کے چلے جانے پر بے کسی کی زندگی گزارنے لگی۔ تر بوروں نے شکر کیا کہ یوسف چلا گیا وہ سمجھے اب وہ واپس کہاں آئے گا۔ چند دنوں بعد انہوں نے مشہور کر دیا کہ یوسف مارا گیا اور اس طرح ساری جائیداد پر خود قبضہ کر کے ماں بیٹی کو گھر سے نکال دیا۔ شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرنے والی ماں اور بیٹی لوگوں کی خدمت کر کے زندگی کے دن گزارنے لگیں۔

شیر بانو زخمی کونپل کی طرح ہجر و فراق کے لمحات تڑپ تڑپ کر گزارنے لگی اور جب اس کا باپ مر گیا تو اس کے رہے سہے حواس بھی کھو گئے۔ اب تو اس کا وسیع اور عریض گاؤں، اس کے ہرے بھرے کھیت اس کے لئے قفس کی طرح تھے۔ اب وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ظلم و جور کا شکار تھی۔ شیر بانو کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ اس کے چچازاد بھائیوں کی نیت میں فتور ہے۔ وہ اسے کٹے پرندے کی طرح ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس پر ہر ممکن ظلم کریں گے یہاں تک کہ اس کی شادی بھی کسی اور کے ساتھ کر دیں گے۔ وہ کانپ اٹھی اور اپنے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ اس کا ہاتھ اگر کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیا گیا تو وہ زہر کھا لے گی۔

اور پھر وہ منحوس گھڑی بہت جلد آ گئی جس میں ڈھولک سُرنا نے شیر بانو کی شادی کا اعلان کر دیا۔ شیر بانو پر غم و الم کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح بندی کو بلوا بھیجا۔ بندی بہن، اس بھری دنیا میں میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔ بہن اگر تو مجھے تھوڑا اس از ہر لا دے تو بڑا احسان ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ یوسف کے علاوہ کسی اور کے گھر جاؤں۔ وہ کہے گا شیر بانو بے وفا نکلی۔ یہ لے میرا سونے کا پیزوان، اسے بیچ ڈال تا کہ میری پاک محبت پر حرف نہ آئے۔ بہن جلدی اثر کرنے والا زہر لانا''۔

''شیر بانو بہن، تو نے تو میری مشکل بھی حل کر دی۔ زہر میں مجھے بھی شریک کرنا، اب تو میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی، میرا شہزادہ بھائی یوسف نہیں ہے، تو میں اب کیا کروں''۔ اور بندی دوسرے دن زہر لانے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

نقارے بج رہے تھے، ڈھول سُرنا کی مدھم دھاڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک طرف چولھوں پر بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور بندی اُن دیگوں کے لئے پانی ڈھونڈ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور لب پر یوسف کا نام۔ وہ بھائی سے شکایت کر رہی تھی کہ وہ ایسا گیا کہ اپنی بہن کی خبر تک نہ لی۔ اسی محویت میں ایک گھڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا، گھڑا ٹوٹ گیا۔ باورچی نے اس حرکت پر اسے گھرکا۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز تو تھا ہی، بے اختیار چھلک پڑا۔ وہ ایک طرف جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔۔۔ ''اے بھائی، اے میرے یوسف بھائی! اے گاؤں کے سردار بھائی'' دیکھ تیری ناز و نعم کی پالی بہن کو کیا کیا دکھ جھیلنے پڑ

غاروں میں ساتھیوں کے ساتھ جشن مناتا لیکن اس عرصے میں اس کے دل میں جو چیز کانٹا بن کر کھٹکتی رہی وہ شہی کی یاد تھی۔ یہ خلش اسے ہر وقت ستاتی۔ شہی کو اپنانے کی اسے کوئی صورت نظر نہ آتی۔ اس نے چاہا کہ وہ اسے اغوا کر لائے لیکن اس نے اپنے بازوؤں میں وہ قوت نہ پائی جس سے مندڑوں کا مقابلہ کر سکے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ضبط کا یارانہ رہا تو ایک دن خود بخود مستجاب خان کے حجرے میں داخل ہوا۔ اسے مہمان سمجھ کر خوش آمدید کہا گیا۔ خان نے اسے چارپائی پر اپنے برابر جگہ دی اور نوکر سے کہا مہمان کے لئے تکیہ لاؤ اور لسی کا ایک کٹورا بھی۔

''مہمان تم کہاں سے آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہم تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں''۔ ''میں صرف آپ کے سلام کے لئے آیا ہوں، مجھے تورلئی کہتے ہیں''۔ تورلئی نے جواب دیا۔

''تورلئی! مستجاب خان ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تلوار نیام سے نکال لی۔ ڈاکو، چور، خونی بتاؤ کس نیت سے یہاں آئے ہو؟ اگر تم میرے حجرے میں نہ ہوتے تو تمہیں میری تلوار سے دنیا کی کوئی طاقت نہ بچا سکتی''۔

''میں ڈاکو ہوں۔ ملک بابا لیکن یہاں ڈاکو کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مظلوم فریادی بن کر آیا ہوں''۔

مستجاب خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تلوار نیام میں چلی گئی، وہ مطمئن ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم مظلوم کی ہر مدد کرنے کو تیار ہیں چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو''

''خان بابا یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ڈاکو زنی میرا پیشہ نہیں، مجھے حالات نے ایسا بننے پر مجبور کر دیا۔ منور نے جرگے والوں کو ورغلا کر مجھے گاؤں سے نکلوا دیا، میری زمین پر خود قابض ہو گیا اور مجھے ڈاکو بننے پر مجبور ہونا پڑا''۔

''اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو تم پر واقعی بڑا ظلم ہوا ہے، میں تو آج تک اندھیرے میں تھا، مجھ سے تو کچھ اور ہی کہا جاتا رہا۔ تورلئی مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمہاری ہر مدد کرنے کو تیار ہوں''۔

''خان بابا! میرا آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اگر آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیں تو میں عمر بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا''۔

خان اس پر چونک اٹھا اور بولا ہوش کی دوا کرو تورلئی۔ یوسف زئی اور منڈر کا رشتہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں قبیلے کا سردار ایسی حرکت کروں تو جرگے کو کیا جواب دوں گا''۔

''لیکن خان بابا میں تو آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں، آپ کی دولت آپ ہی کے گھر رہے گی''۔

یہ سن کر مستجاب خان ایک گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ ایک طرف نوجوان بہادر تورلئی تھا جس سے بہتر رشتہ اسے یقیناً اپنی اکلوتی بیٹی شہی کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ دوسری طرف قبیلے کی عزت، جرگے کا خوف، عداوت، پختو، ایسی چیزیں تھیں جس کی وجہ سے یہ رشتہ ناممکن سی بات تھی اور جب ملازم لسی کا کٹورہ لے کر آیا تو مستجاب خان نے چونک کر کہا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے تورلئی۔ تم میرے مہمان ہو، میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا خواہ اسکے لئے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے یا بڑی سے بڑی مشکل کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے''۔

تورلئی نے اٹھ کر مستجاب خان کے گھٹنے چھوئے اور ڈاکا زنی سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر کے خان کے پاس رہنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے دل کی مراد بر آئی۔ اپنی محبوبہ کے انگارہ ایسے رخسار اور پھول جیسے شبرنگ گیسوؤں کے ٹھنڈے سائے پا کر وہ زمانے کا کا سرد و گرم بھول چکا تھا۔

منور کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے سوچا تورلئی کا مستجاب خان کی لڑکی سے رشتہ طے پا گیا تو وہ بڑی طاقت پکڑ جائے گا اور اسکے لئے مستقل خطرہ بن جائے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ ابھی اور اسی وقت اس کا سر کچل دیا جائے۔ چنانچہ وہ موقع کی تلاش میں رہا اور ایک دن جنگل میں اکیلا پا کر اپنے ساتھیوں سمیت جا کر اسے گھیر لیا۔ اکیلا تورلئی کس کس کا مقابلہ کرتا۔ قریب تھا کہ منور کی تلوار اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی کہ مستجاب خان اطلاع پا کر اپنے آدمیوں سمیت آ پہنچا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد منور کو بھاگنا پڑا۔

شہی، تورلئی کی محبت کا زخم میدان جنگ سے لے کر آئی تھی اور اب تک اسے ایک مقدس امانت کی طرح اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ تورلئی کو بے حد چاہتی تھی، وہ جب بھی اسے دیکھتی اس کے جذبات میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہو جاتی، اس کی نس نس میں رباب کی طرح ٹپے الاپنے لگتی، اس کا رواں رواں گیت گانے لگتا لیکن اس بے پناہ محبت کے باوجود ایک بات اسے گھن کی طرح کھا رہی تھی اور وہ یہ کہ تورلئی ڈاکو رہ چکا تھا۔ اپنے بیگانوں کے بعنوں کے خیال سے اس کا دل کانپ جاتا اور اسے تورلئی سے نفرت ہونے لگتی۔ پھر وہ سوچتی کہ اس کی شادی ہو گئی تو قبیلے کی عورتیں اس پر آوازیں کسیں گی، اس پر انگلیاں اٹھائیں گی اور اسے جینا دوبھر ہو جائے گا۔ کہاں یوسف زئی ڈاکو اور کہاں منڈروں کی شہزادی۔۔ سوچتے

سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا، وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی یہاں تک کہ وہ اپنی جان سے بیزار نظر آنے لگی۔

آخر ایک دن اس نے فیصلہ کن انداز میں ماں سے کہا ''ماں میں تور دلئی سے شادی نہیں کروں گی''۔ ماں نے اٹھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بدتمیز لڑکی، تجھے شرم نہیں آتی، یہ آج تو کیسی بہکی باتیں کرنے لگی ہے''۔

''ماں وہ چور ہے، ڈاکو ہے، خونی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یوسف زئی ہے۔ ہمارے قبیلہ کا دشمن۔ ماں ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے''۔

''خاموش۔ اپنے منگیتر کے خلاف زبان کھولتے تجھے حیا نہیں آئی؟ کیا اپنے باپ کے شملے کو خاک میں ملانا چاہتی ہے؟ خبردار جو آئندہ تیرے منہ سے ایسی بات نکلی کہیں باپ نے سن لیا تو تیری زبان کھینچ لے گا۔ مستجاب خان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات ہر قیمت پر پوری ہو کر رہتی ہے۔ تور دلئی یوسف زئی سہی لیکن اب وہ ہمارا ہو چکا ہے۔ اور پھر منڈروں اور یوسف زئیوں میں ایسا فرق بھی کیا ہے، دونوں چچازاد بھائی ہی تو ہیں۔ یہ تو تربور دلی کا برا ہو جس نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے۔ بیٹی وہ ڈاکو نہیں اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ اس کی جائیداد ہے، زمین ہے، خاندان ہے، اپنے پرائے ہیں۔ یہ تو دشمنوں نے اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا اور اب تم دیکھتی ہو وہ سب بُرے کام چھوڑ کر کتنا نیک بن چکا ہے''۔

''تور دلئی جو دروازے کی اوٹ سے ماں بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا یکایک اندر آ گیا اور کہنے لگا، ''شہی میں ڈاکو نہیں، میں نے جس دن سے مستجاب خان کے حجرے میں قدم رکھا ہے، اسی دن سے سب برے کام چھوڑ دیئے ہیں۔ میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اپنا خاندان اور قبیلہ بھی چھوڑ دیا ہے۔

شہی کے چہرے کو شرم و حیا کے سرخ آنچل نے ڈھانپ لیا، اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا اور مارے ندامت کے عرق عرق ہو گئی۔

''تور دلئی مبارک ہو تمہیں! دشمن اپنی موت آپ مر گیا''۔ مستجاب خان نے مکان میں داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

''کون دشمن بابا'' تور دلئی نے حیرت سے پوچھا۔

''منور اور کون''

''وہ کیسے بابا؟''

''ہاشم خبر لایا ہے کہ منور نے شہنشاہ اکبر کی فوج میں نوکری کر لی ہے اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے''۔

''خوب خوب! کمبخت نے کانٹے بوئے تھے، جو کیسے کاٹ سکتا تھا۔ مجھے اپنے گھر بار اور کھیت کھلیان سے نکالا، خدا نے اسے بھی پردیس کے جہنم میں دھکیلا۔ اب پرائی چاکری کرے، در در کی ٹھوکریں کھائے گا تو قدر عافیت معلوم ہو گی اسے''۔

تور دلئی نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔

''بیٹا اگر وہ سچ مچ گاؤں چھوڑ گیا ہے تو تمہاری شادی میں کوئی دیر نہیں، میں نے تمام انتظام مکمل کر رکھا ہے''۔

دوسرے دن منور کے بھرتی ہونے کی تصدیق ہوتے ہی تور دلئی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ منڈروں کے سردار کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔ ہر گھر میں مسرت کے شادیانے بجنے لگے، ہر آنگن میں ''اتن ناچ'' کے رومانی دائرے سبز، سرخ، اودے اور سرمئی آنچلوں کو توس قزح بنا رہے تھے۔ حجروں میں منڈروں کے شمشاد قد جوان گھڑے کے ساز پر ٹپے گا رہے تھے، رباب کی دھنوں کی زبان سے محبت کی داستان سرائی ہو رہی تھی۔ ڈھولک سُرنا کی جوشیلی تانوں پر بلبلہ اور شاڈولا ناچ ناچا جا رہا تھا۔ غرض منڈروں کی سرزمین کے چپے چپے پر یوں خوشیاں منائی جا رہی تھیں جیسے عید کا چاند نکل آیا ہو۔

شہی کے دل میں محبت کی دھڑکنیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں جب اسے خیال آتا کہ وہ آج کل میں تور دلئی کی ہو جائے گی اور پھر وہ دونوں اپنی دنیا کے راجہ رانی ہوں گے تو اس کا چہرہ ایک نشیلی اور لذیذ گرمی محسوس کرتا اور پسینے کے قطرے اس کی چاند جیسی پیشانی سے پھوٹ کر ستواں ناک پر آ جاتے اور پھر سونے کے چمکتے ہوئے پیزوان میں آ کر موتی کی طرح اتر جاتے۔

''کیا سوچ رہی ہو شہی؟'' تور دلئی کی آواز سے شہی چونک کر جھینپ سی گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کو سر پر کھینچ لیا جو ڈھلک کر اس کے شانوں پر آ گرا تھا۔

''کوئی بات نہیں بس یونہی بیٹھی ہوں۔ لیکن تم آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ بات کیا ہے؟''

''خوشی کا آج کیا ٹھکانا ہے شہتی۔ ایک تو تربور اپنی ہار مان کر بھاگ گیا، دوسرے مجھے میرے خوابوں کی وہ ملکہ ملنے والی ہے جس نے برسوں سے میری نیند حرام کر رکھی تھی۔ شہی تم کیا جانو کہ تمہیں پانے کے تصور سے میرے دل کی کیا کیفیت ہے، یہ چند گھڑیاں میرے لئے پہاڑ بن گئی ہیں''۔

''درست ہے میرے لٹیرے محبوب! تمہاری خوشی بجا ہے لیکن میں بھی تھی کہ تم جو اتنے زیادہ خوش ہو تو شاید میرے لئے شہنشاہ اکبر کی رانی کا ست لڑا ہار لے آئے ہو''۔ شہی نے حسب عادت طنز کا ایک زہریلا تیر پھینکا۔

شہی کے اس طنز نے تور دلئی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی رگ رگ میں سوئی

ہوئی یوسف زئی غیرت اور پت ایک دم جاگ اٹھی، اس کا دماغ ہنڈولے کی طرح گھومنے لگا، اس نے دیکھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے محل میں کھڑا ہے، سامنے تخت پر ملکہ بیٹھی ہے، اچانک وہ جھپٹ کر تخت پر چڑھ گیا اور ایک ہی جھٹکے میں ست لڑا ہار ملکہ کے گلے سے چھین کر لے آیا۔

''تم سوچ میں پڑ گئے۔ خیر کوئی بات نہیں، آج نہ سہی کل لے آنا ہار، اتنی جلدی بھی کیا ہے'' شہی شرارت آمیز چٹکی لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''منڈڑوں کی ملکہ تو واقعی ست لڑے ہار کے قابل ہے۔ اب میں نے عزم کر لیا ہے کہ تیری فرمائش پوری کر کے ہی دم لوں گا، اگر اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکتا تو مجھے معاف کر دینا۔ میری شہی۔ خدا حافظ۔''

شہی جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی۔ اپنے چونچلوں کا یہ خوفناک نتیجہ دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی۔۔۔ ''میرے سرتاج، میرے سرتاج! مجھے ست لڑا ہار نہیں چاہیے۔ واپس آ جاؤ، خدا کے لئے واپس آ جاؤ، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں''۔۔۔ وہ بے اختیار ہو کر پاگلوں کی طرح چلانے لگی۔ لیکن آہ تور دلئی جا چکا تھا!

شہی کے حسین خوابوں کی مالا ٹوٹ گئی اور اس کا دانہ دانہ بکھر گیا۔ منڈڑوں کی بستی میں قہقہوں ں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ رباب کے تار شل ہو گئے۔ گھنگروؤں کے چھناکوں نے دم توڑ دیا، مستجاب خان کا ہنستا بولتا چہرہ اداسیوں میں ڈوب گیا۔ ''کیا کر دیا تو نے؟ شہی یہ کیا کر دیا؟ بیوقوف لڑکی تو نے اپنے ہاتھوں سے اپنا سہاگ اجاڑ دیا۔ باپ کی کمر توڑ دی۔ قبیلے کی ناک کاٹ دی۔ آہ۔ آہ۔ مستجاب خان غش کھا کر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔

شہی۔۔۔ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح اکیلی پڑی کرلا رہی تھی۔ وہ فراق کی آگ میں بھننے لگی۔ تور دلئی سچ مچ کا لٹیرا نکلا، اس کے اطمینان کی دولت غارت کر کے چل دیا۔ اسے ایک پل بھی آرام نہیں تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے تور دلئی کے خیال میں مگن رہتی، وہ اس کے خوابوں میں بس گیا تھا۔ وہ دیکھتی کہ تور دلئی دشمن کی فوج میں گھر گیا ہے اور وہ اس پر تلواروں اور تیروں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ تور دلئی اکبر بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ چیخ مار کر جاگ اٹھی۔ ماں نے تسلی دی ''تور دلئی بڑا بہادر ہے، اسے بڑی سے بڑی فوج بھی نہیں پکڑ سکتی۔ گھبراؤ نہیں وہ جلدی لوٹ آئے گا''۔

ایک رات جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، آسمان سے تاریکیوں کے قافلے اتر رہے تھے، منڈروں کی ساری بستی نیند کے جزیرے میں اتر چکی تھی۔ شہی بدستور اپنے محبوب کے خیال میں کروٹیں لے لے کر صبح کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ شہی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خدا خیر کرے اتنی رات گئے کون آیا ہے۔ کہیں میرا تور دلئی نہ ہو۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ مستجاب خان نے دروازہ کھولا۔۔ ''بھگوان داس! اس وقت تم کہاں خیر تو ہے۔ آؤ بیٹھو دوست، کہو کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا؟'' مستجاب خان نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دوست سے پوچھا جو اٹک کے قلعہ سے آیا تھا۔

''گھبراؤ نہیں خان'' بھگوان داس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہارا چہرہ تمہارے دل کا ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہے جو تم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ دوست جلدی کہو۔ خدا کے لئے دیر نہ کرو، میں بُری سے بُری خبر سننے کو تیار ہوں''۔

''خان تور دلئی کو شہنشاہ کے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟ کیا کیا تھا اس نے؟''

وہ شاہی محل میں نقب لگا رہا تھا۔ شہنشاہ نے اسے موت کی سزا دے دی۔

بھگوان داس نے دھڑکتے ہوئے دل اور آبدیدہ آنکھوں سے یہ بات کہی۔ شہی اسے سنتے ہی چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ گھر میں واویلا مچ گیا۔ بھگوان داس نے پوچھا یہ شور کیسا ہے اور چیخ کس کی تھی؟

''بدنصیب شہی کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ تور دلئی کی منگیتر ہے۔ کاش یہ اسے ست لڑے ہار کا طعنہ نہ دیتی! شکستہ دل مستجاب خان نے دل تھام کر بمشکل یہ فقرے ادا کئے۔

''شہی میری بھتیجی''۔۔ بھگوان یہ کہہ کر اٹھا اور دوڑ کر شہی کے پاس پہنچا اور اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولا ''پتری گھبراؤ نہیں، بھگوان داس اپنی بیٹی کے لئے پہاڑ سے بھی ٹکر لے گا''۔

شہی نے آنکھیں کھولیں۔ ''بھگوان کاکا مجھے تور دلئی کا پاس لے چلو''۔

''بیٹی تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔ میں خود ہی سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تور دلئی کو تمہارے پاس نہ پہنچا دوں''۔ والدین نے بہت سمجھایا لیکن شہی نہیں مانی اور مچل گئی کہ میں ضرور جاؤں گی اور جب صبح ہوئی تو بھگوان داس، شہی اور مستجاد خان تینوں نے رخت سفر باندھ لیا لیکن بھگوان نے مستجاب کو ساتھ جانے سے روک دیا اور خود شہی کو لے کر روانہ

ہو گیا۔

اٹک کا خونخوار دریا پار کر کے دونوں شہنشاہ اکبر کے فولادی قلعہ میں پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ کل تو ردلئی کو زمین میں گاڑ کر اس پر خونخوار کتے چھوڑے جائیں گے۔

یہ سنتے ہی شہی کا سر چکرانے لگا، قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے۔ لیکن بھگوان داس نے اسے سنبھالا دیا۔ ''بیٹی تمہارے سینے میں پٹھان عورت کا دل ہے۔ تم مستجاب خان کی بیٹی اور منڈر قبیلے کی شہزادی ہو تمہیں دلیری کے ساتھ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ بدحواس ہونے سے ہم تو ردلئی کی زندگی نہیں بچا سکیں گے، اس کے لئے کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی''۔

بھگوان داس کے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی، وہ شاہی کتوں کے نگہبان کے پاس پہنچا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''اکبر اعظم کے حکم کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں۔ بھگوان ہوش کی باتیں کرو''۔ اس جواب سے بھگوان کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ گھر جا کر اپنی بہو کے کنگن لایا اور کتوں کے نگہبان کے آگے ڈال دیئے۔

اگلے دن جب تو ردلئی پر خونخوار کتے چھوڑے گئے تو وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکے لیکن قریب پہنچ کر اسے سونگھنے لگے اور سونگھ کر واپس چلے گئے۔

تماشائی حیران تھے۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ خبر سن کر اکبر کو بھی بڑا تعجب ہوا اور اس نے غصے میں آ کر حکم دیا کہ شاہی فیل خانے کے مست ہاتھی سے مجرم کو کچلوا دیا جائے۔ اس نئے حکم نے بھگوان کا خون بھی خشک کر دیا لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی، وہ شاہی مہاوت کے پاس پہنچا لیکن وہ نہایت سرد مہری سے پیش آیا۔ بھگوان مغموم ہو کر گھر آیا اور اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہا۔ لیکن اس کی بہو بولی ''بابا شہی کے لئے ہم سب کچھ کریں گے۔ مہاوت کی بیٹی میری منہ بولی بہن ہے۔ میں ابھی جا کر اس سے کہتی ہوں کہ اپنے ابا سے کہہ کر تو ردلئی کو بچا لے''۔

شہر میں ڈونڈی پٹ گئی۔ لوگ جوق در جوق میدان میں جمع ہونے لگے۔

''کتوں سے تو بچ گیا لیکن ہاتھی بڑا ظالم ہے، یہ نہیں چھوڑے گا بچارے کو۔۔۔''

اتنے میں ایک مست و خونخوار ہاتھی چنگھاڑتا، کف اڑاتا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ لوگ سہم گئے۔ سب کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ فیل مست نے تو ردلئی کے پاس آ کر اپنا خوفناک پاؤں اٹھایا، لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ہاتھی نے پاؤں زمین پر مارا، زمین دہل گئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ تو ردلئی کا نام و نشان تک نہ رہا ہوگا۔ لیکن وہ زندہ سلامت موجود تھا۔ لوگوں نے کہا یہ شخص ضرور کوئی جادو گر ہے۔ شہنشاہ نے سنا تو برہم ہو کر کہا اسے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ تو ردلئی کا تربور، منور شہنشاہ کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔

شہنشاہ نے تو ردلئی پر غضب آلود نگاہ ڈالی اور منور سے مخاطب ہو کر کہا ''کیا یہی وہ باغی ہے جس نے مابدولت کے مقابلے میں منڈروں کی مدد کی اور تمہارے گاؤں پر ڈاکے ڈالے؟''

منور نے کہا ''جی حضور''۔۔۔ پھر شہنشاہ نے تو ردلئی سے کہا۔۔ ''اے بدبخت تو نے شہنشاہ ہند کی حرم سرا میں داخل ہونے کی کیسے جرات کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ جرات کتنی مہنگی پڑے گی؟'' شاہ کی گرجدار آواز گونج رہی تھی۔ دربار پر مہیب سناٹا طاری تھا۔

''رحم، رحم، رحم، ان داتا!۔۔۔ دور سے بھگوان'' شہی اور لتا کی آوازیں جنہیں چوبدار نے اندر آنے سے روک دیا تھا۔ ''فریادیوں کو حاضر کیا جائے'' ان داتا نے حکم دیا۔

''ان داتا تو ردلئی کی جان بخشی کی جائے ورنہ اس دوشیزہ کا سہاگ لٹ جائے گا''۔ بھگوان نے ہاتھ جوڑ کے التجا کی۔ ''ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اس نے ہمارے ناموس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی، اس نے حرم میں داخل ہونے کی گستاخی کی، اس کی سزا اسے ملنی چاہیے'' شہنشاہ نے گویا اپنا آخری حکم سنایا۔

''بھائی منور۔۔۔ تو ردلئی تمہارا چچا زاد ہے۔ وہ تمہارا اور تم اس کے وارث ہو، شہنشاہ تمہاری بات مانتا ہے، اپنے بھائی کی جان بخشی کرا دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں''۔ شہی نے منور کے سامنے اپنا دامن پھیلاتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحہ منور شاہ کی خدمت میں کورنش بجا لایا اور زمین بوس ہو کر تو ردلئی کی جان بخشی چاہی۔ ''تعجب ہے کہ تم اپنے دشمن کی جان بچانا چاہتے ہو''۔

''ان داتا بجا فرماتے ہیں لیکن اس کی اور میری دشمنی قبائلی دشمنی ہے جو اپنے وطن تک محدود ہے، وہاں میری تلوار اس کا خون پینے کو بے قرار رہتی ہے لیکن یہاں یہ میرا مہمان ہے، اس لئے مجھے میرا قومی فرض مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کی جان بچاؤں''۔

''لیکن مابدولت کا حکم ناطق ہے۔ اس پر کوئی قلم بھی خط تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔ ہم تمہاری سفارش کو بے محل قرار دیتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ تمہیں ہی اپنے اس مہمان کا خون بہانا ہوگا''۔

''ان داتا۔۔۔ میرے خون میں ابھی غیرت و حمیت کے شرار موجود ہیں، پردیس میں میری تلوار اپنے بھائی کے خون سے رنگین نہیں ہو سکتی اور نہ میری موجودگی میں کوئی دوسرا اس کا خون بہا سکتا ہے۔۔۔ مہابلی مجھے اپنی اس گستاخی کا

انجام معلوم ہے لیکن میں مجبور ہوں کیونکہ یہ میرے قومی وقار کا سوال ہے۔ میں آخری مرتبہ درخواست کرتا ہوں کہ تور دلئی کو چھوڑ دیا جائے اور جس جرم میں اسے قتل کی سزا دی گئی ہے وہ ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو عنایت کیا جائے، اس کے عوض میرا سر حاضر ہے"۔

منور نے شاہی رعب وجلال کی آخری حدوں کو چھولیا تھا۔

"تمہاری یہ جرات قابل مذمت ہوتے ہوئے بھی مابدولت کو پسند آئی، اس لئے ہم حکم دیتے ہیں کہ تور دلئی کو رہا کر دیا جائے اور ملکہ کا ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو پہنا دیا جائے۔"

شہی اور تور دلئی نے منور کے پاؤں پکڑ لئے، "منور بھائی یہ تو نے کیا کیا؟ ہم قبیلے کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

منور نے دونوں کو گلے لگا لیا۔ "شہی بہن تیرا سہاگ تجھے مبارک ہو، شکر ہے اللہ نے مجھے تمہارے سامنے سرخرو کیا۔ تور دلئی بھائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر بڑے ظلم کئے۔ میرا خون اگر میرے گناہوں کا کفارہ ہو سکے تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔ اُمید ہے اب تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی کدورت نہ ہو گی"۔

بھگوان اور لتا نے اپنے مہمان کو آنسوؤں کے ہجوم میں الوداع کہی۔ کشتی اٹک کی تند و تیز موجوں پر بہے جا رہی تھی۔ خیر آباد پہنچ کر وہ کشتی سے اترے اور پیدل چل پڑے۔ محبت کے ان پروانوں کو اکوڑے کے قریب ایک جنگل میں رات بسر کرنی پڑی۔ نصف شب کے قریب شہی کو پیاس محسوس ہوئی۔ سنسان جنگل کی وحشت ناک ویرانی، گھپ اندھیرا اور پانی کی تلاش۔ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے ایک طرف پہاڑی کے دامن میں خانہ بدوش کوچیوں کے خیمے نظر آئے۔ تور دلئی نے اس طرف کا رخ کیا۔ خیموں کے قریب پہنچا تو کوچیوں کے خونخوار کتے بھیڑیوں کی طرح اس پر لپکے۔ کتوں کا شور سن کر کوچی بیدار ہوئے اور سمجھے شاید ڈاکوؤں نے ہلہ بول دیا ہے۔ وہ تلواریں سونت کر نکل پڑے اور اندھیرے میں بیسیوں تلواریں تور دلئی پر ٹوٹ پڑیں!

ادھر پیاس کی شدت سے شہی کا بُرا حال ہو رہا تھا، جب کافی دیر ہو گئی اور تور دلئی نہ لوٹا تو وہ مجبور ہو کر اس کی تلاش میں نکلی۔ سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ کوچیوں کے خیموں کو دیکھ کر وہ اس طرف بڑھی۔ اور جب خیموں کے نزدیک پہنچی تو تور دلئی کی لاش کو خون میں نہایا ہوا پایا۔ وہ تور دلئی کہہ کر اس کی لاش سے چمٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

"تور دلئی؟۔۔ ڈاکو تور دلئی؟۔ کوچیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ وہ دوڑے دوڑے آئے۔ شہی کو لاش سے جدا کیا لیکن آہ وہ بھی اپنے محبوب کے پاس جا چکی تھی!

خانہ بدوش کے اس چھوٹے سے جزیرے پر یک لخت افسردگی چھا گئی۔ اچانک اور ناحق دو انسانوں کا خون بہہ جانے پر سارا قبیلہ پریشان تھا، وہ ان لاشوں کو دفنانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ شہنشاہ اکبر کے سپاہیوں کی بھاری جمعیت ایک جنازہ اٹھائے ہوئے ادھر سے گزری اور جب انہیں پتہ چلا کہ تور دلئی قتل ہو چکا ہے اور شہی مر چکی ہے تو وہ ان کی لاشیں بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

منڈر اور یوسف زئی قبیلوں کو اس مشترک المیے نے ایک صف میں کھڑا کر دیا، دونوں کی ہری بھری فصل ایک ہی بجلی نے پھونکی تھی۔ دونوں کے دل ایک ہی سیخ میں پروئے گئے تھے، دونوں کی آنکھوں میں آنسو۔ محبت، غیرت اور حمیت کے ان تینوں شہیدوں کو اسی سرسبز و شاداب چراگاہ میں دفن کر دیا گیا جسے ہزاروں منڈروں اور یوسف زئیوں کے خون نے سینچا تھا۔

زرسانگہ: لنڈی خانہ کے درخت شیتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے گول گول سے پتوں میں مونگیا رنگ کے شیتوں کے خوشے لنڈی خانے میں گہرا حسن پھیلا رہے تھے۔ زرسانگہ کے قدم رقص کی سی کیفیت لئے شاطرینہ سے آگے بڑھ گئے۔ اس نے ہنستی ہوئی نظروں سے شیتوں کے شاداب درختوں کو دیکھا اور دوپٹہ سامنے والے درخت کی اوپر والی شاخ پر پھینک کر اسے نیچے جھکا لیا اور شیتوں کے خوشے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگی۔ جب جھولی بھر گئی تو دونوں ہاتھوں سے اسے رگڑ سی دی۔ خوشوں میں سے شیتوں کے دانے جھولی میں بکھر سے گئے۔ اس نے دانے ٹوکری میں ڈال دیئے اور دانوں سے خالی خوشے پھینک دیئے۔ اس نے دوسری شاخ جھکائی اور دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑ کر جھولا سا جھولنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی۔ "بہت خوش ہونا، بھائی کی منگنی ہونے والی ہے، آخر کیوں نہ اتنی خوشی ہو۔ آٹھ بہنوں کا ایک بھائی ہے"۔ زرسانگہ نے ایک دم سے رک کر سامنے دیکھا۔ اس کی نظر درختوں میں چھپی ہوئی گل منداپر پڑی۔ وہ بولی: "منگنی تو جمعہ کو ہوئی ہے مگر خوشی منانی ابھی باقی ہے، ہمارے آدمی جلال آباد گئے ہوئے ہیں، قتوال لانے کے لئے"۔ گل منداسکرائی اور زرسانگہ کے قریب آتے

ہوئے بولی، ''اچھا، مجھے تو علم نہ ہو''۔

زرسانگہ کی نشیلی آنکھوں میں شیشوں کے درختوں کی ساری ٹھنڈک بھر گئی۔ اس نے دُعا دی ''خدا کرے تمہارے بھائی کی منگنی بھی جلد ہو جائے''۔ گل منداں نے پوچھا ''وہ لوگ کب لوٹیں گے جلال آباد سے؟'' زرسانگہ نے آزاد سرزمین کی آزاد ہواؤں میں ایک سرد سانس لیتے ہوئے کہا ''ہو سکتا ہے آج ہی آ جائیں، پھر آج رات کو ہی محفل جمے گی، تم بھی آنا ناں ہمارے ہاں، چھت پر سے تماشا دیکھیں گے''۔ اور زرسانگہ کے خوبصورت ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور اس کی لانبی لانبی سفید سفید انگلیاں گریبان میں اٹکے ہوئے کابلی روپوں پر ٹک ٹک کرنے لگیں۔ گویا وہ بھائی کی منگنی کی خوشی میں کوئی سریلا سا ساز بجانے لگ گئی ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے آ کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ گل منداں کی نظریں کانپ گئیں اور زرسانگہ کا دایاں ہاتھ کابلی روپوں پر ساز بجاتا ہوا ایک دم رک گیا۔ اس نے حیران ہو کر بائیں جانب دیکھا۔ اس کی نظر شاہ خمیر پر پڑی۔ وہ فوراً معاملے کو سمجھ گئی اور اسے حقیقت بتانے کے انداز میں چلائی، ''میں کے یار محمد کے خاندان سے نہیں ہوں، میں کرمنہ کے بادشاہ گل کے خاندان سے ہوں، میرا لباس تو دیکھو، یہ ''کرمنہ'' کا لباس ہے۔ مگر شاہ خمیر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اپنے پیچھے کھینچنے لگا۔ گل منداں گرجی ''یہ سچ کہہ رہی ہے، اسے چھوڑ دو'' شاطرینہ نے دور درختوں کے درمیان سے دیکھا اور اسکے چہرے کے اردگرد دہکتے ہوئے انگاروں ں نے حلقہ کر لیا۔ اس نے ایک بھاری پتھر اٹھایا تا کہ شاہ خمیر کا سر پھوڑ دے۔ اچانک اس کی نظر شاہ خمیر کے دو ساتھیوں پر پڑ گئی۔ اسے اپنی جان بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ وہ غصے میں لرزتی ہوئی درختوں کی آڑ میں ہو گئی۔ زرسانگہ کے کانوں میں قبائلی علاقے کی تیز و تند آندھیوں کا سارا شور بس چکا تھا۔ وہ طوفان کی طرح چیخی ''میں زخاخیلوں کے بہادر اور غیرت مند قبیلے سے ہوں، بد بخت ہمارے ساتھ کیوں دشمنی مول لیتے ہو؟'' جب اس نے محسوس کیا کہ شاہ خمیر اکیلا نہیں، اس کے ہمراہ دو نوجوان اور بھی ہیں تو اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا ''ارے بہادرو! پہلے دشمن کو پہچانا کرو، پھر دشمنی کیا کرو''۔ شاہ خمیر کے قدم مدھم پڑ گئے، اس نے مڑ کر زرسانگہ کی طرف دیکھا۔ شکر خان غرایا۔ ''ایسے ہی کہہ رہی ہے، مت چھوڑنا''۔ اس کے ساتھ ہی شاہ خمیر کی رفتار تیز ہو گئی۔

جوان اول بی بی لیمپ کے باہر بیٹھی اپنا سرخ رنگ کا کرتہ سی رہی تھی۔ جب اس کی نظر شاہ خمیر اور زرسانگہ پر پڑی تو اس کی سفید پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہو گئیں اور ان شکنوں میں سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی، کُرتہ کندھے پر ڈالا اور زرسانگہ کے قریب آ کر اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ زرسانگہ کے تر و تازہ چہرے پر شفق کی ساری سرخیاں جمع تھیں، اس کا سانس تیزی سے آ جا رہا تھا اور اس کی نشیلی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ اول بی بی نے قہر آلود نظر شوہر پر ڈالی اور بولی ''نئی دشمنی مول لے لی؟ یہ لڑکی یار محمد کے خاندان سے نہیں، یہ کرمنہ کی معلوم ہوتی ہے''۔ شاہ خمیر کی نظروں میں غصہ بھر گیا۔ وہ شکر خان کی طرف دیکھنے لگا۔ زرسانگہ نے بھی ایک لمحے کے لئے شکر خان کی طرف دیکھا۔ شکر خان کو یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو ''تم ایک ٹھیک دشمن نہیں ہو''۔ شکر خان کے سینے میں پشیمانیوں کے مدجزر اٹھنے لگے۔ وہ شانے کے ساتھ لٹکے ہوئے پستول سے کھیلنے لگا اور خفت آمیز لہجے میں بولا ''تو کیا ہوا، یہ واپس جا سکتی ہے''۔

اول بی بی نے زرسانگہ کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو بہن کچھ کھا پی لو، تھک بھی گئی ہو گی۔ ذرا آرام کر لو، دوپہر کے بعد چلی جانا''۔

زرسانگہ نے بے قراری سے کہا، ''نہیں میں اسی وقت واپس جاؤں گی''۔

اول بی بی اسے سمجھانے لگی، ''اتنا صبر کرو بہن کہ گل اکبر اور خان بادشاہ آ جائیں، ان کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گی۔ تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟''

زرسانگہ کیمپ کے اندر جا کر چارپائی پر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اول بی بی نے اس کے سامنے ایک چنگیر لا کر رکھ دی۔ اس میں لسی سے بھرا ہوا کٹورہ، مکھن، پیاز اور جوار کی دو روٹیاں تھیں۔

زرسانگہ منہ پھیر کر بولی، ''میں کھانا نہیں کھاؤں گی''۔

اول بی بی نے نرمی سے کہا، ''تم ہماری مہمان ہو، بہن، تمہارے خاندان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں''۔ اور لسی کا پیالہ زرسانگہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

جب قبائلی علاقے کی ہواؤں میں دوپہر کی تمازت بھر گئی تو زرسانگہ، گل اکبر اور خان بادشاہ کے ساتھ چل پڑی۔ ''اچ لرگی'' کا پہاڑ عبور کر کے وہ اسے ''لنڈی خانے'' تک چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ شیشوں کے ٹھنڈے سایوں والے درختوں کے جھنڈ تک پہنچ کر اسے اپنی نند شاطرینہ کا خیال آیا۔ اس نے ''کرمنے'' کے سارے علاقے میں آگ لگا دی ہو گی! ایسا نہ ہو کہ آدم خیل آ چکا ہو، اور قوالوں کو واپس کر دیا ہو۔ وہ شیشوں کے خوبصورت درختوں میں بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں تاغیانو کے پہاڑ پر چڑھ گئی اور پھر تیزی سے دوسری طرف اتر گئی۔ جب اس نے کرمنے کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کا جی چاہا کسی سے پوچھے ''میرے بھائی نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟'' اچانک اس کی

نظر بارانے پر پڑی جو کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈیوں پر سے گزر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بے تابی سے بولی، ''میرا بھائی جلال آباد سے آ گیا ہے؟ اس نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟'' بارانے نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور کہا ''وہ ابھی نہیں آیا۔'' زرسانگہ کی زندگی کے گویا تمام اندیشے علاقہ آزاد کی فضاؤں میں کھو کر رہ گئے۔ وہ کنگنائی، ''خدایا ہم آٹھ بہنوں کے بھائی کو سات بیٹوں کا باپ کرنا!''۔ بارانے نے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ پگڈنڈیوں پر سے دوڑتی چلی گئی۔

شاطرینہ صحن میں مرجھائی ہوئی بیٹھی تھی۔ محلے کی چند عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ جب ان کی نگاہ زرسانگہ پر پڑی تو وہ چونک سی گئیں اور اس طرح اسے دیکھنے لگیں جیسے ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے کسی شناسا کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند لمحے لگاتار دیکھنے کے بعد شاطرینہ کا سویا ہوا چہرہ جاگ اٹھا۔ وہ بھاگ کر آئی اور اپنی حسین بھاوج کے گلے سے لپٹ گئی۔

کرمنہ میں شور مچ گیا کہ زرسانگہ واپس آ گئی، وہ غلطی سے لے جائی گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ سب اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے تھے جیسے انہوں نے اسی پہلی بار دیکھا ہو اور وہ کسی اجنبی شہر سے آئی ہو۔

جب دن کے اُجالے شام کے دھندلکوں میں ڈولنے لگے تو نتھار خسے بھاگتا ہوا آیا اور بولا ''وہ آ گئے ہیں''۔ زرسانگہ کا جی چاہا کہ وہ رخسے کو گود میں اٹھا کر اس کا پھول سا چہرہ چوم لے، مگر وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور دیوار کی آڑ میں ہو کر نیچے دیکھنے لگی۔ اس کی نظر کئی چہروں پر پڑنے کے بعد آدم خیل پر پڑی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناچتی ناچتی اس تک پہنچ جائے اور اسے سینے سے لگا لے اور کہے ''میرے اچھے بھائی، اللہ تجھے سات بیٹوں کا باپ بنائے''۔

یار مست کرمنہ کی چہ میگوئیوں سے بے خبر حجرے کو درست کرنے لگ گیا۔ اس کے چہرے پر جلال آباد کے سفر کی تکان کے کوئی آثار نہ تھے۔ حجرے کے چاروں طرف چارپائیاں ڈال دی گئیں اور درمیان میں چٹائی بچھا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرمنہ کے جوان اور بوڑھے بندوقیں تھامے ان کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ بچے قوالوں کے اردگرد زمین پر جمع ہو گئے۔ محلہ کی کئی عورتیں آئیں اور زرسانگہ کے پاس چھت پر چلی گئیں۔ قوالوں نے قوالی شروع کر دی اور کرمنہ کے در و دیوار موسیقی کی تانوں میں کھو گئے۔

یار مست محسوس کرنے لگا کہ محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ جب اس کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی نظریں کوئی عجیب سی کہانی سنانے لگتی ہیں۔ اس نے غنزل سے پوچھا، ''یہ کیا بات ہے؟'' غنزل نے اسے اشارہ کیا اور وہ دونوں موسیقی کی محفل سے باہر نکل گئے۔

غنزل صبح کا واقعہ سناتا گیا اور یار مست کا خون کھولتا گیا۔ جب غنزل خاموش ہو گیا تو یار مست نے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ میں تھامی ہوئی بندوق کو کندھے کے ساتھ لگا لیا اور بھاری بھاری قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ غنزل اس کے پیچھے بھاگا، ''دیکھو دوست، بھائی بے قصور ہے، اسے کچھ نہ کہنا''۔

یار مست غرایا، ''اسے بازار کے علاقے میں جا کر شیخے اکٹھے کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ لوگ میری طرف دیکھیں اور کہیں کہ اس کی بیوی کو فلاں لوگ پکڑ کر لے گئے تھے؟ تم چاہتے ہو کہ میں بے غیرت بن جاؤں اور خاموش رہوں؟'' اور وہ تیز تیز قدموں سے جانے لگا۔ غنزل دیر تک وہاں حیران اور پریشان کھڑا رہا۔

صحن میں قدم رکھتے ہی یار مست نے بیوی کو پکارا۔ آواز میں پہاڑوں کی سی سختی اور طوفان کا سا جوش تھا۔ بھائی کی منگنی کی خوشیوں میں مگن ساری کائنات سے بے خبر زرسانگہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگی۔ باقی عورتیں خوفزدہ ہو کر چھت کے اس کنارے پر آ گئیں۔ یار مست گرجا، ''میرے گھر سے اسی وقت نکل جاؤ، میں بے غیرت نہیں ہوں کہ اس عورت کو گھر میں رکھوں جس کے ہاتھوں میری بے عزتی ہو''۔ زرسانگہ کے حلق میں آزاد علاقہ کے سارے کانٹے چبھ گئے۔ چھت پر بیٹھی ہوئی عورتیں لرز کر رہ گئیں۔ شاطرینہ کو چکر سا آ گیا مگر وہ بھاگ کر آئی اور بھائی کے قدموں میں گر پڑی، ''میرے بھائی، اس بیچاری کا کیا قصور ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' یار مست نے پاؤں کھینچ لئے۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میرے وطن کے دشمن اسے میرے لئے ایک مستقل طعنہ بنا دیں۔ میں وطن کو لوگوں کے بتانا چاہتا ہوں کہ میں غیرت مند ہوں''۔ پھر وہ بندوق زمین پر زور سے مار کر بولا، ''تم ابھی تک کھڑی ہو، میں کہتا ہوں جاؤ، بھائی کے گھر کا رُخ کرو''۔

زرسانگہ جھیل بوجھل قدموں سے دروازے سے نکل گئی۔ اس کی زندگی کی راہوں پر جلتے ہوئے سارے دیئے بجھ گئے۔ چاروں طرف تاریکیاں پھیل گئیں۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ یہ خواب ہے؟

اس نے بے جان سے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ زور زور سے آنکھیں جھپکانے لگی۔ تو کیا یہ حقیقت ہے؟ اس کے سوئے ہوئے سے دماغ میں یہ خیال ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی کی تانیں بستی کے لوگوں کے تمسخر آمیز قہقہوں میں بدل گئیں۔ وہ آگ اگلتے ہوئے تنور میں جا گری، اس کے لبوں کو تیزی سے جنبش ہوئی''۔ یہ شاطرینہ کا بھائی سمجھتا ہے کہ وہ غیرت مند ہے اور میں غیرت مندوں کی بیٹی نہیں ہوں''۔ اس کے پاؤں تیزی سے حرکت میں آ گئے، وہ بھائی کے حجرے کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

آدم خیل سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ روز کی نسبت زیادہ خوبصورت اور جوان معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک زرسانگہ کو یوں لگا جیسے وہ دور دیس کے ایک طاقتور قبیلے کو اس کا دشمن بننے کے لئے پکارنے آئی ہے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں، آسمان کی نیلاہٹوں میں سات تاروں کا جھرمٹ بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اس نے اس کی چھاؤں میں گہری ٹھنڈک محسوس کی۔ اس کے قدموں نے اس طرف لپکنا چاہا، مگر اسی لمحے اس نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کائنات پکارنے لگی تھی، ''بے غیرت!'' شعلے لپکے اور اس کی روح سے بغلگیر ہو گئے۔ ان کی گرمی میں نیلگوں آسمان پر چمکنے والے سات تارے اپنی سارے ٹھنڈک کھو بیٹھے۔ وہ اس زور سے کھانس دی کہ محفل میں سے بہتوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ دودان شاہ جلدی سے اس کے پاس آیا اور پوچھا، ''کیا بات ہے؟'' وہ بے چینی سے بولی: ''آدم خیل کو بھیج دو''۔

آدم خیل نے قریب آتے ہی خوشی کے لہجے میں کہنا چاہا: قوال اچھے ہیں؟ میں تو نہیں لانا چاہتا تھا، پھر سوچا چلو ہماری بہن خوش ہو جائے گی، اصرار کر رہی ہے''۔ مگر جب اس نے تاروں کی مدھم روشنی میں اسے غور سے دیکھا تو پریشان ہو کر کہا، ''کیا بات ہے؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟''

زرسانگہ اسے صبح کی واردات سنانے لگی، اس کی آواز میں تند ہواؤں کا ساز و رتھا۔ جب وہ خاموش ہو گئی تو آدم خیل اداسی سے بولا، ''تو یار مست نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے؟''

''ہاں، وہ کہتا ہے میں بے غیرت نہیں ہوں کہ تمہیں گھر میں رکھوں۔ تمہارے ہاتھوں میری بے عزتی ہوئی ہے''۔ پھر اس کا وجود تیزی سے جلنے لگا۔ وہ چیخ پڑی، ''اُس نے اس طرح مجھے گھر سے نکال کر تمہاری غیرت کو پکارا ہے''۔

آدم خیل کے صحت مند وجود میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ فیصلہ کُن لہجہ میں بولا، ''میری غیرت اس پکار کو سنے گی، میرے پیچھے آؤ''۔

یار مست صحن میں بیٹھا بندوق گود میں لئے کلائیاں گھٹنوں پر رکھے اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے کچھ سوچ رہا تھا۔ جب ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا تو وہ چونک اٹھا، لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ آدم خیل کی آنکھوں میں کسی پختہ مگر خطرناک عزم کی سرخی ہے اور اس کے پیچھے زرسانگہ کھڑی ہے۔ آدم خیل گرجا، ''میں دشمنوں کو غیرت کے معنی سمجھانے جا رہا ہوں۔ اب تمہیں میری بہن کو گھر سے نکالنے کی ضرورت نہیں''۔ اور جب وہ دروازے کی طرف مڑا تو زرسانگہ بولی، ''شاہ خمیر تو مجھے راستے سے ہی واپس کر دیتا لیکن شکر خان نے اسے ایسا کرنے سے روکا''۔

آدم خیل سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں نے شکر خان کو کبھی نہیں دیکھا''۔

زرسانگہ جلدی سے بولی، ''اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں''۔

یہ سنتے ہی آدم خیل تیزی سے دروازے سے نکل گیا۔ اس وقت اس کے قدموں کی چاپ سے زمین کا سینہ اکانپ رہا تھا۔ حجرے میں پہنچتے ہی وہ چیخا، ''بند کرو یہ موسیقی''۔

موسیقی ایک دم بند ہو گئی۔ آدم خیل کے سرخ چہرے کی طرف لوگ اس طرح دیکھنے لگے جیسے انہیں تمام معاملے کا علم ہو۔ مت علی اسے مشورہ دینے لگا، ''اس وقت اس محفل کو درہم برہم نہ کرو''۔

آدم خیل بندوق پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا، ''جب تک میں دشمنوں سے انتقام نہیں لے لیتا صرف اس بندوق سے پیار کروں گا''۔

مت علی کہنے لگا، ''انتقام کا وقت معین نہیں ہوتا۔ انتقام چالیس سالوں میں بھی لیا جا سکتا ہے''۔

''میں باعزت بادشاہ گل کا بیٹا ہوں، میری نظروں میں بے عزتی کے انتقام کا وقت معین ہے، میں چالیس گھنٹوں کے اندر اندر انتقام لوں گا''۔

مت علی کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہو گئے۔ ''بے وقوف نہ بنو آدم خیل، بہتر موقع کی تلاش میں رہو۔ شاہ خمیر کیمپ میں رہتا ہے اور کیمپ میں گورا فوج ہے۔''

آدم خیل گرجا، ''تم بھولتے ہو مت علی، غیرت کی آگ پہاڑوں میں شگاف پیدا کر دیتی ہے اور سمندر کے پانیوں کو خشک کر ڈالتی ہے''۔

پوری محفل نے یہ سب کچھ سنا۔ روغن شاہ نے بنات گل سے کہا، ''غیرت مندوں کی اولاد غیرت مند ہوتی ہے، طاقتوروں کے مقابلہ پر جا رہا ہے، وہ چھ بھائی ہیں اور یہ تنہا ہے''۔

ملنگ نے خان میر سے کہا، ''عزت دنیا کی بہت بڑی دولت ہے''۔

اسی رات علاقہ غیر کے آسمان پر چمکنے والے چاند نے ایک

خوبصورت نوجوان کو دیکھا جس نے بندوق تھامے تیز تیز قدموں سے بوڑے پہاڑ کو عبور کیا اور خیبر سے ہو کر لواڑگی کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے لالٹین تھامے اس کے دو ساتھی تھے۔

صبح چار سیر گوشت خریدا گیا اور سیڑھی کہیں سے حاصل کی گئی اور رات کی تاریکی میں جب کیمپ کا رخ کیا گیا تو کتے بھونکنے لگے۔ ان کے آگے چار سیر گوشت پھینک دیا گیا، وہ گوشت کھانے لگے۔ رات خاموش ہوگئی کیمپ کی دیوار کے ساتھ سیڑھی کھڑی کر دی گئی۔ آدم خیل بڑے اطمینان سے اوپر چڑھا، دیوار کے اندر کی جانب دایاں پاؤں اور باہر کی جانب بایاں پاؤں لٹکا کر سیڑھی اوپر کھینچنے لگا۔ نیچے سے گل نواز اور مسے خان سیڑھی اوپر کی طرف اٹھا رہے تھے۔ جب وہ اوپر اٹھ گئی تو آدم خیل اسے کیمپ کے اندر کی جانب جھکانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ آدم خیل نیچے اترا۔ اسے چاند کی مدھم روشنی میں کئی چارپائیاں نظر آئیں، وہ ایک چارپائی کے پاس گیا، وہاں ایک عورت کو سویا ہوا پایا، دوسری چارپائی کے پاس گیا تو نظر چیچک کے داغوں سے آلودہ چہرے پر پڑی۔ اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس نے حقارت سے چیچک زدہ چہرے کو دیکھا اور بندوق اس کے سینے پر رکھ کر چلا دی۔ کیمپ میں سوئے ہوئے لوگ ایک دم جاگ پڑے، انہیں یوں محسوس ہوا جیسے خواب میں کچھ دیکھا ہو۔ کیمپ کے اندر کسی کا قتل! کوئی اتنی جرات کر سکتا ہے؟ ہر ایک کا ذہن یہی سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کسی وہم کے پیدا ہوتے ہی شاہ خمیر نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سید اکبر نے بھی عین اسی وقت سر اٹھایا، اور پوچھا، ''گولی چلنے کی آواز تھی؟'' اب تو شاہ خمیر گھبرایا اور جلدی سے بولا ''ہاں'' پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سرہانے رکھی ہوئی بندوق فوراً ہاتھ میں تھام لی۔ سید اکبر بھی اٹھ بیٹھا اور پورے کیمپ کی کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت تک آدم خیل دیوار پھاند کر کیمپ سے دور جا چکا تھا۔ ایک دم کیمپ سے روشنیاں بلند ہوئیں اور وہ پھر زمین کے سینے سے چمٹ گئے۔ جانے کتنی بار روشنیاں بلند ہوئیں اور کتنی بار ان کے تندرست وجودوں نے زمین کی چھاتی کو چھوا۔

دوسرے روز صبح تک ''کرمنہ'' یہ خبر پہنچ گئی کہ آدم خیل کامیاب رہا۔ اسی روز مغرب کے وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چپکے سے تواڑگی کے ایک مکان سے نکلا اور کرمنہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بوڑے پہاڑ کو عبور کرنے تک وہ بڑے چوکنے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ چاروں طرف نظریں دوڑا لیتے۔ بوڑے پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد آدم خیل کے فتح مندانہ قدم بہن کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بستی کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر اسے تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہوا ساتھ ہولیا۔ زرسانگہ دوڑ کر آئی اور اس کی مضبوط چھاتی سے چمٹ گئی۔ وہ غیور لہجے میں بولا، ''میں نے تمہیں وطن میں بہت اونچا کر دیا ہے''۔ ان گنت نظریں رسانگہ کی طرف اٹھ گئیں۔ زرسانگہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس بستی کی ایک ایسی باوقار ملکہ ہے جس کی مسرتوں کے چمکتے ہوئے چاند کو بجھانے کے لئے دور دیس کا ایک قبیلہ کمر باندھ رہا ہے۔ ایکا ایکی سات دیئے نیلگوں آسمان میں بکھر کر خلاؤں میں کھو گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس نے آدم خیل کی چوڑی چھاتی کے گرد اپنی بانہوں کا حلقہ اور تنگ کر لیا اور اس کی جانب اٹھی ہوئی ان گنت نظروں میں عزت و توقیر کے ساتھ ساتھ رشک بھر گیا۔

بہرام و گل اندام: فیاض سترھویں عیسوی کا ایک خانہ بدوش موسیقار تھا جو قصے نظم کر کے قریہ بہ قریہ، رباب کے تاروں کی زبانی اہل دل تک پہنچاتا تھا۔ ''بہرام و گل اندام'' اس کی ایک طویل رومانوی بلکہ پرانے زمانے کی اکثر کہانیوں کی طرح طلسمی داستان ہے جس کی دنیا میں شہزادوں، شہزادیوں اور جنوں پریوں کی دنیا ہے جس میں درویشوں ہی کی دعائیں اور دستگیری کام آتی ہے اور شکار ہی کا شاہانہ مشغلہ ہے جو شہزادوں کو رومان کی راہوں پر ڈال دیتا ہے اور وہ کانٹوں کے فرش سے گزر کر پھولوں کی سیج پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی شہزادی ان کا انتظار کرتی ہے۔

تھا دیارِ روم میں اک حکمراں　　مملکت اس شاہ کی تھی بیکراں
دولت و جاہ و حشم میں کم نہ تھا　　حسن و آلام سے محرم نہ تھا!
طفلِ خوش اندام سے محروم تھا　　جم تھا لیکن جام سے محروم تھا
منتیں مانیں، دعائیں کیں مگر　　ہو سکا کوئی نہ حربہ کارگر
آخر اک درویش کے فیضان سے　　ہو گیا آزاد اس خلجان سے
عالمِ پیری میں بر آئی اُمید　　شامِ غم میں صبح کی پائی نوید

ڈوبتے دل کو سہارا مل گیا
چشمِ اشک افشاں کو تارا مل گیا

اس قدر تھا خوبرو وہ مہ لقا　　جس نے دیکھا ہو گیا دل سے فدا
دوست انجم، وہ مہِ گلفام تھا　　نام اس کا اصل میں بہرام تھا
تربیت اسکی ہوئی اس شان سے　　ہو گئے اہلِ فلک حیران سے
جب وہ شہزادہ جواں ہونے لگا　　ماہِ کنعاں کا گماں ہونے لگا
آنکھیں اس کی اسقدر مخمور تھیں　　روم کی سب لڑکیاں محسور تھیں

وہ کسی پر بھی نظر کرتا نہ تھا　　وادیِ الفت سے کوسوں دور تھا
صنفِ نازک ہی سے تھی نفرت اسے
تھی شکار و سیر سے رغبت اسے

ایک دن صحرا میں تھا محوِ شکار　　ساتھ اسکے تھے ملازم بے شمار
ایک آہو کے تعاقب میں چلا　　ہو گیا ہمراہیوں سے پرجدا
سوچتا تھا یہ کہ اب جائے کدھر　　سامنے اک جھونپڑا آیا نظر
دفعتاً دیکھا وہاں اک مردِ پیر　　خال و خد میں خضر کی گویا نظیر
پیار سے اس نے بٹھایا اور کہا　　کیسے آئے اور کیا ہے مدعا؟
سوچ کر کچھ مردِ حق کے سامنے　　کہہ سنایا حال سب بہرام نے

سن کے آہِ سرد وہ بھرنے لگا
داستاں اپنی بیاں کرنے لگا

بولا، دنیا گھوم کر آیا ہوں میں　　کہکشاں کو چوم کر آیا ہوں میں
دیکھے ہیں لاکھوں حسینانِ جہاں　　رشک جن پر کر رہا ہے آسماں
گرچہ ہیں وہ پیکرِ حسن و شباب　　لعبتِ چیں کا نہیں کوئی جواب
شاہ چیں کی دخترِ زیبا ہے وہ　　تو کہے پیمانۂ صہبا ہے وہ
تندے کا اک چھلکتا جام ہے
نام اس مہ وش کا گل اندام ہے

یہ بیاں سنتے ہی مردِ پیر کا　　ہو گیا شہزادہ کچھ دلگیر سا
وہ تصور دل کو تڑپانے لگا　　اُٹھ کے سمتِ چیں وہ جانے لگا
ہجر کے اندوہ سے دل ریش تھا　　رات دن اس کو سفر درپیش تھا
جاتے جاتے پیاس نے گھیرا اسے　　ہر طرف سے یاس نے گھیرا اسے

راہ میں اک باغ دیکھا پُر بہار　　گلشنِ جنت بھی ہے جس پر نثار
کچھ عجب پُر کیف تھا وہ گلستاں　　جا بجا شفاف چشمے، ندیاں
تلخیِ انجام سے غافل ہوا　　دوڑ کر وہ باغ میں داخل ہوا
جھک کے اک چشمے سے جب پانی پیا　　اک پری پیکر کا اس میں عکس تھا

یہ پری پیکر وہی گلفام تھی!
لعبتِ چیں یعنی گل اندام تھی

جب نظر اس نے اٹھائی ایک بار　　بس نگاہیں ہو گئیں اس سے دوچار
عشق آخر کام اپنا کر گیا　　دل میں دونوں کے محبت بھر گیا
گفتگو کر کے لبِ خاموش سے　　ہو گئے دونوں مگر بیہوش سے
دیر تک بجتا رہا الفت کا ساز　　آنکھوں آنکھوں میں ہوئے رازو نیاز
جب وہ آپس میں جدا ہونے لگے　　دونوں اپنے حال پر رونے لگے
اس طرف تھا غم سے شہزادہ نڈھال　　اس طرف ابتر تھا شہزادی کا حال
تھے غمِ فرقت سے دونوں بیقرار　　مشکلیں تھیں راستے میں بے شمار
جل رہے تھے آتشِ الفت سے وہ　　مل نہ سکتے تھے کسی صورت سے وہ
رفتہ رفتہ مشکلیں حل ہو گئیں　　دشمنوں کی قوتیں شل ہو گئیں

ختم جورِ آسماں ہو کر رہا
عشق آخر کامراں ہو کر رہا

مردان ریجن

جغرافیہ:

مردان صوبہ سرحد کا ایک ڈویژن ہے۔ یہ اس علاقے کی سیاسی حیثیت ہے جبکہ مردان کی ثقافتی حیثیت یہ ہے کہ اس کا تعلق پشاور سے رہا ہے اور بہت عرصے تک صوبہ سرحد کے دو اہم پختون قبیلوں یوسفزئیوں اور خٹکوں کا مرکزی خطہ رہا ہے۔ اب بھی یہی دو اقوام اس علاقے کی اہم قومیں ہیں۔ یہ خطہ ضلع صوابی اور مردان ضلع کا مجموعہ ہے۔ تخت بھائی کا قدیم ترین علاقہ اور گراں قدر ثقافتی آثار رکھنے کی وجہ سے مشہور ہے اور ضلع مردان کی تحصیل ہے۔ مردان پشاور کے شمال مشرق کی جانب صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں کے لئے شاہراہ رکھنے والا متمدن' تہذیبی اور ثقافتی صنعتی شہر ہے۔ اس کے مشرق اور شمال کی طرف کے علاقے قدیم تاریخی اور ثقافتی مرکز کے حامل شہر ہیں۔ مردان شہر کی عہد حاضر میں امتیازی حیثیت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی چھاؤنی اور طویل تجارتی اور صنعتی بازاروں کا حامل شہر ہے۔ اس کے مشرق کی طرف دریائے سندھ کے مغربی کنارے اور شمال کی طرف شیر گڑھ سے اوپر تک اور مغرب کی جانب منگا درگئی اور جنوب کی طرف رسالپور تک پھیلا ہوا یہ یوسفزئیوں' خٹکوں' صاحبزادگان' ہوتی اور قاضیوں کا مسکن شہر ہے۔

صوابی:

مردان کے ضلع صوابی کے مضافات گندھارا کی تہذیب ثقافت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان میں ہنڈ اور لاہور جیسے مقامات ہیں جنہیں ہزاروں سال کی عظمت رفتہ اور انسانی تہذیب کی درخشانی کے آثار رکھنے کا فخر حاصل ہے۔ یہ وہ خطے ہیں جو کہ قدیم ترین انسانی تہذیبوں کی تاریخ اپنے سینے میں دفن کئے ہوئے ہیں اور انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ قدیم بابلی اور نینوائی تہذیبوں کی حامل اقوام ان خطوں میں آ کر آباد ہوئیں۔

چھوٹا لاہور:

صوابی کے علاقے کا قدیم ترین خطہ لاہور ہے جسے عہد حاضر میں چھوٹا لاہور کہا گیا۔ یہ ایک متمدن شہر تھا جو وسیع تر رقبے پر پھیلا ہوا تھا اس شہر کا قدیم ترین نام صلاطور تھا مگر جب ستارہ پرست لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے جو کہ مختلف ستاروں کی پرستش کرتے تھے تو وہ لوگ جو کہ ستارہ مریخ کی پرستش کرتے تھے انہوں نے اس جگہ مریخ کا معبد بنایا اور اس مقام کا نام لاہور رکھ دیا۔ لاہور کا مطلب ان کی زبان میں ستارہ مریخ کا معبد ہے چونکہ اس مقام پر ستارہ مریخ کا معبد تعمیر ہوا تو اس سارے مقام کا نام لاہور رکھ دیا گیا۔ چینی زائر ہیونگ سانگ اور کنگھم نے اس شہر کو برہمنوں کا عظیم شہر لکھا ہے۔ مہاراجہ اشوک نے یہاں پانینی کی یادگار تعمیر کروائی تھی۔ جسے دیکھنے کے لئے بہت سے عالمی شہرت کے حامل سیاح اور تاریخ دان یہاں پر آتے رہے' میر سید بخاری کی تحقیق کے مطابق مجان تیکا پانینی کی یادگار جو تعمیر ہوئی تھی اس میں شامل رہا ہے۔ وہ شاہان کابل جو برہمن تھے جب افغانستان سے ان کا اخراج ہوا تو انہوں نے اس مقام (چھوٹا) لاہور میں آ کر پناہ لی اور اسی مقام کو اپنا پایہ تخت بنا لیا۔ پانینی جس نے سنسکرت کی گرائمر لکھی یہی مقام اس عظیم دانشور کی جائے ولادت تھی۔ اور بدھ مت کی تبلیغ کے لئے جن دو مبلغوں کو بھیجا گیا وہ بھی اسی مقام پر آ کر ٹھہرے تھے اور انہوں نے بدھ مت کی تبلیغ کا سلسلہ یہیں سے شروع کیا تھا اور پہلا وہ شخص جس نے بدھ مت کو اختیار کیا تھا اس کا تعلق بھی اسی مقام لاہور سے تھا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے سکندر اعظم 226 قبل مسیح میں دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹیکسلا کے راجہ امبی کا مہمان بنا تھا اور یہی وہ مقام ہے جو کہ اسلامی عہد سے قبل گندھارا کی سرزمین کا دارالخلافہ اور راجہ جے پال کی راجدھانی تھا۔

تخت بھائی:

تخت بھائی مردان شہر سے آٹھ میل دور سطح سمندر سے 823 فٹ بلند مردان کے شمال کی جانب ہے۔ یہاں قدیم ترین بدھ عہد کی یادگار درسگاہ ہے۔ یہ وہ تاریخی ورثہ ہے جسے دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے بدھ مذہب کے پیروکار آتے ہیں۔ تخت بھائی راجہ بھائی کی راجدھانی تھی۔ اس کے جنوب مغرب اور مردان کے شمال مغرب کی جانب جمال گڑھی کا وہ تاریخی خطہ ہے جہاں اب تک ہندو اور بدھ عہد کے آثار ملتے ہیں۔ تخت بھائی سے اوپر شیر گڑھ کا سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ مردان کے جنوب میں رسالپور کا علاقہ ہے۔ مردان کے باقی شہر طور و مایا' توت کلے' طاؤس' بالا گڑھی' گجرات' بکشالی' گڑھی کپورہ' گیدڑ گسینت' چمتار' کوچیاں کلے' شیرن کلے' کلیاڑ اور ھاتھیان۔ مردان کے اہم شہروں اور قصبوں میں شہباز گڑھی' جمال گڑھی' رسالپور' کلپانی' بغدادہ' کاٹلنگ' میاں گونو کلے اور خصوصاً شہباز گڑھی اور رستم کے علاقے قابل ذکر ہیں۔ جبکہ ضلع صوابی کے مشہور دیہات و مضافات میں نواں کلی' شاہ منصور' ہنڈ' چھوٹا لاہور' کالوخان' یار حسین' صوابی مانیری' شیوہ' لاہور پیختار' ڈاگئی' تو نالئی' ٹوپی' گدون' کلا بٹ' ترلائندی' ٹنڈی کوئی قابل ذکر ہیں۔ مردان'

صوابی کے محل وقوع میں جن اقوام کا ذکر ہے ان میں دو بڑی قومیں خٹک اور یوسفزئی آباد ہیں۔ مردان، صوابی کے تمام علاقوں میں سب سے زیادہ کاشت تمباکو اور گنا کی ہوتی ہے۔ ان علاقوں میں تمباکو کی بہت بڑی منڈیاں اور فیکٹریاں ہیں۔ لوگ پختون ہیں اور پختون روایات کی سختی سے حفاظت کرتے ہیں۔

گدون:

یہ ضلع صوابی کا ان دنوں ایک صنعتی قصبہ ہے۔ یہاں کی ثقافتی حیثیت بالکل اسی طرح مسلم ہے جس طرح کہ ضلع صوابی کے دوسرے علاقوں کی ثقافتی حیثیت ہے۔ یہ علاقہ قیام پاکستان کے بعد مردان میں شامل کیا گیا تھا۔

سمہ: ضلع صوابی کا ایک قدیم نام سمہ ہے۔ سمہ بابلی تہذیب وثقافت کا حامل علاقہ ہے۔ تقریباً 2400 قبل مسیح میں بابل میں نمرود نے سموتینا کو شکست دے کر بابل میں اقتدار کی بھاگ ڈور سنبھالی تو سموتینا بادشاہ وہاں سے اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ کر مردان کے علاقہ میں آ گیا اور پھر یہاں اور صوابی کے تمام علاقے میں اس کا خاندان پھلا پھولا اور سموتینا کی نسبت سے اس پورے علاقے کو سمہ کہا جانے لگا۔

شہر بہلول: مردان شہر سے سات میل کے فاصلے پر ایک درجن ڈھیریوں پر مشتمل علاقہ ہے یہاں پر کھدائی کے بعد بہت سے قدیم سکے دریافت ہوئے ہیں جس سے ماہرین آثار قدیمہ نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ جگہ پہلی صدی عیسوی میں آباد تھی۔ اس جگہ کو ماہرین نے بدھ عہد کا بہت ہی اہم مرکز قرار دیا ہے۔

جمال گڑھی:

تخت بھائی اور مردان کے درمیان جمال گڑھی کے نام سے ایک گاؤں آباد ہے یہاں بھی بدھ عہد کے کھنڈرات ہیں۔ یہاں پر مزری گھاس سے مختلف چیزیں بنانے والے دستکار ہیں جو کہ مزری سے چٹائیاں، ٹوکریاں، چھکیریں، موڑھے اور دوسری متعدد اشیاء بناتے ہیں۔ سیاح لوگ ان اشیاء کی خریداری کرتے ہیں اور یہاں موجود کھنڈرات دیکھتے ہیں۔ یہاں سے بدھ دور کے نوادرات بھی بکثرت دریافت ہوئی ہیں جنہیں پشاور کے عجائب گھر میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ ایک دریافت شدہ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ 275 تک آباد تھی۔

خرکی: یہ مقام مردان چھاؤنی سے اندازاً اٹھارہ انیس میل کے فاصلے پر تپہ بائیزئی میں واقع ہے۔ یہاں پر ماہرین آثار قدیمہ نے 1874ء میں کھدائی کی تھی اور یہاں سے بڑی تعداد میں قدیم نوادرات کی دریافت ہوئی تھی۔

اسوٹا: مردان شہر سے بیس میل کے فاصلے پر ضلع صوابی میں یہ وہ مقام ہے جو بدھ عہد سے قبل بھی آباد تھا اور یہاں سورج کے پجاری آباد تھے۔

مردان کے معروف محلّہ جات:

بکٹ گنج مردان شہر کا مشہور ومعروف بازار ہے جہاں کے آس پاس کے محلّہ جات یہ ہیں:

دو میل: گنج (ہندوؤں کا محلّہ) شام گنج (ہندوؤں کا محلّہ) موجودہ عہد میں اس کا نام اسلام گنج میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

محلّہ آتمارام: (ہندوؤں کا محلّہ) شمسی محلّہ۔

مردان شہر کے محلے: ان محلّہ جات میں مشہور محلے یہ ہیں:

محلّہ صدی خیل، محلّہ رستم خیل، ہوتی محلّہ، محلّہ نور، مندخیل، محلّہ شاہ ڈھنڈ اور محلّہ شرقی پیران، محلّہ گنڈیری۔

بازار: بازاروں میں مشہور بازار یہ ہیں:

بازار گجو خان، بازار بکٹ گنج، بازار بینک جسے بینک روڈ کہا جاتا ہے یہ بہت بڑا مرکزی اور تجارتی بازار ہے۔

تاریخ مردان، صوابی

صوبہ سرحد کے پختونوں کا وہ خطہ جس کی تاریخ کا سراغ صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں سال سے پہلے نینوا اور بابل کی ثقافت سے ملتا ہے وہ مردان اور صوابی کا علاقہ ہے۔ مردان ریجن کا ضلع صوابی جس میں ہنڈ اور چھوٹالاہور کے وہ تاریخی اور ثقافتی خطے ہیں۔ تاریخی اور ثقافتی سرمایہ افتخار رکھنے والا یہ وہ خطہ ہے جس نے بابلی ثقافت رکھنے والی اقوام کو اپنے دامن میں پناہ دینے سے پیشتر بھی عظیم تاریخی اور ثقافتی سرمایہ رکھنے والی اقوام کو پھلنے اور پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ یونان کا سکندر مقدونی جس نے ایران کی فتوحات کے بعد برصغیر ہندوستان کی طرف رخ کیا تو یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے سکندر نے دریائے سندھ کو پار کر کے ٹیکسلا جسے اس دور میں تکشلا کہا گیا پہنچا اور راجہ امبی کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے بعد اُس کی رفاقت میں راجہ پورس کی راجدھانی جہلم پر حملہ آور ہوا۔

بہر حال اس وقت جس مردان ریجن بشمول ضلع صوابی کی تاریخ کا ذکر مطلوب ہے یہ پختونوں کا خطہ ہے جن کی زبان خالصتہً پشتو ہے۔ یہاں پر دو بڑی اقوام یوسفزئی پٹھان اور خٹک پٹھان کافی عرصہ حالت تصادم و کشمکش میں بھی رہی ہیں۔

جہاں تک یوسفزئیوں کی اجتماعی رہائش و سکونت کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ یوسفزئی دو بڑی شاخوں یوسف اور مندڑ میں سے ہیں، مگر موروثی اعتبار سے دونوں شاخوں سے تعلق رکھنے والوں کو اجتماعی نام یوسفزئی ہی سے متعارف کیا جاتا ہے۔ یوسفزئی قوم مورث اعلیٰ جس کا نام مندے تھا۔ مندے کے دو بیٹے تھے بڑے لڑکے کا نام عمر تھا اور چھوٹے کا یوسف۔ عمر کے بیٹے کا نام مندڑ تھا، عمر نے جب وفات پائی تو مندڑ کے چچا یوسف نے اسے اپنی سرپرستی میں لیا اور پھر مندڑ کی اولاد بھی اپنے چچا کے نام یوسف سے منسوب ہو کر یوسفزئی ہی کہلائی۔ جبکہ یوسف کی اولاد تو تھی ہی یوسفزئی یعنی یوسف کی اولاد، گو کہ بوجہ شناخت مندڑ کی اولاد کو مندڑ یوسفزئی کہا جاتا رہا۔

مردان جو کہ بشمول صوابی ہے اس علاقے کو یوسفزئیوں کا علاقہ ہی پکارا جانے لگا تھا۔ بعد میں ان دونوں قبیلوں مندڑ یوسف اور یوسفزئیوں میں کثرت آبادی یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے لئے علاقوں کو تقسیم کر لیں۔ چنانچہ ان دونوں قبائل نے بالاتفاق اپنے لئے علاقوں کو اس طرح تقسیم کیا کہ یوسف کی اولاد نے اپنے لئے پہاڑی علاقوں سوات، دیر، باجوڑ اور بونیر کو مختص کر لیا جبکہ مردان کا علاقہ قبیلہ مندڑ نے اپنے لئے مختص کر لیا۔ مگر مردان میں بھی مندڑ قبیلہ کے لوگ اپنے آپ کو یوسفزئی کے نام سے ہی متعارف کرواتے رہے اور یوں اس تقسیم کے بعد بھی مردان کا علاقہ یوسزئیوں کا ہی مسکن رہا ہے۔

مگر یوسفزئیوں سے پہلے اس علاقے پر دلہ زاکوں کا بھی قبضہ رہا ہے۔ جنہیں امیر سبکتگین نے ہزارویں صدی عیسوی کے آخر میں یہاں پر آباد کیا تھا۔ یہ پہلی اسلامی قوم تھی بعد میں جب یوسفزئی یہاں پر آ کر آباد ہوئے تو یوسفزئیوں اور دلہ زاکوں کے درمیان چھوٹی بڑی جنگیں ہوتی رہیں۔ پھر علاقہ شہباز گڑھی اور کاٹلنگ کے مقامات کے درمیان ان دونوں قبائل دلہ زاک اور یوسفزئیوں کی فیصلہ کن جنگ ہوئی تو دلہ زاک یوسفزئیوں کے مقابلے میں پسپا ہو کر دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ اور حچھ کے علاقے میں جا بسے۔ یہ جنگ ایک تحقیق کے مطابق 1520ء اور 1525ء کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ میں یوسفزئیوں کے سرداروں ملک احمد خان اور ملک گجو خان نے نمایاں طور پر حصہ لیا تھا۔

مردان کی تاریخی حیثیت: مردان گندھارا تہذیب و ثقافت کا قدیم قصبہ تھا اس علاقے کے جن اہم مقامات پر بدھ مت دور کے آثار پائے گئے ان میں تخت بھائی، سہری بہلول، جمال گڑھی، شہباز گڑھی، چنکہ ڈھیری اور پلوڈھیری ہیں۔ مردان، صوابی و تخت بھائی اور مضافات کی تاریخی حیثیت کا تعین یوں تو نہ صرف صدیوں بلکہ ہزاروں برسوں پر مشتمل ہے جس کی تفاصیل مختلف علاقوں کی تاریخی تشریح و بیان کے ذیل میں آتی ہے۔ ان تمام علاقوں کے لئے مردان کی موجودہ عہد میں مرکزی حیثیت کے پیش نظر اس کے نام مردان سے مربوط تاریخ کے بیان میں یہ کہنا بعید از حقیقت نہیں کہ مردان شہر پٹھانوں کے قابل ذکر قبیلہ یوسفزئی کا آباد خطہ ہے۔ عبدالحلیم اثر افغانی کی پشتو کتاب ''روحانی ترون'' کے مطابق یوسفزئیوں میں سے ان کے ایک بزرگ حضرت مدیح باباؒ روحانی شخصیت کے حامل بزرگ تھے جو اپنے شجرے کے لحاظ سے دسویں سلسلہ میں پختونوں کے مورث اعلیٰ قیس (عبدالرشید) سے جا ملتے ہیں۔ حضرت مدیح باباؒ جنہیں قدیم پختون مدے باباؒ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ محمود غزنوی کے ابتدائی لشکر اسلام کے ساتھ ان چیدہ چیدہ بزرگوں کے ساتھ جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر 392ھ بمطابق 1001ء میں یہاں پہنچے تھے۔ محمود غزنوی کے ساتھ یکے بعد دیگرے پختونوں کے تمام قبیلوں کے لوگ ان حملوں کے وقت شامل تھے جن میں دلہ زاک اور یوسفزئیوں کے قدیم قبائل کے لوگ بھی شامل تھے۔

حضرت مدیح باباؒ کی اولاد کو مداخیل قوم کے نام سے یوسفزئیوں کی ایک شاخ کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے پھر مداخیل قوم کے لوگوں کو حضرت مدیح باباؒ کی اولاد سے نسبت رکھنے کی بناء پر پیر یا پیرزادہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس مداخیل قوم کے لوگ مردان کے علاوہ سوات، بونیر، باجوڑ اور کوہستان کے علاقوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں حضرت مدیح باباؒ کی اولاد پیرزادگان یا صاحبزادگان میں سے حضرت پیر گل نامی بزرگ اپنے جد اعلیٰ حضرت مدیح باباؒ کے نقش قدم پر چل کر زہد و تقویٰ اور علم و عرفان کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچے۔ حضرت پیر گلؒ کا عہد مغل شہنشاہ اکبر کا عہد تھا یعنی شہنشاہ اکبر اور حضرت پیر گل ہمعصر تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہی مردان نامی بستی کی بنیاد سولہویں صدی عیسوی میں رکھی۔ عام طور سے اور خصوصاً اس عہد میں جو لوگ اسلامی علم و عرفان کے حامل تھے انہیں ان خصوصیات کی بناء پر مردان یعنی بہادر اور صاحب جرات کہا جاتا تھا۔ اس مناسبت سے اس بستی کا نام مردان رکھا گیا جو بعد میں بڑھتی ہوئی آبادی اور تعمیرات کے پیش نظر ایک تمدنی اور تہذیبی شہر کے طور پر عام ہو گیا۔ دوسری توجیہ یہ پیش کی جاتی ہے جو کہ سینہ بسینہ روایت کے مطابق ہے وہ یہ کہ اس علاقے کو ایک بزرگ نے دعا دیتے ہوئے امرت دان کا نام دیا جس کا مطلب ہے میٹھا اس کی جگہ اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس دعا کا نتیجہ ہے کہ یہاں پر گنے کی کاشت

بہت زیادہ ہوتی ہے اور پھر یہ کہ گنے سے گڑ اور چینی بنائی جاتی ہے چینی بنانے کی بہت بڑی مل یہاں پر ہے' کافی عرصے تک اس مناسبت سے اسے امرت دان کہا گیا۔ زمانہ کے ساتھ اس کا نام امرت دان سے مردان ہو گیا۔

مردان کا پورا علاقہ گندھارا ریاست کے لئے مرکزی خطے کے طور پر مشہور ہے اور مردان کے مختلف مضافات میں گندھارا فنون و آرٹ کے آثار اب تک دریافت ہو رہے ہیں۔ اس علاقہ میں گندھارا ریاست کی کئی چھوٹی چھوٹی راجدھانیاں تھیں اس قسم کی ایک راجدھانی مردان کی موجودہ تحصیل تخت بھائی میں تھی جو کہ مہاراجہ کنشک کے دور میں ایک ایسا علمی مرکز تھا جہاں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تخت بھائی کے کھنڈرات صوبہ سرحد کا عظیم تاریخی ورثہ ہے۔ مردان شہر میں شاہ بوستان باباؒ کا مشہور مقبرہ ہے جس کے بارے میں یہاں کے لوگوں میں مختلف عقائد رائج ہیں۔ یہاں کی خواتین بیمار بچیوں کو یہاں لاتی ہیں اور ان کی صحت یابی کے لئے دعا کرتی ہیں۔ صوفی بزرگ شیخ ملتون کا تعلق بھی اسی علاقہ سے ہے جو یوسفزئیوں کے پیر و مرشد تھے۔ ان کے نام سے منسوب مردان سے باہر جنوب میں ایک جدید بستی تعمیر کی گئی ہے۔

شہباز گڑھی: ضلع مردان کا قدیم ثقافتی اور نمایاں خطہ شہباز گڑھی ہے۔ یہاں بدھ دور کے متعدد آثار پائے جاتے ہیں۔ شہباز گڑھی کا قدیم نام لنگر تھا۔ بہت پہلے یہاں ایک اونچا ٹیلہ یا پہاڑ تھا جسے کوہ لنگر کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس سارے قصبے کو لنگر کہا جاتا تھا بعد میں اس کا نام شہباز گڑھی رکھا گیا۔ حضرت اخوند درویزہ کے بیان کے مطابق اس مقام پر تین بھائی تھے جو سید زادے تھے۔ ان تین سید زادوں میں سے ایک کا نام سید محمودؒ تھا جو نہایت نیک اور پرہیز گار تھے۔ یہ جب فوت ہوئے تو اس ٹیلے پر ان کے مریدوں نے ان کی قبر بنا دی جہاں لوگ بکثرت آتے اور اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے تھے بعد میں اسی مقام پر ایک اور شخص آیا جس کا نام شہباز تھا یہ ایک مکار اور مرتد انسان تھا اپنی چالاکی اور چرب زبانی سے لوگوں میں بحیثیت بزرگ شہرت پاتا رہا۔ اس نے اپنے اردگرد عقیدت مندوں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر لی جو اس کے مرید ہو گئے۔ سید محمودؒ کی قبر کی زیارت کے لئے لوگ آتے تھے مگر اس شہباز نامی شخص کو یہ گوارا نہ ہوتا تھا کہ لوگ یہاں آئیں اور سید محمودؒ کی زیارت پر اپنی عقیدتوں کا اظہار کریں اس بناء پر اس کے دل میں سید محمودؒ کے بارے میں کینہ پیدا ہو گیا اس شخص نے اپنے حلقہ اثر میں آنے والے لوگوں کو نصیحت کی کہ جب یہ شخص یعنی شہباز مر جائے تو اسے سید محمودؒ کی قبر میں دفن کر دیا جائے تا کہ لوگ اس کی قبر پر آئیں کچھ عرصہ کے بعد اس کا جھگڑا دریائے سندھ کے پار بسنے والے تنولیوں سے ہوا تو اس کے اور تنولیوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں یہ شخص مارا گیا تو اس کی نعش کو اس کے حمایتی لوگ اٹھا کر لے آئے اور انہوں نے اسے اس کی نصیحت کے مطابق یہاں سید محمودؒ کی قبر میں دفن کر دیا اور پھر اس جگہ کا نام انہوں نے اس کے نام شہباز کی مناسبت سے شہباز گڑھی رکھ دیا تب سے اس قصبے کو شہباز گڑھی کے نام سے پکارا جانے لگا جو آج تک مشہور ہے۔ مغل شہنشاہ بابر 1518ء میں باجوڑ سے ہوتا ہوا جب یوسفزئیوں کے میدانی علاقوں میں پہنچا اور تخت بھائی اور کاٹلنگ سے ہوتا ہوا شہباز گڑھی پہنچا تو اس نے یہاں کے اونچے ٹیلے جسے قدیم عہد میں لنگر پہاڑ کہا جاتا تھا وہاں سیر کی اس نے یہاں سیر کرتے ہوئے اس قبر کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے یہاں کے اسی شہباز نامی ملحد کی اس قبر کے بارے میں شہنشاہ بابر کو تفصیلات بتائیں ان تفصیلات کے پیش نظر شہنشاہ بابر نے اس ملحد کی قبر کو ہموار کروا دیا۔

شہباز گڑھی کے مقام پر ایک قلعہ بھی ہے جسے قلعہ لنگر کہا گیا۔ یہ قلعہ مغل شہنشاہ اکبر کا بنایا ہوا ایک تاریخی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ اس مقام کی اہمیت اور تاریخی حیثیت کا ایک اہم ثقافتی پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں پر بدھ مت کے پیروکار مہاراجہ اشوکا نے اپنے فرامین بھی کندہ کروائے ہیں۔ یہاں پر ماہرین آثار قدیمہ اب تک کھدائی کر رہے ہیں اور بدھ عہد کے متعدد آثار دریافت ہو چکے ہیں۔ شہباز گڑھی مردان شہر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے میں صوابی روڈ پر واقع ہے۔ شہباز گڑھی سے چند کلومیٹر کے فاصلے اور شیوہ اڈہ کے قریب اسوٹا میگالتھ ہیں اور اسی سڑک پر ہی شیوہ اڈہ سے گزر کر صوابی میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ شہباز گڑھی کے علاوہ مردان کے دوسرے اہم دیہات اور قصبے بھی ہیں انہیں کاٹلنگ' طورو مایار' میاں گانو کلے' ہوتی' توت کلے' کلپانی' طاؤس' بالا گڑھی' گجرات' بخشالی' گڑھی کپورہ' گنیت' گوجر گڑھی' کروغ' چمتار' رستم' کوچیان کلے' شیرف کلے بار' بانڈہ' بغدادہ' کلیاڑہ' اوسے کلے اور ھاتھیان قابل ذکر ہیں۔

ہنڈ: چھوٹا لاہور سے چار میل کے فاصلے پر صوابی کے جنوب مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے پر آباد اس علاقے کو کئی وجوہ سے تاریخی اور ثقافتی اہمیت حاصل ہے۔ شوہ اڈہ سے ہوتے ہوئے جب آدمی صوابی پہنچتا ہے تو صوابی کے مقام پر سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سڑک ہنڈ کی طرف جاتی ہے یہ گندھارا کے آخری شاہی خاندان کا دارالخلافہ رہا یہیں سے 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم گزرا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹیکسلا میں راجہ امبی کا مہمان بنا۔ دسویں صدی عیسوی

میں محمود غزنوی اور سولہویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ بابر وارد ہوئے تھے۔

یہی وہ مقام ہے کہ جہاں سے وسطی ایشیاء سے آنے والے قافلے دریائے سندھ عبور کر کے برصغیر کے وسطی علاقوں تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے مہاراجہ جے پال کا دارالخلافہ تھا۔ اس شہر کے متعدد نام گنوائے گئے ہیں۔ موسیو سٹینلے نے ہنڈ کے پرانے ناموں کو اتکانڈیا اتکانڈ لکھا ہے۔ البیرونی نے اپنی تاریخ میں اس مقام کو ویہنڈ کہا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف حملہ آوروں اور مورخوں نے اسے ھنڈیا ہنڈ لکھا ہے۔ اسے ہند کا دروازہ کہا جاتا تھا۔ اسے ھک باندہ پورہ بھی کہا گیا جس کا مطلب ہے دریا کے کنارے کا شہر۔ جب محمود غزنوی نے 1001ء میں راجہ جے پال کو شکست دی تو اس وقت اس شہر کی شکست و ریخت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا ورنہ اس شہر کی بلند و بالا عمارتیں اس کی آبادی' سبزہ زاری اور بہت بڑی مرکزی گزرگاہ اور منڈی کی حیثیت مورخوں کے لئے مرکزی اہمیت رکھتی تھی۔ معروف مورخ و سیاح مقدسی نے دسویں صدی عیسوی میں اس شہر کا دورہ کیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ یہ ''شہر عالیشان دارالخلافہ ہے جو منصورہ سے بڑا شہر ہے یہ ہموار مربع پر محیط ہے۔ اس میں متعدد دلکش باغات ہیں' دریا اپنے عروج پر ہے اس شہر کے باغات کیلے اور کھجوروں کے ہیں۔ ہر شے کی قیمت نہ صرف مناسب بلکہ کم ہے تین من شہد ایک درہم میں خریدا جا سکتا ہے۔ روٹی اور دودھ بہت سستا ہے اور حشرات الارض ناپید ہیں مکانات کی چھتیں چوبی اور خشک گھاس کی ہیں۔ ھنڈ کا موازنہ ایران کے خوبصورت ترین شہروں سے کیا جا سکتا ہے۔''

مہاراجہ اشوکا جو بدھ مت کا پیروکار تھا اس نے 250 قبل مسیح میں بدھ مت کے مبلغین کو اس شہر میں بھیجا تھا۔ چینی سیاح ھیونگ سانگ نے 630ء صدی عیسوی میں یہاں کا تفصیلی دورہ کیا تھا۔ ھیونگ سانگ نے اس شہر کے بارے میں لکھا کہ یہ شہر ایک بڑا تجارتی مرکز ہے اور لوگ کپڑے اور نگینوں کی تجارت کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بڑے خوشحال ہیں یہاں روٹی اور دودھ سستا ہے۔ ھنڈ میں ماضی کے متعدد کھنڈرات اور مزارات ہیں۔ انہیں بڈ ڈھیری' سوختہ ڈھیری' سونہی ڈھیری' چینی ڈھیری' رانا ڈھیری' انبار ڈھیری اور اجی ڈھیری مشہور آثار ہیں۔

یہاں پر سولہویں صدی عیسوی میں مغل شہنشاہ اکبر نے وزیری اینٹوں سے ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا جو اب تک موجود ہے۔

اس شہر کا پرانا رقبہ کچھ اس طرح ہے تین کلومیٹر لمبا' دو کلومیٹر چوڑا' اور تقریباً 38 فٹ گہرا ہے۔ یہاں سے 1996ء اور 1997ء میں نوادرات کی دریافت ہوئی تھی جو اب پشاور یونیورسٹی کے عجائب گھر میں رکھے گئے ہیں۔ حکومت صوبہ سرحد نے یہاں سکندر اعظم کی یادگار تعمیر کروائی ہے۔

یہ تاریخی اور ثقافتی شہر اب تک اپنی ثقافتی حیثیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور یہاں کے لوگ گائے اور بھینس چرانے کے لئے جزیروں میں چھوڑ دیتے ہیں جو شام کے وقت خود بخود اپنی تھان میں واپس آ جاتے ہیں۔ ان مویشیوں کی وجہ سے یہاں دودھ وافر ہے۔

ٹکر: مردان ریجن کی تحصیل تخت بھائی بازار کے بائیں طرف مغرب کی جانب ایک سڑک جاتی ہے جہاں معروف گاؤں ٹکر کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقام مردان کا ایک تاریخی مقام ہے کہ یہاں پر 28 مئی 1930ء میں ایک بہت بڑا خونچکاں واقعہ ہوا تھا۔ یہ ٹکراؤ فرنگیوں اور یہاں کے رہنے والے آزادی پسند مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ فرنگیوں اور علاقے کے لوگوں کے درمیان ٹکراؤ کی وجہ سے ہی اس مقام کا نام ٹکر رکھا گیا۔ جس طرح کہ 23 اپریل 1930ء میں پشاور کے بازار قصہ خوانی میں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ ہوا تھا اور یہاں گولی چلنے کے نتیجے میں آزادی کے کئی متوالے شہید اور زخمی ہوئے تھے اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ اور کچھ دن بعد 28 مئی 1930ء کو ٹکر کا معرکہ ہوا تھا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی

علاقے کا قدیم خاندان سمہ: قدیم تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرحد کے عظیم تاریخی اور ثقافتی شہر مردان کے علاقہ صوابی میں آباد ہونے والا قدیم خاندان سمہ تھا اور اسی خاندان کی موجودگی کی وجہ سے اس سارے علاقے کو تاریخ میں سمہ بھی کہا گیا ہے۔ اس خاندان سے متعلق تفصیل کے مطابق عراق کے شہر بابل میں سمہ خاندان کے نام سے ایک حکمران خاندان کی بنیاد 2452 قبل مسیح میں پڑی تھی۔ اس خاندان کے گیارہ یکے بعد دیگرے حکمرانوں نے یہاں حکومت کی تھی۔ سب سے پہلے حکمران کا نام سموابی تھا اس سموابی کی نسبت ہی سے مختصر لفظوں کے ساتھ اس خاندان کو سمہ کہا گیا۔ اس کا آخری بادشاہ سموستانا تھا جس نے 2182 قبل مسیح سے 2151 قبل مسیح تک یعنی 31 برس حکومت کی۔ حضرت ابراہیم علیہ اسلام شہر بابل میں اسی بادشاہ کے دور میں 2160 قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور جب اللہ کے اس فضیلت مآب پیغمبر کی عمر نو برس کی تھی تو اس سموستانا بادشاہ کو نمرود نے شکست دے کر سمہ خاندان کی حکومت ختم کر دی۔ نمرود کا اصلی نام نموتھا عربی لہجے میں اس کا نام نمرود لکھا گیا ہے۔ اس کا تعلق قوم اکاد سے تھا۔ بہرحال جب نمرود نے سموستانا کی

حکومت ختم کر دی تو یہ مع اپنے خاندان کے مشرق کی طرف اسی علاقہ مردان میں آ کر آباد ہو گیا اور اس سارے علاقہ کا نام اپنے خاندانی اجداد کے نام پر سمہ رکھ دیا۔ قدیم تاریخوں میں اب بھی اس علاقے کا قدیم نام سمہ ہی ہے جو کہ جغرافیائی لحاظ سے ضلع صوابی کا قدیم نام ہے۔

اگرچہ بعد میں یہاں پر آباد ہونے والے پختونوں نے اپنی زبان پشتو کے مطابق سمہ کے لفظ کو اس چھوٹے سے میدان کو قرار دیا ہے جو کہ پہاڑوں کے دامن میں واقع ہو یا جو کسی بارانی نالہ یا دریا کے کنارے بلند میدان پر واقع ہو۔ پشتون پہاڑی علاقے کے مقابلے میں ہموار زمین کو سمہ کہتے ہیں۔

صابی: اس علاقے میں وارد ہونے والی قدیم قوم سمہ ہے اس قوم یا خاندان کی مذہبی عبادات کے حوالے سے یہ صابی کے نام سے موسوم تھی۔ کیونکہ یہ لوگ ستارہ پرست تھے جو کہ مختلف ستاروں کی عبادت کرتی تھی ستارہ پرست کو صائب یا صابی کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع یا جمع الجمع صوابی ہے۔ چونکہ یہ علاقہ ان ستارہ پرستوں سے آباد تھا اس لئے اس نسبت سے اس سارے علاقے کو صوابی کہا گیا جو کہ اب تک مردان ریجن کا سب سے بڑا ضلع اور عہد حاضر میں بھی صوابی کے نام سے موسوم ہے۔ بابل میں اس ستارہ پرست قوم کے ہر ایک ستارے کا ہیکل تھا تو یہاں پر بھی انہوں نے مختلف ستاروں کے نام پر ہیکل بنا کر ان کے مختلف نام رکھ دیئے تھے۔ ابوریحان البیرونی نے ان ستاروں سیاروں کے نام اپنی کتاب الھند میں گنوائے ہیں۔

ڈوماخیل: علاقہ صوابی کی یہ ایک قدیم ترین قوم ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ صوابی کے عہد حاضر کے ایک گاؤں لاہور جسے اب چھوٹا لاہور کہتے ہیں یہ دو حصوں پر مشتمل ہے مشرقی لاہور اور مغربی لاہور اس کے مشرقی اور مغربی دونوں حصوں میں ڈوما قوم کی اولاد موجود ہے جسے ڈوماخیل کہتے ہیں۔ تاریخی اور ثقافتی قدامت کے پیش نظر یہ اس علاقہ کی قدیم ترین قوم ہے۔ میر سید بخاری کا کہنا ہے کہ اسی قوم کے کچھ لوگ ڈیرہ اسماعیل خان کے مغرب میں سلسلہ کوہ شیرانی میں بھی آباد ہیں۔ اس قوم کی تفصیل کے بارے میں آسمانی کتاب تورات کی طرف رجوع کرنے سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ اسلام کے بارہ فرزند تھے ان بارہ فرزندوں میں سے ایک کا نام دوما' یا ڈوم تھا مردر زمانہ کے مطابق ڈوم کی اولاد میں سے جو ڈوماخیل کہلاتی ہے تاریخ کے کسی بھی عہد میں اس طرح مہاجرت اختیار کر کے آ گئے اور پھر چھوٹا لاہور کے مشرقی اور مغربی حصوں میں آباد ہو گئے جو اب تک ڈوماخیل کہلاتی ہے۔

بریا برہمن: کابل شاہان کے نام سے گندھارا پر طویل عرصے تک حکومت کرنے والے لوگ برہمن تھے۔ امیر سبکتگین کے وقت اس خاندان کا راجہ جے پال اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا پایہ تخت صوابی کا علاقہ ھنڈ تھا۔ تاریخ کامل ابن اثیر نے راجہ جے پال کا نام برو جے لکھا' جو کہ بر کی نسبت سے ہے۔ بر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک پڑپوتے کا نام تھا۔ جو حضرت اسماعیل علیہ اسلام ہی کے ایک پوتے کا نام ہے۔ بر بیٹا تھا کیدار کا اور کیدار فرزند ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا۔ راجہ جے پال کا تعلق بر ابن کیدار ابن اسماعیلؑ سے تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ اسلام سے نسبت رکھنے کی بناء پر انہیں برہمن کہا گیا جو کہ ہندوستان کا معزز ترین خاندان ہے۔ تاریخی حوالے سے اس خاندان کے بارے میں جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق اس خاندان کی جائے سکونت افغانستان کا علاقہ شہر کابل کے جنوب میں بیس میل کے فاصلے پر کمری اور چکری کے مقامات ہیں۔ لیث ابن صفار نے 256 ہجری میں یہاں کے علاقے فتح کئے اور اس خاندان کو شکست دی۔ شکست کھانے کے بعد یہ لوگ علاقہ صوابی کے مقام ھنڈ اور لاہور میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔

رونی قوم: علاقہ صوابی مردان ریجن میں گاؤں چھوٹا لاہور کے شمال مشرق کی جانب ایک ٹیلہ ہے جسے رانی گٹ کہتے ہیں۔ یہ اصل میں رونی گٹ تھا جہاں پر رون قوم کے لوگ رونی کے نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی کے فرزند سلطان مسعود غزنوی کے زمانے کا ایک مشہور شاعر اسی قوم رون سے تعلق رکھتا تھا اور رونی کے نام سے مشہور ہوا۔

بیکہ: یہ بھی ایک نہایت ہی قدیم قوم ہے اسے بیکا بھی لکھا جاتا ہے غالباً یہ آرین میں سے ایک خاندان ہے جو اس علاقے میں آباد تھا۔ موجودہ گاؤں چھوٹا لاہور اور ھنڈ کے قریب بیکا کے نام سے ایک مشہور مقام ہے یہاں پر کئی آثار ایک ڈھیری (ٹیلہ) کی شکل میں ہیں اس بیکا کے شمال مشرق میں ایک اور مقام ہے جسے بوکا کہتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ ان دونوں مقامات پر ایک ہی طرح کی قوم بیکہ یا بیکا آباد ہے اور اس قوم کی نسبت سے ہی ان مقامات کا نام بیکا اور بوکا رکھا گیا ہے۔

بھالا: یہ بھی قدیم ترین قوم میں سے ہے اور قیاس یہی ہے کہ اس کا بھی تعلق آریہ اقوام میں سے تھا۔ اسی بھالا قوم کی نسبت سے آثار قدیمہ کے ایک مشہور مقام کا نام سری بالا ہے۔ یہ مقام مردان اور تخت بھائی کے درمیان واقع ہے جہاں متعدد آثار قدیمہ قدیم ترین تاریخ و ثقافت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس بھالا قوم کو بھالو بھی کہا گیا

ہے اور اس بھالو کی نسبت سے دو اور مقامات بھی ہیں۔ ایک مقام موضع چھوٹا لاہور کے قریب دو میل کے فاصلے پر بھالو کے نام پر آباد ہے اور دوسرا مقام موضع بھلو سے دو میل شمال کی جانب برلب دریائے سندھ ہے جسے بھالو کنہر کہا جاتا ہے۔

دراصل ان دونوں قدیم قوموں بیکہ اور بھالو اور مالا کا ذکر سنسکرت زبان کے گرائمر یعنی صرف نحو لکھنے والے پانینی نے اپنی کتاب ''سمکر یتا'' میں کیا ہے۔

یوسف زئی: مردان ریجن بشمول علاقہ صوابی کی وہ تمام اقوام جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہو چکا ہے۔ یہ تمام عہد قدیم اور قبل از مسیح سے تعلق رکھنے والی اقوام ہیں جبکہ اس وقت مردان میں سب سے بڑی پشتون قوم یوسف زئی ہے۔ جو اس علاقے اور اس سے اوپر پہاڑی علاقوں پر قابض ہونے والی شستہ اور نفیس پشتو زبان بولنے والی قوم ہے اور اب عہد حاضر میں مردان و مضافات میں اپنی مختلف خیلوں کے نام سے اور ذیلی شاخوں کے دیگر ناموں کے ساتھ آباد قوم ہیں۔ یوسف زئیوں کی کئی ذیلی شاخیں ہیں جو اپنے طور پر ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ من حیث القوم یوسف زئی دریائے کابل کے بالائی حصوں سے مشرق کی طرف آئے۔ میدانی علاقوں میں آباد دلہ زاکوں کو انہوں نے منتشر کر کے کچھ تو دریائے سندھ کے پار علاقہ چھچ و ہزارہ کی طرف دھکیل دیا اور بعض کو باجوڑ کے پہاڑی علاقے کی طرف منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے سواتیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے سندھ پار کی طرف دھکیل دیا۔

یوسف زئیوں نے ایسا باوقار تشخص حاصل کیا کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ یوسفزئی لکھنے پر فخر محسوس کرتے۔ ملک احمد، شیخ ملی اور شاہ منصور اس یوسفزئی قبیلے کے نہایت ہی نامور سرداروں میں سے ہیں اور مغل تاجدار ظہیر الدین بابر کے ساتھ اپنے قومی تشخص کے قیام و بقاء کے معاملات سے متعلق متعدد مذاکرات کئے۔ مردان کے یوسف زئی، میدانی علاقے کے یوسفزئی کہلاتے ہیں۔ ان یوسف زئیوں کے تین بڑے گروہ ہیں کمالزئی، امازئی اور بائیزئی۔ مردان ریجن کے یوسفزئی زیادہ تر زراعت پیشہ لوگ ہیں اور نہایت جفاکشی سے انہوں نے اپنی زمینوں کو زرخیز بنایا ہے۔ یہ خوش وضع اور خوش پوش لوگ رہے ہیں۔ پٹھانوں میں یوسفزئیوں کو معتبر اور برتر پٹھان سمجھا جاتا ہے۔ زمین کا روایتی نظام جس کے تحت ہر فرد کا ایک دفتر یعنی اس کا اپنا قطعہ زمین بھی ہے۔ جین ڈبلیو سپین کے مطابق قبائلی شاملات میں اس کا حصہ بھی بدستور قائم ہے۔ نتیجہ چھوٹے زمینداروں کا بڑا طبقہ موجود ہے لیکن انیسویں صدی میں برطانوی بندوبست اراضی کے تحت برپا ہونے والے نظام خانی کی وجہ سے بعض انفرادی زمینی املاک 20 ہزار ایکڑ سے بھی اوپر تک جا پہنچی ہے۔

بہر حال مردان جسے میدانی علاقہ کہا جاتا ہے یہاں بسنے والے یوسف زئی تعلیمیافتہ، ہنرمند، تہذیب بردار، تمیز دار اور خوشگفتار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے خیلوں اور ذیلی شاخوں کی تعداد دیگر پٹھان قبیلوں سے زیادہ ہے۔

یوسفزئی دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک کو یوسفزئی اور دوسرے کو مندنڑ کہا جاتا ہے۔ حضرت اخوند درویزہ نے اس کی جو تفصیل دی ہے اس کے مطابق اس قبیلے کے جد امجد کا نام مند تھا۔ مند کے دو بیٹے تھے ایک یوسف جس کی اولاد اپنے مورث کے نام سے یوسفزئی کہلاتی ہے۔ دوسرے کا نام عمر تھا جسے مندنڑ کہا جاتا ہے اس کی اولاد اپنے مورث کے نام سے مندنڑ کہلاتی ہے۔ یوسف کے پانچ بیٹے تھے:

(1) عیسےٰ (2) موسےٰ (3) مالی (4) اکو (5) اوریا۔

عیسےٰ کے گیارہ بیٹے تھے، مغلوں کی فوجوں سے تصادم کے نتیجے میں عیسےٰ خود اور اس کے نو بیٹے مارے گئے۔ صرف دو بیٹے زندہ بچے ایک کا نام حسن تھا اس کی اولاد حسن زئی کہلاتی ہے اور دوسرے کا نام یعقوب تھا اس کی اولاد یعقوب زئی کہلاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عیسےٰ کا ایک اور بھی بیٹا تھا جو عیسےٰ کی وفات کے بعد پیدا ہوا اس کا نام اکا تھا اس کی اولاد اکوزئی کہلاتی ہے۔

یوسفزیوں کی دوسری شاخ مندنڑ ہے یہ لوگ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اپنے مورث اعلیٰ کے نام سے پر مندنڑ مشہور ہیں اور یہ سب کے سب مردان میں شمال مشرق کی طرف چملے کے علاقے تک پھیلی ہوئی ہے۔

مندڑ کی شاخیں: مندڑ کے تین بیٹے تھے (منور (2) خضر (3) رجڑ۔ منور کے دو بیٹے تھے (1) عثمان (2) اتمان۔ عثمان کے دو بیٹے تھے (1) کمال (2) امان۔

کمال کی اولاد کو کمال زئی کہتے ہیں جو کہ دو شاخوں میں پھیلی ہوئی ہے ایک کو مشران زئی کہتے ہیں اور دوسری کو کشران زئی۔

مشران زئی سے تعلق رکھنے والے طورو کے خوانین ہیں جبکہ ہوتی مردان کے نواب و خوانین کا تعلق کشران زئی سے ہے۔

اتمان نامہ: اتمان کی اولاد میں سے ایک شاخ وہ ہے جو شجرے میں اتمان نامہ سے مشہور ہے۔ اتمان نامہ میں اکازئی، گنازئی اور علی زئی شامل ہیں۔ جبکہ (باسیند) بذات خود ایک قبیلہ ہے جو کہ دریائے سندھ کے کنارے مہابن کے جنوب میں آباد ہے۔ یہ جن جن دیہات میں آباد ہیں وہ بیٹو پی، سینی، کوٹہ اور مرغز ہیں۔

دوسری شاخ میں سدو کی اولاد آتی ہے سدو کی ذیلی شاخیں یہ ہیں: اباخیل، عمرخیل، میراحمدخیل، بہزادخیل، خدوخیل اور بامخیل۔

یہ خیلیں جن جن گاؤں میں آباد ہیں وہ یہ ہیں: کنڈہ، زیدہ، ہنڈ اور شاہ منصور میں ابا خیل آباد ہیں۔

مرغز، ٹنڈ کوئی اور سلیم خان میں میراحمدخیل آباد ہیں۔

کلابٹ میں خدوخیل اور پشتارڈاگئی، توتالئی اور باجامیں بامخیل آباد ہیں۔

رجڑ: رجڑ کو پشتو رسم الخط میں زرڑ لکھا جاتا ہے یہ طبقہ پانچ شاخوں میں منقسم ہے۔ مانی زئی، ملک زئی، اکوزئی، خضرزئی اور محمودزئی آباد ہیں۔

خٹک: تمدنی رکھ رکھاؤ، تہذیب واطوار سے قریب تر تعلیم وہنر اور نفاست فنون لطیفہ سے واقفیت رکھنے والی خٹک قوم جو کہ اپنی علاقائی پہچان کے ساتھ صوبے کے شمالی حصوں سے لے کر شمال مشرق اور جنوب مشرق ومغرب کے علاقوں تک پھیلی ہوئی قوم ہے۔ پٹھانوں کے نامور قبیلوں میں سے ایک کثیر التعداد افراد پر مشتمل قبیلہ ہے۔ انہوں نے اپنی مخصوص اوصاف کھوئے نہیں بلکہ ان میں ارتقائی تنوع پیدا کیا ہے۔ یہ بہادر، محنتی، جنگجو اور پٹھانوں کی مشترکہ سماجی صفت مہمان نوازی میں کم واقع نہیں ہوئے۔ یہ ابتدائی ایام میں صوبے کے جنوبی اضلاع کے چٹیل میدانوں اور بے آب وگیاہ پہاڑوں اور غیر مزروعہ زمینوں سے اٹھے اور وہاں سے منتقل ہوتے ہوئے صوبے کے ہر علاقے میں پھیلتے گئے۔ یہاں تک کہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے ہوتے ہوئے اور اس دریائی کنارے کے تمام علاقوں پر اپنا تسلط جماتے ہوئے اپنے قبائلی نظام کے تحت ایک نہایت ہی مدبر، موقع شناس اور بہادر جنگجو سردار ملک اکوڑہ خان خٹک کی سربراہی وقیادت میں دریائے کابل کے مشرقی کنارے پر پہنچ گئے اور اس علاقے کو اپنی دائمی اور ابدی سکونت بنا کر رہنے لگے۔ ابتداء میں اس علاقے کو سرائے اکوڑ خان خٹک کا نام دیا گیا جسے بعد میں اکوڑ خان خٹک سے منسوب کر کے حتی اکوڑہ خٹک کہا جانے لگا۔ ملک اکوڑ خان خٹک مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کی ایماء پر اپنے قبیلے کے جنگجو لوگوں کو لے کر یہاں آیا، مغل بادشاہ کا مقصد ان خٹکوں کے ذریعے یوسف زئیوں کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رہنا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہ خٹک لوگ کافی عرصے تک مغلوں کی ڈھال بن کر یوسف زئیوں سے نبرد آزما رہے جلال الدین اکبر نے ملک اکوڑ جسے ملک اکو بھی کہا جاتا ہے اسے اپنے بھرے دربار میں ملک الشعور کا خطاب دیا لیکن ملک اکوڑہ خان نے اس اعزاز کو یہ کہتے ہوئے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہوسکتا ہے کہ اس سرکاری اعزاز کو میرے قبیلے کے لوگ پسند نہ کریں اور مجھ سے حسد کرنے لگیں اس لئے میرے لئے یہ مناسب رہے گا کہ بادشاہ کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا جائے کہ قافلوں اور جانوروں کی آمد ورفت پر میں ٹیکس لیا کروں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس ٹیکس کو وہ کان (گوش) ٹیکس پکارتا تھا اس ٹیکس کی محصولات میں سارا قبیلہ حصہ دار تھا بعد میں اس ٹیکس میں توسیع ہوتی گئی اور یہ ٹیکس پھیلتے پھیلتے گھاٹ، کنواں، گھر، نمک اور زمین تک حاوی ہوگیا اور پھر نوشہرہ سے لے کر سندھ تک کا علاقہ اس کی جاگیر میں آ گیا۔ ملک اکوڑ طبیعت کا غنی تھا اس نے جگہ جگہ مسافروں کے قیام کے لئے سرائیں بنوائیں جہاں قیام کے علاوہ طعام کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ ملک اکوڑہ خان نے 1550ء سے 1600ء تک سرداری کی اور پھر اپنے ہی قبیلے میں مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بیگے جانشین ہوا جس نے تقریباً 20 سال تک سرداری کی اور یوسف زئیوں سے لڑتے ہوئے کام آیا۔ پھر اس کا پوتا شہباز خان جانشین ہوا اسے اس کی خصلت کی بناء پر لوگ حاتم ثانی کہتے ہیں طبیعت کا درشت اور توسیع پسند خصلت رکھتا تھا۔

یوں تو یوسف زئیوں اور خٹکوں کے درمیان جو آویزش کی فضاء پیدا ہوئی تھی اس کے نتیجے میں کئی مقامات پر چھوٹی موٹی معرکہ آرائی ان دونوں قبائل کے درمیان ہوتی رہی ہیں مگر جہاں تک یوسف زئیوں کے علاقوں میں خٹکوں کے قبضے کا تعلق ہے اس کا آغاز شہباز خان نے اپنے باپ بیگے خان کے زمانے ہی میں یوسف زئیوں کے ساتھ باقاعدہ لڑائیوں سے کر دیا تھا۔ تاریخ مرجع میں افضل خان نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شہباز خان قبیلے کی سرداری کے لئے اپنے آپ کو حقدار تسلیم کروانے کی خاطر یہ ضروری سمجھتا تھا کہ وہ کسی غیر خٹک قبیلے کے ساتھ مستقل جنگ کرے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے باپ بیگے خان کے منع کرنے کے باوجود یوسف زئیوں سے لڑائی مول لیتا رہا چنانچہ ایک طرف یوسف زئیوں کا سردار بھاکو خان مدمقابل رہا ہے تو دوسری جانب شہباز خان۔ ان جنگوں کا نتیجہ یہ رہا کہ خٹک یوسف زئیوں کی زمینوں پر قابض ہونے لگے اور پھر نتیجہ یوسف زئیوں کے ان علاقوں، جہانگیرہ، مانکئی، تورڈھیر، جلبی، جلبی اور لاہور تک خٹک قابض ہوگئے۔ جبکہ اس کے علاوہ بھی مردان ریجن کے بعض علاقوں میں یہ خٹک آباد ہیں۔ مثلاً لونڈ خوڑ۔ جمال گڑھی۔ شیر گڑھ وغیرہ اور پھر یہاں سے آگے بڑھ کر مالاکنڈ ایجنسی کے سخاکوٹ اور درگئی میں آباد ہوگئے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب شہباز خان اور بھاکو خان اپنے اپنے حلقہ اثر قبیلوں یا لوگوں کے ساتھ متحارب گروہوں کے طور پر لڑ رہے تھے تو اسی لڑائی کے دوران، یوسف زئیوں کے علاقے میں شہباز کو ایک تیر کنپٹی پر لگا جس سے شہباز خان

جانبر نہ ہو سکا اور وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خوشحال خان خٹک قبیلے کا سردار مقرر ہوا جو بعد میں بلف شمشیر اور سخن ادب و شعر اور ذہانت و فطانت کا محافظ ثابت ہوا۔

سادات: مردان و صوابی کے مختلف علاقوں میں سادات کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو اپنے شجرہ نسب کے حوالے سے اپنے علاقوں میں خاص حلقہ اثر رکھتے ہیں۔ ان سادات میں کچھ تو گیلانی ہیں جن کے بارے میں ابھی تسلی بخش تحقیق نہیں ہو سکی۔ البتہ بخاری سادات کا حلقہ دیگر علاقوں کی طرح مردان و صوابی و مضافات میں بھی خاصا وسیع ہے۔ صوابی کے قدیم گاؤں چھوٹا لاہور میں پڑھا لکھا بخاری سادات کا گھرانہ علمی اور خاندانی شہرت کا حامل ہے۔ اس خاندان کا شجرہ نسب کچھ اس طرح سے ہے کہ میر سید بخاری کے والد سید محمد شاہ بخاری مرحوم کی جہت سے حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے ننھیال مروند (افغانستان) کے سادات تھے جن سے تعلق اور رابطہ شجرے کے لحاظ سے حضرت مخدوم عاشقان لعل شہباز قلندرؒ کا تھا۔

بزیدزئی یا بیزئی: یہ یوسف کے آخری بیٹے اکو کی اولاد میں سے ہیں۔ اکو کی دو بیویاں تھیں ان دو بیویوں کے بطن سے نصف درجن بیٹے پیدا ہوئے بعد میں ان سے کئی خیلیں چلیں۔ ان خیلوں میں سے بزیدزئی یا بیزئی ہیں جن کے ساہت حصے ہیں انہی میں سے کچھ مردان کے اوپر لونڈ خوڑ وادی میں آباد ہیں اور باقی سوات کے بائیں کنارے کوہ دوسرا کی شمالی ڈھلان سطح مرتفع غور بند اور دریائے سندھ میں وادیوں اور کوہستان میں آباد ہیں۔

گدون یا جدون: یہ مشرق کی طرف ایک کونے میں گدون یا جدون نام کے ساتھ آباد تھے۔ اس سارے علاقے کو گدون کہا جاتا ہے جہاں عہد حاضر کا صنعتی علاقہ ہے اور بڑی بڑی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔

صاحبزادگان یا پیرزادگان: مردان میں پیرزادگان یا صاحبزادگان کے خاندانی نسبی سلسلہ کے ساتھ یہ معتبر اور قابل تکریم خاندان ہے ان کا نسبی سلسلہ نیک و پارسا بزرگ حضرت مدیخ بابا سے ملتا ہے۔ البتہ حضرت مدیخ بابا کی اولاد کا جو سلسلہ ہے اسے مداخیل کہا جاتا ہے جو کہ یوسف زئیوں کی ایک شاخ کے طور پر شناخت کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو صاحبزادگان یا پیرزادگان کہا گیا۔ اسی خاندان کے لوگ مردان کے علاوہ دیگر کوہستانی علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت مدیخ بابا کی اولاد میں سے حضرت پیر گل نامی بزرگ اپنے جد اعلیٰ حضرت مدیخ بابا رحمتہ اللہ علیہ کے نقش قدم پر چل کر زہد و تقویٰ اور علم و عرفان کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچے۔

ہوتی: یہ یوسف زئی قبائل کا مشہور و معروف اور نامور قبیلہ ہے۔ مردان میں اس قبیلے کے لوگ معتبر اور روسا میں سے شمار ہوتے ہیں۔ سماجی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے ہوتی قبیلے کے لوگ غیر معمولی مقام رکھتے ہیں۔ اس قبیلے کے وہ لوگ جو کہ سیاست و معاشرت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انہیں عموماً ہوتی نوابوں کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ مردان کی زمینوں کا وسیع تر رقبہ ان کے زیر تصرف ہے۔ زمینی جاگیروں کے مالک ہونے کے علاوہ صنعتی میدان میں بھی ان کا حلقہ اثر وسیع ہے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہوتی قبیلے کے نواب اکثر ملکی اور حکومتی حلقے میں ناموری رکھتے ہیں اور یہ نواب لوگ حکومتی اقتدار میں ہمیشہ شریک کار رہے ہیں اور وزارتوں اور مشاورتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اس قبیلہ ہوتی کے نام پر ہی قدیم مردان کا علاقہ ہے جو کہ ایک گاؤں ہے جسے اب ہوتی مردان کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مردان کے نام سے پہلے یہی ہوتی گاؤں ہی پورا مردان تھا اور آبادی کے لحاظ سے یہ مردان کا بہت بڑا خطہ ہے۔ یوسف زئیوں کے اس بڑے قبیلے کی جو ذیلی شاخیں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

بابو خیل، محمد خیل، مرجا خیل، بنوسا خیل، بلند خیل، لنگر خیل، نورمن خیل اور ماندوری۔ ان خیلوں میں ماندوری ذیلی قبیلہ ایک ایسا قبیلہ ہے جو کہ پورے مردان کے ہر گاؤں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ مردان اور مضافاتی بستیوں میں آباد ہیں۔

دانشور اہل قلم ڈاکٹر پروفیسر ہمایوں ہما کے کہنے کے مطابق دراصل ہوتی ایک ہندو کا نام تھا جس کی نسبت سے اس جگہ کا نام ہوتی پڑ گیا اور یہاں کے رہنے والے لوگ اپنے نام کے ساتھ ہوتی لگانے لگے۔ ہوتی قبیلہ نہیں ہے بلکہ یہ یوسفزئی قبیلے کے لوگ ہیں۔

درج بالا یوسف زئی قبیلے کے ذیلی قبائل کے یہ لوگ زیادہ تر مردان کے مضافات میں آباد ہیں جبکہ مردان شہر سے تعلق رکھنے والے یوسف زئیوں کے ذیلی قبائل میں مشہور قبیلے یہ ہیں:

رستم خیل، مدی خیل، خان خیل، پیران، صاحبزادگان اور سید۔

مقامی کھانے اور پکوان

مردان ریجن بشمول ضلع صوابی و مضافات کا تمام علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ جہاں پر سبزیوں، گنے اور تمباکو کی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مال مویشی بھی بکثرت پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے گائے، بھینس اور بھیڑ اور بکریوں کا دودھ بھی وافر پایا جاتا ہے۔ دودھ سے مکھن، پنیر اور مٹھائیوں کی متنوع اشیاء بنائی جاتی ہیں جبکہ گنے اور چقندر سے چینی بنانے کی یہاں چھوٹی بڑی ملیں بھی ہیں۔ ہر قسم کی سبزی اس علاقے میں کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں گندم کے علاوہ مکئی اور باجرے کے کھیت بھی ہیں۔ مال مویشی وافر ہونے کی وجہ سے یہ گائے اور بھینس کا دودھ پینے کے ساتھ ساتھ گائے بھینس کا گوشت بھی زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ بعض وہ علاقے جہاں پانی بکثرت ہے وہاں چاول کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ اکثر چاول بھی اپنے معمولات کے کھانے میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر لوگ مکئی کے آٹے کی روٹی سالن اور دودھ کے ساتھ کھاتے ہیں۔

کھانے کے اوقات: صوبہ سرحد کے بیشتر علاقوں کی طرح یہاں اور مضافات میں بھی کھانے کے وہی اوقات ہیں جو کہ صوبے کے دوسرے علاقوں میں ہیں۔

کھانے کے بشمول ناشتہ تین اوقات ہیں جبکہ عصر اور مغرب کے درمیان کے وقت میں عموماً دودھ کی چائے پینے کا رواج عام ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو کہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں وہ گرمیوں اور سردیوں دونوں موسموں میں اس وقت کے دوران چائے ضرور پیتے ہیں مگر جب تک چائے ایجاد نہیں ہوئی تھی تب تک اس وقت کے دوران یہ لوگ نمکین لسی پیتے تھے البتہ گرمیوں کے موسم میں دودھ کی کچی لسی کا استعمال زیادہ کیا جاتا تھا۔

صوابی کے دیہات میں مجھے ذاتی طور پر جو تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے اس کے مطابق یہ لوگ دوپہر کے بعد عصر کے وقت مکئی کے دانے جو کہ دیہاتوں میں بھٹیوں پر بھونے جاتے ہیں مرد و خواتین گھروں میں کھاتے ہیں اور حجروں میں مہمانوں کو بھی یہ دانے کھلائے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ رات کو سونے سے پہلے اور رات کے کھانے کے بعد دودھ پیتے ہیں۔

صبح کا ناشتہ: علاقے کے لوگ عموماً مذہبی روایت کے پابند لوگ ہیں اس لئے تمام علاقے کے مرد اور خواتین صبح کی اذان کے ساتھ اٹھ جاتے ہیں۔ مرد بستی میں قائم مسجد میں نماز باجماعت پڑھتے ہیں اور خواتین گھروں میں ہی نماز فجر ادا کرتی ہیں نماز کے بعد عموماً لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں گھر کی بڑی خواتین ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں دیہاتوں میں عموماً ہر گھر میں تنوری ہوتی ہے جس میں روٹیاں پکائی جاتی ہیں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ صبح کے ناشتے کے وقت بھی بعض گھرانوں میں تنوری میں ہی روٹیاں پکائی جاتی ہیں تاہم شہروں میں توے پر پراٹھے پکائے جاتے ہیں دیہاتوں میں اب بھی دیسی گھی استعمال کیا جاتا ہے اس لئے گاؤں کی خواتین دیسی گھی کے پراٹھے پکاتی ہیں خصوصاً اس وقت کہ جب کوئی مہمان ہو تو توے پر دیسی گھی کے پراٹھے تیار کئے جاتے ہیں اور انڈے پکائے جاتے ہیں اور چائے کے ساتھ ناشتہ کیا جاتا ہے تاہم بعض قدیم گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں اب تک صبح کے ناشتے میں بھی لسی استعمال ہوتی ہے مرد و خواتین رات کی بچی ہوئی تنوری کے ساتھ لسی استعمال کرتے ہیں روٹی کا نوالہ منہ میں ڈال کر اوپر لسی کا گھونٹ پی لیتے ہیں لیکن یہ رواج اب بہت کم رہ گیا ہے عموماً چائے کا استعمال زیادہ ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غریب لوگوں کا ناشتہ عموماً بہت سادہ ہوتا ہے یہ لوگ عموماً رات کی بچی ہوئی روٹی ہی چائے کے ساتھ نوش کر کے اپنے کھیتوں اور دوسرے کام دھندے پر چلے جاتے ہیں اور گھر کی خواتین گھریلو کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

امراء لوگوں کے ناشتے میں تکلف کا اہتمام بھی ہوتا ہے خاص کر ایسے وقت میں جبکہ مہمان ہو تو ناشتے میں مہمانداری کے طور طریقوں میں دیسی گھی کے پراٹھے، مکھن اور چائے کا استعمال ہوتا ہے جبکہ میرے مشاہدے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ صبح کا ناشتہ بھی دوپہر یا رات کے کھانے کا ہم رنگ ہوتا ہے اور باقاعدہ چاول، مرغی کا سالن اور گائے کی کلیجی بھی ناشتے میں شامل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شہد اور مکھن اور چائے بھی ناشتے کے تواضع میں شامل ہے۔

دوپہر کا کھانا: عام طور سے مضافات میں دن کے گیارہ بجے ہی سے دوپہر کے کھانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہے۔ دیہاتوں میں روایتی بنے ہوئے مٹی کے چولہوں میں درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں کا ایندھن جلایا جاتا ہے اور چولہے کے اوپر مٹی کی ہنڈیا میں سبزی اور گوشت کی ترکاری پکائی جاتی ہے۔ صبح ہی سے گندم کا آٹا گوندھ لیا جاتا ہے جو دوپہر کے وقت تک خمیر ہو جاتا ہے اور گھروں میں بنائی ہوئی مٹی کی تنوریوں میں گائے اور بھینس کے گوبر کے ایندھن کو جلا کر تنوری کو گرم کیا جاتا ہے ہر گھر سے تنوری کے شعلوں سے اٹھے ہوئے دھوئیں سے عجیب خوشکن قدرتی منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ تنوری میں گندم کے آٹے اور مکئی کے آٹے کی بڑی بڑی روٹیاں پکائی جاتی ہیں تاہم مکئی کے آٹے کی روٹیاں گندم کے آٹے کی روٹی

کی نسبت چھوٹی ہوتی ہے۔ مردان وصوابی کے شہروں میں عموماً لوگ نانبائی کی دوکان کی روٹیاں ہی استعمال کرتے ہیں مگر دیہات میں اب تک قدیم اور روایتی طرح کی روٹیاں ہی پکائی جاتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے کھانے میں لسی کا استعمال عام ہے اور سبزیوں میں اگر ساگ' گوبھی اور شلغم پکا ہو تو مکئی کی روٹی کے ساتھ ترکاری کھائی جاتی ہے۔ لوگ زیادہ تر دوپہر کی نماز سے پہلے ہی کھانا کھالیتے ہیں۔

رات کا کھانا: مردان وصوابی کے شہروں میں کام کاج کرنے والے دوکاندار وغیرہ شام سے پہلے ہی اپنے کام کاج کو ختم کر دیتے ہیں اور دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ عموماً لوگ دیہاتوں کے باشندے ہوتے ہیں اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اپنے اپنے دیہات اور گھروں میں پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں اس اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی لوگ اپنے بال بچوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں غرضیکہ سب کی روایتی زندگی دیہات سے منسلک ہے اور دیہات کی روایتی زندگی اور زندگی کے طور طریقوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مرد حضرات عشاء کی نماز دیہات کی مساجد میں ہی ادا کرتے ہیں اور پھر عشاء کی نماز کے بعد گھر میں پکا ہوا کھانا تمام ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ رات کے کھانے میں دوپہر کا بچا ہوا کھانا ہوتا ہے اور وہی تنوری میں پکی ہوئی روٹی کھائی جاتی ہے۔ البتہ کھانے کے بعد یا کھانے کے ساتھ ہی علاقے میں پیدا ہونے والے پھلوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے عام طور سے کھانے کے بعد خربوزہ، آڑو، آم، مالٹا اور امرود وغیرہ کو نوش کیا جاتا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد سونے سے پہلے لوگ اکثر دودھ پیتے ہیں۔ سن رسیدہ مرد وخواتین اکثر رات کا کھانا عام طرح سے ہٹ کر کھاتے ہیں کہ تنوری کی پکی ہوئی تھوڑی سی روٹی دودھ کے ساتھ کھالیتے ہیں اور یہی ان کا رات کا کھانا ہوتا ہے۔

پنیر: چینی سیاح ھیونگ سانگ اور فاہیان نے یہاں کی سیاحت کی۔ ھیونگ سانگ نے ھنڈ کو یہاں کا آباد ثقافتی شہر قرار دیا ہے۔ اس نے یہاں کے لوگوں کی بود وباش' رہن سہن اور خوراک کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ھیونگ سانگ جو کہ ساتویں صدی میں یہاں آیا اس نے یہاں کے مال مویشیوں اور دودھ' مکھن' گھی اور پنیر کا بہت ذکر کیا ہے۔ یہاں پنیر قدیم دور سے بنایا جاتا ہے اور لوگ بہت شوق سے پنیر کھاتے ہیں۔ صوابی اور مردان کے علاقے میں پنیر استعمال بھی زیادہ ہوتا ہے اور سستا بھی ہے۔ اکثر روٹی کے ساتھ بھی لوگ پنیر کھاتے ہیں۔

سالن: مردان' صوابی اور مضافات میں سالن بنانے کا رواج شروع ہی سے ہے مضافات میں زیادہ تر ساگ کا سالن' آلو اور چنے کی دال کا سالن پکتا ہے تاہم ہر سالن میں گائے اور بھینس کا گوشت عام طور سے پکایا جاتا ہے۔ گوشت خوری کا رواج عام ہے البتہ مرچ مصالحوں کا استعمال کم ہوتا ہے۔ یہاں پر چونکہ شلغم اور چقندر کی کاشت زیادہ ہوتی ہے اس لئے عموماً گھروں میں شلغم گوشت کا سالن پکتا ہے اور لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اکثر گھرانوں میں رات کو چاول پکائے جاتے ہیں مگر یہ التزام کے ساتھ نہیں پکائے جاتے تاہم کوئی مہمان آ جائے تو چاول مٹر ملا کر پکائے جاتے ہیں چاولوں میں بھی گوشت ہوتا ہے اسے یہ لوگ پلاؤ کہتے ہیں۔

خاص خاص پکوان: مردان وصوابی کا کوئی بھی ایسا شہر اور دیہات نہیں جہاں چپلی کباب کی دکان نہ ہو مگر یہ چپلی کباب صرف بازاروں اور گلیوں اور چوراہوں میں دکانوں پر ہی بنائے جاتے ہیں۔ پشاور کی طرح کے ہی لذیذ اور مزیدار چپلی کباب قیمے میں مختلف مصالحہ جات ملا کر بڑی سی کڑاہی میں بھینس یا گائے کی چربی کے تیل میں بنائے جاتے ہیں۔ ان چپلی کبابوں کے بنانے کی ایک خاص ترکیب ہے' قیمے میں مکئی کا آٹا اور پیاز کو باریک کاٹ کر ملایا جاتا ہے اور پھر اس میں مختلف مصالحے اور ٹماٹر ملا کر کڑاہی میں گولائی میں پکایا جاتا ہے یہ سارا عمل ہاتھ کے ساتھ ہوتا ہے نہ صرف مقامی لوگ کھاتے ہیں بلکہ مہمانوں کی تواضع بھی ان کبابوں سے کی جاتی ہے۔ مردان کے علاقہ کے ایک مشہور بازار میں ''توت کڑاہی'' نام سے چپلی کباب کی دکان نے بڑی شہرت حاصل کی ہے اس دکان کے کباب نہایت ہی لذیذ اور ہاضمے دار ہوتے ہیں۔ کباب عموماً گندم کے آٹے کی روٹی کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ مکئی کے آٹے کی روٹی سے یہ کباب زیادہ نہیں کھائے جاتے۔

بدایونی پیڑے: یہ مردان کی نہایت ہی مشہور اور مخصوص مٹھائی کے پیڑے ہیں ان پیڑوں نے مردان کے خاص پکوان کی حیثیت سے قومی سطح پر شہرت حاصل کی ہے اور یہاں سے دور دراز کے علاقوں میں بطور تحفہ یہ لائے جاتے ہیں۔ یہ نہایت ہی لذیز اور خاص خوشبودار کھوے کے پیڑے ہوتے ہیں۔ مردان کے معروف بازار بنک روڈ پر قدیمی دکان ہے جہاں سے یہ دستیاب ہوتے ہیں۔ ان بدایونی پیڑوں کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ یہ پیڑے ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع بدایوں میں بنائے جاتے تھے۔ اس مٹھائی کا اپنا نام صرف پیڑا ہے مگر

جب مردان میں یہ بننے لگے تو یہ بدایوں کی مناسبت سے بدایونی پیڑے کہلانے لگے۔ 1947ء میں پاکستان بننے کے بعد بدایوں ضلع سے ہجرت کر کے سات بھائی پاکستان آ گئے اور مردان میں رہائش اختیار کر لیا اور بازار میں ایک دکان لے کر مٹھائی کے کاروبار کو اختیار کر لیا۔ لوگوں کی طرف سے ان پیڑوں کو بڑی پذیرائی حاصل ہونے لگی اور یہ خاص قسم کے مقوی، لذیذ اور خوشبودار پیڑے دور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی خریدنے لگے۔

یہ بدایونی پیڑے دودھ سے نکلے ہوئے کھوئے سے بنتے ہیں اس کھوئے میں چینی اور دیگر خاص قسم کی خوشبویات کی آمیزش ہوتی ہے اور انہیں آگ کی مدھم آنچ پر ایک کڑاہے میں اچھی طرح بھون لیا جاتا ہے جب یہ تیار ہو جاتا ہے تو پھر اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی رنگ وغیرہ نہیں ڈالا جاتا اس کا اپنا ہی اصلی رنگ ہوتا ہے۔

ککوں: ویسے تو صوبہ سرحد کے تمام اضلاع کے دیہات میں ککوں کا استعمال بھی ہوتا ہے اور ککوں کھانیوں میں بنتا بھی ہے مگر مردان وصوابی میں چونکہ گنا بکثرت پیدا ہوتا ہے اس لئے اس علاقے میں ککوں کو خوراک میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل کڑاہے میں گنے کا رس ہوتا ہے جسے گھانیوں کے ذریعے سے نکالا جاتا ہے اس ککوں کو روایتی انداز میں مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھڑوں میں ڈالا جاتا ہے زمیندار لوگوں کے گھروں میں بھی استعمال ہوتی ہے جبکہ قریبی رشتے داروں اور شہر میں بسنے والے دوست احباب کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ گھر کے مرد وخواتین اسے دسترخوان پر پیالے میں رکھتے ہیں اسے سادہ طریقے سے بھی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں البتہ امراء لوگ اسے آگ پر گرم کر کے اس میں دیسی گھی یا خالص مکھن ملا کر روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اس کے استعمال سے ہاضمہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور یہ کہ یہ روٹی کے ساتھ لذیذ خوراک بھی ہے۔ گھڑوں میں یہ ککوں کئی کئی مہینوں تک رہتا ہے گرمیوں میں اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔

سرخ وسفید مٹھائی: مردان شہر میں ایک خاص قسم کی سرخ اور سفید قسم کی مٹھائی بھی دستیاب ہوتی ہے اس مٹھائی کی متعدد دکانیں شہر کے علاوہ دیہات میں بھی ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگ بڑے شوق سے یہ مٹھائی خریدتے ہیں اور گھروں میں مہمانوں کو بھی پیش کرتے ہیں جبکہ بیاہ شادی کے موقعوں پر منوں کے حساب سے یہ مٹھائی خریدی جاتی ہے۔ مقامی لوگ اسے سادہ مٹھائی یا سواتی مٹھائی کہتے ہیں۔ یہ حلوائیوں کی دکان کے علاوہ مردان کی ہر بیکری کی دکان پر بھی دستیاب ہوتی ہے۔ عموماً یہ مٹھائی سرکنڈوں اور مزری سے بنی ہوئی پانچ اور دس کلو کی پچھیوں میں ڈال کر بیچی جاتی ہیں۔ عید اور بیاہ شادی کی خوشیاں اس مٹھائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتیں۔

چلم: مردان وصوابی کے دیہاتوں مین حجروں میں چلم کا استعمال عام ہے۔ چونکہ اس تمام علاقے میں تمباکو کی کاشت بہت زیادہ ہوتی ہے اور جگہ جگہ پر تمباکو کی فیکٹریاں ہیں جو جدید طریقے سے سگریٹس بناتی ہیں اور پورے ملک مین برآمد کی جاتی ہیں تمباکو یہاں کی مقامی فصل ہے مگر دیسی طریقے سے تمباکو کا استعمال چلم کے ذریعے ہوتا ہے اس لئے چلم یہاں کے ہر گھر اور حجرے کی زینت ہے۔ مہمانوں کی مہمان نوازی کا تصور بغیر چلم کے ناممکن ہوتا ہے۔ باہر سے آیا ہوا مہمان چاہے چلم کا سوٹا لگانا پسند کرے یا نہ کرے چلم کی پیشکش میزبان کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ گھروں اور حجروں کے علاوہ دکانوں میں بھی چلم پڑی ہوتی ہے۔ مقامی لوگ چلم کا سوٹا اکثر لگاتے ہیں۔ آج کل چلم کا رواج بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اور مردان کے ساتھ تو سرحد کے حجروں میں چلم بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ جبکہ بیس تیس سال پہلے حجرے میں چلم کا ہونا لازمی تھا۔

پیشے اور دستکاریاں

کسان: کسان کی اہمیت کو اس خطے کی مزروعہ زمینوں کے پیش نظر کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہاں کے شہروں اور گاؤں میں بعض کسان تو وہ ہیں جن کی اپنی چھوٹی موٹی زمینیں ہیں اور اپنی زمینوں پر فصلوں کی کاشت کرتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اپنی زمینوں کو قابل کاشت رکھنے کے لئے ہمیشہ سے مستعد رہے ہیں۔ دوسرے کسان وہ ہیں جو کہ زمینوں کے مالکوں کے پاس ملازم ہیں یہ دہقان کہلاتے ہیں اور اپنے مالکوں کی زمینوں میں بیج بونے سے لے کر فصل کی کٹائی تک کا سارا کام کرتے ہیں۔ یہ دہقان اپنے مالکوں کے بڑے بڑے حجروں سے متصل چھوٹے چھوٹے کچے بنے ہوئے مکانات میں رہتے ہیں اور زراعت کے تمام اصولوں سے آگاہ ہیں۔ یہ لوگ صبح اندھیرے منہ اٹھتے ہیں ان کی عورتیں بھی فجر کے وقت اٹھ کر گھریلو کام کاج میں لگ جاتی ہیں جبکہ دہقان مسلمان ہونے کی صورت میں مسجدوں میں جا کر صبح کی نماز ادا کر کے گھر لوٹتے ہیں تو ان کی خواتین نے چولہے کا کام سنبھال لیا ہوتا ہے سادہ سا ناشتہ تیار کرتی ہیں اور پھر سب گھر والے ایک ساتھ مل کر ناشتہ کرتے ہیں جو کہ عموماً گڑ کی چائے اور رات کی بچی ہوئی تنوری کی روٹی کا ہوتا ہے۔ ناشتے کے بعد یہ ہل چلانے یا فصل کی کٹائی کے

زمانے میں فصل کاٹنے کے لئے زمینوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور دوپہر تک یہ زمینوں پر رہتے ہیں۔ان دہقانوں کو موسموں کے مطابق زراعت کے تمام معاملات کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

کمہار: یہ لوگ وہ ہیں جو مردان وصوابی میں ہر دور میں اپنے ہاتھوں کی چابکدستی سے مٹی سے برتن بناتے ہیں۔ان برتنوں میں مٹی کی ہنڈیا' گھڑے' مٹکے' تھالی' پیالے' پیالیاں غرضیکہ تمام گھریلو ضروریات کا سامان مٹی سے بنانے میں یہ کمہار لوگ بڑے مشاق و تجربہ کار ثابت ہوئے ہیں۔مردان کے دیہات میں عموماً جبکہ طور و اور غلہ ڈھیر میں عموماً کمہاروں کی بھٹیاں ہوتی تھیں۔اب بھی کہیں کہیں یہ کمہار لوگ موجود ہیں۔یہ قدیم دستکاری ہے جو تاریخ کے ہر دور میں ثقافتی پیشے کے لحاظ سے زندہ رہی ہے۔مردان وصوابی کے متعدد تاریخی مقامات پر کھدائیاں ہوئی ہیں ان میں مٹی کے بنے ہوئے برتن کے آثار دریافت ہوئے ہیں جو کہ مردان میوزیم میں رکھے گئے ہیں گھریلو ضروریات کے علاوہ دیگر آرائشی نمونے بھی ایسے دریافت ہوئے ہیں جو ان کمہاروں کی دستکاریوں کے شواہد ہیں ان میں بچوں کے کھلونے مٹی کے گھوڑے' ہاتھی' گدھے اور اونٹ کے نمونے شامل ہیں۔صوابی کے چند ایسے گاؤں کا تذکرہ باضافت تحقیق ملتا ہے کہ ان دیہات میں بڑے مشہور اور چابکدست کمہار رہے ہیں جو ایسے ہلکے اور سبک وزن مٹی کے پیالے بناتے تھے جو کہ پورے علاقے میں مشہور دستکاری کی مصنوعات سمجھی جاتی تھیں اور یہ پیالے لوگ استعمال کے علاوہ گھریلو سجاوٹ کے لئے بھی رکھتے تھے۔

چرواہے: خصوصاً صوابی کے علاقہ کے بعض دیہات کی زمینیں ایسی ہیں جو کہ بنجر اور خشک سمجھتی جاتی ہیں باقی تمام علاقہ کی زمینیں سرسبز و شاداب ہیں اور ٹیلوں پر چراگاہیں بنی ہوئی ہیں جہاں پر چرواہے اپنے مال مویشی چرانے کے لئے لے آتے ہیں۔یہ چرواہوں کا پیشہ قدیم زمانے سے مشہور ہے ان میں سے بعض چرواہے وہ ہیں جو کہ اپنے مال مویشی پالتے ہیں اور ان چراگاہوں میں چرانے کے لئے لے آتے ہیں اور شام کو اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں۔یہ اپنے مال مویشی مہنگے داموں فروخت بھی کرتے ہیں اور ان کے دودھ سے گھی' مکھن اور پنیر نکال کر بیچنے کا فن بھی جانتے ہیں۔

چپل سازی: مردان بشمول صوابی تقریباً تمام علاقوں میں وہی چپلی بنائی جاتی ہے جو کہ پشاور کی دستکاری ہے۔کیونکہ اس چپلی کے کاریگر اب صوبے کے ہر حصہ میں موجود ہیں اور صوبے کے تمام علاقوں میں ایک جیسی ہی چمڑے کی چپلی بنائی جاتی ہے۔تاہم مردان کے ان چپلی ساز دستکاروں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ چپلی میں خالص چمڑا استعمال کرتے ہیں۔عموماً مردان کی چپلی سیاہ رنگ کی ہوتی ہے جو کہ دیرپا سمجھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ مردان کے علاقے میں پشم اور چمیار کی بنائی ہوئی چپلی بھی بہت مشہور و معروف ہے۔کہا جاتا ہے کہ مردان کے چپلی سازوں کی پشم اور چمیار کی بنائی ہوئی چپلی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں برآمد کی جاتی تھی، خصوصاً بھوپال، بمبئی اور دہلی میں اس چپلی کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔اس وقت مردان شہر اور طورو میں چپلی سازی کا کام ہوتا ہے ان کاریگروں کی بنائی ہوئی چپلی بڑی مضبوط ہوتی ہے اسے اہلیان مردان ''پنڑیں'' کہتے ہیں۔

پلالہ: یہ قدیم پازیب ہے جسے مرد حضرات پہنتے تھے۔یہ چپلی قدیم ثقافتی پہناوہ ہے جسے چاول کے بھوسہ سے خاص مہارت کے ساتھ بنایا جاتا تھا۔مردان وصوابی کے پشتون اسے پلالہ کہتے تھے۔اب یہ پلالہ مفقود ہے تاہم اس کی ثقافتی حیثیت برقرار ہے۔

کھڑانواں: یوسف زئی قبیلے کے تمام لوگ یہ کھڑانواں پہنتے تھے خصوصاً بارشوں کے دنوں میں جب بازاروں اور گلیوں میں کیچڑ ہو جاتا تو اس وقت پاؤں میں یہ کھڑانویں پہن لی جاتی تھیں۔ان کھڑاؤں کے دستکار یہاں بڑی تعداد میں ہوتے تھے اور خاص مہارت کے ساتھ کھڑانویں اس طرح تیار کرتے تھے کہ پاؤں کے نیچے چوبی تھلہ ہوتا تھا اور اوپر پاؤں کے اگلے حصے اور اوپر کے حصے پر نوار کے کپڑے کو دونوں اطراف میں ٹانک دیا جاتا تھا۔یہ قدیم تہذیب و ثقافت کے حامل لوگوں کا پہناوہ تھا اب مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس پہناوے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔

جولاہے: مردان وصوابی کے شہروں اور دیہاتوں میں جولاہے نہایت چابکدستی کے ساتھ کھڈیوں پر کپڑا بنتے تھے۔اس دیسی کپڑے کے پہننے کا بہت رواج تھا اور کھڈیوں پر تیار کردہ کپڑا لوگ شوق سے استعمال کرتے تھے۔خصوصاً کھدر کا کپڑا یہاں مختلف مقامات پر کھڈیوں پر بنا جاتا تھا اور نہ صرف مردان وصوابی بلکہ پورے صوبے میں یہ کپڑا برآمد کیا جاتا تھا۔اب بھی مردان کے ایک دیہات گڑھی کپورہ میں کھدر کا کپڑا تیار کرنے والے جولاہے موجود ہیں۔کھدر کے علاوہ کاٹن کا کپڑا بھی کھڈیوں پر تیار کیا جاتا ہے۔

درزی: درزی کا ایسا فن ہے جو کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر رہا ہے اور ہر زمانے اور مقام پر درزی کی ضرورت رہی ہے۔قدیم زمانہ سے لے کر اب تک کپڑا

سینے والے دستکاروں کی ضرورت کو محسوس کیا گیا ہے اب تو ہر مقام و محلہ میں یہ دستکار لوگ زنانہ و مردانہ کپڑے بناتے ہیں جبکہ زنانے کپڑے نت نئے نمونوں میں تیار کئے جاتے ہیں اور سلائی مشینیں بھی جدید قسم کی رائج ہوگئی ہیں۔ جبکہ قدیم درزی لوگ کپڑا بنانے کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے یہاں تک کہ سلائی مشین کے ہینڈل کو بھی اپنے ہاتھ سے گھماتے تھے زمانے کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس دستکاری نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ زنانہ مردانہ قمیص و شلوار کے ساتھ ساتھ کوٹ واسکٹ اور جدید سوٹس کی سلائی کا کام جاننا اب ہر درزی کے لئے ضروری ہوگیا ہے۔

معمار یا گلکار: گلکار یا معمار اسے کہا جاتا ہے جو علاقے کی ضرورتوں اور ارتقائی حالات کے مطابق مکانات کی تعمیرات کا کام بخوبی جانتا ہو۔ ہر علاقے اور دیہات میں ان معماروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ قدیم کچے مکانات سے لے کر بڑی بڑی عمارتوں کے بنانے کے لئے ان معماروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مردان و صوابی کی دیہاتی زندگی میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ غریب دیہاتیوں اور کسانوں کے مکانات اب تک پرانی روش کے مطابق کچے اور گارے کے بنے ہوئے ہیں جن کے وقتاً فوقتاً مرمت کے لئے ان گلکاروں کی ضرورت رہتی ہے اس لئے مردان صوابی کے ہر شہر و دیہات میں اس قسم کے دستکار موجود ہیں جو دیہاڑی یعنی روزانہ کی مزدوری پر کام کرتے ہیں۔

ترکھان: ہر معاشرے اور سماج کی بنیادی ضرورتوں میں ترکھان یعنی بڑھئی کی ضرورت لازمی رہی ہے۔ یہ لوگ عمارتوں، دکانوں میں ضروری آرائش و زیبائش کے لئے الماریاں، میزیں، کرسیاں اور دیگر اشیاء بنانے کے علاوہ گھریلو تعمیرات میں دروازے، کھڑکیاں، روشندان خاص مہارت کے ساتھ بناتے ہیں۔ ترکھان کے اوزار میں آری، رندہ، ہتھوڑی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم دور میں ہر گاؤں میں ترکھان اجناس کے بدلے میں کام کرتے تھے اور یہ اجناس فصل کے پک جانے پر اسے اپنے حصے کے طور پر دانوں کی صورت میں ملتے تھے جبکہ فصل بہ فصل ترکھان خان کے حجروں کی ضروریات کے مطابق چیزیں بناتے۔ ضروری مرمت کرتے۔ ان کے کسانوں کے لئے ہل کے لئے ضروری لکڑی کا کام کرتے، کھیتوں کے آس پاس کنوؤں کی چرخیاں وغیرہ بھی ترکھان کی ذمہ داریوں میں شامل ہوتا تھا۔ دیہاتی گھرانوں میں شادیوں کے موقع پر جہیز کے سامان کے لئے کرسیاں، میز، الماریاں، صندوق بنانا بھی ترکھان کی ذمہ داری ہوتی۔ یہ معاوضے کے طور پر اجناس کے علاوہ نقدی بھی وصول کرتے۔

لوہار: یہ پیشہ زمانہ قدیم سے ہی انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مردان و صوابی کا کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں لوہار کے پیشے کی ضرورت کو محسوس نہ کیا جاتا ہو۔ زراعتی معاملات سے لے کر گھریلو ضروریات تک لوہار کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ لوہار زمینوں کی کاشت کے لئے ہل بناتے ہیں، گھریلو ضروریات کے لئے پانی کی بالٹیاں، ٹب، گانیوں میں گڑ بنانے کے لئے بڑے بڑے تھال بنانا یہ سب لوہار کی ذمہ داری ہے۔ مختلف کاموں کے لئے اور دیگر دستکاروں اور پیشہ وروں کے لئے اوزار بنانا، ہتھوڑی، ہتھوڑا، درانتی، کھرپہ، آری، تیشہ، بیلچہ وغیرہ یہ سب کچھ لوہار بناتا ہے۔ عرصے سے لوہار کے پیشہ ور لوگوں کی دکانیں اور بھٹیاں، مردان کے گوجر گڑھی میں موجود ہیں جہاں گھریلو ضروریات کے علاوہ زرعی آلات بنائے جاتے ہیں یہ مقام لوہاروں کے پیشہ کے لئے شہرت کا حامل ہے اور گوجر گڑھی کے لوہاروں سے یہاں کے لوگ حسب منشاء مصنوعات تیار کرواتے ہیں۔

ٹوکری و چھبی سازی: کھجور کی شاخوں کے طویل پتوں کے ذریعے دستکار مختلف گھریلو ضروریات کی اشیاء بناتے ہیں جسے مزری کا کام کہتے ہیں۔ مردان کے علاقہ تخت بھائی کے پاس جنڈئی میں یہ کام بہت مشہور ہے۔ یہاں کے کاریگر ٹوکریاں، چھبیاں، چٹائیاں، موڑھے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ بناتے ہیں۔ مردوں کے علاوہ دیہات کی خواتین بھی ان کاموں میں مہارت رکھتی ہیں اور گھروں میں یہ اشیاء بنا کر مناسب مزدوری لیتی ہیں۔ ان مصنوعات کے دکاندار ان خواتین کی بنائی ہوئی مصنوعات خرید کر دکانوں میں لے آتے ہیں۔ تمام علاقہ کے لوگوں کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے سیاح لوگ یہ چیزیں بڑے شوق سے خریدتے ہیں ان مصنوعات میں مزری کے بنے ہوئے پنکھے اور پنکھیاں بڑی شہرت رکھتی ہیں۔

زرگر، سنار: سنار کا پیشہ بھی تہذیب انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا ہے۔ جوں جوں آدمی آگے کی طرف جاتا رہا ہے آرائش و زیبائش کے حوالے سے سنار کے پیشے کی ضرورت بڑھتی رہی ہے۔ مردان میں آغاز سے لے کر اب تک ان سناروں کی کاریگری رواں دواں ہے۔ شروع میں علاقے کے یوسفزئیوں کی خواتین پتھروں کے بنے ہوئے زیورات پہنتی تھیں لہٰذا یہ زرگر یعنی سنار خواتین کے لئے ہار، پازیب، کڑے، انگوٹھیاں پتھروں اور چاندی سے بنایا کرتے، تاہم سونا بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے مگر زیادہ تر پتھروں اور چاندی کے بنے ہوئے بھاری اور وزنی زیورات پہنے جاتے تھے۔ اب زیادہ تر سونے کے زیورات بنتے ہیں تاہم اب بھی قدیم روایات کو قائم رکھے ہوئے بعض گھرانوں کی

ہوئے زیورات پہنتی تھیں لہٰذا یہ زرگر یعنی سنار خواتین کے لئے ہار، پازیب، کڑے، انگوٹھیاں پتھروں اور چاندی سے بنایا کرتے، تاہم سونا بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے مگر زیادہ تر پتھروں اور چاندی کے بنے ہوئے بھاری اور وزنی زیورات پہنے جاتے تھے۔ اب زیادہ تر سونے کے زیورات بنتے ہیں تاہم اب بھی قدیم روایات کو قائم رکھے ہوئے بعض گھرانوں کی خواتین قدیم فیشن کے مطابق چاندی کے زیورات پسند کرتی ہیں۔ سناران زیورات میں نت نئے نمونے کے زیورات تیار کرتے ہیں۔

شخصیات

صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان: صوبہ سرحد کی ممتاز شخصیات میں صاحبزادہ سر عبدالقیوم کا نام سرفہرست ہے۔ آپ نے ملک کو فرنگیوں سے آزاد کروانے کے لئے بالکل مختلف اور جداگانہ انداز اپنایا۔ انہیں دنیا پر حکمرانی کرنے والی انگریز نسل کی نفسیاتی کیفیت کا ادراک بھی تھا اور انگریزوں کے ماحول کا وہ کلی نظریہ بھی ان کے سامنے تھا جس کے بل بوتے پر انگریز برصغیر ہندوستان پر ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر چھوٹی بڑی اقوام پر حکومت کر رہے تھے۔ صاحبزادہ سر عبدالقیوم قوم کو ایک ایسی تہذیب کا شعور دلانا چاہتے تھے جس سے مالا مال ہو کر آزادی کی منزل کے قریب نہایت پرامن طریقے سے پہنچا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو آپ نے اپنی علمی اور سیاسی زندگی میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کر لینے اور پھر آزادی کے بعد ملکی لوگوں میں زمام اقتدار پر گرفت حاصل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔ چنانچہ آپ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انگریزوں کی خو بو کو سمجھنے کے لئے ان سے دوستانہ مراسم اس حد تک قائم کئے کہ صوبہ سرحد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز انگریز ان کی دوستی پر فخر کرنے لگے تھے اور وہ اکثر صوبے کی حد تک نظم و نسق کے معاملات میں ان سے مشورے طلب کرتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے اس حد تک میل ملاپ کو صوبے کے بعض لوگ شک کی نظر سے دیکھنے لگے مگر صاحبزادہ عبدالقیوم ان کی اس تنقید کو خاطر میں لانے کے بجائے اخلاص و ولولے کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف رواں دواں رہے اور اس جدوجہد میں تیزی پیدا کر دی کہ ایک غلام قوم میں وہ مطلوبہ صلاحیتیں کس طرح پیدا کی جائیں جن کی بدولت وہ آزادی کی منزل کی طرف شستہ اور مہذب قوم کی حیثیت سے بڑھے۔ خطے کے بعض وہ حضرات جو کہ صاحبزادہ سر عبدالقیوم کے نظریئے سے واقفیت حاصل کر چکے تھے انہوں نے آپ کے قدم بہ قدم چلنے کا عزم کیا جس سے صاحبزادہ صاحب کے حوصلے بلند ہوئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب مسلمان اپنے لئے ایک علیحدہ خطہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں سے میل ملاپ کو بڑھاتے ہوئے مسلمانوں کے نصب العین سے انہیں پوری طرح آگاہ کیا اور ابتدائی طور پر انہوں نے انگریز حکومت کی ملازمت میں رہ کر اعلیٰ مناصب حاصل کر کے اپنی عقل و ذہانت سے ایسے فیصلے کئے جن کی بدولت اکثر مواقعوں پر انگریز اور پختون قبائل کے درمیان خون خرابوں پر مبنی تنازعات حل ہوئے اور پرامن فضاء پیدا ہوئی، جس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے سیاست بیزاری کا خود بھی ثبوت دیا اور اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی سیاسی معاملات سے دور رکھا اور تمام تر توجہ اس طرف مبذول کی کہ قوم کو تعلیمیافتہ نسل دیں۔

صاحبزادہ عبدالقیوم نے صوبہ سرحد کے پختونوں میں عقل و فراست کی خوبیاں پیدا کرنے کے لئے ان میں تعلیم کا جذبہ پیدا کیا چنانچہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھنا تھا جو کہ ایک بہت بڑا تعلیمی ادارہ بن کر ابھرا۔

تحریک پاکستان کے نامور کارکن اور راہنما مرحوم پروفیسر امداد حسین کی یادداشتوں کے مطابق آپ سرحد کے لوگوں کے بہت بڑے محسن ہیں، آپ صوابی کے ایک گاؤں ٹوپی میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ صوبہ سرحد سیاسی لحاظ سے ہندوستان کے زیر اثر تھا بعد میں انگریزوں نے اسے صوبہ پنجاب کا حصہ بنا دیا اس وقت صوبہ سرحد میں کالج تو کیا سرکاری سکول تک تعمیر نہیں ہوا تھا۔ یہاں کے لوگ جدید تعلیم کے مخالف تھے۔

میر عبدالصمد نے اپنی کتاب ''لوئے پختون'' میں لکھا ہے کہ سر صاحبزادہ عبدالقیوم کا تعلق لودہی خاندان سے تھا۔ انہوں نے دینی تعلیم موجودہ پشاور کے خیبر روڈ کے پاس تہکال بالا گاؤں میں مولانا عارف سے حاصل کی۔ صاحبزادہ صاحب نے کچھ دینی کتابیں مولوی جمعہ خان سے بھی پڑھی تھیں۔ صاحبزادہ صاحب نے پشاور کے مشن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مشن سکول سے فراغت پائی تو مرزا اسماعیل نیازی انسپکٹر آف سکول نے انہیں ملازمت دلوا دی پھر نائب تحصیلدار اور اس کے بعد ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے میر منشی مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد نائب تحصیلدار ہوئے اور پھر 1892ء میں مستقل تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ ڈیورنڈ لائن 1893ء اور اسمار کی حد بندی کے بعد اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔

1896ء میں جب انگریزوں اور مہمندوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں انگلستان کے مسٹر چرچل بھی شامل تھے صاحبزادہ صاحب نے اس موقع پر مہمندوں اور

انگریزوں میں صلح کروادی جس کے صلہ میں تلوار اور خلعت بطور انعام حاصل کی۔

تیراہ کے آفریدیوں اور انگریزوں میں صلح کرانے کے صلہ میں انہیں 1898ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ 1898ء میں انہوں نے خیبر کے پولیٹیکل ایجنٹ میجر روس کیپل کے ساتھ مل کر قاضی عبدالغنی خان کے تعاون سے پشتو گرائمر کی کتاب لکھی۔

1903ء میں پھر انگریزوں اور آفریدیوں کے درمیان جنگ ہوئی لیکن صاحبزادہ صاحب نے جلد فریقین کے درمیان صلح کروادی جس کے صلہ میں حکومت نے انہیں ہزارہ کی جاگیر اور سی آئی اے کا خطاب دیا۔ 21 مارچ 1913ء میں پشاور میں اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی گئی جو کہ صاحبزادہ صاحب کی بہت بڑی خواہش کی تکمیل تھی۔ 1919ء میں صاحبزادہ صاحب اپنی سرکاری ملازمت کی میعاد پوری کر کے ریٹائر ہو گئے۔ 1922ء میں مرکزی اسمبلی کے ممبر نامزد ہو گئے۔ 1927ء تا 1930ء کی پہلی گول میز کانفرنس بمقام لندن میں شرکت کی اور آئینی اصلاحات کے نفاذ کی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ 19 اپریل 1932ء جب صوبہ سرحد گورنری صوبہ بنا تو صاحبزادہ صاحب وزیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے 1935ء ایکٹ کے تحت 1936ء کے عام انتخابات پھر کانگرسی امیدوار خان عبدالعزیز خان کا مقابلہ کیا یہاں ان کے مقابلے میں تو کامیاب نہ ہوئے مگر ہزارہ کے ایک حلقے سے کامیاب ہوئے۔

گورنر نے انہیں وزارت بنانے کی دعوت دی اور صوبہ سرحد اسمبلی میں قائد ایوان مقرر ہو کر صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مقرر ہو گئے ان کی وزارت اعلیٰ کے دوران کابینہ میں سردار اورنگزیب خان عمرزئی چارسدہ کے خان بہادر سعد اللہ خان اور پشاور کے بہادر لالہ مہر چند کھنہ رکن مقرر ہوئے جب کانگرسی ممبران اسمبلی نے عہدے قبول کئے تو صوبائی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے ضلع ہزارہ کی ڈیموکریٹک پارٹی کے تعاون سے 3 ستمبر 1937ء میں صاحبزادہ کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کیا جس کے بعد صاحبزادہ صاحب اپنے گاؤں ٹوپی چلے گئے اور 4 دسمبر 1937ء کو اس جلیل القدر شخصیت نے وفات پائی۔

پروفیسر امداد بیگ کا کہنا ہے کہ جب قائداعظم محمد علی جناح 1936ء میں پشاور تشریف لائے تو علاقہ یکہ توت منڈی بیری کے مقام پر صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی رہائش گاہ پر انہوں نے قیام فرمایا۔

خان روشن خان: روشن خان کا تعلق مردان ریجن کے ضلع صوابی کے ایک گاؤں نواں کلی سے ہے۔ ان کی معروف کتاب ''تذکرہ'' ہے جس میں پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں۔

انہوں نے اس سے قبل تواریخ حافظ رحمت خان کے اصل پشتو مخطوطہ کا اردو میں ترجمہ کیا جو ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور تالیف ''افغانوں کی نسلی تاریخ'' کے نام سے بھی ہے۔

''تذکرہ'' ان کا بہت بڑا تحقیقی مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے پٹھانوں کے بارے میں نہایت عرق ریزی کے ساتھ تحقیقی مواد جمع کیا ہے۔

روشن خان پشتون یا پختون اہل قلم میں سے ایسے محقق ہیں جو کہ پشتون کو بنی اسرائیلیوں کے جلاوطن قبیلے بنی پخت میں سے شمار کرتے ہیں اور یہ کہ ان کو پختون نام پخت یعنی ان کے مورث اعلیٰ کی نسبت سے ملا جو کہ تمام پشتون قبائل کے لئے مستعمل ہے۔

مولانا عبدالقادر مرحوم: پشتون معاشرے کے تہذیبی اور ثقافتی ادب و ہنر اور زبان و بود و باش کے جو امتیازی خدوخال باضابطہ طور پر کتابی اور تحریری صورت میں آج ہم تک پہنچ رہے ہیں یہ نتیجہ ان چند مخصوص پشتون اہل قلم اور ادب شناس ہستیوں کی جدوجہد کا ہے جنہوں نے اس سلسلے میں اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں اُن لوگوں میں مولانا عبدالقادر مرحوم کا نام نمایاں ہے۔ آپ کا تعلق مردان ریجن کے ضلع صوابی کے گاؤں پاپینے سے ہے۔ ان کے والد کا نام سید ابوذر تھا اور 14 جون 1905ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا عبدالقادر نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی اور مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ پر عبور حاصل کیا۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم کے حصول میں بڑی محنت سے کام کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ ایاز داؤدزئی کے قول کے مطابق مولانا عبدالقادر نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ مولانا عبدالقادر نے میٹرک کالجیٹ ہائی سکول پشاور سے کیا۔ بی۔اے اسلامیہ کالج پشاور سے پاس کیا۔ اور اسلامیہ کالج چڑیونین کے صدر منتخب ہو گئے۔ جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے انگریزی، ایم۔اے عربی، ایل۔ایل۔بی، اور بی ٹی کے امتحانات پاس کئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے دو دفعہ نائب صدر منتخب ہوئے۔ واضح رہے کہ اُس وقت سٹوڈنٹس یونین کا صدر یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوا کرتا تھا۔ مولانا عبدالقادر نے علی گڑھ میں طالبعلمی کے زمانے میں پورے برصغیر میں شہرت حاصل کی پشتو زبان میں تحقیق اور نثر نگاری کی حوصلہ افزائی کرنے والوں

کے بانیوں میں سے ہیں۔

پشاور میں ون یونٹ کے زمانے میں 1954ء میں پشتو اکیڈیمی قائم کرنے میں انہوں نے محمد اسلم خان خٹک کی معاونت سے جو جدوجہد کی وہ بارآور ثابت ہوئی اور پشاور یونیورسٹی میں یہ اکیڈیمی قائم ہوگئی اور پھر اس اکیڈیمی کے پہلے سربراہ بھی مولانا عبدالقادر ہی بنے۔ انہوں نے صوبہ بھر کے پشتون لکھاریوں' ادیبوں اور شعراء اور محققین وافسانہ نگاروں کو یکجا کیا اور ان میں پشتو زبان وادب کے باضابطہ طور پر فروغ کے لئے جذبہ پیدا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پشتون ادباء شعراء اور محققین بموجب بساط علم و ہنر میدان عمل میں اتر پڑے۔ مولانا عبدالقادر کی پشتو زبان وادب کے فروغ کے لئے خدمات پشتون اور صوبہ سرحد کی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ آج ہر خورد وکلاں پشتون ادیب واہل قلم ان کا نام بے حد احترام سے لیتا ہیں۔

حافظ محمد ادریس: ضلع مردان موضع طورو سے تعلق رکھنے والے جید عالم دین حافظ محمد ادریس مرحوم دینی اور تہذیبی وثقافتی شخصیتوں میں عظیم تر شخصیت کے مالک ایسے وجود کے محافظ تھے جس کے ساتھ نہ صرف اہلیان مردان بلکہ صوبہ سرحد کے ہر علمی دینی اور فکری گھرانے سے تعلق رکھنے والے افراد بے پناہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ حافظ محمد ادریس نے پشتو نثر کو جو اسلوب دیا ہے یہ آنے والے ہر پشتون قلمکار کے لئے راہنما طرز کے طور پر زندہ وتابندہ ہے۔ اُن کے بے شمار صاحب علم و باکردار شاگرد ہیں۔ 1965ء میں عالمی سطح پر ناقابل فراموش قاہرہ کا جو فضائی حادثہ پیش آیا اور اس جہاز میں سفر کرنے والے تمام وہ لوگ تھے جو کہ ملک کا قیمتی اثاثہ تھے یہ تمام لوگ علمی مہارت' ملکی انتظامی صلاحیت رکھنے والے، حکام، سائنسدان، ماہرین اور دینی ودنیوی علوم وفراست کے حامل اشخاص تھے۔ جنہوں نے مصر کے دارالخلافہ قاہرہ میں پیش آنے والے فضائی حادثہ میں اجل ناگہانی کو لبیک کہا ان قیمتی اثاثہ کی حامل شخصیتوں میں حافظ محمد ادریس بھی شامل تھے۔

حافظ محمد ادریس حافظ قرآن پاک ہونے کی عظیم خصوصیت رکھنے کے علاوہ دینی علوم اور پشتو زبان وادب کے نام ور لکھاری تھے۔ حافظ صاحب ریڈیو پاکستان پشاور کے مستقل تقریر کرنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کے علمی اور قلمی کارناموں میں سب سے اہم اور امتیازی کارنامہ قرآن پاک کی وہ مشہور تفسیر ہے جو کہ کشاف القرآن کے نام سے چھپی اور دینی مدارس کے علاوہ یونیورسٹیوں کے اسلامیات وعربی کی ایم۔اے کے نصاب میں شامل ہے۔ انہوں نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے علاقے کے نامور علماء سے حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے شہروں بریلی' امروھہ' اورنگ آباد' دہلی کے دینی مدارس میں علمی تشنگی کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سرکاری ملازمت کا آغاز عربی اور اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج مردان سے کیا۔ بعد میں امرتسر ایم۔اے۔او کالج میں اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ حافظ صاحب مرحوم نے ابتدا ایم۔اے۔او کالج سے کیا۔ مردان میں جب کالج بنا وہاں تشریف لے آئے اور مردان کالج سے پشاور یونیورسٹی تشریف لے آئے۔

میاں خیرالحق گوہر: مردان کے نزدیک مردان وصوابی کی پل کے ساتھ ایک ڈھیری کے اوپر چھوٹا سا گاؤں ہے جسے نوشہرہ کے حضرت کاکا صاحبؒ کی اولاد نے آباد کیا اور یہ بستی انہی کا کاخیل خاندان کی ہے اور انہیں کی نسبت سے اسے میاں گانو کلے کہتے ہیں۔ یہ سرسبز وشاداب گاؤں ہے۔ میاں خیرالحق بھی اسی کاکاخیل خاندان کے ایک پڑھے لکھے پرانی وضع قطع رکھنے والے فرزند تھے۔

آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رحمان باباؒ کے عہد' ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں کا تعین نہایت عرق ریز تحقیق کے ساتھ کیا۔ انہوں نے یہ تحقیقی مقالہ رحمان باباؒ کی برسی کے موقع پر ان کے مزار پر منعقدہ تقریب میں پڑھا تھا۔

میاں خیرالحق کاکاخیل پشتو ادبی جرگہ مردان کے تاحیات صدر رہے اس ادبی جرگہ کی بنیاد 1955ء میں رکھی گئی تھی آپ نے 5 ستمبر 1989ء میں وفات پائی۔

صدیق اللہ رشتین: مردان شہر سے متصل گاؤں بغدادہ کے رہنے والے صدیق اللہ رشتین 1919ء میں غازی آباد میں پیدا ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ علمی' فکری اور ادبی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا اور پھر اپنے والد مولوی تاج محمد کی حیات میں ہی 1978ء میں مردان آگئے اور بغدادہ میں مقیم ہوگئے۔ بغدادہ میں ان کے رشتے دار پہلے ہی سے رہائش پذیر تھے لوگ ان کے رشتے داروں کو صوبے داران کہتے تھے۔

رشتین صاحب کی زندگی کا زیادہ حصہ افغانستان کے علمی اور ادبی اداروں میں تدریس وتحقیق میں گزرا تھا۔ انہوں نے شادی یوسفزئیوں کے علاقہ میں رہنے والے خاندان میں کی تھی اور یوسفزئی پشتو کے لہجہ میں لکھتے اور بولتے رہے۔ رشتین صاحب اگرچہ شاعری بھی کرتے تھے مگر زیادہ تر پشتو زبان میں نثر نگاری کی طرف رجحان تھا اور زمانے کا تقاضا بھی یہی سمجھتے تھے کہ اس وقت پشتو

میں نثر نگاری کی ضرورت زیادہ ہے۔

میر سید بخاری: میر سید بخاری کا نام محققین کی صف میں اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''لاہور تاریخ کے آئینے میں'' لکھ کر اس بات کو پوری تحقیق و تدقیق کے بعد باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ تاریخی لحاظ سے اصل لاہور (مردان ریجن ضلع صوابی کا ایک گاؤں) کی نوعیت کیا ہے اور وہ خطہ جو کہ قدیم ترین تاریخوں میں لاہور کے نام سے زیر مطالعہ آتا ہے حقیقتاً کونسا خطہ ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دستاویزات سے یہ ثابت کیا ہے لاہور شہر وہ ہے جو کہ صوبہ سرحد کے موجودہ مردان ریجن کے ضلع صوابی کا اب ایک چھوٹا سا گاؤں بن کر سکڑ گیا ہے۔ کام کی اس نوعیت کے اعتبار سے میر سید بخاری کی شخصیت اس علاقہ سے تعلق رکھنے والی تاریخی اور ثقافتی شخصیتوں میں ایک نمایاں مقام کی حامل ہے۔ ان کی کتاب ''لاہور تاریخ کے آئینے میں'' کے بارے میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کے پروفیسر محمد جمیل نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ان کا شجرہ نسب ان کے والد ماجد حضرت سید محمد شاہ مرحوم و مغفور کی جہت سے حضرت جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ سے جاملتا ہے۔ ان کے ننھیال کا شجرہ نسب حضرت لعل شہباز قلندر سے جاملتا ہے۔

قمر راہی: مردان کے چیدہ اہل قلم، ادباء اور شعراء میں قمر راہی کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ ان کے ادبی پاروں میں ''قند'' کے مجلّہ کا اجراء مردان کے ادبی میدان میں نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

آپ نے اس مجلّے کا اجراء مردان شوگر مل سے کیا جو مردان کی ادبی اور ثقافتی تاریخ میں ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ انہوں نے مجلّہ کے ذریعے پشتو شعراء، ادب اور فن و ثقافت کی جتنی خدمت کی پشتو ادب کے فروغ میں اس کی بہت کم مثال ملتی ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر محمد ہمایوں ہما: محمد ہمایوں ہما مردان کی نامور و معروف علمی اور ادبی شخصیت ہیں۔ پشتو زبان کے بالا دراک، ڈرامہ نگار، شاعر، نقاد ہیں جبکہ گاہے بگاہے اردو میں بھی ادبی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اردو کے اخبارات میں کالم نویس کی حیثیت سے ادبی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں ہما مردان کی ایک مضافاتی بستی (گاؤں) بغدادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی گاؤں میں 13 اکتوبر 1944ء میں پیدا ہوئے۔ سنجیدہ اور مزاحیہ ڈرامے لکھے۔ پہلا ڈرامہ زمانہ طالب علمی میں ''سلور زرہ روپئ'' لکھا جو کہ 1962ء میں ریڈیو پاکستان پشاور سے براڈ کاسٹ ہوا۔ 1968ء میں راولپنڈی اسلام آباد ٹیلی ویژن کے ہفتہ وار پروگرام آغوش کہستان میں ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ''فیصلہ'' ٹیلی کاسٹ ہوا۔

انہوں نے ایم۔اے / ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں نمایاں کامیابی کے ساتھ حاصل کی۔ پشتو زبان میں السنہ شرقیہ (پشتو آنرز) کا امتحان پشاور ایجوکیشن بورڈ سے پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔

سرکاری ملازمت کے سلسلے میں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو کر مختلف سرکاری کالجوں میں بحیثیت لیکچرار اور پروفیسر خدمات انجام دینے کے بعد سینیئر پروفیسر کی حیثیت میں 13 اکتوبر 2004ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ نے چھ کتابیں تصنیف کیں۔

ڈاکٹر سلمٰی شاہین: پشاور یونیورسٹی میں پشتو اکیڈیمی کی ڈائریکٹر محترمہ سلمٰی شاہین کا تعلق مردان کے معروف موضع بغدادہ سے ہے۔ بغدادہ مردان چھاؤنی سے متصل اب ایک جدید طرز کی بستی ہے یہاں پشتو کے نامور لکھاری اور دانشوروں نے جنم لیا ہے۔ ان نامور پشتون لکھاریوں میں محترمہ سلمٰی شاہین کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے 2002ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے پشتو زبان و ادب اور پٹھانوں کی تاریخ کو اجاگر کرنے کے لئے متعدد قلمی مقالات لکھنے کے علاوہ پشتو گیت کی معروف اور عوامی حلقوں میں مقبول صنف ''ٹپہ'' سے متعلق تدوین و ترتیب دو جلدوں میں کی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحبہ نے جو انداز اپنایا یہ ایک بالکل جداقسم کا تخلیقی کارنامہ ہے جس کے پس منظر میں گرانقدر تحقیقی عرق ریزی کا اظہار ہے۔ ''روہی سندرے'' (ٹپے) کے نام پر انہوں نے دو جلدوں میں ضخیم مطبوعہ کتابیں لکھیں ہیں۔ پشتو گیت کی صنف ٹپہ کو نہایت محنت کے ساتھ اس طرح ترتیب و تدوین کیا ہے کہ حروف تہجی کے مطابق ان ٹپوں کو بالترتیب یکجا کر دیا ہے۔

آپ مختلف عنوانات پر مشتمل تحقیقی مقالہ جات سپرد قلم کر چکی ہیں اور ان تحقیقی کاموں پر مختلف علمی ادبی اور ثقافتی تنظیموں سے ایوارڈ بھی حاصل کئے اور بہت سے حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کی علمی اور ادبی کمیٹیوں کی ممبر بھی ہیں۔

ان کی مطبوعات میں ''روہی سندرے'' کے علاوہ مزید یہ ہیں:

نوائے سرحد (پشتو مجموعہ شعری)، اباسین دا تاریخ پہ آئینہ کښ (دریائے سندھ کی تاریخ پشتو)، پختو ٹپہ (پشتو کا تعارف)، معاشرتی اور ثقافتی

آ ثار، زے ھم ھغہ سے وڑاوے (مجموعہ شعری پشتو)، کنبے رڑاں شوا (ناول)، کانڑیں اوازغہ (مختصر کہانیاں)، دل اور آنکھیں چین میں (سفرنامہ)، ماڈرن نظم پشتو میں (ریسرچ)۔

نثار محمد خان: نثار محمد خان شاہ منصور صوابی میں یکم جنوری 1942ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ریڈیو پاکستان پشاور میں مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد سٹیشن ڈائریکٹر پشاور کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ صوبہ سرحد کے ثقافتی معاملات کے بارے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے پشتو میں ایم۔اے کیا۔ جبکہ کلچر اسٹون مینو نائیٹ یونیورسٹی ورجینا' امریکہ سے اعزازی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ آپ کی درج ذیل تصنیفات ہیں:

۱) اللہ اکبر سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ

WITH PEACE FRAM PAKISTAN ایسٹرن مینو نائٹ یونیورسٹی امریکہ، BBC PEACE HARBO بش ہاؤس، THE TRADITION، ملائشیا BU ٹیلیویژن سیریل 1307.26+52، 98 EPISODE، فیچر فلمز۔ اردو 5' پنجابی 1' پشتو 37۔

انہوں نے متعدد ایوارڈز بھی حاصل کئے جن میں:

غورہ ڈرامہ لیکوال سرٹیفکیٹ برائے امن ورجینا۔

فلم ایوارڈ ''دوہ'' مکالمہ نگار۔ غورہ فلم لیکوال۔

ان کی ایک پشتو کتاب ''سپین تمبل'' پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی۔ ان کی سپین تمبل کتاب میں ان تمام برصغیر ہند و پاک سے تعلق رکھنے والے فنکار' گلوکاروں کے بارے میں ذاتی ملاقاتوں کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں۔ یہ پشتو زبان میں اس نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

رسوم ورواج

شادی بیاہ، پیدائش اور موت

مردان بشمول صوابی ہزاروں سال پرانا تاریخی اور ثقافتی خطہ ہے۔ گندھارا، خصوصاً بدھ عہد کے حوالے سے اس خطے کی ثقافتی اہمیت خیر معمولی ہے۔ یہاں پر آریہ سماج سے پہلے جو میری عہد کی یادگار قومیں وارد ہوئی ہیں اس وقت سے اس علاقے میں قومی اور سماجی لحاظ سے تعلق رکھنے والی رسوم ورواج کی باقیات اب تک موجود ہیں۔ مردان ریجن کے علاقے سے متعلق لوگوں کی رسوم و رواج سے متعلق جو تحقیق کی گئی اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

منگنی: پختون معاشرے میں منگنی کی رسم کی ادائیگی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جب منگنی کی رسم کی ادائیگی سے دو جیون ساتھیوں کا انتخاب ہو جاتا ہے تو اس کو پختون گھرانے میں ہر حال میں نبھایا جاتا ہے۔ لڑکی کے انتخاب میں عموماً والدین کی مرضی کو خاصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ تر رشتے خاندان میں ہی طے کئے جاتے ہیں تاہم ضروری نہیں، باہر کے خاندانوں میں بھی رشتے طے کئے جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ دیہات میں چھوٹی عمر ہی میں لڑکے اور لڑکی کو ازدواجی بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے۔ کم سنی کی شادی کا رواج اب کم ہو چکا ہے۔

لڑکی کا انتخاب لڑکے کے والدین کرتے ہیں اور جب لڑکی کا انتخاب ہو جاتا ہے تو منگنی کے لئے تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے اور مقررہ تاریخ کو لڑکے کے والدین اور کچھ دیگر نزدیکی رشتے دار اکٹھے ہو کر لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور لڑکی کو نشانی کے طور پر منگنی کی سونے کی بنی ہوئی انگوٹھی پہناتے ہیں اور دعائے خیر کرتے ہیں۔ اس موقع پر لڑکی والے مٹھائی وغیرہ کھلا کر رشتے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد مروجہ طریقے سے لڑکی کے والدین اور دیگر قریبی رشتے دار لڑکے کے گھر آتے ہیں اور وہ اپنی طرف سے سونے کی بنی ہوئی انگوٹھی لڑکے کو پہناتے ہیں۔ لڑکے کے گھر والے بھی مٹھائی بانٹتے ہیں اور لڑکی والوں کی چائے وغیرہ سے تواضع کرتے ہیں اس طرح یہ ازدواجی رشتہ طے ہو جاتا ہے بعض گھرانوں میں منگنی کے موقع پر شادیانے بجتے ہیں اور خوشیوں کی تقاریب بھی منعقد ہوتی ہیں مگر یہ خوشیوں سے تعلق رکھنے والی منگنی کی تقاریب صاحب حیثیت لوگ منعقد کرتے ہیں جہاں گائیک گانے کی محفلیں کرتے ہیں۔ ان محافل میں ڈھولک اور باجے بجاتے جاتے ہیں۔ منگی اور ستار بھی بجائے جاتے ہیں اور ٹپے گائے جاتے ہیں۔ ان محافل میں خاندان کے لوگوں کے علاوہ لڑکے کے یار دوست بھی شامل ہوتے ہیں۔

بارات: منگنی کے بعد ہی سے لڑکی اور لڑکے کے گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور جب شادی ہونے لگتی ہے تو لڑکے کے والدین اور کچھ رشتے داروں میں سے بزرگ لوگ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور دونوں طرف سے چاند کی تاریخ کے حساب سے شادی کی تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے۔

اس کے بعد دونوں گھرانوں میں شادی کے لوازمات اکٹھے ہونا شروع

ہو جاتے ہیں اور جوں جوں شادی کی تاریخ قریب آتی ہے دونوں گھرانوں میں شادی کی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ قدیم روایتی شادیوں کا انداز یہ تھا کہ دونوں گھرانوں کی خواتین کئی کئی روز پہلے سے شادی کی دعوت دینے کے لئے قریبی رشتے داروں کے گھروں میں جاتیں جنہیں پشتو اور ہندکو میں سدہ کہتے ہیں۔ یہ سدہ ٹولیوں کی صورت میں عورتوں کا جمگھٹا ہوتا ہے جن گھروں میں سدہ جاتا ہے وہاں ان کی خاطر داری سردیوں میں چائے اور روٹی سے کی جاتی ہے اور گرمیوں میں عموماً مشروبات سے۔ یہ رواج اب بھی قدیم گھرانوں میں جاری ہے۔ تاہم اب بدلے ہوئے حالات کے تحت شادی کے مطبوعہ کارڈز تقسیم کئے جاتے ہیں۔ لڑکے کی طرف سے ولیمے کی دعوت عام ہوتی ہے جبکہ برات کے لئے قریبی رشتے داروں اور دوستوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ دیہات میں لڑکے کے گھر میں صبح ہی سے مدعوین اکٹھے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر دن کو دوپہر سے پہلے بارات نکلتی ہے۔ لڑکے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں بینڈ باجوں کے ساتھ بارات لڑکی کے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ شہروں میں بارات کا وقت شام سے پہلے کا ہوتا ہے۔ لڑکے کے گھر سے لے کر لڑکی کے گھر تک بارات کے لوگ عموماً پا پیادہ چلتے ہیں اور راستے میں جگہ جگہ بینڈ باجے کی ٹولی میں لڑکے کے یار دوست ناچتے اور رقص کرتے ہیں۔ لوگ خوشی خوشی لڑکی والوں کے گھر پہنچتے ہیں۔ لڑکی کے گھر میں عموماً مٹھائی اور چائے سے بارات کے لوگوں کی تواضع کی جاتی ہے۔

نکاح: مردان ومضافات میں نکاح کی رسم صوبہ سرحد کے دیگر علاقوں کی نسبت منفرد ہے اور یہاں کے لوگ نکاح کی مذہبی رسوم کی ادائیگی اس وقت کرتے ہیں جبکہ لڑکی کی ڈولی لڑکے کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں کی اس مسنون رسم کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ اب جبکہ تعلیم عام ہو چکی ہے تو مردان کے شہری تعلیمیافتہ لوگ اس بات پر احتجاج کرتے ہیں کیونکہ مذہبی لحاظ سے یہ درست نہیں ہے کہ لڑکی کا نکاح لڑکے کے گھر میں ہو اس لئے اب اس رسم نکاح کی ادائیگی لڑکی کے گھر میں ہی ہوتی ہے۔ تاہم یہاں کی روایتی اور ثقافتی زندگی میں عام طور سے نکاح کی رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب لڑکی دولہے کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ لڑکے کے گھر میں دولہن جب آ جاتی ہے تو سب سے پہلے لڑکی اور لڑکے کے درمیان مذہبی رسومات کے مطابق نکاح پڑھا جاتا ہے اس سے قبل جب لڑکی دولہے کے گھر کے دروازے میں داخل ہوتی ہے تو قریبی رشتے دار پیسوں کے سکے پھینکتے ہیں علاوہ ازیں بعض گھرانوں میں جو خاندانی رسومات ہوتی ہیں وہ ادا کی جاتی ہیں۔ پھر نکاح کے بعد مٹھائی وغیرہ تقسیم ہوتی ہے۔ صرف مردان میں نہیں بلکہ اکثر پشتون قبائل بشمول قبیلہ خٹک، نکاح اُس وقت پڑھا جاتا ہے جب لڑکی دولہا کے گھر پہنچ جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ لڑکی کی ڈولی صبح کے وقت لائی جاتی ہے اور نکاح رات کو پڑھا جاتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ پشتونوں میں یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی ہے کہ شادی کے دن دولہا بزرگوں کو نظر آئے۔ چہ جائیکہ سسرال کے گھر جائے۔

ولیمہ: شادی کے دوسرے روز لڑکے کے گھر والے شادی کی خوشی میں خاص وعام سب کو ولیمہ کے کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ بعض اہل ثروت کے گھرانوں میں ولیمہ کی دعوت دو قسم کی ہوتی ہے ایک عام دعوت ہوتی ہے جو کہ گاؤں کے تمام لوگوں اور رشتے داروں کے لئے ہوتی ہے اس میں چاول، زردہ اور قورمہ ہوتا ہے صبح 9 یا 10 بجے سے یہ دعوت شروع ہو جاتی اور پھر دوسری خاص قسم کے کھانے کی دعوت ہوتی ہے اس میں وہ لوگ شریک ہوتے ہیں جو کہ دور دراز سے آئے ہوتے ہیں اور مخصوص لوگ ہوتے ہیں۔ یہ عام طور سے دوسرے روز ہوتی ہے۔ اس دعوت میں بعض مرغی کا سالن بھی شامل کرتے ہیں اور سلیقے کے ساتھ کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ دعوت ولیمہ کے اختتام کے ساتھ ہی شادی کی تقریب اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

اور پھر قریبی رشتے دار شادی والے گھر آتے رہتے ہیں اور دلہن کو کچھ رقم منہ دکھلائی کے طور پر دیتے ہیں۔ دلہن پورے ایک ہفتہ تک سسرال کے گھر میں رہتی ہے اور پھر ایک ہفتہ کے بعد اپنے میکے جاتی ہے دلہن کے ساتھ دولہا بھی جاتا ہے اور دلہن کے میکے میں دلہن کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ قیام میکے میں پورے ہفتے کا ہوتا ہے۔ اس علاقے کی ثقافتی زندگی میں اس رسم کا قاعدہ یہ ہے کہ دولہا بھی دولہن کے ساتھ اس کے میکے یعنی اپنے سسرال کے ہاں گزارتا ہے تاہم اب اس پابندی سے لوگ آزاد ہیں اور ایک آدھ دن گزار کے دولہا واپس آ جاتا ہے مگر لڑکی میکے میں پورا ایک ہفتہ بسر کرتی ہے۔ بعض گھرانوں میں یہ پابندی نہیں ہے کہ دلہن ایک ہفتہ سسرال کے ہاں گزارے اور ایک ہفتہ میکے میں بلکہ اصل پابندی یہ ہے کہ جتنے روز دلہن سسرال کے ہاں رہتی اسی قدر میعاد وہ میکے کے ہاں بھی بسر کرتی ہے۔

بچہ کی پیدائش: شادی کے بعد بچے کی پیدائش کا مرحلہ ہوتا ہے جوں جوں بچے کی ولادت کے دن نزدیک آنے لگتے ہیں۔ ساس اور نندیں وغیرہ دلہن کی آؤ بھگت میں لگ جاتی ہیں۔ دلہن پر آنے جانے اور دیگر قسم کی پابندیاں شروع ہو جاتی

ہیں تا کہ بچے کی پیدائش فطرت کے اصولوں کے مطابق ہو اور دلہن کی کسی قسم کی بے احتیاطی سے نومولود کے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ گھر میں ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ نومولد لڑکا ہو' پختون معاشرے میں عموماً اس خواہش کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اور خاص کر پہلے بچے کی پیدائش میں لڑکے کی پیدائش کو بڑی قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب لڑکا پیدا ہو تو گھرانے میں بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں اس موقع پر فائرنگ کی جاتی ہے اور ڈھولک سرنے والے آتے ہیں اور وہ پیدائش کے گھر یا حجرے میں ڈھول اور باجے بجاتے ہیں اور موقع کی مناسبت سے ٹپے اور گیت گاتے ہیں اور والدین اور قریبی رشتے داروں سے رقمیں لیتے ہیں قدیم روایتی انداز کے مطابق بچہ جننے کے سارے عمل میں گھرانوں کی دایہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور زچگی کے سارے معاملات دائی انجام دیتی ہے۔ لڑکے کی پیدائش کے موقع پر دائی کی قسمت بھی جاگ اٹھتی ہے اور بڑی بڑی رقمیں اسے ملتی ہیں۔ چالیس روز تک یہ دائی خبر گیری کے لئے زچگی والے گھر چکر لگاتی رہتی ہے۔ اگر بچی جنے تو خوشیوں کا اظہار گرمجوشی سے نہیں کیا جاتا۔ نومولود کو سب سے پہلے نہلایا جاتا ہے اور پھر اسے کپڑے پہنا کر ایک کپڑے میں طریقے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ قریبی مسجد کے ملا کو بلا کر مسلمان گھرانے کے لوگ بچے کے کان میں اذان دلواتے ہیں اور پھر ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔

عقیقہ: یہاں کے لوگوں میں عقیقے کی رسم کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بچے کے جننے کے فوراً بعد یا کچھ مدت کے بعد عقیقے کی رسم ادا کی جاتی ہے جسے پشتو میں سر کلے کہتے ہیں۔ اس موقع پر بکرا ذبح کیا جاتا ہے اور لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ صاحب حیثیت لوگ بہت سے لوگوں کو بلاتے ہیں جبکہ غریب لوگ چھوٹی سی دعوت کرتے ہیں۔ انتہائی غریب لوگ اس سے محروم رہتے ہیں بچے کے سر کو منڈھوایا جاتا ہے۔ اس موقع پر چاول پکائے جاتے ہیں اور لوگوں کی پلاؤ سے خاطر داری کی جاتی ہے۔ قریبی رشتے دار اس موقع پر بچے کے لئے تحائف لے کر آتے ہیں۔

ختنہ: مسلمان گھرانوں میں ختنہ کی رسم کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پختون معاشرے میں اس رسم کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر بھی قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا جاتا ہے اور پلاؤ وغیرہ کے ساتھ تواضع کی جاتی ہے۔ بچے کو علاقائی روایات کے مطابق گھوڑے پر نئے کپڑے پہنا کر بٹھایا جاتا تھا اور کسی مزار پر لے جا کر دعا کی جاتی تھی پھر گھر میں خاندانی نائی کو بلایا جاتا تھا جو کہ بچے کو بھنگ پلا کر نشہ دیتا اور پھر شام سے پہلے یہ نائی بچے کا ختنہ کرتا۔ اس موقع پر بھی قریبی رشتے دار نائی کو رقمیں دیتے تاہم اب یہ رسم بھی صرف دیہات کی حد تک محدود ہے اور لوگ اتنی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ اب قریبی ڈاکٹر کے مطب یا ہسپتال میں بچے کو لے جا کر ختنہ کروالیا جاتا ہے۔ جہاں تک علاقائی اور روایتی رسم کا تعلق ہے تو پشتون معاشرے میں اس رسم کی ادائیگی میں بھی بڑی گرمجوشی دکھائی جاتی ہے جس بچے کا ختنہ ہوتا ہے اس گھر میں کئی کئی روز تک مہمان آتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں اور بچے کے لئے تحائف لاتے ہیں۔ اس گھر میں گائیک لوگ ڈھول باجے کے ساتھ آ کر گاتے ہیں اور رقمیں وصول کرتے ہیں۔

میت کی رسوم: مردان ومضافات میں جب کوئی میت ہو جاتی ہے تو مرد ہو یا خاتون میت والے گھر آس پاس رہنے والے پڑوسی اور رشتے دار جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ خواتین میت والے گھر کے اندر چلی جاتی ہیں جبکہ مرد حضرات میت خانہ کے حجرے میں بڑی بڑی بچھی ہوئی چارپائیوں پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں اگر میت والے گھر کا اپنا حجرہ نہ ہو تو محلے میں خان یا کسی اور بڑے کے حجرے میں مردوں کی نشست کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ آتے ہیں تو اسی وقت سے تعزیتی دعاؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میت کے قریب ترین رشتے دار' بیٹے' بھائی' یا والد سے آ کر لوگ تعزیت کرتے ہیں اور مردے کی مغفرت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

مردے کی تدفین کے لئے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ قریبی ہمسائے قبر کھودنے کے لئے قبرستان چلے جاتے ہیں۔ پختون معاشرے میں پیشہ ور گورکن نہیں ہوتا بلکہ قریبی لوگ اور ہمسائے ہی یہ کام انجام دیتے ہیں۔ محلے یا گاؤں کے ملا کو بلایا جاتا ہے جو کہ کفن تیار کرتا ہے۔ مردے کو وقت مقررہ سے کچھ پہلے نہلایا جاتا ہے جسے آخری غسل کہتے ہیں۔ غسل کے بعد تکفین کی جاتی ہے اور پھر جنازے کو چارپائی پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اگر مردہ خاتون ہے تو گھریلو عورتیں ہی مردے کو نہلاتی ہیں اور نہایت پردہ داری کے ساتھ جنازے کی چارپائی میں اس طرح رکھا جاتا ہے کہ باہر کا کوئی شخص اس خاتون مردے کو دیکھ نہ پائے۔ وقت مقررہ پر جنازہ اٹھتا ہے اور لوگ نہایت احترام کے ساتھ جنازے کو کندھے پر اٹھا کر قبرستان کی طرف لے جاتے ہیں اس موقع پر راستے میں کلمہ شہادت کا ورد کیا جاتا ہے جنازہ جب جنازہ گاہ پہنچتا ہے تو نماز جنازہ اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہے نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد پیش امام مردے کی مغفرت کے لئے اجتماعی دعا کرواتا ہے

اور پھر اس کے بعد عام لوگ قریبی رشتے داروں سے تعزیت کرتے ہیں۔ قریبی رشتے دار مردے کو قبر میں رکھ دیتے ہیں اور اچھی طرح ڈھک کر قبر میں مٹی ڈالی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں قبر میں مٹی ڈالنے کے عمل میں سب شریک رہتے ہیں۔ جب قبر تیار ہو جاتی ہے تو مولوی صاحب قبر پر قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ ایک بار پھر میت کی مغفرت کے لئے اور لواحقین کے صبر جمیل کے لئے دعا کی جاتی ہے اس آخری اور اجتماعی دعا کے بعد لوگ قبرستان سے واپس آ جاتے ہیں۔ قریبی رشتے دار میت والے گھر واپس آ جاتے ہیں۔ اس موقع پر خیرات کی جاتی ہے جو کہ چاولوں کی صورت میں ہوتی ہے اور پھر میت کی مغفرت کے لئے دعاؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہ مسلسل تین دن تک جاری رہتا ہے۔ تیسرے روز کو سوئم کہتے ہیں۔ اس روز شام کے وقت حجرے یا محلے میں بچھی ہوئی چارپائیاں اٹھا لیتے ہیں۔ تاہم میت والے گھر میں قریبی رشتے دار خواتین چالیس روز تک وقفے وقفے سے آتی رہتی ہیں اور تعزیت کرتی رہتی ہیں۔ اس موقع پر میت والے گھر میں مختلف ایام میں میت کے ایصال ثواب کے لئے خواتین قرآن پاک کے ختم کرتی رہتی ہیں۔ جب چالیسواں روز ہوتا ہے تو اس روز چہلم کی تقریب ہوتی ہے اگر غریب لوگ ہیں تو نہایت سادگی کے ساتھ چند قریبی رشتے دار میت والے گھر اکٹھے ہو کر ختم قرآن پاک کر کے میت کو ایصال ثواب کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ اگر صاحب حیثیت لوگ ہوں تو وہ اس چالیسویں روز بڑی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔ بڑی بڑی پلاؤ اور زردے کی دیگیں پکواتے ہیں اور ختم قرآن پاک کا اہتمام کرتے ہیں نزدیک و دور سب رشتے داروں اور احباب کو دعوت دی جاتی ہے اور چالیسویں کی خیرات میں سب لوگ شامل ہوتے ہیں۔ چالیسویں روز بھی دعائے مغفرت کی جاتی ہے اور پھر اس روز کے اختتام کے ساتھ ہی لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

دستار بندی: ایسی صورت میں کہ اگر گھر کا یا خاندان کا بڑا فوت ہو چکا ہو تو میت کے تیسرے روز یعنی سوئم کے دن شام سے پہلے اجتماعی دعا ہوتی ہے اس دعا سے پہلے میت کے سب سے بڑے بیٹے یا مردے کی نصیحت کے مطابق کسی بھی بیٹے کی دستار بندی کی جاتی ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اب یہ فرزند یا چھوٹا بھائی مرنے والے کا جانشین ہوگا۔ اس تقریب دستار بندی میں گھرانے کے بزرگ لوگ شامل ہوتے ہیں اور خاندان کا سب سے بڑا بزرگ کوئی اہم شخصیت یا سید جانشین کے سر پر پگڑی باندھتا ہے اور اس طرح یہ دستار بندی کی رسم مکمل ہو جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی اجتماعی دعا ہوتی ہے جو کہ میت کی مغفرت کے لئے لواحقین کے صبر جمیل اور جانشین کی لمبی زندگی اور عدل و انصاف کے مطابق رویہ رکھنے کے لئے ہوتی ہے۔

کھانے کے طور طریقے: قدیم زمانے کے مختلف طور طریقوں میں سے یوسفزئیوں کے علاقوں میں کھانے کے طور طریقوں کے جو رواج چلے آ رہے ہیں ان میں یہ ہے کہ جب ایک یا زیادہ مہمان آ جائیں تو انہیں علاقے کے بڑے حجرے میں ٹھہرایا جاتا تھا اور کھانے میں عموماً گوشت اور سبزیوں کی ترکاری پکائی جاتی تھی۔ کھانے کے وقت سب کو ایک جگہ فرشی نشست پر بٹھا کر دسترخوان بچھا دیا جاتا۔ کھانے سے پہلے حجرے کا ملازم یا گھر کے چھوٹے مہمانوں کے ہاتھ دھلاتے' پانی کوزے میں ہوتا اور باری باری چلمچی آگے رکھ دی جاتی جس پر مہمان ہاتھ دھوتے اور پھر تولئے سے صاف کئے جاتے۔ اس کے بعد سب ایک ہی جگہ پر کھانا تناول کرتے۔ اگر چاول پکے ہوں تو مٹی کی بنی ہوئی پرات' جسے سینک کہا جاتا تھا' اس میں ڈال دیئے جاتے اور سب شریک مجلس ہاتھوں سے چاول تناول کرتے۔ روٹی میں عموماً مکئی کی روٹی اور ترکاری میں مقامی ساگ یا پالک ضرور پکائی جاتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں لسی کا استعمال ہوتا۔ یہ روایتی طریقہ اب بھی بعض گھرانوں میں رائج ہے۔

تہوار اور میلے

میلہ نذر بوستان باباؒ: مردان سے متصل گاؤں بغدادہ میں نذر بوستان باباؒ کا مزار ہے جس کے اردگرد بہت بڑا قبرستان ہے۔ یہاں ایام گذشتہ میں عیدین کے موقع پر ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا جہاں مٹھائیوں اور چوڑیوں وغیرہ کی دکانیں سجی ہوتی تھیں اور بچوں کے لئے جھولوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تین دن تک یہ میلہ لگا رہتا تھا۔

اب بھی لوگوں میں یہ رواج ہے کہ نماز عید کے بعد لوگ اس قبرستان جاتے ہیں اور مردوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اب یہاں پر اس قسم کا میلہ نہیں لگتا جیسا کہ پہلے منعقد ہوتا تھا تاہم چونکہ لوگ وہاں قبروں پر جاتے ہیں تو مختلف قسم کے چھابڑی فروش' اور دیگر اشیاء یہاں بیچنے کے لئے لے جاتے ہیں اکا دکا جگہ پر جھولے بھی لگائے جاتے ہیں۔

میلہ کمپنی باغ: انگریزوں کے دور اور اس کے بعد بھی اس جگہ عیدین کے موقع پر ایک بہت بڑے میلے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جہاں جھولے اور چھلوں'

مٹھائیوں اور آرائش وزیبائش کی دکانیں لگائی جاتی تھیں۔ یہ مردان شہر کا بڑا میلہ سمجھا جاتا تھا جو عید کے تین دن تک جاری رہتا تھا۔ جھولوں اور خورد ونوش کی دکانوں کے علاوہ یہاں پر لکی سرکس بھی لگایا جاتا۔ اب میلے کی اس جگہ پر کرکٹ سٹیڈیم بن گیا ہے۔

میلہ مویشیاں: یونس سٹیڈیم مردان میں میلہ مویشیاں کے نام پر بہت مشہور میلہ لگتا تھا۔ یہاں مویشیوں کو سجا کر لایا جاتا تھا۔ اس موقع پر ان کی بڑی تعداد میں خرید وفروخت بھی ہوتی تھی۔ میلہ مویشیاں کے روز خورد ونوش کی اشیاء کی دکانیں لگائی جاتی تھیں۔ خاص طور پر چپلی کباب اور پکوڑوں کی دکانیں یہاں لگتی تھیں۔ اس میلے کے موقع پر مختلف کھلاڑی بھی یہاں آتے اور اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کھیلوں میں نیزہ بازی' تیراندازی' کبڈی کے مقابلے ہوتے تھے۔

تعمیرات، یادگاریں، رہائش گاہیں، قلعے، غاریں اور کھنڈرات

قلعہ مردان: یہ قلعہ مردان کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (CMH) کے قریب ہے۔ اس قلعہ کی بنیاد 1853ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کی تعمیر کے لئے بارہ سو مقامی مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔ یہ قلعہ مردان شہر کی دفاعی ضرورت کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔

یادگار: کنٹونمنٹ بورڈ کے سامنے ایک محرابی شکل کی چھوٹی سی عمارت ''یادگار'' کے نام پر 3 دسمبر 1879ء کو برطانوی حکومت کے لاؤس لیور گیزی نے فتح کابل کے موقع پر ان گائیڈز کی یاد میں تعمیر کروائی تھی جو کہ یہاں پر تعینات تھے اور جو کہ برطانوی ریذیڈینسی کا دفاع کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے تھے۔ اس ریذیڈینسی پر افغان حریت پسندوں نے دھاوا بول دیا تھا اور یہاں پر برطانوی حکومت کے تعینات اس گائیڈ دستے نے دفاع کیا تھا۔ سنگ مرمر کی تختی پر ان سپاہیوں کے نام کندہ کروا کے اس یادگار پر نصب کر دیئے گئے تھے جو اب تک موجود ہیں۔

چھاؤنی چوک: یہ چھاؤنی چوک مردان موجودہ عسکری بینک کے سامنے ایک یادگار تعمیر کی گئی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں یہاں ایک جنگ ہوئی تھی جسے مالاکنڈ کا غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معرکے میں جو انگریز سپاہی جاں بحق ہوئے تھے ان کی یاد میں یہ تعمیر کی گئی تھی۔

مردان چھاؤنی: انگریزوں نے مردان شہر کے ساتھ ایک چھاؤنی تعمیر کروائی اور اس چھاؤنی میں 1850ء میں انگریز گائیڈز آنا شروع ہوئے اور پھر دھیرے دھیرے ان فوجی دستوں میں اضافہ ہونے لگا جو کہ بغدادہ اور گوجر گڑھی تک پھیل گئے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں پر پنجاب رجمنٹ سنٹر قائم ہوا۔

کمپنی باغ: مردان کا یہ باغ انگریز دور کا تعمیر کردہ تاریخی باغ ہے۔ چونکہ یہ باغ انگریزوں نے تعمیر کروایا تھا اس لئے اسے کمپنی باغ کہا جاتا ہے۔

خاکسار منزل: مردان کے مصروف بازار بینک روڈ پر ایک قدیم عمارت خاکسار منزل کے نام پر سرخ رنگ کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ دراصل ایک سرائے ہے جس کے اندر اوپر اور نیچے چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہ عمارت زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی اور ثقافتی تعمیر کی علامت بن چکی ہے۔

مندر درھمسال: پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندو بڑی تعداد میں مقیم تھے اور مردان ومضافات میں ہندوؤں کی عبادت گاہیں' مندر و درھمسال کے نام پر تعمیر ہوئیں۔ ان میں سے بہت سے قدیم مندر اب کھنڈرات میں بدل گئے ہیں۔

ان مندروں میں مردان شہر کا یہ مندر یادگار تعمیر ہے۔ ہوتی پل کے ساتھ سوئی بازار میں اس وقت ایک مکان کی صورت میں مندر کی عمارت تھی جسے مندر درھمسال کہتے تھے۔ یہ عمارت بہت زیادہ بوسیدہ ہوگئی تو محکمہ اوقاف نے خطیر رقم خرچ کر کے اسے ایسے مندر میں تبدیل کر دیا جو رہائشی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے والی عمارت بن گئی ہے۔ قدیم عمارت میں لکڑی کا استعمال زیادہ تھا اور لکڑی پر خوبصورت کندہ کاری اور چتر کاری کی گئی تھی۔

مسجد: مردان میں ہوتی پل کے پاس سورے منڈے میں سب سے بڑی اور تاریخی مسجد تعمیر کی گئی جو اب تک مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور مذہبی عقائد وعبادات کی امین تعمیر ہے۔

بستی شیخ ملتون: مردان سے باہر جنوب کی طرف یوسفزئیوں کے سردار اور پیر ومرشد شیخ ملی کے نام سے منسوب ایک جدید بستی ''شیخ ملتون'' کے نام پر بسائی گئی ہے۔ یہ ایک وسیع احاطے پر مشتمل بستی ہے جہاں کشادہ سڑکیں' گلیاں اور مختلف مقامات پر بچوں کے کھیلنے کے لئے پارکس تعمیر کئے گئے ہیں۔ مردان شہر ومضافات کے متعدد تعلیمیافتہ' تاجر اور سکون پسند لوگ اس بستی میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ بستی

1985ء میں تعمیر ہوئی ہے۔ کھلے ہوادار اور ستھرے مکانات ہیں۔

غاریں: مردان، صوابی اور مضافات کے علاقوں میں ان قدیم غاروں کا پتہ چلتا ہے جن میں لوگ رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض وہ غاریں بھی ہیں جو کہ دفاعی پناہ گاہ کے طور پر بھی تعمیر ہوئی تھیں۔

غار کشمیر: فن تعمیر کے لحاظ سے یہ ایک عجوبہ غار ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اسے تخت بھائی کے ہم شکل بتاتے ہیں۔ اس غار سے متعلق ''لاہور تاریخ کے آئینہ میں'' کے مصنف کتاب کے صفحہ نمبر 41 میں پوری تفصیل کے ساتھ یوں ذکر کرتے ہیں:

''وادی سدوم مردان ریجن سے ملحق علاقہ کوہ ''پاجا'' میں یہ غار پہاڑ کی چوٹی پر کھودی گئی ہے۔ عام طور سے مشہور ہے کہ یہ وادی کشمیر میں جا نکلتی ہے۔ اس غار میں نیچے اترا جائے تو تھوڑی دور تک تو روشنی ملتی ہے جبکہ اس سے آگے جانے کے لئے خود روشنی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس غار کو انگریزوں کے ابتدائی دور میں دیکھا گیا تو اس میں تین کمرے دکھائی دیئے ایک سے ہو کر دوسرے میں داخل ہونا پڑتا ہے جبکہ تیسرے کمرے میں چند سیڑھیوں کے ذریعے اترنا پڑتا ہے جو کہ گھوم کر اترتی ہیں اور ان میں ہوا بھی لگتی ہے۔ ابتدائی دونوں کمروں کی لمبائی 322 فٹ تھی اور دوسرے کی 94 فٹ بتائی گئی ہے اور دونوں کی درمیانی گلی کوئی سو فٹ قطر کی ہوگی جس کی چھت میں تازہ ہوا کے لئے روشن دان رکھے گئے تھے۔ پہلے غار میں داخلہ کے ساتھ ہی ایک معبد تھا جہاں لکڑی کا ایک تابوت بھی پڑا تھا اس تابوت پر ایک فقیر کو رقص کرتے اور ایک عورت کو اسے پھول پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ مرکزی دالان میں ایک مربع شکل کی عبادت گاہ تھی اور اس کے ساتھ تیرہ فٹ چوڑا تین فٹ لمبا اور سو فٹ گہرا پانی کا ایک کنواں تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کی حفاظت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کیونکہ اس کے قریب کشمیری برج ہے اور اس قسم کے دوسرے تحفظات دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں ایک ایسا کتبہ بھی ملا تھا جس پر مختلف حروف کندہ تھے جن کا استعمال پانچویں صدی عیسوی میں تاتاری کرتے تھے۔

قدیم قلعے: وہ تاریخی قلعے جو کہ مردان ریجن میں جا بجا بنائے گئے تھے ان قلعوں میں بعض تو اب تک موجود ہیں اور بعضوں کے آثار ملتے ہیں۔

قلعہ ہنڈ: ہنڈ جسے راجہ جے پال کا دارالسلطنت کہا جاتا ہے یہ کبھی دنیا کی تاریخ میں قابل ذکر اور آباد متمدن شہر تھا اب ضلع صوابی کا بڑا قصبہ ہے۔

اس قلعہ کی تعمیر فنی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ قلعہ کی دیواروں کا محیط 1400 گز ہے اور ہر چوتھائی حصہ پر ایک دروازہ ہے۔ اس لحاظ سے کل دروازے چار ہیں جن میں سے جنوبی دروازہ بالکل ختم ہے مگر دیگر تین دروازوں کے آثار موجود ہیں اس کی دیواروں اور بنیاد میں قدیم طرز کا تعمیراتی مٹیریل دیکھا جاتا ہے۔

لاہور کے قلعہ جات: ضلع صوابی کے قدیم شہر لاہور میں موجود قلعہ کا ذکر البیرونی نے اپنی کتاب ''کتاب الہند'' میں کیا ہے۔ اس قلعہ کے اندر اور باہر مغرب کی جانب کنویں نما غاریں ہیں۔ ان غاروں میں سے بعض اب بھی پائی جاتی ہیں۔ جب انگریز اس خطہ میں داخل ہوئے تو اس وقت اس قلعہ کی آبادی سے لوگ پتھر نکال کر لاتے اور نئے گھر آباد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور قلعہ مشرقی لاہور کے شمال میں تھا جو اب روانہ گڑھی کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرا قلعہ گڑھی خان خیل کے نام سے مشہور ہے اس کی اونچائی مشرقی لاہور کی عام آبادی سے پچاس فٹ ہے۔

قلعہ بتیور: یہ قلعہ بتیور نام سے (تور ڈھیر) بنایا گیا جو کہ غزنویوں کے دور تک آباد تھا یہ علاقہ ہنڈ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔

قلعہ شہباز گڑھی: شہباز گڑھی جو مردان کا ایک معروف مقام ہے۔ یہاں پر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنے فوجیوں کو ٹھہرانے کے لئے 16 ویں صدی عیسوی میں ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا جو کہ قلعہ شہباز گڑھی کے نام سے معروف ہے۔

ڈھیریاں: ڈھیریوں کے بارے میں اجمالاً ذکر ہوا ہے یہ وہ ڈھیریاں ہیں جو کہ اونچے ٹیلوں پر بنائی جاتی تھیں۔ قدیم ادوار میں یہاں پر گھاس پھوس کے مکانات تعمیر کر کے علاقے کے باشندے بسیرا کرتے تھے۔ اب یہ ڈھیریاں آثار زمانہ کے طور پر موجود ہیں۔ ان میں قدیم لاہور ضلع صوابی کی تین ڈھیریاں، بہت مشہور ہیں۔

۱) کلی خوڑ ڈھیری جو آبادی ''کندے رایورے'' سے مغرب کی جانب ہے۔

۲) چھتہ ڈھیری، ۳) سپونجیلو ڈھیری۔

ان ڈھیریوں میں سے کلی خوا ڈھیری ایسی ہے کہ گاؤں کے باشندے یہاں سے نئی دیواریں بنانے کے لئے گول پتھر اکھاڑ کر لاتے ہیں اور اپنے گھروں اور دیواروں کی مرمت کرتے ہیں۔

اس گاؤں میں کئی مزارات موجود ہیں جن میں مرزا شیخ جمال الدین المعروف بادو بابا بہت مشہور ہے۔ یہاں پر مسلمان گھرانوں کے علاوہ کچھ ہندو

بھی آباد ہیں۔ یہ اروڑے ہندو ہیں جو سودا سلف بیچتے ہیں۔ 1872ء تک یہاں بارہ کچی مسجدیں' ایک دھرمسالہ' حجرے بارہ عدد' گھر 551 بوسیدہ اور کچے' پختہ مکان کوئی نہیں' کل آدمی 2308' مسلمان 2159 ان میں سے مرد 1157 اور خواتین 1083' ہندو 49' مرد ہندو 31 اور عورتیں 18 یہ کل تفصیلات ہیں۔

ان تین ڈھیریوں کے علاوہ موضع لاہور میں کچھ مزید بھی ڈھیریاں ہیں ان میں وسطی ڈھیری ہے۔

اس ڈھیری تلیٹی مغربی تلیٹی پر کمال الدین نیک نام کا مزار ہے۔ جس کے مغرب کی طرف گاؤں کے ایک مکان کے صحن میں کمال الدین نیک نام کے والد سعید کے چھوٹے بھائی عبداللہ اللہ داد کا مزار ہے۔ ان کے علاوہ اس بڑی ڈھیری کے مشرق میں ایک دوسری بڑی ڈھیری ہے جس کی مغربی تلیٹی پر سید جمال الدین بخاری کا مزار ہے۔

اجی ڈھیری: منشی گوپال داس نے بھی کلی خواڈھیری کا ذکر کیا ہے۔ اس کے جنوب میں ادینہ لاہور (چھوٹا لاہور) روڈ پر ایک اور ڈھیری اجی ڈھیری کے نام سے بھی ہے۔ یہ ڈھیری آجاسا + اسپالاہورا کی یاد میں بنائی گئی تھی جس سے مراد ہے کہ اس قدیم لاہور کے حکمران آجاساتھے یہ ایک مرکب نام ہے اس + پاسے۔

نقری وعزیز ڈھیری: یہ بمقام ''باکر'' نقری اور عزیز ڈھیری کے نام سے موسوم ڈھیریاں ہیں یہ ڈھیریاں قدیم آبادیاں تھیں اور یہاں سے آثار قدیمہ کے ماہرین نے بڑی مقدار میں بت نکالے ہیں جو اس مقام کی قدامت پر شواہد ہیں۔

کھنڈرات: مردان کے شمال کی جانب تخت بھائی کے مقام پر بدھ مت کا علمی اور مذہبی مرکز اب تک تخت بھائی کے کھنڈرات کی صورت میں مشہور ہے۔ موجودہ تخت بھائی کے بازار کے مشرق کی طرف انتہائی اونچائی پر بدھ دور کے یہ کھنڈرات صدیوں سے موجود ہیں۔

رومانوی داستانیں

ولی جان اور تانو: یہ رومانوی داستان بھی موسیٰ خان و گل مکئی کی داستان کے ساتھ ہی جڑی ہوئی دوسرے بھائی ولی جان اور دوسری بہن تانو کی داستان محبت ہے۔ مگر علاقہ غرمسک کے خان عیسیٰ خان کے دوسرے بیٹے ولی جان اور گل مست خان کی دوسری بیٹی تانو کی داستان عشق بیان کرنے سے پہلے اس کے کچھ بنیادی عناصر کا بھی یہاں ذکر کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ خان کی کوئی اولاد نہیں تھی منتوں اور دعاؤں کے بعد بھی کوئی اولاد نہ ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حضرت رحمکار باباؒ المعروف کاکا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ولایت و بزرگی کا بڑا چرچا تھا۔ عیسیٰ خان کی اولاد طلبی کی شدت کو دیکھ کر دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ حضرت کاکا صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دے اور ان سے اولاد کے لئے دعا کروائے۔ چنانچہ عیسیٰ خان حضرت کاکا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اولاد کے لئے دعا کرنے کی درخواست کی۔ حضرت کاکا صاحبؒ نے اس کے لئے دعا فرمائی اسی اثناء میں ایک مرید انجیریں لے کر حضرت کاکا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا عیسیٰ خان حضرت کاکا صاحبؒ سے دعائیں لے کر جب واپس جانے لگا تو حضرت کاکا صاحب نے عیسیٰ خان کو کچھ انجیریں لینے کے لئے کہا عیسیٰ خان نے انجیروں کے ٹوکرے میں سے دو انجیریں اٹھائیں حضرت کاکا صاحبؒ نے عیسیٰ خان سے کہا کہ تو نے دو انجیریں اٹھائیں ہیں جاؤ اللہ تعالیٰ تجھے دو بیٹے عطا کرے گا۔ اگر تو ان انجیروں کے ٹوکرے سے زیادہ انجیریں اٹھاتا تو اللہ تعالیٰ تجھے کثیر الاولاد کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا یوں ہوا کہ اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام موسیٰ خان رکھا گیا۔ راویوں کے مطابق یہ وہی موسیٰ خان ہے جو گل مکئی کی داستان عشق کا ہیرو ہے۔ دوسرے سال دوسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ولی جان رکھا گیا۔

دونوں لڑکے ذرا بڑے ہوئے تو گاؤں کے مکتب میں تعلیم کے لئے بٹھا دیا گیا اسی مکتب میں ان کے چچا کی دو بیٹیاں گل مکئی اور تانو بھی درس کے لئے آتی تھیں۔ موسیٰ خان اور گل مکئی کی داستان عشق بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جبکہ ولی جان اور تانو کی داستان محبت بھی اس مکتب سے پروان چڑھتی ہے۔

بات پہنچتے پہنچتے گل مکئی اور تانو کی ماں تک پہنچ گئی ماں نے ان دونوں بیٹیوں کو مکتب میں بھیجنا بند کر دیا اور وہ گھر میں مقید ہو گئیں۔

جہاں تک گل مکئی کی داستان کا تعلق ہے وہ پہلے ہی بیان ہو چکی ہے۔

ولی جان اور تانو کی محبت کے سلسلے میں بھی وہی کچھ ہوا جو کہ گل مکئی اور موسیٰ خان کی محبت کے سلسلے میں پیش آیا یعنی دونوں بھائیوں یعنی عیسیٰ خان اور خان مست کے درمیان کشمکش تو پہلے ہی جاری تھی اب اس بات سے بہانہ ہاتھ آ گیا کہ دونوں علے الاعلان میدان مقابلے میں اتر پڑے۔ گل مست نے اپنے گاؤں کے لوگوں کو عیسیٰ خان کے خلاف ابھارا اور انہوں نے ہتھیار سے لیس ہو کر عیسیٰ خان اور اس کے بیٹوں پر حملہ کر دیا ادھر عیسیٰ خان نے بھی اپنے گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور میدان میں اتر پڑے۔ تین چار روز سخت جنگ ہوئی اور دونوں طرف کے لوگ

میدان میں کام آئے۔ آخر اس بے مقصد جنگ کے نتائج کا اندازہ کرتے ہوئے طرفین کے بزرگوں نے اس جنگ کو بند کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ سروں پر قرآن پاک اٹھا کر میدان میں آ گئے اور طرفین کے لوگوں سے جنگ بند کرنے کی درخواست کی جس کے نتیجے میں جنگ کے شعلے سرد پڑنے لگے اور جنگ بند ہو گئی۔ پھر بزرگوں نے دونوں بھائیوں عیسیٰ اور گل مست خان کے درمیان صلح کروا دی اس موقع پر گل مست خان کی طرف ولی جان کے لئے تانو کی شادی کا پیغام بھیجا گیا جو اس نے منظور کر لیا اور دونوں کی شادی دھوم دھام کے ساتھ ہو گئی۔

شادی خان اور بو: یہ لوک داستان بھی پشتون علاقوں کی رومانوی داستانوں میں سے ایک ایسی رومانوی داستان ہے جس کا تعلق پشتونوں کی دیگر صفات میں سے ایک اہم صفت وفاداری اور ثابت قدمی سے ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ داستان افغانستان کے علاقے کے ایک گاؤں بکوا و تلخک سے ہے۔ جو افغانستان کے صوبہ قندھار کے قریب ہے۔

بعض نے اسے پشاور کے قریب ایک گاؤں ترخہ کی طرف منسوب کیا ہے جبکہ ترجیحاً روایت کے مطابق یہاں اسے مردان ریجن کے ضلع صوابی کے ایک گاؤں کوٹہ سے منسوب کر کے بیان کیا جا رہا ہے۔ خاطر غزنوی نے اسے صوابی کی رومانوی داستانوں میں شامل کیا ہے۔

سید معصوم جو کہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے سپہ سالار تھے ادب اور قلم کے ساتھ بھی شغف رکھتے تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں قندھار گئے اور قندھار اور مضافات کی تہذیب و ثقافت سے متعلق انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کی کتاب تحفہ معصومی میں یہ رومانوی داستان رقم ہے جبکہ پروفیسر پریشان خٹک نے بھی اپنی کتاب ''پشتون کون؟'' میں اس داستان کو مختلف حوالوں سے پشتون کی وفاداری کے عنوان کے ماتحت بیان کیا ہے یہ رومانوی داستان کچھ اس طرح سے ہے:

علاقہ صوابی کے گاؤں کوٹہ میں دو بھائی رہتے تھے ایک کا نام ولی محمد تھا اس کا بیٹا شادی خان تھا۔ دوسرے بھائی کا نام علی محمد تھا اس کی ایک بیٹی تھی جو بو کے نام سے مشہور ہوئی۔ ممکن ہے اس کا اصلی نام کوئی اور ہو مگر صوبہ سرحد کے علاقوں میں بو یا تو پیار سے لڑکیوں کے نام رکھے جاتے ہیں یا احترام سے۔ بہر حال شادی خان اور بو چچازاد بہن بھائی تھے۔ دونوں کا بچپن ایک ہی گاؤں ایک ہی فضاء میں کھیلتے کودتے گزرا دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ اگرچہ دونوں کی مالی حیثیتوں میں بہت فرق تھا۔ بو کا باپ مالی حیثیت سے مستحکم تھا اور وہ ایک محل نما مکان میں رہتا تھا جبکہ شادی خان مالی حیثیت سے کمزور تھا اور وہ ایک جھونپڑے میں رہتا تھا مگر خاندانی اور نسلی نسبت سے دونوں کی حیثیت ایک تھی چونکہ شادی خان اور بو بچپنے سے ساتھ ساتھ تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت بھی کرتے تھے۔ جوں جوں یہ جوان ہوتے رہے تو اسی کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے جذبہ محبت بھی پروان چڑھتا رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ جو کہ عمر کے ساتھ ساتھ جذبہ عشق میں منتقل ہوتا گیا۔ مگر پشتون روایت کے مطابق اس جذبے کو انہوں نے باہمی احترام کے نقاب سے باہر نہیں آنے دیا۔ مرد ہونے کے ناطے شادی خان بو کے حسن و جمال کی مدح سرائی اپنے دل ہی دل میں کرتا رہتا تھا۔ جب دونوں بلوغت و جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئے تو پشتون روایات کے مطابق ان کے کھلے عام ملنے جلنے پر پابندی عائد ہو گئی۔ اب شادی خان سے بو کا ملنا جلنا بہت کم ہو گیا شادی خان بو کے عشق کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتا رہتا تھا مگر کھلے عام اظہار محبت کے لئے اسے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ دوسری طرف بو بھی باوجود شادی خان کے لئے اپنے دل میں والہانہ محبت کے جذبات رکھنے کے اپنی خاندانی روایات کے سامنے جھک گئی۔

شادی خان کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور شام کو لکڑیاں کاٹ کر گھر لے آتا۔ اسی معمول کے طابق ایک روز وہ صبح کے اندھیرے میں جنگل پہنچا اور جب افق پر سفیدی چھانے لگی تو اس وقت تک اس نے ایک بڑے تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک گرایا تھا۔ اس روز بو بھی اسی لمحے ادھر کو آ نکلی دونوں کا آمنا سامنا ہوا' دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں' دونوں اپنا اپنا حالِ دل بیان کرنے کی تڑپ رکھتے تھے۔ مگر دونوں کے ہونٹ بند رہے اور چپ چاپ یہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ اچانک بو کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور کہا'' شادی خان ہٹ جاؤ، دیکھو! تمہاری طرف ایک سانپ بڑھ رہا ہے اسے مارو'' شادی خان نے جب سانپ کی طرف دیکھا تو نہایت اطمینان کے ساتھ کہا:'' سانپ کو اپنی راہ پر جانے دو' میں منہ اندھیرے جنگل میں آتا ہوں ابھی تک مجھے کسی بھی سانپ نے نہیں ڈسا ہم لوگوں کا اس مخلوق کے ساتھ واسطہ رہتا ہے۔ جو لوگ اندھیرے میں جنگل میں کام کرتے ہیں انہیں سانپوں کی دشمنی مول نہیں لینی چاہئے۔'' اس کے بعد دونوں طرف سے پھر خاموشی چھا گئی شادی خان نے بو سے کہا:'' بو کچھ تو حالِ دل بیان کرو کہ دل پر سے کچھ بوجھ اتر جائے۔'' بو نے کہا،'' شادی خان تم کچھ کیوں نہیں بولتے کیا تمہارے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھا ہے کہ تم نہیں بولتے تم ہی کچھ اپنے دل کا حال بیان کر دو۔'' شادی خان جو بو کی محبت میں اندر ہی اندر پگھل چکا تھا بڑی جرات کے ساتھ بولا'' بو اگر میں

تیرے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ کر بوسہ لے لوں تو تم برا تو نہیں مناؤ گی۔'' بو نے جب شادی خان کے منہ سے پشتون روایت سے برعکس یہ الفاظ سنے تو اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا اور نہایت غضبناک ہو کر کہا: '' شادی خان اگر تجھے پشتون قوم کی روایت کی پاسداری نہیں اور اپنے خاندان کی قدروں کو تو بھول گیا ہے تو میں تو ان باتوں کو نہیں بھولی ہوں۔ بہتر تو یہ تھا کہ تم رشتہ کا پیغام میرے والدین کے پاس بھیج دیتے تا کہ خاندانی روایات کی پاسداری کے ساتھ ہمارا رشتہ طے ہوتا۔'' بو یہ کہہ کر غصے کی حالت میں اپنے گھر کی طرف چل دی اور ادھر شادی خان کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو اپنا مال و متاع کھو کر دیار غیر میں تن تنہا بے سہارا رہ گیا ہو۔ شادی خان نے بو کو پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا: '' اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی اس جنگل اور اپنے وطن کو چھوڑ کر جا رہا ہوں کیونکہ اب مجھے ان فضاؤں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔'' یہ کہہ کر شادی بوجھل قدم اٹھائے ہوئے جنگل سے نکلنے لگا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسے توقع تھی کہ بو اسے آواز دے کر روک لے گی مگر بو نے اسے آواز نہیں دی اور شادی خان ہمیشہ کے لئے اپنے وطن سے دور جانے کا عزم لے کر جنگل کی فضاؤں سے نکل گیا۔

شام کو جب شادی خان گھر نہیں پہنچا تو اس کی ماں کو بیٹے کی فکر لاحق ہوئی' شادی خان کا باپ اپنے بھائی کے ساتھ سوداگری کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا رات کا کافی حصہ گزر گیا مگر شادی خان گھر نہ لوٹا تو ماں اور زیادہ بے قرار ہو گئی اس نے آس پاس اڑوس پڑوس ہر طرف سے شادی خان کی ٹوہ لگائی مگر کہیں سے بھی اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ صبح ہوتے ہی شادی خان کی ماں بو کو لے کر جنگل پہنچی وہ اس درخت تک پہنچی جہاں شادی خان نے درخت گرایا تھا مگر شادی خان کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ماں نے جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا بو نے شادی خان کی ماں کو دلاسا دینے کی کوشش کی مگر ماں نے کہا: '' بو تجھے ایک ماں کے دل کی کیفیت کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔'' بو نے کہا: '' بے شک میرے سینے میں ایک ماں کا دل تو نہیں مگر میرے سینے میں ایک چاہنے والا دل ضرور دھڑک رہا ہے۔ میں اپنے طور سے آگ میں سلگ رہی ہوں اور تم ایک ماں کی حیثیت سے بیٹے کی جدائی کی آگ میں جل رہی ہو۔'' اس کے بعد بو نے شادی خان کی ماں کو کل کا سارا واقعہ سنا دیا کہ شادی خان اور اس کے درمیان کیا مکالمہ ہوا تھا۔ شادی خان نے جب گاؤں چھوڑا تو گاؤں سے باہر سڑک پر اسے ایک قافلہ مل گیا جو کہ سوداگری کی غرض سے ہندوستان سے ایران جا رہا تھا۔ یہ قافلے کے ساتھ ہو لیا۔ جب رات آئی تو قافلے والوں نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ شادی خان تنہا ایک طرف بیٹھ گیا قافلے کے دوسرے لوگوں نے آگ جلائی کھانے کا سامان تیار کیا شادی خان بھوکا پیاسا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ دل میں محبت کا نغمہ الاپ رہا تھا۔ اس نے نہایت درد بھری آواز میں پشتو کا ایک گانا شروع کیا۔ قافلے کے سردار نے جب یہ درد بھرا نغمہ سنا تو نوکروں کو کہا: '' اس شخص کو میرے پاس لاؤ۔'' اسے قافلے کے سردار کے پاس لایا گیا لوگوں نے شک ظاہر کیا کہ یہ چوری چکاری کے لئے نہ آیا ہو۔ مگر قافلے کا مالک تجربہ کار شخص تھا اس نے کہا کہ کوئی چور اس قسم کا درد بھرا نغمہ نہیں کہہ سکتا۔ سردار نے اسے دلاسا دیا۔ شادی خان نے اسے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ قافلے کا سردار اس واقعہ سے بڑا متاثر ہوا اور اسے قافلے کے ساتھ اصفہان لے گیا جہاں اس نے شادی خان کی ایمانداری اور صداقت کا پوری طرح مشاہدہ کیا۔ قافلے کا مالک اس کے کردار سے بڑا متاثر ہوا اور اسے اہم ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اسی اثناء میں چار سال کا عرصہ گزر گیا قافلہ پھر سوداگری کا مال لے کر ہندوستان کے لئے تیار ہوا تو قافلے کے مالک نے شادی خان کو اصفہان میں اپنا قائم مقام بنا دیا۔ اس کا نام تاج محمد تھا۔ شادی خان نے تاج محمد کو ایک خط اپنے چچا کے لئے دیا اور لکھا کہ میں اصفہان میں بڑے اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔ قافلہ جب پشاور پہنچا تو تاج محمد نے صوابی جا کر اس کے چچا کو یہ خط دیا۔ خط ملنے پر سب کو معلوم ہو گیا کہ شادی خان اصفہان میں ہے۔ شادی خان کا باپ بیٹے کو لینے کیلئے اصفہان پہنچا اور بیٹے کو آمادہ کیا کہ وہ گاؤں چلے جہاں اس کی ماں اس کے فراق میں بڑی بے چین ہے۔ شادی خان باپ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ادھر قافلہ ابھی اس مقام پر ٹھہرا ہوا تھا شادی خان پہلے گاؤں پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے اسے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا اور پھر بو کے ساتھ اس کی منگنی ہو گئی۔ شادی خان قافلے کی طرف چلا گیا جہاں قافلے کے سردار تاج محمد کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس نے شادی خان کو بلا کر کہا: '' میں نے تجھے اپنے بیٹے کی طرح رکھا ہے میرے دل میں تیرے لئے بیٹے سے کم محبت نہیں۔ میں تجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔ میرے گاؤں میں میری بیوی اور ایک بیٹی ہے میرے جتنے بھی قافلے کے ساتھی ہیں یہ فصلی بٹیرے ہیں اور مجھے کسی پر بھی بھروسہ نہیں۔ یہ مال و متاع کی لالچ میں ہو سکتا ہے مجھے راستے ہی میں قتل کر دیں۔ تم مجھے اپنے گھر چھوڑ آؤ۔'' یہ سوداگر کو لے کر مال و اسباب کے ساتھ اس کے گھر لے گیا سوداگر نے گھر پہنچ کر دم توڑ دیا اور گھر ماتم کدہ بن گیا۔ شادی خان چند روز وہیں ٹھہرا رہا۔ سوداگر کی بیٹی نے جب شادی خان کو ایک باکردار اور ایماندار آدمی پایا تو اس کے ساتھ اسے محبت ہو گئی اور اس نے شادی خان کو ایک دن اپنے دل کا حال بیان کر دیا۔ شادی خان نے کہا: '' اس کی منگنی تو اس کے چچا کی لڑکی کے ساتھ ہو چکی ہے'' یہ کہہ کر شادی خان اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا جب گاؤں کے قریب

پہنچا تو رات ہو چکی تھی اس نے ایک پڑاؤ کے پاس رات کو قیام کیا۔ یہ زمین پر لیٹا ہوا تھا کہ نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اس نے ساتھ ہی ایک کھونٹے میں گھوڑے کی رسی باندھ دی تھی آدھی رات کو گھوڑے نے خطرے کو بھانپ کر پاؤں زمین پر مارنا شروع کر دیئے۔ مگر شادی خان نے کوئی توجہ نہ دی اور وہ سویا رہا۔ نیند میں اس نے خواب دیکھا کہ اس کے قریب ہی ایک سانپ رینگ رہا ہے بو اس کے پاس کھڑی ہے اور وہ کہہ رہی ہے شادی خان سانپ کو مارو مگر یہ جواب دیتا ہے کہ اسے جانے دو۔ اتنے میں اس کی آنکھ کھلتی ہے تو یہ اپنے پاس سانپ کو دیکھتا ہے جو اسے ڈس چکا ہے اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر گھر پہنچنے کی کوشش کی مگر سانپ کا زہر سارے بدن میں پھیل چکا تھا جس کی وجہ سے یہ وہیں گر گیا اور پھر وہیں پر ہی اس نے دم توڑ دیا۔ گاؤں میں شادی خان کے مرنے کی خبر پھیلی تو سارے لوگوں کے ساتھ بو بھی اس کے پاس پہنچی اور اس کی لاش پر گر گئی اور چمٹ گئی۔ لوگوں نے انہیں علیحدہ کرنے کی جب کوشش کی تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ بو بھی اس کے ساتھ ہی مر گئی۔ دو سچے محبت کرنے والے اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ اسی مقام پر دونوں کو دفن کیا گیا۔

ظریف خان و اومئی: اس کہانی کا تعلق یوسف زئی کے علاقہ مردان سے ہے۔ کہتے ہیں کہ تین بھائی تھے ایک کا نام حسین خان دوسرا عجب خان اور تیسرے بھائی کا نام حذرئی تھا۔ بڑا حسین خان تھا جو اپنی قوم اور قبیلے کا سردار تھا۔ اس کا ایک بیٹا ظریف خان تھا۔ منجھلے بھائی عجب خان کا بھی ایک بیٹا تھا جس کا نام عالم خان تھا اور تیسرا بھائی لاولد تھا۔ حذرئی کا کاروبار افغانستان سے کوچیوں کے گھوڑوں کو خرید کر ہندوستان لے جا کر بیچنا تھا۔ وہ اس کاروبار سے کافی روپیہ کماتا تھا۔ حسین خان بھی کافی صاحب جائیداد تھا مگر خرچ کرنے میں بخیل اور کنجوس واقع ہوا تھا۔ اس کی طبیعت میں کنجوسی کا عنصر بہت حد تک داخل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بخیلی اور کنجوسی میں علاقے میں مشہور ہو چکا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرے مگر خرچ نہ کرے۔ اس کی یہ منفی سوچ پٹھانوں کی شاہ خرچیوں کے برعکس تھی۔ علاقے میں سب لوگ اسے کنجوس اور بخیل کہتے تھے۔ وہ پٹھانوں کی طرح مہمان نوازی نہیں کرتا تھا اس کے حجرے میں مہمانوں کی ضیافت کا دستر خوان نہیں بچھتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ظریف خان کو اس کے باپ کی اس تنگ ظرفی اور کنجوسی کے بارے میں طعنہ دیتے تھے۔ وہ روز لوگوں سے اپنے باپ کی اس ناپسندیدہ عادت کے بارے میں سنتا رہتا تھا اور اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا۔ روزانہ اس قسم کی باتیں سن سن کر وہ تنگ آ گیا آخر ایک روز وہ اپنے باپ کے ساتھ لڑ پڑا اور خودکشی کی دھمکی دی۔ چونکہ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ بیٹے سے بے رغبتی نہیں برت سکتا تھا اس لئے اس نے خزانے کی چابیاں بیٹے کو دے دیں۔ بیٹے نے خزانے کی چابیاں سنبھالتے ہی باپ کا خزانہ لٹانا شروع کر دیا۔ وہ بے دریغ خرچ کرنے لگا اور حجرے میں ضیافت کا ایسا دستر خوان بچھا دیا کہ ہر کس و ناکس یہاں آتا اور ضیافت کے مزے اڑاتا اس وجہ سے سارے گاؤں میں ظریف خان کی دھوم مچ گئی۔ ظریف خان کی شاہ خرچی اس حد تک بڑھ گئی کہ اب گاؤں کے مطلب پرست اور خودغرض لوگوں کا حلقہ بھی اس کے گرد بڑھنے لگا۔ لوگ آتے اور اس سے اپنا مطلب پورا کرتے رہتے تھے۔ باپ یہ سارا منظر دیکھتا رہتا اور دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ وہ بیٹے کو کافی سمجھاتا رہتا کہ وہ خرچ میں اعتدال پیدا کرے مگر بیٹا کہاں مانتا۔ باپ کے سمجھانے کے باوجود اس کی شاہ خرچیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ایک روز ظریف خان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ حجرے میں اس کا ملازم نعمت اللہ مہمانوں کی آؤ بھگت اور دیکھ بھال کے لئے موجود تھا۔ دو مہمان آئے تو نعمت اللہ نے ان کی اپنے مالک کی ہدایت کے مطابق خاطر مدارات کی۔ باتوں میں ان مہمانوں نے ساتھ کے دوسرے گاؤں کے مجید خان کی ضیافت و مہمان نوازی کی بڑی تعریف کی اور مجید خان کی مہمان نوازی کو بے مثال قرار دیا۔ ظریف خان کے ملازم نے اگرچہ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں کی مگر انہوں نے مجید خان کی مہمان نوازی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ نعمت اللہ کو ان کی باتیں اچھی نہ لگیں۔ جب ظریف خان واپس حجرے میں آیا تو اس کے ملازم نعمت اللہ نے ساری باتیں ظریف خان کو کہہ ڈالیں۔ ظریف خان اور نعمت اللہ نے کافی غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ وہ پڑوس کے گاؤں میں جا کر مجید خان کی مہمان نوازی کی حقیقت معلوم کریں۔ دونوں مجید خان کے گاؤں پہنچے انہوں نے دیکھا کہ مجید کے گاؤں میں بے شمار مہمان پہلے ہی سے موجود تھے۔ مجید خان ظریف خان اور نعمت اللہ کے ساتھ بھی بڑی مروت کے ساتھ پیش آیا۔ اس نے ان دونوں کا پرتپاک استقبال کیا اور دوسرے مہمانوں کے مقابلے میں اسے زیادہ تعظیم و تکریم دی۔ ظریف خان نے مجید خان سے پوچھا کہ وہ اپنے حجرے میں آنے والے مہمانوں میں امتیاز کیوں برت رہا ہے۔ مجید خان نے جواب دیا کہ میں اپنے مہمانوں کے معیار و مرتبے کو پہچان کر ان کی خاطر مدارات اور دیکھ بھال کرتا ہوں۔ میں اس بات کے حق میں نہیں کہ جو ساری عمر روکھی سوکھی کھا رہا ہو اس کی مہمان نوازی اس طرح کروں کہ اسے مرغ پلاؤ پیش کروں اور جو ساری عمر پرتعیش زندگی گزار رہا ہو اسے روکھی سوکھی پیش کر کے اس کے مقام مرتبے سے چشم پوشی کروں۔ ظریف خان اس کی باتوں سے بڑا متاثر ہو رہا تھا اور مجید خان کے اس فلسفے سے پوری طرح

اتفاق کرنے لگا۔ اسی دوران مجید خان نے کہا: ''میرا گمان ہے تم ظریف خان ہو'' نعمت اللہ خان نے فوراً کہا: ''آپ کا گمان درست ہے یہ ظریف خان ہی ہے جس کے مہمان نوازی کے چرچے آج کل گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے ہیں۔'' دونوں مجید خان اور ظریف ایک بار پھر پرتپاک طریقے سے ملے اور اس روز سے دونوں کے درمیان مضبوط دوستی کی بنیاد رکھی گئی اور یہ دونوں دوست اکثر ملتے رہتے اور ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے۔

ظریف خان کا باپ حسین خان بیٹے کی روز روز کی فضول خرچی کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوتا رہتا مگر ظریف خان ٹس سے مس نہ ہوتا۔ حسین خان نے سوچا کہ اس کی شادی وہ اپنی بہن کی بیٹی اومئی سے کر دے جو کہ اس کی بچپن کی ساتھی بھی ہے اور اس کی پھوپھی زاد بہن بھی ہے ممکن ہے وہ شادی کے بعد سدھر جائے۔ چنانچہ دونوں کی منگنی کر دی گئی اور منگنی کے بعد شادی کی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ اس کا باپ حسین خان فوت ہو گیا۔ ظریف خان نے باپ کی وفات کی رسومات پر بھی بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ جب باپ کا سایہ سر پر نہیں رہا تو اب تو کوئی اس کے راستے میں رکاوٹ بھی نہیں رہی جو اسے شاہ خرچیوں سے منع کرے۔ اس لئے اس کی فضول خرچی حد سے زیادہ بڑھنے لگی۔ اس کے گرد خود غرض اور ابن الوقت لوگوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ایسی حالت میں اس کے دوست مجید خان نے اسے ان خود غرض لوگوں کے بارے میں بتایا کہ یہ خود غرض اور مطلب پرست لوگ ہیں جو کہ آزمائش کی گھڑی میں کسی کے کام نہیں آتے۔

چنانچہ ظریف خان نے ان دوستوں کو آزمانے کے لئے ایک چال چلی۔ ایک دن ظریف خان خون سے لت پت تلوار ہاتھ میں لئے ہانپتے کانپتے ہوئے حجرے میں داخل ہوا۔ حجرے میں موجود دوستوں کو کہا: ''وہ ایک بڑے خان کو قتل کر آیا ہے اور اب اس خان کے لوگ اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی طرف آ رہے ہیں۔'' جب اس کے خود غرض دوستوں نے یہ بات سنی تو وہ حجرے سے کھسکتے گئے اور حجرے میں اس کا ملازم نعمت اللہ رہ گیا جو ظریف خان کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ ظریف خان نے نعمت اللہ کو اپنی تدبیر کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا: ''نعمت اللہ تمہیں کسی قسم کی فکر نہیں کرنی چاہئے یہ سب کچھ تو میں نے ان خود غرض لوگوں کو آزمانے کے لئے کیا ہے۔ میں نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا میں نے تو ایک ہرن کو مارا ہے اور اس کے خون سے میری تلوار رنگین ہوئی ہے اب میں نے ان خود غرض دوستوں کو پہچان لیا ہے۔''

اب ظریف خان کو ان دوستوں سے نجات مل گئی مگر وقت کافی گزر چکا تھا وہ کنگال ہو گیا تھا اس نے اپنے تاجر چچا حذرئی خان کو کہا کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ ہندوستان لے جائے تاکہ تجارت کر کے روپیہ کما سکے' حذرئی خان نے پس وپیش کے بعد اس کی بات مان لی اور اسے اپنے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان لے جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ ظریف خان کی ایک بہن بھی تھی اس نے ہندوستان جانے سے پہلے اپنی بہن کو اپنی پھوپھی کے گھر پہنچا دیا اور وہاں پر اومئی سے بھی تھوڑی دیر کے لئے ملاقات کر سکا۔ اومئی نے اسے کہا: ''ظریف خان تم تو ہندوستان جا رہے ہو مگر مجھے خدشہ ہے کہ تمہارے چچا کا بیٹا عالم خان کوئی شرارت نہ کرے۔'' ظریف خان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''اگر کوئی ایسی نوبت آئی تو وہ اس کے دوست مجید خان کو بتا دے وہ اس معاملے میں ایک بہترین معاون ثابت ہوگا۔'' ظریف خان نے کوچیوں سے گھوڑے خریدے اور سفر پر روانہ ہونے لگا۔ اس کے ملازم نعمت اللہ نے موضع ہنڈ تک اس کا ساتھ دیا اور اس مقام پر اسے الوداع کہا۔ دریائے سندھ کے کنارے پہنچے تو اس نے دریا پار کرنے کے لئے ایک اجارہ دار کی کشتیوں کو تیار دیکھا اس اجارہ دار کا اس کا چچا مقروض تھا اس لئے اس کے چچا حذرئی نے تمام گھوڑے ظریف خان کے سپرد کر کے کہا کہ تم دریا پار کر کے چلے جاؤ میں ایک ضروری کام کے لئے جا رہا ہوں اور ایک دو روز میں دریا کے پار تم سے ملوں گا۔ اجارہ دار ظریف خان کے اخلاق اور اعلیٰ کردار سے بہت متاثر ہوا اس کے گھوڑے بحفاظت دریا کے پار اتروائے۔ وہیں اس کا چچا حذرئی بھی پہنچ گیا یہاں پر اکبر بادشاہ کے سپاہیوں نے انہیں ٹھہرا لیا اور ان کے گھوڑے بیگار میں لے جانے کو کہا۔ حذرئی خان اس پر اکبر کے سپاہ سے الجھ پڑا تو انہوں نے حذرئی کو گرفتار کر لیا۔ ظریف خان فوج کے بڑے منصب دار سے ملا اور اسے اپنے اخلاق سے متاثر کیا تو وہ ظریف کو بیربل اور زین خان کے پاس لے آیا بیربل اور زین خان بھی ظریف خان کے اعلیٰ اخلاق اور حسن گفتگو سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کی سفارش پر اس کے چچا حذرئی کو آزاد کر دیا اور اس کے گھوڑے بھی واپس کر دیئے۔ جب ظریف خان کے گھوڑے انہوں نے اچھے داموں میں خرید لئے جس پر ظریف خان کو اچھا نفع ہوا انہوں نے ظریف خان کے اس اعلیٰ اور نفیس کردار و اخلاق اور جرات کی بناء پر اکبر کی فوج میں ملازم بھی رکھ لیا۔ ظریف خان نے ایک ہزار روپیہ اپنے چچا کو دیا اور کہا: ''یہ روپے وہ اس کی بہن اومئی کو پہنچا دے۔'' حذرئی روپے اور مال و اسباب کے ساتھ اپنے وطن روانہ ہوا۔ حذرئی خان جب گاؤں واپس آیا تو اسے اس کا بھتیجا عالم خان ملنے کے لئے آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ ظریف خان نے حذرئی خان کے ہاتھ ایک ہزار روپیہ بھیجا ہے تو اس نے چچا حذرئی خان کو بہلا پھسلا

کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ان روپوں کا بٹوارہ کر لیا جائے اور آپس میں آدھے آدھے تقسیم کر لیں اور ساتھ ہی عالم خان نے یہ افواہ بھی پھیلا دی کہ ظریف خان دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے۔ اس نے اپنی پھوپھی کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ظریف خان مر گیا ہے اور اومئی کی منگنی اب اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اومئی کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سمجھ گئی کہ یہ ایک سازش ہے۔

ادھر جب ظریف خان نے اپنے چچا حذرئی خان کو ایک ہزار روپے اپنی بہن کے لئے بھیجے تو ساتھ ہی اس نے کسی کے ہاتھ اپنے گھر ایک خط بھی بھیجا جس میں تمام تفصیلات درج تھیں۔ اتفاق سے وہ خط اسی اثناء میں ظریف خان کے گھر پہنچ گیا اومئی نے یہ خط مجید خان کو بھجوا کر تمام تفصیلات سے اسے آگاہ کیا۔

ادھر عالم خان اور اومئی کی شادی کی تیاریاں مکمل ہونے لگیں اور عین شادی کی رات مجید خان بھی چھپتا چھپاتا اپنے ساتھیوں کو لے کر اومئی کی مدد کے لئے شادی کے گھر پہنچ گیا۔ یہ اومئی کے گھر کے پچھواڑے آ کر ٹھہر گیا۔ ادھر اومئی کو بھی مجید خان نے تمام منصوبے کے بارے میں اطلاع کر دی تھی اس لئے اومئی عین وقت پر کسی بہانے مکان کی چھت پر چڑھ گئی اور چھت پر سے کود پڑی چھت سے کودنے کی جب آواز آئی تو ایک عورت اوپر آئی اور اس نے دیکھا کہ اومئی چھت سے کود گئی ہے اور کسی شخص کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہی ہے۔ عالم خان اور اس کے ساتھیوں نے ان کا تعاقب کیا مجید خان کے ساتھ تعداد تھوڑی تھی اور عالم خان کے ساتھی زیادہ تھے اور مجید خان کے گاؤں کا فاصلہ بھی زیادہ تھا اس لئے راستے میں سردار خان نامی ایک شخص کا گاؤں پڑتا تھا مجید خان نے اس کے گاؤں میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا اور گاؤں پہنچ کر سردار خان کو پناہ دینے کی درخواست کی۔ سردار خان نے پہلے تو ایک عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر پناہ دینے میں لیت و لعل سے کام لیا مگر جب مجید خان نے اس کے سامنے تمام تفصیلات رکھیں تو اس نے پناہ دے دی اور اس نے گاؤں کے تمام راستوں پر اپنے آدمی بٹھا دیئے اور لوگ مورچوں پر بھی چڑھ گئے۔ عالم خان اور اس کے ساتھیوں نے سردار خان کے گاؤں پر حملہ کر دیا یہ لڑائی دو دن تک ہوتی رہی اس دوران جب مجید خان کے گاؤں والوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی ہتھیار سے لیس ہو کر یہاں پہنچ گئے۔ ادھر ظریف خان بھی عین موقع پر اس جگہ پہنچ گیا۔ عالم خان ہر طرف سے نرغے میں آ گیا تھا اور آخر کار وہ اور اس کے ساتھی مارے گئے اور ظریف خان اور اومئی کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

قطب خان و نیازو: یہ سرحد کی رومانوی داستانوں میں سے ایسی داستان محبت ہے جس کا تعلق مردان کے ایک مشہور گاؤں طورو سے ہے۔ مردان کے مضافات میں ڈیرہ حسن خان نامی ایک بستی ہے۔ حسن خان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام آدم خان تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ وہی آدم خان ہے جو کے درخانئے کے عشق کی داستان کا ہیرو ہے اور نیازو اسی آدم خان کی حسن بے مثال رکھنے والی بہن تھی۔ اس داستان سے متعلق واقعات کچھ یوں ہیں کہ قطب خان کا تعلق سوات کے علاقہ سے تھا۔ قطب خان کا حسن و جمال خدا کا عطا کردہ ایک انعام تھا یوں کہئے کہ قطب حسن و نزاکت میں حسن یوسف کا ایک پرتو تھا۔ وہ جہاں سے گزرتا جمال مہتاب کی طرح سے طلوع ہوتا اور جہاں مڑتا شعاع آفتاب کی طرح غروب ہونے والی کرنوں کی مانند مغرب کے افق سے ملتا تو ماحول کو تیرہ و تاریک کر دیتا۔ اس کے خد و خال نہایت دلکش اور آنکھیں مستی شراب میں ڈوبی ہوئیں ہوتیں۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح گلابی و نازک تھے وہ جہاں سے گزرتا اس کا سراپا لوگوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ قطب خان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سیر و شکار کا دلدادہ تھا۔ وہ جو بات منہ سے نکالتا والدین اس کی بات کو پورا کرتے۔ جب اس کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو حسن و جمال اپنی پوری رعنائیوں اور تازگیوں کے ساتھ اس کے وجود میں جمع ہو گیا۔ لوگ اس کے حسن پر دل و جان سے نثار ہوتے۔ ایک روز وہ کسی بات سے اپنے والدین سے ناراض ہوا اور اپنے وطن سوات کو چھوڑ دینے کا عزم کر لیا اور وطن چھوڑ کر مردان کے علاقے میں چلا آیا اور اس کی مضافاتی بستی ڈیرہ حسن خان پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ حجرے میں حسن خان کے دو ملازم الو گئے اور بلو گئے موجود تھے۔ انہوں نے جب اس نوخیز لڑکے کو حجرے میں دیکھا تو وہ ششدر رہ گئے اور اپنے آقا آدم خان کو اس آفتاب شعاع انگیز کی شام کے اندھیرے میں کرنیں بکھیرنے کی خبر سنائی۔ آدم خان فوراً گھر سے نکلا اور اپنے حسن و جمال کے مرقع مہمان کا پرتپاک استقبال کیا۔ آدم خان نے دل و جان سے قطب خان کی مہمان نوازی کی اور اسے اپنے پاس دو روز تک مہمان رکھا۔ اس دوران آدم خان نے بڑی کوشش کی کہ وہ قطب خان کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرے مگر قطب خان نے اپنے بارے میں کچھ بتانا قرین مصلحت نہ سمجھا اور اپنی پراسرار شخصیت کو بے نقاب نہ ہونے دیا۔ اپنے میزبان کو صرف اتنا بتایا کہ وہ ہندوستان جانے کی ٹھان چکا ہے۔ آدم خان نے اسے سمجھایا کہ وہ ہندوستان جا کر کیا کرے گا اسی گاؤں میں رہے۔ چنانچہ آدم خان کے سمجھانے اور اس کے اصرار پر وہ یہیں ٹھہر گیا۔

اب روزانہ علی الصبح قطب خان کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ گلے میں غلیل ڈالے جنگل کی طرف شکار کے لئے نکل جاتا۔ وہ جب شکار کے لئے جاتا تو راستے میں ایک پنگھٹ کی طرف سے گزرتا۔ پنگھٹ پر اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور جب قطب خان اس طرف سے گزرتا تو لڑکیاں اس کے حسن و جمال پر نثار ہونے کے لئے تڑپتی تھیں۔ اب کیا تھا کہ گھر گھر عورتوں اور لڑکیوں میں قطب خان کے جادوئی حسن کا چرچا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں صبح سے شام تک قطب خان کی واپسی کا انتظار کرتیں اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے ارمان دل میں لئے ہوئے گھنٹوں اس پنگھٹ پر وقت گزارتیں۔ قطب خان جب اس طرف سے گزرتا تو یوں لگتا کہ جیسے بادلوں میں چاند نکل آیا اور لڑکیاں حسرت بھری آہوں کے ساتھ اپنے گھروں میں واپس لوٹ جاتیں۔

نیازو جو آدم خان کی بہن تھی وہ بھی حسن و جمال کا پیکر تھی ایک تو اپنے حسن و جمال کا گھمنڈ اور دوسرا رئیس زادی ہونے کا زعم تھا جس کی وجہ سے وہ عام لڑکیوں سے ملنا جلنا پسند نہ کرتی اور اپنی منفرد شخصیت کے پندار میں گرفتار رہتی۔ اس لئے وہ عام لڑکیوں کی طرح کبھی بھی پنگھٹ پر جا کر نہیں بیٹھتی تھی۔

ایک روز نیازو کی نوکرانی پانی بھرنے کے لئے پنگھٹ پر گئی تو اس نے قطب خان کو شکار پر جاتے ہوئے دیکھ لیا یہ نوکرانی خود بھی بہت خوبصورت تھی مگر قطب خان کے حسن بے مثال کے سامنے بے بس ہوگئی اور وہ قطب خان کی واپسی تک پنگھٹ پر بیٹھی رہی۔ شام کو جب وہ گھر لوٹی تو نیازو اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اس نے غصے میں پوچھا: ''تم سارا دن کہاں غائب تھی؟'' نوکرانی نے کہا: ''میں نے پنگھٹ پر سے قطب خان کو جب گزرتے ہوئے دیکھا تو یوں لگا جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہو میں شام تک اس چاند کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ اگر تم قطب خان کو دیکھ لو تو شاید گھر کا راستہ ہی بھول جاؤ۔''

دوسرے روز نیازو بھی پنگھٹ کی طرف چل پڑی اور قطب خان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ گاؤں کی لڑکیوں نے جب نیازو کو یوں کسی کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا تو حیران ہوگئیں کہ نیازو جیسی مغرور لڑکی بھی آج کسی کے حسن بے نیاز کی نیاز مند ہوگئی ہے اور یوں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ جب شام کے قریب قطب خان اس پنگھٹ کے پاس سے گزرا تو نیازو کے قصر جمال میں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ دوسری طرف قطب خان نے بھی نیازو کی ایک جھلک دیکھی تو اسے بھی یوں لگا کہ جیسے صبح کو طلوع ہونے والا ستارہ ثریا زمین پر آ گیا ہو۔ اس طرح دونوں نے حسن و جمال کے سنگم پر ایک دوسرے کا دیدار کر لیا۔

دوسرے روز جب پنگھٹ کے پاس سے قطب خان گزرا تو ایک عورت نے قطب خان کو گھڑا اٹھانے کے لئے کہا مگر قطب خان نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور بے اعتنائی کے ساتھ پنگھٹ پر سے گزرنے لگا تو اس عورت نے غصہ کی حالت میں اسے پیچھے کی طرف سے آواز دے کر کہا: ''تم اس قدر مغرور ہو جیسے کہ نیازو کے ساتھ تو تمہاری ہی شادی ہوگی۔''

اس عورت کا یہ طعنہ اس کے دل کو چھیدتا ہوا گزر گیا اور اسی وقت اس نے نیازو کے ساتھ شادی کا تہیہ کر لیا۔ دوسرے روز اس نے نیازو کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کی تو معلوم ہوا کہ یہ لڑکی آدم خان کی بہن ہے۔ جب اس نے یہ سنا تو وہ شش و پنج میں پڑ گیا ایک طرف آدم خان کی دوستی کا پاس تھا اور دوسری طرف محبت کی اثر انگیزی۔

آخر محبت کا جذبہ دوستی پر غالب آ گیا اور اس نے نیازو سے ملاقات کرنے کی ٹھان لی وہ نیازو کے ساتھ ملاقات کے بارے میں حیلہ جوئی کرتا رہتا تھا ایک شام جب آدم خان کے مویشی گھر جا رہے تھے تو قطب خان بھی ان کی آڑ میں چھپتا ہوا آدم خان کے گھر میں داخل ہوگیا اور جانوروں کی باڑھ میں چھپ کر انتظار کرنے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ اسی رات بارش ہوگئی تو آدم خان نے نیازو کو آواز دی کہ وہ اس کے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دے۔ نیازو جب گھوڑے کو اصطبل میں لا کر باندھنے لگی تو قطب خان رازداری کے ساتھ نیازو کی طرف بڑھا' نیازو گھبرائی لیکن جب اس نے اسے بتایا کہ وہ قطب خان ہے اور نیازو سے ملنے کے لئے یہ تدبیر کی ہے تو نیازو خاموش ہوگئی۔ دونوں کی یہاں پر ملاقات ہوئی اور جب علی الصبح قطب خان آدم خان کے گھر سے باہر نکلا تو آدم خان نے اسے دیکھ لیا کیونکہ وہ بھی اسی وقت نماز کے لئے باہر نکلا تھا۔ آدم خان نے اپنے نوکر بلو گئے کو آواز دی اور اس شخص کا پیچھا کرنے کو کہا اس کے نوکر نے قطب خان کا پیچھا کیا اور اسے اندھیرے میں قتل کر دیا۔

بعد میں جب آدم خان کو معلوم ہوا کہ قتل ہونے والا اس کا دوست قطب خان ہے تو آدم خان نے بھی خودکشی کر لی۔

بعض داستان کے راویوں کے نزدیک یہ آدم خان وہی کردار ہے جو کہ درخانئے کے عشق کی داستان کا ہیرو ہے لیکن محققین اس نظریئے سے بربناء حقائق انکار کرتے ہیں۔ میرا اپنا بھی خیال یہی ہے کہ یہ آدم خان ایک جدا داستان کا ہیرو ہے۔

روایات و قصے

امردان: مردان سے متعلق ''امردان'' نامی قصہ بہت مشہور ہے اور یہ امردان ہی مردان کے نام پر دلالت کرتا ہے۔ امردان کا مطلب ہے دیرپا قصہ یعنی امر ہونے والا نہ مرنے والا قصہ۔ روایت کچھ اس طرح کی ہے کہ مردان شہر ہی میں جہاں اب حضرت سید جلال باباؒ کا مزار ہے اس مزار کے قریب قبرستان سے یہ واقعہ مروی ہے۔ یہاں پر مہاتما گوتم بدھ نے اپنے ایک چیلے کو اپنی آنکھیں پھوڑ کر دی تھیں۔ یہ عجیب و غریب واقعہ ناقابل فانی واقعہ تھا اس لئے اسے امردان' کہا جانے لگا۔ اس واقعہ کی وجہ سے یہاں کے شہر کا نام امردان' نہ مٹنے والا واقعہ سے منسوب ہوا جو بعد میں الف کے حذف کے بعد مردان ہو گیا۔ یہ محض روایت ہی ہے اور اس کے بارے میں اہل تحقیق کے لئے میدان کھلا پڑا ہے۔

سفید ہاتھی: شاہباز گڑھی کے مقام پر جو کھدائیاں ہوئی ہیں اور ان کے نتیجہ میں جو عجائبات دستیاب ہوئے ہیں ان عجائبات میں ایک معبد بھی دریافت ہوا ہے۔ اس معبد کے بارے میں یہ روایت عام ہونے لگی کہ یہ وہی معبد ہے جس میں مہاتما بدھ نے قحط زدہ ایک وفد کو سفید ہاتھی دیا تھا۔ اس ہاتھی کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ جہاں بھی جاتا اس علاقے میں بارش ہو جاتی اور زمینیں ہری بھری اور قابل کاشت ہو جاتیں جس کی وجہ سے قحط زدہ علاقہ میں خوراک اور غلے کا انتظام ہو جاتا تھا اس معجزاتی یا کراماتی ہاتھی کی اس صفت کی وجہ سے بدھ مت کے پیروکار سفید ہاتھی کو بڑی عزت و حرمت دیتے تھے اور اب تک بدھ پیروکاروں کے نزدیک سفید رنگ کا ہاتھی قابل تکریم و عزت سمجھا جاتا ہے اور اس ہاتھی سے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ یہ سفید ہاتھی جہاں بھی جاتا وہاں خوشحالی و ہریالی ہوتی ہے۔

لوک سازگیت

جس سرزمین کے گیتوں سے متعلق بات ہو رہی ہے یہاں ان کے گیتوں میں محبت کے رزمیہ اور طربیہ دونوں اظہار' پنگھٹ کی چوری چھپے ملاقاتوں کے مناظر' اور سخت جاں معاشرے کی ناانصافیوں کی شکائتیں' غربت و بدحالی اور تنگ و بھوک کا تذکرہ غرضیکہ خوشی و غمی' مرگ و شادی اور دوستی و دشمنی ہر ماحول اور ماحول میں بسنے والے لوگوں کے جذبات و احساسات کا اظہار ان کے گیتوں میں موجود ہے۔

ان پختونوں کے لوک گیتوں کی مقبول اصناف مندرجہ ذیل ہیں:

لنڈی یا ٹپہ: یہ یہاں کے پٹھانوں کے قدیم ترین لوک گیتوں کی معروف صنف ہے۔ پشتو ٹپے کے پہلے مصرعہ کا دوسرے مصرعے سے باقاعدہ ربط ہوتا ہے اور ایک ہی قسم کی ردیف چلتی ہے اس میں ہر موضوع کے مواد کی فراوانی ہوتی ہے۔ جس میں عشقیہ، مذہبی، تاریخی، سیاسی، وطنی، ملی اور قومی ٹپے زیادہ ملتے ہیں۔ غرضیکہ ٹپہ زندگی کے ہر موضوع اور واردات کا احاطہ کرتا ہے۔ اسے لنڈی اس لئے کہا جاتا ہے کہ پہلا مصرعہ چھوٹا ہوتا ہے اور پشتو میں ''لنڈ'' چھوتے یا مختصر کو کہتے ہیں۔

آزادی کے حوالے سے ٹپہ:

د آزادی پہ مرگ خوشحال یم
دغلامئ ژوندون کہ ډیر وی رک دشینہ

ترجمہ: میں آزادی کی موت پر خوش ہوں غلامی کی زندگی بہت بھی ہو لعنت ہے۔

آزادی دوہ ورزے کافی دہ
قبول بہ نہ کړم دغلامی ہزار کالونہ

ترجمہ: آزادی کے دو دن کافی ہیں غلامی کے ہزار سال مجھے قبول نہیں۔

ستا دخائ غاخونہ مات شہ
چہ وغریب پہ تنگ داولگول چکونہ

ترجمہ: اے خان تو نے غریب کی ناموس کو جھنجوڑا ہے خدا کرے کہ تیسری انی کے دانت ٹوٹ جائیں۔

حسن و جمال کے بارے میں ٹپہ:

د تو روز لفو پہ زنگل کے
کہ دسپین مخ رڼا نہ وے رک بہ دمہ

ترجمہ: اگر تیرے چہرے کی روشنی نہ ہوتی تو زلفوں کے اس سیاہ جنگل میں میں کب کا کھو گیا ہوتا۔

د زلفو بارئے پہ اوگورے
زکہ جاناں م درانہ اخلی قدمونہ

ترجمہ: میرے محبوب کے کندھوں کو زلفوں نے زیر بار کر دیا ہے اسی وجہ سے تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے۔

زما دیار دا سے خندہ دہ
چہ دعمر دنو مرور ٹچلا کوینہ

ترجمہ: میرے محبوب کی ہنسی ایسی ہے کہ عمر کے روٹھے ہوؤں کو منا لیتی ہے۔

دغ گلشن چ بہار جوڑ کڑ

دزلفو باد غوڑولی زیڑ گونہ

ترجمہ: تیرے چہرے کے گلشن نے بہار کا سماں پیدا کر دیا ہے اور تیری زلفوں کی ہوا نے بسنتی پھول کھلا دیئے ہیں۔

زان دزڑو جامو کے جوڑ کہ

لکہ پہ روان کلی کے باغ دگلو دینہ

ترجمہ: تو پرانے کپڑے پہن کر نکلی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ویران گاؤں میں گلزار کھلا ہے۔

رزمیہ ٹپہ: درج ذیل ٹپہ کے گیت وہ ہیں کہ اس میں ایک محبوبہ اپنے چاہنے والے محبوب کو جنگ کے میدان کی طرف بھیجتی ہے اور پھر یہ کہتی ہے:

جانانہ جنگ نہ پہ شانشی

چہ دھمڑ لوم رانہ شی پیغور ونہ

ترجمہ: میرے محبوب جنگ میں پیٹھ نہ دکھانا کہ مجھے اپنی سہیلیوں کے طعنے سننے پڑیں۔

چہ تورہ او باسی گڈ یگہ

ماپہ ھمڑ دلو پورئی ڈیر خندلی دینہ

ترجمہ: میدان میں ناچتے ہوئے تلوار نکالنا میں نے اپنی سہیلیوں کے خوفزدہ محبوبوں کا خوب مذاق اڑایا ہے۔

بدلہ: (جنگی داستانوں کے رزمیئے)

حجروں، میلوں اور صوفیائے کرام کے عرسوں کے موقع پر گائے جانے والے یہ جنگی داستانوں کے رزمیئے رباب اور گھڑے کی تھاپ پر گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ یہ جنگی داستانوں کے رزمیئے سناتے ہیں انہیں داستان سرا کہتے ہیں یہ داستان سرا رزمیہ داستانوں کو گا کر ماضی کے واقعات اور کارناموں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ زمانہ ماضی کی راکھ میں ان دبے ہوئے انگاروں کو گیت کی جس صنف میں گاتے ہیں اسے بدلہ کہتے ہیں۔

افغانستان کے بادشاہ امیر دوست محمد خان کا بڑا بیٹا وزیر اکبر خان تھا جو اپنی بہادری اور بسالت کی وجہ سے بڑا مشہور تھا۔ جب 1834ء میں سکھوں نے قندھار پر چڑھائی کر دی تو امیر دوست محمد خان کے اسی بیٹے وزیر اکبر خان نے میدان میں کود کر بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کو ہار ماننا پڑی۔ اس جنگ کی منظوم داستان کو یوں پیش کر کے ماضی کے اس جیالے کو تاریخی دوام بخشا جاتا ہے:

یمہ خوشحالہ اور یدلے م خبر و اسلام

اکبر خان راوست لہ کابلہ خہ لشکر دا اسلام

ترجمہ: میں نے جب یہ بات سنی کہ اکبر خان کابل سے اسلام کا عظیم لشکر لے کر آ رہا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

وزیر اکبر ویل د پلار تہ رب نہ گورہ

پہ مسلمانانو ساعت تنگ شو لور دلورہ

پو زونو راغلہ د کفار و دلہ ہو رہ

پہ پختونو باندئے وتڑ لو ورد اسلام

ترجمہ: وزیر اکبر خان نے اپنے باپ سے کہا مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے کفار کی فوجیں لاہور سے آ گئی ہیں اور انہوں نے پشتونو کی ناکہ بندی کر دی ہے۔

بیا دوست محمد ویل رختیا چہ دا سے حال دے

منگٹ یو خبر خو مھم دا راتہ یو سوال دے

چہ نظر وکڑم نا موجودے بیت المال دے

در وڑہ م

کاندی مدد پہ سیم و زر د اسلام

ترجمہ: دوست محمد خان نے کہا بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو مگر یہ مسئلہ بڑا کٹھن ہے ہمارا بیت المال بھی خالی ہے میرے بھائی شائید زر و مال کی صورت میں کچھ مدد کریں۔

وزیر محمد خان ویل پلارہ خدائے رزاق دے

ضامن زمونگہ روزی علے الاطلاق دے

جنگ فرض عین شو د راویانو اتفاق دے

چہ کفر لاندے اصلی زائے کڑہ پیخور د اسلام

ترجمہ: وزیر اکبر خان نے جواب دیا والد محترم خدا ہماری روزی کا ضامن ہے اس وقت جنگ فرض ہو چکی ہے کفر نے اسلام کے اصلی مرکز پشاور پر قبضہ کر لیا ہے۔

بیا دوست محمد وے بیڑہ مہ کڑہ اکبر خانہ

اوس معطل یم و ختن ترخہ فرمانہ

د احمد شاہ پہ شان بہ خم تر ھندوستان

چہ حکم وشی ھغہ دم یم زہ نوکر د اسلام

ترجمہ: دوست محمد خان نے کہا بیٹا جلد بازی نہ کرو مجھے ابھی اپنے مالک نے حکم نہیں دیا ورنہ میں احمد شاہ ابدالی کی طرح ہندوستان پر بھی حملہ کر دیتا جب بھی حکم جاری ہوا مجھے اسلام کا جانثار پاؤ گے۔

وزیر اکبر وے معظمی نہ دے پکارہ
د توکل وسلہ تر ملاکڑہ خپلہ پلارہ
کہ غم د دین کڑے راسوریڑہ پہ تلوار
چہ جنگ لہ کفرہ سرہ وکڑو خاص پہ سر د اسلام

ترجمہ: وزیر اکبر نے کہا مصلحت قرین قیاس نہیں ہے اے والد محترم اٹھ اور توکل کا اسلحہ زیب تن کر دین کی حفاظت کے لئے گھوڑے کو ایڑ لگا اٹھ کہ اسلام کے لئے صدق دل سے جنگ کریں۔

بیا دوست محمد ووئیل غازیانو توکل کڑی
د پتنگانو پشان تورونہ یرغل کڑی
خکلے چراغ د پاک نبیؐ د شرعے بل کڑی
چہ تیارہ ورکہ شی را وخیوی پیین نمر د اسلام

ترجمہ: آخر دوست محمد خان نے کہا غازیو اٹھو خدا پر بھروسہ کرو شمشیر بکف پروانوں کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑو پاک نبیؐ کے دین کے چراغ کو روشن رکھو تا کہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور اسلام کا دمکتا ہوا سورج نکل آئے۔

ټول شہباز پہ گڈہ راغلہ لہ کابلہ
پہ ډیر شتاب شتاب یوکړ دوہ منزلہ
راغلہ ډکے تہ مصلحت شو یو لہ بلہ
پختنی ننگ باندے ورکڑو د خطر د اسلام

ترجمہ: کابل سے شاہینو کے ڈار آ گئے بے تابی شوق میں وہ بغیر کسی آرام کے منزلیں طے کرنے لگے اور پھر ڈکے میں آ کے انہوں نے صلاح مشورہ کیا اور طے پایا کہ پشتون غیرت کا یہی تقاضا ہے کہ اسلام کو خطرے سے باہر نکالا جائے۔

اوس آئندہ چہ خدائے کوی ھغہ بہ کیگی
امید م شتہ چہ کافران بہ د شرمیگی
شول نا آرام پٹ ورو ورد سرہ غلیگی
چہ مونگ بہ ورک کڑی امیر رانغے زورہ ور د اسلام

ترجمہ: آئندہ جو خدا کی مرضی ہوگی وہی ہوگا اور کافر شرمندہ ہوں گے وہ کافر دبی دبی آواز سے فریاد کرتے رہے کہ اب مسلمانوں کا امیر آ گیا ہے جو بہت بڑا بہادر ہے اب ہماری خیر نہیں۔

دلہن کی رخصتی کے وقت کا گیت: شادی کے وقت جب دلہن رخصت ہونے کے لئے ڈولی میں بیٹھتی ہے جدائی کی ان رقت انگیز گھڑیوں کو اس گیت کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے:

ا و ل شپہ د بیلتا نہ د ہ
نما خام نہ جاڑم شپہ بہ سنگہ تیرومہ

ترجمہ: جدائی کی پہلی رات ہے شام ہی سے رو رہی ہوں رات کیسے گزاروں گی۔

مو رکئی مہ را تہ قہر یگہ
نری شمال دماز یگریم ورک بہ شمہ

ترجمہ: اے ماں مجھ پر غصہ نہ کر عصر کے وقت کی لطیف سی باد شمال ہوں غائب ہو جاؤں گی۔

ما تہ نو رمہ قہر یگہ مورے
پہ تا تیر شوی پہ ما اوس راغلی دینہ

ترجمہ: ماں مجھ پر غصہ نہ کر تو یہ دن گزار چکی ہے مجھ پر اب گزر رہے ہیں۔

با چائی تخت م قبول نہ دی
ډیل جانان سرہ بہ وگی ټولہ ومہ

ترجمہ: شاہانہ تخت مجھے درکار نہیں ہے میں اپنے محبوب کے ساتھ بھٹے جمع کر کے پیٹ پالوں گی۔

چاربیتہ: فنون لطیفہ میں چاربیتہ طویل نظم کے مشابہ ہوتا ہے یہ بھی دوسرے لوک گیتوں کی طرح سینہ بسینہ منتقل ہونے والا پشتو گیت ہے۔ قدیم چاربیتے اکثر ناپید ہیں مگر عہد حاضر میں بھی پشتون شعراء چاربیتہ نظم کہتے ہیں۔ اسے حجروں، کھیتوں اور کھلیانوں، میلوں ٹھیلوں غرضیکہ ہر جگہ پر گھڑے کی تھاپ پر اس طرح گایا جاتا ہے کہ جب ایک فنکار گھڑے کو تھاپتا ہے تو دوسرا اس تھاپ کے ساتھ ہی اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیتا ہے۔

کلہ بہ راوڑے دواڑہ لب شیرین
گفتار یو دار ، زلفی دتار پہ تار ، سوزم بے اورہ
کلہ بہ راوڑے دواڑہ لب رتہ

ترجمہ: کب تیرے شیریں گفتار لب میرے بن سکیں گے اور تمہاری بکھری ہوئی زلفیں میری ہوں گی میں بغیر آگ کے جل رہا ہوں کب تیرے

لب میرے ہوں گے۔

محبوب اور عاشق کا مکالمہ: چاربیتہ کے ان دو بیتوں میں محبوبہ اور عاشق کا بڑے شوخ ترنگ انداز میں مکالمہ ہوتا ہے۔ پہلے بیت میں محبوبہ اپنے جادوئی حسن و جمال کا تذکرہ کرتی ہے اور پھر دوسرے بیت میں عاشق اپنی بیماری عشق و محبت کا اظہار نہایت عاجزی کے ساتھ کر کے وصال کی امید کرتا ہے اس چاربیتہ میں فنی بلوغت کا بھی اظہار ہے۔

دوروزوخال زماسردارد ینہ - دتورزلفے م فوزونہ لرم
ھلکہ نوی م بہارو ینہ - زان سسانتہ یرملکیو نہ لرم
زماصورت وگلوھارونہ - پہ اوربل زڑونہ تعویزونہ لرم
افسون کڑم وجادوگرو پہ شان - ستر گے م خکارکڑہ دوربینہ سرہ

ترجمہ: میرا خال سردار اور کالی زلفیں فوجیں ہیں۔ ارے میری جوانی پر بہار ہے اپنی خیر مناؤ میں ناز و ادا میں مہارت رکھتی ہوں۔ میری صورت پھولوں کا ہار ہے اور ماتھا سونے کے زیورات سے لدا ہوا ہے۔ میں جادوگروں کی طرح افسوں پھونکتی ہوں میری نگاہیں حدود ناشناس ہیں۔

جواب:-

افسون دا کڑہ جادوگرے جینئی - پہ مخہ مہ رازہ رنجور دکڑم
دتورے زلفے دلنگرے جینئی - ھسی پہ دارلکہ منصور دکڑم
زوردا و بہ شہ زورآور جینئی - ھمسارا اخلم پہ ضرور دکڑم
بیگہ ورزم دنا خبرو پہ شان - چہ یولہ بلہ او کڑو مینہ سرہ

ترجمہ: ہاں تو نے مجھ پر جادو کر دیا ہے میرے سامنے نہ آ تو نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔ بے شک تیری زلفیں فوجیں ہیں اسی لئے تو میں منصور کی طرح سولی پر چڑھ گیا ہوں۔ او زور آور لڑکی خدا تیرا زور توڑ دے تو نے تو مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ آج رات اچانک تیرے ہاں جانے کو جی چاہتا ہے تا کہ تجھ سے چند میٹھی میٹھی باتیں کروں۔

لوبہ: پشتو زبان میں لوبہ کھیل کو کہتے ہیں۔ مگر گیتوں میں یہ ایک نہایت دلچسپ اور مقبول عام صنف ہے۔ یہ عوامی گیتوں سے ہم آہنگ ہے اور عوامی جذبات و احساسات کی اس میں عکاسی ہوتی ہے۔ لوبہ کا مزاج نازک ہوتا ہے اس کی مخصوص غنائیت اور سریں ہوتی ہیں۔ یہ لوبہ عموماً مکالمے کی صورت میں گایا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ دوگانہ ہے۔ مگر بعض صورتوں میں اسے صنف نازک ہی اپنی نازک و سریلی آواز میں گاتی ہیں جو کہ لوبہ کے مناسب حال ہے۔ اس کے زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ بند اور کم از کم تین بند ہوتے ہیں۔ لوبہ عموماً رزمیہ ہوتا ہے:

	ترجمہ
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
دتوار ستر گو پہ زڑہ	تیری مخمور نگاہوں نے میرے دل کو زخمی
وشغلی یمہ	کر دیا ہے
ڈیر غم خوڑلی یمہ	غم نے مجھے کھا لیا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آ جا
دزے دزے دپہ ڈیر غم کڑم	تو نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
زہ خو دبے اجلہ نن وھلی یمہ	آج تو نے مجھے بے اجل مار دیا ہے
ڈیر غم خوڑلے یمہ	غم نے مجھے کھا لیا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
غمونو ستا کڑمہ بدحالہ	تیرے غم میں بدحال ہو گیا ہوں
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
اوس خو جانانہ خبر والا آ	اپنے چاہنے والے کی حالت پوچھ
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
ستا حسن وعشق دواڑو	تیرے حسن و عشق دونوں نے
زہ لوٹلی یمہ	مجھے لوٹ لیا ہے
ڈیر غم خوڑلی یمہ	غم نے مجھے کھا لیا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
اوس خوم زڑہ درپسی جاڑی	اب میرا دل تیری جدائی پر روتا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
شیرین وصال دراونہ غواڑی	تیری شیریں قربت چاہتا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا
ڈیر دغمونو دبیلقون	جدائی نے مجھے بہت
وھلی یمہ	ہلکان کر دیا ہے
ڈیر غم خوڑلی یمہ	غم نے مجھے کھا لیا ہے
نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبین آج آ جا

لوبہ کی دوسری قسم یہ ہے:

	ترجمہ
داوخکوڈ کے ستر گے چاتہ	اشکوں بھری آنکھیں کس کی طرف
واڑ ومہ	پھیروں
غم پہ زڑہ دتنہ زہ	غم کو دل میں چھپا کر زندگی
تیرہ ومہ	گزارتا ہوں
ھرنوی غم زما میلمہ وی	ہر نیا غم میرا مہمان ہوتا ہے
ویش کے اول م پہ نامہ دی	غم کی تقسیم میں پہلے میرا نام آتا ہے
پہ میلمستیا کے دتن غوخے	اس مہمان کو تن کا گوشت
ورکومہ	کھلا رہا ہوں
لوٹ ی زما زڑگی کور کڑہ	اس نے میرے من کی دنیا اجاڑ دی ہے
وطن ی ٹول راتہ سور ھور کڑہ	وطن میرے لئے آگ کا گڑھ بن گیا ہے
فکر کوم چہ کوم طرف تہ اوختمہ	سوچتا ہوں کہ کس طرف
اوختمہ	بھاگ جاؤں
پہ کور کے غم باہر م غم وی	گھر میں بھی غم ہے اور باہر بھی یہی غم
چہ چرتہ ذوزم راسرہ سم وی	جدھر جاتا ہوں غم کا زہر میرے ساتھ ہے
یو تلے نہ وی چہ بل غم تہ	ایک غم جاتا نہیں کہ دوسرا میرے
غاڑے شمہ	گلے پڑ جاتا ہے

نیمہ کئی:

پشتو لوک گیتوں میں نیمہ کئی' بھی ایک معروف صنف ہے' نیمہ پشتو میں آدھے کو کہتے ہیں اور جسے آدھا کر دیا جائے اسے نیمہ کئی' کہتے ہیں چونکہ اس کا بھی ایک مصرعہ آدھا ہوتا ہے اس لئے اسے نیمہ کئی کہتے ہیں۔ اسے دوران رقص مرد اور عورتیں اکٹھا گاتی ہیں مطلب یہ ہے کہ اسے اجتماعی طور پر بدن کی حرکت کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ اسے مختلف صورتوں اور مقامات پر گایا جاتا ہے۔ گھروں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر' پنگھٹ پر پانی بھرتے ہوئے' چرخہ کاتتے ہوئے اور ساگ کے کھیتوں میں ساگ چنتے ہوئے عورتیں گاتی ہیں۔ اس کے گانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک عورت پہلا مصرعہ گاتی ہے اور باقی سب دوسرے مصرعہ میں اس کا جواب دیتی ہیں اور پھر آخر میں سب مل کر سر کے پہلے مصرعہ کو ایک دو مرتبہ دھرا لیتی ہیں:

مثلاً ایک عورت کہتی ہے۔

	ترجمہ
زما زڑگی کوی درد دنہ میر	میرے دل میں درد ہے

باقی عورتیں کہتی ہیں:

خیر خورے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: دآ شا غم را باندزیات محبو	محبوب کا غم دوچند ہو گیا ہے
دے مڑہ بہ شمہ مرجاؤ	مرجاؤں گی
باقی عورتیں: خیر خورے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: تہ پہ بستر کوے خوبونہ تم	تم بستر پر نیند کے مزے اڑاتے ہو۔
باقی عورتیں: خیر خورے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: زما مخ کے اوښکے لارے جوڑہ دینہ میر	میرے چہرے پر آنسوؤں نے راستے بنا لئے ہیں
باقی عورتیں: خیر خورے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: ستا پہ فرقت کے زڑہ قلم شو تیری	تیری جدائی نے دل میں شگاف ڈال دیئے ہیں
باقی عورتیں: خیر خورے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: لکہ لوئے غر چہ زلزلے چولے وینہ دراڑ	جیسے بڑے بڑے پہاڑوں میں زلزلے دراڑیں ڈال دیتے ہیں
باقی عورتیں: خیر خورے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: چہ اول مرگ دے بیا جوندون وے زندگی	کاش موت کے بعد پھر کاش زندگی ملتی
باقی عورتیں: خیر خورے ولے:- کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟
پہلی عورت: چہ راتہ معلوم دے ہر دوتا کرا	تاکہ اپنے اور بیگانے سب کی
چلونیتو نہ نیتوں	نیتوں کا پتہ چل جاتا
باقی عورتیں: خیر خودے ولے؟ کیو	کیوں بہن خیر تو ہے؟

لوری: پشتون علاقوں میں لوری کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ ایسا عوامی گیت

ہے جو ہر گھر میں ہر ماں کو ازبر ہے۔ لوری گیت کے لئے کوئی ساز درکار نہیں ہوتا۔ اس کی قدرتی لے اور سر ہوتی ہے۔ پشتون معاشرے میں اس لوری کے ذریعے ابتداء ہی سے بچوں کو پشتون کی روایات و تہذیبی زندگی کے گر بتا دیئے جاتے ہیں۔ ابھی بچہ جھولے میں ہی ہوتا ہے کہ ماں لوری کے ذریعے بچے کے کان میں نہایت ہی دلنشین اور میٹھے انداز میں پختون، غیرت، حمیت، تندہی، انتقام، جرائت و بہادری اور کڑی زندگی کا عادی بنانے کے لئے پیغام دیتی ہے اور جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے یہ لوری کے بند اس طرز جاں بنتے جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان گھرانوں کی پختون مائیں توحید پرستی کا بھی درس لوری کے ابتدائی مصرعہ میں دے دیتی ہے:

ترجمہ

للی للی للی للی للی۔ اللہ ھو　　سوجا سوجا میری جان سوجا۔ اللہ ھو

بابا تلی او بوخوڑ کوی پہ شپو　　تیرا باپ رات کو کھیتوں میں پانی

خانان اودہ دی خوب کوی پہ　　دینے کے لئے گیا ہے۔ اللہ ھو جبکہ زمیندار

بسترو۔ اللہ ھو　　بستروں پر سوئے ہوئے ہیں۔

للی للی للی للی للی۔ اللہ ھو　　سوجا سوجا میری جان سوجا۔ اللہ ھو

دپلار دا ورزے ژڑدی ساپہ کاسو　　تیرے باپ کی یہ حالت مجھے خون رلاتی ہے۔

اللہ ھو　　اللہ ھو

زھرہ ئی شنہ شی دخوارانو　　بیچارے کا ہل چلاتے چلاتے خون

پہ قلبو　　خشک ہو گیا ہے

اللہ ھو　　اللہ ھو

تیارہ یوسی ترغٹ خیژی　　اور یہ موٹی تو ندو والا تیار فصل اپنے

خرپشو　　گھر لے جاتا ہے

اللہ ھو　　اللہ ھو

پہ غرونو گرزی خانان خکار　　پہاڑوں پر یہ خان باز او باشوں

کڑی پہ غاخو　　سے شکار کھیلتا ہے

اللہ ھو　　اللہ ھو

بابا ونا ست دی زڑہ ئی　　اور تیرے باپ کی زندگی کھیتوں میں

شین شی پہ کسلو　　محنت کرتے کرتے برباد ہو گئی

اللہ ھو　　اللہ ھو

ورزد تیر یگی دخانانو　　میرا سارا دن خان لوگوں کی گلیوں

پہ کوسو　　کی خاک چھانتے گزر جاتا ہے

اللہ ھو　　اللہ ھو

للی للی للی للی للی۔ اللہ ھو　　سوجا سوجا میری جان سوجا۔ اللہ ھو

درج بالا لوری ایسا گیت ہے جو ایک کسان کی بیوی اپنے بچے کو سناتے ہوئے نہایت دکھ بھرے انداز میں اپنے خاوند کی کڑی محنت اس کی تندہی اور جفاکشی کی سوزش و تپش کو بیان کرنے کے ساتھ خاوند کے ساتھ اپنی وفاداری اور محبت کا اظہار اور معاشرے کی ناہمواریوں اور طبقاتی تقسیم اپنی غربت اور خان کے بارے میں اپنے اندر کا ولولہ بیان کرتی ہے۔ غرضیکہ یہ ایک وفا شعار بیوی کا ترانہ لوری کی صورت میں ہے۔ لیلی لوری پشتونوں کے دو چار اضلاع میں گائی جاتی ہے۔

چلم: پٹھانوں کے معاشرے میں چلم ان کے حجروں کا لازمی جز ہے۔ یہ مہمان نوازی کا حصہ ہے، مجلس کا سنگھار اور سب سے بڑی بات یہ کہ غم واندوہ کی کیفیت میں چلم کا سوٹا ہی محبت بھرے دلوں کے زخموں کا مرہم بھی ہے۔ ہزار ہا غم واندوہ ہوں چلم غم واندوہ کی شدت کے ہجوم میں مردوں کا ساتھی ہے اسی کے ساتھ ہی چلم محبوبہ کو اس لئے پسند ہے کہ چلم کے نیچے محبوب کے ہونٹوں کا بوسہ ہوتا ہے: چلم کے اس پہلو کو پہ کے ان گیتوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، محبوبہ کہتی ہے:

ترجمہ

چلم پہ شرع نا روادی　　چلم شرع کے لحاظ سے تو ناروا ہے

پہ ما روا دی د یار غم　　لیکن مجھ پر اس لئے روا ہے کہ اس

غلطو مہ　　سے یار کا غم غلط ہوتا ہے۔

ما ئی دیے خکلے چلم زار　　اس پیاری چلم کے صدقے جاؤں

کڑی چرے بہ ستڑی　　جس پر میرا تھکا ہوا محبوب منہ

لالی خولہ بہ ایخی وینہ　　رکھتا ہے

جس دل میں محبت کی آگ سینے کو پگلا رہی ہو اس دل میں رقابت کی چنگاریاں بھی سر اٹھاتی رہتی ہیں یہی حال ایک پختون محبوبہ کا بھی ہوتا ہے وہ چلم کو اس لئے کوستی ہے کہ اس کے محبوب کے ہونٹوں کا لمس چلم کے نیچے کو چھوتا ہے ایسے میں محبوبہ کے لئے چلم رقیب بن جاتی ہے تو محبوبہ کے لئے رقابت و حسد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو چلم کو یوں کوستی ہے:

چیلمہ خدائے گوچہ دمات کڑم　اے چلم خدا کی قسم تجھے توڑ کر رکھ دوں گی
مین پہ ماردے غم پتا غلطوینہ　وہ عاشق مجھ پر ہے اور دل تجھ سے بہلاتا ہے
چہ جانانی خولہ دربانداگیدی　اے چلم تو مجھ سے بہتر ہے
دواڑہ لاسونہ　میرا محبوب دونوں ہاتھوں اور منہ سے
تجھے چھوتا ہے

پھر جب محبوبہ اپنے محبوب کی چلم نوشی کی رغبت کو انتہائی درجے پر دیکھتی ہے تو محبوبہ اپنے محبوب کی اس وارفتگی کا حل یہ ڈھونڈتی ہے کہ جو شے میرے محبوب کو پسند ہے اسے میں بھی پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ پرخلوص محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی پسند ہی دوست کی پسند ہوتی ہے اور پھر محبوبہ بھی اپنے محبوب کی پسند پر چلم پینے لگتی ہے اور محبوب کو کہتی ہے:

ترجمہ

پہ کوڈہ سرکڑہ رادونہ　آ کوٹھڑی میں جھانک کے دیکھ
پہ چلم زانگی تورے زلفی شنہ　چلم پر سیاہ زلفیں اور سبز خال جھول رہے ہیں
خالونہ

پھر درج ذیل ان اشعار میں محبوبہ اپنے محبوب کو چلم سے اجتناب برتنے کی کس خوبصورتی سے ترغیب دیتی ہے:

ترجمہ

پہ چلم چا عادت کڑی یارہ　میرے محبوب تجھے چلم کا عادی کس نے کیا ہے
ترکا ڈ ذی شونڑ و دحیوی　تیرے کاغذی ہونٹوں سے سبز دھواں نکلنے لگا ہے
شنہ دوددونہ

اور پھر درج ذیل اس شعر میں چلم کے ساتھ محبوب کی ہرجائی کی طبیعت کو تشبیہہ دے کر نہایت ہی خوبصورت انداز میں محبوب کو چلم سے نفرت دلاتی ہے:

ترجمہ

داسی یاری م خوخہ نہ وہ　ایسے محبوب کی دوستی قبول نہیں
کہہ دچہلم پہ نچہ ھرڈوک　جسے چلم کی نے کی طرح ہر کوئی منہ
خولہ ریگدینہ　لگائے

محبوبہ کی ہر ترکیب جب غلط ثابت ہوتی ہے اور محبوب چلم نوشی کی عادت کو ترک نہیں کرتا تو پھر محبوبہ یہ تمنا کرتی ہے کہ وہ خود چلم اور اس کا دھواں بن جائے کہ محبوب کے منہ کے راستے اس کے دل میں اتر جائے۔

ترجمہ

مادآشنا دچلم دودکڑی　اے اللہ مجھے چلم کا دھواں بنا دے
چہ دجانان دزڑہ دحال خبرشنہ　کہ محبوب کے دل کا حال معلوم کر سکوں
مادآشنا چلم نل کڑی　اے اللہ مجھے چلم کینال بنا دے
چہ ہر ساعت جانان خوگی راباند　کہ ہر وقت مجھ پر محبوب اپنا منہ رکھتا پھرے
ایگدینہ

رزمیہ لوری: اس لوری میں بچے کو سلاتے ہوئے ماں اپنے خاوند کے رزم گاہ کی طرف جانے اور اس کی معرکہ آرائی کی جرائت و بہادری کا ذکر کرتی ہے اور اس طرح پختونوں کی وطن دوستی اور ناموس وطن پر مر مٹنے کا تذکرہ کرتی ہے:

ترجمہ

اللہ ھوشہ حما جانہ　سو جا میری جان
اللہ ھو　اللہ ھو
للی للی للی للی للی۔ اللہ ھو　سو جا سو جا میرے لال سو جا۔ اللہ ھو
پلار دی تلی دی پہ جنگ　تیرا باپ میدان جنگ کو گیا ہے
خہ تیرہ توروہ ترسنگ　اپنی تیز دھار والی تلوار کمر میں باندھ کر
سر بہ در کاندپہ ننگ　وہ اپنا سر ناموس وطن پر قربان کرے گا
پہ وطن راغے فرنگ　کیونکہ وطن پر فرنگی نے چڑھائی کی ہے
اللہ ھوشہ اللہ ھوزما　سو جا میرے لال سو جا اللہ ھو
جانانہ اللہ ھو
پلار دتلی پہ غزا!　تیرا باپ غزہ پر گیا ہے
دشمنان بہ کڑی فنا　وہ دشمنوں کو فنا کر دے گا
نوم بہ پریگدی پہ دنیا　اپنا نام دنیا میں چھوڑ جائے گا
نن بہ راشی یا صبا　آج لوٹ آئے گا یا کل
اللہ ھوشہ اللہ ھوزما جانانہ　سو جا میرے لال سو جا
اللہ ھو　اللہ ھو اللہ ھو

قدیم راگ: البیرونی کا کہنا ہے کہ راگوں میں ایک راگ ایسا ہے جو کہ روحانی مخلوق کا راگ ہے اور یہ روحانی مخلوق فرشتوں کے آگے یہ راگ اور گیت سناتی ہے۔ البیرونی نے اس راگ کو گاندھرپ کا نام دیا ہے۔ یہ راگ جس علاقائی نسبت

سے رائج ہے وہ بھارت پرش کا شمالی علاقہ گندھارا ہے۔ محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ چونکہ یہی صوابی اور مردان کا علاقہ گندھارا کا مرکزی خطہ ہے جس میں موجودہ صوابی ضلع کا ایک گاؤں لاہور ہے جہاں پر مہاراجہ اشوکا نے اپنے مبلغین کو بدھ مت کی تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ اس سے چار میل کے فاصلے پر وہ تاریخی اور عظیم شہر ہے جسے آج کل ہنڈ کہتے ہیں اور ابوریحان البیرونی نے اسے ویہنڈ لکھا ہے جس کا مطلب ہے خوبصورت شہر اور جو کہ راجہ جے پال کا دارالخلافہ بھی تھا۔ غرضیکہ یہ گندھارا عہد اور آرٹ کا مرکزی خطہ ہے اور اسی سے قدیم راگ گاندھرپ منسوب ہے۔ یہ یہاں کے لوگوں کا قدیم ترین اور مسحور کن راگ اور گیت ہے۔

ساز: پشتون کے علاقوں میں بجائے جانے والے ساز عموماً رباب، ڈھول، گھڑا، سرنا اور بانسری ہے۔

زیادہ تر یہاں پر طربیہ محفلیں حجروں میں جمتی ہیں۔ عام طور سے رات کے وقت ان حجروں میں روایتی رقص وسرود کی محفلیں ہوتی ہیں تو رباب، ڈھول، گھڑا اور سرنا بجائے جاتے ہیں۔ رباب اور گھڑے کو ان کے روایتی سازوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان حجروں میں اکثر لوبہ، نیمہ کئی، چار بیتے اور ٹپے انہیں سازوں کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ بڑے، بوڑھے اور جوان حجروں میں گیت کی ان اصناف میں رباب اور گھڑے کے ساتھ اپنے اسلاف کے کارناموں اور رومانوی داستانوں کو پیش کرتے ہیں۔

بانسری ایک غم کا ساز ہے اور اکثر یہاں کی رومانوی داستانوں میں اس ساز کا تذکرہ ملتا ہے جبکہ رباب ایک ایسا روایتی ساز ہے جس کی وجہ سے یہاں کی بعض رومانوی داستانوں نے جنم لیا ہے۔

بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جس حجرے میں رباب کی تاروں سے نغمات پھوٹتے ہیں اکثر انہیں حجروں میں رباب نوازوں کی انگلیوں کی مہارت پر جانثاری و فداکاری کی رومانوی داستانوں نے جنم لیا ہے اور پھر جہاں محبوبہ کا محبوب جس حجرے کی زینت ہو تو وہ حجرہ محبوبہ کی نگاہوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک محبوبہ اپنے محبوب کو یہ کہتی ہے:

ترجمہ

کہ دمرغئ وزرزماوی	اگر میرے بازو پرندوں کے پروں کی طرح ہوتے
زہ بہ ئی حجرے نہ چار چار پیرہ	تو میں تیرے حجرے کے چاروں طرف
گرزیدمہ	طواف کرتی رہتی
ستاد حجرے ورشل کگاشہ	تیرے حجرے کی دہلیز ٹیڑھی ہو جائے
حماد زڑہ ستنی کگادرپسی دینہ	تو نے میرے دل کے کھمبے کو ٹیڑھا کر دیا ہے
چہ م جانان پہ حجرہ ورشی	میرا محبوب حجرے جاتا ہے
زلمی راپاسی ودرتہ سرپہ سلام شینہ	تو نوجوان اٹھ کر سلام کرتے ہیں
نن م حجرہ کے داسی واوریدہ	آج میں نے حجرے میں یہ بات سنی ہے
عمر اخان اخپل وطنہ فرارشونہ	کہ عمر خان اپنے وطن سے فرار ہو گیا ہے
بیابہ حجری تہ خلقہ نہ زم	میں پھر حجرے کا کبھی رخ نہ کروں گا
دستر گوغشو دپلئ ویشتلی یمہ	مجھے کل منڈیر پر سے دو آنکھوں کے تیروں نے گھائل کر دیا ہے

آلات موسیقی

ڈھول: یہ ساز عموماً ہر علاقہ اور معاشرے میں رائج ہے۔ ڈھول لکڑی کے کھوکھلے تنے کے دونوں طرف چمڑے کو منڈھ کر اور پھر دونوں ٹکڑوں کو رسیوں سے آپس میں کس کر بنایا جاتا ہے۔ دونوں اطراف کے چمڑوں کی آوازیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے ایک طرف موٹی آواز پیدا کرنے والا چمڑا کسا ہوتا ہے اور دوسری طرف پتلی آواز پیدا کرنے والا۔ رسیوں کے ساتھ دونوں اطراف کو بڑی مہارت اور مضبوطی سے کس لیا جاتا ہے۔ موٹی آواز پیدا کرنے والی طرف کو موٹے ڈگے سے اور پتلی آواز پیدا کرنے والے چمڑے کو پتلی چھڑی سے بجایا جاتا ہے۔

شہنائی: یہ بیاہ شادیوں میں بجنے والا ہر دلعزیز اور معروف ساز ہے اور تقریباً ہر علاقے میں خوشی کے موقع پر بجایا جاتا ہے۔

گھڑا: یہ یہاں کے پٹھانوں کا مخصوص ساز ہے۔ سادہ مٹی کا گھڑا ہوتا ہے جو خاص ترکیب سے رکھ کر ایک ہاتھ گھڑے کے منہ پر مارا جاتا ہے جو عموماً دائیں ہتھیلی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ کا پنجہ گھڑے کے پیٹ پر مارا جاتا ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے اسے رباب کے ساتھ بھی بجایا جاتا ہے اور رباب کے علاوہ بھی حجروں میں گھڑا بجانے کی خاص محفلیں ہوتی ہیں۔ گھڑے کے ساتھ لوبہ اور چاربیتہ گائے جاتے ہیں تاہم اس کے لئے کسی خاص صنف کی قید نہیں اور تقریباً ہر صنف کے گیت گائے جاتے ہیں۔

بانسری: یہ بید کی ٹہنی کے چھلکے سے بنا ہوا ایک ایسا ساز ہے جو کہ پیشہ ور لوگ بھی بجاتے ہیں اور شوقیہ بھی۔ بانسری کی لمبی سی لکڑی کے اوپر کے سرے کو ہونٹوں سے بجانے کے لئے قلم کی طرح تراشا جاتا ہے اور اس تراشے ہوئے سرے سے نیچے کچھ سوراخیں ہوتی ہیں ان سوراخوں پر انگلیاں رکھ دی جاتی ہیں اور جب ہونٹوں سے ہوا دی جاتی ہے تو نغمات کی سرتال پیدا کرنے کے لئے انگلیوں کو نہایت ہی مہارت کے ساتھ اس کی سوراخوں پر رکھتے ہیں ان انگلیوں کے ماہرانہ فن ہی سے اس میں سے حسب خواہش آواز پیدا کی جاتی ہے اس کی آواز میں ایک درد والم ہوتا ہے۔

سرنائی: سرنائی بجانا ایک نہایت ہی مشکل فن ہے۔ سرنائی دراصل بانسری کی ہی ایک ارتقائی شکل ہے' فارسی میں اسے سرنائی' سورنائی اور سرنا تینوں الفاظ سے تلفظ کیا جاتا ہے۔ سرنائی دول اور دمامہ کے ساتھ بجائی جاتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی نکال دیں تو سرنائی کی لے اور تان بے اثر ہو جاتی ہے۔ اسے پندرہ انچ کی خوبانی کی لکڑی سے کاٹ کر بنایا جاتا ہے اس کے درمیان سے سیدھ میں سوراخ کیا جاتا ہے اس کا بیرونی حصہ اندر سے کھوکھلا کر دیا جاتا ہے اس سے دبی ہوئی موسیقی کی دھن پھیل جاتی ہے آٹھ سوراخ اوپر اور ایک سوراخ نیچے بنایا جاتا ہے۔ جہاں پر منہ رکھ کر اسے بجایا جاتا ہے یہ حصہ علیحدہ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ بید مجنوں کی لکڑی دو انچ لمبی اور نصف انچ موٹی کاٹ کر اسے گول کر دیا جاتا ہے اس کو اندر سے 1/8 انچ بڑا سوراخ بنا کر سرنائے کے اوپر منہ والے حصہ میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر اخروٹ یا خوبانی کی لکڑی سے چھوٹی سی تھالی نما چیز بنا کر اس کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے اس تھالی کے وسط میں بھی اتنا ہی سوراخ بنایا جاتا ہے اور پھر ان سوراخوں کے درمیان پیتل کی نالی بنا کر کس دی جاتی ہے۔ اس کے بعد قلم بنائے جانے والی گھاس سے ایک انچ کاٹ کر اسے پانی میں بھگو دیا جاتا ہے اور جب یہ پانی میں نرم ہو جائے تو اس کا سرا چپٹا کیا جاتا ہے اور دوسرا سرا پیتل والی نالی کے اندر کس دیا جاتا ہے۔ یوں یہ سرنائی ساز تیار ہو جاتا ہے۔

لباس وزیورات، رہن سہن

خواتین کا لباس: شروع میں ان یوسفزئیوں بشمول دیگر پختون خصوصاً یہاں آباد خٹک قبیلے کی خواتین کا ایسا لباس تھا کہ گردن سے لے کر پاؤں تک ڈھانپا جاتا تھا۔ یہ اوپر سے ایسا کرتا پہنتی تھیں کہ اوپر کا تمام بدن ڈھپ جاتا تھا اور کھلی اور دراز غرارہ نما شلواریں زیب تن کرتیں جن کا رنگ عموماً کلیجی' کالا' سرخ یا سبز ہوتا یا سرخ اور سبز ملا جلا ہوتا۔ سر پر موٹی چادر ہوتی جو عموماً سبز رنگ یا سرخ رنگ کی ہوتی تھی۔ گھر سے باہر نکلتیں تو پورا چہرہ چادر سے اس طرح ڈھانپا جاتا تھا کہ چادر کو اوپر سے سرکا دیا جاتا اور نیچے ٹھوڑی سے اوپر تک چادر ہوتی جو کہ ناک سے اوپر تک چلی جاتی صرف آنکھوں کا کچھ حصہ کھلا رہتا' پاؤں میں جرابیں پہنتیں اور سینڈل پازیب کرتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے لباس میں تبدیلی آتی رہی ہے۔

برقعہ: جب خواتین میں لباس کی تبدیلی کا عمل شروع ہوا تو گھر سے باہر نکلنے والی مستورات نے برقعہ زیب تن کرنا شروع کیا جس سے خواتین کی مکمل ستر پوشی ہوتی تھی۔ اس علاقہ کی خواتین میں جب برقعے کا رواج ہوا تو ان کا برقعہ سفید لٹھے کا بنایا جاتا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح کا برقعہ ہوتا جیسا کہ پشاوری خواتین پہنتی ہیں۔ البتہ یوسفزئی خواتین میں عموماً سیاہ برقعہ پہننے کا طریقہ مروج ہوا ہے۔

چادر: عہد حاضر میں اس علاقہ کی خواتین میں چادر اوڑھنے کا رواج عام ہے۔ یہ چادر خاصی بھاری ہوتی ہے جس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور اس پر رنگدار دھاگے سے بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ صوابی کے علاقہ کی خواتین میں ایسی چادروں کا رواج ہے۔ کہ سفید چادر پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سرخ رنگ کے چوکور یا گول ٹکڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ اب اس علاقے کی مخصوص مستورات کی چادریں ہیں جن چادروں پر دھاگے سے کام ہوتا ہے اسے عموماً سواتی چادریں کہا جاتا ہے کیونکہ دھاگے سے جو بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں وہ سواتی کاریگری اور دستکاری کا ایک نمونہ ہیں۔

مردوں کا لباس: قدیم زمانہ میں مرد لوگوں کے لباس نہایت کھلے اور بھاری ہوتے تھے۔ سردیوں میں مرد حضرات عموماً کھدر کے کپڑے پہنتے کرتہ بھی کھلا اور بڑا ہوتا اور شلوار بھی کھلی اور لمبی سلوائی جاتی۔ کندھے پر چادر ہوتی اور سر پر پگڑ باندھتے۔ اب جبکہ تغیر زمانہ ہوا تو مردوں کے لباس میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور ان کے مردوں کا بھی وہی لباس ہے جو پشاور کے لوگوں کا ہے۔ تاہم مقامی سطح پر علاقے کی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے مرد حضرات میں ایسے لوگ موجود ہیں جو قدیم طرز کے لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔

جوتی: قدیم طرز کی جوتی جو تلے دار ہوتی اور پورے پاؤں کو ڈھانپ دیتی یہ جوتی پہننے کا عام رواج تھا۔ اب بھی جا بجا یہ جوتی استعمال کی جاتی ہے مگر عموماً پشاوری چپلی پہنی جاتی ہے۔

ٹیکہ: یہ عموماً سونے کا ہوتا ہے۔ ماتھے پر سجایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایک پٹی سی بنی ہوتی ہے جو کہ سر سے کانوں تک باندھ دی جاتی ہے۔

جھمکے: یہ یہاں کی خواتین کے کانوں کا زیور ہے جو بڑے بڑے ہوتے ہیں اور عموماً سونے کے ہوتے ہیں۔

بالیاں: یہ سادہ اور گول زیور ہوتا ہے جو کہ عموماً بچیاں کانوں میں پہنتی ہیں۔

ٹاپس: یہ بھی یہاں کی بچیوں کے لئے کانوں میں قابل استعمال زیور ہے۔ تاہم بڑی خواتین بھی ٹاپس استعمال کرتی ہیں۔

میخہ کے: یہ ناک میں پہننے کا زیور ہے جسے ناک کا کوکا بھی کہتے ہیں۔

ہار: یہ گلے میں پہننے والا زیور ہے۔ یہ سونے کا بھی ہوتا ہے اور چاندی کا بھی۔ اس میں جگہ جگہ قیمتی چھوٹے اور بڑے خوبصورت پتھر جڑے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں عموماً نگ کہتے ہیں۔

کنگن: ہاتھ کی کلائیوں میں پہننے والے زیور کو کنگن کہا جاتا ہے یہ ابتداء میں قیمتی پتھروں سے بنائے جاتے تھے بعد میں اس کا رواج سونے کے کنگنوں میں تبدیل ہوا اب عموماً یہ کنگن سونے کے ہوتے ہیں۔

پائل: یہ پاؤں کا زیور ہے جو عموماً چاندی کا ہوتا ہے۔ یہ پاؤں میں پہننے والا خوبصورت زیور ہے اس کے ساتھ ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لٹکا دیئے جاتے ہیں کہ چلتے وقت یہ ٹکڑے پائل پر ٹکراتے ہیں تو اس سے آواز نکلتی ہے جسے پائل کی جھنکار کہتے ہیں۔

یہ عام طور سے شادیوں اور خوشیوں کے مواقع پر ناچنے والی کنجریاں یا ناچنے والے لڑکے 'لخنے' اپنے پاؤں میں ناچتے وقت ڈالتے ہیں اور ناچتے وقت پاؤں کو زور سے زمین پر مارتے ہیں تو اس سے جھنکار نکلتی ہے۔

جسمانی کھیل

موخہ: مردان وصوابی کے تمام علاقوں میں کھیلا جانے والا یہ کھیل بہار کے موسم میں بڑے اہتمام کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کا اعلان ہوتا ہے تو کثیر تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور غیر معمولی اہتمام کے ساتھ یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اسے موخہ یا موخہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کھیل کے لئے جو کیچڑ سے شکل بنائی جاتی ہے وہ منہ کی طرح ہوتی ہے یا یہ کہ یہ آگے کی طرف کھیلا جاتا ہے۔ پشتو میں مخ چہرے کے اگلے حصے کو کہتے ہیں اور مخامخ سامنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ کھیل سامنے سے کھیلا جاتا ہے اس لئے اس لفظ کے مماثل اس کا نام موخہ یا مخہ ہے۔

یہ کھیل شہر سے باہر قدرے اونچے ٹیلے پر کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل سے پہلے منتظمین جگہ دن اور وقت کا اعلان کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کھیل کو دیکھنے کے لئے جمع ہو سکیں۔ سامنے کسی درخت پر یا مخصوص جگہ بنا کر وہاں کیچڑ تھوپ دیا جاتا ہے جو کہ ایک شکل نما نشانے کی جگہ ہوتی ہے۔ نشانہ لگانے کے لئے اس میں ایک سوراخ بنا لیا جاتا ہے۔ کھیل کھیلنے کے لئے دو پارٹیاں بن جاتی ہیں ان میں سے ہر پارٹی کا آدمی اپنے نمبر پر آگے کی طرف بڑھ کر کمان کو ہاتھ میں سنبھالتا ہے جو بانس کی باریک لکڑی سے بنی ہوتی ہے اس میں تیر رکھتا ہے اور نہایت مہارت سے نشانہ باندھتا ہے اور جو موخہ میں بنی ہوئی سوراخ پر نشانہ لگا لیتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک پارٹی کے بعد دوسری پارٹی یہ کھیل اسی ترتیب سے کھیلتی ہے۔ بعد میں جس پارٹی کے لوگوں نے زیادہ تعداد میں درست نشانہ لگایا ہو وہ پارٹی جیت جاتی ہے۔ موخہ کا کھیل مقامی سطح پر کھیلنے کے علاوہ بڑے بڑے مقابلوں میں بھی کھیلا جاتا ہے اور جیتنے والی پارٹی کو انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ یوں تو یہ کھیل مردان وصوابی کے ہر شہر و دیہات میں کھیلا جاتا ہے مگر میری معلومات کے مطابق صوابی کے چارباغ اور نواں کلی کے دیہات میں یہ کھیل زیادہ مقبول ہے۔ اس کھیل کی ایک مخصوص بات یہ ہے کہ کھیل کے دوران ڈھولک بجتا رہتا ہے اور جب کوئی اپنا نشانہ درست جگہ پر لگا لے تو اس پر ڈھول کی آواز تیز ہو جاتی ہے اور جو پارٹی جیت جاتی ہے اس پارٹی کے لوگوں کو لوگ اپنے کندھوں پر سوار کر کے ڈھولک کی تھاپ پر بستی میں لاتے ہیں۔ دراصل یہ کھیل تیراندازی میں مکمل مہارت حاصل کرنے کے لئے کھیلا جاتا ہے اور لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر دیہات میں سے کثیر تعداد میں لوگ اس کھیل میں مہارت حاصل کریں۔

کبڈی: کبڈی عموماً پشتون اور غیر پشتون صوبہ سرحد کے تمام علاقوں میں کھیلی جاتی ہے۔ مردان وصوابی کے تمام دیہاتوں اور شہروں میں عموماً گرمیوں کے موسم میں دیہات کے باہر میدانوں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل میں دو پارٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ دونوں مدمقابل پارٹیوں کے درمیان زمین کے اوپر ایک حدِ فاصل کے طور پر لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ ایک پارٹی لکیر کے ایک طرف اور دوسری پارٹی لکیر کے

دوسری جانب کھڑی ہو جاتی ہے۔ جب کھیل شروع ہو جانے کا اعلان ہوتا ہے تو ایک پارٹی میں سے ایک کھلاڑی آگے بڑھ کر مخالف پارٹی کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور ساتھ ہی منہ سے 'کبڈی کبڈی' یا 'کت کت' کی آواز نکالتا ہے مخالف پارٹی کے لوگ اسے دبوچنے کی کوشش کرتے ہیں اگر مدمقابل اسی آواز کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے مخالف آدمی سے جان بچا کر حد فاصل کی لکیر تک پہنچ جائے یا اس لکیر تک اس کا ہاتھ پہنچ جائے تو وہ جیت جاتا ہے اور مدمقابل کا کھلاڑی ہار کر کھیل کے میدان سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح پھر دوسرا اور پھر تیسرا کھلاڑی اسی آواز کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ ہارنے کی شکل میں مدمقابل کی پارٹی میں سے کھلاڑی مدمخالف کی حدود میں داخل ہوتا ہے جس پارٹی کے زیادہ لوگ ہار گئے ہوں وہ پارٹی ہار جاتی ہے۔

نیزہ بازی: عہد قدیم میں نیزہ بازی کا کھیل جنگی معرکوں کے لئے اپنے آپ کو قابل بنانے کے لئے اور سپاہیانہ طور طریقوں کو سیکھنے کے لئے کھیلا جاتا تھا۔ ایام قدیمہ سے ہی یہاں کے قبائل میں سرداری سسٹم چلا آتا ہے اور ہر سردار مخالف قبیلے کو نیچا دکھانے کے لئے اسی قسم کے نیزہ باز اور شمشیر زن لوگ تیار کرتا ہے اور مقامی سطح پر ان کے کھیل منعقد کئے جاتے تھے جو ان کھیلوں کے ذریعے نیزہ بازی میں سبقت حاصل کرنے کی مشق کرتا ہے یہ نیزہ بازی کا کھیل گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر نیزے کو ایک خاص مہارت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دوڑاتے ہوئے مقام مخصوص پر سے زمین میں گڑی ہوئی لکڑی کو نیزے کی انی کے ساتھ نکالنے کا ہوتا ہے۔

تیراندازی: تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ تیراندازی کے کھیل اس سرزمین پر بڑی مہارت کے ساتھ کھیلے گئے ہیں بلکہ اس علاقے کی مقامی لوک داستانوں سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تیراندازی میں ان کی خواتین بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی اور مہارت حاصل کرتی رہی ہیں۔ ایک رومانوی داستان میں تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کی ایک دوشیزہ تیراندازی میں اتنی ماہر تھی کہ بیرونی حملہ آور اس کی تیراندازی سے خائف رہتے تھے اور وہ کمال مہارت سے ایسی اوٹ سے تیر پھینکتی تھی کہ کئی کئی تجربہ کار سپاہیوں کو تیروں کی زد میں مار کے رکھ دیتی تھی۔ بہرحال یہ تیراندازی کا کھیل بھی یہاں کا ایک علامتی کھیل ہے۔

ایلئی ایلئی: یہ اس علاقے کے ان پختونوں کا کھیل ہے جو کہ دریاؤں کے پاس آباد ہیں اور صرف ان لوگوں کے درمیان کھیلا جاتا ہے جو کہ دریائی پانی میں تیرنے کی مہارت جانتے ہوں۔ کھیلنے والوں کی ایک ٹولی بن جاتی ہے یہ سب لوگ مرغابی بن جاتے ہیں جسے پشتو میں ''شغدے'' کہتے ہیں۔ یہ سب شغدے یعنی مرغابی کی طرح اڑان کرتے ہوئے تیز دوڑ کر دریا میں چھلانگ لگانے کے لئے پہل کرتے ہیں۔ جو اس پہل میں پیچھے رہ جائے وہ چور ہو جاتا ہے جسے پشتو میں ''غل'' کہتے ہیں۔

پھر کھیلنے والوں میں سے ایک کھلاڑی اس کھلاڑی کی طرف جو ایک پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے، کے اٹھے ہوئے پاؤں کے نیچے ایک پتھر زور سے پھینکتا ہے اس پتھر کو پشتو میں ''خوٹی'' کہا جاتا ہے۔ یہ پاؤں کے نیچے سے سرک کر جس مقام پر جا کر رک جائے چور اس پتھر تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی وقت باقی سب کھلاڑی دریا میں چھلانگیں لگا لیتے ہیں یہ چور کھلاڑی پتھر تک پہنچ کر واپس آ کر تیزی سے دریا میں چھلانگ لگاتا ہے اور باقی تیرنے والوں کے پیچھے بھاگتا ہے باقی تیراک اس کی پہنچ سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ پیچھے بھاگتا ہے یہ چور جب کسی کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ پکڑا ہوا کھلاڑی ہار جاتا ہے اور پھر وہ چور بن جاتا ہے اور دوسروں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ کھیل اسی پکڑ دھکڑ کے ساتھ دریا میں تیرتے ہوئے جاری رہتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو ہار جاتا ہے یعنی پکڑا جاتا وہ دوبارہ کھلاڑیوں میں شامل ہوتا ہے یہاں تک کہ کوئی ایسا کھلاڑی جو دریا میں تیرتے ہوئے اپنے آپ کو اس جگہ تک پہنچائے جہاں پانی کم ہو یا پانی نہ ہو تو وہ پھر دوبارہ کھلاڑیوں میں شامل ہونے سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک تیراکی کا کھیل ہے جو ان علاقوں میں ''ایلئی ایلئی'' کے نام سے جاری ہے اور اس میں جوان لڑکے حصہ لیتے ہیں۔

اکوبکو (بچیوں کا کھیل): یہ چھوٹی بچیوں میں رواج پانے والا کھیل ہے جسے اکوبکو کہتے ہیں۔ اس کھیل میں ہار جیت نہیں ہے اور اس وقت تک کھیلا جاتا ہے جب تک بچیاں دوڑتے دوڑتے تھک جاتی ہیں۔ یہ کھیل اس طرح کھیلا جاتا ہے کہ کثیر تعداد بچیاں ایک قطار میں کھڑی ہو جاتی ہیں ایک لڑکی قطار سے باہر نکل کر پہلے سرے کی لڑکی سے شروع ہو کر ایک لڑکی پر انگلی رکھتی ہے اور یہ الفاظ اس طرح کہتی ہے:

اکوبکو سرسیندھ کوغواسے لاڑہ تر پکوا باسین

یعنی: دریا میں اکوبکو گائے چلی گئی۔

پھر یہ تمام لڑکیاں کہتی ہیں 'خورے درے' اور پھر یہ لڑکی 'خورے درے' کہتی ہے۔ جب آخری لفظ پر جس لڑکی پر انگلی رکھی جاتی ہے وہ بچی چور سمجھی جاتی ہے پھر سب بچیاں دوڑتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ کسی پناہ گاہ کے پیچھے چھپ جائیں اگر کوئی بچی پناہ گاہ میں چھپنے سے محروم ہو جائے اور اسے میدان میں پکڑ لیا جائے تو پھر وہ

چور بن جاتی ہے اور پھر باقی لڑکیاں اس سے چھپنے کی کوشش میں دوڑتی ہیں جن میں وہ پہلے والی چور بچی بھی شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ کھیل جاری رہتا ہے تاوقتیکہ سب بچیاں تھک جائیں اور بالاتفاق سب کھیل ختم کرنے کا اعلان کردیں۔

لوک وروحانی علاج معالجہ

بہت سے خاندانوں اور گھرانوں میں قدیم روایات اور سماجی بندھنوں سے بندھے لوگ زندگی کو قدیم تقاضوں کے مطابق ہی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مردان وصوابی کے علاقوں میں اطباء وحکماء کو بڑی عزت ومنزلت کا مقام حاصل تھا یہ مختلف انسانی بیماریوں سے متعلق جڑی بوٹیوں اور دیگر زرعی حاصلات سے لوگوں کا علاج کرتے تھے۔

مردان شہر میں ایک محلہ گنڈیری محلہ کے نام سے ہے یہاں پر موروثی حکیم خاندان آباد ہے۔ موجودہ حکماء اور اطباء کے جد امجد کا نام حکیم سید امین الحق تھا جو کہ باجوڑ کے ایک گاؤں گنڈیری سے ہجرت کر کے مردان آئے تھے اور موجودہ محلہ میں رہائش پذیر ہوئے اور اپنے سابقہ گاؤں گنڈیری کے نام سے یہ محلہ آباد کیا۔ مردان کے قدیم گھرانے کے لوگ اس محلے کو حکیموں کا محلہ بھی کہتے ہیں۔ مردان کے لوگ ان حکماء سے علاج کرواتے تھے۔ یہاں کے حکماء جڑی بوٹیوں کے صفوف اور ان کے مشروبات سے علاج تجویز کرنے کے علاوہ یہاں پر پیدا ہونے والے پھلوں سے مختلف بیماریوں کا علاج مختلف طریقے سے کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔

مردان کے علاقے میں بہی کے باغات پائے جاتے ہیں بہی کے درختوں کو کاشت بھی کیا جاتا ہے اور یہ خودرو بھی ہوتے ہیں۔ بہی کے استعمال کے ذریعے اس علاقے کے کئی دیسی علاج دریافت ہوئے ہیں۔ پشتو میں بہی کو صفر جل کہا جاتا ہے۔ حکماء نے اسی علاقے میں بہی کے مختلف طریقوں کے استعمال سے مختلف امراض کے علاج تجویز کئے ہیں۔

دل کے امراض: دل پر جب بوجھ ہو اور سینے میں اندھیرا محسوس ہو تو حکماء نے یہ علاج تجویز کیا ہے کہ صبح کے وقت نہار منہ بہی کے استعمال سے دل کی بیماریاں ختم ہوتی ہیں اور سینے پر سے تاریکی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

معدے کی جلن کا خاتمہ: جو لوگ بہی کا استعمال بالالتزام رکھتے ہیں معدہ کا نظام بحسن وخوبی بحال رہتا ہے اور معدے کی جلن ختم ہو جاتی ہے۔

کھانسی کا علاج: وہ لوگ جنہیں کھانسی کا عارضہ لاحق ہو اور ان کے گلے میں خشکی پیدا ہو جاتی ہو تو بہی کے تخم جسے بیدانہ کہا جاتا ہے۔ اس بیدانہ کو دودھ میں ابال دیا جائے اور اس میں میٹھا ملا کر پی لیا جائے تو کھانسی ختم ہو جاتی ہے اور گلے کی خشکی اور خراش سے افاقہ ہو جاتا ہے۔

جلنے کا علاج: بہی کے درخت کے پتوں کو خشک کر کے ان پتوں کو پیس کے جلی ہوئی جگہ لگا دیا جائے تو زخم ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مردان کے قدیم باشندے جلے ہوئے مرد وزن کا علاج اسی دیسی طریقے سے کرتے تھے اب بھی قدیم گھرانوں میں بہی علاج کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

کھانسی اور دمے کا علاج: اس قسم کے امراض جنہیں لاحق ہوں تو ان کے لئے یہاں کے حکماء نے برگ دھتورہ کا نچوڑ تجویز کیا ہے۔

جگر کے امراض: وہ لوگ جنہیں جگر میں گرمی یا دیگر امراض لاحق ہوں تو ان کو کاسنی کے تازہ پتوں کا عرق نکال کر پلایا جاتا ہے جس سے مریض کو افاقہ ہو جاتا ہے۔

میعادی بخار: جسے میعادی بخار یعنی ٹائفائیڈ ہو جائے تو اوپھر کی دال پکا کر اس کا پانی نتار کر مریض کو دیا جاتا ہے۔ یہ پانی آنتوں کے باریک باریک دانوں پر پلستر کا کام کرتا ہے اور اس کے استعمال سے بخار بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔

خارش کا علاج: وہ لوگ جنہیں جلد کی خارش کا عارضہ لاحق ہو تو ان کے لئے گندھک کو پیس کر تیل میں ملا دیا جاتا ہے اور پھر اس گندھک ملے ہوئے تیل کو متعلقہ حصوں پر مل دیا جاتا ہے یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ ایسے مریض کو دودھ پلایا جائے۔

قبض کا علاج: قبض کشائی کے لئے مریض کو بھوسی کی روٹی کھلائی جائے اگر قبض شدید ہو تو ساتھ روغن بادام اور اسپغول کا استعمال کیا جائے۔

اعتقادی علاج

مدتوں سے مردان وصوابی کے علاقوں میں جڑی بوٹیوں سے علاج کے طریقوں کے علاوہ یہاں کے لوگوں میں بعض اعتقادی اور روحانی طریقوں کے علاج بھی جاری ہیں۔ یہ مزارات پر جا کر منتیں مانگنے اور دعا سے وابستہ ہیں۔ خصوصاً خواتین مختلف مزارات پر جا کر امراض سے شفاء کے لئے دعا کرتی ہیں۔ خواتین کے علاوہ عقیدت مند مرد حضرات بھی مزارات پر جاتے ہیں ان میں مشہور مزارات یہ ہیں:

سنگر باباؒ کا مزار، مزار ڈانگ باباؒ، مزار بادو باباؒ۔

سوات ''مالاکنڈ ریجن''

جغرافیہ

ضلع سوات، ضلع شانگلا، ضلع دیر، ضلع بونیر اور مالاکنڈ ایجنسی پر مشتمل جغرافیے کا خطہ مالاکنڈ ریجن کی صورت میں صوبہ سرحد کا شمالی علاقہ ہے چنانچہ ہم اِس خطے کو مالاکنڈ ریجن تو کہہ سکتے ہیں مگر اِس ریجن کا سب سے نمایاں تہذیبی، روایتی اور قدیم اقوام کا مسکن تہذیب وثقافت کے سرمائے سے مالا مال خطہ سوات ہے جو قدرتی حسن اور فطری مناظر سے مالا مال ہے۔

سوات کا رقبہ ۸۷۸۸ مربع کلومیٹر ہے۔ سوات کے مشرق کی جانب ہزارہ کوہستان اور دریائے سندھ ہے جس کی وجہ سے اِس کوہستانی علاقہ کو اباسین کوہستان بھی کہتے ہیں۔ مغرب کی طرف ضلع دیر ہے جو کہ ریاستِ دیر کے نام سے مشہور تھا۔ شمال مشرق کی جانب گلگت، اور شمال مغرب کی طرف ضلع چترال اور جنوب کی طرف ضلع بونیر واقع ہے۔

سوات کے جغرافیئے کی حدود میں شامل ہونے والے علاقوں میں، اوڈیگرام، بلوگرام، بالیگرام، علی گرام، بٹ کڑہ، جانبیل، مانگلور، خوازہ خیلہ، مدین، بحرین، کالام، مٹلتان، اوشو، اُتروڑ، گجرال اور شانگلہ کے قدیم علاقے ہیں۔

سوات کا قدیم نام اودیانہ تھا جس کا ذکر آریاؤں کی قدیم کتب میں موجود ہے۔ اودیانہ سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی باغ اور گلستان کے ہیں۔ چونکہ یہ سرسبز پہاڑی علاقہ ہے لہذا اِس مناسبت سے اِس کا قدیم نام اودیانہ رکھا گیا تھا۔ اسلام سے پہلے اِس علاقے میں بدھ مت رائج تھا اور جگہ جگہ اِس بدھ عہد کی یادگاریں اب تک کھنڈرات کی صورت میں موجود ہیں۔

سوات کے متعدد ایسے تاریخی اور ثقافتی علاقے ہیں جہاں کے کھنڈرات سے قدیم عہد کا پتا چلتا ہے اِن میں اوڈیگرام اور بٹ کڑہ کے کھنڈرات قابلِ ذکر ہیں۔ سوات کا دارالخلافہ سیدو شریف ہے اور بڑا شہر مینگورہ ہے۔ سیدو شریف جو کہ سوات کا دارالخلافہ ہے یہ سطح سمندر سے ۳۲۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ سیدو شریف میں مرغزار، قدرتی حسن کا مرقع ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں پر والی سوات کا قدیم محل تھا جو کہ اب ایک ہوٹل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سوات کا تجارتی اور مرکزی شہر مینگورہ ہے۔

دریائے سوات اِس علاقے کا وہ دریا ہے جو سوات کی زمینوں کی زرخیزی وشادابی، اور اِس کی وادیوں کی سبزہ زاری کا باعث ہے اور چشموں کی روانی اِسی دریائے سوات کی سیلانی سے ہے۔ سیاحوں کی توجہ کا مرکز یہ دریا سوات کے شمالی کوہستانی علاقوں سے شروع ہو کر سوات کے عین وسط سے گزرتے ہوئے اِس کے جنوب مغرب کی طرف سوات کی زمینوں کو ہریالی بخشتا ہے۔ وید میں دریائے سوات کا ذکر سواستو کے نام سے ہوا ہے جبکہ یونانیوں نے ایسے سواتن نام دیا ہے اور چینیوں نے اِس کو سوپوفاسٹو کہا ہے۔ رگوید میں جو بھجن آریاؤں نے لکھے ہیں ان میں دریائے سوات کی نسبت بھی کچھ گیتوں کا تذکرہ موجود ہے اور مہابھارت میں شمال مغربی ہند کے علاقوں کی جو فہرست دی گئی ہے اِس میں بھی اِس کا ذکر موجود ہے۔

دریائے سوات کے علاوہ یہاں ایک اور دریا بھی دریائے 'بشی گرام' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دریا سوات کے شمال میں واقع ایک حسین وخوبصورت علاقے مدین کے بازار میں آکر دریائے سوات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اِس دریا کا پانی نیلے رنگ کا ہے جسے مقامی لوگ پشتو میں 'لعلونو دریاب' کہتے ہیں۔ یہ دریا مدین کے مشرق میں واقع وادی بشی گرام سے آتا ہے اِس لئے اِس دریا کا نام دریائے بشی گرام ہے۔ چونکہ سوات پھلوں اور پھولوں کا شہر ہے اِس لئے یہاں کا شہد بہت شہرت رکھتا ہے۔ پھلوں میں سیب، مالٹا، ناشپاتی اور خوبانی یہاں کی مشہور پیداوار ہیں۔ چونکہ یہ سارا علاقہ زرعی زمینوں پر مشتمل ہے لہذا دریاؤں کی سرزمین ہونے کی بناء پر یہاں ہر قسم کی سبزیوں کی کاشت ہوتی ہے جن میں آلو، ٹماٹر، پالک اور دیگر قسموں کا ساگ، کدو، ٹینڈہ، بھنڈی توری، مٹر، گاجر، مولی وغیرہ شامل ہیں۔ سوات میں پانی بکثرت ہے اِس لئے یہاں چاول بھی بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

سوات چونکہ بہترین پانیوں کے دریاؤں کا خطہ ہے۔ اس لئے ان دریاؤں میں بہترین قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قیمتی اور پسندیدہ مچھلی ٹراؤٹ ہے جو اس خطے کی بڑی پیداوار ہے۔ ٹراؤٹ مچھلی نہ صرف قیمتی ہے بلکہ کھانے میں اس کی لذت منفرد ہے۔

سوات کے قدیم اور بدھ مت کے تہذیبی دور کے یادگار علاقوں میں بلوگرام، اوڈیگرام، گوکدرہ، غالیگے اور بریکوٹ ہیں جہاں آج بھی بدھ دور کے قائم سٹوپے، درسگاہیں اور مہاتما بدھ کے مجسمے موجود ہیں جن سے سوات کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شانگلہ: سوات کے جنوب مشرق کی طرف شانگلہ کا پہاڑی علاقہ سطح سمندر سے (7000) سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ اب سوات ریجن کا ایک ضلع

ہے اور مینگورہ سے ۵۶ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا تحصیل ہیڈکوارٹر الپوری ہے۔ اسکی حدود مشرق کی جانب بشام تک ہے۔ شانگلہ کے مشرق کی جانب ضلع کوہستان ہے جو کہ ہزارہ ریجن کا کوہستانی ضلع ہے۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع شانگلہ کی آبادی چار لاکھ انتیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ ضلع انتظامی لحاظ سے دو سب ڈویژن، الپوری اور پورن پر مشتمل ہے۔

والی سوات کے دور میں اس کی سات تحصیلیں تھیں۔ ان میں تحصیل کانا، آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑی تحصیل تھی جہاں یوسفزئی قوم کے مختلف قبیلے آباد ہیں۔ یہ خوبصورت وادیوں اور جھیلوں کی سرزمین ہے۔ وادی کانا ایسی وادی ہے جس کے بیچوں وبیچ ایک خوبصورت دریا بہتا ہے جسے مقامی لوگ خوڑ کہتے ہیں۔ دراصل یہ اس علاقے کی ایک خوبصورت ترین جھیل ہے جس کا منبع یخ کنڈاؤ جھیل ہے جو آگے جا کر دریا کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر جنوب کی طرف دریائے سندھ میں بہتی ہے۔ کانا میں خوبصورت تاریخی اور ثقافتی مقام پیر خانہ ہے جس کی آبادی تقریباً ۲۸ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کے پہاڑوں کا سلسلہ کوہِ ہمالیہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ان برف پوش پہاڑوں کی بلندی پر وہ تاریخی گزرگاہ ہے جہاں سے چنگیز خان اور پھر ہلاکو خان کی فوجوں نے ایشیاء کوچک اور دوسرے علاقوں پر متعدد حملے کئے۔ اس علاقے میں ایک مشہور چراگاہ ہے جس کا نام تختِ بہرہ خان ہے، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دراصل تختِ بہرام خان کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو کہ الف لیلوی داستان شہزادہ بہرام خان اور گل اندام سے منسوب ہے۔ شانگلہ کے تمام علاقوں میں یوسفزئی قوم کے مختلف قبائل آباد ہیں۔

اس علاقے میں بدھ مت کے دور کے بہت سے نشانات ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس علاقے پر طویل دور تک بدھ مذہب کا اثر رہا ہے۔ بدھ دور کی علامات اب تک اس علاقے میں موجود ہیں، مثلاً بعض علاقوں کے نام بدھ عہد کی یاد تازہ کرتے ہیں جیسے یوشت، کارشٹ، تالشٹ، گھبر شٹنا می گاؤں ایسے ہیں جو کہ بدھ عہد میں تھے اور ابھی تک یہی نام چلے آرہے ہیں۔

کالام : سوات کے صدر مقام سیدو شریف سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب مدین اور بحرین سے گزر کر کوہستان کا صدر مقام کالام ہے۔ کالام کے راستے میں بحرین سے ہی سوات کوہستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ بحرین کے مقام کو علاقہِ کوہستان کا دروازہ کہتے ہیں۔ اس مقام پر دریائے ورال کا پانی دریائے سوات میں گرتا ہے۔ چونکہ اس مقام پر دو دریا آپس میں ملتے ہیں اس مناسبت سے اس جگہ کو بحرین کہتے ہیں یعنی' دو دریا'۔ جبکہ بحرین کا قدیم سنسکرتی نام 'بھونال' تھا۔ بحرین سے شمال کی طرف پہاڑی علاقہ بتدریج بلند ہوتا ہے اور پھر کولالی گاؤں تک اس پہاڑی راستے کی بلندی سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ تک بلند ہو جاتی ہے۔ راستے میں آنے والے دیہات کیدام، لائی کوٹ، کولائی، مانکیال اور پشمال ہیں جو کہ دریائے سوات کے کنارے پر آباد ہیں۔ ان دیہات کے بعد کالام کا خطہ شروع ہو جاتا ہے جسے مشرق کا سوئیٹزرلینڈ کہا گیا ہے۔ کالام کے عین وسط میں سطح زمین کے ساتھ دریا بہتا ہے۔ کالام سطح سمندر سے چھ ہزار آٹھ سو بتیس فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس کی مشہور چوٹی 'چوٹی فلک سیر' بیس ہزار فٹ بلند ہے۔ روایت کے مطابق کالام مہاتما گوتم بدھ کا پیروکار تھا جو کہ اس علاقے کا سردار تھا۔ یہاں اب ایک بازار آباد ہے جہاں کھانے پینے اور دوسری اشیاء کی دستیابی کے لیے دکانیں ہیں، سیاحوں کے لیے دریا کے دونوں جانب پختہ ہوٹل بن گئے ہیں۔ دریا کے مشرق کی جانب کالام کا قدیم دیہات ہے۔ دریا کے آر پار جانے کے لئے قدیم طرز کا لکڑی کا پل بنا دیا گیا ہے۔ کالام وادی کا کل رقبہ تین میل ہے۔ دریا کے مشرقی کنارے پر کالام کی قدیم جامع مسجد ہے جو تمام کی تمام اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی ہے۔ مسجد میں لکڑی کے بنے ہوئے دیو ہیکل شہتیر ہیں اور باقی چھت، دروازوں اور کھڑکیوں میں استعمال ہونے والی لکڑی پر چیتر کاری کا کام کیا گیا ہے جو کہ گندھارا آرٹ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ کالام کے تمام باشندے کوہستانی زبان بولتے ہیں اور ان باشندوں کو دردی بھی کہا جاتا ہے۔ کالام سے آگے تین وادیاں اوشو، اترو ڑ اور گبرال ہیں۔ اگرچہ یہاں کے لوگوں کی زبان کوہستانی ہے جو کہ پشتو سے مختلف ہے مگر لوگ پشتو بھی بآسانی بولتے ہیں۔ یہاں پہاڑوں کی بلندی پر ایک وادی ہے جسے دہسان کہتے ہیں، اس وادی میں قدرتی جنگلات کی بہتات ہے۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹے گاؤں بھی ہیں جو اپنی قدیم تعمیرات اور بود و باش کے ساتھ پرانی ثقافت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں کے دیہات حسب ذیل ہیں:

میوڈنڈ، مٹلتان، گوجر، گبرال، اتیکر، لائیکوٹ اور پشمال۔ کالام سے اترو ڑ کا فاصلہ بارہ کلومیٹر ہے اور اترو ڑ سے ادھر گبرال، گوجر گبرال کا علاقہ ہے جو کہ گجر ہیں اور گجر زبان بولتے ہیں۔ یہ ایک جدا تہذیب و ثقافت کے محافظ لوگ ہیں جو کہ بھیڑ، بکریاں اور گائے پالتے ہیں اور اون سے لباس بناتے ہیں۔ کالام کوہستان کے لوگ اپنے آپ کو راجہ گیرا کی اولاد بتاتے ہیں۔ راجہ گیرا کی راجدھانی اوڈیگرام تھی جسے محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں شکست دیکر قتل کر دیا تھا۔ گجروں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ گجر خانہ بدوش اور صدیوں سے ایک ہی طرح کی مخصوص

ثقافتی حیات رکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپریل یا مئی کے مہینے میں ان کوہستانی علاقوں میں آجاتے ہیں اور پھر اکتوبر اور نومبر کے درمیان میدانی علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔

ان کوہستانیوں کی لوک کہانیوں میں دیو، پریوں، اژدھوں، غاروں اور ڈھنڈوں یعنی تالابوں کا ذکر اکثر ملتا ہے جس سے ان کی ان دیومالائی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

بونیر: بونیر سوات کا وہ قدیم شہر ہے جو اب ملاکنڈ ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ یہ علاقہ تین اطراف سے سوات کے ساتھ ملتا ہے۔ سوات سے مغرب کی طرف آتے ہوئے بڑی شاہراہ پر واقع گاؤں بریکوٹ سے بغلی سڑک بونیر کی طرف جاتی ہے۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں لیگانڑیں گاؤں ہے اور اس سے آگے جوڑ گاؤں ہے جو اب تحصیل ہیڈکوارٹر ہے۔ اس مقام سے آگے دائیں طرف راستہ ڈگر کی طرف جاتا ہے جو بونیر کا ضلعی صدر مقام ہے۔ ڈگر سے جنوب کی طرف پہاڑی راستہ ہے جو براستہ رستم ہو کر مردان صوابی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ تحصیل ہیڈکوارٹر جوڑ سے بائیں طرف کو راستہ گدی زئی کی طرف جاتا ہے جہاں پر سید علی ترمذی المعروف پیر بابا کا مزار ہے اور اس مزار کی وجہ سے ہی بونیر کے علاقے کی شہرت ہے۔

بونیر میں پام پوہا نامی گاؤں بہت مشہور ہے جہاں دو قسم کا ماربل پتھر پایا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے پاس بونیر کے جنوب مشرق کی طرف نواگئی نامی گاؤں بہت مشہور ہے اور اس مقام سے دریا کے پار ہزارہ کا علاقہ ہے۔

بونیر کے ایک اور مضافاتی گاؤں تورورسک کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کے اکثر مرد بیرون ملک، تھائی لینڈ، بنکاک اور سنگاپور میں کاروبار کرتے ہیں اور ان لوگوں کی وجہ سے یہ گاؤں بڑا خوشحال ہے۔ بونیر کا ایک دیہی مقام شمال مشرق کی طرف سے سوات کے علاقے جامبیل سے ملتا ہے۔ ان کے علاوہ انفاپور اور کاٹ قلعہ وہ مضافاتی علاقے ہیں جو کہ بہت مشہور ہیں۔ بونیر سوات کا ایک قدیم ترین ثقافتی اور تہذیبی علاقہ ہے جہاں بدھ دور کے آثار قدیمہ موجود ہیں۔ یہ علاقہ خشک ہے۔ بونیر کا صدر مقام ڈگر سطح سمندر سے 2500 فٹ کی بلندی پر ہے اور بنگلورہ سوات سے 64 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

مالاکنڈ: مالاکنڈ جسے ملاکنڈ بھی لکھا گیا ہے، یہ ایک پہاڑ کا نام ہے اور سوات جاتے ہوئے کڑاکڑ کے پہاڑ کی انتہائی بلندی پر واقع ہے۔ مالاکنڈ کے بارے میں میر سید بخاری اپنی کتاب 'لاہور تاریخ کے آئینے میں' کہتے ہیں کہ سمہ یعنی صوابی کے علاقے میں سنسکرت کی گرائمر کے موجد پانینی نے تین اقوام کی شناخت کی ہے ان میں ایک قوم بھیگا ہے، دوسری کا نام بالا ہے اور تیسری قوم مالا ہے۔ مالاکنڈ وہ مقام ہے جہاں قدیم سنسکرت زبان وثقافت رکھنے والی قوم آباد تھی اور اسی نسبت سے انہوں نے مالاکنڈ کی توجیہہ کی ہے۔ مالاکنڈ کے جنوب میں درگئی اور سخاکوٹ کے زیریں علاقے، شمال کی طرف طوطاکان اور مشرق کی جانب لنڈاکے کا علاقہ واقع ہے۔ اس وقت ملاکنڈ میں دو بڑی قومیں آباد ہیں ان میں ایک اتمانزئی ہے اور دوسری وانیزئی۔ مالاکنڈ کے ایک حصے میں اتمانخیل آباد ہے اور جنوب کی طرف رانیزئی آباد ہے جو کہ یوسفزئی پٹھانوں کی ایک شاخ ہے۔

مالاکنڈ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بٹ خیلہ ہے۔ بٹ خیلہ کے جنوب مشرق کی طرف ڈھیری الہ ڈھنڈ ایک قدیم، روایتی اور ثقافتی میلانات کا حامل قصبہ ہے جہاں متعدد مکانات روایتی شکل میں، پتھر اور گارے سے بنے ہوئے ہیں۔ یہ قصبہ مختلف قدیم محلوں پر مشتمل ہے۔ ہر محلے کی سطح پر ایک حجرہ بنا ہوا ہے۔ ان حجروں میں مقامی لوگوں کے فیصلوں کے علاوہ ٹنگ ٹکور یعنی گانے کی محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں۔ الہ ڈھنڈ میں برکس باغونوں کے مقام پر یوسفزئیوں کے سردار ملک احمد خان کا مرکز تھا جو باقاعدہ طور پر ایک قلعہ بند جگہ تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ملک احمد خان جرگے منعقد کرتا تھا۔ ملک احمد خان نے 1535ء میں وفات پائی تو اس جگہ پر ان کا مدفن بنایا گیا جو کہ اب اس علاقے کا ایک ورثہ ہے۔

دیر: یہ سوات مالاکنڈ ریجن کا ایک وسیع وعریض ضلع ہے جس کا صدر مقام تیمر گرہ ہے۔ دیر کا علاقہ طویل عرصہ تک نوابی اقتدار اور اختیار کے زیر اثر رہا ہے اور یہاں کے لوگ تا دیر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جس کی وجہ ان کے نزدیک ان کے اپنے پرانے رسم ورواج ہیں۔ دیر کا علاقہ سرد اور گرم دونوں قسم کے خطوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک وسیع وعریض رقبہ کوہستانی ہے جسے دیر کوہستان کہا جاتا ہے۔ دیر کا قدیم معاشرہ آج کے معاشرتی اور سماجی حالات اور رویوں سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ دیر کے علاقے میں بہنے والا سب سے بڑا دریا پنجکوڑ ہے اور پنجکوڑ دریا کے دونوں جانب دیر کے مضافاتی گاؤں آباد ہیں۔ اس کے صدر مقام تیمر گرہ کے انتہائی شمال میں دیر خاص واقع ہے اور دیر خاص کے شمال کی طرف چترال جانے والا پہاڑی راستہ لواری ٹاپ ہے۔ دیر خاص کے پہاڑی مقام پر شمال کی جانب نواب آف دیر کا بنایا ہوا ریسٹ ہاؤس ہے۔

تیمر گرہ کے شمال کی طرف برلب سڑک دریائے پنجکوڑ کے مشرقی ساحل

پر ''خال'' کے نام سے پُر رونق بازار ہے۔ یہاں قدیم آبادی ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ یہاں پر استاد شہید نامی ایک شہید کا مقبرہ ہے جو انگریزوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

دیر خاص کے جنوب مغرب کی طرف جانے والا راستہ تحصیل براول کو جاتا ہے۔ یہ ضلع دیر کا سب ڈویژن ہے۔ تحصیل براول دو حصوں میں تقسیم ہے ''بر براول'' اور ''لر براول''۔ ان دونوں کا مرکزی مقام بانڈہ ہے جہاں ایک بڑا تجارتی بازار ہے۔ دیر کا کوہستانی علاقہ متعدد دروں پر مشتمل ہے۔ دیر کا علاقہ داڑے دیر کا سب ڈویژن ہے، جہاں درہ نہاک مشہور ہے۔ اس درے کے لوگ بڑے جنگجو ہیں اور ان کے آپس میں زمین کے تنازعات ہر وقت رہتے ہیں۔ ان کے ہاں صرف جرگہ کا رواج ہے اور جرگے کے فیصلے کی پابندی ان کی روایتی زندگی کا حصہ ہے۔ باشندے ذہنی طور پر پسماندہ ہیں، افیون کی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔ لوگ اسلحہ رکھنے کے دلدادہ ہیں۔ دیر کے علاقہ خال میں چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے، پھلوں میں یہاں کا مالٹا پورے ملک میں مشہور ہے۔

دیر کے صدر مقام تیمر گرہ کے انتہائی جنوب میں چکدرہ کا مقام ہے جو سوات اور دیر کا سنگم ہے۔ یہاں پر ایک میوزیم بنایا گیا ہے۔ چکدرہ کا مقام ہے، سکندر اعظم اسی مقام سے سوات کے علاقے میں داخل ہوا تھا جبکہ محمود غزنوی نے اسی مقام سے گزرتے ہوئے سوات کے علاقے اوڈیگرام پر حملہ آور ہو کر راجہ گیرا کو شکست دی تھی۔

چترال: (چترال کے بارے میں تفصیلی معلومات ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کے پہلے والیم میں دی گئیں ہیں)۔

قدیم تہذیب وثقافت کی ترجمان سرزمین چترال سوات مالاکنڈ ریجن کا ایک وسیع وعریض ضلع ہے۔ چترال کے مشرق کی طرف چین اور کشمیر کا علاقہ، مغرب کی جانب افغانستان ہے۔ مشرقی سرحد جو کہ چین سے متصل ہے اس میں کوہِ ہمالیہ کی وسطی برفانی وادیاں قراقرم اور کے ٹو کے نام سے موسوم ہیں۔ درہ ابریشم بھی اس سلسلہ قراقرم کی ایک کڑی ہے۔ اس کے جنوب میں دیر ہے۔ چترال صوبہ سرحد کا انتہائی شمال مغربی خطہ ہے جو کہ تنگ دروں، دشوار گزار راستوں، سربفلک پہاڑوں اور قدرتی چشموں پر مشتمل ہے۔ یہاں پر قدیم گندھارا آرٹ اور تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ چترال کا لفظ چتر کے لفظ سے بنا ہے۔ چونکہ وادی چترال جنوبی دروں کے راستوں کے ذریعے گندھارا کے نشیبی علاقوں سے متصل تھی اور گندھارا آرٹ یا تہذیب چتر کاری میں ملکہ رکھتی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا نام چتر تھا جو بعد میں چترار ہوا اور پھر چترار سے چترال میں بدل گیا۔ علاوہ ازیں چتر کا لفظ اونچی جگہ کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس نسبت سے بعض محققین کے نزدیک چتر کو چھت بھی کہا جاتا ہے، چتر کا مبدل چترال ہے جو کہ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے چھت کا مفہوم دیتا ہے اس لفظی معنی کی مناسبت سے اس کا نام چترال پڑ گیا۔

جہاں تک چترال کے قدیم ناموں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس خطے کو کہوستان اور بلورستان بھی کہا گیا ہے اور باشندوں کو کہو، بلوری اور چترالی کہا جاتا ہے۔

چترال کی قدیم ترین قوم ''کہو'' ہے اور ان کی زبان کہوار ہے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ یہاں پر بسنے والے شمال سے قراقرم اور جنوب سے ہندوکش کے علاقوں سے آکر آباد ہوئے تھے۔ جنوبی حصے سے آئے ہوئے یہ امن پسند لوگ، ارندو، دروش، اور باشقاوہ کوہستان اور ترست آسماد میں آباد ہو گئے۔ شمال کی طرف سے آئے ہوئے باشندے زیادہ تر ترکستان اور بدخشاں تہذیب وتمدن کے وارث ہیں اس لئے یہاں ان علاقوں کی تہذیب اور ثقافتی بود وباش کے اثرات بھی موجود ہیں۔ چترال کے یہ باشندے جسمانی طور پر خوبصورت، اور ساخت میں نازک اور دبلے ہیں مگر اندر سے بڑے مضبوط وتوانا ہیں اور انتہائی مذہب پرست اور عقیدے میں راسخ واقع ہوئے ہیں۔

چترال میں تین قسم کے گروہ آباد ہیں ان میں سنی العقیدہ مسلمان، اسماعیلی فرقے کے لوگ اور کافر کیلاشی ہیں۔

کیلاش چترال کے جنوب اور دریائے چترال کے دائیں کنارے کے مختلف مقامات پر اپنی جداگانہ ثقافت اور طرز بود وباش کے ساتھ صدیوں سے موجود ہیں۔ کیلاشیوں کی آبادی کا نصف حصہ اُن لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو یونانی النسل کہتے ہیں اور آدھا حصہ کوہستانی کیلاشی ہیں۔ یہ کوہستانی کیلاشی یونانی النسل کیلاشی بود وباش اور رہن سہن کے طریقوں سے خود کو مبرا کیے ہوئے ہیں۔ سال میں دو تین مرتبہ قدرتی آفات کے مواقع پر جمع ہو کر دعائیں کرتے ہیں اور مخصوص گیت گاتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لوگ گائے، بھیڑ اور بکری کی قربانی کرتے ہیں۔

کیلاشی زیادہ تر زراعت پیشہ لوگ ہیں ان کی اہم فصل انگور ہے اور جب انگور کے پکنے کے ایام ہوتے ہیں تو یہ خدا سے وعدہ کرتے ہیں اور پھر قربانی دیتے ہیں۔ زیادہ تر قربانی بکری اور گائے کی کرتے ہیں۔ یہ لوگ چترال کی تین خوبصورت

وادیوں، بمبوریٹ، ریمبور، اور بریر میں آباد ہیں جبکہ ان وادیوں کے مضافات میں بھی ان لوگوں کے پہاڑوں پر بالکل جدا اور قدیمی طرز تعمیر کے مطابق مکانات ہیں۔ ان کے مضافاتی دیہات میں بلاداتان دیہہ، درش گرد، اینش، برونڈ، بترک اور اکالی بمبوریٹ وادی سے متعلق ہیں، جبکہ وادی ریمبور سے متعلق مضافاتی بستیاں گلشگرام، بتھ، گروم، بغض گرد، اور مالی دیش ہیں۔ وادی بریر کی ذیلی بستیاں گورد، اسیر، لوشبو، گرم بیت، کس گرد، بشکال اور بیو ہیں۔

چترال کا صدر مقام چترال خاص ہے جس کی آبادی دریائے چترال کے دائیں کنارے پر ہے جہاں چترال کے مہتران کا شاہی قلعہ اور شاہی مسجد قابلِ دید ہیں۔ چترال خاص کے شمال کی طرف گرم چشمہ کا سرسبز علاقہ ہے جہاں پر اسماعیلی فرقے کے لوگ بکثرت آباد ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں قدرتی معدنیات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہاں ایک قدرتی چشمہ ہے جس کا پانی ہر موسم میں گرم ہوتا ہے اسی مناسبت سے اس کا نام گرم چشمہ رکھا گیا ہے۔ یہاں کا پہاڑ اسماعیلی فرقے کے لوگوں کے لئے بڑا متبرک ہے کیونکہ ان کے پیشوا امیر ناصر خسرو نے اس پہاڑ کی غار میں چالیس روز تک چلہ کیا تھا۔

چترال کا جو علاقہ شہرت رکھتا ہے وہ درہ یورغل ہے جو کہ سری کوٹ کے باشندوں کی خوبصورت وادی ہے۔ یہ وادی چار مختلف دروں سے ہوتی ہوئی افغانستان سے جا ملتی ہے۔ یہاں کی عورتیں خوبصورت اور دیدہ زیب لباس پہنتی ہیں جو کہ ان کی ثقافتی پہچان ہے۔ یہاں کے لوگ وخی زبان بولتے ہیں۔ مرد کمزور ہوتے ہیں اور افیون زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

چترال کا علاقہ دروش لواری ٹاپ سے اکیس میل کے فاصلے پر دریائے چترال کے بائیں کنارے پر ہے۔ یہاں پر سرکاری رجمنٹ کی بڑی چھاؤنی ہے، ہسپتال، ڈاکخانہ، ہوائی اڈہ، اور ایک بڑا بازار ہے۔ یہ متعدد چھوٹے چھوٹے دیہات پر مشتمل علاقہ ہے۔ چترال کے علاقوں میں تحصیل مستوج مین بونی کا علاقہ انتہائی خوبصورت باغات سے اٹا ہوا ہے جہاں تر و تازہ اور خشک پھل بکثرت ملتے ہیں۔ سیب، ناشپاتی، آلوچہ، آلو بخارہ، خوبانی، اور اخروٹ یہاں کی اہم پیداوار ہیں۔

شندور بلندی پر واقع چترال کا مشہور درہ ہے، یہ گلگت اور چترال کے سنگم پر ہے اور سطح سمندر سے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ چترال سے ۱۵۰ کلومیٹر اور گلگت سے ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پولو کھیل کے لئے پولو گراؤنڈ بہت مشہور ہے جہاں ہر سال ''شندور کا میلہ'' لگتا ہے اور پولو کے کھیل کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

تاریخ

سوات کی تاریخی حیثیت جاننے کیلئے ہمیں 327 قبل مسیح میں سب سے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھنے والے سکندر اعظم کے حملے کے عہد کو بھی ذہن میں رکھنا پڑتا ہے کیونکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سوات کے موجودہ کوہستانی علاقوں میں بسنے والے دردی لوگ وہ ہیں جو کہ سوات کے حکمران رہے ہیں، جن کی بہادری کے پیشِ نظر یونان کے سکندر اعظم کے حملے سے قبل ایران کے بادشاہوں نے اس علاقے کے لوگوں اور شہسواروں کا ایک دستہ اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا اور اسا کینی کا نام دیا تھا اور یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بدھ دور میں بدھ مت کو پھیلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور گندھارا تہذیب کو اجاگر کرنے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ گویا یہ اپنے دور کی مہذب قوم ہے جس نے بدھ عہد کی شاندار تہذیبی اور ثقافتی حیات کو پیدا کرنے میں تاریخی مقام حاصل کیا۔

اٹلی کے ماہرین آثارِ قدیمہ نے سوات کی ہزارہا سالہ پرانی تاریخ پر پڑے ہوئے دبیز پردے ہٹائے۔ ان ماہرین میں سے پروفیسر ٹاکول نے سوات کے کوہستانی علاقہ کالام میں 1968ء میں بڑا کام کیا جس کے بارے میں پرویش شاہین نے اپنی کتاب کالام کوہستان میں لکھا ہے کہ پروفیسر ٹاکول نے دو مقامات پر کام کیا تھا۔ ایک وہ مقام ہے جہاں اتروڑ اور گبرال کے دریا آپس میں ملتے ہیں اور دوسرا مقام اوشورن ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے راشی نیل کے مقام پر بھی کچھ آثار پائے تھے۔ ان مقامات سے حاصل کردہ ٹھیکریوں اور یہاں پر پرانی قبروں، مقبروں اور عبادت گاہوں سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جس طرح سوات کے دیگر علاقے قبل از تاریخ کے زمانے میں آباد تھے کالام کا علاقہ بھی ویسے ہی آباد تھا کیونکہ وہاں انہوں نے جو آثار پائے تھے وہی آثار انہوں نے چترال، پنجکوڑہ، سوات، بونیر، اور دیگر شمالی علاقہ جات میں پائے تھے جس کی وجہ سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قدیم عہد میں گلگت، چترال اور دیر کی طرف کالام بحیثیت ایک شاہراہ استعمال ہوتا تھا کیونکہ یہ راستہ بالواسطہ ہندوکش اور واخان کو وادی سندھ سے ملاتا تھا جو کہ انڈس کوہستان اور وادی کونڑ سے گزرتا ہے۔ قبروں اور عبادت گاہوں کے علاوہ یہاں ایسی چیزیں پائی گئی ہیں جن کا زمانہ چار صدی قبل مسیح تک ہے۔

سوات کا نام مختلف ادوار میں بدلتا رہا، اس کا قدیم نام اودیانہ، یعنی گلستان کے مفہوم میں ہے۔ آریاؤں نے دریائے سوات کو دید میں سواستو کا نام دیا۔ یونانیوں

نے اِس کے دریا سواستو کی نسبت سے اس کا ذکر کیا ہے۔ عربوں نے اِس خطّے کا جو نام دیا ہے وہ سواد تھا۔ سواد عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب سیاہ ہے۔ چونکہ یہ جنگلات اور درختوں کے جھنڈوں سے شاداب علاقہ تھا اِس لئے اِسے سواد یعنی سیاہ کہا گیا۔ بعد کے دور میں اودیانہ، سواستو اور سواد سے ہوتا ہوا سوات میں تبدیل ہو گیا۔

1957ء میں ایک اطالوی ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ٹوچی نے پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کے تعاون سے سوات میں آثار قدیمہ کی تلاش کا کام شروع کیا تو منگورہ سے متصل بٹکڑہ کے مقام پر آثار قدیمہ دریافت ہوئے۔ یہ علاقہ اٹھارہ سو مربع کلومیٹر میل پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ اصل میں اِس شہر کی بہت بڑی عبادت گاہ ہے جس میں شاہی محلات کے کچھ آثار بھی دریافت ہوئے۔ یہاں ایک عظیم الشان سٹوپہ کے آثار بھی ملے ہیں جس کے گرد 250 چھوٹے سٹوپہ تھے۔ یہیں سے ہرے رنگ کے پتھر سے تراشے ہوئے قریباً سات ہزار مجسمے بھی ملے ہیں۔ جو اِس سٹوپہ کے چاروں طرف نصب تھے۔ چند سٹوپوں سے سونے کی بنی ہوئی ڈبیاں بھی ملی ہیں جن میں مہاتما بدھ کی خاک تبرک کے طور پر رکھی جاتی تھی۔ اِس مقام کے آثار دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر گیارھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔

یہاں سے ملنے والے مجسموں میں نہ صرف گوتم بدھ کے مجسمے ہیں بلکہ ان میں مختلف جانوروں اور مختلف دیگر نواع کے کئی اور مجسمے اور تصاویر بھی ہیں۔ اِس قسم کے کھنڈرات کئی اور مقامات پر بھی سوات کے اطراف میں پائے گئے ہیں۔ ان میں اوڈیگرام، بلوگرام، بالی گرام، علی گرام، نجی گرام، نیموگرام، بانڑ گوگدرہ اور یار ڈھیری کے کھنڈرات کے آثار قدیمہ قابلِ ذکر ہیں۔ سوات کے اوڈیگرام قصبے کو تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں پر انتہائی اہم نوعیت کے آثار قدیمہ پائے گئے ہیں جن سے بدھ مت اور پھر اسلامی لشکر کی آمد کے نشانات ملتے ہیں۔ یہاں پر گیرا نامی مشہور پہاڑ ہے جہاں راجہ گیرا کی راجدھانی تھی۔ اِسے محمود غزنوی نے 1001ء میں شکست دی۔ محمود غزنوی نے جب سوات پر حملہ کیا تو سوات کا علاقہ دو خودمختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک کا دارالخلافہ دریائے سوات کے پار کا علاقہ نیک پی تھا، جبکہ دوسرے کا دارالخلافہ اوڈیگرام تھا۔

اِس مقام کے کھنڈرات سے تسبیح، جائے نماز کے ٹکڑے اور کئی دوسری اشیاء دستیاب ہوئیں، ان میں ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن، کانسی کا بنا ہوا ایک دیا، اور محمود غزنوی کے دور کے سکے بھی دریافت ہوئے۔ کھدائی میں ایک اعلیٰ فنِ تعمیر کے مطابق بنی ہوئی مسجد درست حالت میں دریافت ہوئی ہے۔ اِس مسجد کا محراب، اِس کی دیواریں، وضو خانہ اور تالاب درست حالت میں پائے گئے۔

سوات یوسفزئی پختونوں کا علاقہ ہے اور یوسفزئی قوم کی ذیلی شاخوں میں تین معروف اقوام ہیں جن میں پختون، سید اور ملد مینگورہ اور محلقہ علاقوں میں موجود ہیں جبکہ علاقہ کوہستان میں قدیم اقوام میں، دردی، قاشقار اور گوجر آباد ہیں۔

دیر: دیر کی تاریخ اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر بھی بدھ مت کے اثرات پہنچ چکے تھے اور لوگ بدھ مت کے پیروکار رہے ہیں۔ یہاں پر انٹرز کے مقام پر ایک پہاڑ کے اوپر ایک قدیم قلعہ کے کھنڈر موجود ہیں۔ یہاں سے بدھ عہد کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں پہاڑوں پر قدیم عہد کے بنے ہوئے مکانات کے آثار بھی پائے گئے ہیں جن سے علاقہ دیر کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں کی دو مشہور قومیں نوراخیل اور شاہی خیل ہیں۔ اب ان لوگوں میں پرانی روایات اور طور طریقے باقی نہیں رہے تاہم دش خیل قوم کے لوگوں میں اب تک قدیم روایات اور ثقافتی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ علاقہ تالدش کے لوگوں کی اکثریت کے مکانات پرانی طرز کے کچے اور بوسیدہ ہیں۔

دیر میں بہت عرصہ تک نوابی دور رہا ہے اِس لئے دیر کا عمومی تاریخی تعارف ایک ریاست کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ ریاست دیر کے نوابوں کی ملکیت ہے۔ اس کا ریاستی رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل بنتا ہے۔ ریاست کے بانی حضرت اخون الیاس تھے جو کہ یوسفزئی قبیلہ کی ایک شاخ ملیزئی کے طبقہ پائندہ خیلوں میں سے تھے۔ دیر میں حضرت اخون الیاس اپنے پیرومرشد کے حکم پر آئے اور یہاں سجادہ نشینی اختیار کی اور اپنی روحانی تربیت اور زہد و تقویٰ کی بناء پر شہرت حاصل کی۔ انہوں نے دیر کے مقامی اور کوہستانی علاقوں تک اپنا حلقہ اثر پھیلایا اور لوگ ہر جگہ ان میں شامل ہوتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اِس سارے علاقے کو ایک ریاست کی حیثیت دے دی۔ حضرت اخون الیاس کے بعد ریاست دیر میں غلام خان، پھر قاسم خان اور اِس کے بعد رحمت خان کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ رحمت خان نے 1884ء میں وفات پائی تو اس کی جگہ اس کا بیٹا شریف خان مسند نشین ہوا۔ دوسری طرف جندول میں عمرا خان کی حکومت تھی اس نے 1890ء میں دیر پر حملہ کیا اور محمد شریف خان کو شکست دی۔ 1895ء میں انگریزوں نے شریف خان سے ملکر عمرا خان پر حملہ کیا اور اسے شکست دیکر دیر کا دوبارہ شریف خان کو حاکم بنا دیا۔ 1897ء میں انگریزوں نے محمد شریف خان کو نواب کا خطاب دیا اور یوں دیر میں نوابی دور شروع ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اورنگزیب خان مسند نشین ہوا اور حکومت ہند کی طرف سے باضابطہ نواب دیر ٹھہرا۔ حکومت ہند نے اِس کا سالانہ وظیفہ پچاس ہزار

روپیہ مقرر کیا اور نوابی کے خطاب کو اس کے خاندان کے ساتھ موروثی کر دیا۔ 1925ء میں شاہ جہاں خان نواب دیر مقرر ہوا۔ 1961ء میں اسے معزول کر کے اس کے ولی عہد محمد شاہ خسرو کو نواب دیر مقرر کر دیا گیا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی

قدیم تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوات (مالاکنڈ) ریجن کے قدیم باشندے وہی ہیں جو کہ اِن دنوں سوات کوہستان کے علاقوں میں آباد ہیں اور جنھیں گاروی کہا جاتا ہے۔ اِن میں کچھ تو وہ لوگ ہیں جو کہ سوات کوہستان کے کوہستانی علاقوں میں آباد ہیں اور کچھ وہ ہیں جو کہ دیر کوہستان کے لوگ ہیں۔ یہ وہ قدیم باشندے ہیں کہ جب پٹھان یعنی یوسفزی آئے تو انہیں اُوپر کے کوہستانی علاقوں میں جا کر آباد ہونا پڑا جیسا کہ ڈاکٹر حسن دانی کہتے ہیں کہ آثارِ قدیمہ اور تاریخی حقائق اس بات کے مظہر ہیں کہ ماضی بعید میں اس تمام علاقے پر غیر مسلموں کا تسلط رہا ہے۔ چنانچہ بعض علاقوں اور ان کے دیہاتوں کے نام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً کالاکوٹ، کالام اور کالائی وغیرہ جو کالا نامی کافر کے نام سے نسبت رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اِن پہاڑی علاقوں میں زمینیں آباد کیں اور علاقے کی آب وہوا نے انہیں یہاں پرسکونت کی تمام سہولیات فراہم کیں۔

زبان: ابتدائی آریہ اقوام کی اِن علاقوں میں زبان سنسکرت اور پالی تھی۔ اب اس علاقے کی اکثریت کی زبان یوسفزئیوں اور ان کی شاخوں کی وجہ سے پشتو ہے جو بڑی تیزی کے ساتھ تمام علاقوں تک پھیلتی گئی اور اِس وقت علاقے کے ایک وسیع رقبے تک پشتو زبان پھیلی ہوئی نظر آتی ہے جو کہ علاقہ سوات کی تمام مقامی آبادی کے علاوہ، ضلع شانگلہ، ضلع بونیر اور ضلع دیر کے وسیع ترین رقبے میں بولی جاتی ہے جبکہ کوہستان کے علاقے میں جو کوہستانی زبانیں بولی جاتی ہیں اُن میں گوجروں کی نسبت سے گوجری زبانیں عام ہیں جو کہ بحرین سے شروع ہو کر کالام اور کالام کے مضافات، اوشو، اتروڑ، گبرال اور کوجر گبرال میں بولی جاتی ہیں، جبکہ دیر کوہستان کے علاقوں میں، پاترا ک، شرنیگل، درہ نہاگ، اشیر وغیرہ وہ کوہستانی علاقے ہیں جہاں کوہستانی لہجے اپنے ہیں۔ زبانوں کے حوالے سے چترال اپنے جغرافیائی رقبے کی بناء پر ایک بالکل الگ زبان کھوار سے پہچانا جاتا ہے، البتہ بعض علاقے ایسے ہیں جو اپنے ناموں کی نسبت سے معمولی فرق کے ساتھ زبان کی یکسانیت نہیں رکھتے مثلاً علاقہ لٹکو جو کہ گرم چشمہ کے علاقے کا قدیم نام ہے وہاں پر بولی جانے والی ہراکرت لٹکو ہی ہے اور علاقہ کلاش میں بولی جانے والی زبان علاقے کی نسبت سے کالاشی کہلاتی ہے، جبکہ چترال کے تمام علاقے کی زبان کو بحیثیت مجموعی چترالی زبان کہا جاتا ہے۔

دردقوم: سوات کوہستان کے علاقوں میں بسنے والی کوہستانی قوم کو دردی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا سنسکرت ادب میں دارد یا درد کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اور اِن کا یہ ذکر سنسکرت کی رزمیہ نظموں میں بھی ملتا ہے۔ یونانی محقق بطلیموس انہیں دردی اسٹرابو، دردی نوناس، دردائے اور ڈایا کہتا ہے اور نیساسی انہیں دردنائی کہتا ہے۔ یہ دردی لوگ وہی ہیں جن کے وطن کو دردستان کوہستان کہا جاتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے سوات کوہستان، دیر کوہستان، چترال کوہستان اور انڈس کوہستان میں موجود تھے اور ان کی آمد کا زمانہ تقریباً 2200 قبل مسیح کا ہے اور ایک قوم ڈوم کی جو شناخت کی گئی ہے یہ لوگ اسی قومیت کے حامل ہیں۔ جب آریہ اِن کے وطن میں آئے تو یہ مختلف پہاڑی علاقوں میں پھیل گئے۔ یہ لوگ ابتدائی طور پر سورج کے دیوتا بنا کر انہیں پوجا کرتے تھے بعد میں مختلف ستاروں کے ناموں سے بھی اِن کے دیوتا ایجاد ہوتے رہے اور یہ لوگ اِن کی پوجا پاٹ کرتے رہے۔

اِن کے بارے میں پروفیسر ابراہیم عطائی لکھتے ہیں کہ آزاد کوہستان میں ایک قبیلہ رہتا تھا جسے کوہستانی کہا جاتا ہے جو اپنی زبان رکھتا ہے اور اپنے آپ کو قریش کہتا ہے لیکن دیگر روایات کے مطابق یہ آریائی نژاد ہیں جو سکندر اعظم کے وقتوں سے اِن پہاڑوں میں آباد ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کا تعلق کوہی یاکشن کے کناروں سے ہے جو پہلے نعمان اور پھر کونڑ میں رہتے تھے اور وہاں سے آ کر چترال میں آباد ہوئے۔ ہیروڈوٹس کی محققانہ رائے کے مطابق یہ دردی لوگ ہیں۔ موجودہ دور میں بہت کم لوگوں کو درد اور دردی کا علم ہے، یہ لفظ درد نہیں بلکہ دراد ہے اور یہ لفظ سنسکرت زبان کا ہے جس کے لغوی معنی بھیانک، ڈراؤنا، اور خوفناک کے ہیں۔ ازمنہ قدیم ہی سے ان کے چار گروہ تھے، شین، یشکن، کمین اور ڈوم۔ بعض محققین کی رائے ہے۔ یہاں کی قدیم آبادی کمین اور ڈوم کی تھی بعد میں کسی وقت شمالی دروں سے ایک نئی قوم حملہ آور ہوئی جو یشکن قوم تھی جنھوں نے قدیم باشندوں کو اپنے زیرِ تسلط کر لیا اور ایک حکومت کی بنیاد ڈالی۔ کافی عرصے بعد چین قوم موجودہ ہزارہ، سوات اور دیر کوہستان میں داخل ہوئی جہاں یشکن قوم آباد تھی۔ اِس نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکے اور فاتحین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ نتیجتاً یشکن قوم پیچھے ہٹتی ہٹتی شمال کے بلند و بالا پہاڑوں کی دشوار گزار گھاٹیوں اور وادیوں میں پناہ گزین ہوئی۔

پروفیسر فریڈرک کا کہنا ہے کہ سوات کوہستان کالام، سوات کوہستان تور دال اور انڈس کوہستان والے تمام درد ہیں جو کہ محمود غزنوی کے سوات پر حملہ آور ہونے کے بعد مسلمان ہوئے۔

قاشقار: سوات کوہستان کی وادیوں، اوشو، مٹلتان، درگاہ، بلوگاہ، برموٹلی اور اریائی کے باشندے چترال کی ایک قدیم قوم ہیں جو کہ مہتران چترال کی طرف سے علاقہ بدر کئے جانے پر یہاں آکر مقیم ہو گئے اور ان علاقوں کی زمینوں کو آباد کیا۔ ہوتا یوں تھا کہ جب بھی چترال کے شاہی خاندان کے حکمران لوگ جنہیں مہتران چترال کہتے ہیں، جب نچلے طبقوں سے ناراض ہو جاتے یا ان سے بغاوت کا خطرہ محسوس کرتے تو یہ ان طبقوں کو علاقہ بدر کر دیتے یا ایسے حالات پیدا کر دیتے کہ یہ طبقے مجبور ہو کر اپنے علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف اپنی جائے پناہ کی تلاش میں نکلتے۔ قاشقار طبقہ بھی ایسے ہی مغلوب طبقوں میں سے ہے۔ پرویش شاہین نے ان کے معاملے میں جو تحقیقی رپورٹ دی ہے اس کے مطابق قاشقاریوں کا کہنا ہے کہ وہ ان متذکرہ علاقوں میں گزشتہ تیرہ پشتوں سے چلے آرہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شروع میں پانچ افراد یہاں اوشو کی وادی میں آئے تھے یہ چترال کے جن علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ان علاقوں میں، لشکوہو، بونی، مستوج، اور لاسپود کے علاقے ہیں، ان علاقوں کی نسبت سے ان کو قاشقاری کے علاوہ چترالیان بھی کہتے ہیں، چونکہ یہ لوگ چترال کے علاقوں سے یہاں منتقل ہوئے اور ان علاقوں میں پہلے ہی سے موجود ردی، کوہستانی لوگوں سے گھل مل گئے تو ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا چنانچہ انہوں نے غالباً اپنی چترالی اور ان کی کوہستانی زبان کی آمیزش سے ایک نئی زبان یا بولی اختراع کی جسے قاشقاری زبان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ وادی اوشو میں چوتھائی حصے میں قابض ہیں۔ ان کے علاقوں میں مشہور دو جھیلیں ہیں ان میں ایک میوڈنڈ ہے اور دوسری شندور ڈھنڈ ہے۔

قوم کہو: سوات (مالاکنڈ) ریجن کے علاقہ چترال کی قدیم ترین قوم کہو ہے اور ان کے خطے کا قدیم نام کہوستان ہے اور زبان کہوار ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باشندے شمال نے قراقرم اور جنوب سے ہندوکش کے علاقوں سے جائے پناہ کی تلاش میں نکلے تھے۔ وہ باشندے جو کہ شمالی اور جنوبی اطراف سے آئے وہ جنگ وجدل اور انتشار کی زندگی سے تنگ آکر اس علاقے میں پہنچ گئے۔ شمال سے آئے ہوئے باشندے چترال کے علاوہ گلگت اور ہنزہ میں بھی آباد تھے جبکہ جنوبی حصے سے آئے ہوئے یہ امن پسند لوگ چترال کے علاقوں، آرندو، دروش، باشقار، کوہستان اور ترست اسمار میں آباد ہو گئے۔ شمال کی طرف سے آئے ہوئے باشندے زیادہ تر ترکستان اور بدخشاں کی تہذیب و ثقافت ساتھ لے کر آئے اس لئے یہ لوگ نسبتاً مہذب اور متمدن ہیں۔ چترال کے علاقوں، توریکہو، مولیکہو اور مستوج میں یہ لوگ آکر آباد ہوئے تو ان کی تہذیبی نسبت سے یہ علاقے بھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھے۔ چترال کے یہ لوگ جسمانی طور پر خوبصورت اور نازک اندام ہیں مگر اندر سے بڑے مضبوط، توانا اور تنومند ہیں۔ مذہب میں بڑے راسخ العقیدہ لوگ ہیں۔

کیلاش: کیلاش قوم اصل میں لفظ کلش کا مبدل ہے۔ یہ کیلاشی باشندے چترال کے جنوب اور دریائے چترال کے دائیں کنارے کے مختلف مقامات پر اپنی جداگانہ ثقافت اور طرزِ بودوباش و معاشرت کے ساتھ کافر قوم کی حیثیت سے صدیوں سے موجود ہیں۔ کیلاشیوں کی آبادی کا نصف حصہ وہ ہے جو اپنے آپ کو یونانی النسل متعارف کرواتا ہے اور نصف حصہ کوہستانی ہے۔ یہ کیلاشی لوگ سال میں دو تین مرتبہ قدرتی آفات کے موقع پر جمع ہو کر دعائیں کرتے ہیں اور مخصوص گیت گاتے ہیں اور گائے اور بکری کی قربانی کرتے ہیں۔ خصوصاً ان کی فصلوں کے پکنے کے دن ہوتے ہیں تو یہ خدا سے وعدے کرتے ہیں۔

آدم زادے: چترال میں ازمنہ قدیم سے یہاں کے باشندے دو تین طبقوں میں تقسیم تھے، ایک طبقے یا فرقے کو آدم زادہ کہا جاتا تھا۔ اس طبقے کے لوگ شاہی خاندان کے افراد تھے یا پھر شاہی خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مختلف شاخیں ہوتی تھیں، ان طبقوں میں آنے والے وہ لوگ بھی تھے جو علاقے میں باعزت مقام کے حامل تھے اور اخلاق اور تہذیب میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ چترال میں اب بھی ان اوصاف سے متصف لوگوں کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے، یہ شائستہ اور مہذب لوگ کہلاتے ہیں۔

یغت: عام لوگ ہیں اور جن امور کی انجام دہی آدم زادے کرتے تھے یغت ان امور کی انجام دہی میں شامل نہیں ہوتے تھے، مگر اب یہ فرقہ بندی بتدریج ختم ہو چکی ہے۔

اُریت: یہ وہ لوگ تھے جو کہ آدم زادوں کی ملکیتی زمینوں پر بطورِ مزارع کام کرتے اور ان کی خدمت گزاری کرتے۔

خانہ زاد: یہ وہ طبقہ ہے جو غلامانہ اور محکومانہ زندگی گزارتا اور اپنے آقاؤں کی خدمت کرتا تھا۔ ان لوگوں کو ان کی مالی حیثیت کے پیشِ نظر حکومتی واجبات سے بری

الذمہ کیا جاتا تھا۔ ان کا کام صرف اور صرف خدمت گزاری ہوتی تھی۔

باشگلی: تاریخ جن اقوام کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے ان میں باشگلی چترال کی وہ قوم ہے جو ابتداً مشرقی افغانستان کی قوم تھی۔ افغانوں نے جب دسویں صدی ہجری میں انھیں اپنے علاقوں سے نکال باہر کیا تو وہ باشگل پہنچ گئے اور پھر باشگل کے وہ کلاش باشندے جو اقلیت میں اور کمزور تھے وہ ان نقل مکانی کرنے والے افغانی باشندوں سے مغلوب ہو گئے تو وہاں سے بھاگ کر چترال پہنچ گئے اور یہاں چترال آ کر جنوبی اضلاع پر قابض ہو گئے اور آج تک یہیں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ باشگل ایک گاؤں کا نام تھا جو کہ اصل میں بازگل تھا جو بازگل سے باشگل ہو گیا اور پھر آس پاس کے علاقے بھی اس گاؤں کے نام سے متعارف ہوئے اور ایک وسیع و عریض خطہ باشگل کے نام سے موسوم ہو گیا اور ان حدود میں رہنے والے لوگ باشگلی کہلائے۔ باشگل کے شمالی علاقے 1530ء میں ریاست چترال میں شامل ہوئے۔ ان علاقوں کو محمد بیگ نے فتح کیا تھا اور محمد بیگ ہی چترال کے شاہی خاندان کا بانی تھا۔

رئیس: تاریخ بتاتی ہے کہ 1320ء میں ایک غیر ملکی سردار نادر جو غالباً ترکستان کا رہنے والا تھا سرزمین چترال میں وارد ہوا اور سابق حکمران کو شکست دے کر جنوبی چترال فتح کر لیا اور پھر اپنا لقب رئیس رکھ کر خاندانِ رئیسہ کی بنیاد رکھ دی جنھوں نے ان علاقوں میں 1595ء تک حکومت کی۔

اسماعیلی سادات: ریاستِ چترال کے اکثر علاقوں میں بسنے والے باشندے اسماعیلی سادات کے فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرسید سلطان محمد شاہ آغا خان اور اس کے جانشینوں کے پیروکار ہیں۔ مرزا احمد غفران مصنف تاریخ چترال کے بیان کے مطابق وہ الموت خراسان کے سلاطین کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرقہ اسماعیلیہ کے لوگ زیادہ تر گرم چشمہ لٹکوہ کے مقام پر اور علاقہ مستوج اور بونی اور لاسپور میں ہیں، اس کے علاوہ بھی چترال کے گرد و نواح میں یہ لوگ اپنے عقائد کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ گرم چشمہ میں ان کا عبادت خانہ بھی ہے۔ بونی میں موجودہ اسماعیلی فرقہ کے پیشوا آغا خان کا محل بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ سید رضا تھے۔ جنھوں نے چترال کے علاقہ سنوغر و مستوج مین اسماعیلی مولائیہ مذہب کی اشاعت و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا اور بعض حصّوں کی پیشوائی بھی کرتے رہے۔ تاریخی شہادت یہ ہے کہ علاقہ مستوج کے لوگوں میں مذہب اسماعیلیہ مولائیہ کی ترویج 1320ء میں تاج مغل سردار نے کی جو علاقہ یارقند سے آیا تھا اور پھر یہاں سے گلگت جا کر اس اسماعیلی فرقہ کی تبلیغ و اشاعت کی۔

قاضی: چترال میں قاضی خاندان کا مورثِ اعلیٰ ملا دانشمند ستاقی ہیں جن کی اولاد قاضیانِ چترال کے نام سے موسوم ہوئی۔ ملا دانشمند ستاق رئیسانِ چترال کے عہد میں بدخشاں سے چترال آئے تھے اور انھیں رئیس چترال کی طرف سے قاضی القضاۃ کا منصب تفویض ہوا۔ چترال میں اس خانطان کے افراد مختلف رئیسان و مہترانِ چترال کے عہد میں اسی معزز و معتبر منصب پر فائز ہوتے رہے اور قاضیانِ چترال کے اعزاز سے متصف رہے ہیں۔

کٹور: یہ قوم کابل اور چترال کے درمیانی علاقوں میں نہایت شان و شوکت اور تمکنت کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کی شان و شوکت اور آن بان سے چترال کے لوگ بڑے مرعوب تھے اور جب کسی شخص یا خاندان کی شان و شوکت کے چرچے عام ہو جاتے تو یہاں کے لوگ انہیں کٹور، یا کٹوریہ خاندان کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے۔ جب چترال میں رئیس خاندان زوال پذیر ہو گیا تو محترم شاہ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر چترال پر غالب آ گیا اور اپنی شان و شوکت کے ساتھ تختِ چترال پر متمکن ہوا۔ اس کی طاقت، شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کے پیش نظر چترال کے لوگوں نے اسے کٹور کا لقب دیا۔ یوں یہ خاندان کٹوریہ کے لقب کے ساتھ مشہور ہوا، اس خاندان نے چالیس سال تک چترال پر حکومت کی۔

یوسفزئی: یوسفزئی پٹھان ایک ایسی قوم ہے جس نے سوات اور دیر (مالاکنڈ ریجن) کے علاقوں میں اپنے حسنِ انتظام اور اخلاق و تہذیب کی بدولت پختون تہذیب و ثقافت پر وہ اثرات چھوڑے ہیں کہ جن کے تذکرے کے بغیر اس علاقے کی تہذیب و ثقافت مکمل نہیں ہو سکتی۔ سوات اور دیر یوسفزئی پختونوں کا علاقہ ہے۔ سوات میں یوسفزئی قوم کی ذیلی شاخوں میں معروف تین اقوام ہیں ان میں پختون، سید اور ملا، منگورہ اور ملحقہ علاقوں میں موجود ہیں۔ پختون یوسفزئی مندڑ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ شستہ پشتو زبان بولتے ہیں۔ ان میں ملا، میاں اور قاضی کے نام سے مشہور اور باعزت گھرانے ہیں جبکہ سید بھی منگورہ اور آس پاس کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملا، قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ان کا جد امجد شیخ طاؤس تھا۔ اس کی اولاد میں محمد اکبر نامی عہدہ قضاۃ پر فائز ہوئے اور ملا بابا کے نام سے مشہور ہوئے منگورہ میں ملا بابا کے نام سے ایک روڈ بھی ہے۔ ان کی اولاد قاضی خیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ انہیں کے نام سے منگورہ میں قاضی سٹریٹ بھی ہے۔ ملا

بابا کے مسند نشین پیر صالح اور پھر ان کے جانشین حیدر مشہور ہوئے۔ اب ان کی اولاد صاحبِ حق کے نام سے معتبر شناخت رکھتی ہے۔

ورزی لائق دی بابوزئی: ان میں بابوزئی بڑی شاخ ہے جس کی ترتیب ذیلی شاخوں میں کچھ اس طرح ہے، موسیٰ خیل، بامی خیل، حقداد خیل، میر خان خیل، فتح خان خیل، عیسیٰ خیل، جلوخیل، غزنی خیل، جنکی خیل۔

غزنی خیل کے لوگ خوازہ خیلہ،، جانو، تنگر شال پین اور آس پاس کے علاقوں میں آباد ہیں۔ جنکی خیل کے لوگ میاں دم، گاشکور، پیا، جڑے اور فتح پور کے علاقوں میں آباد ہیں۔ فتح پور کا قدیم نام بے تئی تھا۔

والیانِ سوات: ریاست سوات پر جن لوگوں نے حکومت کی اور اہلِ سوات کو ایک نئی تہذیب و تنظیم سے آشنا کیا انہیں والیانِ سوات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان والیانِ ریاست سوات کا تعلق مہمند قوم کے صافی قبیلہ سے تھا۔ صافی قوم میں سے ایک شخص عبدالواحد سوات کے شموزئی قبیلہ میں آباد ہوا۔ اس کے ہاں 1784ء میں ایک سعادت نصیب لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالغفور رکھا گیا۔ یہی وہ خوش نصیب فرزند تھا جو بعد میں سوات کے ''باباجی'' اخوند صاحب یا سید بابا کے مبارک القاب سے مشہور ہوا۔ ابتداء ہی سے ان کی رغبت روحانیت اور سلوک و طریقت کی طرف تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے سے حاصل کرنے کے بعد مردان کے علاقے گوجر گڑھی میں تشریف لے آئے اور یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد روحانی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے حضرت شیخ رحمکار المعروف کاکا صاحبؒ کے مزار پر چلہ کشی کی اور پھر اپنے ہمعصر بزرگ پشاور کے حضرت جی باباؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت کاملہ سے فیوض و برکات حاصل کیں اور اس کے بعد صوابی کے علاقے تورڈھیر آ گئے۔ وہاں مولانا محمد شعیب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چالیس سال تک روحانی تربیت کے مقامات طے کرنے کے بعد مردِ کامل کے مقام پر فائز ہوئے اور اپنے وطن سوات چلے آئے اور یہاں سیل بانڈی نامی گاؤں میں قیام کیا۔ یہاں پر نیک پی خیل گھرانے میں شادی کی اور پھر مستقلاً سیدو میں آ کر آباد ہوئے اور ان کی شہرت اخوند بابا اور سیدو بابا کے نام سے ہونے لگی، لوگوں میں عزت و افتخار کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ انہوں نے 1877ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد میں شدید اختلافات رونما ہونے لگے۔ ان اختلافات کا فائدہ نواب دیر نے اٹھاتے ہوئے سوات پر حملہ کر دیا۔ اس وقت سوات پر ان کے مخالف سید عبدالجبار کا اقتدار تھا چنانچہ نواب دیر کے حملے میں سید عبدالجبار کو شکست ہوئی تو پھر لوگ میاں عبدالودود کی طرف متوجہ ہوئے مگر اس عرصے میں کچھ اور لوگ بھی ریاست سوات پر حکومت کرنے کے دعویدار ہوئے۔ ان میں شموزئے قبیلہ کے دارمئے خان، حقداد خیل میں سے جمروز خان، شیرین خان اور سید گل قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے سید گل کارئی، جانبیل اور پرونڑاں کے علاقوں میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور سید زادے بھی تھے جبکہ باقی تمام لوگ حادثاتی طور پر قتل ہو گئے اسلئے حکومت عبدالغفور اخوند باباؒ کے پوتے میاں گل عبدالودود کے سپرد ہوئی۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد میاں گل عبدالودود کی خاندانی حیثیت کے پیشِ نظر انہیں اپنا سربراہ مقرر کر دیا اور پھر یوں پورے علاقے میں میاں گل عبدالودود کی ولایت قائم ہو گئی اور پہلے والی سوات کے طور پر مشہور ہوئے۔ ان کی ولایت قائم کرنے میں علاقہ کانا شانگلہ کے دو بھائیوں امیر خان آف برکانا، اور پیر داد خان شاپور نے اور ایک بزرگ مولانا احمد علی المعروف سنڈاکی باباجی نے اہم کردار ادا کیا۔

خاندانِ نوابان: نواب خاندان کے لوگ مالاکنڈ سوات ریجن کے ضلع دیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب دیر کا علاقہ ریاست کے طور پر مشہور ہوا تو 1897ء میں محمد شریف خان کو ریاست دیر کا حاکم بنا کر اسے نواب آف دیر کا خطاب دیا اور یوں اس علاقے میں نوابی دور شروع ہو گیا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا اورنگزیب خان دیر کا بادشاہ بنا تو حکومت ہند کی طرف سے اس کا سالانہ وظیفہ پچاس ہزار روپیہ مقرر ہوا اور نوابی کے خطاب کو اس خاندان کے ساتھ موروثی کر دیا گیا اور پھر جب 1925ء میں شاہجہان خان نواب دیر بنا تو اس کا دور عوام کے لئے پسماندگی کی نحوست لے کر آیا کیونکہ اس نواب نے عوام اور علاقے کو قصداً پسماندہ رکھا اور علم و ہنر کے تمام راستے بند کر دیئے تاکہ کوئی اُس کے لئے خطرے کا باعث نہ بنے۔ لوگ اس دور میں محکومی اور ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

نوراخیل اور شاہی خیل: یہ دو ایسی ذیلی قومیں ہیں جن کا تعلق یہاں کی پختون قوم یوسفزئی سے ہے۔ یہ دونوں قومیں یوسفزئیوں کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان اقوام کے لوگوں میں تعلیم کے فروغ کی وجہ سے پرانی روایتی اور ثقافتی حیات کے طور طریقے باقی نہیں رہے اور بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے بموجب انہوں نے تمدنی اور تہذیبی زندگی کے نئے حالات کے اثرات قبول کر لئے ہیں اور ان کی بود و باش میں نئی تہذیب کے خدوخال ملتے ہیں۔

وش خیل: یہ خیل بھی علاقہ دیر کی قدیم پختون قوم یوسفزئیوں کی ذیلی شاخ ہے۔

وش خیل قوم کے لوگوں میں اب بھی قدیم روایتی اور ثقافتی زندگی کے خدوخال پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً مہمان نوازی اور میل جول میں پرانی روایات و ثقافت کو قائم رکھنے کے پابند لوگ ہیں۔ قالاش میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے۔

مقامی خصوصیات

سیدو شریف: یہ سوات (مالاکنڈ) ریجن کا دارالخلافہ ہے جو کہ مینگورہ شہر کے جنوب میں واقع ہے۔ اس علاقے کی وجہ شہرت حضرت اخوند سیدو بابا کا مزار ہے۔ سیدو کے مقام پر آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ یہ والیانِ سوات کے مورثِ اعلیٰ بھی ہیں۔ 1877ء میں وفات پائی تو اس مقام پر ان کو دفن کر دیا گیا اور ان کا شاندار مقبرہ تعمیر ہوا جہاں زائرین دور دراز سے آکر زیارت کرتے ہیں۔ سیدو کے مقام پر ہی والیِ سوات کا محل ہے۔ یہ مقام زمانہ قدیم سے مشہور ہے اور آس پاس بدھ مت کے کھنڈرات کے آثار بھی ہیں۔ یہاں پر بانیِ سوات بطور ریاست میاں گل عبدالودود کا بھی مزار ہے۔

مرغزار: مینگورہ شہر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر سیدو شریف سے جنوب کی طرف مرغزار سفید محل کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ محل والیِ سوات میاں گل عبدالودود کی گرمائی رہائش گاہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مشہور اور تاریخی پہاڑ ایلم ہے جس کی بلندی تقریباً دس ہزار فٹ ہے۔ یہ محل اب ایک ہوٹل کی صورت میں بدل دیا گیا ہے۔

مالم جبہ: مینگورہ سے بیالیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ مقام سیاحت اور تفریح کے لئے مشہور ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے نو ہزار پانچ سو فٹ ہے۔ سردیوں کے موسم میں کثرت سے برف باری ہوتی ہے اور پورا علاقہ برف سے اٹا ہوتا ہے۔ یہاں سیاحوں کے لئے ایک عالیشان ہوٹل تعمیر کر دیا گیا ہے اور تفریحی چیئر لفٹ بھی لگائی گئی ہے۔

الپوری: مینگورہ سے 63 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پُر فضا قدرتی مناظر رکھنے والا مقام ہے۔ یہ مقام پشتو کے مشہور صوفی شاعر حافظ الپوری کی شہرت کی وجہ سے معروف ہے جو ان کی آبائی سکونت گاہ ہے۔ سڑک کے ساتھ ہی دریائے الپوری کے کنارے حافظ الپوری کا مزار ہے۔ یہ پشتو کے صوفی شاعر اور پورے علاقے میں شہرت کے حامل تھے۔ ان کے مزار کے پاس ہی دریائے الپوری پر رسی کا پل بنا دیا گیا ہے۔

بحرین: یہ مقام سوات کوہستان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ اس کا پرانا اور قدیم نام بھونال تھا اور برانیال بھی کہتے تھے۔ بحرین کا مطلب دو دریاؤں کا آپس میں ملنا ہے۔ اس مقام پر دریائے ورال اور دریائے سوات آپس میں مل جاتے ہیں، اس وجہ سے یہ علاقہ بحرین کے نام کا حامل ہے۔ یہ علاقہ ہر طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ بحرین سے شمال کی طرف سطح زمین بتدریج بلند ہوتی ہے۔

گبرال: سوات کوہستان کا یہ علاقہ نہایت خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں پر گوجر آباد ہیں جو کہ اپنی جداگانہ طرزِ بود و باش اور ثقافتی حیات کے ساتھ بستے ہیں۔

اوڈیگرام: محمود غزنوی 1001ء میں براستہ باجوڑ یہاں پہنچا اور پہلا حملہ اس مقام پر راجہ گیرا کی راجدھانی پر کیا۔ راجہ گیرا، راجہ جے پال کی طرف سے اس علاقے کا گورنر تھا۔ قلعہ اوڈیگرام پہاڑ کی بلندی پر تھا۔ اس پہلے اسلامی لشکر کے حملے کی وجہ سے یہ مقام شہرت رکھتا ہے۔ یہاں پر محمود غزنوی کے وقت کے نوادرات اور آثار پائے گئے ہیں اور اس مقام کے کھنڈرات بھی بہت مشہور ہیں۔

بونیر: بونیر ایک قدیم تاریخی اور ثقافتی کا علاقہ ہے جو اب ایک ضلع ہے۔ اس کی وجہ شہرت سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ کا مزار ہے۔ بونیر میں گدی زئی گاؤں میں پیر باباؒ کا مزار ہے مگر پورا علاقہ بونیر اسی مزار کی روحانی عظمتوں سے وابستہ ہے، اسی لئے پیر باباؒ کو بونیر باباؒ بھی کہا جاتا ہے اور پورا علاقہ بونیر ان سے منسوب ہے۔

بلکان شریف: یہ علاقہ سوات کے ضلع شانگلہ میں ایک گاؤں ہے جس کی وجہ شہرت بزرگ ہستی سید عبدالشکور ملنگ باباؒ کی جائے ولادت کے طور پر ہے۔ سید عبدالشکورؒ المعروف ملنگ باباؒ یوسفزئیوں کے مشہور قبیلے کنداخیل سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد کو ملک احمد شیخ ملی کے زیر انتظام کنداخیل قبیلے کے لئے سوات میں پیر خانہ کے نام سے جگہ دی گئی۔ سید عبدالشکور ملنگ بابا کو بلکان کے گاؤں سے تعلق کی وجہ سے ملنگ باباؒ بلکانی بھی کہتے ہیں۔ آپؒ بلکان میں 1902ء میں پیدا ہوئے، ابتداء ہی سے دینی طریقت و سلوک کی طرف رغبت تھی اور 1935ء میں دہلی میں حضرت علی شاہ صاحب ابدال چشتیؒ کے دستِ حق پر بیعت کی اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ 1976ء میں پشاور میں وفات پائی۔

خال: دیر کا مشہور گاؤں ہے۔ اس کی وجہ شہرت بہترین مالٹے کی پیداوار ہے جو کہ پورے ملک میں نمایاں مقام رکھنے والا پھل تصور کیا جاتا ہے۔ خال کا مالٹا بیرون ملک بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی معاشی زندگی کا دارومدار اسی پیداوار پر ہے۔ مالٹے کے علاوہ یہاں پر پیاز کی بھی کاشت کی جاتی ہے۔

زیارت: علاقہ دیر کے مقام تالاش میں بہت مشہور گاؤں ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے یہاں پر معروف روحانی ہستی حضرت سید جلال الدین جعفری بخاری گنج عالم شہید کا مزار مبارک ہے۔ محمود غزنوی کے اسلامی لشکر کے ساتھ سید جلال الدین یہاں آئے اور تالاش کے مقام پر کفار کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے تو اس مقام پر انہیں دفن کر کے ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا، یہ مقام اسی مقبرے کی وجہ سے زیارت کے نام سے مشہور ہو گیا۔

درہ آئن: دیر کے دروں میں ایک مشہور درہ ''درہ آئن'' ہے۔ اس کی وجہ شہرت ڈھیرے نامی ایک مشہور ثقافتی مقام ہے جو ایک چٹان کی صورت میں ہے۔ اس مقام سے بدھ دور کے آثار ملے ہیں اور یہ مقام گندھارا آرٹ و تہذیب کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تالدوڈھنڈ نامی ایک جنگل بھی ہے۔

دیر خاص: دیر خاص تیمر گرہ کے انتہائی شمال میں تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں ہر قسم کے چاقو اور چھریاں تیار کی جاتی ہیں۔ یہاں کی یہ صنعت پورے ملک میں مشہور ہے۔ اس کے علاوہ سفید ٹوپیاں بھی بنتی ہیں جن پر ریشم اور سفید دھاگے سے بہترین قسم کا ماہرانہ انداز میں کام کیا جاتا ہے۔ سیاح یہ ٹوپیاں بہت پسند کرتے ہیں۔

مقامی کھانے

سوات، دیر اور چترال یہ تمام علاقے ایسے ہیں جہاں پانی کی فراوانی ہے، دریائے سوات، دریائے درال، دریائے پنجکوڑ اور دریائے خزرہ بڑے دریا ہیں جبکہ آس پاس چھوٹے چھوٹے دریا بھی موجود ہیں۔ ان علاقوں میں زیادہ تر برفانی علاقے ہیں جن کی وجہ سے جھیلیں اور آبشاریں بھی موجود ہیں۔ ان علاقوں میں چاول زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کے کاشتکار مکئی کی فصل زیادہ کاشت کرتے ہیں اور ان شہروں اور دیہاتوں میں مکئی کی روٹی زیادہ استعمال کی جاتی ہے اگرچہ گندم کی روٹی بھی کھاتے ہیں، سبزیاں تقریباً تمام علاقوں میں ہر قسم کی پیدا ہوتی ہیں اس لئے ان کی خوراک میں سبزیاں زیادہ پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔

چونکہ ان علاقوں کے اکثر لوگ خصوصاً کوہستان میں رہنے والے مال مویشی زیادہ پالتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دودھ خوب استعمال کرتے ہیں اور دودھ سے مکھن اور گھی بھی نکالتے ہیں، اس لئے ان کی خوراک میں مکھن اور مقامی طور پر بنایا جانے والا دیسی گھی زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو مہمان نوازی کے طور پر یہ دیسی گھی گرم کر کے علیحدہ رکھتے ہیں اور دستر خوان پر مکھن بھی رکھا جاتا ہے۔ شہد اس سارے علاقے کا بہت مشہور ہے اس لئے صبح ناشتے کے وقت شہد کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ کوہستان کے علاقے میں سجل کا ساگ زیادہ پیدا ہوتا ہے اس لئے ان کی سادہ خوراک میں سجل کا ساگ دونوں وقت کے کھانوں میں شامل ہوتا ہے جسے مکئی کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

تھر گشگوگ: سوات کے کوہستانی ماتمی فاتحہ کو تھر گشگوگ کہتے ہیں۔ تھر گشگوگ یعنی فاتحہ خوانی کے بعد اجتماعی خوراک کا اہتمام کیا جاتا ہے جسے کوہستانی لوگ ماخامے کہتے ہیں۔ جمعہ کے دن اس قسم کی خیرات کرتے ہیں، عموماً چاول پکاتے ہیں۔

اُگرہ: یہ مالاکنڈ کے علاقے بٹ خیلہ اور ڈھیرے الہ ڈھنڈ کے لوگوں کا مقامی کھانا ہے۔ اگر رات کو چاول بچ جاتے ہیں تو رات کے بچے ہوئے چاولوں کو صبح لسی میں بھگو دیتے ہیں اور یہ لسی ملے ہوئے چاول صبح کے وقت بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ اس خاص کھانے کو یہاں کے لوگ اُگرہ کہتے ہیں۔

ورسلے: یہ یہاں کے باشندوں کی ایک خاص خوراک ہے۔ موسم بہار میں اُگنے والی جڑی بوٹیوں' اُگاگئے' چلوگئے' شورہ پئے' کاریزہ' شڑے' ڈرپلے' مرغنے' انچا' کرکمان' شڑہ شم' غواگئے' کنگہے' پالگ' دھنیا' ملِ خوازئے' پشترہ' کے پتوں کو خشک کر کے انہیں پیس لیتے ہیں اور پھر ان پسی ہوئی جڑی بوٹیوں کو چاول میں ملا کر پکاتے ہیں، جس سے ان کے علاقے کا یہ خاص چاول مخصوص ذائقے کے ساتھ پکتا ہے۔

لیٹے: گندم کے آٹے کو پانی میں اُبال لیتے ہیں۔ اس ساتھ چمچ ہلاتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ پانی بھی ڈالتے رہتے ہیں' جبکہ گڑ کا شربت اور دیسی گھی دو علیحدہ علیحدہ برتنوں میں ڈال کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر یہ دونوں چیزیں یعنی گڑ کا شربت اور دیسی گھی اس گندم کی لیٹی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس پکوان کو یہ لوگ سرد موسم میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ اس علاقے کی مقوی غذا ہے جسے سردیوں میں ایک یا دو بار کھاتے ہیں۔

اگا کوڈوڈے: یہ بھی اس علاقے کا ایک خاص پکوان ہے جسے اگا کوڈوڈے کا نام دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک خودرو پودا ہے جو اس علاقے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس پودے کو خشک کر کے اسے پیس لیتے ہیں اور پھر اسے مکئی کے آٹے میں ملا کر آٹا گوندھ کر اس کی روٹی پکاتے ہیں اور اس روٹی کو لسی یا چائے کے ساتھ یا سالن کے ساتھ یا ویسے ہی کھاتے ہیں، یہ بھی ایک مقوی غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

غٹے مینجے: گندھے ہوئے آٹے کی خواتین اپنے ہاتھوں سے سویاں بناتی ہیں

اور انہیں خشک کر لیتی ہیں۔ یہ سیویاں پکا کر کھاتے ہیں۔

ورشے: یہ بھی اول الذکر اُگرہ قسم کی بچی ہوئی روٹی ہوتی ہے جسے یہ لسی میں ملا کر بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ خوشحال خان خٹک نے اس ورشے کا ذکر اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔

لسی کی کڑی: ان کے ہاں جو کڑی بنائی جاتی ہے وہ عموماً لسی کی ہوتی ہے جبکہ عموماً دہی سے کڑی بنائی جاتی ہے۔

تبئے: دریا میں سے ایک خاص قسم کا پتھر لیا جاتا ہے جسے یہ لوگ سنگینے کہتے ہیں۔ اِسے آگ میں سرخ کرتے ہیں جب یہ پتھر گرم ہو کر سرخ ہو جاتا ہے تو پکے ہوئے سالن خصوصاً ماش کی دال میں اِس گرم سرخ پتھر کو ڈال دیتے ہیں جس سے ایک خاص قسم کا ذائقہ پیدا ہوتا ہے، اس سالن کو تبئے کہتے ہیں۔

اشیلے: یہ ایک خاص قسم کی روٹی ہوتی ہے۔ گندم کا آٹا بنا لیتے ہیں اور پھر آگ پر توا رکھ دیتے ہیں اور توے پر دیسی گھی ڈال دیتے ہیں اس گھی پر روٹی کا پیڑا رکھ کر اُسے پھیلا دیتے ہیں اور اس طرح یہ خاص قسم کی روٹی تیار ہو جاتی ہے۔

سپورے شیلے: شبقدر کی مبارک رات کو یہ لوگ گڑ کا شربت تیار کر لیتے ہیں پھر اس تیار شدہ گڑ کے شربت میں گھی ملا دیتے ہیں۔ اس گھی ملے گڑ کے شربت میں خشک روٹی بھگو کر کھاتے ہیں اور ساتھ ہی تبرک کے طور پر قریبی رشتے داروں کو بھی یہ شربت بھیجتے ہیں۔

چلم: صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں خصوصاً قبائلی علاقوں کی طرح سوات کے مضافات خاص کر سوات کوہستان، دیر کوہستان، چترال اور بونیر کے بعض مقامات پر لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں چلم کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ گھروں اور حجروں میں چلم کا رواج عام ہے۔ ان کے ہاں آنے والوں مہمانوں کو بھی یہ لوگ چلم پیش کرتے ہیں۔ اس میں خشک تمباکو جلایا جاتا ہے۔

نسوار: ان علاقوں میں اب بہت حد تک چلم کی جگہ نسوار نے لے لی ہے۔ نسوار تیار کرنے کے اب بڑے بڑے کارخانے بن گئے ہیں۔ یہ نسوار بھی تمباکو کو کوٹ کر اور اس میں چھائی ملا کر بنائی جاتی ہے۔ اب سوات کے تمام علاقوں میں اور خاص کر بونیر میں نسوار کا رواج عام ہو چکا ہے اور مہمانوں کو بھی نسوار پیش کی جاتی ہے جو ایک چٹکی نسوار کی منہ میں دبا لیتے ہیں۔

میت کا کھانا: جس گھر میں کوئی مر جائے اُس گھر میں تین روز تک چولھا نہیں جلتا۔ دونوں وقت کا کھانا اور صبح کا ناشتہ قریبی رشتہ داروں کے گھر سے آتا ہے جو ماتمی گھر کے افراد اور وہاں ٹھہرے ہوئے رشتے داروں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ کھانے میں گوشت کا سالن جس میں زیادہ تر آلو ہوتے ہیں اور تنور کی پکی ہوئی روٹیاں ہوتی ہیں جبکہ ناشتے میں پراٹھے اور چائے ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں لسی کا عام رواج تھا۔

سات جمعے کی خیرات: علاقہ سوات کوہستان میں رہنے والے قاشقار باشندوں میں کوئی میت ہو جائے تو وہ سات جمعے کرتے ہیں، اور ہر جمعہ کی رات خیرات کرتے ہیں اور میت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اِسے یہ لوگ اپنی زبان میں ''شوکوار خیرات'' کہتے ہیں اور پھر چالیسویں پر جو خیرات کرتے ہیں اِسے ''ژوبی شیرو'' کہتے ہیں اور پھر برسی پر جو خیرات کرتے ہیں اُسے ''بورن'' کہتے ہیں۔

گوجروں کی خیرات: علاقہ کوہستان کے گوجر باشندوں میں کوئی مر جائے تو میت کے رشتے دار تین دن تک ''شام کی خانک'' کے نام سے خیرات پکاتے ہیں۔ یہ لوگ سات جمعوں تک خیرات کرتے ہیں اور اس موقع پر گائے، بھیڑ اور بکریاں ذبح کر کے ان کا گوشت پکاتے ہیں یا چاولوں میں ڈالتے ہیں۔ یہ خیرات ہر جمعہ کی رات کو ہوتی ہے، پھر چالیسویں کے موقع پر اور برسی کے موقع پر بھی خیرات کرتے ہیں جسے یہ ''تلنیز'' کہتے ہیں اور چالیسویں کی خیرات کو ''چی می'' کہتے ہیں۔

مواں کی رات: کوہستانی گوجروں میں عید کے دن شام کو ایک خیرات ہوتی ہے جسے یہ لوگ مواں کی رات، یعنی مردوں کی رات کہتے ہیں۔ یہ خیرات مردوں کے لئے ہوتی ہے اور اُن کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

پیدائش کی خیرات: جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو گوجروں کے ہاں رشتے دار گھی، کپڑے اور انڈے لا کر ان کی خیرات کرتے ہیں، اِسے یہ لوگ ''نیاری'' کہتے ہیں۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں

سوات، دیر اور چترال کے علاقوں پر نظر ڈالیں تو ان علاقوں میں ہر جگہ گندھارا آرٹ ملتا ہے جو ان علاقوں کی تہذیبی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات بغیر کسی ابہام و شک کے پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے کہ یہ آرٹ ان علاقوں میں ایک مستقل پیشے اور دستکاری کی حیثیت

اختیار کر چکا تھا اور اب تک سوات اور مضافات میں پتھروں، لکڑی اور کپڑوں پر جو کام کیا جا رہا ہے وہ گندھارا آرٹ اور فن کا ہی عکس ہے۔

اس کے علاوہ وہ کوہستانی علاقے جہاں قدیم اقوام آباد ہیں ان میں چاہے دردی، گادری یا گوجر جو بھی ہوں زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہیں کیونکہ انہیں جو زمینیں ملیں وہ کاشت اور فصل کے لحاظ سے بڑی زرخیز ثابت ہوئیں اور انہوں نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس لحاظ سے اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ زراعت اور کاشت ہی کی ضرورتوں کے تابع جن آلات کی ضرورت ہوئی اس کے لئے لوگوں نے مختلف پیشے اپنا لئے جن میں ترکھان، لوہار نمایاں ہیں کیونکہ زمینوں پر کاشت اور زراعت کے لئے لکڑی اور لوہے کے اوزار کی خاطر ان دو پیشوں کو اپنانا بنیادی ضرورت تھی۔ چونکہ یہ لوگ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں لہٰذا ضروری ہوا کہ ان بھیڑ بکریوں کی اون سے کچھ بنایا جائے۔ چنانچہ نہ صرف ان کے مرد بلکہ گھر میں بیٹھی ہوئیں عورتیں بھی بھیڑ بکریوں کی اون سے گھروں میں مختلف دستکاریاں بناتی ہوئی نظر آتی ہیں جن میں نمدے، ازار بند اور سردیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جرسیاں وغیرہ بنانا ان کی مقامی دستکاریاں ہیں۔ ان تمام بنیادی ضرورتوں پر مبنی پیشوں اور دستکاریوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ اس طرح کیا جاتا ہے۔

کسان: زمینوں کی کاشت کے معاملے کو ہم دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں کہ ایک طبقہ زمینوں کا مالک بن کر زمیندار اور ملک بن گیا اور دوسرا طبقہ کسان اور مزارع بن کر چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ ان علاقوں میں اب یہی کسان اور مزارع بھی مناسب زمینوں کے مالک ہیں مگر وہ اپنی زمینوں پر خود کاشت کرتے ہیں اور اب یہ کسان اپنی اولاد کو تعلیم و ہنر کی طرف بھی لا رہے ہیں۔

سواتی دستکار اور دستکاریاں: تاریخ سوات کے تناظر میں گندھارا میں پنپنے والی تہذیبوں اور ثقافتوں کے اجتماع کا کھوج یہاں کے ہنرمندوں اور کاریگروں کی صناعی اور دستکاری سے بھی ملتا ہے۔ یہاں جب قدیم مذاہب کی اقوام نے بسیرا کیا تو ان کی مروجہ رسوم و رواج، ہنر اور دستکاریاں پھلی پھولیں۔ اس سلسلے میں کپڑوں پر نقش و نگار کا ہنر تسلسل سے ترقی پذیر رہا ہے اور اہلِ سوات کی دستکاری اور ان کے نمونے تخلیق میں اپنی مثال آپ ہیں۔ سوات کی مخصوص ٹوپیاں، چغے، دوپٹے، کمبل اور شالیں بہت مشہور ہیں۔ زیادہ تر سواتی خواتین گھروں میں کام کرتیں ہیں اور اکثر گھروں میں کڑھائی اور سلائی کا کام بڑی مہارت سے کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سوات کے کوہستانی علاقے میں دستکاری کا کام شہرت رکھتا ہے۔ یہاں کا گلکاری کا کام بڑا مقبول ہے جو کوہستانی زبان میں چھو چھاں کار کہلاتا ہے۔ یہاں کی خواتین اپنے گھروں میں ایک دوسرے سے تربیت لے کر یہ کام بڑی مہارت سے کرتی ہیں اور دھاگے، ریشم اور اون سے مختلف قسم کی اشیاء تیار کرتی ہیں جو ان کی گھریلو ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ان کی شادیوں میں کام آتی ہیں۔

یہ خواتین اون اور کپڑے پر مہارت سے کڑھائی کا کام کرتی ہیں جن میں چادریں، پاؤں میں پہننے کے لئے جرابیں، ہاتھوں کے دستانے، ازار بند، میز پوش، بنیانیں، جرسی، رومال وغیرہ اور ٹوپیاں، پراندے شامل ہیں۔ اسی طرح دیر کوہستان کی خواتین بھی اس کام میں بڑی مہارت رکھتی ہیں اور نمدے اور ازار بند بڑی مہارت کے ساتھ تیار کرتی ہیں جبکہ سوات کوہستان کی خواتین بکری کے بالوں سے مضبوط اور مقامی قالین بناتی ہیں جنھیں یہ اپنی زبان میں پلس کہتے ہیں۔

گوجروں کے گھروں کی خواتین دستکاری میں بڑی ماہر ہیں۔ یہ خواتین قیمتی اونی شال اپنے ہاتھوں سے بناتی ہیں جسے گوجری میں "پلی" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ خوبصورت دسترخوان، ازار بند اور کرتے پر ریشم کا کام مہارت کے ساتھ کرتی ہیں۔ ان کی عورتیں درختوں کی ٹہنیوں سے خوبصورت ٹوکریاں بھی بناتی ہیں۔

علاقہ دیر کوہستان کی خواتین بھیڑ کی اون سے بہترین قسم کے گھریلو نمدے بناتی ہیں جسے یہ اپنی زبان میں "لمسی" کہتے ہیں جبکہ اون سے جو ازار بند تیار کرتی ہیں اسے یہ لوگ "گوٹ" کہتے ہیں۔

دیر خاص میں دستکار بہترین قسم کی سفید ٹوپیاں بناتے ہیں جن پر ریشم اور رنگین دھاگے کا خوبصورت کام کیا جاتا ہے۔ یہاں کی یہ سفید ٹوپیاں اتنی مشہور ہیں کہ دوسرے علاقوں میں ان کو برآمد کیا جاتا ہے۔ دیر خاص کا بازار ان ٹوپیاں بنانے والے کاریگروں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔

ترکھان: ترکھان کا لفظ اردو، پشتو، ہندکو سب میں برابر ہے جو کہ بڑھئی کیلئے مستعمل ہے۔ ترکھان کی اہمیت سوات مالاکنڈ ریجن کے تمام علاقوں سوات، دیر اور چترال کیلئے برابر ہے اس لئے کہ ان تمام علاقوں میں جنگلات کی اہمیت مسلم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام علاقوں میں بدھ مذہب کا زور رہا ہے اور بدھ عہد میں لکڑی کا کام اور لکڑی پر بدھ تعلیمات کا پرچار چتر کاری اور کندہ کاری کے ذریعے کیا جاتا رہا ہے اور اس عہد سے لے کر آج تک لکڑی کا کام مختلف شکلوں میں شہرت پذیر رہا ہے۔ آج بھی سوات، دیر اور چترال میں لکڑی پر چتر کاری اور کندہ کاری کا کام بہت مشہور ہے۔ لکڑی کا یہ کام گھروں کی تعمیرات سے لے کر گھروں میں آرائش و

زیبائش کے کام تک پھیلا ہوا ہے۔ مینگورہ میں گھریلو تعمیرات کے سلسلے میں دروازے، کھڑکیاں اس طریقے سے تیار کی جاتی ہیں کہ ان پر قدیم گندھارا آرٹ کے مطابق چتر کاری اور کندہ کاری کی جاتی ہے جبکہ چھتوں پر بھی اسی قسم کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آرائشی سامان میں شیر، گھوڑے، گلدان اور دوسری قسم کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں گھریلو ضروریات زندگی سے متعلق لکڑی کی چوکیاں، گھڑونجی، میز، کرسیاں اور فرنیچر کا اعلیٰ سامان تیار کرنے کے لئے مینگورہ میں کارخانے ہیں جہاں بڑی بڑی جدید مشینیں موجود ہیں۔

مینگورہ سے آگے کوہستان کے علاقے میں قدیم دور سے ہی لکڑی کے کام کا بہت رواج تھا اور اب بھی کالام اور مضافات میں متعدد مکانات صرف لکڑی سے تیار کئے گئے ہیں۔ کالام میں جامع مسجد تمام کی تمام لکڑی سے بنی ہے جس کے ستونوں اور چھت پر چتر کاری کی گئی ہے۔ اتروڑ میں بھی بڑی مسجد لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ گوجروں کے علاقے میں بھی ترکھان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے مکانات لکڑی اور پتھروں سے بنے ہوتے ہیں اس لئے گھروں کی تعمیر میں لکڑی کا سارا کام ترکھان کرتا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے علاقوں کی طرح لوہار، کمہار، گلکار، سنار، طبیب، کاشتکار، کان کن، سنگ تراش، جولاہا، موچی، نائی اور قصاب کے پیشوں سے بھی لوگ وابستہ ہیں یہ تمام عمومی پیشے ہیں جن کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

قالین اور نمدہ بافی: بھیڑ، بکری کی اون سے قالین اور نمدے زیادہ تر سوات کوہستان اور دیر کوہستان میں بنتے ہیں۔ چونکہ ان علاقوں میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لئے ان کے ہاں یہ مصنوعات زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔ یہ کام زیادہ تر ان علاقوں کی خواتین گھروں میں کرتی ہیں۔ اون سے گلوبند اور ازار بند بھی بنایا جاتا ہے جو بہت گرم اور مضبوط ہوتے ہیں۔

ملا یا خطیب: سوات میں اسلام آنے کے بعد جس طبقے اور پیشے کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ ملا اور خطیب کا طبقہ ہے۔ یہ مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھاتا ہے اور اسلامی علوم کی تدریس کے فرائض انجام دیتا ہے۔ تنازعات کے فیصلوں میں ملا اور خطیب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ ملا اور خطیب کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا محلے، علاقے اور گاؤں والوں کی اجتماعی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے علاقے کے تمام لوگ اجتماعی چندہ کرتے ہیں یا پھر زمیندار کی فصل میں سے ملا یا خطیب کا حصہ ہوتا ہے۔ ملا علاقے کی تمام مسلمان بچیوں کے نکاح پڑھاتا ہے۔ علاقہ کوہستان سوات میں ملا جو کہ امام مسجد یا خطیب ہوتا ہے اسے اس علاقے کے لوگ زمین کی فصل پر ایک کتول فی نفر دیتے ہیں جو موجودہ وزن کے مطابق ایک چار سیر کے برابر ہے۔

گوجروں کے علاقے میں ملا یا امام مسجد کو ہر فصل پر ہر گھرانہ ایک من غلہ دیتا ہے۔ اس غلے کو ناپنے کے لئے ان کے ہاں ایک خاص پیمانہ ''اوڈی'' ہوتا ہے جو کہ ڈھائی سیر کے برابر ہوتا ہے۔ اس اوڈی سے ایک من غلہ ناپ کر دیا جاتا ہے اور قاشقاد لوگ مولوی صاحب کو دو کتول ہر گھرانے سے غلہ دیتے ہیں جو کہ ڈھائی سیر کے برابر ہے۔ ہر گھرانہ سالانہ غلہ دیتا ہے۔

ادبی سماجی اور ثقافتی شخصیات

ملک گجو خان: ملک گجو خان قبیلہ مندڑ کی شاخ بیزاد خیل سے تھا اور یوسفزئیوں کا سردار تھا جو ملک احمد خان کی وفات (1530) کے بعد تمام یوسفزئیوں کا قائد مقرر ہوا اور اس نے اپنے حسن تدبر اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے یوسفزئیوں کے تمام قبیلوں کو ایک جگہ پر منظم کیا۔ ملک گجو خان میں قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ثقافتی روایات کی نگہبانی کی اہلیت بھی موجود تھی اور ساتھ ہی وہ کتاب و قلم کا شناور تھا۔ ملک گجو خان نے خلیل مہمندوں کے خلاف دریائے شاہ عالم کے مقام پر ایک تاریخی جنگ لڑی جس میں ملک گجو خان کو فتح حاصل ہوئی اور خلیل مہمند اپنے علاقوں کی طرف چلے گئے۔ ملک گجو خان میں اخراجات کے سلسلے میں میانہ روی اس کی تہذیبی زندگی کا ایک حصہ تھی۔ وہ اکثر معاملات میں فیاض بھی تھا جبکہ فیاضی کے ساتھ ساتھ اس میں اخراجات کے سلسلے میں احتیاط کی روش بھی تھی۔ اس سلسلے میں اس کی اس میانہ روروش کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی موجود ہے جو کہ اللہ بخش یوسفی مرحوم نے اپنی کتاب یوسف زئے پٹھان میں نقل کیا ہے۔ واقعہ کچھ اس طرح سے ہے کہ اس کی بہو، مٹہ خان اکوزئے کی بیٹی تھی جو ایک سردار صفت اور مخیر آدمی تھا۔ ایک روز اس کی بہو نے دیکھا کہ ملک گجو خان ایک مرغی کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پٹی باندھ رہا تھا۔ بہو کو یہ منظر بڑا عجیب لگا کہ وہ اس ٹوٹی ہوئی ٹانگ والی مرغی کی مرہم پٹی کر رہا ہے اس کی بجائے اسے ذبح کیوں نہیں کر دیتا۔ بہو کو ملک گجو خان کی یہ حرکت اس کی بخل پسندی کے مترادف محسوس ہوئی اور وہ یہ سمجھی کہ وہ ایک کنجوس آدمی ہے۔ چنانچہ اپنے سسر کی اصل حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے اس نے بطور

آزمائش واویلا مچا دیا کہ اس کے پیٹ میں شدید درد ہے۔ ملک گجوخان کو بھی بہو کے پیٹ کے درد پر تشویش ہوئی اور دریافت کیا کہ اس سے پہلے بھی کبھی یہ شکایت ہوئی اور اگر ہوئی ہے تو کیا علاج کیا گیا تاکہ وہی علاج برائے صحت یابی ہم بھی کریں۔ لڑکی نے کہا: ''اس سے پہلے اسے اپنے والدین کے گھر درد کی یہ شکایت ہوئی تھی تو والدہ نے اسے ایک قیمتی موتی کا دانہ پیس کر کھلا دیا تھا۔'' گجوخان نے فوراً موتیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکالی اور کہا کہ حسب ضرورت اس میں سے موتی نکال کر اور پیس کر اسے کھلا دیئے جائیں اور باقی موتیوں کو بھی پیس کر حفظ ماتقدم کیلئے رکھ لیا جائے تاکہ جب بھی آئندہ کوئی اس قسم کی شکایت ہو تو اسے کھلا دیئے جائیں۔ اس واقعہ سے ملک گجوخان کی خو اور طبیعت کا انداز ہوتا ہے کہ وہ فیاض بھی تھا اور موقع اور محل کے مطابق خرچ کرنے میں احتیاط کی روش کو بھی اپناتا تھا اس لئے کہ وہ قوم کا ایک ذمہ دار نامتوسر دار تھا۔

حافظ عبدالمقتدر المعروف حافظ الپوری: حافظ عبدالمقتدر کا تعلق منگورہ سوات سے 63 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ضلع شانگلہ کی تحصیل الپوری سے تھا اسی بنا پر آپ حافظ الپوری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ حافظ الپوری صاحب دیوان شخصیت اور پشتو زبان کے نامور صوفی شاعر ہیں۔ ان کا روحانی سلسلہ' قادری اور نقشبندی ہے۔

حافظ الپوری کو زیادہ تر لوگ ان کے دیوان کے حوالے سے جانتے ہیں۔ انہوں نے پشتو زبان میں جو اشعار کہے ہیں ان میں لوگوں کو انسانیت سے پیار اور اخلاق عالیہ اپنانے کا درس دیا ہے۔ ان کا دیوان' دیوان حافظ الپوری کے نام سے شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ان کا مقبرہ دریائے الپوری کے کنارے پر واقع ہے۔

پیر صاحب لیونو پیر: اس علاقے کی دوسری نامور اور جانی پہچانی روحانی شخصیت پیر صاحب لیونو پیر میاں کلی والا سارے علاقے میں شہرت کی حامل شخصیت تھے۔

مولانا مختار گل صاحب بلکانی: بلکان اس علاقے میں ایک گاؤں کا نام ہے اور گاؤں کی نسبت سے انہیں بلکانی کہا جاتا ہے۔ ایک درویش صفت عالم فاضل شخصیت کے مالک تھے۔

کند محمد کند: سوات کی نامور ادبی شخصیتوں میں کند محمد کند کا نام ادبی حلقوں میں جانا پہچانا نام ہے۔ کند محمد کند زیادہ تر چاربیتہ اور غزل کی صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ 1966ء میں وفات پائی۔

ولی محمد ولی: علاقہ ڈھیرے الہ ڈھنڈ کا رہنے والا تھا اور کند محمد کند کا بھائی تھا۔ پشتو کا نامور شاعر تھا۔ یہاں کے موسیقار اور گائیک اکثر محفلوں میں ان کا کلام گاتے ہیں۔

اخوند زر دالله: یہ بھی الہ ڈھنڈ ڈھیرے کا رہنے والا شخص تھا اور فی البدیہہ اشعار کہتا تھا پیشے کے لحاظ سے یہ ایک معمار تھا اور شاعری کی طرف رجحان تھا جو اس کا شوق تھا اکثر محافل میں فی البدیہہ اشعار پیش کرتا تھا۔

جشن میلے اور تہوار

عرس حضرت سید علی ترمذی: علاقہ سوات ملاکنڈ کے وہ علاقے جو سوات اور دیر سے متعلق ہیں ان علاقوں میں اگرچہ متعدد بزرگان دین کے مزارات ہیں مگر جیسا کہ ملک کے دوسرے حصوں میں ان مزارات کے عرس ہوتے ہیں اس نوعیت کے عرسوں کا اہتمام نہیں ہوتا صرف ان مزارات پر ان کے سال کے دن میں ختم قرآن پاک اور وعظ کا اہتمام ہوتا ہے اور عقیدت مند حاضری کیلئے آتے ہیں کوئی میلہ وغیرہ نہیں ہوتا البتہ بونیر میں جہاں کہ حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا کا مزار ہے وہاں ان کا عرس پورے جوش و جذبے کے ساتھ ہوتا ہے صوبہ سرحد کے طول و عرض سے پیر بابا کے عقیدت مند مزار پر حاضری کیلئے ٹولیوں کی صورت میں حاضر ہوتے ہیں اور عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

جشن سوما: سوما ایک ایسے پودے کا نام ہے جو سوات کی ایک مشہور پہاڑی جو نوسر کی چوٹی پر اُگتا تھا یہاں پر یہ پودا بڑی وافر تعداد میں پیدا ہوتا تھا جو کہ پورے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں برآمد کیا جاتا تھا۔ یہ پودا ایسا تھا جسے مذہبی تقدس حاصل تھا اور اسلام سے پہلے کے تمام مذاہب کے پیروکار، زرتشتی ہندو اور بدھ مت سب اس پودے کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عہد قدیم میں ہر سال اس پودے کے اگنے کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام ہوتا تھا جس کا نام جشن سوما تھا اس روایتی میلے میں شرکت کیلئے تمام مذاہب کے پیروکار دور دراز کے علاقوں سے آ کر یہاں جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے مذہبی طریقوں سے اس میلے میں شرکت کرتے۔ سوات میں اس روایتی جشن کا بہت چرچا رہا ہے۔ ثقافتی اور روایتی لحاظ سے عہد قدیم کے حوالے سے تاریخ میں اس جشن کا تذکرہ علاقہ سوات کے میلوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس پودے سوما اور جشن سوما کی وجہ سے جو نوسر کی چوٹی کو بھی ایک خاص عقیدت سے دیکھا جاتا تھا۔

فنِ تعمیر اور رہن سہن

پورے سوات کے علاقہ بشمول کوہستان کا علاقہ ایسا ہے جہاں کی قدیم تعمیرات کا زیادہ تر حصہ لکڑی کا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہاں کے جنگلات ہیں یہاں پر درخت بکثرت ہیں اور صدیوں سے لیکر عہد حاضر تک یہاں قدم قدم پر پر درختوں کی بہتات ہے یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے اس پورے علاقے کے باشندوں نے اپنے رہنے اور چار دیواری تعمیر کرنے کیلئے لکڑی کے مکانات تعمیر کئے ہیں جس کی تعمیری صورت یہ ہے کہ لکڑی کے تختے بنا کر لکڑی ہی کی دیواریں بنائیں جاتی تھیں اور پھر اوپر کی چھت کو خیمے کی طرح بنایا جاتا تھا تاکہ بارشوں اور برفباری کے اثرات کم ہوں پرانے مکانات ایسے ہیں جو کہ پہاڑوں پر اوپر نیچے بنائے گئے ہیں۔ عموماً مکان ایک یا دو کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل ہوتا تھا جو کہ آگے سے کھلا رکھتے تھے تاہم وہ لوگ جن کے پاس مال مویشی ہوتے وہ ان مویشیوں' گائے' بھینس' بھیڑوں، بکریوں اور گدھوں کیلئے مکان کے ایک طرف لکڑی کی چھت ڈال دیتے اور آگے لکڑی کے ستون کھڑے کر دیتے تھے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق مکانات تعمیر کرتا۔ اکثر مکانات ایسے ہیں جن کی دیواروں کی لکڑیوں اور ستونوں پر نقش ونگاری کی جاتی جو کہ گندھارا فن تعمیر کا خصوصی پہلو ہے۔ حاجت کیلئے سوات کے شہری اور دیہاتی علاقوں میں گھر کے اندر کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا تھا بلکہ اس مقصد کیلئے لوگ کھیتوں میں جاتے تھے۔ مگر اب یہ حالت نہیں رہی اب ہر گھر کے اندر ہی لیٹرین بنائی گئی ہیں۔ سوات کا قدیم علاقہ ایسا ہے جو کہ کئی ادوار پر مشتمل ہے گندھارا عہد یعنی آریاؤں اور ان سے بھی قبل کی اقوام کا مسکن رہا ہے۔ لہذا جو قوم بھی یہاں وارد ہوئی وہ اپنے اثرات یہاں پر مرتب کرتی رہی ہے سوات کے علاقوں خصوصاً کوہستانی علاقوں اور سوات کے قدیم دیہاتی علاقوں میں اب بھی ایسی قدیم تعمیرات موجود ہیں جن کی وجہ سے سوات کی قدیم ثقافتی تاریخ محفوظ چلی آ رہی ہے۔ تعمیرات میں لکڑی کے تختوں کے علاوہ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ پتھروں کا استعمال ہوا ہے اور پہاڑوں سے پتھر نکال کر ان کی تراش خراش کر کے پتھروں کو اوپر نیچے رکھ کر مکانات کی دیواریں تعمیر ہوئی ہیں۔ تاہم کمروں اور چھتوں پر لکڑی ہی کا استعمال ہوا ہے۔ آپس کے میل جول سے طرز حیات میں یکسانیت پیدا ہوتی گئی اور اسی یکسانیت کی وجہ سے تعمیرات اور رہنے سہنے کے طریقے سواتی ثقافت کی علامت بنتے گئے۔ تعمیرات میں بھی یک رنگی پیدا ہوئی اس یک رنگی نے گندھارا آرٹ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کیونکہ اس آرٹ میں ایسی دلکشی اور جاذبیت تھی کہ ہر قوم نے اس آرٹ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا چنانچہ ہر قوم کے افراد اس آرٹ کے ماہر بنتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سکندر اعظم کے حملوں سے پہلے ہی سے یہ آرٹ یہاں کا قدیم اور مقبول مشغلہ تھا۔ یونانی جب یہاں پر آئے تو انہوں نے بھی اپنی تعمیرات میں اس فن کو استعمال کیا۔ سب سے نمایاں اور اہم بات یہ ہے کہ سوات کے پورے خطے میں بدھ مذہب کی بنیادیں بڑی مضبوط رہی ہیں۔ بدھ مت کے دور میں جو تعمیرات ہوئی ہیں سوات میں یہ تعمیرات کھنڈرات کی حالت میں موجود ہیں۔ ان بدھ عہد کے محلات کو سواتی لوک ماثریں کہتے ہیں یہ محلات یعنی ماثریں' پہاڑوں کی انتہائی بلندی پر بنے ہوئے ہیں جو دور سے تو چھوٹے نظر آتے ہیں مگر جوں جوں پہاڑوں کی اونچائی پر آدمی جاتا ہے ان کا رقبہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ محلات کئی کئی کمروں حوضوں اور کھلے صحنوں پر مشتمل ہیں ان محلات کی دیواریں اتنی مضبوط اور پختہ ہیں کہ صدیاں گزرنے اور ہر قسم کے آندھی' طوفان' برفباری' بارش اور زلزلے کے باوجود یہ اپنی شان و شکوہ کو لئے ہوئے کھڑے ہیں۔

ان محلات کے علاوہ سوات کے اکثر دیہاتوں میں بدھ عہد کے پکوڈے موجود ہیں جو کہ نچلی سطح زمین پر بنائے گئے ہیں۔ ان پکوڈوں کے اوپر بھی اینٹوں کا استعمال ہوا ہے۔

عبادت گاہیں

ان علاقوں میں عموماً جو مساجد تعمیر ہوئی ہیں وہ سب کی سب لکڑی کے تختوں ستونوں کی بنی ہوئی ہیں۔ کالام بازار میں جامع مسجد بہت مشہور ہے۔ یہ مسجد دریائے سوات کے بائیں کنارے پر ہے۔ دریا پر لکڑی کا قدیم اور روایتی پل ہے۔ پل کو بڑے بڑے رسوں کے ساتھ باندھا گیا ہے اور بڑے بڑے لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا ہے۔ پل کے دونوں جانب لکڑی کے بنے ہوئے جنگلے ہیں۔ یہی کالام کا گاؤں ہے جس کے نام سے یہ پورا علاقہ کالام مشہور ہے۔ جہاں مسجد بنی ہوئی ہے اس سے ذرا ہٹ کر کالام گاؤں کے مکانات ہیں یہ مکانات گارے اور پتھر کی دیواروں کے ہیں جبکہ ان میں بھی زیادہ تر تمام لکڑی ہی کا ہوا ہے۔ کالام کی جامع مسجد اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی ہے مسجد میں دیوہیکل لکڑی کے شہتیر ہیں جن پر گندھارا آرٹ کے مطابق کندہ کاری اور چتر کاری کی گئی ہے۔ یہ مسجد بذات خود یہاں کے قدیم ہنرمندوں اور کاریگروں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سوات مالاکنڈ ریجن میں مالاکنڈ ایجنسی کا ایک مشہور اور تاریخی مقام ڈھیری الہ ڈھنڈ کا قدیم گاؤں ہے جو کہ یوسفزئیوں کے سردار ملک احمد خان کا مرکز تھا

جو کہ ایک قلعہ بند قسم کی عمارت ہے۔ یہیں پر یوسفزئیوں کے جرگے منعقد ہوتے تھے۔ ڈھیری الہ ڈھنڈ میں جو مکانات تعمیر ہوئے ہیں وہ یہاں کی روایتی شکل میں ہیں۔ ان مکانات کی تعمیرات میں پتھر اور گارا استعمال ہوا ہے۔ ہر مکان تقریباً دو یا تین کمروں پر مشتمل ہے۔ مکان میں باورچی خانہ ضرور ہوتا ہے جسے یہ لوگ اپنی زبان میں کھڈے کہتے ہیں۔ چند مکانات پر مشتمل ایک محلّہ ہے جس کا علیحدہ علیحدہ نام ہے۔ ہر محلے میں ایک حجرہ بنا ہوا ہے جہاں محلے کے لوگوں کے مہمان ٹھہرتے ہیں جبکہ علاقے کے سردار کا بڑا حجرہ ہوتا ہے۔ حجرے میں حسب ضرورت دو یا تین بڑے کمرے ہوتے ہیں آگے برآمدہ اور پھر نہایت وسیع و عریض صحن ہوتا ہے جہاں چارپائیاں پڑی رہتی ہیں۔ دکانیں مقامی پتھروں اور گارے کی ہیں جن کے آگے لکڑی کے دروازے بنے ہوئے ہیں۔ اکثر دکانوں کے آگے لکڑی کے تختوں کے برآمدے ہیں یہاں پر قدیم ثقافت کی جھلک نمایاں ہے۔ یہاں دش خیل قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ان کے اکثر مکانات پرانی طرز کے ہیں۔ یہ مکانات کچے اور بوسیدہ ہیں جو کہ اونچے ٹیلوں پر بنائے گئے ہیں۔ یہ مکانات ایک منزلہ ہیں۔ چھتوں پر لکڑی کا استعمال ہوا ہے اور گھر کی دیواریں مقامی پتھروں اور گارے کی بنی ہوئی ہیں لوگ سادہ اور بے تکلف بود و باش رکھتے ہیں۔ ان کے گھروں میں تنوری بنی ہوتی ہے اور ہر گھر میں خواتین ان تنوریوں میں روٹیاں پکاتی ہیں۔

قلعہ وڈیگرام: سوات منگورہ کے راستے میں ایک قدیم اور تاریخی گاؤں وڈیگرام ہے جہاں قدیم طرز کے مکانات اب تک موجود ہیں۔ یہاں ہر دور کے قدیم آثار اور کھنڈرات موجود ہیں۔ کچھ عرصہ قبل یہاں پر محمود غزنوی کے عہد کی بنی ہوئی ایک مسجد بھی دریافت ہوئی ہے اور پر پہاڑ روڈ بگرام کا قلعہ اور اس قلعہ کے نیچے ہموار میدان میں بہت بڑے بازار کے آثار ملے ہیں یہاں قدیم دور میں پختہ گلیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ قلعہ میں سیڑھیاں پانی کے تالاب، کھیل کے میدان، عسکری تربیت گاہ، گندے پانی کی نکاسی اور تازہ پانی کی رسد کے تمام انتظامات موجود ہیں۔ قلعہ تک پانی کی رسائی کے لئے مٹی کے اس طرح پائپ بنائے گئے تھے کہ مٹی کے گول گول چھوٹے پائپوں کو ایک ساتھ جوڑ کر اوپر تک پہنچایا گیا تھا اور اس کا دوسرا سرا دریائے سوات کے پانی میں تھا اور دریائے سوات سے یہ پانی اوپر تک پہنچایا جاتا تھا۔

قدیم مسجد: غزنوی عہد کی یادگار مسجد ہے۔ اس مسجد کی دریافت 1985ء میں اٹلی کے ماہرین آثار قدیمہ نے کی جبکہ انہوں نے یہاں کھدائی کے دوران ایک کتبہ دریافت کیا جس پر یہ عبارت درج تھی۔ غزنوی عہد کے امیر نے اس مسجد کی تعمیر کا حکم صادر کیا تھا۔ اس تحریر کی روشنی میں کھدائی کی گئی تو یہ قدیم مسجد دریافت ہوئی چونکہ محمود غزنوی کے ذریعے سب سے پہلے سوات کے اسی مقام پر اسلام کی کرنیں پھیلیں اور اسی عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی جو سوات کی اسلامی تاریخ میں پہلی مسجد ہے۔

سفید محل: سوات کا پُرفضا مقام مرغزار سیاحوں کے قدموں کو کھینچ کر اپنی طرف لاتا ہے۔ یہ مقام سیدو شریف سے آٹھ میل کے فاصلے پر جنوب کی جانب واقع ہے۔ اس مقام کا پرانا نام "مینہ" تھا۔ اس وادی کے پہاڑوں میں قدرتی معدنیات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اس مقام پر سوات کے ریاستی دور کے حکمران' والی سوات کا ایک محل تعمیر ہوا تھا۔ جسے سفید محل کا نام دیا گیا۔ اسے 1935ء میں شروع کیا گیا اور 1941ء میں تعمیر کے آخری مرحلے میں پہنچا۔ یہ محل سوات کے مشہور اور تاریخی پہاڑ ایلم کے دامن میں بنایا گیا ہے اس کی تعمیر کیلئے سنگ مرمر کا پتھر استعمال ہوا ہے اور اس کے بنانے کیلئے ماہر معمار باہر سے منگوائے گئے۔ اس محل میں شمال کی جانب سے داخل ہوں تو ایک خوبصورت سبزہ زار میدان آنے والوں کا استقبال کرتا ہے چمن میں مختلف جگہوں پر سنگ مرمر کے بینچ اور میز بنائے گئے ہیں اس کے مشرق کی جانب نماز کیلئے ایک خوبصورت چبوترہ بنایا گیا ہے۔ داخل ہونے کیلئے شمال کی جانب چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جن کے دائیں جانب سیاحوں اور مہمانوں کے قیام کیلئے کمرے بنائے گئے ہیں۔ سبزہ زار چمن سے تقریباً 4 فٹ کی اونچائی پر محل کی اصلی عمارت ہے جس میں داخل ہونے کیلئے سنگ مرمر ہی کی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب خوبصورت گیلری ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی برآمدہ۔ سیڑھیوں کے بالکل سامنے محل میں داخل ہونے کا راستہ ہے جس کا دروازہ خوبصورت اور چوبدار ہے۔ اندر داخل ہوں تو دونوں جانب کمرے ہیں۔ اس محل میں وہ تاریخی کمرہ بھی ہے جہاں 1962ء میں ملکہ برطانیہ' ملکہ الزبتھ ٹھہری تھیں۔ اس سارے محل میں وہی سفید سنگ مرمر استعمال ہوا ہے جو ہندوستان کے تاج محل میں استعمال کیا گیا ہے۔ محل والی سوات کا گرمائی مقام تھا یہ محل اب ایک ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1983ء سے عام سیاحوں کیلئے اسے کھول دیا گیا اور تب سے یہ اب ایک خوبصورت ہوٹل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اب اسے وائٹ پیلس ہوٹل کہا جاتا ہے۔ اس محل کے پیچھے دائیں جانب بغلی پہاڑی پر سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جہاں سے ایک پہاڑی کے اوپر کی جانب رسائی ہوتی ہے یہاں پر دائیں جانب آٹھ مزید کمرے ہیں جو کہ سیاحوں کے قیام کیلئے ہیں۔ اس کے مشرق کی جانب پھر ایک پہاڑی ہے جہاں سیڑھیوں کے ذریعے پہنچا جاتا ہے

پہاڑی پر خوبصورت کمرے بنائے گئے ہیں کمروں کے آگے چھوٹے چھوٹے سبزہ زار چمن ہیں۔ دائیں جانب ایک چبوترہ پر مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا کا مزار ہے۔

لوک داستانیں اور کہانیاں

چار دوستوں کی کہانی: علاقہ سوات میں صدیوں پرانی ایک ایسی داستان مشہور ہوئی۔ جس کے مطابق چار ایسے دوست کہ جو مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے علاقے میں بیروزگاری کی زندگی سے تنگ آ کر اپنے علاقے سے ہجرت کر کے یہ عزم کیا کہ کسی دوسرے علاقے میں جا کر بسیرا کرنا ہے اور رزق کی تلاش کیلئے ہاتھ پاؤں مارنا ہے ان چار دوستوں میں ایک بڑھئی تھا دوسرا درزی' تیسرا سنار اور چوتھا مولوی صاحب یہ چاروں دوست اپنے علاقے کو خیر باد کر کے حصول روزگار کیلئے نکل پڑتے ہیں اور ایک جنگل میں داخل ہو گئے چلتے چلتے شام ہوگئی نماز کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ جو خورد ونوش کا سامان رکھا تھا وہ کھالیا اور پھر چاروں نے سونے سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ پوری رات سیر کرنی ہے چونکہ جنگل ہے اور جنگل میں رات کی سیر میں ہر قسم کے خطرات بھی موجود ہیں ان خطرات سے بچاؤ کیلئے چاروں دوست باری باری پہرہ دیں گے رات کے پہلے حصے میں بڑھئی پہرہ دے گا دوسرے حصے مین درزی پہرہ دے گا تیسرے حصے میں سنار پہرہ دے گا اور چوتھے حصے میں مولوی صاحب' پس تین دوست سو گئے تو پہلے حصے میں پہرہ کیلئے بڑھئی جاگتا رہا اس دوران بڑھئی نے یہ سوچا کہ ویسے بھی رات گئے تک پہرہ تو دینا ہے کیوں نہ کوئی کام ہی کر لیا جائے۔ بڑھئی نے یہ سوچ کر اپنا اوزار نکالا اور آری سے ایک درخت کاٹ لیا اور پھر اس تنے سے چار ساڑھے چار فٹ کی ایک مورتی بنانے لگا چونکہ یہ سوات کا ایک ثقافتی ہنر بھی ہے اس لئے اس ثقافتی ہنر کے علامت کے طور پر اس نے ایک خوبصورت مورتی تیار کر لی جب مورتی تیار ہوگئی تو بڑھئی کے پہرے کا وقت بھی ختم ہو گیا تو اس نے درزی کو بیدار کیا اور کہا۔ میرے پہرے کا وقت ختم ہو گیا اب تمہاری باری ہے یہ کہہ کر بڑھئی سو گیا اور درزی پہرا دینے لگا درزی نے جب ایک خوبصورت لکڑی کی مورتی دیکھی تو اس نے سوچا کہ رات کا یہ پہر گزارنے کیلئے کیوں نہ وہ اس مورتی کیلئے خوبصورت لباس تیار کرلے چنانچہ اس نے اپنے تھیلے سے کپڑا نکالا اور اپنے اوزار سے اس مورتی کیلئے خوبصورت لباس تیار کرنے لگا لباس جب تیار ہو گیا تو اس نے یہ لباس مورتی کو پہنا دیا جس سے مورتی ایک حسین لڑکی کی طرح دکھائی دینے لگی اس عرصے میں درزی کا وقت بھی ختم ہو گیا تو اب اس نے سنار کو بیدار کیا کہ وہ اس رات کے تیسرے حصے میں پہرہ دے اور درزی خود سو گیا جب سنار کی نظر اس خوبصورت مورتی پر پڑی تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ رات کا یہ پہر گزارنے کیلئے کوئی کام لے۔ چنانچہ اس نے اپنے تھیلے سے ضروری سونا اور چاندی نکالا اور اوزار سے مورتی کیلئے سونے اور چاندی کے زیورات تیار کرنے لگا جب زیورات تیار ہو گئے تو مورتی کو پہنا دیئے جس سے یہ مورتی ایک حسین دلہن کی طرح دکھائی دینے لگی اس عرصے میں سنار کے پہرے کا وقت ختم ہو گیا تو اس نے مولوی صاحب کو اٹھایا کہ اب اس کے پہرہ دینے کا وقت ہے اور وہ خود سو گیا مولوی صاحب نے جب یہ مورتی دیکھی تو حسین وجمیل دلہن کی طرح تھی تو مولوی صاحب نے پانی سے وضو کیا اور عبادت میں مشغول ہو گیا مولوی صاحب کے جی میں یہ بات آئی کہ کاش یہ مورتی ایک جاندار انسان کی طرح کی دلہن ہو یہ سوچ کر اس نے اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر دعا کی تو اللہ کی قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ مورتی میں روح پیدا ہوگئی اور اب یہ مورتی لکڑی کی مورتی نہیں تھی بلکہ ایک خوبصورت اور حسین وجمیل انسانی دنیا کی سجی سجائی دلہن تھی۔ اتنے میں صبح ہوگئی تو مولوی صاحب نے باقی دوستوں کو بھی بیدار کر دیا سب نے صبح کی نماز پڑھی اور یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ان کے سامنے اب انسانی دنیا کی ایک حسین وجمیل دلہن کھڑی تھی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر اب سب نے اس زندہ اور خوبصورت دلہن کو حاصل کرنے کیلئے دعوی جتانا شروع کر دیا اور بڑھئی نے کہا اس پر میرا حق اس لئے ہے کہ سب سے پہلے میں نے لکڑی کو کاٹ کر اور اسے تراش خراش کر کے اسے ایک مورتی کی شکل بنائی اس لئے اس پر میرا حق ہے درزی نے کہا کہ اس پر میرا حق اس لئے ہے کہ میں نے کپڑے سی کر اسے پہنا کر اسے خوبصورت بنا دیا سنار نے کہا کہ اس پر میرا حق اس لئے ہے۔ میں نے اس کیلئے قیمتی زیورات بنائے اور اسے پہنا کر خوبصورت سجی سجائی دلہن بنا دیا پھر مولوی صاحب نے اپنا حق جتاتے ہوئے کہا کہ سب سے بڑا کام تو میں نے کیا کہ میں نے اللہ کی حضور دعا کی تو دعا منظور ہوئی اور اس میں روح پیدا ہوگئی اور یہ ایک بے جان مورتی سے ذی روح دلہن بن گئی ان سب کے مابین یہ جھگڑا ہو ہی رہا تھا کہ اس علاقے کا کوتوال اس طرف آ گیا اس نے چار آدمیوں اور ایک نئی نویلی دلہن کو دیکھا اور ان کے مابین تنازعہ کی حقیقت دریافت کی تو سب نے اپنا اپنا مدعا بیان کیا اس پر توال نے کہا کہ اب اس بات کا فیصلہ تو علاقے کا فرمانروا ہی کریگا ان سب کو حاکم وقت کے سامنے پیش کیا گیا تو سب نے اپنا اپنا مدعا بیان کر دیا حاکم وقت نے ہر ایک کی داستان سننے

کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ یہ جنگل چونکہ میری سلطنت میں شامل ہے اس لئے یہاں پر جو درخت ہیں وہ بھی میری ملکیت ہے اور ان درختوں سے جو کچھ تیار ہوتا ہے وہ بھی میرا ہی ہے اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ یہ دلہن میری ہے۔ بادشاہ کے اس فیصلے کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور آخر کار سب کی محنت اکارت چلی گئی اور فائدہ بادشاہ کو ہو گیا۔

ناگا پالا "اژدہا": کہا جاتا ہے کہ جب سوات کے لوگوں نے بدھ مت کو قبول کر لیا تو سوات کا ایک مشہور راجہ ناگا پالا' دریائے سوات کے دھانے میں رہتا تھا اور وسیع و عریض علاقے کا راجہ تھا اور اسے جادو کے علم پر کامل دسترس حاصل تھی وہ اپنے جادو دوئی زور سے علاقے میں پانی کا سیلاب لاتا تھا جس کی وجہ سے ملحقہ گاؤں زیر آب آ جاتے اور لوگ بے گھر ہو جاتے اور کئی لوگ سیلاب کے پانی میں ہلاک ہو جاتے تھے۔ بستی کے لوگ اس راجہ کی ان حرکات سے بہت زیادہ تنگ آ گئے۔ آخر کار انہوں نے مہاتما بدھ کو یہاں آنے کی درخواست کی مہاتما بدھ اپنی روحانی و ورائی طاقت کے زور پر یہاں تشریف لائے اور اس ناگا پالا' جو کہ اژدھا کی صورت بنانے پر قدرت رکھتا تھا اسے اپنا مطیع و فرمانبردار کر لیا اور اسے ان بستی کے لوگوں کو پر امن رکھنے کی تلقین کی اس پر ناگا پالا نے مہاتما گوتم بدھ سے درخواست کی کہ اسے بارہ سال میں صرف ایک مرتبہ سیلاب لانے کی اجازت دی جائے۔ مہاتما بدھ نے اس کی درخواست پر اسے یہ اجازت دے دی کہ وہ بارہ سالوں میں ایک مرتبہ علاقے میں سیلاب لا سکتا ہے یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر سیلاب آتا تھا اسے چینی زائرین و محققین' ہیون سانگ اور فاھیان بھی دیکھنے آئے تھے اور پھر اس واقعہ کی شہادت ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ٹوچی نے بھی دی ہے اس سیلاب کو کتابوں میں سفید پانی کا نام دیا گیا ہے جسے یونانی زبان میں Sweta یعنی سفید پانی لکھا گیا ہے جو بعد میں سوات ہوا۔ اسی نسبت سے مشہور زمانہ مسلمان مؤرخ البیرونی نے بھی سوات کا ذکر سفید پانی کے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔ البیرونی نے لکھا ہے کہ یہاں کے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس سفید پانی میں بھادو کے مہینے میں مہادیو آ کر نہاتے ہیں۔

رخسانہ اور سکندر اعظم کی داستان عشق: تاریخ دانی سے دلچسپی رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ علاقے دیر و سوات بشمول پشاور ایرانی سلطنت کا ہفت اقلیم یعنی ساتواں صوبہ تھا جہاں پر ایران کا گورنر اگزیارتیس' کی حکومت تھی رخسانہ جسے پشتو زبان میں "رنڑاں" یعنی روشنی لکھا گیا ہے اسی اگزیارتیس کی حسین و جمیل بیٹی تھی جس کے حسن کے بہت چرچے تھے اور بڑے سردار اور رئیسوں کے بیٹوں کی شادیوں کے پیغام اس کے لئے آئے مگر اس نے ٹھکرا دیئے تھے اس سچی اور تاریخی داستان کی شہادت نہ صرف اس علاقے کے محققین و تاریخ دانوں نے دی ہے بلکہ مغربی دنیا کے عالموں نے بھی اس داستان کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یہ داستان سوات ریجن کے علاقے دیر سے متعلق ہے علاقہ دیر کا ایک گاؤں جسے تالاش کہتے ہیں۔ اس گاؤں کے آس پاس سے متعلق یہ سچی داستان عشق سکندر اعظم المقدونی ہے اس داستان کو رنڑاں' یعنی رخسانہ نے اپنی آپ بیتی کے عنوان سے بھی رقم کیا ہے۔

اس کہانی کے مختلف روپ ہیں جو کہ داستان گوئی پر دسترس رکھنے والوں نے لکھی ہیں مگر ایک سینہ بسینہ چلنے والی روایت کے مطابق اس داستان کا نہایت ہی دلچسپ پہلو ہے جو کہ مجھ تک پہنچا ہے۔

سکندر مقدونی' جب دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے اپنی سلطنت سے روانہ ہوا تو اس کے استاد ارسطو نے اسے نصیحت کی کہ بیٹا اس بات کا خیال رکھنا کہ تم بہت بڑی مہم پر روانہ ہو رہے ہو جو کہ تمہارے مصمم ارادے پر مبنی ہے لہذا اس راستے میں اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں عورت کے چنگل میں نہ پھنس جانا کیونکہ عورت حسن کا ایک ایسا جادو ہے جو بڑے بڑے دلیروں اور بہادروں کی راہ میں سد راہ ثابت ہوا ہے بہر حال سکندر جب فتوحات کرتے ہوئے ایرانی سلطنت کے اس صوبے ہفت اقلیم کے علاقہ دیر جسے تاریخوں میں "مساگا" لکھا گیا ہے پہنچا تو یہاں پر اسے بتایا گیا کہ اس صوبے کے ایرانی گورنر اگزیارتیس کی بیٹی نہ صرف اپنے حسن زہد شکن میں بے پناہ شہرت رکھتی ہے بلکہ اپنی ذہانت اور فطانت کے اعتبار سے بھی ممتاز مقام رکھتی ہے پہاڑوں کے دامن میں رنڑاں' یا رخسانہ کا ایک وسیع و عریض سرسبز و شاداب باغ تھا جہاں صبح کے وقت یہ لڑکی سیر کرتی تھی سکندر کو اسے دیکھنے کا موقع نوروز کے تہوار کے موقع پر ملا۔ سکندر نے بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس حسینہ کا نظارہ صبح کے وقت کیا جب وہ اپنے باغ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی سکندر اس کے حسن سحر انگیز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اب فوجیں یہاں پر قیام پذیر ہو گئیں سکندر روزانہ اس کا نظارہ کرتا تھا سکندر نے ابتدائی طور پر شادی کا پیغام اسے بھیجا مگر فوری طور پر رنڑاں نے اس پیغام کو ٹھکرا دیا اس لئے کہ رنڑاں کی نظروں میں سکندر اس کی قوم کا قاتل اور علاقوں کا غاصب تھا ادھر سکندر بھی اپنی دل کے ہاتھوں مجبور و بے بس تھا اس لئے اب فوجیں اس مقام سے آگے بڑھ ہی نہیں رہی تھیں۔ جاسوسوں نے سکندر کے استاد ارسطو کو یہ جانکاہ پیغام دیا کیونکہ یہ فاتح افواج کیلئے بڑی تشویشناک صورت حال تھی ارسطو کو جب یہ پیغام ملا تو وہ بہت غمگین ہوا کہ

دنیا کو زیر نگیں کرنیوالا سکندر خود عورت کے حسن کے آگے بے بس ہو گیا۔ چنانچہ ارسطو یونان سے اپنے شاگرد کو اسی چنگل سے نکالنے کیلئے بڑی تیزی کے ساتھ یہاں پہنچا۔ اس مقام پر پہنچ کر سکندر کی سرزنش کی اور اسے یہ وعدہ یاد دلایا کہ یونان سے فتح مندی کا جذبہ لیکر روانہ ہونے والے سکندر نے ارسطو سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ عورت کے چنگل میں نہیں پھنسے گا مگر یہاں پہنچ کر صورتحال نے کروٹ لی ہے۔ سکندر اس وعدہ کو ہی نظر انداز کر گیا۔ سکندر نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ اپنے استاد سے یہ درخواست کی آپ خود جا کر اس خاتون سے ملاقات کریں اور پھر اس کے حسن و جمال اور انداز تکلم و انداز کو قریب سے دیکھ کر مجھے مشورہ دیں تب آپ کا ہر مشورہ مجھے منظور ہوگا۔

ارسطو نے اس خاتون کو پیغام بھیجا کہ میں ارسطو یعنی سکندر مقدونی کا استاد تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ رخزا یعنی رخسانہ نے یہ درخواست منظور کر لی اور جب ارسطو اس سے ملاقات کیلئے اس کی حویلی میں پہنچا تو اوہ خود اس کے حسن کے جادو سے سحر زدہ ہو گیا اور مبہوت ہو کر اس خاتون کو بنانے والے خالق کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد یہ درخواست کی کہ میں خود یعنی ارسطو ' سکندر مقدونی کا استاد اس کے ساتھ شادی کر کے درخواست کرتا ہوں۔ رخزا نے جب ارسطو کی زبانی یہ عجیب وغریب الفاظ سنے تو سخت حیران ہوئی اور کہا کہ دنیا کے عظیم اور خوبصورت شہزادوں کے اس قسم کے پیغامات کو وہ ٹھکرا چکی اور اب جبکہ دنیا کے وسیع وعریض رقبے کے فاتح اور نوجوان وخوبصورت سکندر کے پیغام کو وہ اہمیت نہیں دے رہی تو آپ ادھیڑ عمر کے شخص کو وہ کیسے قبول کر سکتی ہے ارسطو جو کہ سرمایہ علم وفلسفے کا وارث تھا یوں بولا اے حسن و جمال کی شہزادی یہ ٹھیک ہے کہ سکندر جو کہ علاقوں کا فاتح ہے اس کے پاس تلوار ہے اور تلوار کے ذریعے سے وہ علاقے فتح کر رہا ہے مگر میرے پاس وہ سرمایہ علم ہے جس نے کئی سکندر بنائے ہیں۔ میں اپنے علم کے زور سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہوں۔ سکندر جوان ہے مگر میں اپنے فلسفے کی وجہ سے اپنے سینے کے اندر ایک ایسا دھڑکنے والا دل رکھتا ہوں جو کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا سکندر تاریخ میں لوگوں کی نعشوں سے گزرنے والا حکمران ثابت ہوگا۔ میں لوگوں کے ذہنوں پر حکمرانی کرنے والا ارسطو ہوں۔ اس لئے تجھے اپنے حلقہ عروسی میں شامل کرنے کیلئے درخواست کرتا ہوں۔ رخزا نے ارسطو کی باتوں کو بہت غور سے سنا اور پھر کہا کہ یقیناً آپ کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اب اس شادی کیلئے میری ایک شرط ہے ارسطو نے کہا کہ تمہاری ہر شرط مجھے منظور ہے اس خاتون نے کہا: میں صبح کے وقت اپنے باغ میں ٹہلتی ہوں میرا باغ بہت وسیع وعریض ہے میں تھک جاتی ہوں مجھے ایک گھوڑے کی ضرورت ہے اگر آپ میرا گھوڑا بن سکتے ہیں اور روزانہ صبح مجھے اس باغ کی سیر گھوڑا بن کر اور مجھے اپنے اوپر سوار کر کے کروا سکتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ شادی کیلئے تیار ہوں ارسطو نے اس شرط کو منظور کر لیا دوسرے روز صبح ارسطو باغ میں گھوڑا بن گیا اور رخزا اس پر سوار ہو کر باغ کی سیر کرنے لگی۔

ادھر سکندر اپنے استاد کا منتظر تھا کہ کیا پیغام آتا ہے سکندر کو اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ آپ کے استاد ارسطو تو گھوڑا بن کر رخزا کو سیر کرواتا ہے دوسرے روز سکندر عین اس وقت جبکہ ارسطو گھوڑا بن کر رخزاں کو باغ کی سیر کروا رہا تھا کہ اس کے سر پر اپنے وزراء کے ساتھ پہنچ گیا اور ارسطو سے پوچھا استاد محترم یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے آپ کو کس کام کیلئے بھیجا تھا اور آپ تو اس خاتون کے گھوڑا بن گئے ہیں۔ ارسطو فوراً اٹھا اور سکندر کو برجستہ جواب دیا بیٹا میں گھوڑا اس لئے بنا ہوں کہ اس عورت کی شرط یہ ہے اور پھر میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تیرے استاد ارسطو کو جو کہ دنیا میں ایک بہت بڑا فلسفی ہے اسے یہ عورت گھوڑا بنا سکتی ہے تو تجھ جیسے شخص کو تو گدھا بنا کر رکھے گی پس یہ میں تجھے سبق دینا چاہتا ہوں بہر حال واقعی یہ خاتون اپنے حسن اور ذہانت میں اس قابل ہے کہ سکندر کی ملکہ بنے۔

اس کے بعد باضابطہ طور پر ارسطو کے ذریعے رخزاں یعنی رخسانہ کیلئے سکندر کا رشتہ اس کی والدہ کے ذریعے طے ہوا۔ رخسانہ اور اس کی والدہ نے سکندر کو کھانے کی دعوت پر مدعو کیا۔ سکندر جب اس کے محل میں داخل ہوا تو سکندر کے استقبال کیلئے اس کی والدہ کے علاوہ وہ خود اور محل کی دوسری دوشیزائیں موجود تھیں سکندر اس کے حسن سے بے حد متاثر ہوا اور کھانے کے وقت روٹی کو اپنی تلوار کے ساتھ دو ٹکڑے کر کے اس کے ساتھ شادی کا اعلان کر دیا اور پھر سکندر کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی۔ جب سکندر عراق میں زیادہ شراب نوشی سے فوت ہو گیا اور ساری فوج اور جرنیلوں نے وہیں دفنا کے چھوڑ دیا۔ تو رخسانہ اُس کی قبر پر بیٹھ گئی۔

نیمبولا اور دیمبولا: یہ سوات سے متعلق ایسی دیومالائی قسم کی داستان ہے جس نے بے پناہ شہرت حاصل کی اور آج تک سوات کے بڑے چھوٹے کی زبان پر ہے۔ سوات میں رات کو سوتے وقت بڑی بوڑھیاں اپنے بچوں کو سنایا کرتی تھیں اس کہانی نے اتنی شہرت حاصل کی کہ علاقہ سوات سے نکل کر دیگر پختون علاقوں تک پھیل گئی اور پھر پشتو کے شاعروں نے اس کہانی کو اپنے اشعار میں بھی نظم کیا یہ عجیب وغریب داستان کچھ اس طرح سے ہے۔

علاقہ کشمیر میں ایک بادشاہ تھا جو کہ جنات کا بادشاہ تھا اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نیمبولا تھا اسی کی سلطنت میں ایک سردار تھا وہ بھی جنات کا سردار تھا اس کے

بھی ایک بیٹا تھا اس کا نام دیمبولا تھا نیمبولا اور دیمبولا جو ناموں کی مشابہت کے ساتھ ساتھ ہم عمر بھی تھے دونوں کو تعلیم حاصل کرنے کیلئے مکتب میں داخل کروادیا گیا چونکہ دونوں اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے شان وشوکت کے ساتھ ساتھ نزاکتیں بھی ان میں موجود تھیں گھریلو لاڈ پیار نے انہیں اپنی حدود سے باہر کردیا اور بدمستیوں اور کھیل کود میں زیادہ وقت خرچ کرتے تھے استاد بہت کوشش کرتا تھا کہ یہ پڑھائی میں دل لگائیں مگر وہ پڑھائی سے جی چراتے تھے۔ استاد جب بہت تنگ ہو گیا تو اس نے دونوں کے والدین سے ان کی پڑھائی سے عدم دلچسپی کی شکایت کر دی۔ اس شکایت پر جنوں کے بادشاہ کو بہت طیش آ گیا اور اس نے نیمبولا کو پیٹا۔ نیمبولا نے جب باپ کے ہاتھوں مار کھالی تو اس نے اپنا وطن چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور اپنے ساتھی دیمبولا کو لے کر اپنا ملک چھوڑ کر سوات کے علاقے میں پہنچ گئے سوات میں پھرتے پھراتے ابوعہ کے ایک گاؤں میں پہنچ گیا ابوعہ کے گاؤں کی ایک مسجد میں ملا صاحب بچوں کو تعلیم دیتے تھے جہاں گاؤں کے بچے اور بچیاں درس لیتے تھے ان بچوں میں ابوعہ گاؤں کے ایک خاتون کی بچی بیگم جان بھی شامل تھی۔ نیمبولا نے جب بیگم جان کو دیکھا تو اس لڑکی پر فدا ہو گیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ وہ بھی اس مسجد میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہو کر اس بیگم جان کے پاس رہنے کے قابل ہو گا کیونکہ اب بیگم جان کو دیکھنے اور اس سے راہ رسم بڑھانے کا یہی ایک ذریعہ تھا چنانچہ اس نے دیمبولا سے مشورہ کیا اور پھر دونوں یعنی نیمبولا اور دیمبولا مسجد میں آ کر ملا صاحب کو ملے۔ ملا صاحب جس کا نام ملا بہادر تھا اور سوات ہی کے ایک قریب کے گاؤں نیڑ کا رہنے والا تھا اس نے ان دونوں کی درخواست منظور کر کے انہیں اپنے حلقہ شاگردی میں شامل کرلیا۔ سو اس دن سے انہوں نے ملا صاحب سے درس لینا شروع کر دیا۔

پہلے دن جبکہ درس شروع ہوا اور پھر چھٹی کا وقت قریب آنے لگا تو نیمبولا یہ سوچ کر نڈھال ہونے لگا کہ اب بیگم جان اپنے گھر چلی جائے گی مگر اس کیلئے جدائی کی یہ گھڑیاں ناقابل برداشت ہیں چنانچہ نیمبولا نے ایک ترکیب سوچی تاکہ زیادہ سے زیادہ بیگم جان مدرسے میں موجود رہے اور نیمبولا کیلئے اس کے دیدار کی ساعتیں طویل ہوں یہ سوچ کر نیمبولا نے استاد صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تمام بچوں سے آج کا سبق سن لیا جائے جسے سبق یاد نہ ہو اسے چھٹی نہ دی جائے تاوقتیکہ وہ سب یاد نہ کرلے استاد صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی اس نے سب بچوں سے اس روز کا سبق سنا تو بیگم جان کو یہ سبق یاد نہ تھا اس لئے اب اسے شام تک چھٹی نہ دی گئی مگر جب شام ہونے لگی تو اسے چھٹی مل گئی ادھر نیمبولا کیلئے اس کی جدائی کی یہ گھڑیاں ناقابل برداشت ہونے لگیں۔

اب روزانہ کا یہ معمول تھا اس پر نیمبولا نے دیمبولا سے مشورہ کیا کہ وہ رات کو بیگم جان کے ہاں ٹھہرے گا چنانچہ وہ اپنے جناتی روپ میں رات کو دیمبولا کو لے کر بیگم جان کے گھر چلا جاتا بیگم جان کو بخار ہونے لگا جو دن بدن علاج بسیار کے باوجود زیادہ ہونے لگا اور بیگم جان کی صحت روز بروز گرنے لگی اس کا رنگ زرد ہو گیا اور وہ خود دبلی ہو گئی اس پر بیگم جان کے والدین کو سخت تشویش ہوئی انہوں نے بیگم جان سے ماجرا جب پوچھا آخر وہ کونسی وجہ ہے کہ اسے افاقہ ہونے کے بجائے مرض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ شام ہوتے ہی وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے دو ہم مکتب طالبعلموں کے سائے آتے ہیں اور اس پر منڈلاتے ہیں۔

بیگم جان کے والد نے ملا بہادر کو بلا کر یہ ماجرا سنایا ملا بہادر کو جنات پر قبضہ جمانے کا علم از بر تھا اس لئے اس نے شام کو بیگم جان کے گھر آ کر اس کے پاس چند دائرے کھینچے اور پھر وظیفہ شروع کیا ادھر نیمبولا بیگم جان کے عشق کی بھٹی میں جل رہا تھا اور وہ بیگم جان سے دور نہیں رہ سکتا تھا اس لئے حسب معمول وہ دیمبولا کو لے کر بیگم جان کے کمرے میں داخل ہوا تو ملا صاحب کے پھیلائے ہوئے موت کے جال میں پھنس گیا۔ نیمبولا اور دیمبولا جب گرفتار ہو گئے تو انہوں نے ملا صاحب کے سامنے بڑی آہ وزاری کی مگر ملا صاحب ایک نہ مانا اور انہیں جلا کر بھسم کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا عین اسی وقت نیمبولا کے والدین اور اس کے علاقے کے دیگر جنات وغیرہ یہاں پہنچ گئے اور انہوں نے مل کر ملا بہادر سے ان کی جان بخشی کی درخواست کی مگر ملا صاحب نے ایک کی بھی نہ سنی اور نیمبولا اور دیمبولا کو جلا کر مار دیا جب ملا صاحب نے ان کی جان لے لی۔ تب نیمبولا کے بھائی جو کہ جنات اور پریوں پر مشتمل تھے انہوں نے بھی ملا بہادر کی جان لینے کا مصمم ارادہ کرلیا اور پھر اس تاک میں رہنے لگے کہ وہ کسی طرح اپنے بھائیوں کا بدلہ ملا بہادر سے لے۔ اب ملا بہادر کو بھی اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ ہر وقت وضو اور وظائف کی حالت میں رہنے لگا دوسری طرف یہ پریاں جنات بھی اس کے درپے تھے اور اس تاک میں تھے کہ ملا بہادر کی ذرا سی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس سے اپنے بھائیوں کا بدلہ لیں۔

آخر کار داستان کا اختتام یوں ہے کہ مسلد بہادر ہر وقت باوضو رہنے لگا جسکی وجہ سے جنات کے قابو میں نہیں آ سکتا تھا ایک دن ذرا سی دیر کے لئے اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ تو نیمبولا کی بہنوں نے اُسے شہر اور چھت کے درمیان ٹانک دیا۔ اور اس طرح اُس کی جان لے لی۔ اور اس طرح انہوں نے ملا بہادر سے اپنے بھائیوں نیمبولا اور دیمبولا کے قتل کا بدلہ لے لیا۔

ظہیر الدین بابر اور مبارک بی بی کی داستانِ محبت: شہنشاہ

بابر نے جب یوسفزئیوں کے علاقے پر حملہ کیا تو انتہائی کوشش کے باوجود وہ اُن پر غلبہ نہ پاسکا اور یوسفزئیوں کے قلعہ کو سر نہ کر سکا تو عیدالاضحیٰ کے دن بابر فقیرانہ بھیس بدل کر اس قلعہ کی مضبوطی کو دیکھنے کیلئے نکلا اس جگہ پہاڑ کے دامن میں یوسفزئیوں کے سردار ملک شاہ منصور کا گھر تھا۔ وہاں بہت سے لوگ عید ملنے کیلئے اکٹھے ہو رہے تھے بابر بھی فقیرانہ بھیس میں وہاں جا پہنچا اس نے وہاں ایک خیمے میں شاہ منصور کی بیٹی مبارک بی بی کو دیکھ لیا جو پیکر حسن و جمال تھی۔ مبارک بی بی نے جب فقیر کو دیکھا تو فقیر کی مدد کیلئے اپنی کنیز کے ہاتھ روٹی اور کچھ گوشت بھیجا۔ کنیز جب فقیر (بابر) کے پاس روٹی اور گوشت لے کر آئی تو بابر نے اس سے پوچھا کہ یہ کس نے بھیجا تو اس نے کہا کہ یہ خیرات مبارک بی بی نے بھیجی ہے جو سامنے خیمے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد بابر وہاں سے رخصت ہوا اور روٹی اور گوشت ایک پتھر کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔ بابر جب اپنے کیمپ میں آیا تو بہت پریشان تھا۔ اس نے ملک احمد جو کہ یوسفزئیوں کا سب سے بڑا سردار تھا، اسے خط لکھا کہ میری یہ خواہش ہے کہ وہ مبارک بی بی کو اس کے باپ سے میرے لئے مانگ لے مگر ملک احمد نے اس کام کی فوری طور پر حامی نہیں بھری اور اس نے بابر کو کہا کہ اس سے پہلے بابر کے چچا الغ بیگ اور خان میرزا کی یوسفزئیوں کی لڑکیوں سے شادی ہوئی مگر ان شادیوں کا نتیجہ یوسفزئیوں کیلئے کوئی بہتر نہیں رہا اور یوسفزئیوں کیلئے بربادی اور ہلاکتوں کے سوا اور کوئی بات سامنے نہیں آئی اور اب تو ہمارے ہاں کوئی ایسی لڑکی ہے ہی نہیں جو شادی کے قابل ہو۔ اس کے جواب میں بابر نے اسے وہ تمام واقعات لکھ بھیجے اور ثبوت کے طور پر اس خیراتی روٹی اور گوشت کا قصہ بھی بیان کر دیا اور کہا کہ فلاں پتھر کے نیچے جا کر یہ روٹی گوشت نکال لے۔

آخر کار یہ طے پایا کہ یوسفزئی قبیلوں کا جرگہ بلایا جائے اور اس جرگے کے سامنے یہ مسئلہ رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جرگے نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے بھی مغلوں میں یوسفزئیوں کی بہن اور بیٹیاں بیاہی گئی ہیں تو اب مبارک بی بی کے رشتے سے انکار کا مطلب یہ ہوگا کہ بادشاہ سے دشمنی مول لی جا رہی ہے جو کہ قبیلے کیلئے اچھی بات نہیں، اس لئے جرگہ مبارک بی بی کیلئے بابر کا رشتہ قبول کرتا ہے۔ جرگے کے اس فیصلے کو ملک احمد نے قبول کرتے ہوئے کہا کہ اچھی بات ہے جب آپ سب کے خیال میں قبیلے کی اجتماعی بہتری اس شادی میں ہے تو یہ شادی ضرور ہوگی۔

ملک احمد نے بابر کو رضامندی کا خط لکھ دیا اور ساتھ ہی جرگے کے فیصلے کے بارے میں بھی اطلاع کر دی بابر کو اس خبر سے بڑی خوشی حاصل ہوئی اور اس نے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔ بابر نے دلہن کیلئے قیمتی تحائف بھجوائے جن میں ایک تلوار بھی تھی۔ رخصتی کے وقت ملک احمد اور ملک شاہ منصور دلہن کے ساتھ علاقہ دیر کے گاؤں تالاش تک آئے جہاں شاہی محافظ ان کے استقبال کیلئے کھڑے تھے۔ یہاں سے دلہن مبارک بی بی محافظوں اور کنیزوں کے ساتھ شاہی کیمپ میں لائی گئی۔ کیمپ میں ایک بہت بڑا شاہی خیمہ نصب تھا دلہن کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ شادی کی رات اور دوسرے روز تک شاہی امراء کی بیگمات دلہن کو ملنے کیلئے آتی رہیں۔

ادھر مبارک بی بی نے اپنی کنیزوں کو کہہ رکھا تھا کہ جب بادشاہ اس طرف آئے تو مجھے فوراً اطلاع کریں۔ یہ جمعے کا دن تھا، بادشاہ جب جمعہ کی نماز کے بعد شاہی خیمے کی طرف آنے لگا تو کنیزوں نے مبارک بی بی کو بادشاہ کے آنے کی اطلاع کر دی۔ چنانچہ مبارک بی بی تخت سے اتر کر نیچے فرش پر مودبانہ انداز میں دست بستہ کھڑی ہوگئی اور بادشاہ جب خیمے کے اندر آیا تو انتہائی ادب سے بادشاہ کی تعظیم کی۔ بادشاہ اپنی اس پشتون بی بی کے حسن و جمال سے بے حد متاثر ہوا اور جب اس نے اپنا نقاب اٹھایا تو بادشاہ مبارک بی بی کے حسن کے جلوے سے ششدر رہ گیا۔ اس نے مبارک بی بی سے کہا: اے میری پشتون بی بی! آؤ اور میرے پہلو میں بیٹھ جاؤ مگر وہ آگے نہیں بڑھی۔ اس نے دوسری مرتبہ کہا پھر بھی اس نے قدم نہیں بڑھایا۔ جب تیسری مرتبہ کہا تو اس نے بادشاہ سے کہا: اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی تو مبارک بی بی نے کہا کہ بادشاہ یوں سمجھیں کہ پوری یوسفزئی قوم میرے دامن میں میرے ساتھ آ گئی ہے۔ اس لئے میری خاطر بادشاہ یوسفزئی قوم کے قصور معاف کر دیں۔ بابر نے کہا کہ میں نے تمام یوسفزئیوں کے قصور تمہاری خاطر معاف کر دیئے ہیں اور انہیں تمہاری جھولی میں ڈال دیا ہے اور اب میرے دل میں یوسفزئی قوم کیلئے کوئی خلش نہیں۔ اس پر اس نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور آداب بجالائی۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس تخت پر بٹھالیا۔ اتنے میں نماز عصر کا وقت ہوگیا۔ بادشاہ جب نماز کیلئے تخت سے اٹھا تو مبارک بی بی نے جھٹ تخت سے اتر کر بادشاہ کے جوتے اس کیلئے سرکا دیئے۔ بادشاہ نے جوتے پاؤں میں پہنے اور مبارک بی بی کے اس عمل سے بے پناہ خوش ہوا اور پھر دوبارہ کہا کہ میں نے تمہاری خاطر تمام یوسفزئیوں کو معاف کر دیا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا کہ تمہیں یہ ادب و آداب کی باتیں ملک احمد نے سکھائی ہوں گی۔

لوک ساز، گیت اور رقص

مالاکنڈ سوات ریجن کا خطہ پختونوں کا علاقہ ہے۔ اس لئے یہاں ہر وہ

لوک ساز اور گیت رائج ہیں جو پختونوں کے دوسرے علاقوں میں ہیں۔ ان میں ایسے گیت ہیں جن میں داستان گوئی ہے اور ایسے بھی ہیں جن میں غم اور فراق کا اظہار ہوتا ہے، ایسے بھی ہیں جن میں بہادروں کی شجاعت کا ذکر ہے، لوری کے گیت بھی ہیں، ان گیتوں کی اصناف میں ٹپہ، چاربیتہ، لوری، مذہبی گیت، موت اور جنازے کے گیت اور شادی بیاہ کے گیت اور غزل وغیرہ جن کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

ضرب الامثال

ٹپہ اور چاربیتہ کے علاوہ سوات میں ضرب الامثال بھی گائے جانے کا رواج ہے۔ مثال کے طور پر دریائے سوات کے کنارے علاقہ خوازہ خیلہ کے نزدیک ایک بڑا گاؤں چالیار ہے۔ یہ گاؤں کبھی بڑا گاؤں تھا مگر اس کے پاس دریائے سوات گزرتا تھا۔ دریا کے پانی میں اتار چڑھاؤ رہتا تھا جس کی وجہ سے گاؤں کا بیشتر حصہ جو دریا کے کنارے تھا دریا برد ہو گیا اور یہ گاؤں اپنے حجم اور رقبے کے لحاظ سے چھوٹا ہو گیا۔ اس پر یہ ضرب الامثال بہت مشہور ہوئیں جو کہ اس کے لوک گیت میں شامل ہوئیں۔ یہ ضرب الامثال یہ ہیں۔

ہسے سین چار لیا رتہ ارم شوے دے
سین اخیل کانڑی پہ وخت شادی
دسین کانڑے تے دسڑے ورنہ نے
پیتی صرف دسوات پہ کانڑی پخیگی

سوات کوہستان کے وہ علاقے جہاں گوجر باشندے بستے ہیں ان علاقوں میں خوشی اور غمی دونوں قسم کے گیت گائے جاتے ہیں۔ وہ گیت جو غم سے متعلق ہو اسے یہ اپنی زبان میں ھکا کہتے ہیں اور یہ گیت صرف ان کی عورتیں گاتی ہیں جبکہ خوشی کے گیت مرد اور عورتیں دونوں گاتے ہیں، یہ اپنے گیتوں کے ساتھ جو ساز بجاتے ہیں ان میں بانسری ہے جسے یہ اپنی زبان میں بانجی کہتے ہیں۔ گھڑا جسے یہ اپنی زبان میں منگے کہتے ہیں اور تمبل استعمال کرتے ہیں۔

قاشقاری گیت: سوات کوہستان کا وہ علاقہ جہاں قاشقاری باشندے آباد ہے وہاں ان کی قاشقاری زبان میں جو گیت گایا جاتا ہے وہ یہ ہے:

او تہ علامہ گی کو ۔ تن سورا روپوش ارو
اینگار مہ بے ہوش ارو ۔ تن حسن چراغوں پروانہ
مدہوش ارو ۔ ایگار مہ بے ہوش ارو

ترجمہ۔ جب میں تیرے سلام اور دیدار کیلئے آیا تو تو نے اپنے آپ کو غلاف میں چھپا لیا۔ تمہارے ایسا کرنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔ تمہارے چراغ جیسے حسن نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ تمہارے ایسے کرنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔

پیران تو آنجوش مگر گیروان تو برچور
شورو وگان کی سنائی کنہ چان نوبرچور

ترجمہ۔ قمیص پہنتے وقت جب آستین پہننے لگی تو گریبان کیسے بچے گا۔ کیا خزاں میں کسی درخت پر پتے رہ سکتے ہیں؟

ساز

پختون کے علاقوں میں زیادہ تر رباب اور گھڑا گیت گاتے وقت استعمال ہوتا ہے۔ سوات کوہستان کے علاقوں میں گیتوں کے ساتھ جو ساز استعمال ہوتے ہیں وہ ستار، گھڑا اور شپر ہیں۔

گوجری ساز: وہ علاقے جہاں گوجر آباد ہیں۔ وہاں وہ اپنے گیتوں کے ساتھ جو ساز استعمال کرتے ہیں ان میں:

بانسری: بانسری جسے یہ اپنی زبان میں بانجی کہتے ہیں۔

ستار: یہ ہر گیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

گھڑا: اسے یہ اپنی زبان میں منگے کہتے ہیں۔

تمبل: تمبل ان کا خاص ساز ہے۔ قاشقار علاقوں کے ساز بھی تقریباً اسی قسم کے ہیں۔ ان میں گھڑا، بانسری، ستار اور رباب عام ہے جبکہ ڈھولک بھی استعمال کرتے ہیں۔

سرنے، نقارہ: سرنے اور نقارہ عام ساز ہیں جو اکثر بیاہ شادیوں کے موقع پر بجاتے ہیں۔

لوک لباس، زیورات اور سامان آرائش

جب سوات ملاکنڈ کی ثقافتی زندگی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام ریجن ایسا علاقہ ہے جس میں گندھارا آرٹ ایک مشترک ثقافتی ورثہ ہے مگر اس کے باوجود سوات، دیر اور چترال کی ثقافتی پوشاک و زیورات سے قدرے مختلف ہیں۔

سوات میں قدیم گندھارا دور سے ہی زیورات کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے خاص طور پر سونے کے زیورات کو۔ بعض تاریخی شواہد سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس علاقے سے کبھی سونا وافر مقدار میں نکالا جاتا تھا کیونکہ تبت کا ایک زائر تیرھویں صدی عیسوی میں سوات آیا تھا اور اس نے اس علاقے کی سیر کر کے ایک سفرنامہ لکھا جو کہ تبت کے لوگوں میں بہت مقبول عام ہوا۔ اس سفرنامہ کی وجہ سے اس تبتی زائر کو "آرگیان پا" کا اعزازی نام بھی ملا۔ جس کا ان کی زبان میں ترجمہ سوات کا آدمی ہے۔ اس سے پہلے چینی زائرین فاہیان، ہیونگ سانگ اور سانگ یو یہاں آئے اور انہوں نے اپنے سفرناموں میں لکھا کہ تالو یا پھر تلے لو کی خانقاہوں میں چودہ ہزار سونے کے مجسمے ملے ہیں۔

ان زائرین کے بیان سے یہ بات شہادت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے کہ قدیم دور سے ہی یہاں کے لوگوں میں سونے کی اشیاء بنانے کا رواج عام تھا اور چودہ ہزار مجسمے جو کہ سونے کے بنائے گئے تھے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہاں پر ایسے پہاڑ ضرور موجود تھے جن سے سونا نکالا جاتا تھا اور یہاں کے ہنرمند اور کاری گر سونے کی اشیاء یہاں تک کہ مجسمے بھی سونے کے بناتے تھے۔ اس سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی تک یہاں کے لوگوں میں سونے کے زیورات پہننے کا رواج عام تھا۔ ''مشرق کا سوئیٹزرلینڈ'' سوات کے مصنف محمد پرویش شاہین کے بیان کے مطابق آثار قدیمہ کے ماہر مسٹر نذیر خان نے کہا ہے کہ کھدائی کے دوران اگرچہ سونے کے مجسمے تو نہیں ملے البتہ ایسے مجسمے ملے ہیں جنہیں سونے سے مزین کر دیا گیا تھا۔

سوات میں کندہ کاری سونے اور چاندی کے زیورات میں بھی جھلکتی ہے۔ سوات میں جو لباس بنتا ہے اس میں کڑھائی والے کرتے، تلے دار ٹوپیاں گرم اونی لباس، کمبل، واسکٹ اور خوبصورت شالیں بہت مشہور ہیں۔ ان پر قدیم دور کا ہنر نمایاں نظر آتا ہے۔ شالوں پر رنگدار دھاگے کے ساتھ خوبصورت کام کیا جاتا ہے۔ دھاگے کے علاوہ شیشے کا کام بھی ہوتا ہے۔ سوات کی خواتین یہ شالیں بڑے شوق سے استعمال کرتی ہیں، یہ شالین اونی بھی ہوتی ہیں اور سوتی بھی۔

سواتی یوسفزئی پشتون ہیں۔ اس لئے جب پشتون کے لباس و پوشاک کا ذکر ہو تو سب سے پہلے سواتی پشتون کے روایتی لباس و پوشاک کو ملحوظ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہاں کے مردوں کا لباس عام طور پر شلوار قمیض پر مشتمل ہوتا ہے جو نہایت سادہ اور ڈھیلا ڈھالا لباس ہے۔ علاوہ ازیں کندھے پر چادر ضروری ہوتی ہے اور سر پر پگڑی یا ٹوپی پہنتے ہیں۔ چونکہ پیشہ گری سے ان کے بزرگ منسلک رہے ہیں اور اس روایتی پیشے کو زندہ رکھنے کیلئے سواتی اپنے آپ کو مسلح رکھتے ہیں۔ پہلے عہد میں ان کے پاس تلواریں اور چھریاں ہوتی تھیں اب بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنے پاس پستول یا بندوق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بندوق کے بارے میں ایک مشہور مقولہ ہے:

ټوپک داحنوان کالے دے

بندوق نوجوانوں کا زیور ہے۔

عورتوں کا عمومی لباس: یہاں کی خواتین کا لباس عموماً باحیا اور باپردہ ہوتا ہے اور ان کی عورتیں مذہبی شعار کی پابندی کرتی ہیں۔ اس لئے یہ عموماً باپردہ لباس استعمال کرتی ہیں۔ باہر جب نکلتی ہیں تو ان خواتین کا روایتی پردہ، برقعہ ہوتا ہے جو سر سے لے کر پاؤں تک کو ڈھانپتا ہے۔ اکثر گھرانوں کی خواتین چادریں استعمال کرتی ہیں مگر یہ چادریں بھی اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ ان میں پورا جسم ڈھانپا ہوا ہوتا ہے۔

قبائلی زندگی کے دور میں سواتی خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھیں جس کی وجہ سے ان کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا جس کے اوپر ایک بہت بڑی سفید یا کالی نقطہ دار چادر اوڑھی جاتی تھی جسے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔

عہد قدیم میں روزانہ کی مصروف زندگی میں خواتین زیورات استعمال نہیں کرتی تھیں بلکہ زیورات کا استعمال بیاہ شادیوں کے موقع پر کیا جاتا تھا۔

سوات کے علاقے کالام میں خواتین اور مردوں کا پیرہن قمیض، چادر تاہ یعنی کمبل، شریال شلوار، کین، پٹ کوٹش، اوتر اور بنگی ہے۔ اس علاقے کی عورتیں عام طور پر چاندی کا زیور استعمال کرتی ہیں اور صرف وہ زیور جو کہ ناک میں استعمال کرتی ہیں سونے کا ہوتا ہے۔ ان زیورات میں انگوٹھی، جسے گادری زبان میں رنگوسر کہتے ہیں، نتھ جسے یہ ٹیس کہتے ہیں، بالی جسے یہ کربٹ کہتے ہیں، گلے کا ہار جسے ہاری کہتے ہیں، جھومر جسے یہ جھوٹ کہتے ہیں، پیزوان جسے یہ پیزران ہی کہتے ہیں، پازیب جسے یہ پانزیب کہتے ہیں، چوڑی جسے یہ بنگڑے کہتے ہیں شامل ہیں۔ سوات کوہستان میں جہاں گوجر آباد ہیں ان کی خواتین کا لباس حسب ذیل ہے:

بڑی چادر اور لنگی عام خواتین استعمال کرتی ہیں جبکہ بیاہ شادی کے موقع پر دلہن کا لباس سیاہ چنگر اور ریشمی ہوتا ہے۔

ان کی خواتین جو زیور استعمال کرتی ہیں وہ عموماً چاندی کا ہوتا ہے صرف ناک میں نتھ اور کوکا جو استعمال کرتی ہیں وہ سونے کا ہوتا ہے جسے یہ لوگ کونڈ کہتے

ہیں۔ ہاتھ میں چوڑیاں استعمال کرتی ہیں جسے چوگربان کہا جاتا ہے، ماتھے پر جھومر جسے یہ ٹیک کہتے ہیں، کانوں میں جوزیور استعمال کیا جاتا ہے، اسے موندی کہا جاتا ہے گلے کے ہار کو امیل کہا جاتا ہے اور انگوٹھی کو گوٹھی کہتے ہیں۔ یہ وہ زیورات ہیں جو گوجری خواتین استعمال کرتی ہیں۔ وہ کوہستانی علاقے جہاں قاشقار لوگ آباد ہیں جیسے اوشو اور ملحقہ دیہات، ان کے مردوں کا لباس یہ ہوتا ہے۔

قمیض شلوار: یہ دونوں پہناوے نہایت ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں تاکہ کھیتوں میں کام کرتے وقت یا دوسری مزدوری کے کام کے وقت انہیں آسانی ہو۔ ان کی قمیض عہد قدیم میں نہایت کھلی اور لمبی ہوتی تھی جسے کرتہ کہا جاتا تھا اور گریبان کو ایک لڑی کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔

زنانہ لباس: ان کی خواتین زیادہ تر سیاہ لباس استعمال کرتی ہیں جو لمبے سے کرتے پر مشتمل ہوتا ہے اور اوپر تنگ اور نیچے سے کھلا ہوتا ہے۔

پیران: یہ وہی گول قمیض ہوتی ہے جو ان کی خواتین استعمال کرتی ہیں۔ اسے یہ لوگ مقامی زبان میں پیران کہتے ہیں۔

کیر کی تگی: یہ سر کا پراندہ ہوتا ہے جو کہ ان کی خواتین باندھتی ہیں۔

رکھوائے: بچوں کو جو سر پر ٹوپی بنا کر پہناتے ہیں اسے یہ اپنی مقامی قاشقاری زبان میں رکھوائے کہتے ہیں۔

زیورات: قاشقاری خواتین جو زیورات استعمال کرتی ہیں وہ چاندی کا ہوتا ہے صرف ناک میں جو زیور استعمال کرتی ہیں وہ سونے کا ہوتا ہے۔

کان کرلی ورسینی:

یہ کان میں پہنے جانے والے زیورات ہوتے ہیں جنہیں یہ مقامی زبان میں کان کرلی ورسینی کہتے ہیں۔

بازوگان: یہ گلے میں ڈالنے کیلئے یا سر پر باندھنے کیلئے تعویز ہوتا ہے۔ یہ سب چاندی کے زیورات ہوتے ہیں۔

نسکر وٹیک: یہ ناک میں پہننے کی نتھ اور کوکے ہوتے ہیں جو مقامی زبان میں نسکر وٹیک کہلاتے ہیں اور سونے کے ہوتے ہیں۔

سیاہ لباس: دیر کوہستان کی عورتیں پردہ کی سخت پابند ہیں اور یہ خواتین سیاہ اور کھلا لباس استعمال کرتی ہیں۔ سیاہ لباس پر چادر لئے ہوئے سر سے پاؤں تک کو ڈھانپتی ہیں۔

سفید ٹوپی: دیر میں عموماً مرد سفید ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ دیر خاص میں سفید ٹوپی بنانے والے ہنرمندوں کی متعدد دکانیں ہیں۔ یہاں کی ٹوپیاں بہت مشہور ہیں جن پر ریشم اور رنگین دھاگے کا کام کیا جاتا ہے۔ عام آدمی سے لیکر بااثر لوگ تک سبھی سر پر یہ سفید ٹوپی رکھتے ہیں جو کہ ان کا ثقافتی پہناوا ہے۔

زیورات: دیر کی خواتین جو زیور استعمال کرتی ہیں قدیم زمانے میں یہ زیورات بڑے بھاری بھرکم ہوتے تھے۔ زیادہ تر یہ زیورات چاندی کے ہیں۔ ان میں تعویز، گلے کا ہار، جھومر اور بڑی بڑی موٹی انگوٹھیاں اور پازیب شامل ہیں۔

یہاں کی خواتین میں اب تک چاندی کے زیورات کا استعمال عام ہے۔ پہلے نیکلس، پازیب اور ناک کی نتھ اور کوکا زیادہ استعمال ہوتا تھا اب زیادہ تر صرف ہار، ناک میں کوکا اور کانوں میں جھومر استعمال کئے جاتے ہیں البتہ ہار کا استعمال عام ہے۔

لوک کھیل تماشے

صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں کی طرح سوات ملاکنڈ ریجن کے مختلف حصوں میں بھی کھیل نمایاں ثقافتی پہلو ہے۔ عہد حاضر میں بہت حد تک علاقائی لوک کھیل اب ناپید ہو گئے ہیں اور بچے اور جوان اب روایتی کھیلوں کی نسبت جدید کھیلوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔

انگر گشتے: یہ کھیل سوات کوہستان کے علاقہ کالام میں اس طرح کھیلا جاتا ہے کہ برفباری کے دنوں میں دو مدمقابل نوجوان اپنا بایاں پاؤں پیچھے کی طرف اوپر کرتے ہیں اور اس پاؤں کو دائیں ہاتھ کو کاندھے کی طرف پشت کی طرف سے اس ہاتھ کے ذریعے بائیں پاؤں کو پکڑتے ہیں اور اسی حالت میں دونوں مدمقابل ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بھی پہلے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ جیت جاتا ہے۔ لوگ اس کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جیتنے والے کو داد دیتے ہیں۔ اس مقامی کھیل کو کوہستانی زبان میں انگر گشتے کہتے ہیں۔

بزل: بھینس کی پسلی کی ہڈی یا بھینس یا گائے کے ناخن سے ایک اسٹیکر نما چیز بناتے ہیں پھر اس سے چار گز کے فاصلے پر ایک پتھر رکھ دیتے ہیں، اس پتھر کو باکڑی کہتے ہیں اور پھر اس اسٹیکر سے اس پتھر کا نشانہ لیتے ہیں۔ جو اپنے ہدف پر ٹھیک نشانہ

لگادے وہ جیت جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی لڑکوں کے دوسرے روایتی کھیل ہیں۔ انہیں سخے' کھودری ڈق باچی' پیٹر بٹہ سنٹر' شوشے امیڑا' کہتے ہیں۔ دیر کوہستان کے علاقوں میں بھی یہ مقبول ثقافتی کھیل موجود ہیں۔

اشخے : یہ دیر کوہستان کا کھیل ہے جسے اشخے کہا جاتا ہے۔ دو گروپ بنائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک چور ہوتا ہے۔ ہر گروپ کا لڑکا بائیں ہاتھ کو پیچھے کی طرف لیجاتا ہے اور دائیں پاؤں کو پیچھے کی طرف اٹھا کر بائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے۔ پہلے ایک گروپ سے ایک لڑکا منتخب کیا جاتا ہے جو کہ چور کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ ناکام ہو جائے تو دوسرے گروپ سے ایک لڑکا منتخب ہوتا ہے۔ وہ بھی ناکام ہو جائے تو پہلے گروپ سے دوسرا لڑکا چن لیا جاتا ہے۔ وہ بھی ناکام ہو جائے تو دوسرے گروپ سے دوسرا لڑکا چن لیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ جس گروپ میں سے جو بھی لڑکا چور کو پکڑ لے وہ گروپ کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ اب یہ کھیل بہت حد تک متروک ہے۔

نخے : اس کھیل میں پتھروں کے نشانے لگائے جاتے ہیں اس لئے اس کھیل کو مقامی زبان میں نخے کہتے ہیں۔ نخے کا مطلب نشانہ لگانا ہے۔ اس کھیل میں پانچ پانچ لڑکوں کے دو گروپ بنائے جاتے ہیں۔ ایک خاص مقام اور فاصلے پر تین پتھر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ پہلے ایک گروپ میں سے ایک لڑکا آتا ہے اور وہ ان تینوں پتھروں کا نشانہ لگاتا ہے اور پتھر پر پتھر پھینکتا ہے۔ دونوں گروپوں میں سے کوئی بھی لڑکا اگر تسلسل سے تینوں پتھروں پر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگالیتا ہے۔ تو اس کے پورے گروپ کو فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کھیل کوہستانی بچوں اور لڑکوں میں بہت مقبول ہے۔

کا گڑئی : یہ کھیل بھی کوہستانیوں میں بہت دلچسپ اور مزاح کا حامل کھیل ہے جسے یہ اپنی مقامی زبان میں کا گڑئی کہتے ہیں۔

اس کھیل میں چالیس سے لیکر پچاس تک لڑکے شامل ہوتے ہیں۔ اس کھیل کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ ایک لڑکے کو زمین پر بٹھا دیتے ہیں اور کوئی دوسرا لڑکا اس کا محافظ بن کر اس کے سر پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کھیلنے والے لڑکوں میں سے ایک لڑکا آتا ہے اور بیٹھے ہوئے لڑکے کو محافظ سے بچ بچا کر نوچنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ اس دوران بیٹھے ہوئے لڑکے کا محافظ اپنی لاتوں سے آنے والے لڑکے کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک لڑکا جب بیٹھے ہوئے لڑکے کو نوچ لیتا ہے اور محافظ سے بچ کر کامیاب ہو کر نکل جاتا ہے تو پھر دوسرا آتا ہے اور وہ بھی بڑی مہارت کے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے کو نوچنے کی کوشش کرتا ہے اور محافظ سے اپنے آپ کو بچا کر واپس چلا جاتا ہے۔ یہ عمل کھیل میں شریک تمام لڑکے باری باری دہراتے ہیں جب بھی اور جس کو بھی بیٹھے ہوئے لڑکے کا محافظ لڑکا لات مارنے میں کامیاب ہو جاتا یعنی جس لڑکے کو بھی محافظ کی لات پڑ جاتی ہے وہ لڑکا قیدی بن جاتا ہے۔ اور پھر بیٹھے ہوئے لڑکے کی جگہ پر وہ سزا کے طور پر قیدی بن کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر دوسرا لڑکا اپنی باری پر محافظ سے بچ بچا کر اس لڑکے کو نوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی دلچسپ اور مزاح سے بھرپور کھیل ہے اور کوہستانیوں کا ہر دلعزیز کھیل سمجھا جاتا ہے۔

لوک علاج

سوات ملاکنڈ کے وہ علاقے جہاں کے لوگ اب تک روایتی طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی بیماریوں کے علاج مقامی سطح پر پیدا ہونے والی جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سوات کا وہ علاقہ جو کہ کوہستانی ہے وہاں پر اس قسم کے علاج بہت زیادہ ہوتے تھے جن بیماریوں کے علاج مقامی سطح پر پیدا ہونے والی جڑی بوٹیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا سوات کوہستان کے علاقہ کالام وغیرہ میں حسب ذیل ہے جسے گاوری تہذیب وثقافت کا ایک نمایاں حصہ قرار دے سکتے ہیں۔

کوٹ : یہ بوٹی جنسی طاقت کیلئے مفید سمجھی جاتی ہے۔

طاقت ناز : ایک ایسا پودا ہے جسے کمزوری دور کرنے اور خون صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

مامیرہ : آنکھوں کی بیماری اور سینے کے بلغم کیلئے شفایاب ہے۔

نیلوفر کے پتے : یہ ناسور یعنی موجودہ دور کے کینسر کیلئے شفایاب ہے۔

ہیس : جو شخص گر جائے اور ہڈی ٹوٹ جائے یا زخمی ہو جائے تو اس کے لئے بہت مفید ہے۔

لودل : پھوڑے پھنسی اور گرمی دور کرنے کیلئے مفید ہے۔

سپیرکی : پیٹ کے درد کے لئے مفید ہے۔

برج : اسے خون بند کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آنکھ کا درد: جب آشوب چشم کا عارضہ لاحق ہو تو اس میں گھی ڈالتے ہیں آنکھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔

سر درد: جب سر میں درد ہو تو ایک پودا پھنڑ کاش کو پانی میں کوٹتے ہیں اور پھر اس کے رس کو پی لیا جاتا ہے سر درد ختم ہو جاتا ہے۔

پہاڑ سے گرے: جب کوئی شخص پہاڑ سے گرے اور کوئی ہڈے وغیرہ ٹوٹ جائے تو مرغی ذبح کر کے اس کی کھال ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھ دی جاتی ہے۔

خون بند کرنا: جب کسی کا خون بہہ رہا ہو تو کپڑا جلا کر اس کی راکھ کو زخم پر باندھ دیا جاتا ہے خون بند ہو جاتا ہے۔

ریچھ جڑی: یہ ایسی جڑ ہے جسے نومبر کے مہینے میں ریچھ کھا لیتا ہے اور اس کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ایک غار میں جا کر سو جاتا ہے۔ جب مارچ ی، اپریل کے مہینے میں آمد بہار ہوتی ہے اور گرج دار بارشیں شروع ہوتی ہیں تو ریچھ جاگ جاتا ہے۔ اس بوٹی کے پتے اس کے پیٹ میں ہی ہوتے ہیں اس وقت اس کا شکار کر کے اس کے پیٹ سے یہ پتے نکال لیتے ہیں اس پتے کا پانی اور ریچھ کا گوشت قوت باہ اور جنسی طاقت کیلئے بے حد مفید ہے۔

تا کی جڑی: یہ بھی ایک جڑ ہے اسے کوٹ کر پانی میں ڈال کر پی لیا جاتا ہے جو کہ پیٹ کے درد، قبض دور کرنے اور گرمی ختم کرنے کے لئے اکسیر ہے۔

جڑی: یہ ایک ایسی چیز ہے جو کہ نہایت خطرناک ہے جب کسی پر اس کا سایہ پڑ جائے تو پورے بدن میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

زیرہ مہرہ: یہ جڑی پانی میں ڈال کر دی جاتی ہے یہ پھیپھڑوں کی بیماری کے لئے اکسیر ہے جانوروں کو بھی بیماری کی حالت میں دی جاتی ہے۔

متر جڑی: اس سے مکھن زیادہ ہوتا ہے طریقہ یہ ہے کہ جس چاٹی میں مکھن بلویا جاتا ہے اس چاٹی کے نیچے اسے رکھ دیا جاتا ہے مکھن زیادہ بنتا ہے۔

پشمالہ: جب پیٹ میں درد ہو تو یہ استعمال کی جاتی ہے۔

سی مو: یہ ایسی جڑی بوٹی ہے جس سے زخم بھر جاتا ہے۔

پوٹیال: جلاب کیلئے اسے کوٹ کر لسی میں ملا کر دیا جاتا ہے۔

تین دی جڑی: یہ ایک ایسی جڑ ہے جسے کوٹ کر زخم پر لگایا جاتا ہے زخم بھر کر ٹھیک ہو جاتا ہے۔

علاقہ کوہستان سوات کے وہ علاقے جہاں قاشقاری لوگ آباد ہیں ان کے ہاں بھی مختلف بیماریوں کے علاج دیسی طریقہ سے جڑی بوٹیوں کے ذریعے کئے جاتے ہیں۔

چونچ: ایک ایسی جڑی بوٹی ہے کہ اگر کوئی شخص پہاڑ سے گر جائے تو یہ استعمال کی جاتی ہے یہ کمر درد کیلئے بھی مفید ہے۔

زدموار چو: اسے قوت باہ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے نہایت مفید ہے۔

پن کچ: اسے پانی میں ملا کر دیا جاتا ہے جو کہ بعد میں پھنسی پھوڑوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔

بین: یہ ایک ایسی جڑی بوٹی ہے جسے دست وقے کیلئے مفید سمجھا گیا ہے۔

کان کا درد: جب کسی کے کان میں درد ہو تو چترال کے لوگ عورت کا دودھ کان میں ڈالتے ہیں جس عورت کا دودھ کان میں ڈالا جائے وہ رضائی ماں بن جاتی ہے۔

پیٹ کا علاج: جب کسی کے پیٹ میں درد ہو تو پیٹ کے درد کیلئے زیرہ دیا جاتا ہے جس سے آدمی صحت یاب ہو جاتا ہے۔

دانے کا علاج: جب کسی کو پھوڑا اور دانہ نکل آئے تو اس کے لئے پیاز کو راکھ ڈال کر پکا لیا جاتا ہے اور پھر اسے پھوڑے پر لگا دیتے ہیں۔

آشوب چشم: جب کسی شخص کو آشوب چشم کا مرض لاحق ہو جائے تو آنکھوں میں کرمیزی رنگ ڈال دیتے ہیں آنکھیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔

بخار کا علاج: جب کسی کو انتہائی درجہ کا بخار ہو تو بیر کے درخت کی پتیاں کوٹ کر جب ان کا رس نکل آئے جو کہ سخت کڑوا ہوتا ہے تو اسے بخار میں مبتلا مریض کو پلا دیا جاتا ہے۔ بخار سے افاقہ ہو جاتا ہے اور ساتھ خون بھی صاف ہو جاتا ہے کیونکہ یہ رس مصفی خون بھی ہے۔

ہزارہ

جغرافیہ

ہزارہ کے مشرق میں آزاد کشمیر اور دریائے جہلم ہے، مغرب میں دریائے سندھ اور دریائے سندھ سے پار صوابی کا خطہ ہے۔ شمال میں بلتستان اور جنوب اور جنوب مشرق میں پوٹھوار کا علاقہ ہے۔ ہزارے کا علاقہ اپنے قدرتی ماحول اور صحت افزا مقامات رکھنے کی بناء پر مغرب سے آئے ہوئے حملہ آوروں کی توجہ کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق یعنی کشمیر پنجاب کے قدیم حکمرانوں کی نظروں کو بھی للچاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے آنے والے حملہ آوروں کی دلچسپی کا محور رہا ہے۔ ہزارہ کا قدیم صدر مقام میدانی علاقہ یعنی ہری پور تھا جسے میدان ہزارہ کہا گیا جبکہ بعد میں قدیم تاریخ و ثقافت کے میلانات کا حامل قصبہ دھمتوڑ بھی رہا ہے۔ تحقیق تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قدیم دارالخلافہ ہری پور کو میدان ''رش'' سے پکارا جاتا تھا جو سنسکرت کا لفظ ہے یہ لفظ ''اورشی'' سے رش تخفیف کے ساتھ ہوا ہے ''اورش'' کا مطلب پانی کی جھیل ہے جو کہ موجودہ ہزارے کے صدر مقام ایبٹ آباد کیلئے مستعمل ہے۔ قدرتی آبشاروں، اور سردیوں کے موسم میں برفانی علاقہ ہونے کی بناء پر یہ علاقہ گرمیوں میں جھیل نما ہوتا تھا اس لئے اسے ''اورش'' کا نام دیا گیا۔

ہزارہ کی وجہ تسمیہ: اسلام کی آمد کے بعد تک یہ علاقہ اُراشہ کے نام ہی سے موسوم تھا اور یکے بعد دیگرے راجوں اور مہاراجوں کے زیر اقتدار رہا۔ برصغیر ہندوستان کی طرف جب منگولوں کے قدم بڑھے تو امیر تیمور نے دہلی کو فتح کرنے کے بعد براستہ کشمیر ہزارہ کی طرف رُخ کیا جب تیمور ہزارہ کی سرزمین میں داخل ہوا تو اس علاقے کی خوبصورت وادیوں اور برف پوش پہاڑوں نے اسے متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا اور اُس نے اپنی فوج کا ایک خاص دستہ جو ایک ہزار ترک منگول فوجیوں پر مشتمل تھا اس علاقے میں تعینات کر دیا تاکہ وہ اس علاقے میں اقتدار کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ شاہراہ کشمیر کی بھی حفاظت کرے چنانچہ اس ایک ہزاری تیموری دستے کی یہاں تعیناتی کی بناء پر اس علاقے کو ہزارہ کہا جانے لگا جس کا مطلب ہے ایک ہزار تیموری سپاہ کا وطن۔ اس خطے کو بہت عرصے تک کارلغ ہزارہ کے نام سے پکارا جاتا رہا، کارلغ تیمور کی ذاتی نسل کے لوگوں کو کہتے تھے جو کہ ترکی کا لفظ ہے مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ کارلغ کو لوگوں نے حذف کر دیا اور صرف ہزارہ رہ گیا جو کہ آج تک اسکی جنوبی سرحدات میں اٹک و ٹیکسلا سے لیکر شمال کی جانب بلتستان کی سرحد تک پھیلا ہوا وسیع و عریض خطہ ہے۔ ہزارہ صوبہ سرحد کا واحد ایسا ریجن ہے جو تین مختلف بڑی اقوام، شنا یعنی کوہستانی، پشتون یعنی سواتی پشتون، اور ہندکو بولنے والے ہندکو دان لوگوں کی تہذیب و تمدن کا سنگم ہے۔ چونکہ امیر تیمور اس علاقہ میں 1398ء میں داخل ہوا اس لئے ہزارہ کا نام اس خطے کیلئے 1398ء کے بعد مخصوص ہوا۔

تاریخی حوالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سرزمین ہزارہ پر ترکوں کی پہلے ہی سے حکومت موجود تھی جو کہ کارلغ کے نام سے یہاں حکومت کرتے تھے اور ان کا مرکز ایبٹ آباد کے پاس دھمتوڑ کا علاقہ تھا اور یہی وہ کشش تھی جو کہ امیر تیمور کو اس طرف کھینچ کر لائی اور پھر اس علاقے کی حفاظت و انصرام کیلئے اپنی نسل میں سے ایک ہزار ترک سپاہیوں کو یہاں چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اسے کارلغ ہزارہ کہا جانے لگا۔ اس علاقہ میں ایک قبرستان ہے جہاں ترک شہزادوں کی قبریں اور ان آثار موجود ہیں۔ میدان رش یعنی ہری پور میں بھی ترکوں کی حکومت تھی جبکہ میدان پکھلی تک ان کا اقتدار تھا جنھیں بعد میں علاقہ سوات سے آئے ہوئے جلال باباؒ کی قیادت میں سواتیوں نے شکست دیکر پکھل میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اب تک اس علاقے میں سواتیوں کا بہت اثر ہے۔ یہ وہ سواتی لوگ ہیں جو اب ہزارہ قوم میں شامل ہیں مگر اپنی شناخت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ سواتی لکھتے ہیں اور زبان و ثقافت کے لحاظ سے ان میں ہزارہ کی ہندکو اور رکھ رکھاؤ بھی موجود ہے اور پشتون کے علاقوں یعنی یوسفزئیوں کی عادات و خصائل بھی ان میں موجود ہیں اور پشتو زبان بھی بولتے ہیں۔

مقامی خصوصیات

ہزارہ: ہزارہ ریجن جو بذات خود صوبہ سرحد کا ایک بہت بڑا ریجن ہے اور دونوں قسموں سرد گرم موسموں کو سموئے ہوئے ہے اور پہاڑی اور میدانی علاقوں پر مشتمل ہے اس کا قدیم نام جیسا کہ اس کی وجہ تسمیہ کے ذیل میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ کارلغ ہزارہ تھا اور یہ نام 1398ء میں اُس وقت اس خطے کیلئے مخصوص ہوا جب امیر تیمور (منگول) یا مغل یہاں پر براستہ کشمیر فتح دہلی کے بعد پہنچا۔ اُس نے اپنا ایک مخصوص دستہ جو تیمور کی ایک ہزار سپاہ پر مشتمل تھا اس علاقے کے انتظامی بندوبست کیلئے یہاں تعینات کر دیا کارلغ ترکی کا لفظ ہے جو کہ تیموری نسل کیلئے استعمال ہوتا تھا تب سے اس کا نام کارلغ ہزارہ ہوا پھر بعد میں مرور زمانہ کارلغ کو حذف کر کے صرف ہزارہ کے لفظ تک محدود ہو گیا اور اسی نام سے یہ علاقہ اب تک ہزارہ ہے پورے ریجن کی خصوصیت اور شہرت یہ ہے کہ یہاں گروائی سرسبز و شاداب مقامات ایبٹ آباد

کاغان اور گلیات کے ٹھنڈے اور صحت افزاء مقامات ہیں، یہاں پر ڈاؤر کے مقام پر ٹی بی کے مریضوں کو صحت یابی کیلئے رکھا جاتا ہے۔

ایبٹ آباد: ایبٹ آباد ہزارہ ریجن کا صدر مقام ہے جو کہ انگریزوں کے دور میں تعینات ہونے والے پہلے ڈپٹی کمشنر میجر ایبٹ کے نام پر موسوم ہے۔ اس کا پرانا اور قدیم نام ''اورش'' ہے جو سنسکرت کا لفظ ہے اس کے معنی جھیل کا پانی ہے۔ ایبٹ آباد کے مشرق میں بھانڑیاں، گلیات تا کشمیر، مغرب کی جانب تناولوں کے علاقے، کھٹیالہ، شیروان اور بریلہ شمال کی جانب مانسہرہ، جو کہ اب ہزارہ ریجن کا ایک ضلع ہے۔ ایبٹ آباد کے تمدنی خطہ میں مختلف قومیں جن میں تنولی، جدون، عباسی، پنی، ترین، کرڑال، ڈھونڈ راعوان، قریشی، اور سید آباد ہیں۔ ایبٹ آباد کے مضافات میں ڈوڈیال، نواں شہر، دھمتوڑ اور منڈیاں مشہور مضافاتی علاقے ہیں، ایبٹ آباد کی زیادہ تر مقامی آبادی ملک پورہ میں رہائشی بستیاں بسائے ہوئے ہیں۔ ایبٹ آباد کے جنوب مشرق کی جانب سربن پہاڑ اور مغرب کی جانب بلند و بالا شملہ پہاڑی ہے۔ یہاں کے تمام باشندوں کی زبان ہندکو ہے جسے ہزارہ جاتی ہندکو کہا جاتا ہے، ایبٹ آباد کو ایک تفریحی مقام ہونے کی بھی حیثیت حاصل ہے کیونکہ گرمیوں کے موسم میں اس علاقے کا موسم معتدل اور خوشگوار ہوتا ہے جس کی وجہ سے صوبے کے میدانی علاقوں کے باشندے یہاں پر اکثر آجاتے ہیں، ایبٹ آباد کے بڑے بڑے بازاروں میں، مین بازار، کینٹ بازار، رئیس خانہ بازار، کچہری بازار اور گردوارہ بازار مشہور بازار ہیں۔ گردوارہ بازار میں وہ تاریخی گردوارہ ہے جہاں اکثر رنجیت سنگھ اپنے دور حکومت میں آیا کرتا اور مذہبی رسومات ادا کرتا تھا۔ شہر کے دونوں جانب یعنی مشرق و مغرب کی طرف پہاڑ ہیں اور ان پہاڑی سلسلوں میں مقامی لوگوں کی رہائش گائیں ہیں۔ ان گھروں میں بعض مکانات تو تہذیب نو کی عکاسی کرنے والی تعمیرات کے مطابق بن چکے ہیں جبکہ اکثر پرانے مکانات ہیں جن کی دیواریں مقامی پتھروں اور گارے سے بنی ہوئی ہیں اور چھتیں لکڑی کے چھوٹے ٹکڑوں اور شہتیروں پر مشتمل ہیں اور اوپر گارہ استعمال ہوا ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں بھی لکڑی سے بنی ہوئی ہیں۔

ایبٹ آباد کے مضافات میں تاریخی گاؤں دھمتوڑ ہے جو ایبٹ آباد شہر کے جنوب مشرق کی جانب ہے۔ یہاں پر اب تک کھڈی پر کپڑا بنتا ہے اور ہر مسجد کے ساتھ ایک حجرہ بنایا جاتا ہے جہاں گاؤں کے لوگوں کے فیصلوں کیلئے جرگہ منعقد ہوتا ہے اسی جرگے کے ذریعے گاؤں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے بھی طے کئے جاتے ہیں۔ گزشتہ پچھتر (۷۵) سال سے اس علاقے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے اور یہ گاؤں ہزارہ کی رہن سہن کا روایتی منظر پیش کرتا ہے۔ ایبٹ آباد کے مشرق کی جانب ڈوڈیال اور نواں شہر اور کاکول کی آبادیاں ہیں جہاں پرانی طرز کے مکانات ہیں، ڈوڈیال میں مٹی کے برتن کی بھٹیاں ہیں جہاں مٹی کے ظروف تیار ہوتے ہیں یہاں پر کمہاروں کے مکانات ہیں جو یہ برتن تیار کرتے ہیں اب صرف ایک ہی کمہار کا گھرانہ اس روایتی صنعت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ یہاں پر پرانی دستکاریوں میں چھج اور شروڑچی بہت مشہور ہے یہ نواں شہر میں دریامان بھٹی نامی شخص کانے کے تیلوں سے بناتا ہے یہ دور دراز کے دیہاتوں میں استعمال ہونے والی دستکاریاں ہیں ایبٹ آباد کے نواں شہر میں الیاس مسجد بہت مشہور ہے جو ایک پہاڑی پر تعمیر کی گئی ہے۔

حویلیاں: ایبٹ آباد کے جنوب میں حویلیاں کا علاقہ ہے جو اب ہزارہ کی ایک بہت بڑی آبادی پر مشتمل ہے اور سیاسی تقسیم کے لحاظ سے یہ ایک تحصیل ہے۔ یہ ہزارہ کی سیاست کا محور علاقہ سمجھا جاتا ہے یہ ایک تجارتی مرکز بھی ہے۔ حویلیاں میں اب تک قدیم عمارتیں موجود ہیں جنھیں ثقافتی ورثے کا درجہ حاصل ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اس علاقے کو اہمیت حاصل رہی اور بعد میں بھی یہ علاقہ قابل توجہ رہا ہے۔

حویلیاں کے مشرق میں کیال، چمنکا، دیوان، بجیکوٹاور باگن کے مضافاتی علاقے ہیں۔ مغرب میں ہری پور کا ضلع شمال میں ضلع ایبٹ آباد اور جنوب میں پھلاںوالی، چھیری، چنالہ، دھرڈائی، دکھن پیر، کریکی، لنگڑیال اور ڈبرس کے مضافاتی علاقے ہیں۔

گلیات: ضلع ایبٹ آباد کے انتہائی سبزہ زار پُر فضا اور گرمیوں کے موسم میں سکون آفریں مقامات میں گلیات کا علاقہ سیاحوں کیلئے پُرکشش اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ گرمی کے موسم میں یہ بلند و بالا پہاڑی مقامات ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے سیاحوں کیلئے جذب و کشش کے حامل رہے ہیں۔ یہاں فطری حسن و جمال، درخت و پھول اور بادو باراں بکثرت پائی جاتی ہیں، ان گلیات میں باڑاگلی، کالا باغ، نتھیاگلی، ڈونگاگلی، کالا پانی، چھانگاگلی، خیراگلی اور لوہر باڑیاں مشہور تفریحی اور ٹھنڈے مقامات ہیں۔ یہ سب مقامات ایبٹ آباد کے مشرق تا انتہائی جنوب مشرق میں واقع ہیں، نتھیاگلی اور ڈونگاگلی دس ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ ان پہاڑی علاقوں میں ہزارہ کی جنگجو قومیں آباد رہی ہیں۔ نتھیاگلی گلیات کا صدر مقام ہے۔ اور انگریزی دور سے اب تک حکومت صوبہ سرحد کا گرمائی صدر مقام رہا ہے۔

نتھیا گلی پرانی اور نئی تہذیبوں اور ثقافتوں کا سنگم ہے یہاں کے مقامی باشندوں کی بولی' پہاڑی ہزارہ جاتی' ہے۔ ان کی بود و باش سادہ ہے۔ تمام گلیات کے لوگ پہاڑی ہندکو بولتے ہیں جو میدانی علاقوں سے قدرے مختلف ہے۔ مقامی لوگ زیادہ تر اپنی زمینوں کو خود کاشت کرتے ہیں۔ مقامی آبادی کے علاوہ باہر کے لوگوں نے یہاں پر زمینیں خرید کر مکانات تعمیر کئے ہیں جو کہ صرف گرمیوں کے موسم میں یہاں گزر بسر کرتے ہیں۔ کالا باغ کے مقام پر سبزہ زیادہ ہو جاتا ہے چونکہ جہاں سبزہ گنجان ہو وہ مقام سیاہ نما ہو جاتا ہے اسی وجہ سے اس مقام کو کالا باغ کہتے ہیں۔ نتھیا گلی سے تقریباً ایک کلومیٹر ایبٹ آباد کی طرف موچی ڈھارا کا مقام ہے ایک روایت کے مطابق یہاں پر سو سال قبل ایک موچی کام کرتا تھا جس کی وجہ سے اس مقام کا نام موچی ڈھارا رکھ دیا گیا۔ ڈھارا پہاڑی ہندکو میں ٹھکانہ یا مقام کو کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ موچی کا ٹھکانہ۔

نتھیا گلی کی وجہ تسمیہ: یہاں کے باشندوں میں سینہ بسینہ محفوظ روایات کے مطابق یہاں ایک سکھ ڈیرہ تھا جس کا نام نتھو سنگھ تھا چنانچہ علاقے کا ڈیرہ ہونے کے ناطے اس علاقے کا نام اس کے نام پر نتھو گلی رکھ دیا گیا جو بعد میں نتھو سے نتھیا گلی ہو گیا۔ ہزارہ جاتی پہاڑی ہندکو میں گلی اس مقام کیلئے استعمال ہوتا ہے جو تنگ سا پہاڑی راستہ ہو چونکہ یہ سارا علاقہ بلند و بالا سرد اور سبزہ زار پہاڑوں پر مشتمل ہے جن پر تنگ سی سڑک ہے اس لئے یہ علاقے گلیات کے نام سے موسوم ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی رہائشی بستیاں یک منزلہ کچی آبادیوں کی سی ہیں۔ گلیات کے پہاڑی علاقوں میں ہزارہ کی ڈھونڈ قوم آباد تھی اور ان کی باقیات اب تک ہیں۔ ڈھونڈ قوم بآسانی باہر سے آئی ہوئی قوموں کے تسلط کو قبول نہیں کرتی تھیں۔ ڈونگا گلی سے متصل مشرق کی طرف خانس پور کا وہ مقام ہے جہاں انگریزوں نے اپنی چھاؤنی بنادی تھی غالباً اس چھاؤنی کا مقصد بھی ڈھونڈ قوم کے باشندوں کی ہتھ درازی کو قابو میں رکھنا تھا۔ نتھیا گلی کا قدیم نام میاں جانی ہے اور ڈونگا گلی کا قدیم نام موچھ پوری ہے۔ یہ قدیم نام میجر ایبٹ کی اُس ڈائری میں محفوظ ہیں جو انہوں نے 1849ء میں انگریز حکام کو صحت افزا مقام کی تجویز کیلئے رقم کی تھی، اور ایک طویل خط انگریز سرکار کو لکھا تھا چونکہ میجر ایبٹ اس پورے ہزارہ کے علاقہ کی تاریخی اور جغرافیائی زندگی سے مکمل طرح سے آگاہ تھا اس لئے جب انگریز سرکار نے صحت افزا مقام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے میجر ایبٹ سے کہا تو انہوں نے جواباً انگریز سرکار کو اس پہاڑی سلسلے اور گلیات میں بسنے والی قوم ڈھونڈ کے لوگوں کی یورشوں اور عداوت پسندی کی روش سے مکمل طور سے آگاہ کیا اور اسی خط میں نتھیا گلی کو میاں جانی اور ڈونگا گلی کو موچھ پوری کہا ہے اور ساتھ ہی اس ڈھونڈ قوم کی مذہب پرستی، اغیار سے عداوت اور ان کی اسلحہ بندی کی عادت و وصف سے سرکاری حکام کو آگاہ کر کے سرکاری حکام کو ان علاقوں میں مستقل سکونت سے منع کیا۔ اس کے بعد ہی خانس پور میں ان لوگوں کو قابو رکھنے کیلئے انگریز سرکار نے اپنی چھاؤنی بنا کر یہاں فوج جمع کر دی اب یہ چھاؤنی یہاں پر نہیں ہے۔ سردی کے موسم میں یہاں شدید برف باری ہوتی ہے۔

شیروان: ضلع ایبٹ آباد کا ایک آباد پہاڑی قصبہ ہے جو تنولی قوم کا مرکزی خط ہے۔ یہ ایبٹ آباد کے مغرب کی طرف واقع ہے اس سے پہلے موضع کوٹھیالہ ہے۔ کوٹھیالہ کے باشندے اپنی قدیم ثقافت کے ساتھ آباد ہیں۔ ان کے مکانات کچے اور پہاڑیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ ایبٹ آباد سے شیروان تک جاتے ہوئے جو مضافات آتے ہیں ان میں، صوبن گلی، بیگا گلی، پنج کوٹ، گوا، تھیل اور پھر شیروان، شیروان میں دور حاضر کے تہذیبی اور ثقافتی ارتقاء یافتہ معمولات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تنولی قوم کے لوگ آباد ہیں۔

شیروان کے علاقہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس علاقہ کے موضع کمیلا میں جو کہ شیروان کے شمال مغرب کی طرف ہے اس کے پہاڑوں میں سے خاص قسم کے پتھر نکالے جاتے ہیں جو بارود، سٹیل اور فولاد میں استعمال ہوتا ہے، شیروان کے مضافات کے لوگ انتہائی غریب اور کاشتکار ہیں۔ بہت کم لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ یہ لوگ تارا میرا ساگ بکثرت کھاتے ہیں جو کہ پانی کی ندیوں کے کنارے پر خود رو پیدا ہوتا ہے اور سفید مکئی کی روٹی پر مکھن اور شہد لگاتے ہیں اور پھر دودھ میں بگو کر شوق سے کھاتے ہیں، سرسوں کا ساگ بھی یہاں پر مکئی کی روٹی کے ساتھ زیادہ کھایا جاتا ہے۔ کوٹھیالہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ کوٹھیالہ کا پرانا نام کھامرا تھا بعد میں کھامرا سے کوٹھیالہ ہوا۔ یہاں کی خواتین اب تک قدیم پہناوہ استعمال کرتی ہیں اور لنگ نما شلوار پہنتی ہیں۔ یہاں کی زبان ہندکو ہے مگر ٹھیٹ ہزارہ جاتی ہندکو بولتے ہیں۔

یہاں کے لوگ مال برداری کیلئے زیادہ تر خچر استعمال کرتے ہیں کیونکہ پہاڑی علاقہ ہے۔ ایبٹ آباد سے ان تمام علاقوں کیلئے اب سڑک پختہ بنادی گئی ہے جبکہ نصف صدی پہلے یہاں سڑک کا مناسب انتظام نہ تھا اور لوگ خچروں کے ذریعے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ یہاں کی زمینیں سرسبز و شاداب ہیں موسم معتدل ہی رہتا ہے۔

ان مضافات میں ایک کوہ ہوتا ہے جسے ککارا کہتے ہیں، یہ نسواری رنگ کا

ہوتا ہے۔ دم سیاہ، سفید اور لمبی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں یہ عقیدہ ہے کہ جس کے گھر پر بیٹھ کر آواز لگائے وہاں مہمان ضرور آتا ہے۔

نواں شہر "ڈوڈیال": ایبٹ آباد کے شمال مشرق کی طرف نواں شہر اور ڈوڈیال کی آبادیاں ہیں۔ ڈوڈیال ایک قصبہ ہے۔ یہاں مٹی کے برتنوں کی بہت سی بھٹیاں ہیں جہاں کمہار گھرانے مٹی کے برتن بناتے ہیں۔ یہ قصبہ ثقافتی لحاظ سے اپنے ورثے کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ یہاں پر اب بھی کمہاروں کے چند گھرانے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں کئی اور قدیم دستکاریوں کا کام ہو رہا ہے جن میں چھج شروڑچی قابل ذکر ہیں۔ جو کہ کانا کی لکڑی سے بنتی ہیں۔ اسی طرح پلنترا جو مکھن نکالنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ نواں شہر کے ساتھ ہی ایک قصبہ چونا کاری کے نام پر آباد ہے۔ اس چھوٹے سے قصبہ کی وجہ شہرت پُر فضا درختوں تلے قدرتی چشموں کی پہاڑ کے دامن میں الیاسی مسجد ہے۔ جسے دیکھنے کیلئے مقامی اور غیر مقامی سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

لورہ: ایبٹ آباد کے جنوب میں لورہ، پہاڑی اور دشوار گزار علاقہ ہے۔ یہاں پر عباسی اور کرڑال قوم کے باشندے ہیں اس کے علاوہ اعوان لوگ بھی آباد ہیں۔ یہاں پر مست ملنگ سرکار کا روپڑ کے علاقے میں مزار ہے۔

مانسہرہ: ہزارہ کے دارالخلافہ ایبٹ آباد کے شمال میں ہزارہ کا قدیم شہر مانسہرہ ہے۔ جسے مان سنگ نے آباد کیا تھا اور وہ اس علاقے کا حکمران تھا اسی کے نام کی مناسبت سے اسے مانسہرہ کہا جاتا ہے۔ اس علاقے کے بائیں جانب دردستان یعنی کوہستان کا علاقہ ہے اور دائیں جانب انتہائی شمال میں شمالی علاقہ جات کی سرحد ہے۔ اسی کے شمال مشرق میں آزاد کشمیر اور شمال مغرب میں ضلع سوات کی سرحد ہے۔ جبکہ جنوب میں ہزارہ کا دارالخلافہ ایبٹ باد شہر ہے۔ مانسہرہ کے شمال مغرب کی جانب علاقہ پکھل ہے جو شنکیاری سے لیکر بشام تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سارے علاقے میں سواتی قوم کے وہ باشندے ہیں جنہیں یوسفزئیوں نے افغانستان سے ہجرت کے دنوں میں نکال دیا تھا۔ وہ دریائے سندھ کو پار کر کے مشرق کی طرف اس علاقے میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ پشتو اور ہندکو دونوں زبانوں پر قادرالکلام ہیں، پشتو ان کی مادری زبان ہے جبکہ ہندکو ان کی علاقائی زبان ہے۔ مانسہرہ کے ضلع میں بسنے والے یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ سواتی ضرور لکھتے ہیں۔ مانسہرہ کی مقامی آبادی خالصۃً ہزارہ کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ مانسہرہ کے اکثر لوگ اس وقت حافظ قران ہیں اور یہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مانسہرہ کے وہ لوگ جو کسی بھی خصوصیت میں شہرت رکھتے ہیں وہ اپنے نام کے ساتھ ہزاروی لکھتے ہیں جیسے موجودہ صدی کے معروف عالم دین، مولانا غلام غوث یہاں کے باشندہ ہونے کی وجہ سے ہزاروی لکھتے تھے، مانسہرہ میں وہ چٹانیں بہت مشہور ہیں جن پر مہاراجہ اشوکا کے فرامین کندہ ہیں۔ یہ اشوکا کی چٹانوں کے نام پر مشہور ہیں۔ یہاں کے ثقافتی کھیلوں میں گتکہ، کبڈی اور فصل کی کٹائی پر بیل دوڑ مشہور کھیل ہیں۔ مانسہرہ کے شمال مغرب کی طرف شنکیاری اور بفہ کی ہیں، بفہ میں گلی باغ قدیم معروف دیہات ہے اور یہی وہ مقام ہے جو ترک حکمرانوں کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں پر بزرگ دیوان راجہ باباؒ کا مزار ہے۔

پکھل: مانسہرہ کے شمال مغرب کی طرف وسیع و عریض علاقہ پکھل کے نام سے موسوم ہے جہاں پر ترک حکمران محمود شاہ کے عہد میں سوات سے جلال بابا سواتی کی قیادت میں سواتی باشندے آئے اور یہاں پر ترکوں کو شکست دیکر اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہاں کونش ویلی اور سرن ویلی مشہور ہیں۔ ان دونوں مقامات پر گجر لوگ آباد ہیں ان کی پوشاک، خوراک اور عادات ہزارہ کے باقی علاقوں کے باشندوں سے مختلف ہیں۔ ان کے تقریباً ۱۰۱ خاندان پہاڑوں پر آباد ہیں۔ ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں سردیوں میں میدانی علاقوں میں آجاتے ہیں اور گرمیوں میں پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ لوگ سر پر پٹکہ باندھتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک گیت بہت مشہور ہے جو یہ لوگ تنہائی میں گاتے ہیں اسے قینچی کہتے ہیں۔

بفہ: ہزارہ کے میدانی علاقہ پکھل کا مرکزی مقام ہے۔ یہ سارے علاقے جو پکھل کے نام سے موسوم ہیں اور جن کی حدود لمبائی میں مانسہرہ سے اچھیریاں تک اور چوڑائی میں ڈاڈر سے تناول تک ہے علاقہ پکھل کے تمام علاقے سواتیوں کے مقبوضات ہیں۔ مانسہرہ کے بعد شنکیاری سے بفہ اور پھر بفہ سے کوہستان ہزارہ کی سرحد تک کا سارا علاقہ میدان پکھل کہلاتا ہے۔ بفہ کو اس کی مرکز کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے مگر مقامی لوگوں اور صوبہ سرحد کے دوسرے اضلاع میں اس کی وجہ شہرت یہاں کے خاص طرح سے تیار کئے جانے والا "کھواہ" ہے جو کہ خالص دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ بفہ کے معنی مقامی زبان میں جھیل کے ہے۔

کاغان: مانسہرہ سے انتہائی شمال کی جانب واقع وادی کاغان کا علاقہ ہے۔ کاغان کے مشرق کی جانب چمبر، ڈانگی سیری، پلداراں، اندھیر بیلہ، راجوال اور راوی کوٹ کے مواضع ہیں شمال کی طرف ڈورنگی سپیری، اور پلہ ران کے مواضع، مغرب کی طرف

پہاڑی علاقہ ہے اور جنوب کی طرف بٹن دیس، کنہارہ، نکہ جریبد کے مواضع ہیں۔ سکھوں کے دور میں یہ ایک سٹیٹ تھی۔ یہاں پر سید ضامن شاہ سکھوں کے خلاف برسرپیکار رہے جب فوت ہوئے تو بیلہ کے مقام پر دفن کئے گئے۔ کاغان اصل میں کاگان تھا یہاں کی قدیم آبادی کافروں کی تھی ان کے سردار کی بیوی کا نام کاگان تھا۔ اور یہ وادی اس کے نام سے کاگان پر مشہور تھی۔ تغیرات زمانہ کے ساتھ اس کا نام بدل کر کاغان ہوگیا۔ یہاں پر سید، سواتی اور گوجر مشہور قومیں آباد ہیں۔

بالاکوٹ: مانسہرہ کے شمال میں یہ مقام سید احمد شہید اور اسماعیل شہید کے مزارات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ سکھوں کے دور میں جب مجاہدین کی تحریک چلی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس تحریک مجاہدین کی وجہ سے کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس تحریک کے بانی سید احمد شہید اور ان کے پیروکار اسماعیل شہید تھے۔ پشاور اور مردان کے علاقوں میں یہ تحریک پھلی پھولی مگر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی جس کی وجہ سے سید احمد اور اسماعیل مجاہدین کے ساتھ ہزارہ کے اس شمالی علاقے بالاکوٹ میں آگئے یہاں بھی سکھوں نے انکا تعاقب کیا اور آخر کار یہ دونوں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ اسی مقام پر ان کے مقبرے تعمیر کئے گئے، یہ علاقہ بالاکوٹ گھنے جنگلوں سے پُر علاقہ تھا، یہاں پر بالا نامی حکمران تھا اور اسی کے نام پر ایک قلعہ یا حویلی تھی جس کی وجہ سے اسے بالاکوٹ کہا جانے لگا۔

کوہستان ہزارہ: ایبٹ آباد کے انتہائی شمال کی جانب کوہستان کا علاقہ ہے جسے ہزارہ کوہستان کہا جاتا ہے۔ اسے اباسین کوہستان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ آباد ہے۔ دریائے سندھ کے مشرق کی جانب جو کوہستانی علاقے آباد ہیں ان میں بٹیرہ، کوئی، کوز پالس، بر پالس، کرن شیر، شمیال، جالکوٹ، شونی نالہ، بھاشہ اور درہ مداخیل قابل ذکر بڑے علاقے ہیں۔ جبکہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر آباد بستیاں یہ ہیں۔

بن کڑ، مندرازا، رانولیا، کوڑمنگ، دوبیر، جیجال، پٹن یسو، کہال، کیلہ، داسو، دوگا، گیال، کندھیا، اور راتھور۔ دریائے سندھ اس کوہستانی علاقے میں 158 کلومیٹر تک تنگ سے پہاڑی راستے سے بہتا ہے اس سارے علاقے میں بل کھاتی ہوئی سڑک ہے جس کا نام شاہراہ ریشم ہے۔

اس علاقے میں بہتے ہوئے عظیم دریائے سندھ، جسے آریاؤں کی قدیم مذہبی کتاب رگوید میں، سندھو کا نام دیا گیا ہے، جبکہ سکندر اعظم مقدونی نے جب اس علاقے پر حملہ کیا تو یونانیوں نے اس دریا کو سندوس کے نام سے پکارا۔ لاطینی میں اسے سندس اور انگریزی میں انڈس کہا گیا اور اسی رعایت سے اس علاقے کو انڈس کوہستان کا بھی نام دیا گیا، جبکہ پختون اور کوہستانی اسے اباسین کوہستان کہتے ہیں، یعنی دریاؤں کے باپ کا کوہستانی علاقہ۔

اس کوہستانی علاقے میں بہت سی جھیلیں ہیں ان میں مشہور یہ ہیں۔

نلیا سر جھیل، دوبیر چن سر جھیل، پٹن سر جھیل، کندھیا سر جھیل۔

ہزارہ کوہستان کا پہاڑی خطہ دو ہزار مربع میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے یہ خطہ سطح سمندر سے تین ہزار آٹھ سو سے چار ہزار میٹر کے درمیان بلند ہے۔

ہری پور: ہری پور ہزارے کا ایک اہم اور پوٹھوار کے علاقے کے قریب تر شہر ہے۔ جو اب ایک ضلع ہے۔ یہ باغوں، پھلوں اور پھولوں کا شہر ہونے کے علاوہ ایسے پہاڑی علاقے پر مشتمل ہے جہاں پر سیاہ پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں پر ایسے کاریگر اور ہنرمند موجود ہیں جو سیاہ پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر ان پر کندہ کاری کرتے ہیں اور سیاہ پتھروں سے دستی مہارت کے ساتھ مختلف اشیاء بناتے ہیں۔ ہری پور، مہاراجہ سردار ہری سنگھ نلوہ کا آباد کردہ شہر ہے جس کی بنیاد ہزارہ میں سکھ دور حکومت میں 1823ء میں رکھی گئی۔ یہاں پر انہی ایام میں قلعہ کرشن گڑھ بھی تعمیر کیا گیا، یہ شہر ایبٹ آباد کے جنوب مغرب کی جانب ہے جبکہ اس شہر کے جنوب مغرب کی جانب ٹیکسلا اور اٹک کا علاقہ ہے۔ اس کے شمال میں دریائے سندھ واقع ہے جہاں تربیلہ کے مقام پر دریائے سندھ پر تربیلہ ڈیم بنایا گیا ہے۔ ہری پور کے لوگ ہندکو بولنے والے ہزاروی ہیں اور ان کا رہن سہن اصلاً ہزارے کے لوگوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں پر پتھر کا کام کرنے والے اور لکڑی کی اشیاء بنانے والے دستکار موجود ہیں جو نہایت مہارت کے ساتھ پتھروں اور لکڑی سے آرائش وزیبائش کی چیزیں بناتے ہیں۔ ہری پور کے مشہور مقامات میں سرائے صالح، کھلابٹ، درویش، کوٹ نجیب اللہ، سری کوٹ، تربیلہ، سرائے گدائی اور سادات کے گھرانوں پر مشتمل کوکلیہ کا گاؤں اور خانپور اور بھیرہ ہیں۔ ہری پور کا علاقہ حطار ان دنوں صنعتی علاقہ کہلاتا ہے یہاں پر کارخانے ہیں۔ علاقے میں اب تک ایسے مکانات ہیں جو کہ پہاڑوں میں بنائے گئے ہیں۔

خانپور: ہری پور کے جنوب مشرق کی جانب خانپور کا وہ علاقہ ہے جہاں راجہ خاندان آباد ہے۔ یہاں پر مختلف پھلوں کے باغات ہیں۔ یہاں کا مالٹا بہت مشہور ہے اور اس مقام پر ایک ڈیم بنا دیا گیا ہے جسے خانپور ڈیم کہتے ہیں۔ مالٹے کے علاوہ لوکاٹ، لیچی اور کینو کے بھی باغات ہیں۔

غازی: یہ ہری پور کی مغربی جانب وہ مشہور مقام ہے جہاں کے لوگوں نے سکھوں کے خلاف اکثر لڑائیاں لڑی ہیں۔ اس لئے اس مناسبت سے اسے غازی کہا جاتا ہے۔ تاریخ ہزارہ میں یہ علاقہ سب سے پہلے دلہ زاکوں کا تھا۔ یہ ہری پور کا تحصیل ہیڈکوارٹر بھی ہے اور بالکل تربیلہ ڈیم کے ساتھ پنجاب کے ایک گاؤں حضرو کے ساتھ جڑا ہوا ہے جہاں کے زیادہ تر لوگ زمینداری اور کاشتکاری کرتے ہیں اور زمین بڑی زرخیز اور آباد ہے۔

پنیاں: یہ پنی قوم کا وہ علاقہ ہے جو ہری پور سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے مغرب میں ہے۔ پنی قوم کاکڑ کی اولاد میں سے ہے اور کاکڑ پٹھانوں کے جد اعلیٰ غورغشت کی اولاد میں سے ہیں۔ پنیاں کے علاقے کے درمیان قدیم آبادیاں ہیں۔ پنڈ مانکرائے اور پنڈ مندرا، یہ وہ قدیم آبادیاں ہیں جہاں غیر مسلم لوگ آباد تھے جنھیں کافر کہا جاتا تھا اور ان کی آبادیوں کو کافروں کی آبادی کہا جاتا تھا۔ ان کے زمانے کے کنوؤں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ پنی قوم کے لوگوں نے ان پر یورش کی اور وہاں آباد ہو گئے۔ سب سے پہلے پنی خان اس علاقے میں سلطان محمود غزنوی کے دور میں داخل ہوا اور اس کی قوم کے لوگ یہاں آباد ہوئے۔

سرائے گدائی خان: ملک گدائی خان کا آباد کردہ یہ گاؤں سرائے گدائی کے نام سے مشہور ہے جو حسن ابدال سے ہری پور روڈ پر واقع ایک چھوٹی سی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہاں ایک تاریخی مسجد ہے جو اس وجہ سے مشہور ہے کہ ایک صاحب کرامت بزرگ حضرت سید شاہ قبول اس مسجد سے کچھ فاصلے پر بھورہ شریف میں ایک غار میں عبادت و ریاضت کرتے تھے اور آدھی رات کو حضرت سید شاہ قبول اس مسجد میں آکر چھپ چھپاتے ہوئے کنویں سے پانی نکال کر اس کی ٹینکی کو بھر دیتے تھے تاکہ نمازیوں کو وضو کیلئے سہولت ہو یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا اس وجہ سے یہ مسجد آج تک اسی واقع کے ساتھ مشہور ہے۔

بھورہ شریف: بھورہ ہزارہ جاتی ہندکو میں غار کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل ایک ٹیلہ ہے جہاں قبرستان ہے۔ یہ پہاڑی تودے کے نیچے وہ غار ہے جہاں پر اللہ کے ولی حضرت سید شاہ قبول کشمیر سے آکر عبادت و ریاضت کرتے تھے اور مدتوں یہاں پر وہ مراقبہ میں رہے اسی مناسبت سے یہ علاقہ بھورہ شریف کہلاتا ہے۔

کوکلیہ: یہ گاؤں بھی ہری پور کے جنوب مغرب میں برلب سڑک واقع ہے اس گاؤں کی وجہ شہرت سید میر حسن شاہ گیلانی ہیں۔ اس گاؤں میں ان کی اولاد گیلانی سادات کے نام سے موجود ہے اسے سادات کا گاؤں بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر اب تربیلہ کے اُن باشندوں کے مکانات ہیں جو کہ تربیلہ ڈیم بننے کی وجہ سے اپنے علاقہ سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔

کوٹ نجیب اللہ: ترین قوم کے نجیب اللہ خان کے تعمیر کردہ قلعہ کے نام سے منسوب یہ گاؤں ہری پور کے مغرب کی جانب واقع ہے۔ جہاں ترین قوم کے اس نامور سردار نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ کوٹ کا مطلب قلعہ ہے۔ یہ ہری پور کے ضلع کا ایک مشہور و معروف دیہات ہے یہاں کچے اور پکے دونوں قسم کے مکانات ہیں۔ یہاں پر شاہ فتح حیدر عرف ننگا بابا مظفر آباد کے سائیں سہیلی بابا کے پیر بھائی تھے۔ کوٹ نجیب اللہ میں ان کا مزار بہت آباد اور مرجع خاص و عام ہے۔

سرائے صالح: سرائے صالح ہری پور کے مشرق کی جانب ہری پور سے متصل برلب سڑک ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں صالح خان نے آباد کیا تھا اور اسی کے نام پر سرائے صالح کے نام پر آباد ہے یہاں پر اب ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن، ٹیکنیکل کالج اور سرکاری سکول ہے۔ یہ گاؤں دریائے دڑ کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں پر دیہاتی اور شہری زندگی دونوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ پڑھے لکھے اور تاجر پیشہ ہیں۔ ہندکو زبان بولتے ہیں۔

گلی باغ: بفہ سے کچھ فاصلے پر ہزارہ کا ایک تاریخی دیہات ہے۔ یہاں سے دریائے سرن گزرتا ہے۔ یہاں ایک ایسی تاریخی کھنڈر نما عمارت ہے جو ایک دالان پر مشتمل ہے اس کے اوپر ایک گنبد بھی ہے مقامی لوگوں سے روایت ہے۔ یہی مقام ہے جو کہ پکھلی کے ترکوں کا دارالخلافہ تھا جو کہ سواتیوں سے پہلے یہاں کے حکمران تھے۔ یہاں پر حضرت راجہ دیوان باباؒ کا مزار ہے اور گلی باغ کی خصوصیت یہی مزار راجہ دیوان باباؒ کا ہے۔ راجہ دیوان باباؒ صوفی شاعر اور بزرگ حق گو ہستی تھے ترکوں کے زمانے میں ترک شہزادوں کے ظلم و جور اور عیش پرستی پر ان سے برسرپیکار رہے۔ ترکوں کے آخری شہزادے، شہزادہ اکبر خان نے انھیں شہید کروا دیا تھا اور گلی باغ میں اب ان کا مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے۔

نوکوٹ: یہ بفہ سے کچھ مسافت پر ایک مقام ہے۔ اس مقام پر ایک پہاڑی ٹیلہ پر ایک قلعہ نما پرانی عمارت ہے۔ یہ امیر کبیر سید علی شاہ ہمدانی المعروف شاہ ہمدان کی چلہ گاہ تھی۔ اب یہ ایک قلعہ نما بوسیدہ عمارت ہے جو اس جگہ کی ثقافتی اور اسلامی تاریخ

کی روایتی اور تہذیبی علامت ہے اس وجہ سے نوکوٹ کو خصوصیت حاصل ہے اور دور دراز سے لوگ اس مقام کی زیارت کیلئے آتے ہیں۔ اس کے اندرونی حصہ میں چاروں اطراف عمارت کے ستون ہیں۔ ایک ستون اندر سے غار نما ہو گیا ہے کہا جاتا ہے کہ اسی غار نما ستون کے اندر شاہ ہمدان مراقبہ اور چلہ کرتے تھے۔ وسطی ایشیاء کے تاجک اور افغانستان و ایران سے ان کے معتقدین یہاں اکثر دعا کیلئے آتے ہیں۔

خاکی: مانسہرہ کا ایک مشہور گاؤں جس کی وجہ شہرت خاکی نام کا ایک فقیر تھا جو اس مقام پر اُس وقت آیا جب کہ نشیبی علاقہ ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کے دست برد سے محفوظ نہ تھے۔ اس خاکی نام فقیر نے اس گاؤں کی بنیاد اونچے ٹیلے پر رکھ دی تب سے اس کا نام خاکی ہے۔

گڑھی حبیب اللہ: اس کی وجہ شہرت ایک قلعہ ہے جو کہ کشمیر کی سرحد پر اس مقام پر بنایا گیا ہے۔ گڑھی مقامی زبان میں قلعہ کو کہتے ہیں یہاں پر محمد سید خان سواتی حکمران تھا پھر اس کے بعد اس کا بیٹا نجیب اللہ سردار ہوا اور اس کے بعد حبیب اللہ تب سے اس مقام کو گڑھی حبیب اللہ کہا جانے لگا۔

جھیل سیف الملوک: شہزادہ سیف الملوک کی ایک (دیو مالائی) پری سے معاشقے کی لوک داستان سے منسلک ہونے کی وجہ سے یہ خوبصورت مقام جھیل سیف الملوک کے نام سے موسوم ہے اور یہیں اس کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔

روایت کچھ اس طرح سے ہے کہ شہزادہ دہلی سیف الملوک یہاں سیر و تفریح کیلئے آیا اور پھر 12 بارہ سال تک یہاں مقیم رہا اور چلاکشی کرتا رہا۔ یہاں پر دیو مالائی مخلوق جنوں اور پریوں کا ٹھکانہ تھا۔ پری بدیع جمال سے اس شہزادے کا معاشقہ ہو گیا جو دیگر تمام پریوں میں حسن و جمال کا پیکر تھی۔ شہزادے نے اس پری کو سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب وہ اپنی تین سو ساٹھ پریوں کے ساتھ نہانے کیلئے تالاب پر آئی شہزادہ اسے دیکھ کر دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا جب تمام پریاں اپنے کپڑے تالاب کے کنارے پر رکھ کر نہانے میں مصروف ہو گئیں تو شہزادے نے چپکے سے بدیع جمال کے کپڑے اٹھائے اور اس مقام سے بھاگ گیا نہانے کے بعد تمام پریوں نے اپنے اپنے کپڑے سمیٹے اور پہن کر اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ پس بدیع جمال اکیلی رہ گئی شہزادے نے اسے کپڑے دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وعدہ کرے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گی تب اسے کپڑے دیے جائینگے۔ پری بدیع جمال نے وعدہ کر لیا مگر اس پری پر ایک دیو بھی عاشق تھا جب اسے بدیع جمال اور شہزادے کے معاشقے کا علم ہوا تو سخت غضبناک ہوا اور جا کر جھیل کا ایک کنارہ توڑ ڈالا جس سے پانی ایک طرف کو بہنے لگا اور سارے نشیبی علاقے کی طرف سیلاب آنے لگا پری اور شہزادہ ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اس سے دونوں کی جانیں بچ گئیں اس کے بعد شہزادہ پری کو دہلی لے گیا اور شادی کر لی اور خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ اس واقع کے بعد یہ مقام جھیل سیف الملوک کے نام سے موسوم ہے۔ سیر و تفریح کیلئے بہت خوشگوار مقام ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح یہاں آ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

عطر شیشہ: مانسہرہ سے کچھ دور بالاکوٹ روڈ پر واقع ایک چھوٹا گاؤں عطر شیشہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں پر کوئی مغل بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ کچھ دن ٹھہرا جب وہ چلے گئے تو ملکہ اپنی خوشبو (عطر) اور شیشہ یہاں بھول گئی تب سے اس مقام کا نام عطر شیشہ رکھ دیا گیا۔ یہ مقام اونچے ٹیلے پر واقع ہے اور چند کچے مکانات ہیں۔ وہ مغل جہانگیر کی بیوی نور جہان تھی جو اس مقام پر سنگار کے لئے کشمیر جاتے ہوئے رُک گئی تھی۔

دھنکہ: یہ بھی مانسہرہ کا ایک گاؤں ہے۔ چند برس ہوئے ہیں کہ اس مقام نے بہت شہرت حاصل کر لی ہے اور اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں پر ان دنوں ایک زندہ پیر کا ٹھکانہ ہے۔ لوگ دور دراز سے اپنی منتوں اور دعاؤں کیلئے ان کے پاس آتے ہیں۔ تب سے یہ مقام دھنکہ کے نام سے شہرت حاصل کر گیا ہے۔

نگری ٹوٹیال: ہزارے کا ایک گاؤں جس کی وجہ شہرت ایک بہادر شخص ٹوٹے خان کی وجہ سے ہوئی۔ شروع میں اسے ٹوٹے خان کی نگری کہا جاتا رہا بعد میں یہ نام بدل کر ٹوٹے خان کی نگری سے ٹوٹیال ہو گیا اب اسی نام سے یہ مقام مشہور ہے۔

اباسین کوہستان: کوہستانی علاقوں میں اباسین کوہستان، جو کہ ہزارہ کوہستان کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ اب ہزارہ کا ایک ایسا ضلع ہے جو کہ ہزارہ کے شمال میں واقع ہے یہاں کے لوگوں کی زبان، لباس، رہن سہن سب کچھ ہزارہ کی باقی اقوام و خطوں سے جدا اور الگ تھلگ ہے، ان کی زبان گودری اور قومی شناخت شنا ہے یہ علاقہ اب تک تہذیبی تغیر اور زمانے ارتقاء سے محفوظ ہے اور قدیم تہذیب و ثقافت کا حامل وسیع پہاڑی علاقہ ہے یہاں پر گرمیوں اور سردیوں کا امتزاج رہتا ہے۔ البتہ سردیوں کے موسم میں شدت پائی جاتی ہے۔ اس کا قدیمی نام اباسین کوہستان ہے۔ اباسین دریائے سندھ کو کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے دریاؤں کا باپ۔ اس سارے

کوہستانی علاقے سے دریائے سندھ گزرتا ہے اس لئے سے دریائے سندھ کی خصوصیت کی بناء پر اس علاقے کو اباسین کوہستان لکھا گیا ہے۔ یہ شمالی علاقہ جات گلگت وغیرہ کی شاہراہ ہے جس کے آخر میں چین کی سرحد واقع ہے۔ چین نے پاکستان کے ساتھ دوستی کو فروغ دینے کیلئے اس علاقے کے پہاڑوں کے نیچے اور دریائے سندھ کے کنارے کنارے خوبصورت پکی سڑک بنائی ہے جسے شاہراہ ابریشم کا نام دیا گیا ہے۔

ذیل میں اباسین کوہستان، ہزارہ کے دیگر مقامات کی خصوصیات کے ساتھ علاقوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

رانولیا: یہ علاقہ حسن و جمال کے اعتبار سے مشہور ہے اور اس کی وجہ شہرت یہاں کے باشندوں کا حسن و جمال ہے۔

پٹن: خیر برکت کی وجہ سے مشہور ہے۔

کیال: یہاں پر ساگ کی پیداوار دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے اور یہ ہی اس کی وجہ شہرت ہے۔

کندھیا: بوقت ضرورت یہاں جنگ کے لیے لشکر دستیاب ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ علاقہ شہرت حاصل کر گیا ہے۔

بالگوٹ: باشندوں کے ضدی اور عناد رکھنے کے اعتبار سے شہرت حاصل کر چکا ہے۔

پالس: بناؤ سنگھار کے اعتبار سے اس کی شہرت ہے۔

دوبیر: یہاں اکثر علاقائی لوگوں کے معاملات کو طے کرنے کیلئے جرگے ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ علاقہ مشہور ہے۔

سلم کھنڈ: یہ ہزارہ کے ضلع ہری پور کا ایک گاؤں جس کی وجہ شہرت سمل کا ایک درخت ہے۔ اس کا قدیم نام اسی درخت کے نام پر سمل کھنڈ تھا بعد میں سمل کے بجائے سلم ہوا اور سلم کھنڈ پڑ گیا یہ گاؤں سکھوں کے دور میں کئی مرتبہ جلایا گیا اور بار بار آبادی ہوتی رہی۔

بھورہ شریف: ہزارہ جاتی ہندکو میں بھورہ غار کو کہتے ہیں۔ یہ ایک قبرستان ہے جہاں حضرت سید شاہ قبول کی اولاد گیلانی سادات کی قبریں ہیں اور پہاڑی کے نیچے وہ غار ہے جہاں پر عرصہ دراز تک حضرت سید شاہ قبولؒ نے مراقبہ اور چلہ کیا تھا۔ اس مقام کی وجہ شہرت یہی غار ہے اس وجہ سے اسے بھورہ شریف کہا جاتا ہے۔

تربیلہ: طاہر خیلی قوم کا مسکن ہے جو ہزارہ کی ایک نامور قوم ہے۔ یہاں پر بہت بڑا ڈیم ہے۔

روپڑ: ہزارہ کے گاؤں لورہ کی ایک آبادی ہے یہاں پر الحاج مستانہ قلندر کی گدی ہے اور اب یہاں پر ان کا مزار ہے۔ اسی نسبت سے اسے روپڑ شریف کہا جاتا ہے اور یہی اس کہ وجہ شہرت ہے۔

تاریخ ہزارہ

علاقہ ہزارہ جو دو دریاؤں مشرق کی طرف دریائے جہلم اور مغرب کی جانب دریائے سندھ کے درمیان پہاڑی اور میدانی علاقوں پر مشتمل ہے اس علاقہ کی زیادہ تر تاریخی اہمیت اس کے پہاڑی اور گرمائی علاقوں کی وجہ سے ہے جہاں پر سردیوں میں برفباری ہوتی ہے اور گرمیوں میں موسم خوشگوار اور پہاڑوں پر ہریالی ہوتی ہے۔ ہزارہ کے گلیات کے علاقوں کے علاوہ کاغان وناران کے علاقے بھی سرد ہیں اور تفریحی مقامات میں شمار ہوتے ہیں۔ 227 ق م میں جبکہ سکندر اعظم نے کوہ ہندوکش کے راستے برصغیر میں قدم رکھا تو اُس وقت ہزارہ کا پرانا نام اُراشہ تھا اور اسی نام کی مناسبت سے رش کا میدان اس کے علاقہ کو کہا جاتا ہے۔ سکندر اعظم کے ٹیکسلا پہنچنے کے وقت اس علاقہ کا حکمران ''ارسکیز'' تھا۔ ٹیکسلا جو کہ علمی اور تہذیبی لحاظ سے مالا مال شہر تھا یہ ہزارہ کی سرحد پر واقع تھا اور ہزارہ کے لوگوں نے بھی سکندر اعظم کے اقتدار کے سورج کے سامنے اطاعت کا اظہار کیا اور پھر سکندر کے بعد جب چندر گپت موریا، جو کہ موریہ خاندان میں سے تھا وہ کوتلہ چانکیہ کی ذہانت کے بل بوتے پر تخت اقتدار پر متمکن ہوا تو یہ ہزارہ کا علاقہ جسے اُراشہ کہتے تھے چندر گپت موریا کہ زیر تصرف آ گیا۔ اس دور میں ہزارے کا علاقہ ٹیکسلا کا ایک صوبہ تھا اور چندر گپت موریا کا پوتا مہاراجہ اشوکا اس خطے کا گورنر رہا تھا جس نے اپنے فرامین ایک پتھر پر کندہ کروائے جو کہ اب تک ہزارہ کے علاقہ ضلع مانسہرہ کے بریڑی پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہیں جنھیں اشوکا کی چٹانیں کہا جاتا ہے۔

جین مت اور بدھ مت کے پیروکاروں یعنی چندر گپت موریا اور مہاراجہ اشوکا کے بعد اس علاقے میں جس راجے کی حکومت کی شہرت آج بھی ہے وہ راجہ رسالو ہے جس نے تقریباً 2000 سال پہلے پنجاب کے علاقہ سیالکوٹ میں ساکا حکمرانوں کو شکست دی اور اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ راجہ رسالو راجہ سالباہن کا بیٹا

اور نہایت بہادر اور خوبصورت نوجوان تھا۔ یہ اپنی حکومت کو وسعت دینے کی خاطر شمالی سرحدات کی طرف بڑھا اس وقت ٹیکسلا میں راجہ سری کپ کی حکومت تھی۔ راجہ رسالو نے راجہ سری کپ جو کہ تاریخ میں بدطینیت اور ظالمانہ کردار کے ساتھ منسوب ہے، سے نبرد آزما ہونے کیلئے راجہ رسالو اس کی سلطنت کی طرف آنکلا اور یہاں پر اُس وقت کا شاہانہ کھیل "چوپڑ" راجہ سری کپ سے کھیلا۔ اس کھیل میں راجہ رسالو نے اپنی جواں مردی اور عالی ہمتی کا لوہا منوایا اور کئی حسیناؤں کو اپنی شخصیت سے مرعوب کیا۔ سری کپ کی ایک رانی تھی اس نے جس وقت راجہ رسالو کو راجہ سری کپ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اُس کے ارادوں سے اسے باز رہنے کی تلقین کی۔

بہرحال ٹیکسلا بشمول ہزارہ راجہ رسالو کی حکومت قائم ہوگئی اس علاقے سے متعلق راجہ رسالو کی بہت سی یادداشتیں موجود ہیں۔ ایبٹ آباد کے مشرق کی طرف سربن پہاڑ میں وہ غار، تاریخی اہمیت کا حامل ہے جہاں راجہ رسالو شکار کے بعد آرام کیا کرتا تھا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی

ہزارہ کی سرزمین کی تاریخی اور ثقافتی حیثیت کا تعین اُن قدیم اقوام کی آمد کے دور سے ہی کیا جاسکتا ہے جب مغرب سے آئی ہوئی اقوام دریائے سندھ کو عبور کر کے شمال اور جنوب سے اس سرزمین میں داخل ہوئیں ان میں بعض اقوام وہ ہیں جو اپنی مخصوص ثقافت کے ساتھ ہزارہ میں داخل ہوئیں اور ہزاروں سالوں کے گردش لیل ونہار کے باوجود اپنی بود و باش اور طرز زندگی کو تبدیل نہ کر سکیں اور اب تک اپنی منفرد ثقافت کے ساتھ ہزارہ کی سرزمین پر زندگی بسر کر رہی ہیں۔

پھر جب منگول مغرب سے مشرق کی طرف آئے تو ان منگولوں کے ہم زاد سرزمین ہزارہ پر ترک حکمرانوں کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے اور پھر جب اسلام اس علاقے میں آیا تو اسلام کے پیروؤں کی حیثیت سے کئی اور اقوام، سواتی، تنولی، قریشی، جدون، ترین، عباسی اور سید پنی سرزمین ہزارہ میں داخل ہوئیں کہ اب تک اپنی منفرد پہچان کیساتھ سرزمین ہزارہ میں گزر بسر کر رہے ہیں۔

زبان: یوں تو ہزارہ کے تمام علاقے کی زبان ہندکو ہے۔ اگرچہ یہاں پر وہ اقوام بھی ہیں جن کی مادری زبان ہندکو نہیں۔ وہ ایسی اقوام ہیں جو کہ دریائے سندھ کے مغرب کی طرف سے خصوصاً یوسف زئیوں کے علاقوں سے اس طرف آنے کی وجہ سے اب تک اپنی زبان پشتو بولتے ہیں مگر علاقے کے اثر کی وجہ سے وہ ہزارہ جاتی ہندکو بھی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ ہزارہ جاتی ہندکو پشاور میں بولی جانے والی احمد علی سائیں کی ہندکو جیسی نہیں بلکہ یہ ایک ایسی مخصوص ہندکو ہے جس کا لہجہ پورے ہزارے میں ایک ہی طرح کے ہیں اور ان کی زبان کو پوٹھوہار، کی پنجابی زبان بولنے والے بھی اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں اور پشاور کے ہندکو دان بھی بہتر طرح سے ان کی زبان کے لہجے اور مفہوم کو سمجھتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہزارہ کی عام فہم زبان کی شناسائی صوبہ سرحد کے انتہائی جنوبی ریجن ڈیرہ اسماعیل خان تک ہے جو کہ سرائیکی زبان بولتے ہیں۔ یہ مقبول عام زبان رکھنے والے آپس میں لہجوں کے تبادلوں کا گر بہتر طرح سے جانتے ہیں کیونکہ ان کے بعض علاقوں کی زبان کے لہجے اپنے علاقائی جغرافیے سے بھی منسلک ہیں مثلاً پہاڑی زبان اُن لوگوں کی زبان کو کہا جاتا ہے جو کہ ہزارہ کے پہاڑی علاقوں کے باشندے ہیں مگر زبان وہی ہزارہ جاتی ہے صرف لہجوں میں فرق ہے ان لہجوں میں تبادلے کا ہنر ایبٹ آباد جیسے متمدن علاقے کے لوگ بخوبی جانتے ہیں اسی طرح گجروں کی زبان جو کہ ہزارہ کی ہندکو سے قطعی طور پر مختلف ہے پھر بھی یہ گجر لوگ اپنی گوجری زبان کے علاوہ ہزارہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہندکو بولتے ہیں گو کہ وہ لوگ جو کہ گوجروں میں سے خانہ بدوش لوگ ہیں یا صرف اپنے علاقوں تک محدود پہاڑوں میں رہنے والے اور صرف بھیڑ بکریاں اور گائے بھینس پالنے والے گوجر ہیں۔ یہ دوسرے علاقوں سے الگ تھلگ ہیں اس لئے یہ لوگ آپس میں صرف گوجری زبان ہی بولتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزارہ کے انتہائی شمالی علاقہ کوہستان میں رہنے والے وہ کوہستانی لوگ جنہیں بساچہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ہزارہ کی مخصوص کی شناخت اور اپنی جدا تہذیب و ثقافت اور رہن سہن رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں جو زبان رائج ہے اسے شنا کا نام دیا گیا ہے اور اسی شنا کی شناخت کے لحاظ سے انھیں شنا قوم بھی کہا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو ہزارہ کی ہندکو سے مکمل طور سے ناواقف ہیں۔ گو کہ یہ لوگ پشتو بولتے اور لکھتے مگر ہندکو سے یہ بالکل الگ تھلگ رہے ہیں۔ نہ ان کی زبان کو ہزارہ کے دوسرے علاقوں کے لوگ سمجھتے ہیں اور نہ یہ لوگ ہزارہ کے ہندکو دان لوگوں کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ چونکہ ان علاقوں کے لوگوں کو دردی بھی کہا گیا ہے اور ان کے علاقوں کو دردستان کہا گیا ہے اسلئے ان کے ہاں بولی جانے والی زبان کو داردی زبان کہا جاتا ہے۔

ہزارہ میں بولی جانے والی زبانیں درجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہندکو　　(ہزارہ جاتی ہندکو)

۲۔ پشتو　　(جو ہزارہ کے سواتیوں کی زبان ہے)

۳۔ گوجری　　(گجروں کی زبان)

۴۔ شنایا داردی　　(کوہستانیوں کی زبان)

۵۔ پہاڑی　　(گلیات میں رہنے والوں کی زبان)

ہزارہ میں پشتون کی ایک کثیر تعداد اپنی زبان پشتو چھوڑ کر ہزارہ جاتی ہندکو بولتے ہیں۔ جیسے جدون، تنولی ترین طاہر خیلی اور بہت سے پہلے پشتون قبائل مگر بہت سے پشتون ہزارہ میں آباد ہونے کے باوجود اب بھی اپنی زبان پشتو بولتے ہیں۔ جیسے بٹگرام، مانسہرہ کا زیادہ حصہ ہری پور کا سریکوٹ وغیرہ کے علاقے۔

قومیں

کاشتکار قومیں: ہزارہ میں وارد ہونے والی متعدد ایسی قومیں ہیں جو ابتداء میں کاشت کاری کرتی رہی ہیں۔ ان میں گجر، سواتی، جدون اور تنولی سب شامل ہیں۔ مگر بعد میں جب انہوں نے ان زمینوں پر قبضے کر لئے تو یہ زمینوں کے مالک بنتے گئے اور تعلیم اور تجارت کے دوسرے پیشوں سے بھی منسلک ہوتے گئے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان اقوام کے تمام افراد زمیندار بنے ہوں بلکہ اب بھی بہت سے افراد ہر قوم میں بحیثیت دہقان زمینوں کی کاشت کرتے ہیں۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک جن اقوام کے افراد کثرت سے ہیں۔ ان میں گجر، ڈھونڈ، سواتی اور جدون شامل ہیں۔ علاوہ ازیں تجارتی معاملات کے تقاضوں کے پیش نظر دوسرے تجارتی پیشوں سے بھی ان قوموں کے باشندے وابستہ ہو گئے چونکہ گجروں کی اکثریت وہ ہے جنھوں نے ابھی تک اپنی قدیم ثقافت و رہن سہن کو اپنے ہاں محفوظ کر رکھا ہے اسلئے یہ لوگ بھیڑ، بکریوں اور گائے وغیرہ پالنے کے ساتھ اپنی زمینوں پر کاشت بھی کر رہے ہیں اور ابھی تک ان میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ہزارہ میں اس وقت صرف دو علاقے ہی ایسے ہیں جہاں پر ان کی قدیم روایتی زندگی کو دیکھا جا سکتا ہے اور ثقافتی پہچان میں ان کو اولیت دی جا سکتی ہے ان میں ایک تو یہی گوجر ہیں جو کہ شنکیاری سے اوپر دریائے سرن کے پاس مالیا میں سکونت رکھتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جنھیں کوہستانی کہا جاتا ہے جو شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ آباد ہیں ان میں کچھ تو وہ ہیں جو دریائے سندھ مشرقی کنارے پر ہیں ان کو پار پتی کہتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر بستے ہیں ان کے علاقوں کو آر پتی کہا جاتا ہے۔

کمہار: ہزارہ کے ضلع ایبٹ آباد کے ڈوڈیال شہر میں مٹی کے برتن بنانے والے بہت سے کمہار گھرانے آباد تھے۔

گجر: تاریخ ہزارہ کے مطابق یہاں ان میں تین بڑی اقوام ہیں۔ ڈھونڈ، کرڑال اور گجر۔ باقی جتنی بھی اقوام ہیں وہ بعد میں اگر مغرب سے آئے ہیں تو دریائے سندھ کو پار کر کے اس سرزمین پر آباد ہوئے یا پھر مشرق کی طرف سے آنے کی صورت میں براستہ جموں و کشمیر یہاں پر وارد ہوئی ہیں۔ ان سب میں گجر وہ باشندے ہیں جن کے وارد ہونے کا زمانہ گندھارا میں ویدوں کے زمانے سے پہلے کا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا وید میں ذکر استاد گووئے یا ست گوئے کے سنسکرتی الفاظ کے ساتھ ہوا ہے۔ اگرچہ آریائی دور یا اس سے بھی پہلے گندھارا کے وطن میں ان کا دخول ثابت ہوتا ہے جو کہ ترک قبائل سے ہیں اور ہمیشہ سے مال مویشی پالنا اور زمینوں کی کاشت کے ذریعے اپنے لئے اور اپنے مال مویشیوں کیلئے خوراک مہیا کرنا تھا۔ اگرچہ ان کا پہلا مسکن گندھارا کی سرزمین کا مرکزی خطہ پشاور تھا مگر ان کا اضافہ انھیں اس بات پر آمادہ کرتا رہا کہ وہ مختلف اطراف میں پھیل جائیں۔ یہ گجر ہزارہ کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں مگر ان کا اصل مسکن مانسہرہ کے مغرب میں شنکیاری کے نزدیک پہاڑی علاقہ مالیا ہے۔ ان میں بعض تو وہ ہیں جو کہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں اور گرمیوں میں پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں اور سردیوں میں مال مویشیوں کے ساتھ میدانی علاقوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ ان کا رہن سہن قدیم ثقافتی اور روایتی زندگی کی عکاسی کرتا ہے یہ نہایت محنتی لوگ ہیں انکی اپنی زبان اپنا لباس اور رہن سہن ہے۔ یہ لوگ گوشت بہت کم کھاتے ہیں، دودھ، مکھن، لسی اور مکئی کی روٹی ان کی خوراک ہے۔ ساگ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں اور سبزیاں اُگاتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں۔ ان کی زبان گوجری ہے۔ حال ہی میں ان پر جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق ان کے ایک سو ایک خاندان ہیں ان گوجروں میں بعض وہ خاندان بھی ہیں جو کہ ایک ہی مقام پر کچے مکانات یا خیموں میں رہ رہے ہیں۔ ان کی گوجری زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو کہ ہزارہ کی دیگر اقوام کیلئے ناقابل فہم ہیں۔ گرمیوں میں یہ جن خاص مقامات پر بسیرا کرتے ہیں ان میں سرن ویلی اور کونش ویلی کے پہاڑ ہیں مگر زیادہ تر کونش ویلی میں پائے جاتے ہیں۔ مکئی لسی اور ساگ کی خوراک کے علاوہ یہ خاص موقعوں پر چاول ابال کر کھاتے ہیں جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ گوشت بہت کم کھاتے ہیں۔ جب ان کی کوئی بھیڑ، بکری یا گائے ناتواں ہو جائے تو اسے ذبح کرتے ہیں اور اس کا گوشت آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ پنیر یہ لوگ خود بناتے اور کھاتے ہیں۔ ان کا لباس آگے سے کھلا ہوتا ہے اور سر پر پگڑ ضرور باندھتے ہیں۔ بھیڑ کی اون سے ان کی خواتین شالیں بناتی

ہیں۔ان کی شلواریں اور کرتہ چغہ جیسا ہوتا ہے۔ جسے یہ لوگ اپنی زبان میں ماہیا کہتے ہیں۔تاریخ گجر کے مولف رانا حسن علی خان کے مطابق یہ اصلاً آریہ کھشتری ہیں جن کی مادری زبان سنسکرت تھی پھر یہی زبان گجراتی ہوئی اور باہر جانے پر گوجری ہوئی۔ان کی مذہبی کتاب گیتا تھی اور ابتدائی مذہب ویدک تھا۔

بہر حال یہ ایک قدیم قوم ہے جو دوسرے علاقوں کی طرح ہزارہ کے پہاڑی علاقوں میں منفرد شناخت کے ساتھ زندہ ہے۔اب ان کا مذہب اسلام ہے۔

کرڑال: کرڑال قوم کا مورث اعلیٰ گلر شاہ بزرگ تھا، تاریخ ہزارہ کے مصنف ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی تحقیق کے مطابق یہ کرڑال قوم کے باشندے بہ عہد سلطنت چغتائی جو کہ منگول تھا اس وطن میں آکر آباد ہوئے اس کے سردار گلر شاہ نے علاقہ ہزارہ کے ناڑہ پر قبضہ کیا اور یہاں آباد ہو گیا۔پھر کرڑال پھیلنے لگے اور جب مورچہ کلے خان کا دور شروع ہوا تو ان پر گکھڑ قبضہ گیر ہونے لگے اور گکھڑوں نے جہلم سے اس طرف کا رُخ کیا مگر مورچہ کلے خان نے ان کے تسلط کو قبول نہ کیا تو گکھڑ زبردستی قابض ہو گئے اور مورچہ کلے خان کو گکھڑوں کے راجہ نے قید کر لیا اور اسے یہاں پر قیدی بنا کر چلا گیا۔اس پر مورچہ کلے خان کرڑال نے قسم کھائی کہ جب تک اس گکھڑ راجے کو قتل نہ کرے اس پر کھانا حرام ہے سو اپنے اس قول کی لاج رکھتے ہوئے یہ راجہ قوم گکھڑ کے درپے آزار ہو گیا اور بالآخر اس نے اپنی قوم کی حمایت کے ساتھ اسے قتل کر دیا بعد میں سکھوں کے دور میں امر سنگھ مجیٹھیہ نے ناڑہ پر حملہ کر کے اس علاقے کو فتح کر لیا اور یہاں پر اپنی حکومت کے استحکام اور دفاعی حکمت عملی کے زیر اثر ایک قلعہ تعمیر کیا جو قلعہ ناڑہ کے نام پر مشہور ہوا لیکن کرڑال بھی چین سے نہیں بیٹھے اور انہوں نے سکھوں کے راجہ کو قتل کر کے یہ علاقہ ان سے واگزار کروالیا لیکن سکھوں اور کرڑالوں کے درمیان سلسلہ مخاصمت جاری رہا۔سکھوں نے اس علاقے پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کیلئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جب ہری سنگھ نلوہ کی ہزارہ میں حکومت قائم ہوئی تو اس سکھ سردار نے ان پر یلغار کی مگر کرڑالوں کے سردار حسن علی خان اور سردار احمد علی خان نے صلح کی راہ اپنا کر ان سکھوں سے مصالحت کر لی اور قلعہ ناڑہ پر سکھوں کا قبضہ رہا۔1849ء میں انگریزوں کے عہد میں جب ناڑہ پر قبضہ ہوا تو انگریزوں نے قوم کرڑال کی جاگیری بحال کر دی اور بہت سا علاقہ جدونوں کے قبضہ میں چلا گیا۔کرڑال قوم کے باشندے کوہ مری اور ہزارہ کے میدانوں کے درمیان پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔کرڑال قوم کے لوگ آپس میں بھی ناچاقی کی حالت میں دنگا اور فساد میں رہتے تھے اور باہمی سرداروں کا قتل ان میں جاری رہتا تھا جس کی وجہ سے کبھی ایک سردار ہوتا اور کبھی دوسرا، ان کی سرداری اور جاگیرداری میں جو قصبات شامل ہیں ان میں پانچ قصبات بہت مشہور ہیں، گلی پھٹ گراں، بٹولنے، ترموچھا، سروالہ اور سریلہ۔کرڑالوں کے دو خاندانوں میں سرداری نصف نصف رہی ہے، ان میں ایک خاندان ڈبران ہے اور دوسرا منال۔

ڈھونڈ: یہ ڈھونڈ باشندے ہزارہ کے پہاڑی علاقہ کے باشندے ہیں جو کہ پہاڑی ہندکو بولتے ہیں۔زیادہ تر ڈونگا گلی کے پہاڑی سلسلوں میں آباد ہیں۔ہزارہ کے علاقہ کے ساتھ مری کے علاقہ میں بھی یہ لوگ آباد ہیں ان کے قابل ذکر اور سرکردہ خاندان بکوٹ اور مجوہاں میں آباد ہیں۔تاریخ ہزارہ کے شیر بہادر خان پنی انہیں جھگڑالو، طبعاً شرارتی اور فتنہ پرداز قرار دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی دوسری قوم کا تسلط قبول نہیں کیا، اور انگریزوں نے جب پہاڑی علاقوں کو گرمائی مرکز بنانا چاہا تو میجر ایبٹ جو کہ اُس وقت ضلع ہزارہ کا زیرک ڈپٹی کمشنر تھا اور وہ تمام علاقوں اور علاقوں کے مضافات میں بسنے والی اقوام کی خوبو سے بخوبی واقف تھا انہوں نے انگریز سرکار کو اس اقدام سے منع کرنے کی سفارش کی اور کہا تھا کہ ان پہاڑوں میں رہنے والے ڈھونڈ قوم کے لوگ فتنہ پرداز، اور سرشت شریر لوگ ہیں اور انہوں نے کبھی بھی باہر سے آنے والی قوموں کے تسلط کو قبول نہیں کیا۔یہ لوگ جسمانی ساخت کے لحاظ سے نہایت مضبوط اور توانا واقع ہوئے ہیں۔ڈھونڈ قوم کے سربرآوردہ اشخاص کا مسکن لورہ بھی ہے۔یہ لوگ مذہباً مسلمان ہیں مگر اسلامی تعلیمات اور شریعت سے بہت دیر تک ناواقف اور بیگانہ رہے ہیں۔ان کے ہاں جو رسومات و رواج ہیں وہ قدیم ہندوؤں کی رسومات و رواج سے مشابہ ہیں بلکہ بعض تو ہندو رسومات کی عکاسی کرتی ہیں اور وہ ان رسومات کی ادائیگی میں بہت پختہ کار واقع ہوئے ہیں۔

ڈھونڈ کے دو بڑے قبیلے ہیں ایک قبیلے کا نام چندپال اور دوسرے کا نام اتیال ہے۔یہ دونوں راجپوت سرداروں کی اولاد میں سے ہیں جن کے باپ کا نام راہی تھا اور دہلی کے قریب تر ایک علاقے کا راجہ بنا تھا۔یہ دونوں قبیلے ایسے ہیں جن کے لوگوں میں ہندوانہ تہذیب کے نشانات اب تک پائے جاتے ہیں مثلاً چھوت چھات اور شادی کے طور طریقے۔

ضلع ہزارہ میں ڈھونڈ قوم کی چھ مشہور و معروف شاخیں ہیں:

۱، پیتال۔۲، گبرال۔۳، ایجال۔۴، لہرال۔۵، بڈھڑیال۔۶، بہاگر تھال۔اس قوم اور اس قوم کی شاخوں کے باشندے کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بحیثیت قوم ان کا پیشہ کاشتکاری ہے۔

ترک: ترک قوم کے لوگ مغلوں کی آمد سے پہلے ہزارہ میں موجود تھے اور ان کی حکومت ہزارہ کے وسیع وعریض علاقہ پر مشتمل تھی۔ یہ حکومتی جاہ جلال رکھتے تھے۔ جب تیمور 1399ء میں براستہ کشمیر ہزارہ میں داخل ہوا تو اُس وقت ہزارہ کے میدان پکھل، میدان رش اور تناولیوں کے بہت سے علاقوں تک ان ترکوں کی حکومت تھی۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس علاقہ کا نام ہزارہ کی وجہ تسمیہ تیمور کے ایک ہزار تیموری نسل کے سپاہ پر مشتمل لشکر کے یہاں قیام کی وجہ ہے اور تیمور کی اس علاقے میں اپنی ذاتی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک ہزار فوجیوں کے دستے کو یہاں تعینات کرنے کا پس منظر بھی ان پہلے سے موجود ترک نسل کے لوگوں کے اقتدار کو مزید تقویت دینا تھا۔

پکھل کے سارے علاقے پر ترکوں کی حکمرانی تھی اور جب ترک حکمران محمود شاہ کا دور تھا تو اس وقت سوات کے علاقے کی طرف سے سید جلال بابا (جو کہ سید علی ترمذ المعروف پیر باباؒ کی اولاد میں سے تھے) وہ اور اس کے معتقدین اس علاقہ میں داخل ہوئے۔ (جب سید جلال بابا اور ان کے مریدوں نے علاقہ سوات سے کوچ کیا تو اُس وقت ان کے علاقہ پر سلطان پکھل کی حکومت تھی اسلئے وہ جب یہاں پہنچے تو حصول اقتدار کے بعد اس علاقے کا نام انہوں نے پکھل رکھ دیا) اس علاقہ میں سید جلال باباؒ کا اثر ونفوذ بڑھنے کے ساتھ ساتھ سواتی پشتون کی تہذیبی زندگی بھی اس علاقے پر اثر انداز ہونے لگی تھی اس پھیلتے ہوئے اثر ونفوذ کی وجہ سے ترکوں کو خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں ہمارے اقتدار کا سورج غروب نہ ہو جائے چنانچہ سیاسی مصلحت کے زیر اثر محمود شاہ ترک نے سید جلال باباؒ کے عقد میں اپنی لڑکی دے کر ان سے رشتہ داری قائم کر لی لیکن پھر بھی سواتی پشتونوں یا پختونوں سے خوف کا یہ احساس ختم نہ ہوا تو محمود شاہ نے خفیہ طور سے سید جلال باباؒ پر حملہ کر دیا سید جلال باباؒ کو اسی سازش کا علم ہو گیا تو سوات سے مزید کمک بلالی اور ترکوں پر حملہ کر دیا اسطرح انہوں نے ترکوں کو شکست دیکر پکھل کے علاقے کا انتظام وانصرام 1700ء میں خود سنبھال لیا اس علاقے کا رقبہ لمبائی میں مانسہرہ سے اچھڑیاں تک اور چوڑائی میں ڈاڈر سے تناول تک جا لگتا ہے، جب سواتیوں کے زیر تسلط یہ علاقہ ہوا تو اُس وقت ترکوں کا دارالخلافہ گلی باغ تھا۔

سواتی: جیسا کہ ترکوں کے زوال کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ سوات میں سلطان پکھل کے دور میں سید جلال باباؒ اور ان کے ہمراہ ان کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ کے علاقہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ترکوں کے حکمران محمود شاہ کو شکست دیکر 1700ء اور 1800ء کے درمیان اس علاقہ پر اپنی حکومت قائم کر لی اور اسی پورے علاقے کا نام سلطان پکھل کے نام پر پکھل میدان رکھ دیا۔ تہذیبی اور ثقافتی حیثیت سے ہزارہ کی کل بڑی قوموں میں سے سواتی قوم کا شمار دوسری بڑی قوم کے ہوتا ہے جو کہ اس وقت مانسہرہ اور مضافات سے لیکر علاقہ کوہستان کی سرحد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی پٹھان روایات کے ساتھ تہذیب وثقافت اور زبان کے ساتھ یہاں پر رہ رہے ہیں۔ یہ اپنی پختون روایات اور زبان وہنر کے ساتھ ساتھ ہزارہ کی ہندکو میں بھی کمال مہارت رکھتے ہیں اور اس وقت ہزارہ کی ہندکو اور سوات کی فصیح پشتو زبان کے بھی وارث ہیں۔

تنولی: یہ ہزارہ کی ایک اہم اور قابل ذکر قوم ہے۔ تنولیوں کی دو بڑی شاخیں ہیں (۱) پلالی (۲) ہندوالی، یہ قوم ہزارہ کے انتہائی شمال مغربی کنارے پر آباد ہے۔ ان کی دو ریاستیں تھیں اپر تناول اور لوئر تناول، پلالی تناول سردار ممارا خان پلال کے اسلاف ہیں اور ہندوالی تناول سردار گل محمد خان ہندوال کے اسلاف میں سے ہیں۔

سب سے پہلے سردار ممارا خان پلال کی سرگردگی میں تنولی دریائے سندھ کو پار کر کے اس کے مشرقی کنارے کے علاقوں میں آباد ہوئے۔ یہ واقع 8، اپریل 1472ء کا ہے جبکہ سردار ممارا خان پلال نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے عشرہ سے اپنی قوم کے ساتھ ہجرت کی اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ کے انتہائی دشوار گزار اور پہاڑی سلسلوں میں آباد ہوئے اس وقت اس سارے علاقے پر ترکوں کی حکومت تھی اور گلی باغ کے مقام پر انکا دارالخلافہ تھا ترکوں کو ان کی آمد اور ہزارہ پر ان کا تسلط ناگوار محسوس ہوا تو اُس وقت کے ترک حکمران سلطان شہاب الدین نے ان تنولیوں کی گوشمالی کیلئے اپنے بیٹے سلطان دریا خان کو بھیجا جو تنولیوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے بارہ ہزار کے لشکر کو لیکر ان کے مقابلے کیلئے نکلا۔ ادھر سردار ممارا خان پلال نے بھی اپنے چار ہزار شمشیر زن کو منظم کیا اور دونوں فوجوں کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی تنولی بڑی بے جگری سے لڑے اور ترکوں کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، ترک لشکر میدان سے بھاگ گیا تو شکیاری کے ہندو راجہ چندر نے تنولیوں پر چڑھائی کر دی ابھی تنولی ترکوں کے ساتھ نبرد آزمائی سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ راجہ چندر کی سپاہ راجہ کی قیادت میں تنولیوں کے سامنے کھڑے تھے مگر تنولیوں کے سردار پلال نے اپنے جنگجو بہادروں کو غیرت دلائی جس پر یہ سب مقابلے کے لئے دوبارہ تیار ہو گئے اور نہایت قلیل اور تھکے مارے تنولیوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ راجہ چندر کا مقابلہ کیا اور راجہ کو گھیرے میں لے کر اسے قتل کر دیا۔ راجہ کے قتل

ہونے کے بعد اس کے سپاہی میدان سے بھاگ گئے تو تنولیوں نے ان معرکوں سے فراغت پانے کے بعد اس علاقے میں اپنی ریاست پلالی کی داغ بیل ڈال دی۔ تنولی ہزارہ کے ایک وسیع عریض رقبے پر قابض ہو گئے۔ ان کا علاقہ پہاڑی اور سرسبز ہے اور سطح سمندر سے 5400 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ان کے علاقے مشرق کی جانب پکھلی اور مانسہرہ تک ہیں، شمال میں وادی اگرو دارو جنوب میں ہری پور کا علاقہ اور مغرب میں تربیلا جھیل ہے، یہ مغربی علاقہ جو شروع میں ریاست امب کے نام سے مشہور تھی اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت یہ ہے کہ یہاں پر سکندر اعظم 327 ق م میں گزرا اور یہاں پر قیام بھی کیا تھا تاریخی حوالوں سے اسی علاقے کی اہمیت اس سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے نامور اور شہرت یافتہ انقلابی لیڈر سبھاش چندر بوس کا قیام یہاں رہا ہے۔

رابٹسن کے مطابق یہ مغل قوم میں سے برلاس خاندان کے لوگ ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام امیر خان تھا جس کے دو بیٹے تھے (۱) پال خان (۲) ہندو خان، پلالی تنولی پال خان کی اولاد ہیں اور ہندوالی تنولی ہندو خان کی اولاد ہیں۔

تنولی قوم کی مشہور شاخیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) میراں (۲) سیداں (۳) بنیال (۴) بینکر پال (۵) کرگوال (۶) نری تال (۷) بھجوال۔

بعد میں سکھوں کے دور میں سردار ہری سنگھ نلوہ کے ساتھ تنولیوں کے مقابلے ہوتے رہے۔

جدون: جدون ہزارہ کی وہ قوم ہے جسے تاریخ میں ابتدائی طور پر گدون لکھا گیا بعد میں گاف کو جیم سے بدل کر جدون کہا گیا۔ یہ کاکڑ قبیلے کی ایک شاخ ہے لوگ زیادہ تر تعلیم یافتہ ہیں ان کا مورث اعلیٰ اشرف خان تھا جس کے دو بیٹے سیدا خان اور مفور خان تھے۔ سیدا خان کی اولاد سلاری مشہور ہوئی اور مفور خان کی اولاد مفوری۔ سالار جدون ہزارہ کے علاقہ رجوعیہ سے ہیں جو کہ کڑ والوں کا علاقہ رہا ہے اور مفور جدون کا علاقہ دھنوڑ و مانگل ہے۔

جدون بطور کاشتکار ہزارہ میں دریائے سندھ کو پار کر کے اس کے مشرق کی طرف منتقل ہوئے یہ نسلاً پٹھان ہیں۔ ابتداء میں انہوں نے دلازاکوں اور ترکوں سے زمین لے کر اس پر کاشت کی مگر بعد میں ان زمینوں پر مالکانہ حقوق حاصل کر کے ہزارہ کی نامور قوم کے طور پر بسنے لگے، ہزارہ کے علاقہ پکھل میں بھی انہوں نے سواتیوں سے زمینیں حاصل کیں اور ان پر کاشت کی مگر جونہی انہوں نے زمینوں پر مالکانہ حقوق حاصل کر لئے تو اپنے ہم قوم مزید لوگوں کو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے مغرب کی طرف بلا کر کڑ وال اور ترک قوم سے معرکہ آرائی کر کے ان کے علاقوں پر مستقلاً قابض ہو گئے، ایک یادداشت کے مطابق جو جدون قوم مولوی نواب خان جدون نے تحریر کی ہے اس کے مطابق جدون دریائے سندھ کے مغرب میں علاقہ مہابن میں محمود غزنوی 1001ء کے دور میں آباد ہوئے اور پھر احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو اُس وقت جدونوں نے دریا پار کر کے کڑ الوں اور ترک قوم کے علاقوں پر قبضہ کیا، جدون قوم جن مواضعات پر قابض ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

گڑھی سیریاں، درش خیل، قاضی میرا، رتہ بندہ، ڈھوک طورو، بگڑہ جبکہ بڑے علاقوں میں دھنوڑ، مانگل اور رجوعیہ شامل ہیں۔

پنی: ہزارہ کی ایک معروف قوم ہے جو کہ پختونوں کی ایک شاخ کاکڑ میں سے ہیں۔ ان کا آبائی مسکن کوہ سلیمان میں علاقہ سیوی تھا۔ جب مغلوں کا دور شروع ہوا اور کوہ سلیمان کے علاقوں کو انہوں نے تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا تو یہ پنی قوم کے لوگ ہجرت کر کے ہندوستانی علاقوں میں پناہ حاصل کرنے لگے، یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلتے گئے چونکہ جدون بھی کاکڑوں میں سے ہیں جس کی وجہ سے ان میں اور پنیوں میں رشتہ داری تھی جب جدون دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ میں رہنے لگے تو ان کی دیکھا دیکھی یہ پنی بھی ہزارہ میں آ کر آباد ہو گئے اور انھیں زرخیز زمینیں مل گئیں، سب سے پہلے یہ پنی قوم کے لوگ ہزارہ کے میدان پر قابض ہوئے چونکہ یہ ایک بزرگ اور مبلغ دین مرید حسن خان بن گدون کی سرکردگی میں یہاں پہنچے مقامی لوگوں پر یلغار کی اور انھیں یہاں سے بھگا کر خود ان علاقوں پر قابض ہوئے تو یہاں انہوں نے اپنے بزرگ کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ دین کا کام کیا اور اسلام کو اس علاقے میں نافذ کر کے عشر اکٹھا کیا ایک دو پشتوں کے بعد جب ترک قوم نے ان پر حملہ کیا تو یہ یہاں سے منتقل ہو کر ہری پور کے مختلف مواضعات پر قابض ہو گئے۔

اس وقت ہزارہ کے ضلع ہری پور کے پاس ان پنیوں کے نام پر پنیاں ایک معروف و مشہور علاقہ ہے۔

ترین: ترین قوم کے جد اعلیٰ پٹھانوں کے عبدالرشید قیس کے بیٹے سڑبن تھے۔ یہ ابدالی قوم کے ہم جد ہیں۔ جب احمد شاہ ابدالی اٹھارویں صدی کے آخر میں قندھار کا حکمران ہوا تو اس نے برصغیر ہندوستان کی طرف پیشقدمی کی اور دہلی کو فتح کر کے برصغیر ہندوستان کو فتح کر لیا اُس زمانے سے یہ ترین قوم ہزارہ میں اپنے عروج و اقبال

مندی کے ساتھ داخل ہوئی یہ بڑی نامور اور خوش بخت قوم ہے اگرچہ عروج کے ساتھ زوال بھی انہیں آتے رہے مگر اسی قوم میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو اس قوم کی اقبال مندی کے اسباب ساتھ لاتے رہے، جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو فتح کر لیا تو ترین قوم کا سپوت نجیب اللہ خان ہزارہ کا حکمران ہوا، اس کا اقتدار ہزارہ میں 1762ء سے 1792ء تک رہا اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا منصب سرداری پر متمکن ہوا، سکھوں کے دور میں احمد خان اور سردار ہری سنگھ نلوہ کے درمیان خطرناک حد تک چپقلش پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں احمد خان سکھوں سے لڑتے ہوئے قتل کر دیا گیا، اس کے بعد اس کا بیٹا غلام خان منصب سرداری پر فائز ہوا مگر یہ بھی سکھوں اور پھر سکھوں کے بعد انگریزوں سے نبرد آزما رہا۔ انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے آلہ آباد جیل بھیج دیا، اس طرح یہ قوم شکست و ریخت سے دوچار ہوئی۔ تقریباً سو سال کے عرصہ میں اس قوم میں سے ایک نامور جرنیل، فیلڈ مارشل آف پاکستان کے منصب تک پہنچ گیا جو آخر کار مملکت پاکستان کا صدر بن گیا۔ ترینوں کے مشہور مواضعات یہ ہیں، درویش، کوٹ نجیب اللہ، چھیر، پنیاں، ڈوئی آبی و خشکی، بوٹہ، پہاڑو، جاگل، ڈھینڈہ، میلم، ملکیار، سکندر پور، کاہل، گل ڈھیری، منگ بمریلہ، سریہ، کھیوا، گلمہ، کھدو پنجو، باندھتی، میسڑال، میر پور، ہی سب مواضعات اب پٹی ترینی کے نام پر آباد ہیں۔ واضح رہے کہ ترین قبیلے کی ایک کثیر تعداد بلوچستان بھی میں آباد ہے۔

اعوان: یہ بہت قدیم زمانے سے مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے لوگ ہیں۔ جہلم سے دریائے سندھ تک یہ لوگ آباد ہیں۔ راورٹی کی رائے کے مطابق یہ کوہ سلیمان اور کوہ سفید کے دامن تک بھی آباد ہیں اور زمانہ قدیم میں سلسلہ کوہ نمک کے مغربی طرف کے میدان میں یہ قوم قابض تھی لیکن آہستہ آہستہ پٹھانوں نے اٹک پار سے آ کر اور جہلم کی طرف ٹوانوں نے انہیں بے دخل کر دیا اعوان اپنے آپ کو عرب سے آئے ہوئے باشندے کہتے ہیں اور انہوں نے چونکہ اسلامی لشکر کی کفار کے مقابلے میں مدد کی اس لئے یہ اعوان ٹھہرے جو کہ جمع ہے عون کی ''مددگار معاون'' ان کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ قطب شاہ کی اولاد سے ہیں جو کہ حضرت علیؓ کی ایک بیوی کے بطن سے تھے۔ سید قطب شاہ عون ہرات کے حکمران تھے اور جب امیر سبکتگین نے برصغیر کی طرف راجہ جے پال کے خلاف پیشقدمی کی تو سید قطب شاہ نے ان کی اعانت کی سید قطب شاہ عون نے 1039ء میں وفات پائی اور غزنی میں مدفون ہیں۔ ان کی اولاد میں سے برصغیر ہندوستان میں آنے والے لڑکے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ گوہر شاہ، سکیسر کے نزدیک مقیم ہوا۔

۲۔ کلان شاہ مزمل علی (کلگان) دھن کوٹ (کالا باغ) میں مقیم ہوا۔

۳۔ چوہان، دریائے سندھ کے پہاڑوں میں مقیم ہوا۔

۴۔ کھوکھر جسے محمد شاہ بھی کہتے تھے، چناب کے علاقے میں مقیم ہوا۔

۵۔ نوریٰ اور جھاج تیراہ وغیرہ میں مقیم ہوئے۔

ہزارہ میں ان اعوان کی آمد کا زمانہ 1783ء کے بعد کا ہے۔ اعوان کی اصلیت کیا ہے، اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ قوم دراصل اوان ہے جو کہ باختری یونانیوں میں سے ہیں اور یہ لوگ سکندر اعظم کے حملے سے پہلے یہاں آباد تھے۔

گکھڑ: تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نسلاً یہ لوگ ایرانی ہیں اور مغلوں کی طرف سے انہیں ہمیشہ پشت پناہی حاصل رہی ہے، برصغیر ہندوستان میں ان کی آمد کا زمانہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں کا دور ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام سردار گکھڑ شاہ تھا جو غزنوی عہد میں بڑا بااثر شخص تھا۔ محمود غزنوی نے اور سلطان محمود غزنوی کے دور میں جب کھوکھروں کو شکست ہوئی تو ان کا علاقہ ان گکھڑوں کو دیا گیا یہ وہ قوم ہے جو ماضی میں بہادری کا نشان بن کر ابھری اور قسمت نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا اسی وجہ سے ان کی حکومت اٹک سے جہلم تک رہی ہے۔ اس گکھڑ خاندان کے کارناموں کے بارے میں رائے زادہ دوتی چند برہمن نے ایک کتاب گوہر نامہ تصنیف کی ہے جس میں گکھڑ قوم کے لوگوں کی بہادری اور حکومت سے متعلق تفصیلی بیان ہے۔ اس کتاب کے علاوہ گکھڑوں کے بارے میں دو اور کتب تاریخ فتح خان از مرزا قابل خان اور تاریخ بڈھالان بھی لکھی گئیں ہیں۔

گکھڑ قوم کے لوگ عہد غزنوی میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کی خواتین شرع کی پابند اور بزرگوں سے خاص عقیدت رکھنے والی ہیں۔ یہ اپنی قوم سے باہر لڑکی کی شادی نہیں کرتے۔ ان کی خواتین میں رانی منگو بہت مشہور ہوئی ہے جو دیوان اللہ داد کی منکوحہ تھی اور مردانہ لباس پہن کر دیوان عام میں بیٹھ کر انتظام کرتی۔ یہ سب سے پہلے کشمیر اور پھوٹھوہار میں آباد ہوئے اور پھر وہاں سے ہزارہ کی طرف پیشقدمی کی۔

بوھرا: ایبٹ آباد کے ایک خاص علاقہ میں تاجر پیشہ لوگ بوھرا فرقے سے تعلق رکھنے والے اہل ثروت اور معاشی اعتبار سے مستحکم باشندے ہیں۔ یہ بوھرا لوگ کہلاتے ہیں، لباس و عادات میں اپنا ایک منفرد مذہبی کلچر رکھنے والے لوگ ہیں۔ اخلاق و آداب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یہ مخصوص خاندان صرف آپس میں ہی شادیاں کرتے ہیں ان کو میجر ایبٹ نے یہاں لا کر بسایا تھا یہ ایبٹ آباد کے جس

مقام پر آباد ہیں اسے محلہ سیٹھاں کہا جاتا ہے، تجارت میں یہ ایک اہم ساکھ قائم کئے ہوئے ہیں ان کا مخصوص لباس ہوتا ہے ان کے مرد سر پر سفید اونچی سی ٹوپی پہنتے ہیں جس سے ان کی شناخت ہوتی ہے علاقے کے لوگ ان کی تجارت اور لین دین پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ اس خاندان کی خواتین پردے کی پابند ہیں اور سرتا پاؤں سیاہ لباس میں ملبوس ہوتی ہیں اور سکارف پہنتی ہیں یہ لوگ سیٹھ کے نام سے شہرت رکھتے ہیں یہ زیادہ تر کراچی سے یہاں آکر انگریز دور میں آباد ہوئے ہیں۔ مہذب اور با اخلاق اور رہن سہن میں منفرد مقام کے حامل لوگ ہیں۔

طاہر خیلی: یہ قوم ایسی ہے کہ درانیوں کے عہد میں اس قوم کے بعض اجداء نے نامور ی پیدا کہ اور احمد شاہ ابدالی کے دور ہی میں یہ لوگ ہزارہ میں آکر آباد ہوئے، ان کے جد اعلیٰ کا نام طاہر خان تھا۔ اور اسی کے نام پر اس قوم کے لوگ اپنی پہچان کرواتے ہیں، یہ پٹھانوں کی ایک شاخ اتمان زئیوں میں سے ہیں۔ اس قوم کے لوگ اب بھی اپنے ساتھ طاہر خیلی لکھتے ہیں، ہزارہ میں یہ جن مواضعات میں آباد ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

غازی، جموں، یہ علاقہ جموخان کے نام سے جموں کہلاتا ہے، سلم کھنڈ، سلم درخت کا نام ہے اس علاقے میں سلم کے درخت پائے جاتے ہیں اسی وجہ سے اسے سلم کھنڈ کہا جاتا ہے، تربیلہ، خرہاڑہ کونٹھرہ۔

عباسی: یہ بھی ہزارہ کی ایک قابل ذکر قوم ہے جو کہ ہورہ، پکوٹ تناول کے علاقہ اور ایبٹ آباد میں ان کی اچھی خاصی آبادی ہے یہ ہزارہ کے تین اضلاع میں آباد ہیں۔

سردار: ڈھونڈ قوم کے وہ لوگ جو سرکردہ رہے ہیں انھیں سردار کہا جاتا ہے، علاوہ ازیں گوجر قوم کے بعض با اثر لوگ بھی اپنے نام کے ساتھ سردار لکھتے ہیں۔

راجہ: ایک با اثر خاندان جو کہ ہزارہ کے علاقہ خانپور میں ہے، اس میں یہ راجہ خاندان کے افراد رہتے ہیں اس خاندان میں راجہ سکندر زمان خان نامور ہے اور حکومت صوبہ سرحد میں ہمیشہ انکا اثر رہا ہے، راجہ سکندر زمان خان صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز رہے ہیں۔

روایتی کھانے اور ان سے متعلقہ روایات

صبح کا ناشتہ: ہزارے کے متمدن علاقوں میں شروع ہی سے صبح کا ناشتہ پر تکلف رہا ہے۔ لوگ صبح سویرے اٹھتے ہیں۔ ان کی خواتین چائے تیار کرتی ہیں۔ عموماً پراٹھے پکائے جاتے ہیں اور رات کا بچا ہوا سالن یا انڈے کے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی چائے بھی نوش کرتے ہیں۔

دیہاتی علاقوں میں خواتین گھروں میں ہی لسی بناتی ہیں اور پھر مرد و خواتین رات کی بچی ہوئی تنور کی روٹی پر مکھن لگا کر ناشتہ کرتے ہیں۔ اب موجودہ صورت حال میں بعض دیہاتی گھروں میں بھی چائے کا استعمال صبح کے ناشتے میں ہونے لگا ہے اور جب ان کے ہاں کوئی مہمان ہو تو اس کی مہمان نوازی کیلئے اس کے مزاج کے مطابق ناشتہ تیار کرتے وقت چائے بناتے ہیں اور پراٹھوں، انڈوں، چائے اور مکھن کے ساتھ مہمان نوازی سے بھرپور ناشتہ پیش کرتے ہیں۔

ہزارہ کے بیشتر دیہاتوں میں ان کا روایتی ناشتہ مکئی کی روٹی، مکھن اور لسی سے ہوتا ہے اور دیہاتوں کی تقریباً اسی (80) فیصد آبادی چائے کا استعمال نہیں کرتی۔ زیادہ تر سفید مکئی کے دانے پیس کر مکئی کے آٹے کی روٹی پکاتے ہیں۔ اکثر دیہاتی علاقوں میں عورتیں ناشتہ مردوں کے ناشتے کے بعد اس وقت کرتی ہیں جبکہ وہ ناشتہ تیار کر کے اپنے مردوں کو دے دیتی ہیں۔ مرد جب ناشتہ کر کے اپنے کاروبار اور زمینوں پر چلے جاتے ہیں تو خواتین گھر کا ضروری کام کاج کرنے کے بعد تسلی سے ناشتہ کرتی ہیں۔

دوپہر کا کھانا: دوپہر کا کھانا ان کے ہاں اس طرح ہے کہ ہر گھر میں ناشتہ اور گھر کا کام کاج کرنے کے بعد خواتین دوپہر کا کھانا تیار کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ پہلے چکی پر جو عموماً ہر گھر میں چھوٹی بنی ہو۔ گھریلو چکی پر دانے پیس کر اس کا آٹا گوندتی ہیں جو مٹی کی بنی ہوئی سینک میں گوندا جاتا ہے پھر دیہاتی گھروں میں مٹی کے بنے ہوئے چولھوں پر جن کے نیچے لکڑی جلائی جاتی ہے مٹی کی ہانڈی میں ترکاری تیار کی جاتی ہے اور زیادہ تر ترکاری میں بھی ساگ ہی استعمال کیا جاتا ہے ہزارہ کے دیہاتوں میں عموماً تارامیرا کا ساگ پکایا جاتا ہے یہ ساگ پانی کی ندیوں کے کنارے پر خودرو قسم کا ساگ ہے جسے ہر دیہاتی گھر میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے گھروں میں سرسوں کا ساگ بھی زیادہ تر استعمال ہوتا ہے جب کوئی مہمان آجائے تو آلو کے شوربے اور چاول سے مہمان نوازی کرتے ہوئے دوپہر کا کھانا اس طرح کھلاتے ہیں کہ آلو گوشت، چاول، لسی اور مکھن اور مکئی کی روٹی تاہم گندم کی روٹی بھی پیش کی جاتی ہے، دوپہر کو روٹی گھروں میں بنائی ہوئی تنوری پر پکائی جاتی ہے اکثر دیہاتی زندگی میں یہ ہوتا ہے کہ محلے میں چند چھوٹی چھوٹی گھروں کے باہر کسی ٹکر پر یا کسی گھر پر بنائی جاتی ہے اور چار چار پانچ پانچ گھروں کی روٹیاں اس

تنوری پر اپنے اپنے گھر کی خواتین باری باری پکاتی ہیں، بیشتر گھروں کا معمول یہ ہوتا ہے کہ خواتین لسی بگوٹ کر اور دودھ سے مکھن نکال کر مکئی کی روٹی اور ساگ پہلے اپنے کاشتکار مردوں کیلئے اُن کی زمینوں کو پہنچاتی ہیں اور پھر خود واپس آ کر گھروں میں بچوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتی ہیں۔ ان کے دوپہر کے کھانے تیار کرنے کے اوقات گیارہ بجے تک ہوتے ہیں اور پھر دوپہر کی نماز سے پہلے پہلے ختم ہو جاتے ہیں گرمی ہو یا سردی ان کے ہاں یہی دوپہر کے کھانے کے اوقات ہوتے ہیں۔

رات کا کھانا: ہزارہ کے دیہاتوں میں رات کا کھانا شام ہوتے ہی تیار ہو جاتا ہے مستورات تنوری پر روٹیاں پکاتی ہیں اور دوپہر کا تیار کردہ سالن ہی استعمال کرتی ہیں اور یہ رواج قریباً قریباً شہری اور دیہاتی زندگی میں مساوی ہی ہے۔ شاذ و نادر ہی شام کو علیحدہ ترکاری تیار کی جاتی ہے، بلکہ دیہاتوں میں تو شام کو روٹی بھی نہیں پکائی جاتی اور جو دوپہر کی روٹی بچی ہوتی ہے اسے ہی آگ پر یا توے پر گرم کر کے کھاتے ہیں۔ رات کے کھانے میں بھی روایتی کھانے کے مطابق لسی اور مکئی کی روٹی اور ساگ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ رات کو بعض گھرانوں میں دیسی گھی کو گرم کر کے اُسے بھی ساگ کے اوپر ڈال کر استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ طریقہ سردیوں کے موسم میں مروج ہے شہری زندگی میں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ شہروں کے لوگوں کا رات کے کھانے کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا شہری لوگ عشاء کی نماز کے بعد یا رات گئے تک رات کا کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کے بعد اکثر چائے پیتے ہیں، جبکہ دیہات کے لوگ اکثر سونے سے پہلے دودھ پی لیتے ہیں۔

تنوری: ہزارہ کے اکثر دیہاتی علاقوں میں مٹی کی بنی ہوئی تنوری کا رواج عام ہے۔ یہ تنوری اپنے اپنے گھروں میں بھی ہوتی ہے جبکہ گھروں سے باہر کسی نکر پر ایسی جگہ بھی ہوتی ہے کہ جو تین تین چار چار گھروں کیلئے مخصوص ہوتی ہے اور اس اجتماعی تنوری پر خواتین آ کر باری باری اپنی اپنی روٹیاں پکاتی ہیں تنوری میں چھوٹی چھوٹی درختوں کی شاخیں ڈالکر آگ جلائی جاتی ہے یا پھر گائے اور بھینسوں کے گوبروں میں بھوسہ ملا کر اسے خشک کیا جاتا ہے اور پھر اس کو تنوری میں رکھ کر آگ جلا کر تنوری کو گرم کیا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر بڑے بڑے تنور بھی ہیں جہاں علاقے کے بھٹیارے لوگ روٹیاں پکاتے ہیں آج کل کی ہنگامہ خیز زندگی میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دیہاتی لوگ بھی روٹیاں گھروں میں پکانے کے بجائے تنوروں سے ہی منگوا لیتے ہیں روٹیاں پکانے کا ایک رواج یہ بھی ہے کہ دیہاتی گھروں میں توے بھی استعمال کئے جاتے ہیں جنہیں چولھے پر رکھ کر انھیں گرم کیا جاتا ہے اور پھر ان توؤں پر روٹی پکائی جاتی ہے۔

عام دیہاتی کھانا: دیہاتی زندگی میں سالن پکانے کا رواج بہت کم ہے جبکہ ہزارہ کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں سالن یا ترکاری پکانا ہی لوگ نہیں جانتے جیسا کہ بالاکوٹ سے اوپر پہاڑوں پر رہنے والے وہ گوجر لوگ کہ جن کے علاقوں میں صرف مکئی، لسی اور دودھ کا استعمال عام ہے وہ تو ترکاری پکانا جانتے ہی نہیں۔ ان کے ہاں سرخ مرچ کی چٹنی کوٹ کر مکئی کی روٹی کے نوالے کے ساتھ لقمہ بنا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اور اُسے چبا کر حلق سے اتارنے کیلئے اوپر لسی کا گھونٹ پی لیتے ہیں یا پھر مکئی کی روٹی دودھ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہی ان لوگوں کی مقامی خوراک ہے جو کہ صبح دوپہر اور شام کو ہوتی ہے یہ اپنی اس سادہ سی خوراک کو استعمال کر کے نہایت خوش اور فارغ البال زندگی میں مست ہیں۔ البتہ پنیر کا استعمال بھی یہ لوگ کرتے ہیں۔ بعض خال خال گھرانوں میں گوشت کبھی کبھار پکایا جاتا ہے مگر ان گھرانوں میں جو کہ تمدنی علاقوں سے متصل پہاڑی علاقوں میں بستے ہیں یہاں پر البتہ بعض اوقات سبزیاں اور چاول بھی ابال کر استعمال کرتے ہیں اور یہ لوگ گوشت اُس وقت استعمال کرتے ہیں جبکہ ان کے ہاں کوئی بکری یا گائے بیمار ہو جائے اور اُس کے مرنے کا انہیں اندیشہ ہو تو ایسے میں یہ اسے ذبح کر کے اُس کے گوشت کی بوٹیاں بنا لیتے ہیں اور پھر یہ گوشت تھوڑا تھوڑا سارے آس پاس کے گھروں میں بطور سوغات تقسیم کرتے ہیں۔

یہ خانہ بدوش گوجر قبائل سالن میں زیادہ تر ساگ کو ابال لیتے ہیں اور پھر اس ساگ پر سرخ مرچ اور نمک ڈال کر مکئی کی روٹی اور لسی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

خاص پکوان: گرڑا، ہزارہ کا وہ علاقہ جو پکھل کا علاقہ کہلاتا ہے اس علاقہ میں بشہ کا علاقہ ہزارے کا ایک خاص مقام ہے جو کہ علاقہ پکھل کا مرکزی خطہ ہے۔ یہاں کے علاقے کا ایک خاص پکوان ایسا ہے جسے یہ لوگ "گرڑا" کہتے ہیں۔ یہ اس علاقے کا مشہور اور مرغوب پکوان ہے، یہ ایسا پکوان ہے کہ علاقے کے مقامی چاول کو بھگو دیتے ہیں اور پھر پالک (ساگ) میں ملا کر اسے پکاتے ہیں اور حسب ضرورت مرچ اور نمک وغیرہ ڈالتے ہیں یہاں کے لوگ اپنے گھروں میں رکھ لیتے ہیں اور پھر صبح اور شام استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے علاقوں میں اس پکوان کو غلہ کہتے ہیں۔

چاول کا پراٹھا: ہزارہ کے اسی علاقہ پکھل کا ایک خاص پکوان چاول کو بیں

کر اس کو گوند لیتے ہیں اور اس کا آٹا بنا کر اسے پراٹھے کے طور پر پکا لیتے ہیں زیادہ تر اسی پر دیسی گھی ڈالتے ہیں اس پراٹھے کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

کنڈی، کنڈیرہ، گنیار: پہاڑوں پر بسنے والے گوجر قبائل اگر ترکاری بناتے ہیں تو ان کے ہاں پیدا ہونے والا ایک خاص قسم کا ساگ ہوتا ہے جسے یہ ابال لیتے ہیں اور پھر اس اُبلے ہوئے ساگ پر سرخ مرچ کو کوٹ کر ڈالتے ہیں اور اوپر نمک ڈالتے ہیں یہ لوگ اس ساگ کو بڑے شوق سے مکئی کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ان کے ہاں اس مرغوب ساگ کو جو نام دیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

کنڈی، کنڈیرہ، گنیار۔

کھوہ: یہ علاقہ پکھل کے بغہ کا ایک مخصوص پکوان ہے جو کہ مٹھائی کے ضمن میں آتا ہے۔ اسے دودھ سے خاص مہارت کے ساتھ نکالا اور پکایا جاتا ہے جس میں شکر (چینی) ڈالی جاتی ہے اس کے علاوہ اس میں پستہ اور بادام بھی کوٹ کر ملائے جاتے ہیں۔ اس علاقے کا یہ ایک مشہور پکوان ہے جسے دوسرے علاقوں کے لوگ حلوائی کے دکانوں یا دودھ فروش دکانوں سے خریدتے ہیں یہ نہایت مقوی اور خوش ذائقہ پکوان ہے اسے بنا کر دکانوں پر مس کے تھالوں میں پیڑے بنا کر سجایا جاتا ہے عام طور سے ایک بڑے سے تھال میں ایک ہی بڑا سا پیڑہ بنا کر رکھتے ہیں اور خریداروں کو تول کے حساب سے بیچتے ہیں۔

شادی کا خاص پکوان: ہزارہ کے بعض دیہات میں شادی کے موقع پر ایک روایتی میٹھی روٹی اُس وقت تیار کی جاتی ہے جبکہ دولہن اپنے میکے جاتی ہے تو میکے کے گھر میں ایک خاص میٹھی روٹی اس طرح پکائی جاتی ہے کہ پھول دار لکڑی کی چوکی پر گڑ ملا ہوا گندوہ آٹے کا پیڑہ ڈال دیا جاتا ہے اور پھر ہاتھوں سے اس پیڑے کو چوکی پر پھیلا دیا جاتا ہے جس سے اس روٹی پر گلکاری ہو جاتی ہے پھر اس کو تنوری میں پکا دیا جاتا ہے جب روٹی پک جاتی ہے تو قریبی رشتے داروں میں بانٹ دی جاتی ہے۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں

شروڑچی: ہزارہ کی یہ دستکاری نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ کانا کی لکڑی سے بنائی جاتی ہے۔ جس میں نوار کا کپڑا استعمال ہوتا ہے اس میں چھج اور شروڑچی دونوں قسم کی اشیاء شامل ہیں۔ یہ کام اس وقت ہزارہ کے دور دراز کے دیہاتوں میں مروج ہے۔ البتہ ایبٹ آباد کے قریب نواں شہر میں ایک گھرانہ دریا مان بھٹی اس کام میں مہارت رکھتا ہے اور وہ اپنے گھر پر ہی یہ کام کرتا ہے۔

پلیترا: یہ لکڑی کی بنی ہوئی پلیترا نامی دستکاری بھہ نواں شہر ہی میں بنتی ہے جو کہ مکھن نکالنے کیلئے استعمال ہوتی ہے اب اس کا رواج بہت کم رہ گیا ہے اور اس کے بنانے والے دستکار بھی خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔

ریشمی پھلکاری: ریشم کے دھاگے سے تیار ہونے والی دستکاریاں جسے پھلکاری کہتے ہیں۔ ہزارہ میں بہت مقبول ہے ابتداء میں یہ کام دھمھوڑ میں ہوتا تھا۔ یہ کام بہت باریک اور وقت طلب ہے اس لئے اب یہ دستکاری بہت کم رہ گئی مگر پھر بھی دھمھوڑ اور حویلیاں کے دیہاتوں میں اس کام کی مقبولیت کی بناء پر یہ کام جاری ہے یہ کام خواتین گھروں میں کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ روایتی دستکاری پھر نمایاں ہو رہی ہے۔

پتھر کی مصنوعات: ہزارہ کے مغربی حصہ میں اکثر ایسے سیاہ پہاڑ ہیں جنھیں کاٹ کر ان کے سیاہ پتھروں سے مختلف گھریلو ضرورت کی اور آرائشی اشیاء کے علاوہ مقبروں کے کتبے بنائے جاتے ہیں جنہیں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ جس پتھر سے یہ اشیاء بنتی ہیں ان کو سلیٹ کا پتھر کہا جاتا ہے۔ پتھروں سے بنائی ہوئی اشیاء خاصی قیمت میں خریدی جاتی ہیں جنھیں گھریلو استعمال کے علاوہ آرائش کے طور پر بھی رکھا جاتا ہے جن میں مختلف جانور، ہاتھی، گھوڑا، اونٹ، بچوں کے لئے مختلف کھلونے شامل ہیں۔

دیگر گھریلو دستکاریاں: ہزارہ کے مختلف دیہاتوں میں خواتین اپنے ہاتھوں سے مختلف کام کرتی ہیں۔ ان میں پنکھیاں بنانا، کریشیا کا کام، ٹوکریاں بننا اور ریشم سے لباس تیار کرنا ہے۔ دھمھوڑ کے علاقے کے خواتین تکیئے کے غلاف بڑی خوبصورتی کے ساتھ بناتی ہیں۔ ان میں کخواب کا کپڑا زیادہ استعمال کرتی ہیں اور تکیئے کا غلاف جب تیار کرتی ہیں تو اس کے دونوں سروں پر جھبہ لگاتی ہیں خصوصاً بیاہ شادیوں کے موقع پر دلہن کیلئے اس قسم کے تکیئے اور متکیئے کے غلاف تیار کئے جاتے ہیں اور تقریباً یہ رواج عام ہے۔

اسی طرح کھڈیالہ میں گھریلو خواتین بان کے پٹھے سے گھریلو خواتین بڑی خوبصورتی کے ساتھ پنکھیاں بناتی ہیں اور اس کے ساتھ لکڑی کی رنگ شدہ ڈنڈی لگا کر پنکھی کے کنارے پر خوبصورت کپڑا لگا دیتی ہیں۔ دلھوں کیلئے زیادہ مہارت کے

ساتھ ہی یہ کام کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اسی مقام پر گھروں میں چھکیریں بھی بنتی ہیں جو کہ کشتی نما چھکیریں ہیں اور اس کے گرداگرد بھی خوبصورت کپڑا لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چارپائیاں خواتین خود بنتی ہیں جو کہ بڑی مضبوط ہوتی ہیں ایک چارپائی تین چار خواتین شریک ہو کر بنتی ہیں۔ گجروں کے علاقوں میں بھیڑ بکریوں کے بالوں سے خواتین رسیاں اور رسے بناتی ہیں جو مضبوطی اور پائیداری میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

کریشیا: یہ دستکاری بھی گھریلو دستکاری ہے جو کہ ہزارہ کے دیہاتوں اور شہروں کی خواتین اپنے ہاتھوں سے ایک کنڈے دار لوہے کی بنی ہوئی سلائی سے بناتی ہیں۔ یہ سوت اور ریشم دونوں سے بننے والی دستکاری ہے، یہ ایک گھریلو آرائشی دستکاری ہے جس کا رواج عام ہے اور خواتین بڑے شوق سے یہ کام کرتی ہیں بعض خواتین اون سے سلائیوں پر سویٹر اور جرسیاں بھی گھروں میں تیار کرتی ہیں جس پر رنگ برنگی نمونے بنائے جاتے ہیں۔

نان بائی: یہ قدیم پیشہ ہر جگہ جاری ہے۔ ہزارہ کے ہر شہر اور گاؤں میں نانبائی کا تنور ہوتا ہے بلکہ شہروں کے ہر محلے میں نانبائی اپنے تنوروں میں روٹیاں پکاتا ہے یہ ایک ایسا پیشہ ہے کہ جسے خاندانی پیشہ کہتے ہیں یعنی اس نانبائی کے پیشے سے منسلک خاندان کے لوگ ہی ہوتے ہیں جسے بھٹیارہ خاندان کہا جاتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی آ چکی ہے اور یہ پیشہ اب خاندان تک محدود نہیں رہا بلکہ دوسرے تاجر پیشہ لوگ بھی یہ کام کرنے لگے ہیں۔

دھوبی: یہ بھی ایک خاندانی پیشہ ہے اور ملک کے ہر حصے کی طرح ہزارہ کے مختلف بڑے بڑے شہروں اور آباد مضافاتی بستیوں میں دھوبی کپڑے دھوتے اور صاف کرتے ہیں پچھلے زمانوں میں دھوبی خاندان کے لوگ صرف آپس میں ہی شادی بیاہ کرتے اور خاندان سے باہر نہ تو لڑکی کا نکاح کرتے اور نہ باہر کے خاندان کی لڑکی اس خاندان میں شامل ہوتی کیونکہ ذات پات کے رواج کی بناء پر دھوبی خاندان کو نچلا درجہ حاصل تھا۔ ہزارہ کے بڑے شہروں میں دھوبیوں کی دکانیں ہیں یہ لوگ ہر قسم کا کپڑا اٹھا کر کے نہروں اور چشموں پر لے جاتے اور وہاں پر قائم دھوبی گھاٹ پر کپڑا دھوتے جبکہ گاؤں میں ان کی ڈھیریاں ہوتیں جہاں یہ کپڑا خشک کرتے اور پھر ان کے گھروں پر ہی کی خواتین استری کرتیں ہیں۔ اب یہ کام زیادہ تر دکانوں پر ہی کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانوں میں ان دھوبیوں کی بستیاں دریاؤں کے کناروں پر گھاس بھوس کی بنی ہوتی تھیں۔ ان کے ہاں سرداری نظام ہوتا ہے اور ان کا ایک سردار ہوتا ہے جو مختلف امور میں فیصلہ کرتا ہے سردار کے حکم کے سب پابند ہوتے ہیں اب اس کام میں ترقی ہو گئی ہے اور مشینوں کے ذریعے کپڑے دھوئے بھی جاتے ہیں اور خشک بھی کئے جاتے ہیں۔

ماشکی: قدیم زمانے ہی سے ماشکی کا پیشہ چلا آ رہا ہے جو چمڑے کی بڑی بڑی مشکوں میں پانی بھر کر گھروں میں لاتے تھے اور فی مشک کے حساب سے قیمت وصول کرتے۔ ہزارہ کے شہروں میں یہ رواج عام تھا کیونکہ پانی ہر گھر کی ضرورت تھی یہ ماشکی لوگ ہزارہ میں کشمیر سے آئے تھے ان ماشکیوں ہی میں سے وہ دستکار بھی ہیں جو کہ مشک بنانا جانتے ہیں اب یہ رواج بہت کم رہ گیا ہے کیونکہ ٹیوب ویلوں کے ذریعے اب ہر گھر میں نلکوں کو بچھا کر پانی پہنچایا گیا ہے اور ہر گھر میں ٹونٹی لگی ہوئی ہے ہزارہ کے دیہات میں جہاں پانی کی کمی ہے وہ بارانی پانی پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان کی خواتین دور دراز سے بارش کا پانی اکٹھا کرنے والے ٹاپوؤں سے گھڑوں میں پانی بھر کر گھروں میں لاتی ہیں جو ان کی گھریلو اور مال مویشیوں کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

موہڑہ سازی: ایبٹ آباد اور ہزارہ کی دیگر علاقوں میں کانوں سے بیٹھنے کیلئے ایسے آرام دہ موہڑے بنائے جاتے ہیں جنھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ موہڑوں کے علاوہ دیگر اشیاء مخصوص کرسیاں، اور ایسے شیشے بھی بنائے جاتے ہیں جن کی فریم کانوں کی ہوتی ہے۔ ایسی چھوٹی میزیں بھی بنائی جا رہی ہیں جو کہ کانوں کی بنی ہوتی ہیں یہ آرائشی سامان ہزارے کے متمدن شہروں میں لوگ اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔

ادبی اور ثقافتی شخصیات

حضرت دیوان راجہ باباؒ: ہزارہ کی روحانی اور صاحب دیوان ادبی شخصیت حضرت راجہ دیوان باباؒ کا زمانہ 1700ء کا ہے یہ وہ دور تھا جبکہ علاقہ پکھل میں ترکوں کی جابر حکومت تھی۔ حضرت دیوان راجہ باباؒ قادر الکلام صوفی شاعر ہونے کے علاوہ روحانی بزرگ ہستی کے مالک تھے اور رشد و ہدایت میں مصروف رہتے تھے اور اپنے عہد کی ظلم آفرین ترک حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے۔ جس کی وجہ سے ان کو ترکوں کے آخری شہزادہ اکبر خان نے شہید کروا دیا جو کہ ایک عیاش اور خود سر ترک شہزادہ تھا۔ حضرت دیوان راجہ باباؒ اسے دینی شعار کی پابندی کی تعلیم دیتے تھے اور

لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آنے کی تلقین کرتے رہے حضرت دیوان راجہ باباؒ کی رشد و ہدایت سے بھرپور زندگی اس ترک شہزادے کی بدمستیوں کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ تھی اس لئے اس نے حضرت راجہ دیوان باباؒ کو اپنی راہ سے ہٹانے کیلئے انھیں شہید کروادیا آپ کا فارسی کلام پر مشتمل ایک دیوان بھی ہے جو اب نایاب ہے۔ حضرت راجہ دیوان باباؒ کا مزار ہزارہ کے علاقہ پکھل کے مقام بفہ میں گلی باغ میں بنا ہوا ہے۔

حضرت سید احمد شہید: حضرت سید احمد شہید کا مزار ہزارہ کے ضلع مانسہرہ کی تحصیل بالاکوٹ میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے سید احمد شہید کا تعلق خاندان ولی اللہ میں سے ہے آپ کا تعلق سرزمین ہندوستان کے علاقہ بریلی سے ہے تحریک مجاہدین کے بانی ہیں اور مجاہدانہ کردار و عمل کے حامل سرفروشانہ جذبوں کے آمین تھے ،آپ کے خاندان کو یہ شرف حاصل ہے کہ سرزمین پاک و ہند میں اسلامی علوم و افکار کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں جذبہ جہاد اور شوق شہادت کی آبیاری کرتا رہا۔ اپنے خاندان کی اسی روایت کو تازہ اور تابندہ رکھتے ہوئے آپؒ اپنے وطن مولوف سے ہجرت کرتے ہوئے سرحد و افغانستان کے علاقوں میں پہنچے جہاں مسلمانوں میں غیر شرعی بدعتوں کو ترک کرنے اور غیر مسلموں سے اسلامی علاقوں کو آزاد رکھنے کی خاطر مسلمانوں میں جذبہ جہاد پیدا کرنے کی مساعی جمیلہ کا آغاز کیا، سید احمد شہید 1825ء میں سکھوں کے خلاف جہادی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے براستہ راجپوتانہ مارواڑ، سندھ، بلوچستان، سے کابل اور کابل سے پشاور پہنچے۔ پشاور کچھ عرصہ قیام کے بعد علاقہ ہشنگر (چارسدہ) پہنچے اور لوگوں کو تبلیغ دین کی اور سکھوں سے اپنے علاقوں کو آزاد رکھنے کیلئے جہاد کی تلقین کی۔ سید احمد شہید کے دست راست محمد اسماعیل شہید تھے جنہوں نے آخری وقت تک اس مجاہد اسلام کا ساتھ دیتے ہوئے ان کے ساتھ ہی جام شہادت نوش کیا۔ سید اسماعیل شہید کی تحریک جہاد اگرچہ اپنے مقاصد میں بہت حد تک کامیابی سے ہمکنار رہی مگر پشاور کے سردار یار محمد خان بارکزئی کی در پردہ سکھوں کی حمایت کی وجہ سے آپؒ کی تحریک زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جس کی وجہ سے آپ دل برداشتہ ہو کر ہزارہ کے علاقہ میں پہنچے اور نسبتاً پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے بالاکوٹ کے مقام کو سکھوں سے محفوظ سمجھتے ہوئے بالاکوٹ پہنچے تاکہ یہاں پر مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف منظم کریں مگر یہاں بھی بعض غدار مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکے جس کی وجہ سے سکھوں نے کنور شیر سنگھ کی قیادت میں بالاکوٹ کے مقام سے تھوڑے فاصلے پر دریائے کنہار کے پاس ان پر حملہ کیا اور سید احمد شہید نے 7 مئی بمطابق 1831ء کو بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

مولوی محمد محمود عثمانی: ہزارہ کے عثمانی خاندان کے خانوادے تھے۔ عربی اور فارسی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے منظوم کلام فارسی پر مشتمل کتاب نیرلامع 1891ء نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب ایبٹ آباد کے خاندان عثمانی کے پاس موجود ہے اس کے علاوہ ان کی مطبوعہ کتابوں میں سراجی در علم میراج مطبوعہ 1873ء اور تعریف الاشیاء مطبوعہ 1861ء نے بہت شہرت حاصل کی، یہ فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر اور عالم دین تھے۔

چاچا ایبٹ: سرزمین ہزارہ میں قیام پذیر ہونے والا انگریز دور کا انگریز ڈپٹی کمشنر میجر جیمس ایبٹ جس کے نام پر سرزمین ہزارہ کا دارالخلافہ ایبٹ آباد شہر کا آج تک چاچا ایبٹ کی یاد دلاتا ہے سر ایبٹ وہ پہلا حاکم ہزارہ، تھا جس نے ہزارہ کے بچوں اور بوڑھوں، جوانوں اور مردوں کے دل میں اپنا مقام و مرتبہ پیدا کیا۔

منشی امین چند اپنے سفرنامہ مطبوعہ 1849ء میں میجر ایبٹ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے میجر ایبٹ کو ہری پور کی سڑکوں پر بچوں کے ساتھ بلا خوف و امتیاز گھومتے پھرتے دیکھا ہے وہ لوگوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ بڑوں کے علاوہ چھوٹے بچے بھی پیار و محبت سے اُن کو چاچا ایبٹ کہتے تھے۔

میجر جیمس ایبٹ 1807ء میں انگلستان میں پیدا ہوئے۔ وہاں کی ملٹری اکیڈمی ایڈیس کو لمبے سے فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد انگلستان کے دوسرے آرمی افسران کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ مختلف مقامات پر سرکاری فرائض انجام دینے کے بعد انگلستان واپس چلے گئے۔ دوسری بار پھر انگلستان سے ہندوستان آئے اور مختلف مقامات پر رہے۔ صوبائی سکھ گورنر چتر سنگھ اٹاری کے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ مقرر ہوئے اور جب سکھوں کو شکست ہوئی تو انگریز حکومت کی طرف سے 1849ء میں ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ وہ صرف چار سال کی مدت یعنی 1849ء تا 1853ء تک ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر رہے۔

اُن کی سرزمین ہزارہ سے لازوال محبت و دارفتگی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ ایشیاء پور کلکتہ کے نزدیک رائفلوں اور بارود خانے کے انچارج بنائے گئے تو ان دنوں وہاں پر انھیں ایبٹ آباد ہزارہ کی یاد بڑی بے چین کر دیتی تھی اور ان کی یہ تمنا تھی کہ انھیں فراغت کا کوئی ایسا موقع ملے کہ وہ ایک بار پھر ہزارہ کی فضاؤں میں کچھ وقت گزار سکیں مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور پھر 1896ء میں وہ آنجہانی ہو گئے۔

سید محمود شاہ ڈھینڈہ: آپ عالم، فاضل شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور ہزارہ کی مذہبی روایت وثقافت کے پابند عالم دین تھے، ان کا تعلق سرزمین ہزارہ کے ہری پور ضلع سے مغرب کی جانب دو تین میل کے فاصلے پر واقع گاؤں ھینڈہ سے تھا سید محمود شاہ سادات میں سے قابل احترام واعظ شیریں مقال اور صاحب فراست وبصیرت باکردار شخص تھے۔ یہ اپنے وعظ سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے اور جو بھی ایک بار انکا وعظ سن لیتا وہ مسحور ہو جاتا انھیں وعظ و شیریں گفتاری پر کامل دسترس حاصل تھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ: ملک کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے روح رواں ڈاکٹر سید عبداللہ جنھیں لوگ محسن اُردو، قائد اردو اور بابائے اردو ثانی کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے بانی ارکان میں سے اور مجلس ترقی ادب کے اہم رکن اور انجمن ترقی اردو کے ناظم خصوصی تھے، ان کا تعلق سرزمین ہزارہ کے موجودہ ضلع مانسہرہ کے جنوب کی جانب 15 میل کے فاصلے پر لوئر تناول کے ایک گاؤں منگلور سے ہے۔ 1806ء پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی جو ایک عالم دین اور پیشے کے لحاظ سے حکیم تھے۔

بعد میں انہوں نے مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں تعلیمی مدارج طے کئے اور پھر اعلیٰ تعلیم کیلئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد لاہور آ گئے اور لاہور کالج میں 1922ء میں منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ 1925ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ اور پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کر لی۔ بعدازاں ڈی اٹ کی ڈگری حاصل کی اور پٹیل کالج لاہور میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ یہاں ان کی کوششوں سے اردو کلاسوں کا باقاعدہ طور پر اجراء ہوا۔

انہوں نے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب وتدوین کیلئے نامور اردو دان لوگوں کی ایک جماعت تیار کی اور اپنی سرپرستی میں یہ کام انجام دیا۔ انہوں نے 1959ء میں حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ حاصل کیا۔ 16، اگست 1986ء کو ان کا انتقال ہوا۔

محمد عرفان رضوی: موضع کھوڑی کے ایک عالم دین مولانا محمد عالم کے چشم و چراغ محمد عرفان رضوی علم وادب کے حوالے سے ہزارہ کی جانی پہچانی شخصیت کے حامل 20 جون 1928ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی سیکنڈری سطح تک تعلیم مانسہرہ کے ایک ہائی سکول میں حاصل کرنے کے بعد شعبہ تدریس سے متعلق پیشہ ورانہ ڈگری بی ٹی حاصل کی اور اسی تدریس کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔

ان کی شاعری کے چار مجموعے ہیں۔ ایک کتاب فن وشخصیت جمال فطرت، نامور ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور مفکروں نے اس کتاب میں ان سے متعلق مضامین لکھے ہیں علم وادب کے حوالے سے ہزارہ میں ان کی شخصیت ہر دلعزیز اور مقبول سمجھی گئی ہے۔

سائیں غلام دین: ہزارہ میں چاربیتہ کا معروف صوفی شاعر غلام دین مرحوم ہے۔ اس کے چاربیتہ ہزارے کے شادی بیاہ اور دوسرے موقعوں پر تین آدمی مل کر گاتے ہیں ان چاربیتہ کی وجہ سے سائیں غلام دین کو ہزارہ کی ادبی اور تاریخی شخصیت کا درجہ حاصل ہے۔

حبیب بابا: ہزارہ کی چاربیتہ سے متعلق دوسری اہم ادبی اور صوفیانہ شخصیت حبیب بابا کی ہے جو کہ غلام دین بابا کے مقابلے میں چاربیتہ بناتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے چاربیتہ بھی ہزارہ میں بہت مشہور ہیں اور مختلف میلوں، عرسوں اور شادی بیاہ کے مواقع پر حبیب بابا کے چاربیتہ بھی گائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی: ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی، قوم پنی کے نامور فرزند ہیں۔ ان کے والد کا نام رسول خان ہے جو کہ قوم پنی کے خاندان منیر خان کے فرزند تھے اور پنیاں میں سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے تاریخ ہزارہ کتاب تصنیف کی اس کتاب میں پنی قوم کا زیادہ سے زیادہ احاطہ کیا گیا ہے اور تاریخی اعتبار سے پنی قوم کی تاریخ اور ثقافت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ 898 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔

فدا حسین: ہزارہ کے اُن اہم لکھاریوں میں ان کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے تاریخ ہزارہ اور ثقافت ہزارہ میں بڑی عرق ریزی کی ہے، اور اپنی قوم تناول کی مکمل تاریخ لکھ ڈالی۔ فدا حسین علاقہ تناول کے گاؤں کوھٹیالہ میں چار فروری 1932ء میں پیدا ہوئے۔

رسم ورواج

جب ہزارے کی رسوم اور ان کے رواج کے بارے میں بات کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک خاص ثقافتی خطے کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ پنجاب اور کشمیر سے ملحق سرحد کا وہ خطہ ہے جس کے باشندوں کے خدوخال اور پوشاک وزبان میں تینوں علاقوں کی آمیزش ہے۔ اگرچہ ہزارہ میں پشتو بولنے والے پختون بھی ہیں مگر زبان ورسوم ورواج میں اُن کی آمیزش اپنے علاقے

ہزارے کی ثقافت پر مبنی ہے۔ سوائے کوہستانی باشندوں کے باقی تمام ہزارہ کے لوگوں کی رسوم و رواج تقریباً ایک ہی ہیں اور اگر ان ہزارہ جاتی زبان و پوشاک کے باشندوں کی رسوم و رواج کا جائزہ لینا ہو تو پھر لامحالہ اس ہزارہ کے بڑے اور مرکزی علاقوں ایبٹ آباد، دھمتوگلیات، مانسہرہ، بالاکوٹ، ناران و کاغان، حویلیاں، ہری پور اور خانپور وغیرہ کے علاقوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جہاں سے ہزارے کی مخصوص رسوم و رواج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

منگنی: ہزارہ کے تمام علاقوں میں منگنی کی قدیم رسم ہے کہ چھوٹی عمر ہی سے لڑکے سے لڑکی نسبت کر دی جاتی تھی اور اس نسبت کو مستحکم اور پختہ کرنے کیلئے نشانی کے طور پر ایک معمولی سا زیور اور ایک جوڑا کپڑے کا دے دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے رشتے میں گھر کی بڑی بوڑھیوں دادی اور نانی کا کردار بڑا اہم ہوتا تھا۔ وہی دونوں طرف یہ رشتہ طے کرتی تھیں جو کہ خاندان کے اندر ہی چچازاد، بہن بھائی، ماموں زاد بہن بھائی، خالہ زاد بہن بھائی وغیرہ میں یہ رشتے ہوتے تھے مگر موجودہ صورت حال اس سے بہت مختلف ہے خصوصاً ہزارہ کے بڑے تمدنی علاقوں میں یہ رواج دم توڑ چکا ہے اگرچہ بعض دیہاتوں میں اس قسم کے رشتے اب بھی ہوتے ہیں کیونکہ قدیم رسومات بعض دیہاتوں میں صدیوں سے چلی آرہی ہیں جبکہ بڑے شہروں میں قرابت داری میں رشتے کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ صرف دو خاندانوں کی شرافت وغیرہ کو ترجیح دی جاتی ہے تاہم منگنی کی رسوم میں نشانیوں کا تبادلہ اب تک رائج ہے اور منگنی کے موقع پر گھروں میں گانے اور ناچنے کی محفلیں ہوتی ہیں زیادہ تر اس قسم کی محفلیں خاندان کی لڑکیاں اور ہمسائیگی میں رہنے والی لڑکیاں منعقد کرتی ہیں اور رات گئے تک گانے گائے جاتے ہیں۔

جہیز، داج: زمانہ قدیم سے لے کر اب تک ہزارہ کے تمام علاقوں میں جہیز کا رواج موجود ہے۔ جہیز اس سامان کو کہا جاتا ہے جو شادی کے وقت لڑکی اپنے ساتھ دولہے کے گھر لاتی ہے پہلے دیہاتوں اور شہروں کی لڑکیوں میں یہ رواج عام تھا کہ جہیز کا سامان لڑکی خود یا اس کی قرابت دار لڑکیاں یا محلے دار لڑکیاں اپنے ہاتھوں سے بناتی تھیں جن میں دوپٹے پر کرم اور ریشم کا کام لڑکیاں بڑی محنت اور مشقت سے کرتی تھیں۔ ٹوپیوں، تکیے اور بستر کے غلافوں پر بھی ریشم کا کام ہوتا تھا لڑکی کے گھر والے جہیز کے لئے لحاف، توشک گھر ہی میں تیار کرتے ہیں۔ مقامی زبان میں اس جہیز کو داج کا نام دیا جاتا ہے اور لڑکی کے گھر والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لڑکی کیلئے داج تیار کیا جائے۔ یہ بات لڑکی کیلئے عزت و ناموس کی علامت ہوتی ہے۔ داج میں لڑکی والے لڑکی کو تمام گھریلو سامان بستر سے لیکر سوئی دھاگے تک دیتے تھے اب بھی تقریباً یہی رواج ہے۔

تمنڑ و نیزہ بازی: ہزارہ کے اکثر دیہاتوں میں خصوصاً دھمتوڑ و مضافات میں شادی کے موقع پر لڑکے کے گھر میں تمنڑ اور نیزہ بازی کے کھیل کھیلے جاتے ہیں تمنڑ۔ نشانہ بازی کی رسم ہے۔ یہ کھیل کئی کئی دن شادی سے پہلے لڑکے کے خاندان والے اور دوست کھیلا کرتے ہیں۔

تتی: یہ بھی ایک کھیل ہے جو رسماً لڑکی والوں کے گاؤں میں شادی کے پہلے پہلے دنوں میں جوان کھیلا کرتے تھے اور پھر اس کھیل کود کے بعد نکاح خوانی ہوتی تھی نکاح خوانی کے بعد شیرینی تقسیم کی جاتی تھی مثلاً گڑ، بتاشے یا شکر وغیرہ۔ اب بھی پنیوں کے دیہاتوں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے مگر بہت کم۔

ماہیوں: ہزارہ کے مانسہرہ اور مضافات میں ماہیوں کی بڑی دلچسپ رسم ہے۔ جب شادی کی تاریخ طے پا جاتی ہے تو دلہن کو قریبی رشتے دار یکے بعد دیگرے اپنے گھروں میں مدعو کرتے ہیں اور پھر دلہن اپنے والدین کے گھر ماہیوں کی رات واپس لوٹتی ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو سہیلیاں بھی ہوتی ہیں اور رات کو پھر جب لڑکے والے آتے ہیں تو ماہیوں کی رسم ادا ہوتی ہے۔

ڈولی لڑاوی: دلہن کی ڈولی جب لڑکے والے کے گھر پہنچ جاتی ہے تو دولہا والے ڈولی اُتارنے کی رسم پوری کرنے کیلئے حسب استطاعت دلہن کو کچھ رقم دیتے ہیں جو دلہن کی ملکیت ہو جاتی ہے بعد میں یہ رقم دلہن اپنے دلہا کو دے دیتی ہے اس رسم کو ڈولی لڑاوی کی رسم کہتے ہیں۔

دستور بٹانا: اس رسم کے ادا ہونے سے پہلے دلہن کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا دلہن جب دولہا کے گھر پہنچ جاتی ہے تو سب سے پہلے دلہن کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بٹھا دیا جاتا ہے دلہن اپنی طرف سے اس بچے کو کچھ رقم دیتی ہے پھر ساس یا قریبی لڑکیاں دلہن کی مٹھی میں کچے چاول دیتی ہیں اور پھر دلہن کا ہاتھ کلائی تک دیسی گھی میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دلہن کو دیکھنے کی عام اجازت مل جاتی ہے سب سے پہلے وہ شخص دلہن کا چہرہ دیکھتا ہے جو صاحب حیثیت ہو۔ وہ دلہن کو اپنی طرف سے کچھ رقم ادا کرتا ہے اس رسم کو دستور بٹانا کہتے ہیں۔

ٹمن مارنا: ڈولی اٹھانے سے پہلے یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ ایک سکہ درخت کی

شاخ کے ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے جب لڑکے کی برات لڑکی والوں کے گھر پہنچ جاتی ہے اور نکاح وغیرہ ہو جاتا ہے تو رخصتی کے وقت یہ رسم اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ درخت کی شاخ سے لٹکے ہوئے سکے پر لڑکے والوں میں سے جب تک کوئی اس کا نشانہ نہیں لگا لیتا اُس وقت تک دلہن کی ڈولی نہیں اُٹھائی جاتی یہ نشانہ لگانے کے بعد ہی ڈولی اٹھانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس رسم کو ٹمن مارنا کہتے ہیں۔

نیندرہ: جب لڑکے کے گھر سے برات روانہ ہونے لگتی ہے تو برات کے روانہ ہونے سے پہلے لڑکے کے والد کے رشتے دار یا قریبی دوست بطور امداد نیندرہ دیتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ نیندرہ کی رقم ایک روپیہ فی کس ہوتی تھی۔ اس رقم سے لڑکے والوں کو اخراجات کیلئے بڑی مدد مل جاتی ہے۔ اس کی باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی ہے۔ یہ رسم دیہاتی علاقوں میں پائی جاتی ہے جبکہ اس کی شکل بڑے شہروں میں بدل گئی ہے اور نیندرہ کی مقرر شدہ رقم کے بجائے اہل ثروت لوگ زیادہ رقمیں دینے لگے۔

غمی کی رسمیں

بیمار پرسی: ہزارہ کے دیہاتوں میں جب کوئی شخص بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کی تیمار داری کیلئے آس پاس سے لوگ بیمار کے گھر آتے ہیں۔ ان مہمانوں کی بیمار کے گھر میں اچھی خاصی تواضع ہوتی ہے۔ اس تیمار داری کی رسم کی وجہ سے غریب لوگ بوجھ تلے دب جاتے ہیں اس لیے بعض مقامات پر اب اس رسم سے اجتناب ہونے لگا ہے اور چھوٹی موٹی بیماریوں میں لوگ تیمار داری کی اس رسم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اسقاط: یہ رسم موت کی موقع پر ادا ہوتی ہے جب کوئی فوت ہو جائے تو مردے کی تکفین و تدفین پر غریبوں اور ملاؤں کو نقدی دی جاتی ہے بعد میں اس رسم میں اضافہ کر کے جنازے کے ساتھ مٹھائی، گڑ، چھوہارے یا کشمش کی بوری بھی جاتی ہے جو کہ دفنانے کے وقت بانٹے جاتے ہیں اس تکلیف دہ رسم کی وجہ سے غریب لوگوں کی معاشی زندگی قرضوں تلے دب گئی ہے۔ اس لئے اس رسم کو اب بہت حد تک کم کر دیا گیا ہے۔

ختنہ: ہر مسلمان گھرانے میں یہ ختنہ ایک مذہبی رسم ہے۔ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کے فوراً بعد یا چند دن بعد یہ رسم ادا کی جاتی ہے ہزارہ میں مسلمان گھرانوں میں اس رسم کی ادائیگی کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ اگرچہ اب اس رسم کو بہت مختصر کر دیا گیا ہے مگر قدیم زمانے میں ہزارہ کے شہروں اور مضافات میں بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ اس رسم کی ادائیگی کیلئے محلہ اور گھرانے کے نائی کو بلایا جاتا تھا اور بچے کو نئے کپڑے وغیرہ پہنائے جاتے تھے۔ جب ختنہ ہو جاتا تو ختنہ کے تیسرے روز بچے کی مبارکبادی کیلئے محلے اور قریبی رشتے داروں کی خواتین اکٹھی ہوتیں اور ساتھ چینی، گڑ، بتاشے وغیرہ بھی لاتیں اس روز ختنہ والے گھر مہمان خواتین کو کھانا دیا جاتا۔

عرس اور میلے:

ہزارہ کے متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں ولیوں، شہیدوں اور بزرگوں کے مزارات ہیں۔ انہیں میں بعض مزار ایسے ہیں جہاں باقاعدگی کے ساتھ عرس منعقد ہوتا ہے جو کہ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے اور ایک دن سے لے کر تین دن تک یہ عرس کی تقریبات رہتی ہیں۔ بزرگوں کے ان مزارات پر عرس کے موقع پر دور دراز بلکہ بعض جگہوں پر تو بیرون ملک سے لوگ آتے ہیں اور عرس کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ان بزرگوں کے عرس کے موقع پر ان کے مذہبی مسلک کا خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے مسلکوں کے مطابق عرس کی تقریبات ہوتی ہیں۔ ان تقریبات میں قوالیاں، نعت خوانی، قرات کے مقابلے اور علماء کے وعظ شامل ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مختلف کھیلوں اور تماشوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض مقامات پر مختلف نوعیت کے میلے بھی لگتے ہیں۔ جنھیں مختلف نام دیئے جاتے ہیں۔ جیسے میلہ مویشیاں، میلہ گھڑ دوڑ وغیرہ یہ میلے بھی ثقافتی اور دایتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

دنداں دی لیک: ہری پور میں کھلے میدان میں ہر سال بیلوں کا میلہ لگتا ہے۔ ہزارہ جاتی ہندکو میں لیک کا مطلب دوڑ یعنی ریس ہے۔ شائقین بڑی تعداد میں یہ میلہ دیکھنے کیلئے دور دراز سے آتے ہیں۔ اور بڑے شوق و انہماک کے ساتھ بیلوں کا میلہ دیکھتے ہیں۔ بیلوں کے مالک سارا سال میلے میں شریک بیل کو بڑی محنت کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور خوب فربہ، کپڑوں اور پھولوں سے سجا کر اپنا اپنا بیل اس میلے میں لاتے ہیں اور پھر باقاعدہ طور پر بیلوں کی ریس لگتی ہے۔ اس ریس کے موقع پر شائقین کئی کئی ہزار روپے کی شرطیں باندھتے ہیں۔ بیلوں کے علاوہ بھی دیگر مویشیوں کو یہاں لایا جاتا ہے یہ میلہ ہر سال موسم بہار میں لگتا ہے۔

میلہ زیارت شیخ باباؒ: مانسہرہ سے آگے شنکیاری کے مقام پر ایک قدیم مزار شیخ باباؒ ہے۔ جن کا اصلی نام میر علی بابا ہے۔ عیدین کے موقع پر اس مزار پر لوگ بڑی تعداد میں آتے ہیں اور میلے کا سا سماں ہوتا ہے چھوٹی موٹی دکانیں اور کھانے پینے

لیئے چھابڑی فروش اس مقام پر آجاتے ہیں عید کے تین دن تک لوگ یہاں حاضری دیتے ہیں۔

میلہ بربری ماتا: مانسہرہ میں یہ پرانا دیوی کا مندر ہے جہاں اب ہندو جنم اشٹمی کے تہوار پر اکھٹے ہوتے ہیں اور اس جگہ شیرینی اور حلوہ چڑھاتے ہیں۔ ایک میلہ کا سا سماں ہوتا ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہبی تہوار ہے جو کہ عرصہ دراز سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ یہاں حلوہ کے علاوہ بھی نذرانے چڑھاتے ہیں۔

ڈھیری بھائی کریارام: ہزارہ کے مقام کوٹ نجیب اللہ میں بھائی کریارام کے نام سے منسوب ہندوؤں کی ایک درسگاہ تھی جہاں ہندو ہر سال ساون کے مہینے میں اکھٹے ہوتے اور نذریں، نیاز چڑھاتے ہیں اس موقع پر ایک میلہ کا سا سماں ہوتا ہے۔

شوالہ: ہزارہ کے علاقہ شنکیاری میں ہندوؤں کا ایک شو مندر ہے اس مندر کے اندر ایک بڑا شولنگ ہے ہندو اس کو اپنا عبادت خانہ جانتے ہیں اگرچہ یہ اب غیر آباد اور ویران ہے مگر ہر سال ہندو یہاں اکٹھے ہوتے، عبادت کرتے ہیں اور نذریں نیازیں چڑھاتے ہیں۔

میلہ میاں کنگال: ہزارہ کے مقام مانگل میں میاں کنگال کا مقبرہ ہے۔ ان کا اصلی نام خواجہ گل محمد ہے جو کہ میاں کنگال کے نام سے معروف ہیں۔ یہ علاقہ کشمیر کے بہت بڑے بزرگ اور ولی زمانہ شیخ عبدالصبور قادری المعروف بستال زمانہ جن کا دور 1140 بمطابق 1732 ہے ان کے مرید ہوئے اور پھر تبلیغ دین کیلئے مانگل کے مقام پر آگئے۔ یہاں میاں کنگال کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے بیعت کی اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے اسی مقام پر ان کا وصال ہوا اور یہیں دفن کردیئے گئے۔

ان کے مزار پر ہر جمعرات کو ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جہاں دور دراز سے لوگ شرکت کرتے ہیں۔

میلہ موضع داڑی: ہزارہ کے شہر ہری پور سے چھ میل کے فاصلے پر نزد موضع کھلابٹ کے مقام پر شاہ شیر محمد غازی کا مزار ہے۔ یہ شیر محمد غازی ضلع راولپنڈی کے مقام سید کراں سے آکر اس مقام پر متمکن ہوئے اور یہاں پر چلہ کیا اسی مقام پر رحلت کی تو ان کے مریدوں نے یہیں پر انہیں دفن کردیا۔ یہاں پر ہر عید کے موقع پر میلہ لگتا ہے جہاں علاقے کے لوگ بڑی تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ دکانیں لگتی ہیں اور مختلف ثقافتی کھیل کھیلے جاتے ہیں جن میں ہزارے کا معروف ثقافتی کھیل "تتی" خصوصیت کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔

عرس بابا شنکیاری: حویلیاں کے نزدیک موضع چمبہ میں ان کا مزار ہے اور انہیں چھوٹی والا بابا جی بھی کہتے ہیں یہاں پر ان کا عرس تین دن ہوتا ہے۔ اپریل کے مہینے کی پندرہ، سولہ اور سترہ تاریخ کو ان کا عرس مبارک منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع پر ختم القرآن پاک کے علاوہ حمد و نعت کی محافل ہوتی ہیں اور لوگ دعائیں مانگتے ہیں۔

عرس سید محبوب شاہ الحسینی الکاظمی: ایبٹ آباد سے مانسہرہ کو آنے والی سڑک پر قلندر آباد سے دائیں طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر سید محبوب شاہ الحسین الکاظمی کا مزار ہے۔ ان کے مزار کے پاس سبزہ زار اور میوہ دار درختوں کی کثرت ہے جس کی وجہ سے گرمیوں کے موسم میں بہار کا سا سماں ہوتا ہے اور ساتھ ہی ایسے چشمے بھی ہیں جن کا پانی سردیوں میں گرم ہوجاتا ہے۔ سید محبوب شاہ ہزارہ کی بہت بڑی بزرگ شخصیت کے حامل ہیں۔ آپ موضع سنگر نزد کوکل علاقہ تناول میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی حضرت سید کبیر شاہ تھا۔ آپ نے موضع دانہ میں ہی وفات پائی اور اسی مقام پر ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ جہاں ہر جمعرات کو عرس ہوتا ہے۔ اس موقع پر حضرت غوث پاک سے منسوب بہت بڑا لنگر ہوتا ہے۔

عرس مبارک سید حافظ عمر شاہ: سید حافظ محمد شاہ امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے ہیں۔ اس نسبت سے انہیں عمر شاہ کاظمی بھی کہتے ہیں۔ آپ کے والد سید محبوب شاہ الکاظمی ہیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے آپ نے اپنے والد کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے موضع داتہ سے موضع نزد کہ ہجرت کی جہاں کئی تشنگان علم و عرفان نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ آپ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی علوم پر بھی تصرف رکھتے تھے اور محدث بھی تھے۔ آپ لوگوں میں باجی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ موضع نزو کہ میں ہی آپ کا وصال ہوا اور وہیں پر ہی مدفون ہیں۔ آپ کا مزار مقامی لوگوں میں رونٹا والے باجی دی زیارت کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کا مزار نزوک میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے ایسے لوگ جن کی اولاد نہیں ہوتی وہ یہاں آپ کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔ اس موقع پر ختم قران اور حمد و نعت کی محافل لگتیں ہیں اور علماء وعظ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر جمعرات کو ان کے مزار پر ایک میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔

عرس الحاج مستانہ ملنگ قلندر: ہزارہ کے علاقہ لورہ ضلع ہری پور کے موضع روپڑ میں الحاج مستانہ ملنگ قلندر کا مقبرہ ہے۔ آپ کا تعلق لورہ کے موضع

روپڑ ہی سے تھا۔ ہر سال 12,11 اور 13 ربیع الاول میں ان کا عرس ہوتا ہے۔ عرس کے موقع پر بڑے چہل پہل ہوتی ہے اور ملک کونے کونے سے ان کے عقیدت مند روپڑ پہنچتے ہیں جہاں عرس کی محافل منعقد ہوتی ہے۔ ہر سال واہ کینٹ سے ان کے عرس والے دن ایک ڈالی روانہ ہوتی ہے جو کہ سہ پہر کو روپڑ شریف پہنچتی ہے۔ سب زائرین سہ پہر کو مزار پر حاضری دیتے ہیں اور پھر نماز مغرب کے بعد مزار کو غسل دیا جاتا ہے اور چادر چڑھائی جاتی ہے شام کے بعد عام لنگر ہوتا ہے اور پھر دوسرے روز سے عرس کی باقاعدہ تقریبات شروع ہو جاتی ہیں اس موقع پر قوالی ہوتی ہے، دھمال درباری بھی ہوتا ہے جس کے بعد حمد و نعت گوئی ہوتی ہے پھر اختتام پر رسم چراغی ادا کی جاتی ہے۔ ان کے ایک عقیدت مند اور مرید پروفیسر محمد جمیل قلندر کا اپنے مرشد کے نام سے منسوب کلام پیش کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے۔

آئیں گے بہت، پر نہ کوئی آپ سا ہوگا
ہے گوہر مقصود، وہ یگانہ قلندر
روپڑتے ہیں سنگریزے بھی روپڑ شریف میں
جب ساز بجاتا ہے وہ مستانہ قلندر
حاجی بھی ہے، کعبہ بھی اور مستانہ ملنگ بھی
ہے جان قلندر وہی جانانہ قلندر

عرس باجی سرکار: ہزارہ کی معتبر روحانی شخصیت پیر فضل الرحمان شاہ المعروف باجی سرکار کے والد کا اسم گرامی سید محمد حسین شاہ اور جد امجد کا اسم گرامی سید عالم شاہ تھا۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت امام علی رضاؑ سے جاملتا ہے ان کا روضہ مبارک مشہد (ایران) میں ہے اس لئے باجی سرکار کے خاندان کو مشہدی بھی کہتے ہیں۔ حضرت باجی سرکار پیدائشی ولی اللہ تھے۔ طبعیت میں خاکساری و فقر شروع ہی سے تھا۔ مجاہدوں اور مراقبات کی جان کش سختیاں برداشت کیں۔ عہد فقیری میں کشمیر کے علاوہ کئی دیگر مقامات کے سفر کئے اور بزرگان دین سے روحانی فیوض و برکات حاصل کیں۔ ابتداء میں آپ نے گرہالہ گاؤں کے پہاڑ کے دامن میں چلہ کشی کی اور مجاہدے اور مراقبات کئے۔ پچاس کی دہائی میں آپ نے منڈیاں کے قریب بجانب مغرب پہاڑ کی ایک چوٹی کو اپنا مسکن بنالیا اور تادم آخر اسی مقام میں عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ اسی مقام پر باقاعدگی کے ساتھ لنگر جاری ہوتا ہے جہاں لوگ آتے اور لنگر تناول کرتے۔ آپ بہت کم سوتے تہجد کے علاوہ بھی نوافل میں مشغول رہتے اور نماز فجر کے بعد تبلیغ دین کے سلسلے میں لوگوں کو رشد و ہدایت کرتے۔ مریدوں سے بلاتکلف ملتے تھے اور خاکساری و عاجزی کو شیوا بنائے رکھا۔

آپ نے 26 دسمبر 1989 بروز منگل کو مختصر سی بیماری کے بعد وصال فرمایا اور جہاں آپ کا آستانہ تھا وہیں پر آپ کو دفن کر دیا گیا۔ ہر سال 26 دسمبر کو یہاں عرس کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔

طرزِ تعمیر، آرائش و رہن سہن

قدیم ہزارہ میں ہندو راجاؤں کی حکومتیں تھیں جو کہ سکندر کے یہاں آنے سے پہلے بھی تھیں اس لحاظ سے ہزارے کی رہن سہن اور تعمیرات نہایت ہی قدیم ہے۔ ہندو راجاؤں کی جہاں بھی حکومتیں تھیں یہ وہاں قلعے تعمیر کرتے مگر ان کی رعایا اور عام آدمی کے رہنے کیلئے تعمیرات ایسی نہ تھیں جو کہ ان راجاؤں اور نوابوں کی تھیں۔ ہزارہ میں وارد ہونے والے باشندوں کی تعمیرات کا ابتدائی دور اس طرح تھا کہ یہ لوگ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے پہاڑوں میں غاریں بنا کر رہتے یا پھر پہاڑوں کے اوپر گھاس پھوس کی جھگیاں بنالیتے اور جھگیوں کے اوپر کیچڑ کی لیپائی کر لیتے تھے۔ اب تک بھی ہزارہ کی متعدد ایسی دیہاتی آبادیاں موجود ہیں جو یا تو پہاڑوں کی غاروں میں چھتیں ڈال کر اور برآمدہ بنا کر رہتے ہیں یا پھر اسی قسم کی جھگیاں بنا کر رہتے ہیں۔

اس وقت بھی ہزارہ کے دیہاتوں میں قدیم تعمیرات اسی نوعیت کی ہے۔ یہ پہاڑی اونچائی پر تقریباً ایک فٹ یا دو فٹ کی گہرائی کر کے بنیادیں بنالیتے اور پھر ان بنیادوں پر اوپر نیچے پتھر رکھتے ہر پتھر کے اوپر دوسرے پتھر کو جوڑنے کیلئے قدرتی پہاڑی بجری اور مٹی کو پانی سے گھول کر اس پر ڈال دیتے تاکہ پتھر ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے اور اس طرح چاروں طرف ستون بنالیتے پھر لمبائی کی طرف بھی دو چار اس قسم کے ستون بنالیتے ستون متوازن ہوتے ہیں اور پھر ان ستونوں پر درختوں کی لکڑیوں کو رکھ لیتے اور پھر اوپر چھتیں ڈال لیتے یہ گارے اور مٹی، پتھر کے بنے ہوئے مکانات ہوتے ہیں۔ ہر مکان ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ کمروں میں چھوٹی چھوٹی بارکیں ہوتی ہیں۔ ان بارکو میں لکڑی کی فریم بنالیتے ہیں چونکہ ہزارے کا اکثر حصہ برفانی ہے اس لئے یہ اپنے گھر اس طرح بناتے کہ برف باری کے موسم میں ان کے کمرے سردی سے محفوظ رہیں۔ اپنے کمروں میں یہ مٹی کے چولھے بنالیتے اور سردیوں میں ان چولہوں پر لوہے کی بنی ہوئی چمنی رکھ کر اور اوپر چھت میں سوراخ کر لیتے تاکہ آگ کا دھواں اوپر کو خارج ہو جائے۔ کمروں کے باہر چھوٹا سا برآمدہ ہوتا ہے اور برامدے کے ساتھ ہی ان کے مال مویشیوں کیلئے

ایک محفوظ جگہ ہوتی ہے۔اپنے مال مویشیوں کو بھی برفانی موسم کی خنکی سے محفوظ رکھنے کیلئے آگے پردہ ڈال لیتے اور ان کے گھاس اور بھوسے کیلئے آگے کچی مٹی سے جگہ بنا لیتے۔اگر زمیندار لوگ ہیں تو یہ لوگ مٹی اور گندم کو جمع کرنے کیلئے ایک سٹور بھی بنا لیتے ہیں۔ میں نے ان چھوٹے موٹے زمینداروں اور دہقانوں کے ان کچے مکانوں کو دیکھا ہے یعنی یہ لوگ اپنی زمینوں پر کھیتی باڑی کرنے کی غرض سے اپنے مکانات اپنی زمینوں میں تعمیر کرتے ہیں تاکہ آسانی سے یہ اپنی زمینوں کی کاشت کرسکیں۔جبکہ شہروں میں ان کی تعمیرات قدرے مختلف ہے۔پہاڑوں پر یہ لوگ پتھر اور گارے کے مکانات اس طرح بناتے ہیں کہ اوپر نیچے مکان بنتے ہیں۔ان مکانات کے بیچوبیچ گلیاں بنائی گئی ہیں جو کہ اب پکی گلیاں ہیں۔ان گلیوں میں پانی کی نکاسی کیلئے نالیاں بنائی گئی ہیں۔

ہزارہ کے نواب اور راجے جہاں رہتے ہیں اسے کوٹ یا گڑھی کا نام دیا جاتا ہے۔وہاں پر یہ قلعہ بناتے ہیں ہزارہ کی ہندکو زبان میں گڑھی قلعہ کو کہتے ہیں۔ جیسے گڑھی حبیب اللہ یا کوٹ نجیب اللہ' پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے سڑک کے دونوں اطراف میں جو گلیاں بنائی گئی ہیں ان گلیوں کے دونوں اطراف میں مکانات ہوتے ہیں اور یہ گلیاں اوپر کی طرف جاتی ہیں مکانات بھی اسی طرح اوپر کی طرف بنے ہوئے نظر آتے ہیں اس کا اندازہ رات کو لگایا جاتا ہے جبکہ چراغ روشن ہوتے ہیں تو پہاڑوں پر بنے ہوئے ان مکانات کی ساخت کا بہتر طرح سے اندازہ ہوتا ہے۔ہزارہ کے متوسط لوگوں کے مکانات ان کچے مکانات کی نسبت پختہ ہوتے ہیں اور برفانی موسم میں برفباری کے خدشے کے پیش نظر ان متوسط لوگوں کے مکانات کی چھتوں کے اوپر ٹین کی چادریں عمودی شکل میں بنی ہوتی ہیں تاکہ برف کے پگھلنے کے وقت پانی ان چادروں سے باسانی نیچے بہہ سکے۔اکثر ان متوسط لوگوں کے مکانات کے ساتھ ایک حجرہ نشست و برخاست کیلئے بنا ہوتا ہے۔اگرچہ ماضی کی نسبت موجودہ دور کے مکانات کافی حد تک بدل چکے ہیں اور ان مکانات کی تعمیرات زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق ہونے لگی ہیں مگر ان کی ضروریات وہی ہیں جو کہ قدیم زمانے میں تھیں۔اس لئے زیادہ تر مکانات ماضی کی طرح بنے ہیں تاکہ ان دیہاتی ماحول کی سادگی برقرار رہے۔

پنی قوم کے علاقوں میں ان کے طرز تعمیر اور مکانات کے بارے میں شیر بہادر خان پنی اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں چونکہ طوائف الملوکی اور بدامنی کا زمانہ تھا اس لئے لوگ عارضی طور پر چھپر نما مکان ہی بنایا کرتے تھے جن سے وہ بوقت ضرورت فوار نکل جایا کرتے تھے اور عموماً صحن میں ایک کنواں دو چار گز گہرا ہوتا تھا جس میں بوقت ہجرت فالتو سامان وغیرہ ڈال دیا کرتے تھے پھر جب واپس آتے تو اپنا سامان نکال لیا کرتے تھے۔انگریزوں کے دور میں ان لوگوں کے کچے مکانات کافی لمبے چوڑے ایک ہی کمرہ جن میں ستون لگائے جاتے تھے بنانے کا رواج تھا اور غلے اور سامان رکھنے کیلئے کلہوٹے یعنی مخروطی شکل کی کوٹھیاں مٹی سے بنائی جاتی تھیں جبکہ گھر کے تمام افراد اسی ایک کمرہ میں رہتے تھے۔بیچ میں مٹی کا ایک چوکور چولھا جس کے تین پائے ہوتے تھے اس پر توا رکھ کر روٹی پکائی جاتی تھی اور تمام گھر کے افراد اس چولھے کے آس پاس بیٹھا کرتے تھے ان کے یہ رہن سہن کا ایک روایتی انداز تھا۔سب ایک ہی جگہ یعنی چولہے کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے یہ ان کا انداز سردیوں کے ایام میں تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ پھر متوسط گھرانے کے لوگوں میں ایسے مکانات کے دونوں سروں پر ایک ایک چھوٹی کوٹھڑی بنائی جانے لگی اس میں سے ایک کو باروچی خانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ابتدائی ایام میں مکان کے سامنے یا بغل میں ایک برامدہ کا رواج بھی پایا جاتا ہے جو اونچے طبقہ کی خواتین کے گھروں میں روٹی وغیر پکانے کیلئے موزوں سمجھا جاتا تھا۔اس کے بعد کچے مکانوں کی جگہ پہلے پتھر سے پختہ مکانات بنے اور پھر مکانات اینٹ سے بنائے جانے لگے جبکہ زمانہ حال میں لوگ سیمنٹ کے بلاک استعمال کرنے لگے ہیں۔

ہزارہ کے وہ باشندے جو گوجر کہلاتے ہیں ان کی رہائشی زندگی خانہ بدوشوں جیسی ہے یہ زیادہ تر مانسہرہ سے ایک تہائی شمال کی جانب مالیا کے مقام پر پہاڑوں پر رہتے ہیں جو کہ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔یہ پہاڑوں پر گرمی کا موسم گزارنے کیلئے چڑھ جاتے ہیں اور کچی جھگیاں بنا کر زندگی بسر کرتے ہیں اور جب سردی کا موسم ہوتا ہے تو یہ لوگ میدانی علاقوں میں آجاتے ہیں۔

رہن سہن: ہزارہ کے لوگوں کے رہن سہن میں جو مشترکہ عنصر پایا جاتا ہے یہ ان کی حجرہ میں پلنے والی زندگی ہے ہر گاؤں میں قدیم زمانہ میں ایک حجرہ ہوتا تھا اب تک ان کی یہ روایتی زندگی سے منسلک شناخت برقرار ہے۔حجرہ میں جرگہ ہوتا ہے دراصل یہ ایک بڑا سا مکان ہوتا تھا اور اس کے سامنے ایک بڑا سا صحن ہوتا تھا جس میں چارپائیاں بچھی رہتی تھیں ساتھ ہی چلم اور تمباکو ہوتا تھا جو کہ حجرہ کی شناخت تھی۔ حجرہ کی دیواروں کے ساتھ زمین سے کچھ اونچائی پر ایک تھڑہ ہوتا تھا جہاں عام دیہاتی لوگ آکر بیٹھتے تھے جبکہ بزرگ لوگ یا مہمان چارپائیوں پر بیٹھتے۔یہ حجرہ ہر گاؤں کی سیاسی اور مجلسی رہن سہن کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور حجرہ ہی میں زندگی

کے اہم فیصلے طے پاتے مثلاً نکاح معاملات میں لین دین اور مقدمات کے فیصلے وغیرہ انہیں حجروں میں طے پاتے تھے۔ محلے میں اگر کوئی میت ہو جاتی تو اسی حجرہ میں لوگ اکٹھے ہوتے یا کوئی اور تہوار ہوتا تو حجرہ ہی میں لوگ آپس میں ملتے تھے۔ گویا کہ یہ حجرہ ہزارہ کے لوگوں کی رہن سہن اور بود و باش میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ اب اکثر لوگ اپنے گھر کے ساتھ باہر کی طرف ایک بیٹھک بنا لیتے ہیں جو کہ حجرے ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے مگر اب بھی دیہاتوں میں حجرہ کی تہذیب موجود ہے۔ ہزارہ کے بعض دیہاتوں میں بعض ایسی مساجد ہے کہ اگر وہ اونچائی پر بنی ہوتی ہیں تو ان کے نیچے اس قسم کے حجرے بنے ہوتے ہیں جہاں پر اس قسم کی مجلس زندگی رچی بسی ہوئی نظر آتی ہیں ان حجروں ہی میں نکاح منگنی اور دیگر معاملات طے پاتے ہیں۔ ہزارہ کے تمام دیہاتوں میں دیہاتی تعمیرات کے مطابق کچی مساجد بنی ہوئی تھیں۔ ان مساجد میں بہت سی اب پختہ ہو چکی ہیں جبکہ دیہاتوں میں اکثر مساجد پرانے طرز کی اب تک موجود ہیں۔ ان مساجد میں چھوٹی بڑی دونوں قسموں کی ہیں۔

ہزارہ کے بعض دیہاتوں میں اب پکی گلیاں بنا دی گئی ہیں اور گلیوں کے دونوں اطراف میں پکی اینٹوں اور سیمنٹ والے مکانات بنا دیئے گئے ہیں۔ ایبٹ آباد شہر سے اوپر شملہ پہاڑی کے نیچے جو علاقہ ہے یہ کچھ عرصہ پہلے دیہات پر مشتمل تھا۔ یہاں پر اب تمام مکانات پکے بن چکے ہیں یہ علاقہ اپر ملک پورہ کے نام سے موسوم ہے۔

عمارت مزار زبردست خان المعروف صوبہ خان:

علاقہ تناول میں زبردست خان المعروف صوبہ خان کے مزار کی قدیم طرز کی کبھی پرشکوہ عمارت تھی جس کا ذکر کرنل چارلس نے اپنی کتاب روئدادِ اختیار و نامی خاندان پنجاب میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔ یہ مزار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو کہ دریائے سرن اور مانگل کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ ایسی عمارت ہے کہ اس عمارت جیسی علاقے میں دوسری کوئی عمارت نہیں کرنل چارلس کہتا ہے یہ عمارت ایسی جگہ پر بنی ہے کہ جہاں دو دریاؤں کا اس میں سنگم ہے دریائے سری اور ندی مانگل۔ اگرچہ مزار کی یہ عالیشان پرشکوہ عمارت اب زمین بوس ہو چکی ہے اور اس عمارت کے بلند و بالا مینار گر کر زمین میں دھنس گئے ہیں۔ مزار کا کل رقبہ 40 کنال یعنی 5 ایکڑ پر مشتمل ہے جس کے اردگرد چار دیواری تھی۔ یہ دیواریں اب گر کر نیست و نابود ہو چکی ہیں۔

امیر کبیر سید شاہ علی ہمدانی کی چلہ گاہ: یہ ایک ایسی چوکور عمارت ہے جہاں امیر کبیر سید شاہ علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدان نے چلہ کیا تھا۔ یہ بوسیدہ عمارت علاقہ بفہ سے کچھ مسافت پر نوکوٹ گاؤں میں ایک بلند ٹیلہ پر واقع ہے۔ یہ ایک قلعہ نما عمارت ہے جو اس کے چاروں طرف قلعہ نما فصیل ہے۔ عمارت کے بیچ اور قلعہ کے اندرونی حصہ میں چاروں طرف عمارت کے ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی تھی۔ ایک ستون کی تہہ میں ایک غار ہے ایک روایت کے مطابق اس کے اندر شاہ علی ہمدانی چلہ اور مراقبہ کرتے تھے۔

لوک داستانیں اور کہانیاں

راجہ رسالو اور رانی کوکلاں: ہزارہ کی تاریخ میں راجہ رسالو کا نام ہمیشہ کیلئے ناقابل فراموش رہا ہے۔ اور ہزارہ کے باشندوں میں راجہ رسالو اور رانی کوکلاں کی قدیم لوک داستان بڑی مشہور و معروف اور قابل بیان داستان ہے۔ اور اس داستان راجہ رسالو اور رانی کوکلاں کو یہاں کے عوامی گیت میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ داستان اب سے دو ہزار سال پہلے کی ہے مگر اب تک زندہ اور پائندہ ہے۔ راجہ رسالو راجہ سالباہن کا بیٹا تھا۔ یہ بڑا بہادر اور وجیہہ نوجوان تھا۔ راجہ رسالو کا باپ سالباہن سیالکوٹ کا حکمران تھا۔ اس کی سلطنت راولپنڈی کے علاقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہی دنوں ٹیکسلا میں راجہ سری کپ کی راجدھانی تھی جو کہ ہزارہ کے علاقے تک تھی۔ راجہ رسالو نے سرکپ سے مقابلہ کی خواہش کی۔ راجہ سری کپ جو کہ ایک سرکش اور ظالم راجہ تھا وہ چوپڑ کے کھیل کا ماہر کھلاڑی تھا اور جو بھی اس سے نبرد آزما ہونے کی ٹھان لیتا راجہ سری کپ چوپڑ کے کھیل کھیلتے ہوئے اسے ہلاک کر دیتا تھا۔ راجہ رسالو جب راجہ سری کپ کی طرف حملہ آور ہوا تو ٹیکسلا کے ایک مقام پر پر راجہ رسالو نے راجہ سری کپ سے چوپڑ کا کھیل کھیلا اور اسے اسی کھیل میں قتل کر دیا۔ راجہ رسالو نے جب راجہ سری کپ پر غلبہ حاصل کر لیا اور اسے ہلاک کر دیا تو راجہ سری کپ کی سب حسین و جمیل دوشیزائیں راجہ رسالو پر جان نچھاور کرنے لگیں اور راجہ رسالو پر فریفتہ ہو گئیں۔ راجہ سری کپ کی ایک نہایت ہی خوبصورت اور نازک اندام پری وش رانی تھی جس کا نام رانی کوکلاں تھا جب راجہ رسالو گھوڑے پر سوار ہو کر راجہ سری کپ سے چوپڑ کا کھیل کھیلنے آ رہا تھا تو رانی کوکلاں نے اس حسین و قد آور بہادر راجہ کو دیکھا تو اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ یہ راجہ رسالو راجہ سری کپ کے نیزے کا شکار نہ ہو جائے اس لیے دور ہی سے رانی کوکلاں نے اس حسین وجیہہ اور بہادر راجے کو یہ مشورہ دیا کہ وہ راجہ سری کپ سے مقابلہ کئے بغیر واپس چلا جائے اور اپنی جان کو جوکھوں میں نہ ڈالے اس موقع پر رانی کوکلاں اور راجہ رسالو کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے اسے

ہزارہ جاتی ہندکو کے ایک گیت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

رانی کوکلاں راجہ رسالو سے کہتی ہے:

نیلے گھوڑے والے یا نیویں نیزے آ

اگے راجہ سری کپ اتے سیر لیسی اولا

بھلا چاہیں اپڑا تا پچھے ای مڑی جا

اس کے جواب میں راجہ رسالو کہتا ہے:

دوروں بیڑا اچکیا اتھے فتح آئے

سری کپ دا سر کٹ کے ٹوٹے کرساں چار

تینوں بنڑا ساں ودھیڑی میں نبڑساں مہاراج

اس مکالمے سے مہارانی کوکلاں کو راجہ رسالو سے اور زیادہ پیار ہو جاتا ہے اس لئے وہ راجہ سری کپ سے جا کر کہتی ہے:

ملک جو آیا راجپوت کر دا مار و مار

تنوں راجہ مار کے سانوں کھڑسی نال

راجہ سری کپ کو اپنی طاقت اور ہمت پر ناز تھا۔ وہ کہتا ہے:

چھوٹی نگوی واواسکن رانی وڈی کرے پکار

جد میں باہر نکلاں تاں میری تاں نچادے ڈھال

فجر روٹی تاں کھاساں سر لیساں اتار

جب دونوں راجے آمنے سامنے ہوئے اور چوپڑ کا کھیل کھیلا گیا تو راجہ رسالو راجہ سری کپ پر غالب آ گیا اور اس نے ایک ہی وار سے راجہ سری کپ کا سر کاٹ کر اس کی رانی کوکلاں کو اٹھا کر گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا اور ساتھ لے گیا:

داستان گرج پہاڑ: حسن ابدال سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں سلطان پور ہے اس علاقے میں ایک پہاڑ گندگر ہے۔ جسے گرج پہاڑ کا نام دیا گیا ہے۔ روایت ہے کہ سال دو سال کے وقفہ کے بعد اس پہاڑ میں گھن گرج کی آواز ایسے موسم میں نکلتی ہے کہ جب آسمان پر بادلوں کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور بجلی کوندنے کی کوئی علامت تک نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ مغل شہنشاہ جہانگیر نے بھی اپنی تزک جہانگیری میں لکھا ہے۔ جب اس نے براستہ ہزارہ کشمیر کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس داستان کو راجہ رسالو کی لوک کہانیوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ گندگر پہاڑ میں راجہ رسالو نے دیوؤں سے مقابلہ کیا تھا۔ داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ایک روز جبکہ راجہ رسالو علاقہ رجوعیہ میں آرام کی غرض سے سو رہا تھا تو اس وقت اس کی ایک رانی گندگر پہاڑ میں مقیم تھی کہ ایک دیو آیا اور وہ رانی کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے لگا رانی کو بھی اس دیو کے ساتھ محبت ہو گئی اور محبت آمیز انداز میں دیو کے ساتھ مشغول ہو گئی۔ رانی نے ایک طوطا اور ایک مینا بھی پال رکھے تھے یہ دونوں جانور دیو اور رانی کی حرکتوں کو دیکھتے رہے اور انہوں نے دیو اور رانی کے اس ملاپ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور رانی کو لعن طعن کرنے لگے رانی کو غصہ آ گیا اور اس نے مینا کی گردن مروڑ کر اسے مار ڈالا طوطا جان بچا کر وہاں سے سیدھا اڑتے ہوئے رجوعیہ میں آ گیا اور علاقہ رجوعیہ میں بہتے ہوئے دریائے دوڑ کے پانی میں اپنے پر ڈبو دیئے اور پھر راجہ رسالو کے منہ پر چھینٹے مار کر اسے نیند سے بیدار کر دیا اور تمام واقعہ راجہ کو اپنی معصومانہ زبان سے سنا دیا جسے راجہ رسالو خوب سمجھتا تھا چنانچہ راجہ رسالو غصے کی حالت میں گھوڑے پر سوار ہو کر گندگر پہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے دیو اور رانی دونوں کو راز و نیاز کی حالت میں بچشم خود دیکھا تو آپے سے باہر ہو کر رانی کو قتل کر دیا مگر دیو بھاگ کر پہاڑ کی ایک غار میں چلا گیا راجہ بھی اس کے تعاقب میں غار کے منہ تک پہنچ گیا مگر دیو غار کے اندر غائب ہو گیا تھا راجہ نے غار کے دہانے پر ایک پتھر رکھ کر اسے بند کر دیا اور پتھر کے اندر کی جانب اپنے تیر سے اپنی ایک ایسی تصویر منقش کی کہ کمان پر تیر چڑھایا ہوا۔ ہے جب کبھی دیو باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو پتھر پر راجہ رسالو کی مع تیر کمان کے تصویر دیکھ کر شور مچاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اندر کو بھاگ جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے اس گندگر پہاڑ سے خوفناک گھن گرج کی آواز وقفے وقفے سے آتی رہتی ہے!

اس دیو مالائی آواز کے بارے میں انگریز دور کے ڈپٹی کمشنر میجر ایبٹ نے بھی تصدیق کی ہے کہ اس آواز کے بارے میں لوگوں نے اسے یہ بتایا ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے تیس سالوں تک یہ آواز لوگ سنتے رہے ہیں اسی واقع سے منسوب اس پہاڑ کا نام گرج پہاڑ رکھ دیا گیا ہے ہزارے کی اس دیو مالائی داستان نے بہت شہرت حاصل کی۔

قینچی: ہزارہ کے لوگ گیتوں میں بے حد مقبول اور لوک داستان پر مبنی ایک ایسا گیت ہے جو کہ پہاڑوں میں بسیرا کرنے والے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے والے گوجروں سے منسوب ہے۔ اس گیت کا پس منظر ہزارہ کے شمالی علاقوں کاغان اور مضافاتی وادیوں میں رہنے والے گوجروں میں مقبول اور معروف ہونے والی محبت بھری داستان ہے۔ یہ گیت تنہائی میں ماضی کی اس محبت بھری داستان کو دہراتے ہوئے گایا جاتا ہے جس کی تان دو محبت بھرے دلوں کے ہجر و فراق کے سوز

پر ختم ہوتی ہے۔ اس لوگ گیت اور نغمہ پر سوز میں ایک ایسے منشی کی محبت کی داستان کا رنگ ہے جو کہ اس وادی کے درشی نامی جنگلوں میں منشی یعنی پٹواری تھا اور منشی کے نام سے ہی جانا پہچانا جاتا تھا۔ فرض منصبی کے تحت اسے گاؤں میں آنا پڑتا تھا اور اس مقام پر درشی کی ایک حسین وجمیل گل انداز ونازک اندام لڑکی کی آنکھیں منشی سے چار ہوگئیں اور پھر ایک لطیف وخوبصورت جذبہ محبت نے دونوں کی روحوں کو ملا دیا چونکہ لڑکی کا نام داستان محبت میں انجانا ہے اس لئے بعضوں کا خیال ہے کہ علاقے کی نسبت سے لڑکی کا نام بھی درشی ہی تھا اور قینچی کے طویل گیت کی ہر کلی میں درشی کا ذکر موجود ہے۔

لگی قینچی دلے دی ' دل ڈاہڈا تنگ ہے
گولی ماراں راکھیاں کی ' اللہ مارے سنگ اے

ترجمہ: میرے دل کو غموں کی قینچی کاٹ رہی ہے میرا دل بہت گھٹن محسوس کر رہا ہے۔ درشی کے رکھوالوں کو گولی لگے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اچا چاڑاں بنگلہ ' وچ نیویں لاداں بستے
ٹریا ساڈا منشی ہن ' تکاں کیڑے رستے

ترجمہ: اونچا بنگلہ بنا کر اس میں نیچی کھڑکیاں رکھوں۔ میرا منشی چل دیا اب اسے کن راستوں میں ڈھونڈوں۔

لگی قینچی دلے دی دل ڈاہڈا تنگ اے

جب دونوں طرف محبت کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی تو پورے علاقے میں منشی اور درشی کی ملاقاتیں دوز افزوں ہونے لگیں۔ جنگل کے رکھوالے ان دو محبت کی آگ میں جلنے والے پروانوں کے درپے ہوگئے اور وہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ منشی اور درشی کی ملاقات جنگل کی تنہائیوں میں کس وقت ہوتی ہے اور پھر یہ جنگل کے رکھوالے ان دو محبت کے مارے دلوں کے جذبوں کو سرد کرنے کیلئے لوگوں میں ان کی ملاقاتوں کے راز کو افشا کرنے لگے مگر یہ دو سچی محبت کے محافظ ان کی پرواہ کئے بغیر راز ونیاز کے ساتھ ملاقاتیں کرتے رہتے۔ دونوں درشی کے جنگل کے درختوں کے سائے میں ملتے اور محبت کی سوزش کو قدرے سرد کرتے مگر یہ ملاقاتیں ان کی محبت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکاتی رہیں۔ یہ بات پھیلتے پھیلتے لڑکی کے والدین تک جا پہنچی۔ اگرچہ منشی بھی اپنی خاندانی اور مالی حیثیت میں کچھ کم نہ تھا کہ اس لڑکی کو حاصل نہ کر سکتا ہو مگر لفظ محبت ہی ان دو وجودوں کے ملاپ کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ معاشرہ میں لفظ محبت سچے رشتوں کو بھی آلودہ کر دیتا ہے اور پھر وہ معاشرہ کہ جس میں یہ محبت پیدا ہوئی تھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لفظ محبت کو عزت واحترام اور رشتوں کے تقدس کیلئے استعمال کیا جائے بلکہ محبت کا جذبہ نیک نامی کو بدنامی کے داغ سے آلودہ کر دیتا ہے۔ یہی حال منشی اور درشی کی محبت کا بھی تھا کہ اس جذبہ محبت اور محبت سے متعلق لوگوں نے ان دو محبت بھرے دلوں کے راستے میں بھاری بھرکم پتھر رکھ دیا پس گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں اور یہ تدبیریں نکالی جانے لگیں کہ منشی کا منشی کو درشی میں آنا جانا بند کروا دیا جائے چنانچہ حکام کو کہہ کر علاقے کے بااثر لوگوں نے درشی کے جنگلوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دور بھجوا دیا۔ درشی کو اس فیصلے پر بے حد دکھ اور صدمہ ہوا۔ اب منشی کے ہجر وفراق میں جلنے کے دن آ گئے یہ مجبور وبے بس لڑکی اپنے محبوب کے فراق میں صرف اتنا کہنے کے قابل تھی:

اچا چاڑاں بنگلہ چو خیر لاواس آے
چل ماڑیا منشی اللہ دے حوالے

ترجمہ:۔ میں ایک اونچا بنگلہ بناؤں گی جس کے چاروں طرف طاقچے بناؤں گی۔ اے میرے منشی جا تیرا خدا حافظ۔

کہتے ہیں کہ منشی دکھ بھرے دل، محبت بھری داستان اور قینچی سے کٹتے ہوئے کلیجے کے ساتھ درشی سے رخصت ہونے پر مجبور کیا گیا اور جب یہاں سے گیا تو پھر کبھی واپس اس طرف نہیں آیا۔ ادھر درشی منشی کی محبت کی سوزش میں جلتی رہی۔ اس کے فراق میں تڑپتی رہی اور وہ منشی کے ہجر وفراق میں جل جل کر پگلتی رہی اور صرف ان گیتوں کے سہارے سانسیں لیتی رہی۔

کٹ دیا گھاس اللہ چھوڑ آئی بناں
لڑیا ساڈا منشی جیوں چودھوی دا چناں
لگی قینچی دلے دی۔۔۔۔۔

ترجمہ: میں گھاس کاٹ رہی تھی مگر ایک کھیت چھوڑ دیا۔ میرا منشی جو چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا چل دیا میرا دل قینچی سے کٹا جا رہا ہے۔

درشی کا بنا بچ پتراں کوڈھیر
گیو میرا منشی اللہ لیاوے خیر
لگی قینچی دلے دی۔۔۔۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں خشک پتے بہت ہیں۔ میرا منشی چلا گیا اللہ اسے پھر واپس لائے۔

درشی کا بناں بچ گھگیاں کو جوڑ دیو میرا منشی رکھ نیں تھوڑ دو

لگی قینچی دلے دی۔۔۔۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں فاختہ کا ایک جوڑا رہتا ہے میرا منشی مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہے اور میرے دکھ کچھ کم نہیں ہیں میرا دل غموں کی قینچی سے کٹ رہا ہے۔

درشی کا بناں بچ نیلا نیلا دکھ

گیو میرا منشی گیو میرا سکھ

لگی قینچی دلے دی۔۔۔۔۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں نیلے نیلے درخت ہیں۔ میرا منشی اور میری ساری خوشیاں چلی گئی ہیں میرا دل غموں کی قینچی سے کٹ رہا ہے۔ اس محبت بھری داستان کے ضمن میں بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ منشی کو جب درشی کے جنگل سے نکالا گیا اور وہ ہمیشہ کیلئے دکھی دل کے ساتھ اس علاقے کو الوداع کہہ کر چلا گیا تو راستے میں اسے ایک منصوبے کے تحت قتل کر دیا گیا جیسا کہ قینچی کے گیت کی اس کلی میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

درشی دے بناں بچ لکیاں نے تاراں

لوکاں کیتا جلسہ منشی کوں ماران

لگی قینچی دلے دی۔۔۔۔۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں بھیڑ کے بچے چرتے ہیں۔ منشی کو سحر کے وقت قتل کیا گیا۔ میرا دل غموں کی قینچی سے کٹ رہا ہے۔ آگے اس گیت میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ منشی کس چیز کے ساتھ کس طریقے سے قتل کیا گیا۔ اس سے یہ بات بغیر ابہام کے کہی جا سکتی ہے کہ منشی کو راستے ہی میں قتل کیا گیا اور قتل کر کے لاش بھی کسی جگہ دفنا دی گئی کیونکہ اس کے بعد منشی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

درشی دے بناں بچ پکیاں نے ہاڑیاں

منشی کو ماریا نال کلہاڑیاں

لگی قینچی دلے دی۔۔۔۔۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں خوبانیاں پک چکی ہیں۔ منشی کو لوگوں نے کلہاڑیوں سے مار دیا ہے۔ میرا دل غموں کی قینچی سے کٹ رہا ہے

درشی دے بناں بچ دساں دریکاں

گم گیا یوسف ڈھونڈے زلیخا

لگی قینچی دلے دی' دل ڈاہڈا تنگ اے

ترجمہ: درشی کے جنگل میں بکائن کے درخت ہیں۔ یوسف گم ہو گیا ہے اور زلیخا تلاش کر رہی ہے۔ میرا دل غموں کی قینچی سے کٹ رہا ہے اور گھٹن محسوس کر رہا ہے۔

سیف الملوک بدیع الجمال: دیومالائی داستانوں میں سیف الملوک اور بدیع الجمال کی لوک داستان نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ داستان جھیل سیف الملوک سے منسوب ہے جو کہ علاقہ کاغان کی مشہور اور خوبصورت جھیل ہے جو ہزارہ کے علاقہ ناران سے چھ میل مشرق کی جانب بلندی پر واقع ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دلی کے ایک شہزادے کا نام سیف الملوک تھا۔ وہ سیر وسیاحت کا دلدادہ تھا اور اکثر اس غرض سے اپنے ملک سے دور سفر میں ہی وقت گزارتا تھا شہزادے نے نیند کی حالت میں ایک ایسا خواب دیکھا کہ ایک نہایت ہی حسین وجمیل پری سے اس کی ملاقات ہو رہی ہے صبح جب یہ بیدار ہوا تو اس پری کی صورت اسے بیتاب کرنے لگی۔ اس نے اپنے ملک کے نہایت ہی نامور نجومیوں کو بلایا اور انھیں اپنا خواب بیان کرتے ہوئے اس پری کے حسن وجمال کا تذکرہ کیا اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ اپنے علم ونجوم سے معلوم کریں کہ یہ پری کہاں رہتی ہے نجومیوں نے اپنے علم نجوم سے معلوم کر کے شہزادے کو بتایا کہ یہ پری ہزارہ کے علاقہ کاغان کے گاؤں ناران سے اوپر ایک وادی میں رہتی ہے۔ اگر شہزادہ اس کو دل دے بیٹھا ہے تو اسے وہاں جا کر بارہ سال عبادت میں گزارنے ہونگے اور جب بخیر وخوبی شہزادہ بارہ سال عبادت میں گزار لے تو اسے اس کی مراد حاصل ہو جائیگی چونکہ شہزادہ پہلے ہی اس پری کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو چکا تھا اس لئے وہ اس پری کو حاصل کرنے کے لئے اس کے علاقے کی طرف چل پڑا جب نجومیوں کے بتائے ہوئے مقام تک پہنچ گیا تو اس نے وہاں دریا کے پاس بہت بڑی جھیل دیکھی شہزادہ اس مقام پر ٹھہر گیا اور پری کو حاصل کرنے کیلئے عبادت میں مشغول ہو گیا اور پھر پورے بارہ سال اس نے عبادت میں گزار دیئے شہزادہ آنکھیں بند کئے ہوئے ایک روز عبادت میں مشغول تھا اور اپنے تصورات میں پری کے حسن وجمال میں کھو چکا تھا کہ اس نے اپنے آس پاس پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کو محسوس کیا جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہاں پری بدیع الجمال اپنی تین سو ساٹھ دوسری پریوں کے ساتھ جھیل پر نہانے کیلئے پانی میں داخل ہو گئیں۔

شہزادہ یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ اس نے خصوصیت کے ساتھ پری بدیع الجمال کے کپڑوں کو نظروں میں رکھا اور جب سب پریاں اپنی ملکہ بدیع الجمال کے ساتھ جھیل میں نہا رہی تھیں تو شہزادے نے پری بدیع الجمال کے کپڑے اٹھا لئے پریوں نے شہزادے کو دیکھ لیا اور فوراً جھیل سے نکل کر کپڑے پہن کر اڑ گئیں صرف بدیع الجمال بے بسی کی حالت میں جھیل کے اندر رہ گئی۔ پری بدیع الجمال نے

شہزادے سے اپنے کپڑے مانگے تو شہزادے نے پری بدیع الجمال سے یہ وعدہ لینے کے بعد اسے کپڑے دیئے کہ وہ شہزادے سے شادی کرے گی۔ وہاں ایک ایسا دیو بھی تھا جو کہ پری بدیع الجمال پر عاشق تھا وہ قریب کے ایک پہاڑ پر رہتا تھا جب اس نے دیکھا کہ شہزادہ اس پری سے شادی کر رہا ہے تو دیو انتہائی غضب ناک ہوا اور اس نے غصے اور طیش میں آ کر جھیل کے ایک کنارے پر ایسی لات ماری کے جھیل کے کنارے میں دراڑ پڑ گئی اور جھیل میں سیلاب آ گیا سیلاب کا پانی اس دراڑ سے گزر کر طوفان کی صورت میں وادی کی طرف بہنے لگا۔ دراصل دیو یہ چاہتا تھا کہ سیلاب کے پانی میں شہزادہ اور پری ڈوب جائیں مگر شہزادہ اور پری بدیع الجمال پہاڑ کی ایک اوٹ میں ہو گئے جس کی وجہ سے وہ بچ گئے جب سیلاب کا پانی گزر گیا تو شہزادے نے اس دیو کو بددعا دی۔ لہذا شہزادے کی بددعا سے دیو وہیں پتھر کا بن گیا لوگ کہتے ہیں کہ آج جھیل سیف الملوک کے کنارے جو پہاڑ کھڑا ہے وہ وہی دیو ہے جسے شہزادے نے بددعا دے کر پتھر کا بنا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شہزادے کی بددعا سے دیو پتھر کا بن گیا تو شہزادہ نہایت اطمینان کے ساتھ پری بدیع الجمال کو لے کر دلی چلا آیا اور وہاں پری بدیع الجمال سے شادی کر کے رہنے لگا۔

روایت ہے کہ یہ واقعہ سولہویں صدی میں رونما ہوا جبکہ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادہ سیف الملوک کا پورا نام طاہر سیف الملوک تھا اور اس کے والد کا نام شاہ محمد سیف الملوک تھا جو کہ غوجستان کا حاکم تھا۔

مریم: ہزارہ کے علاقے ضلع مانسہرہ کی تحصیل بالاکوٹ کے ریسٹ ہاؤس کے صحن میں ایک ایسا پتھر پڑا ہوا ہے جس سے مریم کی داستان کچھ اس طرح سے منسوب ہے کہ بالاکوٹ میں پیدا ہونے والی لڑکی مریم جو کہ حسن و خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی یہ بالاکوٹ میں پلی اور جوان ہوئی۔ کہتے ہیں کہ بالاکوٹ کے اس ریسٹ ہاؤس کے صحن میں پڑا ہوا بھاری بھرکم وہی پتھر ہے جسے مریم ایک ہاتھ سے اٹھا لیا کرتی تھی۔ جب مریم دریا کے کنارے پانی بھرنے جاتی تھی تو ایک ہاتھ سے یہ بھاری بھرکم پتھر اٹھاتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں گھڑا اور دریا سے گھڑے میں پانی بھر کے لاتی تھی مریم جب پوری طرح عالم شباب میں داخل ہو گئی تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی مگر مریم نے اپنی شادی کیلئے یہ شرط رکھ دی کہ وہ اس بہادر جوان سے شادی کرے گی جو اس پتھر کو اٹھا لے۔ گاؤں کے بڑے بڑے بہادر جوان آنے لگے اور قسمت آزمائی کرنے لگے مگر نامراد ہی واپس لوٹتے انھی گاؤں کے نوجوانوں میں ایک بہادر نوجوان شہزاد نامی بھی تھا۔ اس نے اپنی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور پتھر اٹھانے کیلئے میدان میں کود پڑا۔ مریم اس بہادر کو دل سے چاہتی تھی اور یہ چاہتی تھی کہ شہزاد پتھر اٹھانے میں کامیاب ہو جائے اور پتھر اٹھانے کی شرط پوری کر کے مریم اور شہزاد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ چنانچہ جب شہزاد پتھر اٹھا رہا تھا تو مریم کی دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں اور وہ اس بہادر نوجوان کی کامیابی کیلئے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔

شہزاد اگرچہ بہت حد تک پتھر اٹھانے میں دوسروں کے مقابلے میں کامیابی سے ہمکنار ہوا اور وہ پتھر کو سینے تک لے آیا جس کی وجہ سے میدان میں موجود لوگوں کے ہونٹوں پر تبسم کھلنے لگا اور وہ شہزادہ کو داد و تحسین پیش کرنے لگے۔ شہزاد اب بہت تھک چکا تھا اور جب پتھر سینے تک پہنچ گیا تو اس وقت اس کی ہمت جواب دے چکی تھی اور پتھر اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس ناکامی پر شہزاد بہت دلبرداشتہ ہو گیا ادھر مریم کا دل بھی شہزاد کی ناکامی کی وجہ سے چور چور ہو گیا اور کہا جاتا ہے کہ اسی رات مریم کو ایسا بخار ہوا کہ وہ اس کے بعد بستر سے نہ اٹھ سکی جبکہ اس واقعے کے بعد شہزاد کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

لوک ساز گیت اور ناچ

پہاڑی گیت: یہ پہاڑی گیت جو نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس نے پورے ہزارہ کے شہری اور مضافات کے علاقوں میں یکساں مقبولیت حاصل کر لی ہے بلکہ ہزارہ سے باہر بھی اس گیت کو لوگ گاتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

یہ گیت خوشی کے موقع پر مل کر گایا جاتا ہے ڈھول کی مخصوص تھاپ پر اور بانسری کی دھن پر یہ گیت اس طرح گایا جاتا ہے کہ ایک ٹولی ہوتی ہے جو کہ دائرے کی شکل میں بیٹھتی ہے جب یہ گیت شروع ہوتا ہے تو اس کی دھن کے ساتھ ہی یہ پوری ٹولی حرکت میں آ جاتی ہے اور دائرے میں مخصوص انداز میں رقص کرتے ہوئے یہ گیت گایا جاتا ہے اس گیت کے بارے میں ایک عجیب بات سامنے آئی ہے کہ یہ گیت ہزارہ کے تمام پہاڑی اور میدانی علاقوں میں مقبول ہوا ہے جبکہ اس کی دھن کسی استاد نے نہیں بنائی ہے۔ جب یہ گیت گایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ خود بول رہے ہیں۔

پہاڑی گیت کی یہ صنف کچھ اس قسم کی ہے کہ اس کی ابتدائی اس کا آدھا مصرعہ یوں ہے۔ چنے چنے دی چانڑیں اور پھر اس کے ساتھ ہی آدھا مصرعہ مکمل کیا

جاتا ہے جو زیادہ تر اس طرح ہے کہ سرگی دے یا تارے یا لوچا دے۔

اور پھر آدھا مصرعہ نیچے لگا کر بات مکمل کی جاتی ہے اور اس طرح یہ ایک بیت یا بند بن جاتا ہے اور پھر دوسرا بیت اسی ترتیب سے شروع کیا جاتا ہے۔

چٹے چنے دی چانڑیں سرگی دے دیا تارے یا لوچا دے

میرا چھلہ گمایا دی اوہ چادے

چٹے چنے دی چانڑیں میری بلی اتے بگلہ بول گیا

لت مار کے کجلہ ڈھول گیا

چٹے چنے دی چانڑیں میں رہن پرانده پانی آں

تو یہ کر موٹر میں آنی یاں

چٹے چنے دی چانڑیں کا کولہ بنگلہ نواں بیا

چل دیکھنڑ چلی ایں کوویں جیا

چٹے چنے دی چانڑیں بلی اتے بگلہ بول گیا

لت مار کے کجلہ ڈھول گیا

چٹے چنے دی چانڑیں ویڈی دیاں سنگلہ کس لایا

تو سنا دی ایں میں کھیڈ آیا

چٹے چنے دی چانڑیں سرگی دے یا تارے یا لوچا دے

میرا چھلہ گمایا دی اوہ چادے

اس گیت کے ساتھ جو رقص کیا جاتا ہے اسے پہاڑی زبان میں ''کر'' کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ماہیا، چاربیتہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

شادی کے لوک گیت

ارائی گیت: شادی سے تین دن پہلے ہزارے کے لوگ لڑکے کو گلی کوچوں میں چکر دیتے ہیں۔ اس موقع پر تمام خواتین جو کہ لڑکے کے رشتے دار ہوتی ہیں وہ لڑکے کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لڑکے کو لڑکی گھر بھی لے جایا جاتا ہے اور ساتھ پھلیاں یا بتاشے بھی لے جاتے ہیں جو کہ لڑکی والے آپس کے رشتہ داروں میں بانٹتے ہیں۔ اس رسم سے شادی شروع ہو جاتی ہے تو پھر یہ گیت گاتے ہیں جسے ارائی گیت کہتے ہیں۔

پنڈی نیلام ہوئی یا نولکھ دی جولی یا

سہریاں والے یاں دی اساں ملنی جولی یا

کیلی یا نڑیں جیسی ای بنگلے نالا لائی یا

گنڈی یاں والے یا کسی موج بڑائی یا

پکیاں خانپورے دی یاں ناکھاں

یہ لوک گیت ہری پور کے ایک قصبے خان پور کی طرف منسوب ہے جو پورے ہزارے میں یکساں مقبول ہے لیکن اس گیت کی اصل ہری پور علاقے سے مختص ہے اس گیت میں بار بار خانپور کا ذکر آتا ہے شادی کے موقع پر جب خواتین لڑکے کے گھر سے لڑکی کے گھر مہندی لگانے کیلئے جاتی ہیں یا لڑکی کے گھر سے لڑکے کے گھر مہندی کیلئے جاتی ہیں تو راہ چلتے ہوئے ڈھول کی تھاپ پر سب خواتین یہ گیت اس طرح گاتی ہیں۔

آ کھاں کے نا آ کھاں پکیاں خانپورے دی یاں ناکھاں

گنڈیاں والے آں ماؤ نکیوں منگایا دی

پھلاں دا سہرا گانا پنڈیوں آیا دی

آ کھاں کے نا آ کھاں پکیاں خانپورے دی یاں ناکھاں

اتے تلے دو ڈولیاں ھک دود ہے دی ویر چھوڑو

نکے دی منگوئیں بڈے دی شادی کر چھوڑو

جتناں تو بدھ سو ہنڑاں ساڈ دیس پیارا دی

بنی دی لاج مانڑوے

یہ گیت ہزارہ کے لوگ اس وقت گاتے ہیں جب برات سے پہلے لڑکے کو خواتین نہلاتی ہیں تو اس وقت خواتین مل کر یہ گیت گاتی ہیں۔

لولاک مانڑوے

بنی دی لاج مانڑوے

عرشاں تو چاند آیا

جڑی آپ اللہ فرمایا

میرے نبیؐ دے خزانے کھلے

وجواونڑ عطر ادے ہولے

جنڈا پاک نبیؐ دا چولے دے

لولاک مانڑوے

پھر جب لڑکا کپڑے پہن لیتا ہے تو خواتین یہ گیت گاتی ہیں۔

کپڑے شپڑے لاندے یاں
تنوں اللہ دی یاں دعائیاں
تو جی پیزادے یا پایاں
تو جی وہٹی دے یا سائیاں
تیرا بناں سوایا سالیاں

دعائے خیر کا گیت: جب دولھا تیار ہو جاتا ہے اور جنج نکلنے لگتی ہے تو اس وقت خواتین گیت کے یہ بول گاتی ہیں۔

جل دے یاں تو قربان
چٹیاں دنگار تے نشان
صدقے جل دے یاں تو
جل دے یاں تو قربان
صدقے آیاں تو۔

جب دلہن کی ڈولی لڑکے کے گاؤں یا محلے میں داخل ہوتی ہے تو دولہا کے گھر کی خواتین دروازے پر کھڑے ہو کر یہ گیت گا کر لڑکی کا استقبال کرتی ہیں۔

آیاں تو قربان پھکے چٹے اتے نشان
صدقے آیاں نوں
لالہ کھڑے اتے سرانواں شکرا بڑیا خیر اواں
صدقے آیاں نوں
لالہ خیر تیر یا منگیاں تیرا کاج سوہایا سنگیاں
صدقے آیاں نوں
نہ ٹوریں تو مائے میری ڈولی

ہزارے کا یہ لوک گیت بھی ہزارہ کے مختلف علاقوں میں اس وقت گایا جاتا ہے جب لڑکی کی ڈولی اپنے ماں باپ کے گھر سے اٹھنے لگتی ہے یہ گیت لڑکی کے گھر کے لڑکیاں مل کر گاتی ہیں جس کے بول یہ ہیں۔

نہ ٹوریں تو مائے میری ڈولی
نہ کہلی تے نہ میں بولی
میری ڈولی دا رنگ کالا
ڈولی بدیا کرے میرا لالا
سوہنڑیں لالے تو میں کہولی
نہ ٹوریں تو مائے میری ڈولی
میری ڈولی نال سرادیں
ڈولی بدیا کرنز میرے مامے
سوہڑیں مامیاں تو میں کہولی
نہ ٹوریں مائے میری ڈولی
میری ڈولی نال زنجیر دے
ڈولی بدیا کرنز میرے میر دے
سوہنڑیں ویراں تو میں کہولی
نہ ٹوریں تو مائے میری ڈولی
جنڑ یا کھٹ آیا

ڈولی جب لڑکے کے گھر تک پہنچ جاتی ہے تو اس وقت شور مچ جاتا ہے ڈولی آ گئی تو پھر گھر میں لڑکے کی خواتین یہ گیت گاتی ہیں۔

جنڑ یا کھٹ آیا
راویل لڑیاں کھٹ آیا
لالہ چھک تجوے دیاں رسیاں
دشمنڑ دیکھنڑ چٹیاں اکھیاں

جنڑ یا کھٹ آیا۔

گتکہ: یہ اگرچہ ایک لوک کھیل ہے مگر اس قسم کا کھیل ہے کہ شادی بیاہ کے موقع یہ گتکہ باز اس طرح رقص کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کی تلواریں ہوتی ہیں اور یہ گول دائرے میں کبھی ایک پاؤں اٹھا کر اور تلواریں لہرا کر رقص کرتے ہیں اور کبھی دوسرا۔

ہزارہ کے آلاتِ موسیقی

ہزارہ میں جو ساز وغیرہ کیلئے اوزار تیار ہوتے ہیں ان میں روایتی ساز دور ڈھولک یا باجے مندرجہ ذیل ہیں۔

دف، ڈھولک، پچنگ، بین، شہنائی، بانسری اور سرمنڈال وغیرہ روایتی ساز ہیں۔

ہزارہ کے لوک ساز میں پچنگ ایک مخصوص ساز ہے یہ بچھو کی طرح لوہے کی ہوتی ہے جس کے بیچ میں لوہے کی ایک تار گزار دی جاتی ہے اس کے ایک سرے کو منہ میں رکھ کر بجایا جاتا ہے اور یہ اس سرے کو منہ کے خلاء سے بجاتے ہیں یہ

مخصوص قسم کی آواز پیدا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ بین، سرمنڈال اور بانسری یہاں کے روایتی ساز ہیں۔ یہ حویلیاں کے محلہ قصاباں میں بابا عبدالرؤف خود بناتا ہے اور وہ ان کا استعمال بھی جانتا ہے۔

مانسہرہ اور ہری پور کے مقامات پر بھی سازندے بنائے جاتے ہیں اور ہری پور کے موضع سرائے صالح جو کہ چڑیا کے نام سے مشہور ہے مختلف سازندے بنانے میں بہت ماہر ہیں خصوصا بین بنانے اور بجانے میں اس خاندان کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ یہ خاندان بہت پھیلا ہوا ہے اور ساز اور سازندے کے اعتبار سے ایک روایتی خاندان ہے۔ اس کا بیٹا خورشید اور بہو سلامت بی بی بہت مشہور ہیں یہ لوگ گانے اور ساز بجانے میں یکتا ہیں۔ اس کی پوتی انشا زیبی آج کل علاقے میں گانے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔

ایبٹ آباد کے موضع نواں شہر میں رہائش پذیر حسین بخش کو ثر لوک گیت گانے میں بہت مشہور ہو۔ ایہ اصل میں ہری پور کا تھا مگر بعد میں ایبٹ آباد کے نواں شہر میں رہنے لگا۔

کلاسیکل گانے والوں میں استاد مولا بخش کی ہزارے میں بڑی شہرت تھی جو کہ مانسہرہ کا باشندہ تھا۔ اس کے متعدد شاگرد ہیں۔

لوک گیتوں میں اس وقت اشرف ہزاروی اور رافعہ بانو پور کے علاقے میں مشہور ہیں جبکہ شکیل اعوان لوک گیت گاتے ہیں۔

لباس اور زیورات

خرقہ: یہ ایک کرتہ ہے جو قدیم ہزارہ کے باشندے استعمال کرتے تھے یہ بہت سادہ کھلا اور گھروں میں سہولت سے بنایا جاتا تھا۔ ڈھیلا ڈھالہ اور آگے سینے سے کھلا ہوتا تھا۔ اس کرتے کے بازو کھلے اور لمبے ہوتے سینے کی طرف دونوں جانب کپڑے ہی سے بنے ہوئے تسمے لگے ہوتے تھے جن کو یہ اپنی ہزارہ جاتی زبان میں تڑیاں کہتے تھے۔ ان تڑیوں کو آگے سے باندھ لیا جاتا تھا۔ کھیتوں میں کام کاج کے وقت ان تڑیوں کو پیچھے کی طرف باندھ لیا جاتا تھا تو اگلے حصہ خالی ہو جاتا تھا اور اس طرح کام کاج کے وقت یہ لباس مزید ڈھیلا اور آرام دہ ہو جاتا تھا۔

پاجامہ: ان قدیم لوگوں کا پاجامہ بھی کرتے کی مناسبت سے کھلا اور ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا۔ یہ بھی سوت کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ اس پاجامے کے پائنچے کھلے ہوتے تھے یہ نہایت سیدھا سادہ لباس تھا۔

پگڑی: ہزارہ کے قدیم باشندے اپنے متذکرہ مخصوص روایتی لباس کے ساتھ سر پر پگڑی باندھتے تھے جس کا رنگ عموما سفید ہوتا تھا یہ لوگوں کا باوقار لباس سمجھا جاتا تھا۔ مصافات میں اب بھی یہ روایتی پہناوہ موجود ہے۔

کلاہ زری: ہزارہ کے بااثر لوگ پگڑی کے ساتھ ساتھ طلا زری کا بنا ہوا کلاہ بھی استعمال کرتے ہیں جس پر پشاور کی بنی ہوئی سفید آسانی لنگی باندھا کرتے تھے اور ہاتھ میں چھڑی استعمال کرتے جسے یہ لوگ ہسہ کہتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس روایتی اور ثقافتی لباس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

ٹوپی: ہزارہ کے تمدنی حالات کے تحت لباس میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے اور تمدنی علاقے کے لوگ بھیڑ، بکری کے پوستوں کی بنی ہوئی قراقلی ٹوپیاں بھی استعمال کرنے لگے۔

چادر: ہزارہ کے وہ لوگ جو کہ کھیتوں میں کام کرتے اکثر اپنے ساتھ چادر رکھتے جو کہ بوقت ضرورت کئی امور میں کام آتی تھیں۔ چادر یہ لوگ اکثر کاندھوں پر رکھتے جبکہ سرد علاقوں میں یہ چادریں بدن پر اوڑھتے ہیں۔ ان چادروں اور کمبلوں کا رواج اب بھی سرد علاقوں میں بکثرت ہے۔

خواتین کا لباس: ہزارہ کے دیہاتوں میں اب تک بڑی بوڑھی مستورات کا لباس قدیم روایتی زندگی کی عکاسی کرتا ہے وہ خواتین جو گھروں میں یا کھیتوں میں کام کرتی ہیں ان کا لباس ڈھیلا ڈھالہ ہوتا ہے جو رنگدار ہوتا ہے۔ کرتہ اور پاجامہ کھلا ہوتا ہے۔ گلے پر دھاگے سے کام کیا ہوتا ہے۔ عورتوں کے گلے سے نیچے بھی تڑیاں ہوتی ہیں جسے باندھ لیا جاتا ہے جبکہ اس سے اوپر بٹن بھی لگے ہوتے ہیں۔ کرتے پر مختلف بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ ان کے لباس کا زیادہ تر رنگ گوشتی اور آسانی ہوتا ہے۔

برقعہ: ہزارہ کی عام خواتین میں ستر پوشی کا رواج مذہبی جذبے کو برقرار رکھنے کیلئے تھا اور سب گھر سے باہر نکلتی تھیں تو سرتاپا برقعہ اوڑھ کر نکلتی تھیں۔ یہ برقعہ سفید لٹھے یا کسی اور سفید کپڑے کا ہوتا تھا اس کپڑے کی پیمائش 12 میٹر ہوتی تھی۔ یہ اس طرح بنا ہوتا کہ سر پر ٹوپی ہوتی اور ٹوپی کے آگے آنکھوں والے حصے میں ایک جالی بنادی جاتی جو کہ قریشے سے بنائی جاتی تھی اس جالی کو ٹوپی کے اگلے حصے میں لگا دیا جاتا تھا

اور پھر نیچے ٹوپی کے اردگرد برقعے کا کپڑا لگا دیا جاتا بدن کے تین حصے آگے اور دائیں بائیں کا کپڑا پاؤں تک ہوتا جبکہ آگے کا کپڑا دامن تک ہوتا بوقت ضرورت اگلے کپڑے کو اوپر بھی ٹوپی پر ڈالکر منہ کھلا کر دیا جاتا تھا۔ اب بھی بڑی بوڑھیوں میں برقعے کا رواج مکمل طرح سے ناپید نہیں ہے اور مضافات کی خواتین جب شہروں میں آتی ہیں تو یہ برقعہ اوڑھ کر آتی ہیں۔ اب زیادہ تر چادروں کا رواج ہے اور خواتین چادریں اوڑھ کر گھر سے باہر نکلتی ہیں۔

چغہ: یہ لباس ہزارہ کے پہاڑوں پر بسنے والے گوجروں کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ سادہ شلوار استعمال کرتے ہیں اور اوپر ایک ایسا کرتہ پہنتے ہیں جو کہ چغہ نما کھلا ہوتا ہے۔ گوجر لوگ سر پر پٹکہ ضروری باندھتے ہیں گوجر اس چغہ نما کرتے کو اپنی گوجری زبان میں "ماہیا" کہتے ہیں۔

شال: یہ ایک بڑی شال ہوتی ہے جو چادر کا کام دیتی ہے گوجر لوگ یہ شال کاندھے پر رکھتے ہیں۔ یہ شالیں گوجر باشندے بھیڑ کی اون سے خود بناتے ہیں جب سردی زیادہ ہوتی ہے تو ان شالوں سے بدن کو ڈھانپتے ہیں۔

زری کی جوتی: ہزارے کے نوجوان لوگ زری کی جوتی بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ یہ چمڑے کی اوپر سے کھلی اور ہوادار جوتی ہوتی تھی جس پر طلائی کا کام ہوتا تھا۔ اس جوتی کو زری کی جوتی کہا جاتا ہے۔

پول یا کھیڑی: یہ ایک ایسا چپل ہوتا ہے جس کے اوپر گندم کی بالیوں کو نہایت سلیقے کے ساتھ سیلا جاتا ہے ہزارہ کے بڑے، بوڑھے اور جوان یکساں طور پر اسے بڑے شوق کے ساتھ پہنتے اسے ہزارہ کی زبان میں پول یا کھیڑی کہتے۔

زیورات

نامہ: ہزارہ کی خواتین جو زیورات استعمال کرتی ہیں انہیں گلے کے ہار کے رواج پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اس گلے کے ہار کو ہزارہ کی خواتین نامہ کہتی ہیں اور شوق سے پہنتی ہیں۔

تعویز: ہزارہ کے مضافات میں خواتین میں تعویز کے استعمال کا رواج عام ہے جو اکثر چاندی کا بنا ہوتا ہے۔ یہ تعویز ڈبی نما چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے اور اس کے دونوں طرف زنجیری لگی ہوتی ہے ماتھے سے اوپر سر پر ایک طرف کر کے اسے لٹکا دیا جاتا ہے۔

کڑے: ہاتھ کے کلائیوں میں جو کنگن استعمال کرتی ہیں انہیں کڑے کہا جاتا ہے۔ یہ ہر گھرانے کی مالی حیثیت کے مطابق خواتین استعمال کرتی ہیں ان میں بعض کڑے تو وہ ہوتے ہیں جو کافی موٹے اور وزنی ہوتے ہیں بعض کڑے کم وزنی اور ہلکے ہوتے ہیں۔

پازیب: پاؤں میں جو پازیب استعمال کی جاتی ہے وہ عموماً چاندی کی بنی ہوتی ہے۔ ہزارہ کی خواتین اسے پنزیب کہتی ہیں۔

مرکی: یہ مرکی دو قسم کی ہوتی ہے جو کہ ناک میں پہنی جاتی ہے ایک تو وہ ہے جو ناک کے ایک طرف استعمال ہوتی ہے دوسری وہ ہوتی ہے جو کہ نتھ کے طور پر استعمال ہوتی ہے ہزارہ کے مضافاتی دیہاتوں میں عموماً نتھ کے طور پر یہ استعمال ہوتی ہے۔ عموماً سونے کی ہوتی ہے البتہ گھرانوں میں چاندنی کی بھی مرکی ہوتی ہے۔

کوکا: یہ ناک میں سوراخ کر کے ڈالا جاتا ہے اور اس کے سرے پر موتی جڑا ہوتا ہے اسے تھیوا بھی کہتے ہیں۔ عام خواتین یہی استعمال کرتی ہیں۔ یہ چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔

بالیاں: یہ بالیاں چھوٹی عمر کی بچیوں سے لے کر بڑی عمر کی خواتین تک استعمال کرتی ہے یہ کانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

ٹیکہ: یہ ماتھے پر لگایا جاتا ہے یہ چاندی کا بھی ہوتا ہے اور سونے کا بھی بڑا بھی ہوتا اور چھوٹا بھی، یہ گولائی میں ہوتا ہے البتہ اس کے مختلف ڈیزائن ہوتے ہیں۔ اس کے سرے پر ایک تار لگی ہوتی ہے جسے بالوں میں پھنسا دیا جاتا ہے۔

مندری: مندری ہندکو میں انگوٹھی کو کہتے ہیں یہ بغیر موتی کے بھی ہوتی ہے اور موتی والی بھی ہوتی ہے اور پتھر بھی لگایا جاتا ہے۔ خواتین اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک دو یا دو سے زیادہ انگوٹھیاں پہنتی ہیں۔

دوپٹہ: ہزارہ کی خواتین میں دوپٹہ کا رواج عام ہے اور دوسرے علاقوں کی طرح یہ خواتین بھی چھوٹی عمر سے لے کر بڑی عمر تک کی خواتین اسلامی شعار کے حوالے سے استعمال کرتی ہیں۔ بچیاں مختلف رنگوں والے دوپٹے استعمال کرتی ہیں جبکہ بوڑھی خواتین عموماً سفید دوپٹہ استعمال کرتی ہیں۔

شلوار قمیض: موجودہ دور کے تقاضوں کے بموجب اب ہزارے کے مرد و

خواتین شلوار قمیض عموماً استعمال کرتے ہیں البتہ دونوں جنس کی سلائی میں اور رنگوں میں فرق ضرور ہوتا ہے۔

کھیل اور لوک کھیل تماشے

ہزارہ کے تمام علاقوں میں بعض ایسے لوک کھیل ہیں جو کہ تمام شہروں اور مضافات میں یکساں مقبول ہیں اور ہزارہ کے علاقوں کی پہچان بن گئے ہیں۔ ان کھیلوں میں مندرجہ ذیل ثقافتی اور روایتی کھیل ایسے بھی ہیں جو کہ صرف اور صرف ہزارہ کی سرزمین سے ہی منسوب ہیں اور ان کے نام ہی سے خیال اس طرف چلا جاتا ہے کہ یہ ہزارہ کا ثقافتی کھیل ہے جو دوسرے کسی علاقے سے منسوب نہیں۔

بتکر: ہزارہ کے صدر مقام ایبٹ آباد کے مضافاتی علاقہ دھمتوڑ میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں خاص قسم کا ایک بڑا وزنی پتھر تیار کیا جاتا ہے یہ بڑے سے بڑے وزن کا پتھر بھی ہے اور کم وزنی بھی یہ پتھر ہر طرف سے چکنا ہوتا ہے اور تقریباً بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔

اس پتھر کو اٹھانے کو بتکر کہا جاتا ہے اور ہزارہ کے شہروں اور مضافات ہر جگہ پر بڑا مقبول اور دلچسپ کھیل ہے۔ شادی بیاہ کے موقع کے علاوہ مختلف میلوں میں اور عرس میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل میں نوجوان لوگ پتھر اٹھانے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کا مخصوص دوسرا نام پڑ ہے یعنی جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو اس وقت اس کو پڑ کہتے ہیں پتھر بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ اس پتھر کا وزن دو من سے لیکر چار من تک ہوتا ہے اس کھیل کیلئے جسمانی طاقت کے علاوہ فنی مہارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ثقافتی کھیل قدیم زمانے سے ہوتا آرہا ہے جو کہ اب تک ہزارہ میں مقبول ہے اس کھیل کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف کی جاتی ہے اور جس اکھاڑے میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اس اکھاڑے کی نسبت بھی حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے۔ جب دو مد مقابل اکھاڑے میں پتھر اٹھانے کیلئے اترتے ہیں تو پتھر اٹھانے سے پہلے یہ مقابلہ کرنیوالے نوجوان یہ پڑھتے ہیں۔

اعوذ باللہ درود میں محمدؐ۔ صلوٰۃ میں علی و دختر محمدؐ
لانو لشکر علی مست میں محمدؐ۔ میدان میں علیؓ
اکھاڑے کی مٹی تن بدن پر ملی حیثیت میں بال موزار
حکمت سے چار قلندری حکمت سے کرو وضو یا اللہ یا
نبیؐ شاہ علیؓ

اس کے بعد مقابلہ شروع ہو جاتا ہے جو مد مقابل پتھر اٹھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کھیل ہر میلے اور ثقافتی مقام پر کھیلا جاتا ہے جبکہ شادی بیاہ کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اس کھیل کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کھیل کا ماہر انعام یافتہ محبوب احمد نامی جوان ہے جو کہ دھمتوڑ ہی کا رہنے والا ہے۔

گتکہ: بتکر کی طرح گتکہ بازی بھی ہزارے کے تمام علاقوں میں بڑا مقبول اور تفریحی کھیل ہے اور اس کھیل کی نسبت بھی حضرت علیؓ کی طرف ہی کی جاتی ہے یہ کھیل بھی شادی بیاہ کے موقع کے علاوہ مختلف ثقافتی میلوں میں کھیلا جاتا ہے۔ تلوار کا دستہ پیتل کا ہوتا ہے اس کھیل کے کھیلنے والے کو گتکہ باز کہتے ہیں۔ دو مد مقابل میدان میں آتے ہیں ایک گتکہ باز تلوار سے حملہ آور ہوتا ہے دوسرا اس گتکہ باز کے وار کو اپنی ڈھال سے روکتا ہے پھر ڈھال والا گتکہ باز تلوار سے حملہ آور ہوتا ہے اور دوسرا گتکہ باز اس کے وار کو روکتا ہے اسی طرح یہ کھیل لگاتار کھیلا جاتا ہے جب ڈھال والا تلوار والے گتکہ باز کی وار کو روکنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو تلوار والا گتکہ باز فاتح ہوتا ہے۔ یہ گتکہ باز ہزارے میں مخصوص لوگ ہیں جن کا زیادہ تر کام ہی اس کھیل کے مشغلے کو زندہ رکھنا ہے۔ ہزارے میں عبدالغنی نامی گتکہ باز نے بہت شہرت حاصل کی اور اکثر گتکہ باز اسی کے شاگرد ہیں۔ کچھ عرصہ قبل عبدالغنی نے وفات پائی ہے اور اب اس کے شاگرد اس کھیل اور ہنر کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

کرمک کریا: یہ ایسا دیہاتی کھیل ہے کہ ہزارہ کے تقریباً تمام بچے کھیلتے تھے۔ جو اس طرح سے کھیلا جاتا تھا۔ ایک لڑکا دوسرے لڑکے کی گود میں سر رکھ کر زمین پر ٹانگیں لمبی کر کے لیٹ جاتا تھا بیٹھا ہوا لڑکا لیٹے ہوئے لڑکے کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا پھر کھیل میں شریک باقی لڑکے ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں پر سے ایک طرف سے دوسری طرف پار ہوتے جاتے۔ بیٹھا ہوا لڑکا آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے لیٹے ہوئے لڑکے سے سوال کرتا تھا کرمکریا کون کریا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بتاؤ تمہاری ٹانگوں پر سے کون پار ہو رہا ہے لیٹا ہوا لڑکا صرف اپنے قیافہ سے پاؤں کی آواز سے معلوم کر کے گزرنے والے لڑکے کا نام لیتا تھا اور جب تک وہ درست نشاندہی نہیں کر پاتا لڑکے اسی طرح اس کی ٹانگوں پر سے گزرتے جب وہ کسی گزرنے والے لڑکے کا نام صحیح بتا دیتا تو اب وہ لڑکا اس کی جگہ پر لیٹ جاتا اور پھر یہ کھیل اسی انداز سے دوبارہ شروع ہوتا۔ اس کھیل کا مقصد بچوں میں حواس کی پختگی اور دوسرے کی رفتار کا درست اندازہ لگانا ہوتا تھا یہ بچوں کا کھیل اب ناپید ہے۔

لنڈو کے: یہ کھیل اس طرح سے کھیلا جاتا تھا کہ دو پارٹیاں آمنے سامنے ہوتی تھیں دائیں ٹانگ کو اٹھا کر اس ٹانگ کے پاؤں کو دوسری ٹانگ سے پیچھے لیجا کر بائیں ہاتھ سے اس کے انگوٹھا کو پکڑ لیتے تھے اور ایک ٹانگ پر چھلانگ لگا کر دوڑتے تھے اور بالمقابل کو کھلے ہاتھ کی ہتھیلی سے دھکے دے کر گرانے کی کوشش کی جاتی اس کھیل سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ بدن کا توازن کس طرح سے قائم رکھا جا سکتا ہے بچوں کے اس روزمرہ کے ثقافتی کھیل کو لنڈو کے کہا جاتا تھا۔ یہ کھیل اب تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

چھین چھوت: یہ کھیل اس طرح سے ہے کہ اس میں سب بچے چھپ جاتے تھے اور ایک بچہ ان کو تلاش کرتا تھا جس کسی کو تلاش کر کے ہاتھ لگا دیا جاتا تو یہ چھوت ہو جاتا پھر وہ بچہ دوسروں کو تلاش کرتا اور اس طرح یہ کھیل دیر تک جاری رہتا تھا۔

آڑیا آڑیا: یہ کھیل بھی تقریباً متروک ہے۔ تاہم اس کے اصول باقی ہیں اور ممکن ہے کہ کسی دیہات میں بچے اس کھیل کو کھیلا کرتے ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی دلچسپ کھیل ہے یہ ایک ایسا کھیل ہے کہ بچے دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے اور ایک دوسرے سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر دیواروں کی اوٹ میں اپنا پرانمبر وار جماتے تھے جب دونوں پر سے نمبر دار کھڑے ہو جاتے تو ان کے لیڈر اپنی کمانڈ بدل لیتے مثلاً دو پارٹیاں الف اور ب کی ہیں الف دوسری طرف سے جا کر ب پارٹی کی نگرانی کرتا اور ب جا کر الف پارٹی کی نگرانی کرتا الف والا اسی طرف سے اپنی پارٹی کے فرد سے جو نمبر اول کھڑا ہوتا اسے آواز دیکر پوچھتا آڑیا آڑیا آڑے دا نام کیا یعنی اے ساتھی ادھر کے ساتھی کا جو تمہارے نمبر ایک پر کھڑا ہے کیا نام وہ نام اگر درست بتا دیتا تو الف اپنی پارٹی کو آواز دیتا کہ آؤ سوار ہو جاؤ یہ سب دوسری طرف دوڑ کر جاتے اور بالمقابل والے گروہ کی پیٹھوں پر سوار ہو جاتے پھر وہ سب واپس آ کر اپنی جگہ پر آ کر کھڑے ہو جاتے اور پھر کھیل اسی طرح شروع ہو جاتا جب کبھی آواز پر درست نام بتایا جاتا تو نام بتلانے والے کو اپنا لیڈر آواز دیتا کہ تمہارا ساتھی جس کا تم نے نام لیا ہے وہ اول نمبر پر نہیں بلکہ تیسرے نمبر پر یا دوسرے پر ہے لہذا تم بھی دو سے یا تین سے پیچھے ہو جاؤ ہر ایک لیڈر باری باری یہی آواز دیتا غلط ہونے پر آواز والا بھی اسی نمبر پر چلا جاتا جس پر بتلایا ہوا آدمی ہوتا یہ کھیل بہت دیر تک اسی طریقے سے جاری رہتا تھا۔ یہ کھیل اس مقصد کیلئے بچوں میں کھیلا جاتا تھا کہ اس کھیل کے ذریعے بچے اپنی دفاعی تربیت کریں اور حساب کتاب کے قواعد کو بہتر طرح سے سمجھ سکیں۔

انا مناوے کوکلے: یہ بچوں اور لڑکوں کا ایسا مقبول اور دلچسپ کھیل ہے کہ اس کھیل کے ذریعے بچے سراغ رسانی کے عمل کو سیکھتے تھے اب بھی دیہاتوں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل اس ترکیب کے ساتھ کھیلا جاتا ہے کہ تقریباً ایک یا ڈیڑھ کنال کے رقبے پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اس کھیل میں کھلاڑیوں کی دو پارٹیاں ہوتی ہیں ایک دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے اس دائرے کی مخصوص حدود میں پہلے ایک ٹیم کے کھلاڑی منتشر ہو کر پتھروں کے نیچے مخصوص علامت کے ساتھ تحریر لکھتے ہیں اور دوسری ٹیم اس تحریر کو ڈھونڈتی ہے جس پتھر کے نیچے یہ تحریر ہوتی ہے وہ یہ پتھر ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور ایک جگہ پر اکٹھے کر دیتے ہیں۔ پھر دوسری ٹیم کے کھلاڑی اپنی مخصوص علامت کے ساتھ پتھروں کے نیچے پہلی ٹیم سے خفیہ تحریر لکھتے ہیں اور پہلی ٹیم کے لوگ جا کر اس تحریر کو ڈھونڈتے ہیں اور پتھر اکٹھے کر کے لاتے ہیں پھر دوسری ٹیم یہ عمل کرتی ہے اسی طرح یکے بعد دیگرے یہی کھیل باری باری کھیلا جاتا ہے جو کہ کافی وقت طلب ہوتا ہے آخر میں ہر ٹیم کے لائے ہوئے تحریر کردہ پتھر گنے جاتے ہیں جس ٹیم نے مخالف ٹیم کے زیادہ تحریر کردہ پتھر جمع کئے ہوں وہ ٹیم فاتح ہوتی ہے اسے انا منادے کو کلے کہتے ہیں۔

اللہ کو لوزاری کرنے یاں: ہزارہ کے علاقوں میں جب گرمی شدید پڑتی تھی تو بچے اکٹھے ہو جاتے اور پاؤں سے ننگے ہو کر ایک جلوس کی شکل میں سڑکوں پر پھرتے ہیں اور یہ الفاظ بولتے ہیں:

اللہ زاری زار اللہ ھو۔ لڑگئے میرے پیرا اللہ ھو
گھڑ اپانڑیں دا۔ ہٹی ہٹی سوترے دی
یا خدا مینہ وسا

بچے لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتے اور یہ الفاظ کہتے لوگ انہیں آٹا دیتے اور پیسے دیتے یہ آٹا غریب لوگوں کو دینے اور پیسوں سے مسجد میں جا کر حلوہ وغیرہ پکاتے اور پھر اللہ سے بارش کیلئے دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بچوں کی دعاؤں سے بارش برسا دیتا۔

اخروٹ اور چرخی: یہ ایسا کھیل تھا جو متوسط عمر کے لوگ اور جوان کھیلتے تھے یہ کھیل اخروٹ اور چرخی کا ہوتا تھا جس کا طریقہ یہ ہے کہ گاؤں کے حجرے کے صحن میں ایک معمولی سا گڑھا کھودلیا جاتا تھا اس میں چار پانچ سو کی تعداد میں اخروٹ ڈال دیئے جاتے پھر اس کے گرد چار پانچ کھیلنے والوں کا چھ فٹ نصف قطر کا بنا دیا جاتا تھا پھر یہ کھیل کھیلنے والے اس دائرہ کی لکیر پر کھڑے ہو کر چاروں طرف سے ایک لکڑی کی چرخی تقریباً

بارہ انچ قطر اور ایک انچ موٹی سے مار کر ان اخروٹوں کو گڑھے سے باہر نکالتے تھے یہ کھیل اس وقت تک جاری رہتا جب تک سب اخروٹ گڑھے سے باہر نہ نکال لئے جاتے۔

تتی: یہ کھیل ہزارہ کے سب علاقوں میں بہت مقبول ہے۔ اس کھیل کا مقصد طاقت اور جوانمردی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ کھیل کھیلنے کے لئے تمام کھلاڑی صرف ایک مختصر سا لنگوٹہ باندھ کر باقی کپڑے اتار لیتے ہیں یہ کھیل کھیلنے والے بڑے شوقین مزاج ہوتے ہیں اس لئے بعض تو لنگوٹے پر ریشم کا کام کرواتے ہیں اور بعض لنگوٹے کے ساتھ گھنگرو بھی باندھ لیتے ہیں کھیل کے میدان میں دو پارٹیاں بن جاتی ہیں ایک پارٹی ایک ایک کھلاڑی کو میدان میں بھیجتی ہے دوسری مدمقابل پارٹی دو آدمی اس کو پکڑنے کیلئے میدان میں بھیجتی ہے پہلا کھلاڑی دوڑ کر میدان کے درمیان چلا جاتا ہے اس کو پکڑنے والے اس کے پیچھے دوڑتے ہیں کھیل میں تیز دوڑنا اور پکڑنے والوں کو تھپڑ مارنا ہوتا ہے اگر آگے بھاگنے والا ان دو میں سے کسی ایک کو تھپڑ لگا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ فاتح ہوتا ہے اس کھیل میں دوسری پارٹی کے دو اشخاص جو کہ پکڑنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ یکجا ہو کر بھاگنے والے کو پکڑ لیں اور بھاگنے والے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان دونوں کو جدا کر کے ایک کو تھپڑ مار کر بھاگ جائے۔ جب بھاگنے والا تھپڑ مارنے کی کوشش کرتا ہے تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی کلائی کو قابو کر کے اپنی چھاتی پر ہو اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے باندھ لیتے ہیں یا پھر دور سے ایسی جھلانگ لگاتے ہیں کہ اپنی دونوں ٹانگوں سے بھاگنے والے کی ایک ٹانگ جکڑ لیتے ہیں اس داؤ سے بھاگنے والا بے توازن ہو کر گر جاتا ہے اس داؤ کو یہ اپنی زبان میں قینچی مارنا کہتے ہیں۔

لڑکیوں کے کھیل

پینگ: پینگ کا رواج عموماً ہر جگہ ہے اور لڑکیاں فارغ اوقات میں پینگ جھولا کرتی تھیں مگر مانسہرہ میں اس کا رواج عام تھا۔ عید یا کسی اور خوشی کے تہوار پر لڑکیاں کسی ایک بڑے سے گھر میں یا باہر قبرستان میں درخت میں جھولا لٹکا کر پینگ جھولا کرتی تھیں۔ پینگ پر دو دو لڑکیاں یا ایک لڑکی کھڑی ہو کر زور زور سے جھولا جھولتی ہیں اور ایک دوسرے سے جھولا زیادہ اونچا لے جانے پر مقابلہ کرتی تھیں جس کا جھولا زیادہ اونچا ہوتا تھا وہ جیت جاتی تھی۔

گڈا گڈی: ہزارہ کے دیہاتوں اور شہروں میں لڑکیاں جب بچپنے کی عمر میں ہوتی ہیں تو وہ گڈا گڈی کی شادی کا کھیل کھیلتی ہیں۔ اس کھیل میں بچیاں شروع ہی سے اپنی معاشرتی زندگی کے طور طریقے اور گھر بسانے کا تہذیبی ماحول حاصل کرتی ہیں۔ یہ کھیل اس طرح سے ہوتا تھا کہ ایک لڑکی کا گڈا ہوتا تھا اور دوسری لڑکی کی گڈی یہ گڈا گڈی کے عموماً گھر بڑی بوڑھیاں کپڑے سے بناتی تھیں۔ گڈے والی بچی گڈے کی بنج لے کر اپنی دوسری سہیلی یعنی گڈی والی بچی کے گھر آتی ہے اس موقع پر اس کی سہلیاں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہیں اور پھر گڈے والے گھر پر بھی گڈی والی بچی کی سہیلیاں ان کا استقبال کرتی تھیں گڈی کو مختلف ریشمی کپڑوں سے سجا کر اسے دلہن بنایا جایا ہے۔

لوک علاج، دم درود

کمر کا درد: کمر میں درد ہو تو اس کیلئے رتن جو اور جوینڑ کے چھلکے کا سفوف بنا لیا جاتا ہے اور پھر حلوہ بنا کر اس کے ساتھ یہ سفوف کھلا دیتے ہیں مگر ہڈی ٹوٹنے پر اس سفوف کو تیل میں ملا کر ہڈی پر لگایا جاتا ہے۔

معدے کی بیماری: معدے کی ہر قسم کی بیماری کیلئے کچی سونڈ کو سفوف بنا کر ٹھنڈے پانی کے ساتھ دیا جاتا ہے معدے کی بیماری ختم ہو جاتی۔

بچوں کا قبض: بچوں کو قبض ہو جائے تو اس کیلئے املتاس کے اندر سے گودا نکال کر اسے دودھ میں ملا دیا جاتا ہے اور پھر جالی میں اسے صاف کر کے یہ دودھ دیا جاتا ہے۔ بچوں کے پیٹ کا درد اور قبض ختم ہو جاتا ہے۔

کھانسی کا علاج: کھانسی طویل ہو جائے تو سونڈ کی گڈی کو تیل میں ڈال کر یہ تیل آگ پر اچھی طرح گرم کیا جاتا ہے جس سے سونڈ کی گڈی خوب جل جاتی ہے پھر اسے پیس لیا کر یہ سفوف پانی کے ساتھ ملا لیا جاتا ہے اس کے متواتر استعمال سے کھانسی رک جاتی ہے یہ سینہ کیلئے بھی یہ مفید ہے۔

سینے کا علاج: جب کسی بچے یا بوڑھے شخص کا سینہ کمزور ہو۔ اور اس میں درد ہو تو دالچینی منہ میں رکھ کر اسے چوستے ہیں اس سے گلہ اور سینہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

دانوں پھنسی کا علاج: جب کسی کے بدن پر دانے اور پھنسی ہوں تو سرتی بوٹی کے کاسنی پتوں کو کوٹ کر ان کا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے اور پھر ان پتوں کا پانی پلا دیا جاتا ہے جس سے خون صاف ہو جاتا ہے اور دانے پھنسی ختم ہو جاتے ہیں۔

زکام کا علاج: اگر زکام دراز ہو جائے تو بنفشہ کے پھول کو ابال کر اس کے پانی میں میٹھا ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس پانی کو متواتر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے

زکام ٹھیک ہو جاتا ہے جبکہ ان اُبلے ہوئے بنفشہ کے پھولوں کے پھوک کو توے پر تل کر اسے گلے پر باندھ دیا جاتا ہے جس سے گلے کی رگوں میں توانائی آجاتی ہے اور گلہ بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

دانت کا درد: جب دانت میں درد ہو جس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں چنانچہ دانتوں اور مسوڑھوں کے ورم کیلئے سرسوں کے تیل میں نمک ملا کر دانتوں پر مل دیا جاتا ہے جس سے دانتوں اور مسوڑھوں کا مفسد مواد پانی کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے پھر گوند کے پتوں کو ابال کر اس کے پانی سے کلی کی جاتی ہے جبکہ بعد میں تمر کے درخت کی مسواک کو معمول بنا دیا جاتا ہے اس عمل سے دانتوں کا درد اور مسوڑھوں کا ورم ٹھیک ہو جاتا ہے اور دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔

اندر کے زخم کا علاج: جب کوئی شخص گر جائے اور بدن کے اندر کے حصے میں کہیں بھی زخم پیدا ہو جائے تو اس کیلئے کہ سملو کی جڑ کا چھلکا اتار کر اسے دھو لیا جاتا ہے پھر اسے دھوپ میں رکھ سوکھا لیا جاتا ہے جب اچھی طرح سوکھ جائے تو پیس کر اس کی پھکی بنا کر دیسی گھی کے ساتھ اس پھکی کو استعمال کرتے ہیں۔ اسے تین دن تک متواتر استعمال کروایا جاتا ہے اور ساتھ کھانے میں دیسی گھی کی روٹی دی جاتی ہے اس دوران کم از کم ایک گھنٹہ تک پانی نہیں پیا جاتا اس سے ہر قسم کا زخم درست ہو جاتا ہے۔

بچوں کے امراض: چھوٹے بچے بیمار پڑ جائیں اور علاج کے باوجود تندرست نہ ہوں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس پر کسی کا سایہ ہو گیا ہے ایسی صورت میں دیہاتوں میں قائم مزارات پر بچوں کو لے جایا جاتا ہے یا پھر پیر فقیر کے پاس دم درود اور تعویز کیلئے اس کے پاس لے جایا جاتا ہے وہ لوگ جو کہ دم درود کرتے ہیں۔ وہ تعویزات کر کے بچوں کیلئے دیتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ اس تعویز کو تکیے کے نیچے رکھ دیں یا بازو پر باندھ دیں یا پانی میں بھگو کر اس کا پانی پلوا دیں۔ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اس طرح بچہ تندرست ہو جاتا ہے۔

زیارات پر علاج: ہزارہ کے شہروں اور مضافات میں جڑی بوٹیوں کے علاوہ لوگ مزارات پر بھی جاتی ہیں اور مختلف بیماریوں کے علاج کیلئے وہاں مختلف طریقے جو کہ صدیوں سے رائج ہیں۔ لوگوں کا بعض بیماریوں سے متعلق پختہ عقیدہ ہوتا ہے اور مزارات پر جا کر دعاء کرتے ہیں نذریں مانتے ہیں چڑھاوے دیتے ہیں۔

آنکھوں کے مریضوں کا علاج: ہری پور سے چھ میل کے فاصلے پر نزد کھلابٹ شاہ شیر محمد غازی کا مزار ہے یہاں پر وہ لوگ جن کی آنکھیں شدید دکھتی ہیں اور علاج کے باوجود ٹھیک نہیں ہوتیں تو جمعرات کے روز اس زیارت پر جاتے ہیں اور زیارت کی پھلاہیوں کے پتوں کا رس آنکھوں میں ڈالتے ہیں تو اللہ کے حکم سے شفاء ہو جاتی ہے۔ لوگوں کا اس معاملے میں پختہ عقیدہ ہے۔

متعدد امراض کیلئے: شیروان اور ہری پور کے درمیان ایک مزار میاں سلطان غازی کا ہے اس مقام کا نام کہنیاں مستھانہ ہے۔ برلب سڑک مزار ہے متعدد امراض کے لوگ یہاں آتے ہیں اور یہاں پر ایک ٹھنڈے پانی کے چشمے پر نہاتے ہیں اور امراض سے شفاء پاتے ہیں۔

سر دردی کا علاج: زیارت موضع جیو پنڈیہ ایک ایسے فقیر کی زیارت ہے جو کہ اسلامی عہد کے آغاز میں یہاں آ کر مقیم ہوا اور پھر وصال کے بعد یہاں پر ہی دفن کیا گیا۔ ہر جمعرات کو سر درد کے مرض والے لوگ یہاں آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ انہیں شفاء دے دیتا ہے۔

بخار کا علاج: مانسہرہ ضلع میں شنکیاری روڈ پر گلی باغ گاؤں میں راجہ دیوان بابا کا مزار ہے۔ مستجاب الدعاء بزرگ تھے ان کی دعا ہی سے ترکوں کی حکومت زوال پذیر ہوئی اس زیارت کے پاس ایک چشمہ ہے جہاں دور دراز سے بخار کے مریض آتے ہیں۔

کوڑہ کے مرض کا علاج: ضلع مانسہرہ تحصیل بالاکوٹ میں برلب دریائے کنہار حیات المیر کا مقبرہ ہے۔ ان کی زیارت کے ساتھ ایک چشمہ ہے۔ اس چشمہ کو لوگ شربت کہتے ہیں۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کوڑہ کے مریض اس چشمہ سے پانی پی کر صحت یاب ہو جاتے۔ اس لئے ملک کے کونے کونے سے کوڑھ کے مریضوں کا یہاں رش ہوتا ہے۔ حکومت نے اب یہاں پر کوڑھ کے مریضوں کیلئے ایک بڑا ہسپتال قائم کر دیا ہے۔

آسیب زدہ کا علاج: زیارت نکوٹ، علاقہ پکھل، یہاں پر سید علی ہمدان کا روضہ ہے۔ یہاں ہر مہینے چاند کے پہلے چودہ دنوں میں خواتین آتی ہیں اور اپنے بچھاویں (آسیب زدہ) بچوں کو لاتی ہیں اور یہاں پر ایک صدیوں سے قائم درخت کے نیچے سے گزارتی ہیں، اس طرح ان کا خیال ہے کہ بچے شفا پاتے ہیں۔

پیٹ کا درد: توتنی کی زیارت جسے غازی کوٹ کی زیارت بھی کہا جاتا ہے ایبٹ آباد کو جانے والی سڑک پر واقع ہے ہر جمعرات کو پیٹ کے درد والے آتے ہیں۔

کوہاٹ

جغرافیہ

صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کا پہلا خطہ کوہاٹ ہے۔ ہندکو اور پشتو کے لسانی امتزاج کے اس خطہ کے مشرق میں دریائے سندھ مغرب کی جانب کرم ایجنسی شمال اور شمال مغرب کی جانب خیبر اور اورکزئی ایجنسی اور جنوب مشرق کی جانب کرک اور میانوالی کے علاقے ہیں۔ ضلع کوہاٹ کوہ جواکی کی وجہ سے پشاور سے جدا ہوتا ہے جس میں سے ایک چھوٹی سی پٹی درہ آدم خیل کے نام سے گزرتی ہے اور جسے عرف عام میں درہ کوہاٹ بھی کہتے ہیں۔ اس درہ کے شمال میں سفید تھانہ تک شمال کی جانب کوہاٹ کی حدود ہیں۔

کوہاٹ انتظامی لحاظ سے تین اضلاع کوہاٹ، کرک اور ہنگو اضلاع کا مجموعہ ہے۔ کوہاٹ کے اطراف میں اورکزئی قبائلی بھی آباد ہیں جبکہ ضلع ہنگو بنگشوں کا علاقہ ہے اور ضلع کرک خٹک قبیلے کا مسکن ہے۔

کوہاٹ کا کل رقبہ تقریباً اس نوعیت کا ہے کہ اس کے مشرق میں خوشحال گڑھ سے لے کر مغرب میں ٹل تک کا علاقہ، شمال میں سفید تھانہ تک کا اور جنوب میں شکر درہ تک کڑپہ اس کی آخری حد ہے۔ شکر درہ میں ساغری خٹک اور گنبت خوشحال گڑھ میں سینی خٹک آباد ہیں۔ کوہاٹ شہر کے شمال کی طرف جنگل خیل مشہور گاؤں ہے جس کی حدود شمال کی طرف کوتل پہاڑ کے نیچے سے شروع ہو کر بیرون کوہاٹ شہر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ چکر کوٹ سے ریلوے لائن نکلتی ہے اور چکر کوٹ سے پھر کوہاٹ چھاؤنی کا علاقہ ہے۔ کوہاٹ شہر کے محلہ میانخیل میں بزرگان سلف میں مشہور بزرگ حضرت حاجی بہادر بابا کا مشہور مقبرہ ہے۔

کوہاٹ کے قدیم دروازے: کوہاٹ شہر کی آبادی ایک مستطیل قسم کے بازار میں ہے جہاں مختلف محلے اور کوچے بنے ہوئے ہیں۔ شہر مشرق کی طرف سے کھلتا ہے جہاں کچھ کچھ فاصلے پر قدیم دروازے ہیں یہ دروازہ فیصل شہر میں بنے ہوئے ہیں۔ ان قدیم دروازوں میں تحصیل دروازہ، کنگ دروازہ اس کا نیا نام شاہ فیصل دروازہ رکھا گیا ہے جنگل خیل دروازہ یہ دروازہ بڑے بازار کے وسط میں ہے اور شہزادگان دروازہ چرسی دروازہ۔

بازار: کوہاٹ شہر کے معروف بازاروں میں سے بڑا بازار تحصیل دروازہ سے شروع ہو کر مشرق کی طرف شاہ فیصل دروازہ چھاؤنی پر ختم ہوتا ہے اس سے متصل چھوٹے بازار میاں خیل بازار، چرسی بازار، تیراہ بازار، بنوں بازار، صرافہ بازار اور بازا زرگراں۔ بعض بازار مارکیٹوں کے نام سے معروف ہیں سیف اللہ مارکیٹ، بانو مارکیٹ اور انارکلی مارکیٹ ہیں۔

مشہور اقوام: کوہاٹ کی قدیم اور مشہور قوموں میں خٹک اور بنگش قابل قابل ذکر ہیں کوہاٹ میں جو خٹک آباد ہیں یہ سنی خٹک کے نام سے متعارف ہیں جو تقریباً سات سو سال قبل کوہ سلیمان میں شوال سے کوچ کر کے پہلے بنوں اور پھر بنوں سے شمال کی طرف مہاجرت اختیار کر کے کوہاٹ کے خطے میں داخل ہوئے جبکہ کچھ ٹیری کے علاقہ میں ہی ٹھہر گئے۔ کوہاٹ میں وارد ہونے والے خٹک سنی خٹک کے نام سے مشہور ہوئے۔ کوہاٹ میں وارد ہونے والا دوسرا بڑا قبیلہ بنگشوں کا ہے یہ بھی خٹک قبیلہ کا ہمعصر قبیلہ ہے جو کہ افغانستان کے علاقہ گردیز اور پھر وہاں سے کرم ایجنسی میں آباد ہوا اور پھر کرم سے نیچے آ کر کوہاٹ اور مضافات کی طرف رخ کیا اب ان کا قدیم مسکن کوہاٹ ریجن کا ضلع ہنگو ہے جو کہ ٹل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دو بڑے قبیلوں کے علاوہ کوہاٹ شہر سے منسوب جو دوسرے خاندان ہیں ان میں گیلانی، سید، بنوری سید، میانخیل، جو اپنے آپ کو حاجی بہادر بابا کی اولاد کہتے ہیں بخاری سید، پراچہ اور کیانی آباد ہیں ان کی زبان پشاور کی ہندکو سے قدرے مختلف ہے۔

لہجہ ہندکو ہے جو کہ علاقے سے نسبت رکھتے ہوئے کوہاٹی ہندکو کہلاتی ہے۔ شہری آبادی میں رہنے والے یہ سب خاندان ہندکو کے علاوہ اپنے کوہ باشی اقوام و قبائل سے تعلق رکھنے کی بناء پر پشتو بھی بولتے ہیں ان پشتو بولنے والوں میں زیادہ تر بنوری سادات ہیں جن کی شہری ہندکو بھی بڑی واضح ہے اور پشتو بھی بڑی روانی کے ساتھ بولتے ہیں جبکہ مضافات کے کوہ باشی لوگوں کی زبان پشتو ہے۔ ان کے علاوہ کوہاٹ کی جن قدیم ترین اقوام کی شناخت کی گئی ہے ان میں بہزادی اور ملک میری ہیں۔ کچھ شنواری بھی آباد ہیں جو کوہاٹ کے گاؤں جنگل خیل میں آباد چلے آ رہے ہیں۔ بنگشوں کا علاقہ نصر خیل سے آگے چکر کوٹ سے شروع ہو کر ہنگو تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زیادہ تر شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور پشتو بولتے ہیں۔ بنگش کا نواب خاندان کوہاٹ شہر میں رہتا ہے جہاں اور بھی بہت نامی گرامی بنگش آباد ہیں۔ ساتھ ہی جنگل خیل میں بھی بنگش کافی تعداد میں آباد ہیں۔ مغرب میں شیخان توغ سرائے بنگش ہیں۔

بنوری جو کہ سید آدم بنوری کی اولاد ہیں ہندوستان کے قصبہ بانور سے ہجرت کر کے یہاں آئے اور اپنے نام سے بستی بنا کر گڑھی بنوریاں میں رہنے لگے۔ یہ کوہاٹ سے مغرب کی طرف ہنگو روڈ پر ہے اس کے علاوہ بنوں روڈ سے پہلے میری بانڈہ، سلطان بانڈہ، پسی یہ بڑے گاؤں ہیں اور مغرب کی طرف میر دزئی پل کے ساتھ بانی زئی اور پل سے پار جرمہ بڑا گاؤں ہے۔ یہاں بھی بنوری سادات کے گھرانے آباد ہیں یہ گھرانے پہاڑی کے عقب میں آباد ہیں اس کا رقبہ زیادہ ہے تاہم ان کی زمینیں بارانی ہیں اور سال میں ایک فصل ہوتی ہے۔ کوہاٹ شہر کے شمال میں گیلانی سادات آباد ہیں یہاں بعض بخاری سادات بھی رہتے ہیں میاں خیل کوہاٹ شہر کے اندر محلہ میانخیل میں آباد ہیں جو اپنے آپ کو حاجی بہادر صاحب کی اولاد کہتے ہیں مگر بنوری سادات ان کو سادات کے زمرہ میں شمار نہیں کرتے۔ کوہاٹ کے جنوب مغرب میں واقع شاہ پور میں کیانی آباد ہیں۔

پیداوار: کوہاٹ کی پیداوار میں سفید گنا، گڑ والا گنا، گندم، مکئی، چنا مزری، گھاس، سرسوں، تارامیرا، امرود، لوکاٹ، آلوچہ، آڑو، گرگرے، اخروٹ، سیب اور انگور اہم پیداوار ہیں۔ یہاں کوہاٹ شہر کے جنوب میں باغات بکثرت ہیں اور صوبہ بھر میں یہاں کے امرود خاص شہرت رکھتے ہیں۔ کوہاٹ مجموعی طور پر ایک سنگلاخ سطح مرتفع کا خطہ ہے جو پہاڑیوں کے پست سلسلہ میں بٹا ہوا ہے اس میں بعض مقامات پر زرخیز وادیاں بھی ہیں مگر اکثر پہاڑی علاقے بنجر ہیں۔ زراعت کا دارومدار بارش پر ہے۔ اس کے جنوبی اور مشرقی حصہ میں کوہ نمک جڑا ہوا ہے اب یہ کوہاٹ کے ضلع کرک کا قدرتی پیداوار کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جو کہ بہادر خیل گاؤں میں ہے۔ اس کے علاوہ علاقہ خٹک کے سب پہاڑ نمک کے ہیں۔ فی الحال جٹہ اسماعیل خیل بہادر خیل اور کرک کی کانوں سے نمک نکالا جاتا ہے۔

کرک: کرک کوہاٹ کے جنوب مشرق کی جانب ستر کلومیٹر کے فاصلے پر خٹک قبیلے کا علاقہ ہے۔ اس کے دو سب ڈویژن ہیں تحصیل بانڈہ داؤد شاہ جو کرک کے شمال مغرب کی طرف ہے۔ دوسرا مقام کرک کے جنوب مغرب کی طرف تحصیل تخت نصرت ہے۔ کرک کا قدیمی اور مقامی خٹک قبیلہ بار کی خٹک کے نام سے معروف ہے۔ کرک میں نمک کے پہاڑ یہاں کی قدرتی پیداوار ہے۔ کرک کا قدیم نام سوترہ ہے اور اب بھی اہل قلم سوترہ لکھتے ہیں۔ یہاں کے زیبی گاؤں میں ایک ڈیم بھی بنایا گیا ہے۔ کرک کے باشندوں کی زبان پشتو ہے۔ لوگ علاقے کی تہذیب اور روایات کو سنبھالے ہوئے ہیں اور زیادہ تر پڑھے لکھے ہیں۔ خٹک قوم کی تہذیب شناسی، تمدن آگاہی اور علم و ہنر کیلئے سخت کوشی ان کے وہ اوصاف ہیں جو انہیں دیگر پشتون قبائل سے ممتاز کرتی ہیں۔ خٹک قوم کی زمینیں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ اٹک سے لے کر کوئی پندرہ میل تک شمال کی طرف کالاباغ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کرک کے گرگری کے مقام پر تیل کا کنواں کھودا گیا ہے دوسرا تیل کا کنواں مکوڑی میں نکلا ہے اور ساتھ ہی گیس بھی۔ شکر درہ اگرچہ ضلع کوہاٹ کے ساتھ ہے مگر قبیلہ خٹک کا علاقہ ہے یہاں پر بھی تیل اور گیس کے ذخائر ہیں اس کے علاوہ کوئلہ جپسم اور لوہا وافر ہے۔ کرک کی خاص پیداوار میں گندم، چنا، باجرہ، مکئی جبکہ مشہور سبزیوں میں پالک، مولی، گاجر، مرچ شلغم اور گھوبی شامل ہیں۔

آب و ہوا: کرک کی آب و ہوا نہایت خوشگوار اور صحت افزاء ہے یہاں پر پانی بکثرت ہے۔ یہ سطح سمندر سے ساڑھے تین ہزار فٹ بلندی پر واقع صحت افزا اور زرخیز مقام ہے۔

یہاں پر جنگلی حیات میں نایاب پرندے پائے جاتے ہیں جن میں تیتر، بٹیر، خرگوش چکور، سسی اور ہرن شامل ہیں۔

کرک کا مشہور رقص: خٹک ناچ کرک کے علاقے میں ثقافتی سطح پر وہاں کی سب سے مقدم پہچان ہے۔ اس کی مقبولیت نہ صرف صوبے کی سطح پر ہے بلکہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بھی ہے۔ خٹک ڈانس اب تمام پٹھانوں کی مشترکہ علامت کے طور پر مشہور ہو گیا ہے جو کہ خوشیوں کے مواقع کے علاوہ اجتماعی تہواروں اور جشن کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

وادی سوترہ: کرک کا قدیم اور تاریخی نام وادی سوترہ ہے یہ سطح سمندر سے ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اس کے تین اطراف میں پہاڑ ہیں۔ کرک کا ایک مشہور گاؤں غنڈی ہے۔ خٹکوں کا بنوں سے خروج کے بعد پہلا پڑاؤ اسی مقام پر ہوا۔ سوترہ وادی سولہ میل لمبی اور سات میل چوڑی ہے۔ معتدل آب ہوا ہے۔ یہاں پر لہری۔ گھاس اور پانی وافر ہے۔

درہ کوہاٹ: کوہاٹ کے شمال میں کوتل پہاڑی راستے سے قبل پشاور کی اختتامی حدود میں واقع درہ کوہاٹ جسے آفریدی قبیلے کی معروف شاخ آدم خیل کا مسکن ہونے کی مناسبت سے درہ آدم خیل کہا جاتا ہے یہ کوہاٹ کے دروں میں اہم اور غیر معمولی شہرت کا حامل ہے۔ یہاں پر آفریدی قبیلہ کے لوگ اپنی جداگانہ رسوم اور ثقافت کے ساتھ آباد ہیں۔ یہ آزاد درہ ہے جسے ایف آر کوہاٹ بھی کہا جاتا ہے۔

چمڑے سے بنی روایتی چارپائی، ہیئو دوکو ہستان

کالے ریچھ کی کھال کا پوستو (یہ تلائی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے)

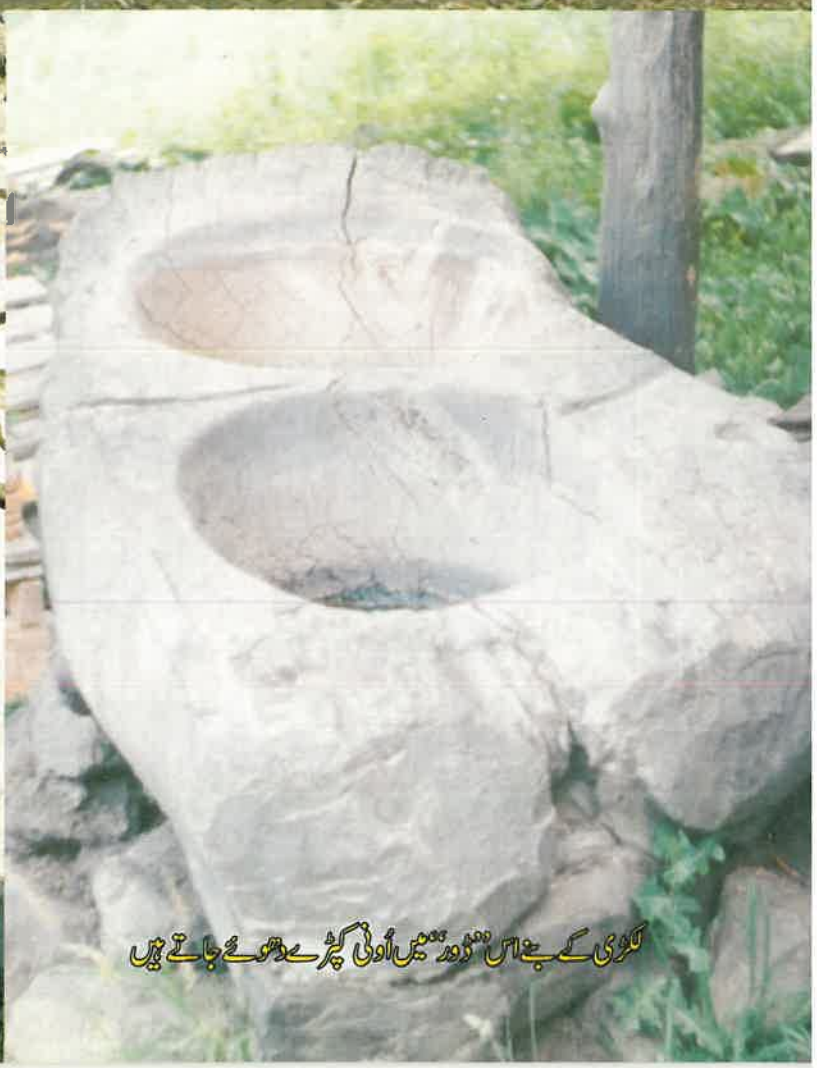

لکڑی کے بنے اس "ڈور" میں اُونی کپڑے دھوئے جاتے ہیں

شریال وادی کا ایک قلعہ اور اس کا بالائی حصہ جسے کٹاپور کہا جاتا ہے

دشکھی سیر، بستی، کوہستان

Razwal

تھنگ گاؤں، ہرمن کوہستان

Razwal

شریال وادی کی ایک بستی

کوہستان، ایک اور مکان کا اندرونی منظر

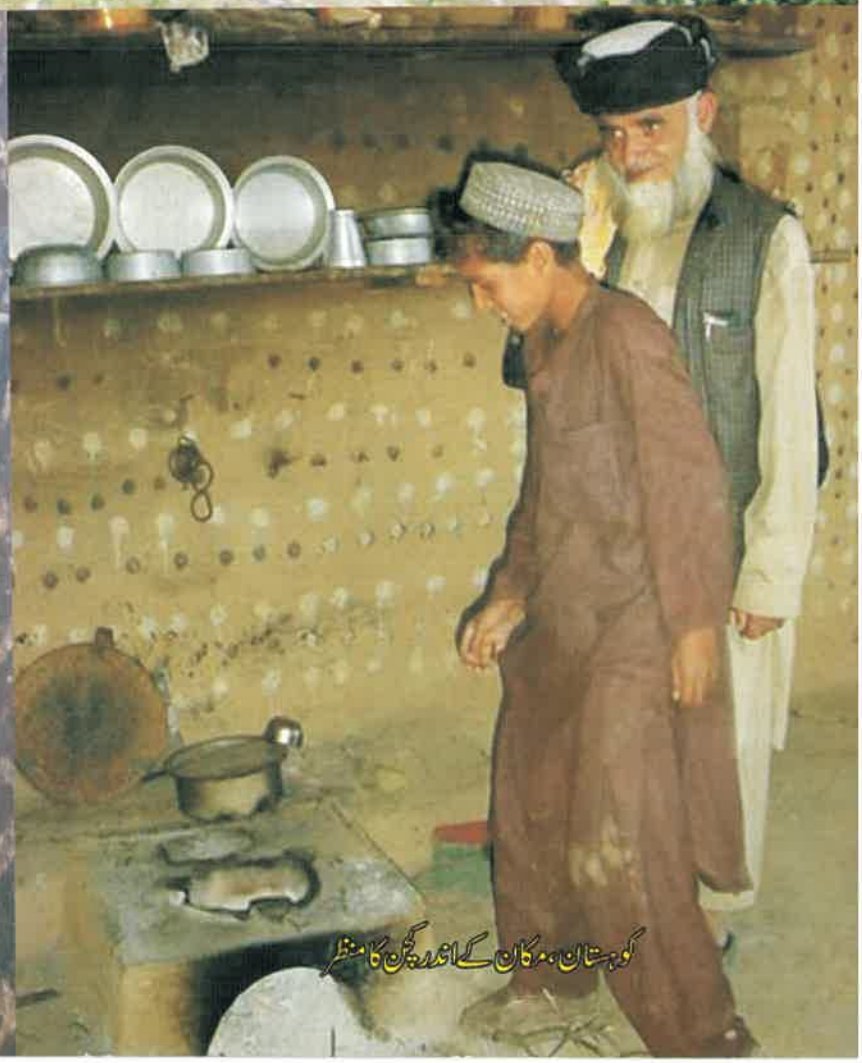

کوہستان، مکان کے اندر کچن کا منظر

گن اور کشاپ، کوہاٹ

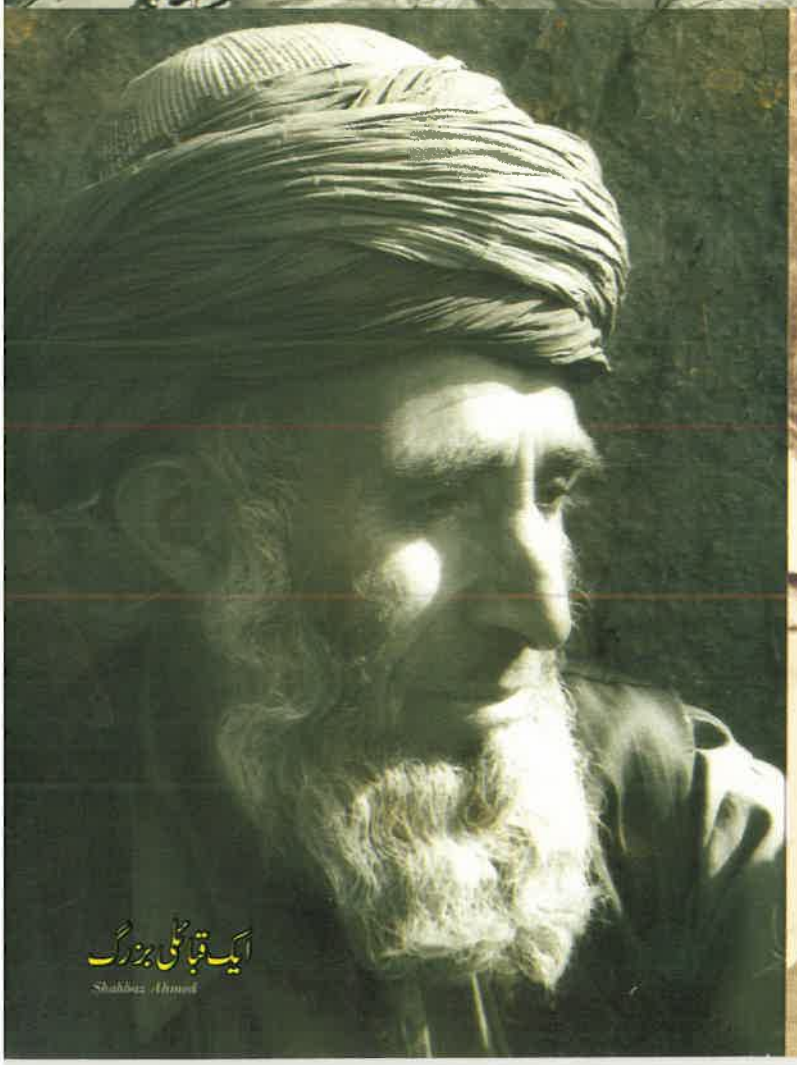

ایک قبائلی بزرگ

Shahbaz Ahmed

کاغان کا ایک گجر اپنے بچوں کے ساتھ

Bobby Jos

ایک بندوق کا کندہ جسے روایتی انداز میں سجایا گیا ہے

Razwal

شکار کے لئے استعمال ہونے والی لوہے کی کراس بو

Razwal

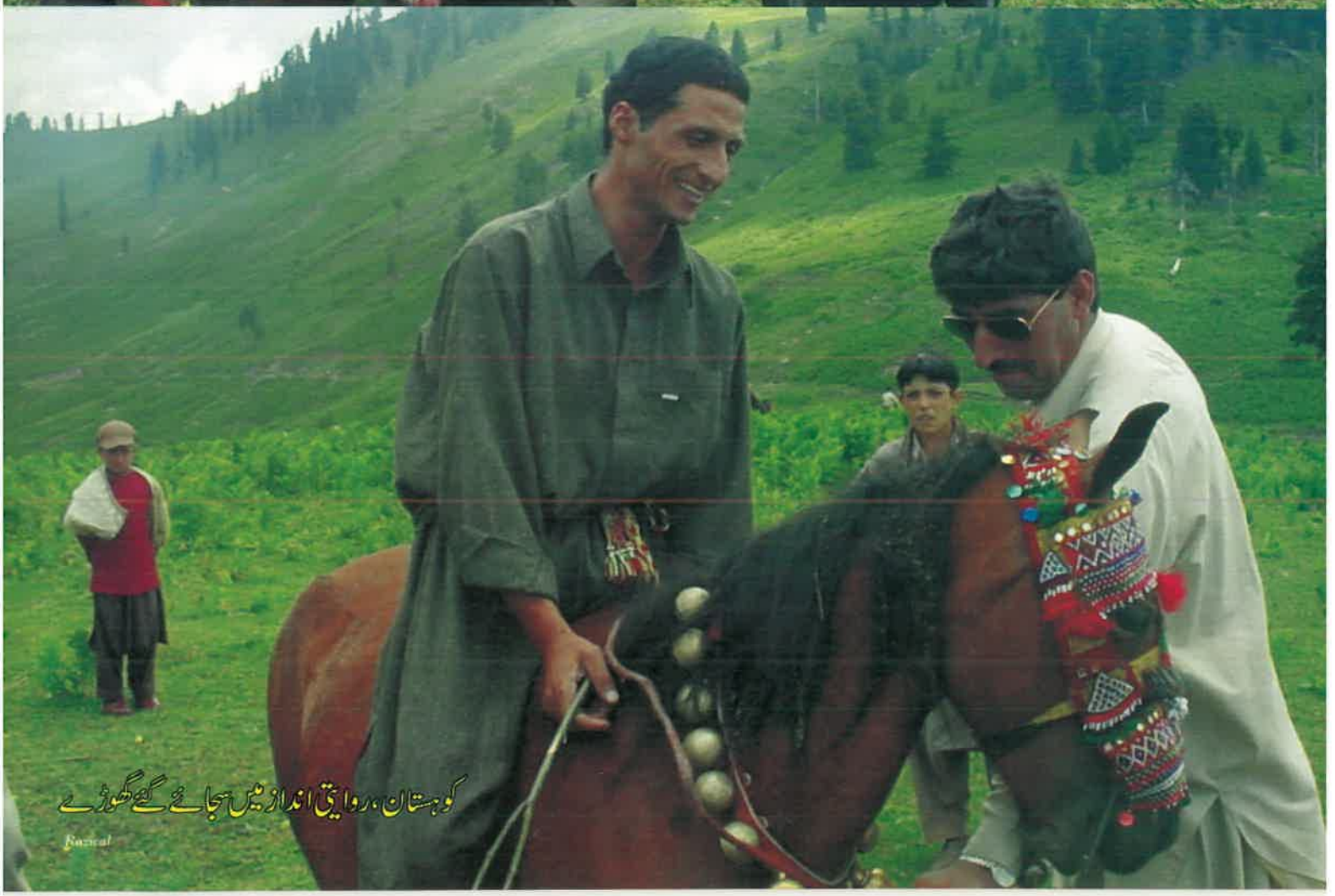

کوہستان، روایتی انداز میں سجائے گئے گھوڑے

Faizal

درخت کے تنوں سے بنا ایک روایتی پل

تعمیراتی لکڑی کو جنگل سے نیچے لانے کے لئے بنائی گئی سلائیڈ جسے "پترو" کہتے ہیں

پالس کی ایک بستی میں لڑکے روایتی کھیل کُھجیں کھیل رہے ہیں

Rizwan

کوہستانی بچے

Gul Peerik

کوہستان، درخت پر خشک گھاس ذخیرہ کرنے کا روایتی طریقہ

مٹی کا بنا پلہ؟ چراغ دان جسے لمدرد کہتے ہیں
اس پر چراغ یا جلتی ہوئی لکڑی رکھی جاتی ہے

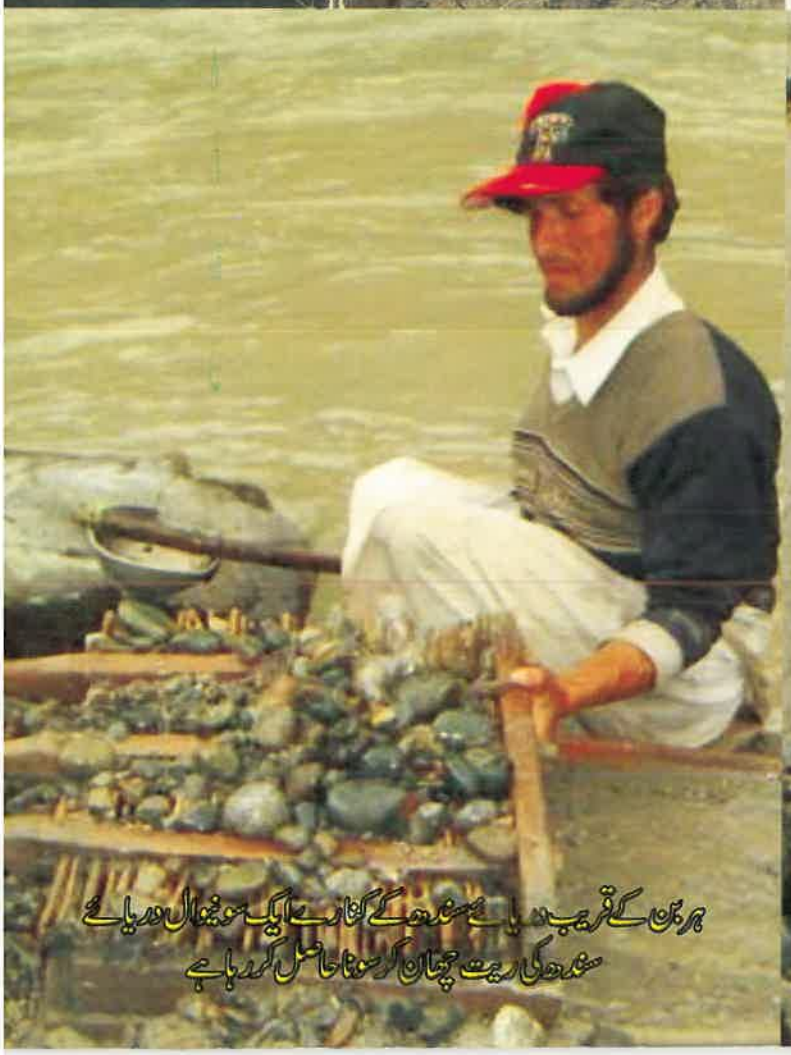

ہربن کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ایک سونیوال دریائے
سندھ کی ریت چھان کر سونا حاصل کر رہا ہے

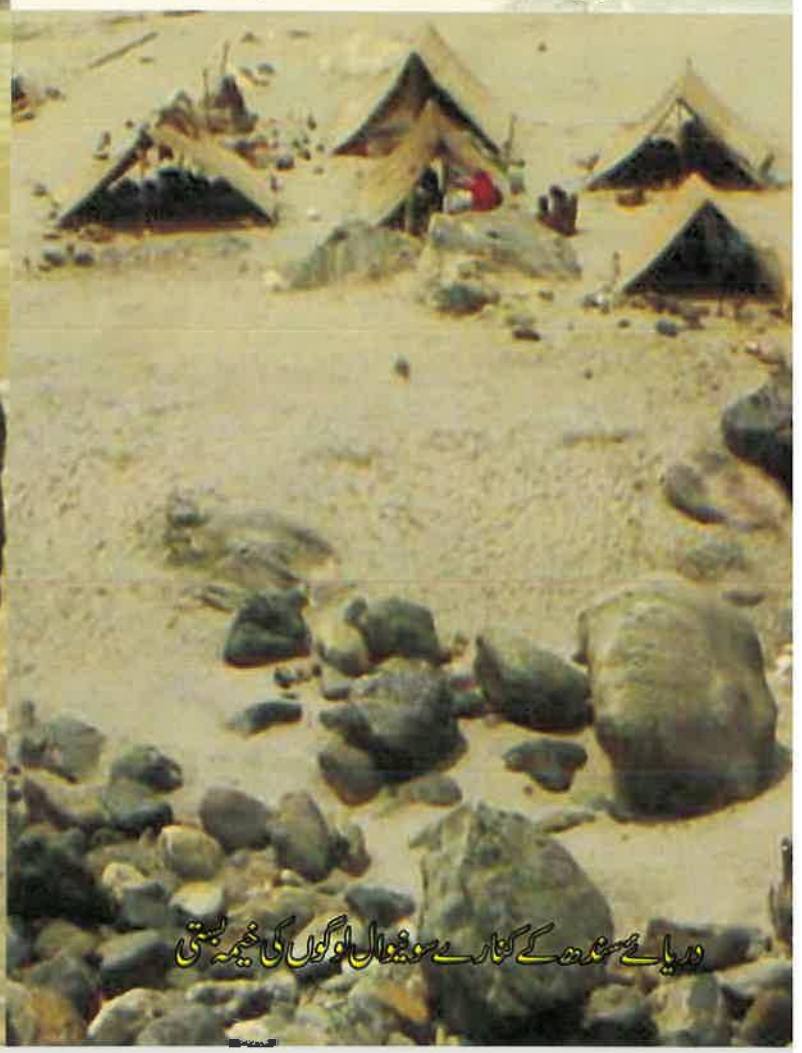

دریائے سندھ کے کنارے سونیوال لوگوں کی خیمہ بستی

پالس میں ایک معمر شخص قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہے

Gai Devik

درو پالس: ایک شخص مرغیاں بیچنے جا رہا ہے

Razwal

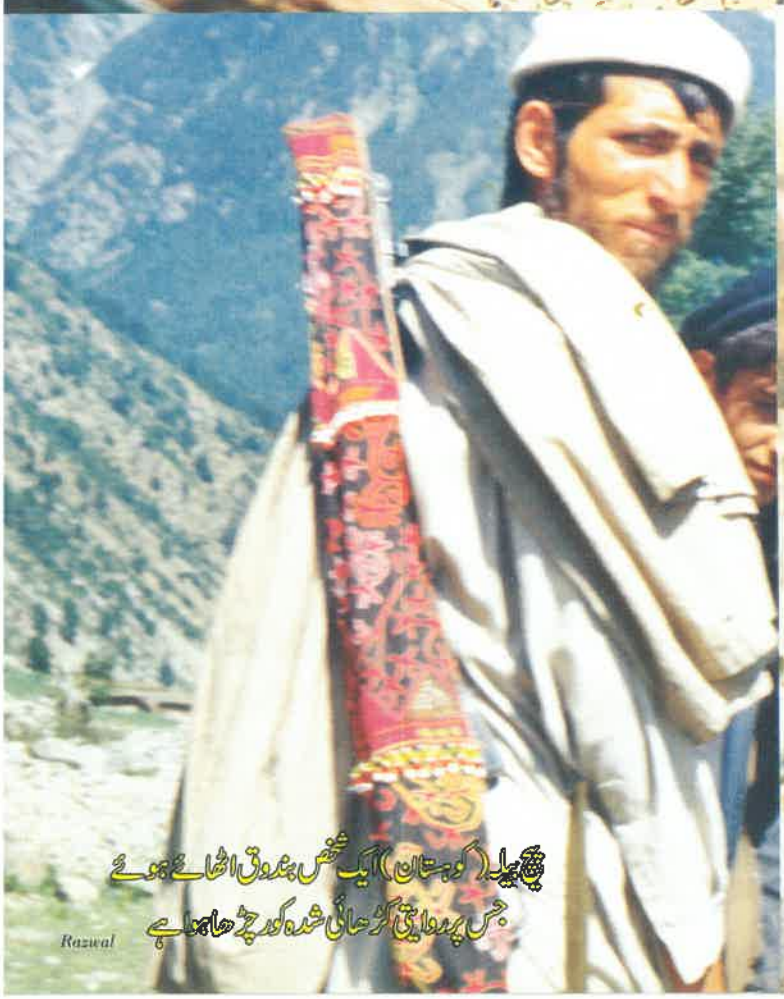

پیچ بیلہ (کوہستان) ایک شخص بندوق اٹھائے ہوئے
جس پر روایتی کڑھائی شدہ کور چڑھا ہوا ہے

Razwal

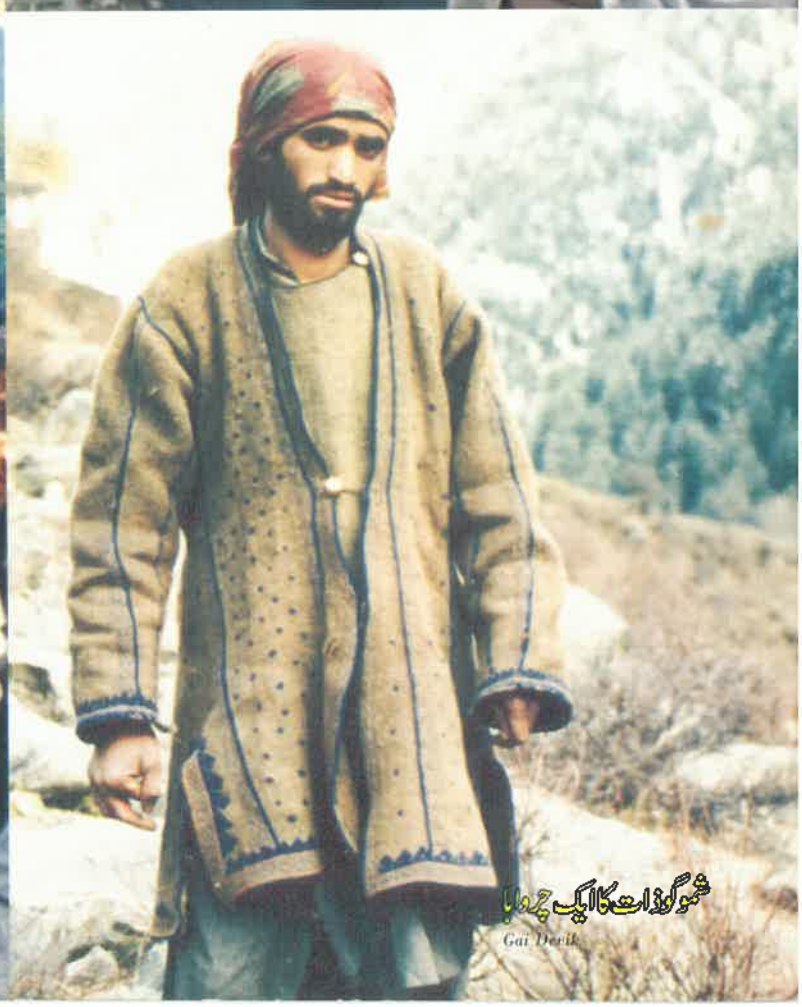

شمو گوزات کا ایک چرواہا

Gai Devik

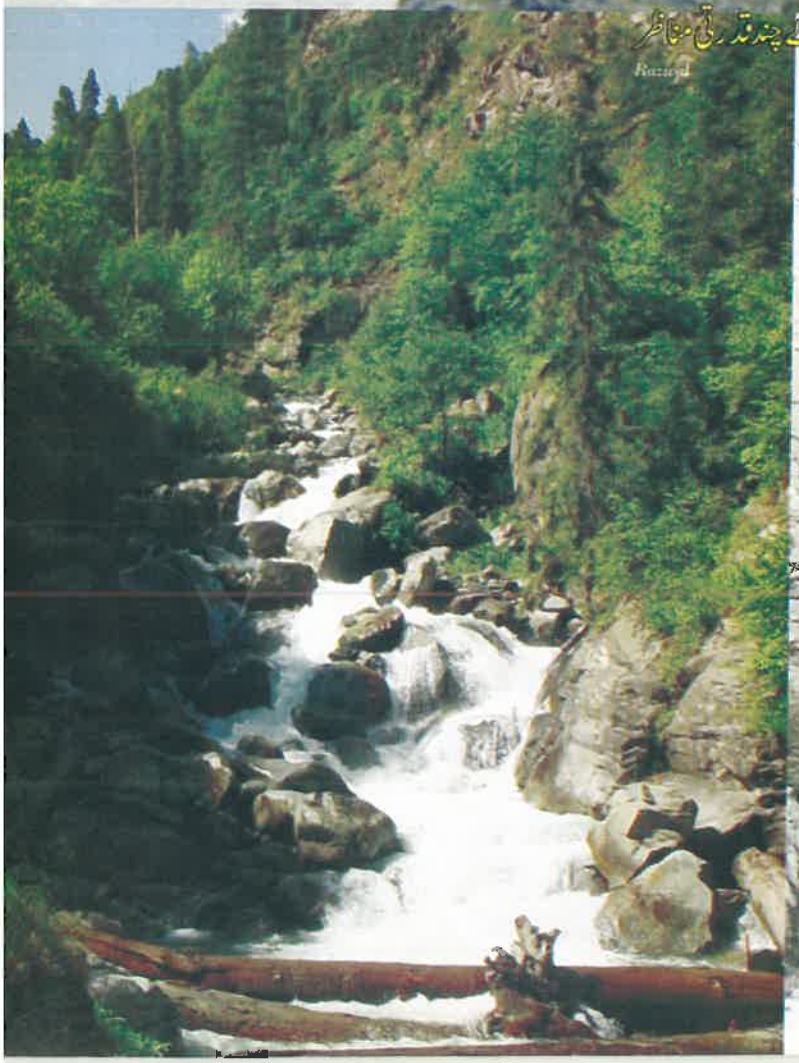

انڈس کوہستان کے چند قدرتی مناظر

کوہستان کے پہاڑ، دریائے سندھ اور شاہراہِ ریشم کا منظر

Gai Devik

چراگاہ لیدی کے زیریں حصے کا منظر

Bazwal

ایک پن چکی کا اندرونی حصہ

Razwal

وادی کاغان کا ایک لوہار اپنی دکان میں کام کرتے ہوئے

Razwal

دستکار چٹان تراش کربن پنچی کا پاٹ بنا رہے ہیں (انڈس کوہستان)

لوہار کے استعمال کی چھونکنی

ہربن وادی کے قریب انڈس کے کنارے ایک سونے والے سے بات چیت

گدار کی بستی میں منعقدہ ایک جرگہ (اندس کوہستان)

Razwal

مسی کی بستی میں روایتی جرگہ (اندس کوہستان)

PCDR

کوہستان میں لکڑی پر کندہ کاری کے چند اور خوبصورت نمونے

گوہستان پارو کی ایک مسجد کے ستون پر کندہ کاری کا خوبصورت نمونہ

لکڑی پر کندہ کاری کا نمونہ، چھت کا ستون اور تاج

کوہستانی کشیدہ کاری کے چند خوبصورت نمونے

تاریخ کوہاٹ

صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں پہلا ضلع کوہاٹ جو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک قدیم علاقہ ہے جس کی تاریخی حیثیت پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں تاہم یہاں کی قدیم اقوام آفریدی، بنگش، اورکزئی، خٹک اور شنواریوں کے بارے میں جو تواریخ مرتب ہوئی ہیں ان اقوام وقبائل کی تاریخی حیثیت کے مسلمات میں سے اس علاقے کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ البتہ یہاں کے چند اہل قلم نے تاریخ کوہاٹ سے متعلق قلم آزمائی کی ہے اور اس سلسلے میں جو تحقیقی مواد دستیاب ہوا ہے اس کے مطابق اس علاقے کی تاریخ کے بارے میں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ جس طرح صوبہ سرحد کے دیگر علاقوں کے تاریخی پس منظر کو منظر عام پر لانے کے لئے وہاں کے محققین واہل قلم نے جتنی کوششیں کی ہیں اس معیار کی کوشش کا سراغ کوہاٹ کی سرزمین میں نہیں ملتا۔ اس ضمن میں احمد پراچہ کی کتاب ''تاریخ کوہاٹ'' ایک قابل ستائش کوشش ہے۔

کوہاٹ کے تاریخی پس منظر کو واضح کرتے ہوئے ''تاریخ کوہاٹ'' کے مصنف احمد پراچہ لکھتے ہیں کہ مختلف ادوار میں مختلف مصنفین کے ہاں مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ سید محمد قاسم شاہ مرحوم (پیر حقانی) کی تالیف بعنوان تذکرہ سید عبداللہ کوہاٹی جو 1396 ہجری بمطابق 1976 منظر عام پر آئی۔ پیر حقانی نے اپنی تالیف میں عزیز اختر وارثی مرحوم کے حوالے سے کوہاٹ کے بارے میں کچھ اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ کوہاٹ ایک قدیم تاریخی شہر ہے جو بندوبست سے پانچ سو سال قبل آباد کیا جانا بیان ہوتا ہے۔ بدھ مت کے عہد میں یہاں دو راجاؤں عاد اور کوہاٹ کی آمد ہوئی اور یہ دونوں راجے اس علاقے کی شمالی سرحد پر آباد ہوئے۔ راجہ کوہاٹ نے اس شہر کو اپنے نام کی نسبت سے کوہاٹ کے نام سے منسوب کیا۔

کوہاٹ کی وجہ تسمیہ: کوہاٹ کی وجہ تسمیہ ایک تو یہ ہے کہ یہاں کے ایک راجے کا نام کوہاٹ تھا اور اس نے اپنے نام کی مناسبت سے اس راجدھانی کا نام کوہاٹ رکھ دیا۔ مگر یہ بات محل نظر ہے کہ قدیم راجاؤں کی راجدھانیوں کے سلسلے میں اور ان راجاؤں کی بابت راقم الحروف کا جن کتابوں سے مطالعہ وابستہ رہا ہے کسی بھی قدیم کتاب میں راقم الحروف کے مطالعہ اور مشاہدہ میں راجہ کوہاٹ کا نام نظروں سے اوجھل رہا ہے اور یہ کہ مصنف نے بھی اس سلسلے میں کوئی واضح حوالہ نہیں دیا جو کہ اس بات کی شہادت دے سکے کہ اس علاقے میں کسی کوہاٹ نامی راجہ کی حکمرانی قائم ہوئی تھی۔

دوسری توجیہہ وہ ہے جو علاقے کی جغرافیائی حالت کے پیش نظر بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ خطہ ایسا ہے کہ جو پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس مناسبت سے اسے کوہاٹ کہا گیا۔ کوہ کے معانی پہاڑ اور اٹ کے معانی جگہ یا ٹھکانہ یا منڈی کے ہے۔ اسی معانی سے قریب قریب تاریخ کوہاٹ میں اس علاقے کے اہل قلم مرحوم ادیب ایوب صابر کی ایک رائے اس طرح رقم کی گئی ہے کہ کوہاٹ کے بارے میں جو مجھے سکول میں بتایا گیا تھا یہ تو یاد نہیں لیکن جب زندگی کی گہما گہمیوں میں ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے میں داخل ہوا تو میں نے ٹوہ لگائی کہ کوہاٹ کو کوہاٹ کیوں کہتے ہیں مگر کوہاٹ کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے دل کو تسکین ہوتی' کوہاٹ ایک معمہ ہے اور اس معمہ کو لوگ مختلف طریقوں سے حل کرتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ کوہاٹ دراصل ''کوہ اور آٹ'' کا مرکب ہے کوہ کے معنی پہاڑ ہیں اور اٹ کے معنی اٹا ہوا چونکہ یہ ضلع پہاڑوں سے اٹا ہوا ہے اس لئے اسے کوہاٹ کہتے ہیں۔

رحیم گل مرحوم جو کہ فلمی ہدایت کار اور ناول نویس گزرے ہیں۔ ان کی بھی کوہاٹ کے نام سے متعلق رائے ایوب صابر کی رائے سے ہم آہنگ ہے ان کا کہنا ہے کہ پرائمری کی کسی جماعت میں پڑھا تھا کوہ کے معنی پہاڑ اور اٹ کے معنی منڈی یعنی پہاڑوں کی منڈی بے آب وگیاہ زمین۔ ضلع کی جس سمت کو نکل جائیں خشک پہاڑ و سنگلاخ چٹانوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دے گا۔ پسماندگی کا داغ کوہاٹ کے لئے مقدر ہو چکا تھا مگر بھلا ہو ادب اور شعر کے چراغ جلانے والوں کا کہ اب یہی ٹمٹماتی روشنی مہ و آفتاب سے آنکھ ملا رہی ہے۔ کوہاٹ کی تاریخ اور محل وقوع کے تعین کے اعتبار سے ایڈورڈ ای الیور نے اپنی کتاب پٹھان اور بلوچ میں جو منظر کشی کی ہے مترجم نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ پانی کی نالیوں، گندم کے کھیتوں، باغیچوں اور پایاب، شفاف ندیوں کے درمیان ایک منظر خیز قصبہ جس کے پس منظر میں نیلی پہاڑیوں کے سلسلے اور مشرق کی طرف سنگلاخ پہاڑ ڈھلوان اور اوپر کو اٹھتا ہوا کوتل کے عین عقب میں جس کے اوپر سے درہ کوہاٹ آفریدی علاقہ سے پشاور کو جاتا ہے اور مزید ڈھلوان ابلان درہ سے ملوغر کی بلند ترین چوٹیوں کی سمت بڑھتا ہے۔ غرب کی طرف اورکزئی پہاڑیاں اور ذرخیز میرانزئی وادی جو شاذ و نادر ہی جانسوز گرمی کے دوران بادنسیم سے محروم رہتی ہیں اور جو بسا اوقات اتنی تیز اور ٹھنڈی ہوتی ہیں کہ سرحد کے ساتھ ساتھ خنک ترین نسیم کو ہی ہانگو کہنے لگ گئے۔ جنوب کی طرف زیتون سے لدا پھندا میر خویلی استادہ ہے اور وہ سلسلہ بھی جس کے گرد دریائے توئی ایک سرسبز علاقہ سے گزرتا ہوا سندھ کی طرف آتا ہے۔ پیش منظر میں شہتوتوں کے جھنڈ اور باغات ہیں یا اخروٹوں اور ہندوستانی انجیروں کے درخت اور ان میں

حاجی بہادرؒ کا مشہور مقبرہ ہے جہاں سرحدی پٹھان اپنی غیر معمولی قسمیں اٹھاتے ہیں جو کہ عدالتی قسموں سے بھی زیادہ واجب العمل ہوتی ہیں یہ ہے کوہاٹ۔ ایک نخلستان ایک ایسے علاقے میں جو دوسرے علاقوں سے کچھ زیادہ ہی بنجر، چٹیل اور پتھریلا ہے۔ جب انگریز راج یہاں نافذ ہوا تو انگریزوں نے یہاں پر چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں قائم کیں جن میں دو تین پیادہ ایک رسالہ پلٹن ہوتی تھی اسے انگریزوں نے ہی اپنے دور میں فرنٹیئر فورس کا نام دیا۔ ان چھاؤنیوں کے علاقے میں مکانات تعمیر کئے جن کے ساتھ باغیچے بھی تھے۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ کہنا تاریخی حقیقت کے قریب تر بات ہے کہ کوہاٹ وملحقہ اضلاع ہنگو اور کرک قدیم خطے کی نشاندہی کرتے ہیں اور اپنے اندر بہت سے تاریخی نشیب وفراز سمیٹے ہوئے ہیں۔

ہنگو: کوہاٹ کے مغرب کی جانب ہنگو اور اس سے ملحقہ مضافات ٹل تک کا علاقہ بنگشوں کا ہے۔ اس ضلع کا صدر مقام ہنگو ہے جسے تاریخ میں ہانگو بھی لکھا گیا ہے۔ ہنگو میں زیادہ تر شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے بنگش رہتے ہیں جبکہ سنی بنگش بھی موجود ہیں جو ہنگو کے علاوہ مضافات میں بستے ہیں۔

خٹکوں اور اورکزئی کے درمیان جنگ: خٹک اور اورکزئی کے درمیان جس مشہور اور تاریخی جنگ کا ذکر آیا ہے وہ خٹک قبیلہ کے لوگوں نے بنگش قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ مل کر اورکزئیوں کے خلاف لڑی تھی۔ اس سلسلے میں پروفیسر پریشان خٹک اپنی کتاب ''پشتون کون؟'' میں رقمطراز ہیں کہ ''چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں قبیلہ بنگش بھی وادی کرم سے موجودہ ضلع کوہاٹ کی طرف کوچ کر کے چلا آیا جہاں پر اورکزئی قبیلہ آیا تھا زمین پر قبضہ جمانے کی کوشش میں اورکزئی اور بنگش قبیلوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ جنوب سے خٹک بھی اورکزئی علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے عزائم کے اشتراک کی بناء پر خٹک اور بنگش نے مل کر اورکزئیوں کے خلاف مہم جاری رکھی۔ اس عداوت کے دوران دو فیصلہ کن لڑائیاں محمد زئی اور تپی کے قریب ہوئیں جو بالترتیب کوہاٹ سے قریباً تین اور چار میل کے فاصلے پر جانب غرب اور جانب جنوب واقع ہیں۔ مورخین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ ان لڑائیوں میں قبیلہ اورکزئی کو شکست ہوئی اور وہ تیراہ کی پہاڑیوں کی طرف پسپا ہوئے۔''

ایک دلچسپ تقسیم: اورکزئیوں کے تیراہ کی پہاڑیوں کی طرف کوچ کر جانے کے سلسلے میں پروفیسر پریشان خٹک اس بات سے متفق نہیں کہ اورکزئی پٹھان اس وجہ سے تیراہ کے پہاڑی علاقے کی طرف کوچ کر گئے کہ انہیں بنگشوں اور خٹکوں سے شکست ہوئی۔ بلکہ اس کی وجہ ایک پشتون ضابطہ اخلاق کی پاسداری ہے اس سلسلے میں نہایت ہی دلچسپ واقعہ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں جو بحوالہ بنگشوں کے قلمی مصنفہ سید جعفر حسین شاہ رشتون کہتے ہیں کہ جب بنگش اور اورکزئی قبیلے کے لوگوں کے درمیان کافی کشت وخون ہوا تو قبائلی رسم ورواج کے عین مطابق دونوں قبیلوں کے بزرگوں نے متفقہ طور پر جرگہ منعقد کر کے صلح کرنے کی کوشش کی۔ ہنگو کے ایک گاؤں درسمند کے میدان میں دونوں قبیلوں کا جرگہ منعقد ہوا اور ان کے درمیان صلح کی کوشش کی گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ تائی نامی حجام یہ فیصلہ کریگا کہ میدان کس کو ملے اور پہاڑی علاقہ کس کے حصہ میں آئے دونوں طرف کے لوگوں نے اس پر اتفاق کیا اور اپنے آپ کو تائی حجام کے فیصلے کا پابند کرتے ہوئے تائی حجام کو فیصلے کا اختیار دے دیا چنانچہ تائی جو کہ ہوشیار اور پیشہ ور نائی تھا گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اس نے اپنے مخصوص انداز میں یہ فیصلہ اپنے ایک ہاتھ کو کان پر رکھ کر منظوم الفاظ میں اس طرح دیا:

تائی تائی تائی داسے وائی
چہ سمہ دبنگشو غرڈنول اور کزئی

ترجمہ: تائی تائی تائی یہ کہتا ہے کہ میدان بنگشوں کا اور تمام پہاڑ اورکزئیوں کا۔ تائی نے یہ فیصلہ دے کر گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بعض زبانی روایت کے مطابق تائی حجام نہیں تھا بلکہ میراثی تھا چونکہ دونوں قبیلوں کی دلچسپی کا مرکز میدانی علاقہ تھا مگر تائی کا جو فیصلہ ہوا اسے اورکزئیوں نے قبول کیا اور پہاڑی علاقے کی طرف کوچ کر گئے اور اس طرح پشتون روایت کی پاسداری کرتے ہوئے فیصلے پر کوئی قدغن نہیں لگایا۔ فیصلے کے مطابق بنگش جب میدانی علاقے پر پھیلنا شروع ہوئے تو ان کے اتحادی خٹک بھی اپنا حصہ لینے کیلئے آگے بڑھے اور کوہاٹ کا بہت علاقہ ان کے حصے میں آیا جس میں تیری سے مشرق کی طرف لاچی سے ہوتے ہوئے ساری اور گداخیل کے گاؤں اور دائیں طرف گمبٹ اور خوشحال گڑھ کا علاقہ ہے۔ واضح رہے کہ گداخیل میں بنگش قبیلہ آباد ہے اور خٹک اور بنگش قبیلے کیلئے حد فاصل ہے۔

درہ آدم خیل: درہ آدم خیل کوہاٹ کے دروں میں غیر معمولی شہرت کا حامل درہ ہے۔ یہ اب ایف آر کوہاٹ کہلاتا ہے۔ کوہاٹ کے شمال اور پشاور کے جنوب میں کوہاٹ اور پشاور کی درمیانی گزرگاہ ہے جو کہ پشاور سے کوتل پہاڑی سے قبل پشاور کی

اختتامی حدود پر واقع ہے اور جو آفریدیوں کے قبیلے کی معروف شاخ آدم خیل کا مسکن ہے۔ 1850ء میں درہ آدم خیل کے قبائل کے خلاف انگریزوں نے ایک مہم بھیجی تھی یہ مہم کمانڈر انچیف سر چارلس نیپئر نے پشاور سے روانہ کی اس مہم کی غرض وغایت اس درے سے گزرنے والی سڑک کی مرمت تھی تاکہ انگریز اس درے سے آفریدی قبائل پر اپنی برتری کا احساس قائم کر کے بآسانی پشاور سے کوہاٹ جانے کے لئے راستہ ہموار کریں۔ چونکہ سکھ دور سے یہ دستور قائم رہا کہ سکھ اس درے سے گزرنے والی گزرگاہ سے گزرنے کے لئے یہاں کے آفریدیوں کو معاوضہ ادا کرتے رہے تھے اور جب انگریز تسلط قائم ہونے لگا تو راہداری کا یہی اصول بحال رہا مگر انگریز کمانڈر انچیف نے اسی درے میں آباد قبائل میں احساس محکومی پیدا کرنے کے لئے یہ منصوبہ تیار کیا کہ یہاں سڑک کی مرمت کے بہانے یہاں کے قبائل پر تصرف حاصل کیا جائے۔ چنانچہ جب سڑک کی مرمت کی غرض سے یہاں مزدور وغیرہ پہنچے تو یہاں کے آفریدی قبائل نے سخت مزاحمت کی جس پر بریگیڈیئر جنرل سر کولن کمبل کی کمان میں ان قبائل کو دبانے کے لئے ایک مہم روانہ کی گئی۔

9 فروری 1850ء کو جب یہ مہم پشاور سے روانہ ہوئی تو کمانڈر انچیف چارلس نیپئر بھی اس لشکر کے ساتھ تھا۔ چنانچہ 10 فروری 1850ء کو یہاں آفریدی قبائل کی طرف مزاحمت ہوئی مگر ایک مختصر سی جھڑپ کے بعد انگریزوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر اخور کے گاؤں پر قبضہ کر لیا جو درہ کوہاٹ کے شمالی راستے میں واقع ہے اور پھر یہاں پر قبضہ کو مضبوط کرنے کے لئے انگریز کمانڈر نے کچھ فوج کو تعینات کر دیا اور خود باقی ماندہ سپاہ کے ساتھ کوہاٹ کی طرف پیش قدمی کی اور آس پاس کی قبائلی آبادیوں پر یلغار کرتے ہوئے 11 فروری کو انگریز لشکر کوتل کے پاس جا پہنچا یہاں پر آفریدی قبائل نے پہاڑیوں سے انگریز لشکر پر پتھراؤ کیا اور گولیاں برسائیں مگر انگریز فوج کوہاٹ کی طرف پیش قدمی کرتی رہی جبکہ بہت حد تک انگریز فوج نے نقصان بھی اٹھایا۔

بعدازاں یہاں کے مکین قبائل نے کوتل کی پوسٹ پر حملہ کر دیا اور سپاہیوں کا گھیرا تنگ کر دیا تو ان کی مدد کے لئے کوہاٹ سے ایک کمک روانہ ہوئی کوتل کا برج مسمار کر دیا گیا اور سیاسی گفت وشنید کا دور شروع ہوا۔ صلح کی شرائط ان مذاکرات کے نتیجہ میں طے پا گئیں جن کی رو سے آدم خیل کو دیئے جانے والے راہداری کے معاوضے کو بڑھا دیا گیا اور پھر پشاور اور درہ کوہاٹ کے درمیان انگریزوں نے فورٹ میکسن کے نام پر ایک مزید قلعہ تعمیر کر لیا۔ یہ بات بھی تاریخ کے ساتھ پیوستہ ہے کہ آفریدیوں اور انگریزوں کے درمیان صلح کی شرائط طے پا جانے کے بعد اور قلعہ کی تعمیر کی اجازت اور تعمیر کے بعد بھی آدم خیل آفریدی انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتے رہے اور انگریز اس بغاوت کی آگ کو سرد کرنے کے لئے حکمت عملی سے کام لیتے رہے مگر جب آدم خیل آفریدیوں کے حملے بڑھتے گئے تو انگریز سرکار کی طرف سے 1853ء میں ان قبائل کے خلاف فوجی مہم کی اور وادی تک پہنچنے کے لئے ہاتھیوں پر توپیں لاد کر مقابلے کے لئے بھیجیں۔ اس سلسلے میں راستے میں جو بھی گاؤں اور آبادی آتی گئی اسے توپوں کا نشانہ بنایا اس صورت حال کے پیش نظر آفریدیوں نے انگریز سرکار کے پاس اپنا جرگہ بھیجا اور صلح کے لئے شرائط پیش کیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے پیش کردہ مجوزہ شرائط کے مطابق 24 فروری 1854ء کو ایک معاہدہ دونوں فریقوں کے درمیان طے پا گیا۔

میران زئی: یہ ایک پہاڑی وادی ہے جو ندی نالوں اور مقامی باشندوں کے کچے مکانوں پر مشتمل ہے۔ یہ زائی مشت قبیلہ کا مسکن ہے۔ راستہ دشوار گزار ہے۔ کوہاٹ کے غرباً اور جنوباً وادی ہنگو اور پاڑا چنار کے درمیان ہے۔ انگریزوں کے دور میں یہ علاقہ ان کے حملوں کی زد میں رہا اور یہاں کے قبیلہ زائی مشت کے باشندے انگریزوں سے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کیلئے ان سے لڑتے رہے۔

اجزائے ترکیبی

صوبہ سرحد کے جنوبی خطوں میں پہلا جنوبی خطہ پہاڑوں میں گھرا ہوا مجمع البحال قدرے میدانی اور گرمیوں کے موسم میں شدید گرمی اور حدت رکھنے والا خطہ کوہاٹ ہے۔ کوہاٹ میں زیادہ اثر پذیر پشتون قبائل میں، خٹک، بنگش اور کرئی اور کوہاٹ سے شمال کی جانب قدرے دور بسنے والے آفریدی ہیں جبکہ شہری اقوام و خاندان میں بنوری، سادات، گیلانی سادات، بخاری سادات، شہزادگان، پراچہ اور کیانی معروف خاندان ہیں جو شہر کے اندر اور بیرون میں اپنی بستیاں بسائے ہوئے ہیں۔

خٹک: تہذیب آشنا اور مصلحت شناس، ارتقائی حالات سے ہم آہنگ ہو کر پیشرفت میں ممتاز مقام رکھنے والا یہ پٹھانوں کا واحد ایسا قبیلہ ہے کہ جب سے کوہ سلیمان میں وادی شوال سے خروج کیا اور تمدنی علاقوں میں رخ کرتے ہوئے صوبہ سرحد کی زرعی اور قدرے بنجر زمینوں میں آباد ہوا تو اس نے اپنی آبادکاری کیلئے قطعہ زمین میں توسیع کے لئے جنوبی سرحدی صوبے سے لے کر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے جنوب مشرقی حصہ اور اوپر شمال کے علاقہ مردان کے مشرق تک آباد ہوتا چلا گیا۔ خٹکوں میں ملک اکوڑ خان خٹک ایک نہایت ہی زیرک مصلحت شناس، تنظیم آگاہ، درباری طور طریقوں سے واقف، اہل فراست سردار ثابت ہوا بعد

میں ان کے پوتے خوشحال خان خٹک نے صاحب سیف وسخن کا امتیازی مقام حاصل کر کے خٹکوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جو عزت ومحترم مقام بخشا۔ خوشحال خان خٹک نیزہ، بدست سخن بلسان ایسی حیرت انگیز شخصیت کے اسرار ورموز کو اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے تھا کہ نہ صرف خٹک قبیلے کے تمام ذیلی قبائل سے تعلق رکھنے والے پشتون اس پر فخر کرتے ہیں بلکہ تمام پٹھان من حیثیت القوم خوشحال خان خٹک کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ کوہاٹ کے جنوبی حصوں شکر درہ اور پھر ضلع کرک میں ان کا مسکن ہے۔ کوہاٹ کے شہری علاقوں میں بھی صاغری خٹک کے نام سے کچھ خٹک آباد ہیں جبکہ کوہاٹ کے جنوبی ضلع کرک میں بارک خٹک ہیں۔ کوہاٹ کے خطہ تک پہنچنے سے پہلے اس قبیلے کی تاریخی نوعیت کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ ماضی میں خٹک بنوں کے مغرب میں غول چوٹی کے پاس بقول ایڈورڈ ڈی ایلور اب غلزئیوں کا گرمائی مقام ہے۔ شوال وادی میں رہتے تھے شوال سے مشرق کی طرف موجودہ ضلع بنوں آئے جہاں ان کے دو اہم ہم نسل قبیلے ہوتئے اور منگلئے آباد تھے۔ 1300ء کے قریب شینگ یہاں آئے اور پھر شینگ اور خٹک ہم آہنگی کے ساتھ رہنے لگے۔ زمین کی وسعت درکار ہوئی تو یہ شمال اور مشرق کی طرف نکلے جنوب کی طرف ٹیری وادی کے اوپر موجودہ کوہاٹ ضلع کے جنوب اور مشرق کی طرف بنگشوں کی رفاقت میں رہنے لگے۔ انہوں نے یہاں آباد اورکزئیوں کو نکال باہر کیا جو کوہ سفید اور تیراہ کی طرف چلے گئے۔

خٹک کی وجہ تسمیہ: ایڈورڈ ای ایلور نے خٹک کی وجہ تسمیہ خوشحال خان خٹک کے پوتے افضل خان کی تاریخ مرصع کے حوالے سے بیان کی ہے۔ وہ ایک منفرد داستان پر مبنی ہے اور جسے جیمز ڈبلیو سپین نے بھی (Land of the Pakhtoon) میں درج کیا ہے۔ مگر پروفیسر پریشان خٹک نے اس کی بقدر تخفیف تردید کی ہے اور خٹک کی وجہ تسمیہ میں ایک نئی توجیہہ پیش کی ہے۔ ایڈورڈ ای ایلور اور جیمز ڈبلیو سپین نے تاریخ مرصع کے حوالے سے خٹک قبیلے کے نام کی توجیہہ سے متعلق جو دلچسپ داستان رقم کی ہے وہ یہ ہے جب اس قبیلے کے لوگ اپنے آبائی وطن شوال میں رہتے تھے تو اس قبیلے کے چار پٹھان بھائی شکار کے لئے میدانوں میں اترے سامنے سے نقاب پوش اور خوش وضع زنانہ لباس میں ملبوس چار مستورات نمودار ہوئیں لباس اور چال ڈھال میں نوخیز دوشیزائیں تھیں جب وہ قریب آئیں تو بڑے بھائی جس کا نام لقمان تھا اس نے تجویز پیش کی کہ اگر ہر بھائی ایک کو بیوی بنالے تو بہت مزہ آئے گا۔ بھائیوں نے اس تجویز پر اتفاق کیا اور انتخاب کے لئے قرعہ اندازی کا سوچا لیکن لقمان نے بڑے ہونے کی وجہ سے پہلے قرعہ کا حق مانگا۔ چونکہ ان کے چہروں پر نقاب تھا لہذا لقمان نے بظاہر شوخ ترین لباس والی خاتون کو پسند کیا جب چاروں تقسیم ہوگئیں اور پھر ان کی نقاب کشائی ہوئی تو لقمان کی اختیار کردہ اور پسندیدہ غیر کشش یا فتہ سیاہ اور بے حد مایوس کن ثابت ہوئی۔ اس کے مقابلے میں تینوں خوبصورت خوش وضع تھیں۔ اس حیرت انگیز منظر پر باقی تین بھائیوں نے نظر فریب لباس پر مر مٹنے پر کہا کہ لقمان پہ خٹہ لاڑ' یعنی لقمان کیچڑ پر گر گیا۔ مطلب یہ ہے کہ لقمان اپنے انتخاب پر نشانہ تمسخر بن گیا اور یوں خٹہ کا لفظ اس پر چسپاں ہوگیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اولاد کے ساتھ یہ نام چلتا رہا بعد میں یہ خٹہ خٹک ہوگیا اس خاتون کا نام جسے خٹک کی ماں کا درجہ حاصل ہے سباقہ تھا سباقہ کے بطن سے دو بیٹے ہوئے اور دیگر تین دوشیزاؤں نے بہن سے بیٹوں کو جنم دیا مگر ان کی اولاد کو خٹک کے دائرہ میں بھی شامل کیا گیا اور یوں یہ خٹک مشہور ہوئے۔

پروفیسر پریشان خٹک اپنی کتاب پشتون کون؟ میں رقم طراز ہیں کہ لقمان عرف خٹک کا حلیہ اتنا بگاڑ دیا گیا کہ آج تک کسی کو سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ لقمان کا عرف خٹک کیسے پڑ گیا۔ جو لوگ کرلانڑی شاخ کے قبائل کے جغرافیائی حالات اور علاقائی تعصبات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ پشتون کے جنوبی قبائل میں پہلے زمانہ میں تو کیا آج تک بھی سب سے مقبول اور مرغوب میوہ (پھل) خربوزہ ہے۔ جسے جنوبی اور تمام قبائل خٹکے کہتے ہیں۔ اس خربوزے یا خٹکی کا رنگ اور خوشبو خاص طور پر کلاچی کے خربوزے کی تو تمام ملک میں دھوم ہے یہ میوہ اس لئے بھی زیادہ مقبول ہے کہ نہ صرف اس علاقے میں پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا رنگ اس کی خوشبو اور ذائقہ مرغوب ہونے کی وجہ سے کسی کی پیاری شخصیت کو اس سے تشبیہہ دی جاتی ہے ایک پہاڑی ماں اس علاقے میں بیٹھ کر اپنے پیارے سے بچے کو چومتے ہوئے بار بار یہ کہتی ہے خٹکے (خربوزہ ہے خربوزہ) اس طرح سے اپنے لقمان بیٹے کے رنگ خوشبو اور ذائقے کا اظہار ایک لفظ خٹکے یا خٹکی میں کرتی ہے۔

پروفیسر موصوف نے یہ توجیہہ سابقہ توجیہہ کے مقابلے میں پیش کی ہے اور بعض علمی اور تحقیقی رجحانات اور پشتون ضابطہ اخلاق وغیرت کے منافی قرار دیا ہے کہ جنگل میں چار عورتیں پشتون قبائلی سماج ومعاشرے میں گھومتی ہیں اور وہ بھی ایک ایسی سرزمین پر جہاں کہ اس طرح دیدہ دلیری سے گومنا اپنی موت کو آپ دعوت دینے کے مترادف ہے جبکہ اس پر طرہ یہ کہ چار قبیلے کے غیرت مند پشتون ان کو دیکھتے ہی از خود انہیں حلقہ زوجیت میں لینے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں یہ سب ایک غیر عقلی ہی نہیں بلکہ پشتون معاشرے کے ضابطہ سے بھی برعکس بات ہے۔

اس بارے میں تیسری توجیہہ ہے کہ خٹک کے خٹک ہونے کی توجیہہ کوئی اتنا حساس مسئلہ نہیں ہے پشاور میں کئی لوگ ایسے ہیں جو عمر کے آخری حصے تک خٹے کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور یہ نام اتنا مقبول ہو جاتا ہے کہ اصلی نام لوگوں سے پوشیدہ رہتا ہے مگر یہ خٹہ' خٹے یا خٹو استہزا کے طور پر نہیں لیا جاتا بلکہ بچے کے پیار کی ایک یادگار کے طور پر آخری عمر تک زندہ رہتا ہے۔ بعض گھرانوں میں ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں جو کہ صحت و جسمانی توانائی و ساخت کے لحاظ سے بڑے مناسب جسم کے ہوتے ہیں تو بچپن ہی سے ان کا نام خٹہ' یا خٹو رکھ دیا جاتا ہے جو کہ پیار کی علامت ہوتا ہے اور پھر عمر کے ساتھ ساتھ یہ نام چلتا رہتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ کسی دوسری شے کے استعارے یا تشبیہہ کے زیر اثر نام نہیں بلکہ اپنی ذاتی جسمانی کیفیت اور ساخت کے حوالے سے یہ نام معروف ہو جاتا ہے اور کوئی بھی اسے قابل تمسخر نہیں بناتا بلکہ اسے بچپن کی ایک یادگار سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس قبیلے کے لقمان کے نام کے ساتھ یہ خٹہ یا غٹہ اس لئے مشہور ہو گیا کہ وہ جسمانی لحاظ سے مضبوط توانا اور صحت مند ہو اور پھر بعد میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یہ غٹہ یا خٹہ خٹک ہو گیا۔ جو کہ والدین کی بچے کے ساتھ محبت اور پیار کی ایک یادگاری کیفیت کا اظہار ہے کیونکہ اگر خٹک کی توجیہہ میں خٹکے خربوزہ کی تشبیہہ کو شامل کر لیا جائے تو اس سے بھی تصغیر کا ایک پہلو نکلتا ہے جبکہ خٹک قبیلہ کے تہذیبی رکھ رکھاؤ، تعلیمی ارتقاء، تمدنی نشوونما اور ان کی فراست و فطانت ان توجیہات سے بہت بلند ہے۔

بہر حال کوہاٹ کے اجزائے ترکیبی میں خٹک اس ریجن کی ایک قابل ذکر قوم ہے۔ خٹک اپنی سابقہ کوہ باشی کی زندگی کے دور گذشتہ کی یادگار اوصاف بھی رکھنے والے ہیں اور تمدنی زندگی کی خصوصیات اور ارتقائی تہذیب کی انفرادیت بھی اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے ہیں ان کے بارے میں Land of Pakhtoon کے مصنف جیمز ڈبلیو سپین لکھتا ہے کہ خٹکوں کو ایک مستند بیرونی عالم نے پورے سرحد میں پٹھانوں کا عمدہ ترین نمونہ قرار دیا ہے اور ان کے بہت سے مضافاتی ہمسائے اور ہمعصر بھی اسی رائے کے حامل ہیں۔ یہ کافی حد تک صاف گو اور متحمل المزاج لوگ ہیں۔ وضع قطع میں مضبوط اور لطیف اندام وہ اپنے اختیار کردہ دو گونہ پیشوں؛ جنگجوئی اور کاشتکاری کے اہل بھی ہیں اور اس پر مطمئن بھی۔ خٹک غورغشت کی اولاد ہیں اور جغرافیائی حدود کے اعتبار سے قبیلہ ان شاخوں میں منقسم ہے۔ بارک خٹک ملک اکوڑہ خان کے نام سے منسوب ہے۔ ضلع کوہاٹ کے اصلی باشندے سینی اور ساغری خٹک ہیں۔ کوہاٹ کے جنوبی ضلع کرک میں بارک خٹک آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیری، کربوغہ اور گورگوری وغیرہ گاؤں میں بھی خٹکوں کی آبادیاں ہیں۔ کچھ خٹک مشرق کی جانب شکر درہ کے مقام پر آباد ہیں۔ پروفیسر پریشان خٹک انہیں قدیم ترین باختری اقوام میں سے قرار دیتے ہوئے استاگیدی قرار دیتے ہیں۔ ان کا تذکرہ آریاؤں کی مذہبی کتاب وید میں بھی آیا ہے چنانچہ پروفیسر موصوف اپنی کتاب پشتون کون؟ میں لکھتے ہیں کہ ستاگیدیون کا ذکر بطلیموس نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے اور عیلام اور بابل کے مورخوں نے بھی اور انہیں ستاگوئی اور ست گوسو کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

ستاگیدی، آراکوزی کے لوگوں سے بھی ملتے تھے اور فرانسیسی محقق ایندرویں بارتلو کہتا ہے کہ ستاگیدی پاروپانیز اور ہیلمند کے شمال کے حصہ اور اس جگہ میں رہتے تھے جسے اب غزنی کہتے ہیں۔ راونسن کہتا ہے کہ ایک ایسی اونچی جگہ پر بستے تھے جس کی چوڑائی ایک طرف ہرات سے کابل تک اور دوسری سمت سرپل سے ہیرمند کے کناروں تک تھی یعنی آریانا کے مرکزی پہاڑی علاقوں اور کوہستان میں ان کی بود و باش تھی۔ خٹک قبیلے کی قدیم ترین سکونت گاہ کے بارے میں تقریباً تمام مورخ محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قبیلہ وزیرستان کے زرخیز مزروعہ علاقے اور خوشگوار آب و ہوا کا حامل خطہ وادی شوال سے ہجرت کر کے بنوں میں تھوڑے عرصہ کیلئے نہر سدراونڑ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے میں آباد ہوا مگر یہاں شیتکوں کی موجودگی اور ضروریات معاشرت کی عدم دستیابی نے انہیں وہاں زیادہ عرصے تک ٹکنے نہ دیا تو انہوں نے وہاں سے خروج کیا اور مشرق کی طرف کوچ کر کے سوترہ کی وادی میں آ گئے یہاں پر انہیں وہ تمام سہولتیں میسر آ گئیں انہیں معاشی و معاشرت کے لحاظ سے مطلوب تھیں۔ پھر یہاں سے اس قبیلہ خٹک کی مختلف ذیلی شاخیں مشرق اور شمال کی جانب پھیلتی گئیں اور کچھ جنوب اور مغرب کی جانب یہی وہ زمانہ ہے کہ اس قبیلہ کے کچھ لوگ ضلع کوہاٹ کی طرف بڑھے اور انہوں نے وادی کرم سے خروج کرنے والے بنگش قبیلہ کے ساتھ مل کر اورکزئیوں سے جنگ کی۔ پروفیسر پریشان خٹک نے بعض تاریخی نوشتوں کے حوالے سے اورکزئیوں کے ساتھ خٹکوں اور بنگشوں کی معرکہ آرائی سے متعلق جس مقام کی نشاندہی کی ہے وہ محمد زئی اور تپی کے قریب کا مقام ہے جو کہ کوہاٹ سے بالترتیب تین اور چار میل کے فاصلے پر جانب غرب اور جانب جنوب ہے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں قبیلوں خٹک اور بنگش کی آمیزش سے اورکزئی کو پسپا ہونا پڑا اور اورکزئی قبیلہ کے لوگ تیراہ کی پہاڑیوں کی طرف کوچ کر گئے اور پھر کوہاٹ و مضافات میں بنگش اور خٹک اپنی علیحدہ علیحدہ ثقافتی اور روایتی قبیلوں کی پہچان کے ساتھ رہنے لگے۔

بنگش: بنگش قبیلہ کے لوگ بھی کوہاٹ کے باشندوں میں شامل ہیں۔ یہ قدیم پٹھانوں کا وہ مقامی قبیلہ ہے جس کا تعلق گار فرقہ سے ہے جغرافیائی لحاظ سے ان کا صدر مقام ہنگو ہے جو کہ آب کوہاٹ ریجن کا ایک ضلع ہے۔ دراصل بنگش وادی کرم کے قدیم باشندوں میں شناخت ہوتے ہیں وادی کرم میں جب توری اور دوسرے قبائل وارد ہوئے تو بنگشوں سے ان کی چھوٹی موٹی جنگیں ہوتی رہیں جس کے سبب انہوں نے من حیث القوم وادی کرم سے اخراج کیا اور مشرق کی طرف چلے آئے اور پھر ٹل اور ہنگو کے مقام پر انہوں نے سکونت اختیار کر لی۔ ویسے ان کا صدر مقام ہنگو ہی ہے ان میں سے کچھ تو شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے بنگش ہیں اور کچھ سنی العقیدہ لوگ ہیں۔ کوہاٹ شہر و مضافات میں بھی بنگش آباد ہیں۔ انگریزوں کے دور میں ان کی کل تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی مگر اب یہ کثیر التعداد لوگ ہیں۔ کوہاٹ و ہنگو و مضافات کے بنگش میرانزئی، بائیزئی اور سالمزئی کے ذیلی قبیلوں میں تقسیم ہیں۔ یہ بنگش لوگ فطرتاً امن پسند اور جفاکش ہیں بہت سے بنگش محنت مزدوری کے سلسلے میں ملک سے باہر ہیں۔ ان کی قدیم رہائش گاہیں اب جدید طرز کی تعمیرات میں بدل چکی ہیں انگریزوں کے دور میں بنگش قبیلہ کے بہت سے لوگ برطانوی فوج میں ملازم رہ چکے ہیں پاکستان بننے کے بعد ان کے باشندے پاکستانی افواج میں بھی ملازم ہو گئے اور اب بھی فوج میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں تاہم اب یہ بنگش لوگ اپنے کاروبار میں مصروف ہیں اور تاجر پیشہ کہلاتے ہیں۔ بنگشوں کا قدیم وطن افغانستان کا علاقہ گردیز تھا اور عہد حاضر سے تقریباً آٹھ سو سال قبل گردیز سے کرم ایجنسی میں آ کر آباد ہوئے تھے دیگر قوموں اور قبیلوں کی آمد، باہمی جھگڑوں کے اور اپنی امن پسند طبیعت کے باعث انہوں نے مشرق کی طرف نقل مکانی کی اور کوہاٹ کے پاس ہنگو اور کچھ لوگ ٹل میں آباد ہو گئے۔

ابتداء میں بنگشوں کے دو طائفے تھے گار اور سالم۔ چونکہ دونوں طائفوں کے درمیان سخت ترین عداوت و نفرت تھی اس لئے دونوں ایک دوسرے کی بیخ کنی میں مشغول و مصروف رہے اور یہی ان کی آپس میں معرکہ آرائی اور ایک دوسرے طائفے کو باہمی طور سے ختم کرنے کی عداوت ہی غالباً ان کے نام بنگش کی توجیہہ رہی ہے۔ ان کی آپس کی معرکہ آرائی اور ایک دوسرے کو ختم کرنے کی وجہ سے انہیں بن کش کہا جانے لگا جس کا مطلب ہے بیخ کن۔ پھر بعد میں یہ بن کش لفظ بنگش بن گیا اور اب تک اسی بنگش کے نام سے معروف ہیں۔ کوہاٹ شہر و مضافات میں اکثر سنی بنگش ہیں جبکہ ہنگو اور مضافات میں شیعہ بنگش آباد ہیں۔ ان کی قدیم بود و باش کے سلسلے میں جو روایات ملتی ہیں اس کے مطابق یہ لمبی لمبی داڑھیاں رکھنے والے لوگ ہیں جن کے چہرے کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی لٹیں ہوتی تھیں اور باقی سر کے بال ترشواتے تھے زیادہ تر بنگش قدیم پیشے کی لحاظ سے زراعت پیشہ لوگ رہے ہیں اور ان میں سے کچھ نمک کے تاجر بھی رہے ہیں۔ ان میں تشدد پسندانہ رجحانات کا فقدان رہا ہے انتظامی لحاظ سے خوش انتظام سمجھا گیا ہے۔

اورکزئی: کوہاٹ کی مقامی آبادیوں میں اورکزئیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ پٹھان شجرہ نسب میں یہ سب کے سب غورغشت کی اولاد شناخت ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی قبائلی حیات ہے اور جس ایجنسی کے یہ وارث ہیں وہ انہیں کے نام اورکزئی ایجنسی سے موسوم ہے جو کہ تقریباً بارہ سو میل رقبے پر پھیلا ہوا علاقہ ہے۔ یہ کوہ سفید کی ایک جنوبی گھاٹی ہے یہ اورکزئی تیراہ کی جنوبی وادیوں اور کرم کی شمال اور کم اونچی اور پست پہاڑیوں میں بھی آباد رہے ہیں تاہم اب بھی ان وادیوں میں یہ لوگ آباد ہیں۔ ان کے بڑے بڑے دو فرقے ہیں گار اور سالم زمانہ گذشتہ میں یہ گار اور سالم فرقے اورکزئیوں کے چھوٹے طائفوں اور ان کے اجزاء کو متصادم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں چونکہ ان میں بعض طائفے شیعہ مسلک سے متعلق ہیں اس لئے یہ مذہبی مسلک کا اختلاف ان کے درمیان اکثر جھگڑوں اور جنگ و جدل کا باعث رہا ہے۔ انگریزوں کے دور میں فرنگیوں کے خلاف بھی برسرپیکار رہے ہیں۔ کوہاٹ چھاؤنی میں بھی انگریز انتظامیہ کے لئے یہ ایک کانٹا ثابت ہوئے۔ ان اورکزئیوں کے مختلف حصے ہیں ان کے بارے میں محققین کی یہ رائے رہی ہیں کہ ان کا ہر حصہ ایک دوسرے سے متضاد راہوں پر کھڑا نظر آتا رہا ہے یعنی ان میں آپس میں میل جول کے بجائے دشمنی پروان چڑھتی رہی جس کے باعث یہ علیحدہ علیحدہ قبائل معلوم ہوتے رہے ہیں۔ یہ اسماعیل زئی، مستوزئی، دولت زئی، محمد خیل اور ستوری خیل و لشکرزئی ہیں۔ انہیں میں سے سب سے زیادہ بڑا اور طاقتور قبیلہ لشکرزئی سمجھا گیا ہے۔ کوہاٹ شہر و چھاؤنی میں ان کا ایک طائفہ مامون زئی آباد رہا ہے جو انگریزوں سے برسرپیکار رہا ہے جس کی وجہ سے انگریزوں نے کافی نقصان بھی اٹھایا اس کے علاوہ علی خیل، ملاخیل، مشتی اور شیخان بھی ایسے قبائل ہیں جو کہ اورکزئیوں سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ قبیلے جو کہ محمد خیل اور ستوری خیل سے تعلق رکھتے ہیں وہ کثیر تعداد میں شیعہ شناخت ہوئے ہیں جبکہ باقی تمام لوگ سنی المذہب ہیں۔

آفریدی: آفریدی پٹھانوں کا وہ قبیلہ ہے جس کا تذکرہ وید میں بھی آپاریتی لفظ کے ساتھ آیا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آفریدی ان قدیم اقوام میں سے

ہیں جن کے وجود کی سند وید میں ملتی ہے۔ آفریدیوں کے بارے میں جو تحقیقی مواد دستیاب ہے اس کے مطابق آفریدی متضاد صفات کا حامل مجمع القبائل قبیلہ ہے۔ ان میں اعلیٰ انسانی شرافت سے تعلق رکھنے والے اوصاف بھی موجود ہیں جیسے بہادری، احتیاط روی، جانبازی اور مروت۔ قبائلی خو کی بنا پر بغاوت کا عنصر ان میں شدت سے نمایاں ہے۔ آفریدیوں کے مشہور اور بڑے آٹھ قبائل ہیں جن میں آدم خیل، اکاخیل قمبر خیل، کوکی خیل، ملک دین خیل، زکاخیل اور سپاہ آفریدی پشاور کے جنوب اور مغرب میں کوئی ایک ہزار مربع میل رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کوہاٹ کے آفریدی آدم خیل ہیں جو کہ کوہاٹ اور پشاور کی درمیانی پہاڑیوں میں رہنے والے پٹھان ہیں انہیں کے نام سے موسوم وہ درہ جہاں ان کا آبائی مسکن ہے۔ درہ کوہاٹ میں ان کی اہم ترین دیسی ساخت کی اسلحہ ساز فیکٹریاں ہیں۔ یہ درہ آزاد اور بالکل علیحدہ بے آئین پٹی کی حیثیت سے ضلع کوہاٹ سے منسلک ہے۔ آدم خیل قبیلہ کے لوگوں اور اکاخیل کے باشندوں کی باہمی چپقلش اور معرکہ آرائی تاریخ کا ایک ستم ظریفانہ حصہ بن گیا ہے۔ آفریدی من حیث القوم خوش نما لوگ سمجھے گئے ہیں اور انہیں خدوخال میں عیرانی قوم کی مشابہت رکھنے والے سمجھا گیا ہے۔ آدم خیل آفریدی انگریزوں کے خلاف بھی برسرپیکار رہے ہیں۔ عجب خان آفریدی آدم خیل قبیلے کی ایک ذیلی شاخ بوستی خیل سے تعلق رکھتا تھا جس کی انگریزوں کے خلاف یورش پر مبنی داستان سرحد کی نہایت مشہور داستانوں میں سے شمار ہوتی ہے اور جس کی لوٹ مار اور انگریز لڑکی کو کوہاٹ چھاؤنی سے اٹھا کر لانا اور اپنے پاس یرغمال کے طور پر رکھنے کا واقعہ تاریخی حیثیت کا واقعہ ہے مگر یہ سب کچھ اپنے وطن کی آزادی کی خاطر عجب خان نے کیا تھا اور انگریزوں کے خلاف خود بھی اور دیگر آفریدی جوانوں کو بھی آمادہ بہ جنگ رکھا تھا جس کی وجہ سے انگریز کے پیش نظر خصوصاً آدم خیل کے آفریدی آنکھ کا تنکا ثابت ہوئے تھے تاہم درہ آدم خیل کے آفریدی دیگر قبائل کے خلاف برطانوی ہندی فوج میں بھرتی بھی ہوئے تھے اور مشہور خیبر رائفلز کی تنظیم میں یہ لوگ شامل رہے تھے۔

کوہاٹ میں نبوریؒ سادات کی آمد: بنوری سادات کا قبل ازیں تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے، کوہات میں ان کی آمد کے بارے میں تفصیلی درج کی جاتی ہے۔

اظہار سعد بنوریؒ کی تصنیف کے مطابق حضرت سید بنوری کے خلیفہ خاص حاجی عبداللہ بہادر حج بیت اللہ کے بعد کوہاٹ آ گئے۔ جو یہیں کے ہی باشندہ تھے۔ اس زمانے میں روافض فرقہ کا یہاں بڑا زور تھا ان کی وجہ سے اسلام کے نام پر بدعتوں کا زور تھا اور بقول مصنف یہ خود ساختہ سادات بن گئے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر حضرت حاجی عبداللہ کوہاٹی نے تبلیغ دین کا دائرہ وسیع کیا اور اس مقصد کی خاطر بنور سے حضرت سید محمد قطب بنوری کو بھی کوہاٹ آنے کی دعوت دی۔ سید محمد قطب بنوری آپ کے بڑے پوتے اور سید عبدالاحد کے فرزند تھے۔ سید محمد قطب کوہاٹ تشریف لائے اور تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کر دیا ان دونوں بزرگوں کی تبلیغی مساعی سے لوگوں کے عقائد اسلامی تعلیمات کے تابع ہو گئے کچھ مدت کے بعد حضرت سید قطب بنوری اپنی اہل وعیال کے ساتھ مستقلاً کوہاٹ ٹھہر گئے۔ حضرت حاجی عبداللہ بہادر کوہاٹی نے 1090ء میں وفات پائی تو آپ لاہور چلے گئے اور پھر 1106ء میں دوبارہ کوہاٹ تشریف لے آئے۔ اس دوران آپ باجوڑ بھی گئے بیماری کی حالت میں آپ کے فرزند انہیں لے کر چارسدہ مٹہ مغل خیل لے آئے اور شیخ محمد فاضل پاپینی کے گھر 17 رجب 1108ء میں وفات پا گئے تو ان کے اہل خانہ نے انہیں پشاور لا کر حضرت شیخ حبیبؒ کے مزار کے احاطہ میں دفن کیا اور پھر ایک سال کے بعد آپ کی میت کو وہاں سے کوہاٹ منتقل کیا گیا جہاں حضرت حاجی بہادر بابا کے مزار کے احاطہ میں دفن کیا گیا جہاں تک کوہاٹ میں بنوری خاندان کے سادات کی آبادکاری کا تعلق ہے اس کے بارے میں وثوق سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی البتہ یہ کہا گیا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو 1761 میں صوبہ سرحد کے لوگ مختلف علاقوں میں ان کی فوجوں کے ساتھ بنوری سادات کے گھرانے کے لوگ صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں آ کر آباد ہونے لگے اور اسی زمانہ میں کوہاٹ میں بھی بنوری سادات گھرانہ آ کر آباد ہو گیا۔ کوہاٹ میں شہر کے مغرب کی جانب ہنگو روڈ پر بنوریان کے نام پر ایک محلہ ہے۔ جسے گڑھی بنوریان کہتے ہیں۔ یہ کوہاٹ کے بنوری سادات کا قدیم مقام ہے مگر اس وقت اس خاندان کے افراد اب کوہاٹ کے مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں جبکہ بنوں روڈ پر ایک گاؤں جرمہ مشہور مقام ہے جہاں بنوری سادات کے لوگ آباد ہیں۔ یہ گاؤں روڈ کے مغرب کی طرف پہاڑ کے عقب میں ہے اس گاؤں کا رقبہ بڑا ہے بعض زمینیں مزروعہ ہیں۔ گاؤں میں بنوری سادات کے علاوہ کچھ غیر سادات گھرانے بھی آباد ہیں۔

میاں خیل: کوہاٹ شہر کے معروف ومعزز خاندانوں میں میاں خیل خاندان کے لوگ کوہاٹ کی معروف ترین بزرگ اور ولیاللہ شخصیت حضرت حاجی بہادر باباؒ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کوہاٹ کے جملہ باشندے انہیں حضرت حاجی بہادر باباؒ کی اولاد مانتے ہوئے ان کے خاندانی وقار کے استحقاق کو تسلیم کرتے

ہیں۔ میاں کا لفظ بزرگ، عالم فاضل اور زہد و تقویٰ کی حامل شخصیت کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ چونکہ حضرت حاجی بہادر باباؒ بہر طور اپنے زہد و تقویٰ اور بزرگان سلف کی شان و شوکت کے حامل ہیں۔ اس لئے ان کے لئے میاں کا لقب مستعمل رہا اور پھر ان کی اولاد کے لئے میاں خیل کا لفظ معروف ہو گیا۔ میاں خیل کے نام پر کوہاٹ کے اندرون شہر ایک محلہ میاں خیل بہت مشہور ہے اور اسی محلہ میں حضرت حاجی بہادر باباؒ کا مزار بھی ہے۔

میاں خیل خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ حضرت حاجی بہادر باباؒ کی اولاد ہونے کے ناطے سید بھی لکھتے ہیں یہ سید کا لفظ نام سے پہلے لکھتے ہیں اور نام کے بعد خاندانی وجاہت کی وجہ سے شاہ بھی لکھتے ہیں۔

حضرت حاجی بہادر باباؒ کی کوہاٹ آمد: جب مغل فرمانروا شاہجہاں کے فرمان کے مطابق حضرت سید آدم بنوری اپنے خلفاء خاص کے ساتھ ہندوستان چھوڑ کے عازم حرمین شریفین ہوئے تو اس سفر میں دیگر خلفاء کے ساتھ ساتھ ان کے خلیفہ خاص حضرت حاجی بہادر باباؒ بھی تھے۔ حضرت سید آدم بنوری زیارت حرمین شریفین کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے اور اسی مقام پر سید آدم بنوری نے آپؒ کو بہادر کا خطاب دیا۔ حضرت حاجی بہادر باباؒ کا اصلی نام شیخ عبداللہ تھا مگر حضرت شیخ عبداللہ المعروف حاجی بہادرؒ کو اپنے پیر و مرشد سے انتہا کی عقیدت و وابستگی کو تھی اور پھر حرمین شیریفین کے سفر میں اس عقیدت کا اظہار خلوص و محبت سے ہوا تو وہاں آپ کو اپنے پیر و مرشد کی طرف سے مقام عالیہ دیا گیا اور بہادر کا خطاب ملا۔ تب سے آپ شیخ عبداللہ کے بجائے حضرت حاجی بہادر باباؒ کے نام سے موسوم ہوئے اور حضرت حاجی بہادر باباؒ اس خطاب پر بہت نازاں ہوتے تھے کیونکہ یہ خطاب انہیں روضہء رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے پیر و مرشد حضرت آدم بنوریؒ نے دیا۔

حضرت سید آدم بنوری کے وصال کے چند برسوں کے بعد حضرت حاجی بہادر بابا اپنے پیر و مرشد کے حکم کے تحت حضرت نبوری کی کم سن اولاد کو لے کر کوہاٹ تشریف لے آئے اور تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں پر مستقل سکونت اختیار کر لی تو حاجی بہادر باباؒ کوہاٹی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

حضرت حاجی بہادر باباؒ نے 1099 ہجری میں وصال فرمایا اور یہیں محلہ میاں خیل میں مدفون ہیں۔

کوہاٹ میں ان کے علاوہ گیلانی سادات، بخاری سادات اور قاضی بھی آباد ہیں۔ ان کے بارے میں تفصیلات پہلے دی جا چکی ہیں۔

پراچہ خاندان: پراچہ کوہاٹ کا معروف ترین خاندان ہے اور اس سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اپنے نام کے ساتھ پراچہ لکھتا ہے۔ تحقیق بسیار کے باوجود یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کوہاٹ میں کب آ کر آباد ہوئے تاہم اس بات پر اہل دانش متفق ہیں کہ یہ تاجر پیشہ خاندان ہے اور اس خاندان کے لوگ تجارت پر چھائے رہے ہیں۔ پروفیسر پریشان خٹک کا کہنا ہے کہ کوہاٹ کی تجارت اس خاندان کے لوگوں میں رہی ہے۔ ایک عام تاثر یہ بھی ہے کہ شروع میں خاندان کے لوگ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بزرگان اسلام کی تبلیغ کی بدولت اسلامی عقائد و سماج سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور پھر اسلام پر پوری استقامت دکھائی۔ دریائے سندھ سے پار بھی مکھڈ میں پراچہ خاندان کے لوگ رہتے ہیں مگر کوہاٹ کے پراچہ خاندان کے لوگوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ بعض زبانی روایت کے مطابق پراچہ خاندان کے لوگ کپڑے کی تجارت کرنے والے لوگ تھے چونکہ پارچہ کپڑے کو کہتے ہیں اور جو لوگ یہ تجارت کرتے تھے اس پارچہ کی نسبت سے پراچہ ہو گئے یعنی پارچہ جات کی تجارت کرنے والے لوگ۔

کیانی: کوہاٹ کا کیانی خاندان بہت ہی مشہور اور قابل عزت سمجھا جاتا ہے۔ تعلق شیعہ مسلک سے ہے۔ کوہاٹ سے باہر ایک مضافاتی بستی شاہ پوران کا بنیادی مسکن ہے اس خاندان کے لوگ ایران کے صوبہ کیان سے آئے تھے۔ پاکستان کے دیگر مختلف شہروں کی طرح کوہاٹ میں بھی یہ خاندان آباد ہو گیا۔ جسٹس محمد رستم کیانی چیف جسٹس اس خاندان کی ایک نامور شخصیت تھے۔ انصاف پسندی اور ادب نوازی کی وجہ سے انہوں نے بڑا نام پیدا کیا رستم کیانی مرحوم کو اہلیان کوہاٹ بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ دیکھتے تھے۔

شہزادگانِ کوہاٹ: کوہاٹ میں ایک محلہ، محلہ شہزادگان کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ماضی سے تعلق رکھنے والے شہزادگان کی عالی شان اور پرشکوہ عمارتیں اور حویلیاں موجود ہیں۔ شہزادگان کوہاٹ کا یہ محلہ کوہاٹ شہر کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ ایک مختصر سا خاندان تھا۔ اس خاندان کا تعلق احمد شاہ ابدالی کے اخلاف میں سے ہے۔ انہی میں سے ایک خاندان کوہاٹ میں سکونت پذیر ہوا اور یہاں اپنے حسب مرتبہ عالیشان عمارتیں اور حویلیاں تعمیر کر کے رہائش پذیر ہوا۔ اس خاندان کے تیمور شاہ جو کہ احمد شاہ ابدالی کے فرزند تھے نے بہت شہرت حاصل کی وہ کثیر الازواج اور کثیر الاولاد بادشاہ تھا۔ اس کے خاندان میں سے

شہزادہ سلطان خادر کے بیٹے شہزاد سلطان اسد کو سکھوں کے دور میں اس عہد کی مالیت کے مطابق 2300 کی جاگیر عطا ہوئی۔

سب سے پہلے شہزادہ جمہور جان نے کوہاٹ قلعہ کے گردواح میں سکونت اختیار کی بعدازاں بنوری بازار کے علاقے میں رہنے لگے۔ جن کا انتقال 63 برس کی عمر میں 1870ء میں ہوا اور موضع شاہ پور میں شہزادگان کوہاٹ کے قبرستان میں مدفون ہیں جیسا کہ اوپر تذکرہ ہوا ہے کہ تیمور شاہ ولد احمد شاہ ابدالی کثیر الاولاد بادشاہ تھے ان کے دو پوتے شہزاد ہاشم اور شہزادہ اسد تھے۔ کوہاٹ کے محلہ شہزادگان میں انہیں کی اولاد اپنی حویلیاں اور عمارتیاں بنا کر رہے ہیں۔

بہادر خیل: یہ ایک ذیلی قبیلہ ہے جس کا تعلق خٹک قبیلے سے ہے۔ کوہاٹ کی نمک کی کانوں کے پاس رہتا تھا۔ انگریزوں نے جب نمک کی کانوں پر قبضہ کیا تو انہوں نے ایک نئی سڑک بنائی جو کہ بہادر خیل اور سورڈگ سے ہو کر نکلتی تھی چنانچہ اس سڑک کے اخراجات پورے کرنے کے لئے انگریز سرکار نے نمک کا محصول بڑھا دیا جس کی وجہ سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور وہ بغاوت پر اتر آئے تو اس اشتعال کی آگ کو سرد کرنے کیلئے سرکار نے لیفٹننٹ پولاک کی سرکردگی میں ایک بھاری توپ خانہ اور فوج بھیج دی۔ قبیلے کے لوگوں اور فوج کے درمیان خوب لڑائی ہوئی اور انگریز پسپا ہو کر لتمر کی طرف بھاگ گئے کئی دنوں تک فریقین کے درمیان جنگ جاری رہی جس کے نتیجے میں محصول میں بھاری کمی کی۔ بعد میں 1850ء میں بہادر خیلیوں نے دوبارہ طوطلکئی کے نواح میں انگریز لیوی کے دستوں پر حملہ کر دیا اور نمک کی کانوں پر قبضہ کر لیا یہ قبیلہ وقتاً فوقتاً نمک کی کانوں پر قبضہ کرتا رہا اور انگریزوں سے نبرد آزما رہا۔

بوستی خیل: درہ آدم خیل کے آفریدیوں میں سے یہ ایک ایسا ذیلی آدم خیل کا قبیلہ ہے جس سے اس علاقے کے اہم اور نامور ہیرو عجب خان آفریدی کا تعلق ہے۔ اس قبیلے کی اہمیت اور خصوصیت عجب خان آفریدی کی داستان سے جڑی ہوئی ہے یہ کوہاٹ کے اہم قبیلوں میں شمار ہوتا ہے۔

زائی مشت: ٹل اور پارہ چنار کے درمیان ایک ذیلی قبیلہ زائی مشت بھی ہے جسے تاریخ کوہاٹ لکھنے والوں نے خصوصیت کے ساتھ تاریخ کوہاٹ کا حصہ بنایا ہے۔ یہ وہ بہادر قبیلہ ہے جس کے نہتے مرد و زن نے بڑی بے جگری کے ساتھ انگریز لشکر کا مقابلہ کیا اور انگریزوں کے ہاتھوں بہت سا جانی اور مالی نقصان اٹھا کر بھی اپنی حریت پسندی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا یہ حالات و واقعات کی ستم ظریفی کا شکار رہنے والا قبیلہ ہے۔

مفتی یا میاں: کوہاٹ کے علاقہ ٹیری کے مقام پر ایک خاندان ایسا بھی آباد ہے جس کے اسلاف کا تعلق حضرت رحمکار المعروف کاکا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی نسل سے ہے۔ اسی خاندان کے لوگ مفتی کے نام سے آباد ہیں اور اس خاندان کے لوگ اپنے نام میں مفتی لکھتے ہیں۔

جنگل خیل: کوہاٹ شہر سے باہر بجانب شمال جنگل خیل وسیع و عریض علاقہ ہے اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہ علاقہ کوہاٹ گیلانی سادات کا مسکن ہے جس وجہ سے اس علاقے کو شہرت حاصل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگل خیل میں بہت ہی قدیم قدرتی چشمے ہیں جو تا حال جاری ہیں۔

جواکئی: درہ کوہاٹ کے مشرق کی جانب بسنے والے لوگ جواکئی یا ڑواکئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے قبائل ہیں جو کہ آدم خیل قبیلے کا ذیلی قبیلہ ہے یہاں پر سڑک بنانے کے قضیئے کے نتیجے میں انگریزوں اور جواکئی کے باشندوں کے درمیان 1877ء میں معرکہ آرائی ہوتی تھی جس کی وجہ سے اس مقام اور قبیلے کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔

کوہاٹ کی ادبی و ثقافتی شخصیات

احمد فراز: احمد فراز نے اپنا ادبی نام 1942ء میں منتخب کیا اور تب سے اب تک یہی نام دنیا بھر میں ان کی پہچان ہے۔ احمد فراز کا ادبی سفر اردو سبھا کی ادبی مجلسوں سے شروع ہوا تھا جو کہ پشاور کے معروف اور قد آور ادبی حلقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص ادب شناس نے قائم کی تھی۔ یہ وہ دور تھا کہ بہت سے ماضی کے ادبی فن شناس اپنے ادب پاروں کو اسی مجلس اردو سبھا کے حوالے سے منظر عام پر لے کر آتے تھے۔ اس وقت احمد فراز کا قلمی نام شرر برقی تھا جبکہ بعد میں انہوں نے اپنے ادبی میلانات کو احمد فراز کے ہلکے پھلکے نام سے جوڑ دیا۔ فراز ادبی اور شعری تخلص رکھا۔ احمد فراز کوہاٹ میں ادبی ذوق کے حامل گھرانے میں 12 جنوری 1931ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کوہاٹ کے ممتاز شاعروں میں اپنا مقام رکھتے تھے جنہیں آغا برق کے نام سے معروف مقام حاصل ہوا۔ برق ان کا تخلص تھا۔ احمد فراز نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول کوہاٹ میں حاصل کی جبکہ میٹرک پشاور سے کیا

اور میٹرک کے بعد ایڈورڈ کالج پشاور میں داخلہ لیا اور یہیں سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پشاور یونیورسٹی سے علی الترتیب ایم اے اردو اور ایم اے فارسی کے امتحانات پاس کئے۔ ابتداء میں سرکاری ملازمت ریڈیو پاکستان سے شروع کی وہ تدریس کے شعبہ سے بھی منسلک رہے اور پھر ممتاز سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

پروفیسر پریشان خٹک: پروفیسر پریشان خٹک کا تعلق کوہاٹ ریجن کے ضلع کرک میں بسنے والے معتبر پٹھان قبیلے خٹک سے ہے۔ ان کے والد مرحوم کا نام ملک حسن خان ہے۔ پریشان خٹک کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پریشان خٹک کو جن ادبی، تاریخی، ثقافتی اور قلمی صلاحیتوں سے نوازا ہے ان صلاحیتوں کو انہوں نے ہمیشہ اپنی منکسرانہ خو اور طبیعت سے جوڑے رکھا۔ ان کے بڑے بھائی پوردل خان خٹک خوش طبعی اور ملنساری و صحبت برداری میں یکساں مقام و منزل پر نظر آتے ہیں۔ آپ ممتاز سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

جسٹس محمد رستم کیانی (مرحوم): محمد رستم کیانی مرحوم کا تعلق کوہاٹ سے دو میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں شاہ پور سے ہے جو کوہاٹ کے کیانی خاندان کی رہائش گاہوں پر مشتمل ہے جہاں 8 اکتوبر 1902ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالصمد خان تھا۔ ابتدائی تعلیم کوہاٹ میں حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے جہاں ایڈورڈ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے جہاں انہوں نے ٹرینٹی کالج کیمبرج سے انگریزی ادبیات میں ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1927ء میں انڈین سول سروس سے منسلک ہوگئے بعد میں عدلیہ سے وابستہ ہوگئے اور ڈسٹرکٹ سیشن جج مقرر ہوئے۔ 19 اپریل 1949ء کو آپ لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ 12 اپریل 1958ء میں آپ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

قاضی فطرت قریشی: کوہاٹ کے ایک معتبر اور اہل علم و فضل خاندان قاضی سے تعلق رکھنے والے قاضی فطرت قریشی ایک بزرگ اور ادبی حلقوں کی نامور شخصیت کے حامل ہیں۔ یہ منفرد قادرالکلام شاعر، ادیب ہیں۔ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا اور اپنی شاعری میں تحریک آزدی کے تمام واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی شاعری کا آغاز 1940ء سے ہوتا ہے کوہاٹ کے ادیب و شاعر انہیں ایک معتبر استاد کا درجہ دیتے ہیں۔ آپ پاکستان کی تشکیل سے پہلے اور بعد میں مختلف قومی سطح کے اہم اخبارات کی رپورٹنگ اور رسالوں کی ادارت سے بھی منسلک رہے۔

قاسم علی خان آفریدی: آپ اردو، پشتو اور فارسی کے شاعر تھے۔ درہ کوہاٹ کے گاؤں اخور سے ان کے اباواجداد کا تعلق تھا۔ فارغ بخاری کی تحقیق کے مطابق 1763ء میں پیدا ہوئے جبکہ شاہ محمد مدنی کی ''پشتو زبان وادب کی تاریخ، ایک جائزہ'' کے مطابق 1769ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا قبیلہ آدم خیل ہے۔ آباء واجداد نے اپنے آبائی گاؤں اخور درہ آدم خیل سے نقل مکانی کی اور ہندوستان چلے گئے کچھ عرصہ دہلی اور جے پور میں قیام کے بعد فرخ آباد چلے گئے اور وہیں پر مستقل قیام پذیر ہوگئے اور اسی مقام پر قاسم علی خان پیدا ہوئے اور خالصۃً ہندوستانی ماحول میں پرورش پائی۔ اس لئے اردو پر مقامی اثرات کی وجہ سے کامل دسترس تھی مگر نسلاً چونکہ پٹھان طبقے سے اور غالباً گھریلو ماحول پشتون زبان وثقافت کے اثر کے نیچے پروان چڑھا اس لئے انہوں نے آباؤاجداد کے موروثی ماحول سے اپنے آپ کو جوڑے رکھا جس کی وجہ سے وہ پشتو زبان بھی بلاتکلف اور روانی کے ساتھ بولتے تھے اور ادبی وشعری کمال میں بھی پشتو زبان کو شامل رکھا اور اردو کے علاوہ پشتو کو بھی شاعری کا وسیلہ بنائے رکھا نیز جس ماحول میں انہوں نے بچپن اور جوانی گزاری ان دنوں ماحول میں سرکاری طور پر فارسی کا بڑا عمل دخل تھا اس لئے انہوں نے فارسی میں بھی شاعری کی۔

ازھرالقادری: ازھرالقادری کوہاٹ کے ایک علمی فضیلت کے حامل شاعر تھے۔ ان کا اصلی نام عبدالرحمن ہے دینی علوم پر دسترس رکھنے کی بناء پر مولوی عبدالرحمن کے طور پر اہلیان کوہاٹ کے لئے احترام وتعظیم کے مستحق سمجھے گئے۔ شاعری میں ان کا تخلص ازھر ہے جس کا مفہوم معنی کلی کے ہے چونکہ سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے اس لئے تخلص سے آگے القادری رقم کرتے تھے۔ آپ 1884ء میں کوہاٹ میں پیدا ہوئے اور کوہاٹ ہی میں وفات پائی۔

محمد جان عاطف: کوہاٹ کے فنون لطیفہ کے شہسواروں میں محمد جان عاطف کا قابل التفات نام ہے۔ محمد جان عاطف عصر حاضر کے ادیبوں، اہل قلم اور شاعروں میں بوجوہ ممتاز مقام کے حامل ہیں ان کا زیادہ تر کلام اردو میں ہے مگر ہندکو میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ آپ ینگ رائٹرز ایکویٹی کوہاٹ کے بانی ہیں اور کوہاٹ آرٹس کونسل کے ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ محمد جان عاطف کوہاٹ میں 1955ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی پانچ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

سید امتیاز حسین گیلانی: امتیاز حسین گیلانی 1947ء کو کوہاٹ کے گیلانی سادات کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی سید امیر حسین گیلانی

ہے جن کا شمار کوہاٹ کے گیلانی سادات کے بزرگوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ صوبہ سرحد کے وزیر ثقافت وکھیل اور تعلیم وسیاحت بھی رہے ہیں۔

پیر مطیع اللہ: پشتو اور فارسی کے شاعر پیر مطیع اللہ کا مزار کوہاٹ میں پیر خیل جنگل خیل میں ہے۔ ان کا دور احمد شاہ ابدالی کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کے عہد میں پیر مطیع اللہ بقید حیات تھے۔ پیر خیل کے عمر رسیدہ لوگوں میں پیر مطیع اللہ کے اشعار پڑھنے کا رواج عام ہے اور یہ سلسلہ سینہ بسینہ چل رہا ہے۔ قیاس کیا گیا ہے کہ پیر مطیع اللہ کا سن وفات اٹھارویں صدی کا اوائیل کا عرصہ ہے۔

آغا برق کوہاٹی: کوہاٹ کے حضرت حاجی بہادر باباؒ کی اولاد سے ان کا تعلق ہے ان کا اصلی نام سید احمد شاہ ہے اور شاعرانہ تخلص برق ہے انہیں برق کوہاٹی بھی کہا جاتا تھا۔ کوہاٹ میں 1897ء میں پیدا ہوئے اور یہیں پر تعلیم حاصل۔ کی ملازمت کے سلسلے میں پشاور مقیم رہے اس لئے پشاور کے ادبی حلقوں میں بھی بڑے مقبول شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ شاعری میں آپ مذاق نامور استاد شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگرد رہے ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن، غزل، رباعی میں طبع آزمائی کی مگر غزل کی طرف طبعی میلان تھا اس لئے عام طور سے انہیں غزل گو شاعر ہی کہا گیا۔ پشاور سے کوہاٹ واپسی ہوئی تو کوہاٹ کی ادبی محفلوں اور مجلسوں میں ان کی شمولیت سے ایک تازگی پیدا ہوئی۔ مرحوم آغا برق اردو کے علاوہ فارسی میں سخن طرازی کرتے تھے "گلبانگ پریشاں" کے عنوان سے فارسی کلام کا مجموعہ طباعت ہو چکا ہے۔

آغا برق کی زندگی کے آخری ایام اپنے بیٹے سید محمود شاہ کے ہاں لندن میں گزرے، وہیں بیمار ہوئے اور پھر 1980ء میں وہیں پر انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد ان کا جسد خاکی کوہاٹ لایا گیا اور حضرت حاجی بہادر باباؒ کے مقبرے میں انہیں دفن کیا گیا۔

میر عبدالصمد خان: میر عبدالصمد کوہاٹ سے متصل ایک گاؤں موضع شیخان میں 1916ء میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام میر سمندر رکھا بعد میں میر عبدالصمد کے نام سے موسوم ہوئے۔ آپ نے 26 ستمبر 1983ء میں وفات پائی۔ آپ کی کتاب "خوشحال واقبال" پشتو اور اردو دان حلقوں میں یکساں مقبول ہے۔

آزر سرحدی: کوہاٹ کی نامور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات میں آزر سرحدی کا نام معتبر ہے۔ اردو، فارسی، پشتو اور انگریزی زبانوں پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ نظم نثر بلا تکلف لکھنے کا قدرتی طور پر ملکہ رکھتے تھے کوہاٹ کے علمی اور ادبی حلقوں کے سفر میں ہمیشہ شامل رہے۔ حضرت سیماب اکبر آبادی کے تلامیذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ 1935ء سے تسلسل سے شعر کہنے لگے تھے۔ 1942ء میں برصغیر پاک وہند کی معروف ترین اور مقبول عوام فلم "جگنو" کے لئے چند گیت لکھے جنہیں لازوال شہرت حاصل ہوئی ان کا اصلی نام وزیر محمد تھا مگر ادبی اور فلمی دنیا میں آزر سرحد کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے 6 اپریل 1972ء میں وفات پائی۔

عزیز اختر وارثی: عزیز اختر وارثی 1916ء میں کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کوہاٹ کے علمی اور ادبی میدان میں نمایاں حیثیت حاصل کی اور شعر وسخن کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی مگر غزل میں ایک منفرد مقام پیدا ہوا۔ انہوں نے کوہاٹ میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی اور پھر اس حوالے سے صوبہ سرحد کے جنوبی پہاڑی علاقوں میں اردو کے ارتقاء کے لئے سرگرم عمل رہے اردو کے ساتھ انہیں والہانہ لگاؤ تھا وہ مشاعرے میں اپنا کلام متاثر کن انداز میں ترنم سے سناتے تھے اور حاضرین سے داد تحسین وصول کرتے تھے۔ عزیز اختر وارثی نے 21 جنوری 1980ء میں وفات پائی۔

احمد پراچہ: کوہاٹ کے پراچہ خاندان کے ممتاز اہل قلم اور ادیب ودانشور ہیں۔ ادبی اور فکری حلقوں میں ان کی پہچان ایک محقق اور مورخ کی حیثیت سے ہے۔ ان کا نمایاں کارنامہ تاریخ کوہاٹ ہے جس میں کوہاٹ سے متعلق تاریخی دستاویزات کو ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ انہوں نے علمی اور ادبی زندگی کے اہم اور قابل ذکر جو رخ اپنائے ہیں ان میں افسانہ نگاری، ناول نویسی، تذکرہ، تبصرہ نویسی اور شخصیت نگاری جیسے اہم ادبی میلانات ہیں۔ کوہاٹ میں انہیں پہلا ناول نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے ان کے پہلے ناول کا نام "خلش" ہے۔

ان کی ایک نثری کتاب کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء ایسی کاوش ہے جس پر انہیں پاکستان رائٹر گلڈ کا 84-1985ء ادبی ایوارڈ ملا۔

پردل خان خٹک: علمی وادبی اور قلمی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بناء پر ہمیشہ احترام وعزت کے مستحق، سمجھے گئے ہیں۔ آپ کا تعلق ضلع کرک کے گاؤں غنڈئی سے ہے۔ انہوں نے پشتو کی نامور ادبی شخصیات ومحققین کے ساتھ مل کر پشتو اور نعت گوئی کی ترتیب وتدوین میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی سے ان کی وابستگی ان کے ادبی اور لغوی سفر کی علامت ہے۔ بہت عرصہ تک اہم سرکاری منصوبوں پر بھی فائز رہے اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد قلم کتاب سے رشتہ جوڑ لیا۔ پشتو

ادب میں متعدد تحقیقی اور تنقیدی مضامین حوالہ اشاعت ہو چکے ہیں اور اشتراک زبان کے حوالے سے ''اردو اور ترکی کے مشترک الفاظ'' کے عنوان سے ان کی کتاب چھپ چکی ہے علاوہ ازیں پشتو میں، پشتو اکیڈیمی کے ڈائریکٹر مولانا عبدالقادر مرحوم کے خطوط پر مشتمل ان کی کتاب چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔

نور شاہ جہان انور: آپ پشتو کے اعلیٰ پائے کے شاعر اور اچھے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔ فارسی پر بھی آپ کو کمال قدرت حاصل ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کے بعض اشعار اور ان کی حکایات کو پشتو نثر میں ترجمہ کر کے ''گلدستہ رومی'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپوائی ہے جس پر اباسین آرٹس کونسل پشاور کی جانب سے پہلا ادبی انعام ملا تھا یہ کتاب 1969ء میں شائع ہوئی۔ نور شاہ جہاں اخور کا تعلق ضلع کرک کے گاؤں گنڈیری سے ہے۔ 1933ء میں اسی گاؤں میں مولوی شیخ حسن کے ہاں پیدا ہوئے۔ پشتو آنرز کا امتحان پاس کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم بی اے اور ایم اے کے امتحانات پاس کئے۔ ایم اے پشتو میں اعزازی امتحان پاس کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا اور صوبہ سرحد کے مختلف کالجوں میں لیکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

روایتی پکوان

یہ ضلع قدیم زمانے میں پشاور کا حصہ رہا ہے اور بہت سی باتوں میں پشاور کی تہذیبی اور ثقافتی حیات سے جڑا ہوا ہے اور یہاں کے کھانے کے طور طریقوں میں پشاور کی تہذیبی زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور رواجی کھانے، ان کے اوقات اور خاص مواقع کے پکوان تقریباً یکساں ہیں۔

پیشے دستکاریاں، ہنر اور فنون

نمک کے کان کن: کوہاٹ کے وہ جنوبی پہاڑی علاقے جن پر خٹک قوم کے لوگ قابض ہیں۔ یہاں نمک کے پہاڑ بکثرت ہیں جو کہ قدرتی معدنی دولت ہے۔ یہ نمک کے پہاڑ جن اہم مقامات پر ہیں ان میں جٹہ، مالکین، نزی، کرک، بہادر خیل، مترلے، بربرہ، اسپینہ، کڑوری، کرڑ، سونگ اور شادرنگ قابل ذکر ہیں۔ ان نمک کے پہاڑوں کو کھود کر نمک کی کانیں بنائی گئی ہیں جن سے روزانہ ہزاروں ٹن وزن کا نمک نکالا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ سلسلہ شروع ہے۔ یہاں کے رہنے والے مزدور نمک کی کانوں کے تجربہ کار ہیں اور وہ خاص مہارت کے ساتھ نمک کے ڈلے نکال کر زمانہ قدیم میں خچروں اور گدھوں کے ذریعے دیگر شہروں میں برآمد کرتے تھے۔ یہاں اکثر نمک کی کانوں میں کام کرنے والے خٹک قبیلہ لوگ کے مزدور ہیں ان کا یہی پیشہ ہے ان نمک کے پہاڑوں کے مالک خٹک قبیلہ کے نواب ہیں اور نمک کے حاصلات کی رقم ان ہی کے پاس جمع ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ زمانہ قدیم سے جاری ہے۔

گھریلو دستکاریاں: کوہاٹ شہر میں اب سے کچھ عرصہ قبل تک گھریلو دستکاریوں میں اونی اور سوتی چادریں اور قالین تیار کی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں جنگل خیل کے علاقے میں کھڈیوں پر دستکار لوگ خوبصورت پٹو اور اونی اور سوتی چادریں تیار کرتے تھے اور یہ مصنوعات کوہاٹ سے باہر دوسرے علاقوں تک پہنچتی تھیں۔ گھریلو خواتین بھی اس قسم کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔

چپلی سازی: کوہاٹ کی چپلی بہت مشہور رہی ہے۔ اب بھی کوہاٹ میں تیار ہونے والی چپلی کا بڑا چرچا ہے اور مضافات و دیگر اضلاع کے لوگ کوہاٹ کی یہ چپلی بڑے شوق سے پاؤں میں پہنتے ہیں۔ یہ چپلی چمڑے سے تیار ہوتی اور چپلی کے دستکار بند اور ہوادار دونوں قسم کی چپلی سازی میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ہوادار چپلی خالص چمڑے کی ہوتی اور اوپر ریشم کے دھاگے کا ایک سرخ یا سبز پھول بنا کر چسپاں کر دیتے تھے۔

مزری کا کام: کوہاٹ میں کھجور کے درخت کی ٹہنیوں کے سرکنڈوں کو خشک کر کے اس سے مختلف قسم کی پچھیاں، ٹوکریاں، چھکیریں اور دیگر متعدد اشیاء بناتے ہیں۔ اب تک یہ کام کوہاٹ کی دستکاریوں میں غیر معمولی نوعیت کا ہے۔

عرس اور میلے

انگار خوردنی: ہنگو میں محرم الحرام کے دسویں روز درگاہ درعباس میں ایک خاص قوم کی سوز اور مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ درعباس میں خاص مقام پر لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی جاتی ہیں جس کے گرد مقامی شیعہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور مخصوص آواز میں مرثیہ خوانی کرتے ہیں' مرثیہ خوانی کی یہ مجلس ایک مذہبی کرامت کا منظر پیش کرتی ہے۔ مرثیہ خواں آہستہ آہستہ آواز کو بلند کرتے ہیں اور پھر جب مجلس میں شریک مرثیہ خواں ماتم میں خوب محو ہو جاتے ہیں تو آگ کے روشن الاؤ میں سے

دہکتے انگارے اٹھا کر اپنے دامن میں ڈالتے ہیں اور پھر محویت کی حالت میں ان دہکتے ہوئے انگارے کو منہ میں ڈال کر چبانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ منظر دیکھنے کیلئے دور دراز سے لوگ آئے ہوتے ہیں۔ یہ انگار خورنی اس حد تک ہوتی ہے کہ آگ کے الاؤ میں سے ایک بھی انگارہ باقی نہیں رہتا۔ مجلس ہر سال عاشور محرم کے روز ہوتی ہے۔

عرس حضرت حاجی بہادر باباؒ: کوہاٹ میں سولہ دیں صدی عیسوی کے معروف و مشہور بزرگ حضرت حاجی عبداللہ المعروف حاجی بہادر باباؒ کا مزار ہے۔ حضرت حاجی بہادر باباؒ کوہاٹی نے جب 6 رجب 1096ء ہجری بمطابق 6 مئی 1688ء میں وصال فرمایا تھا۔ تب سے ہر سال ان کے یوم وصال کے موقع پر عرس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مزار سے متصل مسجد میں علماء کرام تقاریر کرتے ہیں اور حمد و نعت کی محافل منعقد ہوتی ہیں اور عرس میں شریک لوگ ذکر و اذکار کرتے ہیں۔

یہ کوہاٹ کا بہت قدیمی مزار ہے جو کہ پنڈی خوشحال گڑھ روڈ پر کیڈٹ کالج سے آگے بائیں طرف شمال کی جانب پہاڑی سلسلوں میں مزار اللہ داد باباؒ کے نام سے مشہور ہے اور لوگ دور دراز سے اس مزار پر حاضری دینے کے لئے آتے ہیں یہ مزار مغلیہ دور کی طرز تعمیر کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس مزار سے متعلق قدیم زمانہ سے تا زمانہ یہ علامتی بات ہے کہ مزار کے آس پاس سانپوں کی بہتات ہے اور ذرا سی بھی بے احتیاطی سے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاتا کہ سانپ ڈس لے، مگر مزار سے متعلق یہ کرامت بھی بہ تسلسل چلی آ رہی ہے کہ جس شخص کو بھی سانپ ڈس لے مزار کے احاطے میں لا کر لٹا دیا جاتا ہے اور مزار کے مجاور لوگ متاثرہ شخص کو دم کرتے ہیں تو سانپ کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مضافات اور دور دراز سے بھی سانپ کے ڈسے اشخاص کو یہاں خصوصیت کہ ساتھ لایا جاتا ہے اور مجاور دم کرتے ہیں تو بحکم خدا لوگ تندرست ہو جاتے ہیں۔

مزار سے باہر بھیڑ، بکریاں اور گائے وغیرہ بکثرت چرتی ہیں اور اکثر ان جانوروں کو بھی سانپ ڈس لیتے ہیں روایت ہے کہ ان ڈسے ہوئے جانوروں کو بھی مزار کے احاطے میں لا کر مزار کے گرد طواف کرواتے ہیں تو سانپ کی زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

عرس گھمکول شریف: کوہاٹ شہر سے باہر شمال کی جانب پہاڑی سلسلہ کے دامن میں ایک گاؤں گھمکول شریف ہے جسے اب ایک بزرگ المعروف زندہ پیر کے نام سے منسوب کر کے گھمکول شریف کہا جاتا ہے۔ یہاں پر 1952ء میں پیر صاحب آئے اور اس بیابان میں عبادت شروع کر دی۔ ان سے بہت سے لوگ فیض یاب ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ ان کا وصال 4 ذوالحجہ بروز سوموار بمطابق 22 مارچ 1999ء میں اسی مقام پر ہوا اور انہیں یہی دفن کر دیا گیا۔ ہر سال مارچ کے آخری ہفتہ میں جمعۃ المبارک کے دن سے عرس کی تقریبات شروع ہو جاتی ہیں جو تواتر تک سہ روزہ عرس کے طور پر ختم ہوتی ہیں۔ قرآن خوانی اور حمد و نعت کی محافل کے علاوہ علماء کرام مواعظ حسنہ کرتے ہیں اور زندہ پیر کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

زندہ پیر کا تعلق ہزارہ ایبٹ آباد کے موضع جنگل خیل سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد غزنی سے آئے تھے۔ اخون خیل قبیلہ سے تعلق تھا۔ ان کے والد شہاب الدین غوری کے مرشد تھے۔ شیخ بھانڈی میں آبائی گھر موجود ہے۔ آرمی میں ملازم ہوئے۔ رغبت فقیرانہ زندگی کی طرف تھی اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ روایت ہے کہ آپ 1952ء میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم ہوا کہ تبلیغ دین کے لئے کوہاٹ چلے جائیں چنانچہ حکم کے مطابق کوہاٹ کے اس پہاڑی بیابان میں آ کر گوشہ نشین ہوئے۔ اور پھر یہیں پر ہی اللہ نے فضل کیا یہ جنگل منگل ہو گیا۔ ان کی حیات میں یہاں پر بڑا اجتماع اکتوبر کے مہینے میں ہوتا تھا۔

تعمیرات

شہزادگان کوہاٹ کے محلات: کوہاٹ شہر میں محلہ شہزادگان کوہاٹ کے شہزادوں کی حویلیوں کی وجہ سے مشہور محلہ ہے۔ یہ عمارتیں بڑی پر شکوہ اور تہذیبی ورثہ کی حامل ہیں۔ کوہاٹ شہر کے جنوب مغرب کی جانب شہزادہ اسد جان نے 72 ہزار کنال کی اراضی پر یہ محلات اور باغات تعمیر کروائے تھے جو کہ عہد حاضر میں زمانہ گذشتہ کی ایک تہذیبی اور ثقافتی یادگار ہیں۔ ان کے محلات پہاڑی پتھروں کو تراش خراش کر بنائے گئے ہیں۔

کوہاٹ میونسپل کمیٹی کی عمارت: کوہاٹ ہنگو روڈ پر کوہاٹ کی قدیم میونسپل کمیٹی کی عمارت ہے جو کہ قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ یہ سرخ اینٹوں کی دو منزلہ عمارت ہے۔ موجودہ عہد میں اس عمارت میں کئی سرکاری دفاتر ہیں۔ اوپر کی منزل جناح میونسپل لائبریری ہے۔ یہ عمارت کوہاٹ کی قدیم عمارت میں سے ایک ہے۔ اس عمارت میں کوہاٹ آرٹس کونسل کا بھی دفتر ہے جہاں کوہاٹ کے اہل قلم اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے اہل ہنر اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہیں پر کوہاٹ کے شعراء مشاعرے بھی منعقد کرتے ہیں۔

کوہاٹ کوتل ٹنل: یہ جدید تعمیر کی شاہکار سرنگ ہے جو کوہاٹ اور پشاور کو آپس میں ملاتی ہے اور کوہاٹ شہر سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ کوہاٹ کے دشوار گزار پہاڑی سلسلے کوتل کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ اس کی لمبائی یعنی پونے دو کلومیٹر ہے۔ یہ سرنگ کوتل پہاڑیوں کے سلسلے میں ہے جسے مقامی لوگ چرسی روڈ کہتے۔

درعباس: ہنگو میں ایک درگاہ ہے جسے لوگ درعباس کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ یہاں ایک متبرک پتھر ہے جو حضرت عباس علمبردار کی یاد میں ہے۔ اس سے متعلق داستان کچھ یہ ہے کہ یہاں آس پاس کے دیہات کی کچھ لڑکیاں ایک شادی میں شرکت کے لئے جارہی تھیں کہ یہاں اچانک کچھ لٹیرے آ گئے اور ان خواتین کو لوٹنے کے لیے آگے بڑھے لڑکیوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے یا عباس مدد۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی اللہ نے ان کی عصمت کی حفاظت اس طرح کی کہ ایک گھڑ سوار نمودار ہوا اور لیٹروں کو قتل کر دیا۔ عورتیں اس منظر کر دیکھ کر بے ہوش ہوگئیں۔ خواتین کو جب ہوش آیا تو انہوں نے یہ واقعہ لوگوں کو سنایا۔ اسی وقت سے یہ پتھر یہاں پر رکھ دیا گیا جسے حضرت عباس علمبردار کے نام سے منسوب کیا گیا اور درگاہ کو درعباس کہا جانے لگا۔ اس پورے احاطے کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں شیعہ مسلک کے علاوہ سنی لوگ بھی آ کر منتیں مانگتے ہیں یہاں پر دس محرم کی رات کو مخصوص انداز سے ماتم داری ہوتی ہے۔

چلہ گاہ حضرت حاجی بہادر باباؒ: کوہاٹ شہر سے باہر شمال کی جانب وہ مقام ہے جہاں حضرت حاجی بہادر باباؒ چلہ فرماتے تھے۔ یہ چلہ یا خلوت گاہ موجودہ قلعہ کے قریب ہے۔ چند برس پہلے تک یہ چلہ گاہ اپنی اصلی حالت میں تھی مگر بعد میں اسے پختہ کرادیا گیا ہے۔

قبرستان شہزادگان کوہاٹ: کوہاٹ کے شہزادگان سے موسوم بھی ایک قبرستان ہے۔ جہاں ان شہزادگان کے مقبرے تعمیر کئے گئے ہیں۔

لوک رقص گیت اور لوک ساز

کوہاٹ وادی میں ہندکو اور پشتو بولی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس ضلع میں پشتو کے گیت ٹپہ، چاربیتہ، نمکئی وغیرہ ایسے گیت ہیں جو کہ صدا بہار ہیں جبکہ مقامی کوہاٹی ہندکو میں بھی گیت اور گانے ہیں جو کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ اس طرح کوہاٹ ریجن کے پشتون علاقوں میں جو ساز اور آلات موسیقی استعمال ہوتے ہیں ان کی نوعیت بھی وہی ہے جو کہ پشاور سے ملحقہ مضافاتی پشتون دیہات میں استعمال ہوتے ہیں۔

خٹک ناچ: کوہاٹ ریجن اور خصوصاً کرک کے خٹک علاقے کا معروف ترین رقص جس نے بین الاقوامی طور پر شہرت حاصل کی وہ یہاں کا خٹک ڈانس ہے۔ اس ناچ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ایڈورڈ ای آلیور اپنی کتاب ''پٹھان اور بلوچ'' میں اس رقص کے بارے میں لکھتا ہے۔ ''خٹک قوم کا قومی ناچ ان کا طرہ امتیاز ہے۔ ہر مجلس یا تقریب اس کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اسے ایک بڑے الاؤ کے گرد ڈھول اور سرنا کے موسیقی کے ساتھ کئی آدمی تلواریں سونت کر ناچتے ہیں۔ شروع میں تھاپ کے ساتھ مدھم اور نپی تلی حرکات ہوتی ہیں اور تلواریں اونچی یا خیالی دشمنوں کو کاٹتی ہوئی سر کے اردگرد لہرائی جاتی ہیں۔ پھر حرکت بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے اور زوردار موسیقی کے ساتھ رقاص اپنے جنگی نعرے لگاتے ہیں اور آخر میں وہ جنون کی کیفیت میں گھومتے ہیں ان کی تلواریں کوندتی ہیں گیت پر جوش ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ پوری جمعیت تھک جاتی ہے۔''

اگرچہ خٹک رقص کا علاقائی ماخذ کرک کا علاقہ ہے مگر پورے پشتون معاشرے میں جہاں کہیں بھی شادی بیاہ دیگر خوشی کے مواقع ہوتے ہیں وہاں خٹک رقص ضرور کیا جاتا ہے۔ یہ خٹک رقص غیر معمولی طور پر پٹھانوں کے ثقافتی رجحانات کے تعین میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

لوک گیت: کوہاٹ میں جو گیت وغیرہ گائے جاتے ہیں میں تحقیق بسیار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ شہری علاقوں میں ہندکو کے وہی گیت گائے جاتے ہیں جو کہ پشاور میں رائج ہیں ممکن ہے کہ کوئی ایک دو گیت ایسے ہوں جو کہ کوہاٹی لہجہ میں ہوں مگر سرحدی گیتوں کے سلسلے میں جن محققین نے عرق ریزی کر کے مختلف علاقوں کے گیت جمع کئے ہیں ان میں کوہاٹ کے شہری علاقے کے ساتھ کوئی مخصوص گیت نہیں ملتا۔ جیسا کہ پہلی سطروں میں بھی یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کوہاٹ کی مروجہ تمدنی زندگی پشاور کی تمدنی زندگی کا ایک عکس ہے اور بہت سے مروجہ معاملات اور طور طریقوں میں کوہاٹ اور پشاور کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا آپس میں ملاپ اور جوڑ ہے جبکہ کوہاٹ کے علاوہ دیگر پشتون علاقوں میں مخصوص پشتون روایات اور تہذیب سے جڑے ہوئے طور طریقے ہیں۔ اسی طرح ان علاقوں میں ان کے پشتو کے گیت، جو کہ ٹپہ، لوبہ، نیمکئی وغیرہ کی صورت میں رائج ہیں۔ کرک کا مخصوص رقص جسے دنیا خٹک ڈانس کی حیثیت سے جانتی ہے اس کی تفصیل آ چکی ہے۔ تاہم ایک بات جو کہ گیتوں کے حوالے سے ضروری ہے وہ یہ کہ پشتو ہو یا ہندکو ان کے چہار

بیتوں میں جرات اور بے کی کا اظہار ان کا مشترکہ ورثہ ہے جبکہ گیتوں کی دیگر اصناف میں پیار و محبت اور لطیف جذبات و احساسات کا عنصر مشترک ہے۔

لباس و زیورات

صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کے باشندوں کے لباس و زیورات اور دیگر پہناؤں کے سلسلے میں اپنے اپنے خطے کے حصے میں اس موضوع سے متعلق تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہو گیا ہے۔ کوہاٹ اور کوہاٹ سے ملحقہ دیگر اضلاع اور مضافات میں عہد حاضر میں عمومی طور پر وہی ملبوسات مرد و زن کے ہیں جو کہ اس وقت صوبہ سرحد کے دیگر خطوں میں مروج ہیں۔ اس وقت کوہاٹ کے تمام خطوں کے لوگ جو مردانہ لباس استعمال کرتے ہیں۔ ان میں مروج قمیض شلوار ہے اور ایک ہی رنگ کے کپڑے سے یہ لباس بنایا جاتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں بنیان کے اوپر قمیض پہنی جاتی ہے۔ یہ لباس اب تو سیدھا سادھا لباس سمجھا جاتا ہے مگر اب سے نصف صدی پہلے قدیم باشندے اس لباس کو انگریزی لباس کہتے تھے۔ سردیوں میں عموماً لوگ قمیض کے اوپر کوٹ یا واسکٹ پہنتے ہیں۔ آج کل تمام لوگوں میں واسکٹ کا رواج زیادہ ہے۔ زیادہ تر لوگ ننگے سر رہنا پسند کرتے ہیں مگر دیہات میں سر ڈھانپ کر چلنا پسند کیا جاتا ہے۔ عام طور سے لوگ سفید ٹوپی پہنتے ہیں جو مذہبی ہونے کی بھی علامت ہوتی ہے۔ یہ وہی ٹوپیاں ہیں جو کہ خصوصیت کے ساتھ دیر میں بنتی ہیں مگر اب ہر شہر میں یہ ٹوپیاں بنتی ہیں۔ سردیوں میں زیادہ تر لوگ چترالی اون کی پٹی سے بنی ہوئی گرم ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ پاؤں میں عام طور سے کوہاٹی بنی ہوئی چمڑے کی چپلی پہنتے ہیں۔ خواتین کا لباس بھی عہد حاضر کے مطابق وہی لباس ہے جو کہ صوبے کے دوسرے حصوں میں پہنا جاتا ہے اور عہد حاضر کے ڈیزائنوں کے مطابق مستورات کے کپڑے سلتے ہیں۔ گھر سے باہر جو خواتین نکلتی ہیں تو وہ بھی دوسرے علاقوں کی طرح چادر ڈھانپ کر نکلتی ہیں مگر شہر میں اور دیہات میں زیادہ تر مستورات قدیم ٹوپی دار برقعہ پہن کر نکلتی ہیں جو سر سے پاؤں تک ہوتا ہے۔ وہ علاقے جو کہ پٹھانوں کے ہیں ان کا قدیم لباس بہت مختلف ہوتا تھا مرد حضرات کا کوٹ نما ایسا چغہ ہوتا تھا جو اوپر کندھوں سے گھٹنوں تک ہوتا تھا اور آگے سے ایک رسی کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔ اسے پشتو زبان میں شڑے کہا جاتا تھا۔ سر پر سفید پگڑی رکھی جاتی تھی۔ اور کندھے پر چادر بعد میں پھر اس میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی تو کھلا ایسا کرتہ استعمال کیا جانے لگا 14 گز کپڑے سے بنایا جاتا تھا اور شلوار کیلئے 18 گز کا کپڑا استعمال ہوتا تھا جو کہ کالے رنگ کا ہوتا تھا۔

زیورات: قدیم اور ثقافتی پہناوے میں کوہاٹ و مضافات کی تمام مستورات جو زیورات استعمال کرتی تھیں وہ چاندی کے بنے ہوئے زیورات ہوتے تھے۔ ان زیورات میں ماتھے کا ٹیکہ گلے کا گلوبند، کان کے جھومر اور ہاتھ کے کنگن اور ناک کی نتھنی۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی رونما ہوئی تو خواتین سونے کے زیورات استعمال کرنے لگیں اور ہر علاقے میں سنار خواتین کے لئے نئے نئے ڈیزائنوں میں سونے کے زیورات بنانے لگے۔ مگر اب بھی بعض قدیم تہذیبی ماحول کو عزیز رکھنے والی خواتین چاندی کا زیورات استعمال کرتی ہیں۔

لوک اور روحانی علاج

کوہاٹ صوبہ سرحد کا پہلا جنوبی خطہ ہے جو کوہستانی تہذیب کا نمائندہ خطہ قرار دیا جاتا رہا۔ کوہاٹ، مضافاتی بستیوں اور پہاڑی قبیلوں میں یہ روایتی اور دیسی علاج نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم لوگ گھریلو ٹوٹکوں، جڑی بوٹیوں اور دیگر عقائد سے تعلق رکھنے والے علاج کو ہر دور میں اہمیت دیتے رہتے ہیں۔ یہ علاج معالجے کے وہ طریقے ہیں جو کہ نسلوں میں سینہ بسینہ چلتے ہیں یا پھر قدیم حکماء کے قلمی نسخوں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔ کوہاٹ میں اب بھی پہاڑی علاقوں میں سنیاسی لوگ شہروں اور دیہاتوں میں گھوم پھر کر علاج کرتے ہیں۔ خصوصاً ان امراض کا علاج جو کہ پرانا مرض ہو جائے اور کسی ڈاکٹر یا حکیم کے علاج سے شفایابی حاصل نہ ہو تو پھر سنیاسیوں کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ یہ سنیاسی لوگ جنگلوں میں گھوم پھر کر مختلف جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتے ہیں اور خاص ترکیب سے ان کے سفوف اور مرہم وغیرہ بناتے ہیں اور پھر بازاروں اور چوراہوں پر مجمع لگا کر لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور مختلف امراض سے متعلق علاج تجویز کرتے ہیں، جڑی بوٹیاں اور مرہم اور تیل بیچتے بھی ہیں۔ علاوہ ازیں بزرگوں کے مزاروں پر بھی لوگ جاتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں اور مجاوروں سے دم درود بھی کرواتے ہیں۔

ہڈی پٹھے کا روحانی علاج: کوہاٹ کے مضافات میں ایسے مزارات ہیں جن کے بارے میں لوگوں کا اعتقاد ہے کہ وہاں جا کر دعا کرنے سے ہڈی اور پٹھے کے درد سے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔ لوگ جنہیں ہڈی، پٹھے کا درد ہو تو ایسے مریض اس مزار پر جاتے ہیں وہ مزار پر حاضری دے کر دعا کرتے ہیں اور سجادہ نشین کے پاس سے تیل دم کر کے اور تعویذ لکھ کر دیا جاتا ہے تیل کی مالش صبح شام کی جاتی ہے۔

بنوں

جغرافیہ:

بنوں صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کا ایک وسطی ضلع ہے۔ یہ دو اضلاع بنوں اور لکی مروت پر مشتمل ہے۔ بنوں کی حدود جنوب کی طرف پیزو تک، جنوب مغرب کی جانب میرانشاہ تک اور شمال مشرق کی جانب دومیل، سپین تنگی سے پانچ کلومیٹر کرک کی طرف سے شروع ہوتی تھیں۔ بنوں کا موجودہ جغرافیہ کچھ اس طرح سے ہے کہ اس کے مشرق کی طرف دریائے سندھ اور دریائے سندھ سے پار کالا باغ کا علاقہ ہے جو صوبہ سرحد کے جنوب مغربی اضلاع میں شامل ہے، بنوں کے شمال مشرق کی جانب کرک جواب کوہاٹ ریجن کا ایک ضلع ہے۔ اس کے علاوہ اس کے شمال مشرق کی جانب بانڈہ داؤد شاہ اور خوشحال گڑھ کے علاقے ہیں۔

بنوں شہر سے گیارہ میل دور براستہ گلوم میرانشاہ کے مقام پر مشہور درہ ہے۔ بنوں مستطیل شکل کے ایک طویل بازار پر مشتمل شہر ہے۔ یہ مشرق کی طرف پریٹی گیٹ سے شروع ہو کر مغرب کی طرف ٹانچی بازار میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بازار کے شمالی جانب بھی دروازے ہیں۔ شہر کے اندر مختلف محلے ہیں۔ شہر میں بنوں کی مقامی آبادی کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی آباد ہیں۔ جنہوں نے بنوں کے مخصوص ثقافتی اور جغرافیائی ماحول کے مطابق تہذیب و تمدن اور زبان کو اپنا لیا ہے۔ بنوں کی مقامی آبادی کے لوگ قد آور، لمبے اور صحتمند ہیں جو کہ اس علاقے کی مخصوص پوشاک کے مطابق سر پر لنگی کا پٹکا باندھتے ہیں۔ بنوں شہر کے جنوب مغرب کے پہاڑی علاقوں میں قیمتی پرندے پائے جاتے ہیں ان میں چکور، تیتر، کونجیں، مرغابی، تلیر اور بٹیر بکثرت ہیں۔ بنوں شہر کی تاریخی اور ثقافتی تعمیر کی علامت رکھنے والے دروازوں کے نام یہ ہیں:

کچہری گیٹ، سکڑی گیٹ، مریان گیٹ، ہنجل گیٹ، ریلوے گیٹ، پریٹی گیٹ، قصاباں گیٹ، لکی گیٹ، پوڑی گیٹ۔

ان دروازوں کے ساتھ ساتھ قدیم فصیل شہر ہے۔ بنوں کا موجودہ شہر انگریزوں کے زمانے میں بنا تھا اس لئے اس کا نقشہ باقی شہروں کی نسبت جدید طرز کا ہے۔

لکی مروت: لکی مروت بنوں ریجن کا ایک ضلع ہے جہاں مروت قوم آباد ہے اور انہیں کے نام سے یہ علاقہ لکی مروت کہلاتا ہے، یہ بنوں کے جنوب مشرق میں بنوں شہر سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ مروتوں کا یہ علاقہ جنوب کی طرف پونڈہ اور پنیالہ تک پھیلا ہوا ہے۔ لکی مروت کی زیادہ تر زمینیں بارانی ہیں۔ یہاں زیادہ تر گندم، سرسوں، چھوٹی مکئی اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے۔ تاہم کچھ علاقہ ایسا ہے جہاں سے نہروں کے ذریعے زمینوں میں آبپاشی ہوتی ہے، ان نہری علاقوں میں گندم، سرسوں، بڑی مکئی، جو، گھاس، شلغم، گاجر، کدو، توری، پیٹھہ، گوبھی، بھنڈی اور ہر قسم کے ساگ کی فصلیں ہوتی ہیں۔

لکی مروت کا علاقہ جن اہم دیہات پر مشتمل ہے ان میں لنڈیوہ، ابا خیل، شہاب خیل اور نورنگ کے علاقے ہیں۔ نورنگ کا علاقہ ایک بڑی منڈی ہے۔

لکی مروت اور مضافات میں زمینیں بڑی زرخیز ہیں۔ عام دیہاتی اور مقامی لوگ کاشتکاری کرتے ہیں۔ زمینداری کے موسم کے بعد زمیندار اور کاشتکار لوگ سارا سال فارغ رہتے ہیں اور ان کا ذریعہ معاش زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ہوتی ہے۔ فارغ اوقات میں یہ میدانوں میں تیر اندازی یا پھر انڈے لڑانے کا شغل کرتے ہیں۔ اب بھی لوگوں میں یہ مشغلہ عام ہے جو کہ یہاں کی ثقافتی اور روایتی زندگی کی علامت ہے۔ یہ لوگ مقامی سواری کے لئے اونٹ اور گدھے استعمال کرتے ہیں۔

لکی مروت نیازیوں کا بھی مقام رہا ہے اور مروتوں کے آنے سے پہلے یہاں نیازی قوم کا اثر تھا جو اپنی مخصوص روایتی اور ثقافتی طرز حیات کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ جب مروت یہاں آئے تو مروتوں اور نیازیوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں نیازی دریائے سندھ کو پار کر کے دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر آباد ہو گئے اور یہ علاقہ مروتوں کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔

تاریخ

بنوں صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کا ایک وسطی قدیم ثقافت، روایات اور مخصوص تہذیب کا حامل شہر ہے جہاں کے باشندے رسوم و رواج، بود و باش اور زبان و پوشاک کے اعتبار سے اپنی قدیم تہذیب و ثقافت سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ یہ شہر کئی فاتحین کی گزرگاہ بھی رہا۔ روایت کے مطابق سکندر اعظم نے جب پنجاب میں راجہ پورس کو شکست دی تو واپسی میں سکندر نے یہی راستہ اختیار کیا اور پھر براستہ کرمان واپس گیا تھا۔ پہلے اسلامی فاتح محمود غزنوی نے بھی سومنات پر ایک حملہ کے لئے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ بعد میں مغل خاندان کا بانی تیمور اور پھر تیمور کے بعد بابر بھی یہاں پہنچا۔ یہاں پر شاہان مغل کی قبائل کے ساتھ جنگیں بھی ہوئیں۔

بنوں شہر سے گیارہ میل دور براستہ گلوم میرانشاہ کے مقام پر ایک مشہور درہ ہے۔ شہر کے پاس سے دریائے کرم گزرتا ہے۔ دریائے کرم کاوید میں کرمو کے نام سے ذکر کیا گیا ہے جس سے اس دریا کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے۔ دریائے کرم کی وجہ سے بنوں کے آس پاس کی زرعی زمینیں زرخیز ہیں۔ بنوں شہر کے شمال مغرب کی جانب ایک خوبصورت چھاؤنی ہے جہاں اب سرکاری دفاتر اور افسروں کے بنگلے اور طلباء و طالبات کے لئے پبلک سکول اور کالج ہے۔ شہر سے کچھ فاصلے پر دریائے کرم کے اوپر مٹی کا بنا ہوا ایک ڈیم ہے جسے بارانڈ کہتے ہیں۔

بنوں اور اس سے ملحقہ علاقوں میرانشاہ اور وزیرستان کے باشندے ہمیشہ سے آزاد منش، جنگجو، آزادی پسند اور کڑی محنت کے خوگر اور سادہ خوراک و پوشاک اور روایات کے پابند لوگ رہے ہیں۔ انہوں نے بیرونی تسلط کو کبھی بھی قبول نہیں کیا اور انگریز دور میں انگریزوں کے ساتھ برسرپیکار رہے۔ سرسبز و شاداب اور زرخیز زمینوں کی وجہ سے یہ علاقہ مغربی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی اقوام و قبائل کے لئے مرکز نگاہ رہا۔ یہاں پر وارد ہونے والی جن اقوام کی تاریخی حوالوں سے شناخت ہوتی ہے ان میں انگل، منگل، کیوی، سودانی اور شیتک قومیں شامل ہیں۔ شروع میں یہاں انگل اور منگل قومیں وارد ہوئیں بعد میں سودانی اور کیولی اقوام یہاں پر حملہ آور ہوئیں جبکہ بارہویں صدی عیسوی میں شیتکوں نے اس علاقے کی طرف رخ کیا اور یہاں پر قابض ہو گئے۔ جس کی وجہ سے یہاں کی قدیم اقوام انگل اور منگل کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ شیتکوں، کیوی اور سورانیوں نے زمینیں آپس میں تقسیم کر لیں اور یہاں پر آرام و خوشحالی کے ساتھ رہنے لگے۔ انہوں نے یہاں کے تمدن پر گہرے نقوش ثبت کئے اور زمینوں کو آباد کیا۔ جب یہ لوگ ان زمینوں پر قابض ہو گئے اور آرام سے گزر بسر کرنے لگے تو ان پر خٹک قبیلے نے حملہ کر دیا اور ان سے نبرد آزما ہو کر بہت سا علاقہ ان سے چھین لیا لیکن بعد میں شیتک بھی خٹکوں پر حملہ آور ہوئے اور ان سے اپنی چھینی ہوئی زمینیں لے کر انہیں شمال مشرق کی پہاڑیوں کی طرف دھکیل دیا اور خٹک سفید نمک کی پہاڑیوں کے علاقے میں آباد ہو گئے۔

بنوں کی جغرافیائی حدود میں آنے والی زمینوں کے بارے میں ایڈورڈ اپنے دور قیام کے دوران اس طرح تصویر کشی کرتا ہے۔ ''بنوں کے علاقے میں موسم بہار میں سبزیوں کی زبردست فصل ہوتی ہے اور سردیوں کے موسم میں متنوع فصلیں ایسی لگتی ہیں جیسے کہ سریز۔'' (سریز رومی لسانیات کا ایک لفظ ہے جو کہ فلاح کی دیوی کے لئے استعمال ہوتا ہے) اور یہ کہ سریز نے عظیم کوہستان نمک سے ٹکرا کر اپنا آدھا خوشحال زمانہ اس مبارک وادی بنوں میں بکھیر دیا ہو۔ بنوں کے ارضی منظر کی خوشنمائی و دلکشی کا انحصار اس وادی میں پائے جانے والے شیشم کے ان درختوں پر ہے جو اپنی اعلیٰ نوعیت و ہیئت کے ساتھ صرف اور صرف اس وادی میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کے ملحقہ دیہات میں شہتوت کے موٹے اور تناور درخت یہاں کی منفرد نباتاتی حیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان درختوں کے ساتھ جنگلی انگور کی بیلیں زمین پر خوشبودار سایہ پھینکتی ہیں' ایڈورڈ اس کے بارے میں کہتا ہے کہ ان سایہ دار اور خوشبودار مناظر کے نیچے فقراء (بقول ایڈورڈ یحیم و شیحم سید) خوشی کے مجسموں کی مانند تسبیح خوانی کرتے ہوئے اونگھتے ہیں۔ جب موسم بہار کا اختتام ہوتا ہے تو یہاں کے بالائی حصے میں گلاب کے پھول بکثرت ہوتے ہیں۔ بنوں کے مضافات میں شہتوت' تربوز اور لیموں بکثرت ہوتا ہے۔ غرضیکہ بہار و سبزہ اور مزروعہ زمینوں' قدرتی چشموں اور پانی کی بہتات نے بنوں کو امن و سکون کے مرغزاروں کی سرزمین بنانے کے علاوہ قدرت نے اس جغرافیائی ماحول کو ہلکے بھورے رنگ کی پہاڑیوں' سورج کی کرنوں میں چمکتی ہوئی برف پوش چوٹیوں اور بعض مقامات پر کسی قدر اداس گھاٹیوں کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ جو ماحول عطا کر دیا ہے اس کی دلآویزی میں وہ کشش ہے جو کئی اقوام کو اس طرف کھینچ کر لائی اور باوجود یہاں کے درشت و کرخت باشندوں کے فطری جنگجو خصائل کے یورپ کی متمدن انگریز قوم کو یہاں تک پہنچنے میں دلچسپی تھی۔ انگریز راج میں یہاں کے بندوبستی افسران نے اس خوبصورت وادی کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ اس وادی کے جغرافیائی ماحول کے بیش بہا ہونے کی دلیل ہے۔

بنوں اپنی آب و ہوا کے اعتبار سے تاریخی و جغرافیائی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں پلنے والی نسلیں اپنے شمال مغربی اور جنوب مغربی آزاد قبائل وزیرستان کے جنگجو اور درشت و کرخت خصائل کے حامل قبائل کی ہمسائیگی کی بناء پر مغربی جغرافیائی ماحول سے بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ بلکہ بہت حد تک خصائل و اطوار کے اعتبار سے بنوچی جو آزاد منش فضاؤں کے رہنے والے اہم قبائل وزیر اور محسود ہیں۔ ان لوگوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ تاہم بنوں کی مقامی تہذیب تعلیم و ہنر سے متصف ہو کر بنوچی معاشرے کو عہد بہ عہد تمدنی علاقہ بنانے سے غافل نہیں رہتے۔ اس کے باوجود وزیری آزاد قبائلی علاقے سے مخصوص محل وقوع رکھنے کی بناء پر بنوں ہمیشہ سے غیر معمولی نوعیت کا جغرافیائی علاقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ بنوں بہت سی شاہراہوں کے لئے مرکزی خطہ بھی رہا ہے۔

بنوں قدیم ترین اقوام کا مسکن: ان کیولی، سورانی، شیتک اور خٹک اقوام سے قبل بنوں کے علاقے میں جو قدیم ترین اقوام آباد تھیں یہ آریائی قبیلے کی

کچھ شاخیں تھیں جو کہ شمالی علاقوں سے نقل مکانی کر کے جنوبی اضلاع کی طرف چلی آئیں۔ان آریائی قبائل نے بنوں کی سرزمین کو اپنا مسکن بنالیا۔ان آریائی قوموں کا تاریخ میں تذکرہ ان ناموں کے ساتھ ہوتا ہے لکی، برت، مندیر، شادیو، بنجر اور سکری۔یہ بنوں کی وہ قدیم ترین اقوام ہیں جن کا تعلق آریائی قبائل سے ہے اور اب تک یہ بنوں کی مقامی آبادی کا حصہ ہیں اور آریائی دور سے یہاں آباد ہیں۔ان کی قدیم راجدھانی اکرہ ہے جو ایک راجہ کی راجدھانی تھی۔اکراہ راجدھانی اب نیست و نابود اور زمین دوز ہو چکی ہے۔ان کے علاوہ جن دوسری قدیم ترین اقوام کی شناخت ہوتی ہے ان میں منڈان، مغل خیل، داؤد شاہ، ممش خیل، لنڈی ڈاک، یوید، اوجڑی اور طوغل خیل ہیں۔

اس وقت بنوں کی معروف ترین قوم مروت ہے۔اس قوم کے نام سے موسوم بنوں ریجن کا ایک ضلع مروت ہے۔مروت قوم ضلع لکی مروت کی تہذیب یافتہ اور تعلیم و تجارت میں ممتاز مقام رکھنے والی قوم ہے جن کا ہر دور میں یہاں کی ملکی سیاست میں بھی عمل دخل رہا ہے۔مروتوں کی تین بڑی شاخیں ہیں، وڑے پلارے، بہرام اور موسیٰ خیل۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مروتوں کے یہاں وارد ہونے سے پہلے بنوں کے علاقوں میں نیازیوں کی گرفت تھی اور ان سے پہلے نیازی یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ نیازیوں اور مروتوں میں چچا اور بھتیجے کا رشتہ تھا۔ نیازیوں نے رشتے کی پاسداری کرتے ہوئے مروتوں کو بھی دعوت دی کہ وہ بھی اس سرسبز و شاداب اور زرخیز زمینوں میں آ کر آباد ہو جائیں۔مروت اس وقت ایران اور افغانستان کی سرحدی پہاڑیوں غور میں رہائش پذیر تھے۔ان مروتوں نے نیازیوں کی دعوت پر نقل مکانی کی اور بنوں کی طرف رخ کیا۔نیازی ان دنوں دریائے گمبیلا کے کنارے آباد تھے۔یہ وہ علاقہ ہے جہاں نیازیوں سے پہلے پیروں کے خاندان آباد تھے۔جب مروت نے غور سے متفقہ طور پر نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تو وہاں سے کوچ کر کے ایک پر فضاء مقام شوال پہنچے یہ وہی پر فضا وادی ہے جہاں ان سے پہلے خٹک سکونت پذیر تھے۔مروتوں نے اس وادی میں پہنچ کر یہاں کی زمینوں کو آباد کیا اور یہاں سے معاشی فائدے حاصل کئے۔کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد یہاں سے نقل مکانی کر کے محسودوں کے علاقے میں داخل ہوئے۔مروتوں اور محسودوں کے درمیان معرکہ آرائی بھی ہوئی۔اس جنگ کے نتیجے میں جب مروتوں نے یہاں اپنے قدم جمتے ہوئے نہ دیکھے تو پھر یہ گنڈہ پور کے علاقے میں داخل ہوئے۔یہاں ان کے ساتھ گنڈہ پور متصادم ہوئے تو یہ براستہ بٹنی پیزو آ گئے اور پھر براستہ پیزو یہ لوگ بنوں کے سلیمان خیل علاقے میں داخل ہوئے اور اس وسیع و عریض علاقے میں آباد ہو گئے۔اس میدانی علاقہ میں یہ کچھ عرصہ تک قیام پذیر رہے۔اس علاقے میں مروتوں کی زمینیں اور جائیدادیں اب بھی موجود ہیں۔یہاں سے انہوں نے نقل مکانی کی اور والی کے مقام پر منتقل ہوئے۔یہ ایک پہاڑ ہے۔انہوں نے کچھ عرصہ یہاں بھی سکونت اختیار کی اور مختصر عرصہ یہاں ٹھہرنے کے بعد گمبیلا پہنچ گئے جہاں ان کی ملاقات نیازیوں سے ہوئی۔

یہاں پر مروت اور نیازی مل جل کر مشترکہ کھیتی باڑی کرنے لگے مگر بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہونے لگے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مروتوں اور نیازیوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ روایت کے مطابق ان کے درمیان جنگ کا عرصہ صرف ایک دن تھا مگر بہت خونریز جنگ تھی۔اس جنگ میں مروت کے قبیلے موسیٰ خیل کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ شام کے وقت جنگ بندی ہوئی تو مروتوں اور نیازیوں کے مابین صلح ہو گئی۔اس کے بعد مروتوں کے تینوں قبیلوں وڑے پلارے، بہرام اور موسیٰ خیل نے آپس میں صلاح مشورے کئے۔موسیٰ خیل نے کہا کہ اس سے پہلے جب لڑائیاں ہوتی تھیں تو ہر قبیلے کے لوگ کام آتے تھے مگر یہ جنگ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی انوکھی رہی کہ اس میں صرف موسیٰ خیل قبیلے کے لوگ ہی کام آئے۔ چنانچہ مشاورت کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد تینوں قبیلے مل کر گھوڑوں پر سوار ہو کے نیازیوں پر حملہ آور ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہوا جب مروتوں نے نیازیوں پر فجر کی نماز کے فوراً بعد حملہ کر دیا تو یہ حملہ نیازیوں کے لئے بالکل خلاف توقع اور اچانک تھا۔ نیازی بالکل تیار نہ تھے۔اس لئے نیازی یہاں سے جان بچا کر فرار ہو گئے اور دریائے سندھ کو پار کر کے میاں والی کے علاقے میں جا کر آباد ہو گئے اور پھر یہ پورے کا پورا علاقہ مروتوں کے قبضے میں آ گیا۔

بنوں کی وجہ تسمیہ: بنوں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔مگر سب سے زیادہ اور حقیقت سے قریب تر بات یہ ہے کہ بنوں "بن" سے ہے جو کہ جنگل کے لئے استعمال ہونے والا لفظ ہے۔عربوں کی تاریخ "تاریخ فتوح البلدان" میں اسے اپنے عربی لہجہ میں بنہ لکھا گیا ہے۔دریائے کرم بنوں شہر سے گزرتا ہوا مغرب سے مشرق کی طرف جا کر دریائے سندھ میں مل جاتا ہے جبکہ دریائے ٹوچی افغانستان سے آتا ہے اور یہ دریا بارانی پانی سے بن کر بہتا ہے۔ دوسری طرف دریائے گمبیلا ہے، دریائے ٹوچی دریائے گمبیلا کے ساتھ مل کر دریائے

سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ دریائے کرم پر بارانڈیم کے مقام پر ڈیم بنایا گیا ہے۔ دریائے کرم سے بنوں کی زرعی زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا پانی نہایت شیریں اور فصلوں کے لئے مفید ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی پیداوار سبزی' چاول اور پھلوں میں منفرد ذائقہ ہوتا ہے۔ دریائے کرم میں مچھلی وافر پائی جاتی ہے اور یہ مچھلی دوسرے علاقوں کی نسبت غذائیت سے بھرپور اور لذت میں منفرد ہوتی ہے۔ بنوں شہر کی حدود شمال کی طرف ڈومیل قصبہ سے شروع ہو جاتی ہیں اور جنوب کی طرف سرائے نورنگ تک ہیں جو کہ اب لکی کی تحصیل ہے۔ یہ سب وادی کرم کہلاتی ہے۔

یہاں چونکہ ریتلا علاقہ زیادہ ہے اس لئے کھجور کے درخت ہیں۔ بنوں کی کھجوریں بہت مشہور ہیں خصوصاً علاقہ غوری والا اور شمسی خیل کی کھجوریں لذیذ اور مقوی ہوتی ہیں۔ یہاں کی سب سے نمایاں چیز یہاں پیدا ہونے والی انجیر ہے۔ یہاں کے باشندوں کا کہنا ہے کہ علاقے میں پیدا ہونے والی انجیر پوری دنیا سے مختلف انجیر ہے اور حکماء و اطباء نے اس انجیر کے بہت سے فوائد بیان کئے ہیں اور اس پر بہت تحقیق ہو چکی ہے۔ یہاں کے باشندوں کی مخصوص ثقافتی زبان و پوشاک ہے۔ بنوں اور ملحقہ علاقوں کی پشتو زبان کو شین کہا گیا ہے کیونکہ یہ صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں کے پٹھانوں کی زبان سے مختلف لہجہ رکھنے والی پشتو زبان ہے۔ یہ لوگ شین کا استعمال زیادہ کرتے ہیں اور اس جنوبی علاقے کے پٹھانوں کو اور ان کی زبان کو شین کہا گیا ہے۔ سرحد کے شمالی حصوں میں جہاں 'خ' اور 'گ' استعمال ہوتا ہے، وہاں جنوبی حصے میں 'ش' اور 'ژ' استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً خوگ (زخمی) خوژ بنگرہ (چینی) شکرہ۔ مگر جنوبی حصے کے پٹھانوں کو شین نہیں کہا جاتا۔

تحقیق کے مطابق بنوں کا علاقہ ایک وسیع و عریض جنگل پر مشتمل تھا جہاں دریائی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے پانی وافر تھا۔ اس لئے اس علاقے کو بن یعنی جنگل کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہاں پر جب انسانی آبادی بڑھنے لگی تو یہ بن سے بنوں ہو گیا۔

دوسری توجیہہ جو کہ یہاں کے باشندوں کی طرف سے زبانی طور پر پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بنوچیوں کے مورث اعلیٰ کا نام شیتک تھا اور شیتک کی بیوی کا نام بانو تھا جس کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد بانوزئی کہلائی۔ یہاں پر جب شیتک قبیلے کے لوگوں نے قبضہ کیا تو انہوں نے اس علاقے کا نام اپنی ماں کے نام پر بانو رکھ دیا جو بعد میں مختصر ہو کر بنوں ہو گیا۔

تیسری روایت جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے باشندوں کی طرف سے بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ڈیرہ شہر کے بانی سہراب خان بلوچ کے تین بیٹے تھے اسماعیل خان' غازی خان اور دریا خان اور ایک بیٹی کا نام بانو تھا۔ تین بیٹوں کے نام سے مختلف علاقے منسوب ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان' دریا خان اور غازی خان جبکہ یہ بنوں کا علاقہ بانو کے حصہ میں آیا تو اس کا نام بانو رکھ دیا گیا جو وقت کے ساتھ مختصر ہو کر بنوں ہو گیا۔ بہرحال ان توجیہات سے قطع نظر یہ علاقہ قدیم ترین آریائی اور ہندو اقوام کا بھی مسکن رہا جہاں ان کی راجدھانیاں تھیں جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس علاقے کو مغرب کی طرف سے آنے والی اقوام نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور یہاں پر ہر آنے والی قوم نے پہلی قوم کو نکال باہر کیا۔ ہر وارد ہونے والی قوم کی یہ کوشش رہی کہ یہاں کی سرسبز و شاداب اور قابل معاش زمین پر قبضہ جمائے جس کی وجہ سے یہ خطہ مختلف اقوام کی رزم گاہ رہا۔

بنوں کے بارے میں ایک اور توجیہہ میر سید بخاری نے اپنی کتاب ''لاہور تاریخ کے آئینے میں'' یوسفی غزنوی مرحوم کے ایک تحقیقی اقتباس سے پیش کی ہے کہ لفظ بنیان سے بنوں نکلا ہے۔ مرحوم محقق نے بنیان کا ذکر آقائے حبیبی قندھاری کے تحقیقاتی اقتباس سے کیا ہے اور کہا ہے کہ ملک حسن قرنغ لشکر سے شکست کھا کر غزنی و کرمان کے راستے ملتان و سندھ پہنچا' انہوں نے اس اقتباس سے بنیان سے مراد بنوں لیا ہے جو کہ ملتان اور غزنہ کے درمیان واقع ہے اور وہ یہی شہر بنوں ہے۔ بعض تاریخ دانوں اور محققین نے ملتان اور غزنہ کے درمیان جس شہر کو بنیان کہا ہے وہ یہی بنوں ہے۔

عربوں نے تاریخی حوالوں کے ساتھ بنوں کو بنہ لکھا اور یہ نام متذکرہ بنوں کے ناموں کی تاریخی عہد سے ماقبل قدامت پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ عربوں نے اپنے لسانی تلفظ کے اعتبار سے بنوں کو بنہ کہا ہوگا۔

عربوں کی شروع کی جو فتوحات ہیں، ان فتوحات میں 44ھ میں برصغیر ہندوستان کی طرف حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں حضرت مہلب بن ابی صفرۃ نے پیش قدمی کر کے بنوں اور لاہور تک رسائی حاصل کی جس کا تذکرہ البلازری نے اپنی کتاب کے مشہور باب ''فتوح السند'' میں اس طرح کیا ہے:

ثم غزا ذلک القفر المہلب بن ابی صفرۃ فی ایام معاویہ ۴۴ھ

فاتی بنہ والاھوار دھا بین الملتان والکابل فلقیہ العدو فقاتلہ ومن معہ واتی بنہ

ترجمہ: تب مہلم بن ابی صفرۃ نے حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت 44ھ میں ہندوستان کی سرحد پر جنگ کی اور بنہ اور لاہور تک پہنچ گیا۔

اہم تاریخی واقعات: مغل خاندان کا بانی تیمور لنگ جب 1393ء میں سمرقند سے روانہ ہوا تو وہ راستے کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا ہوا دہلی پہنچا اور شہر کو خوب لوٹا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر اور بہت سا مال و خزانہ لوٹ کر واپس لوٹا تو

1398ء میں بنوں کے راستے واپس ہوا مگر بنوں بشمول کوہاٹ کے اردگرد افغانیوں نے پہاڑیوں سے اتر کر قلعے تعمیر کئے اور وہ تیمور کے واپسی کے راستے میں اس کے لئے سدراہ ثابت ہوئے۔ یہاں پر تیمور اور افغانی سرحدی پٹھانوں کے درمیان معمولی معرکے ہوئے۔

تیمور کے بعد ظہیر الدین بابر فرغانہ سے وسط ایشیاء میں نمودار ہوا اور اُس نے نہایت سمجھ بوجھ، انتظامی صلاحیتوں اور عسکری ضابطوں کے ساتھ مغلیہ خاندان کی مضبوط داغ بیل ڈال دی۔ بابر نے 1504ء میں کابل پر قبضہ کیا اور پھر درہ خیبر کے راستے ہندوستان داخل ہوا۔ جب وہ براستہ کوہاٹ بنوں میں داخل ہوا تو یہاں کے پٹھان اس کے راستے میں حائل ہوئے مگر مغل لاؤ لشکر کے سامنے انہیں پسپا ہونا پڑا۔ بنوں میں بعض دشمنوں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بابر سے معافی مانگی۔ معافی مانگنے کا جو طریقہ رائج تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے دانتوں میں گھاس لے کر بابر کے سامنے معافی کے لئے حاضر ہوئے اور بابر نے ان کی جان بخشی کا فرمان جاری کیا۔

جب سکھوں کا دور شروع ہوا تو سرحد میں ان کے تسلط کا مقصد صرف یہ تھا کہ گردونواح کے خان پہ 10 ہزار روپے سالانہ کا ٹیکس لیا جائے' کاشتکاروں سے تین چوتھائی تک پیداوار بٹوری جائے۔

بنوں کی تاریخی اہمیت انگریز کی نظر میں: بنوں پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو اس علاقے کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس سرزمین کو انہوں نے غیر معمولی اہمیت دی تاکہ اس کے شمال مغرب تا جنوب مغرب کے سرکش و جنگجو قبائل پر نظر رکھی جاسکے۔ اس تاریخی اہمیت کے علاوہ سرزمین بنوں کی اپنی زرخیزی اور آبادی بھی منفعت سے خالی نہ تھی۔ ماہرین اراضیات کا کہنا ہے کہ یہ علاقہ آریائی اقوام کے یہاں پہنچنے سے پہلے ایک عظیم جھیل تھا جسے ایک ڈنڈیا جھیل کہا جاتا رہا۔ بنوزئیوں خصوصاً شیتک قبیلہ کے لوگوں نے یہاں پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں کھودیں، کنویں بنائے، دریاؤں سے نہریں نکالیں اور اس علاقے کو فصل کی کاشت کے قابل بنا کر یہاں پر مستقل سکونت اختیار کی۔ اس کے بعد کئی اقوام نے اس سرسبز و شاداب زمینوں کی طرف رخ کیا اور یکے بعد دیگرے کئی اقوام نے اس علاقے میں اپنی آبادیاں قائم کیں۔ یہاں تک کہ 1848ء میں برصغیر ہندوستان میں انگریز آئے تو وہ بھی اس حسین و سرسبز و شاداب خطے کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے یہاں کے بندوبستی علاقے تک اپنا قبضہ جمایا۔ ان کا پہلا حاکم سر ایڈورڈز تھا جس نے اس علاقے کو بڑی تفصیل کے ساتھ دیکھا اور ایک جامع رپورٹ تیار کی۔

اس نے بنوں شہر سے باہر شمالی حصے کی طرف ایک خوبصورت چھاؤنی تعمیر کروائی جہاں عصری تقاضوں کے مطابق خوبصورت بنگلے' سرکاری دفاتر اور باغ و باغیچے بنوائے اور اس کا نام ایڈورڈز ٹاؤن رکھا۔

تاریخی و ثقافتی تغیرات: انگریز دور میں تھارن برن نے بنوں کی وادی سے متعلق جو طویل رپورٹ مرتب کی ہے اس کے مطابق بنوں کی قدیم ترین اقوام کی تہذیبی اور ثقافتی حیات اور تاریخی خطے کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے تاریخ دانوں اور ثقافت و تہذیب نگاروں کے لئے مرکزی سرمایہ قلم ہوں گے۔ تھارن برن نے بنوں کے بارے یہ نہایت دلچسپ جملہ لکھا ہے کہ ''اس کے محل وقوع' تاریخی مناظر اور زرخیزی نے اسے ایک سنگلاخ علاقے میں زمرد کی طرح جوڑ دیا ہے۔'' بنوں میں عکرہ کے مقام پر دریافت ہونے والے آثار قدیمہ ایک ترقی یافتہ اور تہذیب کے بندھن سے جڑے ہوئے شہر کا پتا دیتے ہیں۔ یہاں یونانیوں کی آمد سے پہلے کے آثار کے علاوہ یونانی' باختری (ایرانی) انڈو سیتھی اور بدھ آثار ملے ہیں۔ ہندو شاہیا کے دور میں اس شہر کی دوبارہ آبادکاری ہوئی۔ اسے ست رام کے شہر کی روایات سے مزین کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نویں صدی سے پہلے یہاں پر شمالی ہندوستان کے برہمن مہاراجوں کی حکومت تھی۔ یہاں راجہ جے پال کی طرف سے مقرر کردہ راجاؤں کی راجدھانیاں قائم تھیں جن کے دور میں یہاں پر ہندوؤں کی پوجا پاٹ کے لئے عالیشان مندر تعمیر ہوئے اور پھر دسویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے باپ امیر سبکتگین نے ہندو شاہیا کو ختم کرنے کا تہیہ کیا اور اس کے بعد محمود غزنوی نے جو پے در پے حملے کئے، ان حملوں کے لئے دریائے کرم اور گمبیلا کے کنارے پر اس کی فوجوں نے خیمے نصب کئے اور یہیں سے ہندوستان پر حملہ کرتے رہے۔ چودھویں صدی کے اواخر میں تیموری فوجیں یہاں آئیں اور پھر سولہویں صدی کے اوائل میں بابر کی فوجیں یہاں پر نبرد آزما ہوئیں۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی

تحقیق نگاروں اور مورخوں کا اکثریتی فیصلہ یہی ہے کہ یہاں پر سب سے پہلے قدم جمانے والی قوم بنوشیتک ہیں جو کہ شیتک کی بیوی مسمات بانو کے بطن سے ہیں اور یہی اولین دور کے وارد ہونے والوں میں سے ہیں اور انہیں ہی اصلی بنوچی قرار دیا گیا ہے جنہیں پشتو میں بنوسی کہتے ہیں۔ یہ بنوچی یا بنوسی ''کرلانڑی'' اور

غور غشتی پٹھان ہیں۔ یہ سب سے پہلے کوہ سفید میں رہتے تھے پھر وہاں سے نقل مکانی کر کے کوہ سلیمان کی طرف آئے اور بعد میں وہاں سے بنوں منتقل ہوئے اور اس علاقے کی زرخیزی کو دیکھتے ہوئے یہاں مستقل طور پر رہنے لگے اور زمینوں کو آباد کیا۔

کرلانڑی پٹھانوں کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ شیتک کے علاوہ کرلانڑی قبیلے کی قابل ذکر شاخیں یہ ہیں۔

دلہ زاک' اورکزئی' خٹک' اتمان خیل' آفریدی' خوزی (خوگیانی)' منگل' وزیر' بنگش، موسیٰ زئی اور محسود بنگش۔

نوڑو: یہ کیوی کے بیٹے میری کی اولاد سے ہیں جو کہ میری کی چوتھی بیوی کے بطن سے ہیں جو غیر قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے میری کی دوسری اولاد انہیں اپنے ہم پلہ نہیں سمجھتی۔ یہ بھی بنوں کی ایک مشہور قوم ہے۔

نورڑ: یہ میری کی دوسری بیوی کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ بنوں کی قدیم اقوام میں سے اور اقتصادی اور معاشی ترقی کے لحاظ سے میری کی اولاد کی دوسری شاخوں سے برتر سمجھے جاتے رہے ہیں۔

منڈان: یہ کیوی کے بیٹے سمی کی اولاد میں سے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس لئے اصلی بنوچی نہیں ہیں کہ یہ بنگشوں کے علاقے میں رہتے تھے اور بعد میں بنوں آئے مگر گل ایوب خان سیفی نے اس نظریئے کی اپنی کتاب ''تاریخ بنوں اور وزیرستان'' (پشتو) میں تائید نہیں کی اور انہیں بنوں کے اصلی باشندوں میں شامل کیا ہے۔

ھنجل: یہ پٹھانوں کا وہ قبیلہ ہے جسے منڈان قبیلے نے اپنے علاقے میں رہنے کے لئے زمینیں اور مکانات دیئے اور منڈان قبیلے کے لوگوں نے ان کو اپنی پشت پناہی کے لئے اپنے ساتھ رکھا مگر جب منڈان قبیلے کے پاؤں یہاں جم گئے انہوں نے ھنجلوں پر حملہ کر دیا اور ان سے بہت سا علاقہ چھین لیا۔

سکندر خیل: سکندر خیل سمی کی اولاد سے تعلق رکھنے والے قبیلہ عیسکی کی ایک شاخ ہے جس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سکندر خیل بنوچی نہیں بلکہ خراسان کے رہنے والے باشندے ہیں اور وہاں سے یہاں آئے ہیں، اس لئے بعض لوگ انہیں چنڈول کہتے ہیں اور بعض لوگ انہیں سدوزی کہتے ہیں۔ مگر بعد از تحقیق یہ ثابت ہوا ہے کہ سکندر خیل بنوں کا ایک مستقل قبیلہ ہے جو کہ عیسکی کی اولاد سے ہے اور عیسکی بنوچی ہیں۔

اسماعیل خیل: اسماعیل خیل قوم کے لوگ اس لحاظ سے بنوں کے اصلی باشندے ہیں کہ یہ ھوید کی اولاد میں سے ہیں اور ھوید شیتک کی تیسری بیوی کے بطن سے تھا۔ بعض لوگوں نے اس مغالطے کی بناء پر انہیں بنگش کہا ہے کہ یہ اسماعیل خان خیل ہیں چونکہ بنگشوں کا مورث اعلیٰ اسمٰعیل تھا اور پھر اسماعیل کی اولاد اسماعیل خیل بنگش کہلائی جو کہ کوہاٹ' پشاور اور خوست میں آباد ہے مگر یہ اسماعیل خیل بنگش کے مورث اعلیٰ اسماعیل کی اولاد نہیں بلکہ ھوید کی اولاد میں سے ہیں جو کہ شیتک ہیں۔

خوجڑی: خوجڑی سیناور کی اولاد میں سے ہیں اور یہ تپئی میں آباد تھے' تپئی کے ساتھ ہی ایک مقام کا نام ان کے نام پر سیناور ہے۔ ان کا شجرہ نسب اس طرح ہے کہ سناور کی دوسری بیوی میں سے دوسرے بیٹے کا نام خوجڑی ہے اور اس کی اولاد بنوں کی خاص اور اصل قوم ہے۔

سوکڑ: یہ بھی سناور کی اولاد ہے اور اس کی دوسری بیوی کے بطن سے ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی ھنجل کے ساتھ مل کر رہنا شروع کیا۔ ھنجل سناور کی پہلی بیوی کے بطن سے ہے۔

سورانی: یہ بھی بنوں کے اصلی باشندے ہیں۔ سورانی شیتک کی بیوی بانوں کا دوسرا بیٹا تھا، اس کی اولاد سورانی کے ساتھ منسوب ہے۔

عمر خیل: یہ بارک زئی کی شاخ میں سے ایک قبیلہ ہے جسے اب مغل خیل کہتے ہیں۔ اس قبیلے کے اسلاف میں سے حسن خان نامی شخص یوسف زئی کے علاقے سے بنوں آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے عمر خان اور سمل خان بھی آئے تھے اور غیرت خان المعروف سرکرمی جو کہ خوجڑی کی شاخ میں سے ہے، کے ہمسائے بن کر رہنے لگے۔ چونکہ غیرت خان میں قیادت کی اہلیت نہ تھی اور وہ کمزور واقع ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے علاقے غوری والا ٹیپے پر عمر خیل قابض ہو گئے اور یہاں کے رئیس بن گئے۔

دیگان: گل ایوب سیفی نے اپنی پشتو کتاب ''تاریخ بنوں اور وزیرستان'' میں دیگان کے متعلق لکھا ہے کہ یونین کونسل سشی خیل میں دیگان ایک گاؤں ہے اور دوسرا گاؤں سورنای میں ہے۔ یہ افغان لوگ ہیں۔ افغانستان کے ایک روز کے لئے بننے والے بادشاہ بچہ سقہ کا تعلق انہیں دیگان سے تھا۔ یہ شروع ہی سے سرحدی علاقے میں بنوں کے ہمسائے تھے۔ انہوں نے بنوں کی کچھ زمین پر قبضہ کر لیا۔

فاطمہ خیل: یہ بھی ایک ایسا بنوچی قبیلہ ہے جو اصلاً توشیتکی یعنی بنوچی نہیں لیکن قدیم عرصے سے منگل قبیلے میں یہاں رہ رہے ہیں۔ ان کا مسکن تپہ تپئی میں میرا خیل

اور اسماعیل خیل کے درمیان کا علاقہ ہے اور انہوں نے بنوچیوں سے مخاصمت کی بنا پر یہاں سے نقل مکانی کی۔ تاہم ایک گاؤں کریم خان فاطمہ خیل کے نام پر موجود ہے۔

داؤد شاہ: دراصل داؤد شاہ سڑبنی پٹھانوں میں سے خلیل (مہمند) کی ایک شاخ میں سے ہے۔ اس قبیلے کے اسلاف میں سے ایک بزرگ یہاں پر دینی علوم کے حصول کے لئے آئے تھے اور ان کی اولاد نے یہیں پر سکونت اختیار کی اور کچھ زمین خرید لی۔ اس لحاظ سے داؤد شاہ کے لوگ بنوں کے مستقل اور اصل باشندے نہیں تھے۔

تیر خیل: تیر خیل کے اسلاف پہلے پہل یہاں پر آئے تو بنوچیوں کے ہاں دہقان ہوئے۔ بعد میں انہوں نے اپنے مالکوں سے آزادی حاصل کر لی۔ ان کی دوسری نسل تور خیل کے نام سے متعارف ہوئی۔ ان کا کوئی ایک مستقل گاؤں یا ٹھکانہ نہیں بلکہ اکثر دیہاتوں میں ان کے صرف دو تین گھرانے ہوتے ہیں اور یہ جہاں بھی گئے زمینیں خرید کر سکونت اختیار کی۔

قریش اور اخوند: قریش کے وہ گھرانے جنہوں نے علم دین حاصل کیا اور عالم ہو گئے تو وہ اخوند ہو گئے۔ اخوند اس شخص کو کہا جاتا ہے جو علم دین پر عبور رکھتا ہو۔ معاشرے میں انہیں باوقار مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ اخوند قریش ہی میں سے ہو مگر بنوں میں جو بھی عالم دین ہو اسے قریش سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ قریش عربی النسل لوگ ہیں اور جو عربی لشکر یہاں آئے یا یہاں سے گزرے تو ان میں سے اکثر قریشی بیمار ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے یہاں ٹھہر گئے اور وہ اپنی مخصوص شناخت قریش کے ساتھ یہاں پر بس گئے یا یہ کہ یہ لوگ ان اسلامی لشکروں کے ساتھ سیستان و کرمان وغیرہ میں ٹھہر گئے اور جب بنوں آباد ہونے لگا تو کچھ لوگ یہاں بھی آ گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ سادات میں سے بھی تھے۔ ان قریشیوں، سادات اور اخوندزادوں کو بنوں کے لوگوں نے مفت زمینیں دیں جو انہوں نے آباد کیں اور مستقل سکونت اختیار کر کے یہاں کا طرز تمدن اپنا لیا۔

کنڈے: یہ مروتوں کی ذیلی شاخ ہے جو کہ بنوں میں کنڈی کے نام سے آباد ہے۔

وحید دان: یہ بھی مروتوں کی ایک ذیلی شاخ سے تعلق رکھنے والی قوم کے لوگ ہیں جو کہ بنوں کے مروت قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ضندکی: یہ بھی مروتوں ہی کی ذیلی شاخ سے تعلق رکھنے والی بنوں کی ایک قوم ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے خاندان بھی ہیں جو کہ مروتوں کی ذیلی شاخوں سے تعلق رکھنے والے گھرانوں پر مشتمل ہیں۔

ملا خیل: عصر حاضر میں ملا خیل قوم کے لوگ مروت اس وجہ سے کہلاتے ہیں کہ یہ مروتوں کے ساتھ مکمل طور پر خلط ملط ہو چکے ہیں۔ مروت قوم کے جتنے بھی دیہات و مضافات ہیں ان میں ملا خیل کے کچھ نہ کچھ گھرانے آباد ہیں۔ ان کو لوگ مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ بعض انہیں فقیر کہتے ہیں بعض ملا عثمان، بعض بیٹنی اور بعض انہیں شیخ کے نام سے پکارتے ہیں۔

ممریز خیل: یہ ایک ایسی قوم ہے جس کا زیادہ تعلق مروت قبیلے کی شاخ بہرام خیل کے ساتھ رہا ہے۔ یہ لوگ بہرام خیل کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بہرام خیل نے انہیں اپنی زمینوں پر آباد کیا۔ بہرام خیل اور ممریز خیل کی آمیزش اس حد تک ہو چکی ہے کہ لوگ انہیں مروت ہی کہتے ہیں۔

مروتوں میں اب دو بڑے گروہ ہیں۔ (1) تور گند (2) سپین گند، یہ دو گروہ نیازیوں سے جنگ کرنے اور انہیں دریائے سندھ سے پار دھکیلنے کے نتیجے میں نمودار ہوئے۔ تور گند گروہ میں مروتوں کی بڑی اقوام غزنی خیل، عیسک خیل، سکندر خیل اور مینا خیل ہیں جبکہ سپین گند میں بڑی اقوام میرا دخیل اور میگو خیل ہیں۔

درے پلارے اولاد: درے پلارے اولاد کا مطلب ہے تین باپوں کی اولاد۔ ان کا مورث سندر ہے۔ سندر کی اولاد میں خدو خیل اور چو خیل شامل ہیں مگر ان کے ساتھ ہی مسٹوری، دلو خیل، زیڑان، ابا خیل اور دلشی خیل پانچ قومیں بھی شامل ہیں۔ یہ پانچ دولت شاہ کی اولاد میں سے ہیں جو ابا شہید کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ ایک نیک سیرت خدا ترس اور پاکباز شخص ہے جو ایک جنگ میں شہید ہوا تھا۔ ان کی اولاد اپنے مورث کی وجہ سے بنوں میں باوقار اور باعزت لوگ سمجھے جاتے ہیں اور انہوں نے مروتوں کی ہر جنگ میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے مروتوں کے سندر کی اولاد کے ساتھ ان کو بھی حصہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ابا شہید اور سندر کی اولاد کی نسبت سے ان کو درے پلارے اولاد کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک باپ کی اولاد اچو خیل ہے، دوسرے باپ کی اولاد خدو خیل ہے اور تیسرے باپ دولت خان المعروف ابا شہید کی اولاد میں متذکرہ پانچ اقوام مٹوری، دلو خیل، زیڑان، ابا خیل اور دشی خیل شامل ہیں۔ یہ سب درے پلارے اولاد کے نام سے مشہور ہیں۔

نیازی: بنوں کا ایک ضلع جسے لکی مروت کہتے ہیں۔ اس علاقے میں پہلے نیازی آ کر آباد ہوئے تھے۔ نیازیوں اور مروتوں کے آباؤ اجداد میں چچا اور بھتیجے کا رشتہ تھا۔

جب نیازی دریائے سندھ کے مغربی کنارے موجودہ لکی مروت میں آ کر آباد ہوئے تو انہوں نے اس علاقے کی زمینوں کی شادابی اور آب وہوا کو اپنے موافق حال پا کر یہاں مستقل قیام کیا۔ بعد میں انہوں نے مروتوں کو بھی بلا لیا جو کہ مغرب کی طرف سے مختلف قوموں سے لڑتے بھڑتے یہاں پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ تک تو نیازی اور مروت دونوں مل جل کر یہاں رہتے رہے مگر بعد میں ان میں اس حد تک اختلاف پیدا ہو گیا ان کے درمیان خونریز معرکہ ہوا جس کی وجہ سے نیازی نقل مکانی پر مجبور ہو گئے اور وہ دریائے سندھ کو پار کر کے مشرق کی طرف چلے گئے۔ نیازیوں کا شجرہ نسب کچھ اس طرح سے ہے کہ ان کا مورث اعلیٰ ابراہیم المعروف لوری ابن شاہ حسین ابن غلجی ابن بیٹن ہے۔ اس لحاظ سے نیازی اور مروت بیٹنی پٹھان ہیں۔ نیازیوں کا شجرہ:

ابراہیم المعروف لودی

سیانی نیازے دوتانڑے

اس کا مطلب یہ ہے کہ نیازی لودی کی اولاد ہیں۔ نیازیوں کی ذیلی شاخوں میں مہیار اور سرہنگ مشہور شاخیں ہیں۔

پوٹی: یہ ایک قدیم قوم ہے جو کہ نیازیوں کی آمد تک لکی کے وسیع ترین علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے قبل یہاں ہندوؤں کی اقوام آباد تھیں مگر جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر چودھواں حملہ اس طرف سے کیا تو یہاں کی ہندو آبادیاں منتشر ہو گئیں اور وہ ہندوستانی علاقوں میں چلی گئیں تو یہاں پر پوٹی قوم کے لوگ آباد ہو گئے مگر جب نیازی یہاں پر آئے تو انہوں نے یہاں سے پوٹی قوم کے لوگوں کو نکال دیا اور خود یہاں قابض ہو کر وسیع و عریض علاقے میں اپنی آبادکاری کی اور زمینوں کو خوب آباد کیا اور قابل کاشت بنایا۔ پوٹی قوم کے مذہب کے بارے میں تا حال کوئی سراغ نہیں مل سکا کہ یہ ہندوؤں کی کوئی شاخ ہے یا یہ کہ کسی اور مذہب سے ان کا تعلق تھا یا یہ لوگ لامذہب تھے۔

مروت: بنوں کی تاریخ و ثقافت میں مروت قبیلے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ بنوں کی سرزمین پر ان کے قدموں کی چھاپ کا زمانہ تاخیر پر مبنی ہے مگر اس قبیلے کی اثر انگیزی کا یہ حال ہے کہ اس وقت بنوں کا تذکرہ مروتوں کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہوتا ہے۔ حالات و واقعات نے انہیں کئی قدیم جنگجو یا قبیلوں سے نبرد آزما ہونے پر بھی مجبور کیا اور انہوں نے اپنی جنگی صلاحیتوں اور اپنے ہمسایوں اور قومی رشتے سے منسلک اقوام کی حمایت و تائید حاصل کرنے کی اہلیتوں کا بھی ثبوت دیا ہے۔

مروت قبیلے کی تین بڑی شاخیں ہیں (1) درے پلارے (2) بہرام خیل اور (3) موسیٰ خیل۔

خٹک: خٹک قبیلے کے لحاظ سے ایسی قوم کے افراد ہیں جو کہ صوبہ سرحد کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پٹھان قبائل میں قابل ذکر قبیلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خٹک قوم کے لوگوں میں کوہ باش قبائل کی ہمت کے اوصاف بھی ہیں تو ساتھ ہی زیر انتظام اضلاعی بندوبستی علاقوں کی تہذیب و تمدن کی علمبرداری میں بھی صف اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا قبیلہ ہے جس کے افراد نے ہر جغرافیائی ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں ذہانت اور بردباری کا ثبوت دیا ہے۔

خٹک قبیلے کے لوگ غورغشت کی اولاد ہیں۔ بنوں میں ان کی آمد کا زمانہ وہی ہے جو شیشکوں کا ہے۔ جب شیشک یہاں پر آ کر آباد ہوئے تو خٹک مغرب کی طرف سے آئے اور شیشکوں پر حملہ آور ہوئے اور بہت سا علاقہ شیشکوں سے چھین لیا مگر بعد میں شیشک قبیلے کے لوگ ان خٹکوں پر حملہ آور ہوئے اور خٹکوں کو شمال مشرق کی پہاڑیوں کی طرف دھکیل دیا۔ خٹک قبیلہ کے لوگ جغرافیائی لحاظ سے پانچ حصوں میں منقسم ہیں سینی خٹک، اکوڑہ خٹک، ساغری خٹک، بنگی خیل اور بولاق۔ خٹکوں کی بنوں آمد کے سلسلے میں پروفیسر پریشان خٹک اپنی کتاب ''پشتون کون؟'' میں لکھتے ہیں کہ:

''آثار و قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ شوال سے ہجرت کر کے خٹک بنوں میں تھوڑے عرصے کے لئے نہر سدراونڈ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے میں آباد ہوئے مگر یہ علاقہ ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں تھا چنانچہ مشرق کی طرف کوچ کر کے سوترہ کی وادی میں آ گئے۔'' آگے کی سطروں میں پریشان خٹک بنوں سے خٹکوں کے خروج کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ: ''یہ لوگ شوال کی خوشگوار آب و ہوا کے عادی تھے، بنوں کی گرم آب و ہوا میں ان کے لئے رہنا مشکل تھا۔''

پروفیسر پریشان خٹک کے بیان کے مطابق خٹک قبیلے نے بنوں کی سرزمین برضا و رغبت اپنی ضروریات اور آب و ہوا کو اپنے لئے غیر موافق سمجھتے ہوئے چھوڑی اور ان کا انخلاء کسی بیرونی دباؤ کی بناء پر نہیں ہوا جبکہ دیگر محققین اور تاریخ نگاروں نے بنوں سے خٹکوں کے انخلاء کی وجہ شیشکوں کی طرف سے ان پر دباؤ بتائی ہے۔

گل ایوب خان سیفی اپنی پشتو کی کتاب ''بنوں او وزیرستان تاریخ'' میں لکھتا ہے کہ ''وہ لوگ جنہیں بنوچی کہا گیا ہے وہ 1400ء میں بنوں آئے تھے اور ان سے قبل یہاں منگل اور خٹک قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ 1200ء اور 1300ء میں یہاں آباد ہوئے تھے۔'' کتاب میں آگے چل کر سیفی لکھتا ہے کہ ''کرم کے

بائیں جانب خٹک آباد تھے۔ بنوچی ان کے مقابلے میں زیادہ مضبوط تھے اس لئے انہوں نے کرم سے متصل علاقے سے خٹک قبیلے کے لوگوں کو پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا۔ اب یہ خٹک کرک' کوہاٹ، نوشہرہ اور کچھ کچھ عیسیٰ خیل' کیمبل پور، مردان، پشاور، لکی مروت، بنوں، صوابی اور مالاکنڈ میں آباد ہیں۔''

شجرہ نسب کے لحاظ سے خٹک کرلانڑیں ہیں۔ کرلان کے دو بیٹے تھے، ان کا شجرہ کچھ اس طرح سے بنتا ہے۔

کرلان

(1) کودے (2) ککے

برہان ورک اتمان مانے لقمان خوگے منگلے

خٹک

یعنی خٹک کودے کے بیٹے لقمان کی اولاد ہیں۔

مرزا خیل: یہ اتمان خیل شاخ میں سے مروت ہیں۔ گل ایوب خان سیفی کا کہنا ہے کہ ''مرزا خیل قوم میں سے ان کا ایک بزرگ خٹک کے نام سے مشہور تھا، اس نام کے مغالطے کی بناء پر بعض لوگ انہیں خٹک سمجھتے ہیں جو کہ حقیقت سے بعید بات ہے''۔

خان خیل: یہ اصل میں علاقہ خیسور سے نسبت رکھنے کی وجہ سے خیسور قوم کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک شخص جس کا نام خان تھا وہ خیسور سے نقل مکانی کر کے اپنی بیوہ ماں کے ساتھ مروتوں کی ایک شاخ دولت خوازی کے پاس آ کر رہنے لگا اور وہیں پر شادی کر لی۔ دولت خوازی قوم کے لوگوں نے اسے اپنی زمینوں پر آباد کیا۔ اس کی اولاد خان خیل کے نام سے مشہور ہوگئی۔

گور کے پیران: یہ وہ لوگ ہیں جن کی لوگ اس وجہ سے عزت کرتے ہیں کہ شیخ اورگین کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ اورگین کا اصلی نام شیخ شاہ محمد روحانیؒ ہے اور ان کی اولاد تپہ عیسکی شیخانو میں رہتی ہے۔ اورگین نام کی نسبت سے شیخان بھی کہلاتے ہیں۔ سیفی صاحب کا کہنا ہے کہ ''نار اور گور کہ مروت اصل میں سید ہیں اور یہ گور کہ شیخ شاہ محمد روحانی کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ ان کی اولاد کے لوگ شیخان کہلاتے ہیں۔''

مچن خیل: مچن خیل ایک ایسی قوم ہے جو کہ شروع ہی سے نیازیوں کے ساتھ ان کے علاقے میں رہ رہی تھی۔ ان کا جداعلےٰ ایک نیک اور فقیر طبع شخص تھا جو کہ شیخ مچن کے نام سے مشہور ہوا۔ مچن خیلوں میں سے ایک شاخ غنی مچن خیل' شہباز عظمت خیل بنوں میں اور دوسری مچن خیل ترخیوال غوریوالہ بنوں میں آباد ہے۔ زیادہ مچن خیل مروتوں کے علاقے لکی مروت میں آباد ہیں۔

سادات: بنوں اور مضافات میں سید بہاؤالحق صاحبؒ کی اولاد مدتوں سے آباد ہے۔ ان کی مشہور آبادیاں جھنڈو خیل' کلہ خیل' مستی خان' مریا خیل اور شمسی خیل میں ہیں۔ شمسی خیل کے عنایت شاہ شیخ بہاؤالحق کی اولاد میں سے وقت کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں۔ سید امیر نور علی شاہ جھنڈو خیل مشہور شخصیت ہیں۔

درانی: درانی ایسا قبیلہ ہے جو صوبہ سرحد کے تقریباً تمام علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ درانی خاندان کی بنیاد احمد شاہ ابدالی کے دور میں رکھی گئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے ایک جرنیل کا نام سردار جہان خان تھا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی جب بنوں کے دورے پر آئے اور بنوں کے نظم ونسق سے متعلق اقدام اٹھائے تو اس وقت ان کے جرنیل سردار جہان خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ شاہ بزرگ کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ شاہ بزرگ نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح سردار جہان خان درانی سے کر دیا اور غالباً سردار شاہ جہان درانی کی اولاد ہی ہے جو کہ بنوں میں مقیم ہے اور بنوں کے درانی خاندان کی وسعت کا باعث ہے۔ دوسرا حوالہ مدد خان درانی کا ملتا ہے جو کہ احمد شاہ ابدالی کے دور میں ہی تھا۔ بنوں میں بااثر ملک اور خان تھا۔ ایک مرتبہ بنوں میں اس پر شیر حملہ آور ہوا۔ اس موقع پر بیگو خان موجود تھا اس نے اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے شیر کا کام تمام کر دیا۔ اس بہادری کے صلے میں مدد خان درانی نے بیگو خان کو موضع کلورکوٹ تحصیل میانوالی کا علاقہ انعام میں دے دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدد خان درانی احمد شاہ ابدالی کے پاس پہلے ہی کسی اعلےٰ عہدے پر مقرر تھا۔ اسی لئے بیگو خان کو اتنی بڑی جاگیر بخش دی اور مالی انعام بھی دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درانی خاندان کا اثر احمد شاہ ابدالی کے دور ہی سے بنوں میں تھا۔

بیگو خان: بیگو خیل قوم کی نسبت بنوں کے نامور اور بہادر شخص بیگو خان سے ہے۔ بیگو خان کا شجرہ نسب کچھ اس طرح سے ہے' بیگو خان بن ہاتی خان بن علی خان بن کلئے خان بن بھرت بن اللہ داد خان المعروف دادی خان بن فیروز ہے۔ بیگوں خان کے آباؤ اجداد بھی اپنے خیلوں کے بڑے سردار گزرے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی نے جب مرہٹوں کے خلاف پانی پت کے میدان میں جنگ کی تو اس موقع پر بیگو خان بھی ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدان میں حاضر تھا اور احمد شاہ ابدالی کی حمایت میں لڑا اور خوب داد شجاعت لی۔ بیگو خان کا تعلق چونکہ مروت قبیلے سے تھا اس لئے احمد شاہ ابدالی نے مروتوں پر مالیہ معاف کر دیا اور بیگو خان کو ایک سند بھی

دی۔ بیگو خان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا نواز خان باپ کی جگہ جانشین ہوا۔

غزنی خیل: غزنی خیل دراصل مروتوں کی تورگند شاخ میں سے ہی ہیں اور تورگند شاخ کے سردار ہی عیسک خیل اور غزنی خیل کہلاتے ہیں۔ انگریزوں یا سکھوں کے دور میں غزنی خیل قوم کے مشہور اور قابل ذکر ملک یہ ہیں۔ دوران خان، محبت خان، ارسلا خان اور پردل خان۔

میرادخیل: میرادخیل قوم کے لوگ مروتوں کی شاخوں تورگند اور سپین گند کی دوسری شاخ میں سے ہیں۔ میرادخیل قوم کا جداعلیٰ بہرام ابن سالار تھا اور اسی کی اولاد میراد خیل کہلاتی ہے۔ میرادخیل اس قوم کا جداعلیٰ ہے اور اسی کے نام پر یہ قوم میرادخیل مشہور ہے۔

عیسک خیل: عیسک خیل بھی مروتوں کی ایک شاخ ہے جس کا جداعلیٰ عیسک خان ہے اور اسی کے نام پر عیسک خیل قوم مشہور ہوئی۔ عیسک خیل کا تعلق تورو سپین گند کی شاخ نمبر ایک سے ہے جس کے سردار اچو خان تھے اور اس کی اولاد اچو خیل کے نام سے مشہور ہوئی۔

مینا خیل: مینا خیل بنوں کی ایک مشہور قوم ہے جو کہ مروت قبیلے کے درے پلارے شاخ میں سے ہیں۔ مینا خیل قوم کا جداعلیٰ مینا خان تھا اور اسی کے نام کی نسبت سے یہ مینا خیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ مینا خان کا دادا سکندر خان تھا اس لئے اسے سکندر خیل بھی کہتے ہیں۔

مغل خیل: مغل خیل بنوں کی مشہور قوم ہے۔ اس قوم کے لوگ اصلاً بنوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس قوم کا مورث اعلیٰ حسن خان بنوچی نہیں بلکہ یوسف زئی تھا جو کہ اپنے علاقے یوسف زئیوں کے موضع اوخیل سے قومی دشمنی کی بناء پر امن و عافیت کی تلاش میں اپنے دو بیٹوں عمر خان اور سمل خان کے ہمراہ بنوں آیا تھا۔ پہلے پہلے ہنجلو کے مضافات میں مقیم ہوا اور بعد میں موضع خوجڑی آ گیا۔ حسن خان نے اسی مقام پر وفات پائی اور اس کے دونوں بیٹے جدا جدا رہنے لگے۔

عمر خان غور یوالہ میں آ کر مقیم ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ غور یوالہ اور شمی خیل علاقے میں پنجاب کی سرزمین سے آئے ہوئے جٹ اعوان بھی آباد ہو گئے تھے۔ بعد میں غور یوالہ میں ایسے حالات پیدا ہو گئے جو عمر خان کی سرداری کے لئے بہت موافق ثابت ہوئے۔ عمر خان پورے غور یوالہ کا ملک (سردار) بن گیا۔ عمر خان کی تیسری پشت سے مغل خان نامی ملک بہت بہادر، منصف اور نظم و نسق کی صلاحیت کا حامل تھا۔ اس مغل خان کے نام کی نسبت سے اس کی اولاد مغل خیل بنی جو کہ بنوں کی معروف قوموں میں سے ایک قوم ہے۔

میرزعلی خیل: میرزعلی خیل قوم مروتوں کی شاخ سپین گوند سے تعلق رکھتی ہے اور یہ اصل میں منڈان ہیں اور منڈان سے تعلق رکھنے والے ملک اور سردار ہی میرزعلی خیل قوم سے متعلق ہیں۔

میرھوس خان اس قوم کا نامور شخص گزرا ہے جس نے یہ مقام حاصل کیا کہ بیک وقت منڈان، سوکڑی، فاطمہ خیل اور ہنجل کا سردار بنا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا میر عالم خان اس کا جانشین ہوا۔ 1848ء میں میر عالم خان آف میرزعلی خیل نے بنوں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی جس میں وہ لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور بنوں سے انگریزوں اور سکھوں کو نکلنے پر مجبور کر دیا اور بنوں کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور افغانستان سے امیر دوست محمد خان کے بھائی کو بنوں بلا کر اس کی مدد سے تقریباً نو ماہ تک بنوں میں حکومت کی۔ بعد میں جب انگریزوں کی طاقت بڑھ گئی تو انگریزوں نے دوبارہ بنوں پر قبضہ کر لیا اور میر عالم خان آف میرزعلی خیل کو جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ افغانستان چلا گیا اور وہیں پر وفات پائی۔

نقرہ دین خیل: بنوں کی نقرہ دین خیل قوم کے بارے میں گل ایوب سیفی کا نظریہ یہ ہے یہ اصلاً بنوچی نسل سے تعلق رکھنے والے عیسکی ہیں۔ جبکہ بعض محققین انہیں اکوڑہ خٹک میں شمار کرتے ہیں اور بعض انہیں منگل کہتے ہیں۔ اس قوم کا قائد شادی خان تھا۔ ایوب گل سیفی دلیل دیتے ہیں کہ ''خوشحال خان خٹک نے اپنے دیوان میں اپنا جو شجرہ نسب دیا ہے اس میں شادی خان کا ذکر نہیں۔ اس لئے نقرہ دین خیل قوم کے لوگ اکوڑہ خٹک نہیں ہو سکتے اور شادی خان اس خیل کے پہلے آدمی ہیں جس کا نام بنوچی سرداروں میں شامل ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بنوچی قوم میں کوئی قابل ذکر سردار نہیں ہوا۔ بنوں گزیٹیر میں بنوچیوں کی جن چار بڑی خیلوں کا ذکر آیا ہے ان میں نقرہ دین خیل کا بھی ذکر ہے۔''

بوزید خیل: بوزید خیل قوم کے لوگ بنوں کی مندراخیل شاخ میں سے ہیں۔ اس قوم کا سردار بوزید خان ہے اور اس کے نام کی وجہ سے یہ قوم بوزید خیل کہلائی۔ بوزید خان عبدالخالق کا بیٹا ہے جو کہ صاحب سیف شخص تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے تین سو کسانوں کو قتل کیا تھا۔ اس کے 18 بیٹے تھے۔ بوزید خان کے مرنے کے بعد اس کا

بڑا بیٹا اسد خان جانشین ہوا۔ گل ایوب سیفی کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے اس کی عسکری خدمات کی پذیرائی کے طور پر اسے بہادری کا ایک بڑا تمغہ وکٹوریہ کراس بھی دیا تھا۔

سکندر خیل عیسکی: بنوں کی یہ ایک ایسی قوم ہے کہ جس میں بڑی بڑی نامور شخصیتیں گزری ہیں۔ یہ کوئی مستقل قوم نہیں بلکہ ہر خیل میں سے لوگوں کا تعلق اس خیل سے بنتا ہے۔ اس خیل کے شامولی خان، اسد خان اور کریم خان اپنے اپنے عہد میں قومی ہیرو سمجھے گئے ہیں۔

اسمٰعیل خیل: اسمٰعیل خیل بنوں کی تپی نسل سے تعلق رکھنے والی خیل ہے اور یہ مروتوں کی شاخ سپین گوند سے ہے۔ اسمٰعیل خیل میں بڑے بڑے نامور اور اعلےٰ عہدوں پر فائز لوگ گزرے ہیں۔ غلام اسحٰق خان جو کہ بیوروکریسی کے اعلےٰ عہدوں سے ہو کر صدر پاکستان کے عہدے تک پہنچے، اسی اسمٰعیل خیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

عالم گل خیل: بنوں کی قوم عالم گل خیل مروتوں کی شاخ تورگند میں سے ہے۔

ہندو قومیں: پاکستان بننے سے پہلے تک بنوں میں ہندو قومیں بھی آباد تھیں اور مسلمان اور ہندو مل جل کر بنوں اور مضافات میں رہتے تھے۔ ہندو قوم تاجرانہ ذہن رکھنے والی قوم ہے۔ بنوں کی منڈیوں میں ان کی تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ محمود غزنوی کے حملے سے پہلے یہاں پر ہندوؤں ہی کی آبادیاں تھیں اور جب محمود غزنوی نے 1001ء میں راجہ جے پال کو شکست دی تو یہاں کی ہندو آبادیوں اور ان کے مندروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا جن کے آثار بنوں میں اکرہ کے مقام پر موجود ہیں۔ سلطان محمود غزنوی 1006ء میں بنوں آیا تھا اور اسے باقاعدہ طور پر مسلم آبادی میں شامل کیا۔ اس سے قبل یہاں پر ہندوؤں کی راجدھانیاں تھیں۔ غوری نے ملتان پر حملہ کرنے کے لئے بھی بنوں کا ہی راستہ اختیار کیا تھا اور یہاں پر ایک مشہور گاؤں غوریوالہ میں کیمپ لگایا تھا۔ اس وجہ سے اس گاؤں کا نام غوریوالہ پڑ گیا تھا۔ سلطان شہاب الدین محمد شاہ غوری کی آمد کی وجہ سے بھی ہندوؤں کی راجدھانیاں کمزور پڑ گئی تھیں اور مسلمانوں کا اثر و نفوذ بڑھنے لگا تھا۔ بہر حال ہندوؤں کی آبادیاں مسلمانوں کی آبادیوں کے ساتھ ساتھ تھیں اور یہ سلسلہ پاکستان بننے تک جاری رہا۔

مشہور ہندو خاندان گوروا ڑہ ہے جو کہ دیوان مانک رائے کی قوم تھی۔

گوسائیں، شری لعل جی کا خاندان، دھمیجہ، بگائی، کھتری، ماٹہ اور بھاٹیہ ہیں۔ یہ وہ ہندو خاندان ہیں جو کہ ڈیرہ، بنوں اور مضافات میں رہتے تھے۔

قدیم آریائی اقوام: بنوں میں قدیم ترین اقوام وہ آباد ہوئیں جو کہ آریائی قبیلوں سے تعلق رکھنے والی قومیں ہیں۔ یہ قدیم آریائی قبیلے کے لوگ ہیں جنہوں نے شمالی علاقوں سے نقل مکانی کی اور جنوب کی طرف منتقل ہوئے۔ ان آریائی قبائل کی جو اقوام یہاں آباد ہوئیں ان میں لکی، برت، مندیر، شادیو، ہنجر اور سکری شامل ہیں۔ بنوں میں ان تمام ناموں کے دیہات موجود ہیں جو دراصل ان ناموں کی اقوام کے مسکن تھے اور آج تک ان اقوام کے ناموں سے منسوب آباد علاقے ہیں۔ ان اقوام کی سب سے بڑی راجدھانی "اکرہ" تھی جو کبھی ان لوگوں سے آباد اور سرسبز و شاداب آبادی تھی۔ اب اکرہ آثار قدیمہ کے ماہرین کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے علاوہ قدیم آبادی نورڑ بھی ہے۔ اس کے علاوہ بنوں کی قدیم آبادیوں اور اقوام میں اوجڑی اور طوغل بھی شامل ہیں۔

مقامی خصوصیات

غوریوالہ: بنوں میں یہ ایک مشہور گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پر محمد شہاب الدین غوری ملتان جاتے ہوئے ٹھہرے تھے اور یہاں پر کیمپ لگایا تھا۔ جہاں محمد شہاب الدین غوری کی فوجیں ٹھہری تھیں اس جگہ کو غوریوالہ کہا جانے لگا۔

لکی مروت: یہ بنوں ریجن کا ایک بڑا ضلع ہے جہاں بنوں کی بڑی قوم مروت آباد ہے۔ مروتوں کی وجہ سے اسے لکی مروت کہا جاتا ہے۔ علاقے کی وجہ شہرت مروت قوم کی آبادی ہے۔

ٹھٹھی مچن خیل: اس مقام پر مروتوں کے قبیلے موسیٰ خیل والوں کی جنگ نیازیوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ جنگ موسیٰ خیل قبیلے کے سردار دلاور ملک قتل خان کی سرکردگی میں ہوئی تھی۔ اس جنگ کی وجہ سے ٹھٹھی مچن خیل کے مقام کو یاد کیا جاتا ہے۔

دلیپ فورٹ: جب ایڈورڈ بنوں کا حاکم تھا تو اس نے بنوں اور مضافات میں قلعہ نما مکانات کو مسمار کروا دیا اور پھر بنوں میں یہ قلعہ بنوایا۔ یہ قلعہ ایڈورڈ نے سکھ فوجیوں کی مدد سے بنوایا تھا اس لئے اس کا نام مہاراجہ دلیپ سنگھ کے نام پر دلیپ فورٹ رکھا۔

دلیپ نگر: ایڈورڈ ہی نے بنوں کے مشہور بازار کا نام بھی مہاراجہ دلیپ سنگھ کے نام پر رکھ دیا۔ پہلے یہ بازار لعل باز خان کے نام سے مشہور تھا۔ اگرچہ ایڈورڈ نے قلعے کا نام دلیپ فورٹ اور بازار کا نام دلیپ نگر رکھ دیا مگر بنوں کے لوگوں نے ان ناموں کو دل

سے قبول نہ کیا اور دلیپ فورٹ کو صرف قلعہ اور دلیپ نگر کو صرف بازار کے نام سے پکارا اور اب تک بنوں کے لوگ انہی ناموں سے ان دونوں مقامات کو یاد کرتے ہیں۔

گڑھی میر عالم خان: بنوں کے ایک مرد مجاہد میر عالم خان کے نام پر یہ موضع آباد ہے۔

سپینے تنگی: اس مقام پر انگریزوں کے خلاف وزیر اور خٹک قبیلے کا ایک بہت بڑا جلسہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی میں ہوا تھا۔ یہی مقام خٹک اور وزیر قبیلے کے مابین سرحد ہے۔ جب یہ جلسہ ہو رہا تھا تو انگریزی فوج نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور فائر شروع کیا جس سے سینکڑوں افراد شہید ہوئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ یہ واقعہ جلیانوالہ باغ سے کسی طرح کم نہیں مگر خٹک اور وزیر قبیلے کی اس قربان گاہ کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ اس واقعے کا بڑا ہیرو ایوب خان تھا۔

بنوں میں ہاتی خیل وزیر میں ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی وجہ خصوصیت قاضی فضل قادر نامی شخص ہے جو کہ اس مقام کا رہنے والا تھا اور خلافت کمیٹی میں سرگرم کارکن بھی تھا۔ اسے اس مقام کا ہیرو مانا جاتا ہے۔

جھنڈو خیل: بنوں میں یہ مقام نہایت اہم اور تاریخی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بنوں کی تاریخ میں یہاں ہندو لڑکی اسلام لائی جو اسی مقام پر پیدا ہوئی تھی۔ یہیں کے سادات گھرانے کے سید امیر نور علی شاہ کے عقد نکاح میں آئی' اس واقعہ نے بنوں کی تاریخ میں بڑی شہرت حاصل کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا' جس کے نتیجے میں لڑکی کو اس کے ہندو ورثاء کے حوالے کیا گیا۔ فقیر اپی اس سانحہ کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ اس لڑکی کا نام رام کوری تھا۔ جس کا اسلامی نام اسلام بی بی رکھ دیا گیا۔ اپی کا یہ جہاد انگریزوں اور ہندوؤں کی بے انصافی کی خلاف تھا۔ جس میں دونوں طرف سے کئی لوگ شہید ہوئے اور مارے گئے۔

اپی کلے: اس مقام کا تعلق حاجی میر زعلی خان سے ہے جو کہ تاریخ میں فقیر اپی کے نام سے زندہ ہے۔ حاجی میر زعلی خان کی وجہ سے اپی کلے نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

بارانڈیم: بنوں شہر کے شمال مغرب میں دریائے کرم پر ایک ڈیم بنایا گیا ہے، اس مناسبت سے اسے بارانڈیم کہا جاتا ہے اور یہی اس مقام کی وجہ شہرت ہے۔

اکرہ: بنوں میں یہ ایک قدیم پرانی بستی ہے۔ یہاں قدیم آریائی قبائل کے مسکن تھے جو اب کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ علاقہ آثار قدیمہ اور کھنڈرات کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور یہاں پر ماہرین آثار قدیمہ نے بہت کام کیا ہے۔ یہاں سے قدیم نوادرات برآمد ہوئے۔ ان آثار قدیمہ کی وجہ سے یہ علاقہ مشہور ہے۔

پکوان اور کھانے کے طور طریقے

بنوں قدیم روایتی پشتونوں کا مسکن ہے جہاں ان کی روایتی زندگی کے طور طریقے تا حال بدستور قائم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بنوچیوں، مروتوں اور بنوں میں مقیم دیگر اقوام کے طرز پکوان میں بھی یکسانیت ہے۔ بنوں اور مضافات میں روٹی گندم اور مکئی کے آٹے کی پکائی جاتی ہے۔ مضافات میں لوگ زیادہ تر مکئی کے آٹے کی روٹی پکاتے ہیں۔ شہر کے گھروں اور ہوٹلوں میں روٹی توے پر پکائی جاتی ہے۔ تو ابہت بڑا ہوتا ہے اس پر روٹی بڑی چوڑائی میں پکائی جاتی ہے۔ لکی مروت ضلع کے لوگ جو روٹی پکاتے ہیں یہ مخصوص طرح کی روٹی ہوتی ہے۔

لغن: یہ ایک قسم کی روٹی ہے جو بنوچیوں میں عموماً جبکہ لکی مروت میں مروت قوم کی خوراک میں خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔ یہ گندم کے آٹے کی چوڑی اور موٹی روٹی ہوتی ہے جسے بڑے سے توے پر پکایا جاتا ہے۔ جب روٹی پک جاتی ہے تو یہ خستہ قسم کی روٹی ہوتی ہے۔ اسے اس طرح کھایا جاتا ہے کہ چنے کی دال کا شوربہ مٹی کی بڑی سی ہنڈیا میں تیار کیا جاتا ہے۔ شوربے میں پانی زیادہ ہوتا ہے پھر اس لغن روٹی کے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں اور چنے کی دال سے پکے ہوئے شوربے کو بڑے سے برتن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس شوربے میں لغن روٹی کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں جب اس روٹی کے ٹکڑے شوربے کو جذب کر لیتے ہیں تو سب گھر والے ایک ہی جگہ پر اکٹھے ہو کر یہ کھانا کھاتے ہیں۔ یہ مروجہ طریقہ ان کے ہاں عہد بہ عہد تواتر سے تا حال جاری ہے اور مروتوں کے قدیم گھرانوں میں مہمانداری کا بھی یہی طریقہ ہے۔ یہ نہایت ہی مقوی اور زود ہضم غذا ہوتی ہے۔

مکئی کی روٹی: بنوں کے عام و خاص گھرانوں میں مکئی کی روٹی کھانے کا رواج عام ہے۔ اگرچہ گندم کی روٹی بھی پکتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ مکئی کی روٹی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ بنوں شہر کے لوگ عموماً ہر قسم کی سبزی کی ترکاری تیار کرتے ہیں۔ گوبھی' شلغم اور ہر قسم کے ساگ کی ترکاری کو شوق سے استعمال کرتے ہیں اور ان سبزیوں کے ساتھ عموماً مکئی کی روٹی ہی استعمال کرتے ہیں۔

صحبت: یہ وہی روایتی پکوان ہے جسے کہ ڈیرہ اسماعیل خان والے اپنی سرائیکی زبان میں "صوبت" کہتے ہیں اور بنوں اور ڈیرہ کے شہروں اور دیہاتوں میں روایتی پکوان کے طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ بنوں میں یہ خاص پکوان خاص موقعوں پر اور مہمانوں کی مہمان نوازی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں اسے بھی قدرے پرتکلف بنا دیا گیا ہے۔ اس پکوان کے لئے گوشت کا شوربہ تیار کیا جاتا ہے اور جب شوربہ تیار ہو جاتا ہے تو اسے ایک بہت بڑی پرات میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس شوربے میں گندم کے آٹے سے توے کے اوپر بڑی چوڑی روٹی پکائی جاتی ہے۔ یہ روٹی بڑی باریک اور چوڑی ہوتی ہے اور پھر اس روٹی کے ٹکڑے پرات میں ڈالے ہوئے شوربے میں بھگو دیئے جاتے ہیں اور اوپر گوشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اب مہمان نوازی کے طور پر یہ بھی اضافہ کر دیا گیا ہے کہ پرات میں شوربے اور روٹی کے ٹکڑوں پر گوشت کے علاوہ مرغ بھی روسٹ کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

کھانے کا طریقہ: صحبت کے کھانے کا طریقہ اس طرح ہے کہ پرات کے اردگرد سب لوگ بیٹھتے ہیں اور سب اکٹھے مل کر یہ کھانا ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ صحبت کا کھانا بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ صحبت کے کھانے کے بارے میں بنوں والوں کا نظریہ عقیدہ کی حد تک پختہ ہو چکا ہے کہ جس پرات میں یہ صحبت پکوان رکھا ہوتا ہے جتنے بھی لوگ شامل ہوتے رہیں سب کے لئے پورا ہو جاتا ہے اور کمی نہیں آتی۔

بنوں کا حلوہ: بنوں کا سوجی کا حلوہ بہت مشہور ہے۔ یہ حلوہ بنوں کے عام گھرانوں میں بھی پکایا جاتا ہے اور بازاروں میں بھی پکا کر بیچا جاتا ہے۔ گھروں میں پکا ہوا حلوہ عموماً گڑ اور دیسی گھی سے تیار کیا جاتا ہے۔

بنوں کے مصالحہ جات: بنوں کے مصالحہ جات نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ اصلی مصالحہ جات بنوں ہی میں تیار کئے جاتے ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ یہاں سے مصالحہ خصوصیت کے ساتھ خریدتے ہیں۔ یہ مصالحہ تیار کر کے بیچنے والوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ جب دوسرے علاقوں کے لوگ ان سٹوروں سے یہ مصالحہ خریدتے ہیں تو مصالحہ بیچنے والے دکاندار خریدنے والے کے علاقے اور شہر کے بارے میں پوچھتے ہیں اور لوگوں کو ان کے شہر اور علاقوں کے موسمی حالات کے مطابق مصالحہ تیار کر کے دیتے ہیں۔

بنوں کی نسوار: یوں تو سرحد کے تمام علاقوں میں نسوار کا استعمال عام ہے مگر بنوں نسوار کے استعمال میں نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ یہاں کی نسوار بہت مشہور ہے۔ مہمانوں کی ضیافت میں نسوار کا پیش کرنا لازم ہے۔ مہمانوں کو چاہے جتنے بھی مرغن اور قیمتی کھانے پیش کئے جائیں اگر نسوار شامل نہ ہو تو مہمان نوازی میں کسر باقی رہ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ مہمانوں کی طبیعت پر موقوف ہے کہ وہ نسوار استعمال کرتے ہیں یا نہیں مگر میزبان کے فرائض میزبانی میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مہمانوں کو نسوار پیش کرے۔ چنانچہ کھانے کے بعد بنوں کی بنی ہوئی نسوار سب شریک محفل کو پیش کی جاتی ہے۔ یہ رواج امیر و غریب سب گھرانوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔

بنوں کی کھجوریں: بنوں کا بیشتر علاقہ ریتلا ہے جہاں جگہ جگہ کھجوروں کے درخت ہیں۔ اس لئے بنوں میں بہترین کھجوریں پیدا ہوتی ہیں اور نخلستانی علاقوں سے کھجوریں شہر میں لائی جاتی ہیں۔ بنوں کے عام گھرانوں میں کھانے کے اوقات میں کھانے کے بعد کھجوروں کا استعمال عام ہے۔ مہمانوں کی ضیافت بھی اکثر کھجوریں پیش کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو کہ دیگر علاقوں سے بنوں آتے ہیں وہ اپنے ساتھ بنوں کی کھجوریں تحفتاً لے جاتے ہیں ان کھجوروں میں بہت زیادہ گودا ہوتا ہے۔

بنوں کے کیلے: بنوں کے کیلے بہت مشہور ہیں۔ یہ کیلا کافی لمبا اور موٹا ہوتا ہے۔ چھلکا بھی موٹا ہوتا ہے مگر ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ اوپر سے کیلے کا چھلکا گاڑھے زرد رنگ کا ہوتا ہے جس پر سیاہ اور سبزی مائل لکیریں ہوتی ہیں۔ بنوں کی پیداوار میں اس کیلے کو خاص اہمیت حاصل ہے جب بنو چیوں کے ہاں کوئی مہمان آتا ہے تو عموماً ضیافت میں بنوں کا یہ خاص کیلا پیش کیا جاتا ہے۔

چلم: حجروں میں نسوار کے علاوہ چلم بھی رکھی ہوتی ہے جو تمباکو بھر کر حجروں میں آنے والے لوگوں کو پیش کی جاتی ہے۔

پیشے، دستکاریاں، ہنر اور ہنرمند

دوسرے علاقوں کی طرح کمہار، ترکھان، لوہار، گلکار، درزی، چپل ساز، اور اسلحہ سازی جیسے پیشے شامل ہیں۔ ان پیشوں وابستہ لوگوں کے کام کے انداز اور استعمال کی جانے والی اشیاء تقریباً وہی ہیں جو سرحد کے دوسرے علاقوں میں مروج ہیں۔

تاریخی، ادبی اور سماجی شخصیات

غازی دلاسہ خان: غازی دلاسہ خان کے بارے میں بنوں میں پہلے انگریز

حاکم مسٹر ایڈورڈ نے اپنی کتاب ''آے آئران دی پنجاب فرنٹیئر'' میں لکھا ہے کہ دلاسہ خان بنوں کا وہ پہلا ملک اور سردار ہے جس نے ابھی تک ہمارے سامنے اطاعت کا اظہار نہیں کیا۔ یہ اپنے ہموطنوں کی نسبت سکھوں کے بارے میں اپنے دل میں سخت نفرت اور عناد رکھتا ہے۔ ایک ایسا بھی موقع آیا کہ دیوان تارہ چند کی کمان میں آٹھ ہزار کے لشکر کو دلاسہ خان نے شکست دی۔ اس جنگ میں غازی دلاسہ خان کے ہاتھوں دوسو سکھ فوجی مارے گئے تھے اور پانچ سو فوجی زخمی ہوئے۔ ایڈورڈ لکھتا ہے کہ میرا یقین ہے کہ اس جنگ میں سکھوں کی طرف سے کمانڈر فرانسیسی جرنیل کوٹ تھا۔

دوسری مرتبہ سکھوں نے اپنے جرنیل سوچیت سنگھ کی قیادت میں ملک دلاسہ خان کے دیہات پر حملہ کیا تھا۔ یہ فوجی دستہ بے شمار سکھ فوجیوں پر مشتمل تھا اور دو روز تک ملک دلاسہ خان کے دیہات کا محاصرہ کئے رکھا لیکن دلاسہ خان اس سکھ فوجی دستے کے نرغے سے نکل گیا۔ جب سے سکھوں نے بنوں کی سرزمین پر قبضہ کیا تب سے سکھ ملک دلاسہ خان سے کانپتے رہے۔ مختصراً یہ کہ دلاسہ خان نے ساری عمر سکھوں کے ساتھ لڑتے بھڑتے ہی زندگی کے شب و روز گزارے جس کی وجہ سے لوگ اسے غازی دلاسہ خان کہنے لگے۔ ایڈورڈ لکھتا ہے'' جب میں بنوں میں داخل ہوا تو ملک مذکور میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ میں ایڈورڈ پر اعتماد اور بھروسہ کر سکتا ہوں؟'' ایڈورڈ لکھتا ہے کہ واقعی اگر میں بیچ میں نہ ہوتا تو سکھوں اور ملک دلاسہ خان کے لوگوں میں ایک بہت بڑی جنگ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غازی دلاسہ خان بنوں کے ایک گاؤں داؤد شاہ میں رہنے والا ایک بہادر بنوچی تھا۔ مسٹر ہربرٹ کے مطابق دلاسہ خان بنوں کے مقام موضع داؤد شاہ میں 1778ء میں پیدا ہوا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد سکھوں نے جب پنجاب پر قبضہ جما لیا تو اس کے بعد سکھوں نے صوبہ سرحد کی طرف رخ کیا۔ اس پر غازی دلاسہ خان کی غیرت و حمیت جاگ اٹھی اور اس نے اپنی مٹی کو سکھوں کی یلغار سے محفوظ رکھنے کی خاطر اور قبیلے کی مدافعت کے لئے اپنی قوم اور قبیلے کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور سکھوں سے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لئے ان میں جذبہ جہاد پیدا کیا اور سکھوں کے خلاف اپنی قوم اور قبیلے کی حمایت کے ساتھ اعلان جہاد کر دیا۔

سکھ اکثر بنوں کے علاقے سے خراج وصول کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق سکھ جب بھی دلاسہ خان سے خراج وصول کرنے کا مطالبہ کرتے تو دلاسہ خان اس کے جواب میں ایک گائے ذبح کر کے سکھوں کے کیمپوں میں پھنکوا دیتا۔

بایزید انصاری: بنوں سے متصل آزاد علاقے وزیرستان میں ایک مشہور مقام کانی گرم میں پشتونوں کا ایک مشہور قبیلہ ارمڑ آباد تھا۔ اس ارمڑ کی ایک شاخ برکی ہے۔ اس قبیلے کی زبان برگستا تھی۔ بایزید انصاری کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ ان کا شجرہ نسب کچھ اس طرح سے ہے۔

بایزید انصاری بن عبداللہ بن محمد اسماعیل بن بایزید اول بن شیخ محمود بن شیخ سراج الدین بن شیخ ابراہیم دانشمند انصاری اور پھر یہ سلسلہ حضرت ابو ایوب انصاری تک پہنچ جاتا ہے۔

لودھی خاندان کا سلسلہ شیخ حمید لودھی سے شروع ہوتا ہے جو کہ راجہ جے پال کے وقت سے ملتان کا حاکم تھا اور پھر بعد میں سلطان محمود غزنوی نے بھی اسے ملتان کی جاگیر کا جائز وارث قرار دیا۔ یہ پشتون تھا اور جب اس کی اولاد یعنی لودھی پشتون نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو پہاڑی علاقوں کے پشتون نے بھی ہندوستان کے میدانی علاقوں کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ارمڑ قبیلے کی شاخ برکی بھی ہندوستان کے میدانی علاقوں کی طرف چلی گئی اور انہوں نے جالندھر کو اپنا مسکن قرار دیا۔ ان کے ساتھ انصاری خاندان کے کچھ لوگ بھی جالندھر آ گئے۔ کانی گرم کے پہاڑی علاقے کے انصاریوں اور جالندھر کے انصاریوں کے درمیان باہمی رشتے داری تھی۔ بایزید انصاری کے دادا شیخ محمد اسماعیل انصاری کانی گرم میں مقیم تھے۔ جالندھر میں شیخ محمد اسماعیل انصاری نے بی بی آمنہ کا رشتہ اپنے ایک بیٹے کے لئے مانگا تو حاجی ابوبکر انصاری نے یہ شرط رکھ دی کہ شادی کے بعد داماد کو کانی گرم سے آ کر جالندھر میں رہائش اختیار کرنی ہوگی۔ چنانچہ مشروط شادی ہوگئی مگر تھوڑے عرصے کے بعد شیخ محمد اسماعیل کا یہ بیٹا فوت ہوگیا اور بی بی آمنہ بیوہ ہوگئی۔ پشتون کے رواج کے مطابق شیخ محمد کے دوسرے بیٹے عبداللہ نے اپنی بیوہ بھاوج کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ عبداللہ کی دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی اس نے کانی گرم میں کی تھی۔ اس بیوی کے بطن سے اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام یعقوب تھا۔ عبداللہ دوسری شادی کے بعد تقریباً دو سال تک جالندھر میں ٹھہرا رہا اور بی بی آمنہ کے بطن سے 1542ء میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام بایزید انصاری رکھ دیا گیا۔ چونکہ عبداللہ کا والد اپنے علاقے کانی گرم کا معزز اور قاضی تھا اور اس کے بعد عبداللہ ہی نے اپنے باپ کا جانشین بننا تھا اس لئے وہ واپس جالندھر سے کانی گرم آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بابر پشتون کے علاقے کے قبائل کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ پشتون سے نمٹنے کے بعد بابر جب ہند کی طرف متوجہ ہوا تو جالندھر تک پہنچ گیا اور وہاں کے

پشتون سے بھی برسرپیکار ہوا۔ پشتون نے بابر کو یہ یقین دہانی کروائی کہ ہم اس کے ساتھ معاندانہ رویے اور تعلقات کے خواہاں نہیں۔ اس لئے ہمارے قافلوں کو بآسانی اپنے علاقے کی طرف کوچ کرنے کی اجازت دی جائے جس پر بابر نے ان کے لئے امن کا فرمان جاری کیا۔ ان پشتون کے قافلے میں انصاری قبیلہ بھی شامل تھا جو کہ شیخ خداداد کی سرکردگی میں کانی گرم پہنچا جس میں بی بی آمنہ اور بایزید انصاری بھی تھے لیکن کانی گرم میں قاضی عبداللہ کی پہلی بیوی فاطمہ کے ساتھ بی بی آمنہ کے تعلقات غیر خوشگوار ہونے لگے تو بی بی آمنہ واپس جالندھر آ گئیں مگر بایزید انصاری کو اپنے باپ عبداللہ کے پاس ہی چھوڑ دیا جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہونے لگی۔ اپنے علاقے کے ایک مہربان استاد پائندہ کے فیض سے بایزید انصاری علم و فضیلت اور معرفت و طریقت کے راستے پر چلنے لگے۔

بایزید انصاری مغل بادشاہوں کے مدمقابل ایک ایسے مرد آہن تھے۔ جنہوں نے بڑے بڑے پشتون قبائل خصوصاً آفریدی، اورکزئی اور بنگش قبائل کو مغلوں کے خلاف ایک متحدہ طاقت بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔ بایزید انصاری نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی یہ تحریک روشنائی کے نام سے متعارف ہوئی اور بایزید انصاری اس تحریک کے روحانی پیشوا تھے۔ جنہیں ان کے مرید پیر ادشان کہتے ہیں۔

مذہبی حیثیت سے اس تحریک کی بنیادیں کچھ روحانی مسلک پر استوار ہیں جس کی وجہ سے یہ تحریک بہت جلد دیگر پختون قبائل میں بھی پھیل گئی حتیٰ کہ پختونوں کے سب سے بڑے قبیلے یوسفزئیوں میں بھی اس روشنائی تحریک کے اثرات پھیلنے لگے۔ لہٰذا اس تحریک نے پشتون یا پختونوں میں ایک قسم کی تنظیمی کیفیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی مذہبی جذبے کو بھی فروغ دیا۔

بایزید انصاری کے مریدوں میں مرد و خواتین برابر شامل ہوتے اور مجلس میں عورتیں اور مرد ایک ہی جگہ پر بیٹھتے۔ یہ بایزید انصاری کی جدت تھی کیونکہ کانی گرم میں اس قسم کا رواج نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ پشتون روایات کی نفی تھی۔ لیکن اس بارے میں بایزید فرماتے ہیں کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ سماع یعنی سرود کی تین قسمیں ہیں، حرام، مباح اور حلال۔ اگر باجے وغیرہ کی آواز دنیا کی محبت کے لئے سنی جائے تو حرام ہے اور اگر جنت کی محبت میں سنی جائے تو مباح ہے اور اگر کسی نے اللہ کی محبت کے لئے سنی تو وہ حلال ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کرتے تھے کہ میں اور میرے مرید درست راستے پر ہیں اور ہمارے علاوہ سب گمراہ اور شرک میں مبتلاء ہیں۔ پس ان عقائد کی بناء پر کانی گرم کے علماء ان کے خلاف ہو گئے لیکن علاقے کے بااثر خاندان کے فرزند ہونے کی بناء پر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ تاہم ان کے جدید مذہبی خیالات کی وجہ سے ان کے والد قاضی عبداللہ بھی ان سے الجھتے رہتے تھے۔ بایزید انصاری تمام نامساعد اور غیر موافق حالات کا پامردی سے مقابلہ کرتے رہتے اور اپنے مذہبی نظریات و عقائد کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے رہے۔ جس کی وجہ سے ان کا حلقہ ارادت و عقیدت وسیع تر ہوتا گیا۔ مرید ان کی تعظیم و توقیر بطرز احسن کرتے تھے۔ ان کی نظر میں بایزید ایک پیر کامل اور مرد مکمل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا وجود اللہ کی طرف سے رشد و ہدایت کے لئے ہے۔ حالنامے کی تحریر کے مطابق مریدوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے غیب سے آواز سنی ہے کہ بایزید کو اب پیر روشن کے نام سے پکارا جائے چنانچہ تب سے مرید انہیں پیر روشن کے نام سے پکارنے لگے۔ اس کے بعد بایزید نے دیگر علاقوں کی طرف رخ کیا۔ جہاں بھی جاتے ان کی فصاحت کلام اور جادوئی شخصیت سے لوگ متاثر ہو کر ان کے حلقے میں شامل ہو جاتے۔ بایزید تیراہ کے علاقے میں آئے اور وہاں اورکزئی، شنواری اور آفریدی قبائل نے ان کے مذہبی خیالات و نظریات کو قبول کیا۔ اس طرح اب ان کا حلقہ اثر وسیع تر ہو گیا جس پر مغل حکمرانوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ دراصل اس وقت کے رواجی اور رسمی پیر، بایزید کی بڑھتی ہوئی روحانی طاقت و جمعیت کو پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا وہ بھی مغل حکمرانوں کو بایزید کے خلاف ورغلانے لگے۔ چونکہ یہ علاقہ مرزا حکیم کی فرمانروائی میں شامل تھا لیکن پشتون قبائل کے روایتی طرز معاشرت اور بااختیار زندگی گزارنے کے ڈھنگ کی وجہ سے پشتون کا یہ علاقہ عملاً مرزا حکیم کی فرمانروائی سے آزاد تھا جبکہ بایزید انصاری کی اس مذہبی اور کسی حد تک سیاسی شعور کی بیداری کی تحریک نے انہیں مزید اس جرات کی ترغیب دی کہ وہ مغلوں کی کسی بھی قیادت کو تسلیم نہ کریں۔ یہ صورتحال اکبر اعظم کے لئے سیاسی مصلحت کی بناء پر اس لئے بہتر تھی کہ وہ خود یہ چاہتا تھا کہ مرزا حکیم اطمینان سے حکومت نہ کر سکے اور اندر ہی اندر وہ کمزور ہو جائے اور اس طرح وہ (اکبر) ان علاقوں پر تصرف حاصل کرنے کا موقع حاصل کر سکے۔ اکبر کی یہ سیاسی سوچ اس کی اس باطنی خواہش سے مربوط تھی کہ مرزا حکیم کے اقتدار کا سورج اس تحریک کے ذریعے غروب ہو اور پھر اس کے بعد وہ جلد یا قدرے بدیر متمتع ہو سکے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ تحریک روشنائی اپنے اثرات کو پشتون کے میدانی علاقوں تک پھیلانے میں کامیاب نظر آنے لگی۔ پشاور اور گردو نواح میں تحریک کے اثرات پہنچ گئے جس سے مروجہ طور طریقوں کے پابند پیر و مشائخ مضطرب و بے چین ہونے لگے اور انہوں نے مرزا حکیم کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ مرزا حکیم نے بایزید انصاری کو طلب کیا اور ان کے خیالات و عقائد کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ بایزید انصاری نے منطق کے ذریعے

اپنے نظریات وافکار کو درست ثابت کر دکھایا تو مرزا حکیم نے احترام و پذیرائی کے ساتھ بایزید انصاری کو اپنے نظریات وعقائد کی تشہیر کے لئے سند اختیار عطا کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بایزید انصاری کا اثر ونفوذ مہمندوں کے علاقوں تک ہونے لگا۔ چنانچہ بایزید ہشتنگر کے علاقے میں آ گئے اور دیگر با اثر شخصیات کو بھی اپنے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ اس وقت کے روحانی سلسلہ کے سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ کی بڑی شہرت تھی۔ بایزید انصاری نے پیر بابا کو بھی دعوتؒ بھیجی پس یہیں سے بایزید انصاری کی اصل مخالفت کا دور شروع ہوا اور پھر باضابطہ طور پر پشتون میں متعارف ہونے والی مذہبی تحریک کو مذہبی جوش وخروش رکھنے والی پیر باباؒ کی تحریک ہی سے ختم کرنے میں مغلوں نے سیاسی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ بہرحال بایزید انصاری جب ہشتنگر کے علاقے میں مقیم ہو گئے تو یہاں کے لوگوں سے رشتے داریاں بھی قائم کیں۔ مختلف اطراف میں اپنے خلیفاء مقرر کئے اور اپنے حلقے میں اہم شخصیات کو شامل کرنے کے لئے دعوت نامے بھیجے۔ اسی قسم کا دعوت نامہ حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ کو بھی ارسال کیا۔ پیر باباؒ کا اپنا بھی ایک وسیع روحانی مسلک کا حلقہ قائم ہو چکا تھا جس میں نامی گرامی روحانی شخصیت حضرت اخوندرویزہ صاحب بھی شامل تھے۔ جب پیر باباؒ کو بایزید انصاری کا دعوت نامہ ملا تو وہ سخت برانگیختہ ہوئے اور فرمایا کہ پشتون پر ایک بڑی آفت نازل ہو چکی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آسانی سے اس سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا چنانچہ پیر باباؒ اور ان کے رفقاء بشمول اخوندرویزہ ہشتنگر کے علاقے میں آئے اور بایزید انصاری سے تین بار مناظرہ کیا۔ اس مناظرے کے دوران بھی حضرت اخوندرویزہ پیش پیش تھے۔ خیر وقت کے ساتھ ساتھ بایزید انصاری کا حلقہ وسیع ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ پیر باباؒ اور اخوندرویزہ کی مخالف تحریک کی وجہ سے لوگوں کے دل میں بایزید انصاری کے بارے میں شکوک وشبہات بھی پیدا ہونے لگے۔ اسی اثناء میں مال واسباب کا ایک تافلہ کابل جاتے ہوئے روشنائی تحریک کے لوگوں کے ہاتھوں لٹ گیا۔ اس کی شکایت کابل کے حکمرانوں کو پہنچی تو سرکاری لشکر نے یہاں کے لوگوں پر حملہ کیا اور مردوں کو قتل کر دیا اور بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ بایزید انصاری نے مغل حکمران مرزا حکیم سے ان گرفتار عورتوں اور بچوں کو آزاد کرنے کی درخواست کی جس پر مرزا حکیم نے پشاور کے صوبیدار معصوم خان کو پیغام بھیجا کہ بایزید اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جائے لیکن بایزید کو اس فرمان کی پہلے ہی اطلاع ہو چکی تھی اس لئے وہ یوسفزئیوں کے علاقے کلپانی کے آس پاس مقیم ہو گئے۔ حاکم پشاور نے وہاں تک بایزید کا پیچھا کیا۔ بایزید اور ان کے ساتھی جن کی تعداد (313) تین سو تیرہ تھی پہاڑی پر چڑھ گئے اور شاہی لشکر کا مقابلہ کیا۔ چونکہ بایزید اور ان کے ساتھی پہاڑ کی چوٹی پر تھے اور شاہی لشکر نیچے تھا اس لئے شاہی لشکر نے شکست کھائی اور پشاور واپس آ گیا۔ یہ مغلوں اور بایزید انصاری کے درمیان پہلی باضابطہ جنگ تھی جس میں بایزید کو فتح حاصل ہوئی۔ بایزید نے اس مقام کا نام آغاز پور رکھا کیونکہ یہیں مغلوں اور تحریک روشنائی کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد بایزید انصاری اور تیراہ کے دوسرے قبائل آغاز پور کی جنگ کے نتیجے میں مغلوں کے اور زیادہ مخالف ہو گئے۔ چنانچہ جب اس دوران مغلوں کا ایک قافلہ کابل سے ہندوستان جا رہا تھا تو خیبر کے مقام پر ان قبائل نے اس قافلے کو لوٹ لیا۔ گو کہ اس عمل میں بایزید انصاری کی کوئی خواہش شامل نہ تھی بہرحال ردعمل کے طور پر حاکم پشاور نے ان قبائل کی گوشمالی کے لئے ان پر لشکر کشی کی۔ مغل لشکر اور ان قبائل کے درمیان خوب جنگ ہوئی لیکن آخر کار مغل لشکر کو پسپا ہو کر پشاور واپس آنا پڑا۔ تاہم مغلوں اور ان قبائل کے درمیان ناختم ہونے والی عداوت ودشمنی پیدا ہو گئی۔ ان حالات سے بایزید انصاری بھی بہت دلبرداشتہ ہوئے اور پھر یوسف زئیوں کے علاقے میں واپس آ گئے جہاں کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے لیکن ان کی تحریک روشنائی مذہبی اور سیاسی تحریک کی حیثیت سے مغلوں کے آخری تاجدار تک زندہ رہی اور اس تحریک نے پشتونوں کے آفریدی، بنگش، اورکزئی، مہمند اور دوسرے کئی ذیلی قبیلوں کو مغلوں کے خلاف برسرپیکار رکھا اور ایک اجتماعی طرز کی بنیاد رکھی کہ اس تحریک کے پیروکار تحریک کے مخصوص افکار ونظریات کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ دوسری طرف پیر باباؒ اور اخوندرویزہؒ کی روحانی قوت اس تحریک کے مدمقابل اٹھ کھڑی ہوئی تو نتیجے کے طور پر یوسفزئی قبیلہ تحریک روشنائی کی گرفت سے آزاد ہونے لگا جس کی وجہ سے بایزید انصاری کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اس تحریک کو اپنے باپ کی طرح پشتونوں میں مقبول بنانے میں کامیاب ثابت نہ ہو سکے۔

فقیر ایپی: 1936ء میں انگریزوں اور جنوبی پہاڑوں میں رہنے والے پٹھانوں کے درمیان جو سب سے بڑا اور اہم تصادم اور معرکہ ہوا، اس معرکے کے ہیرو بنوں سے متصل قبائلی علاقے وزیرستان کے مرزا علی خان المعروف فقیر ایپی تھے۔ جو کہ اتمان زئی وزیروں میں سے توری خیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

ملا مرزا علی خان کی جائے پیدائش وزیرستان کا علاقہ ایپی تھا۔ اسی علاقائی نسبت سے لوگ انہیں بعد میں فقیر ایپی کے نام سے یاد کرنے لگے اور اسی نام سے وہ انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مشہور ہوئے۔ تاریخ میں وہ فقیر ایپی کے

نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ فقیر ایپی اور انگریزوں کے درمیان بپا ہونے والا معرکہ ایسا ہے کہ جس کے سیاسی محرکات اتنے قوی نہیں جتنی کہ اس واقعہ کے پس منظر میں ان کی ثقافتی اور روایتی توجیہات ہیں۔

1936ء سے پہلے فقیر ایپی اپنے علاقے کا ایک گمنام واعظ تھا مگر 1936ء میں رونما ہونے والے ایک واقعے نے فقیر ایپی کو میدان کارزار میں لا کر پورے ہندوستان میں ایک نامور اور غیرت مند، مجاہد کے طور پر مشہور کر دیا۔ واقعہ کی نوعیت یہ تھی کہ ایک مقامی ہندو لڑکی کا معاشقہ ایک قبائلی مسلمان نور علی شاہ نامی لڑکے سے چل پڑا۔ ہندو دوشیزہ نے اسلام قبول کر کے سلمان نور علی شاہ کے ساتھ شادی کر لی اور اس لڑکی کا اسلامی نام اسلام بی بی رکھ دیا گیا۔

ہندوؤں نے اس اقدام کو اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت قرار دے دیا اور اسلام بی بی اور نور علی شاہ کے نکاح کو قبول نہ کیا۔ ہندو اس معاملے کو باضابطہ طور پر حکومت کے پاس لے گئے۔ انگریز حکومت کی مقامی انتظامیہ نے ہندوؤں کی دادرسی کرتے ہوئے اسلام بی بی کو مسلمانوں سے چھین کر دوبارہ اس دوشیزہ کو ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔

انگریز انتظامیہ کے اس فیصلے کو قبائل نے اپنے مذہبی معاملات میں بے جا مداخلت سمجھا کیونکہ لڑکی نے اپنی رضامندی کے ساتھ اپنے ہندو دھرم کو چھوڑ کر اسلام کو قبول کیا اور پھر مسلمان کے ساتھ شادی کر لی۔

اس واقعے پر بنوں کے لوگوں نے مطالبہ کیا کہ اسلام بی بی کو ہندوؤں کی گرفت سے چھڑا کر اس کے مسلمان شوہر نور علی شاہ کو واپس کیا جائے، مگر انگریز انتظامیہ نے یہ مطالبہ نہیں مانا۔ یہ واقعہ بنوں اور گردونواح کے قبائل میں گرمجوشی پیدا کرنے کے لئے کافی تھا اور قبائل انگریزوں کے اس فیصلے کے خلاف متحد ہونے لگے۔ ادھر فقیر ایپی جو کہ انگریزوں کی سرگرمیوں سے پہلے ہی سے نالاں تھے اور خاموشی کے ساتھ مختلف دروں کا دورہ کر کے اپنے جوش کلام سے قبائل نوجوانوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے، انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ٹوچی کو بنا لیا تھا۔

میر عالم خان: میر عالم خان کے والد کا نام میر ہوس خان تھا جو کہ بنوں میں سکھوں کے دور میں یہاں کا نامور ملک تھا۔ میر عالم خان نے 1848ء میں انگریزوں کے خلاف اعلان بغاوت کیا تھا۔ میر عالم خان بنوں کا وہ پہلا باشندہ ہے جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔

سر ایڈورڈ جب ملتان میں سکھوں کے مول راج کے ساتھ برسرپیکار تھا تو اس دوران میر عالم خان نے بنوں کے چند دوسرے سرکردہ ملکوں کے ساتھ مل کر اپنی آزاد حکومت بنالی تھی۔ جب مروتوں نے دیکھا کہ میر عالم خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنی آزاد حکومت بنالی ہے تو انھوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

جب صورتحال کا ایڈورڈ کو علم ہوا تو وہ میجر ٹیلر کے ساتھ ڈیرہ کے نوابوں کی امداد حاصل کر کے عیسیٰ خیل کے راستہ سے لکی کے مقام پر پہنچا جہاں قلعہ میں رام سنگھ کے کچھ سکھ سپاہی موجود تھے۔ میجر ٹیلر نے لکی کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ حیات افغانی کے مطابق اس قلعہ کے محاصرہ کے دوران اگرچہ مروتوں نے میجر ٹیلر کا ساتھ دینے کا وعدہ اور اقرار کیا، مگر دل سے وہ اس کے ساتھ نہ تھے۔ صرف حکیم خان کا بیٹا دیوانہ خان مینا خیل انگریزوں کے ساتھ تھا۔ انگریزوں نے سکھوں سے قلعہ خالی کروا لیا۔ اس واقعہ کے بعد میر عالم خان اور میر زعلی خیل کے ساتھ جلاوطن ہو گیا۔ بعد میں انگریزوں نے بنوں پر مکمل دسترس حاصل کر لی اور یہاں میجر ٹیلر نے نظم ونسق سنبھال لیا۔ میر عالم خان اپنے بھائیوں اور میر اعظم خان اور میر افضل خان کے ساتھ خوست چلا گیا۔ خوست میں امیر دوست محمد خان کابل کا حکمران تھا اس نے میر عالم خان کو کچھ دیہات کے علاوہ ایک رسالہ بھی دیا تھا۔ جب میر عالم خان دوبارہ بنوں آیا تو اس وقت نکلسن یہاں نظم ونسق چلانے کی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔ اس نے میر عالم خان کو اپنے دفتر طلب کیا۔ میر عالم خان جب نکلسن سے ملنے کے لئے آیا تو نکلسن بعض سرکاری امور میں مصروف تھا اور ملاقات میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ میر عالم خان نے اس طرز عمل کو اپنی ہتک سمجھا اور ملاقات کئے بغیر اپنے گاؤں گڑھی واپس چلا آیا۔ کچھ دنوں کے بعد میر عالم خان دوبارہ افغانستان چلا گیا اور اس وقت امیر دوست محمد خان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میر عالم خان دوبارہ بنوں میں کبھی واپس نہ آیا اور وہیں پر وفات پا گیا۔ میر عالم خان کی قبر خواجہ زیارت متین (خوست) میں ہے۔

مولوی عبدالجلیل: بنوں کی معروف علمی شخصیت مولوی عبدالجلیل کا تعلق بنوں کے نواحی دیہات دیگانو کلی سے تھا اور وہیں رہائش رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام مولوی عبدالقیوم تھا۔ نسبی اعتبار سے قریشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اصلی گاؤں بارک زئی (میری) تھا مگر وہاں سے نقل مکانی کر کے دیگان کلی میں آ گئے تھے اور ان کا پورا خاندان اسی گاؤں میں رہائش پذیر رہا۔ مولوی عبدالجلیل نے علم دین ہندوستان کے سب سے بڑے دینی مدرسے دیوبند سے حاصل کیا تھا جبکہ کچھ دینی کتابیں علاقہ چھچھ کے گاؤں غورغشتی میں مشہور زمانہ عالم دین اور روحانی شخصیت مولانا غورغشتی سے سیکھی تھیں۔ دینی علوم کی تحصیل کے بعد انہوں نے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک خلافت میں شامل ہو کر وہاں تحریک خلافت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ کابل میں امان اللہ خان کی حکمرانی کے دور میں انہوں نے کابل کی طرف ہجرت کی تحریک میں بھی حصہ لیا اور اس سلسلے میں کابل بھی گئے مگر بعد میں کابل سے واپس اپنے علاقے میں آ گئے۔ بعدازاں کچھ حالات سے دل برداشتہ ہو کر بامر مجبوری افغانستان چلے گئے۔

افغانستان میں اس وقت مارشل شاہ ولی خان حکمران تھے۔ انہوں نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ افغان حکومت کی طرف سے ان کی علمی فضیلت کی بنا پر ان کو چھ ہزار افغانی دی گئی اور دو ہزار پانچ افغانی روپے ان کی ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔ کچھ عرصہ بعد مولوی عبدالجلیل نے کابل شہر میں وفات پائی تو افغان حکومت کی طرف سے ان کے سوگ میں سرکاری طور پر کابل میں تعطیل کا اعلان کیا گیا۔ ادھر بنوں میں انگریز انتظامیہ نے ان کی ساری جائیداد ضبط کر لی تھی جو کبھی بھی انہیں واگزار نہ کی گئی۔ مولوی عبدالجلیل کے دو بیٹے ضامن خان نورانی اور غلام حقانی تھے۔

سردار علی خان رطل سرحدی: سردار علی خان رطل بنوں میں موضع کلی صوبیدار رمضان میں 1925ء میں پیدا ہوئے یہ گاؤں ان کے دادا کے نام سے منسوب ہے۔ سردار علی خان رطل بنوں کے ایک سماجی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ معروف ادیب اور صحافی بھی تھے۔ 1940ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کی دو معروف کتابیں ''کوئل'' اور دوسری ''اقبال'' ہے۔ انہوں نے کچھ عرصہ فوج میں بھی نوکری کی۔ ملٹری ڈیری فارم اور محکمہ ایکسائز میں بھی ملازم رہے اور آخر میں بنوں شہر کی بلدیہ میں ملازمت اختیار کی۔

آپ ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف لیبر ناردرن زون پشاور کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے۔ رطل صاحب نے ویسٹ پاکستان لوکل باڈیز کی تنظیم کے قیام میں بھی قابل قدر کردار ادا کیا اور پھر اس پلیٹ فارم سے بھی کافی جدوجہد کی۔ ان کی خدمات کے پیش نظر لوکل باڈیز کے ملازمین کی طرف سے فخر ملازمین لوکل باڈیز کا خطاب بھی دیا گیا۔ انہوں نے کرم ورکنگ جرنلسٹس یونین میں بھی صحافتی اور پیشہ ورانہ خدمات انجام دی ہیں۔

شیخ غلام سرور المعروف شیخ ماذون: شیخ غلام سرور بنوں میں قابل تکریم و تعظیم روحانی شخصیت کے حامل شخص پہچانے جاتے ہیں۔ روحانی سلسلے میں ان کے مرولوں، وزیروں اور بنوچیوں میں بہت بڑی تعداد میں مرید ہیں۔ انہوں نے اپنے روحانی سلسلے کے فروغ کے ساتھ ساتھ تحریک خلافت، تحریک آزادی اور پھر تحریک پاکستان میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ چونکہ تینوں علاقوں میں ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے اس لئے یہ جس تحریک میں بھی حصہ لیتے تھے ان کے مرید بھی جم غفیر کی صورت میں اس تحریک میں شامل ہو جاتے اور ہر تحریک میں ان کی وجہ سے بڑی تقویت پیدا ہو جاتی اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوتی۔ انہوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ آپ معروف روحانی شخصیت کربوغے ملا صاحب کے خلیفہ بھی رہے ہیں۔ تحریک ہجرت میں بھرپور حصہ لینے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے نظریئے کے تحت کانگرس میں بھی شامل ہوئے اور انگریزوں سے سرزمین ہندوستان کو آزاد کروانے کے لئے بنوں کے لوگوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کے لئے قابل قدر اور مؤثر خدمات انجام دیں۔ بعد میں دوقومی نظریئے کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے علیحدہ خطہ حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو یہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور آزاد خطے کے حصول کی خاطر مسلم لیگ کے جھنڈے تلے قابل فخر خدمات انجام دیں۔

دلباز خان: بنوں کی معروف سماجی، ادبی اور ثقافتی میلانات کی حامل شخصیت دلباز خان بنوں کے گاؤں مشر داؤد شاہ میں 1930ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی عبدالرحمٰن تحریک آزادی میں سرگرم کارکن تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ تک ملٹری ایجوکیشن برانچ میں سویلین سکول میں بحیثیت معلم ملازمت کی اور سکول کی لائبریری میں کتابوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ تین سال نوکری کرنے کے بعد ملازمت چھوڑ دی اور اپنے گاؤں کے علاوہ ملحقہ دیہات کے لوگوں کی سماجی زندگی میں صحتمندانہ رجحانات پیدا کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ مگر علاقے کے غیر ترقی پسند اور ناخواندہ لوگوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے میں کوئی قابل قدر کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ بنوں میں پشتو ادبی ٹولنہ میں سرگرم کارکن کی حیثیت سے پشتو ادب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ خود بھی پشتو میں بڑی خوبصورت شاعری کرتے تھے۔

دلباز خان وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گاؤں داؤد شاہ میں ایک بزرگ خواجہ عبداللہ باباؒ کے مزار پر عرس کا سلسلہ شروع کیا تو عقیدت مند جوق در جوق اس عرس میں شریک ہونے لگے۔ اس کے علاوہ دلباز خان ہی وہ پہلے محرک ہیں جنہوں نے غازی دلاسہ خان کا یوم منانے کا اہتمام کیا۔ یہ یوم ان کی قبر پر منایا جاتا رہا جہاں نامور شعراء منظوم کلام پیش کر کے غازی دلاسہ خان کو خراج تحسین پیش کرتے اور دانشور اپنے مقالات کے ذریعے اس بہادر سپوت کے بہادرانہ کارناموں کو اجاگر کرتے۔

دلباز خان نے بنوچیوں اور مروتوں کے ساتھ وزیریوں کی جنگ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس جنگ کے حوالے سے بھی بنوں کے لوگ انہیں اپنا ہیرو مانتے ہیں۔

دلباز خان سرزمین بنوں کے ایک نامور ادیب و شاعر اور صحافی کے علاوہ انقلابی شخصیت کے طور جانے جاتے ہیں۔ بنوں کے لوگوں کے علاوہ مروت اور وزیرستان کے علاقوں کے لوگ بھی انہیں عزت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

مولوی گلاب دین المعروف وزیرو ملا: بنوں کے تاریخی واقعات میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ بنوں کی سرزمین کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد رکھنے کے لئے یہاں کے لوگوں میں سے بعض شخصیتوں کے ایسے تاریخ ساز کارنامے ہیں جو کہ اس علاقے کی تاریخ لکھنے والے محققین کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔ ایسی ہی شخصیتوں میں مولوی گلاب دین کا نام بھی ہے۔ مولوی گلاب دین وزیر قبیلے کی سرکی خیل شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جب انگریزوں کے خلاف یورش کی تو بنوں کے علاقہ داؤدشاہ اور ممند خیل کے لوگوں نے اور وزیروں نے بھرپور ساتھ دیا تھا۔ وزیروں کے علاقے سے بنیادی تعلق تھا۔ بعض ایسے حالات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے مولوی گلاب دین نے اپنے علاقے سرکی خیل کو چھوڑ دیا اور وہاں سے بنوں کے موضع داؤدشاہ میں منتقل ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے یہاں سے بھی نقل مکانی کی اور وزیروں کے علاقہ ممند خیل میں آ گئے اور یہاں سے آزادی کے حصول کے لئے انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس اقدام میں ان کا ساتھ بنوچیوں، مروتوں اور وزیروں نے دیا۔ بنوں کے تمام علاقے کے لوگ اور وزیرستان کے لوگ مولوی گلاب کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ ہو گئے۔ ادھر انگریز بھی پوری طرح مستعد و تیار تھے۔ انہوں نے بغاوت اور آزادی کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے پوری طاقت استعمال کی اور داؤدشاہ اور ممند خیلوں کو زیر اثر کر لیا۔ ان حالات کے پیش نظر مولوی گلاب دین دوڑوں کے علاقے میں چلے گئے اور وہاں قلعہ کجوری کو اپنا مرکز بنا لیا اور وہاں اپنی ایک اسلحہ کی فیکٹری بھی قائم کر لی جہاں دیسی ساخت کی بندوقیں اور کارتوس بنائے جاتے تھے۔ جب تک مولوی گلاب دین زندہ رہے اس وقت تک انگریز وزیروں کے اس علاقے تک پہنچنے سے کتراتے رہے مگر جب مولوی گلاب دین نے وفات پائی تو ان کی وفات کے بعد انگریزوں نے یہاں رسائی حاصل کر کے اس علاقے کو تابع فرمان کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی گلاب دین کے ساتھ ہمہ وقت بنوچیوں، وزیروں اور دوڑوں میں سے دس ہزار نفوس پر مشتمل لشکر رہتا تھا اور جب کبھی چھوٹی موٹی جنگ ہوتی تو اس لشکر میں ان علاقوں کے مزید لوگ جہاد میں شریک ہوتے تھے۔ ان جنگوں میں مولوی گلاب دین کی فیکٹری کا اسلحہ استعمال کیا جاتا تھا۔ جب مولوی گلاب دین نے وفات پائی تو لاش کے دفنانے کے سلسلے میں وزیریوں اور دوڑوں میں تنازعہ پیدا ہو گیا۔ وزیری قبیلے کے لوگ لاش حاصل کر کے انہیں پورے اعزاز کے ساتھ اپنے علاقے میں دفنانا چاہتے تھے مگر دوڑ کے لوگوں نے کہا مولوی گلاب دین نے زیادہ عرصہ یہیں گزارا تھا اس لئے ان کی قبر بھی اسی علاقے میں ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے مولوی گلاب دین کو علاقہ دوڑ کے موضع خدوخیل میں دفنا دیا اور یہیں پر ان کی قبر تعمیر کی اور قبر پر شب و روز دوڑوں میں سے دس کسان چوکیداری کرتے رہتے تھے۔ ان کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ممند خیلوں کے وزیریوں نے موقع پاتے ہی یہاں سے ان کی لاش کو نکالا اور اپنے علاقے میں لا کر لاش کو دوبارہ غسل دے کر یہاں دفن کر کے ان کی قبر بنا دی۔

گل ایوب خان سیفی: بنوں میں گل ایوب سیفی کا نام بحیثیت قلمکار، مصنف اور ادیب و مورخ جانا پہچانا نام ہے۔ انہوں نے تاریخ بنوں اور وزیرستان لکھ کر اپنے عہد اور اپنے عہد کے بعد آنے والے محققین اور لکھنے والوں کے لئے بہت بڑا علمی اور تاریخی و ثقافتی سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کا نام گل ایوب خان ہے اور شاعر ہونے کے ناطے سیفی تخلص ہے۔ تاریخ دانی کے علاوہ ادب کے میدان میں بھی ان کا نام محتاج بیان نہیں۔ تعلق بنوں کے کلہ خیل مستی خان 'عیسکی' سے ہے۔ عیسکی کے بیٹے نقرہ دین کی پشت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے صحافت میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا اور بنوں کی انجمن صحافیاں کے صدر ہوئے۔ پھر انجمن ترقی اردو بنوں کے جوائنٹ سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ پشتو اہل قلم کی تنظیم کے کنوینر بھی ہوئے۔

رسم و رواج

صوبہ سرحد کے تمام علاقوں کے رسوم و رواج مقامی نوعیت کے ہیں۔ چاہے پختونوں اور پشتون کے علاقے ہوں یا ہندکو بولنے والے علاقے ہوں۔ سب اپنے تہواروں، بیاہ شادیوں اور اموات کے مواقع پر اپنے جدا جدا رسوم و رواج رکھتے ہیں۔ بعض علاقے تو ایسے بھی ہیں کہ جو معمولی مسافت کی دوری کے حامل ہیں، مگر رسوم و رواج کے اختلاف میں معروف حیثیت رکھتے ہیں۔ بنوں اور لکی مروت کے قدیم پشتون علاقوں کے رسوم و رواج بھی اپنی نوعیت میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تہوار ہوں، بیاہ شادی یا اموات کے مواقع ہوں۔ یہ علاقے اپنے منفرد رسوم و

رواج کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ مروت قوم بنوں کی مشہور ترین قوم ہے جس کی منگنی اور شادی کی رسوم درج ذیل ہیں۔

منگنی: مروتوں کے ہاں جب لڑکے کی طرف سے لڑکی والوں کے گھر رشتے کی بات چلتی ہے تو لڑکی والے مکمل تحقیق کرتے ہیں اور چھان بین کے بعد رشتے پر اتفاق کرتے ہیں۔ جب رشتے کے بارے میں دونوں طرف سے اتفاق ہو جاتا ہے تو اس کے بعد لڑکی والے لڑکے کے سرپرست کی جیب میں سوا ٹانک دیتے ہیں یعنی جیب کے اوپر سوئی پرو دیتے ہیں تو یہ رسم اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ لڑکی والے اس رشتے پر راضی ہیں۔ اس پر دعائے خیر ہو جاتی ہے اور دو گھرانوں میں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف خوشیاں منائی جاتی ہیں اور پھر شادی کے لئے میعاد مقرر کر لی جاتی ہے اور جب شادی کے دن قریب آنے لگتے ہیں تو دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

بارات: شادی والے دن لڑکے کے گھر سے بارات لڑکی کے گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے تو ڈھول سرنا کے ساتھ بارات نکلتی ہے۔ اس موقع پر لڑکے کے رشتے دار اور دوست احباب بھرپور طریقے سے شریک ہوتے ہیں اور راستے میں ناچتے کودتے ہیں۔ بنوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جب بارات بازار سے گزرتی ہے تو اس ناچ کود میں بازاروں کے لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ اس شرکت میں یہ قید نہیں ہوتی کہ صرف اقربا ہی ہوں بلکہ ہر شخص اس خوشی میں بلا لحاظ قرابت داری شریک ہوتا ہے۔ مگر لڑکی کے گھر صرف وہی لوگ جاتے ہیں جو کہ قرابت دار ہوتے ہیں اور پھر اسلامی طریقے کے مطابق نکاح پڑھایا جاتا ہے۔

رخصتی: مروتوں کے ہاں رخصتی سے پہلے ایک قدیم روایتی طریقہ مروج ہے۔ اب بھی قدیم گھرانوں میں اس رسم کا اہتمام کیا جاتا اور وہ یہ ہے کہ دولہا رخصتی سے پہلے لڑکی کے گھر میں نشانہ بازی میں مہارت دکھاتا ہے اور جب تک اس کا نشانہ صحیح مقام پر نہیں لگتا اس وقت تک لڑکی کی رخصتی نہیں ہوتی۔ جب دولہا درست مقام پر نشانہ لگا لیتا ہے تو پھر رخصتی ہوتی ہے۔ اس موقع پر لڑکے کے اقربا اور دوست بھی لڑکے کا ساتھ دیتے ہیں اور درست مقام پر نشانہ لگانے کے لئے اس کی راہنمائی کرتے ہیں کیونکہ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ نشانہ جلد لگ جائے تاکہ رخصتی بروقت ہو۔

ماضی میں جب لڑکے والے لڑکی کے گھر جاتے تھے تو بارات کے لوگ لڑکی کے گھر پر رات بسر کرتے تھے کیونکہ واپسی کا سفر خطرات کے پیش نظر رات کے وقت ممکن نہیں ہوتا تھا۔ اس موقع پر لڑکے والے ساری رات لڑکی کے گھر کھیل کود، ہنسی مذاق اور گانے بجانے میں گزارتے تھے۔ رات کا کھانا لڑکی کے گھر پر ہوتا تھا اور پھر دوسری صبح کو نماز فجر کے فوراً بعد لڑکی کی رخصتی ہوتی تھی مگر یہ بات قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہے جبکہ علاقے بھی دشوار گزار ہوتے تھے اور سواریاں بھی عام نہیں ہوتی تھیں مگر اب ایسا بہت کم اور دور دراز علاقوں میں ہوتا ہے۔

عرس، میلے اور تہوار

عید الاضحیٰ: عید قربان کا تہوار نماز عید سے شروع ہوتا ہے۔ نماز عید کے بعد لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی یاد میں حلال جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ جانوروں کا گوشت غرباء و مساکین اور رشتے داروں میں بانٹتے ہیں اس کے علاوہ مختلف مقامات پر عید کے میلے بھی منعقد ہوتے ہیں۔

عید الفطر: بنوں میں عید الفطر کا تہوار منفرد انداز سے منایا جاتا ہے۔ چاند رات ہی سے لوگ متحرک ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ آگ روشن کرنے کے لئے ایندھن جمع کرتے ہیں جس میں کھجور کی شاخیں، درخت کے تنے اور خشک گوبر ہوتا ہے۔ ہر علاقے کے لوگ قصبے یا شہر سے باہر الاؤ روشن کرتے ہیں اور خوب خوشیاں مناتے ہیں۔ گھروں میں مرد و خواتین نیند سے سحری کے وقت بیدار ہو جاتے ہیں۔ خواتین گھروں میں پکوان تیار کرتی ہیں۔ ہر گھر میں مختلف پکوان پکنے لگتے ہیں۔ چاول، دال، گوشت کی ترکاری، حلوہ، کھیر غرضیکہ مختلف قسم کے پکوان پکتے ہیں۔ ہر محلے یا علاقے کے لوگ صبح نماز فجر پڑھنے کے بعد ایک حجرے میں اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر سب جلوس کی شکل میں سب پہلے محلے یا گاؤں کے بڑے ملک یا سردار کے گھر جاتے ہیں۔ جلوس میں شریک لوگ وہاں پکے ہوئے پکوان کو چکھنا شروع کرتے ہیں اور صرف ایک لقمہ لیتے ہیں اور پھر اسی طرح سارے محلہ یا گاؤں کے گھروں میں جاتے ہیں اور ہر گھر میں پکے ہوئے پکوان کو چکھتے ہیں اور جب آخری گھر میں جاتے ہیں تو وہاں ہاتھ دھونے کے لئے گرم پانی اور تولیہ ملتا ہے جہاں ہاتھ دھوتے ہیں اور پھر تولیئے سے سکھاتے ہیں۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں اور نماز عید کے لئے تیاری کرتے ہیں۔ نئے کپڑے پہنتے ہیں اور پھر نماز ادا کرنے کے لئے عیدگاہ چلے جاتے ہیں۔ عید الفطر کی نماز ادا کرنے کے بعد سب لوگ عیدگاہ میں جوش و جذبے کے ساتھ عید ملتے ہیں اور پھر اپنے اپنے گھروں میں آ جاتے ہیں اور گھر کے افراد سے عید ملتے ہیں۔ پہلے روز

سب اسی طرح گھروں اور حجروں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

میلہ عید الفطر: عید الفطر کے دوسرے روز بنوں کے نزدیک و دور دوسرے شہروں اور مضافات سے لوگ بنوں شہر میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً نور بگ، لکی، دومیل، لکی مروت اور کرک سے لوگ بنوں شہر میں لگے ہوئے میلے میں شرکت کرتے ہیں۔ بنوں کے میلے میں مٹھائیوں اور دوسری اشیاء کی دکانیں لگائی جاتی ہیں۔ میلوں کی جگہوں پر جھولے لگائے جاتے ہیں جہاں بچے اور بچیاں جھولے جھولتی ہیں۔ سرکس کے مناظر پیش کئے جاتے ہیں۔ گاؤں کی بچیاں بھی شہر میں آتی ہیں۔ یہ بچیاں تانگوں پر سوار ہوتی ہیں اور گاتا گاتے ہوئے بازاروں سے گزرتی ہیں۔

میرانشاہ روڈ پر دریائے کرم کے نزدیک میلہ لگتا ہے۔ بارانڈیم کی طرف بھی لوگ جاتے ہیں جہاں دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ لوگ وہاں خورونوش کرنے کے علاوہ دریا میں کشتی رانی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بنوں میں ایک مزار پر عید کے روز میلہ لگتا ہے، لوگ اسے بابا صاحب کا میلہ کہتے ہیں۔ عام و خاص یہاں مزار پر حاضری دیتے ہیں اور میلے میں بھرپور طریقے سے شرکت کرتے ہیں۔

عرس مچن باباؒ: یہ عرس بنوں کے لوگوں میں بہت مشہور ہے اور بنوں اور لکی مروت کے لوگ اس عرس میں نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ مچن باباؒ کا مزار جنوبی وزیرستان میں ورشہ کے قریب ہے۔ یہ عرس ہاڑ کے مہینے میں منعقد ہوتا ہے۔ بنوں اور مروت قوم کے ہزاروں لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں۔ عرس کے منتظم بنوں اور مروتوں میں سے مچن خیل قوم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بنوں اور وزیرستان کے علاقے کے لوگوں میں سے ہر ایک عرس میں ایک مرتبہ ضرور شریک ہوتا ہے۔ مچن باباؒ کی بہت سی کرامات ہیں۔ ان کرامات میں سے ایک کرامت جو تسلسل سے چلی آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ مزار کے آس پاس بہت سے سانپ رینگتے رہتے ہیں۔ جو لوگ مزار پر حاضری دیتے ہیں انہیں یہ سانپ نہیں ڈستے اور ڈس بھی لے تو ڈسا ہوا آدمی مرتا نہیں ہے۔ مچن باباؒ کی اولاد مچن خیل کہلاتی ہے۔

عرس خواجہ عبداللہ باباؒ: بنوں کے گاؤں داؤد شاہ میں خواجہ عبداللہ باباؒ کے مزار پر ہر سال عرس کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ بنوں میں یہ عرس بنوں کی ایک ادبی شخصیت دلباز خان نے شروع کیا اور لوگوں میں اس بزرگ کے بارے میں شعور بیدار کیا۔ عرس کے موقع پر مزار پر لوگ بڑی تعداد میں آ کر حاضری دیتے ہیں۔ قوالی ہوتی ہے اور شعراء منظوم طریقے سے خواجہ عبداللہ باباؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور خطیب حضرات اپنی تقریروں میں خواجہ عبداللہ باباؒ کی بزرگی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

عرس غازی دلاسہ خان: غازی دلاسہ خان کے مزار پر بھی عرس کی تقریب کا رواج دلباز خان نے شروع کیا اور دلباز خان کی کوششوں سے اس مرد مجاہد کے مزار پر ہر سال لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔

میلہ بازار احمد خان: بنوں میں احمد خان کے نام سے ایک آبادی ہے جسے بازار احمد خان کہا جاتا ہے۔ احمد خان کا تعلق غزنی خیل سے ہے۔ وہ غزنی سے نقل مکانی کر کے موجودہ بازار احمد خان آ گیا اور اسے آباد کیا اور یہاں کاروباری مرکز قائم کر دیا۔ جس کی وجہ سے یہ ایک مشہور بازار ہو گیا۔ لوگ اسے بازار احمد خان کہنے لگے۔ زیادہ تر ہندوؤں نے اسے اپنا تجارتی مرکز بنا لیا تھا اس بازار کو مزید وسعت و فروغ دینے کے لئے ایک میلہ مویشیاں کا بھی اہتمام کیا۔ پورے بنوں کے لوگ اس مقام پر اپنے مویشی لاتے تھے اور بازار احمد خان کے ایک وسیع و عریض میدان میں یہ میلہ لگتا تھا۔ دکانیں سجائی جاتی تھیں، قیمتی جانور یہاں لائے جاتے تھے۔ ہر جمعہ کے روز یہاں یہ میلہ مویشیاں لگتا تھا اور ہزاروں کا کاروبار یہاں ہوتا تھا۔ بنوں کے پورے علاقے میں اس میلہ مویشیاں نے بے پناہ شہرت حاصل کی تھی۔

میلہ پولو گراؤنڈ: بنوں کے پولو گراؤنڈ میں بھی ایک میلہ مویشیاں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہاں پر جانوروں کا میلہ لگتا اور دور دراز سے لوگ آتے۔ اس موقع پر حکومتی سطح پر مختلف کھیلوں کا بھی اہتمام کیا جاتا جس میں گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی کے کھیل کے علاوہ بنوں کے مقامی اور ثقافتی کھیل اینڈہ کا خاص انتظام کیا جاتا تھا۔ بنوں کے علاوہ پنجاب کے علاقے سے بھی اینڈہ کے ماہر کھلاڑیوں کو یہاں آنے کی دعوت دی جاتی جو یہاں آ کر اس کھیل میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بنوں کے علاوہ جن دوسرے علاقوں سے اینڈہ کھیل کے کھلاڑی اس میلے میں آ کر اس کھیل کا مظاہرہ کرتے ان میں ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازیخان، فیصل آباد، جھنگ، سرگودھا، میانوالی، منٹگمری، ملتان، مظفر گڑھ اور کیمبل پور کے کھلاڑی قابل ذکر ہیں۔

روایتی طرز تعمیر، قلعے اور کھنڈرات

بنوں کی قدیم ترین آبادی ''اکرہ'' ہے جس کے کھنڈرات سے آرین، ایرانی، یونانی اور بدھ مت کے دور کے سکے اور دیگر نوادرات برآمد ہوئے ہیں۔ لفظ ''اکرہ'' گل ایوب سیفی کی رقم کی ہوئی تاریخ کے مطابق یونانی لفظ ہے جس کے معانی

اونچی جگہ کے ہیں۔ اکرہ کا علاقہ دوسو سے لے کر تین سو فٹ اونچائی پر تھا۔ یہاں پر یونانی باختری بادشاہوں نے 190 قبل مسیح سے لے کر 50 قبل مسیح تک حکومت کی ہے۔ یونانی تعمیرات میں عام گھروں کی تعمیر کا جو نقشہ دستیاب ہوتا ہے اس کے مطابق ان کا طرز تعمیر یہ تھا کہ مکانات یک منزلہ ہی ہوتے تھے اور مکان کے کمروں کے باہر برآمدہ اور برآمدے کے باہر کھلا میدان ہوتا تھا جہاں مال مویشیوں کے لئے باڑے بنائے جاتے تھے اور ارد گرد کچی مٹی کی زیادہ سے زیادہ چار سے پانچ فٹ کی دیواریں ہوتی تھیں۔ کمروں کی چھتوں کو درختوں کی موٹی شاخوں یا تختوں سے ڈھک دیا جاتا تھا اور ان کے اوپر گھاس پھوس ڈال کر اوپر بھوسا ملا ہوا کیچڑ رکھ دیتے اور اس پر لیپائی کی جاتی تھی۔ کمروں میں روشنی پہنچانے کے لئے کمرے کے درمیان میں یا ایک طرف چھت میں ڈیڑھ یا دو فٹ کی گولائی میں سوراخ رکھ دیا جاتا اور کمرے میں کھانا پکانے اور دیگر ضروریات کے لئے جو آگ جلائی جاتی اس کا دھواں بھی ان سوراخوں سے باہر نکل جاتا ہے۔ اگر بارش ہو جاتی تو چھت کے سوراخوں پر مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی سینک رکھ دی جاتی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے لئے درمیان میں ایک لکڑی کا بنا ہوا دروازہ بنایا جاتا تھا اور دروازے کے دائیں اور بائیں طرف چھوٹی کھڑکی بنائی جاتی تھی جس کے دروازے بھی چھوٹے چھوٹے لکڑی کے تختوں کے ہوتے۔ دیواروں پر مٹی کی لیپائی کر دی جاتی تھی۔ بنوں کے قدیم گھرانے اب بھی اسی قسم کی طرز تعمیر پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد قبائلی دور میں قبیلوں کے مابین دشمنیوں کی وجہ سے بنوں اور مضافات کے لوگوں نے ایسے مکانات بنانے شروع کر دیئے جو قلعوں جیسے تھے تاکہ لوگ اپنے دشمن قبائل کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے مکانات اس طرح بنائے کہ جو باہر سے بالکل قلعہ نما ہوتے تھے۔ باہر کی دیواریں اونچی ہوتی تھیں اور گھروں کی اونچائی پر مورچے بنائے جاتے تھے۔ گھر کا بیرونی دروازہ بڑا ہوتا تھا جو لکڑی کے تختوں سے بنایا جاتا تھا۔

بنوں کی قلعہ نما تعمیرات کی مسماری: انگریزی دور میں بنوں کے پہلے حاکم ایڈورڈ تھے۔ انہوں نے آتے ہی حکم جاری کیا کہ بنوں کے تمام قلعے مسمار کر دیئے جائیں۔ انگریزوں کو قبضے سے قبل جاسوسوں نے جو رپورٹ پیش کی تھی اس کے مطابق ان ملکوں کے قلعہ نما مکانات کی تعداد چار سے پانچ سو تک بنتی تھی۔ ایڈورڈ نے یہ حکم دیا کہ ایسے تمام قلعوں کو مسمار کر دیا جائے۔ پہلے پہل تو بنوں کا کوئی ملک اس اقدام پر آمادہ نہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں کے برجوں اور دیواروں کو مسمار کرے مگر جب انگریز حاکم کے اس مطالبے میں شدت پیدا ہو گئی تو کچھ بڑے ملکوں کی مداخلت سے بعض ملکوں نے اپنے قلعہ نما گھروں کے برجوں اور دیواروں کو مسمار کر دیا۔

قلعہ براڑی: جب بنوں کے ملکوں نے اپنے بنائے ہوئے قلعہ نما برجوں اور دیواروں کو مسمار کر دیا تو سر ایڈورڈ نے تاج برطانیہ سے بنوں میں اپنے قلعہ جات بنانے کی اجازت مانگی تاکہ ان قلعوں کے ذریعے وہ قریب کے وزیروں اور محسودوں سے اپنی سلطنت کی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ایڈورڈ نے اکرہ میں قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا مگر یہ مقام وزیروں اور محسودوں کی دسترس سے باہر نہیں تھا اور یہ خطرہ تھا کہ اس مقام پر تعمیر کردہ قلعے کو وزیر اور محسود قبائل نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لئے ایڈورڈ نے ان کی پہنچ سے دور موضع براڑی میں قلعہ کی تعمیر کے لئے جگہ منتخب کی۔ اس جگہ قلعہ تعمیر کرنے میں یہ مقصد بھی شامل تھا کہ اس جگہ قلعہ تعمیر کر کے نہر کچکوٹ پر بھی قبضہ کرنا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس قلعہ کی وجہ سے بنوں کے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے زیر اطاعت کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اس جگہ پر انگریزوں نے پہلا قلعہ تعمیر کیا۔

قلعہ دلیپ فورٹ: بنوں شہر میں یہ قلعہ ایڈورڈ نے سکھوں کی فوج کے لوگوں سے تعمیر کروایا۔ جب یہ قلعہ تعمیر ہو گیا تو اس قلعہ کا نام اس نے سکھ جرنیل دلیپ سنگھ کے نام پر دلیپ فورٹ رکھ دیا۔

دلیپ نگر: دوسرا کام ایڈورڈ نے یہ کیا کہ بنوں بازار کی بنیاد رکھی اور یہاں پر تجارتی مقاصد کے تحت ایک بہت بڑا بازار تعمیر کروایا۔ اس سے قبل بازار احمد خان کے نام سے ایک بازار آباد تھا جہاں تجارت ہوتی تھی۔ بنوں کے لوگ اس بازار احمد خان کو کس بازار کہتے تھے۔ ایڈورڈ نے ہندوؤں کے تعاون سے شہر میں نیا بازار تعمیر کر دیا اور جب یہ بازار تعمیر ہو گیا تو اس کا نام بھی سکھ حاکم کے نام پر دلیپ نگر رکھ دیا۔ اس بازار کی تعمیر سر ایڈورڈ نے 1848ء میں کی تھی۔

بنوں کے قدیم دروازے: بنوں میں جب ڈپٹی کمشنر کیپٹن مزد تھا تو اس وقت بنوں کے قدیم دروازوں کی تعداد پانچ تھی (1) میری دروازہ (2) لکی دروازہ (3) دکھنی دروازہ (4) پریٹی دروازہ اور ایک گیارہ فٹ اونچی دیوار میں کچا دروازہ تھا۔ بعد میں ان دروازوں کی تعداد دس کی گئی۔

(1) پریڈیر دروازہ (2) قصابان دروازہ (3) کچہری دروازہ (4) نیو کچہری دروازہ (5) سوکڑی دروازہ (6) نورڑو دروازہ (7) ھنجل دروازہ (8) ھوید دروازہ (9) ریلوے دروازہ (10) لکی دروازہ۔ ان دروازوں کے ساتھ شہر پناہ تعمیر کی گئی جسے فصیل شہر کہتے ہیں۔ یہ دروازے اور تاریخی فصیل تا حال موجود ہے۔

قلعہ لکی مروت: بنوں کے ضلع لکی مروت کا یہ ایک مشہور تاریخی قلعہ ہے۔ یہاں پر سکھوں کے دور کے حکمران رام سنگھ نے اپنے کچھ سپاہیوں کو رکھا ہوا تھا۔ جب ایڈورڈ ملتان میں مول راج کے ساتھ مصروف پیکار تھا تو ان دنوں کچھ بنوچیوں نے جن میں میر عالم خان کا نام سرفہرست ہے، بنوں میں آزاد اور خودمختار حکومت بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ ان میں مروت قبیلے کے لوگ بھی شامل تھے۔ جب ایڈورڈ کو یہ اطلاع ہوئی تو اس نے میجر ٹیلر کی سربراہی میں ایک بہت بڑی فوج لکی مروت اور بنوں کی طرف روانہ کی۔ اس فوج کو ڈیرہ اسماعیل خان کے بعض نوابوں کی بھی اشیر باد حاصل تھی۔ میجر ٹیلر اپنی فوج کے ساتھ فوراً لکی پہنچا اور اس نے یہاں پہنچتے ہی لکی کے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں سکھ سپاہ محصور تھی۔ اس نے سکھ سپاہیوں کو جان کی امان دے کر اس قلعے کو سکھ سپاہ سے خالی کروالیا اور ساتھ ہی انگریزوں نے لکی مروت کے لوگوں کو بھی مطیع کر لیا۔ یہ واقعہ 1848ء میں پیش آیا تھا۔

قلعہ کجوری: یہ بھی ایک قدیم طرز کا قلعہ ہے جو دوڑ کے پاس کجوری کے مقام پر بنایا گیا تھا۔ سکھوں اور انگریزوں کے عہد سے قبل مقامی آبادی نے یہ قلعہ علاقے کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا۔

میر جانی بنگلہ: یہ بنگلہ بنوں کی قدیم تعمیرات کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس بنگلے کی تعمیر نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ بنگلہ میلاد چوک کے نزدیک واقع ہے۔ میلاد چوک میں مذہبی نوعیت کے موضوعات پر جلسے منعقد ہوتے ہیں اور میلاد شریف کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔

مساجد: بنوں شہر کی چار مشہور مساجد ہیں:

۱) جوبار مسجد: یہ مسجد اصل میں جبار مسجد ہے۔ بنوچیوں کے مخصوص پشتو کے لہجہ میں اسے جوبار مسجد کہا جاتا ہے۔ مذہبی تعمیرات کا نمایاں نشان ہے۔ لکی گیٹ میں تعمیر ہوئی ہے۔

۲) آبی جی مسجد: یہ دراصل آپا جی ہے۔ بنوں کے تلفظ میں اسے آبی جی پکارا جاتا ہے جو کہ تھانہ صدر کے بالمقابل تعمیر ہوئی ہے۔

۳) مسجد قصاباں: قصاباں گیٹ میں تعمیر ہونے والی مسجد کو مقامی پیشے قصاباں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

۴) مسجد بلال: بنوں کی اس مسجد کو تبلیغی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مسجد بنوں دولن مل کی پشت پر ہے۔

بنوں کی رومانوی اور رزمیہ داستانیں

اسلام بی بی: 1936ء میں بہار کے موسم سے پیوستہ علاقہ بنوں کی یہ ایک ایسی رومانوی داستان ہے جس کے ساتھ بڑے اہم معرکے رونماء ہوئے جو جنوبی کہساروں کی تاریخ کا ایک انمٹ باب ہے۔ داستان کا واقعاتی پس منظر کچھ اس طرح ہے۔

1936ء میں بہار کا موسم تھا۔ بنوں کے قریب ایک گاؤں جھنڈو خیل (عیسکی) میں پیرانو کوٹکی میں ایک تنومند و حسین نوجوان امیر نور علی شاہ سے یہ رومانوی واقعہ منسوب ہوا۔

امیر نور علی شاہ کا تعلق معتبر و بزرگ خاندان غوث بہاؤالحق ملتانی کی اولاد سے تھا۔ جس کا معاشقہ ایک ہندو لڑکی رام کور سے ہو گیا تھا۔ امیر نور علی شاہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب وہ سکول جانے کے لئے گاؤں سے شہر آتا جاتا تھا تو اکثر ایک خوبصورت دوشیزہ کو دیکھتا' دونوں کی نظریں چار ہوتیں اور اس دیکھا دیکھی کا نتیجہ یہ نکلنے لگا کہ دونوں کے دلوں نے محبت اور عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ کی آنچ کو محسوس کیا جس سے دونوں دل پگھلنے لگے دونوں سینوں کے اندر دھڑکنے والے دل آنے والے خطرات کو محسوس کئے بغیر ایک دوسرے کے لئے التفات کے جذبوں سے سرشار ہوتے رہے۔ رز و بروز ان کے تعلق بڑھتے رہے حالانکہ ان کی زندگی کے راستے کے درمیان مذہب کی چٹان پہاڑ بن کر کھڑی تھی اس کے باوجود یہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ وزیر علی شاہ جو کہ نہ صرف مسلمان تھا بلکہ ایک معتبر مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ دوسری طرف رام کور بھی کٹر ہندو گھرانے کی دوشیزہ تھی اور دونوں کا رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا تصور تک بھی امر محال تھا۔

عشق و محبت تو وہ جذبہ ہے جو ہزار ہا پردوں میں چھپائے بھی نہیں چھپ سکتا نہ ہی اس جذبے پر قابو پانا کسی کے بس کی بات ہے۔ روز بروز رام کور اور امیر نور علی شاہ کے دلوں میں پلنے والا جذبہ محبت فروغ پاتا رہا۔ جوں جوں یہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے تشنگی اور بڑھتی تھی۔ آخر کار ان دونوں نے دنیا' دنیاداری اور مذہب کی حدوں کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

رام کور نے کپڑوں کا ایک جوڑا لیا اور نور علی شاہ کے قدموں میں آ کر گر پڑی اور یہ فیصلہ کر لیا کہ نور علی شاہ کی خاطر اب وہ اپنا دھرم چھوڑنے کو تیار ہے چنانچہ اس نے کلمہ شریف پڑھ کر مسلمان ہو گئی اور اس کا اسلامی نام نور جہاں رکھ دیا گیا۔

رام کور کے ورثاء یعنی چچا ہرنام داس اور والدہ منسہ دیوی نے سید امیر علی

شاہ کے خلاف تھانہ دومیل میں اغواء کی رپورٹ درج کروادی اور کہا کہ نور علی شاہ نے لڑکی کو دھوکے سے اغواء کر کے اس کو مسلمان کر دیا ہے اور رام کور اپنے ساتھ جو بہت سی نقدی اور پارچہ جات لائی ہے اس پر بھی امیر نور علی شاہ نے قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ پولیس نے امیر نور علی شاہ اور اس کے بھائی سید میر عبداللہ کے گھر چھاپہ مارا مگر کچھ بھی دستیاب نہ ہوا۔ اس کے بعد ہرنام داس نے اسی تھانے میں دوسری رپورٹ بھی درج کروادی اور پہلی رپورٹ کو غلط بتایا ادھر امیر نور علی شاہ لڑکی کو لے کر پک اسماعیل خیل (سورانی) اپنے ماموں میر علی خان کے ہاں چلا گیا۔

بنوں کی تاریخ میں اس نوعیت کا واقعہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے سارے بنوں میں کہرام مچ گیا کہ ایک ہندو لڑکی کو ایک مسلمان نے اغواء کر لیا ہے۔

یہ واقعہ اس قدر سنگین صورتحال اختیار کر گیا کہ دو گھرانوں کا انفرادی معاملہ نہ رہا بلکہ پھیلتے پھیلتے دو قوموں کا مسئلہ بن گیا۔ ایک طرف مسلمان میدان میں اتر پڑے اور دوسری جانب ہندو۔ انگریز انتظامیہ نے اس سلسلے میں ہندو معاونت میں جانبداری کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے مسلمان قبائل میں انگریز انتظامیہ کے خلاف بھی انتقام کی آگ پھیلنے لگی۔

ادھر لڑکی نے یہ اعلان کر دیا کہ اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے اور اپنی مرضی سے امیر نور علی شاہ سے شادی کی ہے۔ اس واضح اعلان کے بعد بنوں شہر کے تمام ہندو یکجا ہو گئے اور انہوں نے لڑکی کے چچا ہرنام داس اور ماں منسہ دیوی کی مدد کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلے میں بڑے ہندو ذات کے پنڈت اور تاجر پیشہ رائے بہادر بھی شامل تھے اور سب نے مل کر منسہ دیوی کی طرف سے ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں امیر نور علی شاہ اور اس کے بھائی عبداللہ شاہ اور کچھ دوسرے عزیزوں کے خلاف استغاثہ دائر کر دیا جس میں لکھا گیا کہ منسہ دیوی ایک بیوہ عورت ہے اور ملزم اثر ورسوخ والے لوگ ہیں اس لئے انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے ابتدائی رپورٹ کے اندراج کی نفی بھی کروادی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا کہ اس واقعے کو مذہبی رنگ بھی دیا جا رہا ہے اس لئے گزارش ہے کہ مغویہ کو واپس ورثاء کے حوالے کیا جائے ورنہ اس سے مذہبی اشتعال پھیل کر خطرناک صورت اختیار کرنے کا باعث بن جائے گا۔

امیر نور علی شاہ کا بڑا بھائی جو کہ گورنمنٹ ہائی سکول میں استاد تھا ڈپٹی کمشنر نے اسے تھانے طلب کر کے کہا کہ اس واقعے سے بڑے خطرناک نتائج پیدا ہو رہے ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ لوگ لڑکی کو ہندوؤں کے حوالے کر دیں اس طرح میر نور علی شاہ کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی بھی نہیں کی جائے گی اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

ڈپٹی کمشنر کی اس ہدایت پر سید عبداللہ شاہ اپنے ماموں کے گھر اسمٰعیل خیل (سورانی) گیا اور نور جہاں سے کہا کہ اگر اس کی خواہش ہو اور وہ اپنے سابقہ فیصلے پر نادم ہو تو اسے اس کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ نومسلم نور جہاں نے اپنے جیٹھ سید عبداللہ شاہ کی اس بات پر جو جواب دیا ہے وہ ایک پشتون معاشرے کی ننگ وناموس کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ نور جہان نے کہا:

''بھائی صاحب آپ مجھ سے یہ بات کر رہے ہیں جب کہ میں آپ کی ناموس ہوں۔ اگر پشتون لوگ اپنی شرم وناموس کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں تو پھر آپ بھی ایسا کر دیں۔ میں نے اپنے چچا اور والدہ کی مرضی کے برعکس اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے اسلام قبول کیا ہے اب اگر میں واپس ہندوؤں میں جاؤں گی تو میری کیا عزت رہے گی۔

اس بے عزتی سے موت بہتر ہے۔ جب میرے لئے موت ہی آخری راستہ ہے تو مجھے ان کے حوالے کرنے کے بجائے قتل کر دیجئے کہ میں روز روز کی موت سے بچ سکوں اور اگر آپ مجھے قتل کرنے سے بھی ہچکچاتے ہیں تو پھر مجھے آزاد کر دیجئے کہ میں کسی مسلمان گھرانے میں ملازمت کر کے زندگی گزاروں اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیجئے''۔

لڑکی کی اس جرائت انگیز اور دلیرانہ گفتگو سننے کے بعد عبداللہ شاہ ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

اس کے بعد امیر نور علی شاہ نور جہان کو لے کر اسمٰعیل خیل سے موضع گمبتی چلا گیا اور پھر وہاں سے پسین وام کے راستے افغانستان فرار ہونے کا منصوبہ تیار کیا مگر اس سے پہلے کہ ان کا یہ منصوبہ بخیر وخوبی پایہ تکمیل کو پہنچتا انگریز انتظامیہ اس منصوبے سے باخبر ہو گئی اور پولیٹکل ایجنٹ نے پسین وام میں ان کی گرفتاری کا مکمل انتظام کر لیا۔

اس واقعہ کی مذہبی نوعیت ایسی تھی کہ علاقے میں ہندو سرکاری حکام ہندوؤں کے مفادات کے تحت اور مسلمان افسران نور جہان اور امیر نور علی شاہ اور سید عبداللہ شاہ کے حق میں اقدامات اٹھانے لگے۔

اس سفر میں امیر نور علی شاہ اور نور جہان کے ساتھ عبداللہ شاہ بھی تھا انہوں نے بعض ناگوار حالات ومجبوریوں کے تحت ٹانک کے راستے فرار ہونے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے انہوں نے ایک ٹیکسی کا اہتمام کیا۔ ٹیکسی ایک ہندو کی لی گئی تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ امیر نور علی شاہ اور نور جہان کو ٹیکسی میں روانہ کر کے عبداللہ شاہ واپس ہو گیا مگر ان کے اس سفر کے بارے میں بھی حکومتی اداروں کو خبر ہو چکی تھی چنانچہ تھانہ غوریوالہ میں ٹیکسی کو رکوا کر ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب تھانہ غوریوالہ کے تھانیدار نے نور جہان سے اس کے نام کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنا نام

اسلام بی بی بتایا اور پھر اسی روز سے نور جہان کا نام اسلام بی بی کے نام سے مشہور ہو گیا جو کہ اسی رومانوی داستان کے ساتھ منسلک ہے۔ تاریخ میں یہی نام مشہور ہوا دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ جیل میں اسلام بی بی سے ملاقات کرنے کے لئے ہندوؤں کو کھلی چھٹی دی گئی جبکہ مسلمانوں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ اسلام بی بی سے ملاقات نہ کریں۔

مسلمانوں کا ایک وفد قائم مقام ڈپٹی کمشنر مسٹر سکاٹ سے ملا۔ اس وفد نے اسلام بی بی سے ملاقات کرنے کی اجازت چاہی مگر مسٹر سکاٹ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہندوؤں کا وفد بھی واپس چلا گیا ہے البتہ دوسرے روز عبداللہ شاہ کو عدالت حاضر ہونے کا حکم دیا۔

عدالت میں سرکاری وکیل حکم چند نے سید عبداللہ شاہ کی اس درخواست پر اعتراض کیا جس میں اسلام بی بی کا بیان قلمبند کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی حکم چند نے اعتراض کی وجوہات یہ بتائیں کہ چونکہ اسلام بی بی پندرہ دن تک امیر نور علی شاہ کے زیر اثر رہی ہے اس لئے یہ بیان درست نہ ہوگا۔

عبداللہ شاہ نے جواب دیا کہ یہ لڑکی اپنے گھر میں پندرہ سال چھ ماہ رہ چکی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صرف پندرہ دن کے اثر نے ساڑھے پندرہ سال کا اثر زائل کر دیا ہو۔ پھر جیل میں پندرہ دن سے زیادہ ہندوؤں کی ملاقاتیں اسلام بی بی کے ساتھ رہیں تو پھر کیسے پندرہ دن کا اثر قائم رہ سکتا ہے۔

عبداللہ شاہ کی اس حاضر جوابی کا مثبت اثر مسٹر سکاٹ پر ہوا اور اس نے اسلام بی بی کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب اسلام بی بی عدالت میں حاضر ہوئی تو شہر کے لوگ جوق در جوق عدالت میں پہنچے۔ اس روز اسلام بی بی سفید برقعے میں عدالت میں حاضر ہوئی سرکاری وکیل حکم چند نے سوال کیا تمہارا نام کیا ہے۔

اسلام بی بی نے جواب دیا پرانا نام رام کوری تھا اور اب اسلام بی بی۔ حکم چند نے کہا تم قرآن کو مانتی ہو۔ اسلام بی بی نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا قرآن مت کہو۔ قرآن شریف کہو۔

اسلام بی بی کی ماں نے عبداللہ شاہ کو بد دعا دیتے ہوئے کہا عبداللہ شاہ تیری پگی ٹوٹے (عبداللہ شاہ تیری گردن ٹوٹے) اسلام بی بی نے بھی ماں کی اس بد دعا کا جواب اس لہجے میں دیا تہاڈی پگی تے گردن ٹوٹے۔

سکاٹ نے اسلام بی بی کو توہین عدالت کی پاداش میں چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔

اس قید کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ چھ ماہ بعد اسلام بی بی بالغ ہو جائے گی تو پھر یہ قانونی طور پر مجاز ہوگی کہ وہ مذہب کو اپنی مرضی سے تبدیل کرتی ہے یا نہیں مگر بعد میں یہ چھ ماہ کی قید دو سو روپے جرمانہ میں تبدیل کر دی گئی۔

دوسرے روز ڈپٹی کمشنر مسٹر سکاٹ رخصت سے واپس آ گیا۔ اس نے ہندوؤں سے اسلام بی بی کا توہین عدالت کا جرمانہ وصول کر لیا اور اسلام بی بی کو سمندر شاہ نامی ایک سکھ کی تحویل میں دے دیا۔

اس فیصلے پر بنوں شہر کے لوگ سخت مشتعل ہوئے اور ان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے روز بنوں کے مسلمان شہریوں نے سمندر شاہ کے گھر کو گھیر لیا اور ایک جلوس ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچا دفتر میں پڑا ہوا فرنیچر توڑ دیا' پتھراؤ کیا اور اسلام بی بی کے حق میں نعرے لگائے اور ہندو انگریز گٹھ جوڑ پر انہیں مردہ باد کہا۔

حالات دگرگوں صورت اختیار کرنے لگے تو بنوں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ مگر بنو چیوں' وزیریوں اور مروتوں نے مارشل لاء کی خلاف ورزی کی اور حکومت کو ایک درخواست بھیجی۔

ان درخواستوں میں بالغ اسلام بی بی کے اسلام لانے کے حق میں اور اسے اپنی مرضی کے خلاف سکھوں کی تحویل میں دینے کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔

معاملات نے نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر لی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فساد کا اندیشہ بڑھ گیا تھا۔

چنانچہ حکومت نے اسلام بی بی کو بنوں کے دو مسلمان معززین خان بہادر غلام حیدر خان اور بازار احمد خان کے ملک تاج علی خان کے حوالے کر کے باقاعدہ قانونی کارروائی کرنے کا اعلان کر دیا۔

مگر ہندوؤں کے لئے یہ بات بھی معیوب تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھ کیسے سپرد کیا گیا انہوں نے در پردہ ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔

اس پر ایک رات کو پولیس افسر تاج علی خان کے گھر پہنچے اور ڈپٹی کمشنر نے تاج علی کو لڑکی حکومت کی تحویل میں دینے کے لئے کہا۔ تاج علی کو تردد تھا کیونکہ ایک طرف مسلمانوں کے جذبات کا خیال تھا اور دوسری طرف ایک ذمہ دار حکومتی نمائندے کا لحاظ۔ ڈپٹی کمشنر نے تاج علی خان کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اسے تردد نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہندوؤں کو لڑکی آپ کے پاس رہنے پر اعتراض ہے۔ اسلام بی بی نے جانے سے انکار کر دیا مگر ملک صاحب بے بس تھے۔ اسلام بی بی بہت چیخی چلائی مگر حکومت کے سامنے بے بس تھی۔ بعد میں معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لڑکی کس کے حوالے کی گئی' کہا یہ جاتا ہے کہ بگائی موٹر سروس کی ایک تیز رفتار لاری پولیس کی حفاظت میں اسلام بی بی کو لے کر ہوشیار پور پہنچ گئی۔

اسلام بی بی کو غائب کر دیا گیا اور سید نور علی شاہ کے خلاف مقدمہ کھڑا کر دیا گیا۔ بعد میں اس واقع کے اثرات اس حد تک پھیلے کہ فقیر ایپی کی سرکردگی میں مسلمان نوجوان متحد ہوئے اور کئی محاذوں پر انگریزوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور انگریز اور مسلمان مجاہدین کے درمیان یہ معرکے قیام پاکستان تک جاری رہے۔

لوک ساز، گیت اور ناچ

صوبہ سرحد کے وہ پشتون علاقے جو کہ اپنے بہادروں اور آزادی پسندوں کے کارناموں سے معروف ہیں۔ ان میں بہادروں کی مدح میں جو رزمیہ گیت پروان چڑھے ہیں ان میں بنوں کا علاقہ بہت مشہور ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ اور دیگر خوشیوں کے موقعوں پر بھی جو مخصوص گانے اور گیت ہیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے وہ گیت جو رزمیہ گیت ہیں ان میں بنیادی طور پر بہادری جرات و دلیری، حب الوطنی اور جوش و ولولہ ہوتا ہے جبکہ ساتھ ہی غداروں کے رویوں کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

رزمیہ گیت کی خاص اصناف بھی ہوتی ہیں اور پشتو کی مشہور صنف ٹپوں میں بھی یہ باتیں ہوتی ہیں۔ دراصل کسی بھی علاقے کا ادب وہاں کے مجموعی ماحول اور لوگوں کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے اور یہی ادب جب نظموں میں ڈھل جاتا ہے تو وہاں کے فنکار اپنے مخصوص انداز میں گیتوں کے ذریعے اس منظوم کلام کو اپنے خاص لے، لہجہ اور آلات موسیقی کے ساتھ پیش کرنے کے فن سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنوں جیسے علاقے میں جو ٹپے گائے جاتے ہیں ان ٹپوں کی ایک قسم یہ ہے:

دا آزادی پہ مرگ خوشحال یم
ذ غلامی ژوندون کہ ذیروی رک دشینہ

ترجمہ: میں آزادی کی موت پر خوش ہوں غلامی کی زندگی بہت بھی ہو تو اس پر لعنت ہے۔

آزادی دوہ ورزے کافی دہ
قبول بہ نہ کڑم دغلامی ہزار کالونہ

ترجمہ: آزادی کے دو دن کافی ہیں۔ غلامی کے ہزار سال مجھے قبول نہیں۔

بنوں کے معاشرتی حالات کی جو تاریخی نوعیت ہے اس میں کئی سپوت ایسے گزرے جنہوں نے وطن کی آن پر جان کی بازی لگا دی اور غیروں کے تسلط کو کبھی قبول نہیں کیا۔ یہ وطن پرستی کی آن رکھنے والے وہ لوگ ہیں جن کے اوصاف ان ٹپوں میں ظاہر ہوتے ہیں:

زان بہ سل زائے قطرے قطرے کڑم
وطنہ تا بہ لہ دخمن زنی ساتمہ

ترجمہ: اپنے جسم کے سو ٹکڑے کر دوں گا اور اے وطن تجھ کو ہمیشہ دشمن سے محفوظ رکھوں گا۔

قبرم جوڑ پرلو یوغرو کڑی ء
چہ وطن شمال م شناختی خوردینہ

ترجمہ: میری قبر اونچے پہاڑ پر بنانا کہ وطن کی ہوا میری لوح سے ٹکرائے۔

پہ زڑہ م خپل وطن ورینگی
لکہ دزائرو قلقلی پسے کومہ

ترجمہ: مجھے وطن کی یاد بے کل کر رہی ہے (اس لئے) کونج کی طرح (بے چین ہو کر) کراہ رہی ہوں۔

بنوں میں کونجیں بکثرت ہیں۔ اس لئے اس ٹپہ میں کونج کی بے چینی کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ٹپے صرف بنوں کے نہیں سارے پشتونوں کے مشترکہ ٹپے ہیں۔ جو ہر علاقے میں گائے جاتے ہیں۔

نوٹ: ٹپے، چاربیتہ اور نیمکئی کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

لوبہ: یہ بھی پشتون یا پختون تمام علاقوں میں گائے جانے والے گیتوں کی ایک خاص صنف ہے۔ پشتونوں میں بنوں کا علاقہ زبان و مزاج کے حوالے سے خاص مقام رکھتا ہے۔ اس لئے اس علاقے میں گیت کی یہ صنف بھی عام ہے۔ لوبہ کا معنی کھیل کے ہے اور یہ گیت کھیل کھیل میں گایا جاتا ہے۔ اس کی اپنی مخصوص لے غنائیت اور اسلوب ہے۔ یہ گیتوں میں نازک اور ہلکی پھلکی صنف ہے اور اکثر مکالمہ کی صورت میں یہ گیت گایا جاتا ہے عام طور سے اسے صنف نازک ہی گاتی ہیں۔ یہ شادی بیاہ اور میلے ٹھیلوں میں بھی گایا جاتا ہے اور کھیتوں میں مستورات کام کرتی ہیں تو اس وقت بھی گاتی ہیں۔ دوگانوں کی صورت میں اس کی لے اور غنائیت کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں مگر دو قسمیں بہت مشہور ہیں۔

ترجمہ

نن راشہ مہ جینی	اے مہ جبیں آج آجا
خمار دستر گودے پہ زڑہ دیشتلی یمہ	تیری مخمور نگاہوں نے میرے دل کو زخمی کر دیا ہے۔ غم نے مجھے بہت زیادہ کھا لیا ہے۔

نن راشہ مہ جبینی	آج آجامہ جبین
دزے دزے دپہ ڈیرغم کڑہ	تو نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا
زہ خو دبے اجلہ نن وژلی یمہ	آج تو نے مجھے بے اجل مار دیا ہے
ڈیرغم خوڑلی یمہ	غم نے مجھے بہت کھالیا ہے
نن راشہ مہ جبینی	آج آجامہ جبین
غمونو ستا کڑمہ بدحالہ	تیرے غموں نے مجھے بدحال کر دیا ہے
نن راشہ مہ جبینی	آج آجامہ جبین

بنوں کے معروف فنکار: بنوں کی سرزمین پر ایسے موسیقار و فنکار پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے فنِ موسیقی کو کمال تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صمد عباسی کا نام بڑا معتبر ہے۔ ڈاکٹر عبدالصمد ہارمونیم، بینجو، وائلن، ستار اور بانسری میں کمال دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے موسیقی کی تربیت بمبئی میں حاصل کی موسیقی کے علاوہ ڈاکٹر عبدالصمد نے انڈیا کی بعض فلموں میں اداکاری بھی کی ان فن کاروں میں بنوں کے مسلمان فنکاروں کے علاوہ ہندو اور سکھ فنکار اور گلوکاروں نے بھی بہت شہرت حاصل کی تھی۔ ان میں امیر سنگھ، روشن لال بھٹہ اور سکھ رام قابل ذکر ہیں جنہوں نے دہلی ریڈیو سٹیشن سے بھی اپنی گلوکاری کے جادو جگائے۔ بازار احمد خان (عیسکی) کے سردار خان لکھنو اور علی گڑھ یونیورسٹی میوزیکل سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔ چاچا مہر دین، سیٹھ لوکو رام اور ڈاکٹر بغداد خان بھی فن موسیقی کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح شیر افگن دہلی ریڈیو سنگر رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بنوں میں فنکار ایسوسی ایشن کے نام پر ایک انجمن بنائی۔ اس ایسوسی ایشن کے ذریعے بنوں میں کئی فنکاروں کی تربیت کا انتظام کیا تھا سکھ رام وزیر چند بھگت سنگھ اور لالہ رام بنوں کے وہ معروف گلوکار تھے جو کہ پشتو گلوکاری کے سلسلے میں دہلی ریڈیو سٹیشن میں خاص مقام رکھتے تھے۔ کابل ریڈیو میں پشتو گلوکار گل زمان کا بھی تعلق بنوں سے تھا۔ خواتین گلوکاروں میں گوہر بیگم، گلنار بیگم، دلشاد بیگم، نسیم اختر اور زرسانگہ بنوں سے تعلق رکھنے والی وہ نامور خواتین ہیں جنہوں نے پشتو موسیقی میں ریڈیو پاکستان پشاور سے اپنی آواز کا جادو جگایا اور اپنے فن میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کے علاوہ بنوں سے تعلق رکھنے والے ریڈیو سنگر زعجب خان، شیر احمد خان، شہباز خان، شریف خان، خواجہ لوئل دارہ، پیر غلام مصطفےٰ کے نام شہرت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ گل ایوب سیفی کی تحقیق کے مطابق وزیر اعظم تغل خیل، گلا جان بڈ امیر عباس، حقداری، میر عباسی، عزیز خان سورانی، شیر جان مغل خیل، نقرہ دین ھویدا، بازار احمد خان کے شیر زمان، قریشی مروت، ککی کے بہرام، عیسکی کے بہرام، عیسکی کے حیدری زامنگی، شیر کلی جوڑئی (شیر کلہ) اکبر خٹک، سحر گل، تور گل، تور گل مخی کلی، سیداں شاہ شمسی خیل غلام غفار اور خان زمان شاہ شامل ہیں۔

طرزِ زندگی، لباس وزیورات

بنوں کی اقوام میں اس وقت مروت قوم نمایاں حیثیت رکھتی ہے جس کی متعدد ذیلی شاخیں ہیں۔ ان کی معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی زندگی ہی ان کی اصل ثقافت کی آئینہ دار ہے۔

لباس: یہ لوگ بڑا سا کرتہ، تنگ پاپانچے والی شلوار پہنتے اور سر پر پگڑی باندھتے۔ یہ ان مردوں کے بزرگوں کا لباس تھا۔ جبکہ ان کے جوانوں کا لباس اُن کے برعکس ہوتا۔ عہد حاضر میں عہد بہ عہد ارتقائی حالات کے تحت اب ان کے لباس میں بڑی حد تک تبدیلی آچکی ہے۔ تاہم بنوں اور لکی مروت کے لوگوں میں پگڑی باندھنے کا رواج بدستور ہے جو کہ لنگی کی رنگدار ہوتی ہے۔ یہ لوگ مخصوص طریقے سے سر پر پگڑی باندھتے ہیں اور یہ پگڑی ہی اکثر ظاہر کر دیتی ہے کہ یہ لوگ بنوچی اور مروتی ہیں۔

خواتین کے لباس: بنوں کے علاقہ میں تمام خواتین بارہ گز پر مشتمل کپڑے کی شلوار استعمال کرتیں، سر پر دوپٹہ اور پاؤں میں قدیم طرز کی جوتی پہنتی ہیں۔ ان کی خواتین پردے کی سخت پابند ہیں۔ ان کا برقعہ قدیم طرز کا سفید یا رنگدار ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک بدن کو ڈھانپتا ہے۔ خواتین عموماً بیاہ شادی، اموات یا کسی اور مواقع پر ہی گھروں سے باہر نکلتی ہیں۔ باہر جاتے وقت اپنے گھروں کے مردوں کے ساتھ ہوتی ہیں اور باپردہ ہوتی ہیں۔

زیورات: بنوں اور لکی مروت کی خواتین میں جن زیورات کا استعمال عام طور سے مروج ہے ان میں پرانی طرز کے نمونے عام تھے۔ ان میں کنگڑا اور اونگن نامی زیورات مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ اوڑدی یعنی گلوبند جو گلے میں پہنا جاتا ہے اس میں سونے کے علاوہ موتی بھی جڑے ہوتے ہیں۔ کلائیوں میں استعمال کرنے والے زیور کو مقامی زبان میں یہ باؤ کہتے ہیں۔ ناک میں جو تھیوہ ڈالتی ہیں اس کو ٹک کا نام دیا جاتا ہے۔ پاؤں میں پہننے والے زیور کو کڑے یا پازیب کہتے ہیں۔ پیشانی پر سجائے جانے والے زیور کو تعویذ کہا جاتا ہے جیسے ایک ہک کے ساتھ سر کے بالوں میں پھنسا کر پیشانی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

بنوں و مضافات اور لکی مروت کی قدیم خواتین سونے کے علاوہ چاندی کے بھاری زیورات بھی بڑے شوق سے استعمال کرتی تھیں۔

گھوڑوں کا زیور: بنوں اور لکی مروت کے لوگوں میں گھوڑوں کو بڑے شوق سے پالنے کا رواج تھا اور مالدار اور شوقین لوگ اپنے گھوڑوں کو بھی زیور پہناتے تھے۔ اس میں تعویذ کا عام رواج تھا اور گھوڑ دوڑ میں دوڑانے والے گھوڑوں کے گلے میں سونے یا چاندی کا تعویذ بنا کر لٹکا دیتے تھے۔

نیازیوں کا طرز معاشرت اور زیورات: بنوں کی قدیم اقوام میں نیازی اہم مقام رکھنے والے لوگ تھے جو مروت قوم سے پہلے یہاں وارد ہوئے اور اب بھی بنوں میں کافی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ لوگ تنگ پائنچے والی شلوار استعمال کرتے تھے۔ ان کے وہ لوگ جو معمر اور بزرگ ہوتے ان کے ہاتھ میں ڈنڈا ضرور ہوتا تھا اور یہ لوگ پگڑی اونچی کر کے پہنتے تھے اب بھی پرانی وضع قطع کے نیازی اسی قسم کے روایتی پہناوے کو ترجیح دیتے ہیں ان نیازیوں کے قد کاٹھ فربہ اور اونچے ہوتے ہیں اور زیادہ تر بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں۔ رنگت گندمی ہوتی ہیں۔

سیر و شکار: بنوں اور لکی مروت کے لوگ شروع ہی سے سیر و شکار کے دلدادہ رہے ہیں۔ بنوں کے مغربی پہاڑی علاقے میں موسم بہار میں چکور، بٹیر، تیتر، کونجیں، مرغابی اور تلیر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ شوقین لوگ یہاں ان پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ بنوں کی کونجیں بہت مشہور ہیں۔ لکی مروت کے لوگ گرمی کے موسم میں جنگلی کبوتر اور سردیوں میں خرگوش کا شکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ سوروں کا شکار بکثرت کرتے ہیں۔ ان کے جنگلوں میں سور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ شکار کرتے وقت یہ لوگ اپنے ساتھ شکاری کتے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں بازوں کا شکار کرتے ہیں۔ یہاں بڑے قیمتی اور نایاب باز پائے جاتے ہیں۔ بازوں کے شکار میں نیازی قوم کے لوگ مشہور ہیں۔ ان کے ہاں جنگلی حیات میں گیدڑ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں اور یہ لوگ ایک خاص مہارت کے ساتھ گیدڑ کا شکار کرتے ہیں۔ گیدڑوں کو مار کر ان کی کھال اتار کر بازار میں بیچ دیتے ہیں۔ یہ کام کاروباری صورت اختیار کر گیا ہے اس لئے زیادہ تر لوگ گیدڑ کے شکار کو ترجیح دیتے ہیں۔

لوک کھیل

کانچ کے بلورے: چند بچے مل کر یہ کھیل کھیلتے ہیں ایک خاص مقام پر کانچ کا بلورہ رکھا جاتا ہے اور خاص فاصلے سے دائیں ہاتھ کی انگلی اور بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے درمیان بلورے کو رکھ کر دوسرے بلورے کا نشانہ باندھا جاتا ہے۔ اگر نشانہ لگانے والا کامیاب ہو جائے تو بدلے میں اسے ایک کانچ کا بلورا دیا جاتا ہے۔ اگر ناکام ہو تو مدمقابل کو بلورا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح پھر دوسرا بچہ یہ نشانہ لگاتا ہے۔

غلیل بازی: درخت کی شاخوں میں سے چھوٹے چھوٹے دو شاخی لکڑی کے ٹکڑے کاٹ کر اسے اچھی طرح چھیل کر اور صفا کر کے لچک دار ربڑ کے ٹکڑے کے دوسروں کو دو شاخی لکڑی کے سروں سے جوڑ دیا جاتا ہے اور پھر ربڑ کے بالکل درمیان چمڑے کا ٹکڑا لگا دیا جاتا ہے اکثر بچے اور نوجوان غلیل کو اپنے گلے میں ڈال کر شہروں سے باہر میدانوں اور جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔ ابتدائی طور پر درختوں کے پھلوں کا نشانہ باندھتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ غلیل کی ربڑ کے اس حصے میں جہاں چمڑا لگا ہوتا ہے وہاں ایک پتھر رکھ کر غلیل کے لکڑ کو دائیں ہاتھ سے پوری طرح آگے کی طرف کھینچ کر نشانہ باندھتا ہے اور مہارت کے ساتھ بائیں ہاتھ میں چمڑے کے حصہ کو زور سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ غلیل سے اڑتے پرندوں یا پھر درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کا شکار کیا جاتا ہے۔ نشانہ پرندے کو لگ جائے تو پرندہ پھڑ پھڑا کر گر جاتا ہے جسے فوراً چاقو سے ذبح کر دیا جاتا ہے۔

نیزہ بازی: بنوں کے خاص بنوچیوں اور لکی میں مروتوں میں نیزہ بازی کا رواج عام تھا۔ اسے بنوچی زبان میں "سونگہ وھنہ" کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنوں اور لکی مروت کے ہر دیہات میں مضبوط اور توانا گھوڑے ہوتے تھے چونکہ نیزہ بازی کا کھیل گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک ہاتھ میں نیزہ مضبوطی کے ساتھ اس طرح پکڑا ہوتا ہے کہ نیزے کا پھل آگے کی طرف ہوتا ہے اور بہت دور فاصلے پر کسی چیز کا نشانہ لیا جاتا ہے۔ گھوڑے کو پوری رفتار کے ساتھ دوڑایا جاتا ہے اور اسی رفتار میں ہی مخصوص چیز خاص کر زمین میں گڑی لکڑی کے ٹکڑے کا نشانہ لیا جاتا ہے۔ جو اس میں سوراخ کر کے اسے زمین سے اکھاڑ کر نیزے کی انی میں اٹکا لے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ جنگی مشقوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اب پالتو گھوڑوں کا رواج بہت کم ہو چکا ہے اور ان کے بجائے سواری کے لئے دوسرے ذرائع پیدا ہو چکے ہیں اس لئے اب یہ گھوڑے بھی ناپید ہونے لگے ہیں۔ تاہم اب بھی بعض مقامات پر نیزہ بازی کا رواج موجود ہے مگر اب یہ کھیل بہت کم کھیلا جاتا ہے۔

کبڈی: کبڈی صوبہ سرحد کے تقریباً ہر حصہ میں کھیلی جاتی ہے۔ بنوں میں اس

کھیل کی نوعیت کچھ زیادہ مقبول ہے اور بنوں اور لکی مروت کے لوگوں نے کبڈی کو بہت زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔ بنوں اور لکی مروت و مضافات کے ہر گاؤں میں کبڈی کے میدان ہیں اور فارغ اوقات میں گرمیوں میں شام کے وقت مقامی طور پر ٹیمیں بنا کر کبڈی کا کھیل کھیلا جاتا ہے اور کثیر تعداد میں تماشائی اس مقابلے سے محظوظ ہوتے ہیں۔ بنوں میں اس کھیل کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنوں میں کبڈی کے کھیل کی باقاعدہ ایک تنظیم ہے جس کے اچھے اچھے کھلاڑی ممبر ہیں اور جہاں بھی کبڈی کے مقابلے ہوتے ہیں، اس تنظیم کے کھلاڑی مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے بھجوائے جاتے ہیں۔ باقاعدہ جن علاقوں میں سالانہ ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ ان میں بنوں کے علاوہ کوہاٹ، کرک، ڈیرہ اسماعیل خان، میانوالی، سرگودھا اور شمالی وزیرستان، فیصل آباد، جھنگ، مظفر گڑھ اور ملتان کے علاقے قابل ذکر ہیں اور ہر سال ان علاقوں میں بنوں کے کبڈی باز حصہ لیتے ہیں۔

پہلوانی: بنوں کی قدیم پہلوانی کے مقابلوں میں نہ صرف جسمانی طاقت کا مظاہرہ کیا جاتا تھا بلکہ باہم لڑنے والے پہلوان تلواروں کے ذریعے بھی داؤ پیچ سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ بنوں اور لکی مروت کے اضلاع کے تمام بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں پہلوانی کا رواج عام ہوتا تھا۔ ہر شہر قصبہ اور دیہات میں متعدد پہلوان ہوتے جن کے اخراجات نہ صرف مقابلوں کے وقت دیہات کے ملک اور بااثر لوگ برداشت کرتے تھے بلکہ ان کے روزمرہ کی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں بھی اخراجات یہی ملک اور بااثر لوگ ہی برداشت کرتے تھے۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا کہ بعض ملک اپنے حجروں تک بھی محدود پہلوان پالتے تھے اور جب قبائل کی باہمی جنگیں ہوتیں تو ان پہلوانوں کو آگے کیا جاتا تھا جو کہ تلواروں کے ذریعے اور جسمانی داؤ پیچ کے ذریعے سے مخالف قبیلے کے طاقتوروں کو زیر کرتے تھے۔

گل ایوب سیفی کے مطابق بنوں کے جس پہلوان نے شہرت حاصل کی ان میں میر گل شاہ پہلوان تھا جس کا تعلق عیسکی گاؤں سے تھا۔ اسے لوگ رستم سرحد بھی کہتے تھے۔ یہ پہلوانی کے مقابلے کے لئے ہندوستان بھر میں منعقدہ مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے شریک ہوتا رہا اور ہر جگہ سے کامیاب و کامران لوٹا ہے۔ اس نے پہلوانی میں ایسے موثر داؤ پیچ سیکھ لئے تھے کہ جس کی وجہ سے یہ ناقابل شکست پہلوان کے طور پر زندہ رہا۔

تیر خان آف میتا خیل بنوں کے شہرت یافتہ پہلوانوں میں سرفہرست ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان، منٹگمری، بمبئی، کلکتہ اور دیگر مقامات پر اکھاڑوں میں ناقابل شکست مقابلے کئے اور بڑے بڑے نامور پہلوانوں کو ہرایا اور گرانقدر انعامات حاصل کئے۔ بنوں کے دوسرے مشہور پہلوانوں میں تیر خوجڑی، میرو آف لکی، میاں ممش خیل، جمال شاہ عیسکی، جان عیسکی اور بنوں شہر کے حنیف کے نام مقبول عام ہیں۔

اینڈہ: یہ بنوں کے لوگوں اور وزیریوں کا دلپسند کھیل ہے۔ یہ کھیل ملحقہ جنوبی اضلاع میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کے لئے ہموار اور وسیع و عریض میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ دور دراز سے شائقین آتے ہیں اور تماشائیوں کی بڑی تعداد اس کھیل سے محظوظ ہوتی ہے۔ بنوں اور لکی مروت کے لوگ جنون کی حد تک اس کھیل کو پسند کرتے ہیں۔ اس کھیل نے یہاں کے مقامی کھیلوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی ہے۔ بنوں اور مضافات میں اس کھیل کے لئے جو مخصوص میدان مشہور ہوئے ہیں ان کے نام اور مقامات یہ ہیں:

اینڈا، تار گل، ودا بینہ (عیسکی)، امبر ژونگ (میریان)، برلشتی (سورانی)، یوگبر (تپئی)، نرائی، میریان، سرہ وڑئی (منڈان)، کرلے کسونہ، ترخہ وال (عیسکی)، دادہ (سورانی)، وغزائی (بکا خیل)، پولوگراؤنڈ بنوں چھاؤنی، پیتل گراؤنڈ (سوکڑی)، سوداد پڑاؤ، گنڈی خان خیل بنج، وانڈہ وزیر ہاتی خیل، پوچے ٹیپان (لکی مروت)، مشہ منصور لکی، ترخی۔

ان متذکرہ میدانوں میں اینڈہ کھیل کے مقابلے لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

ٹوپک نشانہ: بنوں اور مضافات کے پشتون جنگجویانہ خصوصیات پیدا کرنے کے لئے ابتداء ہی سے اپنے بچوں میں بندوق اٹھانے اور چلانے کی تربیت کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو کہ بنوں اور ملحقہ علاقے وزیرستان کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ پشتو میں بندوق کو ''ٹوپک'' کہا جاتا ہے۔ ٹوپک نشانہ یا نخہ کا مطلب ہے بندوق کے ذریعے نشانہ لگانا۔ اس کے لئے شہروں اور قصبوں کی آبادی سے باہر میدانوں میں تربیت گاہیں ہوتی تھیں۔ عام بازاروں اور گلی کوچوں میں بندوق کے ذریعے نشانہ بازی کی عادت پیدا کرنے کے لئے کچھ پیشہ ور لوگ پھرتے رہتے ہیں جو کہ غباروں اور چھوٹے چھوٹے سکوں پر ایک خاص مقام کے فاصلے سے نشانہ لگانے کی تربیت بھی دیتے ہیں اور اس طرح ان کا روزگار بھی چلتا رہتا ہے۔ بعض لوگ نشانہ بازی کے

نہایت ہی ماہر سمجھے جاتے ہیں اور میلوں اور عرسوں کے موقعوں پر یہ ماہر نشانہ باز بندوق کے ذریعے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض نشانہ باز اس فن میں اتنے مشاق و تجربہ کار ہوتے ہیں کہ وہ نہایت بلندی پر اڑنے والے پرندوں کا بندوق کے ذریعے نشانہ لگاتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے فاصلوں سے باریک چیز کا نشانہ باندھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ نشانہ بازی کے مقابلوں کا بھی اہتمام اکثر و اوقات کیا جاتا ہے جس میں نامور نشانہ باز حصہ لیتے ہیں۔

کتوں کی لڑائی: بنوں و مضافات اور لکی مروت کے وہ لوگ جو بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کے ہاں اب بھی پالتو کتے ہوتے ہیں جبکہ قدیم دور میں یہ کھیل عام ہوتا تھا۔ کتوں کو پالا جاتا اور ان کے لئے علیحدہ ملازم رکھے جاتے جو ان کی دیکھ بھال کرتے۔ دوسرے علاقوں کے نواب اپنے کتے لے کر آتے اور میدان میں کتوں کو چھوڑ دیا جاتا۔ خوب مقابلہ ہوتا اس میں کتے ایک دوسرے کو بہت بری طرح زخمی کر دیتے جو کتا زخموں سے بے حال ہو جائے اور پیچھے کی طرف بھاگ جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کتا ہار گیا ہے اس موقع پر بڑی بڑی شرطیں بھی لگائی جاتیں۔

مرغوں کی لڑائی: مرغوں کی لڑائی بھی بڑی عام کھیلوں میں سے ہے۔ قلغی اور کولنگی قسم کے مرغے پالے جاتے۔ مرغوں کو اچھی خوراک اور دانہ کھلایا جاتا ہے۔ اور پھر میدان میں اتارا جاتا ہے۔ دو مدمقابل مرغے میدان میں نکل کر ایک دوسرے کو جھپٹتے ہیں۔ عام طور سے مدمقابل مرغے آنکھوں پر حملہ کرتے ہیں۔ جو مرغا نڈھال ہو جائے اور میدان سے بھاگ جائے تو اس سے مدمقابل والا مرغا جیت جاتا ہے۔ اس موقع پر بھی بڑے بڑے پیسوں کی شرطیں باندھی جاتی ہیں۔ مرغوں کے یہ مقابلے اکثر میلوں ٹھیلوں میں ہوتے ہیں۔ بنوں میں اب بھی مرغوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔

بٹیر بازی: یہ کھیل صوبہ سرحد کے تقریباً ہر حصے میں کھیلا جاتا ہے۔ بٹیر باز، بٹیر پالنے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ بنوں میں یہ کھیل بہت مقبول ہے۔ بٹیر باز اپنے بٹیروں کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ بٹیر باز انہیں ایک خاص قسم کے کپڑے جس کے نیچے بانسوں کی لکڑی سے بنی ہوئی تھالی ہوتی ہے اس کے ساتھ کپڑے کو سی لیا جاتا ہے اور پھر تھیلے کی شکل میں کپڑا ہوتا ہے اوپر سے کپڑے کو باندھنے کے لئے موٹا سوتی دھاگا لگا دیا جاتا ہے جیسے کہ عموماً بٹوے کے سرے پر ہوتا ہے۔ بٹیرے کو اس میں رکھتے ہیں جسے ''خلتہ'' کہا جاتا ہے۔ بٹیرے کی مرغوب غذا باجرہ ہے مگر پالتو اور لڑنے والے بٹیروں کو باجرے میں مقوی چیزیں بھی ملا کر کھلایا جاتا ہے روزانہ بٹیرے کو خلتے سے نکال کر بائیں ہاتھ کو الٹا کر کے مٹھی بنا کر اس پر چھلانگیں لگواتے ہیں۔ میدان میں بھی چھوڑا جاتا ہے اور لڑنے کے لئے اسے مشق کروائی جاتی ہے اور اچھلنے کودنے کی تربیت دی جاتی ہے اور جب مقابلے کے لئے میدان میں لایا جاتا ہے تو بٹیروں کے پاؤں اور پنجوں پر سرسوں کا تیل لگایا جاتا ہے تاکہ آسانی سے گرفت میں نہ آئے۔ بٹیر بازی پر بھی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔

جی تاڑی: یہ کھیل بھی بنوں اور ضلع لکی کا مقبول اور قدیم روایتی کھیل ہے یہ اس طرح کھیلا جاتا ہے کہ پچاس یا ساٹھ گز کے فاصلے پر زمین میں ایک کیل ٹھونک دیتے ہیں پھر اس کیل پر اتنے ہی فاصلے یعنی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے سے ایک چپٹا پتھر پھینکا جاتا ہے اگر یہ چپٹا پتھر کیل کے اوپر ٹھیک نشانے پر لگ جائے تو پتھر پھینکنے والا نشانہ بازی میں جیت جاتا ہے۔

حصے: مروتوں کے علاقے میں یہ بچوں اور جوانوں کا کھیل ہے۔ عام طور سے بچے یہ کھیل کھیلتے ہیں۔ دو مدمقابل میدان میں آتے ہیں دونوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ بائیں پاؤں کو پیچھے کی طرف اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور دائیں ہاتھ کو پیچھے کی طرف سے کر کے بائیں پاؤں کو مضبوطی سے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں اور پھر میدان میں ایک بھاگتا ہے اور دوسرا پکڑتا ہے اگر وقت معین تک بھاگنے والا کھلاڑی پکڑا جائے تو پکڑنے والا جیت جاتا ہے اسی طرح پھر دوسرا لڑکا بھاگتا ہے۔

انڈے لڑانا: بنوں مضافات اور لکی کے علاقوں میں انڈے لڑانے کا کھیل بھی قدیم اور روایتی ہے۔ اس کھیل کے لئے انڈوں کو ابال لیا جاتا ہے اور ان پر سرخ، سبز اور زرد رنگ چڑھا دیا جاتا ہے۔ دو شخص انڈے مٹھی میں دبا ایک دوسرے کے انڈے کے سرے سے بڑی مہارت کے ساتھ مارتے ہیں جس کا انڈا ٹوٹ جائے وہ ہار جاتا ہے اور اپنا انڈا جیتنے والے کو دے دیتا ہے۔ بعض دفعہ اس مقابلے میں نقد شرط بھی لگائی جاتی ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان ریجن

جغرافیہ

ڈیرہ اسماعیل خان صوبہ سرحد کا انتہائی جنوبی (ریجن) شہر ہے جو کہ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ اس سے آگے دریائے سندھ صوبہ پنجاب میں داخل ہو جاتا ہے۔ دریائے سندھ ڈیرہ شہر کے مشرق کی جانب دریا سے پار دریا خان ہے۔ شمال کی جانب بنوں کی حدود پیزو سے، نیچے سے ڈیرہ اسماعیل خان کی حدود شروع ہو جاتی ہیں جبکہ اس کے انتہائی جنوب میں ڈیرہ غازی خان ہے جو کہ صوبہ پنجاب کا شہر ہے، تونسہ شریف ڈیرہ غازی خان میں واقع ہے۔ ڈیرہ کے شمال مشرق کی جانب کافر کوٹ (جو کہ قدیم دور میں راجہ بل کی راجدھانی تھی) اور چشمہ کے علاقے ہیں اس کے نہایت شمال مشرق کی جانب نیلا کوہ اور اس کے ساتھ کوہ شیخ بدین کے علاقے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مغرب کی جانب ضلع ٹانک ہے۔ جہاں مشہور قلعہ "قلعہ لکھی کوٹ" تعمیر کیا گیا ہے۔ ڈیرہ کے مغرب میں کلاچی اور درابن ہے۔ جبکہ جنوب مغرب کی جانب چودھواں کا تاریخی مقام ہے۔ اسی مقام سے محمود غزنوی نے ہندوستان پر چودھواں حملہ کیا تھا جس کی وجہ سے یہ علاقہ چودھواں کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں پر بابر قوم آباد ہے۔ چودھواں کے جنوب مغرب کی جانب کوہ سلیمان اور شمال مغرب کی جانب تخت سلیمان ہے اور پھر اس سے متصل مغرب کی طرف افغانستان کی سرحد ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مغرب اور جنوب مغرب کی جانب کوہ سلیمان میں متعدد درے ہیں جن میں چار درے بہت مشہور ہیں' درّہ گومل' درّہ گجستان' درّہ کھکل' درّہ رمک۔

ڈیرہ سے ملحقہ علاقوں کی تفصیل

ٹانک: یہ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مغرب کی طرف 42 میل کے فاصلے پر اب ایک مفید اور بڑا ضلع ہے جو کبھی ایک قصبہ ہوتا تھا۔ آبادی میں توسیع اور دیگر ضروریات زندگی کی فراوانی کی وجہ سے قصبہ پھیلتا رہا اور پھر اسے ڈیرہ اسماعیل خان ریجن کا ضلع قرار دے دیا گیا۔ قدیم زمانے میں ٹانک کو نوابوں کی حوروں کا مسکن کہا جاتا تھا ان کے بارے میں سر ایڈورڈ نے تاریخ لکھی ہے۔ یہ بہترین پھلوں کے باغات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ نواب سرور خان کے حرم کی داستان ایک لازوال داستان ہے جو کہ زبان زد عام ہے۔ یہاں ان قدیم مکانات کے نشانات اب بھی ہیں جو کہ دیہاتوں میں ہوتے تھے یہ مٹی کے کچے مکانات تھے اور چھتیں بھی لکڑی کی ہوتی تھیں جن کے اوپر کیچڑ کی لیپائی کر دی جاتی تھی۔ دولت زئی اور دولت خیل ٹانک کے اصلی اور قدیم باشندے ہیں۔ اس کے علاوہ تاتار بھی یہاں کے باشندے تھے۔ ٹانک میں قلعہ لکھی کوٹ معروف و مشہور ثقافتی تعمیر کا ایک نشان ہے۔ یہ قلعہ راجہ لکھی نے اپنے دور حکومت میں ٹانک کے مغرب کی جانب تعمیر کروایا تھا اور اسی کے نام پر ٹانک کو قصبہ لکھی کے نام پر آباد کیا تھا۔ محمود غزنوی کے حملے کے نتیجے میں یہ قلعہ ویران ہو گیا تھا۔

کلاچی: یہاں پر مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کی قدیم آبادیاں تھیں۔ یہاں کی تیسری اہم قوم کٹی خیل قبیلہ ہے۔ کلاچی ایک مشہور مقام ہے یہ ڈیرہ اسماعیل خان کے مغرب کی جانب 28 میل کے فاصلے پر ندی لونی کے کنارے پر اور ضلع ٹانک کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ کنڈہ پوروں کا مسکن ہے۔ یہاں پر کنڈہ پوروں کی آمد کی وجوہات ڈیرہ اسماعیل خان کے شمالی کونے میں مروت قبیلے کی ایک شاخ کا قیام بتایا جاتا ہے۔ جب مروتوں کی ایک شاخ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال کی جانب کوہ شیخ بدین کے پاس مقیم ہوئی تو یہ بات ٹانک کے قدیم مقیم قبائل کو ناگوار گزری چنانچہ ضلع ٹانک کے قدیم باشندوں دولت خیل والوں نے مروتوں کو یہاں سے نکالنے کے لئے مغرب کی طرف غلزئی پوندوں کی ایک شاخ گنڈہ پوروں کو مدد کے لئے بلا لیا چنانچہ گنڈہ پور دولت خیل قبیلے کی مدد کے لئے یہاں آئے اور مروتوں کو آگے کی طرف دھکیل دیا اور پھر خود کلاچی میں مقیم ہو گئے اور یہاں پر آبادیاں شروع کر دیں۔ یہ تحصیل کلاچی کے اب اصلی باشندے ہی گنڈہ پور ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے گنڈہ پور قوم قندھار کے مشرقی پہاڑوں میں آباد تھی جس کا معاشی دارو مدار مال مویشی پالنا تھا۔ ان کو کاکڑ قوم نے اپنے ملک سے نکال دیا تھا سترھویں صدی عیسوی میں دولت خیل قبیلہ کی ذیلی شاخ کٹی خیل کے حکمران سردار خان زمان کٹی خیل نے مروتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے بلایا تھا اور انہیں پہلے پہل مقام روڑی پر آباد کیا۔ بعد میں یہ لونی میں آباد ہوئے اور دھیرے دھیرے یہ پھر موجودہ علاقہ کلاچی کے ٹکواڑ، منڈی، شیرواور کوٹ اٹل پر بھی قابض ہو گئے۔ بعد میں اس شہر کا نام کلاچی بلوچوں نے اپنے دور حکمرانی میں رکھا۔

چودھواں: یہ وہ مشہور مقام ہے جہاں سے محمود غزنوی نے برصغیر ہندوستان کے شہر سومنات پر چودھواں حملہ کیا تھا چنانچہ اس چودھویں حملے کی مناسبت سے اس مقام کا نام چودھواں رکھ دیا گیا۔ یہ مقام ڈیرہ اسماعیل خان کے جنوب مغرب کی جانب

اور تحصیل کلاچی کے زیریں جنوب میں واقع ہے۔ یہاں پر بابر قوم کے لوگ رہتے رہے ہیں۔

درابن: ڈیرہ اسماعیل خان کے مغرب، تحصیل کلاچی کے جنوب مغرب اور چودھواں کے شمال مغرب کی طرف ایک مقام ہے۔ یہ میاں خیل قوم کا قدیم مسکن ہے۔ یہ بھی پوندوں کی شاخ غلزئی کے مہذب لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ اس قوم کی رشتے داریاں غزنی کے رہنے والوں کے ساتھ ہیں۔

کافر کوٹ: کافر کوٹ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مشرق کی جانب دریائے سندھ کے کنارے پر وہ مقام ہے۔ جہاں پر ہندوؤں نے اپنے عہد حکمرانی میں شاندار مندر تعمیر کئے تھے۔ محمود غزنوی کے حملے کے نتیجہ میں ان مندروں کو مسمار کیا گیا۔ ان مندروں کے نشانات اور آثار اب تک موجود ہیں جو قدیم ماضی کی تاریخ کا آئینہ دار ہیں۔ ان مندروں کے آثار کی وجہ سے اس مقام کا نام کافر کوٹ ہے۔ کافر کوٹ کو اس زمانہ کے لوگ دیوتاؤں کا کوٹ بھی کہتے تھے۔

قصبہ گل امام: ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مغرب میں ضلع ٹانک میں قصبہ گل امام قدیم قصبہ ہے جو اب ایک آباد علاقہ ہے۔ یہاں پر کنڈی قوم کے لوگ آباد ہیں جو کہ افغان پٹھانوں میں سے ایک ذیلی قبیلہ کے لوگ ہیں۔ اس قصبہ کو کنڈی خاندان کے سرکردہ گل امام کنڈی نے آباد کیا تھا اور اسی کے نام پر یہ قصبہ مشہور ہے۔

پہاڑ پور: موضع پہاڑ پور ڈیرہ اسماعیل خان سے شمال مشرق کی جانب 21 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے پہاڑ خان لودھی نے آباد کیا تھا اور اسی کے نام سے یہ قصبہ پہاڑ پور موسوم ہوا۔ یہاں پر پانی بکثرت ہے جس کی وجہ سے پورا علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں متعدد کنویں کھدوائے گئے تھے۔ یہاں سے گزرنے والی نہر پہاڑ پور کے نام سے بہت مشہور ہے جو 1936 میں چشمہ ملی خیل کے نزدیک سے نکالی گئی تھی۔ اس نہر کی وجہ سے بھی زمین قابل کاشت ہوئی۔ یہاں پر مختلف پھلوں کے آباد باغات ہیں۔ یہ پوندہ پٹھانوں کے تجارتی قافلوں کی منڈی تھی جہاں ہزاروں کا کاروبار ہوتا رہا۔ یہ قصبہ محسود وزیریوں کی طرف سے خطرات کے پیش نظر غیر محفوظ بھی تھا اس لئے یہیں قصبہ کے اندرون ہندو آبادی والے اپنی پناہ کے لئے مکانوں کے اردگرد مضبوط فصیل بناتے تھے اور گھروں کے اوپر مورچے بنا رکھے تھے۔ اس قسم کے مکانوں اور مورچوں کو یہ لوگ اندر کوٹ کہتے تھے۔ شہر کے اردگرد مسلم آبادی بڑھتی گئی۔ ملک کی تقسیم کے بعد یہاں سے ہندو منتقل ہو گئے تھے اور اب مسلمانوں کے مکانات ہیں۔ یہاں پر ہندوؤں نے مندر تعمیر کر رکھے تھے۔

پنیالہ: یہ ڈیرہ اسماعیل خان سے 30 میل کے فاصلے پر شمال کی طرف کوہ شیخ بدین کے نزدیک ایسا قصبہ ہے۔ جہاں پر قوم بلیچ خیل آباد ہے۔ اس قصبہ کو بلیچ خیل قوم کے ایک بزرگ حاجی بلیچ نے آباد کیا تھا۔ اسی مقام پر حاجی بلیچ کا مزار بھی ہے۔ یہاں پر مسلم اور ہندو آبادیاں تھیں یہاں پانی کے چشمے وافر ہیں جس کی وجہ سے علاقہ سرسبز ہے اور اعلیٰ قسم کے پھلوں کے باغات ہیں۔ یہاں کھجور کے درخت بھی بکثرت ہیں جن کا پھل نہایت لذیذ ہے۔

پروا: موضع پروا ڈیرہ اسماعیل خان شہر سے 21 میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس کو ملک پروا نے آباد کیا تھا اور اسی کے نام سے یہ مقام آباد ہوا۔ یہ بھی پوندہ پٹھانوں کے لئے تجارتی منڈی رہی ہے۔ یہاں کی پیداوار کا انحصار بارشوں پر رہا ہے۔ یہاں پر بھی ہندوؤں کی آبادیاں تھیں۔ مسلمانوں کے علاوہ جو ہندو خاندان یہاں آباد تھے ان میں چاولہ، متوترہ اور درکن مشہور ہندو خاندان ہیں۔ یہاں پر ہندوؤں کا مندر بہاری لال مندر بہت مشہور رہا ہے۔

کوہ سلیمان: ڈیرہ اسماعیل خان کے مغرب میں کوہ سلیمان ہے۔ کوہ سلیمان ایک طویل خط مستقیم کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جس کے عین وسط میں تخت سلیمان ہے۔ شمال کی طرف بھٹانی یا شیخ بدین سلسلہ کوہ کی طویل اور سنگلاخ شاخیں ہیں جو رتا کوہ اور نیلا کوہ کے مجمع الجبال سے مل کر ایک مکمل فصیل بن جاتی ہے جو کہ سندھ کے کنارے تک پھیل جاتی ہے اور اس میدان کو بنوں اور مروت سے جدا کرتی ہے۔ سارا علاقہ سندھ سے لے کر پتھریلی گھاٹیوں تک اور جنوب میں دھوا سے شمال میں ٹانک تک یکساں اور سپاٹ ہے۔ متذکرہ پتھریلی گھاٹیوں تک جن سے پہاڑی نالے نکلتے ہیں یہ وہ پراسرار اور مہیب درے ہیں جن کے بے شمار روایتی اور دیومالائی قصے مشہور ہیں۔ آدمی پہاڑیوں سے جس حد تک نزدیک جاتا ہے۔ وہ اتنی ہی مہیب اور کریہہ المنظر بنتی جاتی ہیں جن کے بالائی سرے چاقو نما ہیں۔ یہاں درختوں کی ناپیدی اور قلت آب سے منظر افسردہ خیز ہو جاتا ہے اور جب آدمی ان سنگلاخ اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کے اندر جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کسی گڑھے میں پہنچ گیا ہے۔ جس کے چاروں اطراف عمودی دیواروں کے عفریت انگیز مناظر کھڑے ہیں۔ اس غیر دلکش اور سنگلاخ جگہ سے سد مغربی کو عبور کرنے کے لئے مشہور ترین درے ہیں (1) دھوا یہ درّہ ایک گاؤں کے سامنے ہے۔ (2) درّہ شیخ حیدر

یا زاؤ جس کے معانی غیر معمولی طور پر دشوار ترین درّہ کے ہے۔ جس کے اوپر بہت اونچی اونچی ڈھلانیں ہیں۔ اس کے علاوہ (3) درّہ گومل (4) ٹانک زام اور (5) شوزہ درّے ہیں مگر اس کے علاوہ بھی تقریباً 70 اور درّے بھی ہیں جو کہ دیگر سلسلوں کو پار کرتے ہیں اور ان کے عقب کی طویل وادیوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔

کوہ سلیمان کے شمالی سلسلہ میں دو درّے ہیں (1) بائن (2) پیزو۔ یہ دونوں ضلع بنوں کی حدود میں آتے ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کا پٹ: درّہ گومل سے گزر کر مزید مشرق کی طرف اور ڈیرہ اسماعیل خان کے مغرب کی جانب وہ وسیع وعریض چراگاہ ہے جو کئی میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس وسیع وعریض اور درّوں کے دھانوں پر میدان کو ڈیرہ اسماعیل خان کا پٹ کہا جاتا ہے۔ جب افغان پوندے اپنے سامان تجارت کے ساتھ قافلوں کی صورت میں درّہ گومل وغیرہ سے یہاں پہنچتے تھے تو یہ میدان ان کے شتر گلوں اور بھیڑ بکریوں کے چرنے کے لئے نہایت مفید میدان تھا۔ مزید برآں یہ کہ یہاں تجارتی قافلے پہنچتے تو ان قبائل کے کئی ذیلی قبیلے یہاں آباد ہو جاتے۔ انگریز دور میں یہاں درّوں کے دھانوں پر متعین ملیشیا ان پوندوں کو غیر مسلح کرنے اور راہداری اور پٹ کے لئے ان سے چرائی ٹیکس لینے پر مامور ہوتی یہ وہ عظیم پٹ یعنی وسیع چراگاہ ہے کہ یہاں پر ان پوندوں کے ساتھ آئے ہوئے بے شمار لوگ خیمے نصب کر لیتے اور پھر پوری سردیوں کے موسم کے لئے یہ مقام ان کی مستقل خیمہ گاہ ہوتی۔ یہ اپنے اونٹوں کو اس میدان میں چرنے کے لئے بے خوف وخطر چھوڑ دیتے۔

تخت سلیمان: ڈیرہ اسماعیل خان کے مغرب میں اور کوہ سلیمان کے عین وسط میں تخت سلیمان ہے۔ جس کے بارے میں صدیوں سے ایک دیو مالائی داستان جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ بلقیس سے منسوب ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک متبرک مقام بھی ہے جو جنوں کی صناعی کا ایک خوب صورت منظر پیش کرتا ہے۔ اس میدان کے منظر کو ڈیرہ لیمل بھی کہا گیا۔ تخت کے شمال میں ایک روضہ ہے جو کہ کسی قطب رشد وہدایت بزرگ کا سمجھا جاتا ہے۔ یہ تخت سلیمان بلندی پر واقع ہے۔ جس کے ارد گرد شیرانی قبیلہ کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں پر خوبصورت صنوبر کے درخت ہیں۔

دریائے لونی: گومل کے پاس سے گزرنے والا دریا مختلف مقامات پر سے گزرنے کی بناء پر مختلف نام اختیار کر لیتا ہے۔ جب ڈیرہ کے پاس سے گزرتا ہے تو یہ دریائے لونی کے نام سے مشرق کی طرف بہتے ہوئے دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی مقام سے ایک شاہراہ گزرتی ہے۔ جسے عام طور پر پوندہ تاجروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسے غزنی کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شاہراہ کوہ سلیمان کے سلسلہ سے بل کھاتی ہوئی کھجوری پہنچ کر یا گومل ژوب کی ندیوں کے سنگم کے بعد سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سڑک ژوب کے ساتھ ساتھ دو راستوں سے مغرب اور جنوب مغرب میں پشین اور قندھار کو چلی جاتی ہے اور دوسری شمال مغرب میں گومل کے ساتھ ساتھ غزنی تک پہنچ جاتی ہے۔ وادی ژوب اور پشین تک جانے والے راستے میں تین مشہور درّے ہیں۔ ان میں درّہ شیخ حیدر درہ بند اور دھنا درّہ ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ بغلی وادیوں کے ذریعے ملے ہوئے ہیں۔

تاریخ

ڈیرہ اسماعیل خان ملک کے تین صوبوں کے سنگم پر واقع نہایت ہی اہم سرحدی شہر ہے۔ سرکاری انتظامی حیثیت سے ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن صدر مقام ہے۔ ڈیرہ سرائیکی زبان میں بستی یا رہنے کی جگہ کے لئے استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان صوبہ سرحد کی حدود میں آخری جنوبی بڑا شہر ہے۔ اس ریجن کا دوسرا بڑا ضلع ٹانک ہے۔ جبکہ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ دریا خان جسے اب مختصر کر کے صرف دریا خان کہتے ہیں یہ دونوں شہر صوبہ پنجاب کی حدود میں آتے ہیں۔

یہاں سرائیکی زبان بولی جاتی ہے جو بڑی میٹھی اور کانوں کو بھلی لگنے والی زبان ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے گرداگرد ایک شہر پناہ دیوار تعمیر کی گئی تھی اور کچھ کچھ فاصلے پر مختلف ناموں سے دروازے تعمیر کئے گئے جو صرف اب علامتی نام رہ گئے ہیں تاہم دو تین گیٹ اپنی قدیم ثقافتی تعمیرات کی علامت کے طور پر باقی بچ گئے ہیں جن سے اندرون شہر کی قدیم ہیئت وحالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈیرہ شہر کی بنیاد پڑنے سے پہلے یہ سارا علاقہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے لے کر افغانستان کی سرحد تک دامان کہلاتا تھا۔ چونکہ یہ کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ اس لئے اسے دامان کہا گیا۔ موجودہ ڈیرہ اور قدیم دامان کا علاقہ قدیم دور سے ہندوستان کی تجارتی منڈیوں کے لئے ایک مضبوط ترین گیٹ تھا کہ یہیں سے افغانی پوندے وسط ایشیاء اور افغانستان کا سامان تجارت لے کر پنجاب اور پھر دہلی اور پٹنہ تک جاتے تھے اور پھر ہندوستانی مصنوعات کو وسط ایشیاء اور افغانستان میں متعارف کرواتے تھے۔ ڈیرہ اور مضافات کی اکثر اقوام کا تعلق انہیں پوندہ لوگوں سے ہے جو کہ پوندوں کے مشہور قبیلے غلزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ غلزئی اور ان کے ذیلی قبائل کوہ سلیمان کے مختلف دشوار گزار اور خطرات سے پر درّوں کو عبور

کر کے داخل ہوتے تھے۔ یہاں پر تقریباً 72 مشہور درّے ہیں جبکہ دو چار ایسے درے بھی ہیں جہاں سے پوندے لوگ اپنا سامان تجارت قافلوں کی صورت میں لے کر داخل ہوتے تھے۔ کوہ سلیمان کے شمالی درّوں میں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا اکثر وزیر قبائل سے ہوتا تھا اور دونوں جنگجو قبائل کا مقابلہ رہتا تھا۔

ڈیرہ پھلاں دا سہرا کی اصطلاح کی وجہ علاقے میں پھولوں کی بہتات اور پھولوں کو پسند کرنا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں پر جگہ جگہ پھولوں کے باغ اور باغیچے ہوتے تھے۔ زیادہ تر گلاب اور رائبل کے پھول اگتے جگہ جگہ کنویں ہوتے اور کنوؤں کے پنگھٹ کے آس پاس اس قسم کے پھولوں کے پودے ہوتے تھے۔ شام کے وقت یہاں کے باشندے پھولوں کے ہار لے کر دریا کی طرف بغرض تفریح نکل جاتے تھے۔ اب بھی پرانی طرز کی ثقافت و معاشرت کے حامل لوگ ہاتھوں میں رائبل کے پھول لے کر گھومتے پھرتے ہیں۔ ڈیرہ میں ایک ادبی محفل کے دوران تحقیقی نقطہ نظر سے اس اصطلاح ڈیرہ پھلاں دا سہرا کے بارے میں دریافت کیا تو ڈیرہ کی معروف ادبی شخصیت فاروق جان بابر نے اپنی مٹھی کھول کر مجھے رائبل کے پھول دکھلاتے ہوئے کہا کہ یہاں کے لوگوں میں پھولوں کو پسند کرنے کی جو روایت ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہے اور اس کی زندہ مثال اس وقت میری مٹھی میں رائبل کے پھولوں کا موجود ہونا ہے۔

وجہ تسمیہ: ڈیرہ اسماعیل خان کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ شہر مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں بسایا گیا تھا۔ جب جلال الدین اکبر نے اپنے بھائی مرزا حکیم کے خلاف افغانستان پر چڑھائی کی تو اس وقت اس علاقے کا بااثر شخص سہراب خان بلوچ تھا جو بااثر ہونے کے ساتھ ساتھ طبعاً بہادر اور انتظامی لحاظ سے اچھا منتظم اور مدبر بھی تھا۔ شہنشاہ اکبر نے صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے مختلف علاقوں کی بااثر شخصیات کی حمایت حاصل کی تو سہراب خان بلوچ کو بھی اپنی حمایت پر آمادہ کرتے ہوئے اس سے بادشاہ نے یہ معاہدہ کیا کہ اگر سہراب خان اکبر کی حمایت کرے اور افغانستان پر حملے کی صورت میں اس کا ساتھ دے تو فتح مندی کی صورت میں یہ علاقہ اس کے تسلط و انتظام و انصرام میں دے دیا جائے گا۔ چنانچہ افغانستان کی جنگ میں جب اکبر کو فتح حاصل ہوئی تو اس نے اپنے وعدے کے مطابق یہ علاقہ سہراب خان بلوچ کے حوالے کر دیا۔ جنگ کے دوران سہراب خان کے بیٹے اسماعیل خان نے اہم کردار ادا کیا اور ضربی اور حربی مہارت کا بحسن و خوبی مظاہرہ کیا اور خوب بہادری اور شجاعت سے لڑا، اس لئے اس علاقے کا نام اس کے نام سے منسوب کر کے ڈیرہ اسماعیل خان رکھ دیا گیا۔

موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان کا آباد علاقہ قبل ازیں دریا خان سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ دریائے سندھ کی طوفانی موجوں میں جب ڈیرہ اسماعیل خان کی پرانی حدود کا علاقہ دریا برد ہو گیا تو پھر اس موجودہ جگہ پر نواب شیر محمد خان سدوزئی نے بستی بسالی اور اچھا خاصہ شہر آباد کر دیا لیکن اس نے اس کا قدیم نام ڈیرہ اسماعیل خان بحال رکھا۔ اس طرز عمل سے نواب شیر محمد خان سدوزئی کی عالی ظرفی نمایاں ہوتی ہے کہ اس نے اپنے نام کے بجائے اس کا پرانا نام زندہ رکھا اور اس طرح نواب شیر محمد خان سدوزئی اپنی وسیع الظرفی اور کشادگی قلب کے ساتھ تاریخ میں اچھے لفظوں سے زندہ جاوید ہو گیا۔

نواب شیر محمد خان نے جب یہ ڈیرہ شہر دوبارہ آباد کیا تو اس کے بازاروں کے سنگم پر چوگلیاں تعمیر کیے جو کہ ڈیرہ کے بازاروں اور چوراہوں کے لئے ایک علامتی تاریخی اور ثقافتی تعمیرات ہیں۔ جنگ عظیم کے موقع پر یہاں ایک مورچہ بھی بنایا گیا تھا جس کے دو حصے کر دیئے گئے ایک حصہ ہندو آبادی پر مشتمل تھا اور دوسرا حصہ مسلم آبادی پر۔

موجودہ شہر یا اس شہر سے قبل سہراب خان بلوچ کی آبادی سے قبل بھی یہ سرزمین ہندوؤں کے دور میں یعنی محمود غزنوی کے حملوں سے قبل بھی آباد تھی اور اس علاقے اور گردونواح کے قدیم آثار و قرائن اس بات کے شواہد پیش کرتے ہیں کہ یہاں پر ہندو راجوں کی راجدھانیاں تھیں اور یہاں کی بعض رسوم و رواج کی قدامت اور پکوانوں کی طویل العمری بھی اس بات کی شہادت پیش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کے لوک گیتوں میں بھی قدیم ہندو دور کی جھلک نظر آتی ہے جیسے ''ڈھولہ'' یہاں کا وہ قدیم ترین لوک گیت ہے جس کی تاریخی اور ثقافتی حیثیت نہایت ہی قدیم عہد سے مربوط ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد کے انتہائی جنوبی اس خطے کی آبادی بہت قدیم اور پرانی ہے جو کہ موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کی آبادی سے قبل کے دور کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہاں پر کافر کوٹ کے مقام پر ہندوؤں کے بے شمار مندروں کے آثار بھی ہیں جو محمود غزنوی کے حملوں میں مسمار ہوئے اسی وجہ سے اس مقام کو کافر کوٹ کا نام دیا گیا ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان کی آبادی سے پہاڑی علاقے کی جانب مختلف درّے ہیں جو کہ افغانستان کی طرف سے برصغیر ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے افغانیوں یا مغرب کی طرف سے دوسرے پٹھان قبائل کی گزرگاہوں کے طور پر متعارف ہیں۔ ان گزرگاہ درّوں میں سے چار اہم درّے درہ گومل، درہ گجستان، درہ کھگل، درہ رمک ہیں۔

ڈیرہ کا تاریخی پس منظر

ڈیرہ اسماعیل خان کی تاریخ سے متعلق متذکرہ روایتی پس منظر سے ہٹ کر جو تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ اس کے بارے میں لیفٹیننٹ میکلگن نے تاریخ فرشتہ فارسی نسخہ کا ترجمہ کرتے ہوئے یوں ذکر کیا ہے کہ 1464ء میں قطب الدین کے بیٹے سلطان حسین نے جب ملتان کی حکومت حاصل کی تو قلعہ شورکوٹ و چنیوٹ (ضلع جھنگ) کوٹ کروڑ (لعل عیسن) دین کوٹ (نزد کالا باغ) پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا اس کے بعد ملک سہراب خان ہوت بلوچ نے اپنے دو بیٹوں اسماعیل خان اور فتح خان اور دیگر ہم قوم کے ہمراہ سلطان حسین کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ وہ دور تھا کہ علاقہ ملتان اور گرد و نواح میں پہاڑی لٹیروں اور ڈاکوؤں کی وجہ سے بدامنی اور اضطراب تھا۔ سہراب خان نے اپنے حسن انتظام اور خوب تدبیری سے علاقے میں امن و امان قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس کی وجہ سے سلطان حسین نے امن و امان کے توسیع کی خاطر کوٹ کروڑ سے لے کر دین کوٹ تک کا سارا علاقہ سہراب خان کے زیر انتظام کر دیا۔ گزیٹیر ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے مطابق جب کچھ حکمران کے بلوچوں کو ملک سہراب کی ملازمت کا علم ہوا تو بہت سے دوسرے بلوچ کچھ حکمران سے ملازمت کے لئے ملتان آ گئے جن میں حاجی خان میرالی اور اس کے بیٹوں کا تذکرہ نمایاں ہے۔ چنانچہ حسین خان نے بعوض خدمات جنگ حاجی خان کو ڈیرہ غازی خان تحصیل لیہ اور بھکر کا علاقہ دے دیا۔ اس وقت سے ڈیرہ غازی خان کی بنیاد پڑی۔

اس سلسلے میں گائمن سچیار نے ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کی حد مور جھنگی مقرر کی۔ ملک سہراب خان کو بعوض خدمات دریائے سندھ کے کناروں کی غیر آباد اور آباد زمین مل گئی اور اس نے رفتہ رفتہ دریائے سندھ کو عبور کر کے مغرب کی طرف کے علاقہ دامان (یعنی دامن کوہ سلیمان) تک سارے علاقے پر قبضہ کر لیا اور موضع ببر کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ سہراب خان بلوچ نے علاقے کی غیر آباد زمینوں کو قابل مزروعہ بنا دیا اور پھر اپنے بیٹے اسماعیل خان کے نام پر 1469ء میں ڈیرہ شہر کی بنیاد رکھ دی جبکہ دوسرے بیٹے فتح خان کے نام پر جنوبی حصہ میں ڈیرہ فتح خان کی بنیاد رکھ دی۔

سہراب خان بلوچ کے اخلاف نے یہاں پر بہت عرصہ تک حکومت کی۔ اس خاندان کا آخری حکمران نصرت خان تھا جو کہ بلوچ خاندان کی پانچویں پشت میں سے تھا جس میں حکومتی اور انتظامی صلاحیتوں کی کمی تھی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عسیب خان میاں خیل نے پوندوں بابڑ پٹھانوں اور گنڈہ پور اقوام کی مدد سے اس پر چڑھائی کی اور اسے چکر کوٹ کے مقام پر شکست دی۔ اس کے بعد ہوت بلوچ کے خاندان کا اقتدار یہاں سے ختم ہوگیا۔

1794ء میں ڈیرے پر نواب محمد خان سدوزئی قابض ہو کر حکومت کرنے لگا اور جب محمد خان سدوزئی شاہ درانی والی کابل کی طرف سے لیہ اور بھکر کا بھی والی بن گیا تو اس نے منکیرہ کو اپنا دارالخلافہ بنا دیا۔ دریائے سندھ سے پار کلور کوٹ سے لے کر محمود کوٹ جو کہ دوابہ ہے پر اس کی حکومت قائم ہوگئی۔ محمد خان سدوئی زئی نے بھکر اور لیہ کے علاقوں کا انتظام اپنے پاس رکھا جبکہ ڈیرہ اور دامان کی حکومت دیوان ماتک رائے کے سپرد کر دی اور کچی علاقہ کی آبادی دیوان لکھی مل کے زیر انتظام تھی۔

تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان کے مطابق ایک عرصہ بعد نواب محمد خان سدوئی زئی کا چھوٹا نواسہ اپنے باپ کا جانشین مقرر ہوا مگر وہ آرام طلب اور عیش کوش تھا اس لئے زیادہ دیر تک انتظام حکومت نہیں چلا سکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1836ء میں حکومت کی باگ ڈور کنور نونہال سنگھ کے ہاتھ آ گئی۔ سکھوں نے نواب صاحب کے پرانے وفادار دیوان لکھی مل کو ڈیرے کا گورنر مقرر کر دیا۔ شہزادہ نونہال سنگھ نے اسی سال ڈیرہ میں قلعہ اکال گڑھ کی بنیاد رکھی اور اس میں اپنی فوج کو رکھا۔

زبان: جیسا کہ اس شہر کی قدامت کے بارے میں تاریخ بعض شواہد کی بنیاد پر یہ بتاتی ہے کہ یہاں پر ظہور اسلام سے پہلے ہندو راجاؤں کی راجدھانیاں موجود تھیں۔ چونکہ اس وقت ویدوں کا زمانہ تھا اور وید کی زبان سنسکرت زبان تھی اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی عجیب الخیال بات نہیں کہ اس علاقے پر سنسکرت زبان کا اثر موجود تھا۔ بعد میں جب برصغیر ہندوستان پر اسلامی لشکروں کی یلغار مغرب کی طرف سے ہونے لگی تو ظاہر ہے کہ یہاں پر پھر فارسی اور پشتو زبان کا امتزاج نظر آتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ دریا سے پار پنجاب کی سرزمین ہے اور یہ سرزمین پنجابی زبان کے اثر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ علاوہ ازیں یہاں پر بلوچی زبان کا بھی اثر تھا اور اسی زبان کی تاثیر سے بھی یہ علاقہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ تاہم جب یہ شہر بنا تو یہ دور مغلوں کا دور تھا۔ اس وقت بلوچ اور مغلوں کا امتزاج تھا۔ بلوچوں کی اپنی مخصوص زبان تھی اور مغلوں کی زبان فارسی تھی۔ اسی سے یہ گمان غالب نظر آتا ہے کہ یہاں پر بلوچوں اور مغلوں کا اثر ہونے کی وجہ سے فارسی اور بلوچی زبان کے آثار موجود تھے علاوہ ازیں جب یہ شہر آباد خطہ ہوگیا تو بغرض تجارت یہاں پر تجارتی قافلے افغانستان سے براستہ درجہ بالا درّوں کے آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان تجارتی لوگوں کی

زبان کو سمجھنا نہایت ہی ضروری تھا تا کہ تجارتی لین دین کے لئے آسانی ہو کیونکہ کسی بھی خطے کی معاشی حالت کی بہتری کے لئے تجارتی معاملات میں سہولت پیدا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ بغرض تجارت اپنے قافلوں میں سامان لے کر یہاں یا یہاں سے دریائے سندھ کے پار ملتان کے علاقے میں داخل ہوتے تھے انہیں پاوندے کہا جاتا تھا اور ان پاوندوں کے تجارتی قافلوں اور لین دین کا اتنا اثر تھا کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک بازار اور گیٹ کا نام ہی پوندہ گیٹ یا بازار رکھ دیا گیا۔ ان پاوندوں کے ٹھہرنے کے لئے یہاں پر یا یہاں سے متصل علاقوں حتی کہ ملتان کے راستے میں جگہ جگہ سرائیں تعمیر کی گئیں جہاں پر یہ پاوندے ٹھہرتے تھے اور ان سراؤں میں تجارتی لین دین ہوتی تھی۔

اس تجارتی لین دین میں سب سے بڑی رکاوٹ ایک دوسرے کی زبان کو بسہولت سمجھنے کی اہلیت کا نہ ہونا تھا اور نہایت ہی تکلف کے ساتھ زبان سمجھتے تھے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہاں اور ملتان کے وسیع و عریض علاقے میں جو زبان بولی جانے لگی وہ ان سراؤں میں بولے جانے والی زبان تھی چونکہ اس مشترکہ زبان میں اتنی شیرینی اور بے تکلفی تھی کہ اسے فوراً سب نے قبول کیا اور مفہوم کی ادائیگی میں بھی سہولت محسوس کی گئی۔ اسی نئی زبان کو جو نام دیا گیا وہ ان تجارتی سراؤں سے منسوب کی گئی اور اسے سرائے کی زبان کہا جانے لگا یعنی وہ زبان جو کہ ان تجارتی قافلوں کی سراؤں میں بولی جاتی ہے۔ اس نام میں بھی اتنی روانی اور سہولت اور مٹھاس تھی کہ یہ بہت جلد سرائیکی زبان کہی جانے لگی مگر یہ اس قسم کی زبان ہے۔ جسے شمال کی طرف سے پشاوری کوہاٹی اپنے طور سے ہندکو کہتے ہیں۔

اس علاقے ڈیرے کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ اگرچہ عصر حاضر میں ترقی و تبدیلی کے حالات نمایاں ہو رہے ہیں۔ ڈیرے کا معاشرہ بھی طبقاتی تقسیم رکھنے والا معاشرہ ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں سائیکل رکشہ کی سواری عام استعمال ہوتی ہے۔ صحت کی سہولتوں کی محرومی ہے۔ اس علاقے کی غربت اور پسماندگی اس علاقے کے لوک گیتوں میں عیاں ہوتی ہے۔

مشکل اقتصادی و معاشرتی حالات کے باوجود یہاں کی تہذیبی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیاں ترقی پذیر ہیں۔ کاروباری لحاظ سے بھی یہ علاقہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ شہر کے بائیں طرف دریائے سندھ جو کہ رواں دواں ہے۔ اس علاقے کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ دریائے سندھ ہے۔ یہاں پر اس کا پاٹ بہت کشادہ ہو جاتا ہے۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی

تاریخی حوالوں سے محققین نے ڈیرہ جات میں مسلمانوں کی آمد کا زمانہ امیر سبکتگین کی حکمرانی کا عہد قرار دیا ہے۔ جبکہ خراسان اور غزنی میں امیر سبکتگین کی حکومت تھی تو اس وقت یہاں پر ہندو حکمران تھا جس کا نام راجہ بل تھا۔ اس وقت اس سارے علاقے کو دامان کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ کوہ سلیمان کے دامن میں ہے۔ اس مناسبت سے یہ دامان کہلاتا تھا۔ غرضیکہ مسلمانوں کی اقوام کے آنے سے پہلے یہاں پر ہندوؤں کی حکمرانی تھی، مختلف راجاؤں کی مختلف مقامات پر راجدھانیاں تھیں جنہیں راج گدی کہا جاتا تھا۔

لہٰذا اس سارے علاقہ دامان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو اقوام آباد تھیں۔ ان میں زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ تھے چونکہ یہ دریائی تہذیب کا مرکزی خطہ تھا اور دریا کے ساحل پر آباد ہونے کی وجہ سے لوگ زراعت پیشہ تھے اور اپنی زمینوں کو آباد کرتے تھے۔ علاقے میں جو جو مشہور کوہستانی عادات و خصائل کی قدیم اقوام آباد ہیں ان کا تعلق ان پوندوں سے ہے جو کہ افغانستان کے سوداگر کہلاتے تھے اور مغرب کی طرف سے مختلف پہاڑی درّوں سے ہوتے ہوئے اپنا سامان تجارت برصغیر ہندوستان کی جانب لاتے تھے۔ یہ خاص وضع قطع کے غیر معمولی قد و قامت کے وہ پوندہ قافلوں والے لوگ تھے جو اپنے زور بازو، تندہی، صبح و شام سرگرداں سفر رہنے والی خصائل سے پہچانے جاتے تھے یہ پوندہ لوگ دراصل وسط ایشیاء افغانستان اور ہندوستان کی تجارت کے اجارہ دار سمجھے جاتے تھے۔ ان پوندوں میں جو مختلف ناموں کی ذیلی شاخوں کے قبائل ہیں یہ اجتماعی حیثیت سے غلزئی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ دامان (دامن کوہ) موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان و مضافات میں آباد اقوام قبائل کا تذکرہ انہی غلزئی قبائل سے شروع کیا جاتا ہے۔

غلزئی: مغرب کے پہاڑی درّوں سے وارد ہونے والے پوندہ تجارتی قافلوں سے تعلق رکھنے والی اقوام و قبائل میں سے ایک اہم قبیلہ ہے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو کہ درانیوں کے اقتدار سے قبل تک مشہور قبیلہ رہا ہے۔ بہت سے محققین کا اس قبیلہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ ترکی النسل ہیں جنہیں خلجی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اصل میں ترکی خلجی سمجھے جاتے تھے جس کا مطلب ہے تلوار باز لوگ۔

ایڈورڈ ڈی الیور نے اپنی کتاب ''پٹھان اینڈ بلوچ'' میں ان کے بارے میں ایک رومانوی داستان کو ان کے نام کا ماخذ قرار دیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

ایڈورڈ ڈی ایلبور کے مطابق افغان لوگ اپنی بیٹیوں کو ایرانیوں سے نہیں بیاہتے تھے' ایرانی شہزادوں میں کسی نے ایک افغان لڑکی کے معاشقے میں افغان دوشیزہ کی عصمت دری کی۔ اس دوشیزہ کے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام غل زوئے رکھ دیا گیا' بہرحال یہ روایت محض افسانوی ہو یا حقیقت پر مبنی اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی زیادہ راسخ الخیال بات یہی ہے کہ یہ تلوار باز لوگ ہیں جو کہ بہادر' شمشیر زن اور قابل رشک قد و قامت رکھنے والے لوگ ہیں جنہیں گل افاغنہ کہا جاتا ہے۔ یہ تجارتی ذہن رکھنے والے لوگ ہیں۔ سامان تجارت لے کر بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں جنگجوؤں اور بہادروں کی سرکردگی میں راستے میں حائل قبائل کے ساتھ لڑتے بھڑتے اور جان کی بازی لگاتے ہوئے جان بچا کر درّہ گومل میں سے ڈیرہ پہنچتے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کا پٹ ان کی بہت بڑی چراگاہ ہے۔ ان غلزئیوں کے ذیلی قبائل جو اقوام کی صورت میں ہیں صدیوں سے یہاں آباد ہوئی ہیں۔ یہ جب گومل درّہ سے ہوتے ہوئے برصغیر ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوتے تو اپنا سامان تجارت لے کر پا پیادہ بنارس اور پٹنہ تک کا سفر کرتے۔

کری: یہ بھی غلزئی کی ایک ایسی شاک ہے جو کہ یہاں کی مستقل آبادیوں میں رہتی ہے۔ دراصل کری کا مطلب ہے۔ مستقل خیمہ گاہ' چونکہ غلزئیوں میں سے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہاں خیمے نصب کر کے مستقل طور پر ٹھہرنا شروع کر دیا یہ سردیوں کے موسم میں اپنے ان خیموں میں اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ مستقلاً رہتے ہیں۔ یہ لوگ جو کری میں رہتے ہیں ان کی کوئی مخصوص شناخت تو نہیں اسی لئے ان کے لئے میں نے کری ہی کے لفظ کو مستعمل کیا ہے۔ بہرحال یہ وہ لوگ ہیں جو سامان تجارت کے قافلوں کے ساتھ یہاں آ کر آگے نہیں جاتے اور اپنی خواتین اور بچوں کے ساتھ یہاں موسم سرما میں ٹھہر جاتے ہیں اور ہر سردی کے موسم میں یہاں آ کر ٹھہرے رہتے۔

چھڑیں: ان غلزئیوں میں سے ایک حصہ وہ ہے جنہیں چھڑوں کا نام دیتے ہیں۔ ان کے پاس تجارتی قافلوں کا سامان برائے نام ہی ہوتا ہے۔ یہ قافلوں کے ساتھ تجارتی غرض کے لئے نہیں آتے تھے بلکہ ڈیرہ جات میں محنت مزدوری کی غرض سے آتے اور پھر ٹولیوں کی صورت تلاش معاش کی غرض سے مختلف اطراف میں پھیل جاتے۔ ایڈورڈ ڈی ایلبور نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ لوگ ہوم رول تحریک سے پہلے آئرستانی انگلستان میں فصل کی کٹائی کے لئے آتے تھے مگر ان کی محنت مزدوری کا انحصار صرف اس ایک مزدوری پر نہیں ہوتا بلکہ ہر قسم کی محنت مزدوری کرتے سڑکوں کی تعمیر و مرمت کے لئے پتھر توڑنا' پہاڑی راستوں کو ہموار کرنے کے لئے دقت طلب کام کرنا' سڑکیں بنانا' مال برداری کا کام انجام دینا غرضیکہ ہر قسم کے دقت طلب کام سے جی نہیں چراتے۔ یہ بڑے جفاکش لوگ ہوتے اور دن کو ہر قسم کی محنت مزدوری کر کے شام کو اپنے ساتھ نقدی کی صورت میں رقم لے جاتے اور نہایت سادہ غذا کھاتے اور پھر اچھی خاصی رقم جمع کر کے گرمیوں کے موسم میں افغانستان لے جاتے۔

خروٹی: یہ بھی غلزئی پوندوں میں سے ایک ایسا گروہ ہے جو کہ درّہ گومل سے یہاں داخل ہوتا ہے۔ اس گروہ کے لوگ نہایت غریب ہوتے اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے۔ انگریزوں کے دور سے ہی ان کی معرکہ آرائی کی داستان مشہور ہے۔ یہ جب کوہ سلیمان کے مختلف اطراف میں پھیل جاتے تو ان کا سامنا یہاں کی مستقل قوم سلیمان خیل سے ہوتا۔ سلیمان خیل انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے ساتھ نبرد آزما رہتے۔

سلیمان خیل: یہ پہاڑی علاقوں کی جنگجو قوم ہے۔ اپنے علاقوں میں کسی دوسری قوم کی آمد برداشت نہیں کرتے اور ان کے ساتھ آمادہ بجنگ ہو کر اپنے علاقوں سے انہیں نکال دیتے ہیں۔ انگریز مورخین کی سلیمان خیل کے بارے میں یہ رائے ہے کہ ہندوستان کے اندر ان کا رویہ دل خوش کن اور خوشگوار ہوتا ہے۔ مگر باہر وہ بڑے درشت اور کرخت مشہور ہیں۔ ان کے خاندان پشین سے جلال آباد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ تجارت کرنے والے لوگ ہیں جو ہندوستان کی مختلف منڈیوں سے سامان تھوک کے حساب سے خرید کر پوندوں کے ہاتھ بیچ دیتے اور خاصا منافع کماتے۔

میاں خیل: یہ قوم غلزئیوں کے لوہانی یا روانی قبیلہ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ لوہانی یا روانی فارسی کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے۔ مسافر یا سفر پسند۔ یہ درابن اور موسیٰ زئی میں آباد ہیں۔ یہ قدیم پوندوں میں سے امیر ترین اور تجارت پیشہ لوگ تھے۔ ان کی رشتے داریاں کابل' بخارا اور غزنی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہمنام رشتہ دار اور خاندانوں کے ساتھ معاونت کرنے والے ہیں۔ انگریز دور میں اگر ان کا ہمنام کوئی خاندان ان کے علاقوں میں زمین لے لیتا تو ان کی غیر موجودگی میں ان کی خریدی ہوئی زمینوں کی پوری ذمہ داری کے ساتھ دیکھ بھال کرتے۔ یہ امن پسند اور موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیمیافتہ قوم کے طور پر مشہور ہیں اور خوش پوش و خوش نوش لوگ ہیں۔ قدیم تجارتی اقوام میں ان کی حیثیت زیادہ مستحکم رہی ہے۔ وہ بخارا

کی بیشتر تجارت کے روح رواں سمجھے جاتے ہیں۔ سلک، بھیڑ کی کھالیں اور جڑی بوٹیوں کی تجارت میں شہرت رکھنے والی قوم کے لوگ ہیں۔ تہذیب وتمدن کے حوالے سے ان کا مقام دیگر ہم منصب اقوام کی نسبت سے اعلیٰ اور بہتر رہا ہے۔ اس وقت ملکی خصوصاً صوبہ سرحد کی سیاست میں بھی ان کا خاص عمل دخل ہے۔

دوتانی: یہ ایک چھوٹا سا اور غیر اہم پوندوں کا قبیلہ ہے۔ ان کے پاس گومل اور وزیر اقوام کے درمیان کا مختصر سا علاقہ ہے۔ اس لئے شروع ہی سے ان کے مراسم وزیر اقوام کے ساتھ دوستی پر مبنی ہیں اسی لئے وہ پرامن رہتے ہیں اور زیادہ تر توجہ ان کی اپنی زمینوں کی آبادی پر مرکوز رہی ہے۔ ان کی وادی نسبتاً شروع ہی سے زرخیز رہی ہے۔ ان کی زمینوں پر چاول اور غلہ کی کاشت ہوتی ہے۔

دولت زئی: یہ ڈیرہ اسماعیل خان کے موجودہ دوسرے بڑے ضلع ٹانک کے اصلی باشندے ہیں اور ٹانک میں حکمران قبیلے کے لوگوں سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ بھی اصلاً تجارت پیشہ لوگ ہیں جو تجارتی قافلوں اور جنگجو لوگوں کے ساتھ یہاں وارد ہوئے اور ٹانک کی زمینوں پر اقتدار حاصل کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ ان کے کئی اور بھی چھوٹے چھوٹے مگر غیر اہم قبیلے ہیں جو کہ ٹانک کے مضافات میں آباد ہیں۔

دولت خیل: یہ بھی ٹانک کے ایک مشہور قبیلہ کے لوگ ہیں۔ مروت جب نیازیوں کی دعوت پر مغرب سے مشرق کی جانب چلے آئے تو ان کا ایک حصہ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمالی کونے میں آباد ہو گیا۔ یہ مروت لوگ دولت خیل قبیلہ کے لوگوں کے لئے آنکھ کا تنکا ثابت ہوئے چنانچہ انہوں نے مروتوں کو اپنے علاقے سے نکالنے کے لئے یوں منصوبہ بندی کی کہ انہوں نے مروتوں سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے اپنی مدد کو گنڈہ پوروں کو بلا لیا جو کہ نہایت ہی جنگجو لوگ تھے، چنانچہ گنڈہ پوروں کی مدد سے وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔

کٹی خیل: یہ قبیلہ دراصل دولت خیل مقیم ٹانک کا ایک ذیلی قبیلہ ہے اور ٹانک میں رہائش اختیار کی مگر اس قوم کا حال دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس قوم کے اسلاف میں شہباز خان المعروف خان زمان خان، غازی خان، سلیم خان، قتال خان، سرور خان، اللہ داد خان، نواب شہنواز خان، نواب نور اکبر خان، نواب غلام قاسم خان اور نواب قطب الدین خان گزرے ہیں۔ یہ افغان پٹھانوں کی ایک خیل ہے۔ اس کے سرکردہ خان زمان خان کٹی خیلی ٹانک میں آ کر رہنے لگا اور شمال کی طرف کچھ حصہ میں مقیم مروتوں کے ساتھ مصروف برسرپیکار ہوا اور پھر پورے حصہ پر اس نے قبضہ کر لیا۔ کٹی خیل قبیلہ کے اخلاف نے کئی عروج وزوال اور نشیب وفراز دیکھے مگر انگریزوں کے وقت تک یہ لوگ ٹانک کے حکمرانوں اور نوابوں کی فہرست میں شامل رہے۔ 1947ء میں کٹی خیل قبیلہ کے نواب قطب الدین خان اعلیٰ تعلیمیافتہ شخص تھے۔

گنڈہ پور: یہ ڈیرہ اسماعیل خان کی تحصیل کلاچی کا معروف ومشہور قدیم پوندوں میں سے ایسا جنگجو اور درشت خصائل کا حامل قبیلہ ہے جو کہ دولت خیل قبیلہ کے لوگوں کی امداد کے لئے یہاں وارد ہوا۔ یہ بہادر و جفاکش اور جنگجو لوگ تھے۔ یہ جب مغرب سے مشرق کی جانب آئے تو انہوں نے کلاچی کی زمینوں پر اختیار حاصل کر لیا اور کلاچی کے تمام علاقوں پر قابض ہو گئے۔ عہد حاضر میں ڈیرہ ریجن کی ایک اہم اور غیر معمولی تہذیب یافتہ قوم کے طور پر متعارف ہیں۔

بابر: ایڈورڈز نے بابر قوم کو ماورائے سندھ کی افضل ترین قوم قرار دیا ہے۔ یہ تہذیب اور تعلیمیافتہ ڈیرہ اسماعیل خان کی قوم ہے۔ بابر ڈیرہ میں تاجر قوم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور تجارت میں خوب منافع کمایا۔ انہیں تاریخ میں ایمانداری اور امن پسندی کے اعتبار سے ایک شستہ اور اعلیٰ اقدار رکھنے والی قوم قرار دیا گیا ہے۔

شیرانی: ڈیرہ کی قدیم اقوام میں سے ایک ایسا قبیلہ ہے جو کہ ڈیرہ بسل یعنی تخت سلیمان کے آس پاس آباد ہے۔ شیرانی قبیلہ کے لوگ عموماً درمیانے قد وقامت رکھنے والے چست وجفاکش سمجھے گئے ہیں۔ تاریخ میں شیرانی قبیلہ کے لوگوں کی مابہ الامتیاز حیثیت کا جو نقشہ بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق ایک عام شیرانی جنگجو کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے پاس خمدار تلوار، پرانا انگریزی دونالی پستول اور ایک بارودی سینگ رکھتا ہے۔ یہ قبیلے اور قوم کی حیثیت سے دو حیثیتوں میں تقسیم ہیں۔ اگر پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں تو برگس شیرانی اور اگر وادی کے علاقے سے تعلق رکھتے ہوں تو ارگس شیرانی کہلاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی غربت اور لاچارگی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ اس قبیلہ کے لوگ شروع شروع میں یہاں کی اقوام میاں خیل اور بابروں کے پاس خدمت گزار کے طور پر رہتے تھے۔ یہ ایک وسیع تر قبیلہ ہے۔ جس کے لوگ مغرب میں دریائے ژوب اور شمال میں گومل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی اہم ترین بستیاں مشرق کی پست پہاڑیوں میں ہیں۔ ان کے بیشتر علاقے بے شجر اور زمینیں بنجر ہیں تاہم ان کا اہم پیشہ زراعت ہے۔ زمینیں چونکہ بارانی ہیں بارشوں کے موسم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زراعت پیشہ لوگ اپنی زمینوں

کو قابل کاشت بناتے ہیں۔

ان کی قدیم طرز بود و باش یہ ہے کہ وہ اپنے مکان اونچائیوں پر پہاڑ کے اندر کھدائی کر کے بناتے ہیں اور رات کو دروازہ خاردار درخت کی شاخ سے بند کر لیتے ہیں۔ آزادی سے پہلے انگریزوں اور ان کے درمیان خاصے ناخوشگوار حالات رہے۔ ہیں جس کی وجہ سے حکومتی تعاون انہیں کبھی بھی حاصل نہیں رہا اسی وجہ سے ان کے علاقے بنجر رہے ہیں۔

اشترانا: غالباً یہ ڈیرے کا وہی قبیلہ ہے جو اپنے آپ کو استرانڑاں لکھتا ہے۔ کوئی ڈیڑھ صدی پہلے تک یہ لوگ پوندہ کی حیثیت سے متعارف تھے۔ یہ بہت بڑا قبیلہ ہے جو کہ شیرانی قبیلہ کے علاقہ کے جنوب میں بین الدریائی اونچائی پر آباد ہے۔ ان کا علاقہ کلی ریگستانی اور بنجر ہے۔ ان کی زمینوں کی سیرابی کے لئے بارش ہی سب سے بڑا سہارا ہے۔ انہیں خوش طبع' امن پسند اور تحمل رکھنے والا قبیلہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ انگریز دور میں خاصی حد تک ان کے دوست واقع ہوئے ہیں اس لئے اس قبیلہ کے بہت سے لوگ انگریز فوج اور پولیس میں بھرتی ہوئے۔

ہری پال: یہ فقیر اور ملنگوں کا ایک ٹولہ ہے جو ایک خاندان کے طور پر تخت سلیمان کے مغرب کی طرف آباد ہے۔ یہ اپنی سماجی ضروریات کی تکمیل اور معاش کے لئے شیرانیوں پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور بستی زرکنی میں ہے۔ زرکنی میں آباد لوگ اپنے آپ کو شیخ حیدر کی اولاد میں سے شمار کرتے ہیں۔

مندوخیل: یہ بھی ڈیرہ کا ایک قابل ذکر قبیلہ ہے۔ اس قبیلہ کے لوگ بھی اب تہذیب آشنا اور تعلیمیافتہ ہیں اور صوبہ سرحد کی سیاست میں عمل دخل رکھتے ہیں۔ یہ کاکڑ قبیلہ کی ایک شاخ ہے۔ جن کا ابتدائی مسکن ژوب سے پرے اور دریا اور غلزئی علاقہ کے درمیان ہے۔ اس قبیلہ کے لوگ شروع ہی سے امن پسند رہے ہیں۔ ان کا پیشہ زراعت رہا ہے۔ اس قبیلہ کے لوگ وقت کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور بلا ضرورت معرکہ آرائی سے گریزاں رہے ہیں۔

بھٹانی: ضلع ٹانک کے میدانی علاقوں میں بھٹانی قبیلہ کے لوگ آباد ہیں۔ جہاں تک یہ لوگ آباد ہیں۔ وہاں تک کا علاقہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ یہ لوگ پٹھانوں کے بانی (قیس عبدالرشید) کے تیسرے بیٹے بیٹ کی اولاد میں سے خود کو شمار کرتے ہیں۔ شروع میں یہ جب مغرب سے مشرق کی طرف آئے تو چالیس میل وادی گومل سے لے کر کوہ گبر تک قابض ہوئے کافی عرصہ تک یہ لوگ پہاڑوں پر ہی آباد تھے بعد میں یہ پہاڑوں سے نیچے اترے اور ٹانک کے میدانی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے شروع شروع میں جو آبادیاں کیں وہ اپنی سماجی اور ثقافتی حیات کے بہت قریب تھیں۔ یہ غیر مزروعہ زمینوں پر قابض ہوئے جو کہ پتھریلی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں بسالئے۔ گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بنائیں۔ ان کی سماجی زندگی سادہ تھی۔ بسیار خوردنی ان کی عادت تھی ان کے اور وزیری قبائل کے دوستانہ مراسم مشہور ہیں۔ انگریزوں اور بھٹانیوں کے درمیان کافی عرصہ تک بداندیشی کی داستانیں جنم لیتی رہی ہیں تاہم انہوں نے 1875ء میں درّے کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی تو پھر انگریزوں اور ان کے درمیان مشکل حالات نہیں رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی ترقی کی منازل طے کی ہیں۔

ہوت بلوچ: درج بالا سطروں میں ان اقوام و قبائل اور خاندانوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ جن کا زمانہ ورود ڈیرہ شہر کی بنیاد رکھنے سے قبل تا زمانہ بعد از تعمیر ڈیرہ ہوتا رہا تاہم اب یہ سب متذکرہ اقوام و قبائل کے لوگ دریائی تہذیب اور کوہستانی ہمت و مقاومت کے تربیت یافتہ ہیں اور سب کے سب افغانی پوندوں کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان میں سے اکثر قبائل و اقوام کے لوگ یہاں پر مقیم ہوتے رہے اور اپنی قومی اور قبائلی شناخت کے ساتھ یہاں پر آباد ہوتے رہے۔

ان سطروں میں اب ان اقوام کا تذکرہ ہے جو کہ موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے بانی اور حکمران قوم میں رہی ہیں یا عہد حاضر میں ڈیرہ اور مضافات میں آباد ہیں مسلمان قومیں ہیں۔

ان اقوام میں سب سے مقدم تذکرہ ہوت بلوچ قوم سے تعلق رکھنے والے بلوچوں کا آتا ہے۔ جنہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کی بنیاد رکھی اس سلسلے میں روایات میں عہد و زمانہ کے اعتبار سے قدرے تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات کے مطابق یہاں کے بزرگوں سے مجھے جو معلومات دستیاب ہوئی ہیں اس کے مطابق بلوچ قوم کی آمد کا زمانہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا عہد ہے جو کہ سولہویں صدی عیسوی ہے۔ اکبر نے ہوت بلوچ سہراب خان اور اس کے بیٹوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ اگر یہ اور ان کی قوم کے لوگ کابل کی فتح کے لئے اکبر کا ساتھ دیں تو فتح یابی پر دریائے سندھ کے کنارے کا علاقہ ان کی جاگیر میں دے دیا جائے گا۔ چنانچہ جب کابل پر اکبر نے فتح حاصل کر لی تو وعدے کے مطابق ان بلوچوں کو یہ قطعہ زمین دے دیا جس پر سہراب خان بلوچ نے شہر آباد کر کے اس کا نام ڈیرہ اسماعیل خان رکھ دیا۔ تب سے یہ بلوچ جو کہ ہوت ہیں ان کا تسلط یہاں پر ہو گیا۔

مگر اب جو دستاویزات میرے ہاتھ لگی ہیں جن کو نصیر سرمد سائروی نے نقل کیا ہے۔ ان کے مطابق 1464ء میں قطب الدین ایبک کے بیٹے سلطان حسین نے جب ملتان پر تسلط جما لیا اور ملتان تک کا علاقہ اس کے زیر انتظام آ گیا تو اس نے اسے توسیع دی جس کے نتیجے میں قلعہ شورکوٹ و چنیوٹ (ضلع جھنگ) کوٹ کروڑ (لعل عیسن) دین کوٹ (نزد کالا باغ) تک کے علاقے سلطان حسین کے قبضے میں آ گئے۔

ملک سہراب خان اپنے دو بیٹوں اسماعیل خان اور فتح خان اور اپنے ہمقوم کچھ لوگوں کے ساتھ بلوچستان کے علاقے کیچ مکران سے روانہ ہوا اور چل کر سیدھا سلطان حسین حاکم ملتان کے پاس آ گیا اور یہاں پر سلطان حسین کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دریا کے پار مغربی درّوں سے آنے والے لٹیروں اور پہاڑی ڈاکوؤں سے ملتان شہر اور ملحقہ بستیاں غیر محفوظ تھیں چنانچہ بعض علاقوں کو ان پہاڑی لوگوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر سلطان حسین نے کوٹ کروڑ سے لے کر دین کوٹ تک کا علاقہ ملک سہراب خان کے سپرد کر دیا۔ ملک سہراب خان اور اس کی قوم کے لوگوں نے حسن انتظام کا ایسا منصوبہ بنایا جس کی وجہ سے یہ سارا علاقہ محفوظ ہو گیا۔

کیچ مکران کے کچھ دوسرے بلوچ بھی ملتان چلے آئے۔ ان میں مشہور بلوچ سردار حاجی خان مرالی بلوچ بھی اپنے فرزند غازی خان کے ہمراہ ملتان چلا آیا اور سلطان حسین کی ملازمت اختیار کر لی۔ سلطان حسین نے بعوض جنگ حاجی خان کو موجودہ علاقہ ڈیرہ غازی خان تحصیل لیہ و بھکر عطا کر دیا۔ اس نے یہاں پر شہر آباد کر کے اس شہر کا نام ڈیرہ غازی خان رکھ دیا۔ ادھر ہوت بلوچ ملک سہراب خان نے اپنے زیر تسلط علاقے کی آس پاس کی زمینوں پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح ملک سہراب خان کا قبضہ دامان یعنی دامن کوہ سلیمان کے کئی علاقوں تک ہو گیا چنانچہ ملک سہراب خان نے اس علاقے پر شہر کی بنیاد رکھ کر اپنے بڑے بیٹے اسماعیل خان کے نام پر شہر آباد کر دیا جبکہ دوسرے بیٹے فتح خان کے نام پر ڈیرہ اسماعیل خان کے جنوبی حصہ میں ڈیرہ فتح خان شہر کو آباد کر دیا، تب سے یعنی 1469ء بمطابق 874ھ میں یہاں پر بلوچ خاندان کی حکومت قائم ہو گئی اور ڈیرہ اسماعیل خان کے حکمران خاندان کے طور پر بلوچ خاندان کے لوگ یہاں آباد ہو گئے۔ بلوچ قبیلہ کے اکثر لوگ اپنے آپ کو حضرت امیر حمزہ کی اولاد بتاتے ہیں۔

ہوت، ازر، لغاری، لاشاری، جتوئی، کورائیں، چاندیہ، گوپانگ، نوتکانی، کلاچی، قیصرانی، اور جسکانی، ڈیرہ کے بلوچ ہوت خاندان کے لوگ ہیں۔

سدوزئی: سدوزئی شجرہ نسب کے لحاظ سے سڑبنی پٹھان ہیں۔ ان کے مورث اعلےٰ ترین ہیں سدوزئی' اسد اللہ کی اولاد میں سے ہیں جس کو ملک سدو کہتے تھے۔ اسی کی اولاد آگے چل کر سدوزئی کہلائی' ڈیرہ میں ان کی آمد اور حکومت کا زمانہ 1794ء کا ہے۔ جب یہاں سے ہوت بلوچوں کی حکومت ختم ہوئی تو ڈیرہ کی حکومت نواب محمد خان سدوزئی کو مل گئی یہ عہد درانی شہزادوں کا ہے۔ شاہ درانی والی کابل کی طرف سے محمد خان سدوزئی کو لیہ اور بھکر کی سلطنت تفویض ہوئی۔ محمد خان سدوزئی نے اپنا دارالخلافہ منکیرہ کو بنایا اس وقت اس کے دائرہ اقتدار میں دریائے سندھ کے پار کلور کوٹ سے لے کر محمود کوٹ یعنی دوآبہ سندھ ساگر تک کا علاقہ تھا اس نے اپنی سلطنت کا دائرہ دھیرے دھیرے پھیلا دیا محمد خان سدوزئی نے بھکر اور لیہ کا انتظام اپنے قبضہ میں رکھا جبکہ علاقہ دامان اور ڈیرہ کی حکومت دیوان مانک رائے کے سپرد کر دی تھی اور کچی کا علاقہ دیوان لکھی مل کے زیر انتظام کر دیا۔

1823ء میں پرانا ڈیرہ اسماعیل خان جو کہ موجودہ ڈیرہ شہر سے 4 میل مشرق کی طرف تھا دریا کی موجوں میں غرق آب ہو گیا تو نواب شیر محمد خان سدوزئی جو کہ نواب محمد خان سدوزئی کا چھوٹا نواسہ تھا اس نے نئے ڈیرہ کی بنیاد 1825ء موجودہ جگہ پر رکھی اور فیصلہ یہ کیا کہ ہندو اپنی آبادیاں جنوب کی طرف اور مسلمان شہر کے گرداگرد اور شمال کی جانب بنائیں گے چنانچہ اس فیصلے کے مطابق موجودہ شہر ڈیرہ کو ازسرنو آباد کیا گیا مگر نام ڈیرہ اسماعیل خان ہی رکھا گیا۔

سیال: ڈیرہ اسماعیل خان میں یہ ایک ایسا خاندان ہے۔ جس میں پڑھے لکھے شاعر و ادیب قلمکار و نثر نگار لوگ بھی ہیں اور دستکار پیشہ ور لوگ بھی ہیں۔

سیال ایک قدیم قوم سے تعلق رکھنے والا خاندان ہے۔ جھنگ کے علاقے کے سیال بہت مشہور ہیں۔ احسن المقال کے مصنف نور محمد نے سیال قوم کے بارے میں بڑی عرق ریزی پر مبنی تحقیق کی ہے جس کے مطابق سیال پنوہ' راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں جب راجپوتوں کی ریاستیں ان سے چھین لی گئیں تو ان میں باہمی نا اتفاقی نے جنم لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے راجپوت پنجاب کے علاقوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ سیالوں کی کچھ ذیلی شاخیں بھی ہیں ان میں راء سیال کے لوگ ہیر رانجھا کی رومانوی داستان کی وجہ سے زیادہ نمایاں ہوئے۔ ہیر اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی ہیر کے باپ کا نام چوچک سیال تھا۔

راء سیال ولد راء بجدیو ولد راء کامدیو وہاری نگری کے پنوار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جب یہ الہ آباد کی طرف سے پنجاب آیا تو حضرت بابا فرید شکر گنج

رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ مسلمان کرنے کے بعد حضرت بابا شکر گنج نے اسے دعا دی کہ تمہارا خاندان پھیلے گا اور اسے عروج نصیب ہو گا اور ساتھ ہی یہ بھی مشو رہ دیا کہ دریائے جہلم اور چناب کے سنگم پر آباد ہو جائے چنانچہ یہ جہلم کے پار کچھی میں آباد ہو گیا۔

راء سیالوں میں سے آٹھویں پشت میں سے چوچک سیال اپنے قبیلے اور جھنگی سیالوں کا سردار بنا۔ اسی کی لڑکی ہیر کا رانجھا کے ساتھ معاشقہ ہو گیا اور اس رومانوی داستان کی وجہ سے اس خاندان نے خاصی شہرت حاصل کی۔ جب ہیر اور رانجھے کے معاشقے کی داستان عام ہونے لگی تو سیالوں کے سردار چوچک اور اس کے بھتیجے دل خان ولد پتھر خان نے اپنا اصلی وطن چھوڑ دیا اور دریائے چناب کے بائیں کنارے پر آ کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے آس پاس کے کئی چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو اپنا مطیع کر لیا اور پھر حاکم لاہور کے پاس جا کر اپنا حق حکمرانی جتایا اور حاکم لاہور سے سرداری کا پروانہ حاصل کر لیا اور اپنی جائے رہائش کے لئے ایک شہر کی بنیاد رکھی یہ لوگ جب بستیاں آباد کرتے تو درختوں کے جھنڈ میں اپنے خاندانوں کے نام جھگیاں بساتے تھے چنانچہ جب چوچک سیال اور دل خان نے اپنا نیا شہر بسایا تو اسے بھی جھنگی کا نام دیا جو بعد میں اسم مکبر کے طور پر جھنگی سے جھنگ ہو گیا۔ عہد بہ عہد ان کی ریاست کی حدیں پھیلنے لگیں اور اس خاندان کے لوگ اپنی حدود سے نکل کر ارد گرد علاقوں تک پھیل گئے۔ میرا اپنا نقطہ نظر یہ ہے کہ ڈیرہ شہر کی جب بنیاد پڑی تو شہر کی دریائی تہذیب ان میں سے بعض لوگوں کو کھینچ کر اس طرف لے آئی اور پھر اس شہر ڈیرہ میں بسنے والے خاندانوں میں سے یہ ایک جانا پہچانا خاندان ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب اس خاندان کے احمد خان سیال کو سکھوں نے شکست دی تو ان کے علاقوں پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ سکھوں کے عہد ہی میں اس خاندان کے بہت سے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے چنانچہ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سکھوں کے عہد حکومت میں یہ لوگ ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی آئے ہوں اور یہاں پر آباد ہو گئے ہوں۔

اعوان: ڈیرہ اسماعیل خان میں اعوان خاندان کے لوگ بھی بکثرت آباد ہیں۔ یہ اعوان وہ خاندان ہے جو اپنے بارے میں اس نسبی سلسلے پر فخر کرتا ہے کہ اعوان کا تعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس خاتون کی اولاد میں سے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک جنگی معرکہ میں آپؓ کی بیوی بنیں۔ اعوان کے بارے میں نہایت گہری تحقیق کے بعد میں نے اپنی کتاب ''ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں'' جو تفاصیل دی ہیں یہ تفاصیل برمنڈرتھ کے اس خیال سے ہم آہنگ ہیں کہ یہ لوگ بکٹرئن یونانیوں کے وارث ہیں جو کہ اپنے آپ کو اوان لکھتے تھے۔ اعوان اسی اوان کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بحوالہ ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں صفحہ 168۔

سادات: سادات خاندان کے مختلف گھرانے ڈیرہ اسماعیل خان میں آباد ہیں۔ زیادہ تر سادات وہ ہیں جو کہ شیعہ مسلک کے حامل ہیں اور اپنے ناموں کے ساتھ رضوی، زیدی اور جعفری لکھتے ہیں۔ ڈیرہ میں اہل تشیع کی ایک بہت بڑی تعداد ہے اور ڈیرہ شہر میں اور مضافات میں ان کی مساجد و امام بارگاہیں ہیں۔

اس کے علاوہ یہاں پر بخاری سادات کے بھی کچھ گھرانے موجود ہیں۔

علی زئی: علی زئی قوم کے لوگ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے جنوب مشرق کی طرف آباد تھے۔ اب بھی ان کے کچھ مکانات موجود ہیں۔ حکومت برطانیہ کے دور میں اس خاندان کے لوگوں کو کافی مراعات حاصل ہوئیں کیونکہ اس خاندان کے اکثر لوگ انگریز حکومت کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے ہیں۔ اس خاندان کے معروف شخص نواب فوجدار خان علی زئی تھے ان کے دادا اخدا یار خان والی ملتان مظفر خان کے پاس ایک چھوٹے عہدہ پر تعینات تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے پیر محمد خان علی زئی لاہور میں سکھوں کے ہاں ملازم ہو گئے۔ اس وقت نواب فوجدار خان علی زئی اپنے ماموں نواب سدوزئی کے پاس ڈیرہ چلے آئے جہاں اُن کی حکومت تھی پھر ان سے سکھوں نے حکومت چھین لی تو اس وقت سکھوں کی طرف حاکم ڈیرہ کفور نونہال سنگھ نے علاقہ ٹانک 1836ء میں اللہ داد خان کٹی خیل سے بوجہ بغاوت ضبط کر کے عاشق محمد خان علی زئی، محمد پائندہ خان خواجک زئی اور حیات اللہ خان سدوزئی کو بلحاظ مرتبہ ذاتی و خاندان ان کی جاگیر میں دے دیا۔ ان تینوں اشخاص نے بالاتفاق اپنی طرف سے نواب فوجدار خان علی زئی کو قلعہ دار مقرر کر کے جاگیر کا انتظام اس کے حوالے کر دیا۔ جس وقت انگریزوں نے سکھوں سے حکومت چھین لی تو انگریز دور میں نواب فوجدار خان علی زئی کو کابل میں سفارت کے عہدے پر تعینات کر کے بطور سفیر کابل بھیج دیا گیا۔ نواب فوجدار خان علی زئی کے بعد ان کا بیٹا اب نواب خان قوم کے سردار اور نواب مقرر ہوئے۔

قوم خواجک زئی: یہ قوم ڈیرہ میں نواب محمد خان سدوزئی کے ساتھ ملتان سے آئی تھی۔ پائندہ خان نواب محمد خان کے پاس جمعدار تھا۔ جب حکومت سکھوں کے ہاتھ میں آئی تو کنور نونہال سنگھ نے ٹانک پر قبضہ کر کے اس علاقے کو بطور جاگیر

پائندہ خان اور دو دیگر افراد کو دے دیا۔ اس قوم کے لوگوں کو ملتانی پٹھان کہا جاتا ہے۔ پائندہ خان اور اس کے بیٹے کو فتح خان ٹوانہ نے قتل کروا دیا تھا۔ اس قوم کی بہادری اور وفاداری ضرب المثل ہے۔ یہ خاص ڈیرہ میں آباد ہیں۔

خاکوانی: خاکوانی ابدالی پٹھانوں کی ایک شاخ ہے۔ اس خاندان کے اسلاف خراسان سے ملتان آ کر آباد ہو گئے تھے اور وہاں ملازمتیں اختیار کر لی تھیں۔ اس خاندان کی ایک بزرگ شخصیت برخوردار خان ملتان سے ڈیرہ آئے اور محمد خان سدوزئی کے ہاں ملازم ہو گئے۔ سدوزئی نواب نے انہیں جمعداری کے منصب پر ملازم رکھ لیا۔ جب انگریزوں کی حکومت تھی تو اس وقت اس خاندان کے سرور خان خاکوانی نے اہم فوجی خدمات انجام دیں اس لئے انگریز سرکار نے اسے پنشن عطا کی اور پھر اسے سفارت کے عہدے پر تعینات کر کے کابل بھیج دیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر اسے جاگیر ملی اور سرکار نے اسے نواب کا خطاب دیا۔

کنڈی: یہ بھی پٹھانوں کی ایک شاخ سے تعلق رکھنے والا خاندان ہے۔ تہذیب و تعلیم میں اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھنے والا خاندان ہے۔ تعلیمیافتہ لوگ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں اور صوبے کی حکومت کے انتظامی معاملات میں خاصا عمل دخل بھی ہے۔ اس خاندان کے لوگ پائی، درکی اور گل امام میں آباد ہیں۔

بلیچ خیل: بلیچ خیل قوم کے لوگ کوہ شیخ بدین کے نزدیک پنیالہ میں آباد ہیں۔ قدیم طرز ثقافت و تہذیب کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے بزرگ حاجی بلیچ جو کہ اس قوم کے مورث اعلیٰ سمجھے جاتے ہیں فقیر طبع آدمی تھے اور ان ہی نے موضع پنیالہ آباد کیا تھا۔ اسی مقام پر ان کا مزار ہے۔

پروا: پروا قوم کے لوگ ڈیرہ اسماعیل خان کے جنوب میں پروا کے مقام پر آباد ہیں۔ ملک پروا خان اس خاندان کا مورث اعلیٰ ہے اور اسی نے اس مقام کو آباد کیا تھا۔

جاٹ: یہ وہ لوگ ہیں جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے جنوبی حصہ میں آباد ہیں۔ کچی اور پہاڑپور میں ان کی آبادیاں ہیں۔

دیوان خاندان: چونکہ ڈیرہ میں مدتوں مسلم اور غیر مسلم خصوصاً ہندو مل جل کر رہے ہیں بلکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے تو اس سارے علاقہ میں ہندوؤں کی عملداریاں تھیں۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس علاقے پر مسلم اقوام کا اثر زیادہ رہا ہے۔ تاہم ہندوؤں کی سماجی حیثیت کو بھی ہر حاکم نے تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کا ایک خاندان جو کہ ڈیرہ میں دیوان کے خطاب کے ساتھ مشہور ہوا ہے۔ اس خاندان کے لوگوں کا حکومتی انتظام میں گہرا عمل دخل رہا ہے۔ اس خاندان کا بنیادی تعلق قوم اروڑہ وڈھوا سے ہے۔ اس خاندان کے اسلاف سندھ سے خروج کر کے ملتان منتقل ہوئے۔ بعدازاں ملتان سے خروج کیا اور بھکر اور منکیرہ میں آباد ہو گئے اور پھر آخر کار ڈیرہ اسماعیل خان کو اپنا مسکن قرار دیا۔

سب سے پہلے اس خاندان کے بڑے شری ٹیک چند جس کا تعلق وڈھوا قوم سے تھا اسے نواب محمد خان سدوزئی نے اپنے ہاں محرر مقرر کیا۔ ان کے فوت ہونے کے بعد ان کے بیٹے لکھی مل کو جو کہ ابھی نابالغ ہی تھا بلحاظ خاندانی مرتبہ باپ کی جگہ محرر مقرر کیا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے کام میں تندہی اور محنت دکھائی اور ہوشیاری اور عقلمندی کے ساتھ اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کیا تو نواب محمد خان سدوزئی نے اسے دیوان کا خطاب دیا۔ تب سے اس خاندان کے لوگ دیوان صاحب کے نام سے موسوم ہو گئے۔ انگریز سرکار کی طرف سے اس خاندان کو جاگیر ملی۔

اس کے علاوہ بھی دیگر ہندو خاندان ڈیرہ میں آ کر آباد ہوئے۔ ان میں جندوزنی، ٹھٹانی، منگلانی، نندوانی، سندوانی، پنجانی، پیلانی، گلیانی، بھوٹانی، لکھانی، گبرانی اور درمانی قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کے سب خاندان سندھ سے منتقل ہو کر یہاں آباد ہوئے۔

ڈیال قوم: ڈیرہ اسماعیل خان شہر سے باہر شمال مشرق کی جانب دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ڈیال ہے جو اس قوم کی نسبت سے ڈیال ہے۔ اس قوم کے لوگ زیادہ تر اپنی زمینوں پر کاشتکاری کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی دریائے سندھ کے مشرق کی طرف سے یہاں وارد ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خان کی مقامی اقوام میں آرائیں، دھپ اور قصوریہ بھی ہیں۔

مقامی خصوصیات

ڈیرہ اسماعیل خان جو کہ ایک قدیم روایتی اور ثقافتی اوصاف کا حامل شہر ہے۔ اس شہر کے مضافات و ملحقہ علاقے بعض مقامی خصوصیات کی بناء پر معروف اور مشہور ہیں۔

چونکہ ڈیرہ کے مضافات میں بعض ایسے درّے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے اور یہی درّے اس شہر بلکہ برصغیر ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے مغرب سے آئی ہوئی اقوام کی گزرگاہ رہے ہیں۔ چنانچہ ان مقامی خصوصیات کے تذکرے میں ابتداء ان درّوں اور درّوں کے مضافات میں واقع دیہات و مقامات سے کی جاتی ہے۔

درّہ گومل: کوہ سلیمان کے مغربی درّوں میں درّہ گومل قدیم الایام سے ہی خراسان و ہندوستان کے درمیان ایک بڑی اور مشہور تجارتی شاہ راہ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا رہا ہے۔ اس درّہ گومل کو تجارت پیشہ افغان پٹھانوں کے لئے اس مرکزی اور وسطی شاہراہ کو اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ پشاور کے مغربی درّے درّہ خیبر و کابل اور بولان و قندھار درّوں اور شاہراہوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ ہر سردی کے موسم میں درّہ گومل کے ذریعے بخارا اور افغانستان کے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے گزر کر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل جاتے اور پھر گرمیوں کے موسم میں تبادلے کے طور پر بڑی بڑی منافع کی رقمیں اور سامان لے کر اپنے ٹھنڈے اور گرمائی مقامات کو واپس جاتے۔

اس کے علاوہ یہ ڈیرہ اسماعیل خان کا اہم درّہ کہلاتا ہے اور اسی کے نام سے موسوم ڈیرہ اسماعیل خان کے وسیع و عریض رقبے پر مشتمل یونیورسٹی ہے۔ جسے گومل یونیورسٹی کے طور پر دنیا جانتی ہے۔ اس درّے میں وزیر، محسود اور بھٹانی اقوام و قبائل آباد ہیں۔ یہاں ایک ایسی پہاڑی مشہور ہے جس پر چڑھ کر آدمی غزنی شہر کا مینار دیکھ لیتا ہے۔ چودھواں کا قصبہ اسی درّے کا ایک گاؤں ہے۔

درّہ گومل کو اس لحاظ سے بھی مہم درّہ سمجھا جاتا ہے کہ مغل شہنشاہ بابر نے کوہاٹ اور بنوں میں اپنے دشمنوں کو شکست دی تو اس کے بعد وہ ڈیرہ جات آیا تو اس نے عید الفطر کا تہوار گومل کے کناروں پر منایا۔

درّہ بگستان: اس درّے کو تاریخی اور ثقافتی شہرت اس لئے حاصل ہے کہ قدیم ایرانی سلطنت کے یونانی النسل جرنیل گجیس نامی اس درّے سے برصغیر ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ اس عظیم تاریخی شخصیت کے نام پر ہی یہ درّہ 'درّہ گجیس' کے نام سے مشہور ہے جو کہ ایک تاریخی اور ثقافتی پہچان ہے۔ یہاں پر دو بڑی قومیں بابڑ اور میرانی آباد ہیں۔

درّہ کھگل: چونکہ درّہ کھگل ایسے مقام پر واقع ہے کہ جہاں کھگل کے درختوں کی بہتات تھی اس مناسبت سے اس درّے کا نام درّہ کھگل رکھ دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں پر ایک بزرگ نے آ کر بہت عرصے تک مراقبہ کیا اور یہاں پر انہیں ولایت سے نوازا گیا اس بزرگ کا مزار ڈیرہ شہر کے مغرب کی جانب ہے اور اس مزار کا نام بھی کھگلاں والا مزار ہے۔

درّہ رمک: اس درّہ میں اور مضافات میں ڈیرہ اسماعیل خان کی ایک بڑی قوم اپنی قدیم روایات و ثقافت کے ساتھ آباد ہے۔ اس درّے کی وجہ شہرت قوم استرانڑاں کے مکانات اور آبادیاں ہیں۔

ڈیرہ شہر کی وجہ شہرت: یوں تو ڈیرہ شہر کی وجہ شہرت کے کئی اسباب ہیں کیونکہ یہ ایک ڈیرہ جات کا صدر مقام ہے۔ اس کے علاوہ سرحد، پنجاب، بلوچستان اور افغانستان کے سرحدی سنگم پر ہے اور دریائے سندھ کی صوبہ سرحد کی آخری جنوبی گزرگاہ ہے۔ ڈیرہ کی ایک وجہ یہاں کا سوہن حلوہ ہے جو کہ عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ سوہن حلوہ اور ڈیرہ اسماعیل خان ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی سب سے بڑی سوغات یہ حلوہ ہے جو نہ صرف یہ کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے موجودہ شہر کی تعمیر سے جڑا ہوا ہے۔ بلکہ مدتوں پہلے اس خطے میں یہ نہایت ہی لذیذ اور مقوی صحت پکوان تیار ہو چکا تھا جو کہ ایک لوک داستان سے مربوط ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے دروازے: ڈیرہ اسماعیل خان کی قدیم آبادی شہر کے دروازوں کے اندر آباد ہے۔ شہر کے ارد گرد ایک دیوار تعمیر کی گئی جسے حصار شہر یا فصیل شہر کہا جاتا تھا۔ اس فصیل میں کچھ کچھ فاصلوں سے مختلف ناموں سے دروازے تعمیر کئے گئے۔ اس وقت دو تین دروازے باقی رہ گئے ہیں جو کہ قدیم طرز تعمیر کا نشان ہیں۔ تاہم ان دروازوں کے نام اب بھی زبان زد عام ہیں اور ہر علاقہ ان دروازوں کے نام ہی سے موسوم ہے۔

فقیرنی دروازہ: یہ دروازہ ایک فقیرنی کے نام سے منسوب ہے۔ جس کا اس مقام پر ٹھکانہ تھا۔ اب بھی اس مقام پر اس فقیرنی کی قبر ہے۔

ٹھٹھاراں والا دروازہ: سرائیکی میں ٹھٹھاراں مسگری کے ایک مخصوص فن کو کہا جاتا ہے جو کہ مس کے ظروف پر چتر کاری یا کندہ کاری ہے۔ یہ کام اس مقام پر ہوتا تھا۔ اس لئے اس دروازے کی وجہ شہرت مسگری کا یہ ہنر اور ہنرمند ہیں۔

کنیراں والا دروازہ: سرائیکی زبان میں بان سے چارپائی بننے کے کام کو

کیر اں کہتے ہیں اس مقام پر یہ کام ہوتا تھا اس لئے اس دروازے کی وجہ شہرت اس پیشے سے منسلک ہے۔

توپاں والا دروازہ: اس کے سامنے سرکاری دفاتر اور توپیں نصب تھیں، اس مناسبت سے اس کا نام توپاں والا گیٹ ہو گیا۔ اب یہ گیٹ شہر میں داخل ہونے کے لئے مغربی گزرگاہ ہے اور جو بھی باہر سے آتا ہے۔ اسی گیٹ سے عموماً شہر میں داخل ہوتا ہے۔

اماماں والا دروازہ: محرم الحرام کے مہینے میں اہل تشیع کے جلوس اور تعزیئے اس مقام سے گزرتے ہیں اس لئے اس دروازے کا نام اماماں والا دروازہ ہے۔

پوندہ دروازہ: افغانستان کے تجارتی قافلے اس مقام سے داخل ہوتے تھے ان افغانی قافلوں کو پوندہ کہتے ہیں۔ اس دروازے کی وجہ شہرت پوندہ لوگوں کے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ ہے۔

لغاری دروازہ: یہاں بلوچوں کا ایک خاندان لغاری آباد ہے۔ اس مناسبت سے اسے لغاری گیٹ کہا گیا۔

علی زئی دروازہ: یہاں علی زئی قوم کے لوگ آباد ہیں اور اس گیٹ کی وجہ شہرت علی زئی قوم کی آبادی ہے۔

کمہاراں والا دروازہ: سرائیکی زبان میں کہار شادی بیاہ کے موقع پر ڈولی اٹھانے والے کو کہتے ہیں۔ یہاں پر اس مخصوص پیشے کے لوگ آباد تھے اس لئے اس دروازے کی وجہ شہرت یہی لوگ ہیں۔

محلّہ قصاباں والا: ڈیرہ اسماعیل خان کے شہر کی حدود میں ایک محلّہ قصاباں والا ہے۔ اس محلّہ میں ایک سٹریٹ قصوریہ سٹریٹ کے نام سے موسوم ہے۔ جہاں قصوریہ خاندان کے لوگ رہائش رکھتے ہیں۔ اس سٹریٹ میں ایک حویلی ہے۔ جسے رنگ محل یا پتھر فقیر حویلی کہتے ہیں۔ یہ حویلی یہاں کی ثقافتی تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ جس میں شیشے کے در و دیوار ہیں۔ یہ ایک روحانی مجذوب شخصیت حافظ حمید اللہ کی حویلی ہے۔ جسے لوگ پتھر فقیر کے نام سے جانتے ہیں۔ اس محلّہ قصاباں والا کی وجہ شہرت یہ پتھر فقیر حویلی یا رنگ محل ہے۔

شیخ یوسف ٹاؤن: یہ ڈیرہ شہر کی اندرونی آبادی سے باہر ایک نئی بستی ہے۔ جہاں پر ڈیرہ شہر کے لوگوں نے جدید تقاضوں کے مطابق مکانات تعمیر کر لئے ہیں۔ تاہم اس جدید بستی کے ساتھ جڑی ہوئی قدیم بستی بھی ہے جو کہ قدیم بزرگ اور روحانی شخصیت حضرت شیخ محمد یوسف کے مزار کی وجہ سے شیخ یوسف بستی کے نام سے مشہور ہے۔

مقامی پکوان و مشروبات اور کھانے

سوہن حلوہ: یہ ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک خاص روایتی حلوہ ہے۔ اگرچہ ڈیرہ اسماعیل خان کے مختلف علاقوں اور خاص شہر میں یہ حلوہ تیار ہوتا ہے۔ مگر اس حلوے کے تیار کرنے والی دکانیں زیادہ تر ڈیرہ کے توپاں والے گیٹ کے اندر ہیں۔ اس قدیم حلوے کے بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ گندم کو پانی میں اچھی طرح بھگو لینے کے بعد اسے ایک لوہے یا تانبے کی سینی یا تھال میں رکھ کر اس کے اوپر ململ کا یا کوئی بھی باریک سا کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ تاکہ روشنی اور تیز ہوا سے محفوظ رہے۔ کچھ دن اسی طرح یہ گندم پڑی رہتی ہے تو اس گندم کی کونپلیں نکل آتی ہیں اور پھر اسے دھوپ میں خشک کرنے کے لئے رکھ دیا جاتا ہے۔ جب یہ خشک ہو جاتی ہے تو اسے چکی میں پیس لیا جاتا ہے اور جب دلیہ نما آٹا بن جاتا ہے تو اسے سوہنی بولتے ہیں۔ ڈیرہ کے قلمکار و دانشور نصیر سرمد کے مطابق اسی سوہنی کی وجہ سے اس حلوے کو سوہنی حلوہ کہا گیا جو بعد میں سوہن حلوہ ہو گیا (جبکہ میرا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حلوے کا تعلق صدیوں قبل ایک رومانوی داستان سے ہے جس کا ہیرو سوہن لال ہے۔ اس کی تفصیل رومانوی داستانوں میں مکمل طرح سے ملاحظہ کریں) خشک کرنے کے بعد اسے اچھی طرح میدہ کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس میدہ شدہ گندم میں آٹے کا میدہ اور دودھ ملا لیا جاتا ہے۔ اس آمیزہ کو بڑے سے کڑاہے میں ڈال کر آگ پر رکھ لیا جاتا ہے اور اسے اچھی طرح پکا لیا جاتا ہے۔ جب یہ حلوہ تیار ہو جاتا ہے تو اسے آگ سے اتار کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ پھر اس میں چینی ڈال کر دوبارہ خشک کیا جاتا ہے۔ دوبارہ خشک کرنے کے بعد اس میں گھی ڈال دیا جاتا ہے۔ آخر میں بادام، پستہ اور اخروٹ کی گری ڈال دی جاتی ہے اور پھر بڑے تھال میں ڈال کر اسے اچھی طرح ٹھنڈا کر لیا جاتا ہے۔ ڈیرہ کے ہر گھر میں مہمانوں کی مہمان نوازی کے لئے یہ حلوہ موجود ہوتا ہے۔ جبکہ باہر سے آنے والے مسافر لوگ یہ حلوہ اپنے گھر والوں، دوستوں اور احباب کے لئے بطور سوغات لے جاتے ہیں۔

دودھی کا حلوہ: یہ قطعی طور پر مقامی میٹھا پکوان ہے اور ڈیرے میں حلوائیوں کی دکانوں کے علاوہ ڈیرہ میں رہنے والے لوگ اپنے گھروں میں بھی یہ حلوہ تیار کرتے

ہیں اور اکثر جب مہمان آتے ہیں تو مہمانوں کی خاطر داری کے لئے اور گھروں میں منعقد کی جانے والی تقریبات کے موقع پر یہ حلوہ بنایا جاتا ہے۔ جس کی ترکیب کچھ اس طرح سے ہے۔

گندم کے آٹے کو روٹی بنانے کی طرح اچھی طرح گوندھ لیا جاتا ہے۔ بعد میں اس گوندھے ہوئے آٹے کو پانی کے اندر ہی اپنی ہتھیلیوں میں اچھی طرح مل لیا جاتا ہے۔ اس عمل سے آٹے میں سے نشاستہ نکل جاتا ہے۔ آٹے کی بھوسی جب ربڑ کی طرح ہو جاتی ہے تو اسے لگن سے نکال لیا جاتا ہے اور آٹے کو دوسرے برتن میں رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ پانی جس میں آٹے سے نکلا ہوا نشاستہ ہوتا ہے۔ اس پانی کو تھوڑی دیر کے لئے جوں کا توں رکھ لیتے ہیں جب نشاستہ پانی میں اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے تو نشاستے کے اوپر کا پانی دوسرے برتن میں نتار لیتے ہیں۔ دیگچی یا حسب ضرورت کسی دوسرے برتن دیگچے وغیرہ میں چینی اور گھی ڈال کر اسے آگ پر رکھ لیا جاتا ہے۔ جب چینی گھی میں اچھی طرح سرخی مائل ہو جاتی ہے تو پھر نشاستے والا پانی اس کے اندر ڈال دیا جاتا ہے اور اسے خوب اچھی طرح ہلایا جاتا ہے۔ اس عمل سے یہ ملغوبہ گاڑھا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ سرخی نما حلوہ تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں حسب استطاعت لذیذ بنانے کے لئے بادام اخروٹ اور پستہ ڈال دیا جاتا ہے، البتہ ذائقے کو مزیدار بنانے کے لئے الائچی ضرور ڈالی جاتی ہے۔ اس حلوے کو ڈیرہ کے مقامی لوگ ''دودھی'' کا حلوہ کہتے ہیں۔

ڈیرے کا مخصوص پلاؤ: ڈیرے میں بھی لوگ چاول کا استعمال غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بکثرت کرتے ہیں۔ تاہم ڈیرے میں تیار ہونے والا ایک مخصوص اور روایتی پلاؤ ایسا ہے جس کا رنگ کلیجی نما ہوتا ہے۔ یہ ڈیرے والوں کا روایتی پکوان ہے۔ یہ پلاؤ بازار اور ہوٹلوں میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ جبکہ گھروں میں خواتین بھی ایک خاص ترکیب کے ساتھ تیار کرتی ہیں۔ مہمانداری کیلئے اس پلاؤ کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔

پرانے چاول کو پانی میں بھگو دیتے ہیں۔ جسے کچھ عرصے تک پانی میں رکھا جاتا ہے۔ دوسرے برتن میں گوشت کو پیاز کے ساتھ پکا لیتے ہیں اور اس میں حسب ضرورت مختلف مصالحے ڈالے جاتے ہیں خصوصاً گرم مصالحہ ضرور ڈالتے ہیں۔ جب یہ سالن تیار ہو جائے اور گوشت اچھی طرح گل جاتا ہے تو چاولوں کی مقدار کے مطابق اس میں پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ جب یخنی تیار ہو جاتی ہے تو اس میں بھگوئے ہوئے چاول ڈال دیئے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پانی سوکھ جاتا ہے تو آگ کی ہلکی سی آنچ پر دیگچہ رکھ دیتے ہیں اور اوپر سے دیگچے کے اوپر ڈھکن کو اس طرح رکھتے ہیں کہ کوئی جگہ خالی نہ رہنے پائے تاکہ اچھی طرح دم لگ جائے۔ اس طرح چاولوں کے اندر ملا ہوا پیاز کلیجی کے رنگ کا ہو جاتا تو پلاؤ بھی اسی رنگ میں ڈھل کر براؤن ہو جاتا ہے۔ یہ ڈیرہ والوں کا مخصوص علاقائی اور روایتی پلاؤ ہے۔ اسے عام زبان میں کلیجی پلاؤ بھی کہتے ہیں۔

سوبت (صحبت): یہ یہاں کے لوگوں کا وہ مخصوص پکوان ہے۔ جسے بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ڈیرہ اسماعیل خان سے لے کر بنوں تک کا مخصوص پکوان ہے۔ حالیہ تحقیق کے دوران یہاں کے معروف دانشور نصیر سرمد نے کہا کہ یہ لفظ صحبت نہیں ''سوبت'' ہے۔ اس لئے بقول ان کے یہاں پر اس پکوان کو سوبت ہی لکھا جا رہا ہے۔ ممکن ہے یہ لفظ بنوں میں صحبت ہی ہو اور سرائیکی زبان کے تناظر میں اسے سوبت لکھا جاتا ہو بہر حال یہ اس علاقے کا نہایت ہی مخصوص طرز پکوان کا آئینہ دار ہے۔

قدیم زمانے میں ڈیرہ میں قائم بالا خانوں میں فرشی نشستیں منعقد ہوتی تھیں جہاں یار دوست اکٹھے ہوتے تھے۔ ان نشستوں کو ماڑی فرشی نشست کہتے تھے۔ ماڑی سرائیکی زبان میں بالا خانے کو کہتے ہیں۔ ان فرشی نشستوں کے موقعوں پر سوبت کا اہتمام ہوتا تھا اب بھی بعض جگہوں پر یہ ماڑی فرشی نشست کا تصور موجود ہے۔ یہ ایک ایسا پکوان ہے جو کہ گوشت اور مصالحہ جات سے تیار کردہ شوربے کو بڑے سے پرات یا لگن میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس میں علاقائی طریقے سے تیار کی ہوئی باریک روٹیوں کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اس پکوان کا سارا دارومدار علاقائی طور پر لوہے کے توے پر پکائی جانے والی روٹی پر ہوتا ہے۔ اس قسم کی مخصوص اور روایتی گندم کے آٹے کی روٹی کو سرائیکی میں مانا کہتے ہیں اور جس توے پر یہ روٹی پکائی جاتی ہے۔ اسے سرائیکی میں کپ کہتے ہیں۔ اس مانا کے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ گندم کے گوندھے ہوئے آٹے کے مناسب سے پیڑے کو ہاتھوں میں خاص مہارت سے پھیلا دیتے ہیں جو نانبائی اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی چابکدستی سے روٹی کو جتنا زیادہ پھیلا کر بڑا اور باریک کر دے اسے ماہر سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس روٹی کو بڑے سے توے پر جسے کہ کپ کہتے ہیں ڈال دیتے ہیں جس کے نیچے کوئلوں کی آگ بھڑکتی ہے۔ اس روٹی کو اتنا زیادہ نہیں پکایا جاتا تاکہ یہ پاپڑ نہ بن جائے بلکہ اس ترکیب سے پکایا جاتا ہے کہ اس میں نرمی رہے پھر اس روٹی کے ٹکڑے کر کے شوربے میں ڈال کر انہیں اچھی طرح نرم کیا جاتا ہے پھر سارے گھر والے اس ٹکڑوں والے شوربے کی پرات کے اردگرد بیٹھ کر یہ کھاتے ہیں۔

مہمانوں کی مہمانداری کے لئے سوبت کا اہتمام خصوصی طور سے کیا جاتا ہے اور مہمان کی قدر و منزلت کی مناسبت سے چھوٹے بڑے گوشت یا مرغیوں سے شوربا تیار کیا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی لذیذ اور مقوی صحت پکوان ہے۔

پیاز پوخ: یہ بھی ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک قدیم اور روایتی پکوان ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ پکوان مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے سے یہاں پر مروج ہوا ہے جو اب تک تسلسل سے چلا آ رہا ہے۔ یہ پکوان زیادہ تر ڈیرہ کی مضافاتی بستیوں اور دیہاتوں میں مروج ہے۔ تاہم شہر میں بھی بعض قدیم گھرانوں میں اس کا رواج موجود ہے۔ یہ باورچی لوگ ہی پیاز سے پکوان تیار کرتے ہیں۔ پیاز کی گڈی کو اچھی طرح صاف کر کے اسے مختلف اطراف سے اوپر سے کاٹ کر اس میں مختلف مصالحہ جات ملا دیئے جاتے ہیں اور پھر دوسرے برتن میں گھی اور مختلف ہلکے مصالحوں سے شوربا تیار کر کے اس میں پیاز ڈال دیتے ہیں جب پیاز کا یہ شوربا تیار ہو جاتا ہے تو روٹی کے ساتھ اسے کھایا جاتا ہے۔ اس پکوان کو نہ صرف بلکہ مقوی صحت غذا میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ مقوی ہونے کے ساتھ ساتھ معدے کے لئے بھی مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے ہاضمینہ بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے استعمال سے کھانے کی خواہش بڑھتی ہے۔

مہمانوں کا کھانا: ڈیرہ شہر ہو یا دیہات یا پھر کوہستانی آبادی سب جگہ مہمانوں کی مہمانداری کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ شہروں میں مخصوص قسم کے پلاؤ پکائے جاتے ہیں اور مرغی کے شوربے سے مہمان نوازی کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں مہمانوں کو ٹھنڈا دودھ پیش کیا جاتا ہے اور مختلف انواع و اقسام کے مشروبات سے تواضع کی جاتی ہے۔ جبکہ پٹھان گھرانوں میں تو مہمانوں کی یکسانیت کی بنیاد پر اس کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ پٹھان روایات کے مطابق اگر مہمان زیادہ ہوں تو ان کے لئے بھیڑ بکری تک ذبح کر کے سالن تیار کیا جاتا ہے۔ ورنہ عموماً مرغی تو خواہ مخواہ ذبح کی جاتی ہے اور میزبان کی کوشش ہوتی ہے کہ مہمان زیادہ سے زیادہ کھانا میزبان کے دسترخوان پر نوش کرے۔ جو مہمان اچھی طرح پیٹ بھر کر اور زیادہ سے زیادہ کھانا میزبان کے دسترخوان پر بیٹھ کر کھائے تو میزبان اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہے۔ ان پٹھان گھرانوں میں مہمانوں کے لئے اپنے اپنے علاقائی روایات کے مطابق چاول بھی پکائے جاتے ہیں۔ شہر ہو یا دیہات مہمانوں کو رات کو سونے سے پہلے دودھ ضرور پلاتے ہیں۔

کوڑی روٹی: یہ ڈیرہ میں میت کے گھر کا تین روز تک کا کھانا ہوتا ہے۔ جب کسی گھرانے میں میت ہو جاتی ہے تو قریبی رشتے دار اکٹھے ہو کر کسی ایک کو کھانا پکوائی کا ذمہ دار ٹھہرا دیتے ہیں۔ وہ شخص تین روز تک دو وقتوں کے کھانے اور ناشتے کا انتظام کرتا ہے۔ کھانا نہایت سادہ ہوتا ہے جو صرف قریبی رشتے دار کھاتے ہیں یا وہ لوگ جو دور دراز سے آئے ہوئے ہوں۔ تیسرے روز شام کے وقت سب قریبی رشتے دار بیٹھ جاتے ہیں اور منتظم سے حساب مانگتے ہیں جتنا خرچہ آیا ہوا سے سب رشتے دار آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ان تین دنوں کے کھانے کو کوڑی روٹی کہتے ہیں۔

چہلم کا کھانا: میت کے چالیسویں روز میت والے گھر پر مرنے والے کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوتی ہے اور پھر دعائے مغفرت کے بعد محفل برخاست ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر میت والے گھر میں زردہ پکایا جاتا ہے اور پھر یہ زردہ قریبی رشتے داروں کے گھروں میں تھوڑا تھوڑا بھیج دیا جاتا ہے۔ مگر میت والے گھر رشتے دار نہیں کھاتے۔

اماموں کا نذرانہ: ڈیرہ میں محرم الحرام کے مہینے میں یکم محرم الحرام سے لے کر دسویں محرم کے دن تک اہل تشیع اور سنی حضرات گھروں میں زردہ پکاتے ہیں اور دودھ منگواتے ہیں۔ کمہاروں کے ہاں سے متعدد چھوٹے چھوٹے مٹی کے بنے ہوئے کپ اور ساتھ پرچ منگواتے ہیں اور پھر پرچوں میں زردہ ڈالتے ہیں اور کپوں میں دودھ ڈال کر اماموں کے نام پر لوگوں میں بانٹتے ہیں۔ یہ ایک قدیم رسم ہے۔

پیشے اور دستکاریاں

سرحد کے دیگر علاقوں کی طرح ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی مختلف پیشوں سے وابستہ لوگ آباد ہیں جن میں کاشتکار، ترکھان، لوہار، کمہار، گلکار، موچی، قصاب اور سنار وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کام ایسے ہیں جو اسی علاقے سے مخصوص ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ٹھٹھار: سرائیکی زبان میں ٹھٹھار مسگری کے پیشے کو کہتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں تانبے اور مس کی دھات سے مختلف اشیاء بنانے کا رواج عام تھا۔ اب بھی یہ کام زندہ ہے اور اس کام کے ہنرمند دستکار گھریلو استعمال کے لئے تانبے اور مس کے گھڑے دیگچے، دیگچی، گلاس، کٹورے، چائے جوش، صراحی، آفتابہ، سینی، ٹرے، تھالیاں اور اس کے علاوہ آرائشی سامان گلدان، سنگھار کی اشیاء تیار کرتے ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں یہ پیشہ اتنا عام تھا کہ اس پیشے کی مناسبت سے ٹھٹھاراں والا گیٹ اب تک مشہور ہے۔ گیٹ کے اندر اس کام کے ہنرمند اور دستکاروں کی دکانیں تھیں۔ بیاہ شادیوں کے موقع پر لڑکی کو جہیز کے سامان میں لوگ تانبے اور مس کے برتن دینا قابل فخر بات سمجھتے تھے۔

کنیراں: سرائیکی زبان میں کنیراں بان سے چارپائی بننے والے کو کہتے ہیں۔ قدیم اور روایتی لوگ اب بھی اپنے گھروں میں یہی چارپائی استعمال کرتے ہیں۔ اس پیشے سے مخصوص لوگ ڈیرہ میں موجود تھے۔ اب بھی یہ پیشہ زندہ ہے۔ یہ پیشہ اتنا عام تھا کہ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے پیشہ ور لوگوں کے نام پر ڈیرہ کا ایک دروازہ کنیراں والا دروازہ مشہور ہے۔ جہاں چارپائی بننے والے پیشہ ور لوگ رہتے تھے۔

کہار: سرائیکی زبان میں کہار ڈولی اٹھانے والے کو کہتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر میکے سے سسرال کے گھر رخصت کیا جاتا تھا۔ چاہے مسافت کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو دلہن کو ڈولی میں ہی رخصت کیا جاتا تھا۔ یہ ڈولی اٹھانے والے مخصوص لوگ ہوتے تھے۔ ڈولی کے آگے پیچھے سنے دو کہار ڈولی کو اٹھاتے تھے یہ خاص پیشہ ور لوگ ہوتے تھے جو نہ صرف ڈولی اٹھاتے تھے بلکہ ڈولی بنانے کا کام بھی جانتے تھے۔ اب بھی ڈیرہ شہر کے قدیم روایات کے پابند لوگ اپنی بچیوں کو ان ڈولیوں میں ہی رخصت کرتے ہیں۔ یہ رواج شہر و دیہات میں برابر تھا اور اب تک ہے۔ اگرچہ زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں نے اسی رواج کو بہت حد تک کم کر دیا ہے اور اب عموماً موٹر گاڑی میں دلہن کو رخصت کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ پیشہ پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ ان کے نام پر بھی ڈیرہ اسماعیل خان میں کہاراں والا گیٹ مشہور ہے۔ جہاں ان پیشہ وروں کی ڈولیاں موجود ہوتیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان ڈولیوں میں کمزور اور مریض لوگوں کو بٹھا کر ہسپتال وغیرہ بھی پہنچایا جاتا تھا خصوصاً ان دیہاتوں میں یہ رواج عام تھا جہاں ہسپتال موجود نہیں ہوتے تھے اور دیہات سے شہروں میں مریضوں کو ان ڈولیوں میں بٹھا کر یا لٹا کر لایا جاتا تھا۔

رنگریز: ڈیرہ اسماعیل خان کے رنگریزوں نے بھی بڑی شہرت حاصل کی جو کپڑوں دوپٹوں اور چادروں وغیرہ پر نہ صرف مختلف قسم کے دیدہ زیب رنگ کرتے ہیں بلکہ ایک ہی کپڑے پر کئی قسم کے رنگ چڑھاتے ہیں اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے بہترین رنگ بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وہ ایک ہی کپڑے پر رنگ برنگ بیل بوٹے اور نمونے بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ڈیرہ شہر مضافات میں ہر جگہ ان رنگریزوں کی دکانیں ہیں۔

جھلار ساز: ڈیرہ اسماعیل خان کے شہر میں اور خصوصاً وہ شہر و دیہات جو کہ دریائے سندھ کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہیں وہاں پانی کی دستیابی وافر ہے۔ مواضعات میں اور زمیندار لوگوں نے اپنی زمینوں کے پاس کنویں کھود رکھے ہیں۔ ان کنوؤں سے پانی نکالنے کے لئے بڑے یا چھوٹے جھلاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ جھلار بنانے والے جھلار ساز چمڑے سے یہ جھلار بناتے ہیں جو کہ گھوڑے کے توبرے کی طرح ہوتے ہیں ان جھلار کے کھلے منہ کے درمیان لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لگا دیتے ہیں اور اس کے درمیان کنویں کی گہرائی کی مناسبت سے مضبوط اور موٹی رسی باندھ دی جاتی ہے۔ رسی کے دوسرے سرے کو چرکی کے درمیان کی لکڑی سے مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے اور پھر اسے کنویں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ جب پانی سے بھر جائے تو چرکی کو چلایا جاتا ہے اور جھلار پانی سے بھرا ہوا باہر نکلتا ہے۔

خواتین کاریگر: ڈیرہ شہر و مضافات میں متعدد خواتین اپنے گھروں میں سلائی کڑھائی کا کام نہایت خوبصورتی کے ساتھ کرتی ہیں۔ شہر اور اس کے مضافات میں کپڑوں، چادروں اور دوپٹوں پر رنگ برنگ کے نمونے بناتی ہیں۔ ڈیرہ کی خواتین اس سلسلے میں بہت شہرت رکھتی ہیں اور یہ ڈیرہ جاتی کام کے نام سے مشہور ہے۔

میراثی: یہ ایک ایسا پیشہ ہے جو کہ بیاہ شادی اور دیگر خوشیوں سے متعلق تقریبات کو دوبالا کرتے ہیں۔ اس پیشہ سے گائیک لوگ منسلک ہیں۔ یہ لوگ مخصوص گھرانوں کے افراد ہوتے ہیں جو آباؤ اجداد سے گائیکی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ڈیرہ کے یہ گائیک بہت مشہور ہیں جو کہ مقامی سطح کے گیت اور گانے گاتے ہیں یہ گانے زیادہ تر سرائیکی زبان میں گائے جاتے ہیں ان کی شرکت کے بغیر خوشیوں کی محفلیں ادھوری ہوتی ہیں۔ عرف عام میں اور انہیں میراثی کہا جاتا ہے۔ اس پیشے سے متعلق بڑے بڑے نامور لوگ گزرے ہیں جن کی اولاد ان کی جانشینی کے منصب پر فائز ہے۔ ہر بڑے گائیک کی اپنی ٹولی ہوتی ہے۔ عہد بہ عہد ارتقائی حالت کے تحت اس پیشے نے بہت ترقی کی ہے۔ یہ مختلف سازوں پر مہارت رکھتے ہیں اور گانے کے لئے جو آلات استعمال کرتے ہیں ان میں ہارمونیم، طبلہ، ڈھولکی، ڈھولک، رباب، اور بانسری۔ انہی گھرانوں کی بہت سی خواتین بھی گانا گاتی ہیں جنہیں عرف عام میں میراثن کہا جاتا ہے۔

سائیکل رکشہ: ڈیرہ شہر اور مضافات میں سائیکل رکشہ کا رواج عام ہے۔ یہ

ایک ایسی سواری ہے۔ جسے انسان کھینچتا ہے۔ پیچھے تقریباً دو آدمیوں کے بیٹھنے اور ان کے سامان کی جگہ ہوتی ہے اور آگے سائیکل جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ موجودہ عہد میں اس قسم کے سائیکل رکشہ کا پیشہ کم ہو گیا ہے۔ البتہ مال برداری کی حد تک اب بھی لوگ سائیکل کے پیچھے گدھا گاڑی نما گاڑی کو کھینچتے ہیں۔

صوفیاء ادبی اور ثقافتی شخصیات

شیخ محمد یوسفؒ: ڈیرہ اسماعیل خان کی آبادی کے شمال کی جانب ایک بستی شیخ یوسف ٹاؤن کے نام سے ہے۔ یہ بستی نقش بندی سلسلہ کے معروف بزرگ ہستی اور صوفی حضرت شیخ محمد یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے نام پر بسائی گئی ہے۔ آپؒ نے 1782ء بمطابق 1202ھ میں وفات پائی اور اسی بستی میں ان کا مزار مبارک ہے۔

پیر کھگلاں والا: ڈیرہ اسماعیل شہر میں مغرب کی جانب ایک مزار ہے۔ جسے دربار کھگلاں والا کے نام سے لوگ منسوب کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں پر کھگل درختوں سے اٹا ہوا ایک جنگل تھا۔ 1820ء میں اس مقام پر ایک روحانی شخصیت کا یہاں ظہور ہوا ان کا نام حضرت پیر سید غلام علی شاہ تھا۔ ابتداء میں لوگ ان کے نام سے ناواقف تھے تو یہ پیر کھگلاں کے نام سے پکارے جانے لگے۔

پتھر فقیر: ڈیرہ اسماعیل خان کی معروف روحانی اور موسیقی کے راگوں پر مکمل عبور رکھنے والی شخصیت پتھر فقیر کے نام سے موسوم ہیں۔ آپ کا نام حافظ حمید اللہ ہے جو کہ نیم مجذوب شخص تھے۔ یہ اصل میں ایک نواب زادہ تھے مگر دنیاوی مال و متاع سے ان کو کوئی شغف نہیں تھا۔ فقیری کو ترجیح دی اور فقیروں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے انہیں قدرتی اور فطری طور پر راگوں اور دھنوں کے بارے میں مکمل واقفیت حاصل تھی اور راگوں اور دھنوں پر مکمل دسترس رکھنے والے راگ نواز اور قوال بھی ان کے سامنے مرد بیچ میدان ثابت ہوتے تھے۔ انہوں نے یہ راگ اور دھن کسی سے بھی نہیں سیکھے تھے۔ یہ قدرتی ودیعت تھی جو انہیں حاصل تھی۔ راگ اور دھنوں کے علاوہ انہیں مختلف اقسام اور رنگوں کے پتھروں سے بھی دلچسپی تھی۔ ڈیرہ کے محلہ قصاباں میں نواب زادہ ہونے کے ناطے ان کی ایک حویلی بہت مشہور ہے۔ جہاں ہر رنگ اور ہر قسم کا قیمتی پتھر استعمال ہوا ہے۔ اسی مناسبت سے یہ پتھر فقیر کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ خود اپنی اس نادر اور منفرد حویلی میں بان کی بنی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹے رہتے جو اسی حویلی کے ایک کچی مٹی کے بنے ہوئے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ وفات کے بعد انہیں پیر کھگلاں والے کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

غلام سکندر خان غلام: نام غلام سکندر خان تخلص 'غلام' 1802ء میں فتح محمد خان کے گھر تحصیل بھکر کے گاؤں سیال میں پیدا ہوئے۔ قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مرثیہ کے ساتھ ساتھ نظمیں اور دوھڑے بھی نظم کئے۔ قصہ ''یوسف زلیخا'' اور ''قصہ گیرو باز'' معروف تصانیف ہیں ان کے تقریباً انتیس (29) مجموعہ ہائے کلام طباعت ہوئے۔ ان مجموعہ ہائے کلام میں سے کچھ ادبی سرائیکی لائبریری بہاولپور میں دستیاب ہیں۔

غلام فقیر: ڈیرہ اسماعیل خان کے معروف گاؤں ڈھکی میں 1820ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام مولنا غلام فقیر تھا۔ انہوں نے سرائیکی کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی شاعری کی۔ بہت سی اصناف کے شعر گو ہیں۔ ان کی معروف و مشہور نظم ''سوال و جواب گھڑا مقبول'' ہوئی۔ انہوں نے 1938ء میں وفات پائی۔

منشی کمال خان سائل: منشی کمال خان ایک باکمال مرثیہ گو شاعر تھے۔ ان کا تعلق موضع تاج گنج نواح بہل (بھکر) سے تھا۔ یہ غلام سکندر خان غلام کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک مجموعہ (کلام) مرثیہ کمال خان بلوچ لشاری کے نام سے 1318ھ میں شائع ہوا۔ انہوں نے 1887ء میں وفات پائی۔

اللہ داد شاہ صفائی: خاص ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق متقدمین کے شعراء میں سے تیرھویں صدی ہجری سے ہے۔ ان کا تخلص صفائی ہے اور ان کے بعض مرثیے سید ذوالفقار علی شاہ ساکن ڈیرہ اسماعیل خان کی بیاض میں موجود ہیں۔

اللہ بخش فدوی: ان کی پیدائش ڈیرہ اسماعیل خان کے مشرق میں 14 میل کے فاصلے پر دریا خان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تھی کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں مقیم ہو گئے۔ فن موسیقی سے بخوبی واقف تھے اور سریلی آواز رکھتے تھے۔ ان کا سارا خاندان ڈیرہ اسماعیل خان میں آباد ہے۔ ان کا تخلص فدوی تھا۔ انہوں نے جو مرثیے نظم کئے ہیں وہ ان کے پوتے واحد بخش خاور کے پاس موجود ہیں۔ ان کے مرثیوں میں قرآن پاک کی آیات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ جس سے کلام میں پختگی اور خوبصورتی اور اثر انگیزی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے کلام میں المیہ رنگ کی ہم آہنگی ہے۔ انہوں نے 1301ء ہجری میں وفات پائی۔

کمترین: ان کا تعلق موضع کلورکوٹ تحصیل بھکر ڈیرہ اسماعیل خان سے تھا۔ سید چراغ حسین شاہ کی بیاض جو 1874ء میں لکھی گئی اس میں کمترین کے اشعار موجود ہیں۔

نواب محمد شاہ نواز خان خادم: ان کا تعلق ضلع ٹانک سے تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان علاقہ کے مشہور و معروف نامور شاعر تھے۔ یہ غلام سکندر غلام، ذوالفقار شیرازی اور فدوی کے ہمعصر تھے۔ 1849ء میں انگریزوں نے انہیں قید کر کے لیہ بھیجا اور پھر وہاں سے لاہور بھیج دیا جہاں نظر بندی کی زندگی گزاری۔ 1299ھ میں وفات پائی۔

سید ذوالفقار شیرازی: ان کا گھرانہ ڈیرہ اسماعیل خان کا باوقار مذہبی گھرانہ تصور کیا جاتا ہے۔ پورے کا پورا گھرانہ مذہبی شاعری سے وابستہ ہے۔ سید ذوالفقار 1815ء میں پیدا ہوئے وہ اپنے منظوم مرثیے خود پڑھتے تھے۔ انہوں نے 1925ء میں وفات پائی۔

مشتاق رضا مشتاق: مشتاق رضا کا شعری تخلص بھی مشتاق ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے صف اول کے ممتاز شعراء میں سے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے 12 میل کے فاصلے پر موضع کھوئیاں میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام شیخ محمد فاضل تھا۔ ساہی خاندان سے تعلق تھا دو منظوم قصے سوہنی مہینوال اور صاحباں مرزا سرائیکی زبان میں تقریباً نصف صدی پہلے کے تصنیف شدہ ہیں۔ علاوہ ازیں دوہڑہ، غزل، کافی، نعت، حمد منظوم کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ شعری ذوق کمال تک پہنچا ہوا تھا عارفانہ کلام بھی منظوم کرتے تھے جو کہ سینہ بہ سینہ لوگوں تک پہنچا۔ 80 سال تک شاعری کی۔ نصیر سرمد سائروی نے اپنی کتاب ''دامان'' میں ان کے بارے میں جو تاثر قائم کیا وہ ان الفاظ کے ساتھ رقم ہوا ''سرائیکی ادب نے مشتاق رضا کو یوں پایا جیسے کوئی دیوانہ اپنے بے پناہ پیار اور لاثانی صلاحیتوں سے پاتا ہے''۔ 1928ء میں انہوں نے وفات پائی۔

ملک نور محمد: ڈیرہ اسماعیل خان کے چاہ پیپل والا مقام کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام ملک نور رنگ تھا۔ پیشے کے لحاظ سے مالی تھے۔ شعری ملکہ خداداد صلاحیت تھی۔ ان کے منظوم کیے ہوئے دوھڑے اور واریں ہیں۔ ان کا تعلق قوم کالو خیل سے تھا۔ شاعری میں تخلص آرائیں لکھتے تھے۔ 110 سال کی عمر میں وفات پائی۔

سید عاشق حسین شیرازی: آپ بھی شیرازی گھرانے کے قادرالکلام مرثیہ گو شاعر تھے۔ سید ذوالفقار علی شاہ شیرازی کے فرزند ارجمند تھے۔ مرثیہ خوانی میں بے مثل شخصیت کے حامل تھے۔ اپنے ہی نظم کیے ہوئے مرثیہ پڑھتے تھے۔ 1869ء میں پیدا ہوئے اور ساٹھ (60) سال کی عمر میں 1929ء میں وفات پائی۔ ان کے کلام کی ایک بیاض موجود ہے۔ محرم الحرام کے عاشورہ میں ڈیرہ کے اکثر مرثیہ خوان و ذاکر حضرات ان کا کلام پڑھتے ہیں۔

نور محمد صاحب قادری کلاچوی: پروفیسر عبدالحئی کے مطابق نور محمد قادری کلاچوی فقیر طبع بزرگ ہیں۔ انہوں نے تصوف کے موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ ان کا تعلق تحصیل کلاچی سے ہے۔ اس لئے ان کے نام کے ساتھ کلاچوی لکھا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت سلطان باہو کے بارے میں بڑے تحقیقی مقالے سپرد قلم کئے ہیں اور متعدد فارسی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے ادبیات کی شرح لکھی اور عرفان کتاب کے نام سے حضرت سلطان باہو کے خیالات کو جمع کیا۔ نور محمد قادری کے بیٹوں نے اپنے والد کے بارے میں بائیوگرافی لکھی ہے جو نہایت اہم کام ہے۔

رسوم و رواج

ڈیرہ اسماعیل خان کے رسوم و رواج جیسے منگنی، شادی، پیدائش اور موت کی رسومات سرحد کے دیگر علاقوں سے مماثل ہیں، کچھ ایسی رسوم جو خاص ڈیرہ سے ہی مخصوص ہیں اور کچھ ایسی رسومات جو یہاں آباد غیر مسلم اقلیتوں میں مروج ہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

باٹن: یہ شادی کی رسومات میں سے ہیں۔

شادی کی تاریخ سے ایک یا دو روز پہلے لڑکے کے گھر والے اپنے قریبی رشتے داروں کے ساتھ جو کہ خواتین پر مشتمل ہوتی ہیں لڑکی کے گھر جاتی ہیں اور ساتھ مہندی گھول کر لے جاتی ہیں یہ ٹولی رات کے وقت لڑکی کو مہندی لگاتی ہے۔ اس رسم والی رات کو مقامی زبان میں ''باٹن'' کہتے ہیں۔ مہندی کی رسم کے بعد لڑکی والی خواتین لڑکے کے گھر واپس آجاتی ہیں۔

زلف کشائی: لڑکی کے گھر میں برادری کی قریبی بزرگ خواتین لڑکی کی مینڈھی کھولتی ہے۔ جسے زلف کشائی کی رسم کہا جاتا ہے۔

رنگ بکھیرنا: بارات والی رات سے ایک رات پہلے لڑکے کے قریبی یار دوست اور برادری کے نوجوان لڑکے کے سر پر ململ کا دوپٹہ ڈال دیتے ہیں اور پھر اس پر مختلف، نیلے

پیلے سرخ اور سبز وغیرہ رنگ کے چھینٹے ڈالتے ہیں جس سے دوپٹہ مختلف رنگوں میں رنگ جاتا ہے اور پھر شادی کی رات تک لڑکے کے سر پر یہی رنگدار دوپٹہ پڑا رہتا ہے۔

ست واڑہ: سسرال کے گھر میں لڑکی کم از کم سات دن تک ٹھہر کر ساتویں روز اپنے میکے جاتی ہے۔ تاہم سات دن سے زیادہ کا بھی قیام ہو جاتا ہے۔ بہر حال جتنے روز بھی سسرال کے قیام کرنے کے بعد پہلی مرتبہ جب لڑکی اپنے میکے جاتی ہے تو اسے مقامی زبان میں ''ست واڑہ'' کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر لڑکی کا خاوند بھی لڑکی کے ساتھ اس کے میکے یعنی اپنے سسرال کے گھر جاتا ہے جو پورے دن وہاں ٹھہرتا ہے۔ لڑکی کے والدین اس نئے جوڑے کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں اور پھر شام کو خاوند اپنی بیوی کو ساتھ لے کر واپس اپنے گھر آ جاتا ہے۔

درج بالا رسومات کے علاوہ منگنی، شادی، ابٹن، سہرا بندی، مہاڑی چھوڑائی، ولیمہ، زچگی، نھانے، عقیقہ، ختنہ اور موت کی رسومات معروف طریقوں کے مطابق ادا کی جاتی ہیں جن کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

پونی: یہ ایک ایسی رسم ہے جو ڈیرہ میں آباد ہندو قوم سے منسوب ہے۔ پونی کی رسم کنواری ہندو لڑکیاں ادا کرتی ہیں۔ جب لوہڑی کے تہوار کا دوسرا دن ہوتا ہے تو اس روز ہندوؤں کی کنواری لڑکیاں مختلف ٹولیاں بنا لیتی ہیں اور پھر سارے شہر میں گھومتی ہیں۔ وہ ہندو گھروں میں جاتی ہیں جہاں بھی کوئی ہندو لڑکا اس روز پیدا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں اسے گود میں لیتی ہیں اور اسے اشیر باد دیتی ہیں۔ ہندو والدین حسب استطاعت ان لڑکیوں کو اپنی طرف سے نقدی پیش کرتے تھے۔ ڈیرہ میں ہندوؤں کی اس رسم نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔

چرخہ بھنڈرا: یہ ایک ایسی رسم ہے جو کہ ہندو لڑکیوں کے چرخہ کاتنے سے منسوب ہے۔ اس رسم نے باقاعدہ طور پر ایک تہوار کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس رسم کے مطابق ہندو لڑکیاں اپنی گلی میں نکل آتی ہیں اور بالمقابل یا برابر والی گلی میں رہنے والی لڑکیوں کے گروہ سے وہ لڑکیاں چرخہ اٹھا لاتی ہیں جن کی چرخہ کاتنے کی باری ہوتی ہے اور پھر مقررہ تاریخ پر سب لڑکیاں چرخہ کاتتی ہیں اس موقع پر لوگ ان ہندو لڑکیوں کو بھنے ہوئے چنے، جوار کے پھلے اور مولی اور گاجر کھانے کے لئے پیش کرتے ہیں۔

ولور: یہ پہاڑی درّوں میں بسنے والے قبائل کی ایک رسم ہے۔ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو والدین لڑکے والوں سے لڑکی کے جہیز کا خرچہ مانگتے ہیں۔ اسے ولور کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً خانہ بدوش قبائل میں مروج ہے۔

البتہ شیرانی قبیلہ جو قدیم طرز حیات میں نہایت کسمپرسی اور غربت و افلاس میں زندگی بسر کرتے وہ عموماً ڈیرہ کے میاں خیلوں کے ہاں ملازمت کرتے اور ان کی خدمت گزاری کے عوض مناسب معاوضہ لیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ ولور کی رسم نہیں ہے بلکہ یہ لوگ جب اپنی لڑکی کی شادی کسی لڑکے سے کرتے ہیں تو دیگر قبائل کے برعکس یہ خود لڑکے والوں کو جہیز تیار کر کے لڑکی کے ساتھ دیتے ہیں۔

عرس میلے اور مجالس

عرس کے معانی دلہن کے ہیں۔ بزرگوں کے مزارات پر عموماً ان کی تاریخ وفات کے دن سے جو تقریبات منعقد ہوتی ہیں انہیں عرس کا نام دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مزارات کو اس طرح سے سجایا جاتا ہے کہ جیسے شادی کے دنوں میں دلہن کو۔ یہ عرس کا سماں بالکل شادی کی طرح ہوتا ہے۔ عقیدت مند دور دراز کی مسافتوں کو طے کر کے ٹولیوں میں بھی اور انفرادی طور پر بھی زیارات کے مقامات تک پہنچتے ہیں اور مزار پر حاضری دیتے ہیں اور تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور مضافات میں بھی متعدد بزرگان دین اور اولیائے کرام کے ایسے مزار ہیں جہاں پر عرس کا اہتمام علاقائی رواج کے مطابق ہوتا ہے۔

میلہ عیسیٰ اقطار: یہ میلہ عیسیٰ اقطار نامی بزرگ کے مزار واقع بمقام بلوٹ، ڈیرہ اسماعیل خان میں لگتا ہے۔ شاہان دہلی کے وقت شاہ عیسیٰ اقطار بلوٹ آئے جہاں راجہ بل کی راجدھانی تھی۔ اس وقت یہاں پر فیسور قوم آباد تھی۔ اس قوم کے لوگوں نے شاہ عیسیٰ اقطار کو فقیر سمجھ کر موضع بلوٹ کی ملکیت گزر اوقات کے لئے بخش دی۔ عیسیٰ اقطار فوت ہوئے تو اسی مقام پر انہیں دفنا دیا گیا بعد میں اسی جگہ پر شاہ عیسیٰ اقطار کی اولاد اور ان کے پیروکاروں نے ایک روضہ بنا دیا جہاں زائرین اور معتقدین دور دراز سے آتے اور حاضری دیتے۔ ہر سال ماہ چیت میں اس جگہ پر بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ یہاں پر عورتیں آ کر جن کھیلتی ہیں اور فقراء دھمال ڈالتے ہیں جبکہ عام زائرین چڑھاوا چڑھاتے اور نذرانہ دیتے ہیں۔

عرس دربار شیخ محمد یوسف: ڈیرہ شہر سے جنوب کی جانب ایک بستی شیخ یوسف ٹاؤن کے نام سے ہے۔ اس مقام پر حضرت شیخ محمد یوسف کا مقبرہ ہے۔ اس مزار کے اردگرد انہی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اخلاف کی قبریں ہیں۔ ان کی وفات 1782ء بمطابق 1202ھ میں ہوئی۔ ہر سال اسلامی مہینے شعبان کی 12 تاریخ کو یہاں پر ایک روزہ عرس کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

عرس پیر کھگلاں والا: ڈیرہ اسماعیل خان کے اندرون شہر ایک مزار ہے۔ یہ پیر سید غلام علی شاہ کا مزار ہے جو کہ اپنے دو ساتھیوں سید لعل شاہ اور پیر سید حسین شاہ کے ہمراہ بخارا سے اپنے پیر و مرشد کے حکم سے کھگل آئے تھے۔ یہ کھگل کے درختوں سے اٹا ہوا جنگل تھا۔ اس مقام پر انہوں نے عبادت و ریاضت کا سلسلہ شروع کیا تو لوگوں کی آمد و رفت ہونے لگی جس کی وجہ سے یہ مقام آباد ہونے لگا اور وہ لوگوں میں پیر کھگلاں والا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ انہوں نے اسی مقام پر وصال کیا تو اسی جگہ پر انہیں دفن کر دیا گیا اور ایک مقبرہ تعمیر ہوا۔

یہاں پر ہر سال 24 ربیع الاول کو دو روزہ عرس کی تقریبات ہوتی ہیں۔ قرآن خوانی کے علاوہ حمد و نعت کی محافل ہوتی ہیں اور قوال حضرات صوفیائے کرام کا عارفانہ کلام پیش کرتے ہیں۔ پشتو اور سرائیکی زبان کے شعراء یہاں عرس کے دنوں میں آتے ہیں اور پشتو اور سرائیکی زبان میں پیر کھگلاں والا کے حضور منقبت کہتے ہیں۔

میلہ بلیچ خیل: موضع پنیالہ جو ڈیرہ اسماعیل خان سے 30 میل شمال کی طرف ہے۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب اور یہاں پر بلیچ خیل قوم کے لوگ آباد ہیں۔ اس خاندان کے بانی حاجی بلیچ فقیر طبع اور بزرگ آدمی تھے۔ ان کا مزار اسی مقام پر ہے۔ ان کے مزار پر بھی میلہ لگتا رہتا ہے۔

مجالس: واقعات کربلا کے حوالے سے ڈیرہ اسماعیل خان کی مختلف امام بارگاہوں میں ہر سال محرم الحرام کی پہلی تاریخ سے عاشورہ کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں جن میں ذاکرین حضرات اور مرثیہ خواں حضرات نہایت دل سوزی اور دلفگاری کے ساتھ یہ مجلسیں پڑھتے ہیں۔ مرثیہ نگار و مرثیہ خواں سرائیکی زبان میں مرثیے اور نوحے پیش کرتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی یہ مجلسیں بہت مشہور ہیں۔ قدیم دور سے لے کر اب تک یہ مجلسیں یکساں انداز سے جاری رہتی ہیں۔

ہندوؤں کے میلے اور تہوار

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ڈیرہ اور مضافات میں ہندوؤں کی آبادیاں تھیں۔

یہاں کثیر تعداد میں ہندوؤں کے مندر تھے۔ ڈیرہ کے ہندو اپنے تہوار اور میلے بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اب بھی جو ہندو یہاں آباد ہیں وہ اپنے میلے اور تہوار اپنے مذہبی عقائد و نظریات کے مطابق مناتے ہیں۔

میلہ بساکھی: یہ میلہ ڈیرہ میں ہندو لوگ 13 اپریل کی شام سے 16 اپریل تک مناتے ہیں۔ یہ چار روزہ میلہ بساکھی کا میلہ کہلاتا ہے۔ جب اس میلے کی پہلی شام آتی تو صبح سویرے ہندو دریا پر اشنان کرنے چلے جاتے تھے اور پھر 13 اپریل کی شام کو بساکھی گراؤنڈ میں سب ہندو جمع ہو جاتے یہ میلہ ہندوؤں کا نہایت اہم میلہ ہوتا تھا اس لئے وہ ہندو جو کہ ڈیرہ سے باہر ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہوتے وہ بھی چھٹیاں لے کر میلے میں حصہ لینے کے لئے چلے آتے۔ اس میلے سے متعلق جو روایت عام ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے اس میلہ بساکھی کے لئے مستقل جگہ کے انتخاب سے پہلے رائے صاحب مہاشہ جیند ھرام وکیل کے باغ میں لگایا جاتا تھا۔ عورتوں کے لئے باغ ستھان گنیش پوری مخصوص جگہ تھی۔ چار روز تک ہندو بڑی خوشی و مسرت کے ہجوم میں یہ میلہ مناتے تھے۔ اس میلے کا دوسرا نام بسنت ہے۔ جس میں پتنگ بازی بھی کی جاتی ہے۔ بسنت کے حوالے سے اب تک پاکستان کے بعض شہروں میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ جس میں پتنگ بازی کی جاتی ہے۔

میلہ دوسہرہ: ڈیرہ میں یہ میلہ بھی ہندو بیساکھی گراؤنڈ میں جمع ہو کر مناتے۔ جمع ہونے سے پہلے ہندو صبح سویرے دریا پر اشنان کرتے اور پھر شام کو بیساکھی گراؤنڈ میں جمع ہو کر راون کو مارنے کی رسم ادا کرتے۔ اس روز ہندو خاندانوں کے (سوائے برہمن اور کھتری کے) بچوں میں سے دو بچوں کو بذریعہ قرعہ اندازی منتخب کر لیا جاتا تھا اور پھر دوسہرہ کے روز شام کے وقت راون کو مارنے کے لئے ہندو لوگ جلوس کی صورت میں ان سروپوں یعنی بچوں کو پالکی میں بٹھا کر بہ ہمراہ راجہ سکرپوٹ کانجکی اور ہندوؤں کی خودساختہ فوج' جنہیں باتنز' بھیڑے کہا جاتا اور ساتھ ہنومان کے (ہنومان ایک ہندو دھرم چند ساکن کوچہ بانگیاں والا ہنومان کی شبیہہ بننے میں مشہور تھا) ریچھ اور گھوڑ سوار و پولیس کے زیر انتظام افسران بالا و پولیس کے بساکھی گراؤنڈ میں جمع ہوتے۔ راون کو مارنے کی رسم ادا ہوتی اور آتش بازی کرتے۔ راون کے مارنے اور آتش بازی کے بعد جلوس توپاں والے بازار سے گزرتا ہوا رات کے دو بجے بھاٹیاں والے بازار کی دکانوں اور مکانوں کے باہر بڑا ہجوم ہوتا۔ دو بجے کے بعد لوگ سردیاں والے مندر میں واپس آ جاتے اور وہاں پر چڑھاوے اور نذرانے دیتے۔

ہولی: اس تہوار میں ہندو ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے تھے اور لوگ پارٹیاں بنا کر باغوں اور دریا پر تہوار مناتے تھے۔

دیوالی: ہندوؤں کا یہ تہوار لکشمی سے منسوب ہے۔ اس موقع پر ہندو لوگ گھروں کو خوب سجاتے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے گھروں میں چراغاں کرتے اور پھر رات کو لکشمی کی پوجا کرتے۔

جم وتیا (ٹکا): ہندوؤں میں یہ تہوار بھی بڑا مشہور تھا اس روز ہندو عورتیں اپنے بھائیوں کو تلک لگایا کرتی تھیں۔

جنم اشٹمی: کرشن کے جنم کا دن منایا جاتا تھا۔ یہ دن تمام ہندوؤں کے مندروں میں منایا جاتا تھا اور پھر ہندو بڑا بھاری جلوس نکالتے تھے۔

نرجلا اکادشی: یہ اکادشی کا میلہ عموماً ماہ جون میں ہوتا تھا۔ ہندو لوگ برہمنوں کو جو اونچی ذات والے لوگ سمجھے جاتے ہیں اپنے مرے ہوئے بزرگوں کے نام پر ان کو گھڑے، پنکھے اور میوے دیا کرتے تھے۔

اس رسم اور تہوار کے حوالے سے مغل بادشاہ شاہجہاں کا یہ جملہ تاریخی نوعیت کا ہے جو اس نے اس تہوار کے حوالے سے اپنے بیٹے اورنگزیب عالمگیر کو کہا تھا کہ بہ بیں ہندورا کہ دائم آب می دہند پدر مردہ را۔

یعنی ہندوؤں کو دیکھو کہ مرے ہوئے باپ اور بزرگوں کو ہمیشہ پانی دیتے ہیں۔

لوہڑی: یہ ہندوؤں کا ایک بڑا تہوار ہے جو اُن کی لوہڑی ماتا کی طرف منسوب ہے۔ 12 جنوری کو ہندو لوگ رات کے وقت اپنی آبادیوں میں بڑی آگ جلایا کرتے تھے اور ہزاروں روپوں کی آتش بازی کرتے تھے۔ ہندو رات کو جلائی ہوئی آگ کے اردگرد بیٹھ جاتے اور اپنے خیالات کا تبادلہ کرتے تھے جبکہ ان کی عورتیں لوہڑی ماتا کے آگے منتیں مانا کرتی تھیں۔

جاگن: جب ہندوؤں کے تہوار لوہڑی کے دن قریب آتے تو ایک ماہ پہلے یہ تہوار مناتے تھے۔ مرد عورتیں بوڑھے اور بچے لوہڑی سے ایک ماہ پہلے ہر ہفتہ وار کو آپس میں دعوتیں دیتے اور مل جل کر دعوتیں کھاتے اور خوشی سے وقت گزارتے۔

پونی: جب لوہڑی تہوار کا دوسرا دن ہوتا تو ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی کنواری لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں ماگھی کے روز سارے شہر میں گھومتیں اور ان ہندو گھروں میں جاتیں جہاں لڑکا پیدا ہوا ہوتا۔ یہ لڑکیاں اس لڑکے کو اشیر باد دیتیں اور لڑکے کے والدین حسب استطاعت ان لڑکیوں کو نقدی پیش کرتے۔

تہوار گورپرب: یہ تہوار ہندو اور سکھ مل کر مناتے تھے۔ یہ تہوار ''گورونانک جی'' اور ''دکلنی دھرشری گورو گوبند سنگھ صاحب جی'' کے جنم دن منانے کی طرف منسوب ہے۔ ہندو اور سکھ مل کر یہ تہوار بڑی دھوم دھام سے ڈیرہ میں مناتے تھے۔ اس روز شہر سے بڑا جلوس نکالا جاتا تھا اور دو دراز سے یاتری 'گرنتھی اور راگی آیا کرتے تھے اور خالصہ دھرمسالہ میں اکٹھے ہوتے اور خوب رونق رہتی۔

تہوار شیوداتری: یہ بھی ہندوؤں کا قابل ذکر تہوار ہے جو شری سوامی دیانند جی سرسوتی کو گیان ملنے کی خوشی سے منسوب ہے۔ شوالہ جوگی والا میں اس روز بڑی رونق رہتی تھی اور آریہ سماج کے مندروں میں بھی یہ تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک اس رات کو شری سوامی دیانند جی سرسوتی کو گیان ہوا تھا۔

چرخہ بھنڈار: ہندو عورتیں اور لڑکیاں اپنی گلی اور آبادیوں میں ہر روز شام کے وقت چرخہ کاتا کرتی تھیں اور لڑکیاں اپنی اپنی باری پر اپنی گلی میں چرخہ بھنڈار کا انتظام کرتی تھیں۔ یہ یوں ہوتا تھا کہ جن لڑکیوں کی چرخہ کاتنے کی باری ہوتی وہ دوسری برابر والی یا بالمقابل والی گلی کی لڑکیوں کے چرخے ان کے گھروں سے اٹھا لاتیں اور مقررہ تاریخ کو گلی میں سب لڑکیاں چرخہ کاتتی تھیں اور پھر آپس میں مقابلے کرتی تھیں۔ لڑکیوں کی آؤ بھگت بھونے ہوئے چنوں' جوار کے پھلوں' مولی اور گاجروں سے ہوا کرتی تھی۔ اس تہوار کو چرخہ بھنڈار کہا جاتا تھا۔

دیویانوالی ایکاوشی: یہ تہوار دیوالی کے بعد منایا جاتا تھا۔ رات ہندو لوگ شہر کے سارے مندروں میں بایا کرتے تھے، وہاں یاترا کرتے اور نذریں اور چڑھاوے دیتے تھے۔ اس تہوار کو ہندو لوگ دیویانوالی ایکاوشی کہتے ہیں۔

روایتی طرزِ تعمیر و آرائش اور رہن سہن

ڈیرہ اسماعیل خان ریجن جو کہ کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے اسی بنا پر اس کا قدیم نام دامان ہے۔ مغرب سے آنے والے پوندے جنہیں غلزئی کے مشترکہ نام سے پہچانا گیا اور پھر غلزئی ہی میں سے مختلف ذیلی شاخیں مختلف ناموں سے متعارف ہوئی ہیں انہوں نے ڈیرہ اور مضافات کے خطوں کو اپنے لئے مستقل قیام گاہ کے لئے منتخب کر لیا اور پھر بتقاضائے زمانہ وہ اپنے اپنے مقبوضات میں تعمیرات کرتی گئیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر صدیوں سے ہندوؤں کا راج رہا اور یہاں ہندوؤں کی بستیاں تھیں جن کی آس پاس کے مسلمان قبائل کے ساتھ جنگوں کا

سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ اپنے مکانات اس طرح تعمیر کرتے تھے کہ دشمنوں کے حملوں سے دفاع کر سکیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کا پٹ: مغربی درّوں سے آنے والے پاوندے جب راستے میں پیش آنے والے سخت حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اور راستے میں حائل قبائل سے لڑتے اور نقصان اٹھاتے ہوئے درّہ گومل کے راستے ڈیرہ اسماعیل خان کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے وہ ایک ایسی وسیع و عریض چراگاہ میں داخل ہوتے ہیں جسے ڈیرہ اسماعیل خان کا پٹ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی چراگاہ کے طور پر صدیوں سے معروف ہے۔ جب پاوندے اس چراگاہ میں داخل ہوتے ہیں تو یہاں پر اپنی قیام گاہ کے طور پر خیمے لگاتے ہیں مگر یہ خیمہ گاہیں ان پاوندوں کے لئے عارضی قیام گاہیں ہوتی ہیں۔ وہ کئی کئی مہینے ان خیموں میں گزارتے ہیں اور یہیں پر ان کے مویشی چرتے۔ یہ ان لوگوں کے لئے بہت بڑی چراگاہ ثابت ہوتی ہے۔ یہی وہ پٹ ہے۔ جہاں پر صدیوں سے ان پاوندوں کے ساتھ آئے ہوئے غلزئی قبائل کی شاخیں آباد ہوتی چلی گئیں۔

کری: وہ قبائل جو کہ اسی پٹ پر نصب کئے ہوئے خیموں میں مستقل طور پر رہتے ہیں مگر یہ قیام گاہیں صرف سردی کے موسم میں ان کے لئے کارآمد ہوتی ہیں۔ ان قبائل کی عورتوں، بچوں اور مویشی کے لئے کارآمد ہوتی ہیں۔ سردی کے موسم کے دوران یہ قبائل کچھ دن یہاں ٹھہر کر خود تجارتی غرض کے تحت قافلوں کے ساتھ دہلی اور پٹنہ چلے جاتے تھے اور پیچھے ان کی عورتیں بچے اور اسلحہ و مویشی رہ جاتے تھے۔ اس قسم کی عارضی خیمہ گاہ کو کری کہا جاتا ہے اور وہ قبائل جو کہ ان خیمہ گاہوں میں رہتے ہیں ان کو کری کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عموماً اپنی ان خیمہ گاہوں میں ہر سال اکتوبر میں آتے اور اپریل میں واپس افغانستان کی طرف چلے جاتے ہیں۔

پہاڑی غار: وہ قبائلی لوگ جو ڈیرہ کے مغرب میں تخت سلیمان کے آس پاس رہتے ہیں یہ لوگ پہاڑوں کی اونچائیوں پر اس طرح مکان بناتے کہ پہاڑ کی کھدائی کر کے حسب ضرورت اپنے لئے مکان بنا لیتے جو پہاڑی غار ہوتا ہے، وہ غار کے سرے پر ایک دروازہ بنا لیتے اور رات کے وقت دروازہ کے سرے پر خاردار درخت کی شاخ رکھ کر گھر کو محفوظ بنا لیتے۔ یہ لوگ بھی صرف سردیوں کے موسم میں یہاں اپنی اپنی کمین گاہوں میں آتے۔

بھٹانیوں کے گھر: ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک بھٹانی قبیلہ بہت مشہور ہے۔ اگرچہ اب یہ لوگ متمدن کہلاتے ہیں تاہم زمانہ ماضی میں بلکہ انگریزوں کے دور تک ان کے رہن سہن سادہ اور قبائلی طرز زندگی رہی ہے۔ ان کے گاؤں کچے مکانات پر مشتمل ہوتے ہیں جو کہ گھاس پھوس اور مٹی کے چھپر تھے۔ یہ مکانات انہوں نے پتھریلی اور غیر نمو زمین پر تعمیر کئے تھے۔

اندر کوٹ: یہ بھی قدیم مکانات کی تعمیر کا ایک طریقہ تھا۔ اردگرد کے قبائلی لوگوں کے جنگجویانہ خصائل کے پیش نظر مقامی لوگ اپنی حفاظت کے لئے ایسے کچے مکانات تعمیر کرواتے تھے کہ مکانوں کے چار اطراف ایک فصیل کھڑی کر دیتے تھے اور اس فصیل کے مختلف مقامات پر یا گھر کے عین وسط میں مورچہ بنا لیتے تھے تاکہ قبائلی حملوں اور ڈاکوؤں کے خطروں سے محفوظ رہا جا سکے۔ اس قسم کے زیادہ تر مکانات موضع پہاڑ پور میں ہندوؤں نے بنا رکھے تھے۔ یہ پوندوں کی تجارتی منڈی کی وجہ سے مشہور قصبہ ہے جو کہ ڈیرہ سے شمال مشرق کی جانب 21 میل کے فاصلے پر سرسبز شاداب زمینوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ آس پاس میں وزیر محسود قبائلی رہتے تھے اور ہر وقت ان کی طرف سے حملوں اور ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا اس لئے ہندوؤں نے اس قسم کے مکانات تعمیر کر رکھے تھے۔ ان مکانات کو اندر کوٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ فصیل کے اندر مورچوں والے مکانات۔

عام دیہاتی رہائش گاہیں: ڈیرہ اسماعیل خان کے مضافات میں اب بھی متعدد کچے مکانات ہیں۔ مٹی اور گارے سے بنے ان مکانات کی دیواریں زیادہ سے زیادہ سات آٹھ فٹ کی ہیں۔ مکانات کے اوپر متعدد مورچے بنائے گئے ہیں۔ دیواروں میں چوبی دروازے ہیں اور چھتیں درخت کی لکڑی سے ڈھانپی گئی ہیں جن پر خس یا پھر چٹائی رکھ کر کیچڑ اور گارے سے لیپ دی گئی ہیں۔ چھتوں کے نیچے باہر کی سطح کو تین یا چار درختوں کی بڑی بڑی گیلیوں کے پائے رکھے گئے ہیں جو کہ کمروں اور صحن کے درمیان برآمدے کا کام کرتے ہیں۔ ان برآمدوں کے اندر پھر دو یا تین کمرے بنائے گئے ہیں اکثر گھروں کے نکر پر مال مویشی کے لئے چھپر ڈال دیئے گئے ہیں جہاں ان کے مال مویشیوں کے لئے جگہ مخصوص ہے۔ تقریباً ہر گاؤں میں گھر کی چار دیواری کے اندر ایک نکر پر تنوری ہوتی ہے۔ جہاں خواتین روٹیاں پکاتی ہیں۔ کمروں میں چارپائیاں جبکہ دلہن کے لئے مخصوص انداز کے بنے ہوئے پلنگ ہوتے ہیں۔ قدیم گھرانوں میں یہ پلنگ نہایت سادہ ہوتے ہیں جن کے پائیوں کو رنگوں سے رنگ دیا گیا ہوتا ہے۔ یا پھر ان پر بیل بوٹوں سے نقش کاری کی گئی ہوتی ہے۔ ان قدیم طرز کے مکانات کے کمروں میں ہوا کے لئے دیسی قسم کی کھڑکیاں

رکھی جاتی ہیں۔ بعض کھڑکیوں میں لکڑی کی بنی ہوئی چوکھٹ ہوتی ہے اور دو چھوٹے چھوٹے دروازے ہوتے ہیں، بعض کو ویسے ہی کھلا چھوڑ دیا ہوتا ہے۔

گاؤں کے بڑے لوگوں کے مکانات اگرچہ کچے ہوتے ہیں مگر وہ نسبتاً بہتر طرح سے بنے ہوتے ہیں جہاں مہمانوں کے لئے حجرے یا بیٹھک بنائی گئی ہوتی ہے۔

تقریباً ہر گھر میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز اور دو چار لکڑی کی بنی ہوئی کرسیاں ہوتی ہیں۔ جب مہمان آ جائیں تو انہیں کرسیوں پر بٹھایا جاتا ہے اور تواضع کی اشیاء میز پر رکھی جاتی ہیں۔ اب دیہات میں بعض ایسے بھی مکانات تعمیر ہو چکے ہیں جو پکے ہیں۔ چھتیں لنٹر کی بنائی گئی ہیں اور دیواریں پکی اینٹوں کی ہیں جن پر سیمنٹ کا پلستر کیا گیا ہے۔ یہ بڑے لوگوں کے مکانات ہوتے ہیں اکثر دیہاتی مکانات کے اندر درخت بھی لگائے گئے ہیں۔ ان میں کھجور اور آم کے درخت زیادہ ہوتے ہیں۔

بعض گھروں کے اندر کنویں بھی کھودے ہوئے ہیں تاکہ پانی کی عدم دستیابی کی شکایت نہ ہو۔ زیادہ تر دیہاتی مکانات ایک ہی منزل کے ہوتے ہیں تاہم اب ایسے مکانات بھی تعمیر ہو رہے ہیں جو کہ دو دو اور تین تین منزلوں کے ہیں۔

شہری مکانات: ڈیرہ اسماعیل خان کی شہری آبادی ڈیرہ کے قدیم بنے ہوئے دروازوں کے اندر ہے یہ ڈیرہ کی شہری آبادی ہے جسے دوسری بار نواب شیر محمد خان سدوزئی نے تعمیر کیا۔ کیونکہ ماقبل ڈیرہ شہر دریا برد ہو گیا تھا جسے سہراب خان بلوچ ہوت نے آباد کیا تھا چنانچہ یہ ساری آبادی ڈیرہ کے بڑے بڑے دروازوں کے اندر تھی۔ ان دروازوں کی تعمیر مغل فن تعمیر کے مطابق کی گئی تھی۔ ان دروازوں کے اندر مختلف محلے اور گلیاں تعمیر ہوئیں اور ان کی حد بندی کی گئی۔ ان حد بندیوں کے اندر ڈیرہ کے لوگوں نے تعمیرات کیں اس وقت ڈیرہ کی یہ گلیاں مناسب کشادہ ہیں اور ڈیرہ کے قدیم رہائشی لوگوں کے یہاں ان گلیوں کے اندر مکانات ہیں۔ قدیم مکانات جو تعمیر کئے گئے ہیں یہ زیادہ تر دو منزلہ مکان ہیں۔ اب بھی ان قدیم مکانات میں سے متعدد موجود ہیں۔

چوگلیا: ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے مغربی سرے پر نواب شیر محمد خان سدوزئی نے ایک ایسی ثقافتی اور تاریخی تعمیر کی ہے جو کہ ڈیرہ کی تاریخی اور ثقافتی تعمیر کا ایک زندہ نشان ہے۔ یہ پوندہ بازار کے مشرق کی جانب عین اس مقام پر ہے۔ جہاں شہر کے تمام بازار آ کر مل جاتے ہیں یعنی یہ عمارت شہر کے بازاروں کا ایک سنگم ہے۔ یہ ایک ایسی یادگار عمارت ہے۔ جس کے نیچے چاروں کونوں میں پکی اینٹوں کے مضبوط پائے ہیں۔ کافی اونچائی پر ان پائیوں کے اوپر ایک منزلہ کمرہ نما عمارت کھڑی کی گئی ہے جو مربع شکل کی ہے۔ چاروں اطراف میں آہنی دروازے بنائے گئے تھے جو کہ شام کے بعد بند کر دیئے جاتے تھے اور اس طرح شہر کے ہر بازار کو دونوں اطراف سے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ اب اس عمارت کے بالائی کمرے میں پولیس چوکی بنا دی گئی جسے کوتوالی کہتے ہیں یہ قدیم دروازے اس چوگلیا عمارت کے نیچے اب تک موجود ہیں۔

نوابوں کی حویلیاں: ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ کے مضافاتی علاقوں کو جب انگریزوں نے اپنی مقبوضات میں شامل کیا تو حکومت برطانیہ کو یہاں پر انتظامی امور چلانے کے لئے یہاں کے لوگوں کی سیاسی اور انتظامی میدان میں خدمات درکار ہوئیں۔ جو لوگ اُن کی توقعات پر پورے اترے انہوں نے انہیں جاگیریں بخشیں اور نوابوں کے خطابات سے نوازا۔ اس سے پہلے درانی شہزادوں کے دور میں بھی یہاں کی بااثر شخصیات نے درانی حکومت کے ماتحت رہ کر جو انتظامی امور انجام دیئے اس بنا پر بھی اس وقت کی حکومت نے یہاں کی بااثر شخصیات کو نواب کا خطاب دیا اور جاگیریں دیں۔ ان نوابوں نے اپنے اپنے حلقوں اور خطوں میں عالیشان حویلیاں تعمیر کروائیں خصوصاً ضلع ٹانک کے نوابوں کی حویلیوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ان کی حویلیوں کی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔

اس سلسلے میں تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب قدیم ڈیرہ کی بنیاد سہراب خان بلوچ نے اپنے بیٹے اسماعیل خان کے نام پر رکھی تو اسماعیل خان بلوچ نے شہر میں اپنی بعض حویلیاں تعمیر کروائیں اور اس تعمیر کے لئے اس نے حویلیوں کی آرائش و زیبائش کے لئے ہندوستان سے مغل کاریگروں کو بلوایا جنہوں نے محلات و حویلیوں کی آرائش و زیبائش میں شیشے کا کام کیا اور نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنے ماہرانہ فن کا مظاہرہ کیا۔ غرضیکہ یہ محلات اور حویلیاں مغل فن و آرٹ کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔ یہ ایسے شیشہ گری کے فن کے ماہر پیشہ ور اور دستکار لوگ تھے جنہوں نے اس سرزمین کو اپنے کسب و ہنر کے لئے مفید سمجھا اور وہ پھر اسی سرزمین سے وابستہ ہو گئے۔ تب سے لے کر اب تک فن شیشہ گری ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک عظیم فن سمجھا جاتا ہے۔

پتھر فقیر حویلی: ڈیرہ اسماعیل خان کے محلہ قصاباں، قصور یہ سٹریٹ میں مغل فن تعمیر کا یہ ایک شاہکار ہے۔ اس کا دوسرا نام رنگ محل بھی ہے۔ جبکہ بعض لوگوں میں یہ شیش محل کے نام سے بھی معروف ہے۔ یہ حویلی یہاں کے ایک نواب زادہ حافظ حمید اللہ کی ہے جو کہ پتھر فقیر کے نام سے لوگوں میں معروف ہوئے۔ انہیں مختلف پتھروں کے ساتھ بے حد لگاؤ تھا۔ اس حویلی میں تقریباً ہر قسم کا قیمتی پتھر استعمال ہوا ہے اور

دیواروں پر شیشہ کاری نہایت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ اس عمارت کی دیواریں دو سے چار فٹ چوڑی ساٹھ فٹ اونچی اور آٹھ سے نو فٹ گہرائی میں ہیں۔ اس حویلی کا رقبہ چار کنال اراضی پر مشتمل ہے۔

حویلی نواب احمد نواز خان سدوزئی: نواب احمد نواز خان نواب اللہ داد خان کے بیٹے تھے اور حکومت برطانیہ کے وائسرائے و گورنر جنرل ہند کی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ ڈیرہ میں ان کی حویلی بڑی مشہور ہے۔ 1938ء میں جب مہاتما گاندھی ڈیرہ آئے تو اس حویلی میں قیام کیا۔

قلعہ جات: ڈیرہ اسماعیل خان کے شہر اور گردونواح میں متعدد قلعے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض قلعے ہندوؤں کے دور کے ہیں، بعض سکھوں کے اور بعض انگریزوں کے دور کے۔

قلعہ راجہ بل (بلوٹ): جب ڈیرہ اسماعیل خان کی بنیاد نہیں رکھی گئی تھی تو اس وقت یہ علاقہ دامان کے نام سے موسوم تھا اور یہاں پر ہندو راجاؤں کا راج تھا۔ جس وقت مسلمان غزنی سے یہاں آئے تو یہاں پر راجہ بل کی حکومت تھی جس نے اپنے لئے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کروایا تھا جسے بلوٹ کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ بل اوٹ ہے۔ اوٹ کا مطلب قلعہ ہے۔ چونکہ یہ قلعہ راجہ بل نے تعمیر کروایا تھا اس لئے اس کے نام کی اضافت سے اسے بلوٹ کہا گیا۔ یعنی بل کا قلعہ جو بعد میں قلعہ کے تکرار سے قلعہ بلوٹ ہو گیا یہ نہایت عالیشان قلعہ تھا جو کہ دفاعی حکمت عملی کے تحت تعمیر کروایا گیا تھا۔

قلعہ ٹل: یہ قلعہ ہندو راجہ ٹل سے منسوب ہے جو موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا جو کہ موجودہ موضع ملی خیل (چشمہ) کے نزدیک دریائے سندھ پر واقع ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جو اب کافر کوٹ کے نام سے موسوم ہے۔ اس سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہندوؤں کا ایک متبرک تالاب بھی ہے۔ جسے رام کنڈ کہا جاتا ہے۔ یہ تالاب اس قسم کے پتھروں سے بنا ہوا تھا جو کہ ہندوؤں کے بعض عالیشان مندروں میں نصب تھا۔ قلعہ ٹل کے اندر بھی کئی تالاب تھے۔ راجہ کے زمانے میں ان تالابوں کو دریائے سندھ کے پانی سے جھلاروں کے ذریعے بھر دیا جاتا تھا۔ یہ تالاب کا پانی قلعہ میں تعینات فوج کی آبنوشی اور دیگر ضروریات کے کام آتا تھا۔ یہ قلعہ بھی نہایت مضبوط اور رنگ آمیز تھا۔

قلعہ لکھی کوٹ: یہ ڈیرہ اسماعیل خان ریجن کے بڑے ضلع ٹانک کے ایک قصبہ میں واقع تھا۔ یہاں پر راجہ لکھی کی راجدھانی تھی۔ اس نے یہاں پر قلعہ تعمیر کروایا جو اس کے نام سے قلعہ لکھی کوٹ مشہور ہوا۔ یہ قصبہ شہر ٹانک کے مغرب کی طرف تھا یہ قصبہ بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ یعنی قصبہ قلعہ لکھی کوٹ۔ اس قلعے کے کچھ نشانات باقی ہیں۔ آثار قدیمہ والوں کو اسی مقام سے بعض ایسے سکے ملے ہیں جن پر گھوڑے کی تصویر کندہ ہے۔ ہندو لوگ ان سکوں کو راجہ رام چندر جی کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں اور بعض ہندو راجہ بھرتہ کے زمانہ کے بتلاتے ہیں۔

قلعہ اکال گڑھ (اقبال قلعہ):

یہ قلعہ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے شمال مغرب کی جانب براستہ ٹانک واقع ہے جو شہر کے لئے دفاعی نقطۂ نظر سے کنور نونہال سنگھ نے اپنے دور حکومت 1836ء میں بنایا تھا اور اس قلعہ میں سکھ فوج کو تعینات کر دیا۔ اس قلعہ کا نام اب بدل کر اقبال قلعہ رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایک مضبوط فصیل کے اندر بنایا ہوا قلعہ ہے جو کہ ڈیرہ شہر کی حدود میں ہے۔ یہ قلعہ صوبہ سرحد کے مشہور قلعوں میں شمار ہوتا ہے۔

کوٹھی در پدی: کافر کوٹ دو ہیں ایک کافر کوٹ بلوٹ کے نزدیک اور دوسرا ملی خیل (چشمہ) کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے پر دوسرے کافر کوٹ قلعہ ٹل میں ہے۔ یہ شمالی کافر کوٹ ہے۔ جب چانڈیا کو جلاوطن کر دیا گیا تو وہ یہاں آ کر مقیم ہو گیا اور پھر دریا کے کنارے در پدی کے لئے ایک عالیشان کوٹھی بنوائی جہاں وہ پوجا پاٹ کرتی تھی۔ کافر کوٹ کو اس عہد کے لوگ دیوتاؤں کا کوٹ بھی کہتے تھے۔

کنویں: ڈیرہ اسماعیل خان شہر اور مضافات میں متعدد کنویں ہیں۔ کنوؤں کے پنگھٹ پر ڈیرہ کی دوشیزاؤں کی کئی رومانوی داستانوں نے جنم لیا ہے۔ جنہیں شعراء نے اپنے کلام میں بھی منظوم کیا ہے۔ ڈیرہ کے شمال مشرق کی جانب واقع موضع پہاڑ پور میں بے شمار کنویں ہیں جو کہ وہاں کے لوگوں کی آب نوشی اور دیگر ضروریات کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

ہندوؤں کے محلوں کے کنویں: ڈیرہ میں ہندوؤں نے جن محلوں میں اپنے لئے گھر بنوائے تو ساتھ ہی محلے کی ہر گلی میں کنویں کھدوائے۔ اس کے علاوہ جب ہندوؤں نے پکے مکانات اور عالیشان بنانا شروع کئے تو شہر کے باہر سرکلر روڈ کے ساتھ ساتھ بھی انہوں نے متعدد کنویں بنوائے اور ساتھ ہی باغات بھی لگائے۔

بھاٹیہ کا کنواں: یہ ایک تاریخی نوعیت کا کنواں ہے۔ جسے رائے بہادر جیسا رام بھاٹیہ نے کھدوایا تھا اور اسے پکی اینٹوں سے مضبوط تعمیر کروایا۔

چاہات دروازہ مسگراں: یہاں متعدد کنویں کھدوائے گئے زیادہ تر کنویں ہندوؤں نے بنوائے تھے۔ یہ کنویں مختلف ناموں کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔

چاہ نزد تھلہ بابورام: یہ کنواں بابورام ہندو نے بنوایا تھا۔ یہ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔

اندرون شہر کنویں: ڈیرہ کے اندرون شہر بھی متعدد کنویں تھے۔ ان میں سے بہت سے کنویں اب ناپید ہو چکے ہیں۔ تاہم جن کنوؤں کے بارے میں معلومات دستیاب ہو سکی ہیں وہ یہ ہیں:

چاہ محلہ بھاٹیاں' چاہ اندرون دروازہ بھٹیاں' چاہات بگایاں والے' چاہ بارا چانکی داس' چاہ باداشوتی داس' چاہ دھرمسالہ خالصہ' چاہ ملک شودیال' چاہ بھراتری سکول' چاہ ملکاں والا' چاہ محلہ جوگیاں۔

دروازہ کچہری والا کے کنوئیں:

دروازہ کچہری والا کے چاہات نے بھی بڑی شہرت حاصل کی۔ ان میں چاہ لالہ جوکھا تندسجدیو' چاہ شرائکی' چاہ بالمقابل کمپنی باغ۔

کنوئیں دروازہ پوندہ والا: برلب سڑک ٹانک کنوئیں مشہور ہوئے ان میں دروازہ پوندہ والا کے کنویں ہیں۔ یہ کنویں بھی زیادہ تر ہندوؤں نے بنوائے تھے اور انہی کے نام سے موسوم ہیں۔ چاہ دیوی داس' چاہ فتح چند' چاہ سیٹھ جھانگی رام' چاہ سیٹھ دولی چند' چاہ سیٹھ نرائن' چاہ لالہ پنوں' چاہ لالہ چندہ رام۔

اس کے علاوہ بنوں روڈ پر بھی متعدد بنے ہوئے کنوؤں کے بارے میں معلومات دستیاب ہوئی ہیں جبکہ ہندوؤں کے مندروں اور دھرمسالہ میں بھی کنویں بنوائے گئے۔ مسلمان جب اس طرف آئے تو انہوں نے مساجد تعمیر کروائیں تو تقریباً ہر قدیم مسجد میں کنواں کھدوایا گیا۔

علاوہ ازیں جو باغات تعمیر ہوئے ہیں ان باغات میں بھی کنویں تعمیر ہوئے ہیں جبکہ قدیم آبادیوں میں لوگوں نے اپنے گھروں میں بھی اسی نوعیت کے کنویں کھدوا رکھے تھے اور ڈیرہ شہر سے باہر اور اندر کئی مخیر مسلمانوں نے مفاد عامہ کی خاطر ایسے کنویں بنوائے جن کی پنگھٹ کے گرداگرد ببیل کے پھولوں کے پودے لگوائے۔

اہم سرائیں: ڈیرہ اسماعیل خان و مضافات میں قدیم تعمیرات میں سراؤں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈیرہ کے علاقے سے تعلق رکھنے والی ان سراؤں کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کی سرائیکی زبان کے بارے میں اس رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سرائیکی زبان کی تخلیق بھی ان سراؤں کے مرہون منت ہے اور ان سراؤں کی نسبت سے ہی اس زبان کو سرائے کی زبان کہا جاتا ہے۔

سرائے پوندگان: یہ سرائے سب سے بڑی تجارتی مقاصد کے لئے استعمال ہونے والی قدیم سرائے ہے۔ پوندہ قافلے سامان تجارت لے کر یہاں ٹھہرتے اسی وجہ سے اس کا نام سرائے پوندگان ہے۔ چونکہ یہ سب سے بڑی سرائے ہے۔ اسی لئے انگریز جب آئے تو انہوں نے اس سرائے کو ''کنگ منڈی'' کا نام دیا۔ یہ شہر کے مغرب کی طرف ہے۔ جہاں پوندہ گیٹ ہے۔ چونکہ پوندہ لوگ اسی راستے سے سامان تجارت لے کر شہر میں داخل ہوتے اس لئے اس گیٹ کا نام بھی انہی پوندوں سے منسوب ہے۔

سرائے غلہ منڈی: یہ سرائے غلہ منڈی' سرائے پوندہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ سرائے سٹی تھانہ پولیس کے نزدیک واقع تھی۔ یہاں پر میونسپل کمیٹی کی طرف سے ہر سال تھڑے فروخت ہوتے۔ یہ سرائے مقامی علاقوں کی اجناس کے خرید و فروخت کے لئے مشہور تھی۔

سرائے خربوزہ اور کھجور: یہ سرائے یہاں پر تیسرے نمبر کی سرائے تھی۔ یہ بھی مقامی ضروریات کی تکمیل کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ سرائے سٹی کوتوالی کے سامنے بنی ہوئی ہے۔ یہاں دامان اور کچے کا خربوزہ پنیالہ اور پہاڑپور کی کھجور اور کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائیاں' چنگیریں' پنکھے' رنگدار باسکٹ' ٹرے' پلیٹیں' چارپائی کا بان' لکڑی کے پاوے' اور پائیوں کی خرید و فروخت اسی سرائے میں ہوتی تھی۔

سرائے بھوسہ: دروازہ مسگراں سے باہر مشن کمپونڈ اور جیل خانہ کی دیوار کے نزدیک یہ سرائے تھی جہاں لوگ بھوسہ اور جلانے کی لکڑی لا کر فروخت کرتے تھے۔

ان معروف و مشہور سراؤں کے علاوہ کئی متعدد ایسی بھی سرائیں تھیں جو کہ یہاں کے مسلمان اور ہندو تاجروں نے اپنے طور سے بنوائیں تھیں اور ان سراؤں میں کوٹھیاں بنائی ہوئی تھیں جو کہ یہاں کے ہر تاجر کے نام پر مشہور ہوتیں۔

مندر

کافر کوٹ کے مندر: مسلمانوں کی آمد سے پہلے ڈیرہ اور نواح میں ہندوؤں کی راجدھانیاں تھیں۔ بعد میں جب مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ہندو اور مسلمان مل کر رہنے لگے اور جب ڈیرہ کی بنیاد رکھی گئی تو ہندوؤں کے لئے ان کی رہائشی بستیوں کی تعمیر کے لئے جگہ مخصوص کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کا اس خطے میں قدیم اثر تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے ہندوؤں نے اپنی عبادت گاہیں جگہ جگہ تعمیر کیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی شہادت موجودہ دور کے کافر کوٹ کے نشانات ہیں۔ یہاں پر ہندوؤں کے مندر تھے۔ جب محمود غزنوی سومنات پر حملہ آور ہونے کے لئے اس طرف آیا تو اس کا اس جانب سے ہندوستان پر یہ چودھواں حملہ تھا۔ اسی لئے وہ مقام اب بھی چودھواں کہلاتا ہے۔ یہ مقام تاریخ میں کافر کوٹ کہلاتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب ہندوؤں کی اکثریت یہاں سے ہندوستان منتقل ہو گئی تو ان میں سے بہت سے مندر ویران ہو گئے۔ دستیاب معلومات کے مطابق درج ذیل مندروں کی تعمیر کے خط و خال اب بھی ملتے ہیں۔

مندر رام جی والا: ڈیرہ میں ایک محلہ ہے۔ جہاں ایک کوچہ رام جی والا کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی وجہ شہرت ہندوؤں کے مندر کی تعمیر ہے۔ جس کا نام مندر رام جی والا تھا۔ اسی مندر کی مناسبت سے اس کا نام کوچہ رام جی والا پڑ گیا۔ یہ کوچہ محلہ دیوان صاحب میں واقع ہے کہا جاتا ہے کہ یہ مندر 1825ء میں دو مشہور ہندو پنڈت شودیال اور پنڈت لوڑ بند چند کے باپ نے بنوایا تھا۔

مندر سروپاں والا: ڈیرہ اسماعیل خان شہر میں یہ مندر لعل شاہ سے پوترہ ہندو کے تین لڑکوں نے باپ کی وصیت کے مطابق بنوایا تھا۔ یہ کوچہ رام جی محلہ دیوان صاحب میں ہندو آبادی کے عین وسط میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مندر کے ساتھ ایک کنواں بھی تعمیر کروایا گیا تھا۔

مندر مونموہن جی: یہ مندر محلہ دیوان صاحب میں کوچہ سیٹھ ولبھداس مرچندہ کے سامنے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مندر میں مونموہن جی کی مورتی رکھی گئی تھی۔ اس مندر میں سیڑھیوں والا کنواں بھی تھا۔ مندر کی عمارت جب بوسیدہ ہو گئی تو اس کی دوبارہ تعمیر رام چند جی کھانیجو نے کی۔ اس کا فرش سنگ مرمر سے بنوایا اور بیچ میں ایک تالاب اور تالاب میں فوارہ بھی لگوایا۔

ان کے علاوہ درج ذیل مندر معروف تھے، مندر کو سائیں متھرا ناتھ جی، مندر سکھدھام، مندر شری گورد ھن ناتھ جی، مندر ولبھ داس جی سیوادان، مندر شری لکشمی نارائن، مندر رگھوناتھ جی، مندر شری نندرام جی، مندر بھلاخی چند، مندر گوپی ناتھ، مندر باوا جانگی داس، مندر کالی باڑی یا کالی دیوی، مندر دریا صاحب (امر لال)، مندر پنڈت جیٹھانند جی، مندر سناتن دھرم سبھا، مندر سناتن دھرم رام منڈلی۔

مساجد

جب مسلمان اس علاقہ میں داخل ہوئے تو ڈیرہ اسماعیل خان اور مضافات میں جگہ جگہ مساجد تعمیر کیں۔ ابتدائی عہد میں یہ مساجد کچی بنائی گئی تھیں۔ بعض جگہوں پر کچی چار دیواری کی گئی اور ایک برآمدہ اور برآمدے کے اندر چھوٹی سی کوٹھڑی بنا کر عین وسط میں محراب بنائے گئے اور اوپر لکڑی کے ڈالے جوڑ کر اور ان پر خشک گھاس اور خس ڈال کر مٹی سے لیپائی کر کے چھپر بنائے گئے بعد ازاں ڈیرہ اسماعیل خان کے شہری علاقوں اور محلوں حتی کہ دیہات میں بھی مساجد کی از سر نو تعمیرات عہد حاضر کی تعمیرات کے عین مطابق ہوئیں۔ ہر مسجد کے اوپر دائیں بائیں عظیم الشان اور طویل مینارے بنائے گئے اور وسط میں دلکش اور بڑی جسامت والے گنبد تعمیر کئے گئے۔ اعلیٰ اور بہترین قسم کے چوبی دروازے اور کھڑکیاں تعمیر ہوئیں۔ سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر کے فرش بنائے گئے اور دیواروں پر نقش و نگاری کی گئی۔ ڈیرہ کی بعض قدیم اور تاریخی مساجد یہ ہیں :

مسجد مولوی احمد صاحب: ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے اندر چوک سیٹھ اشرق کے مقام پر یہ ایک قدیم طرز کی بنی ہوئی تاریخی مسجد ہے۔ اس مسجد کی چھت چوبی تختوں سے مزین ہے۔ مسجد کی دیواریں اور محراب قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ اس مسجد کے اندرونی حصہ کے باہر نو عدد چوبی دروازے ہیں دروازوں کے اوپر مغل تعمیرات کے مطابق محرابیں بنا کر رنگدار شیشے لگائے گئے ہیں۔ اس سے باہر تقریباً 8یا9فٹ کا برآمدہ ہے جو ستونوں کے سہارے بنایا گیا ہے۔ اس مسجد کے امام کا نام مولوی احمد تھا اس لئے یہ مسجد بھی انہی کے نام سے موسوم ہو گئی ہے جن کی وفات کا عرصہ بموجب بیان نصیر سرمد سو سال (100) سے اوپر کا ہے۔ مسجد کی چھت پر ڈیرے کے فن گل کاری کے مطابق کام کیا گیا ہے جو بڑا نفیس اور ہنر مندی پر مبنی ہے۔ سرخ، پیلا اور سبز رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ محراب کے اوپر بھی پرانی طرز کی تعمیر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ مسجد کے بیرونی دروازے کے اندر دائیں طرف ایک کنواں

تعمیر کیا گیا تھا۔

مسجد لاٹو فقیر والی: ڈیرہ شہر کے اندرون میں یہ ایک قدیم مسجد ہے۔ یہ نہایت عالیشان مسجد ہے جو کہ اہل تشیع حضرات کی تعمیر کردہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر ایک فقیر کا تھلہ تھا جو اکثر لاٹو گھماتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اسے لوگ لاٹو فقیر کہتے تھے۔ اس کی وفات کے بعد اس مقام پر شیعہ مسلک کے لوگوں نے عالیشان مسجد کی تعمیر کی اس مسجد کے اوپر تین عالیشان گنبد بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے ایک حصہ میں امام باڑہ بھی تعمیر کر دیا گیا ہے۔ یہاں پر اب ایک پرائمری سکول بھی ہے۔

مسجد آستانہ شیخ محمد یوسف: ڈیرہ شہر کے باہر شمال کی جانب بستی شیخ محمد یوسف میں ایک چھوٹی سی مگر نہایت قدیم طرز کی بنی ہوئی تاریخی مسجد ہے جو کہ احاطہ مزار شیخ محمد یوسف کے ساتھ تعمیر کی گئی ہے۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں حضرت شیخ محمد یوسف کی چلہ گاہ تھی اور انہوں نے ہی اپنے دور حیات میں ہی یہ چھوٹی سی مسجد تعمیر کروائی تھی۔ یہ قدیم طرز کی چھوٹی سی مسجد ہے۔

تھلہ بموشاہ: یہ تھلہ جہاں پر تعمیر ہوا ہے۔ اس سارے علاقے کو تھلہ بموشاہ کہتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق یہاں بموشاہ کے نام سے معروف ایک بزرگ تھے جو کہ اہل تشیع سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں پر وہ اکثر نشست رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی یاد میں ایک تھلہ بنا دیا گیا۔ جسے تھلہ بموشا کا نام دیا گیا۔ یہ ایک صحن ہے۔ جہاں تھلہ بنایا گیا ہے۔ اس تھلے کے دائیں جانب ایک بڑا سا دروازہ ہے۔ اس کے اندر ایک بہت بڑا کمرہ تعمیر کروایا گیا جہاں سے تعزیہ نکلتا ہے اور شہدائے کربلا کی یاد میں یہاں پر مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ اس تھلہ کے اوپر عین وسط میں ایک خوبصورت گنبد اور دائیں اور بائیں جانب دو مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔

خانقاہ کوٹلی: ڈیرہ اسماعیل خان شہر سے باہر بجانب مشرق کوٹلی کے مقام پر ایک ایسی خانقاہ ہے جو کہ روضہ امام حسین رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ یہ عمارت 1947ء سے پہلے تعمیر کروائی گئی۔ یہ خوبصورت مربع اور گول شکل کی ایسی خانقاہ ہے کہ جس کے اندرونی حصہ میں چاروں اطراف چھوٹی چھوٹی فیروزی رنگ کی کھڑکیاں رکھی گئی ہیں۔ کہیں کہیں سفید رنگ کی بھی آمیزش ہے۔ اس کی چھت تقریباً 60 فٹ کی بلندی پر ہے۔

گوردوارے: ڈیرہ اسماعیل خان پر جب سکھوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے یہاں گوردوارے تعمیر کئے۔ تاہم اس سے پہلے بھی سکھ کمیونٹی کے لوگ یہاں رہائش پذیر تھے اور پہلے ہی ایک دو گوردوارے تعمیر کر رکھے تھے۔ ایک قدیم گوردوارے ٹانک میں اور ایک گوردوارہ پہاڑ پور میں بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں درج ذیل گوردوارے تھے:

گوردوارہ سردار امر شاہ سنگھ جی، گوردوارہ سردار گوبند شاہ سنگھ جی، خالصہ گوردوارہ، نیا خالصہ گوردوارہ، گوردوارہ سردار ارجن سنگھ، گوردوارہ زرگراں بمقام کلاچی، ڈیرہ بابا نانک (گوردوارہ)۔

لوک ورزمیہ داستانیں، روایات و حکایات

تخت سلیمان: ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مغرب اور جنوب مغرب میں واقع کوہ سلیمان میں وہ مقام جو کہ شیرانی قبیلے کا مسکن ہے۔ یہ مغرب میں دریائے ژوب اور شمال میں گومل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے اوپر کا علاقہ محسود وزیریوں کا ہے۔ شیرانیوں کی بستیاں پست اور پہاڑی ڈھلانوں پر ہیں۔ بندوبستی علاقہ اور ان قبیلوں کے درمیان بنجر ترین اور طویل و تنگ وادیوں پر مشتمل ہے جو کہ جنوب میں قیصرانی تک چلی جاتی ہیں۔ جن میں متعدد تنگ شگاف ہیں۔ گومل زاؤ' درابند اور داہری کے راستے میدان تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ اسی مقام پر تخت سلیمان کا ابھار نظر آتا ہے جو کہ بالائی سطح کی وادیوں میں ہے۔ یہ مقام سرسبز ہے۔ جبکہ آس پاس میں شیرانی علاقے صدیوں سے بے شجر و گیاہ اور بنجر ہیں۔ یہاں پر کچھ ایسے قبیلے بھی ہیں جو کہ مستقلاً یہاں رہائش نہیں رکھتے اور خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں۔ تخت سلیمان جو کہ ہزار ہا سال سے متبرک مقام سمجھا گیا ہے اس سے متعلق ایک دیو مالائی داستان زبان زد عام ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ وہ تخت ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کے ساتھ شادی کی تو اس پیکر حسن و جمال اور دختر نازک اندام ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جس تخت پر آپ بیٹھ کر گرد عالم کی سیر کرتے ہیں مجھ کو بھی ایک روز اپنے تخت پر بیٹھا کر سیر کروائیں' حضرت سلیمان علیہ اسلام کی ملکہ بلقیس کے ساتھ شادی کرنے اور انہیں تخت پر سیر کرانے سے متعلق میں نے کافی تحقیق کی ہے تاکہ اس دیو مالائی داستان کی کڑیوں کو افسانے کی حد سے نکال کر حقیقت کی کڑیوں سے جوڑ دیا جائے۔ اگرچہ دیو مالائی اور افسانوی داستان کے اسلوب میں یہ واقعہ تو کچھ اس قسم کا نقل ہوا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ اسلام ملکہ بلقیس سے شادی کرنے کے لئے اطراف ہندوستان

آئے اور شادی کرنے کے بعد ملکہ کو تخت پر بٹھایا جو کہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ جس کے پائے جنات نے اٹھائے تھے۔ تخت جب ہوا پر اڑ رہا تھا تو ملکہ نے اس مقام پر پہنچ کر خواہش ظاہر کی کہ یہاں پر ٹھہر کر شب عروسی منائی جائے اور اس طرح وہ اپنے محبوب وطن پر آخری نظر ڈال سکے گی۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ یہاں پہاڑ کی چوٹی کو کھوکھلا کر کے تخت یہاں پر رکھ دیں۔ ایسا ہی کیا گیا اور اس طرح ملکہ نازنین نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ یہاں شب عروسی گزاری اور اپنی دل جمعی کے لئے اس میدان کا منظر بھی دیکھ لیا جسے ''ڈیرہ بسل'' سے موسوم کیا گیا۔ اس داستان دلربا سے متعلق میں نے بڑی جستجو کی اور مختلف کتب کا مطالعہ کیا۔ قدیم ترین کتاب ''قصص الانبیاء'' ترجمہ خلاصۃ الانبیاء' مطبوعہ بمقام کلکتہ (کتاب نہایت قدیم وضعیف ہے۔ جس کی وجہ سے تاریخ اشاعت معلوم نہ ہو سکی) حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کے بارے میں یہ سن رکھا تھا کہ اس کو ایک پری نے جنم دیا ہے اور یہ کہ اس کی پنڈلیوں پر بکریوں جیسے بال ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس حقیقت کو جاننا چاہتے تھے اور ملکہ کے آنے سے پہلے محل میں جنوں کے ذریعے شیشے کا ایک ایسا فرش تیار کروایا جو کہ بہتے ہوئے پانی کی طرح کا تھا جب ملکہ اس فرش کے قریب پہنچی تو اس نے پانی سمجھتے ہوئے یہاں سے گزرنے کے لئے اپنی پنڈلیاں کھول دیں۔ حضرت سلیمان نے دیووں کے ذریعے اس کی پنڈلیوں پر بکریوں کے بال ہونے کی تصدیق کر لی اور اسے کہا کہ یہ پانی نہیں شیشے کا فرش ہے۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کے اس نقص کو دور کرنے کے لئے دواء تجویز کی جسے تاریخ میں ''نورہ'' کا نام دیا گیا اور اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تین سو بیبیاں تھیں، ان تمام بیبیوں پر ملکہ بلقیس کو زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ ملکہ کے لئے ایک عالیشان محل بنا دیا گیا جہاں ملکہ کو رکھا گیا۔ ایک دن ملکہ نے کہا اے اللہ کے نبی حضرت سلیمانؑ آپ ہر روز تخت پر بیٹھ کر ہوا پر سیر کرتے ہیں اور دنیا کے چوطرف پھرتے ہیں مجھ کو بھی ایک روز اپنے ساتھ لے چلئے کہ میں بھی آپ کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر عجیب وغریب تماشا دیکھوں تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا کہ تخت کو اس جزیرے میں لے جاؤ جو کہ سات دریا کے بیچ میں ہے۔ ہوا نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ کو وہاں پہنچا دیا۔ ملکہ وہاں کی آب وہوا اور سبزہ وگیاہ دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ وہاں پر ایک عجیب منظر یہ دیکھا کہ جو گھوڑے ہیں وہ دریائی گھوڑے ہیں اور ان کے بازوؤں میں پر ہیں۔ جب انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ کا تخت دیکھا تو سب پرندوں کی مانند اڑ گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیووں کو حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو پکڑ کر میرے حضور پیش کیا جائے۔ دیووں نے عرض کی اے اللہ کے نبی ہم ان گھوڑوں کو پکڑنے سے عاجز ہیں مگر ایک دیو کہ سمندون ہے جو کہ آپ سے باغی ہو چکا ہے اور دریا کی تہہ میں جا چھپا ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان گھوڑوں کو پکڑ لائے اگر آپ کا حکم ہو تو ہم اس کے پاس جائیں اور مصلحتاً اسے یہ کہہ دیں کہ سلیمانؑ مر گئے ہیں تو یہ سنتے ہی ہمارے ساتھ چلا آئے گا۔ حضرت نے حکم دیا کہ اسے پکڑ لاؤ۔ یہ دیو تمام دریاؤں میں گئے اور وہاں یہ صدا دیتے رہے کہ اے سمندون سلیمانؑ مر گئے ہیں تم باہر نکل آؤ تب یہ سمندون دریا سے باہر نکل آیا۔ دیووں نے کہا کہ حضرت سلیمان تو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس لئے ہم سب اس کی سلطنت میں داخل ہو کر مزے کریں گے۔ جب یہ سمندون دیووں کے قابو میں آ گیا تو انہوں نے کمند ڈال کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور سلیمان علیہ السلام کے حضور پیش کر دیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو جب بنظر غضب دیکھا تو سمندون کانپنے لگا اور جان بخشی کی درخواست کی اور کہا کہ اب سے آپ کا فرمانبردار ہوں۔ جو آپ حکم دیں گے ویسا ہی کروں گا۔ تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ تو جان بخشی چاہتا ہے تو ان دریائی گھوڑوں کو پکڑ کر میرے حضور پیش کر واس پر سمندون نے کہا کہ یہ سب دریائی گھوڑے بآسانی میرے قبضے نہیں آ سکیں گے سوائے ایک ترکیب کے۔ حضرت نے پوچھا وہ کیا ترکیب ہے۔ سمندون نے کہا کہ یہ دریائی گھوڑے روزانہ فلاں چشمے سے پانی پیتے ہیں۔ آپ دیووں کو حکم دیں کہ اس چشمے کا پانی نکال کر اس میں شراب کا پانی ڈال دیں جب یہ گھوڑے شراب پئیں گے تو بے ہوش ہو جائیں گے ہم انہیں کمندوں میں کس کر آپؑ کے سامنے پیش کر دیں گے۔ حضرت سلیمان نے دیووں کو ایسا ہی کرنے کا حکم دیا اور دیووں نے سمندون کی سرکردگی میں ویسا ہی کیا اور پھر وہاں سے چالیس دریائی گھوڑے پکڑ لائے۔ جب گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے تو یہ عصر کا وقت تھا جو کہ حضرت سلیمان کی عبادت کا وقت تھا مگر حضرت سلیمان گھوڑوں کی خوبصورتی و لطافت اور خوبیوں میں ایسے مشغول ہوئے کہ وقت کا احساس ہی نہ رہا اور عبادت کا وقت ڈھلنے لگا۔ تب حضرت سلیمانؑ کی اللہ کی طرف سے قدرے سرزنش ہوئی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آ کر اللہ کا یہ پیغام دیا ''سلیمان تو دنیا کے مال ومتاع کی محبت میں ایسا مشغول ہو گیا کہ تجھے نماز عصر کی خبر ہی نہ رہی'' حضرت سلیمان نے جب یہ سنا تو فوراً سجدے میں گر پڑے اور روتے ہوئے استغفار کیا۔ قرآن کی آیت اس واقعہ پر شہادت دے رہی ہے۔ جس کا

ترجمہ یہ ہے۔: ''جس وقت سلیمان کے روبرو شام کے وقت خاص گھوڑے لائے گئے پس اس وقت سلیمان نے (آہ وزاری کرتے ہوئے کہا تھا) تحقیق میں نے دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد کی نسبت یہاں تک کہ سورج پردے میں چھپ گیا پھر کہا لائے ان گھوڑوں کو میرے پاس پس شروع کیا ہاتھ پھیرنا پاؤں اور گردن پر ان گھوڑوں کی''۔

اس سلسلے میں روایت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی آہ وزاری اور استغفار کے کلمات پر اپنے فرشتے بھیجے تا کہ آفتاب کو ڈوبنے نہ دیں یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے عصر کی نماز ادا کر لی اس کے بعد آفتاب غروب ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان گھوڑوں کے پر کاٹ ڈالے جو بعد میں پیدا نہ ہوئے انہی گھوڑوں کی نسل کے گھوڑوں کو اسپ تازی کہا گیا۔ بعض انہیں اسپ بادپا بھی کہتے ہیں۔

تخت سلیمان جو کہ (ڈیرہ بسل) کے نام سے بھی موسوم ہے۔ یہ وادی انتہائی پرکشش ہے۔ یہاں پر صنوبر کے عالیشان اور جہاں پرور درخت اور حسین قدرتی مناظر ہیں جیسا کہ ملکہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ایک روز حضرت سلیمان کے ساتھ تخت سلیمان پر بیٹھ کر ایسی وادی کی سیر کرنا چاہتی ہے جو کہ عجیب وغریب وادی ہے۔ اس وادی کے عجیب وغریب ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں تخت واقع ہے۔ یہ جگہ پہاڑ کے بالائی حصہ میں ہے اور سرسبز وشاداب قدرتی اور فطری مناظر سے اٹی ہوئی ہے۔ جبکہ آس پاس کا سارا علاقہ درشت وکرخت اور خشک وبے آب وگیاہ بنجر ہے۔ اسی لئے ملکہ نے اس وادی کے بارے میں عجیب وغریب ہونے کا عندیہ دیا تھا۔ جہاں تک یہ کہنا کہ یہاں پر ملکہ نے اللہ کے نبی علیہ السلام کے ساتھ شب عروسی کی۔ یہ داستان کا ایک افسانوی حصہ ہے۔ جس میں سے حقائق کو رقم کرنے کے لئے مختلف کتب سابقہ کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ اسے حقیقت کے قریب کر دیا جائے۔ دوسری اہم علامتی بات یہ ہے کہ جب ملکہ بلقیس نے تخت سلیمان پر بیٹھ کر حضرت سلیمان کے ساتھ عجیب وغریب وادی کے سفر کا عندیہ دیا تو حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہوا کو حکم دیا کہ تخت کو اس وادی میں پہنچا دیا جائے جو کہ سات دریاؤں کی وادی ہے۔ اب اس حیثیت سے بھی اس وادی کا جائزہ لینا ہے کہ وہ کون سے سات دریا اس وادی کے آس پاس بہتے ہیں جس کی بناء پر وادی کو سات دریاؤں کی وادی کہا گیا۔ اس بارے اس کے جغرافیائی پس منظر میں جائزہ لیا گیا اس تخت سلیمان وادی کے جنوب مشرق کی جانب پنجاب کے پانچ دریا جبکہ مغرب کی جانب دریائے ژوب اور پھر انتہائے شمال میں دریائے کرم بہتے ہیں۔ تخت سلیمان کے کچھ فاصلے پر شمال کی جانب ایک مزار ہے جسے بعض لوگ بے خبری کی بناء پر حضرت سلیمانؑ کا مزار سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نیک بزرگ کا نام بھی سلیمان ہی ہو جس کی وجہ سے اسے قبر سلیمان کہا گیا ہو۔

ڈھولا باشہ زادی: یہ ڈیرہ اسماعیل خان کے قدیم ڈیرہ سے تعلق رکھنے والی ایک رومانوی داستان ہے۔ جس کا دوسرا کردار ''سوہن'' ہے اور اسی سوہن کے نام سے ڈیرہ کی مٹھائی ''سوہن حلوہ'' ہے۔

ڈیرہ پر جب ہندو راج تھا تو ڈیرہ قدیم جو ساحل دریا پر شہر بسا ہوا تھا یہاں ایک راجہ کی راجدھانی تھی جس کے ہاں کوئی اولاد نرینہ تو نہ تھی البتہ ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈھولا باشہ زادی تھا۔ یہی ڈھولا بعد میں یہاں کے مقامی لوک گیتوں کا موضوع بنا۔ چونکہ ہندو مذہب ذات پات کی تفریق کا مذہب ہے۔ اس لئے یہ ہندو راجے مہاراجے اپنے سے کسی کمتر ذات والے کو اپنی مجلسوں سے دور رکھتے تھے۔ یہاں کا راجہ بھی اسی مذہبی ذات پات کی تفریق کی وجہ سے کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ راجہ کے خاندان کی ہمسری کرے یا کوئی اس کی لاڈلی بیٹی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی کوشش کرے۔ راجہ روزانہ شام سے پہلے اپنی رتھ پر سوار لاؤ لشکر کے سمیت ساحل دریا پر جاتا تھا۔ راجہ کی رتھ کے پیچھے اس کی حسین وجمیل لڑکی ڈھولا دوسری رتھ پر سوار شہر سے گزرتی۔ شہر کے تمام دوکانداروں کو یہ حکم تھا کہ سب لوگ دو طرفہ قطار میں کھڑے ہو کر راجہ اور اس کی لڑکی کا استقبال کریں مگر ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ کوئی بھی لڑکی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھے گا اور نظریں نیچے رکھے گا۔ جو حکم کی خلاف ورزی کرتا اسے راجہ کی سپاہ سزا دیتی۔ شہر میں ایک حلوائی کی دوکان پر ایک نوخیز خوبصورت اور تنومند حلوہ بنانے کے فن کا ماہر آ کر نوکر ہوا تھا۔ راجہ کی جب سواری گزری تو کسی طریقے سے اس نے راجہ کی لڑکی ڈھولا باشہ زادی کو دیکھ لیا اور اس کے حسن سحر انگیز میں گرفتار ہو گیا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ باشہ زادی کو اپنے ہاتھ سے لذیذ ترین حلوہ تیار کر کے پیش کرے۔ چنانچہ یہ سوہن لال نامی لڑکا لذیذ سے لذیذ ترین حلوہ تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔ آخر ایک روز اس نے میدہ کی سوئی سے یہ حلوہ تیار کیا جس میں مختلف خشک میوہ جات' بادام' پستہ' میوہ' اخروٹ وغیرہ خاص مقدار کے مطابق ڈالے اور یہ نایاب حلوہ تیار کیا۔ جب حلوہ تیار ہو گیا تو پیتل کے تھال میں اسے

ٹھنڈا کیا اور پھر اس کو ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔

شام کو جب راجہ کی سواری گزری تو پیچھے والی رتھ میں جہاں باشہ زادی بیٹھی تھی یہ لڑکا سوہن' بھیڑ کو توڑتے ہوئے ڈھولا کی سواری تک پہنچ گیا۔ ڈھولا باشہ زادی نے بھی جب سوہن کو دیکھا تو ایک ہی نظر میں باشہ زادی بھی سوہن کے حسن دلربا پر فدا ہو گئی۔ محافظ دوڑے کہ اس لڑکے کو پکڑیں مگر شہزادی نے محافظوں کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ سوہن نے ڈھولا باشہ زادی کو تھال میں بنے ہوئے حلوے کا ٹکڑا پیش کیا۔ باشہ زادی نے جب اسے منہ میں ڈالا تو اس کی لذت و خوشبو سے حیران ہو گئی۔ ایسا حلوہ اس سے پہلے باشہ زادی نے چکھا تک نہیں تھا۔ سوہن نے کہا کہ میرا نام سوہن ہے اور یہ حلوہ میں نے بڑی محنت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ تب لڑکی کے منہ سے نکلا ''سوہن حلوہ'' تب سے اس حلوے کا نام سوہن حلوہ ہو گیا۔ دوسری طرف راجہ یہ سارا منظر دیکھ کر غضبناک ہوا اور اس نے محافظوں کو کہا کہ اسے گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ڈھولا باشہ زادی کے ساتھ مختصر سی ملاقات کے بعد اسے گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا گیا اور پھر راجہ نے حکم دیا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ کر اسے اندھے کنویں میں ڈال دیا جائے اس نے ایسی گستاخانہ حرکت کیسے کی۔ ڈھولا باشہ زادی کو راجہ کے اس حکم کی جب اطلاع ہوئی تو اس نے راجہ کی منت سماجت کی کہ سوہن کی آنکھیں نہ پھوڑی جائیں مگر باشہ زادی کی فریاد کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی اور سوہن کی آنکھیں پھوڑ کر اسے اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد ڈھولا باشہ زادی بھی سوہن لال کی محبت و چاہت میں روتی رہی اور ہر وقت بے قرار رہی اور اس تاک میں رہی کہ وہ کسی طریقے سے سوہن سے ملے اور اپنے دل کی حالت سے اسے آگاہ کرے۔ آخر کئی روز بعد باشہ زادی نے بعض محافظوں کو اس کے لئے تیار کر لیا کہ اسے سوہن لال سے ملوایا جائے۔ چنانچہ رازداری کے ساتھ باشہ زادی نے سوہن لال کے ساتھ ملاقات کر کے اپنے بے قرار دل کی حالت اس کے سامنے رکھی اور یہ فیصلہ کر لیا کہ موقع ملتے ہی ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ ایک روز موقع پا کر باشہ زادی سوہن لال کو لے کر خفیہ راستوں کے ذریعے راجہ کی حدود سے نکل گئی۔ راستے میں ڈھولا باشہ زادی سوہن لال کو غم بھرے اور دلسوز قسم کے گیت سناتی گئی جن میں باشہ زادی کے دل میں سوہن لال کے لئے جو محبت والفت کے جذبات تھے۔ ان گیتوں میں یہ بھی پیغام تھا کہ یہ مصیبت کے دن گزر جائیں گے اور اس امید کا عزم تھا کہ ہم ایک نہ ایک دن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مل جائیں گے۔ پس صبر و ہمت کے ساتھ ہم نے اس بلا اور آفت کا مقابلہ کرنا ہے۔ دوران سفر ہی ڈھولا باشہ زادی کو اپنے باپ راجہ کے مرنے کی اطلاع مل جاتی ہے۔ راجہ کے مرنے کے بعد اس کا وزیر عارضی طور پر راجدھانی کا تخت سنبھال لیتا ہے۔ مگر قانونی ضابطے کے ماتحت وہ اس وقت تک مستقل راجہ نہیں بن سکتا جب تک آنجہانی راجہ کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کر لیتا کیونکہ قانون یہ کہتا ہے کہ جب کوئی راجہ مر جائے تو اس کے بعد اس کا بیٹا جو ولی عہد ہوتا ہے۔ وہ راجدھانی سنبھالتا ہے۔ اگر بیٹا نہ ہو تو بیٹی کا خاوند یعنی داماد تخت حاصل کرنے کا حق دار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ وزیر جو کہ اب عارضی طور پر راجدھانی کے تخت پر بیٹھا وہ قانونی شرط پوری کرنے کے لئے آنجہانی راجہ کی بیٹی ڈھولا باشہ زادی کے ساتھ شادی رچانے کی ترکیبیں سوچتا ہے اور فوج کو حکم دیتا ہے کہ ڈھولا باشہ زادی کو جہاں بھی ہو پکڑ کر لایا جائے چنانچہ۔ فوجی دستے ڈھولا باشہ زادی کے تعاقب میں نکل پڑتے ہیں۔ آخر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور ڈھولا باشہ زادی اور سوہن لال کو پکڑ کر (عارضی) راجہ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ راجہ ڈھولا باشہ زادی کو محل بھیج دیتا ہے اور سوہن لال کو زندان میں ڈال دیتا ہے۔ ڈھولا باشہ زادی شادی سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ سوہن لال کی ہے اور اسی کی رہے گی۔ راجہ کوشش کے باوجود جب ناکام ہو جاتا ہے تو غضبناک ہو جاتا ہے اور ڈھولا باشہ زادی کو بھی سوہن لال کے ساتھ قید میں ڈال دیتا ہے۔ یہاں سے سابق راجہ کے وفادار فوجی ڈھولا باشہ زادی اور سوہن لال کو بھاگ جانے میں مدد دیتے ہیں اور یہ دونوں یہاں سے بھاگ کر چشمہ کے مقام پر پہنچتے ہیں۔ ادھر راجہ ان کے تعاقب میں اپنے لوگ بھیجتا ہے۔ جب ڈھولا باشہ زادی کو تعاقب کی اطلاع ملتی ہے تو وہ سوہن لال کو کہتی ہے کہ مرنا تو ہماری قسمت میں لکھا جا چکا ہے مگر ہم دوبارہ زندان کی تکلیفوں میں رہ کر مرنا نہیں چاہتے کیوں نہ آزادی کے ساتھ محبت اور عشق کے دریا میں کود کر دونوں جان دے دیں اور اپنی محبت کو لازوال کر دیں۔ سوہن لال ڈھولا باشہ زادی کی اس تجویز سے خوش ہو جاتا ہے۔ ان دنوں چشمہ میں سیلاب آ چکا تھا اور پانی کی لہریں اپنے جوبن پر تھیں چنانچہ یہ دونوں عشق و محبت کی دیوی پر نثار ہونے کے لئے پانی میں کود جاتے ہیں۔ مدتوں یہاں کے لوگوں میں یہ روایت پروان چڑھتی رہی کہ چشمہ کے مقام پر ہر سال انہی دنوں میں سیلاب آتا ہے جن دنوں میں اس عشق و محبت کی دیوی پر نثار ہونے والا یہ جوڑا سیلابی موجوں میں غرق آب ہوا تھا۔

ڈیرہ اور مضافات میں ڈھولا گیتوں کی ایک خاص صنف ہے جو کہ ڈھولا شہ زادی کی طرف منسوب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ڈھولا گیتوں میں مذکر کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ ڈھولا شہ زادی تو مونث یعنی راجہ کی بیٹی تھی جو سوہن لال سے بے پناہ عشق و محبت کرتی تھی بات یہ ہے کہ راجہ کا چونکہ کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے

اس نے اپنی بیٹی کا نام ڈھولا رکھ دیا تھا جو کہ مذکر کی طرف اشارہ کرنے والا نام ہے۔ وہ بیٹی کو بیٹا ہی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ڈھولا کی صنف گیت میں ڈھولا جو مذکر کے طور پر استعمال ہوتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے اور چونکہ یہ گیت ڈھولا شہزادی نے سوہن لال کی ہمت بندھانے کے لئے گائے تھے جن میں وہ سوہن لال کو تسلیاں دیتی ہے۔ یہ گیت سرائیکی ہندکو میں بھی ہیں اور خالصتہً پشاوری ہندکو میں بھی منظوم ہیں ان گیتوں میں امید و ناامیدی دلاسے دینے' ہمت بندھانے' وقت کے شکوے' مصیبتوں کے دنوں کے گزر جانے اور نئے سرے سے زندگی گزارنے کے عزائم کی باتیں ہوتی ہیں۔ ڈیرہ کے گیتوں کی اس صنف میں بے درد ڈھولا خاص موضوع ہے۔ یہ ڈھولا جوں جوں مقبول ہوتا رہا اس کے موضوعات بھی بدلتے رہے۔ کبھی اس کا موضوع ڈھولا کی بے رخی اور بے دردی رہی' کبھی ڈھولا پیار کے وعدوں اور تسلیوں پر مشتمل رہا۔

نواب حکیم گیدا خیل: یہ ڈیرہ اسماعیل خان کی رزمیہ داستان ہے جو نواب حکیم گیدا خیل اور نواز میرداد خیل کے درمیان ہونے والے معرکہ پر مشتمل ہے۔ نواز میرداد خیل جسمانی اور مالی لحاظ سے نواب حکیم گیدا خیل کی نسبت کمزور تھا مگر دونوں کے درمیان دشمنی کی آگ اتنی بھڑک رہی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن بنتے گئے۔ نواز میرا خیل اکثر نواب حکیم گیدا خیل سے دور دور رہتا تھا مگر اندر کی دشمنی ہر وقت اسے حکیم گیدا خیل سے برسرپیکار رکھتی تھی۔ نواز میرداد خیل نے اپنے قبیلے کو نواب حکیم سے دور لے جا کر بسایا اور پھر نواب حکیم گیدا خیل سے مقابلہ کرنے کی خفیہ تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ جب اس نے تیاریاں مکمل کر لیں اور یہ یقین ہو گیا کہ وہ اب نواب حکیم گیدا خیل سے مقابلہ کر سکتا ہے تو اس نے نواب حکیم پر ہلہ بول دیا اور نتیجہ کے طور پر نواب حکیم گیدا خیل میرداد خیلوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس واقعہ کو منظوم رزمیہ داستان کے طور پر جرس نے یوں لکھا:

میں ایک واقعہ نظم کر رہا ہوں کہ شاید اس میں کوئی اثر ہو
یہ سب کچھ اصل میں ازل کے دفتر کی تحریریں ہیں

نواز میرداد خیل کا سارا قبیلہ اور اس کے اہل و عیال خانہ بدوشوں کی مانند موسیٰ خیل کی حدود سے نکل گئے (ایسی حالت میں کہ گھبراہٹ میں) انہیں اپنے گھر بار کے لٹنے کا گمان تک نہ ہوا۔

قلندر کا بیٹا جندر اس پر بے حد مہربان تھا۔ چند ماگزر گئے پھر بھی نواز کے ذہن سے میرداد خیل کی داستان محو نہیں ہوئی قبیلہ برام قدیمی اور معروف قبیلہ تھا۔ نواز چند مخصوص سوار اپنے ساتھ لے کر حکیم خان کی طرف روانہ ہوا۔

حکیم دوپہر سے پہلے ہی ڈیرہ اسماعیل خان میں پڑاؤ کر چکا تھا سب سے پہلے اس کا معرکہ جس کے ساتھ پڑا وہ گلاپی تھا۔ بہادروں اور نڈر لوگوں ہی کو گیتوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ گلاپی بھی ایک بہادر' نڈر اور جنگجو تھا جو کہ نواز کا ہم پلہ تھا۔ اللہ کی رحمت کا نزول ہوا اس پر اور پھر گلاپ نے حکیم نواب سے پہلے جان کی قربانی دے دی کہ لوگ گلاپ سے بجا طور پر یہی توقع رکھتے تھے۔

اور پھر نواز گھوڑے سے نیچے اترا کہ اس کا مقابلہ اب بہادر جنگجو کے ساتھ تھا۔ نواب کی شجاعت و بہادری میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ غیرتمند جوان چمکتی ہوئی تلواروں میں بھی پیٹھ نہیں دکھاتے (آمنے سامنے لڑتے ہیں) (اگرچہ) بہادر نواب نے دشمن پر پے در پے وار کئے مگر اس کی تلوار حسب منشاء کام نہیں دکھا رہی تھی۔ نواز اپنی قسمت پر شاکی تھا اور پھر علی خان کی تلوار نے نواب خان کی زندگی چھین لی اور لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

اے بیبو (نواب کی بیوی) اب تو اپنے نواب پر آنسو بہا' اگر تو اس کے آخری دیدار کی آرزو رکھتی ہے تو اسے آ کر دیکھ لے وہ اب ابدی نیند سو رہا ہے۔ بیبو نے کہا میرا نواب تو چندن کی شاخ کی طرح اور دیار کے درخت کی مانند سرو قد اور خوبصورت ہے۔

دوستو (غور سے سنو) نواز نے کہا اے حکیم (میں تمہارا غنیم تھا پھر بھی تو مجھ سے خوفزدہ نہیں تھا) مگر اس کا کیا علاج کہ تیری موت میرے ہی ہاتھوں ہونی تھی۔ حکیم نے کہا اے نواز اب تو میں مر رہا ہوں افسوس کہ اب مجھ میں شمشیر زنی کی طاقت نہیں رہی۔

افسوس حکیم نواب فانی دنیا سے رخصت ہو گیا اور قبیلہ برام تتر بتر ہو کر رہ گیا۔

نواز میرداد خیل: نواز میرداد خیل قتل کا واقعہ بھی رزمیہ داستانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کو نثری داستان کی صورت میں پیش کرتا ہوں:

نواب حکیم کو جب نواز میرداد خیل نے ڈیرہ اسماعیل خان کے مقام پر قتل کر دیا تو اس قتل کا بدلہ لینے کے لئے سمندر غزنی خیل میدان کارزار میں اتر آیا۔ نواز میرداد خیل ایک بہادر و جنگجو شخص تھا جس نے نواب حکیم گیدا خیل کو قتل کر دیا تھا۔ نواب حکیم قبیلہ برام کا سردار تھا نواز میرداد خیل اور نواب حکیم گیدا خیل کے درمیان قبیلوی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس قبیلوی حریفانہ معرکہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکیم گیدا خیل' نواز میرداد خیل کے ہاتھوں ڈیرہ میں قتل ہو گیا۔ دونوں حریف اپنے اپنے

قبیلوں میں شجیع و بہادر اور نڈر سمجھے جاتے تھے۔ جب نواب حکیم گیدا خیل قتل ہو گیا تو سمندر غزنی خیل اپنے باپ حکیم کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے سامنے آ گیا۔ سمندر خان کا حلیف شربت خان نامی جنگجو اور بہادر پٹھان تھا۔ دونوں نے نواز میرداد خیل سے حکیم کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اتحاد کر لیا اور متحد ہو کر نواز کے قتل کے درپے ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نواز میرداد خیل شربت خان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ نواز میرداد خیل سے بہادر و نڈر کے قتل کی داستان کو رزمیہ داستان کے طور پر شاعر نے پشتو میں نظم کیا جس کا اردو ترجمہ اس طرح ہے۔:

نواز کی موت کی خبر میرے کان میں پڑی (تو میں بے چین ہو گیا) اے نواز تیرے سر کا دشمن اچانک کہاں سے آ گیا' تمہارا تو کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔

سمندر خان اور شربت خان باہم متحد ہو گئے' شربت نے نواز پر حملہ کر دیا' دوستو یقین کرو کہ نواز دشمن کی اس تدبیر سے بے خبر تھا وہ لاعلمی میں مارا گیا۔ کیسا سخت وقت تھا کہ نواز کی مصری تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دوسرا وار اس پر سمندر نے کیا اور اس طرح سمندر خان نے اپنے باپ اور شربت خان نے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ گلاپ کے اہل و عیال کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ سمندر نے اپنے باپ کی لاج رکھ لی۔ شربت غزنی خیل قبیلے سے تعلق رکھتا تھا نواز کو قتل کر کے اس نے اپنا قرض چکا دیا۔ ارسلا غزنی خیل کو بھی یقیناً اس واقعہ سے خوشی ہوئی ہو گی۔

اے نواز تیرا خوبصورت و وجیہہ چہرہ خون میں لت پت ہے تو تو بڑا مدبر تھا تیرے آگے پیچھے حشم و خدام تھے' افسوس کہ تیرے ان جانثاروں میں سے آج ایک بھی تیرے کام نہ آیا۔

میرداد خیل قبیلے کو للکارا گیا تو انہوں نے ڈٹ کر دشمن کے سواروں کا مقابلہ کیا اور وہ شکست سے دوچار ہوئے مگر تلواروں کو میرداد خیلوں نے پیٹھ نہیں دکھائی۔

اس معرکہ میں طوطی خیل اور عمر خیل کا آمنا سامنا ہوا۔ میرداد خیل کا ستارہ گردش میں آ گیا ان کے نصیب سو گئے محمد یار میرداد خیل کے تین بیٹے بھی میدان کارزار میں اتر آئے۔ وہ غصے میں آگ بگولہ ہو گئے اور جنگ کے شعلوں کو گلے لگا لیا۔

سمندر حکیم کا بیٹا تھا اس نے بھی اپنا سر ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ طوطی زئی قبیلے کی سرداری ملے مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ نواز خان کو سپرد خاک کر دیا گیا نواز خان کی موت سے بلیکو خان کا گروہ کمزور ہو گیا، اب نواز دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

لوک ساز، لوک گیت اور اصناف شاعری

ڈیرہ اسماعیل خان ایک صحرائی خطہ اور بے آب و گیاہ زمینوں پر مشتمل علاقہ ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تو یہاں کی خواتین پانی کی دستیابی کے لئے دور دراز جا کر سروں پر کئی کئی گھڑے اٹھا کر ان میں پانی لاتی تھیں جو کہ ان کی ثقافتی زندگی کا ایک قابل ذکر حصہ بن گیا تھا۔ یہاں صنعت و حرفت کا فقدان ہے۔ خواتین معاشی ضروریات کے لئے گھریلو کام کاج کے ساتھ ساتھ گھریلو دستکاریوں میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ یہاں کے لوگ سادہ نوش' سادہ پوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خوشیوں کی تقاریب میں جو گیت گائے جاتے ہیں ان میں بھی ان کی معصومیت' پسماندگی اور دستی ہنر کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے گیتوں میں ڈھولا ان کی سادہ سی زبان کا موضوع ہوتا ہے۔ ڈھولا کا لفظ محبوب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

بے درد ڈھولا:

اینویں نئیں کریندا بے درد ڈھولا
ڈکھیاں کوں پٹلا، گل چا لویندا

ترجمہ: میرا بے درد ڈھولا ایسا نہیں کرتے۔ مجھ دکھیا کو گلے لگاتا جائے۔

گیت کے ان دو مصرعوں میں علاقے کی نئی نویلی دوشیزہ کا سارا سماجی اور معاشرتی دکھ اور درد ظاہر ہو گیا ہے۔ عورت اپنے اندر کے دکھ درد کے اظہار کے لئے ایسے اجتماعی موقعوں کی تلاش میں رہتی ہے جہاں وہ لوک گیتوں کے ذریعے ان کا اظہار کرے۔ اس کے لئے اسے موسموں' فصلوں اور شادی بیاہ کی تقریبات کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ موسموں اور فصلوں کی کٹائی کے موقع پر سادہ لوح دیہاتی اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ آموں کے پیڑوں پر جب بور پڑے تو وہ ایسے خوش ہو جاتے ہیں اور ان کی مسکراہٹیں ہونٹوں پر کھلنے لگتی ہے۔

تیرے کھوہ تے آئیاں ساوا ام اے
دو ڈینہہ دیاں خوشیاں عمراں داغم اے

بے درد ڈھولا

ترجمہ: تیرے کنویں پر آئے ہیں سبز کچے آم ہیں
خوشیاں صرف دو دن کی ہیں باقی ساری عمر کا غم ہے۔
اے بے درد ڈھولا

ڈیرہ اسماعیل خان کی زمین کا اکثر حصہ بارانی ہے اور بارش کے پانی کو

ٹاپو میں اکٹھا کرلیا جاتا ہے۔ وہاں سے خواتین گھڑوں میں پانی بھر کر اپنے گھروں کو لے جاتی ہیں اور پھر اسے ابال کر جمع کر دیتی ہیں اور بوقت ضرورت استعمال کرتی ہیں۔ یہی پانی ان کے مال مویشی کے لئے بھی کام آتا ہے۔ ایسے میں کنویں کا تصور نہایت ہی اچھوتا تصور ہے۔ اس لئے اس علاقے میں عشق و محبت کے اکثر گیت کنوؤں کے تصوراتی خیال سے جڑے ہوئے ہیں۔

بے درد ڈھولا

تیرے کھوے تے آئیاں ساوے کریلے

اساں یار منایا دیگر دے ویلے

بے درد ڈھولا

تیرے کھوتے آئیاں ساوا تما کو

اساں جگ لٹیرے، تساں لٹیا ساکو

بے درد ڈھولا

تیرے کھوتے آئیاں ساوا ام اے

دوڈینھ دیا خوشیاں، عمراں داغم اے

بے درد ڈھولا

اینوے نئیں کریندا بے درد ڈھولا

دکھیا نوں پتلا گل چا لو یندا

بے درد ڈھولا

ترجمہ: تیرے کنویں پر آئے ہیں سبز کریلے ہیں۔ ہم نے محبوب کو عصر کے وقت منالیا ہے۔ بے درد ڈھولا

تمہارے کنویں آئے ہیں، سبز تمباکو ہے۔ ہم تو لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں تم نے ہمیں لوٹ لیا۔ بے درد ڈھولا

تیرے کنویں پر آئے ہیں، آم کچے اور سبز ہیں۔ خوشیاں تو دو دن کی ہیں اور غم ساری عمر کا۔ بے درد ڈھولا

ایسا کرنا مناسب نہیں کہ گلے لگا کر چلتا بنے۔ بے درد ڈھولا

ڈیرہ کا ڈھولا ایسا مخصوص سرائیکی زبان کا گیت ہے جو کہ اس علاقے کی مخصوص لوک حیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ڈھولا کے گیتوں میں یہ کمال بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈھولا کے گیت الھڑ دوشیزائیں محبوبوں کی بے وفائیوں اور بے اعتنائیوں کے رجزیے تنہائیوں اور نجی محفلوں میں گاتی ہیں۔ جب ڈیرہ کی لڑکیاں یہ درد بھرے ڈھولا کے گیت گاتی ہیں تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور دل کے درد چیخوں اور آہوں کی صورت میں باہر نکلنے لگتے ہیں۔ ڈھولا سے منسوب گیتوں میں جو درد دکھ اضطراب ہے۔ وہ کسی اور گیت میں بمشکل ہی محسوس کیا جاتا ہے۔ ڈیرہ بے درد ڈھولا ان کے گیتوں کا مستقل مکھڑا ہے۔ فارغ بخاری مرحوم کا کہنا ہے کہ بے درد ڈھولا کا مکھڑا ڈیروی ہندکو کی اپنی اختراع ہے۔ اس مکھڑا نے بھی ڈھولا کی دردناک لے میں اضافہ کر دیا ہے۔ ڈھولا ٹیپ کے مصرع کا کام دیتا ہے اور اس پر دو مصرعے لگا کر اس کی تخلیق ہوتی ہے۔

ڈھولا برہا کی ٹیاروں کے دکھیارے دلوں کی دھڑکنوں اور ان کی کربناک خاموش آہوں اور سسکیوں سے بنے جاتے ہیں۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اندرونی خلش کی طوفانی لہروں اور زخمی احساس کی تڑپ سے اس کا خمیر اٹھایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ بے چین روحوں، نا آسودہ جذبوں کی ایک ایسی المیہ داستان بن گئے ہیں جو ہر دل کی آواز اور ہر روح کی پکار ہے۔ ڈیرہ کی معصوم اور الھڑ دوشیزہ نا آسودہ اور غیر اطمینان بخش اور دکھوں سے بھرے ہوئے ماحول میں زندگی گزارتی ہے۔ وہ ماں کے گھر میں کڑی محنت اور ہاتھوں کی چابکدستی سے دستکاری کے مشغلے میں رہ کر بھوکے پیٹ کو غذا کا ایندھن پہنچاتی ہے۔ اس کڑی محنت اور مشقت میں بھی وہ ایک آس کے سہارے خوش ہوتی ہے کہ اسے اس کا شہزادہ ملے گا اور اس شہزادے کے گھر میں جا کر وہ آسودہ حال ہو جائے گی۔ تب وہ تمام دکھ دردوں کی کیفیتوں کو چھپا کر ایک نئی زندگی کی ابتداء کرے گی مگر جب وہ اپنے تصوراتی شہزادے کے گھر اور آنگن میں بھی جا کر مفلسی اور غربت کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں آجاتی ہے، تب اس کی ساری آرزوئیں اور امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں ایسے میں وہ بے چین و مضطرب ہو کر پکار اٹھتی ہے۔

اکی نہ منیں ساں، بہونا راضاں ڈھولے تے

یعنی میں اپنے محبوب سے کبھی بھی راضی نہ ہوں گی کہ میں بہت ناراض ہوں، یہ نئی نویلی دلہن اپنے ڈھولے، شہزادے سے وہی خواہش کرتی ہے جو اس نے ساری عمر اپنی روایتی زندگی میں دیکھی ہے اور کہتی ہے:

ہوسادی مورا کین تے بوٹا کڈ دے چولے تے

یعنی۔ سبز مارکین کی قمیص پر مجھے پھول کاڑھ دے

یہ سارا گیت کچھ اس قسم کا ہے:

بزار وکیندے جموں

ہو میرا ڈھولا ٹر گیا بنوں

ترجمہ: بازار میں جامن بک رہے ہیں۔ میرا محبوب بنوں چلا گیا ہے۔

اکی نہ منیں سا، بہونا راض آں ڈھولے تے

ہوساوی مورا کین تے بوٹا کڈ دے چولے تے

ترجمہ: میں اپنے محبوب سے ناراض ہوں۔ بہت ناراض ہوں۔ سبز مارکین کی قمیص پر مجھے پھول کاڑھ دے۔

بازار وکیندیا چھریاں

ہوعشقے دیاں چوٹاں بریاں

ترجمہ: بازار میں چھریاں بک رہی ہیں۔ عشق کی چوٹ بہت بری ہے۔

اکی نہ منیں ساں بہونراضاں ڈھولے تے

ہوساوی مورا کین تے بوٹا کھڑ دے چولے تے

ترجمہ: میں اپنے محبوب سے بہت ناراض ہوں۔ سبز مارکین پر مجھے پھول کاڑھ دے

میں اتھے تے ڈھول میرا چھاونڑی

روڑی کٹ کے تے سڑک بڑانڑی

ترجمہ: میں یہاں ہوں اور میرا محبوب چھاونی میں ہے۔ اس نے روڑی کوٹ کر سڑک بنانی ہے۔

گھڑا گھڑولی کا گیت:

جب شادی کا دن آتا ہے تو جنج روانہ ہونے سے پہلے لڑکے کے وہ دوست یار جو بہت قریبی ہوتے ہیں وہ لڑکیوں جیسا لباس پہنتے ہیں اور ایک دوست کے سر پر پانی کا گھڑا ہوتا ہے۔ اس گھڑے میں سات مسجدوں سے پانی بھر دیا جاتا ہے اور یہ یار دوست ٹولی کی صورت میں گھڑا لئے ہوئے دلہن کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے یہ گیت گاتے ہیں:

تیڈی بیج تے گھڑی گھڑولا بھرن آندی ہاں

بھرن آندی ہاں بھرو دگھنا ندی ہاں

اللہ والی جونگے سولیندی ہاں

تیڈی بیج تے گھڑی گھڑولا بھرن آندی ہاں

ایہہ چٹنا ماہی بکھ دا کالا

کھانگڑ منجھ پلیندی ہاں

اللہ والی جونگے سولیندی ہاں

لوئے لئے لدھڑا کہنے بدھڑا

تیڈی بیج تے گھڑی گھڑولا بھرن آندی ہاں

رقص: ڈیرہ اسماعیل خان میں لڈی ڈالنا اور بھنگڑا مشہور ثقافتی رقص ہیں۔

لڈی ڈالنا: یہ ایک ڈیرے کا مقامی روایتی اور ثقافتی رقص ہے۔ اسے مقامی زبان میں ''دریس'' کہتے ہیں۔ اس رقص کے وقت چار ٹولیاں یا حصے بنائے جاتے ہیں اس رقص کے وقت گانے کے جو ساز بندے ہوتے ہیں ان میں ڈھول، شہنائی اور بین ہے۔ جب یہ ساز بجتے ہیں تو رقص کرنے والے گول دائرے میں چکر کاٹتے ہیں ایک ٹولی تالی بجاتی ہے۔ پھر دوسری ٹولی تالی بجاتی ہے اور پھر تیسری ٹولی یہ رقص اس وقت ہوتا ہے۔ جب سہرا بندی کے بعد جنج لڑکی کے گھر روانہ ہوتی ہے تو سارے راستے میں اس قسم کی کیفیت کا رقص ہوتا ہے۔

دوھڑے: ڈیرہ اسماعیل خان کے لوک گیتوں میں دوھڑے بھی ایک اہم صنف ہے۔ سرائیکی زبان کے شعراء نے اس صنف سے متعلق بھی طبع آزمائی کی ہے اور شادی اور دیگر خوشیوں کے موقع پر یہ دوھڑے گائے جاتے ہیں سرائیکی زبان میں دوھڑے کو ڈوہڑے کہا جاتا ہے۔ سئیں خیر شاہ کے یہ دوھڑے بڑے مقبول ہیں:

مرغ بحر دے رہن کنارے اتے روز روزینہ لھندے

بری کرن پرواز براں وچ جتھ قسمت وچ لھندے

رکھن ذیدز مین اتیں' اوچن چوگانت کھاندے

روزی خیر برابر ہر کوں بھل ودھ پئے خرچ بریاندے

طالب لکھ ہزاراں ہوندے کئی تھولے خاصے تھیندے

اول مہمانی موت پیالہ وچ قسمت والے پیندے

جو ہیندے وچ دامل تھیندے اومر کر خاصے جیندے

شالا خیر وسار ماہی دی تھیوم نصیب کہیں دے

اسی طرح سیف اللہ آصف کے بھی یہ دوھڑے بڑے مقبول ہیں:

ساڈے بیٹ تیں غربت چھائی ہے۔ اساں پتن دا چھائیں وچ ڈتن

ساڈے مال وکا گئے منڈیاں تے اساں کانے کانہیں وچ ڈتن

اساں جھوک دے وسدے دن وچکن اساں پنگھا لہیں وچ ڈتن

تو آصف ونگاں ہتن گھن آئیں اساں کڈن داں پانہیں وچ ڈتن

اللہ داد کے بھی یہ دوھڑے نہایت مقبول ہیں:

سسی دل وچ خیال کیتا میں تاں کیچ دی ملکہ تھیساں جد پرنیساں

کیچی میں تیں مان کر لین میں تاں پھلاں تلیساں بد پرنیساں

پنل میڈا سلطان ہوسی پا تاج میں تخت بہلیساں جد پرنیساں

آکھ اللہ دادی کوں خبر نہ ہائی میں تھل مارو دفنیساں جد پرنیساں

دل دریاتے روح دی موھانا بیڑی خاص لباں وچ آندی
مچھی تھیندی مول نہ بچھی جڑی شوہ دریا واں رہندی
بغلا تھیندا مول نہ میلا جیندی جان چکڑ وچ راہندی
اکھ اللہ داد ہا جیندے پلے ہنج کسیرے اج گالھ ہے۔ اوندی بھاندی

اقبال سوکڑی نے بھی بڑے اچھے دوھڑے لکھے ہیں:

جے ساہ لکھتا ساہ ولڑاں نیں کج منہ دا برتن جھونی رکھ
کت کچی پچھیں کوہ لڑکیں ہتھ صبر صبور دی پونی رکھ
تیڈا آپ کون دھوون دہاون کیا دھو دھوڑاں تھی لائی دھونی رکھ
اقبال توڑے کوئی جنجھاں ہے تو اپنی سوچ سلونی رکھ

ہک وار تیڈی تصویر ڈسے روح سک سکرین تیں سم تھیسی
کیا لوڑھ دعا دی ہر سجدہ اکھ نوٹ جبیں تیں سم تھیسی
کوئی نانگ جے ہوسی کہیں جاہ تین نچ نچ کے بین تیں سم تھیسی
اقبال جے تیڈا رخ ڈیکھے اسمان زمیں تیں سم تھیسی

جتھ کھولے ہن اتھ جھوک ہئی پئی اتھ ٹنگڑیں ہن اتھ ٹاویں ہن
اتھ جاں دی گھاٹی چھاں ہئی پئی اتھ پیریں ہیٹھ کنڑاویں ہن
او مکسارل گئے جیندے وچ تیڈے سانول سوٹ رکھادیں ہن
توں گئیں اقبال ناموئے پئے ہن جیڑھے ساہ ہن سائیں دینانویں ہن

کافی: سرائیکی شاعری کی بہت عمدہ اور معروف صنف ہے۔ سرائیکی زبان میں کافیاں گانے والے ایسے نامور لوک فنکار پیدا ہوئے جنہوں نے شاہ حسین، بابا بلھے شاہ اور خواجہ غلام فرید کی کافیاں گا کر اپنی ذات کو لازوال بنا دیا ہے۔

کافی کے بارے میں ڈیرہ کے سرائیکی زبان کے شاعر نصیر سرمد نے لکھا ہے کہ:

''کافی کا سراغ ہمیں تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت غوث بہاء الدین ذکریاؒ کے دور (1182ء تا 1162ء) میں ملتا ہے۔''

ایک روایت ہے کہ سندھ کے ذاکر حضرت بہاءالدین ذکریاؒ کی محفلوں میں کافیاں گاتے تھے۔ شیخ عبدالجلیل جو حضرت غوث بہاءالدین ذکریاؒ کے داماد اور خلیفہ حمیدالدین حاکم کے خاندان سے تھے (1490ء تا 1540ء)۔ لاہور میں ان کی محفلوں میں سندھی ذاکروں نے کافیاں گائیں۔ تاریخ کے ایک حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بزرگ لاڈ جیو نے ہندوستان میں کافی کی صنف کو متعارف کروایا۔ لاڈ جیو سندھ میں دادو کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے پاٹ کے رہنے والے تھے اور ہجرت کر کے برہان پور گئے تھے یہ دور 1533ء سے 1598ء کا ہے۔ اسی مقام پر وہ بڑی خوش الحانی اور مترنم گلو کے ساتھ کافیاں گاتے تھے۔

کافی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں نصیر سرمد کا بیان یہ ہے کہ شیخ بہاء الدینؒ اور قاضی محمود دریائی نے گجرات میں شاعری کی ایک صنف ذکری کو رواج دیا اور موسیقی کی ایک نئی وضع کی بنیاد ڈالی انہوں نے مختلف راگوں میں جن کو وہ پردہ کہتے تھے ذکریاں تصنیف کیں جو حقیقت میں موسیقی کی تالیفات تھیں۔ ان راگوں کو لوگ خانقاہوں اور آستانوں میں گاتے تھے۔ سندھی شاعروں نے بھی کافیاں تصنیف کیں جو حقیقت میں موسیقی کی تالیفات تھیں ان کو بھی خانقاہوں، آستانوں اور محفلوں میں گایا جاتا تھا ان میں حمد، نعت اور مرشد کی خدمت میں مدحت اور منقبت کے مضامین تھے جو شاعری میں سمو کر گایا جاتا تھا۔ ان کو گانے والے ذاکر ہوتے تھے۔

سندھ کے مشہور عالم اور محقق مولانا غلام محمد گرامی مرحوم نے کافی کے بارے میں بعض حوالوں سے استنباط کیا ہے۔ ان کے مطابق

کافی عربی کے لفظ کفی سے بنا ہے۔ ترازو کے دو پلڑے جو برابر ہوتے ہیں۔ استکفوا، خیرات لینے کو کہتے ہیں وہ فقیر جو دف بجا کر گیت گاتے اور خیرات مانگتے تھے ان گیتوں کو کافی کہتے ہیں۔

نصیر سرمد کافی کے بارے میں کہتے ہیں'' کافی وہ کلام ہے جو مضمون کے لحاظ سے مکمل اور فن پر کفایت کرنے والا ہوتا ہے جو بیان عشق میں مکمل ہو کافی کہلاتا ہے۔'' اس لئے کامل اور حقیقی عشق کے بارے میں جو شاعری دستیاب ہو وہ کافی ہے۔ دوسری اصناف شاعری کی طرح اس میں عشق مجازی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ شاعری کی وہ صنف ہے جو سرائیکی زبان میں مختص ہے۔ اولیاؤں کی درگاہوں میں حجرے بنے ہوتے ہیں جن میں فقراء اور درویش لوگ بسیرا کرتے ہیں اور عارفانہ کلام گاتے ہیں ان حجروں کو کافی کہتے ہیں۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ امیر خسروؒ نے کافی راگ کو ایجاد کیا شروع میں جو کلام کافی راگ میں گایا جاتا تھا اسے کافی کہا گیا لیکن دھیرے دھیرے کافی نے شاعری کی ایک مخصوص صنف اختیار کر لی اور پھر ہر راگ میں کافی گائی جانے لگی۔ تاہم امیر خسرو نے جو راگ کافی کے نام سے ایجاد کیا تھا وہی ایجاد کردہ راگ کافی کی نسبت سے کافی مشہور ہو گیا۔ کافی کی ابتداء اور پھر اس کا رواج سندھ کے سرائیکی علاقوں سے

ابھرا خواجہ غلام فرید اور شاہ حسینؒ نے اکثر کافیاں وائی کے رنگ میں لکھی ہیں :

اللہ میلے سنگ یارا بردی توں دلبردی
نازنزاکت حسن ملاحت کیا چالیں کیا دھنگ یارا
سوہنی طرح نظر دی
مشوے غمزے کرن لڑائی چشماں کردیاں جنگ یارا
ڈاڈھے ظلم قہر دی
ہر ہر کاکل تانگ ورادھا زلف مریندی ڈنگ یارا
قامت یار قیامت ساری سنہیں فریب فرنگ یارا
کمر دی چوچو سر دی
تیر نگہ دا رگ رگ رچیا سارا بدن چورنگ یارا
لگڑ ینوک ٹھہر دی
عشق فرید ریم بروچ ہڈ ہڈ تے انگ انگ یارا
نکھڑ یم کونچ ولھمبر دی

وائی: سرائیکی شاعری کی ایک صنف وائی بھی ہے۔ یہ زیادہ تر سندھی اور سرائیکی زبانوں میں لکھی اور گائی جاتی ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر ڈیرہ جات میں جو گیت گائے جاتے تھے وائیاں گیتوں کی ارتقائی شکل ہے۔ خاص طور پر جو سہرے گائے جاتے تھے تو ان کی ہیئت وائی ہی ہوتی تھی۔ وائی اپنے معانی کے لحاظ سے بات کو کہتے ہیں مگر یہ بات یعنی منہ سے جو لفظ نکلتے ہیں یہ خاص کرب کے اظہار کے لئے ہوتے تھے۔ اس لئے اس کے معانی اس آواز کے ہیں جو کہ درد اور تکلیف اور کرب کے وقت منہ سے نکلتے ہیں۔

وائی کے شروع میں صرف ایک مصرعہ کہا جاتا ہے اور اس مصرعے کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں اور یہی دو ٹکڑے جب ملا کر ادا کئے جاتے ہیں تو ایک مصرعہ بن جاتا ہے۔ جب ایک مصرعہ ادا ہوتا ہے تو بات مکمل ہو جاتی ہے۔

پہلے ٹکڑے کے آخر میں قافیہ ہوتا ہے اور پھر توقف کر کے دوسرا مصرعہ شروع کیا جاتا ہے تو پھر بات مکمل ہو جاتی ہے۔ مثلاً

من موہنا من ٹھار توں ازلاں دامیت

ترجمہ: اے میرے محبوب تو ہی ازل سے میرا دوست ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہی دوسرا مصرعہ جو کہ پہلے مصرعے کا ہم قافیہ نہیں ہے۔ وائی کے ہر مصرعے کے بعد مکرر ہوتا ہے۔ یعنی بار بار گایا جاتا ہے۔

پہلا قافیے والا مصرعہ استھائی ہے اور دوسرا مصرعہ انترا ہے۔ انترا کے ارکان استھائی کے ارکان کے برابر یا دو تین ماترے زیادہ بھی جائز ہیں مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پہلے انترے میں جتنے ماترے ہوں گے باقی بھی سب انترے اتنے ہی ماتروں کے ہوں گے۔

وائی کے گیت کی مثال:

من موہنا من ٹھار توں ازلاں دامیت
توں ہیں تیڈے باجھ نہ کوئی کیتا ھا اقرار
توں ازلاں دامیت
جنڈڑی کیتم جمدوں لاری تیڈے بے نانویں یار
توں ازلاں دامیت
کوڑے ونج وپار دلیں پے سچا تیڈا پیار
تو ازلاں دامیت

وائی کی دوسری شکل غزل کی ہے۔ اس کا ہر مصرعہ علیحدہ معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ (ہر مصرعے کا مضمون جدا) مگر ہر مصرعہ کے بعد ابتدائی مصرعے کا دوسرا ٹکڑا دہرایا جاتا ہے۔

مرثیہ: مرثیہ شاعری کی وہ صنف ہے جو واقعہ کربلا کے بعد وجود میں آئی اور حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ میدان کربلا میں جو الم انگیز واقعات پیش آئے اس کے ایک ایک رخ کو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا۔ مرثیہ خواں اور ذاکر حضرات ان مرثیوں پُر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے مرثیہ گو شعراء نے واقعات کربلا کو دوہڑوں کی صنف کے تحت لکھا۔

سرائیکی شعراء نے مرثیہ گوئی کی جو روایت ڈالی اس کا عہد گیارھویں صدی کا آخر اور بارھویں صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ ہے۔ سرائیکی کے مرثیہ گو شاعروں میں سید زمان شاہ شیرازی کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی مرثیہ گوئی میں مرثیہ یا سلام نما مرثیہ کے ہر بند کے بعد ایک دوہڑا نظم کیا ہے۔ اسی طرح پرانے ڈیرے کے ایک قصبے کہاوڑ کلاں کے ذاکر سید خدا بخش شاہ ولد امام علی شاہ کے قلمی بیاض میں محمد نواز بردہ اور عاجز کے مرثیے درج ہیں۔

ذاکر حضرات یا مرثیہ خواں جو مرثیے کہتے ہیں یہ خاص سر اور لے کے ساتھ ہوتے ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے یہ ذاکر اور مرثیہ خواں نہ صرف پورے صوبے میں

بلکہ پورے ملک میں مشہور ہیں اور محرم الحرام کے عاشورے کے ایام میں ڈیرہ اسماعیل خان سے مختلف علاقوں کے امام بارگاہوں میں مجلسیں پڑھنے اور مرثیہ خوانی کے لئے بلائے جاتے ہیں۔

لوک لباس، زیورات

دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر آباد لوگوں اور ڈیرہ کے لوگوں کی رنگت وہیئت میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ ملتان، میانوالی اور ڈیرہ کی شہری آبادی کے لوگ یکساں قسم کی ثقافتی حیات کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ موسمی لحاظ سے بھی ساخت وہیئت اور رنگت میں اشتراک ہوتا ہے۔

ڈیرہ ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں دریائی تہذیب رکھنے والے شہری لوگ بھی ہیں اور کوہستانی مزاج وخصائل کے پروردہ اقوام وقبائل کے لوگ بھی یکساں طور پر رہ رہے ہیں۔ ان قبائل میں اکثر وہ اقوام ہیں جو کہ پاوندہ کے غلزئی قبیلے سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ یہ وہ اقوام ہیں جو کہ مغربی درّوں کی گزرگاہوں سے دامان میں داخل ہوئیں۔ دامان ڈیرہ اسماعیل خان کا قدیم نام ہے۔ تاریخ میں ان لوگوں کی شناخت جس قدر وقامت سے کی گئی ہے اس کے مطابق اگرچہ یہ قبائل کوائف و ضابطہ زندگی میں متفرق واقع ہوئے ہیں، تاہم عمومی نقطہ نظر سے یہ لوگ پست قد، مضبوط الجثہ، توانا، جنگجو اور بے وطن لوگ سمجھے گئے ہیں۔ ان کی ڈیرہ جات میں ابتدائی زندگی کا طریقہ یہ تھا کہ جب ڈیرہ جات میں یہ داخل ہوتے تو پوندہ ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے مال چرائی کے لئے ڈیرہ جات کے لوگوں کو ٹیکس دیتے تھے ان کی زندگی کا دارومدار زیادہ تر اپنے گلوں اور ریوڑ پر گزارہ کرنا تھا۔ ایڈورڈ ڈی ایلور نے اپنی کتاب ''پٹھان اینڈ بلوچ'' میں ان کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) اونٹ والے (2) بیل اور گدھے والے (3) بھیڑوں والے۔ اونٹ والے لوگ وہ ہیں جن کے پاس بتقاضائے عہد اونٹوں کی تعداد رہی ہے۔ یہ غریب ترین اور گنوار لوگ تھے جو کہ اپنا سامان تجارت لے کر دریائے سندھ سے پار علاقوں تک جاتے۔

وہ لوگ جو کہ بیل اور گدھے والے ہیں یہ بھی ہر جگہ پائے جاتے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ محنت مزدوری کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ مٹی یا اینٹیں ڈھوتے اور ایندھن کاٹ کر بیچتے اور گزارا کرتے۔ وہ لوگ جو کہ بھیڑوں والے رہے ہیں ان کا طریقہ زندگی یہ رہا ہے کہ دامن کوہ کے ساتھ ساتھ بھیڑیں چراتے رہے، یہ لوگ موسم سرما میں اکتوبر کے مہینے میں یہاں آجاتے اور پھر اپریل کے مہینے افغان پہاڑوں کی طرف چلے جاتے اس کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو کہ گومل کے منبع پر رہتے ہیں۔ یہ بھی موسم سرما میں یہاں آجاتے ہیں ان کو خروٹی کہا گیا ہے۔

لباس: کوہستانی علاقوں میں لباس کے لحاظ سے شیرانیوں میں سے غریب لوگوں کا لباس دو کمبل ان کا ثقافتی پہناوہ ہے۔ ایک کمبل کو وہ کمر کے گرد باندھتے ہیں اور دوسرا کمبل کندھے پر رکھتے ہیں تاہم وہ جو کہ ان کا سردار یا خاندان کا بڑا ہو اس کا اضافی لباس ایک میلی کچیلی قمیص، ڈھیلی ڈھالی شلوار اور چکنی قسم کی پگڑی ہوتی ہے۔ اس کے سیاہ بال ژولیدہ حالت میں ہوتے ہیں سر پر ان بالوں کو ڈھانپنے کے لئے زردوز ٹوپی ہوتی ہے جو مسلسل استعمال سے میلی کچیلی ہوتی ہے۔ یہ لباس بھی اس قسم کا پہنتے جس سے ان کی جنگجویانہ مزاج کا اندازہ ہو۔ بڑے بڑے ڈونگا نما جوتے پاؤں میں ہوتے ہیں جو نئے ہونے کی صورت میں سرخ اور زرین ہوتے مگر مسلسل استعمال سے ان کی اصلی شکل ہی بدل جاتی، بعض ان میں سے وہ بانکے ہوتے جو کہ بھیڑ کی پوستین پہنتے جس کے نیچے ملتانی ریشم کی قمیض پہنے ہوتے۔ ان کے پاس ایک خمدار تلوار ایک بارودی سینگ ہوتا اور بعض کے پاس انگریزی دور کا بنا ہوا پستول۔

میاں خیل اور بابروں کا لباس ہمیشہ سے خوش نما اور پرتکلف رہا ہے اور فتار زمانہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے پوشاک میں تبدیلی کی ہے۔ اس لئے یہ خوش لباس وخوش منظر سرخ وسفید چہروں والے لوگ مانے جاتے رہے، جس کی وجہ سے انہیں دیگر قبائل واتحادیوں کی نسبت بہتر اطوار وطریق رکھنے والے تہذیب کے آئینہ دار سمجھا گیا ہے۔ وہ سلیقہ پر مبنی تہذیب کے وارث رہے ہیں۔

شہری ملبوسات

پٹکا: ڈیرہ اسماعیل خان کی شہری آبادیوں میں جو پہناوے صدیوں سے رائج تھے ان میں شرفاء اور اعلےٰ خاندانی لوگوں کے لباس کا انداز یہ ہوتا ہے کہ رؤسا اور اعلےٰ خاندانی لوگ سر پر پٹکا باندھتے تھے۔ ایک تاریخی دستاویز سے ثابت ہوتا ہے کہ 1815ء میں جب نواب حافظ احمد خان سدوزئی نے ڈیرہ کی حکومت سنبھالی تو اس نے لوگوں پر مختلف اشیاء کے استعمال پر ٹیکس عائد کر دیئے تھے۔ ان ٹیکسوں میں ایک ٹیکس پٹکا ٹیکس بھی تھا اس پٹکا ٹیکس سے ثابت ہوتا ہے کہ پٹکا صرف وہ لوگ باندھتے تھے جو کہ بڑے خاندانوں کے باوقار لوگ ہوتے تھے۔ جو شخص سر پر جس حیثیت کا پٹکا باندھتا تھا اس کی قیمت کے مطابق ٹیکس ادا کرتا تھا۔

ٹوپی: ڈیرہ کے شہری لوگ عموماً سر پر سادہ ٹوپی پہنتے جبکہ مخصوص لوگ زردوزی کی ٹوپی بھی پہنتے۔ اس ٹوپی پر ڈیرہ میں حاکم ڈیرہ کی طرف سے ٹیکس عائد کیا گیا تھا اور یہ

ٹوپی ٹیکس بھی بلحاظ قیمت رکھا گیا تھا اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ٹوپی ڈیرہ کے معزز خاندانوں اور اہل ثروت لوگوں کا ثقافتی پہناوہ تھا جس پر یہ لوگ ٹیکس ادا کرتے۔ اب موجودہ دور میں ڈیرہ کے لوگوں کی عموماً پوشاک وہی ہے جو کہ عہد حاضر میں دوسرے علاقوں میں رائج ہے۔ یعنی عام طور سے قمیض و شلوار اور سردیوں میں کوٹ اور واسکٹ کا اضافہ جبکہ قدیم ثقافتی اور تہذیبی لوگوں نے اب بھی اپنی شناخت قائم رکھی ہوئی ہے۔

خواتین کا لباس

ڈیرہ اسماعیل خان اور مضافات میں سلائی کڑھائی کا رواج عام ہے۔ اس لئے ڈیرہ کی خواتین کا لباس عموماً ڈیرہ کی ثقافتی سلائی کڑھائی پر مبنی لباس ہوتا ہے جو کہ متنوع قسم کا لباس ہے۔ قدیم رواج کی پابند خواتین پردہ نشین ہیں اور بہت کم ایسی خواتین ہیں جو کہ چادر میں بازار میں نکلتی ہوں اور اگر بعض پڑھے لکھے گھرانوں کی ایسی خواتین ہوں بھی تو چادر میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ عام طور سے رنگ برنگی بنی ہوئی قمیص اور شلوار پہنتی ہیں۔

برقعہ: ڈیرہ اسماعیل خان کی شہری جبکہ دیہاتی خواتین عموماً سادہ برقعہ پہنتی ہیں۔ یہ بالکل سادہ ٹوپی والا برقعہ ہوتا ہے جو کہ پشاور کی قدیم خواتین پہنتی ہیں۔ یہ برقعہ سر سے پاؤں تک ہوتا ہے اور آنکھوں کی جگہ کریشیہ سے بنی ہوئی ایک جالی لگادی جاتی ہے۔ تاکہ اس میں سے اسے نظر آسکے۔ یہ برقعہ سفید لٹھے کا بھی ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے رنگوں کے ریشمی کپڑے کا بھی بنا ہوتا ہے۔

زیورات: ڈیرہ اسماعیل خان کی قبائلی حیات کی پابند خواتین کے ہاں قدیم زیورات کا استعمال اب بھی موجود ہے۔ پٹھان قبیلوں کی خواتین زیادہ تر چاندی کے زیورات استعمال کرتی تھیں۔ اس میں ہاتھ کے کنگن، ماتھے کا ٹیکہ، کانوں کے بڑے بڑے جھومر اور ناک میں بلاخ استعمال کرتی تھیں۔ اب بھی ان قبائل میں قدرے تبدیلی کے ساتھ اسی قسم کے زیورات کا استعمال ہے جبکہ ڈیرہ شہر کی خواتین سونے کے زیورات استعمال کرتی ہیں۔

چونکہ یہاں پر عرصہ دراز تک ہندوؤں کا راج تھا اور ان کی خواتین زیورات پہننے کی شوقین تھیں اور طرح طرح کے زیورات استعمال کرتی تھیں:

ٹھوٹھا: یہ زیور کی ایک ایسی قسم ہے جو سر کے عین درمیان میں ہندو عورتیں لگاتی تھیں۔ یہ پھول کی طرح کا مینار نما ہوتا تھا اور سر کا دوپٹہ اس کے ساتھ اٹکا رہتا تھا۔

ٹیکا: یہ ٹکا عموماً سونے کا ہی ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ مسلمان خواتین میں بھی یہ مروج ہے۔ یہ قدیم زمانے سے تسلسل سے چلا آرہا ہے۔

جھالر: یہ عموماً ڈیرہ کے نواب اور حکمران خاندان کی خواتین استعمال کرتی تھیں۔ اب بھی بڑے گھرانوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اسے سنگار پٹی بھی کہتے ہیں یہ عموماً دو تولے سے لے کر اڑھائی تولے تک کا زیور ہے اور ٹکے کے اردگرد ماتھے پر لٹکتی ہے۔ اس میں موتی وغیرہ بھی جڑے ہوتے ہیں۔

جھومر: یہ زیور بھی خاص طور سے امیر گھرانوں کی خواتین استعمال کرتی ہیں اسے ماتھے کے دونوں اطراف میں لٹکایا جاتا ہے۔

بلاک: یہ زیور بھی ناک کا ایسا زیور ہے جو خاص کر بڑے گھرانے کی خواتین استعمال کرتی ہیں۔ یہ ناک کے دونوں نتھنوں کے درمیان والی حد میں چھید کر پہنا جاتا ہے۔ اس کی شکل جھمکے کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں موتی اور سونے کی پتیاں بنا کر ٹانکی جاتی ہیں اور ہونٹ کے اوپر والے حصہ پر لٹکتا ہے۔

مور: یہ ایک ایسا زیور ہے جو کہ ناک کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس زیور کی شکل مور سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسے مور کہا جاتا ہے۔ گولائی میں ایک طرف موٹا اور دوسری جانب نوکدار ہوتا ہے۔

ڈنڈیا: یہ کانوں کا مشہور اور اجتماعی زیور ہے۔ جسے دوسرے علاقوں کی طرح ڈیرہ کی خواتین بھی استعمال کرتی ہیں۔ یہ جھمکی والی ڈنڈیاں بھی ہوتی ہیں اور سادہ بھی۔

جھمکے: یہ ایسا زیور ہے جو کہ کان کے چھیدوں میں ہک کے ذریعے لٹکا ہوتا ہے۔ اوپر سے چوڑا اور تھوڑا نیچے آکر اس میں ایک چھوٹی سی گول مکی سی لٹکتی ہے۔ جس کے ساتھ نیچے گولائی میں موتی لٹکتے ہیں اگر سائز چھوٹا ہو تو جھمکیاں ہوتی ہیں۔

کانٹے یا مگر: یہ عموماً کان کے زیوروں میں شمار ہونے والا زیور ہے۔ جھمکوں کی طرح کا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ لمبے ہوتے ہیں جو کہ نیچے کی طرف باریک ہوتے جاتے ہیں مگر مچھ کی دم کی طرح کا ہوتا ہے۔ جسے مختصر کر کے مگر کا نام دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ مگر مچھ ہے۔

ماہلاں: یہ ایک ایسا زیور ہے کہ اس کے دو لڑے ہوتے ہیں۔ نیچے کے حصہ میں تلے کی تار میں لپٹے دھاگے میں موٹے منکے پروئے جاتے ہیں۔

کینٹھا: یہ بھی سونے کا زیور ہوتا ہے۔ جسے رنگین ریشمی دھاگے سے گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ تقریباً سب علاقوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ وہ کینٹھا ہوتا ہے جو کہ مزاروں پر رہنے والے ملنگ، درویش اور فقیر لوگ پہنتے ہیں۔ اس میں قیمتی پتھروں کے منکے پروئے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ منکوں کے عین وسط میں پان پتے کی طرز کی تختی یعنی پتلا اور چوڑا تراشا ہوا پتھر ہوتا ہے۔

مندریا: یہ بھی فقیر و درویش لوگ ہاتھ کی کلائیوں میں اور بازوؤں میں ڈالتے ہیں۔ یہ کڑے پاؤں میں بھی ڈالے جاتے ہیں۔ وہ فقیر لوگ جو کہ مزاروں پر دھمال ڈالتے ہیں وہ پاؤں میں کئی کئی کڑے ڈالے ہوتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں ڈنڈہ ہوتا ہے۔ ڈنڈے کو زمین پر مارتے ہیں اور دونوں پاؤں کو یکے بعد دیگرے زمین پر مارتے ہیں تو ان کڑوں سے آواز نکلتی ہے۔

گلابا: یہ بھی ایک کڑا ہوتا ہے جو ہاتھی دانت کا یا کانچ کا بنا ہوتا ہے جسے فقیر لوگ پہنتے ہیں۔

مندراں: ڈیرہ جات میں ہندوؤں کے دور میں مندروں کے پجاری لوگ یا ناتھوں کے چیلے ہندو کان میں چوڑی چوڑی تانبے یا لوہے کی مندریں پہنتے تھے۔

جسمانی کھیل اور کھیل تماشے

ڈیرہ اسماعیل خان میں بعض ایسے روایتی کھیل ہیں جو خاص علاقے کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض کھیل وہ ہیں جو دوسرے علاقوں میں بھی کھیلے جاتے ہیں۔

کت کت: سرائیکی میں کت کت کبڈی کے کھیل کے لئے مستعمل لفظ ہے۔ یہ کھیل شہر سے باہر میدان میں کھیلا جاتا ہے۔ اس وقت بھی ڈیرہ کے مضافات میں یہ کھیل تسلسل کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کے لئے دو ٹولیاں بن جاتی ہیں دونوں ٹولیوں کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ ایک ٹولی میں سے ایک نوجوان لکیر کو پار کر کے مخالف گروہ کی حد میں کت کت کرتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ مخالف گروہ کے لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ یہ کھلاڑی یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی سانس کو توڑے بغیر مخالف گروہ میں سے کسی ایک پر ہاتھ رکھ کر واپس آ جائے جبکہ مخالف میں سے کوئی ایک اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے اس وقت تک پکڑے رکھے جب تک کہ اس کی سانس نہ ٹوٹے اگر اس دوران اس کی سانس ٹوٹ جائے تو وہ ہار جاتا ہے اور اگر وہ سانس توڑے بغیر کت کت کرتے ہوئے واپس اپنی ٹولی میں آ جائے تو مخالف گروہ کا آدمی ہار مان کر کھیل سے خارج ہو جاتا ہے۔ ڈیرہ کے دیہی علاقوں میں عصر اور مغرب کے دوران یہ کھیل ایک میدان میں کھیلا جاتا ہے۔

پنجری: سرائیکی زبان میں پنجری اس کھیل کو کہا جاتا ہے جس میں وزن اٹھانے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ڈیرہ اور مضافات میں یہ کھیل اپنی مخصوص ہیئت اور نام کے ساتھ مشہور مقامی اور روایتی و ثقافتی کھیل ہے۔ عموماً بڑا وزنی پتھر بیچ میں رکھ دیا جاتا ہے اور نوجوان اسے اٹھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اس کھیل میں شامل ہونے کے لئے دو مخالف نوجوان میدان میں نکلتے ہیں وزن پہلے ہی سے مقرر کر دیا جاتا ہے۔ پہلے ایک شخص یہ پتھر اٹھاتا اور ایک خاص حد تک اوپر کی طرف اٹھانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ جیت جاتا ہے۔ ڈیرہ کی قدیم پٹھان اقوام میں شادی کے موقع پر بھی لڑکی کی رخصتی کے موقع پر اس کھیل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ شرط رکھی جاتی ہے کہ لڑکی کی رخصتی اس وقت ہو گی جب لڑکا وزن اٹھا لے۔ اس لئے شادی سے پہلے دولہا وزن اٹھانے کی مشق کرتا ہے۔ تاکہ شادی کی رات کو وزن اٹھانے کی رسم میں ناکام رہنے کی صورت میں شرمندگی اٹھانی نہ پڑے۔

گھسنی: یہ بھی ڈیرے کا مخصوص ثقافتی کھیل ہے۔ یہ کھیل کھیلنے کے لئے دو ٹولیاں بن جاتی ہیں ایک ٹولی میں سے کبڈی کی طرح دوسری مخالف ٹولی میں داخل ہوتا ہے۔ مخالف ٹولی میں سے ایک آدمی اسے کلائی سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے۔ اس کھیل میں صرف کلائی پکڑی جاتی ہے۔ جس کی کلائی مخالف پکڑے تو یہ شخص کوشش کرتا ہے کہ کلائی کو کسی طریقے سے اس کے قبضے سے چھڑائے اگر یہ شخص کلائی چھڑانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ جیت جاتا ہے اور اگر وقت مقررہ تک یہ اپنی کلائی کو چھڑانے میں ناکام ہو جائے تو کلائی پکڑنے والا کامیاب ہو جاتا ہے۔ گھسنی سرائیکی زبان کا لفظ ہے۔

انڈے توڑ: یہ کھیل عموماً میلے ٹھیلوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل اس طرح کھیلا جاتا ہے کہ اس کھیل کے ذریعے ہاتھ کی ہتھیلی کے نرم حصہ میں انڈا رکھ کر انڈے پر دوسری ہتھیلی کا نرم حصہ رکھ دیا جاتا ہے اور انڈہ توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دونوں ہتھیلیوں کے نرم حصہ کے زور سے انڈا توڑنا ایک مہارت کا کام ہے۔ اگر کوئی انڈا توڑ لے تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ کھیل میں عموماً دو اشخاص آپس میں شرط لگاتے ہیں ایک شخص دوسرے شخص کو چیلنج کرتا ہے کہ اگر یہ انڈا ہاتھ کی ہتھیلیوں کے نرم حصہ سے توڑ لے تو وہ مقررہ رقم یا انڈے دے گا اور اگر توڑنے میں ناکام رہے تو انڈا توڑنے والا مخالف کو یہ معاوضہ دے گا ساتھ یہ شرط ہوتی ہے کہ یہ کوشش بار بار نہیں ہوگی صرف ایک ہی بار انڈا توڑنے کی کوشش کی جائے گی اس کھیل کو ڈیرہ اور مضافات میں سرائیکی زبان میں آنڈا توڑ کہا جاتا ہے۔ یہ کھیل مغل دور سے یہاں رائج ہوا ہے اور مغل اسے فارسی زبان میں بیضہ شکستن کہتے تھے۔

سوکڑ: سوکڑ سرائیکی کا لفظ ہے جو اس مقامی کھیل کے لئے استعمال ہوتا ہے جو مٹھی بند کر کے کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل بھی اس علاقے میں مغل دور کے بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے سے کھیلا جا رہا ہے۔ یہ مقامی کھیل اس طرح سے کھیلا جاتا ہے کہ ایک جوان اپنی مٹھی بند کرتا ہے اور دوسرا اس مدمقابل کے سامنے بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اس کی مٹھی کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر مٹھی کھولنے والا مدمقابل کی مٹھی کو کھولنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔

کشتی: ڈیرہ اسماعیل خان اور مضافات میں یہ کھیل بھی ہر قوم و قبیلہ میں یکساں طور پر رائج ہے۔ اس کھیل میں صرف جسمانی طور پر توانا اور مضبوط لوگ ہی شامل ہوتے ہیں جنہیں پہلوان کہا جاتا ہے وہ یا تو موروثی پہلوان ہوتے ہیں اور یا پھر کسی بڑے نامور پہلوان کے شاگرد ہوتے ہیں۔ یہ پہلوان اپنے اساتذہ سے مختلف داؤ پیچ سیکھتے ہیں۔ یہ کھیل شہروں سے باہر قائم اکھاڑوں میں کھیلے جاتے ہیں مقامی سطح پر تربیت دینے کے لئے پہلوانوں کی ٹولیاں بنتی ہیں اور دو مدمقابل پہلوان اکھاڑے میں اترتے ہیں۔ اگرچہ یہ اکھاڑے ہر موسم میں آباد ہوتے ہیں مگر گرمیوں کے موسم میں یہ زیادہ آباد ہوتے ہیں۔ اکثر پہلوانوں کے درمیان باضابطہ مقابلے بھی ہوتے ہیں جس میں مختلف علاقے کے پہلوان میدان میں اترتے ہیں۔ عہد حاضر میں گو کہ اب اس قسم کے مقابلے اس جوش و خروش سے نہیں ہوتے جیسا کہ ماضی میں ہوتے تھے اس لئے اب بہت حد تک پہلوانوں کے اکھاڑے بھی ناپید ہو چکے ہیں اس کے باوجود شہروں اور دیہات میں یہ کھیل کھیلے جاتے ہیں جو کہ علاقے اور اقوام کی ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور مضافات میں صدیوں سے اس کھیل کے اکھاڑے موجود تھے۔ مسلمان کشتی کھیلنے والے پہلوان ان اکھاڑوں کو حضرت علی کرم اللہ وجیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اکھاڑے کی مٹی کو بھی متبرک جانتے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس ورزشی کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ڈیرہ میں ہندوؤں نے پاکستان بننے سے پہلے متعدد اکھاڑے بنا رکھے تھے۔ ہندوؤں میں بڑے نامور پہلوان بھی پیدا ہوئے۔ ڈیرہ میں ہندوؤں کے چند اکھاڑے یہ تھے:

اکھاڑہ سیٹھ گھنشام داس مرچندہ، اکھاڑہ پنڈت تلسی داس، اکھاڑہ پیڑ ارام، اکھاڑہ گوسائیں رادھا کرشن، اکھاڑہ شام داس بھاٹیہ، اکھاڑہ جسونت رام بھاٹیہ، اکھاڑہ پنڈت رام دیال، اکھاڑہ حسوتر کھان۔

لکڑی کے تنے کا کھیل: ڈیرہ اسماعیل خان میں نوجوانوں کا یہ کھیل بہت مقبول تھا۔ مضافات میں اب بھی یہ کھیل جاتا ہے۔ اس کھیل کے لئے لکڑی کا ایک بھاری تنا مقررہ جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر دو ٹولیاں بن جاتی ہیں پہلے ایک ٹولی میں سے نوجوان نکل کر ایک لکڑی کے ڈنڈے سے اس تنے کو زور سے مارتا ہے۔ اگر اس کی ضرب سے یہ تنا مقررہ جگہ سے ہل جائے تو وہ جیت جاتا ہے۔ اگر اس لکڑی کے تنے میں اس ضرب سے کوئی جنبش پیدا نہ ہو تو وہ ہار جاتا ہے اور پھر مخالف ٹولی میں سے دوسرا نوجوان آگے آتا ہے اور وہ یہی عمل دھراتا ہے۔ اس طرح یہ مشق جاری رہتی ہے۔ جس ٹولی میں سے زیادہ لوگ اس تنے کو ہلانے میں کامیاب ہو جائیں وہ ٹولی جیت جاتی ہے۔

گڈی گڈے کا بیاہ: ڈیرہ اسماعیل خان ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کی خواتین اور لڑکیاں سلائی کڑھائی، کپڑے کے ڈیزائن اور دیگر نمونے بنانے میں بڑی ماہر سمجھی جاتی ہیں۔ ڈیرہ کی خواتین اپنے مردوں کا معاشی میدان میں ساتھ دینے کے لئے شروع ہی سے گھروں میں دستکاری کے کام کرتی رہی ہیں اور اب تک ڈیرہ اور مضافات میں یہ گھریلو صنعت فروغ پذیر ہے۔

گڈی گڈے کا کھیل بھی بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو گھریلو دستکاری کے مشاغل کی طرف راغب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کھیل کے ذریعے شروع ہی سے گھروں میں بچوں کو گھریلو دستکاریوں کے ان کاموں کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے اور کھیل کھیل میں گھروں میں بنائی جانے والی دستکاریوں کو فروغ

حاصل ہوتا ہے۔ یہ کھیل کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ دو سہیلیاں آپس میں یہ طے کر لیتی ہیں کہ ہم نے گڈی اور گڈے کی شادی کرنی ہے۔ ایک سہیلی گڈا بناتی ہے اور دوسری گڈی بناتی ہے۔ چنانچہ گھروں میں ہی اس قسم کی خوبصورت کپڑے کی گڈیاں بنائی جاتی ہیں۔ کپڑے پر ہاتھ کی سلائی کے ذریعے دھاگوں کے ساتھ گڈی اور گڈے کی اشکال بنائی جاتی ہیں اور پھر ان کے اندر روئی، خس یا خشک گھاس بھر دی جاتی ہے اور اس طرح خوبصورت سے خوبصورت گڈیوں کے نمونے بنائے جاتے ہیں۔ گڈی کو دلہن بنانے کے لئے اسے خوب سجایا جاتا ہے۔ اس کے لئے خوبصورت سرخ جوڑا بنایا جاتا ہے۔ ساتھ خوبصورت دوپٹہ اور دیسی زیورات اسے پہنائے جاتے ہیں جبکہ گڈے والی سہیلی اسی نوعیت کا ایک گڈا بناتی ہے اور اسے ضروری لباس زیب تن کروا کر دولہا بنایا جاتا ہے۔ طرفین سے دیگر سہیلیاں بھی اس کھیل میں حصہ لیتی ہیں۔

گڈے کی بارات بڑے اہتمام کے ساتھ نکلتی ہے۔ بچیاں اور نوجوان لڑکیاں ڈفلی بجا کر گاتی ہیں اور پھر گڈے کی بارات گڈی والے گھر پہنچتی ہے۔ جہاں پہلے ہی سے شادی والے گھر کا سماں ہوتا ہے۔ وہاں بچیاں گاتی ہیں مقامی رقص کرتی ہیں اور پھر کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ شادی جیسی تمام رسومات ادا ہوتی ہیں اور پھر گڈی کو گڈے کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا ہے۔ گڈے والے گھر میں گڈی اور گڈے کو کسی جگہ ایک ساتھ رکھا جاتا ہے جو کہ گھر کی سجاوٹ کا ایک حصہ بنتا ہے۔ اس سارے کھیل میں طرفین کی طرف سے والدین اپنی بچیوں کی مکمل حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ کھیل ان کی گھریلو دستکاریوں کے فروغ اور بچیوں کو یہ دستکاریاں سکھانے کا سبب بنتا ہے جو گھر کی ہر ماں کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی بچیاں گھریلو ضروریات کی تکمیل کے لئے یہ دستکاریاں سیکھ کر والدین کے لئے معاون ثابت ہوں۔

لوک علاج

ڈیرہ اسماعیل خان اور نواحی بستیوں اور پہاڑی قبیلوں میں روایتی اور دیسی طریقہ علاج اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ارتقائے زمانہ کے ساتھ ساتھ ان دیسی اور روایتی علاج کے طریقوں میں بھی تھوڑا بہت فرق آیا ہے۔ مگر قدیم روایت پسند لوگ گھریلو ٹوٹکوں، جڑی بوٹیوں اور دیگر عقائد سے تعلق رکھنے والے علاج کو ہر دور میں اہمیت دیتے رہے ہیں۔ یہ علاج معالجے کے وہ طریقے ہیں جو کہ نسلوں میں سینہ بسینہ چلتے ہیں یا پھر قدیم حکماء کے قلمی نسخوں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں مختلف جڑی بوٹیوں اور سفوف کے ذریعے علاج کئے جاتے ہیں۔ ڈیرہ میں اب بھی دریائے سندھ کے کنارے جھونپڑیوں میں رہنے والے یہ سنیاسی لوگ شہروں اور دیہاتوں میں پھر پھرا کر علاج کرتے ہیں۔

آشوب چشم: آشوب چشم ہو تو گھریلو طور پر چاسقو کو کوٹ کر اس کے سفوف کو آنکھوں میں ڈالتے ہیں۔ چاسقو کی ٹھنڈک کی وجہ سے آنکھوں کی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں یا پھر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے ململ کے کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو کاٹ کر آنکھوں پر رکھ دیا جاتا ہے اور پھر اس ٹکڑے پر دہی ڈال دیا جاتا ہے۔ دہی کی ٹھنڈک کی وجہ سے آنکھوں کی گرمی ختم ہو جاتی ہے۔

زکام و نزلہ اور بخار کے علاج: ڈیرہ اسماعیل خان کے لوگ زیادہ تر راجستھانی علاقوں سے آئے ہوئے ہیں یہ لوگ امراض کے علاج کے لئے وہی طریقے استعمال کرتے ہیں جو راجستھانی لوگوں میں رائج ہیں۔

چنانچہ جن لوگوں کو زکام و نزلہ ہو جائے تو دیسی طریقہ علاج یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی طور پر گاڑھی لسی میں کچا دودھ ڈال کر پیتے ہیں۔ اگر سردی کی وجہ سے زکام اور نزلہ ہو تو گرم حلوہ یا انڈہ ابال کر کھلاتے ہیں اور پھر مریض کو لٹا کر اس کے اوپر کمبل یا رضائی ڈال دیتے ہیں۔ اس سے مریض کو پسینہ آ جاتا ہے۔ اس پسینے سے مسام کھل جاتے ہیں اور آدمی تندرست ہو جاتا ہے۔

پیٹ کے کیڑوں کا دیسی علاج: اکثر بچوں کے پیٹ میں کیڑے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بچے کمزور ہونے لگتے ہیں۔ آنتوں میں درد ہوتا ہے اور رنگ بھی زرد ہونے لگتا ہے۔ یہ بچوں کے پیٹ میں کیڑوں کی علامات ہوتی ہیں۔ ڈیرہ اور مضافات میں اس کا دیسی علاج یہ ہے کہ اسے بچوں کو طبیے کا بنا ہوا سفوف دیتے ہیں اور ساتھ ہی شکر قندی کھلا دیتے ہیں۔ اس سے بچوں کے پیٹ سے کیڑے نکلتے ہیں اور بچے تندرست ہو جاتے ہیں۔

ہڈی پٹھے کا روحانی علاج: ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے شمال مشرق کی جانب حضرت شیخ محمد یوسفؒ کا مزار ہے۔ وہ لوگ جنہیں ہڈی، پٹھے کا درد ہو تو ایسے مریض اس مزار پر جاتے ہیں وہ مزار پر حاضری دے کر دعا کرتے ہیں اور سجادہ نشین کے پاس شیخ محمد یوسفؒ کا ایک جوتا ہے جو کہ متعلقہ درد کی جگہ پر پھیرتے ہیں اور ساتھ ہی تیل دم کر کے اور تعویذ لکھ کر دیا جاتا ہے۔ تیل کی مالش صبح شام کی جاتی ہے۔ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اس روحانی عمل سے مریض شفا پا جاتے ہیں۔

انڈس کوہستان

محل وقوع

انڈس یا آباسن کوہستان پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کا ایک دُور افتادہ ضلع ہے جو پاکستان کے مشہور ہمالیائی سلسلہ کوہ میں 34.40 سے 30.35 طول بلد اور 2.50 سے 75.30 عرض بلد پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں شہزادہ سیف الملوک کے نام سے منسوب مشہور جھیل (ملک سر) کا علاقہ ناران واقع ہے۔ الائی کی طرف قدرتی حد بندی اندرک اور چوڑ کے پہاڑ، جبکہ کاغان اور ناراں کی حد بندی لیدی اور سپٹ کی مشہور گرمائی چراگاہیں اور اس کے پہاڑ کرتے ہیں۔ مغرب میں پختونوں کے مشہور یوسف زئی قبیلے کا ضلع سوات، شمال میں پریوں کی آماجگاہ نانگا پربت کی وادیاں چھلاس، تانگر اور داریل جبکہ شمال مغرب میں غذر، کالام اور چترال کی وادیاں واقع ہیں۔

شاہراہ ریشم اور مشہور دریائے سندھ جسے مقامی زبان میں سن کہا جاتا ہے اس ضلع کے وسط سے گزرتا ہے۔ شاہراہ ریشم پاکستان اور چین کے مابین ایک اہم زمینی رابطہ اور تجارتی ذریعہ ہے۔ یہ راستہ وسط ایشیاء کے سیاحوں، تاجروں اور فاتحین کی گزرگاہ اور وسط ایشیاء کو سرزمین سندھ سے ملانے کا ایک اہم ذریعہ بھی رہا ہے۔ جغرافیائی طور پر کوہستان ایک ایسے خط پر واقع ہے جہاں ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش کے مشہور پہاڑی سلسلوں کے ماحولیاتی منطقوں کی قدرتی حد بندی قائم ہوتی ہے۔ شاہراہ ریشم کے آس پاس عالمی اہمیت کے اہم چٹانی کتبات پائے جاتے ہیں جو مختلف تاریخی ادوار، زبانوں، قوموں، مذاہب اور تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ (رازول، 199 صفحہ 9)

معیشت: کوہستان کے لوگ گلہ بانی معیشت کے حامل ہیں۔ ثقافتی طور پر موسمی نقل مکانی کرتے ہیں۔ (فریڈرک بارتھ 1956) معیشت کا انحصار زراعت، جنگلات، شکار اور گلہ بانی پر ہے۔ سرما میں لوگ مزدوری کے لئے زیریں شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ نقد آمدن کے لئے جنگلات کی کٹائی، جڑی بوٹیاں، دنداسہ، ایندھن کی لکڑی، اخروٹ، گھی، اون، لوبیا کی بالیں، جنگلی حیات کا شکار، اسلحہ کالین دین اور معدنیات سے استفادہ اور گھروں میں شہد کی مکھیاں پالنے کا عام رواج ہے جس سے وافر مقدار میں شہد حاصل ہوتا ہے۔ (رازول، 1998 صفحہ 11)

رقبہ اور آبادی: ضلع کوہستان 7581 مربع کلومیٹر رقبہ پر محیط ہے۔ اس کا صدر مقام داسو (ڈسو) ہے جو تین تحصیل پالس، تحصیل پٹن اور تحصیل داسو پر مشتمل ہے۔ (بحوالہ سنسز رپورٹ برائے کوہستان 1998ء)

تفصیل	رقبہ (مربع کلومیٹر)	کل آبادی (ہزاروں میں)	مرد	خواتین
ضلع کوہستان	7581	472.570	261.942	210.628
تحصیل پالس	(اندازاً) 1723	165.613	92.330	72.283
تحصیل پٹن	(اندازاً) 1700	122.211	66.746	55.465
تحصیل داسو	4158	184.746	102.866	81.880

کوہستان کا سیاسی اور انتظامی پس منظر:

کوہستان کے باشندے نسلیاتی، نسبی، لسانی، ثقافتی، تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے شمالی علاقہ جات کی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کل یہ علاقہ انتظامی طور پر شمال مغربی سرحدی صوبہ میں شامل ہے۔ یونانی مورخین ہیروڈوٹس اور پٹولمی نے ان کو ہستانی علاقوں کو ددیکائے کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ماضی بعید میں یہ علاقہ عملی یا فرضی طور پر کئی بیرونی حکمرانوں کی قلمرو میں شامل رہا ہے جیسا کہ مختلف چٹانی کتبات سے ظاہر ہوتا ہے (احمد حسن دانی، 1990، 1983، کارل جٹمار 1982ء)۔ ماضی میں وادی گریز جموں کشمیر سے لے کر ہندوکش تک پائے جانے والے لوگوں کو عمومی طور پر داردی یا دردی قبائل کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ روسی محقق یوری کنکوفسکی (پاکستان کی قومیتیں صفحہ 69) کا کہنا ہے کہ یہ لوگ ہخامنشی سلطنت کے ساتویں صوبہ میں رہتے تھے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ داردقبائل گندھارا کے پڑوسی علاقوں میں رہا کرتے تھے۔ انہوں نے ایرانی فوج میں ایک ہی دستہ میں گندھاریوں کے شانہ بشانہ ایک سپہ سالار کے تحت کئی لڑائیاں لڑیں ہیں۔

قبائلی دور میں کوہستان کا علاقہ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقہ جات میں شامل تھا اس کے معاملات پولیٹیکل ایجنٹ کے تحت پہلے اوگی اور بعد میں بٹگرام میں طے ہوتے تھے۔ انگریزوں کے دور میں یہ لوگ اپنے معاملات کاغان میں طے کیا کرتے تھے اور انگریز سرکار باقاعدہ طور پر انہیں کاغان میں مدعو کرتی جہاں انہیں

Northern
Areas
Chitral
Kohistan
District
AFGHANISTAN
Pattan
Peshawar
AJ&K
Islamabad
D.I.Khan
Lahore

TEHSIL PATTAN
DISTRICT KOHISTAN

Kilometres 5 0 5 10 Kilometres

قیام وطعام کی سہولت بھی فراہم کی جاتی تھی۔

جہاں تک کوہستان کا تعلق ہے تو اس کے شمال میں تبتیوں، کشمیریوں، چینیوں اور آخر میں سکھوں اور انگریزوں کا عمل دخل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ کشمیر سے متعلق مشہور کتاب راج ترنگنی کے مطابق دارد قبائل اپنے سردار کی سربراہی میں متحد رہتے اور اکثر کشمیر پر حملہ آور ہوتے۔ اس طرح یہ کوہستانی قبیلے کبھی یہ اہل چھلاس سے الحاق کر کے کشمیر اور کاغان پر حملے کرتے۔ کتاب راج ترنگنی جلد دوئم آٹھویں ترنگ صفحہ ۱۷۳ پر ان دارد قبائل کے متعلق لکھا ہے:

"انہوں نے ان تمام علاقوں کو اپنے گھوڑوں سے بھر دیا اور فرمانروائے قوم دارد کے کیمپ میں جا شریک ہوئے۔ جب داردوں کا حاکم اس طرح والیان ریاست کو جمع کر رہا تھا ان کے باجگوار حاکم تمام اطراف سے آ کر بھوج کے پاس جمع ہوئے وہ ایک عجیب بولی بولتے تھے"۔

کوہستانی والی سوات اور والی امب کی لڑائی میں بھی بعض اوقات شریک ہوتے اور ان کے لئے خطرات پیدا کرتے۔ کبھی گجروں کے ساتھ مل کر انگریز فوجیوں پر حملے کرتے (جیسا کہ انہوں نے 1857ء میں گوجروں اور سیدوں کے ساتھ مل کر بقیہ ہندوستانی رجمنٹ 55 کو جب وہ کشمیر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے قتل کیا) اور کبھی داریل، تانگر والوں سے مل کر چھلاس میں انگریزوں پر حملہ کرتے (جیسے 1989ء میں انہوں نے چھلاس قلعہ پر حملہ کیا)۔

یہ لوگ کثیر الاگروہی مرکزی نظام میں متحد رہتے تھے اس لئے یہ علاقے بیرونی حملہ آوروں سے زیادہ تر محفوظ تھے اور کسی سے یہ علاقے فتح نہ ہوئے (کارل جٹمار ۱۹۸۹ء)۔ مشہور محقق کارل جٹمار کا کہنا ہے کہ ماضی میں یہ علاقہ اور وادی کنہار بلورستان کی قلمرو میں بھی شامل رہے ہیں۔

1936ء میں والی ریاست سوات نے ان علاقوں کا رخ کیا کیوں کہ وہ انہیں اپنی ریاست کے لئے خطرہ سمجھتے تھے دوسری طرف انگریزوں نے بھی انہیں شہ دی کہ وہ ان آزاد علاقوں کو فتح کریں۔ اس طرح کوہستانیوں اور یوسف زئی پٹھانوں کے مابین بشام کے لہرنالے کے قریب زبردست معرکہ ہوا جس میں بہت سے پٹھان مارے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے مقامی ملکوں اور قبیلوں کی حمایت سے 1937ء میں وادی دبیر، جنوری 1939ء میں وادی پٹن اور جولائی 1939ء میں کھندیا اور سیئو وادی پر قبضہ کر لیا اس طرح کوہستان کا مغربی علاقہ ریاست سوات کا حصہ بن گیا۔ کوہستان کا مشرقی حصہ جو درہ مدخیل سے جلکوٹ تک پھیلا ہوا ہے 1976ء تک آزاد رہا۔ 1974ء کے تباہ کن زلزلہ کے بعد اور اُس وقت کی حکومتی اصطلاحات کے تحت کوہستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کو ملا کر 28 اکتوبر 1976ء میں اسے ایک ضلع کا درجہ دیا گیا۔ 1976ء سے قبل وادی ہربن اور شتیال کا علاقہ شمالی علاقہ جات میں ضم تھا تاہم بعد میں ان علاقوں کو ضلع کوہستان میں شامل کیا گیا۔

ارضیاتی ماحول: کہساری حُسن سے مالا مال یہ خطہ خشک مرطوب جنگلاتی منطقہ کہلاتا ہے۔ جس کے زیریں علاقے خاردار جھاڑیوں زیتون اور شاہ بلوط کے درختوں کے مخلوط نباتاتی تسلسل ظاہر کرتے ہیں۔ نیز بالائی وادیاں مخروطی درختوں کے قدرتی گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہیں جہاں جگہ جگہ چوڑی پتی کے درختوں پر مشتمل قطعات اپنی خزاں پذیر کیفیت سے قدرتی نظارے کو دلکش بناتے ہیں۔

آب و ہوا: کوہستان پہاڑوں اور پہاڑی زرعی علاقہ پر مشتمل ہے۔ کئی بلند پہاڑ اور گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں جن میں دیودار، کائل، چیڑ، پڑتل، جونپر، چلغوزہ، کوٗ، بلوط، شیشم، اخروٹ اور منو کے جنگلات سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ بلند برفانی چراگاہی سلسلوں میں چھوٹے میدانی اور ہموار رقبہ جات بھی پائے جاتے ہیں۔ موسمی لحاظ سے کوہستان کے بالائی اور وسطی علاقہ میں گرمیوں میں موسم خوشگوار اور سردیوں میں سخت سرد رہتا ہے۔ بالائی علاقوں میں سرما میں شدید برف باری ہوتی ہے اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ زیریں علاقے جو دریائے سندھ کے آس پاس واقع ہیں، وہاں گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی ہوتی ہے۔ مون سون کی بارشوں کا انحصار ہواؤں کی شدت اور تواتر پر ہوتا ہے۔

وادیاں: کوہستان کے لوگوں میں ہر خودمختار وادی کو روم قرار دینے کی عام عادت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر روم کا اپنا اپنا کردار، قوت، شناخت اور وسائل ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر جلکوٹ، ہربن، پالس، کولئی، پٹن، کھندیا، دبیر الگ الگ روم سمجھے جاتے ہیں۔ اس قسم کی لوک اصطلاح کے پیچھے شاید روایتی طور پر وسائل کی تقسیم اور لوگوں کی تنظیمی صف بندی کا تاریخی عنصر غالب ہو۔ ہر فرد کو اپنے اپنے روم کی لاج رکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

کوہستان بنیادی طور پر دو بڑے رقبہ جات میں منقسم ہے جو مغربی اور

مشرقی کوہستان یا سوات اپر ہزارہ کوہستان بھی کہلاتے رہے ہیں۔ مغربی حصہ کی وادیوں میں بنکھڑ، ڈبیر، ججیال، پٹن، کیال، سیو، رزقہ، کھندیا (کھلی) اور گبرال جبکہ مشرقی حصہ میں درہ مدخیل، بٹیڑہ، کولئی، پالس، جلکوٹ، ثمر، ہرمین شتیال اور سازین کی وادیاں شامل ہیں۔ ان وادیوں اور اس کے باسی لوگوں کی روایتی عادات، خصلت اور سماجی رویوں کے متعلق ایک بزرگ نے کئی دہائیوں پہلے جو کچھ کہا تھا وہ اب بھی ان پر صادق آتا ہے:

	وادی	خاصیت
☆	کولئی	طورہ (بہادری)
☆	پالس	ڈول (بناؤ سنگھار)
☆	پٹن	اقبال (عزت، قسمت)
☆	جلکوٹ	جہالت/ضد
☆	کھندیا	لنگر (لشکر)
☆	بنکھڑ	غنڑے (خواتین)
☆	دیر	جرگہ
☆	سیو	تکبر (غرور)
☆	کیال	گھنڈولئی (کدو)

درہ مدخیل: اس وادی کا نصف حصہ کوہستان اور نصف ضلع بٹگرام میں واقع ہے۔ جو حصہ کوہستان میں ہے وہاں شنا زبان بولی جاتی ہے اور جو الائی میں شامل ہے۔ وہاں پشتو بولی جاتی ہے اور سواتی پٹھان آباد ہیں۔ علاقہ میں اکا دکا مقامات پر پرانے قبرستان اور مساجد پائی جاتی ہیں۔ علاقہ گزار دشوار ہے۔

وادی بٹیڑہ: یہ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹی سی وادی ہے۔ یہاں بٹیڑی زبان بولنے والے قبیلے آباد ہیں۔ ان کی تعداد 30000 کے لگ بھگ ہے۔ اس وادی میں کافی دشمنداریاں پائی جاتی ہیں۔ اکا دکا قبرستانوں اور مساجد میں لکڑی کی کنندہ کاری کا کام پایا جاتا ہے۔ طرز تعمیر اور روایات کوہستان کی دوسری وادیوں جیسی ہیں۔ یہاں اس قبیلہ کی ایک مشترکہ مسجد پائی جاتی ہے جس کے صدر دروازہ، ستونوں اور ان کے تاج پر لکڑی کی کنندہ کاری کے اچھے نمونے ہیں۔

مہارن/مھہارن: مہارن کا علاقہ گو کہ وادی کولئی کے روم میں شامل ہے تاہم یہ علاقہ اپنی دو معدوم ہونے والی زبانوں چھلسیو اور گبارہ کی وجہ سے علمی اور تحقیقی حلقوں کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ یہ ججیال علاقہ کے مقابل واقع ہے۔

وادی کولئی: وادی کولئی لوگوں کی دشمنداری اور ضدی رویوں کی وجہ سے کوہستان میں مشہور ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی قبیلہ ایسا ہو جو کہ دشمن داری میں الجھا ہوا نہ ہو۔ ان لوگوں کو پُشت، پُھر تیلے اور نشانہ بازی کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی مسجد میں لکڑی کی کنندی کاری کا پرانا کام اور قبروں پر لکڑی کی کنندہ کاری کے اچھے نمونے پائے گئے ہیں تاہم لکڑی کا یہ کام آہستہ آہستہ متاثر ہو رہا ہے۔ وادی میں دیواروں کے بیل بوٹوں کا بھی رواج پایا جاتا ہے جو کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر بنائے جاتے ہیں۔ ریشم کی عمدہ کشیدہ کاری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ یہاں پرانی آبادیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک جگہ کا نام کافر بانڈہ ہے۔ اس وادی کے زیریں مقامات پر گندم اور مکئی کی کاشت کی جاتی ہے۔ لوگ موسمی نقل مکانی کرتے ہیں۔ یہاں حجرے اور قلعے پائے جاتے ہیں۔ علاقہ دشوار گزار ہے۔ اس کے اہم مقامات میں ہُنگلی، قلعہ، ڈوگا، کافر بانڈہ، میدان، رجم کوٹ، شمیال، مہارن وغیرہ شامل ہیں۔ اس وادی میں کبھی ڈوم اور کمہاروں کے کافی گھرانے پائے جاتے تھے۔ اب ان گھرانوں نے پیشہ ترک کر دیا ہے۔ یہاں کے ڈوم رمیم زیادہ مشہور تھے جو شادی بیاہ کے دوران اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بعض رزمیہ گیتوں میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں شنا زبان کے ایک معمر لوک شاعر ستبر بقید حیات ہیں جو چار بیتہ، صود اور صوت رونگو کے شاعر ہیں۔

اس وادی میں دو مذہبی شخصیات دقو پیر یا ڈگو بابا اور مذوف بابا کے مدفن پائے جاتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے کولئی میں اسلام کی روشنی پھیلی۔ 1984ء میں (مولوی ملوک مرحوم جو اس وقت ستر سال کے تھے) مجھے بتایا کہ ڈگو بابا کی اصل قبر بیس ہاتھ لمبی ہے۔ بعض مقامات پر لوہاروں کی دکانیں پائی جاتی ہیں جو کہ مسجد سے ملحقہ ہیں۔ اس وادی کی ایک مشہور خاتون ابوئی دادی بھی گزری ہیں جنہوں نے اسلام پھیلانے کے ابتدائی ایام میں کافی محنت کی تھی۔

بنکھڑ وادی: یہ وادی دوبیر اور بشام کے درمیان واقع ہے۔ آدھی ضلع کوہستان اور آدھی ضلع شانگلہ میں واقع ہے۔ یہاں کوہستانی زبان کا بنکھڑی لہجہ بولا جاتا ہے۔ دشمنداری کی شرح دوسری وادیوں سے نسبتاً کم ہے۔ کئی گھرانے بشام میں آباد ہیں۔

رانولیا اور دوبیر: رانولیا اور دوبیر یہاں کی دو وادیاں ہیں۔ دونوں وادیاں دوبیر بازار سے اوپر دروں میں واقع ہیں۔ یہ وادی دو ملک گھرانوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ جن کے حجرے اور مہمان خانے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ اس وادی میں پشتو بولنے والا جاگی قبیلہ بھی آباد ہے۔ نسبی اعتبار سے یہاں کے قبیلے کھندیا کے قبیلوں کے قریب ہیں۔ یہاں ملاخیل اور گٹرخیل قبیلہ زیادہ بااثر ہے۔ اندرون وادی خوبصورت اور زرخیز ہے۔ لوگ مہمان نواز ہیں۔ یہ وادی دو بزرگ شخصیات جاگ بابا اور باباجی کی وجہ سے بھی مشہور ہے جو علمی اور روحانی حیثیت رکھتے تھے۔

پالس وادی: یہ وادی کئی حوالوں سے بیرون دنیا بھی مشہور ہے۔ اس وادی کے ایک طرف وادی الائی، کاغان اور جھیل سیف الملوک سر یعنی ناران کا علاقہ واقع ہے۔ اس جھیل سے لے کر پالس کے وہ تمام پہاڑ جن کی چوٹیاں جلکوٹ اور ناران سے ملتی ہیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ جنگلی سرسوں کے پودے جوان پہاڑوں پر پائے جاتے ہیں کا بیج شہزادہ سیف الملوک کی محبوبہ بدیع الجمال نے اس وقت بویا تھا جب وہ اسے چھوڑ کر اپنے ملک چین بھاگ گئی تھی۔ سرسوں کے بیج کو پہاڑ پہاڑ پھینکنے کا مقصد یہ تھا کہ شہزادہ سیف الملوک وہاں وہاں سے گزر کر اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہے۔ پالس وادی کے شمال میں مشہور پہاڑ بہادر سیر واقع ہے۔ جلکوٹ کے لوگ اس پہاڑ کو لاشی گلاش کا نام دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر پریوں کا مسکن ہے اور ماضی بعید میں اس چوٹی پر دیوزادے سالانہ تہوار مناتے اور کشتیاں لڑا کرتے تھے۔ (چند مقامی لوگوں نے اس کی چوٹی سر کی ہے اور کہتے ہیں کہ وہاں چھوٹا سا میدان ہے اور گول دائرہ میں بیٹھنے کے لئے پتھروں کی سلیں بچھائی ہوئی ہیں۔ (اس چوٹی سے ایک مسافر طیارہ ٹکرا کر تباہ ہو چکا ہے۔)

وادی پالس کی مساجد اور قبرستانوں میں لکڑی کی کندہ کاری کے پرانے اور اچھے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مکانوں کی دیواروں پر بیل بوٹے بنانے کا رواج ہے۔ بیل بوٹے سفید مٹی یا شیشی رنگ سے بنائے جاتے ہیں۔ یہاں ریشمی کشیدہ کاری کے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں۔ لوگ موسمی نقل مکانی کرتے ہیں۔ گھنے جنگلات اور بلند چراگاہوں کے حوالہ سے یہ وادی کافی مشہور ہے۔ اس وادی کی اہم چراگاہوں میں گھنجا، موڑو، چوڑ، لیدی اور پوڑو قو شامل ہیں۔

گھروں میں شہد کی مکھیاں پالنے کا عام رواج ہے۔ دیسی گھی اور ادویاتی جڑی بوٹیاں بھی دوسری وادیوں یا علاقوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ اس وادی میں بعض مقامات پر پرانی آبادیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں جیسے سکھانو دار۔ ان لوگوں کی کئی بڑی لڑائیاں الائی اور کاغان کے لوگوں سے ہوئی ہیں۔ اس وادی میں اب کمہار، ڈوم وغیرہ کا کوئی بھی گھرانہ موجود نہیں تاہم لوہار اور جولاہوں کے اکا دکا گھرانے پائے جاتے ہیں۔ کوئی تیس سال قبل ان لوگوں نے گندم اور چاول کی کاشت ترک کر دی تھی۔ اب دوبارہ زیریں وادی گندم کی کاشت شروع کی ہے۔ یہاں وافر مقدار میں جنگلی سبزیاں اور میوہ جات پائے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر گہا گہی پائی جاتی ہے۔ عام طور پر روایتی ناچ گانا ختم ہو رہا ہے تاہم اکا دکا شادیوں پر اب بھی ناچ گانا اور مجلس (لوک شاعری) ہوتی ہے (دسمبر ۲۰۰۳ء میں کھلیار کے گاؤں میں جناب حباب کے بیٹے کی شادی کے دوران مشاہدہ کیا گیا) اس وادی کے اہم مقامات شراکوٹ، شریال، پارو، کھلیار، گدار، شرید، کنڈل، بچ بیلہ اور کنشیر ہیں۔ یہاں بھوج پتر کے گھنے جنگلات بھی پائے جاتے ہیں۔ بھوج پتر کو اب بھی تعویز لکھنے اور کئی دوسرے کاموں میں استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ یہاں کا پرانا اہم مقام گول تھا جو کہ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ مقام 1947ء کے زلزلے سے ایک بار تباہ ہو چکا ہے۔ یہاں کھدائی کے دوران پرانے زمانے کی ایسی ٹھیکریاں زمین سے نکلتی ہوئی پائی گئی تھیں جو اس وادی میں ظروف سازی کے ایک اچھے دور کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وادی شریال میں کئی مقامات پر راکھ بھرے برتن بھی ملتے رہتے ہیں جو قبل از اسلام کے دور میں ہندو مذہب کے لوگوں کے مدفن کی عکاسی ہے۔ مقامی خواتین خود ہی مٹی کے اکا دکا برتن بناتی ہیں۔ یہاں غازی شہید، اخون بابا (اخون رفن) اور بارہ شہداء کے مدفن پائے جاتے ہیں۔ وادی میں حجرے اور قلعے پائے جاتے ہیں۔

وادی پٹن: وادی پٹن کی زیادہ شہرت سونے کے ہار کی دریافت سے ہوئی تھی جو اماں حافو کو ملا تھا۔ یہ وادی شروع میں ایک اور بعد میں دو دروں پر مشتمل ہے۔ اس کا بڑا گاؤں پٹن ہے جو کہ ایک بار 1974ء کے زلزلہ سے بالکل ختم ہو گیا تھا۔ تاہم یہ گاؤں اتنا پرانا نہیں تھا بلکہ دریائے سندھ کے ایک بڑے سیلاب کے بعد اس کی آبادکاری ہوئی تھی۔ یہاں کے قدیم گاؤں کا نام اُمراہ گاں ہے جو موجودہ شاہراہ ریشم سے چند کلومیٹر اوپر موجودہ چھوادرہ روڈ کے قریب واقع

ہے۔اس کے متعلق جو لوک کہانی پائی جاتی ہے اس کے مطابق صدیوں قبل اس گاؤں میں اُمراء نام کا ایک راجہ رہتا تھا اور یہ گاؤں اسی کے نام سے موسوم تھا۔اب اس جگہ کوٹ اور بلوط کے جنگل ہیں تاہم مکانوں اور کھیتوں کی دیواروں کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔

یہاں ایک چھوٹا سا میدان بھی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں یہ لوگ اپنے روایتی تہوار منایا کرتے تھے لیکن اُن تہواروں کی اقسام یا نوعیت کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ایک جگہ پتھر جوڑ کر بنائی گئی دو کرسیاں بھی نظر آتی ہیں جنہیں بعد میں لوگوں نے توڑ دیا تاہم بنیادوں کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ روایتی تہواروں کے دوران اس وقت کا حاکم اور اس کی ملکہ ان کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔اس وادی میں جو قدیم بستیاں یا گاؤں پائے جاتے تھے اُن میں اُمراء گاں، بَدیدَن، شولدَن اور بَنیل کے مقامات شامل ہیں۔اُمراء گاں سے کچھ آگے ایک مقام پر ایک غار ہے جو کہ اندازاً پچاس فٹ گہرائی میں ہے۔آخر میں کوئی آٹھ دس فٹ جگہ پائی جاتی ہے جہاں بیٹھنے کی جگہ ہو سکتی ہے۔یہاں کئی دفعہ لوگ اندر آتے جاتے رہے ہیں اور مٹی کے قدیم برتن بھی نکالے گئے ہیں۔(جن میں سے ایک اب بھی موجود ہے) کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بھی پائی جاتی تھیں۔جب اماں حافو کو ہار ملا تو اس کے بعد لوگوں نے اس غار کو بھی الٹ پلٹ کر دیا اور اب کسی نے اس کے اندر دیوار لگا کر اس کے کھلے حصہ کو بند کر دیا ہے۔اس مقام سے قدرے نیچے ایک اور مقام پر ایک چٹان کے اوپر تاج اور تیر کے نشانات کندہ تھے مگر اب توڑ دیئے گئے ہیں۔

یہاں ایک مقام چُویل کی گلی کے نام سے مشہور ہے۔اب یہاں جنگلی اخروٹ کے گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔اس وادی میں کئی چھوٹے دربار پائے جاتے ہیں۔قبرستانوں اور بعض مساجد میں بھی لکڑی کی کندہ کاری کے نمونے پائے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر متاثر ہو چکے ہیں۔وادی پٹن کی بڑی مسجد میں لکڑی کا نہایت اچھا کام پایا جاتا تھا لیکن بعد میں لوگوں نے مسجد کو پختہ کرنے کے دوران پرانی مسجد کی لکڑ فروخت کر دی۔علاقہ میں پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔یہاں کمی یا چھوٹی ذاتوں کے لوگ زیادہ تر دباؤ میں رہتے ہیں۔اس وادی میں سید، میاں گان، ڈوم، لوہار، ترکھان، جولاہے، سنیارے اور گجر ذاتوں کے کئی گھرانے آباد ہیں۔

پٹن وادی کی ایک لوک روایت: وادی پٹن میں دو بھائی تھے ایک امراء تھا دوسرا بدیدن بادشاہ۔ان کے سامنے کی وادی میں ایک دان تھا اور دوسرا شولدن بادشاہ۔یہ بھی آپس میں بھائی تھے۔ان کی وادی کے درمیان ایک ندی بہتی تھی۔دان بادشاہ کی ایک خوبصورت بیٹی تھی، ایک دن امراء بادشاہ نے دان بادشاہ کو پیغام بھیجوایا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے بیٹے کو دے دے۔دان بادشاہ کی بیٹی کو علم تھا کہ شہزادہ اس کی بجائے ایک کمہار کی بیٹی سے محبت کرتا ہے۔شہزادی نے اپنے باپ کو حالات بتا کر شہزادے سے شادی نہ کرنے کی استدا کی۔اُمراء بادشاہ نے دان بادشاہ کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس رشتہ کے بدلے میں منزی یا میزی کا علاقہ بھی اسے دے دے گا۔دان بادشاہ نے رشتہ دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس کا (اُمراء) بیٹا کمہار کی بیٹی پر فریفتہ ہے اس لئے وہ اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دے سکتا۔اُمراء بادشاہ نے اس بات کا کھوج لگانے کے لئے اپنے آدمیوں کو شہزادہ کے پیچھے لگایا۔ایک دن اُمراء بادشاہ کو اس کے آدمیوں نے بتایا کہ شہزادہ کمہار کی بیٹی کے ساتھ آبشار کے پاس (پٹن وادی کے اوپر) بیٹھا گپ شپ کر رہا ہے۔بادشاہ خود موقع پر گیا تو سچ پایا۔ بادشاہ نے بیٹے کو لاکھ سمجھایا کہ وہ اس کی شادی دان بادشاہ کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے اس لئے کمہار کی بیٹی سے ناطہ توڑ دے مگر شہزادہ نہ مانا۔آخر کار مجبور ہو کر شہزادہ اور کمہار کی بیٹی نے آبشار سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔اُمراء بادشاہ نے اس کا ذمہ دار دان بادشاہ کو ٹھہرایا اور کہا کہ وہ لڑائی کے لئے تیار ہو جائے یا علاقہ چھوڑ دے۔دان بادشاہ نے اپنے بھائی شولدن بادشاہ سے مدد مانگی، ان کی لڑائی شروع ہوئی۔جس میں دان بادشاہ مارا گیا۔شولدن بادشاہ اور شہزادی نے لڑائی بند کروائی اور باپ کی جگہ حکومت کرنے لگی۔

ایک سال اُمراء گاں میں تہوار کا انعقاد ہوا تو شولدن بادشاہ اور شہزادی کو بھی تہوار میں مدعو کیا گیا۔چنانچہ شہزادی کو خاص موقع مل گیا۔وہ تہوار میں شامل ہونے آئی۔شہزادی نے موقع پاتے ہی وار کر کے امراء بادشاہ کو قتل کر دیا مگر خود بھی نہ بچ سکی اسے اُمراء بادشاہ کے وزیر نے قتل کر دیا۔تب سے اس علاقہ پر بدیدن بادشاہ کی حکومت قائم ہوئی جو بہت ظالم تھا۔

ججیال: یہ ایک چھوٹی سی وادی ہے جسے پٹن وادی کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔تاہم اس وادی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مال مویشی کی حفاظت اور چارہ کا بندوبست خواتین کے ذمہ ہوتا ہے۔شادی کے فوراً بعد سسرال والے بہو سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون سے جانور کو پسند کرتی ہے اور پھر اس کی پسند کی گائے،

بھینس یا بکری خرید کر اسے دی جاتی ہے جسے پالنے کی وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔

جلکوٹ وادی: جلکوٹ کی وادی اس کے ضدی باسیوں اور ایک قیمتی پتھر پیراڈائیٹ کے حوالہ سے مشہور ہے۔ یہ کافی بڑی وادی ہے۔ جس کے کنارے کاغان اور ناران سے ملتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اس وادی کے دو مقامات تیال اور کنڑوٹ مشہور ہیں۔ روایات کے مطابق قبل از اسلام یہاں بوٹی سنگ نامی شخص مقامی راجہ یا حاکم تھا اور وہ لوگوں سے کم مقدار کا قلانگ یا مالیا قسم کا ٹیکس لیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں یہ حکمت میں ماہر تھا۔ گرمیوں میں ایک پہاڑی سرنگ میں رہا کرتا تھا۔ بعد میں اسے تولو اور دودو کوٹ نامی دو بھائیوں نے قتل کیا۔ اس وادی میں کئی مقامات پر پرانے آثار پائے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں اسی وادی سے ایک راستہ شمال کی جانب گزرتا تھا۔

اس وادی کی سپٹ چراگاہ بہت وسیع اور مشہور ہے جس میں پیراڈائیٹ کا قیمتی پتھر پایا جاتا ہے جسے مقامی لوگ خود نکال کر بیچتے ہیں۔ وادی میں حجرے اور قلعے پائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات کی مساجد اور قبرستانوں میں لکڑی کی کنندہ کاری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ یہاں اشوک کے زمانہ کے چٹانی کتبات پائے جاتے تھے جو شاہراہ ریشم کی تعمیر کے دوران متاثر ہو چکے ہیں۔

بوڑھوں کو کھائی میں پھینکنے کی رسم: کہا جاتا ہے کہ پرانے وقتوں میں یہاں کے لوگوں کی لمبی لمبی عمریں ہوتی تھیں۔ یہاں یہ رواج تھا کہ جب کسی کے والدین عمر کی ایک خاص حد کو پہنچتے تو انہیں ان کے بیٹے اٹھا کر ایک گہری کھائی میں پھینک دیا کرتے تھے۔ یہ مقام جلکوٹ میں تیال کے قریب واقع تھا۔ کہتے ہیں ایک بار ایک شخص اپنے باپ کو اٹھا کر لے جانے لگا تو اس کے باپ نے ایک آہ بھری اس پر بیٹے نے پوچھا:

''کیا آپ کو موت سے خوف آ رہا ہے۔؟'' ''نہیں، موت سے خوف نہیں آ رہا بلکہ وہ لمحہ یاد آیا ہے جب ایک دن میں اپنے باپ کو اسی طرح یہاں سے اٹھا کر لے گیا تھا اور آنکھیں بند کر کے کھائی میں پھینک آیا تھا۔''

باپ کی بات سن کر اس شخص نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ اپنے باپ کو رسم کے مطابق کھائی میں نہیں پھینکے گا۔ اس طرح اس نے اپنے گھر کے اندرونی حصہ میں ایک خاص جگہ بنائی اور اپنے باپ کو وہیں چھپا کر بٹھا دیا۔ کچھ عرصہ بعد ارد گرد کے کسی راجہ قسم کے شخص کو کوئی مسئلہ درپیش آیا جو کسی سے حل نہ ہو سکا۔ یہ بات اس شخص کے ذریعے جب بوڑھے باپ تک پہنچی تو اس نے بیٹے کو اس کا حل بتایا جس نے جا کر اس راجہ کو بتایا۔ راجہ نے کہا کہ یہ حل کسی عام آدمی کا بتایا ہوا نہیں اسے اس دانا شخص کے متعلق مکمل معلومات دی جائیں جس نے یہ حل بتایا ہے۔ تب مجبوراً بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اس دن کے بعد بوڑھوں کو کھائی میں پھینک دینے کی رسم ختم کر دی گئی تا کہ علاقہ کے لوگ عمر رسیدہ لوگوں کی دانائی سے محروم نہ ہوں۔

سیوٗ وادی: یہ وادی ایک قدیم مسجد کے حوالہ سے کافی اہمیت رکھتی ہے جس میں لکڑی کی کنندہ کاری کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ یہاں پرانا قبرستان بھی ہے اور اکا دکا دربار اور درگاہیں بھی ہیں۔ سیوٗ کا قدیم گاؤں دریائے سندھ کے کنارے پر آباد تھا جو کئی سو سال قبل دریائے سندھ کے سیلاب میں تباہ ہو گیا تھا۔ یہاں کی موجودہ مسجد کے باہر وسیع میدان ہے جس میں فارغ اوقات میں بڑے، جوان اور بچے بیٹھا کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ تعلیم کی شرح دوسری وادیوں سے زیادہ ہے۔ لوگ موسمی نقل مکانی کرتے ہیں۔ سیوٗ کا ایک مقام رزقہ بھی اہم ہے۔ اس کے علاوہ دُوگا بھی شامل ہے۔

کھندیا وادی: یہ وادی اپنی زرخیزی اور بااعتبار لوگوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ کوہستان کے سب سے بڑے لوک شاعر مُلا رضول مرحوم کا تعلق اسی وادی سے تھا۔ کہتے ہیں اس وادی میں قبل از اسلام کھاندی نام کے شخص کی مقامی حکومت ہوا کرتی تھی اور یہ وادی اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس وادی میں گجر قبیلہ کے بہت سے گھرانے وادی گبرال میں آباد ہیں۔ اس کی بیرونی حدود تانگر، غذر اور کالام کوہستان سے ملتی ہیں۔

کائیگاہ وادی: یہ ایک چھوٹی سی وادی ہے جس کی زیادہ تر آبادی شاہراہ ریشم کے آس پاس آباد ہے۔ اندرون وادی کا راستہ تنگ اور مشکل ہے۔ اسی لئے یہاں مارخور کی کافی آبادی پائی جاتی ہے

ثُمر وادی، سازین: یہ ایک چھوٹی سی وادی ہے۔ اس کے آباد کار سازین اور ہربن کے قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

شتیال: آثار قدیمہ کے حوالہ سے یہ علاقہ چٹانی کتبات کی موجودگی کی وجہ سے اہم مانا جاتا ہے۔ یہاں پائے جانے والے چٹانی کتبات قبل از تاریخ اور اس کے بعد کے ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ قبل از تاریخ کے دور سے تعلق رکھنے

والی اشکال میں پاؤں کی سادہ اشکال شامل ہیں۔ بعض مقامات پر جنگلی حیات کی اشکال پائی جاتی ہیں۔ کئی چٹانی کتبات میں ہُن، سوغدین، چاند دیوتا، اور بدھ سٹوپا زکی اشکال پائی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی دور میں یہ علاقہ اہم تجارتی مرکز یا گزرگاہ رہا ہے اور زائرین یہاں آ کر قیام کیا کرتے تھے اور ان چٹانوں پر اپنے نشانات چھوڑ جاتے تھے جو ابھی تک موجود ہیں۔ (حوالہ : احمد حسن دانی، 1995,1983، کارل جٹمار 2002 Harald Hauptmann، 1980، 1984، 1997، ص:۵۵، ص:۵۷، ص:۵۷، ص:۶۳)

ہربن وادی: کوہستان میں مکمل بستی یا گاؤں کی صورت میں کہیں آبادیاں پائی جاتی ہیں تو وہ صرف وادی ہربن ہے۔ یہ وادی بڑی زرخیز ہے۔ جہاں کم و بیش 29 بستیاں اور مقامات پائے جاتے ہیں۔ بالائی مقامات جو ہربن کوٹ سے اوپر واقع ہیں تین دروں پر مشتمل ہیں. پہلے اس کے دو درے ہیں اس کے ایک درہ میں آگے جا کر اس کے دو درے بن جاتے ہیں۔ اس وادی میں تین قوموں یا ذاتوں کے لوگ پائے جاتے جن میں دو حصے شن، اور ایک ایک حصہ یشکن اور کمین لوگ ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے پہلے نمبر پر شن، دوسرے پر یشکن اور تیسرے نمبر پر کمین لوگ پائے جاتے ہیں۔ شن لوگ یہاں کافی مضبوط ہیں۔ زیادہ تر بستیوں میں یہ گروہ الگ الگ آباد ہیں تاہم بعض بستیوں اور گاؤں میں اکٹھے رہتے ہیں۔ سب سے بڑا گاؤں کوٹ، اور اس کے بعد لیکو اور تھنگ ہیں۔ ہربن کی بستیوں میں سلطان آباد، مسرنگ زیریں، شم خون، مسرنگ بالا، کور، شل تہ، سنگی، گی، دارلی، سرگڑھی، دار، دلئے، دارگاہ، تھنگ، گلے، شموکر، بدک، گاکوز، سکری بسل، وڑنگ، بابنے، لرگم، لیکو، کوٹ، نلچ، برے، چیچولاٹ، مشونی، حرشنگ شامل ہیں۔ جو بستیاں اور مقامات اوپر دروں میں واقع ہیں ان میں جشلئے گاہ میں بٹئے، بکھن، سرین، ہریل، جشیل جبکہ بڑوگاہ سے آگے بلوشے گاہ کے درہ میں دیونگ، تھلکشے، سرگی ڈم اور کلچئے شامل ہیں۔ پکورے گاہ کے درہ میں اخوکو فاٹ، بریاستیر، ڈلو ددیر، منی تری، ڈوگو، بھٹہ باٹ اور شگو گاہ شامل ہیں۔

یہاں کے لوگوں میں دشمنیاں پائی جاتی ہیں اور جگہ جگہ قلعہ جات ہیں۔ وادی میں زرعی نظام کافی بہتر پایا جاتا ہے اور دستیاب پانی کے وسائل کو بہتر طور پر زرعی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف اقسام کی سبزیاں اور فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ باغات بھی پائے جاتے ہیں۔ کھلیان اصل زرعی زمینوں سے باہر بنانے کا رواج پایا جاتا ہے۔ گھروں کے اوپر اُتھروئی (الٹی وی کی شکل میں) لکڑی کے تختے لگائے جاتے ہیں۔ اس سے چھت ٹپکنے سے محفوظ رہتی ہے جب کہ برف باری کے موسم میں برف بھی خود بخود گر جاتی ہے۔ اس کے اندر گھاس ذخیرہ کی جاتی ہے۔ فن تعمیر روایتی بنیادوں پر استوار ہے۔

یہاں کی شادی شدہ خواتین سیاہ جبکہ غیر شادی شدہ خواتین پٹو کی سفید ٹوپی پہنتی ہیں۔ یہ ٹوپی گول نہیں ہوتی بلکہ چار کونوں والی ہوتی ہے اور عام طور پر چادر کے نیچے ہوتی ہے۔ اس سے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورت کی پہچان ہوتی ہے۔

علاقہ میں مضبوط روایتی نظام پایا جاتا ہے جس کے تحت موسمی نقل مکانی، فصلوں کی بوائی اور کٹائی، چیڑ پتوں والے جنگلات کی نگہداشت اور کئی دوسرے گروہی اور سماجی کاموں پر روایتی ضبط و کنٹرول کا نظام پایا جاتا ہے۔

کوٹ کی مسجد میں لکڑی کی کنندہ کاری کا کام پایا جاتا ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک حجرہ ہے اور باہر تین اطراف میں لگائے ہوئے تختے ہیں جو کہ یہاں کے مردوں کی بیاک (بیٹھنے کی جگہ) ہے۔ اس سے ذرا آگے ایک قلعہ ہے جس کی چھت اور حجرہ کے دروازہ پر لکڑی کی کنندہ کاری کا خوبصورت کام پایا جاتا ہے۔ کوٹ کے شروع میں دو قبریں پائی جاتی ہیں جو لکڑی کی عمدہ کنندہ کاری کے نمونے ہیں۔ یہ قبریں ایک بشیر و کے والدین کی بتائی جاتی ہیں۔ کوٹ نالہ کے دوسری طرف بھی ایک قبرستان ہے۔ جہاں لکڑی کا کام پایا جاتا ہے۔ گاؤں اور بستیوں میں کہیں بھی دیوروں پر روایتی بیل بوٹے نظر نہیں آئے۔ روایتی کنندہ کاری کا کام اس وادی میں دم توڑ رہا ہے۔ یہاں ڈوم ذات کے تین اور لوہار کا صرف ایک خاندان باقی بچا ہوا ہے۔ ڈوم مردوں نے اپنا روایتی پیشہ ترک کر دیا ہے اور آج کل کھڈی پر اون کی پٹی بناتے ہیں جو کہ جولاہوں کا پیشہ ہے۔ یہاں کچھ مروشو گھرانے بھی پائے جاتے ہیں یہ لوگ دریائے سندھ سے سونا چھان کر نکالنے کا پیشہ کرتے ہیں۔ اس پیشہ کا ذکر گزشتہ چودہ سو سال سے تواتر سے آ رہا ہے۔ روایتی لوک شاعری، ناچ گانا اور دوسری لوک رسموں کی ادائیگی میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ تاہم کوہستان کی دوسری وادیوں کی نسبت بول چال میں کافی آزادی پائی جاتی ہے۔ اور لوک ادب اور لوک شاعری پر اتنا دباؤ نہیں جتنا کہ کوہستان کی زیریں وادیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بعض اشیاء کو اٹھانے کے لئے شاخوں کی ٹوکریوں کا استعمال پایا جاتا ہے جسے پیٹھ پر اٹھانے کا رواج ہے۔ لوگوں میں موسمی نقل مکانی کی روایت پائی جاتی ہے۔ اس وادی میں شہدا کا ایک قبرستان پایا جاتا ہے۔ جو جنگ چھلاس میں شہید ہوئے تھے۔

مذاہب

چاند، تارے اور آتش پرستی: کوہستان اور چھلاس سے ملنے والے آثار قدیمہ سے متعلق چٹانی کتبات و اشکال سے معلوم ہوتا ہے اس خطے میں جادوٹونے کا آغاز وسطی ہجری دور میں شروع ہوا (یحی امجد، تاریخ پاکستان قدیم دور، 1989ء)۔

ان علاقوں میں چاند، سورج، آگ اور سانپ سے منسوب بعض لوک اعمال، رسمیں، روئی اور راتھی کا مقامی تصور، چاند گرہن کا لوک اعتقاد، بعض پرانی قبروں کے کتبے اور کئی رسمیں ایسی ہیں۔ جن میں قبل از اسلام کے دور اور مذاہب کا واضع پتہ چلتا ہے۔ (رازدل 1998، صفحہ 12)

پرویش شاہین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بدھ ازم سے پہلے یہاں کے لوگ اژدھا پرست تھے اور بشام کے مقام پر اژدھا پرستی کی بڑی عبادت گاہیں تھیں۔ اس کے بعد سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کی عبادت گاہ ہڈر کے مقام پر تھی۔ پروفیسر دانی کے بقول ہڈر کا پرانا نام سومانگر تھا (پرویش شاہین 1988، صفحہ نمبر 93)

بشام کے ایک آتش کدہ سے اس خطے میں آتش پرستی کے دور کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایسی رسوم بھی پائی جاتی ہیں جن میں آتش پرستی کے سلسلے نظر آتے ہیں۔ ماضی قریب تک مردے کی قبر پر ایک جمعہ تک الاؤ روشن رکھنا اور سالانہ تہوار میں توڑ وتھون (حیلدار لکڑی کو چیر کر اس کے چھوٹے چھوٹے حصے بنا کر ایک ڈال یا چھڑی پر باندھ کر اسے جلائے ہوئے رات کو اجتماعی طور پر روشنی کرنا اور دوڑنا) اسی سلسلہ کی عکاسی کرتا ہے۔ شتیال کے ایک چٹانی کتبہ (Harald Hauptmann, 1997, P-63) کے مطابق اس خطے میں چاند کی پوجا بھی کی جاتی تھی جس کی تصدیق چٹان پر کندہ چاند دیوتا کی تصویر سے ہوتی ہے۔ یہاں کی کشیدہ کاری اور دیواروں کے بیل بوٹوں میں پائی جانے والی بعض اشکال میں بھی ماضی کی بدلی ہوئی جھلک نظر آتی ہے۔

بدھ مت: شتیال و چھلاس کے چٹانی کتبات اس علاقہ میں بدھ مذہب دور کی تصدیق کرتے ہیں۔ داریل میں ایک بدھ یونیورسٹی پائی جاتی تھی۔ شتیال کے علاقہ کو یہاں کے تجارتی اور زائرین کی آمد اور پڑاؤ کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ایک مذہبی خانقاہ کی تعمیر سے متعلق ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ جکھو ڈر کھا کی مذہب پرست بیٹی نے یہ خانقاہ تعمیر کروائی (پرویش شاہین، 1998، ص 93)۔

چینی سیاح فاہیان اور ہوانگ سانگ کے مطابق (جو ان علاقوں سے گزرے ہیں) بدھ مت کے ظہور کے تین سو سال بعد یہاں بدھا کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ پروفیسر دانی کے بقول اشوک کے دور میں یہاں بدھ مذہب پھیل چکا تھا۔ بدھ مت کے چھلاسی کتبات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سیتھن حکمران نے بدھ مت کی سرپرستی کی اور ان کے بعد یہاں پارتھین آئے۔ (احمد حسن دانی، قراقرم ہندکش، مؤلف منظوم علی، ص 145)۔ چینی سیاح ہوانگ سانگ 631ء تا 642ء جب ان علاقوں سے گزرے تو یہاں بدھ مت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں نوسو عیسوی تک بدھ کا اثر رہا۔ ایک چٹانی کتبہ کے مطابق بدھ عہد میں شتیال کے آس پاس کھجا نامی راجہ کی حکومت تھی۔

ہندومت: بدھ مت کے زوال کے بعد یہاں ہندومت کو فروغ حاصل ہوا۔ کوہستان میں ہندو مذہب کی تصدیق 6X12 انچ کے ایک کتبہ سے ہوتی ہے۔ جوکھندیا وادی کے علاقہ گبرال کے جنوب میں ایک کہون قلعہ کے قریب 1895ء میں ملا تھا۔ یہ کتبہ ہندوشاہیہ کی آٹھویں صدی سے تعلق رکھتا ہے (پرویش شاہین، 1988، ص 94)۔ بعض لوک کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ہر وادی میں کوئی نہ کوئی سردار یا راجہ قسم کے لوگ پائے جاتے تھے جیسے کھاندی کافہ، بوٹی سنگ، دَم سنگ، بَدیدن، شُولدن، اُمراء، مان اور کنے جیسے راجگان۔ کئی مقامات سے ایسے مدفن برتن مل رہے ہیں جو راکھ سے بھرے اور کافی پرانے ہیں۔

اسلام کی آمد: کوہستان میں اندازاً چار سو سال قبل اسلام کی روشنی پہنچی۔ اس سے پہلے یہ علاقے دوسری دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔ یہاں پٹھانوں کے ذریعے اسلام پہنچا۔ افغانوں کے ترین خاندان کے ایک بزرگ اخون سالاک نے کوہستان میں اشاعت اسلام کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کے ساتھ جن دوسرے مقامی بزرگوں نے یہاں اسلام پھیلانے کی کوششیں کیں ان میں اخون رفن (جو پالس میں اخون دادا کے نام سے مشہور ہیں)، باباجی، جاگ بابا، میاں بابا، باقی بابا، اخوند صادق بابا، سید نور غازی شاہ، سید ولی محمد بابا، ڈگو بابا اور مذوف بابا سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ کئی مقامی بزرگوں نے اشاعت اسلام کے لئے کوششیں کیں جن میں مذوف بابا، ڈگو بابا، ابوئی دادی، ڈھولیا بابا، غازی شہید شامل ہیں ان کے علاوہ کئی دوسرے مبلغ جن میں سید

،میاں گان اور پختون شامل ہیں نے بھی اشاعت اسلام کے کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ پرویش شاہین کے بقول دیوانہ بابا کی کتاب مقامات میں لکھا ہے کہ کوہستان میں اسلام کی روشنی پہنچانے کا کام 990 ہجری سے 1050 ہجری کے درمیان پایہ تکمیل تک پہنچا (بحوالہ پرویش، 1988ء، ص100)۔

مقامی روایات اور نسبی شجروں یا پیڑھیوں کی بنیاد پر بھی اس حوالہ یا زمانے کی تصدیق ہو رہی ہے کہ یہاں اسلام کی آمد کم از کم ساڑھے تین سے چار سو سال قبل ہوئی اور مختلف وادیوں میں اسلام پھیلانے میں کافی وقت لگا۔ بقامی علماء نے اسلام کی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ یہاں کے علماء فقہ، حدیث، منطق، فلسفہ اور عربی صرف ونحو اور طب میں ماہر ہیں۔ آج کل یہاں کے سوفی صد لوگ دیوبندی سنی ہیں۔ (راز دل 1998، صفحہ 13)۔

اشاعت اسلام کی ایک روایت: کسی زمانے میں (قبل از اسلام) وادی کھندیا میں دو بڑے سردار رہتے تھے جن کی آپس میں عداوت رہتی تھی۔ ایک کا نام کنے اور دوسرے کا نام ڈوٹ تھا۔ ایک بار ان کی لڑائی میں جب ڈوٹ کو شکست ہوئی تو وہ سوات میں اخون سالاک بابا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے لشکری مدد طلب کی۔ بابا اخون سالاک نے ڈوٹ کو اسلام کی حقانیت بیان کی تو وہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس طرح اخون سالاک نے اس کے ساتھ ایک لشکر بھیجا جس نے کھندیا میں کنے کے لشکر کے کے خلاف ڈوٹ کے حق میں جنگ شروع کی۔ اس لڑائی میں کنے کے لشکر کو ایک بزرگ بچہ کی دُعائیں حاصل تھیں اور اس کے لشکر کو شکست دینا مشکل ہو رہا تھا۔ کسی نے اخون سالاک بابا کے لشکریوں کو بتایا کہ کنے کے آدمیوں کو ایک بزرگ بچہ کی پشت پناہی اور دُعا حاصل ہے۔ اس بچہ کے والدین غیر مسلم تھے۔ جب اس بچہ سے کہا گیا کہ اسے تو اللہ تعالیٰ نے بچپن میں ہی روحانی فیض سے نواز دیا ہے تو وہ کافروں کی مدد کیوں کرتا ہے تو بچہ نے کہا وہ کنے کا نمک خوار ہے۔ اُس کی بیوی اسے روزانہ اُبلا ہوا ایک انڈا لا کر دیتی ہے۔ اخون سالاک کے لشکریوں نے بچہ کو کسی نہ کسی طرح قائل کیا اور تسلی دی تو اس نے ان کے حق میں دعا کی اس طرح کنے کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ اس جنگ میں مارا گیا۔ (بعد میں یہ بچہ بابا جی کے نام سے مشہور ہوا جو مُلا خیل قبیلے کا جد امجد ہے اور ان کا مزار وادی دُبیر میں واقع ہے)۔

جب لڑائی میں ڈوٹ کو فتح حاصل ہوئی تو اسے یہاں کا راجہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے تخت کا مقام کرنگ تھا۔ ڈوٹ موجودہ گٹر خیلا ور سرال خیل قبیلے کا جد امجد بتایا جاتا ہے۔

کہتے ہیں اسلام پھیلانے کے دوران بہت سے غیر مسلم مارے گئے اور بہت سے بھاگ گئے۔ ایک بار مسلمانوں کا ایک لشکر کھندیا خوڑ کے پاس آرام کر رہا تھا کہ بابا جی کے ایک مرید کو ایک پن چکی کے ڈھول میں پڑا ہوا ایک کم عمر بچہ ملا تو اس نے بچہ کو لا کر بابا جی کے حوالہ کیا۔ بابا جی اس بچہ کو کالبگرام لے گئے جہاں اُس کی پرورش اُن کے گھر میں ہوئی۔ بعد میں یہ بچہ بڑا عالم فاضل ہوا۔ چونکہ یہ بچہ پن چکی کے ڈھول میں پڑا ہوا ملا تھا اسی نسبت سے یہ 'ڈھولیا بابا' کے نام سے مشہور ہوئے۔

(ماخذ: مقامی بزرگوں سے لئے گئے انٹرویوز)

کوہستان کے لوک ادارے، ذاتیں اور قبیلے

نسبی پس منظر:

یہ بتانا مشکل ہے کہ کوہستان اور شمالی پاکستان کے اولین آباد کار کون تھے۔ یعنی آریائی لسانی طائفہ سے قبل کے لوگ۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کے ادوار میں یہاں دراوڑی تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی پائے جاتے تھے جن کا ایک ہزار سال قبل مسیح دردستان کے موجودہ ماحول میں لڑائی ہوئی تھی۔ سُن اور یشکن لوگوں کے متعلق اس بات پر زیادہ اتفاق رائے پائی جاتی ہے کہ یہ آریائی طائفوں سے تعلق رکھتے ہیں جو وسط ایشاء سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سُن خیبر اور یشکن پامیر کے راستے یہاں پہنچے۔

داردیا داردک: ان لوگوں کے لئے ایک اصطلاح دارد اور ان کی زبانوں کے لئے داردک بھی رائج رہی ہے۔

ذات پات کا تصور: کوہستان میں روایتی طور پر ذات کے صرف دو درجے یا اصطلاحات پائی جاتی ہیں یعنی اُلیسا یا پھقیر۔ اُلیسا سے مراد وہ ذاتیں یا قومیں ہیں جو یہاں کی قدیم رہائشی یا قدرتی وسائل پر ملکیتی حقوق رکھتی ہیں اور ان کا آپس میں کسی نہ کسی طرح کا نسبی اور لسانی رشتہ پایا جاتا ہے جبکہ پھقیر ذاتوں کے زمرہ میں کمزور یا کمی ذاتوں کے لوگ پائے جاتے ہیں جن میں ڈوم، لوہار، گجر، سرخیلی، جولاہے، مروخ وغیرہ شامل ہیں۔

لوک ادارے، روایتی تنظیمی ڈھانچے: کوہستان کی ہر وادی میں

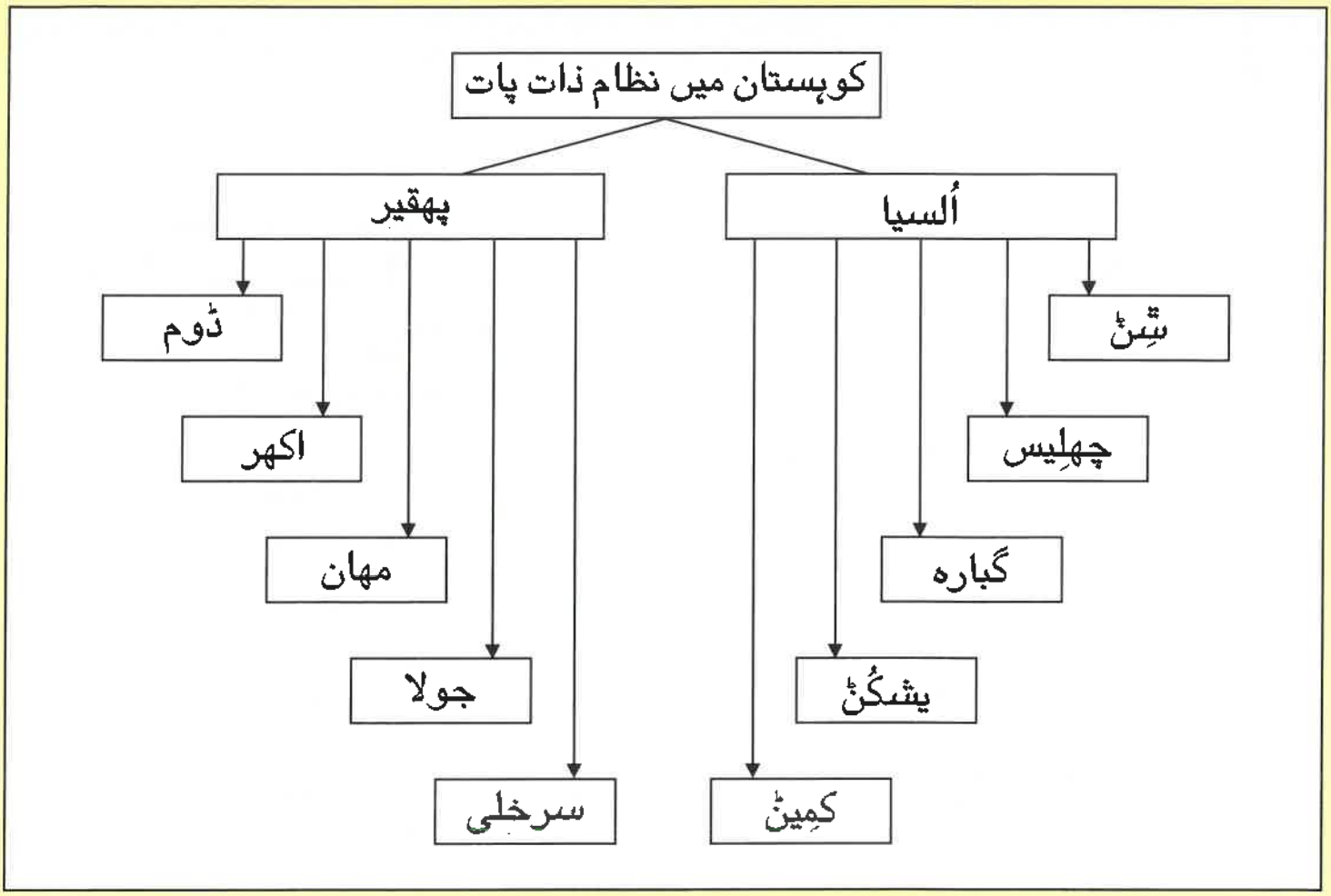
کوہستان میں نظام ذات پات
پھقیر
اُلسیا
ڈوم
اکھر
مھان
جولا
سرخلی
تِرِن
چھلِیس
گبارہ
یشکُن
کمِین

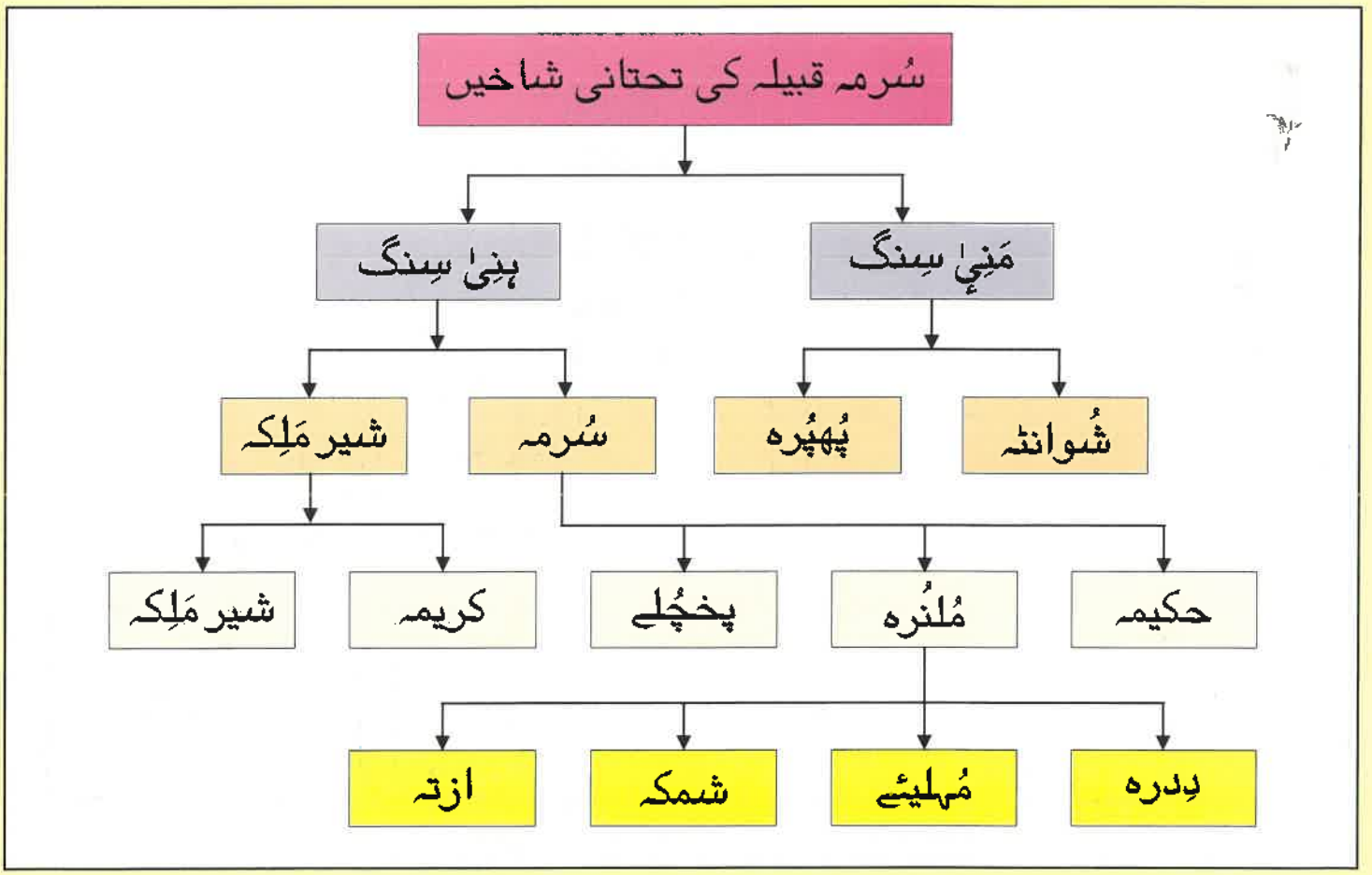
سُرمہ قبیلہ کی تحتانی شاخیں
ہنِیا سِنگ
مَنِیا سِنگ
شیر مَلِکہ
سُرمہ
پُھپُرہ
شُوانٹہ
شیر مَلِکہ
کریمہ
پخچُلے
مُلنُرہ
حکیمہ
ازتہ
شمکہ
مُہلیئے
دِدرہ

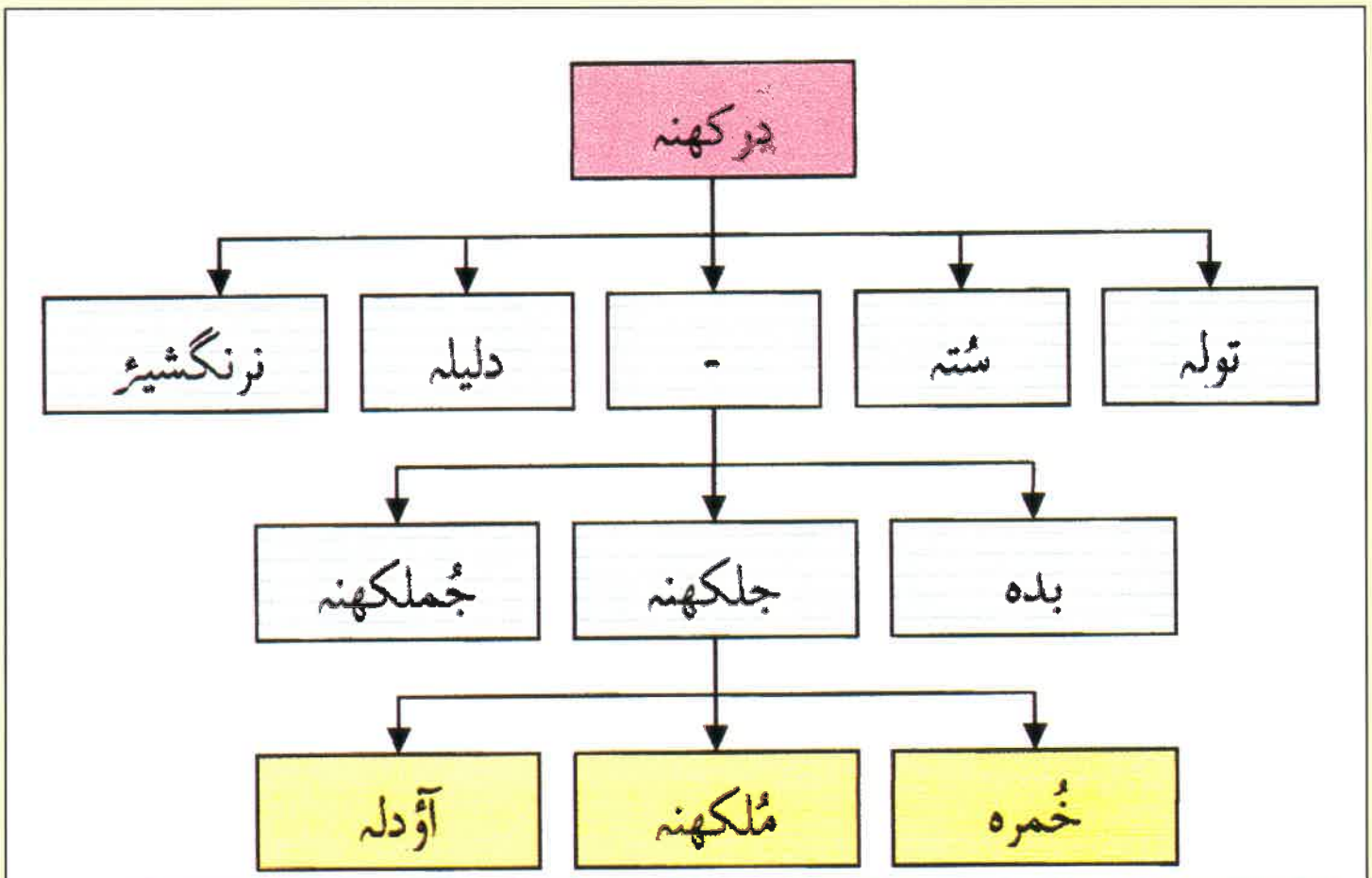
درکھنہ
تولہ
سُتہ
-
دلیلہ
نرنگشیئر
بدہ
جلکھنہ
جُملکھنہ
خُمرہ
مُلکھنہ
آوُدلہ

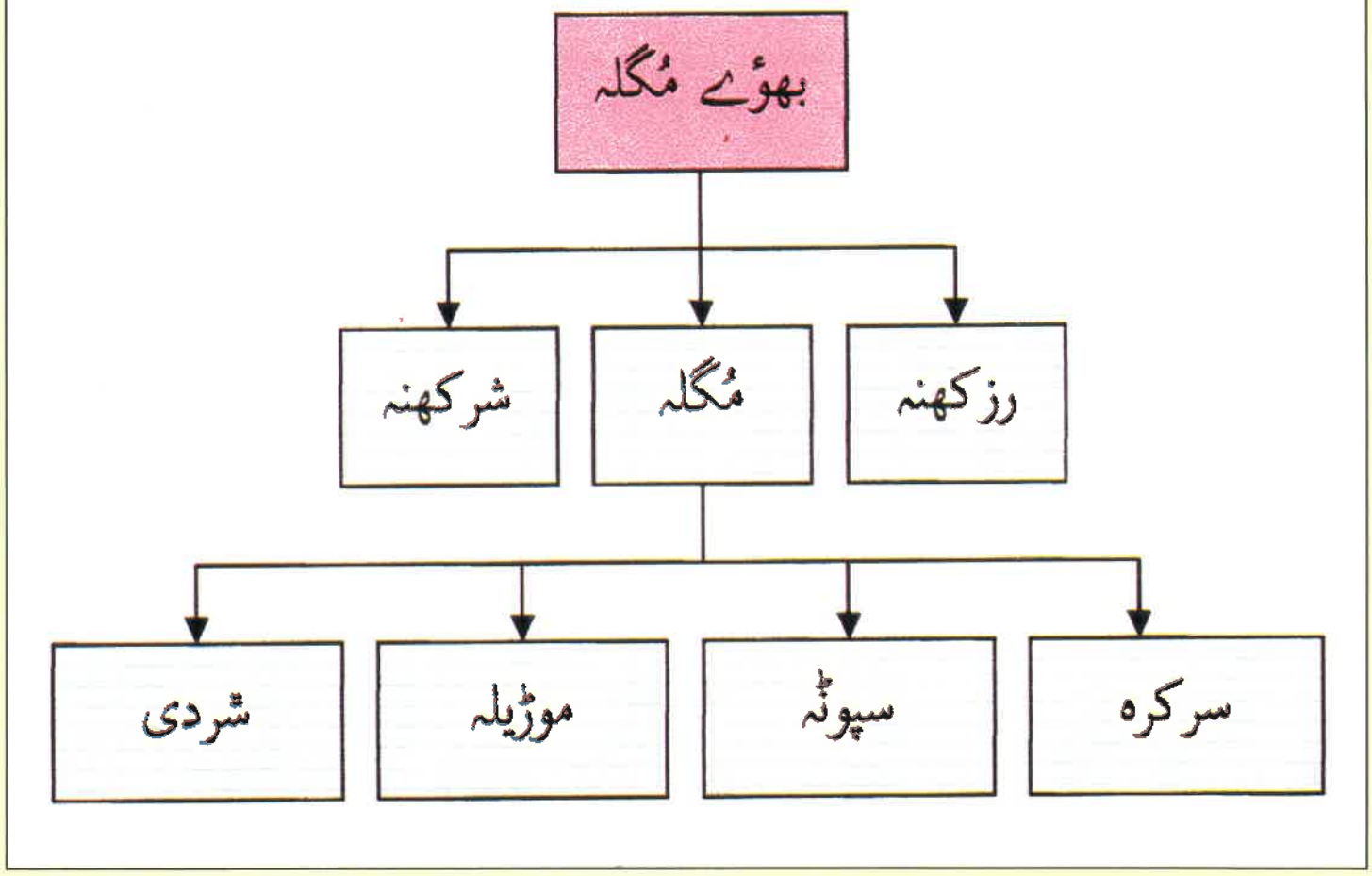
بھوئے مُگلہ
رزکھنہ
مُگلہ
شرکھنہ
سرکرہ
سپوٹہ
موڑیلہ
شردی

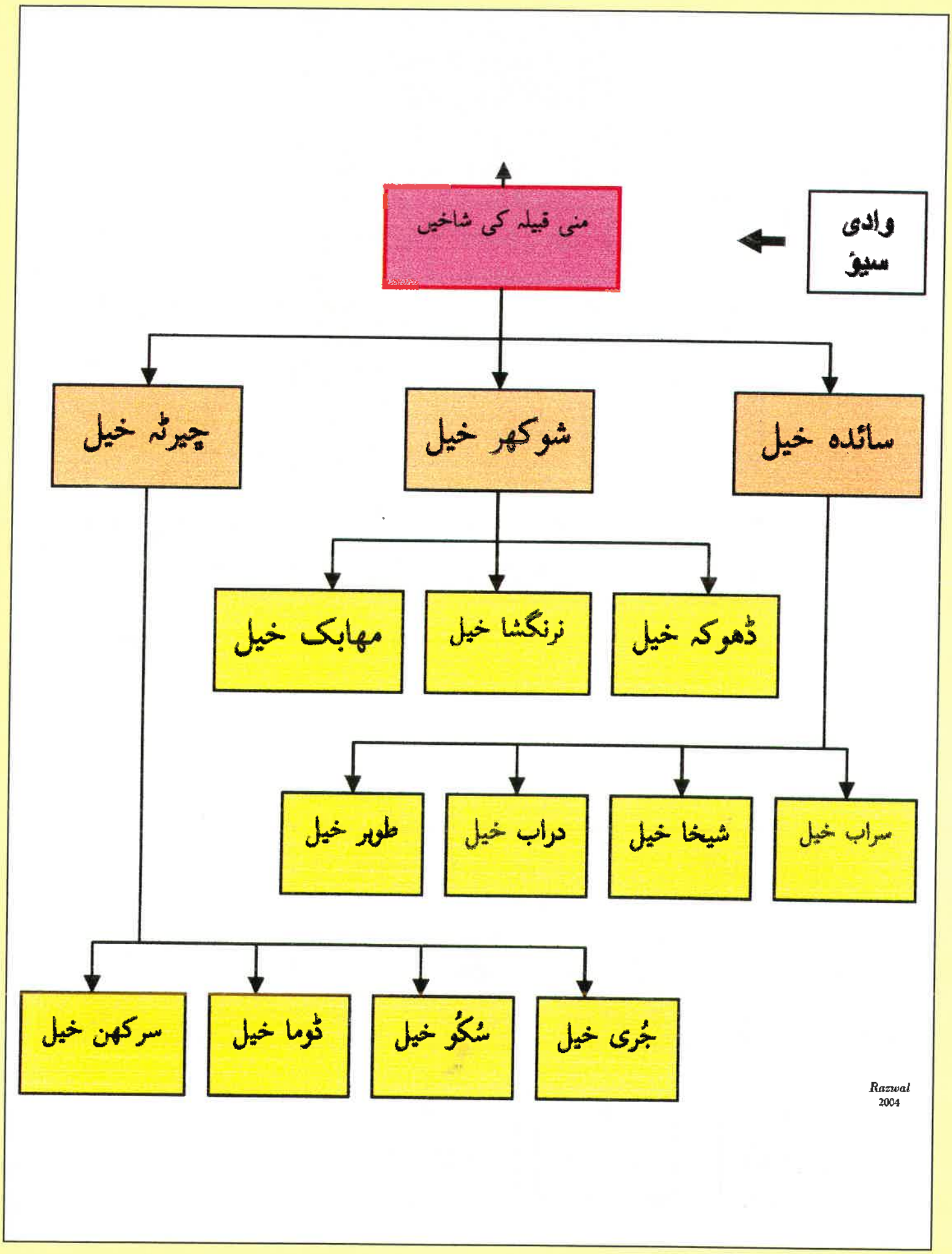
منی قبیلہ کی شاخیں
وادی سیوٗ
سائدہ خیل
شوکھر خیل
چیرٹہ خیل
ڈھوکہ خیل
نرنگشا خیل
مہابک خیل
سراب خیل
شیخا خیل
دراب خیل
طوہر خیل
جُری خیل
سُکُو خیل
ڈوما خیل
سرکھن خیل
Razwal
2004

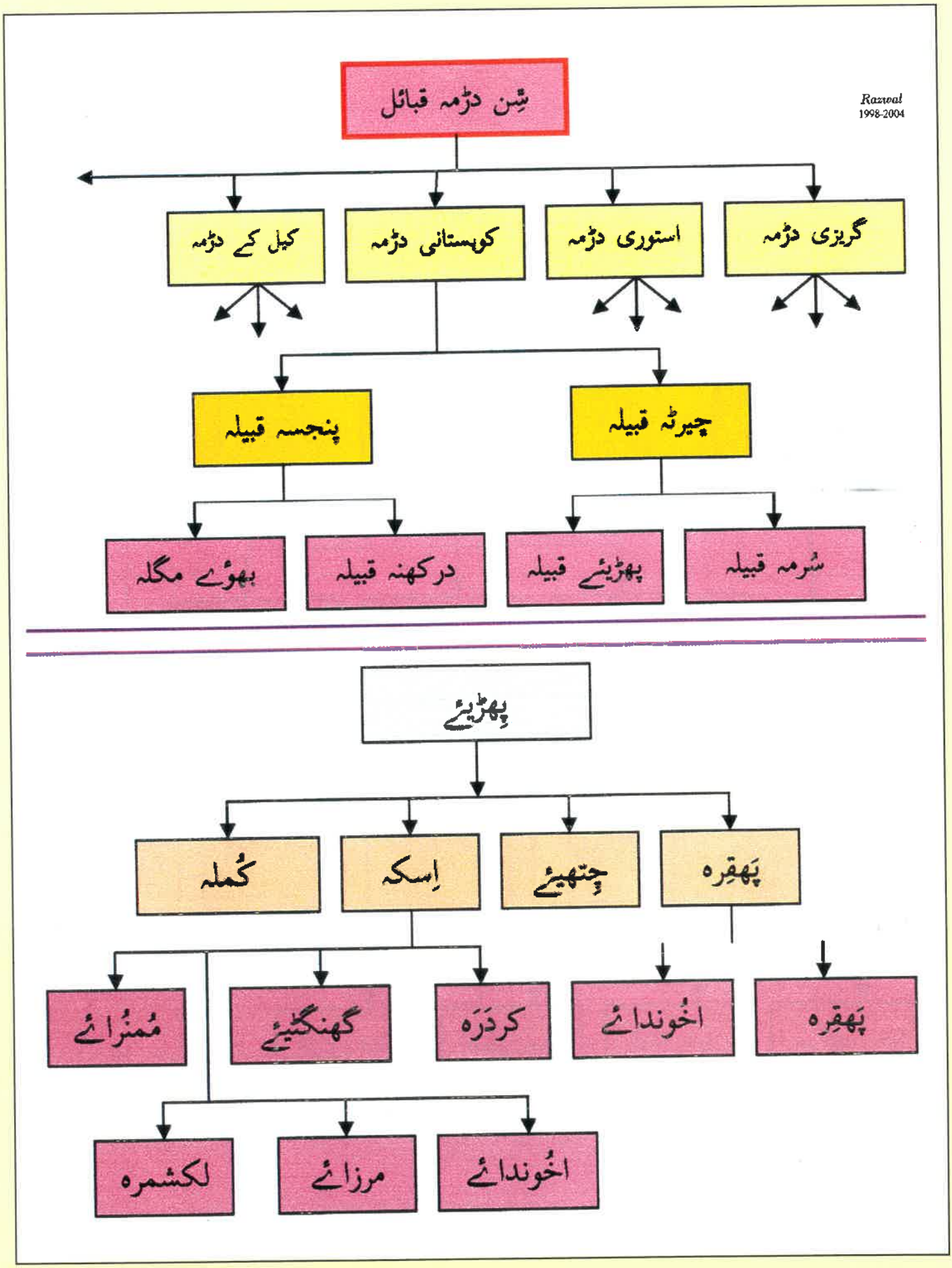
سِن دڑمہ قبائل
Razwal
1998-2004
گریزی دڑمہ
استوری دڑمہ
کوہستانی دڑمہ
کیل کے دڑمہ
چیرٹہ قبیلہ
پنجسہ قبیلہ
سُرمہ قبیلہ
پھڑیئے قبیلہ
درکھنہ قبیلہ
بھوئے مگلہ
پھڑیئے
پَھقِرہ
چِنتھیئے
اِسکہ
کُملہ
پَھقِرہ
اخُوندائے
کردَرَہ
گھنگٹیئے
مُمنُرائے
اخُوندائے
مرزائے
لکشمرہ

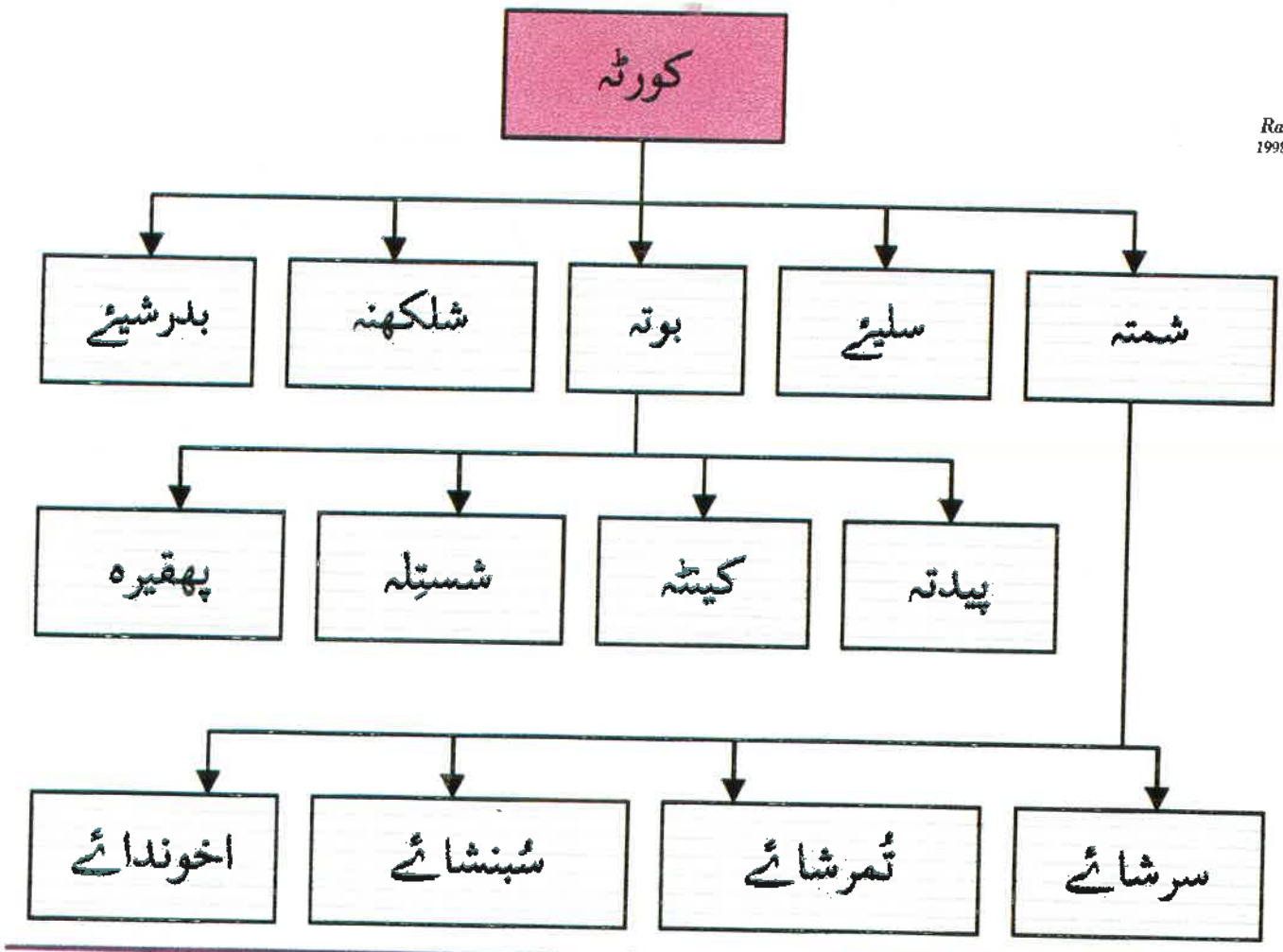

Razwal
1998-2004

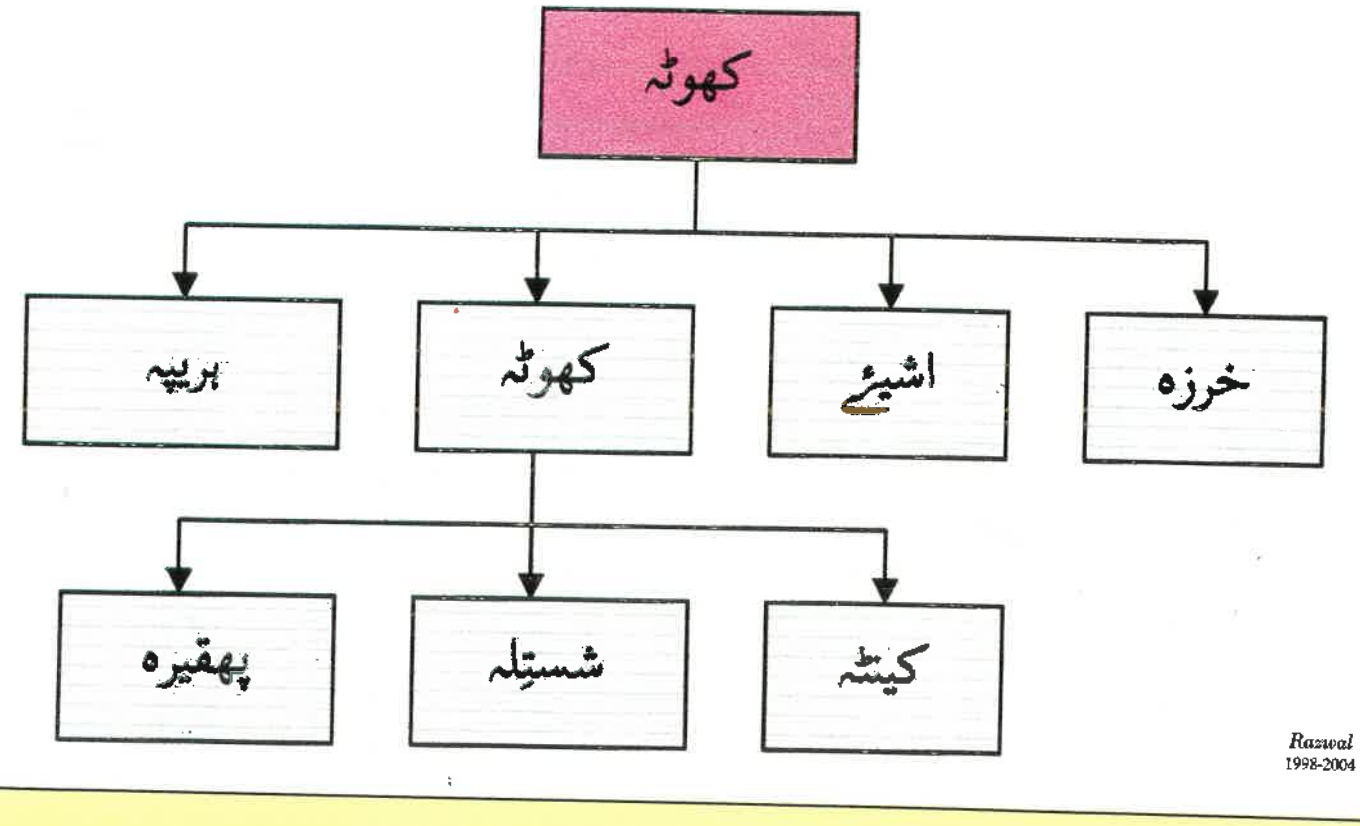

Razwal
1998-2004

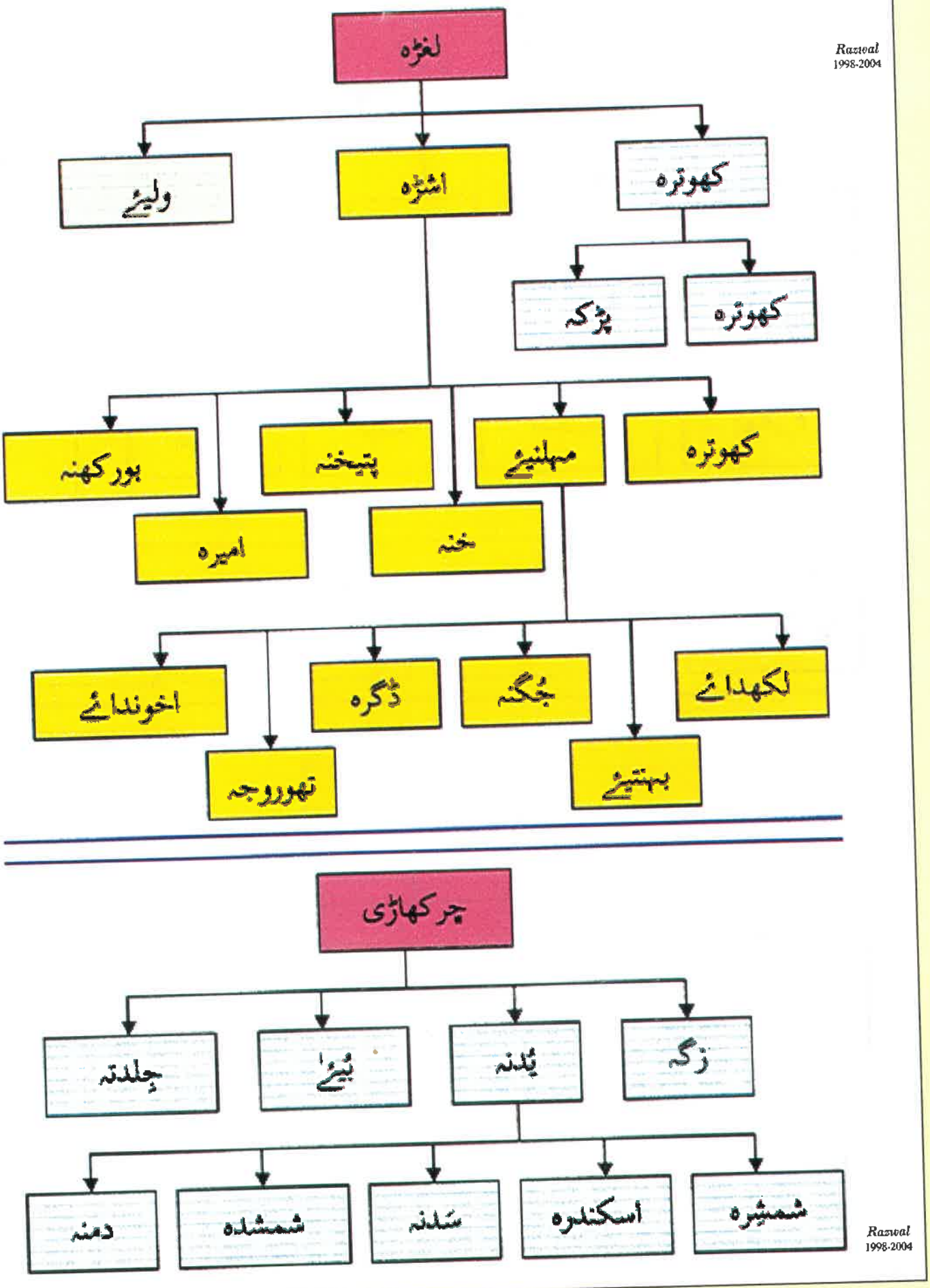
لغڑہ
ولیئے
اشڑہ
کھوترہ
پڑکہ
کھوترہ
بورکھنہ
پتیخنہ
مہلنیئے
کھوترہ
امیرہ
خنہ
اخوندائے
ڈگرہ
جُگنہ
لکھدائے
تھوروجہ
بہنتیئے
چرکھاڑی
جِلدتہ
بُیرُا
یُدنہ
زگہ
دمنہ
شمشادہ
سَدنہ
اسکندرہ
شمشِرہ
Razwal
1998-2004
Razwal
1998-2004

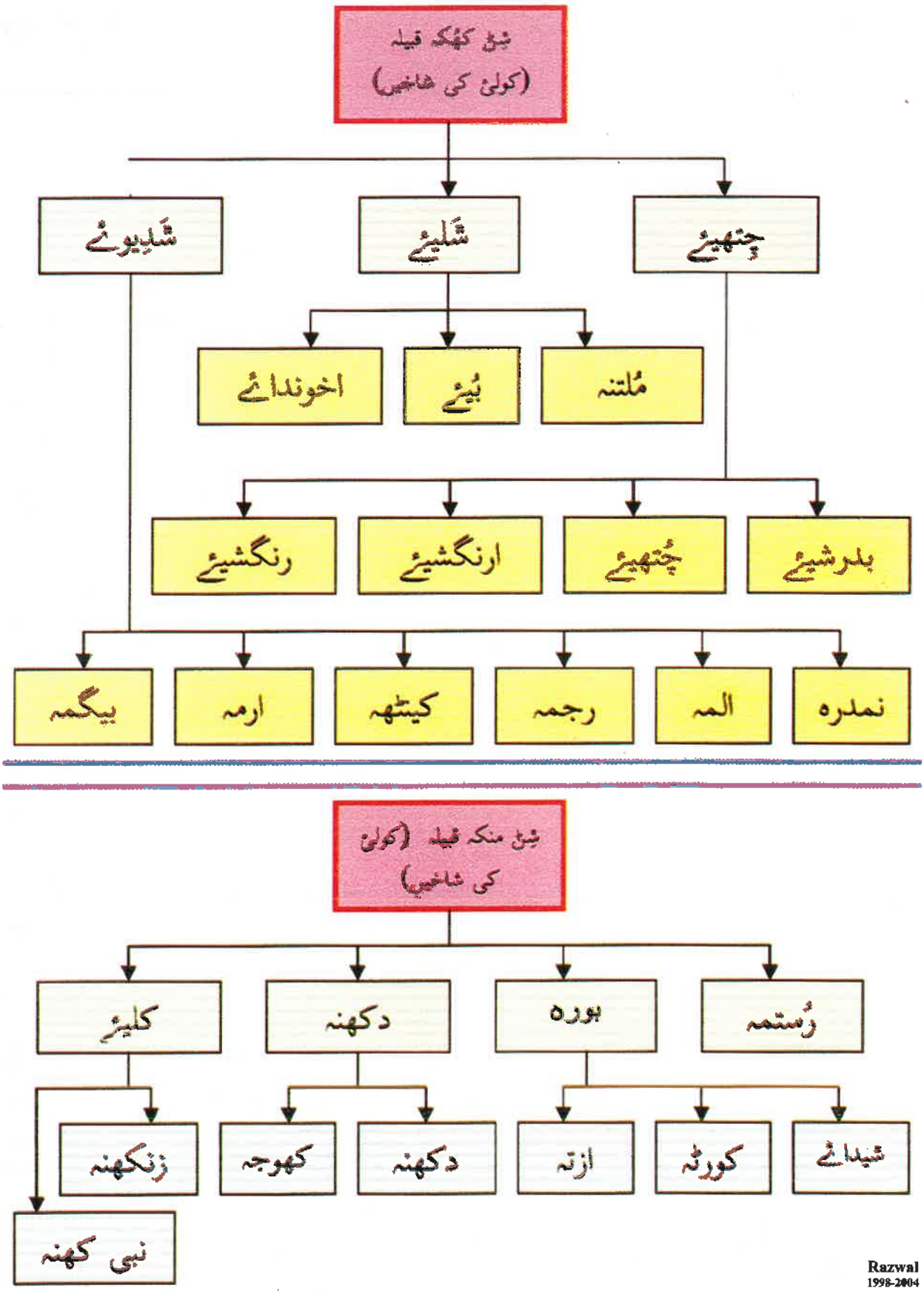

Razwal
1998-2004

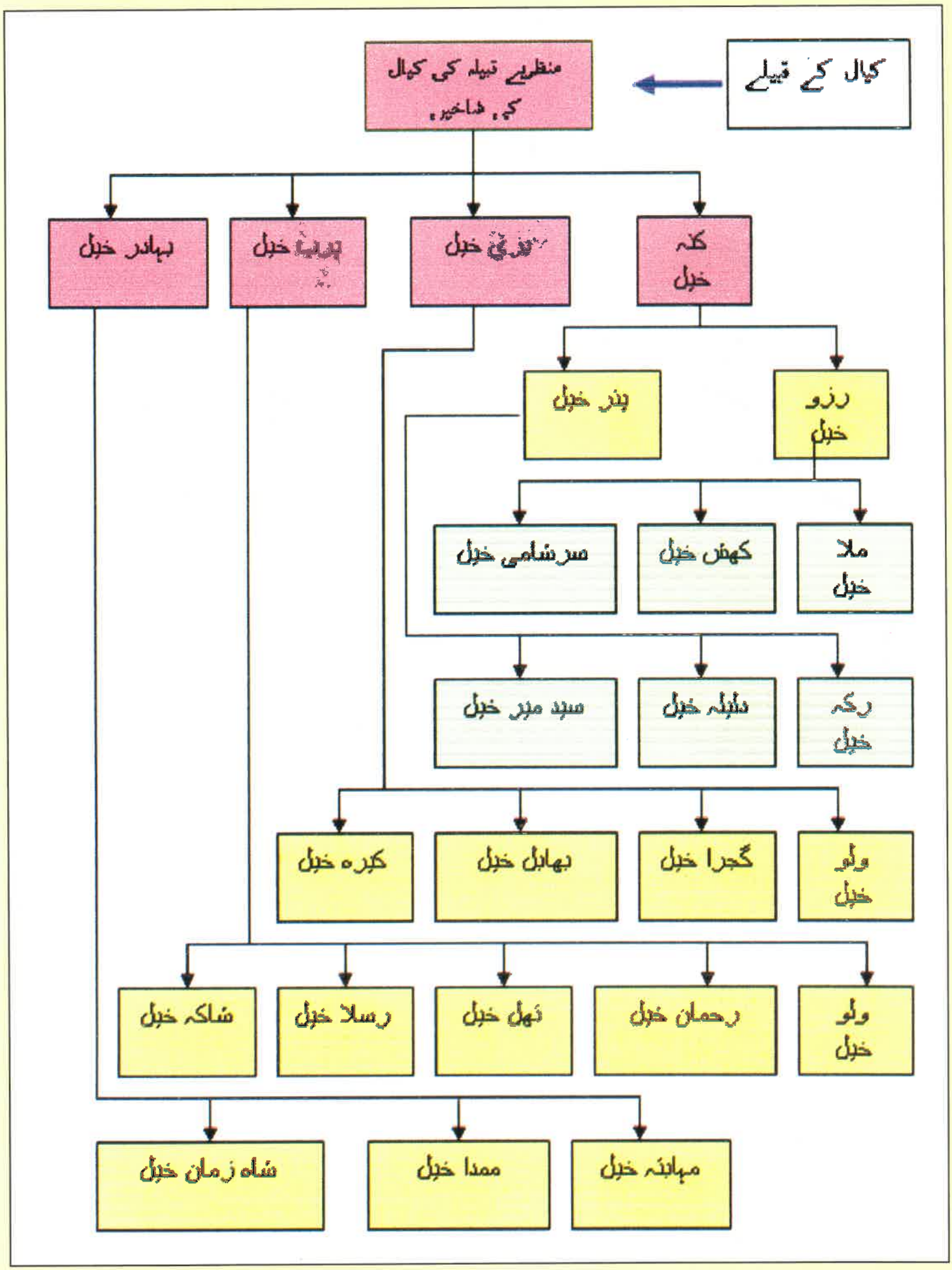
کپال کے قبیلے
منظریے قبیلہ کی کپال کی شاخیں
کلہ خیل
بڑی خیل
بڑیا خیل
بہادر خیل
رزو خیل
بڈر خیل
ملا خیل
کھٹی خیل
سرشامی خیل
رکہ خیل
سید میر خیل
دلبلہ خیل
ولو خیل
گجرا خیل
بھابل خیل
کبرہ خیل
ولو خیل
رحمان خیل
ٹھل خیل
رسلا خیل
شاکہ خیل
مہابنہ خیل
ممدا خیل
شاہ زمان خیل

اپنے اپنے روایتی ادارے یا تنظیمی ڈھانچے پائے جاتے ہیں۔ لوگوں کی روایتی صف بندی انہی تنظیمی ڈھانچوں میں ہوتی ہے۔ یہ لوک ادارے مختلف قبیلوں اور گروہوں کی صف بندی سے تشکیل پاتے ہیں۔ انہیں ہم علاقائی یا ٹیریٹوریل گروپ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان گروہوں کے فرائض میں علاقائی دفاع، قدرتی وسائل کا انتظام وانصرام اور کئی دوسرے معاملات کو نمٹانا ہوتا ہے۔ وادی پٹن، سیئو، دوبیر، کیال اور کھندیا کے لوگ جن کا تعلق منی اور منظریے قبیلوں سے ہے وہ اپنی اپنی وادیوں میں انہی قبیلوں کی تحتانی شاخوں میں صف بند ہیں۔ کولئی وادی کے لوگ تین بڑے دائروں میں صف بند ہیں جو کھکہ اور منکہ گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح وادی پالس اور وادی جلکوٹ ڈرمہ اور کھکہ منکہ قبیلوں کی آٹھ تحتانی شاخوں میں صف بند ہیں۔ وادی ہربن کے لوگوں کے ہاں علاقائی صف بندی کا قدرے مختلف ڈھانچہ پایا جاتا ہے۔ ان کے روایتی تنظیمی ڈھانچہ کی تشکیل کچھ اس طرح ہے:

کوٹھ گن، رٹ، تھلو، خاندان۔

ان کے ہر بڑے جرگہ کے موقع پر مجمے میں سے ہر کوٹھ گن کا ایک ایک معتبر شخص چنا جاتا ہے۔ اس طرح آٹھ کوٹھ گن کے نمائندے آپس میں ابتدائی بات چیت کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ آٹھ افراد اعلان کرتے ہیں کہ ہر رٹ کا گروہ دو دو افراد مقرر کرے ضرورت ہو تو تھلو کی بنیاد پر بھی ممبر بلوائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا یا سنایا جاتا ہے اور اس پر عمل درآمد کروایا جاتا ہے عمل درآمد کی ذمہ داری کلک اور زیتو کی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں مال مویشی کی نقل مکانی، بکی کی کٹائی اور بوائی کی تاریخ، چیئے پتوں والے جنگلات (بانڈو) کی حفاظت وغیرہ بھی کلک اور زیتو کرتے ہیں۔

سُن (سُن): آثار قدیمہ، لسانیاتی اور ثقافتی سماجیاتی حوالوں سے اس بات پر زیادہ تر اجماع پایا جاتا ہے کہ سُن لوگ نسبی اعتبار سے آریائی ہیں اور یہ 1,000 سے 1,500 ق م میں وسط ایشیاء سے نقل مکانی کر کے درہ خیبر کے راستے داخل ہوئے اور موجودہ دربند سے اوپر پکھل اور سرن وادی سے چھلاس تک کے درمیانی رقبہ کو اپنا ابتدائی مسکن بنایا اور بعد میں آہستہ آہستہ اوپر کی جانب گلگت، استور، سکردو اور اس سے آگے جموں میں دراس اور لداخ تک پھیل گئے۔ انہوں نے اس خطہ میں یشکن قبیلوں یا لوگوں کو فتح کیا (رازول، 1998 ص 35-34) اور ان کی زبان کو اس خطے میں فروغ حاصل ہوا۔

اپنے جغرافیہ، نسب، سماج، زبان اور ثقافت کے اعتبار سے کوہستان کے مشرقی حصہ کے سُن لوگوں کا تعلق چھلاس، گلگت، استور، دریل، تانگر، ہراموش، گلتری بلتستان، گریز، دراس اور سورو کے سُن لوگوں سے ہے۔ سُن لوگوں کی بڑی آبادیاں نگر، یاسن، اشکومن اور چترال کی جانب پائی نہیں جاتیں بلکہ ان علاقوں میں یشکن ذاتوں کے لوگ اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔

کوہستان میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر کولئی سے بھشہ تک اس ذات کے دو بڑے قبیلے یا گروہ پائے جاتے ہیں جو ڈرمہ اور کھکہ منکہ کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان گروہوں میں چار چار ذیلی شاخیں اور پھر اس کی بے شمار تحتانی خیلیں یا شاخیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے درمیان جرگائی نظام پایا جاتا ہے۔ نسبی لحاظ سے یہ لوگ مختلف سطحوں کے دائروں میں جڑے ہوئے ہیں۔ سُن لوگوں نے ایک طویل عرصہ تک شمالی علاقہ جات میں گلگت پر حکومت کی۔ گلگت کے شری بدت اور اگوری تھم اسی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ سُن ذات کے لوگوں کے بڑے بڑے قبیلے اور گروہ پائے جاتے ہیں جو کوہستان، گلگت، چھلاس، استور اور ہندوستان کے زیر قبضہ علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ سُن ذات کے بڑے قبائلی گروہوں یا قبیلوں میں ڈرمہ، کھکہ منکہ، ملوئے تھکوچہ، بوٹہ، تھوروجہ، تلیلائے، چاق ماہ چاق، شرسنگیے، گبورہ، دروئے، یوودوئے، تولیئے، شرلیئے، کولیئے، سنکوئے، بکریئے، پھتکوئے وغیرہ شامل ہیں۔ (رازول 1998، pp-34-52)۔

سُن سُرمہ اوپھیڑیئے قبیلہ کے لوگ بنیادی طور پر وادی پالس اور جلکوٹ میں آباد ہیں۔ کچھ گھرانے راولپنڈی، حضرو، ہزارہ، مظفر آباد، چھلاس اور گلگت میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پھیڑیئے قبیلہ کے کچھ لوگ وادی گریز میں آباد ہیں جو 1947ء سے قبل وہاں آباد ہو چکے تھے۔ ان کے مجموعی گروہ کو بعض اوقات جیرٹہ بھی کہا جاتا ہے۔

اسی طرح سُن وڈرمہ گروہ کے دو اور قبیلے جو درکھنہ اور بھوئے منگلہ کہلاتے ہیں وہ بھی وادی پالس اور جلکوٹ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے مجموعی گروہ کو بعض اوقات پنجہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سب سُن وڈرمہ قبیلہ یا گروہ کی تحتانی شاخیں یا قبیلے ہیں۔ وادی کولئی میں سُن ذات کے کھکہ منکہ قبیلہ کے گروہ آباد ہیں یہ لوگ کئی ذیلی شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ سُن منکہ اور کھکہ قبیلہ کے لوگ وادی کولئی کے علاوہ پالس اور جلکوٹ میں بھی آباد ہیں۔

سُن لوگوں کے کچھ قبیلے جو ان علاقوں سے نقل مکانی کر گئے ہیں آج کل چترال، دیر اور سوات کوہستان میں آباد ہیں۔ چترال کے سُن قبیلہ کا تعلق چھلاس کے

بوٹہ قبیلہ سے ہے جب کہ سوات کے اشوجو سُن لوگوں کا تعلق کوئی کے کلئی خیل قبیلہ سے ہے۔ آزاد کشمیر کی نیلم وادی میں بھی سُن ڈڑمہ قبیلہ کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

چلیس یا چھلیس: یہ لوگ سوات کی طرف سے یہاں آئے ہیں اور ان کا تعلق کوہستانی قبیلوں سے ہے۔ ایک گمان یہ بھی ہوتا ہے کہ کوہستان میں یہ لوگ چلاس یا چھلاس سے یہاں آئے ہیں اور اسی نسبت سے انہیں چھلیس کہا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی چھلاس کے عام آدمی کو چھلیس ہی کہا جاتا ہے۔ پندرویں عیسوی کے وسط میں یہ لوگوں جلکوٹ میں کافی طاقت رکھتے تھے بعد میں سُن لوگوں نے انہیں نظام ولیش میں دوسرے گروہوں میں ضم کر کے ان کی طاقت کو کمزور کیا۔ ان کے متعلق جان بڈلف کا کہنا ہے کہ یہ لوگ بنیر یا سوات کے کسی علاقہ سے یہاں آئے ہیں اور ان کا تعلق تروال قبیلہ سے ہے۔ خود چھلیس قبیلہ کے افراد کا کہنا ہے کہ کوئی نو سو سال قبل ان کے آباؤ اجداد قرنا کے علاقہ سے یہاں آئے۔ قرنا کا علاقہ موجودہ تھاکوٹ سے کوئی تیس کلومیٹر زیریں واقع ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ ڈوما نامی شخص کی اولاد ہیں۔ اس قبیلہ کی ایک مشہور شخصیت کا نام دم سنگ ہے جس کا ذکر بعض لوک کہانیوں میں آتا ہے۔ اس شخص کے اختتامی دور میں یہاں اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ اس کی موجودہ نسل کوہستان کے درہ مدخیل کے علاقہ میں آباد ہے جنہیں دن سنگیان چھلیس پکارا جاتا ہے۔ (رازول 1998، pp-57-59)۔

منی اور منظریئے قبیلے: کوہستان کا مغربی حصہ (جو کہ بنکھڑ سے وادی کھندیا تک پھیلا ہوا ہے) میں دو بڑے گروہ آباد ہیں جو منی اور منظریئے گروہوں کے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی کئی تحتانی شاخیں پائی جاتی ہیں جو بنکھڑ، دویر، جیال، پٹن، کیال، سیؤ، رزقہ اور کھندیا وادی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ محقق لٹنر اور جان بڈلف کے مطابق یہ لوگ بھی سُن ذات سے تعلق رکھتے ہیں تاہم اب یہ کوہستانی زبان بولتے ہیں اور ان کا نسبی تعلق کالام، دیر اور وادی کُنڑ کے کوہستانی قبیلوں سے ہے۔

وادی پٹن میں جو بڑا قبائلی گروہ پایا جاتا ہے۔ اس میں سوار خیل، حیدر خیل اور کھشو خیل قبیلے اور ان کی کئی تحتانی شاخیں شامل ہیں۔ جب کہ وادی کیال میں حریپ خیل، بادر خیل، پائر خیل اور کنا خیل اور وادی دویر میں شُدم خیل، شہباز خیل اور ملا خیل قبیلوں کی شاخیوں کے لوگ آباد ہیں۔ بنکھڑ میں ڈھوک خیل گروہ کے لوگ آباد ہیں۔ ان گروہوں اور قبیلوں کے لوگ ایک ہی نسبی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح وادی سیؤ میں سَید اخیل، شکر خیل اور جہ رٹ خیل نامی قبیلے آباد ہیں جو کہ دھرت نامی شخص کی نسل اور پٹن کے حیدر خیل قبیلہ کی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور پٹن سے یہاں آئے ہیں۔

دُبیر اور کھندیا کے گوٹر خیل، ملا خیل، شہباز خیل، شُدم خیل،، شرال خیل، سوئی خیل، شی خُل، درمی خیل، ترياح خیل زیادہ مشہور ہیں۔ اسی طرح منی کی نسل میں سے بنکھڑ کے رستم خیل، کشی خُل، جیال کے قادر خیل، بہادر خیل، شاکن خیل، مرداد خیل جب کہ پٹن کے قبیلوں میں حیدر خیل، سرکھن خیل، کھشو خیل، مرجان خیل، پردت خیل، مربت خیل اور بیگو خیل زیادہ قوی اور متحرک ہیں۔

ان قبیلوں کے علاوہ کھندیا، سیؤ، دبیر اور پٹن وادی میں کچھ دوسری ذاتوں کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں لیکن سماجی طور پر انہیں اہمیت نہیں دی جاتی۔ ان ذاتوں میں کشری، جولاہے، شیئے خیل، نیلو خیل، پھقرہ خیل، ترکھان، ڈوم، موچی، سنیارے اور گجر شامل ہیں جنہیں بعض اوقات پھقیر کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں کچھ گھرانے سید اور پٹھان لوگوں کے بھی ہیں جو اکثر بکھرے ہوئے ہیں۔

ایک روایت: ایک روایت کے مطابق وادی پٹن، سیؤ، کھندیا، دبیر اور بنکھڑ کے قبیلوں کے جد امجد کا نام مُنڈ لی تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے ایک کا نام منور جس کی اولاد منی یا منیئے کہلائی اور جس کی نسل پٹن، سیؤ، جیال اور بنکھڑ میں آباد ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام منظر تھا جس کی اولاد یا نسل منظریئے کہلائی اور جو کیال، دویر، رانولیا اور کھندیا میں آباد ہیں۔

بٹوچہ: نسبی اعتبار سے ان کا تعلق مغربی کوہستان، سوات اور دیر کوہستان کے کوہستانی قبیلوں سے ہے۔ لیکن بہت پہلے یہ قبیلے ان سے الگ ہو گئے تھے اس لئے اب یہ لوگ اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

گبارہ: یہ لوگ زیادہ تر کولئی میں آباد ہیں اور سُن منکہ گروہ میں ضم پائے جاتے ہیں۔ اس قبیلہ کے دوسرے لوگ سوات اور دیر کوہستان میں آباد ہیں۔ محقق جان بڈلف کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اصل میں سوات کے علاقہ رائنگ سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے ہیں (Biddulph, 1880, p-10)۔ کوہستان میں یہ لوگ سُن سمجھے جاتے ہیں اور کھکہ منکہ گروہ میں ضم ہیں۔ (رازول 1998، pp-59-69)۔

یشکن: یشکن قبیلے کوہستان سمیت ضلع دیامر، گلگت، غذر اور چترال کے

اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی زیادہ آبادیاں کوہستان سے باہر یعنی گلگت، نگر، یاسن، اشکومن اور چترال میں ہیں۔ ان کے متعلق محققین کا کہنا ہے کہ یہ لوگ پامیر کے راستے موجودہ شمالی پاکستان میں داخل ہوئے۔ تاریخی طور پر یہ لوگ سُن اقوام سے قبل یہاں آئے۔ یشکن اقوام کو مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے جیسے بورش، دورشک، بورستیوں وغیرہ تاہم یہ ان کے تحتانی قبیلوں یا گروہوں کے نام۔ کوہستان اور شمالی پاکستان میں انہیں سُن لوگوں نے فتح کیا۔ تاہم بارویں صدی کے لگ بھگ انہوں نے سُنوں سے حکومت لے لی تھی۔ کوہستان میں یشکن لوگوں کی جو شاخیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سُن ذاتوں اور قبیلوں میں علاقائی گروہی نظام میں ضم پائی جاتی ہیں تاہم انہیں امتیازی طور پر یشکن کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ کوہستان میں یہ لوگ کوئی، پالس، جلکوٹ، کومیلا، ثمر، ہربین، شتیال اور بشہ (بھاشہ) کے علاقہ جات میں پائے جاتے ہیں۔ اس ذات کی ایک حکمران خاتون دادی جواری نے ماضی میں گلگت پر حکومت کی اور کافی نام پایا۔ کوہستان میں یشکن قبیلہ کی مندرجہ ذیل شاخیں پائی جاتی ہیں: کُٹیئے، شنیئے، جُدرہ، گونہ، بدیئے، مہابوئے، مینتہ، ہنبکہ، بکدُریئے، کشرچیئے، بخدُریئے وغیرہ۔

کمین: کوہستان میں اس ذات کی شاخیں سترہ، رمہ، بائیرہ، تھکرہ، شنیئے، سیسی، مذشیئے، شیائے، دنشائے، بوئیکے، برلیئے، رُلیئے، پھتیئے، سنکے، مچے، شرپائے، لیئے، کریمائے، کریئے، جکیئے وغیرہ یہ لوگ زیادہ تر چھلاس، ہربین، ثمر، سازین، دریل، تانگر وغیرہ میں پائے جاتے۔ ان لوگوں کے متعلق ابھی تک صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہوا کہ نسبی اعتبار سے یہ کون ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سُن آریائی طائفہ کے ساتھ ساتھ یہاں آئے۔ تاہم گمان غالب ہے کہ یہ لوگ یہاں کے اصل باشندے ہیں۔ جو آریائی طائفوں کی آمد سے پہلے یہاں آباد تھے۔ (رازول 1998. pp-61-64) -

کمین لوگوں کے متعلق عرصہ دراز سے یہ قیاس آرائیاں بھی ہوتی رہی ہیں کہ یہ نیچ ذات سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ مقامی زبان میں ذاتوں کی درجہ بندی میں جو اصطلاحات پائی جاتی ہیں یا ان اصطلاحات سے جو گروہ تشکیل پاتے ہیں۔ اس کے مطابق کمین لوگوں کا نیچ ذات سے تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ داریل، تانگر، ہربن، سازین اور شتیال وغیرہ میں جہاں یہ لوگ اکثریت یا ان کی زیادہ آبادیاں ہیں بہت قوی اور مضبوط ہیں اور سُن و یشکن ذاتوں کے مدمقابل تنظیمی دائروں میں ضم ہیں جبکہ وہ ذاتیں جو ڈوم، جولاہے اور مہان وغیرہ ہیں اس قسم کے تنظیمی ڈھانچوں میں کہیں بھی ضم نظر نہیں آتے اور یہ ایک بڑی دلیل ہے کمین لوگوں سے متعلق۔

اِسزی (غالباً عیسیٰ زئی): یہ قبیلہ وادی پالس میں آباد ہے عام طور پر اسے اخوندائے (اخون) اور بعض اوقات اسزی کہا جاتا ہے۔ ان کی مادری زبان پشتو تھی آج کل گھروں میں صرف سُنا بولتے ہیں۔ یہاں یہ لوگ مذہبی فرائض سرانجام دیتے تھے جس کے عوض انہیں سیری بھی ملی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قبیلہ کا اصل تعلق کالاڈھاکہ کے عیسیٰ زئی قبیلہ کی کسی شاخ سے ہے جو یا تو دشمنی کی وجہ سے یا پھر تبلیغ دین کی خاطر یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

پیری مریدی: پہلے پہل پیری مریدی کا رواج عام تھا۔ آج کل اس قسم کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ تاہم عورتوں میں اس قسم کی عقیدتیں اب بھی پائی جاتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی کو اپنا پیر و مرشد مانتی ہیں۔ اس قسم کے اظہار مشکل وقت میں نکلنے والے ان الفاظوں سے لگایا جا سکتا ہے جو عام طور پر سنے جاتے ہیں۔ مرد حضرات پیری مریدی کے خلاف ہیں اور اسے سخت شرک سمجھتے ہیں۔ تاہم اگر پیری مریدی عقیدہ اور سنت کے مطابق ہو تو اس سے انکار نہیں کرتے۔

تبرک: تبرک کو مقامی زبان میں خوردہ کہا جاتا ہے۔ آج کل تبرک کھانا حرام سمجھتے ہیں۔ ماضی میں پیر بابا کی زیارت سے خصوصی طور پر تبرک لایا کرتے تھے۔ آج کل تبرک کا نام یا لفظ نہیں سنا جاتا۔

مہمان نوازی: لوگ مہمان نواز ہیں۔ اندرون وادی کہیں بھی ٹھہرنے کے لئے ہوٹل نہیں۔ اجنبی، مسافر یا عام آدمی کہیں بھی چلا جائے اسے رات کا قیام، کھانا پینا بلا تکلف مہیا کیا جاتا ہے۔ عام طور پر مرد مہمان کے لئے حجرہ میں رہنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ مہمان کو احترام و عزت دی جاتی ہے۔

پاؤں دبانا: لوگ مہمان کے پاؤں دبانا اپنے لئے عزت سمجھتے ہیں۔ رات کا کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد مہمان کے پاؤں دبائے جاتے ہیں۔ حجرہ میں موجود کم عمر لڑکے پاؤں دبانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ پاؤں دبانے والا اپنے دونوں پاؤں کے اوپر مہمان کا ایک پاؤں رکھ کر دباتا ہے۔ کچھ دیر بعد پاؤں کو چھوڑ کر پنڈلی دبائی جاتی ہے اور پھر ران۔ اگر مہمان عمر رسیدہ ہو تو اس کے کاندھے بھی دبائے جاتے ہیں۔ بیٹے اپنے معمر باپ یا دادا کے پاؤں دباتے ہیں۔ سسر اور ساس کے پاؤں دبانا بہو کی ذمہ داری کا ایک لازمی حصہ ہے۔

ہاتھ دھلوانا: مہمان کے ہاتھ دھلوانے کے لئے ہر حجرہ یا گھر میں ایک چلمچی

ہوتی ہے جس کے اوپر چھان نما ڈھکنا لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ دھلنے کا پانی چلمچی میں جمع ہوتا ہے۔ پانی ڈالنے کے لئے عام طور پر سلور کا لوٹا استعمال کیا جاتا ہے۔

مہمان کا کھانا: ہاتھ دھلوانے کے بعد مہمان کے آگے کھانا رکھ دیا جاتا ہے۔ گھر کا اہم فرد مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا ہے اور اس وقت تک کھانے سے ہاتھ نہیں کھینچتا جب تک مہمان بس نہ کردے۔ سیر ہونے کے باوجود مہمان پر زور لگاتے ہیں کہ ایک دو نوالے اور لے لو۔ مہمان کا کھانا کس قسم کا تیار ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے اس کا انحصار میزبان کی استطاعت اور مہمان کی حیثیت پر منحصر ہے۔ ایسے مہمانوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے جو بہت دور کے کسی روم سے آئے ہوں۔

مہمان کو جگہ دینا: روایتی طور پر مہمان کو بیٹھنے کے لئے اچھی جگہ فراہم کی جاتے ہے۔ معزز اور بڑی عمر کا مہمان آئے تو حجرہ یا بیاک میں بیٹھے سبھی لوگ اس کے احترام میں اٹھ جاتے ہیں اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود بیٹھتے ہیں۔ بیاک میں بیٹھنے کی ایک خاص ترتیب بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے مطابق بڑی عمر والے لوگ آپس میں نزدیک اور وسط میں بیٹھتے ہیں جبکہ کم عمر ذرا ہٹ کر یا پیچھے۔ گھر کے اندر یہ ترتیب بدل جاتی ہے۔ اگر انتہائی قریبی معزز مرد کسی رشتہ دار کے گھر جائے تو وہ میزبان مرد کے قریب یا اس کی جگہ بیٹھے گا۔

حال دینا اور لینا: جب دور کی بستی سے کوئی رشتہ دار یا مہمان آئے یا راستہ میں ملے تو ایک ترتیب کے ساتھ وہ آپس میں حال دیتے اور لیتے ہیں اسے جوڑ خیر کہا جاتا ہے۔ یہ عورتوں اور مردوں سبھی میں مشترک اور عام ہے۔ حال دینے اور لینے کو رواج کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ اس سے محبت اور احترام میں اضافہ ہوتا ہے۔ حال دینے اور لینے کے لئے کوئی ایک جیسے مخصوص یا متعین کلمات نہیں بلکہ بولنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ کس انداز میں اور کس طرح ایک دوسرے سے حال لیتے اور دیتے ہیں۔ مردوں کے عام کلمات یہ ہیں:

راش

جوڑ، خیر، تازہ

تھوئی بال چھل روغس یا

قام ذات روغس یا

چھام گاونڈیان روغس یا

متی جونئی تازہ،

جموس کال، خیر خبر

حال دینے اور حال لینے والا عام طور پر ان کلمات میں ایک دوسرے کو جواب نہیں دیتے بلکہ دونوں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوتے ہیں۔ عورتوں میں ان کلمات کے برعکس صرف گھر کے بچے اور رشتہ دار عورتوں کے متعلق پوچھا جاتا ہے۔

پیشہ ور گھرانے، ذاتیں اور اُن کے رواجی فرائض ومعاوضے

کوہستان میں مختلف گروہ مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ مختلف کاموں اور پیشوں کی بنیاد پر علاقائی قبیلوں کی مختلف شاخوں سے جڑے ہوئے ہیں اور پیشہ کی بنیاد پر ملنے والا معاوضہ (جو جنس اور نقد میں ہوتا ہے) پر گزر بسر کی جاتی ہے۔ مختلف وادیوں میں معاوضہ کی مقدار میں کمی پیشی پائی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں ان پیشوں سے وابستہ گھرانے شہروں کی طرف نقل مکانی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ یہاں تفصیل سے ان گھرانوں کی ذمہ داریاں، معاوضہ اور پس منظر پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مَرُوخ (سونے وال): یہ لوگ گزشتہ چودہ سو سال سے دریائے سندھ کی ریت چھان کر سونا نکالنے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کا ذکر میگستھنیز نے (بحوالہ رشید اختر ندوی، 1990ء، صفحہ 206) اپنے روزنامچہ میں اس وقت کیا تھا جب وہ تیسری صدی قبل مسیح میں بطور سفیر ہندوستان آئے۔ 1878ء میں جان بڈلف نے جب ہندوکش کے قبائل نامی کتاب لکھی تو انہوں نے بھی سونے والوں کا ذکر کیا۔ آج ایک سو انتیس سال بعد بھی یہ لوگ ہنوز اسی پیشہ سے منسلک ہیں۔ عام لوگ انہیں سونے وال جبکہ مقامی لوگ مَرُوخ کہتے ہیں۔ چھلاس اور ہربن وادیوں میں ان کی مستقل آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ تاہم سونے کی تلاش کی خاطر ان کے گھرانے دریائے سندھ کے آس پاس خیمے لگائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خواتین، بوڑھے، جوان اور بچے بھی اس کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ خاندان کا سیانہ مرد دریا کے دھانے پر ریت چھاننے کے لیے جگہ بنا کر بیٹھتا ہے۔ اس کے اوزاروں میں لکڑی کا بنا ہوا ایک چھان یا جال ہوتا ہے جو کہ دریا کے ساتھ اس طرح لگایا جاتا ہے کہ ایک ہاتھ سے پانی حاصل کیا سکے۔ وہ ایک ہاتھ سے چھان ہلاتا رہے اور دوسرے ہاتھ سے جس میں ایک پیالہ یا مگہ جسے دستہ لگا ہوتا ہے سے پانی پھینک پھینک کر ریت چھانتا ہے۔ اس کے دیگر مددگار جن میں عورتیں، مرد اور بچے شامل ہیں دریا کے کناروں سے ریت

کھود کھود کر لاتے اور چھان میں پھینکتے جاتے ہیں۔ ان کے پاس لکڑی کا ایک آلہ ہوتا ہے جس میں پارہ محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک خاص عمل اور صفائی کے بعد یہ لوگ سونا حاصل کرتے ہیں۔ ہربن وادی کے قریب میں نے ایک مروخ کو ریت سے سونا نکالتے دیکھا اس کا کہنا تھا کہ وہ اوسطاً دو سے تین سو روپے فی کس کماتے ہیں۔ اب ان میں کئی پختون لوگ بھی یہی پیشہ اختیار کر چکے ہیں۔ عام لوگ ان سب کو مُروخ کہتے ہیں۔ انہیں مقامی ذاتوں کے لوگ کم ذات سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر آپس میں رشتے ناطے کرتے ہیں۔ ان کے بچے کم ہی سکول جاتے ہیں۔

ڈوبی (ڈُوم): کوہستان میں ڈوموں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں ایک وہ جو سرمنڈائی، بچوں کے ختنے، پکائی اور پیغام رسانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ساز یا ڈھول بجانے کا کام کرتے ہیں۔ کوہستان میں اس ذات کے کم ہی گھرانے اب باقی ہیں۔ زیادہ تر شہروں کی طرف نقل مکانی کر چکے ہیں۔ بچے کچے گھرانوں نے آبائی پیشہ ترک کر دیا ہے۔ کہا جاتا کہ یہ لوگ برصغیر کے پرانے باشندوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے پاکستان کے دوسرے مسلی، ڈوم اور میراثی وغیرہ۔ کوہستان سے اس ذات کے اکثر گھرانے مظفر آباد، مانسہرہ، ہری پور اور دوسرے شہروں کو منتقل ہو چکے ہیں۔ ماضی میں علاقائی لڑائیوں یا لشکر کشی کے دوران یہ لوگ جنگی تال و سر (بگائے وزن) میں ڈھول اور سرنا بجا کر لڑاکا لوگوں میں چستی پیدا کرتے تھے۔

ان لوگوں کی اپنی مادری زبان کا نام ڈوماخی ہے جو اب ہنزہ میں بچا ہوا ایک چھوٹا سا گروہ بولتا ہے۔ ڈاکٹر جارج بدرس کا کہنا ہے کہ یہ لوگ دو سو سال قبل جنوب سے تارک وطن ہو کر یہاں (یعنی ہنزہ وادیوں میں) آئے ہیں۔ کوہستان میں یہ لوگ کافی پرانے ہیں اور انہیں اکثر مختلف گروہوں میں بانٹا یا تقسیم کیا ہوا ہے جہاں ہر گروہ اپنے اپنے ڈوم فیملی یا گھرانے کی عزت و مال کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ (رازول 1998)۔ مقامی شادیوں کے دوران یہی لوگ ڈھول بجانے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ڈوم گھرانوں کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں مندرجہ ذیل روایتی کام شامل ہیں (تھے):

ڈُوموں کی رواجی ذمہ داریاں:

۱۔ بچوں کے ختنے کرنا۔
۲۔ سر مونڈنا۔
۳۔ غمی خوشی کے موقعوں پر پیغام رسانی۔
۴۔ شادی کے دوران گوشت کی دیگیں پکانا۔
۵۔ شادی کے روز دلہن کا صندوق اٹھا کر دولہا کے گھر پہنچانا۔
۶۔ شادی بیاہ کے دوران ڈھول اور سرنا بجانا۔
۷۔ ڈوم کی بیوی پر کسی قسم کی رواجی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ڈُوموں کے رواجی معاوضے:

۱۔ سالانہ بنیادوں پر فی مرد (چھوٹا یا بڑا) سر منڈھائی کی بنیاد پر پانچ کلو مکئی پٹن میں اس معاوضہ کو سُسوالی کہتے ہیں۔
۲۔ غمی خوشی کے دوران دیگیں پکانے پر ذبح کئے گئے جانور کا چمڑا، سر اور پائے۔
۳۔ دلہن کا صندوق اٹھا کر دولہا کے گھر پہنچانے پر تین سو روپے۔
۴۔ بچوں کے ختنہ پر دو سو روپے۔
۵۔ مشترکہ زرعی زمین کا ایک ٹکڑا جو سیری کہلاتا ہے گزر بسر کے لئے فراہم کی جاتی ہے۔
۶۔ ہر قبیلہ اپنے قسمی کی عزت اور اثاثہ کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔
۷۔ پاؤں ولی کے نام سے ایک معاوضہ (لاگ) لینے کا رواج ہے۔
۸۔ مشکل حالات میں لوگ ہنگامی امداد دیتے ہیں۔
۹۔ شادی بیاہ کے دوران ڈھول تماشہ میں نقدی اور اجناس کی صورت میں مالی امداد۔

کوہستان کے مشہور ڈُوم گھرانے: کوہستان میں کئی مشہور ڈوم گھرانے پائے جاتے تھے جن کا گانا بجانا جگہ جگہ مشہور تھا۔ یہ لوگ مقامی جنگوں یا شادی بیاہ کے دوران اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں شن قبائل کے ساتھ ڈوم گھرانے بھی نقل مکانی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے۔ تاہم آج کل یہ فن تقریباً ختم ہو رہا ہے۔

وادی کولئی کا رمیم ڈوم، جلکوٹ کا سپت ڈوم کافی مشہور تھے۔ رمیم کا گھرانہ اب بھی وادی کولئی میں ہے لیکن سپت کا گھرانہ کلی طور پر یہاں سے نقل مکانی کر گیا ہے اور آج کل ہری پور میں آباد ہیں اور پیشہ ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اب محنت مزدوری پر گزارہ کرتے ہیں۔ وادی ہربن میں ایک ڈوم گھرانہ پایا جاتا ہے جس نے اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے جولاہے کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اسی طرح وادی پٹن، کھندیا اور دوبیر کی وادیوں میں جو ڈوم گھرانے پائے جاتے ہیں انہوں نے بھی اپنا پیشہ ترک کر دیا ہے۔

اکھر (لوہار/ترکھان): یہ پیشہ ور گھرانے بھی مختلف قبائلی گروہوں کے ساتھ جدی پشتی جڑے ہوئے ہیں اور کسی بھی دوسرے قبیلہ کے پاس نہیں جاسکتے۔ بعض وادیوں میں یہ لوگ قبیلوں اور بعض مقامات میں خیلوں کی بنیاد پر تقسیم کیے ہوئے ہیں۔

رواجی ذمہ داریاں:

۱۔ زرعی اوزار بنانا جیسے ہل، کسی، درانتی، کلہاڑی، وغیرہ۔
۲۔ قومی یا قبیلائی پن چکی بنانا۔
۳۔ نئے گھروں کے شہتیر، ستون اور دروازے بنانا۔
۴۔ قبر کی کائی بٹ (ایسی دیوار جو لکڑ اور پتھر سے بنے) بنانا۔
۵۔ قبروں کے لئے لکڑی کا پنجرہ بنانا۔
۶۔ شہد کی مکھیوں کا ڈور بنانا (اس کے اندر شہد کی مکھیاں چھتا بناتی ہیں)۔
۷۔ چھت سے برف ہٹانے کا ہیچور بنانا۔
۸۔ لوہار اپنی خیل کی اجازت کے بغیر کسی دوسری ذات یا قوم کا کام نہیں کرسکتا۔

رواجی معاوضہ (کھلپن):

۱۔ فصل کے دوران فی گھرانہ چار کلو مکئی (یہ معاوضہ قسمی اور مالک کے رشتہ کا ہے)۔
۲۔ وادی کیال میں بیلوں کی جوڑی کی بنیاد پر بیس کلو مکئی۔
۳۔ وادی پالس میں بیلوں کی جوڑی پر کھلو (پچاس کلو) اور ایک بیل پر دس اوڑی مکئی۔
۴۔ اگر کسی کے پاس بیلوں کی جوڑی نہ ہو مگر وہ لوہار سے خدمات لیتا ہو تو سالانہ پانچ اوڑی مکئی۔
۵۔ پن چکی پیسنے کی اجرت فی من چار کلو مکئی۔ (اگر اس کے پاس چکی ہو تو)۔
۶۔ گرمائی چراگاہوں میں آباد ہر گھر سے سال میں ایک بار ایک وقت کا تازہ مکھن۔
۷۔ مشکل حالات میں ہنگامی امداد کا حق دار
۸۔ پن چکی کا نیا پتھر بنانے کا نو سو روپیے تک معاوضہ۔
۹۔ پن چکی کا ڈھول بنانے پر ساٹھ سے اسی روپیے کا معاوضہ۔
۱۰۔ پن چکی کا چھل بنانے پر چالیس سے ساٹھ روپیے کا معاوضہ۔
۱۱۔ مکان کی ڈبور (برآمدہ کی دیوار جو تختوں سے بنائی جاتی ہے) بنانے پر اسی اور مرمت پر چالیس روپے۔

پیالو (چرواہا): وادی پالس میں چرواہے کی سالانہ اجرت اس کی حیثیت کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ اگر چرواہا اپنے گھرانہ کے سمیت کسی کا ریوڑ پالتا ہو تو اس کا معاوضہ الگ ہے اور اگر وہ اکیلا ہی متعلقہ گھرانہ کے ساتھ رہ رہا ہو تو اس کا معاوضہ الگ۔ یہ پیشہ صرف گجر ذاتوں کے لوگ ہی کرتے ہیں۔ ان کے کام کا دورانیہ بہار سے بہار تک طے ہوتا ہے۔

رواجی ذمہ داریاں:

۱۔ متعلقہ مالک کی بھیڑ بکریاں چرانا۔
۲۔ بھیڑ بکریوں کو مقررہ وقت پر نمک دینا۔
۳۔ بھیڑ بکریوں کے لئے سبز پتے کاٹ کر لانا (سرما میں)۔
۴۔ بھیڑ بکریوں کا مکان مرمت کرنا، چھت ٹپکتی ہو تو اسے درست کرنا، بیرونی حصہ کی باڑ درست کرنا۔
۵۔ ریوڑ بڑا ہو اور پیالو کی فیملی بھی کام کرے تو بچے یا خاتون چھوٹے جانوروں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔
۶۔ بھیڑوں کی اون اور بکریوں کی جٹ کاٹنا یا کترنا۔

رواجی معاوضے:

۱۔ اگر چرواہا اکیلا ہو تو سالانہ تین سے چار ہزار روپے۔
۲۔ روزانہ کا کھانا۔
۳۔ سالانہ دو جوڑے کپڑے۔
۴۔ ایک کوٹ۔
۵۔ دو جوڑے پلاسٹک کے بوٹ اور جرابیں۔
۶۔ اگر چرواہے کی فیملی کام کرتی ہو تو سالانہ ۹ کھلا مکئی (۴۵۰) کلو۔
۷۔ مئی سے نومبر تک ۱۵ بکریوں کا دودھ (دسمبر سے اپریل تک بکریوں کا تمام دودھ جانوروں کے لئے چھوڑا جاتا ہے)۔
۸۔ خاندان کی رہائش کے لئے مکان۔
۹۔ بیماری یا گرنے کی وجہ سے مرنے والی بکری کی چار رانیں مالک کی اور بقیہ حصہ چرواہے کا۔ مالک نزدیک نہ ہو تو تمام مرنے والی بکری یا بھیڑ کی

معقول وجوہات بتانا اور چمڑا مالک کو دکھانا پڑتا ہے۔

۱۰۔ جانی اور مالی تحفظ۔

سرخیلیان: یہ لوگ نسلاً سواتی پٹھان قوم کی سرخیل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو 1713ء کے لگ بھگ سوات سے جلال بابا کے لشکر میں شامل ہو کر ہزارہ میں وارد ہوئے (محمد ارشاد خان، تاریخ ہزارہ، 1976ء) اور وہاں سے الائی اور پھر کچھ گھرانے وادی پالس میں آ کر آباد ہوئے۔ یہاں یہ لوگ دو بڑے مقامی قبیلوں جن کے نام دڑمہ اور کھکہ منکہ ہے کے ساتھ منسلک ہیں۔ ان لوگوں کو پالس کے علاقہ مسی اور گھمری میں مقامی قبیلوں کی زمینیں دی گئی ہیں جن پر یہ کاشت کاری کرتے ہیں اور الگ تلگ ماحول میں رہ رہے ہیں۔ آپس میں پشتو اور مقامی لوگوں کے ساتھ شنا زبان بولتے ہیں۔ زمینوں کی بنیاد پر ان کے گھرانے مختلف خیلوں کے کنڈری کہلائے جاتے ہیں اور یہ لوگ زمینوں کے مالکان کو قلانگ دیتے ہیں۔ قلانگ کے علاوہ ان پر کچھ رواجی ذمہ داری بھی عائد ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

رواجی ذمہ داریاں:

۱۔ علاقائی لڑائیوں میں اسلحہ، کارتوس کی سپلائی۔

۲۔ بیرونی علاقوں کے لوگوں کے ساتھ علاقائی لڑائیوں کے دوران خوراک پہنچانا۔

۳۔ حالت امن میں متنازعہ علاقہ میں پہرا دینا۔

۴۔ ضرورت کی پیغام رسانی۔ (جو علاقائی دفاع سے متعلق ہو)۔

۵۔ اپنے مالک کے سرمائی مکان جو بانڈو میں ہو کی تعمیر میں مدد کرنا۔

۶۔ مالکان زمین کو کم مقدار میں سالانہ قلانگ دینا۔

رواجی معاوضے:

۱۔ زرعی زمین کے ایک حصہ کی کاشت کے لئے فراہمی۔

۲۔ جان اور مال اور عزت کا تحفظ۔

۳۔ لوٹے ہوئے مال سے کم مقدار کا حصہ۔

جولا (جولاہا): ان کا کام اونی پٹی بنانا ہے جس سے لوگ اونی شاڑیاں، سونے کے لمبے لمبے کمبل جنہیں لُہی کہا جاتا ہے اور جن میں دس بارہ افراد ایک ہی لائین میں سو سکتے ہیں بنایا کرتے تھے۔ آج کل ان کا پیشہ ختم ہو رہا ہے۔ میں نے علاقہ کنشیر اور گدار میں ان کی دو کھڈیاں دیکھی ہیں جہاں یہ لوگ پٹی بناتے ہیں۔

اب زیادہ تر لوگوں نے اپنے آبائی پیشہ ترک کر رہے ہیں۔ ان کے زیادہ گھرانے پٹن وادی میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بھی وادی سوات سے یہاں آئے تھے۔ یہ لوگ مختلف گروہوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور ان کے کمی شمار ہوتے ہیں۔ لوگ انہیں سماجی اور معاشی تحفظ فراہم کرتے تھے۔

رواجی ذمہ داریاں:

۱۔ کھڈی پر اونی دھاگہ کات کر دینا۔

۲۔ کمبل، ٹوپی، شوکہ وغیرہ کے لئے اونی پٹی بنانا۔

رواجی معاوضے:

۱۔ فی گھرانی سالانہ ایک بھیڑ کی اون۔

۲۔ گرمائی موسم میں ایک دن کا گھی ہر وہ گھرانہ جن کے پاس مال مویشی ہو۔

۳۔ سالانہ ایک اوڑی مکئی۔

چومیار (موچی): موچی بھی مختلف گروہوں کے سانجے پیشہ ور ہوتے تھے۔ ان کی گزر بسر اپنی محنت پر ہوتی ہے اور انہیں لوہار اور ترکھان کی طرح متعین کھلین (معاوضہ) کی بجائے مرضی کے مطابق کچھ مقدار کی فصل دی جاتی تھی۔ مجھے وادی درہ مدخیل میں سعید زرین ولد عالمگیر (عمر 55 سال) نے بتایا کہ کوئی میں مختلف پیشہ ور ذاتیں یا گھرانے مندرجہ ذیل قوموں میں تقسیم ہیں:

پیشہ ور ذاتیں	جن مقامی گروہوں/قبیلوں کے زیر اثر ہیں
زرگر (سنیار)	ملتنہ قبیلہ (شن ذات)
ڈوم	بیگمہ قبیلہ (شن ذات)
چومیار	شوکھرہ قبیلہ (شن ذات)

کہتے ہیں ان کے آباؤ اجداد چکیسر سے آئے ہیں جو پٹھان تھے۔ اب یہ لوگ شنا زبان بولتے ہیں۔

آخون: مسجد کے خادم کو اخون کہا جاتا ہے آج کل بہت کم ہیں۔ یہ نام بعد از اسلام رائج ہوا ہے۔

کمہار: ان کے زیادہ تر گھرانے وادی کوئی میں آباد تھے اور اچھی قسم کے برتن بناتے تھے۔ آج کل اکا دکا گھرانے باقی ہیں۔ عام طور پر خواتین خود ہی سادہ قسم کے برتن بناتی ہیں۔ کھدائیوں سے برآمد ہونے والے برتنوں اور ان کی ساخت سے پتہ

چلتا ہے کہ قبل از اسلام یہاں اچھی قسم کی ظروف سازی ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنے برتنوں کے معاوضہ پر گزر بسر کرتے تھے۔

مہان/مھان (ملاح): بعض وادیوں میں مہان (ملاح) ذات کے گھرانے پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ماضی میں دریائے سندھ سے لوگوں کو آر پار اتارنے کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کے پاس چمڑے کی بڑی بڑی کھڑیاں ہوتی تھیں جن میں ہوا بھر کر لوگوں کو دریا عبور کراتے ہیں۔ آج کل مہان لوگ ربڑ کی ٹوپوں سے اس قسم کا کام لیتے ہیں۔ ان کی زیادہ تعداد وادی پٹن میں آباد ہے۔

مہان کی ذمہ داری: لوگوں کو دریا سندھ سے آر پار اتارنا۔

معاوضہ: ہر فصل کی کٹائی پر فی گھرانہ ایک اوڈی اناج۔

شموگہ: کوہستان میں اس ذات کے لوگ صرف وادی پالس میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے ایک بزرگ نے (1993ء میں) مجھے بتایا کہ ان کی ذات کا اصل نام بانیائے ہے اور ان کے اجداد قحط کشمیر کے دوران میدان ہزارہ اور بعد میں وادی پالس میں وارد ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ بانہالی ہیں. تاہم قیاس غالب ہے کہ ان کا تعلق گجروں کی ایک شاخ بانیال سے ہے جس کا ذکر ہزارہ کے رواج نامہ بندوبست 1972ء میں پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ لوگ دہقانی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور چوتھائی زمینیں کاشت کرتے ہیں آج کل ان کے زیادہ تر گھرانے دوبارہ میدان ہزارہ کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ ان کی شادیاں آپس میں ہی طے پاتی ہیں۔ آپس میں یہ لوگ گوجری سے ملتی جلتی پہاڑی بولی بولتے ہیں اور مقامی لوگوں کے ساتھ شنا بولتے ہیں۔

گجر: گجر ذات کی زیادہ تعداد وادی گہرال میں پائی جاتی ہے۔ تاہم کئی گھرانے وادی پالس، کولئی، پٹن، سیوئ، جلکوٹ اور ہربن میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ موسمی نقل مکانی کی گردش میں رہتے ہیں۔ پہلے پہل یہ لوگ دوسروں کے ریوڑ ہانکا کرتے تھے آج کل اپنے اپنے ریوڑ رکھتے ہیں۔ ان کے بہت سے گھرانے اپنا پیشہ ترک کر کے مانسہرہ، بالاکوٹ اور مظفر آباد میں جا کر آباد ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں گوجری اور دوسروں کے ساتھ شنا یا کوہستانی بولتے ہیں۔ آپس میں ہی رشتے ناطے کرتے ہیں۔ اکا دکا مقامی ذاتوں کے لوگ جنہیں کہیں سے رشتہ نہ ملے ان سے رشتہ لیتے ہیں لیکن ان کی اولاد کو ہمیشہ کم ذات ماں کا طعنہ ملتا ہے۔

ان کے عام رہائشی مکانات بہت سادہ قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر یہ لوگ غاروں یا بڑی بڑی چٹانوں کے نیچے رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں عام طور پر جانوروں اور میمنوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہ اکثر مقامی ذاتوں کے لوگوں سے ہٹ کر یا کچھ دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی گزر بسر صرف ریوڑ پر ہوتی ہے۔ مردوں کے ہاں عام طور پر ہاتھ والی کلہاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ آپس میں دشمنداری کرتے رہتے ہیں۔ جنگل میں یہ لوگ چھپر بنا کر رہتے ہیں۔

ذمہ داریاں: ہر وہ گجر گھرانہ جو سرمائی موسم میں کسی مالک کے باندو میں قیام کرتا ہو اور اس کی بھیڑ بکریاں اس سے جنگل سے مستفید ہوتی ہوں تو گجر گھرانہ بہار کے دنوں میں تین رات ان کی زرعی زمینوں میں قیام کا پابند ہوتا ہے تا کہ بھیڑ بکریوں کی مینگنوں سے زرعی زمین زرخیز ہو۔ اس قسم کے گجر گھرانہ کو کنڈری بھی کہا جاتا ہے۔

معاوضہ: تین سے چار ماہ تک چیڑ پتوں والے جنگلات میں بھیڑ بکریوں کی مفت چرائی۔ (معاوضہ کی دیگر تفصیل پیالو میں ملاحظہ ہو)۔

کوہستان کی مقامی زبانیں

شنا، کوہستانی، بٹیڑی، گبھاری اور چھلسیو یہاں کی مقامی زبانیں ہیں۔:

ان کے علاوہ یہاں جو دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں پشتو، گوجری اور پہاڑی زبان شامل ہے۔ لسانی شناخت یا درجہ بندی کے اعتبار سے شنا، کوہستانی، گبھاری، چھلسیو اور بٹیڑی زبان کو دردی لسانی گروہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کوہستان کے بازاروں میں رابطہ کی زبان شنا اور کوہستانی ہے۔ جبکہ سرکاری دفاتر میں اردو اور پشتو میں رابطہ کاری کی جاتی ہے۔ تعلیمی سطح پر اردو مروج ہے۔ اس کے علاوہ کوہستان کے بعض دینی مدرسوں میں عربی اور فارسی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔ تاہم آج کل مقامی علماء شنا یا کوہستانی زبان میں دینی علوم پڑھاتے ہیں۔

کوہستان میں مقامی زبانوں کے بولنے کا تناسب

شنا	کوہستانی	بٹیڑی	گبھاری	چھلسیو	پشتو	اردو
40.00 %	40.00 %	8:50 %	3.00 %	4.48 %	3.86 %	0.08 %

بحوالہ رازول کوہستانی، ہمالین جنگل پراجیکٹ رپورٹ 2000ء

شِنا (سُنا): شنا آریائی زبانوں کے مشرقی لسانی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ زبان نصف ضلع کوہستان کے علاقہ درہ مدخیل، کوئی، پالس، جلکوٹ، کمہالی (کمیلا)، ہربین اور شتیال کی وادیوں میں بولی جاتی ہے۔ کوہستان سے باہر یہ زبان ضلع چھلاس، ضلع استور، ضلع غذر کے کچھ حصے، ضلع گلگت کے زیریں حصے (آدھا گلگت)، بلتستان میں ست پارہ جھیل سے اوپر واقع گاؤں، کھرمنگ، کچورہ، آزاد کشمیر (مظفر آباد) کی تحصیل آٹھمقام کے علاقہ جات پھلوائی، مرناٹ اور تاؤبٹ، ضلع چترال میں گھوش، پریگل، بیوڑی وادی، کلکلک، عشریت، اپر دیر کوہستان کے مقام کلکوٹ، مدین کے علاقہ بشیگرام، افغانستان کی کنڑ وادی میں ساؤ کے مقام، جموں کشمیر میں وادی گریز، تلیل، دراس، داہ، ہنو اور لداخ کے بعض مقامات پر مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان کے کئی لہجے پائے جاتے ہیں بعض مقامات کے لہجوں میں کافی بُعد پایا جاتا ہے۔ جدید تحقیقات نے لسانی شواہد اور فنی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ شنا زبان کا لسانی ڈھانچہ اور صوتی عادات قبل از ہند آریائی لسانی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس زبان میں ہندکو، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، گوجری، بروشسکی، سنسکرت، فارسی اور عربی کے کثیر تعداد میں الفاظ پائے جاتے ہیں اور لسانی سرمایہ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تذکیر و تانیث اور صفاتی الفاظ کا اختتام عام طور پر متحرک پایا جاتا ہے۔ علی آوازوں کا نظام سُر اور تان کا حامل ہے۔ سُر میں اتار چڑاؤ سے معنوی امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اس زبان میں آج کل نثر، ڈرامہ، نظم، قواعد، لغات اور کئی دوسرے موضوعات پر لکھا جا رہا ہے۔ تاہم اس کا متفقہ رسم الخط ابھی تک اختیار نہیں کیا گیا۔ اس زبان کا لوک ادب کافی زرخیز ہے۔ لوک گیت، داستانیں، لوک کہانیاں، پہیلیاں، اکھان اور منتر (دم) پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوک ادب بکھرا ہوا ہے اور منظم طریقہ سے محفوظ نہیں کیا جا رہا۔ مختلف وادیوں یا علاقوں میں اس زبان کے لہجوں کے مختلف نام پائے جاتے ہیں۔ (رازول، 1998)۔

کوہستانی: یہ زبان کوہستان کے مغربی کنارے پر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ وادی بنکھڑ، دوبیر، جیال، پٹن، سیو، رزقہ اور کھندیا میں بولی جاتی ہے۔ کوہستان میں اس زبان کے تین لہجے پائے جاتے ہیں جو پٹن، کھندیا اور بنکھڑ میں مروج ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے لہجے کالام کوہستان اور دیر کوہستان میں مروج ہیں۔ جو کالامی، گاؤری اور بشکارک کے نام سے بھی موسوم کئے جاتے ہیں۔ کوہستان میں یہ زبان دو بڑے قبیلے منی اور منطریئے کی مادری زبان ہے جو کھندیا، سیو، کیال، پٹن، جیال، دوبیر اور بنکھڑ وادیوں میں آباد ہیں۔ کوہستانی اور شنا زبان میں لغوی، فونیائی اور صوریاتی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس زبان میں کافی کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ مولانا غلام عیسیٰ مرحوم نے اس زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور طبع کی ہے۔ ریڈیو پشاور سے اس زبان میں پروگرام نشر ہوتے ہیں اس زبان کے بعض صرفی لاحقے گوجری اور ہندکو زبانوں سے میل کھاتے ہیں۔

بٹوچی (بٹیڑی): یہ زبان بشام کے سامنے واقع بٹیڑہ کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ فونیائی، صوریاتی اور لغوی اعتبار سے یہ کوہستانی زبان سے قربت رکھتی ہے۔ تاہم اس کی اپنی انفرادی شناخت قائم ہے۔ اس زبان پر بہت ہی کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ یہاں اس کے بولنے والوں کی تعداد تیس چالیس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ انڈیا میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے۔

(بحوالہ: http://www.ethnologue.com/show_language.asp)

یہ پشتو اور شنا زبان کے درمیان بولی جاتی ہے اور تیزی سے متاثر ہو رہی ہے۔ اس زبان کا رسم الخط اور تحریری ادب موجود نہیں۔ تاہم لوک ادب پایا جاتا ہے۔

چھلسیوٗ: یہ کوہستان کے چھلیس قبیلوں کی زبان ہے جو کوئی میں مھبارن، جلکوٹ اور گلگت میں جگلوٹ کے ایک دو مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ اس زبان کے بولنے والوں کی کوئی گیارہ شاخیں پائی جاتی ہیں لیکن اکثریت اب اپنی زبان بھول چکی ہے۔ کم و بیش ڈھائی تین ہزار کی تعداد میں اس کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ یہ زبان معدوم ہو رہی ہے۔

گبارتی: یہ گبارہ قبیلہ کی زبان ہے جو کوئی میں مھبارن اور بیلہ میں بولی جاتی ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ کوہستانی لہجوں کے قریب ہے۔ کوہستان میں یہ بولی آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی اور اس کے بولنے والون کی موجودہ تعداد دو ڈھائی سو کے قریب ہے۔

گوجری: یہ گجر لوگوں کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والے کھندیا میں گبرال کے علاقہ میں زیادہ پائے جاتے ہیں دوسری وادیوں میں یہ لوگ بکھرے ہوئے ہیں۔ گوجری بولنے والے زیادہ تر گھرانے ہزارہ پلین کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں گوجری بولتے ہیں لیکن دوسروں کے ساتھ کوہستانی یا شنا میں بات کرتے ہیں۔

ایک عام گھر جو دو کمروں اور برآمدے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی چوبیس ہاتھ (نو ہاتھ ڈیڑھ فٹ)، چوڑائی بائیس ہاتھ اور اونچائی سات ہاتھ بتائی جاتی ہے۔ دونوں کمرے بارہ بارہ ہاتھ بنائے جاتے ہیں جب کہ برآمدہ دس ہاتھ چھوڑا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مکانات عام طور پر وادی کوئی، وادی پالس اور جلکوٹ میں پائے جاتے ہیں۔ زمین کی ناہمواری کی وجہ سے برآمدہ کے بیچ ایک لمبا کمرہ بھی بنانے کا رواج پایا جاتا ہے جسے پچھو کہا جاتا ہے۔ یہاں مال مویشی، گھاس یا دیگر فالتو سامان/اشیاء رکھی جاتی ہیں۔ برآمدہ تینوں اطراف سے لمبے لمبے تختوں کے ذریعے بند طرز کا بنایا جاتا ہے جسے ڈبور کہتے ہیں۔ اس کے دائیں بائیں ایک ایک دروازہ ہوتا ہے جب کہ سامنے کی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ ہوتا ہے جسے یہ لوگ درلی (کھڑکی) کہتے ہیں۔ کمروں میں ایک ایک کھڑی چھوڑی جاتی ہے جو کہ ایک فٹ سے بھی کم ہوتی ہے۔ اندرونی دو کمروں میں سے ایک کمرہ رہائشی ہوتا ہے جبکہ دوسرا کمرہ مال مویشی کے لیے۔ سرمائی موسم میں لوگ اندر رہتے ہیں جبکہ عام موسم میں برآمدہ میں سوتے ہیں۔ رہائشی کمرہ کی پچھلی دیوار کے ساتھ تین فٹ اونچی تھلی بنائی جاتی ہے جس پر مٹی کے بڑے بڑے برتن، صندوق اور دوسری اشیاء رکھی جاتی ہیں۔ چولہا عموماً رہائشی کمرہ کے ایک کونے کی طرف ہوتا ہے۔ دیواریں کا گہ بٹ (لکڑی اور پتھر) کی ہوتی ہیں۔ ان کی بنانے کی ترکیب کچھ اس طرح ہے کہ زمین کی کھدائی کے بعد چاروں کونوں میں ایک ایک بڑا پتھر رکھا جاتا ہے اور ان کے اوپر ایک شہتیر نما لکڑ بچھائی جاتی ہے۔ ان کے اوپر ایک چھوٹا سا گنگار رکھا جاتا ہے جسے ٹوپو کہتے ہیں اور ان کے اوپر پھر بڑی لکڑیاں بچھائی جاتی ہیں۔ ٹوپو کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو جگہ خالی رہتی ہے اسے پتھروں کے ذریعے بھر کر بند کیا جاتا ہے۔ دروازوں کو بند رکھنے کے لیے دو چیزیں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ ایک شاکھو اور دوسری اُدی (ہندکو میں لڑو)۔ لکڑی کے ستون ضرورت کے مطابق لگائے جاتے ہیں تاہم ایک شہتیر کے نیچے کم از کم تین ستون کھڑے کیے جاتے ہیں ان میں ایک وسط میں اور ایک ایک کناروں پر دیوار کے ساتھ ہوتا ہے۔ شہتیر کے اوپر کلیجے (چالیاں) رکھی جاتی ہیں ان کے اوپر چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ٹکڑے، اوپر گھاس پھونس اور پھر مٹی ڈالی جاتی ہے۔ برآمدہ کے ایک سرے پر چھولہا ہوتا ہے اور دوسرے سرے پر مال مویشی باندھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ درمیان میں اناج زخیرہ کرنے کی تانگ (لکڑی کا ایک بڑا صندوق) رکھا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس تانگ نہ ہو وہ عموماً مٹی کی ڈِڈیری (مٹی کے اونچے اونچے برتن) بنا کر مکئی کا ذخیرہ کرتے ہیں۔ گھر کی اندرونی اور بیرونی اطراف سے مٹی کی لپائی اور سفید مٹی سے بیل بوٹے بھی بنائے جاتے ہیں۔ گھروں کی تعمیر میں عموماً دیودار کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔

بعض وادیوں کے لوگ (جیسے ہربن، ثمر، رزقہ، پٹن) مکانات کی چھت کے اوپر اُلٹی وی کی شکل میں تختوں کی اضافی چھت بناتے ہیں جسے اُتھروئی کہا جاتا ہے۔

گرمائی مکانات:

موسمی مکانات عام طور پر بلند گرمائی چراگاہوں پر بنائے جاتے ہیں۔ جہاں مال مویشی کے لیے چارہ کے پتوں کے جنگلات پائے جاتے ہوں۔ اس قسم کے مکانات عارضی مکانات سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں انتہائی کم اشیاء لائی جاتی ہیں اور موسم کے ختم ہوتے ہی نقل مکانی کی جاتی ہے۔ تاہم انتہائی بلند چراگاہیں جو آٹھ سے دس ہزار فٹ سے بلندی پر پائی جاتی ہیں وہاں کمروں کا سائز اور اونچائی کم رکھی جاتی ہے۔ ان مقامات پر لوگ صرف ایک ایک کمرہ بناتے ہیں جو کہ دس یا بارہ فٹ سائز کا ہوتا ہے۔ اس کی اونچائی آٹھ فٹ سے زائد نہیں ہوتی کیوں کہ سرما کی برف باری سے گرنے کا امکان ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ گرمائی مقامات سے واپس آتے ہیں تو مکانات کی چھتوں میں اضافی ستون لگاتے ہیں تاکہ برف سے مکان دب نہ جائیں۔ ان مکانات کے چولہے بھی ایک کونے کی طرف ہوتے ہیں۔ چولہے کے انتہائی کونے میں دودھ کا ڈولا رکھا ہوتا ہے۔ ان مکانات میں سونے کے لیے چارپائی نہیں ہوتی بلکہ کمرہ کی ایک دیوار کے ساتھ سونے کے لیے ڈیڑھ دو فٹ اونچی تھلی بنائی جاتی ہے۔ مرد چونکہ حجرہ میں سوتے ہیں اس لیے بچے اور خواتین ہی ان تھلیوں پر سوتے ہیں۔ یہ مکان زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے دو تین سال بعد گھر جاتے ہیں۔

سرمائی مکانات: سرمائی مکانات بھی عام طور پر سادہ قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کا سائز اور اونچائی گرمائی مکانات سے زیادہ ہوتی ہے۔ گجر قبیلوں کے سرمائی اور گرمائی مکانات کافی چھوٹے اور تنگ پائے جاتے ہیں۔

قلعہ جات/حُجرے: کوہستان اور ضلع دیامر میں جگہ جگہ قلعہ جات پائے جاتے ہیں۔ جو عموماً لوگوں کے مشترکہ ہوتے تھے۔ یہ قلعہ جات چار منزلہ ہوتے ہیں اور انہیں مقامی زبان میں گڑی یا شکھاری کہا جاتا ہے۔ اس کی نچلی تین منزلیں ایک سائز کی ہوتی ہیں جبکہ چوتھی یا آخری منزل کٹاپور کہلاتی ہے۔ یہ حصہ عام طور پر نچلی منزلوں سے چہار اطراف ڈیڑھ سے دو فٹ بڑا اور باہر کو نکلا ہوتا ہے۔ نیچے سے

اوپر جانے کے لئے لکڑ کی سیڑھی استعمال کی جاتی ہے۔ تاہم اس کی ساخت عام سیڑھی کی طرح نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی لکڑی ہوتی ہے جسے جگہ جگہ پاؤں رکھنے کے لیے کاٹ کر تیار کیا جاتا ہے۔ کٹاپور کی چھت میں ایک کھڑکی ہوتی ہے جو کہ برف ہٹانے، مٹی ڈالنے وغیرہ کے کام آتی ہے۔ اس قسم کے قلعوں کی نچلی تینوں منزلوں میں اندھیرا ہوتا ہے جب کہ کٹاپور کے حصہ میں کافی روشنی ہوتی ہے۔ تعمیر میں اندرونی اور بیرونی اطراف میں ایک ایک لکڑی لگائی جاتی ہے اور درمیان میں چھوٹے چھوٹے کنکروں سے بھرائی کی جاتی ہے۔ لکڑی کے اوپر ایک ردا پتھر کا لگایا جاتا ہے اور اس کے اوپر پھر لکڑی لگائی جاتی ہے۔ لکڑی کے تنوں کو چہار اطراف میں پیوند کیا جاتا ہے اور وقفے وقفے کے بعد فائرنگ کے لیے سوراخ چھوڑے جاتے ہیں۔ قلعے کے ساتھ ہی ایک حجرہ ہوتا ہے اور بیرونی اطراف سے دیوار کے ذریعے اس کو بند رکھا ہوتا ہے اندر آنے کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے۔ کسی ایک کنارے پر پاخانہ کی جگہ بنائی جاتی ہے جہاں ایک نالی کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا ہے۔ دشمنداری کے دوران مرد باہر نہیں نکل سکتے۔ چہار منزلہ قلعہ جات یا شکھاری/گڑی کا زیادہ رواج وادی بریین، کولئی اور پالس میں پایا جاتا ہے۔ پہلے پہل خیلوں کے اجتماعی حجرے ہوا کرتے تھے۔ آج کل انفرادی حجروں کا رواج بڑھ رہا ہے۔

کٹاپور: کٹاپور ایک تو قلعہ کی چوتھی منزل کو کہا جاتا ہے اور دوسرا بعض گھروں کے کسی کونے کی چھت پر قلعہ نما حصہ تعمیر کیا جاتا ہے جسے کٹاپور کہتے ہیں۔ اس قسم کے قلعے اور کٹاپور عموماً وہ لوگ بناتے ہیں۔ جن کے اپنے قلعے نہیں ہوتے جن کی زیادہ دشمنداریاں ہوتی ہیں۔

پچھو: مال مویشی کے بنیادی مکان کو پچھو کہا جاتا ہے جو عام طور پر مستقل رہائشی علاقہ کے مکان کے تہہ خانہ میں بنا ہوتا ہے۔ مال مویشی اسی جگہ باندھے جاتے ہیں۔ یہ بالکل سادہ قسم کا ہوتا ہے۔ بعض مکانات ایسے بھی ہوتے ہیں جو تہہ خانہ میں نہیں ہوتے لیکن پچھو کے زمرہ میں آتے ہیں کیوں کہ ان میں صرف مال مویشی یا بھیڑ بکریاں رکھی جاتی ہیں۔

مَنُو: پہلے پہل عام گھروں میں چونکہ چارپائی کے استعمال کا رواج نہ تھا اس لیے لوگ سونے کے کمرہ میں چار فٹ اونچائی پر سونے کی جگہ بناتے تھے۔ جسے مَنُو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض چرواہے بھی جنگل میں درختوں کی ڈالوں پر سونے کے مَنُو بنایا کرتے ہیں۔ آج کل اس کا رواج کم ہو گیا ہے۔

یونسؑ (پن چکیاں): کوہستان میں جگہ جگہ پن چکیاں پائی جاتی ہیں۔ پرانے وقتوں میں پن چکیاں قوموں اور خیلوں کی مشترکہ ہوتی تھیں۔ آج کل انفرادی طور پر بھی لوگوں نے پن چکیاں بنائی ہوئی ہیں۔ پن چکی عموماً چھوٹے چھوٹے ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پن چکیاں لوہار اور جولہے چلاتے ہیں اور مالک کو اس کا حصہ دیا جاتا ہے۔ وادی پالس میں آٹھ بڑے قبائلی گروہ پائے جاتے ہیں۔ ہر گروہ کی اپنی اپنی پن چکیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح وادی پٹن، دوبیر، سیو، کھندیا، کولئی، ہربین میں بھی بے شمار پن چکیاں پائی جاتی ہیں۔ پن چکیوں کے پاٹ اور دوسرے اوزار مقامی لوہار یا ترکھان بناتے ہیں۔ پن چکی میں ایک آلہ رکھا ہوتا ہے جسے لپکی کہا جاتا ہے۔ دانے پیسنے کا معاوضہ اسی آلہ سے من کر لیا جاتا ہے۔

لکڑی کی دیگر روایتی اشیاء: لکڑی کی جو دیگر اشیاء پائی جاتی ہیں ان میں مدہانی، تانگ (اناج کے ذخیرے کا صندوق)، انبار (یہ بھی تانگ کی طرح اناج ذخیرہ کرنے کے کام آتا ہے)، پیڑھی، پلنگ (ایسے پلنگ جن کے بازو لکڑی کے اور بُنائی چمڑے کی تندے کی جاتی ہے)، چمچے (پکانے کے چھوٹے اور بڑے چمچے)، چلم کی نلکی، تباخ (لکڑی کا تھال)، ہپن (کمان)، اون کاتنے کا چرخہ، ہچور (برف ہٹانے کا ایک اوزار)، جگلی، پھیلو، ڈوُر (۱۔ ایسے ڈور جو کہ شہد کی مکھیوں کے لیے بنائے جاتے ہیں اور بیرونی دیوار میں لگاتے ہیں۔ ۲۔ لکڑی کے ایسے ڈور جن میں اونی کپڑے پاؤں سے دھوئے جاتے ہیں)، کھر (پرنالہ یا زرعی نہر کا ایسا حصہ جہاں سے لکڑی کی نالی کے ذریعے پانی گزارا جائے)، زرعی اوزار وغیرہ شامل ہیں۔

بیل بوٹے: مقامی سطح پر دیواروں کے بیل بوٹوں، کپڑوں کی کڑھائی، لکڑی کی کنندہ کاری اور شتیال یا اس سے آگے پائی جانے والی پتھروں کی کنندہ کاری میں بعض اشکال میں کچھ مماثلت یا مشابہت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مقامی گھروں کی دیواریں چونکہ مٹیالی ہوتی ہیں اس لیے شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کی تازہ لپائی کے بعد بیل بوٹے بنانے کا عام رواج ہے۔ اس کے لیے خواتین یا تو سفید مٹی سے بیل بوٹے بناتی ہیں یا پھر شیشی رنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ دیواروں کے بیل بوٹوں میں سادہ قسم کی نمایاں اشکال شاخوں اور پھولوں کی پائی جاتی ہیں۔ ایک بنیادی بیل یا درخت کو بنیاد بنا کر اس کے ساتھ شاخوں، پھولوں اور دوسری اشکال کو جوڑنے کا عمل پایا جاتا ہے۔ بعض بیل بوٹوں کے ساتھ شاخ کے وسط میں خلاف معمول پھول یا پتی کے بجائے چوکور چار خانے اور وسط میں ایک

ایک نقطہ پایا گیا ہے۔ دیواروں کے بیل بوٹوں یا ان کے بارڈرز کی اشکال مقامی کشیدہ کاری کے ڈیزائن کی سادہ اشکال کہی جاسکتی ہیں۔ بیل بوٹوں کی بعض اشکال اناج ذخیرہ کرنے کے بڑے بڑے برتنوں پر بھی پائی جاتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جہاں بیل بوٹے جمالیاتی ذوق کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہاں شجر اور اس کی شاخیں زندگی، آبادی کاری اور خوشحالی سے بھی منسوب ہیں اور یہ لوک اعمال میں شجری اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

کشیدہ کاری

کشیدہ کاری میں استعمال کی بُنیادی اشیاء: مختلف رنگوں کا ریشم، سُوتی دھاگہ، رنگین بٹن، موتی اور ہار، سیپیاں، پرانے سکے، ٹچ، چاندی وسلور کے تعویز، مشک ہرن یا ان سے مشابہہ پلاسٹک کے دانت، گھاس کے تنکے (بچوں کی ٹوپی کے لیے)۔

بنیادی تکنیک: روایتی طور پر کشیدہ کاری کے لیے کوئی فریم استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اضافی کپڑا کو عارضی ٹانکہ کے ذریعے بند رکھا جاتا ہے۔ انگلی کو سوئی سے بچانے لیے لوہے کی ہگوئی استعمال کی جاتی ہے۔

جس قسم کا پھول کاڑھنا ہو اس کے لیے پہلے عام دھاگہ سے پھول کی بیرونی چھپائی کا کام لیا جاتا ہے اس ٹانکے کو الخیون بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ٹانکے بنیادی کشیدہ کاری سے باہر ہوتے ہیں اور کشیدہ کاری کے بعد انہیں ادھیڑ کر ہٹا دیا جاتا ہے۔

کڑہائی کا بنیادی سکیل: کپڑے کے طول کے رخ کو اَ اور عرض کے رخ کو اَیر کہا جاتا ہے۔ کپڑے کے چھوٹے چھوٹے مربع کے دھاگوں کی گنتی اور فاصلوں کی بنیاد پر پھول یا پٹی کے سائز کا تعین کیا جاتا ہے۔ کشیدہ کاری کے پھول، ٹہنی، پٹی وغیرہ میں مناسب تناسب یا سائز کے لیے انہی خانوں سے مدد لی جاتی ہے۔

کڑہائی کے ٹانکوں کی اقسام: ریشم کی کڑہائی میں مختلف قسم کے پھول، شاخیں اور ٹانکے پائے جاتے ہیں پھولوں اور ٹانکوں کی اقسام کے مختلف مقامی نام پائے جاتے ہیں۔ ایک کشیدہ کار خاتون نے ان کے یہ نام بتائے ہیں:

ٹانکوں کی اقسام	تفصیل
الخی	سلائی کی ایک ایسی قسم جس سے کڑہائی میں ٹھپے کا کام لیا جاتا ہے۔ جس قسم کی کڑہائی یا پھول بنانا ہو خواتین پہلے الخی کے تحت اسے کاڑھتی ہیں۔ اس کے بعد اس کے اندر ریشم کی کڑہائی کی جاتی ہے جون جوں اصل کڑہائی ہوتی ہے توں توں الخی کا ڈنگا اکھیڑا جاتا ہے۔ یہ عارضی قسم کا ٹانکا ہوتا ہے جو پھول یا پٹی بنانے میں کام آتا ہے۔
کسپٹی	تکونی پٹی کو کسپٹی کہا جاتا ہے یہ عموماً اندرونی یا بیرونی بارڈر کی پٹی کے قریب ہوتی ہے۔ کسپٹی سے مراد تکونی پھول ہوتا ہے۔ ایک بڑی کسپٹی کے اندر ذیلی کسپٹی بھی بنائی جاتی ہیں۔
چُنی کسپٹی	یہ بڑی کسپٹی کے اندر چھوٹی ذیلی تکونی پھول کا نام ہے۔
سرو کسپٹی	یہ بھی تکونی پھول کی ایک قسم ہے۔ اس کا دوہرا ٹانکا ہوتا ہے۔
جالے کسپٹی	جال کے ٹانکا کی ایک قسم ہے جس سے تکونی پھول کاڑھا جاتا ہے۔
سادہ کسپٹی	اس میں ہموار ٹانکا کاڑھا جاتا ہے جو کہ فاصلہ دار ہوتا ہے۔
چوکہ پُھڑہ	چوکور نما پھول کی ایک قسم ہے جس کے چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے ہیں۔
پُچھالی	پُچھالی کے معنی پر کے ہیں۔ کڑہائی میں چوکور پھول کے کونے میں ایک تکونی پھول کا اضافہ کیا جاتا ہے جسے پُچھالی یا پُچھالیو پُھڑہ بھی کہا جاتا ہے۔
بکھو پُھڑہ	ڈال یا شاخ کے پھول کو بکھو پُھڑو کہا جاتا ہے۔
کُڑکی	چوکور نما خانوں کے پھول کے اندر چھوٹے پھول کاڑھے جاتے ہیں جنہیں کُڑکی کہا جاتا ہے۔ یہ ٹانکا کی ایک قسم بھی ہے۔
کُڑکیو پُھڑہ	کُڑکیو کے پھول کو کُڑکیو پُھڑہ کہا جاتا ہے۔
کُڑکیو خک	کُڑکیو کے پھول کا ٹانکا۔
سَرہ	کشیدہ کاری کی پٹی کے اندر چھوٹے چھوٹے پھول اور ٹانکے
لڑوزی	کسی پٹی کے باہر کے کنارے پر سنگل ٹانکے کی تین الگ الگ لائنیں ہوتی ہیں جو بیرونی حد بندی کرتی ہے۔ باہر کی دو لائنوں کا رنگ ایک ہوتا ہے جبکہ درمیانی ٹانکا کا الگ رنگ ہوتا ہے۔
ٹیلی لڑوزی	یہ بھی لڑیزی کے ٹانکہ کی ایک قسم ہے۔

سرگا　　کنارے کی پٹی کی ایک قسم جو سرگا کہلاتی ہے۔

چُمر خَک　　سلائی کے ٹانکا کی ایک قسم جو خواتین کی ٹوپیوں اور تمباکو کے تھیلوں کے کڑھائی کے کام میں استعمال ہوتی ہے۔

بَخی　　یہ کپڑوں کی عام سلائی کے ٹانکا کی قسم ہے۔

پَٹہ　　پٹہ کے پھول کو سَرہ کہتے ہیں۔ جو دہرے ڈنگے میں ہوتا ہے۔ یہ زیادہ محنت طلب کام شمار ہوتا ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر لڑوزی کی لائنیں کاڑھی جاتی ہیں۔ لڑوزی کے باہر عام طور پر زنزیے بنائی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ چند مزید ٹانکے درج ذیل ہیں:

پون، سروپون، چُنی زنزیے، زنزیے، سادہ پُشلوئے، پُشلوئے، خالیے

لباس اور کشیدہ کاری

اگو (شال) یا عام چادر: بنیادی طور پر شال دلہن کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ اس کی دو تہیں ہوتی ہیں زیریں تہہ استر کہلاتی ہے جب کہ کڑھائی کا تمام تر کام بالائی تہہ پر کیا جاتا ہے۔ عمومی طور پر اس کی زیریں اور بالائی تہہ ڈھائی گز کی ہوتی ہے۔ شال کے لئے عموماً سیاہ کپڑا استعمال کیا جاتا ہے تا کہ کڑھائی نکھر کر سامنے آئے۔ اس کی کڑھائی کے لیے مختلف قسم کا ریشم استعمال کیا جاتا ہے جس میں نمایاں طور پر سرخ رنگ غالب نظر ہوتا ہے۔ کناروں پر سفید موتیوں کی جھالریں بنائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد شال کا بارڈر بنایا جاتا ہے اور اس کا انحصار کشیدہ کار کے اوپر ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا بارڈر بناتی ہے۔ بعض خواتین بارڈر کے لیے سیدھی پٹی قسم کی کشیدہ کاری کرتی ہیں اور بعض تکونی پٹیوں پر مشتمل بارڈر بناتی ہیں۔ اگر بارڈر سیدھی پٹی کا بنا ہو تو پھر اس کے باہر تکونی پٹی کی کڑھائی کی جاتی ہے اور پھر تکون کے اوپر درخت نما پھول کی کڑھائی کی جاتی ہے۔ شال کی کناروں کی سادہ اور سیدھی پٹی کے تین عناصر ہوتے ہیں۔ پٹی کے دونوں کناروں کا ڈنگا تین تین لائنوں پر مشتمل ہوتا ہے اندرونی اور بیرونی لائن کا رنگ ایک جب کہ درمیانی لائن کا رنگ الگ ہوتا ہے۔ پٹی کو مختلف رنگوں کے سائز میں تقسیم کر کے بنایا جاتا ہے۔ پٹی کا پھول جو کہ چھوٹے چھوٹے خانوں اور ڈنگوں پر مشتمل ہوتا ہے لڑوزی کہلاتا ہے۔ بعض اوقات سیدھی پٹی کی بجائے الٹی اور سیدھی 'V' وی' کی شکل میں پٹی بھی بنائی جاتی ہے۔ پٹی کی کڑھائی سرہ (تالے) کہلاتی ہے اس کا دوہرا ٹانکا ہوتا ہے جو چھوٹے چھوٹے مربوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض اوقات شال کے کنارے کی پٹی ایک اور ٹانکے میں بنائی جاتی ہے جسے سرگا کہا جاتا ہے۔ اس کے اندرونی اور بیرونی کنارہ پر چنی زنزیے کا ٹانکا ہوتا ہے اور وسط میں سرگا کی کڑھائی۔ یہ کم محنت والا کام ہوتا ہے۔

شال کے بارڈر کے کام کے بعد مختلف طریقوں سے اس کے اندر پھولوں کی کڑھائی کی جاتی ہے۔ شال کے وسط میں بڑا پھول کاڑھا جاتا ہے جب کہ اردگرد مختلف اقسام کے پھول، پتیاں، شاخیں بنائی جاتی ہیں۔ جن اقسام کے مربعے پائے جاتے ہیں ان میں تکونی اور چوکور مربعے اہم ہیں۔ شال کی کڑھائی کے بعد اس کے اوپر مختلف اشیاء ٹانکی جاتی ہیں جن میں پرانے سکے، رنگ برنگے بٹن، چھوٹے بڑے موتی، سیپیاں اور لچ وغیرہ شامل ہیں۔ ان اشیاء کے ٹانکنے کا طریقہ خواتین کی اپنی اپنی پسند پر ہوتا ہے۔ تاہم ایک دوسرے سے مشورہ یا کاڑھی ہوئی اشیاء دیکھی جاتی ہیں۔ عموماً ہر دوشیزہ اپنی شادی کے لیے شال تیار کرتی ہے۔ اس پر کم و پیش ایک سے دو سال لگ جاتے ہیں۔ بڑی عمر کی خواتین اس قسم کی شالیں نہیں اوڑھتیں بلکہ کم عمر خواتین اس قسم کی شالوں کو اوڑھنا ترجیح دیتی ہیں۔

چولیو قمص (زنانہ قمیض): شال کے بعد کڑھائی کی دوسری اہم چیز خواتین کی قمیض کی ہے۔ قمیض کے لیے بھی سیاہ کپڑا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک عام خاتون کی قمیض کی کڑھائی میں مختلف اقسام کے پھولوں اور پتیوں کو کام میں لایا جاتا ہے۔ قمیض کی کڑھائی میں گلے کی کڑھائی زیادہ اہم ہوتی ہے۔

گلے کے اردگرد مختلف قسموں کی پٹیوں کی کڑھائی کی جاتی ہے۔ پہلی پٹی کے بعد سفید موتی لگائے جاتے ہیں اس کے بعد تین سے چار تک کی تعداد میں چھوٹی چھوٹی پٹیاں کاڑھی جاتی ہیں گو کہ یہ پٹیاں جڑی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے لیے درمیان میں ایک دھاگہ کی لکیر نما کڑھائی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد بیرونی حصہ پر عام تکونی پٹی بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے پھول کاڑھے جاتے ہیں اور ہر پھول کے سرے پر سفید موتی پروئے جاتے ہیں۔ خالی جگہوں پر رنگ برنگے موتی اور بٹن لگائے جاتے ہیں۔ موتی اس انداز میں لگائے جاتے ہیں کہ ان کا گول پھول بنے اور اس کے درمیان میں دوسرے رنگ کا بڑا موتی لگایا جا سکے۔ گلے کی کڑھائی عام طور پر ناف تک پھیلی ہوتی ہے اور اس کے اردگرد بعض خواتین موتیوں کی جھالر بنا کر جوڑتی ہیں۔ گلے کی زنجیر یا بٹن کے زیریں اختتامی حصہ پر عام طور خواتین ایک یا دو پرانے سکے ٹانکنے کو ترجیح دیتی ہیں تاہم اگر سکے دو ہوں تو ان میں سے ایک بڑا اور ایک چھوٹا ہوتا ہے۔ قمیض کا

زیریں دامن عام طور پر کشیدہ کاری کے بغیر ہوتا ہے لیکن دامن کے کناروں پر کڑھائی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بازوؤں کے کف کے اوپر کڑھائی ہوتی ہے۔ کف بند اور گول ہوتے ہیں جبکہ گلا پٹی نما ہوتا ہے اس قسم کی قمیصیں صرف نوجوان خواتین پہنتی ہیں یا درمیانہ عمر کی خواتین شادی بیاہ کے موقعوں پر عام حالات میں کڑھائی کی قمیض پہنی نہیں جاتی۔ ایک عام زنانہ قمیض کے لیے ساڑھے چار گز کپڑا درکار ہوتا ہے۔ قمیض کھلی ڈھلی ڈھالی سلائی جاتی ہے۔ اس کی آستینیں بھی کھلی ہوتی ہیں۔ بعض خواتین گلے کی زنجیر لگواتی ہیں اور بعض بٹن کا استعمال کرتی ہیں۔ قمیض کے دائیں طرف جیب لگانے کا رواج ہے۔

شرلی اور پُندی: زنانہ شلوار کو شرلی اور مردانہ شلوار کو شروالا کہا جاتا ہے۔ خواتین کی روایتی شلوار کے لیے عام طور پر بارہ، پندرہ، سولہ یا بائیس گز کا کپڑا درکار ہوتا ہے۔ اگر شلوار زیادہ گھیرے والی ہے تو زیادہ اور کم گھیرے والی ہے تو کم کپڑا لگتا ہے۔ بڑے گھیرے والی شلوار کا پائنچہ الگ ہوتا ہے جسے پُندی کہا جاتا ہے۔ اور اسے بٹن کے ذریعے جوڑا جاتا ہے۔ پندی الگ سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کے لیے تین گز کا کپڑا درکار ہوتا ہے۔ راقم نے ایک بنی ہوئی پندی کی پیائش کی جو کہ 6 انچ چوڑی اور 53 انچ لمبائی میں تھی۔ یہ پنڈلی کے ساتھ چپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ پائنچہ پر ساڑھے تین سے چار انچ تک چوڑائی میں ریشمی کڑھائی کی جاتی ہے جبکہ اندرونی ٹخنوں کے برابر ساڑھے تین انچ گولائی میں سفید موتی پرو کر ایک گول پھول بنایا جاتا ہے اس پھول کے وسط میں سرخ رنگ کا ایک بڑے سائز کا موتی پرویا جاتا ہے۔ اس پھول کو جسے مقامی زبان میں چُھو کہا جاتا ہے۔ پہن کر چلنے کے دوران موتیوں والا گول پھول اندرونی ٹخنہ کے اوپر ہوتا ہے۔ پُندی کافی مشکل سے پہنی جاتی ہے اور اس کا بالائی حصہ بٹنوں کے ذریعے شلوار سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر دلہنیں پہنا کرتی ہیں۔ آج کل اس کا رواج کم ہو رہا ہے۔ شلوار کا بالائی حصہ کافی زیادہ گھیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سلائی ہاتھ سے کی جاتی ہے اور کوئی بھی بڑی عمر کی سمجھدار خاتون اسے بنا سکتی ہے۔ عام شلواریں گو کہ زیادہ گھیرے کی بنائی جاتی ہیں لیکن ان کے ساتھ پُندی نہیں ہوتی ہے۔ اس قسم کی شلواروں کا استعمال بعض افغان قبیلوں کی خواتین میں مشاہدہ کیا گیا ہے۔

روئمال (رومال): پرانے وقتوں میں مرد، لڑکے زیادہ تر سروں پر سادہ یا کاڑھے ہوئے روئمال باندھا کرتے تھے۔ آج کل جوان مرد ٹوپی پہنتے ہیں اور اکا دکا لڑکے کاڑھا ہوا روئمال باندھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ روئمال تکون شکل میں کاٹے اور کاڑھے ہوئے ہوتے ہیں جن کا عام سائز 36X25X25 انچ ہوتا ہے۔

گُلو بند (گلو بند): گلو بند کم عمر لڑکوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے بارڈر عموماً شال کی طرح کاڑھے جاتے ہیں اور درمیانی حصہ میں گوٹا کی جھک کے ڈنگا سے کڑھائی کی جاتی۔ بعض خواتین پھول اور بعض شاخ نما پھول کاڑھ کر جھالریں بناتی ہیں۔ شال کی طرح اس کا بھی استر لگایا جاتا ہے۔ ایک عام گلو بند کی لمبائی 54 اور چوڑائی 17 انچ پائی گئی ہے۔

بالخ (سرہانہ): گھروں میں سرہانوں کی کڑھائی بھی عام پائی جاتی ہے۔ سرہانوں کی کڑھائی خواتین کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں کوئی ایک قاعدہ پایا نہیں جاتا۔ عام طور پر سرہانہ کا بارڈر سیدھی پٹی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اندرونی حصہ پر تکونی پٹی کے پھول کاڑھے جاتے ہیں اور ہر تکونی سرے پر درخت کا پھول کاڑھا ہوا پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے رنگوں کا انتخاب بھی کسی خاتون کے اپنے ذوق کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اس کے بعد سرہانے کا جو حصہ بچ جائے اس کے وسط میں تکونی پٹی کا پھول کاڑھا جاتا ہے اور ارد گرد چھوٹے چھوٹے پھول بنائے جاتے ہیں۔ بیرونی کنارہ پر کچھ خواتین عام دھاگہ سے کشیدہ کرتی اور بعض نہیں کرتیں۔ اس میں کوئی بھی موتی، سکے یا بٹن ٹانکے نہیں جاتے۔ بعض خواتین سرہانہ کے صرف ایک طرف کڑھائی کرتی ہیں اور بعض دو طرفہ۔

کھوڑو (تھیلا): چلم کے تمباکو کا تھیلا کھوڑو کہلاتا ہے۔ اس کا سائز 6x4 انچ ہوتا ہے۔ اس کے اندر استر لگا ہوتا ہے۔ کناروں پر یا تو سفید ہارکی کی جھالریں بنائی جاتی ہیں یا پھر رنگ دار لڑیا اور گچھے بنائے جاتے ہیں۔ اس کا منہ شلوار کے نیفے کی طرح ہوتا ہے جس میں دو طرفہ دھاگہ کی ڈوری ڈالی ہوئی ہوتی ہے دونوں طرف سے کھینچنے پر اس کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ بعض تھیلوں کے بارڈر پر پٹیاں کاڑھی ہوتی ہیں اور بعض پر پھول۔ تاہم اس کا وسطی حصہ تمام تر نفاست کے ساتھ کاڑھا ہوا ہوتا ہے جس میں عموماً چوکور پھول اور اس کے اندر پتیاں بنائی جاتی ہیں۔ بعض جوان کارتوسوں کے گٹہ کے ساتھ پیٹھ پر لٹکائے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں۔ شادی کے دوران جہیز میں عموماً اس قسم کے تھیلے دیئے جاتے ہیں۔ وادی کولئی میں اس قسم کے تھیلوں کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے۔

بوخکی (سرمہ دانی): کپڑنے کی ایک تکونی سرمہ دانی جسے مقامی زبان میں بوخکی کہا جاتا ہے۔ ماضی میں سرمہ کے لیے عام طور پر استعمال کی

جاتی تھی۔ آج کل اس کے استعمال کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ اس کی بناوٹ قرآن مجید کے غلاف سے ملتی جلتی ہے۔ سرے پر ڈوری اور اندر استر لگا ہوتا ہے۔ اس کے اوپر کڑھائی کا نفیس کام کیا جاتا ہے۔ اس کا عام سائز 7:1X3.5X5 انچ ہوتا ہے۔

تعویز (تعویز): بچوں اور بڑوں کے لیے جو تعویز بنائے جاتے ہیں انہیں بعض خواتین ریشمی کڑھائی میں تیار کرتی ہیں۔ کچھ تعویز گلے کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ بندق کے پٹے کے ساتھ لٹکائے جاتے ہیں۔

ٹوپیاں: کوہستان میں روایتی کڑھائی کی ٹوپیوں کی چھ اقسام پائی جاتی ہیں۔ دو مردوں کی، دو بچوں کی اور دو خواتین کی۔ یہاں ان کی الگ الگ تفصیل دی جاتی ہے۔

بال چھلوکھوئی (بچوں کی ٹوپی): بچوں کی اس قسم کی ٹوپی کے کنارے نہیں ہوتے، نہ ہی اس کے اوپر مشک ہرن کے دانت لگے ہوتے ہیں۔ یہ گول شکل میں ہوتی ہے۔ اور وسط میں ایک چڑی/چیئی (ایک قسم کا گچھ) لگایا جاتا ہے۔ اس پر عام سی کڑھائی کا کام ہوتا ہے۔ کڑھائی کے ساتھ ساتھ اس پر موتی، بٹن اور ہار بھی لگایا جاتا ہے۔ نومولود اور کم عمر بچوں کے لیے یہ ٹوپی بنائی جاتی ہے تا کہ ان کے سر گول رہیں۔

خول: بچوں کی ٹوپی کی یہ ایک خاص قسم ہے جو کافی محنت سے تیار کی جاتی ہے۔ ٹوپی کا اوپر والا حصہ خول کہلاتا ہے۔ سر سے نچلا حصہ لپھوا اور تین کنارے کونی (کان) کہلاتے ہیں۔ وسطی کنارہ پیٹھ اور دائیں بائیں کے کنارے شانوں پر ہوتے ہیں۔ اس ٹوپی کا ایک اہم عنصر اس پر جڑا ہوا تعویز اور مشک ہرن کے دانت ہوتے ہیں جو کہ عین پیشانی کے اوپر ٹانکے جاتے ہیں جو نظر بد و بیماری سے بچاؤ اور درازی عمر کا ٹونکا ہوتے ہیں۔ ٹوپی کے وسط میں ایک چھوٹا سا مینارہ نما خول ہوتا ہے۔ (اکثر اسے بدھ مت کے دور کا اثر سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کی شکل اسٹوپا جیسی ہے۔) خول کی کڑھائی مختلف قسموں کے پھول اور پتیوں میں کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس پر پرانے سکے، موتی، ہار، سیپیاں، بٹن وغیرہ بھی ٹانکے جاتے ہیں۔ ایک کشیدہ کار خاتون زندگی میں تین اہم چیزیں بناتی ہے ایک اپنی شادی کی شال، دوسری قمیض اور تیسری اپنے بچی یا بچہ کے لیے خول۔ بعض خواتین پاشمینہ سے بھی اس قسم کی ٹوپیاں تیار کرتی ہیں۔

چولیو کھوئی (زنانہ ٹوپی): یہاں خواتین دو قسم کی ٹوپیاں استعمال کرتی ہیں ایک قسم وادی ہربن، سازین اور شتیال کے علاقوں میں زیر استعمال ہے۔ یہ چوکور نما ٹوپی ہوتی ہے اور چادر کے نیچے پہنی جاتی ہے۔ شادی شدہ عورت سیاہ جبکہ غیر شادی شدہ عورت سفید ٹوپی پہنتی ہے۔ ٹوپی کی دوسری قسم وادی کولئی، جلکوٹ اور پالس میں مروج ہے۔ یہ قسم گجر خواتین کی ٹوپی کی طرح ہے جسے دم دار ٹوپی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے سر کے حصہ کی گولائی کم گہرائی میں ہوتی ہے جب سر پر پہنی جاتی ہے تو اس کی دم کا حصہ پیٹھ پر آ جاتا ہے۔ اس پر کڑھائی کا کم کام پایا جاتا ہے۔ اس کی کڑھائی چُمر خک کے ٹانکا کے تحت کی جاتی ہے۔ کڑھائی کے پھول اور شاخوں کو چُمر چکے پُھڑہ گہ بگہ (چُمر چک کے پھول اور ڈال) کہا جاتا ہے۔ ٹوپی میں سر کے وسط میں ایک گول پھول کاڑھا جاتا ہے۔

لپھوئے کھوئی: مردانہ ٹوپی کی یہ ایک پرانی قسم ہے جو اب صرف چرواہوں کے زیر استعمال ہے۔ یہ ٹوپی بچوں کے خول سے ملتی جلتی ہے۔ یہ اون کی پٹی سے بنائی جاتی ہے اور زیادہ تر موسم سرما میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کے اوپر سادہ قسم کے پھول کاڑھے جاتے ہیں۔ اس کی کڑھائی کا دھاگہ بھی اونی ہوتا ہے۔ کنارے پر ڈال اور پتیوں کے پھول کاڑھے جاتے ہیں۔ سر کی گولائی کے حصہ میں چار یا پانچ اونی گچھے ٹانکے جاتے ہیں اور سر کے عین وسط میں بڑے سائز کا ایک گچھہ ٹانکا جاتا ہے۔ مردانہ ٹوپی کی دوسری قسم اونی پٹی کی ہے جو کوہستان، دیامر اور ضلع گلگت میں پائی جاتی ہے۔ یہ چترالی ٹوپی سے چھوٹی اور ہلکی ہوتی ہے۔

بچوں کی واسکٹ: بچوں کی واسکٹ عموماً ریشمی کڑھائی سے تیار کی جاتی ہیں اور اس کے اندر عام کپڑے کا استر لگایا جاتا ہے۔ گلہ اور بازو پر الگ کپڑے کی کناری لگائی جاتی ہے۔ واسکٹ کے سامنے اور پیٹھ والا حصہ مکمل طور پر کاڑھا ہوا ہوتا ہے۔ کڑھائی کے پھول، شاخیں اور پتیاں خواتین اپنے ذوق کے مطابق بناتی ہیں۔ کوئی ایک کلیہ مروج نہیں تاہم شوخ رنگوں کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔ واسکٹوں پر کڑھائی کے علاوہ سکے، ہار، موتی، بٹن، سیپیاں، لٹچ، زنجیریں وغیرہ بھی ٹانکی جاتی ہیں۔ بعض خواتین ہار کی جھالریں بنا کر واسکٹوں کے کناروں پر لگانے کو ترجیحی دیتی ہیں۔

بڑوں کی روایتی واسکٹ: پہلے بالغ مردوں کی واسکٹیں بنانے اور پہننے کا رواج تھا مگر آج کل اس قسم کی واسکٹیں بنانا اور پہننا ترک کر دیا گیا ہے۔ اس قسم کی واسکٹیں سیاہ کپڑا کی بنائی جاتی تھیں اور اس کے اوپر رنگ دار سوتی دھاگہ کی

کڑھائی کی جاتی تھی۔

شوکہ: یہ اونی پٹی کا چغہ نما کوٹ ہوتا ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں ایک اعلیٰ قسم جو کہ اعلیٰ پٹی اور کڑھائی کا ہوتا ہے اور جو ضلع دیامر، گلگت اور ہنزہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی سادہ قسم وہ ہے جو کہ کم معیاری اونی پٹی اور کم کڑھائی کے ہوتا ہے اور جسے چرواہے خصوصی طور پر اور عام لوگ سرما میں کبھی کبھار استعمال کرتے ہیں۔آج کل اس کا استعمال کم ہو رہا۔ یہ عام طور پر گھٹنوں سے ذرہ اوپر تک ہوتا ہے۔ بازو گول ہوتے ہیں جن کے کناروں پر اونی دھاگہ سے کڑھائی کی ہوئی ہوتی ہے۔اس کے دامن اور پیٹھ کے کناروں پر بھی کڑھائی کی پٹی بنائی جاتی ہیں۔ عام طور پر اس کے وسط میں ایک ہی بٹن ہوتا ہے تاہم اس کے اندر ایک اضافی پٹی لگی ہوتی ہے جسے سینہ کے اوپر پھیلا کر ایک بٹن کے ذریعے گردن کے پاس بند کر دیا جاتا ہے اس کے بعد اس کا جو ایک ہی وسطی بٹن ہوتا ہے بند کر دیا جاتا ہے۔ اندرونی پٹی ہوا سے بچاؤ فراہم کرتی اور کام کاج میں آسانی بھی رہتی ہے۔اس کی پیٹھ پر بعض خواتین پھول بھی کاڑھتی ہیں۔خصوصی قسم کا شوکہ صرف تہوار یا خاص خاص موقعوں پر پہنے جاتے ہیں جبکہ عام شوکہ سرمائی موسم میں کام کاج کے دوران سردی سے بچاؤ کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔

بندوق کا کور اور ارک: بندوق کا مکمل یا صرف کندے کا کور بنانے کا رواج پایا جاتا ہے۔اس پر ریشم کی کڑھائی کی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ سفید ہار بھی لگایا جاتا ہے۔اس کا زیادہ رواج وادی کوئی میں پایا جاتا ہے۔

جائے نماز: اس کے لیے عام طور پر کھاد کی خالی بوری استعمال کی جاتی ہے جو کہ پلاسٹک نما مواد سے بنی ہوتی ہے۔اس کے اوپر پاشمینہ کے دھاگہ سے کڑھائی کر کے جائے نماز تیار کیے جاتے ہیں۔ان کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

دستر خوان: بعض خواتین پشمینہ کی کڑھائی سے مختلف اقسام اور پھولوں کے دستر خوان تیار کرتی ہیں جو کہ بیٹھک یا حجرہ میں کھانے کے دوران بچھائے جاتے ہیں۔

کانس کی جھالریں: گھروں میں کانسیں اور ان کے لیے کپڑے کے پلے بنائے جاتے ہیں جن پر کھلی ڈھلی کڑھائی اور اس کی جھالریں لگائی جاتی ہیں۔ یہ قسم عام طور پر ان خواتین نے یہاں متعارف کی ہے جو کہ شہروں یا زیریں دیہات سے بیاہ کر لائی گئیں ہیں۔

کشیدہ کاری اور مینہ کاری میں رنگوں کا تناسب

ریشم میں رنگوں کا تناسب		مینہ کاری میں رنگوں کا تناسب	
سرخ ریشم	%۵۰	سفید موتی/ہار	%۴۰
سبز ریشم	%۱۵	سرخ موتی/ہار	% ۲۰
پیلا ریشم	%۱۵	پیلے موتی/ہار	% ۱۰
دیگر ریشم	%۲۰	سبز موتی/ہار	% ۱۰
		دیگ موتی/ہار	% ۲۰

ہار، مالائیں اور زیور

مٹھر: مٹھر سولہ لڑوں کی ایک مالا ہوتی ہے جو چھوٹے چھوٹے سفید موتیوں کو ایک ایک لڑ میں پرو کر تیار کی جاتی ہے۔ یہ قسم درمیانہ یا بڑی عمر کی خواتین پہنا کرتی ہیں۔اس کا رواج ختم ہو چکا ہے یا ہو رہا۔ جوان لڑکیاں نہیں پہنتیں۔

کنڈی: یہ مالا چھ سے آٹھ لڑوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اس کا پہلا لڑ چھوٹا اور باقی ایک دوسرے سے بڑے ہوتے ہیں آخری لڑ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ گلے میں پہننے کے دوران ہر لڑ الگ الگ نظر آتا ہے۔ یہ لڑ الگ الگ رنگوں کے موتیوں پر مشتمل ہوتے ہیں سرخ اور پیلے لڑوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے کچھ مکس رنگوں کے لڑ بھی ہوتے ہیں۔ ماضی میں اس کے لڑوں کی تعداد اس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ کالاش عورتوں کی مالاؤں سے ملتی جلتی ہیں۔

سُک پیوُں: یہ ایک ایسی مالا ہوتی ہے۔جس کے دانے چپٹے ہوتے ہیں اور جو گلے کے ساتھ جڑی یا چپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ سرخ یا پیلے دانوں کی ہوتی ہے۔جوان لڑکیوں میں اس کا استعمال عام پایا جاتا ہے۔

پیوُ (پرانده): پرانده عام طور پر سادہ یا پھر ہار کا پایا جاتا ہے۔ سادہ پرانده دھاگہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہار والے پرانده کے تین لڑ ہوتے ہیں۔لڑ کا ابتدائی حصہ موتیوں کی جھالروں میں بنایا جاتا ہے اس کے بعد تکون نما تعویز بنا کر اس کے زیریں حصہ کے ساتھ پانچ پانچ جھالریں بنا کر لٹکائی جاتی ہیں جھالروں میں گول یا چپٹی نما اشیاء بنا کر لٹکائی جاتی ہیں۔ پرانده چونکہ بھاری ہوتا ہے اور اسے سر کے بالوں کے وسط میں سہارا دیا جاتا ہے تاکہ بالوں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔اس قسم کے پرانده دلہنوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

کالے (زیور): زیور میں گلے کا ہمبیل، دولڑہ اور بندی مشہور ہے جو چاندی کے بنے ہوتے ہیں۔ کان کے زیور میں مُندری اور گُشموئے شامل ہیں جبکہ سر کے زیور میں سُرائے، جھمر اور مُندری شامل ہیں۔ کان اور سر کی مندری کا نام تو ایک ہے مگر اس کی شکل اور سائز میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہاتھ کے زیور میں کا (گگن) اور بھنگڑیے شامل ہیں۔ گگن دو قسم کے پائے جاتے ہیں ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ ایک اندازاً ڈیڑھ انچ چوڑا ہوتا ہے اور کلائیوں میں ایک ایک پہنا جاتا ہے جبکہ چھوٹے سائز کے گگن زائد پہننے کا رواج ہے۔ یہاں ناک کے کوکے یا ناک کا زیور دیکھنے میں نہیں آتا یہ الگ بات ہے کہ آج کل کوئی بازار سے لے کر استعمال شروع کر دے۔ چاندی کے زیور کا رواج زیادہ ہے۔ گگن چاندی اور پیتل دونوں کے بنائے جاتے ہیں۔

لُبی (اونی کمبل): اونی لباس میں جیسا کہ اوپر بتایا گیا شوکہ (چغہ) اور لھوئی کھوئی یعنی کانوں والی اونی ٹوپی شامل ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اونی پٹی سے سونے کے لیے لُبی نام کی ایک بہت بڑی شاڑھی نما کمبل تیار کیا جاتا ہے جو حجرہ کے ایک سرے سے دوسرے تک کھینچ کر بچھایا جا سکتا ہے۔ اس میں کافی مرد سو سکتے ہیں۔ جب یہ کمبل تیار ہوتا ہے تو پہلی دُھلائی تک اِسے سپونی کہا جاتا ہے جب پہلی بار دُھل جائے تو اسے لُبی کہتے ہیں۔ آج کل اس کے استعمال کا رواج کم ہو رہا ہے۔

تھوا تِغ: پاؤں پر باندھنے والے چمڑا کو تھوائی کہا جاتا ہے۔ اندرون وادی سفر کرنے والے، چرواہے، شکاری اور دشمنداراافراد اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے نیچے اونی پٹی پاؤں پر باندھی جاتی ہے۔ تھوائی کو چمڑا کے تسموں کے ذریعے باندھا جاتا ہے۔ 1996ء کے دوران دُم بیلہ کے مقام پر ایک لشکر میں بہت سے آدمیوں کو اس کا استعمال کرتے ہوئے مشاہدہ کیا گیا۔

پُشی: پُشی چمڑے سے بنائی جاتی تھی اور دلہنوں کو جہیز میں دی جاتی تھی۔ جب یہاں صندوق کا راج نہ تھا تو خواتین اپنی اشیاء اسی میں رکھا کرتی تھیں۔ یہ عموماً دو فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی ہوتی ہے۔ اس کے کناروں پر چمڑے کی جھالریں لگائی جاتی ہیں۔ منہ ازار بند کی طرح بنایا جاتا ہے۔ اب اکا دکا گھروں میں ہی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔

برون: بکری یا بکرے کی کھال کی بوری کو برون کہا جاتا ہے۔ اس میں عام طور پر دانے یا آٹا رکھا یا ڈھویا جاتا ہے۔ گھروں میں اس کا استعمال عام ہے۔

مدائی: یہ بکری کے چمڑا کی بوری کی ایک قسم ہے۔ پرانے وقتوں میں اس میں لسی رکھی جاتی اور دُودھ رڑکا جاتا تھا۔ آج کل اس میں دُودھ رڑکنے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔

ترک شدہ لباس اور اشیاء: زبان اور ثقافت جامد نہیں اس لیے اس میں ترک اور قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کوہستان میں بعض اقسام کے زنانہ لباس ترک ہو چکے ہیں۔ ان کے متعلق زیادہ معلومات تو دستیاب نہیں تاہم ان کے نام گھنڈی، چھلو، جَملو، جَملی شامل ہیں۔

آلاتِ موسیقی، اوزار

ڈھول: یہاں کے ڈھول کی ساخت ضلع دیامر اور گلگت کے ڈھولوں جیسی ہے۔ ڈھول کی تالیں بھی شمالی علاقہ جات جیسی ہیں۔ تالوں کی تفصیل حاصل نہیں ہو سکی۔ ڈھول کے سروں پر چمڑا تانا ہوتا ہے جسے تندوں کے ذریعے ضرورت کے مطابق کسا یا تنا جاتا ہے۔ ڈھول بجانے کے لیے دو لمبی لمبی خشک شاخیں استعمال کی جاتی ہیں تاہم بعض اوقات ہاتھوں سے بھی ڈھول بجایا جاتا ہے۔

ٹمی: یہ چھوٹے چھوٹے نقارہ نما قسم کے ہوتے ہیں۔ اسے ایک آدمی دو چھوٹی چھوٹی چھڑیوں سے بجاتا ہے۔ شمالی علاقہ جات اور کوہستان میں ٹمی کی ایک جیسی قسم پائی جاتی ہے۔

سُرنی (سرنا): مقامی سُرنی یا سُرنا کی ساخت بھی شمالی علاقہ جات کی سُرنا جیسی ہے۔ اسے سانس توڑے بغیر سانس بندی کے تحت بجایا جاتا ہے۔ سُرنا کے کئی سُر پائے جاتے ہیں۔ ان سُروں کو مقامی اصطلاح میں وزن کہا جاتا ہے جیسے بگائے وزن (جنگی دُھن) وغیرہ۔ مقامی دُھنوں کے متعلق کسی ماہر سے فنی معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

توتک اور باز (بانسری): یہاں بانسری کی دو قسمیں ہیں جسے توتک اور باز کہا جاتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق ساخت کا ہوتا ہے۔ ایک کا سرا جیب جیسا ہوتا ہے جسے ہونٹوں میں پکڑ کر پھونکا جاتا ہے اور دوسری قسم کے سرے پر اوپر کی طرف ایک سوراخ ہوتا ہے جسے پھونک کر بجایا جاتا ہے۔

چنگ: یہ لوہے کا ایک چھوٹا سا ساز ہوتا ہے جسے منہ میں پکڑ کر بجاتے ہیں۔ آج

کل زیادہ دیکھنے میں نہیں آتا۔

کوٹھائی (تھال): لوہے کا بڑا تھال یا شانک بھی بعض اوقات ناچ گانے کے دوران بجایا جاتا ہے اور اس سے ڈھول کا کام لیا جاتا ہے۔ عموماً خواتین اس سے استفادہ کرتی ہیں۔

مٹی کے برتن: مٹی کے برتنوں میں کلئی (دودھ کا ڈولا)، کاوری (گھڑا)، تھلوئی (ہانڈی)، طباخ، گڑوہ (گوزہ)، تبوئی (توی)، مانی (چھوٹا سا کوزہ نما برتن جس میں دیسی گھی رکھا جاتا ہے۔) سرفہرست ہیں۔ کمہاروں کی کمی ہے اس لیے مقامی خواتین خود ہی ضرورت کے برتن بناتی ہیں جن کی ساخت بہت سادہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ اناج ذخیرہ کرنے کے لیے بعض خواتین بڑے بڑے ڈولے اور کندیل بھی بناتی ہیں۔

چگول (چولہے): مٹی کی کچھ اشیاء چولہے سے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اگر چولہا یو شکل یا مکمل گولائی میں بنایا ہوا ہو تو اسے چگول کہا جاتا ہے (لوہے کے تکونی چولہے کو بھی چگول کہتے ہیں) اور اگر اس کے الگ الگ تین حصے بنا کر نصب کیے جائیں تو اسے گھتر کہا جاتا ہے۔

لمدرو: چولہے کے پاس مٹی کا بنا ہوا ایک لمدرو رکھا ہوتا ہے جس پر روشنی کے لئے جلتی ہوئی تیل دار لکڑی رکھی جاتی ہے۔ بعض خواتین اسے خوبصورتی کے ساتھ بناتی ہیں اور اس کے کناروں پر مٹی کے بھندے یا کانٹے قسم کی اشیاء بنا کر لٹکاتی ہیں۔ یہ شکل میں چوکور قسم کا ہوتا ہے تاہم اس کے درمیان میں جگہ خالی ہوتی ہے جس میں ماچس وغیرہ رکھی جاتی ہے۔

تانگ: لکڑی کے تختوں سے بنائے گئے اس چوکور نما بکس میں کافی اناج ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا بکس ہر گھر کے برآمدہ میں پایا جاتا ہے۔

ڈِڈیری: یہ بھی اناج ذخیرہ کرنے کے کام آتی ہے تاہم یہ مٹی اور گھاس پھونس سے بنائی جاتی ہے۔

کندیل: یہ بھی مٹی سے بنایا جاتا ہے لیکن سائز میں یہ ڈیری سے چھوٹا ہوتا ہے اس میں بھی اناج ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

چوبی برتن وغیرہ: چوبی برتنوں اور اشیاء میں جو جو چیزیں عام طور پر شامل ہیں ان میں مدھانی، چھوٹا اور بڑا چمچہ، طباخ، اوڈی، ارڑی (آدھی اوڈی)، لپکی وغیرہ شامل ہیں۔

بالن: بکریوں کی جٹ سے بنائی گئی رسی کو بالی کہتے ہیں یہ کافی لمبی اور مضبوط ہوتی ہے۔ لکڑی اور گھاس ڈھونے کے لئے زیادہ کام آتی ہے۔

بعض زرعی اوزار: پھل، بیل، یوں، لوٹ پھوٹو، شمگئی، یوڑو، کندہ، گوے، پھال، پاؤند، مشٹی، اسپرغے، اٹوئی، لیچی۔

ہتھیار: اس خطے کے قدیم ہتھیار جو پتھر اور چٹانی اشکال میں پائے گئے ہیں بقول پروفیسر دانی کے تین سے پانچ ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خطہ کے نزدیک تانبے اور کانسی کے کلہاڑے، چمچے، کانٹے اور چھنے جرمن محقق کارجٹمار نے دریافت کئے تھے۔ دو عدد مٹھ دار کلہاڑے اس قسم کے بھی دریافت ہوئے ہیں جو شکل میں اُس کلہاڑے سے مشابہت رکھتے ہیں جو دو ہزار قبل مسیح کے اختتام پر آریائی زبان بولنے والے لوگوں کی نقل وحمل کے سلسلوں میں اہل تحقیق کا موضوع بحث بنے ہوئے تھے (ڈاکٹر محمد رفیق مغل، 1985ء)۔

چٹانی اشکال میں جو دوسرے ہتھیار نظر آتے ہیں ان میں تیر کمان، کلہاڑی، خُھرا، نیزہ نما برچھی وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں اس علاقہ کے قدیم ہتھیار قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہپی گہ کون (تیر کمان): اس خطے میں تیر کمان کا دور بھی رہا ہے۔ لوک کہانیوں میں تیر کمانوں کا کافی ذکر پایا جاتا ہے۔ عام طور پر بھی لوگ تیر کمان استعمال کرتے رہے ہیں۔ بچے آج کل بھی چھوٹی قسم کے تیر کمان بنا کر کھیلتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

بندوقیں: بندوق کے زمرہ میں جو ہتھیار آتے ہیں ان میں پرانی قسم چقماق کی ہے۔ جو اکا دکا گھرانوں کے ہاں اب بھی محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد پلتیدار نام کی بندوق کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی نالی کی طرف سے بارود بھرا جاتا تھا اور پھر مخصوص طریقہ سے اس کا فائر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسی بندوقیں پائی جاتی ہیں جن میں گولی ڈال کر فائر کیا جاتا ہے۔ بعد کے دور کی بندوقوں میں پٹے، پوش ڈزی، گورا، چھریز نامی بندوقیں اور پستول آتے ہیں ان کے بعد یہاں کلاشنکوف متعارف ہوئی۔

کھگر (تلوار): کئی گھرانوں کے ہاں اب بھی پرانی تلواریں پائی جاتی

ہیں۔ پہلے پہل لڑائی اور جنگوں میں تلوار ہی سے دشمن کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔ تلوار گلے میں لٹکانے کا رواج دوسرے علاقوں سے ملتا جلتا ہے۔

کٹار (چُھرا): پرانے وقتوں میں چھرا رکھنے کا عام رواج تھا۔ اس کا سائز (دستہ سمیت) اندازاً پونے ہاتھ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اس کے لئے چمڑا کا ایک کور ہوتا ہے جسے تھیک کہا جاتا ہے۔ تھیک کے نچلے سرے پر چاندی کا پترا چھڑھایا جاتا ہے اور گلے میں ڈالنے کے لئے ایک پٹہ تھیک سے جوڑا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے بائیں طرف ڈالا کر چلتے ہیں۔ اس کا لوہا اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ ہمیشہ صاف اور تیز رکھنے کا رواج ہے۔

چٹھل (کلہاڑی): چرواہوں اور گجروں کے پاس اچھے قسم کی دستی کلہاڑی ہوتی ہے۔ دستہ عام طور پر کوُ کا ہوتا ہے۔ جس کلہاڑی سے سبز پتے کاٹے جاتے ہیں وہ عام سی ہوتی ہے لیکن جو سفر یا حفاظت کے لئے بنواتے ہیں وہ کافی خوبصورت، صاف، چمکدار ہوتی ہے۔ اس کا پھل ہمیشہ صاف اور تیز رکھا جاتا ہے۔

کوہستانی لوک ادب

داستانیں: کوہستان میں شنا، کوہستانی، بٹیڑی، چھلسیو اور گبارای زبانوں میں طویل داستانیں پائی جاتی ہیں ان داستانوں میں شاہ بہرام، ممتاز شہزادہ، شہزادہ سیف الملوک وغیرہ کے متعلق واقعات پائے جاتے ہیں۔ یہ داستانیں پنجابی اور پشتو داستانوں جیسے ماحول کی حامل نظر آتی ہیں۔ بعض داستانوں کے مخصوص حصوں کو نظم بھی کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت یوسفؑ اور بعض دوسرے پیغمبروں کے حالات کو بھی داستان کے ماحول میں سنانے کا رواج پایا جاتا ہے۔ پہلے پہل یہاں داستان گوئی کا فن عروج پر تھا اور حجرہ کے ماحول میں لوگ داستان سننے اور سنانے کو ترجیح دیتے تھے۔ آج کل یہ فن ختم ہو رہا ہے۔

لوک کہانیاں / شِلوئے: مقامی زبانوں میں کئی قسم کی لوک کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ایک تو مختصر قسم کی کہانی ہے اور دوسری قسم قدرے طویل کہانیوں کی ہے۔ کہانیوں میں سبق آموز پہلو، دانش مندی وغیرہ کے خاص پہلو نظر آتے ہیں۔ شلوئے کی قسم کی کہانی زیادہ تر بچوں کے لیے مخصوص ہے۔ لوک کہانیوں میں عام طور پر دیو، جن، پریاں، چڑیل، مویشی، پرندے یا جنگلی جانوروں کو موضوع بنا کر بچوں کو سبق آموز کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ بچے عام طور پر دادی، نانی، ماں یا بڑی بہنوں کے ذریعے کہانی سنتے ہیں۔ جن بچوں کو کہانی یاد ہوتی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں۔

چڑیا کی کہانی: کہتے ہیں کسی جنگل میں ایک چڑیا اور چڑے کا گھر (گھونسلا) تھا۔ وہ ہنسی خوشی رہتے تھے۔ ایک سال چڑیا نے چار انڈے دیے جس سے دونوں میاں بیوی انتہائی خوش تھے کہ اس سال ان کے چار بچے انڈوں سے نکلیں گے اور کھیلیں گے۔

کبھی کبھی چڑے کی بہن ان سے ملنے آتی۔ دن بھر ان کے ہاں ٹھہری رہتی اور ڈھیر ساری باتیں کرتی اور شام ہوتے ہی اپنے گھر چلی جاتی۔

چڑیا اپنے انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور بچے نکلنے میں ایک دن باقی تھا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ چڑا کہتا ہمارے بچے بڑے ہوں گے تو ہمارے ساتھ اڑیں گے، جگہ جگہ کی سیر کریں گے اور اگلے سال کسی خوبصورت جگہ دوسرا گھر بنائیں گے۔

ایک رات کو تیز آندھی چلی اور چڑیا کے تین انڈے گھونسلے سے گر کر ٹوٹ گئے۔ میاں بیوی بہت اداس تھے۔ چڑے نے چڑیا سے کہا کہ وہ اداس نہ ہو کم از کم ایک انڈا تو ہے جس سے ایک بچہ پیدا ہوگا۔ اگلے دن دیر تک دونوں نے کچھ بھی نہ کھایا۔ دوپہر کو ایک خوبصورت بچہ انڈے سے نکلا تو وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ چڑا خوشی سے اڑتا ہوا چوگ لانے کہیں چلا گیا۔ اس طرح وہ اپنی اپنی چونچ میں پانی لاتے اور بچہ کو پلاتے۔ جب بچہ کچھ بڑا ہوا تو اسے چوگ کھلانے لگ گئے۔ چڑا چڑیا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

ایک روز سخت بارش ہوئی اور ہوا چلنے لگی۔ اس سے چڑا اور بچہ دونوں بیمار ہو گئے۔ بارش کے اگلے دن سخت گرمی ہوئی اور آہستہ آہستہ قریب کا پانی خشک ہو گیا۔ دونوں سخت بیمار تھے اور پیاس کی شدت سے تڑپ رہے تھے۔ چڑیا دور دور تک پانی تلاش کرتی رہی۔ ایک جگہ اسے پانی کا چھوٹا سا چشمہ نظر آیا تو وہ تیزی سے اڑتی ہوئی وہاں پہنچی اور پانی لے کر اپنے گھر واپس پہنچی۔ چڑا اور بچہ دونوں پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ چڑیا پریشان تھی کہ پانی چڑا اور بچہ دونوں میں سے کس کو پلائے۔ دونوں اپنی اپنی پیاس کا رونا رو رہے تھے۔ بچہ کہتا کہ پہلے پانی اسے دیا جائے اور چڑا کہتا کہ پہلے اسے ورنہ وہ مر جائے گا۔ آخر کار چڑیا نے مجبور ہو کر پانی کا قطرہ بچہ کی چونچ میں ڈالا اور چڑا پیاس کی شدت سے مر گیا۔ چڑیا بہت روئی مگر مرنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ چڑے کی موت کی خبر اس کی بہن تک پہنچی تو وہ روتی ہوئی آ پہنچی۔ چڑیا نے چڑے کی بہن کو ساری کہانی سنائی مگر وہ راضی نہ ہوئی

اور چڑیا کو مارنے پیٹنے لگ گئی کہ اس نے بیٹے کو بچا کر اس کے بھائی کو مار دیا۔ تب سے اب تک وہ چڑیا جنگل میں ماری ماری پھرتی اور یہ گیت گاتی رہتی ہے:

سُوری مازیگرے وجودی چرٹیو آلین	شام کا سورج میرے وجود کو چیرتا ہوا غروب ہونے آیا
دوسیلے چیا	اے سیلانی چڑیا
زنگل دہ آوازی تھے لرمون دہیگی	تو نے جنگل میں درد بھرے گیت گا کر میرا کلیجہ جلا دیا
دوسیلے چیا	اے سیلانی چڑیا

ہرن، بچے اور شکاری: دور کسی گھنے جنگل میں ایک ہرن، ہرنی اور اس کے دو بچے رہتے تھے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ادھر ادھر چلتے، پھرتے، اچھلتے کودتے اور گھاس چرتے تھے۔ ان کا باپ دوسرے ہرنوں کے ساتھ بھوج پتر کے گھنے جنگل میں چرنے جایا کرتا تھا۔ شام کو جب وہ واپس آتا تو دونوں بچے دوڑے دوڑے اس کے پاس جاتے۔ باپ کہتا: ''جب تم ہماری طرح بڑے ہو جاؤ گے تو ہم تمہیں اپنے ساتھ گھنے جنگلوں میں چرنے لے جایا کریں گے۔'' ایک دن ہرنی کے بچے اپنی ماں کے ساتھ قریب کے جنگل میں چر رہے تھے کی کسی طرف سے ایک شکاری آیا اور اس نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ پتھروں کی اوٹ لیتا ہوا ان کے قریب آیا اور پھر نشانہ باندھ کر ہرنی پر فائر کر دیا۔ گولی ہرنی کے پیٹ میں لگی اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ اس کے بچے حیران ہو گئے کہ اُن کی ماں کو کیا ہو گیا ہے۔ ہرنی زمین پر پاؤں رگڑنے لگی تو اُس کے بچوں نے پوچھا:

اؤمی کلئی گہ اجی	او میری کلئی اور امڑی
تو کیہ بُلدن دیگیئی	تو زمین پر کیوں تڑپنے لگی، تجھے کیا ہوا

شکاری وہیں بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اسے بچوں پر ترس آیا اور بہت پریشان ہوا کہ اس نے ہرنی کو مار کر اس کے بچوں کو یتیم کر دیا۔ ہرن کے بچے روتے ہوئے اپنی ماں کے گرد چکر لگانے لگے اس پر ہرنی نے انہیں کہا:

وومی بھالہ	اے میرے بچو
موں بُلو ووئی پسن	میں نے گدلا پانی پی لیا ہے
می ڈیرے دڑ آلینئی	میرے پیٹ میں درد اٹھا ہے
بوجہ گیئے اجی سے اتی بیا، باؤ سے باؤ	جاؤ، جا کر ماں سے ماں بن جاؤ، باپ سے باپ
گیئے تو موسے ٹل بیا	جا کر اپنوں میں مل جاؤ

یہ کہہ کر ہرنی نے دم توڑ دیا۔ اس کے بچے جنگل کی طرف بھاگ گئے شکاری نے گھر آ کر بیوی کو تمام کہانی سنائی۔ اس کی بیوی نے کہا اب کے بعد کسی ایسے جانور کا شکار نہ کرنا جس کے بچے اس کے ساتھ ہوں۔ تب سے اس شکاری نے کسی دوسرے ہرن کا شکار نہیں کیا۔

مرغا، بیل اور گدھا: دور کسی بستی میں تین کسان رہا کرتے تھے۔ کسان کے پاس بوڑھا بیل تھا جو کھیتی باڑی کا کام کر سکتا تھا نہ ہی کوئی اسے خرید کر کسی غم یا خوشی کی خیرات کے لیے ذبح کرنے کے لئے تیار تھا۔

دوسرے کسان کے پاس ایک لاغر گدھا تھا جو لکڑیاں اٹھا سکتا تھا نہ دانے اٹھا کر جندر تک لے جا سکتا تھا جہاں کھڑا ہوتا وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتا۔ کوئے اس کی پیٹھ پر آ بیٹھتے، چونچیں مارتے مگر وہ ہلنے کا نام نہ لیتا اور سر جھکائے وہیں کا وہیں کھڑا رہتا۔ تیسرے کسان کے پاس ایک کمزور سا مرغا تھا جس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اذان دے کر گھر والوں کو بیدار کر سکتا۔ ایک روز تینوں کسانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیوں نہ ان تینوں کو گھر سے نکالا جائے۔ سو ایک دن تینوں کسانوں نے مرغا، بیل اور گدھا اپنے اپنے گھروں سے نکال دیئے۔ مرغا، گدھا اور بیل جنگل میں مارے مارے پھرتے ہوئے ایک روز آپس میں مل گئے اور ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنائی۔

بیل نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا: بھائیو جب میں بچھڑا تھا تو میرا مالک مجھے اچھا اچھا چارا ڈالتا اور میری جوانی کا انتظار کیا کرتا تا کہ میں بڑا ہو کر اس کے کھیت میں ہل چلانے کے قابل ہو جاؤں تا کہ اس کی زمین آباد ہو اور فصل دے۔ مگر بھائیو جوانی پر غرور نہ کرنا یہ ایک دن ڈھل جاتی ہے۔ جب میں جوانی سے گزر کر بوڑھا ہوا اور ہل چلانے کے قابل نہ رہا تو مجھے مجھے گھر سے نکال دیا گیا اب میں کہاں جا سکتا ہوں۔

مرغا بولا: بھائیو جب میں چوزہ تھا تو میرا مالک پیار کے ساتھ تی تی کرتا اور دانے ڈالا کرتا۔ جب وہ تی تی کرتا تو میں بھاگا بھاگا اس کی طرف دوڑا کرتا تھا۔ وہ دانے/ چوگ ڈالتا تو میں سر جھکائے چگتا رہتا۔ مگر جب میں بوڑھا ہوا اور بیمار رہنے لگا اور اذان دینے کے قابل نہ رہا تو انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا اور آج

آپ کے ساتھ اس بیاباں جنگل میں ہوں۔

گدھا بولا: بھائیو میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھ پر جتنا سامان لادتے میں خاموشی سے اٹھائے چل پڑتا۔ مگر اب میری پیٹھ اتنی کمزور اور زخمی ہوگئی ہے۔ میں تھڑے کا بوجھ بھی اٹھا نہیں سکتا اس لئے دھکا دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔

تب وہ تینوں آپس میں دوست بن گئے اور اسی جنگل میں رہنے لگے جہاں انہیں وافر خوراک دستیاب تھی۔ اسی جنگل میں ایک شیر بھی رہتا تھا جس کے خوف سے تینوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی اپنی بولی نہیں بولیں گے ورنہ شیر کو خبر ہو جائے گی اور وہ آ کر انہیں کھا جائے گا۔

ایک سال گزر گیا۔ وہ کھا پی کر پل گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کبھی بیمار ہوئے ہی نہیں۔ بہت موٹے تازہ ہو گئے تھے۔ وہ شیر کے خوف کے باوجود اب اپنی اپنی بولیاں بولنے کو بے قرار تھے۔ ایک روز گدھا بولا بھائیو میں اب مزید خاموش نہیں رہ سکتا اور ڈیچوں ڈیچوں کروں گا ورنہ میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔ بیل بولا گدھے بھائی میرا بھی یہی حال ہے میں بھی مر رہا ہوں اگر میں ڈراں ڈراں نہ کروں تو میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔ مرغا بولا بھائیو گلا تو میرا بھی پھٹ رہا ہے اگر میں بھی ککڑوں کوں نہ کروں تو مر جاؤں گا۔ مگر بھائیو ہم جونہی بولیں گے تو شیر ہم پر حملہ کرے گا اور ہمیں مار ڈالے گا۔

بیل بولا پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ گدھا بولا مجھے تو پتہ نہیں میں تو ڈیچوں ڈیچوں کروں گا۔ مرغا بولا ہم تینوں نے اپنی اپنی بولیاں بھی بولنی ہیں اور شیر سے بچنا بھی ہے۔ جب تک ہم مل کر کوئی کام نہ کریں شیر ہمیں چیر پھاڑ ڈالے گا۔ اس لیے اگر ہم پر کوئی حملہ کرے تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں تبھی ہم یہاں سلامت رہ سکتے ہیں۔ مرغا بولا میرے ذمہ یہ کام ہوگا کہ میں حملہ آور کی آنکھوں پر چونچ سے حملہ کروں گا۔ بیل بھائی تم نے حملہ آور کو سینگ مارنے ہیں اور گدھے بھائی تم نے زور کی دولتی مارنی ہوگی اور ضرورت پڑے تو چک بھی مارو گے۔ تینوں نے اس تجویز کو قبول کیا اور پھر جنگل میں زور زور کی آوازیں لگائیں:

ککڑوں کوں، ککڑوں کوں

ڈراں ڈراں

ڈیچوں ڈیچوں

ان کا بولنا تھا کہ قریب ہی چھپے شیر کو ان کی خبر ہوگئی اور وہ غراتا ہوا آن پہنچا۔ شیر ابھی گدھے پر جھپٹنے ہی والا تھا کہ مرغ نے اڑ کر اس کی آنکھوں پر وار کیا، بیل نے زور زور سے سینگ مارے اور گدھا نے دولتیاں مارنا شروع کیں۔ شیر ایک پر جھپٹتا تو اس پر دوسرا حملہ کرتا، دوسرے پر جھپٹتا تو تیسرا۔ اس طرح شیر کو انہوں نے حیران و پریشان کر دیا۔ اب اسے بھاگنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ گدھا پوری قوت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ شیر نے جب بیل پر حملہ کرنا چاہا تو گدھا شیر پر چڑھ گیا اور اس کی گردن میں دانت گاڑھ دیئے۔ اب صورت یہ تھی کہ نیچے شیر تھا اور اوپر گدھا۔ دائیں بائیں سے مرغا اور بیل حملے کر رہے تھے۔ اس طرح شیر نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ شیر بھاگنے لگا مگر گدھا جس نے دانت گاڑھے ہوئے تھے اب نیچے اتر نہیں سکتا تھا۔ یوں اوپر گدھا اور نیچے شیر۔ شیر بھاگتا ہوا جنگل کے کنارے پہنچا تو وہاں ایک کسان کا بیٹا پیشاب کر رہا تھا۔ اس نے جب گدھے کو شیر پر سوار دیکھا تو سمجھا کہ گدھا کسی گدھی پر سوار ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بڑا روڑا گدھے کو دے مارا اور گدھا نیچے اتر گیا۔ لڑکے نے جب غور سے دیکھا تو گدھی نہ تھی بلکہ شیر تھا جس پر گدھا سوار تھا۔ شیر نے آنکھیں نکالتے ہوئے لڑکے کو کہا: ''تم نے جو کچھ دیکھا ہے اگر کسی کو بتا دیا تو کل اسی وقت میں تمہیں چیر پھاڑ ڈالوں گا۔'' لڑکا گھبرا کر گھر کی طرف بھاگ گیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہا مگر پھر اپنے ماں باپ سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس نے دیکھا تھا۔ شیر دروازے پر کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا دوسری شام جب لڑکا باہر نکلا تو شیر اس کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا شیر نے جونہی حملہ کرنا چاہا لڑکا خوف سے چلایا ''بابا وہ کل والا گدھا پھر آ گیا ہے۔ مجھے بچا لو۔'' شیر نے جو گدھے کا نام سنا تو دم دبا کر بھاگ گیا اور پھر کبھی اس طرف نہیں آیا۔ تب سے اب تک مرغا، بیل اور گدھا اسی جنگل میں ہنسی خوشی رہ رہیں ہیں اور ان پر کوئی بھی دوبارہ حملہ آور نہیں ہوا۔

جوڑی بزونی: کسی بستی کے ایک کمہار نے ایک بکری پالی ہوئی تھی۔ اس کا نام جوڑی بزونی تھا۔ جوڑی بزونی بچے جنتی اور بہت سا دودھ دیتی۔ ایک بار یوں ہوا کہ جوڑی بزونی نے ایک سال بچہ نہ جنا اور لاغر ہوتی گئی یہاں تک کہ کمہار دودھ سے بھی محروم ہو گیا۔ ایک دن کمہار نے ارادہ کیا کہ وہ بکری کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھائے گا۔ مگر بکری نے نہایت عاجزی سے کمہار کو کہا اسے ایک سال کی مہلت دی جائے اور اسے اونچی مالیوں (چراگاہوں) پر چھوڑ آئے۔ اور ایک سال بعد وہ آئے گی تو موٹی تازہ ہوگی تب وہ اسے ذبح کر کے کھائے تاکہ کچھ مزہ بھی آئے۔ کمہار کو بکری کی تجویز پسند آئی اور وہ بکری کو بلند مالیوں میں چھوڑ آیا۔ جب لومڑی کو یہ خبر ہوئی کہ کمہار کی بکری مالیوں میں چر رہی ہے تو اس نے یہ خبر ریچھ کے کانوں تک پہنچائی۔ ریچھ جو شیر کا ہمسایہ تھا اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ شیر ماموں کو بھی اس خبر

سے آگاہ کر دیں ورنہ کل ہم سے خفا ہو جائے گا اور ہماری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ انہوں نے شیر کے پاس جا کر اسے تمام کہانی سنائی تو شیر نے انہیں ہدایت کی کہ وہ راستہ میں بیٹھ جائیں جب بھی کمہار کی بکری گزرے اسے پکڑ لینا اور ہم تینوں مل کر اسے کھائیں گے۔

ایک سال بعد کمہار کی بکری نے وہ جان بنائی، کہ جیسے ابھی ابھی جوان ہوئی ہو۔ اس نے سوچا کہ اب وہ کمہار کے کھانے کے قابل ہو گئی ہے اس لیے اسے بستی میں واپس جانا چاہئے۔ وہ جونہی ایک ٹیلے پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ راستہ میں شیر، ریچھ اور لومڑی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ڈر تو گئی مگر کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنے موٹے تازہ جسم پر بھوج پتر باندھ دیا تا کہ لومڑی، ریچھ اور شیر اسے پہچان نہ سکیں۔ جونہی بکری ان کے قریب پہنچی تو لومڑی کو اس پر شک ہو گیا کہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔ بکری جب لومڑی کے قریب سے گزرنے لگی تو لومڑی نے اس سے پوچھا:

دو جوڑی بروئی تھوکلاے ائی نہ چیگنیئی یا؟

(اے جوڑی بروئی تو نے کمہار کی بکری تو نہیں دیکھی)

بکری نے انکار کیا مگر لومڑی کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ وہ چالاک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی:

ایہ وٹو جوڑی بروئی	آؤ جوڑی بروئی
موں گی تو چھچی قُرلونوٹون	میں اور تو چھچی قرلو کا کھیل کھیلیں

بکری گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں بولی:

ئیں وٹو جھلی	نہیں اے پگلی
موں ملے جملو بونیسن	میں نے ماں کی جملو (قمیض) پہنی ہوئی ہے
می ملے جملو چھیجانی	میری ماں کی جملو پھٹ جائے گی

بکری نے لاکھ انکار کیا کہ وہ چھچی قرلو نہیں کھیلے گی مگر لومڑی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور زور زور سے چھچی قرلو کھیلتے ہوئے چکر لگانے لگی۔ اس طرح بکری کے جسم پر بندھے ہوئے بھوج پتر کی چھال اتر گئے اور لومڑی نے اسے دبوچ لیا۔ ریچھ نے آگے بڑھ کر بکری کو مار ڈالا۔ پھر اس کی آنتیں اور اوجڑی نکالی تو شیر بولا کہ وہ دونوں اسے دھو کر لائیں۔ ریچھ اور لومڑی نہر پر گئے۔ لومڑی نے ریچھ سے کہا کہ وہ جا کر پانی کا رخ موڑ دے تا کہ نہر میں زیادہ پانی آئے۔ ریچھ چلا گیا۔ ریچھ کے جانے کے بعد لومڑی نے سب کچھ کھا لیا۔ جب ریچھ پانی موڑ کر واپس آیا تو لومڑی بولی "تم نے پانی زیادہ موڑ دیا تھا اس لیے اوجڑی اور آنتیں اس میں بہہ گئی ہیں۔ جب وہ دونوں واپس آئے تو لومڑی نے شیر سے شکایت کی کہ سب کچھ ریچھ نے کھا لیا ہے۔ ریچھ نے لاکھ انکار کیا مگر شیر کو یقین نہ آیا اور بولا جنگل کا بادشاہ میں اور کھائے اکیلا ریچھ۔ شیر نے ایک ہی پنجہ مار کر ریچھ کو مار ڈالا۔ تب شیر اور لومڑی ریچھ کی آنتیں اور اوجڑی صاف کرنے نہر پر چلے گئے۔ لومڑی نے شیر سے کہا کہ وہ پانی موڑ دے۔ شیر پانی موڑنے چلا گیا۔ واپس آیا تو لومڑی بولی تم نے پانی زیادہ موڑ دیا تھا اس لیے آنتیں اور اوجڑی نیچے بہہ گئی ہیں۔ شیر نے چٹان سے نیچے کی طرف دیکھا تا کہ آنتیں اور اوجڑی کو دیکھ سکے۔ جب شیر جھانک رہا تھا تو لومڑی نے پیچھے سے شیر کو دھکا دیا اور شیر نیچے جا گرا اور مر گیا۔

تب لومڑی نے کمہار کی بکری کی کھال پہنی اور کمہار کے گھر آ گئی۔ اس روز کمہار بہت خوش تھا کہ اس کی بکری مالیوں پر چر چر کے اچھی خاصی موٹی تازہ ہو گئی ہے۔ تب اس نے بکری کو ذبح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور لومڑی کو بکری سمجھ کر پالنے لگا۔

شکاری، چڑیل اور گائے: کسی بستی میں ایک شکاری رہتا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ شکار پر چلا جاتا۔ شام کو واپس آتا تو اسے سخت بھوک لگی ہوتی مگر اس کی بیوی روز طعنے دیتی کہ وہ جنگل میں کچھ نہ کچھ بھن کر کھا لیتا ہے اور گھر آ کر کہتا ہے کہ سخت بھوک لگی ہے۔ بیوی کے روز روز کے طعنوں سے تنگ آ کر ایک روز شکاری نے اسے کہا: "تو روز یہی کہتی ہے کہ میں جنگل میں کچھ نہ کچھ کھا پی جاتا ہوں حالانکہ یہ درست نہیں بلکہ تو خود مزے سے پکا کر کھا لیتی ہے اور میرا تجھے احساس ہی نہیں ہوتا۔ اب کے بعد اگر ہم ایک دوسرے کے سوا یعنی غیر موجودگی میں کچھ کھا پی جائیں تو تُو گائے بن جائے اور میں بیل ویسے تو تجھے یقین نہیں آتا"۔

شکاری کی بیوی نے کہا منظور ہے۔ اگلے روز شکاری شکار پر چلا گیا۔ اس کی بیوی نے گھر میں جھاڑو دی۔ اور پھر بیٹی اور بیٹے کو دانے بھن کر دیئے اور خود بھی بھولے سے کھا گئی۔ بھنے ہوئے دانے کھاتے ہی شکاری کی بیوی گائے بن گئی۔ اس کا بیٹا اور بیٹی بہت روئے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ شام کو شکاری گھر آیا تو بیوی گھر میں نہ تھی اس نے بچوں سے پوچھا تو انہوں نے باپ کو بتایا کہ ماں نے بھنے ہوئے دانے کھا لیے تھے جس سے وہ گائے بن گئی ہے اور اسے اندر مویشیوں کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

شکاری کو اب افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا

عہد کیوں کیا تھا۔ اس نے جیسے تیسے بچوں کو بہلایا اور تسلی دی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوسرا بیاہ کرے گا تا کہ اس کے گھر اور بچوں کی پرورش ہو سکے۔ ایک روز وہ شکار کو جا رہا تھا تو ایک ندی کے دوسرے کنارے پر کھڑی ایک عورت نے اس پوچھا: "اے شکاری تو کہاں جا رہا ہے"۔

شکاری نے اسے کہا وہ اپنے لیے ایک اچھی سی بیوی ڈھونڈنے جا رہا ہے۔ وہ بولی: "مجھ سے بھی اچھی"۔

شکاری بولا تو ندی کے پار ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "تو آنکھیں بند کر لے میں تیرے پاس آجاؤں گی"۔

شکاری بولا "میرے دو بچے بھی ہیں انہیں سنبھال لوگی"

وہ بولی "ہاں تمہارے بچوں کو سنبھال لوں گی، ایک بچی میری بھی ہے"

شکاری خوش ہو گیا کہ چلو اسے بیوی مل گئی ہے۔ وہ خوشی سے بولا "آجاؤ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں"۔

وہ عورت ایک چڑیل تھی جس نے عورت کا روپ دھارا ہوا تھا۔ شکاری اسے بیوی بنا کر گھر لے آیا۔ اس چڑیل کی ایک بیٹی تھی جو بہت زیادہ گنجی تھی۔ چڑیل اپنی گنجی بیٹی کو اچھے اچھے کھانے کھلاتی اور شکاری کے بیٹے اور بیٹی کو صبح ہوتے ہی ڈنگروں کے ساتھ جنگل کی طرف روانہ کر دیتی جہاں وہ بھوکے پیاسے دن گزارتے۔ جنگل میں جب بہن بھائی کو بھوک لگتی تو ان کی ماں (جو گائے بن گئی تھی) انہیں دودھ پلاتی۔ دونوں کو معلوم تھا کہ وہ گائے اصل میں ان کی ماں ہے مگر ان کے باپ نے انہیں منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنی سوتیلی ماں کو نہ بتائیں کہ ان کی ماں گائے بن گئی ہے۔

ان کی سوتیلی ماں حیران تھی کہ وہ دونوں بہن بھائی اتنے صحت مند کیوں ہیں جبکہ وہ انہیں پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں دیتی بلکہ اچھے اچھے کھانے اپنی گنجی بیٹی کو دیتی ہے۔ ایک دن اس نے اپنی گنجی بیٹی کو کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ڈنگر چرانے جنگل جائے اور یہ معلوم کرے کہ وہ بہن بھائی جنگل میں کیا کھاتے ہیں جس سے موٹے تازہ ہو رہے ہیں۔ جب وہ ان کے ساتھ جنگل کی طرف گئی تو راستے میں بہن بھائی نے مل کر اسے خوب مارا پیٹا وہ روتی ہوئی ان سے بھاگ کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر انہیں دیکھتی رہی اور پھر جو کچھ دیکھا شام کو آ کر اپنی ماں سے کہہ دیا۔

چڑیل اب موقع کی تلاش میں تھی کہ وہ کس طرح اس گائے کو ذبح کروائے جو بچوں کو جنگل میں دودھ پلاتی رہتی ہے۔ چڑیل جب بھی گائے کا دودھ دھونے بیٹھتی گائے ایک تھن کا دودھ بچا کر رکھتی جو اپنے بیٹے اور بیٹی کو پلایا کرتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز چڑیل نے خود کو سخت بیمار ظاہر کیا اور اپنی پسلیوں پر سوکھی روٹیاں باندھ کر کروٹیں بدلتی تو سوکھی روٹیوں کے ٹوٹنے کی آواز آتی تو وہ کہتی ہائے میری پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

بے چارہ شکاری بڑا پریشان تھا۔ اس نے جڑی بوٹیوں کی دوا لا کر اسے دی مگر کچھ افاقہ نظر نہ آیا۔ چڑیل نے شکاری سے کہا: "تمہاری بستی میں دو حکیم تجویز کرتے ہیں مگر ہماری بستی میں دو پہاڑ تجویز کرتے ہیں تو جا اور سامنے والے پہاڑ سے پوچھ کہ میری بیماری کی دوا کیا ہے۔"

شکاری سادہ سا آدمی تھا اسے چڑیل کے چکروں کا علم نہ تھا۔ سیدھا پہاڑ کی طرف روانہ ہوا اور پوچھا: "اے پہاڑ میری بیوی بیمار ہے مجھے اس کی دوا بتائی جائے کہ کس چیز سے وہ صحت یاب ہوگی۔"

پہاڑ میں چڑیل کی گنجی بیٹی چھپی بیٹھی تھی اس نے جواب دیا: "تمہاری بیوی کی دوا مُٹھوری (نام) گائے کا گوشت ہے۔"

مگر شکاری نے گھر آ کر کچھ نہ بتایا اور بولا پہاڑ نے کچھ نہیں بتایا۔ اگلے روز اس نے شکاری کو پھر بھیجا اور پیچھے پیچھے خود بھی گئی۔ پہاڑ نے پھر جواب دیا "مُٹھوری گائے کا گوشت" چڑیل اس فقرہ کو دہراتی ہوئی گھر آئی اور مجبوراً شکاری کو گائے ذبح کرنا پڑی۔ شکاری کی بیٹی جوان ہو گئی تھی اسے بیاہ دیا گیا تھا۔ اور وہ ساتویں پر آئی ہوئی تھی۔ شکاری گھر سے باہر تھا۔ چڑیل نے شکاری کی بیٹی کا گلہ گھونٹ دیا اور اس کے کپڑے اپنی گنجی بیٹی کو پہنا کر سسرال کے گھر بھیج دیا۔ جس جگہ شکاری کی بیٹی ماری گئی وہاں سے ایک چڑیا اڑی اور پھر اس شخص کے ہاتھ لگ گئی جس کے گھر بیوی کا روپ دھار کر گنجی گئی ہوئی تھی۔ گنجی نے اس چڑیا کو مار دیا اور اس کا سالن پکا کر اس شخص کے بیٹے کو کھلانا چاہتی تھی کہ اوپر سے وہ شخص آ گیا۔ اس شخص نے ہانڈی اٹھائی اور باہر پھینک دی۔ جہاں ہانڈی گری وہاں سیب کا ایک درخت اگ آیا۔ بستی کے لوگ سیب کھاتے مگر اس درخت سے سیب ختم ہی نہ ہوتے۔ اس شخص نے اپنی چڑیل ساس کو گھر بلایا اور پھر ماں بیٹی دونوں کو ایک کمرے میں بند کر کے آگ لگا دی۔ اس بستی میں ایک بوڑھی عورت اور اس کا بیٹا بھی رہتے تھے۔ ایک روز وہ بوڑھی عورت وہاں گئی اور سیب کا ایک دانہ لا کر چنگیر میں اپنے بیٹے کے لئے رکھ چھوڑا۔ مگر جب اس کا بیٹا آیا اور چنگیر کا ڈھکنا اٹھایا تو اس میں ایک پری بیٹھی تھی۔ جس نے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ اتنے میں بوڑھی عورت بھی آ گئی اور پھر پری بولی: "میرا کسی کو نہ بتانا ورنہ مجھے لوگ لے جائیں گے۔ میں تمہارے بیٹے سے شادی کروں گی اور تمہارے لیے ہر چیز لاؤں گی۔"

لالالری لاوولالری لاوولالے۔۔۔

لا	لا	ل	یل	او	دل	ال	ری	لا	وو	لا	لا	لے
۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲

یہ ۲۴ رکنی یک مصرعے کا گیت ہے۔ تاہم شنا لوک شاعری ان قواعد کی پابند نہیں اور اس کا اپنا آہنگ اور سُر پائے جاتے ہیں۔

اس گیت کو گانے کے دوران جب کوئی خاتون ناچ رہی ہوتی ہے تو مجمہ میں سے کوئی خاتون زور زور سے سیٹی (منہ سے) بجاتی ہے جس سے خواتین میں بوریت کا خاتمہ اور چستی پیدا ہوتی ہے۔ آج کل کچھ لوک شاعر بھی اپنے گیتوں میں اس قسم کے مصرعہ کو جوڑتے اور دھراتے نظر آتے ہیں جیسے چھلاس کے عبدالغفور صاحب۔ حقیقی معنوں میں اس مصرعہ کی دھن، تال اور ناچ صرف خواتین ہی نبھا سکتی ہیں۔

معدوم ہونے والے گیت کی ایک قسم: بعض قسم کے گیت معدوم ہو چکے ہیں۔ اس قسم کا ایک گیت کوئی بیس سال پہلے راقم نے ریکارڈ کیا تھا۔ یہ گیت ایک معمر خاتون سے سنا گیا تھا ان کا کہنا تھا کہ یہ پرانے گیت کی ایک قسم ہے جو اب ناپید ہو چکے ہیں۔ بہت پرانے وقتوں میں شادی بیاہ کے دوران خواتین اس قسم کے گیت گایا کرتی تھیں۔

وورا روان بیلے

دِلبارے رارو ان بیلے

گئی/گائی (گیت): گئی یا گائی کی یہ صنف خالصتاً خواتین کی ہے اور یہ دو مصرعہ گیت ہوتا ہے۔ اس گیت کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک غم اور دوسرے خوشی کے گیت۔ خوشی کے گیت شادی، بیاہ، منگنی، بچہ کی پیدائش اور ختنہ کے دوران گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں ساخت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

گئی کے ایسے گیت جو دو مصرعہ کے ہوتے ہیں اور گانے یا ناچ کے دوران انہی دو مصرعوں کو بغیر کسی اضافہ یا کمی کے گائے جائیں۔

نمونہ: اَکے بلیجی وَژوس

تو مہ لالے بالڑموں اکے بلیجی وَژوس

ندریاوومی سترونی جازہ

ہُون تھے ولیاودبابوسرے کُووولی

گئی کے ایسے گیت جو دو مصرعوں کے ہوں مگر پہلا مصرعہ کو ٹیپ کے مصرعہ کا درجہ حاصل ہو اور درمیان میں ہر بار گیت کا نیا مصرعہ لایا جائے اور دوسرے مصرعہ کی جگہ پہلے والے گیت کا پہلا مصرعہ دہرایا جائے۔ اس میں دولہا کے قریبی مردوں اور بھائیوں کی بہادری، شجاعت، خوبصورتی یا کسی دوسری عادت کا ذکر کیا جائے۔

ڈیڑھ مصرعہ گیت کی یہ ایک سادہ قسم بھی ہے:

نمونہ: بخشو رو لھاری

چھلاجی گیے مرک بلیئے

بخشو وولھاری

می زا گیا وَپودجی آلیئے

اس قسم کے گیت میں دونوں مصرعے ایک ہی رہتے ہیں صرف دوسرے مصرعے کے اختتام یا ابتدا میں کسی قریبی عزیز کا نام ملایا یا جوڑا جاتا ہے اور یہ گیت خواتین کے ناچ گانے کے دوران گایا جاتا ہے۔

۳۔ ایسے دو مصرعے گیت جو طوالت، اپنے مفہوم، اظہار اور بیان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مربوط ہوں اور ان کے ساتھ کوئی بھی ٹیپ کا مصرعہ دہرایا نہ جائے۔

۴۔ غم کے ایسے گیت جو صرف تنہائی یا جدائی کے دوران بے ساختہ گائے جائیں۔ اس قسم کے گیت میں نے 1975ء میں وادی پالس کے گرمائی مقام مُرُو سے واپسی کے دوران سنے تھے (جن کے بول اب مجھے یاد نہیں)۔ ان گیتوں کو غمے گیئے کہا جاتا ہے۔

رَگن: یہ دو مصرعہ گیت کی ایک اہم قسم ہے جو مردوں اور عورتوں میں یکساں مقبول ہے۔ اس میں لوک شاعری کا سب سے زیادہ عوامی سرمایہ پایا جاتا ہے۔ ان گیتوں میں خوشی اور غمی، عشق و محبت، ہجر و فراق، مناظرِ فطرت وغیرہ ہر قسم کے جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ یہ خوشی اور دکھ کے جذبوں کے اظہار کی اہم صنف ہے۔

اس صنف کے دونوں مصرعے عام طور پر ایک جیسی طوالت کے حامل ہوتے ہیں۔ دونوں مصرعے اظہار، مفہوم اور مقصد میں ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ بعض گیت کچھ لوک شاعروں کے تخلیق کردہ ہیں جیسے جلکوٹ کے نصیر اور پالس کے نواب خان، کولئی کے سنگین اور امیر دار (مقتول) وغیرہ لیکن زیادہ تر عوامی سرمایہ پایا جاتا ہے جس میں مرد اور عورتیں سبھی شامل ہیں اور زیادہ تر گیتوں کے اصل تخلیق کاروں کے متعلق کم ہی معلومات سامنے آتی ہیں۔

رَگن کی گائیگی کے دوران اس کا آغاز دوسرے مصرعے کے وسط سے شروع کرنے کا رواج پایا جاتا ہے جس کے بعد پہلا مصرعہ اور بعد میں مکمل طور پر

دونوں مصرعے گائے جاتے ہیں لیکن سادہ طور پر یا عام سنانے کے لئے پہلا اور پھر دوسرا مصرعہ سنایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گائیگی کے اس انداز سے زگی کے اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زگی کی گائیگی کا مخصوص اور دوسروں کے ہاں ناپید ایک نیا انداز کولئی کے سنگین نامی لوک شاعر کے چند گیتوں میں پایا گیا ہے۔ ان گیتوں میں جو نئی بات پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک زگی کی مکمل گائیگی کے اختتام پر آواز توڑے بغیر اسی وزن کے نئے گیت کا آدھا مصرعہ جوڑا یا گایا جاتا ہے۔ اور پھر سانس توڑ کر بقیہ گیت دوبارہ گایا جاتا ہے۔ اس قسم کے گیتوں کی تان یا سُر بہت دھیمی اور دکھی پائی جاتی ہے۔

زگی کی گائیگی کے دوران ایک ہی وزن یا سُر کے چھ سے دس تک گیت اکٹھے گائے جاتے ہیں اس کے بعد اگر اسی سُر اور تان کا گیت نہ ہو تو نئے سُر کا گیت شروع کیا جاتا ہے۔

یہ گیت عام طور پر تنہائی، جنگل، پہاڑ کی چوٹیوں، پانی کے چشموں، کشیدہ کاری کے دوران، شادی بیاہ، حجرہ وغیرہ میں گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں عام موضوعات کے علاوہ تین کرداروں کا عام طور پر ذکر ملتا ہے یعنی مَیں (گانے والی یا والا)، محبوب اور پیغام رساں۔ محبوب کے لئے جیل اور جیلو کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور یہ ہمیشہ مذکر ہی کے صیغہ میں استعمال ہوتے ہیں مخاطب خواہ مرد ہو یا عورت۔ گیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ بولنے والا کون ہے یعنی مرد ہے تو جیل یا جیلو سے مراد لڑکی یا خاتون ہوگی اور اگر بولنے والی خاتون ہے تو پھر جیل یا جیلو نوجوان ہوگا۔

نمونے:

وخ مازیگر ژ دوئی پوری دہ چوکی بولاس تو
برساتے چھاٹ آلی لیئے سد جھہ لگہ بلا دہ۔
چھلا سے قید یا ن ا پہ کا لو جی گہ مُچی
می نصیبڑ عمر ے شگا لی و یا و و بُبا
ا نو کو کا ل سنگو ی کے سن
برساتے چھاٹ اندوز باد یقانی گدو جی مُچن

مجلُس: کوہستانی ثنا کی لوک شاعری میں مجلُس ایک بڑی اور مشکل صنف ہے اور اسے ایک مکمل لوک شاعر ہی تخلیق کر سکتا ہے۔ مجلُس میں تین اقسام کی ذیلی صنفیں پائی جاتی ہیں جو ترتیب، روانی اور طوالت کے اعتبار مختلف ہیں۔ یہ اصناف چار بیت، صود اور صوت رونگو کہلاتی ہیں۔

مجلُس کا روایتی ماحول: کوہستانی مجلُس صرف رات کو حجرہ کے ماحول میں گانے والی صنف ہے۔ مجلُس کا آغاز رات دس بجے کے قریب ہوتا ہے۔ اس کے گانے والوں میں ایک لوک شاعر (جو اس محفل کا ہیرو ہوتا ہے) اور اس کے پانچ سے دس تک لاجگر (سنگت میں گانے والے) ہوتے ہیں۔ جس شاعر کے جتنے اچھے لاجگر ہوتے ہیں وہ اتنا ہی مشہور ہوتا ہے۔ لاجگروں کو اپنے اپنے دوست شاعر کا تمام کا تمام کلام یاد ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اصل شاعر کی وفات کے بعد بھی اس کے لاجگر اس کے کلام کو شادی بیاہ کے موقعوں پر سناتے رہتے ہیں۔

مجلُس میں گانے کی ترتیب اس طرح ہے کہ شاعر اور اس کے لاجگر حجرہ کے کسی کونے میں دائرہ کی شکل میں بیٹھتے ہیں اور مجلس کے دوران چراغ گل کیا جاتا ہے۔ بیٹھنے کے لئے شاڑی یا کمبل اس طرح نیچے رکھے جاتے ہیں تا کہ گانے والے آسانی سے بیٹھ سکیں۔ گانے کے دوران شاعر اور اس کے لاجگر اپنے ہاتھوں کو کانوں پر رکھ کر گاتے ہیں۔ تاہم صود گانے کا وقت آئے تو لاجگر کان چھوڑ کر زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں ان میں سے ایک ساتھی زور زور سے سیٹی بجاتا ہے اور ایک شت شت کے الفاظ بولتا ہے جس سے محفل میں چستی پیدا ہوتی ہے۔ جب مجلس کا ایک مرحلہ مکمل ہوتا ہے تو شاعر اور اس کے لاجگر خاموش ہو جاتے ہیں اور چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ وقفہ کے دوران ایک نوجوان لڑکا چلم میں تازہ تمباکو بھر کر باری باری شاعر اور لاجگروں کو پیش کرتا ہے۔ ان کے قریب ہی ایک تھالی میں نمک بھی رکھا ہوتا ہے جسے ضرورت کے دوران مجلس والے گلہ تازہ رکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

شادی بیاہ کا سلسلہ جتنے دن چلتا ہے مجلس بھی اتنے دنوں تک جاری رہتی ہے۔ اگر شاعر نہ ہو تو پھر تھوڑی بہت مجلس ہوتی ہے یا پھر کسی سے زگی کے گیت سنے جاتے ہیں۔ پالس میں ایک شادی کے دوران دو لوک شاعروں نے مسلسل انیس راتوں تک مجلس کی نشست چلائی تھی۔

ثنا مجلُس کی شعری ترتیب: مجلُس کے ایک وقفہ میں چار بیت، صود اور صوت رونگو کے جتنے بھی بند گائے جاتے ہیں اسے ٹھاپہ کہا جاتا ہے۔ مجلُس کا آغاز چار بیت کے بندوں سے کیا جاتا ہے اور کم از کم چار بیتوں کے چھ بند گائے جاتے ہیں۔ اس کے فوری بعد بغیر وقفہ کے صود کے چار سے چھ بند گائے جاتے ہیں۔ صود کے اختتام کے ساتھ ہی صوت رونگو کے بند گائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی چار سے چھ تک ہوتی ہے۔ چار بیت، صود اور صوت رونگو گانے کے دوران ٹیپ یا سرنامہ کا شعر بدلا جاتا ہے۔

شنا چار بیت کا شعری ڈھانچہ: چار بیت، صود اور صوت رونگو کے ابتدائی بند میں آٹھ مصرے ہوتے ہیں۔ پہلا شعر سرُ نامہ، درمیان کے دو شعر وئیل اور آخری شعر کھڑہ کہلاتا ہے۔ سرُ نامہ کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ وئیل کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ کھڑہ کا پہلا مصرعہ وئیل کا ہم قافیہ اور دوسرا مصرعہ سرنامہ کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔

چار بیتوں کے مصرعے ایک جیسے کم ہی پائے جاتے ہیں۔ الفاظ یا ارکان کے اعتبار سے کم یا زیادہ پائے جاتے ہیں تاہم چونکہ شنا زبان صوتیاتی اعتبار سے تانی زبان ہے اس لئے یہ دیکھا اور سنا گیا ہے کہ شاعر چھوٹے مصرعوں کو آواز کی تان سے پورا کرتے ہیں۔ یہی صورت صود اور صوت رونگو میں بھی پائی جاتی ہے۔

طویل چار بیتوں میں شعری ترتیب عموماً بدلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ اسی میں سرنامہ کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ جب کہ وئیل کے پہلے تین مصرعے ہم قافیہ اور چوتھا مصرہ سرُ نامہ کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں عام چار بیتوں میں یہ پایا گیا ہے کہ کھڑہ کے مصرعہ کی جگہ جب وئیل کے آخری مصرعہ کے ساتھ سرُ نامہ کا مصرعہ جوڑا جاتا ہے تو ایک بار اسے دھرایا جاتا ہے اور بعد میں سرنامہ کے دونوں مصرعوں کو۔ اس طرح کھڑہ کے مصرعہ کی جگہ عموماً وئیل اور سرُ نامہ کے ایک ایک مصرعہ سے پوری کرنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہلی مثال:

سرنامہ　نش میں وجود درودم نا
　　وو گیئی جُدا مہین صنم نا

وئیل　نش می وجود درودم وو
　　گیئی جُدا سو مہین یارو وو
　　الگلہ جو بل ہللی وو
　　شرُ پھوٹ تھے تھوئی دلبارو وو

کھڑہ　موں روم ہاجی تھین عالم وو
　　تو گہ بوئی تھے بئس تھمہ نا

دوسری مثال:

سرنامہ　وو موں یا زم رنگ دہی
　　چے مُدا بزدیالے زانی گہوڑ بوجی

وئیل　وو میں یارُن لئے مار
　　بلو ہنولڑ مونڑ چا پیر ہگار
　　کا تھہ رَوس رَس وو یار
　　گیئی مجال دیس گیا وُسمار بندَ وجی چھجی

کھڑہ　وو موں یا زم رنگ دہی
　　گیئی مجال دیس گیا وُسمار بندَ وجی چھجی
　　وو موں یا زم رنگ دہی
　　چے مُدا بزدیالے زانی گہوڑ بوجی

گانے کی ترتیب: لوک شاعر پہلے سرنامہ کے دو شعر گاتا ہے اس کے بعد لاجگر کم از کم چار بار سرُ نامہ کے مصرعہ کو دھراتے ہیں۔ اس طرح سرُ نامہ کا شعر لوگوں کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ جب لاجگر خاموش ہوتے ہیں تو شاعر وئیل کے مصرعے گانا شروع کرتا ہے۔ وئیل کے پہلے تین مصرعے صرف ایک بار گائے جاتے ہیں اس کے بعد وئیل کا چوتھا مصرعہ گانے کے دوران لاجگر سنگت میں گانا شروع کرتے ہیں۔ اس مصرعہ کے ساتھ ایک بار سرُ نامہ کا پہلا مصرعہ ملایا جاتا ہے اور پھر ایک بار سرُ نامہ کے مصرعہ کے ساتھ وئیل کا اختتامی مصرعہ دہرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد تین سے چار بار سرُ نامہ کے دونوں مصرعے دہرائے جاتے ہیں۔ گانے اور دہرانے کی یہ ترتیب چار بیت، صوت رونگو اور صود تینوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔

چار بیت، صوت رونگو اور صود کا آہنگ: چار بیت کے مصرعے دھیمے اور طویل ہوتے ہیں اور تیزی کی بجائے آہستگی سے گایا جاتا ہے۔ صوت رونگو کے مصرعے قدرے چھوٹے ہوتے ہیں اور انہیں ذرا تیزی سے گایا جاتا ہے۔ صود کے مصرعے ان دونوں سے چھوٹے ہوتے ہیں اور انہیں تیزی اور تالیوں کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ تالیوں کا آغاز صود کے سرُ نامہ کا مصرعہ دہرانے پر ہوتا ہے۔ مقامی موسیقی میں اس کے بے شمار دھنیں پائی جاتے ہیں۔

مجلس کے موضوعات: مجلس کے چار بیتوں، صود اور صوت رونگو میں ہر قسم کے موضوعات پائے جاتے ہیں اور اس پر کوئی قید نہیں۔ اس میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کا اظہار پایا جاتا ہے۔ لوک داستانوں کو بھی اس صنف میں نظم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عشق، ہجر و فراق، سوز و گداز، نازنخرے، فطری مناظر، موسم، گلے شکوے، مقامی لڑائیاں، مزاح سبھی اقسام کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔

چار بیت: شنا چار بیت کے پہلے دو شعر یا مصرعے سرُ نامہ کہلاتے ہیں درمیان کے دو شعر وئیل اور آخری شعر کھڑہ کہلاتا ہے۔ ترتیب کے حوالہ سے جہاں کھڑہ کا شعر ختم ہوتا ہے وہاں سے سرُ نامہ کا شعر دہرایا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق کسی چار بیت کے ایک ہی وزن کے بندوں پر ہوتا ہے۔ جب چار سے چھے تک چار بیت کے بند دہرائے جائیں تو اس صورت میں چار بیت کے اشعار تین مصرعوں پر مشتمل پائے جاتے ہیں اس صورت میں کھڑہ کا شعر حزف ہو جاتا ہے سرُ نامہ کا ایک شعر اور وئیل کے دو شعر باقی رہتے ہیں سرُ نامہ کے شعر کے بعد جہاں وئیل کا شعر ختم ہوتا ہے وہاں سے سرُ نامہ کا شعر دہرایا جاتا ہے۔ کسی چار بیت کے وئیل کے چار مصرعوں میں پہلے تین مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ چوتھا مصرہ سرُ نامہ کے مصرعہ کا ہم قافیہ ہوتا ہے بعض اوقات لوک شعراء ایک ہی وزن کے طویل چار بیتوں کے درمیان سرُ نامہ کا شعر بدل دیتے ہیں۔ وئیل کے لفظی معنی اظہار یا اپنی صفائی بیان کرنے کے ہیں چنانچہ وئیل کے چار مصرعوں میں اسی قسم کا مکمل اظہار پایا جاتا ہے۔ وئیل کے مصرعوں یا دونوں شعروں میں اظہار کا مکمل بیان یا اختتام ہوتا ہے۔ چار بیت کے مصرعے عموماً ایک جیسے ہوتے ہیں تاہم قدیم چار بیتوں میں یہ پابندی قائم نہیں ملتی اور کسی چار بیت میں ایک آدھ مصرعہ چھوٹا بھی مل جاتا ہے۔ جو مصرعے چھوٹے ہوں انہیں الفاظ کی تانی سُروں میں پورا کیا جاتا ہے۔

چار بیتوں کے چند نمونے:

وومو یازم رنگ دہی:

چے مُدا بَدیالے زانی گھوڑ بوجی
وومیں یارُن لئے مار
پلو ہنولڑ مونڑ چا پیر ہگار
کا تھہ رَوس رَس وو یار
گیئی مجال دیس گیا وسمار بندوجی چھجی
وومو یازم رنگ دہی
چے مُدا بَدیالے زانی گھوڑ بوجی

سیل تھہ وو بھورا:

گلیوڑ وال گیئے پھوڑ وجی ریئ یازوئے
سیل تھہ وو بھورا گالیوڑ وال پھڑ وجی چھلیون درو
لیلے آنجھ بوجی آنہ سویلے چھاڑ وڑون درو

یاری دلبری:

گھن سولیئ سے ساتھی گھوڑ بو جوئی
یاری دلبری گھن سولیئ ساتی راون بلی
لالے بالہ بونی نور پری حسن گی ٹوتام بلی
یے وو موڑ عمرے اے ارمان بلی

کوہستانی زبان کے لوک گیت

یَوغمہ/ بُغمہ/ بوغمائے: بوغمہ خصوصی طور پر کوہستانی زبان بولنے والی خواتین کے گیتوں کی ایک قسم ہے۔ یہ عوامی گیت ہوتے ہیں تاہم گیتوں کے بعض تخلیق کاروں کے متعلق پتہ بھی چل جاتا ہے لیکن عموماً اسے صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے۔ یہ گیت دو مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور دونوں مصرعے تقریباً ایک جیسی طوالت کے ہوتے ہیں۔ یہ گیت عموماً روزمرہ کے کام کاج (گھاس کٹائی، کھیتی باڑی، جنگل یا گھر میں تنہائی میں گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے مطابق ان گیتوں کا مقصد دل کا بوجھ ہلکا کرنا، کسی کی یاد کو تازہ کرنا، کسی کو یاد کرنا وغیرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ جب دل خوش ہو یا کوئی خوشی کا ایسا لمحہ ہو جس پر خوشگوار یادوں کا اثر ہو تو یہ گیت گایا جاتا ہے۔ ان گیتوں میں غم اور خوشی کے دونوں اظہار پائے جاتے ہیں۔

پہلے اور دوسرے مصرعہ میں قافیہ ردیف کی پابندی نہیں البتہ دونوں مصرعوں میں ایک ہی خیال یا اظہار کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ نمونہ کے چند بوغمائے یہ ہیں۔

گھنیں لانگہ وو ہی یاں کمزور
ہی شرُ زنگلاں یَہومَن کا نھو
مہ تم تل آنس تو جوڑ ہست
تیں گھیر کا تگے کلمہ مالی

گیل: گیل بھی خواتین کے لوک گیتوں کی ایک قسم ہے اور یہ صرف خوشی کے گیت ہوتے ہیں جن کے گانے کا موقع شادی بیاہ، منگنی، لڑکوں کے ختنے وغیرہ بتائے جاتے ہیں۔

اس کے گانے کے دوران ایک یا دو خواتین تھال یا بڑے سائز کے دیگچے سے ڈھول کا کام لیتی ہیں اور ایک یا دو خواتین روائتی ناچ ناچتی ہیں اور دوسری خواتین گیل کے گیت مل کر گاتی ہیں۔

گیل کے گیتوں کی ساخت بوغمہ/بُغمہ سے مختلف پائی جاتی ہے۔ یہ عموماً تین مصرعوں کا گیت ہوتا ہے۔ اس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ایک ہی ہوتا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے مصرعہ کے بعد پہلا مصرعہ دہرایا جاتا ہے۔ اس مصرہ کو ضرورت کے مطابق تین سے چھ بار تک دہرایا جاتا ہے اس کے بعد نئے گیت (گیل) کا پہلا مصرعہ گایا جاتا ہے۔

نمونہ کے چند گیت:

اُن دی می کسٹو
گٹی دِشو ہار بین
اُن دے می گسٹو۔۔۔
سُوں آئنس می ارمان
تاں یاں غندلو بسیں ہار
سُوں آئنس می ارمان۔۔۔

شنا زبان کی طرح کوہستانی زبان میں بھی چاربیت، صوداور سوت رونگو کی اصناف پائی جاتی ہیں اوران کی ترتیب یانشست وبرخاست عموماً ایک جیسی ہوتی ہے۔

کوہستان کے لوک شُعراء

کوہستان اور کوہستان کی مقامی زبانوں کے کئی شعراء پیدا ہوئے اور چلے گئے ان کا باقاعدہ کوئی بھی ریکارڈ یا ادوار اور اصناف کے متعلق کوئی جامع دستاویز یا تحقیق موجود نہیں۔

مُلا رضول: ان کا تعلق وادی کھندیا سے تھا۔ کوہستان کے معلوم لوک شعراء میں سب سے بڑے اور پرانے لوک شاعر گزرے ہیں۔ وہ کوہستانی زبان میں چاربیت، صوداور صوت رونگو کی اصناف میں شعر کہتے تھے۔ ان کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ زیادہ تر شعری سرمایہ معدوم ہو چکا ہے۔

فرقان شاعر: فرقان شاعر کا تعلق وادی جلکوٹ سے تھا۔ آپ شنا زبان کے چاربیت گو شعراء میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا زیادہ تر کلام ضائع ہو چکا ہے اکا دکا چاربیت لوگوں کو یاد ہیں۔ آپ کی پیدائش اور وفات کے متعلق صحیح دور کا تعین مشکل ہے۔ آپ کی شاعری کا سبب ایک خاتون کا عشق بتایا جاتا ہے جس سے آپ کو دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ زندگی کے آخری دور میں ان کی شاعری نے عشق حقیقی کا رخ موڑ لیا تھا اور مجازی شاعری ترک کر لی تھی۔

رضول عرف مژو: ان کا اصل نام رضول لیکن گھر میں مژو کے نام سے پکارے جاتے تھے بعد میں یہی نام عام ہوا۔ ان کا تعلق وادی پالس کے شن قبیلہ کی ایک شاخ جلکھن خیل سے تھا۔ وہ وادی بر پالس کے مقام کھلیار میں پیدا ہوئے اور یہیں اندازً نوے سال کی عمر میں 2002ء میں وفات پائی۔

ان کا شمار شنا زبان کے مشہور بزرگ لوک شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ چاربیت، صوت رونگو، صوداور مناجات (ابیات) کی اصناف میں چوٹی کے شاعر تھے۔ آخری عمر میں صرف ابیات کہا کرتے تھے۔

انہیں خصوصی طور پر شادی بیاہ کے موقعوں پر مدعو کیا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے لاجگروں (سنگت میں گانے والے ساتھیوں) کے ساتھ لوک شاعری کا خون جوہر دکھایا کرتے تھے۔ لوک شاعری کے ساتھ ساتھ وہ ایک معروف داستان گو بھی تھے۔ انہوں نے مختلف داستانوں کے کئی حصوں کو نظم کیا۔

تاج: تاج مرحوم کا تعلق وادی پالس کے ملکھن خیل شاخ سے تھا۔ وہ وادی بر پالس میں گدار کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انہوں نے کئی سال دینی علوم کی تعلیم کے دوران وادی سے باہر گزارے۔ تاج کا شمار بھی شنا زبان کے چوٹی کے لوک شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ چاربیت، صوداور صوت رونگو کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں سوز وگداز اور ہجر وفراق کا درد پایا جاتا ہے۔ دینی علوم کی بنا پر ان کی شاعری میں فارسی اور عربی الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

نصیر جالکوٹی: نصیر کا تعلق وادی جلکوٹ کے چھلیس قبیلہ سے تھا اور جوانی ہی میں وفات پائی۔ نوجوان نسل میں ان کا شمار رُگی (دومصرعہ گیت) کے اہم لوک شاعر کے طور پر ہوا۔ انہوں نے مقامی گیت میں پہلی بار تسلسل کے ساتھ سوال جواب کے انداز میں لوک گیت تخلیق کیئے۔ عورتوں میں ان کے گیتوں کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے گیتوں کے کئی کیسٹس مقامی بازاروں میں دستیاب ہیں۔

ست بر: آپ کا تعلق وادی کولئی سے ہے۔ چاربیت گو شاعر ہیں اور کولئی میں مجلس کے استاد مانے جاتے ہیں۔ اب عمر کے آخری دور میں۔ ان کی ایک دو کیسٹس مقامی بازار میں دستیاب ہیں۔

سنگین: ان کا تعلق کولئی کے چھلیس قبیلہ سے ہے۔ دومصرہ گیت رُگی کے شاعر ہیں اور دوسروں کے گیت بھی گاتے ہیں۔ ان کی آواز میں ایک خاص قسم کا آہنگ اور

گداز پایا جاتا ہے۔ ایک مخصوص سُر میں گاتے ہیں۔ جدائی، غم، روایتی پابندیاں، موسم، مناظر اور مقامی ماحول کی عکاسی ان کے گیتوں میں عام ہے۔

نواب خان: آپ کا تعلق وادی پالس کے مقام شریال کے ڈڑمہ قبیلہ سے تھا۔ جوانی میں ہی ایک حملہ کے دوران الائی کے مقام بہاری میں قتل ہوئے۔ ان کے گیتوں میں ایک خاص قسم کا کرب اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ ہوسی نقل مکانی کے مناظر کے ساتھ ساتھ عام حالات و مشاہدات اور سماجی روئیوں کو گیتوں کا موضوع بنایا کرتے تھے۔ ان کے گیتوں کی صرف ایک کیسٹ دستیاب ہوئی جو راقم نے محفوظ کی ہوئی ہے۔

معروف خان (سیوٗ): آپ کا تعلق وادی سیوٗ سے ہے۔ کوہستانی زبان کے چار بیت گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سو سال کی عمر میں وفات پائی لیکن صحیح دور کا معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ محبوب کے سامنے ان کی قوت گویائی ختم ہو جاتی تھی۔

گیتُو: یہ معروف خان شاعر کے بیٹے تھے اور کوہستانی زبان میں چار بیت کہتے تھے۔ آج (2004) سے دس سال پہلے نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ لوگوں کو ان کے بہت سے گیت اور چار بیت اب بھی یاد ہیں۔

جمال خان: ان کا تعلق جلکوٹ وادی کے ست خیل قبیلہ سے تھا۔ شنا زبان کے چار بیت گو شاعر تھے۔

ہریپ: ان کا تعلق بھی جلکوٹ وادی سے تھا۔ کھوتر خیل قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مقامی طور پر شنا لوک شاعری میں طنزیہ اور مزاحی شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا۔

دُچھو میاں: ان کا تعلق پٹن وادی کے میاں گان گھرانے سے تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں کوہستانی زبان میں مجلس / شاعری کی ابتداء کی اور سترہ سال کی عمر میں 1974ء کے زلزلہ کے دوران وفات پائی۔ ان کا بیٹا پُنر بھی شاعر ہے۔

نمیلا: ان کا تعلق پٹن کے بہوں خیل قبیلہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کی آج (2004) سے چالیس سال قبل جب وہ پچاس سال کے لگ بھگ تھے۔ کوہستانی زبان کے چار بیت گو شاعر تھے۔ انہوں نے پندرہ سال شاعری کی۔

لُڑُو: ان کا تعلق پٹن وادی سے تھا اور یہاں کے پرانے شاعر تھے۔ ایک اچھے چار بیت گو شاعر مانے جاتے تھے جو اپنے دور میں شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنے لاجگروں کے ساتھ شاعری یا مجلس کیا کرتے تھے۔

میر ولی: ان کا تعلق وادی کیال سے تھا۔ ان کی مادری زبان کوہستانی تھی لیکن دشمنداری کی وجہ وہ پالس کی وادی میں مقیم تھے اور یہیں پندرہ سال کی عمر میں شنا زبان میں شاعری کی ابتداء کی۔ جب اپنے آبائی علاقہ کیال واپس آئے تو یہاں کوہستانی زبان میں شاعری کا آغاز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

ہمدُ لا شاعر: ہمدُ لا شاعر کا تعلق وادی ہربن سے تھا۔ وہ مجلس کے شاعر تھے۔ مقامی روایات کے مطابق وہ ایک سو بیس سال قبل فوت ہوئے۔ ان کے لاجگروں میں امیر شاہ، حضرت رسول، رحمت علی، اشرف اور فرمس شامل تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کا کلام ان کا ایک لاجگر حضرت رسول سنایا کرتے تھے۔ ان کے گیتوں میں جنگ چھلاس کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔

بریادر (عرف برا): بریادر چار بیت گو شاعر تھے 90 سال کی عمر میں 1999ء میں وفات پائی۔ ان کا تعلق وادی کھندیا سے تھا۔

دربار، درگاہیں اور شلے

کوہستان کی مختلف وادیوں میں کئی بزرگ، شہداء اور ملنگ گزرے ہیں۔ کچھ کے متعلق سرسری معلومات دستیاب ہوتی ہیں اور کئی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ مولانا غلام عیسیٰ نے کوہستانی زبان میں لکھی گئی تفسیر قرآن میں کہیں اس طرح ان کا ذکر کیا ہے:

دُبیراں کھونہ دُوگاں باریک
پنوخو مرچکی بابا
دُبیر منزدھاک دھئی تھے ارباب
کھلیاں زنگلاں شہید بابا

کوہستان میں جو بعض دربار اور درگاہیں اور شلے پائے جاتے ہیں ان کا محل وقوع اور دیگر سرسری معلومات بیان کی جاتی ہیں۔

شلے: کوہستان کی مختلف وادیوں میں بعض مقامات پر ایسی جگہیں جہاں کسی کو

ناحق قتل کیا گیا ہو وہاں لوگ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنکر اور شاخیں پھینک پھینک کر ایک ڈھیر سا بنا دیتے ہیں اور اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے مقامات کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور راہ گزر لوگ وہاں کنکر اور شاخیں وغیرہ پھینک کر دعا کرتے اور گزرتے ہیں ان مقامات کو مقامی زبان میں ڈھلے کہا جاتا ہے۔

دربار، درگاہیں: کوہستان کی مختلف وادیوں میں کئی چھوٹے بڑے دربار اور درگاہیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی چالیس سال قبل تک ان درباروں اور درگاہوں پر لوگ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ جا کر مختلف حاجات کے لئے دعائیں اور منتیں چڑھاتے تھے۔ آج کل یہ سلسلہ بہت حد تک ترک کر دیا گیا ہے تاہم ان درباروں اور درگاہوں کی اہمیت کا اب بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

باباجی کا مزار: دُبیر کے ملاخیل قبیلہ کے جدامجد باباجی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی پیدائش وادی کھندیا میں ہوئی۔ کہتے ہیں ان کی پیدائش کے زمانے میں وادی کھندیا پر کھاندی نام کے کسی شخص کی حکومت یا راجگی تھی۔ باباجی کے بچپنے کے زمانے میں کوہستان میں اسلام کی آمد ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن میں ہی انہیں اپنے فضل سے نوازا ہوا تھا۔ چنانچہ جوانی اور معمری میں انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے یہاں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کے دور میں وادی دبیر میں تین بزرگ ہستیاں موجود تھیں ایک وہ خود، دوسرے جاگ بابا اور تیسرے گٹ بابا۔ کہتے ہیں تینوں بزرگ ہفتہ وار آپس میں میٹنگز منعقد کیا کرتے تھے۔ باباجی کا مدفن وادی دبیر میں ہے۔

جاگ بابا: جاگ بابا کا تعلق بھی وادی دبیر سے تھا ان کا مزار دبیر وادی میں ہے۔ ایک بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ وہ پختونوں کے جاگ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور سوات سے آئے تھے۔ ان کی نسل کو جاگی کہا جاتا ہے اور یہ لوگ تجارت میں مشہور ہیں۔ جاگ بابا علم، آگہی اور دانش میں مشہور تھے۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار شخصیت کے مالک تھے۔

شیخ در بابا: ان کا تعلق وادی دُبیر سے تھا۔ اپنے دور کے بڑے بزرگ اور متقی شخصیت کے مالک تھے۔

گٹ بابا: یہ بزرگ کرامات کے مالک تھے۔ عموماً باباجی سے ملنے آتے تھے۔ ان کے متعلق بعض واقعات میں کہا گیا ہے کہ وہ بارش اور برف میں سفر کے باوجود بھیگے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ ان کا مدفن بھی وادی دُبیر میں ہے۔

اخون دادو (خواجہ اخون رفن): یہ بزرگ اخوند سالاک کے ایک اہم ساتھی اور مرید تھے (پرویش شاہین P-99,1988) کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے عالم دین، ادیب اور مولف تھے۔ ان کا مزار وادی پالس میں واقع ہے وادی پالس میں وہ اخون دادا کے نام سے مشہور تھے۔ مقامی سطح پر اشاعت اسلام کے لئے ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ عورتوں میں ان کے متعلق زیادہ عقیدتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی قبر وادی پالس کے ایک مقام بدوکوٹ کے قریب ہے۔ وہ بڑے متقی اور بزرگ شخصیت کے مالک تھے۔

بائے شہیدان: یہ مزار وادی پالس کی ایک بستی زیریں پارو میں واقع ہے۔ اس میں بارہ شہدا دفن ہیں۔ اسی وجہ سے اس مزار کو بائے شہیدانو جارات کہا جاتا ہے۔ اِن کا تعلق وادی پالس کی حکیمہ خیل قبیلہ سے تھا۔ انہیں سُرمہ خیل قبیلہ کی چار شاخوں (ازتہ، مہلیے، دِدرہ اور شمکہ) نے اندازاً دو ڈھائی سو سال قبل گرمائی مقام مڑ و اور لیدی میں قتل کر دیا تھا۔ ان میں سے دس افراد مڑ و اور دو افراد لیدی کے مقام پر قتل کئے گئے۔ ان شہداء کو پارو کے مقام پر دفن کیا گیا اور یہیں بعد میں مقامی طرز کا مزار بھی تعمیر کیا گیا۔ جو 1992ء کے سیلاب سے متاثر ہو چکا ہے۔ یہاں وادی پالس کے لوگ منتیں اور مرادوں کے لئے آیا کرتے تھے۔ جن دو افراد کو لیدی کے مقام پر اندازاً ساڑھے تیرہ ہزار فٹ بلندی پر قتل کیا گیا تھا۔ وہاں بھی چار دیواری تعمیر کی گئی تھی۔ جہاں شکار کئے گئے آئی بیکس کے سینگ اور سفید پتھر (بکری) لاکر رکھے جاتے تھے۔ (آج کل نظر نہیں آتے اور سینگ بُھر کر ختم ہو رہے ہیں) قریب رہنے والے لوگ اس دربار پر عید، شب برات، محرم، مُڑے اشپہ وغیرہ کے دنوں میں خصوصی طور پر جایا کرتے تھے۔ پراٹھے، میٹھی روٹیاں اور ابلے ہوئے انڈے اس دربار پر رکھے جاتے تھے۔ یہاں شادی، بہادری، دشمن پر غلبہ، بیٹوں کے لئے دعائیں، شوہر اور ساس سُسر کے رویہ میں بہتری اور شفقت، غربت میں کمی، خوشحالی، مال مویشیوں میں اضافہ وغیرہ کے لئے دعائیں اور منتیں مانی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ کئی ماہر شکاری (جو مارخور، آئی بیکس اور ہرن کا شکار کرتے ہیں) بھی اس دربار پر خصوصی طور پر جایا کرتے تھے تاکہ انہیں اچھے اچھے شکار ملیں۔ اس دربار کے دروازہ پر کنندہ کاری کا کام پایا جاتا تھا۔

غازی شہید: ان کا مزار وادی پالس میں گلی باغ (پرانا نام گھہا) کے پاس

واقع ہے۔ یہ بزرگ 5 مارچ 1853ء کی جنگ چھلاس میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ جنگ چھلاس میں اگر وہ شہید ہو جائیں تو ان کے جسد خاکی کو دریا بُرد کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ شہید ہوئے تو ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد مبارک کو دریائے سندھ میں پھینک دیا گیا اور علاقہ وادی پالس کے موجودہ مقام سیر غازی آباد کے قریب دریا نے ان کے جسد مبارک کو کنارے لگا دیا۔ یہاں سے ان کی شناخت کی گئی اور انہیں اُن کے آبائی مقام گھہا کے قریب دفن کیا گیا۔ ان کا اصل نام معلوم نہیں لیکن مقامی طور پر وہ غازی شہید کے نام سے مشہور ہیں۔ جنگ چھلاس سے قبل وہ کئی مقامات پر جہاد کر چکے تھے جس کی بنا پر وہ غازی کے نام سے مشہور تھے۔

مَرچکی بابا: ان کا مزار وادی پٹن کے درہ میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ بہت جلال اور غصہ والے تھے اور غصہ کی حالت میں لوگوں کو دعائیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مرچکی بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔

دُوگا بابا: ان کا مزار دُوگا کے مقام پر ہے جو سیوٗ وادی سے آگے ہے۔ لوگ ان کے مزار پر منتیں اور دعائیں مانگتے تھے۔

وادی رزقہ کا مزار: یہ مزار وادی سیوٗ کے مقام رزقہ (اصل نام رزقی تھا) میں واقع ہے۔ یہ مزار شوکھر خیل قبیلہ سے تعلق رکھنے والے پانچ بھائیوں کا ہے جنہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں ان کا مزار بنایا گیا اور مقامی لوگ موسمی نقل مکانی کے دوران ان کے مزار سے گزرتے وقت اپنی حاجات کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

میاں گل داد کا مزار: اِن کا مزار وادی ہربن میں واقع ہے۔ لوگ گوشت، اخروٹ، انڈے روپے لے جا کر ان کے مزار پر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں ان کے مزار پر امن کی حاجات مانگی جاتی تھیں۔ یہ بزرگ جنگ چھلاس میں شہید ہوئے تھے۔

کھریل دارے جارات: یہ مزار ہربن وادی میں واقع ہے۔ یہاں شادی، عورت اور نرینہ اولاد کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

مہلا دارے جارات: یہ بھی وادی ہربن میں واقع ہے۔ یہاں عام حاجات کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

ڈُگو بابا: اِن کا مزار وادی کوئی میں ہے۔ اپنے دور کے بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ تبلیغ اشاعت کے لئے گراں خدمات سرانجام دیں۔

شدم خیل بابا: یہ مزار کھندیا کی وادی باغ سیری گبرال میں واقع ہے۔ یہ ایک بزرگ تھے جو گبرال بابا کے نام سے بھی مشہور تھے۔

بابا خیل: اس بزرگ کا مزار کھندیا میں کرنگ کے مقام پر ہے۔ یہاں اُن کے چلہ کاٹنے کی ایک کوٹھڑی بھی پائی جاتی ہے۔

حلیم بابا: اِن کا مزار وادی جلکوٹ میں بجا کے مقام پر ہے۔ اس مزار کو بجائے جارات بھی کہا جاتا ہے۔ لوگ یہاں میٹھی روٹی اور ابلے ہوئے انڈے لا کر رکھا کرتے تھے۔ مگر آج کل نہیں رکھتے۔

بُزرگ ددی: یہ ایک بُزرگ خاتون تھیں اور مقامی سطح پر بُزرگ ددی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ جب یہ خاتون زندہ تھیں تو لوگ دعا کرانے اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ بعد از وفات ان کے مزار پر جایا کرتے تھے مگر آج کل مرادوں کی دعا کے لئے نہیں جاتے۔ ان کا مزار وادی جلکوٹ میں کوٹ کے مقام پر واقع ہے۔

ٹو کے بابا: اس بزرگ کا مزار جلکوٹ میں گوشلی کے مقام پر واقع ہے۔ یہاں بھی لوگ میٹھی روٹی، اخروٹ اور ابلے ہوئے انڈے لا کر رکھا کرتے تھے لیکن آج کل نہیں رکھتے۔

مذوف بابا: اس بزرگ کا مزار وادی کوئی میں ہے اور تبلیغ اسلام کے لئے ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔

لوک رسوم، اعتقادات

اچھے اور برے دن: مقامی لوگ اچھے دنوں کو شودیس (سفید دن) اور بُرے دنوں کو کنودیس (کالے دن) قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کے پیچھے انسان کی قسمت (راجھی) اور دعائیں کارفرما ہوتی ہیں۔

شودیس (سفید دن): بعض ایام کو سفید یعنی بابرکت اور خوشحالی کے دن سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں عیدین، جمعہ، شب قدر وغیرہ کے ایام شامل ہیں۔ ان ایام میں لوگ بہنوں، بیٹیوں اور دوسری قریبی خواتین کو جن کے ساتھ دودھ، ماں یا باپ کی پیڑھی کی نسب ہو کھانا بھیجتے ہیں۔ سفید دن کو خوشحالی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو بددعا دینی ہو تو کہا جاتا کہ خدا سفید دن نہ دکھائے۔

دنوں اور مہینوں کے بارے میں اعتقادات:

☆ بدھ، جمعرات اور جمعہ کے ایام کو مبارک سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے دنوں کو نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔

☆ نئے چاند کے ابتدائی اور پرانے چاند کے اختتامی دنوں میں شادیاں نہیں کی جاتیں۔

☆ جمعہ، جمعرات اور ہفتہ کے دن کو شادی کے لئے مبارک سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ان دنوں میں شادی ہونے والی عورت سسرال میں خوشحال رہتی ہے۔

جمعرات:

☆ بعض لوگ روایتی طور پر جمعرات کے دن کو بھاری سمجھتے ہیں اور اس روز موسمی نقل مکانی کرنے کو ترجیح نہیں دی جاتی۔

☆ وادی ہربن میں بتایا گیا ہے کہ جمعہ اور جمعرات کے روز گھر میں جھاڑو دینے کی ممانعت ہے کیوں کہ اس سے گھر کی برکت نکل جاتی ہے۔ (آج کل متروک ہے)۔

مبارک مہینے: شوقدر (شب قدر)، شعبان، رمضان اور ذی الحج۔

مہینوں کے مقامی نام:

☆ خودائی تعالائے موس، شوقدر، روزہ، لکھی عیت، خالی، بڑی عیت، حسن حسین، صفرو، چارسزارہ (مُنجی سس، لیکھی سس، مُنجی سس، بڑی سس)۔

کسانوں کے مہینے:

☆ پساک، جیٹھ، چیتر، ہڑ، پشکال، بہادرو، گُپ، صفرو، حسن حسین، لیکھی سس، مجنی سس، بڑی سس (ہے سزارہ)۔

دنوں کے مقامی نام:

☆ شمبہ، اک شمبہ، دُشمبہ، سہ شمبہ، چار شمبہ، پاشمبہ، جُمہ۔

مقدس شامیں اور راتیں:

مُڑے اشپہ (نوویں محرم)، شوقودر (شب قدر)، جُمائے رقی (جمعہ کی رات)

بارش برسانے کے لوک اعمال:

۱۔ گنجوں کے نام لے کر اس کا ایک خاکہ کاٹپلو بنا کر گھر کے باہر والے حصہ میں بارش برسنے کے لئے لٹکانا یا جاتا ہے۔

۲۔ بعض مقامات پر بتایا گیا ہے کہ بارشیں نہ ہوں تو کسی گنجے آدمی کا منہ کالا کر کے اسے باہر کھڑا کیا جاتا ہے۔

۳۔ باہر سے پتھر لا کر چولہے پر گرم کرنا تا کہ بارش شروع ہو۔

۴۔ بارشیں نہ ہوں تو قبروں پر پانی ڈالنا۔

۵۔ بارش برسانے کے لئے قرآن پاک کا غلاف دھونا۔

۵۔ نماز استقی ادا کرتے ہیں۔

۶۔ بچے جمع ہو کر آوازیں دیتے ہوئے گھر گھر سے آٹا، مرغے اور گھی مانگ کر جمع کرتے ہیں اور پھر گاؤں سے باہر پکا کر آپس میں بانٹ کر کھاتے ہیں اسے شن کاڑے کہا جاتا ہے۔

۷۔ خشک سالی ہو تو بارش برسنے کے لئے بعض لوگ اپنی سانس روک کر تین بار چولہے سے تین مٹھی راکھ نکال کر اسے قبلہ کی طرف پھینکتے ہیں کہتے ہیں اس طرح بارشیں شروع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے لوک اعمال خواتین میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

۸۔ بارش برسنے کے لئے بعض لوگ مولوی حضرات سے تعویز لکھواتے ہیں۔ ان تعویزوں کو تعویز کروانے والا آگ کے نزدیک رکھتا ہے تا کہ تعویز کو سیک پہنچے اور بارش ہو۔

۹۔ بارش برسنے کے لئے بعض لوگ چوری کے پیڑے (مکئی کی روٹی گھی میں توڑ کر) بنا کر لوگوں میں بانٹتے ہیں۔ اسے بارش برسانے کی خیرات یا صدقہ کہا جاتا ہے۔

۱۰۔ بارشوں کے لئے بچے ایک دوسرے پر لوٹوں یا کٹوروں سے پانی بھی ڈالتے ہیں۔

۱۱۔ روٹی کا ایک بڑا روٹ پکا کر لوگوں میں تقسیم کرنا اور اذانیں دینا۔

بارشیں روکنے کے لوک اعمال:

۱۔ جب بارشیں زیادہ یا خطرناک حد تک شروع ہو جائیں اور رُکنے کا نام نہ لیں تو اس صورت میں بارش روکنے کا ایک ٹوٹکا کیا جاتا ہے۔ اس ٹوٹکے کے مطابق گھر کے چولہا سے راکھ نکال کر کسی برتن یا چمچہ سے آسمان کی طرف اچھال کر پھینکا جاتا ہے کہتے ہیں اس سے بارش تھم جاتی ہیں

۲۔ ایک اور رسم کے مطابق پرانے کپڑوں کے چھیتڑوں کی گڈی یا گڈیاں بنا کر مکان کی چھت پر کھڑی کی جاتی ہیں۔ وادی کیال میں اس قسم کی گڑیوں کو

جھڑیاں مسافر (بارش کے مسافر) کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں غریب مسافر ترس اور رحم کے قابل ہوتے ہیں اور اس عمل سے بارش تھم جاتی ہے گویا مثلی مسافر کا سہارا لینے کا عمل پایا جاتا ہے۔

۳۔ کئی وادیوں میں یہ رواج بھی پایا جاتا ہے کہ بارشیں روکنے کے لئے کسان کے ہل کو زمین یا کھیت میں الٹا کر کے کھڑا کر دیا جاتا ہے (یعنی ہل کے پھال والا حصہ آسمان کی طرف کر کے) اس طرح بارشیاں تھم جاتی ہیں۔

۴۔ بارش روکنے کے لئے کسی بھی نیک نامی مرد کی قبر کا پتھر آگ میں ڈالا جاتا ہے تاکہ بارش تھم جائے۔

۵۔ بارش روکنے کا ایک اور عمل بھی پایا جاتا ہے جس کے تحت بستی یا وادی کے سات گنجوں کے نام کسی ٹھیکرے یا کاغذ پر لکھ کر آگ کی طرف کر کے کافی دیر تک پکڑ کر رکھا جاتا ہے تاکہ ان ناموں کو آگ کی سیک لگتی رہے۔ (یہ رسمیں زیادہ تر متروک ہو چکی ہیں)

۶۔ زیادہ بارشیں ہوں تو سمجھا جاتا ہے کہ کہیں کسی بے گناہ کا خون بہایا گیا ہے۔

منحوس علامات، اعمال:

۱۔ جمعہ کے روز کے علاوہ گھر میں جھاڑو دینا اور چولہا سے راکھ نکالنا۔

۲۔ صفرو (صفر) کے ماہ میں شادیوں کی تقریبات کا اہتمام کرنا۔

۳۔ رات کو گائے یا بیل کا آواز دینا یا اس قسم کی آواز سننا۔

۴۔ مرغی کا اذان دینا یا سننا۔

۵۔ بدھ کے روز خواتین سر نہیں دھوتیں۔ کہتے ہیں اس دن سر دھونے والی کا خاوند مر جاتا ہے۔

۶۔ مرد مرغیوں کا سر کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اس سے ماں مر جاتی ہے۔ (اب متروک ہے)۔

بابرکت اور منحوس ایام:

۱۔ سفر کے لئے بعض لوگ ہفتہ، پیر اور منگل کو بابرکت سمجھتے ہیں۔

۲۔ اتوار اور بدھ کا دن اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ بدھ، اتوار کے دنوں میں سفر، شادی یا اہم کام کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

۴۔ گٹ (پرانے اور نئے چاند کے ابتدائی) دنوں کو شادیوں کے لئے منحوس یا بھاری سمجھا جاتا ہے۔ ان دنوں میں شادیاں نہیں کی جاتیں۔ کہتے ہیں ان دنوں میں جس لڑکی کی شادی ہو اسے ہمیشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۵۔ کہتے ہیں گٹ کے ایام میں زچہ پر سایہ لگنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔

سفر پر روانہ ہونا:

۱۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت دروازہ پر ایک مرد یا لڑکے کو قبلہ رخ کھڑا کیا جاتا ہے اور سفر پر جانے والا سب سے پہلے اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ بعد میں دوسروں سے۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت لڑکیوں یا خواتین کو سامنے آنے نہیں دیا جاتا۔

۲۔ روانہ ہوتے وقت دروازہ پر گھر کے کسی بھی چھوٹے لڑکے کو کھڑا کیا جاتا ہے اور اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے کو سفر کے لئے بابرکت سمجھا جاتا ہے۔

پانچ پاؤ کی رسم: پانچ پاؤ کی رسم کے مطابق ایک بکری کو ذبح کر کے اور اس کا پکایا ہوا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بعض لوگ روٹ بھی پکاتے ہیں۔ گھی میں روٹی کو توڑ کر لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مُرادوں کے لئے اسے مقبول سمجھا جاتا ہے۔ (اب متروک ہے)۔

ایک متروک تہوار: شب برات میں لوگ جمع ہو کر لہی کا لھمبا (جلتی ہوئی لکڑیاں) جلا کر دو دو مردوں کی ٹولیاں اسے آگ لگا کر ایک دوسرے سے ٹکراتے اور دوڑتے ہوئے مقابلہ کرتے تھے۔ یہ عمل کئی گھنٹے جاری رہتا تھا۔ آج کل یہ متروک ہے۔

خیرات وصدقہ جات:

۱۔ قدم لپ دینا۔ (میت کو لے جاتے وقت قدم گنتے ہوئے بچوں میں چوری تقسیم کرنا)۔

۲۔ میت کے گھر تیسرے روز خیرات کرنا۔

۳۔ جمعہ دون۔ (میت دفنانے کے بعد ہر جمعہ کو خیرات دینا)۔

۴۔ چالیسواں (میت دفنانے کے چالیس روز کے بعد خیرات دینا)۔

۵۔ شریو خیرات (عام بلاؤں اور مصیبتوں سے نجات کے لئے خزاں میں خیرات دینا)۔

۶۔ سخت بیماری کے دوران بکرا ذبح کر کے خیرات دینا۔

۷۔ بہت عرصہ کے بعد نرینہ اولاد کی پیدائش پر خیرات دینا۔ (عورتوں کو ہی دی جاتی ہے)۔

۸۔ قتل کا بدلہ لینے کے بعد خیرات دینا (بعض لوگوں میں اس کا مشاہدہ کیا گیا)۔

۹۔ کسی مشکل جگہ سے گر کر بچ جائے تو وہ خیرات دی ہے۔

۱۰۔ منگنی پر خیرات دینا۔

۱۱۔ ختنوں پر خیرات دینا۔

۱۲۔ نئے گھر کو آباد کرنے پر خیرات دینا۔

۱۳۔ پکنائے (انہونی چیزیں یا جن بھوت) دیکھنے پر خیرات دینا۔

شکاریوں کے لوک اعمال:

۱۔ شکار پر روانہ ہونے سے پہلے نوافل پڑھنا۔

۲۔ جو جانور شکار کیا جائے اس کی دائیں ران کی منت دینا۔

۳۔ سب سے پہلے راستہ میں جو آدمی ملے اسے منت کی ہوئی ران دینا۔

۴۔ شکار پر روانہ ہونے سے پہلے قریبی زیارت پر جانا اور اچھے شکار کے لئے دعا مانگنا۔

۵۔ شکار پر روانہ ہوتے وقت راستہ میں کسی بچہ کو کھڑا کرنا اور اس سے ہاتھ ملا کر سفر پر روانہ ہونا تا کہ کامیابی ہو۔

۶۔ شکار کے لئے پاک بدن روانہ ہونا۔

۷۔ شکار پر جانے والی صبح سے پہلے والی رات میں بیوی سے ہم بستری سے گریز کرنا۔

۸۔ خواب میں اپنی راجھی کو دیکھنا اور اچھے شکار کے متعلق معلومات ملنا۔

۹۔ شکار والی جگہ کافی سارا خون بہانا، دل کلیجہ نکال کر پھینک چھوڑ دینا تا کہ راجھی راضی ہو۔

نظر بد کے ٹوٹکے:

۱۔ لوہار کی دکان سے مٹی لا کر آگ میں گرم کر کے پانی میں ڈال کر اس کے اوپر نظر بد لگنے والے کو بٹھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے دھونی بھی دی جاتی ہے۔

۲۔ جس آدمی کی نظر لگے اس کی بھوؤں کے بال اور ازار بند کے چند دھاگے حاصل کر کے دھونی دیتے وقت جلا دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے نظر بد دور ہو جاتی ہے۔

۳۔ جس آدمی کی نظر لگے یا جس سے عام لوگوں کو نقصان ہوتا رہے تو اس کے سوئے ہونے کے دوران خاموشی سے اس کا جنازہ پڑھا جاتا ہے اس کے بعد اس کی نظر نہیں لگتی۔

۴۔ جس آدمی کی نظر لگے تو نظر بد ہونے والے کو اس کے وضو کے پانی سے نہلایا جاتا ہے۔

۵۔ نظر بد سے بچنے کے لئے مکان یا کسی اچھی چیز پر کالی لیر باندھی جاتی ہے۔

۶۔ بعض لوگ مکان یا قلعے کی چھت پر کالی ہانڈی رکھ دیتے ہیں؛

۷۔ نظر بد کی دھونی دینے کے لئے چوراہے کی گھاس پھونس، گدے کی خشک لِد، آٹا اور نمیرو (Rhododendron arboreum) کے خشک پتوں کی دھونی دی جاتی ہے۔

۸۔ بیمار یا زخمی آدمی کو بھی اسی قسم کی دھونی صبح شام دی جاتی ہے۔ اس قسم کے بیمار کا احتمال رہتا ہے کہ وہ دُشکر (اس کی مکمل تعریف معلوم نہیں ہو سکی) ہو جاتا ہے۔

۹۔ کہتے ہیں بلماس (جنبی) آدمی کی نظر زیادہ لگتی ہے اور یہ کہ بلماس کو کسی کی نظر نہیں لگتی۔

۱۰۔ نظر بد اور ڈراؤنے خواب، خوف یا سایہ سے بچاؤ کے لئے تعویز بھی کروائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے تعویز بچوں اور خواتین کے گلے میں اکثر نظر آتے ہیں۔

صفر و نکھلون (نکالنا): مارچ کے ماہ میں صفر و کا ماہ شروع ہوتا ہے۔ اسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس ماہ کو بھگانے کے لئے ایک لوک عمل کیا جاتا ہے جس کے مطابق گھر کے کمروں کو بند کر کے لاٹھیوں سے مکان کی دیواروں اور برتنوں کو زور زور سے پیٹا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ کہا جاتا ہے۔

صفر و کفر و اُزہ (صفر و کافر نکل جا):

(ان کلمات کا ماخذ پشتو زبان ہے جس معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم پختونوں سے آئی ہے)

صفر کے ماہ کا ٹوٹکا: صفر کے ماہ کے اختتام پر جو ٹوٹکا پایا جاتا ہے اس کے متعلق مجھے علاقہ کنشیر کے ایک شخص جناب فلک خان عمر ستر سال نے یہ بتایا کہ:

کیرو کدالی

صفرو ڈک ڈک

نیکی ایہہ، بدی بو

یہ کہہ کر کیرو کو پھینک دیتے ہیں۔ جہاں کیرو کو پھینکا جاتا ہے۔ اس طرف واپس دیکھنا منع ہوتا ہے۔ اس عمل کے بعد نیا لباس پہن کر تازہ کھانے پکائے جاتے ہیں اور گھروں کی تازہ لپائی کی جاتی ہے۔ اس عمل سے صفر کے ماہ میں

بیماریوں سے نجات پائی جاتی ہے کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس ماہ آسمان سے بیماریاں اترتی ہیں۔ (آج کل متروک ہے)۔

بے ثمر درخت کو ڈرانا: پرانے زمانے میں جب کوئی پھل دار درخت پھل نہ دیتا تو اس کا مالک کلہاڑی تیز کر کے اسے کاٹنے کو دوڑتا اور لوگ اسے روکنے کی کوشش کرتے۔ ان کے خیال میں اس عمل سے درخت پھل دینا شروع کر دیتا ہے۔

نقل مکانی کی ایک رسم: ماضی میں جب یہ لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام کو موسمی نقل مکانی کرتے تھے تو اس سے پہلے ایک دوسرے کو اچھے اچھے کھانے دیئے جاتے۔ نقل مکانی سے چند لمحے قبل یہ لوگ مندرجہ ذیل رسم ادا کیا کرتے تھے:

☆ نقل مکانی کرتے وقت زور زور سے چلانا، ہل کر شور کرنا اور اس کے بعد روانہ ہونا۔ (آج کل متروک ہے)۔

☆ چھوڑی جانے والی بستی میں ایسی چیز جلانا جس سے بہت زیادہ دھواں پیدا ہو اور دور دور سے نظر آ سکے۔

☆ بہت سی مرغیاں ذبح کرنا تا کہ روانگی سے قبل خون بہایا جا سکے۔ خون گرانے (لیل شھر تھون) کو قربانی، کامیابی اور مرادوں کی تکمیل کے لئے بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

☆ روانگی کے وقت مل کر ہوائی فائرنگ کرنا۔

گرہن: جب چاند گرہن ہوتا تو یہ لوگ ایک رسم ادا کرتے جس میں بستی کے سب سے کم عمر لڑکے کو منتخب کیا جاتا اور اسے ایک معزز مرد ننگا کر کے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چاند یا سورج کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک گرہن ختم نہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ چاند اور سورج کی گرہن سے نجات کے لئے ایک اور رسم بھی پائی جاتی تھی جس میں یہ لوگ چاند یا سورج کی طرف کافی دیر تک فائرنگ کیا کرتے تھے آج کل یہ رسم متروک ہے۔

چاند گرہن کے متعلق جو لوک روایات یا کہانیاں پائی جاتی ہے وہ تین طرح کی ہیں۔

☆ ان کا کہنا ہے کہ چاند (یُون) اور گرہن (آزر) بہن بھائی ہیں۔ ایک بار اُن کی ماں نے نہانا چاہا تو انہیں کہا گیا کہ وہ پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو جائیں۔ اس پر آزر نے ماں کی حکم عدولی کی اور ماں کو ننگا دیکھ لیا اس طرح ماں نے اسے بد عا دے دی۔

☆ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آزر کو گرہن اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بہن (چاند) کی عزت پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

☆ کہتے ہیں گرہن اس وقت ہوتا ہے جب آزر (گرہن) اپنی بہن (چاند) کو مارتا ہے۔

☆ وادی ہرہن میں جب سورج یا چاند گرہن ہو تو لوگ لوہے کا توا اٹھا کر اسے ایک شاخ سے ڈھول کی طرح بجاتے ہیں تا کہ گرہن ختم ہو جائے۔ کہتے ہیں گناہوں کی وجہ سے گرہن ہو جاتا ہے (تفصیل کسی نے نہیں بتائی)

روٹ (روٹی) پکانا: بیماریوں سے نجات کے لئے یہ لوگ مکئی کا ایک روٹ پکاتے ہیں۔ اس کی تیاری اس طرح ہوتی کی ایک مرد بیاک میں روٹ پکاتا اور دوسرا مرد اسے تقسیم کرتا ہے اس دوران گفتگو کرنا منع ہوتی ہے اس عمل کو پوری بستی کے لئے بھی کیا جاتا تھا۔ (آج کل متروک ہے)۔

دانت: دانت گرنے یا نکالنے کے بعد یہ لوگ کہیں دفن کر دیتے ہیں۔ عورتوں کے خیال میں اگر بچوں کے دانت اسی طرح بے دھیانی سے کہیں پھینک دیئے جائیں تو انہیں جن لے جاتے ہیں اور پھر اس کا اثر بچوں پر ہوتا ہے۔ دانت نکال کر اس کی جگہ نمک اور آٹا رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ خود نکلنے والے دانت کو ہاتھ میں پکڑ کر یہ کہا جاتا ہے:

ووپیریان میریان
موس خھو ژانٹھیلو دون دؤس
خھوس موڑ خُمر ددون دیا

ناخن: ناخن کاٹنے کے بعد کہیں محفوظ جگہ پر پھینکنے کا رواج پایا جاتا۔ کم سن بچوں کے ناخن نہیں کاٹے جاتے۔ ان کے خیال میں اس طرح بچے چور بن جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے ناخنوں کو چھپا کر کہیں پھینک دیتی ہیں یا دفن کرتی ہیں۔ مبادہ کہ کوئی جادو یا دم کے لئے استعمال نہ کرے۔

بال: خواتین میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ کنگی کرتے وقت جو بال نکل جائیں انہیں احتیاط سے کہیں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ مردوں کی طرف سے یہ ہدایات ہوتی ہیں کہ وہ اپنے بالوں کو اِدھر اُدھر نہ پھینکیں بلکہ محفوظ جگہ چھپا کر رکھیں تا کہ کسی کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بالوں کو جادو ٹونے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

بالوں کی نشانی: بعض رومان پسند جوڑوں میں زلفوں یا بالوں کی نشانی دینے یا لینے کا رواج پایا جاتا ہے اور انہیں بہت احتیاط سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ (لوک

شاعر نصیر جلکوٹی نے اسی سلسلے میں کہا ہے کہ)

قینچی گی گڑ پ تھے تو موڑ ہر تھینیئی

پھر لوجی پدَ ور تھونے لوترس آلو وومی ساتھی

(اے دوست تو مجھے کہتی ہے کہ میں قینچی سے کاٹ کر تیری زلفوں کی نشانی لوں۔

مگر اے ساتھی تیری گھنی زلفوں کے سائے کو پتلا کرنے سے مجھے بڑا ترس آتا ہے۔)

قبر کے پاس آگ جلائے رکھنا: ماضی میں جب کوئی فوت ہو جاتا تو سات روز تک اس کی قبر کے پاس آگ کا الاؤ روشن رکھا جاتا اور قبر پر سر کی طرف کی سل سات روز تک نہ رکھی جاتی تھی آج کل یہ رسم ترک کی گئی ہے۔

بچی کا پیدا ہونا: ماضی میں یہ رواج تھا کہ جب کسی گھر بچی پیدا ہوتی تو تین روز تک اس گھر میں آگ جلائی نہ جاتی اور بچی پیدا ہونے کا غم کیا جاتا آج کل یہ رسم متروک ہے۔

سر کنگھی کرنے کا امتناع: اگر کسی عوت کا شوہر سفر پر گیا ہوا ہو تو اس کی بیوی شوہر کے آنے تک سر کنگھی نہیں کرتی کہ مبادہ شوہر کو سفر میں کسی مشکل سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

متفرق رسوم، اعتقادات:

☆ شام کو دروازہ کھلا رکھنا ضروری سمجھا جاتا تا کہ ارواح خالی واپس نہ چلی جائیں۔ دعا کرنا لازمی تھا تا کہ ارواح خوشی خوشی سے واپس جائیں۔

☆ آگ میں گھاس جلانے کا امتناع پایا جاتا ہے تا کہ مویشی کی تعداد میں کمی نہ ہو۔

☆ اسی طرح مویشی کے بال بھی آگ میں جلانے سے گریز کیا جاتا تا کہ مال مویشی مر نہ جائیں۔

☆ لسی اور دودھ کا بھی آگ میں پھینکنا ممنوع ہے تا کہ گائے، بھینس دودھ دینا بند نہ کر دے۔

☆ شلوار کا سرہانے رکھنا بھی ممنوعات میں شامل ہے کہتے ہیں اس سے عزت جاتی رہتی ہے۔

☆ بالن (رسی) سرہانے نہیں رکھی جاتی تا کہ مزدوری (مشکل) نصیب نہ ہو۔

☆ کدالی (لاٹھی) راستہ میں نہیں رکھی جاتی تا کہ بلا ضرورت سفر کرنا نہ پڑے۔

☆ منڈیر پر کالا کوا بولے تو مہمان آنے کی علامت یا خبر سمجھا جاتا ہے؛

☆ کالی بلی رستہ کاٹے تو سفر نہیں کیا جاتا ہے۔ کالی بلی کا رستہ کاٹنا ناکامی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

☆ کہتے ہیں نیلی آنکھوں والا وفادار نہیں ہوتا اور دھوکہ دے جاتا ہے۔

☆ نئی دلہن جب دولہا کے گھر میں داخل ہوتی ہے تو اس کے سر پر چشمے کا پانی چھڑکا جاتا ہے تا کہ زندگی بھر وہ پاک دامن رہے۔

☆ دلہن کے سر پر مکئی، اخروٹ و چاول کے دانے اور سکے بھی پھینکے جاتے ہیں تا کہ اسے زندگی میں اشیاء وافر میسر ہوں اور غربت کا سامنا نہ ہو اس کے علاوہ اس عمل کو نیک فال بھی جانا جاتا ہے تا کہ اس عمل سے نئے گھر میں برکت داخل ہو اور وہ گھر کے لئے منحوس ثابت نہ ہو۔

☆ پہلی صبح دلہن کو قریبی چشمہ پر لے جایا جاتا ہے جہاں وہ وضوع کر کے نماز پڑھتی ہے اس کے بعد اسے گھر میں لایا جاہے جہاں وہ اپنا ایک ہاتھ گھی اور دوسرے کو دودھ میں رکھتی ہے تا کہ گھر میں گھی اور دودھ وافر مقدار میں رہے اور بے برکتی پیدا نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہی عمل گوبر میں ہاتھ رکھ کر بھی کیا جاتا ہے۔

☆ سہہ کے کانٹا کو عداوت بڑھانے کے لئے دو گھروں کی چھت میں گاڑھ دیا جاتا ہے۔

☆ جس آدمی کی نظر کمزور ہو جائے وہ چاند کی چودویں رات کو چاند کی طرف دیکھتے ہوئے ادھ پکی کلیجی کھاتا ہے کہتے ہیں اس طرح نظر بحال ہو جاتی ہے۔ (آج کل کم کم لوگ اس قسم کا عمل کرتے ہیں)۔

راجھی: ہر آدمی کی ایک راجھی یعنی قسمت کی دیوی ہوتی ہے۔ جس کی راجھی جتنی خوبصورت ہوگی اس کی قسمت اتنی ہی اچھی ہوگی۔ مال و دولت، دشمنداری، عقل و دانش اور شکار میں راجھی بڑی مددگار ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ہر شکاری کی اپنی اپنی راجھی ہوتی ہے جو کل، مارخور اور دوسرے جنگلی شکار کے دوران شکاری کی مدد کرتی ہے۔ یہ کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتی۔

رُوئی (چڑیل): کہتے ہیں ایک قسم کی عورت روئی یعنی چڑیل ہوتی ہے اور یہ آدمی کو کھا جاتی ہے۔ لوک کہانیوں میں اس قسم کی چڑیلوں کا کثرت سے ذکر پایا جاتا ہے۔ بعض مقامات یا جگہیں بھی اس قسم کے ناموں سے موسوم ہیں جیسے روئی

لاٹ، روئی دار، روئی جیل وغیرہ۔ اس کا چہرا خوفناک، بال بکھرے ہوئے، بڑے بڑے دانت اور پاؤں الٹے ہوتے ہیں۔ یہ کسی گھنے جنگل، غار یا بیابانوں میں رہتی ہے۔ کہتے ہیں برفانی راتوں میں یہ اکثر بستیوں کا رخ کرتی ہے۔ بعض اوقات یہ اپنا روپ بھی بدلتی ہے اور دھوکہ دے کر لوگوں کو اپنا شکار بنالیتی ہے۔

دیو: کہتے ہیں کبھی ان جنگلوں اور بلند پہاڑوں میں دیو آباد تھے۔ کئی جگہوں کے متعلق اب بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں دیو ہیں۔ رات کے گھنے اندھیروں میں دیو لوگوں کی پیٹھ پر تھپڑ بھی مار دیتا ہے جس سے اسی جگہ موت واقع ہوسکتی ہے۔ بہادر سیر پہاڑ کے اوپر دیوزادوں کے کھیل کا مقام بھی ہے۔ ان کی شکل خوفناک اور کالی، قد بلند اور جسم قوی و مضبوط ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر دکھائی نہیں دیتے۔ یہ پریوں کو بھی قیدی بنالیتے ہیں۔

چھیش (سایہ): جن بھوت، دیو، پریوں وغیرہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جس پر ان کا سایہ لگ جائے وہ بیمار رہتا ہے اور اسے دورے پڑتے ہیں۔

فصل، مال مویشی سے متعلق لوک ریت و اعتقادات

فصل بونے کی رسمیں، ٹوٹکے: کوہستان میں پہلے پہل معمر لوگ موسموں اور مہینوں کا روایتی حساب رکھتے تھے۔ ان کی ہدایات کے مطابق فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے دنوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

نیک آدمی سے بوائی کا آغاز: فصل کی بوائی کے شروع میں کسی نیک اور بزرگ آدمی سے مکئی کے کچھ دانے بوائے جاتے ہیں اور اس کے بعد مالک خود بوائی کا عمل شروع کیا جاتا۔ اسے فصل کے لئے بابرکت سمجھا جاتا تھا۔

فصل بوائی کا صدقہ: ابتدائی فصل بوائی کے وقت کسان بیج بونے سے قبل پانچ مٹھی مکئی (بیج) اٹھا کر غریبوں میں بانٹ دیا کرتا تھا تاکہ اس کی فصل قدرتی آفات اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے۔ اسے فصل کا ایک قسم کا صدقہ کہا جاتا تھا۔ مئی کے دوران جب کھیتوں میں پہلا ہل چلایا جاتا تو اس کے لئے دو مخصوص روٹیاں پکائی جاتیں اور بیلوں کو ہل میں جوتنے کے بعد ان کی پیٹھ پر رکھ کر دونوں روٹیاں توڑی جاتیں اور پھر حجرہ میں بیٹھے مردوں میں اس کے ٹکڑے تقسیم کیے جاتے۔ یہ عمل بیلوں کی سلامتی اور اچھی فصل کے لئے کیا جاتا تاہم اب یہ عمل متروک ہے۔ پہلے لوگوں کے باہمی اتفاق سے ایک آدمی اپنی زمین میں ہل چلاتا تھا اس کے بعد باقی لوگ۔ حساب گر فصل بونے کے وقت کا تعین کرتا تھا، اس کے بغیر فصل نہیں بوتے تھے۔ اب اتفاق بھی نہیں اور حساب گر بھی نہیں۔ پہلے ہل چلاتے وقت روٹی تقسیم کرتے تھے اب اس فعل کو شرک سمجھا جاتا ہے۔

فصل بوائی/کٹائی کے بابرکت ایام: اتوار، بدھ اور جمعہ شریف کو فصل کی کٹائی اور بوائی کے لئے ماضی میں بابرکت سمجھا جاتا تھا اور ان دنوں میں فصل کی بوائی یا کٹائی کو ترجیح دی جاتی تھی آج کل اسے شرک سمجھا جاتا ہے۔

فصل کی بیماری کی تدارک کے شجری وسیلے: فصل کی بیماریوں کے لئے کئی روایتی طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ ان سے چند ایک اہم میں مندرجہ ذیل ہیں:

☆ فصلوں کی عام بیماری کو ہگرہ کہتے ہیں جس سے فصل کے بچاؤ کے لئے تعویز کروائے جاتے ہیں۔ پہلے پہل تعویز بھوج پتر پر لکھے جاتے تھے آج کل کاغذ پر لکھے جاتے ہیں۔ تعویز لکھوانے کے بعد عامل کی ہدایات کے مطابق عموماً تعویزوں کو کسی درخت کی شاخ سے باندھ کر لٹکایا جاتا ہے تاکہ وہ بلتار ہے اور اس کے اثر میں تاثیر برقرار رہے۔

☆ تعویز کے علاوہ یہاں ایک درخت پایا جاتا ہے جس کا مقامی نام چودن ہے۔ اس کے پتوں کو کسی لمبے ڈال پر باندھ کر اسے کھیت میں نصب کیا جاتا ہے۔ اسے فصلوں کو بیماریوں سے بچاؤ کا شجری وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔

☆ فصل کو زمینی کیڑوں سے نقصان مل رہا ہو تو لوگ فصل کو تازہ پانی دیتے ہیں جس سے کیڑے بہہ کر مر جاتے ہیں۔

☆ بوائی کی ابتدا میں بیج سے 5 مٹھی مکئی اٹھا کر غریبوں کو دیتے ہیں تاکہ فصل کیڑے مکوڑوں اور آفات سے محفوظ رہے۔

☆ ہل کا پھال بناتے وقت پکا کر لوہار کی دکان پر لے جاتے تھے جسے لوہار لوگوں میں تقسیم کرتا تھا۔ ہل کی یوں کے درمیان روٹی کے چار ٹکڑے توڑ کر اسے لوگوں میں بانٹتے تھے۔ (اب متروک ہے)

کھلیان سے منسوب لوک اعمال: جب کھلیان میں مکئی پڑی ہو اور

اسے منا (تولنا) باقی ہو تو اس صورت میں کھلیان میں خواتین کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ کھلیان میں لوہے اور سلور کی کسی بھی چیز کو رکھنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ مکئی منتے وقت مکئی کے ڈھیر کے گرد کالے رنگ کی رسی اور اس کے نزدیک کتا باندھنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس طرح مکئی کے ڈھیر کے نزدیک جن بھوت نہیں آ سکتے اور اناج محفوظ رہتا ہے۔

اس دوران جب مکئی منتے کا عمل شروع کیا جاتا ہے تو قریب باندھے ہوئے کتا کے سر پر ایک ٹھیکرا بھی باندھ کر رکھنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ کھلیان میں اناج منتے کے دوران کسی سے بات چیت نہیں کی جاتی۔ مزید تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ بسم اللہ سے اناج منتے کا آغاز کرنا تا کہ اناج کے ڈھیر میں برکت ہو۔

۲۔ قبلہ کی طرف رخ نہ کرنے سے پرہیز۔

۳۔ لوہے کی کوئی چیز نہ رکھنے سے پرہیز۔

۴۔ مکئی منتے کے وقت اور گرد کالی رسی باندھنا تا کہ جن بھوت اناج نہ لے جائیں۔

۵۔ اناج کے ڈھیر کے قریب کتا باندھنا اور اس کے سر پر کھپرو (ٹھیکرا) بھی رکھنا تا کہ جن بھوت ڈر کر بھاگ جائیں اور اناج کو نقصان نہ پہنچائیں۔

۶۔ اناج منتے کے دوران کسی اور سے بات کرنے سے گریز کرنا۔

۷۔ اناج منتے کے وقت کھلیان میں بچے اور عورتوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ دینا۔ کہتے ہیں عورتوں اور بچوں کے کھلیان میں داخل ہونے سے اناج کم ہو جاتا ہے۔

۸۔ اناج کے ڈھیر کے قریب سلور کا کوئی بھی برتن نہ رکھنا اور نہ چھوڑنا

۹۔ کھلیان میں پانی نہ پینا۔ پانی پینے سے مکئی کے کم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ اناج کے ڈھیر کے اوپر یعنی وسط میں گوبر کی کم سی مقدار رکھنا تا کہ نظر بد سے بچاؤ ہو؛

۱۱۔ کھلیان میں مکئی کے ڈھیر پر درانتی رکھنا تا کہ جن بھوت کا اثر اور اناج میں کمی نہ ہو۔

۱۲۔ اناج کے برتن میں ایک سینگ رکھنا تا کہ جن بھوت اناج کو چرا کر نہ لے جا سکیں۔

مال مویشیوں میں اضافہ کے لوک اعمال:

☆ پیر کے روز روزہ رکھنا تا کہ مال مویشی میں اضافہ ہو اور مال کی اموات نہ ہوں۔

☆ ہرے یعنی سبز درخت کے تنے یا شاخوں سے اپنے مویشیوں کے بال نکال کر باندھنا تا کہ ہرے بھرے درخت کی طرح مال مویشی بھی پھلتے پھولتے رہیں اور ان میں کمی نہ آئے۔

☆ فروخت کئے جانے والے مال مویشی کے چند بال نکال کر گھر میں رکھنا تا کہ ان جیسے اور مویشی گھر میں آئیں یا پیدا ہوں۔ (یہ عمل خواتین میں زیادہ ہے مردوں میں متروک ہو رہا)۔

بابرکت سمجھے جانے والے درخت، پودے

۱۔ **چھلی** (Juniperus macropoda):

اس درخت کے سوئی نما پتے دنیل لوگوں میں مقبول اور بابرکت سمجھے جاتے ہیں۔ دھمال کے دوران وہ ان کا دھواں سونگھ سونگھ کر پیشگوئیاں کرتے ہیں۔

۲۔ **چودن** (Taxus wallichiana):

اسے بابرکت پودا سمجھا جاتا ہے اور اس کے پتے فصلوں کی ایک بیماری (جسے ہگرہ کہتے ہیں) کے دوران پول پر باندھ کر کھیت میں رکھے جاتے ہیں جس سے فصل کی بیماری ختم ہوتی ہے اور اناج کو نقصان نہیں ہوتا۔

۳۔ **نمیرو/نمیر** (Rhododendron arboreum):

کے پتے دھونی کے کام آتے ہیں نظر بد اور کئی دوسری بیماریوں میں اس کے پتوں کی دھونی دی جاتی ہے۔ کہتے ہیں یہ درخت شفا بخش اور برکت والا ہے۔

۴۔ **بنی** (Quercus baloot):

کہتے ہیں قدیم دور میں اس درخت سے ماس (گوشت) پیدا ہوتا تھا اور یہ لوگوں کے طعام کا ذریعہ تھا پھر کسی کے گناہ کی وجہ سے اس نے گوشت کی پیداوار بند کر دی۔

۵۔ **پھگوئی** (Ficus palmata):

کہتے ہیں یہ جنت کا پودا ہے اس لئے مقدس ہے۔

۶۔ **جوڑی** (Betula utilis):

ماضی اور موجودہ وقتوں میں یہ تعویز کے کام آتا ہے۔

بعض موسموں میں درخت کاٹنے کی پابندی:

بہار اور خزاں میں درخت کاٹنا اچھا نہیں سمجھا جاتا اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔

☆ ہر جاندار چیز کی زندگی کا آغاز بہار میں شروع ہوتا ہے اور جاندار کے جسم میں تازہ لہو یا رس کی گردش شروع ہوتی ہے۔ (زندگی کا آغاز)۔

☆ خزاں میں درخت سے چھلکا نہیں اترتا۔

☆ جو لوگ کثرت سے درخت کاٹتے ہیں وہ مالدار نہیں ہوتے اور بے وارث مر جاتے ہیں۔

نسبی نام، گوت اور روایتی نام

کوہستان کے لوگوں میں نسبی شجرہ باپ سے چلتا ہے اور مشترکہ نظام خاندان پایا جاتا ہے۔ لوگ خیلوں اور قبائلی دائروں میں منظم ہیں۔ رشتوں کو دو اہم حوالوں سے شناخت کیا جاتا ہے ایک خون (جدی) اور دوسرا دودھ (ننھیالی)۔

ذاتوں اور خیلوں کے نسبی نام جدی حوالوں سے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تحتانی شاخوں کو بعض دوسرے حوالوں سے بھی شناخت کیا جاتا ہے اس قسم کے حوالوں کے اظہار کی بنیاد عموماً مقامات، وادیاں، قد، رنگ اور خصلت کی بنیاد ہے۔ ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کے ہاں اندرونی اور بیرونی شناخت کے دو مضبوط حوالے پائے جاتے ہیں۔ اندرونی طور پر یعنی وادی اور علاقہ کے اندر جدی شناخت کا حوالہ قوی ہے جبکہ بیرونی طور بھی ہر وادی یا علاقہ سے باہر علاقائی حوالہ جیسے:

کولو چو	کولئی کا باشندہ
پلسو چو	پالس کا باشندہ
جلکٹی	جلکوٹ کا باشندہ
کھلو چو	کھلی کا باشندہ
پٹو چو	پٹن کا باشندہ
ہربنی	ہربین کا باشندہ
بنکھڑی	بنکھڑ کا باشندہ
بٹو چو	بٹیڑہ (بٹیڑہ) کا باشندہ

علاقائی حوالوں کی شناخت بعض اوقات ضرورت کے تحت بدل بھی جاتی ہے اور اندرون وادی اس کی جگہ بستی یا گاؤں کے نام بھی لے لیتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ ایک ہی خیل یا گوت کے لوگ ایک ہی وادی کے اندر مختلف مقامات پر رہ رہے ہوں۔ اس صورت میں روزمرہ گفتگو میں جب ان کا حوالہ آتا ہے تو ان کی گوت کے ساتھ بستی یا گاؤں کے نام کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے:

پروچہ کملہ، شرکوٹی کملہ، شاٹیوال کملہ، ڈاگوال کملہ، کوٹچہ بدہ، آہوگئی بدہ، شرلوچہ ازتہ، گبروچہ ازتہ، دروچہ ازتہ۔

جدی یا نسبی شاخوں یا گروہی ناموں کی اصل بنیاد آباؤ اجداد کے نام ہیں اور ان کے چھوٹے یا بڑے قبیلوں اور گروہوں کے نام ان سے منسوب ہیں اور مقامی لسانی قواعد کے تحت ان ناموں کے ساتھ جمع کا لاحقہ لگایا جاتا ہے جیسے:

دڑمہ	دڑو مودادا کی نسل
سُرمہ	سُرو مودادا کی نسل
منکہ	منوکودادا کی نسل
کُھوکو	کُکھہ دادا کی نسل
منظریئے	منظر دادا کی نسل
منیئے	منی دادا کی نسل

ان حوالوں کے علاوہ لوگ بعض ذاتوں اور گھرانوں کو ان کے قبائلی ناموں کے ساتھ ساتھ اندرونی طور پر تحتانی سطح پر صفاتی ناموں سے بھی شناخت کرتے ہیں جیسے ژگہ ازتہ یا رگہ سلیئے (ازتہ خیل اور سلی خیل قبیلہ کے وہ گھرانے جن کے قد بڑے ہیں۔ ان کے مقابل انہی گھرانوں سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ جن کے قد قدرے چھوٹے پائے جاتے ہیں انہیں کُہ ازتہ (بونے ازتہ) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات تحتانی گوتوں کے نام رنگ کی وجہ سے بھی مشہور ہو جاتے ہیں جیسے کنہ ازتہ (کالے ازتہ خیل لوگ)۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کوہستان کی مقامی ذاتوں اور قبیلوں کے ناموں کے ساتھ خیل کا لاحقہ اس علاقہ میں یوسف زئی پٹھانوں کے اثرات سے شروع ہوا۔ والی ریاست سوات کے دور میں یعنی 39-1936 کے زمانے میں جب ان علاقوں میں ان کا عدالتی نظام رائج ہوا تو دفتری ضروریات کے تحت مقامی ذاتوں اور قبیلوں کے ناموں کے ساتھ خیل کے لاحقے استعمال کا شروع ہوا اور ہنوز دفتری کاغذات اور معاہدات میں خیل کا لاحقہ استعمال ہو رہا ہے تاہم یہ لوگ اپنی وادیوں میں جب ایک دوسرے کی شناخت کرواتے ہیں، تو اس دوران یہ لوگ خیل کا لاحقہ نہیں لگاتے۔

جدی یا نسبی حوالے ضرورت کے تحت اور بعض مخصوص مواقع کے دوران لیے جاتے ہیں اور ان مواقع کا تعلق قدرتی وسائل کی تقسیم، علاقائی دشمنیاں یا دفاع اور دوسرے اہم مواقع ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدی اور نسبی حوالے موقع کی مناسبت سے لئے جاتے ہیں جیسے اگر وادی کی سطح کے دو بڑے گروہوں کا جرگہ یا

شناخت کرنی ہو تو پھر ڈمہ، کھکہ منکہ، منئی، منظریئے پکارا جائے گا اور اگر جرگہ یا معاملہ ذیلی گروہ کا ہے تو پھر بڑے گروہ کے اندر پائی جانے والی تحتانی شاخوں کا حوالہ لیا جائے گا جیسے سُرمہ، پھڑیئے، درکھنہ، بھوئے مگلہ۔ اس کے بعد خیلوں کی سطح آجاتی ہے اور اگر خیل کے اندر پائی جانی والی چھوٹی شاخوں کو شناخت کرنا ہو تو پھر متعلقہ شاخ کے اہم سربراہ کے نام وغیرہ سے شناخت کیا جاتا ہے

یہاں ایک اور بات کا ذکر ضروری ہے۔ کوہستان میں جدی یا نسبی گروہی ناموں کے ساتھ ساتھ علاقائی گروہی حلقے بھی پائے جاتے ہیں۔ ان حلقوں کی تشکیل جدی یا نسبی رشتوں کی بجائے عام طور پر گروہی کہا جائے گا کیوں کہ ان کی تشکیل میں پائے جانے والے لوگ مختلف ذاتوں یا نسبی دائروں کے ہو سکتے ہیں یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ غیر نسبی چھوٹی ذاتوں کے لوگ قدرتی وسائل کی تقسیم، حصول اور دفاع کے لئے دوسرے بڑے دائروں یا سلسلوں میں ضم ہو جاتے ہیں۔

ناموں کی تحریم: یہ لوگ پڑدادا، دادا و دادی اور نانا و نانی یا باپ، چچا، ماموں وغیرہ کا نام بعض کی قریبی پیڑیوں میں نہیں رکھتے اور اسے رسمی اور روایتی طور پر بے ادبی اور گستاخی سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلی نسل کے لوگ دوسری نسل کے افراد سے ہر لحاظ سے فکری، جسمانی، روایتی اور احترامی طور پر مقدم ہوتے ہیں۔

یہ لوگ ان قریبی رشتہ داروں کے ناموں سے بھی گریز کرتے ہیں جو حال ہی میں فوت ہوئے ہوں۔ مائیں اپنے فوت شدہ بچوں کے نام بعد میں پیدا ہونے والے بچوں کو نہیں دیتیں ان کا خیال ہے کہ اس طرح مرے ہوئے بچوں کے اثرات سے ان کے زندہ بچے متاثر ہوتے ہیں۔

بڑوں کا نام لینے کی تحریم: روایتی طور پر اپنے بڑوں کے نام بھی عزت سے لیے جاتے ہیں۔ باپ دادا، نانا نانی، چچا، ماموں اور ان کی بیویوں کے نام نہیں لیے جاتے۔ کسی محفل میں اگر کسی سے اس کے باپ کا نام پوچھا جائے تو وہ نہیں بتائے گا بلکہ اس کے قریب بیٹھا ہوا کوئی بھی شخص اس آدمی کے باپ یا دادا کا نام بتائے گا۔ اسے طرح میاں بیوی ایک دوسرے کا نام زندگی بھر نہیں لیتے اور نہ سنا گیا ہے۔

شگال (منحوس) ناموں کا امتناع: خواتین میں یہ اعتقاد بھی پایا جاتا ہے کی ایسے افراد کے نام اپنے ہونے والے بچوں کے نہ رکھے جائیں جن کی عملی زندگی لوگوں کے نزدیک منحوس یا ناکام گزری ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح ان ناموں سے وابستہ افراد کا گزشتہ زندگی کا اثر بعد کے افراد بھی پڑ سکتا ہے جن کو ان کے نام دیئے جائیں۔ ایسے افراد سے اس وقت اکثر کترا کر گزرنے کی کوشش کی جاتی ہے جب کوئی کسی خاص مقصد، مہم یا دُور کے سفر پر روانہ ہو رہا ہو۔

مَردوں میں ناموں کا رجحان: کوہستان میں مردوں کے ناموں میں بہت زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ جو مروجہ مقامی نام پائے جاتے ہیں ان میں درج ذیل مشہور ہیں:

پھلوں کے نام: مردوں کے کئی نام ایسے پائے جاتے ہیں جو کہ پھلوں سے تعلق رکھتے ہیں ان ناموں میں دنو (انار) کا نام زیادہ مشہور ہے۔ اس کے علاوہ پلو (سیب)، بُنگ (ناشپاتی)۔

درختوں کے نام رکھنے کا رواج: کئی افراد کے نام درختوں کے ناموں سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کا بھی رواج پایا جاتا ہے۔

پرندوں کے نام: پرندوں کے نام مردوں اور عورتوں سبھی میں پائے جاتے ہیں جیسے گُولو (کبوتری)، لکسو (چکور)، جُچیل (دان گیر)، طوطا وغیرہ۔

جانوروں کے نام: بعض نام ایسے بھی ملتے ہیں جو کہ جانوروں سے تعلق رکھتے ہیں اور مردوں میں ایسے نام رکھنے کا رواج پایا جاتا ہے جیسے اجھو (کم عمر کا ریچھ کا بچہ)، اُچھینی (ریچھنی) وغیرہ،

متفرق نام: بعض لوگوں کو کبھی حقارت اور کبھی پیار سے ایسے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے جو کہ جانوروں یا پرندوں یا اُن کی خصلت سے تعلق رکھتے ہوں جیسے شُوانٹی (کُتیا)، کُھتر و (بلا)، اجھو (ریچھ کا بچہ)، گُولو (کبوتری)، بعض لوگوں کو ان کی شکل، خاصیت، رنگ یا عادات کی وجہ سے بھی یا تو مستقل نام دیئے جاتے ہیں یا پھر موقع مناسبت کے تحت پکارا جاتا ہے۔ ان میں یہ مشہور ہیں۔ گلو، ڈوٹھو، کھپئی، نوتھو دو یالو، جراٹی، جرٹوئی، نوتھو جھورو (ناک بہنے والا)، کِکل، جُدر، کون بل (لمبے کانوں والا)، کون بلو، ڈگرو (پتلا اور لمبا)، ٹنگو (جس کی کمر جکی ہو)، کھٹو (ڈھنا) چاند، تارا عورتوں میں یُون (چاند) اور مردوں میں تارو (تارا) کے نام کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مردوں کے روایتی نام: دَنو، تارو، کھیندا، طالع زر، انار، اِجھو، شدگا، لکشمیر، وڑدمو، کُھوکو، منک، کورٹ، پوئینس، پھیرو، سُردم، تولو، بدو، جل کھان، جُمل کھان، مُل کھان، شر کھان، مُلتان، نمدار، یُدن، لکھوئی، شمشیر، پنک،

شمت، سلی، سُبشا، ثمر شا، سرشا، گھوتر، بور کھان، اُتل، بُجا، کلمدر، دم سنگ، بوٹی سنگ، بگے، مُنگل، اُشر، زمر شا، دنشا، بلسن، ہمَن، سَمَن، زربیان، پنجُلو، شونٹ، ہرزالی، جلدات، گنی، ہریپ، مُرُو، خَنیا، نسر، پردات، ہرباب، شونیا، سری، نارانگ، وجا، فیا، کُتو، سدتی، خواص، لال خان، کاچو، سون گلی، شامل، تھاپا، مریاز، بھلا، حجاب، مہباب، حُباب، مُنشی، شیرویا، غانٹول، پوشُن، گچے، ہجم خان، مَیونر، گدل، گنڈیا، مسر کھان۔

خواتین کے روایتی نام: پلوئی، گُرولی، کلسو، بولیس، گلٹی، لوبان، یون، غمائی، کھٹو، لوٹو، دیونی، مسرو۔

چند متفرق روایتی سزائیں

چور: کوہستان میں چور کے اصطلاحی معنی سے مراد وہ مرد یا عورت ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ غیر شرعی مراسم کے مرتکب پائے گئے ہوں۔ یہ رسم سندھ کی کاری اور سرحد کی تور کے مترادف ہے اور اس کی روایتی سزا موت ہے۔ اس کا اطلاق شادی اور غیر شادی شدہ سبھی پر ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سزا کی ترتیب اور حقوق میں کمی بیشی مشاہدہ میں آئی ہے۔

چور مرد اور عوت دونوں کا جرم ایک جیسا تصور کیا جاتا ہے اور اس جرم میں مارے جانے والے مرد یا عورت کا کوئی بدلہ نہیں ہوتا خواہ ان کے جرم کی بنیاد سچ پر ہو یا جھوٹ پر۔ چور مرد یا عورت اسی صورت میں بچ سکتے ہیں جب وہ دوران حملہ بچ کر بھاگ جائیں یا پھر وہ یہ یقین کرلیں کہ اب ان کو مارا جائے گا اس صورت میں دونوں بھاگ جاتے ہیں تاہم خاتون کے وارث ہمیشہ اس کا پیچھا کرتے ہیں اور جونہی ان کے ہاتھ دونوں یا ایک چڑھ جائیں مار دیتے ہیں۔ اگر مرد مارا جائے اور عورت بچ جائے اور بعد میں وہ کسی سے شادی کرلے تو تب بھی دونوں کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ وادی کے اندر اگر موت کی سزا دینے کا معاملہ ہو اور خاتون شادی شدہ ہو اور اس کے والدین کا گھر قریب ہو تو پھر موت کی سزا دینے کے حقوق شوہر اور خاتون کے بھائیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں خاتون کو اس کا حقیقی بھائی ہی سزا دے سکتا ہے شوہر نہیں۔ یہ الگ بات کہ دونوں گھرانوں کے تعلقات کشیدہ ہوں تو پھر شوہر اپنی بیوی کے بھائی کو یہ حقوق نہیں دیتا اور خود استعمال کرتا ہے۔ بعد صورتوں میں یہ حقوق حقیقی دیور یا سُسر کو بھی منتقل ہوتے ہیں۔

ماضی کے واقعات اور شواہد کی بنیاد پر چور مرد اور عورت کی سزا میں امتیازی فرق پایا جاتا ہے۔ چور مرد کو موقع پر ہی گولی ماری جاتی ہے یا پھر جو بھی ہتھیار موجود ہو اس سے کام لیا جاتا ہے۔

چور جوڑے کو روایتی طور پر علاقہ میں پناہ نہیں دی جاتی البتہ وہ چند دنوں کے لئے پناہ لے سکتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ وادی سے چلے جانے تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ چور جوڑے کو قتل کروانے کے لئے روایتی طور پر جاسوس یا رشوت کا لین دین ہوتا ہے۔ تاہم اس کا راز افشا نہیں کیا جاتا۔ ماضی میں چور جوڑوں کی صلح کی مثالیں نہیں ملتیں تاہم زمانہ قریب میں صلح کی مثالیں مل رہی ہیں۔ موجودہ دور میں چور کی صلح کے لئے کم سے کم دو سے چار تک لڑکیاں اور لاکھ سے دو لاکھ تک روپے دیئے جاتے ہیں اور ساتھ ایک بیل بھی لایا جاتا ہے۔ صلح کے بعد جرگہ کا کھانا کیا جاتا ہے۔

اگر چور عورت قتل ہو چکی ہو اور مرد کی صلح کی جائے تو اس صورت میں عورت کے وارثوں کو ساز دینا پڑتا ہے یہی صورت مرد کی ہے۔ اسے پاک تھون (صاف کرنا) کہتے ہیں۔ روایتی طور پر اس قسم کی صلح کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔

کنڈرے چور: کسی عورت پر آئینہ کا عکس مارنا، سر سے چادر کھینچنا، گالیاں دینا، عزت پر ہاتھ ڈالنا، گھر سے خواتین کی اشیاء یا کپڑے چرا کر لے جانا، گھر کا تالا، دروازہ یا دیوار توڑنا وغیرہ جیسے جرم کرنے والا مرد یا جوان کو رواجی طور پر کنڈے چور کہا جاتا ہے۔ وادی کوئی میں اسے چھپریئے چور (چادر کا چور) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے جرم کی روایتی سزا زخمی کرنا ہے۔ زخمی کرنے کا ایک تسلیم شدہ طریقہ یا قاعدہ پایا جاتا ہے اور اس سے تجاوز کا بدلہ لیا جاتا ہے۔

ایسا جرم جس سے سرزد ہو جائے تو وہ فوری طور پر گاؤں چھوڑ دیتا ہے یا چھپ جاتا ہے (یا اگر زیادہ قوی ہے تو کہیں نہیں جاتا) اور اس کے بعد کسی ایسے خاندان کا فریادی بن جاتا ہے جو لڑکی یا خاتون کے گھرانے کے زیادہ قریب ہو یا اس گھرانہ سے یارانہ کا رشتہ ہو۔ اس کے بعد وہ لوگ متعلقہ گھرانے سے رابطہ کرتے ہیں اور کوشش کے بعد فریاد قبول کی جاتی ہے اور کچھ عرصہ بعد اس کی صلح عمل میں لائی جاتی ہے۔ تاہم جس مرد یا جوان لڑکے نے جرم کیا ہوتا ہے اسے روایتی سزا دی جاتی ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ صلح کروانے والا شخص مجرم کی ٹانگ پر موٹا سا اونی کپڑا باندھ کر اس کی ٹانگ خاتون کے بھائی، خاوند یا باپ کے سامنے کرتا ہے اور وہ لوہے کے بڑے ہتھوڑے جسے یہ لوگ پُلگ کہتے ہیں سے صرف ایک وار کرتے ہیں۔ اس سے خواہ جتنا زخم آئے یا ٹانگ ٹوٹ جائے یہ اس جرم کی سزا ہے۔ اس کے علاوہ جب

جرگہ میں مجرم کو درگزرانے لئے لایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ایک بیل یا بڑی عمر کا بکرا بھی لایا جاتا ہے اگر صلح ہو جائے تو اگلے روز لائے گئے جانور کو ذبح کر کے جرگہ کے لوگوں کو کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔

گزشتہ سالوں میں کنڈرے چور کی روایتی سزا میں تجاوز کی مثالیں سامنے آئی ہیں اور ایسے افراد کے کان کاٹے گئے ہیں تاہم جن افراد کے کان کاٹے گئے ہیں انہوں نے ابھی تک اس سزا کو تسلیم نہیں کیا اور ہنوز تنازعات باقی ہیں۔

قتل: رواجی طور پر قتل کا بدلہ قتل ہے۔ اور بعض اوقات ایک متنازعہ قتل کی وجہ سے کئی کئی قتل ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کئی گھرانے وادیوں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ آج کل تھانہ اور کچہری بھی موجود ہے۔ تاہم عدالت کسی کو قتل کے جرم میں بے قصور قرار بھی دے تو رواجی بدلہ ختم نہیں ہوتا۔

جوبل (زخمی): بندوق کی گولی سے زخمی ہونے والے کو جوبل کہا جاتا ہے اور یہ آدھے قتل کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا بھی بدلہ لیا جاتا ہے اور بعض اوقات صلح ہو جاتی ہے۔

سُسپھوٹون (سر توڑنا): لڑائی جھگڑے میں اگر کسی کا سر توڑ دیا جائے اور خون بہہ جائے تو اس کا بدلہ لینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ وادی پٹن میں کسی کا سر توڑنا ایک سخت قسم کا جرم سمجھا جاتا ہے۔

نوتھودویون: خواتین کی بے حرمتی یعنی چادر کھینچنا، گالی دینا، راستہ روکنا، گھسیٹنا یا اس پر آئینہ کا عکس مارنا جرم ہے۔ اور اس کی سزا میں آج کل ناک کاٹنے کا رواج چل رہا ہے۔ اس جرم کی روایتی سزا ٹانگ توڑنا ہے۔

سورہ: کسی قتل کے قصاص جسے یہ لوگ ساز کہتے ہیں میں جو لڑکی دی جاتی ہے اسے سورہ کہا جاتا ہے اور یہ پختونوں میں بھی عام ہے۔ اس کے دینے سے دونوں گھرانوں میں دشمنی ختم ہو جاتی ہے۔ سورہ میں ملنے والی لڑکی کا مقام ابتدا میں قابل رحم ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے حالات نرینہ اولاد کی پیدائش کے بعد بدلتے جاتے ہیں۔

سوال: سوال کے معنی بھیک کے مترادف ہیں۔ جب کسی کی دشمنداری میں صلح ہو جاتی ہے اور اسے بھاری رقم دینا پڑتی ہے تو وہ وادی کے لوگوں سے سوال کرتا ہے اور مقامی لوگ حسب توفیق اس کی مالی مدد کرتے ہیں۔ مالی امداد کا یہ تصور قدیم عرصہ سے رائج ہے۔

آواز: کسی بھی غیر منگنی شدہ لڑکی پر آواز کے معنی فلاں کی لڑکی میری بیوی ہے کا دعوا ہے۔ ایسی آواز شدہ لڑکی کو کوئی بھی دوسرا آدمی بیاہ کر نہیں لے جا سکتا۔ خاندانی طاقت پر اس کے فیصلہ کی راہیں کھلتی ہیں کچھ لے جاتے ہیں اور کچھ اپنے دعوا سے دست بردار ہو جاتے ہیں جس کے لئے انہیں کوئی اور رشتہ فراہم کیا جاتا ہے۔

در: در کے معنی اپنی غلطی کا اعتراف اور مخالف کے آگے جھکنے کے ہیں۔ جرم کی نوعیت کے مطابق جرگہ قصوروار فرد سے در کرواتا ہے۔ در کے لئے بیل یا بکرا لے کر جانا پڑتا ہے بعض اوقات بیل یا بکرے کے ساتھ نقد رقم بھی دی جاتی ہے۔

اقالہ: اقالہ کے معنی کسی کئے گئے فیصلہ کو توڑنا یا اس سے انکار کے ہیں۔ کسی دشمنی یا تنازعہ کے فیصلہ کے بعد جب ایک فریق فیصلہ کی شرائط سے ہٹ جائے تو دوسرا اس صلح کو توڑنے کا اعلان کرتا ہے۔ اسے مقامی سطح پر اقالہ کہتے ہیں۔

بدلہ: قتل کے بدلوں میں کم عمر لڑکوں کو قتل نہیں کیا جاتا اس کے ساتھ ساتھ خواتین کے ساتھ بھی کوئی بدسلوکی یا بداخلاقی کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ صرف بالغ مرد یا لڑکے سے اس قسم کا بدلہ لیا جاتا ہے۔

لیل حرتھون: لیل حرتھون کا معنی خون چھڑکنا ہے۔ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ جب بھی کوئی مصیبت آئے تو کسی جانور یا مرغ کو ذبح کر کے چھوٹی یا بڑی خیرات دی جائے تو اس سے آفات میں کمی آتی ہے۔ اس کے لئے زیادہ تر باکرہ جانور استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ عمل شدید بیماریوں اور شدید زخمی لوگوں کے بچاؤ کے لئے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ خواتین کا کہنا ہے کہ اپنے دروازہ پر خون چھڑکنے (کچھ ذبح) کرنے سے آفات سے نجات ہوتی ہے۔

تولی: ان لوگوں میں قرعہ اندازی کا رجحان عام ہے۔ پرانے وقتوں میں زمینوں، جنگلات وغیرہ کی تقسیم کے دوران قبیلوں اور گروہوں میں قرعہ اندازی کی بنیاد پر قدرتی وسائل تقسیم کئے جاتے تھے۔ آج کل بعض اوقات سیاسی فیصلہ جات یا آمادگی کے لئے بھی قرعہ اندازی کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر ہونے والا فیصلہ سبھی کو منظور ہوتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاتا۔

میاں بیوی کا اکٹھے کھانا کھانا: گھر کے مردوں اور عورتوں کا اکٹھے کھانا کھانے کا رواج نہیں۔ ان کے خیال میں جو مرد عورت کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں ان کا قرعہ نہیں نکلتا۔ قرعہ اندازی یہاں کا ایک اہم ہتھیار ہے۔

روایتی ویش، کاشت کاری، مقامی کھانے اور مشروبات

ویش: کوہستان میں سو سے ڈیڑھ سو سال قبل تک املاک کا ملکیتی نظام عوامی تھا اور انفرادی ملکیت ناپید تھی۔ اس دور میں زرعی زمینیں اور زیریں چراگاہیں تین سے پانچ سال کی مدت کے لئے مختلف قبیلوں، گروہوں اور خاندانوں میں ایک خاص تناسب سے بانٹ دی جاتی تھیں۔ جب یہ مدت پوری ہوتی تو زرعی زمینوں کی از سر نو عوامی تقسیم عمل میں لائی جاتی۔ زمین کے ساتھ ساتھ گھر بھی تبدیل ہو جاتے تھے۔ تاہم اس میں ایک بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ خیلوں اور تحتانی گروہوں کو ایک ہی علاقہ میں زمینیں دی جائیں تا کہ ان کی قوت اور اتحاد برقرار رہے۔ آج کل چراگاہیں اور چوبی جنگلات قبیلوں کی مشترکہ ملکیت ہیں جب کہ زرعی زمینیں انفرادی ملکیت میں دی جا چکی ہیں۔ اس قسم کا نظام پورے ضلع کوہستان میں رائج رہا ہے۔ سُن نظام ویش میں جو حصہ داری ملتی ہے اسے باگوٹلو کہا جاتا ہے۔ مقامی قدرتی وسائل کی حصہ داری میں صرف سُن، یشکن اور کمین ذاتیں شامل ہیں ان کے علاوہ کسی دوسری ذات کے کسی بھی فرد کو یہ حقوق حاصل نہیں۔

اقسام ویش: کوہستان میں ویش کی تین روایتی اقسام پائی جاتی ہیں۔ ایک ٹنگ ویش، دوسری ہور ویش اور تیسری مُشبگو۔ ان میں ٹنگ اور ہور ویش کا طریقہ زیادہ مستعمل رہا ہے اور مشبگو کا طریقہ بعض مخصوص حالات یا واقعات کے تحت عمل میں لایا جاتا ہے (رازول، 1998ء، صفحہ 100)۔ اس کی روایتی تفصیل نیچے دی جاتی ہے۔

ہور ویش: ہور ویش کے اصول کے تحت قبیلوں یا تحتانی شاخوں میں پائے جانے والے افراد کی تعداد کو گنا نہیں جاتا بلکہ املاک کو نصف نصف اصول کے تحت کسی قبیلہ یا گروہ کی دو شاخوں میں بانٹ دیا جاتا ہے اور وہ اسی اصول کے تحت اگلے مراحل میں اپنی تحتانی شاخوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ہور کے معنی نصف کے ہیں۔

ٹنگ ویش: اس طریقہ میں نصف تقسیم کے اصول کے برعکس قبیلوں میں افراد کی تعداد پہلے معلوم کی جاتی ہے اور اس کے بعد تعداد کے حساب سے زرعی زمینیں یا دوسری املاک تقسیم کی جاتی ہیں اگر ایک قبیلہ کے ایک ہزار آدمی ہیں اور ان کے پاس ایک ہزار باگو (حصہ) ہیں تو انہیں اتنا ہی ملے گا اور اس کے مدمقابل دوسرے قبیلہ کے افراد کی تعداد بارہ سو ہے تو اسے بارہ سو حصے ملیں گے۔

مُشبگو: مشبگو کے معنی صرف بالغ مرد کا حصہ ہے۔ یہ کم حالات میں زیر استعمال رہا ہے۔ اس کے تحت لوٹی ہوئی املاک، مال یا قلانگ (ٹیکس) کی آمدن صرف بالغ مرد کو دی جاتی ہے جو کسی خاص مہم میں شامل رہے ہوں۔ مشبگو میں عورتیں اور بچے حصہ دار نہیں ہوتے۔

مقداری اصول: سُن نظام ویش میں مرد اور عورت کی حصہ داری کی ساخ داری میں مقداری امتیاز پایا جاتا ہے۔ امتیاز کی وجہ مذہبی نہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی ہے۔ تاریخی طور پر اس میں ترمیم و اضافہ کا عمل جاری و ساری رہا ہے جسے باگو اور ٹنگو کا نام دیا گیا ہے۔

باگو: بالغ مرد کا حصہ باگو کہلاتا ہے۔ تاریخی طور پر مرد کی جسمانی و دفاعی اہمیت عورت سے زیادہ رہی ہے اس لئے وہ عورت سے زیادہ کا حقدار رہا ہے۔ عورت اور مرد میں پایا جانے والا یہ امتیاز مختلف قوموں اور ذاتوں میں موجود رہا ہے۔ ایک مرد کا ایک باگو ہوتا ہے اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔

ٹنگو: نابالغ بچے اور عورت کا حصہ ٹنگو کہلاتا ہے۔ تاریخی طور پر ٹنگو باگو کا نصف نہیں رہا کیوں کہ اس کی قدیم شکل چار ٹنگو مساوی ایک باگو کے ملتا ہے گویا قدیم شکل میں ایک ٹنگو باگو کا چوتھائی حصہ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار سے بارہ سو عیسوی تک ایک باگو چار ٹنگو کے برابر تھا۔ 1500 عیسوی میں ایک کی مقدار تین ٹنگو مساوی ایک باگو، 1800 عیسوی میں دو ٹنگو ایک باگو کے برابر تھے۔ جون 1992ء میں دڑمہ گروہ کے تحتانی سُرمہ قبیلہ نے ٹنگو کی مقدار ختم کر کے بالغ مرد، عورت اور بچوں کو ایک ایک مساوی باگو کا حقدار قرار دیا تب سے اب تک اسی پہ عمل ہو رہا۔

عورتوں کے روایتی وراثت (حصہ) کی منتقلی: غیر شادی شدہ عورت کی روایتی حصہ داری ماں باپ کے قبیلہ کے حلقہ میں ہوتی ہے۔ شادی کے بعد اس کے روایتی حصہ کے حقوق شوہر کے قبیلہ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اگر شوہر وفات پائے اور وہ اکیلی ہی رہ جائے اور ماں باپ یا بھائیوں ہی کے پاس کیوں نہ رہے اس کے حقوق شوہر ہی کے قبیلہ میں قائم رہتے ہیں تا آنکہ وہ کسی اور شاخ یا قبیلہ میں دوسری شادی نہ کرے۔ ایسا کرنے پر اس کے حقوق ویش دوسرے شوہر کے قبیلہ یا خیل کو منتقل ہو جاتے ہیں۔

کھیت کی روایتی پیمائش: مقامی سطح پر بندوبست اراضی نہیں اس لئے آج تک لوگ اپنی زمینوں کا حساب باگو اور رٹ کی مقدار یا پیداوار سے لگاتے ہیں۔ زرعی زمین کا ایک خاص حصہ رٹ کہلاتا ہے۔ ایک رٹ میں کتنی کھیتی باڑی کی زمین ہوتی ہیں اس کا حتمی فیصلہ نہیں پایا جاتا کیوں کہ رٹ کا تعین حصوں سے ہوتا ہے کسی زرخیز زرعی زمین کے ایک رٹ میں چالیس حصے ہو سکتے ہیں اور کسی کم زرخیز زمین میں بیس حصے۔ زمین کے یونٹوں کو مرحلہ وار ہور، رٹ اور رٹو میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ زرعی زمین جب قبیلوں کو ہور ویش کے تحت حاصل ہوتی ہے تو وہ اگلے مرحلہ میں اسے رٹ میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک بڑی ہور کو رٹوں میں تقسیم کرنے سے بانٹنے کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ عام رٹ میں بارہ سے سترہ تک باگو ہو سکتے ہیں۔ ہور، رٹ اور رٹو کی جدید پیمانوں کے مطابق تقابلی پیائش نہیں کرائی جا سکی اور یہ بتانا مشکل ہے کہ ایک رٹ میں کتنی زمین ہوتی ہے۔ (رازول، 1998، صفحہ 102، 103)

پیچیدگی: مقامی سطح پر ویش کا نظام ملکیت انتہائی پیچیدہ پایا جاتا ہے اس میں اتنی باریکیاں موجود ہیں جنہیں آسانی سے سمجھنا کافی مشکل کام ہے۔

روایتی نہری حقوق: ویش میں ملنے والی زمین کے ساتھ ساتھ نہری پانی کے تمام حقوق متعلقہ خاندان کو منتقل ہو جاتے ہیں اور یہ کسی بھی صورت میں ساقط نہیں کیے جا سکتے۔ نہر کی مرمت کے ذمہ دار مالکان خود ہوتے ہیں۔

ویش گر: ویش گر کے لفظی معنی بانٹنے والا ہے تاہم اصطلاحی معنی میں اس معزز بزرگ کو ویش گر کہا جاتا ہے جو لوگوں میں زرعی زمینیں، جنگلات اور دوسرے قدرتی وسائل کی تقسیم متعلقہ قبیلہ پاذات کے متعین اصولوں یا رواج کے مطابق عمل میں لائے۔ کوہستان میں کوئی ڈیڑھ سو سال قبل تک زرعی زمینیں لوگوں کی اجتماعی ملکیت ہوا کرتی تھی اور ہر پانچ سال بعد ان زمینوں کو از سر نو ایک متعین اصول کے تحت لوگوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ تقسیم کی ذمہ داری جو شخص ادا کرتا اُسے ویش گر کہا جاتا تھا۔ وادی پالس میں جو مشہور ویش گر گزرے ہیں ان میں خواص دادو لال دادو اور سدقی دادو کا نام سرفہرست ہے۔

نظام ویش کے اثرات:

☆ نظام ویش سے قرابتی اور علاقائی اتحاد، شناخت اور علاقائی سماجی سیاست کو تحرک رہتی ہے جس سے گروہی تنظیمی دائروں میں مسابقت کا عمل تیز ہوتا ہے۔

☆ معاشی استحکام کے لئے مربوط ضوابط کا اجراء ہوتا ہے۔

☆ اس نظام کے تحت گروہ اور گھرانوں میں قدرتی وسائل کی ایک جیسی تقسیم عمل میں آتی ہے۔

☆ گروہی دائروں میں صف بندی اور مربوط مشاورتی نظام عمل وجود میں آتا ہے اور فعالیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

☆ اس سے گروہی انحصاری بڑھتی ہے اور مضبوط صف بندی سے علاقائی دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے۔

☆ لوک اداروں کو مربوط علاقائی مشاورت کے لئے عوامی پلیٹ فارم مہیا ہوتا ہے جہاں اراکین اپنے مثبت یا منفی خیالات اور تجربات کا اظہار کرتے ہیں۔

☆ معاشی و اقتصادی بندوبست عمل میں لایا جاتا ہے۔

☆ اس کے شراکتی عمل سے گروہی جمہوری رویئے فروغ پاتے ہیں اور علاقائی سطح پر آمریت کا راستہ روکنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ موسمی نقل مکانی اور قدرتی وسائل کے مناسب استعمال کے لئے ماحولیاتی علاقے مختص کیے جا سکتے ہیں جس سے گلہ بانی کی معیشت کو استحکام ملتا ہے۔

☆ آبپاشی کے لئے بہتر اور مضبوط نظام معرض وجود میں آتا ہے مل جل کر کام کرنے سے بغیر معاوضہ کے کم وقت میں زیادہ کام ہوتا ہے۔

فصلیں

مَکئی (مکی): کوہستان میں مکئی کو بنیادی فصل کی حیثیت حاصل ہے۔ علاقہ پہاڑی ہے اس لیے مختلف زرعی ماحولی منطقوں میں مختلف اقسام کی مکئی کے بیج کاشت کئے جاتے ہیں۔ بلند زرعی مقامات پر تخو (گرم) بیج کی کاشت کی جاتی جو سرد علاقوں میں اکتوبر تک کٹائی کے قابل فصل تیار کرتا ہے۔ اس کا رنگ پیلا ہوتا ہے اسے لوگ پیلی مکئی کا نام دیتے ہیں۔ اس کا آٹا کھانے میں سخت ہوتا ہے اور ناواقف افراد کے ہونٹ متاثر ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگ سفید مکئی کے بیج کو پسند کرتے ہیں یہ کم نچلے علاقوں میں کاشت کیا جاتا ہے۔

گُوم (گندم): گندم یہاں کی دوسری اہم فصل ہے جو زیادہ تر زیریں گرم علاقوں میں کاشت کی جاتی ہے۔ کوئی تیس سے چالیس سال قبل بلند چراگاہوں اور وسطی جنگل میں کابلی گوم نام کی گندم کاشت کی جاتی تھی جو بعد میں ترک کر دی گئی۔ اس گندم کا رنگ کالا ہوتا تھا۔ آج کل گندم کی کاشت کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے

یو (جو): جو اُگانے کا رواج پہلے زیادہ تھا۔ لوگ اناج اور چارہ دونوں مقاصد کے لیے جو اگاتے تھے۔ آج کل اناج کے مقصد کے لیے نہیں اگاتے بلکہ چارہ کے لیے اگاتے ہیں۔

بیؤں (چاول): چاول کی کاشت بھی پہلے زیادہ تھی آج کل بعض مقامات کے اکادکا لوگ چاول کاشت کرتے ہیں۔

سُوئی (باجرہ): اس کی کاشت پہلے پہل عام تھی مگر پچھلے تیس سالوں سے بالکل ختم کردی گئی ہے۔ اسے بہت حقیر فصل سمجھا جاتا تھے۔ ایک اکھان ہے کہ کسی کو سُوئی کے نرخ کا بھی نہ سمجھنا (یعنی بہت حقیر سمجھنا)۔

گھنار: یہ فصل کم مقدار میں مکئی کے ساتھ کاشت کی جاتی ہے۔ اس کے باجرہ کی طرح چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے ہیں۔ اس کا انگلش نام Amaranthus ہے۔

موٹا (لوبیا): لال لوبیا زیادہ اور سفید لوبیا کم مقدار میں مکئی کی فصل کے ساتھ کاشت کیا جاتا ہے۔ لال لوبیا کو مقامی سطح پر زیادہ اہم اور منافع بخش سمجھا جاتا ہے۔ سردیوں میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ چاول اور لوبیا کو ملا کر پکانے کا رواج پایا جاتا ہے۔

گُلت: اس کی کاشت مکئی کے ساتھ کی جاتی ہے اور ستوں بنانے کا عام رواج ہے۔ گدھوں کو بھی کھلاتے ہیں تا کہ طاقتور ہوں۔

آلو: کوہستان کی بعض وادیوں اور بالائی مقامات پر دیسی قسم کے آلو کی فصل کاشت کی جاتی ہے جس سے گھریلو ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔

جنگلی سبزیاں: کوہستان کے وسطی اور بالائی مقامات کے لوگ جنگلی سبزیوں (ساگ) سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ بے شمار اقسام کے ساگ پکانے اور خشک کر کے سردیوں میں استعمال کا رواج عام ہے۔ سب سے زیادہ جو جنگلی سبزی خشک کی جاتی ہے اس کا نام کڑی (کشمیری میں کنجی) ہے جو دوسرے ساگ پکائے جاتے ہیں ان کے مقامی نام یہ ہیں:

کڑی (کنجی)، ڈومی، لیو، گھناری، رُکالی، تلہرا، زروخل، ہوبوبل، پلون، جمبی، مکوچ، لُکن، پھیل، جلجالی، چکی، کوڑو، بھو، کھگیو، بھنکے، ہوں، ہرولو، گُماری، پھگوئی، کونڈیرو، زین، کنگوں اچھیئے، لیلیو۔

ایسی سبزیاں جو مقامی سطح پر بازار سے خریدی جاتی ہیں یا جن کے بیج لا کر یہاں اُگانے کا رواج فروغ پا رہا ہے ان میں آلو، ٹماٹر، مرچ، بھنڈی، توری، بینگن، مولی، شلغم وغیرہ شامل ہیں۔

جنگلی میوہ جات: کوہستان میں خودرو جنگلات پائے جاتے ہیں جن میں کئی اقسام کے جنگلی میوہ جات پائے جاتے ہیں ماضی میں لوگوں کا انحصار انہی جنگلی میوہ جات پر ہوتا تھا۔ یہاں مندرجہ ذیل جنگلی میوہ جات پائے جاتے ہیں:

گورتہ، چودن، گُراچھ، تُوندل، شِینٹھل، دَنُو، مکئیر سہ، کھیانر، جوروٹہ، سِنگائی، تھولس! ے کلن، کنی رُچ، ہرگلن، پھگوئی، مروچ، شگلو، لُنی، پلوئے، جوگلوٹہ وغیرہ۔

وادی ہربین کے علاوہ یہاں پھلوں کے باغات لگانے کا رواج بہت کم تھا۔ 1995ء کے بعد سے یہاں اس قسم کے باغات لگانے کا رواج شروع ہوا ہے۔ اب سیب، ناشپاتی، خوبانی، آڑو، آلو بخارے، آلوچے اور چیری کے چھوٹے چھوٹے باغات نظر آرہے ہیں۔

خوراک/اشیاء کی تاثیر: لوگوں کی سوچ (persiption) میں ہر پودا یا کھانے والی چیز تین تاثیروں سے خالی نہیں ہوتی ایک گرم، دوسری سرد اور تیسری زہر کی تاثیر۔ بیماری میں خوراک یا کھانے والی اشیاء میں اس قسم کی تاثیر کے مثبت یا منفی اثرات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

ہشر: کوہستان کے لوگوں میں ہشر کا روایتی نظام پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہشر کے تحت کھیتی باڑی، گھاس کی کٹائی، مساجد، نہریں اور راستوں کی تعمیر کا کام مل جل کرتے ہیں۔ گھروں کی لپائی اور گوبر پھیلائی کے لیے عورتوں کی ہشر بھی ہوتی ہے۔

زرعی کاموں کی روایتی تقسیم

کام	مرد	عورت	بچے	ہشر
کھیتوں کی دیواروں کی مرمت	☆	-	-	-
گوبر کی پھیلائی	-	☆	-	☆ (خواتین کی)
روڑے نڑائی	-	☆	☆	☆
ابتدائی ہل چلائی اور بوائی	☆	-	-	☆
گوڈی کرنا	☆	☆	-	☆

فصل کو پانی دینا	☆	-	-	-
غیر مفید گھاس نکالنا	☆	-	-	-
لوبیا کی پھلیاں چننا	-	☆	-	-
فصل کی کٹائی	☆	☆	☆	-
گھاس کی کٹائی	☆	-	-	☆
سٹوں کی چھلائی	☆	☆	☆	-
تھریشنگ	☆	-	-	☆
مکئی کا دھوپ میں خشک کرنا	☆	☆	-	-
مکئی کا ذخیرہ کرنا	-	☆	-	-

بحوالہ رازول کوہستانی، بیس لائن رپورٹ، ہمالین جنگل پراجیکٹ، مارچ 2000

اناج کے مقامی پیمانے:

نمبر شمار	شنا نام	کوہستانی نام	تفصیل
۱۔	کُوو	کُوو	
۲۔	لپکی	لپکی	
۳۔	ارڑی	اوڑی اڈہوری	آدھی اوڈی (سوا کلوگرام)
۴۔	اوڑی	اوڑی	اوڈی (ڈھائی کلوگرام)
۵۔	کھلا	کھلو	بیس اوڈی (پچاس کلوگرام)
۶۔	ٹھو	؟	؟

کھانے کے اوقات: وسطی اور بالائی مقامات کے لوگ صبح کا ناشتہ سورج طلوع ہوتے ہی کرتے ہیں۔ دن کا کھانا دس گیارہ بجے تیار ہوتا ہے، سہ پہر کی پچائیں (ایک قسم کا ناشتہ) عصر کی نماز کے فوری بعد یا قبل، شام کا کھانا مغرب کی نماز سے قبل یا فوری بعد۔ زیریں علاقوں کے لوگ (جو بازاروں کے قریب رہتے ہیں بارہ ایک بجے دن کا کھانا کھاتے ہیں)۔

چائے کا استعمال: 1968ء سے قبل لوگ چائے کا استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ صبح کا ناشتہ دہی اور مکی کی روٹی کے ساتھ ہوتا تھا۔ بالائی علاقوں کے لوگ آج کل بھی دہی اور مکئی کی روٹی کے ناشتہ کو ترجیح دیتے ہیں۔

مصالحہ جات کا استعمال: 1947ء کے زلزلہ سے قبل یہاں اکا دکا لوگ گرم مصالحہ، زیرہ، مرچ، ہلدی کا استعمال کرتے تھے۔ عام لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے۔ اس کا استعمال 1947ء کے زلزلہ کے بعد شروع ہوا ہے۔ وسطی اور بالائی علاقوں کے لوگ انتہائی کم استعمال کرتے ہیں۔

چند خوراکیں اور ان کی مرکب ترتیب:

۱۔ مکی کی روٹی + لسی + ساگ یا دال (لوبیا)
۲۔ مکی کی روٹی + دودھ + گھی (یا بغیر گھی کے)
۳۔ مکی کی روٹی + دہی
۴۔ مکی کی روٹی + پنیر + گھی
۵۔ مکی کی روٹی + گوشت کا شوربہ + گھی (یا بغیر گھی کے)
۶۔ اُلی کی روٹی + دودھ یا گھی کے ساتھ
۷۔ میٹھی روٹی یا اُلی کی روٹی خشک (سفر میں)
۸۔ گندم کی روٹی ساگ لسی
۹۔ گندم کی روٹی + دودھ + گھی (یا بغیر گھی کے)
۱۰۔ گزیری (ایک قسم کی روٹی) + گھی
۱۱۔ ہئ (لیٹی) + گھی
۱۲۔ کھونی (انڈوں کا سالن) + گھی + مکی یا گندم کی روٹی
۱۳۔ ستوں + دودھ (ستوں + لسی، ستوں + پانی)
۱۴۔ پراٹھہ + چائے
۱۵۔ چاول + گوشت کا شوربہ + گھی (یا بغیر گھی کے)
۱۶۔ چاول + دہی
۱۷۔ لوبیا میں پکے چاول + گھی
۱۸۔ ڈگڑو (پنیر کی روٹی) + دودھ یا گھی کے ساتھ

میٹھی روٹی: میٹھی روٹی عموماً مکی کے آٹے میں شہد، گڑ، چینی ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ یہ سفر کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ پہلے پہل درباروں اور مزاروں پر اس کی نیاز رکھی جاتی تھی۔

دربیش: مکی کا آٹا اور شہد ملا کر چھوٹے چھوٹے کلچے نما پکوان یا روٹیاں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ دلہنوں کے داج میں شامل ہوتی ہے۔ میکے سے سسرال جانے والی خواتین کو دربیش بطور خاص دی جاتی ہیں۔ آج کل سوجی، چینی اور ڈالڈا سے تیار کرتے ہیں۔

گزیری: روٹی کی یہ قسم آٹے کو پانی میں گھول کر اسے توا پر پھیلا کر تیار کی جاتی ہے۔ اس قسم کی روٹی جب پک کر تیار ہوتی ہے تو دیسی گھی میں توڑ (کوٹ) کر مہمان کو پیش کی جاتی ہے۔ یہ بچوں کی پسندیدہ غذاء ہے۔ اگر انتہائی کم وقت میں کھانا بنانا ہو تو خواتین اسی کا انتخاب کرتی ہیں۔

پراٹھے: ان کی تیاری عام طور پر پکائے جانے والے پراٹھوں کی طرح ہوتی ہے۔ بعض خواتین آلو کے پراٹھے بھی بناتی ہیں جو بچوں اور بڑوں کو پسند ہوتے ہیں۔

چُرمُی (چوری): دیسی گھی میں مکئی یا گندم کی روٹیاں توڑ کر چوری بنانے کا رواج عام ہے۔ چوری کے پیڑے بھی بنائے جاتے ہیں۔

بئی: حلوہ نما یہ کھانا بئی کہلاتا ہے۔ مکئی کے آٹے میں پانی ملا کر اسے آگ کی تیز آنچ پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ غذا جب پک کر حلوہ کی طرح تیار ہوتی ہے تو تھال میں ڈال کر اس کے وسط میں دیسی گھی ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ خوشی کے موقعوں پر یہ خواتین کی پسندیدہ غذا سمجھا جاتا ہے۔ زچہ کو بھی ابتدائی دنوں میں یہ خوراک دی جاتی ہے۔ شادی کے موقعوں پر جب خواتین کھیل ناچ سے تھک جاتی ہیں تو آدھی رات کے وقت انہیں اس قسم کا کھانا فراہم کرنے کا رواج ہے۔

کھکسئی: زچہ کے لئے جو ابتدائی کھانا تیار کیا جاتا ہے اسے عام طور پر کھکسئی کہا جاتا ہے (تاہم ضرورت پر دوسری عورتیں بھی کھاتی ہیں)۔ یہ بھی بئی کی طرح مکئی کے آٹے کو پانی میں ڈال آگ کی تیز آنچ پر تیار کی جاتی ہے۔ اس میں گھی نہیں ڈالا جاتا۔

گوڑمی (خشک گوشت): سرمائی موسم کے لیے گوشت کے لمبے لمبے لڑ بنا کر خشک کر کے سرما میں استعمال کا رواج کبھی عام تھا۔ آج کل اکا دکا لوگ اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ گوشت خشک کرنے کی اس رسم کو یہاں دائے کو کہا جاتا تھا اور خشک گوشت کو گوڑمی۔ لوگ چربی والے گوشت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہربن، داریل، تانگر اور چھلاس کے علاقوں میں اس کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے۔

رُ ازُن: بھنے ہوئے گوشت کو زُازُن کہا جاتا ہے۔ یہ لوگوں کی پسندیدہ ڈش ہے۔ جو عموماً بڑی عید کے دوران تیار کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خصوصی طور پر اگر کوئی بکری، بکرا یا دوسرا جانور ذبح کیا جائے تو یہ ڈش تیار کی جاتی ہے۔ شکاری لوگ جنگل میں مارخور، کل یا کوئی دوسرا شکار کرتے ہیں تو وہ بھی جنگل میں رُازُن ہی پکاتے ہیں۔ مقامی سطح پر اس میں نمک یا مصالحہ جات ڈالنے کا رواج نہیں صرف گوشت کی چربی میں ہی پکانے کا رواج ہے۔

کچو: گرمائی موسم میں جمع شدہ مکھن کو پگلانے کے دوران اس میں کم مقدار میں مکئی کا آٹا ڈالا جاتا ہے جب گھی پگل کر مکمل طور پر تیار ہوتا ہے تو اسے کسی دوسرے برتن میں ڈالا جاتا ہے اس کی تہہ میں آٹا ملا ہوا جو گھی بچ جاتا ہے اسے کچو کہا جاتا ہے۔ یہ سال میں دو تین بار تیار کیا جاتا ہے جو مکئی کی روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اسے طاقت بخش سمجھا جاتا ہے۔

موزے جُولی: گوشت کے سالن کو موزے جولی کہا جاتا ہے۔ جو لوگ دور دراز علاقوں میں آباد ہیں وہ اس میں مصالحہ جات کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ بالکل سادہ قسم کا سالن ہوتا ہے۔ بازار کے قریب کے لوگ لذیذ اور مصالحہ جاتی سالن پکاتے ہیں۔ اس قسم کے سادہ سالن میں دیسی گھی ملا کر اور روٹی توڑ کھانے کو پسند کیا جاتا ہے۔

شائے جولی: ساگ سے بنی ڈش کو شائے جولی کہا جاتا ہے۔ یہ ڈش کسی بھی قسم کے ساگ سے بنائی جاتی ہے۔ اس ڈش کی دو بڑی اقسام قرار دی جاسکتی ہیں ایک وہ ڈشیں جو صرف پانی میں پکائی جاتی ہیں اور دوسری وہ جو خالص لسی میں۔ جو ساگ لسی میں پکائے جاتے ہیں انہیں میل شا اور جو پانی میں پکائے جائیں انہیں ووئی شا کہا جاتا ہے۔ بعض اقسام کے ساگ ایسے پائے جاتے ہیں جو پانی یا لسی کسی بھی ایک میں بھی پکائے جاسکتے ہیں۔

ٹوکولشا: کدو کی ڈش ٹوکولشا کہلاتی ہے۔ اس کے بیج مکئی کی کاشت کے ساتھ بوئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے کدو کی ساخت گولائی میں فٹ بال کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے تازہ پتوں کا ساگ بھی پکایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے چھوٹے چھوٹے پیس بنا کر سالن تیار کیا جاتا ہے۔ سرمائی موسم میں اس کے بڑے بڑے ٹکڑے پکا کر بغیر روٹی کے کھائے جاتے ہیں۔ مقامی سطح پر اس کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں ایک مقامی جو قدرے چھوٹے سائز کے ہوتے ہیں اور ایک بڑے جنہیں سنکو ٹوکو کہا جاتا ہے۔

دیگر: ان ساگوں کے علاوہ گھریلو ضروریات کے لئے مقامی سطح پر توری، چھوٹے کدو، بھنڈی وغیرہ کاشت کی جاتی۔

ٹِکی (عام روٹی): مکئی، گندم اور جو میں سے ترجیحی طور پر پہلا نمبر مکئی، دوسرا گندم اور تیسرا جو کی روٹی کو حاصل ہے۔ روٹی مٹی کی توی یا لوہے کے توے پر پکانے

کا رواج ہے۔ اکا دکا گھروں میں روایتی تندور پائے جاتے ہیں۔ شکاری اور چرواہے عموماً پتھر پر روٹی پکاتے ہیں۔

رَوٹ: صدقہ یا مخصوص منت کے لئے ایک بڑی اور موٹی روٹی تیار کی جاتی ہے جسے روٹ کہا جاتا ہے۔

اُلے ٹِکی (اُلی کی روٹی): یہ روٹی زیادہ تر سفر کے لیے پکائی جاتی ہے۔ اس کی تیاری کے لیے کے لیے دودھ کے ڈولے میں جمع شدہ اُلی کو پانی میں مذید پانی ملا کر اس پانی میں مکئی کا آٹا گھوند کر روٹی پکائی جاتی ہے۔ یہ روٹی بغیر سالن کے آسانی سے کھائی جاسکتی ہے۔

ستّو (ستّوں): ستوں کُلت کی دال سے تیار کیا جاتا ہے۔ دال کے دانوں کو پہلے بھنا جاتا ہے اور بعد میں پن چکی پر آٹے کی طرح پسوا کر محفوظ کیا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق اسے تین چار طریقوں سے کھایا جاسکتا ہے:

- ☆ ستّوں میں ضرورت کے مطابق پانی اور گڑ یا چینی ملا کر۔
- ☆ لسی میں گھول کر۔
- ☆ دودھ میں گھول کر۔
- ☆ گھی میں پیڑے بنا کر۔

بُرُس: بُرس یعنی پنیر بنانے کا عام رواج ہے۔ تازہ لسی کو ہانڈی میں ڈال کر آگ کی تیز آنچ پر ابالتے ہیں۔ جب یہ اچھی طرح پک جاتی ہے تو ہانڈی کو اتار کر اس میں سے اضافی پانی نکال دیا جاتا ہے اور گاڑھا مادہ بطور پنیر روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اس کے اندر دیسی گھی ڈالا کر کھایا جائے تو یہ اور بھی لذیز ہوتا ہے۔

بوگڑو: کسی باریک کپڑا میں بُرس کو نچوڑ کر اس کی چھوٹی چھوٹی روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ جسے بوگڑو کہا جاتا ہے۔ اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بُرس سے اچھی طرح پانی نکال دیا جائے اس کے بعد اسے کسی باریک کپڑا میں ڈال کر مزید نچوڑا جائے اور پھر کپڑا کے اندر ہی ہاتھ سے دبا کر روٹی کی شکل دی جاتی ہے اس کے بعد اسے کسی بھاری پتھر کے نیچے دبا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ جب یہ اچھی طرح خشک ہوجائے تو محفوظ کیا جاتا ہے۔ کھانے کے لیے اسے انگاروں پر دوبارہ گرم کیا جاتا ہے۔ گوجروں میں بھی اس کے بنانے اور کھانے کا عام رواج ہے۔

دوُل: مکئی کے دانے یا سٹے بھی پانی میں ابالے جاتے ہیں جو بڑوں اور بچوں میں ایک جیسے پسند کیے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچے یا لڑکیاں کھیل کے طور پر بھی پکاتی ہیں۔

چاول اور لوبیا کا کھانا: عام طور پر لوگ چاول اور سرخ لوبیا ملا کر پکاتے اور کھاتے ہیں۔ یہ خوراک سرما میں زیادہ تیار کی جاتی ہے۔ بعض لوگ جن کے پاس دیسی گھی ہوتا ہے اس میں ڈال کر (تپ دے کر) کھاتے ہیں۔

کھوُنی (۱): انڈوں کے سالن کو کھونی کہا جاتا ہے۔ یہ بچوں میں زیادہ مقبول ہے تاہم جلدی میں اگر کھانا تیار کرنا ہو تو بڑوں کے لیے بھی انڈوں کا سالن تیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر انڈے توڑ کر اسے پھینٹا جاتا ہے اور اس کے بعد دیگچی یا ہانڈی میں پکایا جاتا ہے۔ سڑک کے نزدیک کے لوگ اس میں مصالحہ اور پیاز وغیرہ ڈالتے ہیں لیکن جو لوگ بازار سے دور دراز رہتے ہیں وہ سادہ طریقہ سے انڈوں کا سالن بناتے ہیں۔ سالن پلیٹ یا تھالی میں ڈالنے کے بعد اس میں دیسی گھی بھی ڈالا جاتا ہے۔

کھوُنی (۲): بھینس، گائے یا بکری کے سونے کے بعد پہلے تین دنوں تک جو دودھ حاصل ہوتا ہے اسے کھونیئے دُت کہا جاتا ہے۔ اس دودھ کو دیگچہ یا ہانڈی میں دال کر آگ پر ابالنے سے جو خوراک بنتی ہے اسے کھونی کہا جاتا ہے ہندکو اور پنجابی میں اسے بولی کہتے ہیں۔ بعض لوگ اس میں دیسی گھی ڈال کر روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

سُوپ: سرخ لوبیا کے سالن یا شوربہ کو سُوپ کہا جاتا ہے۔ موسم سرما میں پکانے کا رواج زیادہ ہے تاہم اسے کم قدر سالن سمجھا جاتا ہے۔ اگر گھی دستیاب ہو تو اس میں روٹی کوٹ کر کھانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

کھمبی کا سالن: پہلے پہل مقامی سطح پر گچھیوں (Morel mushrooms) کا سالن پکانے کا عام رواج تھا اور اس کی تجارتی اہمیت سے لوگ ناواقف تھے۔ آج کل فی کلو چھ سے آٹھ ہزار میں فروخت ہوتی ہیں اس لیے خود کھانے کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔

رَیا نئے جُولی: یہ مشروم کی ایک اور قسم ہے جو زیادہ تر جنگل میں پائی جاتی ہے۔ خواتین کبھی کبھی اس کا سالن پکاتی ہیں۔ اسے پہلے پانی میں ابالا جاتا ہے ابالنے کے بعد اسے نیچے اتار کر پہلے والے پانی کو نکال کر نئے پانی میں دوبارہ پکانے کا عمل کیا جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ گوشت سے ملتا ہے۔

پاؤں: یہ ایک قسم کا شوربہ ہوتا ہے جو زیادہ تر چہ استعمال کرتی ہے۔ اس سے

دودھ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس قسم کا شوربہ پانی میں کم مقدار کا مکئی کا آٹا ڈال کر آگ کی تیز آنچ پر تیار کیا جاتا ہے۔

کاڑا: یہ ایک قسم کی سادہ سی کڑی ہوتی ہے جو لسی میں کم مقدار کا مکئی کا آٹا ڈال کر تیار کی جاتی ہے۔ اگر لسی دستیاب نہ ہو تو پھر پانی کی کڑی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ یہ سالن اس وقت پکایا جاتا ہے جب کچھ اور دستیاب نہ ہو۔

دُت (دودھ): بھینس، گائے اور بکری کے دودھ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ بھیڑوں کا دودھ کھانے کا رواج نہیں۔

کچلسی: یہ تازہ دودھ میں پانی ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں اس سے طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے پیتے ہیں۔

چکو دُت: دہی کو چکو دُت اور دودھ کو مہورو دُت۔ گرمائی موسموں میں دہی کے استعمال کا عام رواج پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس موسم میں دودھ دینے والے مویشیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

مہورئی میل (لسی): مقامی سطح پر لسی بنانے کا عام رواج ہے۔ گرمائی موسم میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں لسی دستیاب نہ ہو۔ دودھ رڑکنے کا خاص وقت سحر کا ہوتا ہے۔ چونکہ پہلے پہل یہاں چائے وغیرہ کا رواج نہ تھا اس لئے سحر کو دودھ رڑکا جاتا تھا تا کہ ناشتہ کے لئے دہی الگ کیا جا سکے۔ مقامی طور پر تازہ لسی کو مہورئی میل کہا جاتا ہے۔ لوگ شوق سے لسی پیتے ہیں۔

چکئی میل: جیسا کہ تازہ لسی کو مقامی لوگ مہورئی میل کہتے ہیں اسی طرح ایک دو دن پہلے کی لسی کو چکئی میل کہا جاتا ہے۔ اکا دکا لوگ کھٹی لسی کو پسند کرتے ہیں۔ بیمار لوگ کھٹی لسی پینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ مقامی مال مویشی صرف گھاس اور جڑی بوٹی چرتے ہیں۔ کھل اور چوکر وغیرہ کا استعمال بالکل نہیں اس لئے مقامی لسی اور دودھ کا ذائقہ خالص اور لذیز ہوتا ہے۔

گی (گھی): گھی کے لئے تین نام یا قسمیں پائی جاتی ہیں۔ مکھن کو شتانو گی کہا جاتا ہے۔ جب اسے گال کر گھی بنایا جاتا ہے تو ابتدائی دنوں یا عرصہ میں اس کا ذائقہ کڑوا نہیں ہوتا اس لئے اسے مہورڑو گی کہتے ہیں۔ جب گھی میں کڑواہٹ یا ترشی سی آجائے تو اسے چھوگی کہا جاتا ہے۔ بعض خواتین گھی کے برتنوں کو زمین میں دفن کر کے رکھتی ہیں اس سے بھی گھی میں ترشی سی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سخت قسم کا گھی ہوتا ہے اس لئے زیادہ مقدار میں کھایا نہیں جا سکتا۔ شادیوں اور خیراتوں میں گھی کی یہی قسم زیادہ استعمال کی جاتی ہے

شہد: کوہستان کے اکثر گھروں کی بیرونی دیواروں میں شہد کی مکھیوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مٹکے (ڈور) لگائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے دہانے پر ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کو راغب کرنے کے لیے ایک قسم کی جڑی بوٹی کوٹ کر مٹکے کے سوراخ پر لگاتے ہیں جس سے مکھیاں جمع ہونا شروع ہوتی ہیں۔ ڈرم یا مٹکے کا بقیہ حصہ کمرے کے اندر ہوتا ہے جسے مٹی کے گارے سے لیپا جاتا ہے۔ یہاں دو قسم کا شہد پایا جاتا ایک سفید اور ایک سرخ رنگ کا۔ سفید شہد زیادہ معیاری ہوتا ہے۔

موسم، موسمی تقسیم، نقل مکانی اور روایتی سرگرمیاں

موسموں کی تقسیم: روایتی طور پر موسموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جو بزودو (بہار)، والو (گرما)، شریو (خزاں) اور یودو (سرما) کے ناموں سے موسوم ہیں۔ تاہم ان موسموں کا آغاز اور اختتام مقامی موسم کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ ان موسموں میں مختلف اقسام کے روایتی، سماجی، معاشی اور زرعی کام کاج پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ لوگوں کے خیال میں سال کے دو اور حصے بھی خاصے اہم ہیں جب اوقات یا موسم کی تبدیلی شروع ہوتی ہے۔ اس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ 22 جون اور 22 دسمبر کو سورج اپنے ہلول (گھونسلہ) میں پہنچ جاتا ہے جس سے دن اور رات کی طوالت اور موسم میں فرق شروع ہوتا ہے اس خاص موسم کو یہ لوگ سُہیل یا سُویل کے موسم کا نام دیتے ہیں۔ اس موسم کی مناسبت سے ایک پرندہ کا نام بھی پایا جاتا ہے اور یہ پرندہ جب نمودار ہوتا ہے تو ٹھیک یہی موسم ہوتا ہے۔ موسموں اور مہینوں کی تقسیم بعض مقامی لوگ اپنے اپنے حساب سے کرتے ہیں تاہم یہ تقسیم برصغیر کے کسانوں کے مہینوں کے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔

بزدو (بہار): بہار کا موسم یہاں وسط اپریل سے شروع ہوتا ہے۔ برف پگلنے کے ساتھ ساتھ جو سب سے اہم کام شروع ہوتا ہے وہ گچھیوں کا چننا ہے تاہم اس کی ابتدا دس مارچ سے شروع ہوتی ہے اور کئی مقامات کی خواتین، مرد اور

لڑکے جنگلوں میں کھمبیاں چنتے ہیں اور خشک کرنے کے بعد کافی مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں جس کی قیمت فی کلو چھ سے آٹھ ہزار روپے ہوتی ہے۔

اس موسم کے ابتدائی عرصہ کو اول بزودو اور اختتامی عرصہ کو اخر بزودو بھی کہا جاتا ہے۔ اس موسم میں لوگ مال مویشیوں سمیت بلند چراگاہوں پر منتقل ہونا شروع کرتے ہیں۔ یہ خوشی کا موسم شمار ہوتا ہے۔ اس میں گھی بنایا جاتا ہے، کشیدہ کاری کی جاتی ہے، شکار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس موسم میں چشمے پھوٹتے ہیں، پھول کھلتے ہیں اس لیے لوک گیتوں کی تخلیق کے لیے یہ اہم موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں خواتین جڑی بوٹیاں بھی نکالتی ہیں اور مختلف اقسام کا جنگلی ساگ چن کر خشک کیا جاتا ہے۔ اس موسم میں مکانوں کی لپائی کا کام بھی کیا جاتا ہے جو خواتین مل جل کر کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سرما میں جو گوبر ایک جگہ ڈھیر کیا ہوتا ہے اسے بھی کھیتوں میں پھیلایا جاتا ہے۔

اس موسم کی ابتدا میں مقامی سطح پر ادھار لین دین کا کاروبار شروع ہوتا ہے۔ مقروض اور قرض خواہ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں۔ مقامی لوگ وسط ستمبر تک بلند چراگاہوں پر رہتے ہیں اور اس کے بعد واپسی شروع ہو جاتی ہے۔

والوڑ (گرما): زیادہ تر لوگ گرمائی موسم چراگاہوں میں گزارتے ہیں۔ مڑو اور لیدی جیسی بڑی چراگاہوں میں ہر جمعرات کو گھوڑ سواری کی دوڑ کا اہتمام ہوتا ہے جس میں جوان حصہ لیتے ہیں۔ جو لوگ زرعی علاقوں میں ہوتے ہیں وہ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ جو چراگاہوں میں ہوتے ہیں وہ گھی، دودھ، پنیر کھاتے ہیں۔ انسانی نقل وحمل کے لئے یہ موسم اچھا ہوتا ہے۔

مئی میں زرعی نہروں اور کھیتوں کی دیواروں کی مرمت کا کام کیا جاتا ہے۔ خواتین کھیتوں میں گوبر پھیلانے کا کام کرتی ہیں۔ جب کھیتوں میں پہلا ہل چلایا جاتا ہے تو اس میں جو ڈم (مٹی کے روڑے) ہوتے ہیں اسے خواتین توڑتی ہیں۔ وسط جون تک فصل کی بوائی کا کام مکمل کیا جاتا ہے۔ فصل کی کٹائی سے پہلے تک مختلف مراحل کے زرعی کام کاج کیے جاتے ہیں جن میں فصل کو پانی دینا، بے فائدہ پودوں کو تلف کرنا اور کھاد ڈالنا وغیرہ شامل ہے۔

شریو (خزاں): پت جڑ یعنی خزاں کے موسم میں گھاس اور فصل کٹائی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ ہشر کے تحت پہلے گھاس کی کٹائی کرتے ہیں اس کے بعد فصل کی کٹائی کا کام شروع ہوتا ہے۔ جونہی فصل کے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو شادیوں کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس موسم میں شادیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح جو دلہنیں ساتویں پر آئی ہوتی ہیں وہ بھی سسرال کے ہاں چلی جاتی ہیں۔ اس موسم میں اخروٹ، املوک، شہد وغیرہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ بعض پیشہ ور گھرانوں (جیسے چرواہے، کنڈری وغیرہ) کے کام کاج کے زبانی معاہدوں کی تجدید ہوتی ہے۔

اس موسم میں خیرات اور صدقہ جات بھی کثرت سے کیے جاتے ہیں۔ ماں باپ یا دادی دادا کے ایصال ثواب کے لئے اس موسم میں بڑی بڑی خیراتیں پکائی اور دی جاتی ہیں۔ اس موسم کے ابتدائی عرصہ کو اول شریو اور اختتامی عرصہ کو اخر شریو کہا جاتا ہے۔

یودوڑ (سرما): سرمائی موسم کی ابتدا میں سب سے پہلے ایندھن کا ذخیرہ کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وافر مقدار میں مکئی کے آٹے کا پسوانا (وہ لوگ جو وادیوں کے وسط یا بالائی مقامات پر ہوں)۔ برف باری کے دوران مکانوں سے برف ہٹانا، سبز پتے لانا وغیرہ کا کام اسی موسم میں ہوتا ہے۔ اس موسم میں راتیں طویل ہوتی ہیں اس لئے چرخوں پر اونی دھاگے کاتے ہیں۔ سردی اور برف باری کی وجہ سے بعض لوگوں کے نصف گھرانے مال مویشیوں سمیت دریائے سندھ کے کناروں پر پائی جانے والی بستیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس علاقے کو سنکوی کہا جاتا ہے یہاں برف نہیں پڑتی اور مال مویشی کا گزارا اچھا ہو جاتا ہے۔ سرمائی موسم میں مردوں کا زیادہ تر وقت مسجد اور حجروں میں گزرتا ہے۔

دن کی مقامی تقسیم:

- ☆ کونکوں بگے وخ (مرغ کی اذان کا وقت)
- ☆ لوبیل (پوپھٹے کا وقت)
- ☆ لوسکی (صبح)
- ☆ غرمہ (دوپہر)
- ☆ دوزو (دن)
- ☆ پیشی (ظہر)
- ☆ مزگر (عصر)
- ☆ مخام (مغرب)
- ☆ ماخسوتن (عشاء)
- ☆ راتی (رات)
- ☆ ہوڑی راتی (آدھی رات)

☆ دم راتی (پکی یا مکمل رات)

کام کاج کے مقامی اوقات

خواتین کے صبح کے کام:

☆ صبح سویرے اٹھ کر وضو کرنا اور نماز پڑھنا۔ ☆ چشمہ سے تازہ پانی بھر کر لانا۔ ☆ جھاڑو دینا۔ ☆ دودھ دھونا۔ ☆ دودھ رڑکنا۔ ☆ ناشتہ تیار کرنا اور دینا۔ ☆ سونے کے کپڑے اٹھانا اور سنبھالنا۔ ☆ برتن دھونا۔ ☆ مویشی کھولنا اور گھر سے قدرے دور چھوڑنا۔ ☆ مویشی خانہ کی صفائی، گوبر اٹھانا اور کھیتوں میں پھینکنا۔ ☆ پنیر بنانا (اگر گرمائی موسم میں مالیوں پر ہوں تو)۔

دوپہر کے کام:

☆ ساگ چننا (یا اس کا بندوبست کرنا)۔ ☆ دوپہر کے کھانا کی تیاری۔ (دس سے گیارہ بجے کے درمیان)۔ ☆ ضرورت کا ایندھن لانا۔ (سوائے سرمائی ضرورت کا ایندھن)۔ ☆ کھیتی باڑی میں ضرورت کا کام کاج۔ ☆ ریشمی کڑھائی۔ ☆ کپڑے دھونا۔ ☆ کپڑے مرمت کرنا۔

شام کے کام:

☆ پانی بھرنا۔ ☆ مویشی باندھنا۔ ☆ آٹا گوندنا۔ ☆ روشنی کے لئے لکڑی کے ٹکڑے بنانا۔ (اگر دور دراز علاقہ ہو تو)۔ ☆ آگ جلانا۔ ☆ ساگ پکانا۔ ☆ روٹی پکانا۔ ☆ دودھ دھونا۔

رات کے کام:

☆ کھانا کھلانا یا دینا۔ ☆ بستر لگانا۔ ☆ بڑوں کے پاؤں دبانا۔ ☆ بچوں کو کہانیاں سنانا اور سلانا۔ ☆ چرخہ کاتنا (چرخہ کاتنے کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے)۔

پیدائش کی رسمیں

تعویز دھاگے: جن خواتین کے ہاں اولاد نہ ہو وہ اولاد کے ہونے کے لئے تعویز دھاگے کا سہارا لیتی ہیں۔ ماضی میں مختلف وادیوں میں کئی دربار اور درگاہیں پائی جاتی تھیں جہاں خواتین اپنی حاجات یا مرادوں کے لیے دعا کے لیے جایا کرتی تھیں۔ آج کل اس قسم کی حاجات کے لئے درگاہوں پر آنے جانے کا رواج یا عقیدہ ختم ہو رہا ہے۔ تاہم تعویز دھاگوں کا عمل اب بھی جاری ہے۔

ٹوٹکے: بعض خواتین اولاد کی مراد لئے جنگلی ٹوٹکوں پر عمل اور یقین رکھتی ہیں۔

جڑی بوٹیاں: بعض خواتین اس مقصد کے لیے یعنی حمل ٹھہرنے کے لئے جڑی بوٹیوں کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ روایتی علاج معالجہ میں بعض جڑی بوٹیوں کے استعمال کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

حاملہ کا خواب دیکھنا: حاملہ اگر خواب میں چاند، سیب، بندوق وغیرہ دیکھے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ہاں نرینہ اولاد جنم لے گی۔

حمل کے بعد: کسی شادی شدہ خاتون کا حمل ٹھہر جائے تو وہ ساس اور بھاوج کو ابتدائی طور پر اس کی اطلاع دینا روایتی طور پر اچھا نہیں سمجھتی اور اسے حیاداری سمجھا جاتا ہے تا آنکہ گھر کی خواتین خود سمجھ پائیں۔ تاہم اگر کوئی خاتون اس دوران میکے جانے والی ہو اور اس کا حمل ٹھہرا ہوا ہو تو پھر اسے ہر حال میں ساس کو بتا کر جانا پڑتا ہے کہ وہ حمل سے ہے بصورت دیگر نہ بتانے کی صورت میں اسے موت کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

حاملہ کا میت کے قریب جانے کا امتناع: حاملہ عورت کسی فوتگی والے گھر جانے سے گریز کرتی ہے بلکہ اس کو جانے سے منع کیا جاتا ہے خاص کر میت کے قریب جانے سے حاملہ اور اس کے ہونے والے بچہ کے لئے نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے حاملہ عورتیں فوتگی والے گھر یا کسی میت کے قریب نہیں جاتیں۔ اس کے علاوہ جس جگہ میت کو غسل دیا گیا ہو وہاں بھی حاملہ عورت کو پاؤں رکھنے کی ممانعت ہے۔ کہتے ہیں ایسی جگہیں بھاری ہوتی ہیں اور مرحومین کی ارواح حاملہ عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں یا ان پر سایہ پڑنے کا خدشہ رہتا ہے۔

حفاظتی اقدامات: دوران حمل غذا اور کام کاج کے حوالہ سے حفاظتی اقدامات کو نظر انداز کرنے کا رجحان غالب ہے جس کی وجہ غربت اور آگہی میں کمی ہے۔

زچگی: اندرون وادی بچہ کی حالت کا اندازہ اس کے ہلنے سے لگایا جاتا ہے۔ زچگی کے دوران بستی کی کسی سیانی خاتون کو بلایا جاتا ہے اس کے علاوہ انتہائی قریبی رشتہ دار عورتوں کو بھی مدعو یا خبر کی جاتی ہے۔ زچگی کے لئے عموماً بند اور کم روشنی والے کمرہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

مبارک بادی: لڑکا ہونے کی صورت میں مبارک بادیں دی جاتی ہیں۔ مبارک باد دینے والے یا والی کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے۔ لڑکی کی پیدائش کی صورت میں کچھ اُداسی سی چھائی ہوتی ہے۔ پہلے پہل لڑکی کے پیدا ہونے پر متعلقہ گھر میں تین دن تک آگ جلانے کا امتناع ہوتا تھا۔ لڑکے کی پیدائش کی صورت میں حجرہ میں موجود مرد ہوائی فائرنگ کرتے ہیں اور صوبت میں انہیں ایک عدد بکرا دیا جاتا ہے۔ وادی ہربن میں لڑکا کی مبارک باد پر میکے والے کپڑے کا جوڑا یا چادر دیتے ہیں اور بعض لوگ بکرا۔

میکہ والوں کا تحفہ: جب پہلی بار جوان ماں بچہ کو گود میں لے کر میکے جائے تو اس کے والدین یا بھائی بچہ کو مادہ مویشی دیتے ہیں (بکری یا گائے) تا کہ اُس سے اور مویشی پیدا ہوں اور خاتون کو مالی سہارا مل سکے۔

گھی بھیجنا: بچہ یا بچی ہونے کی صورت میں اگر زچہ کے والدین/ میکے والے کہیں قریب رہتے ہوں تو اس کے لیے دو سے چار کلو تک دیسی گھی بھیجتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ بچہ یا بچی کے لیے کپڑے اور گدیلی وغیرہ بھی فراہم کرتے ہیں۔

بچوں کا گیت: لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں بستی کے بچے گروہ کی شکل میں مل کر ایک گیت گاتے ہیں تا کہ انہیں صوبوت (تحفہ) میں مرغا یا بکرا دیا جائے۔ گیت یہ ہے:

موں پری باز اچر خانہ
موں پری بازار

فرضی قبر اور بددعائیں: جس گھر میں لڑکا پیدا ہو اور بستی کے بچوں کو صوبت (بکرا یا مرغا) نہ دیا جائے اور انہیں خالی ہاتھ لوٹایا یا دھتکارا جائے تو لڑکے مل کر پیدا ہونے والے بچہ کی فرضی قبر بنا کر بددعائیں دیتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

بچہ پر سبز درخت کا اثر: بستی کی دائی یا سیانی عورت پیدا ہونے والے بچہ یا بچی کی ناف کاٹنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ ناف کاٹنے کے بعد اسے گھر کے کمرہ کے ایک کونہ میں دفن کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی عورتیں کٹی ہوئی ناف اور جھلی کو سبز درخت کے نیچے دفن کرنے کو ترجیحی دیتی ہیں تا کہ بچہ یا بچی کی زندگی ہری بھر رہے۔ کہتے ہیں جب تک متعلقہ درخت ہرا بھرا رہے یعنی سبز درخت کی زندگی کا اثر دفن شدہ ناف والے پر ہوتا ہے۔

بچہ کی کٹی ہوئی ناف کو کپڑے میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ہے۔ عورتوں کا کہنا ہے کہ اگر کپڑے میں ناف کو لپیٹ کر دفن نہ کیا جائے تو اس پر گرد لگتی ہے جس سے بچہ ہمیشہ چھینکتا رہتا ہے۔ مجھے وادی ہربن کے گاؤں درلی کے ایک بزرگ خاتون جنت نور (عمر اسی سال) نے بتایا کہ ان کی وادی میں ناف کو کاٹ کر پہلے ایک تیلا میں لگایا جاتا ہے اور پھر اُس تیلہ کو مکان کی اندرونی چھت میں لگا کر رکھنے کا رواج ہے۔ کہتے ہیں کٹی ہوئے ناف جتنی جلدی خشک ہوگی بچہ اتنی جلدی صحت یاب ہوگا۔

اذان: نومولود کے کان میں کسی نیک مرد کے ذریعے اذان دلوائی جاتی ہے تا کہ نومولود نیک رہے۔

سر مُنڈائی: بچہ یا بچی جب چالیس دن کے ہوتے ہیں تو ان کے سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں۔ اسے خلاختی سُسل ولون کہا جاتا ہے۔ کہتے اگر چالیس دن کے بعد بچہ یا بچی کا سر منڈوایا نہ جائے تو بچہ یا بچہ ہر ہوتے (یعنی ڈرتے) ہیں۔

بئی دون: لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں بستی کی عورتوں کو بئی کا کھانا دیا جاتا ہے جو کہ آٹا اور دیسی گھی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ کھانا پانی میں مکئی کا آٹا ڈال کر اور اسے مسلسل ہلاتے حلوا کی طرح تیار کیا جاتا ہے۔ جب یہ کھانا تیار ہوتا ہے تو اس کی شکل حلوہ جیسی ہوتی ہے۔ اسے ایک بڑے تھال میں ڈال کر درمیان میں جگہ خالی کر کے اس میں دیسی گھی بھر دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک لقمہ گھی میں ڈبو کر کھایا جاتا ہے۔

نام رکھنا: گھر کا کوئی بھی بزرگ لڑکے کا نام رکھتا ہے اگر لڑکی پیدا ہو تو نام دادی رکھتی ہے۔ نام رکھنے سے پہلے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ رکھا جانے والا نام پہلے سے کسی قریبی رشتہ دار کا تو نہ نہیں۔

مُردوں کے ناموں کا امتناع: بچوں کے ایسے نام رکھنے کا امتناع پایا جاتا ہے جو فوت شدہ بچوں کے رکھے جا چکے ہوں۔ کہتے ہیں مرے ہوئے بچوں کے نام رکھنے سے پیدا ہونے والے بچوں کی زندگی متاثر ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ ہربن وادی میں بچہ کا نام رکھنے پر بستی کے لوگوں کو توفیق کے مطابق کھانا کھلایا جاتا ہے۔

ختنہ: ختنہ کے دوران پہلے زمین پر نمک رکھا جاتا ہے اور اُس کے اوپر ایک تھال کو الٹا کر رکھتے ہیں۔ اس تھال پر ختنہ والے بچے کو بٹھا کر اس کا ختنہ کیا جاتا

ہے۔ ختنہ کے بعد متعلقہ نمک گلابی یعنی ڈوم کو دے دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایک مرغہ بھی۔ بعض لوگ ختنہ کے بعد خیرات پکاتے ہیں جو قریبی رشتہ داروں کو کھلائی جاتی ہے۔

ہر بن وادی میں کوئی بھی پیشہ ور نائی یا حجام نہیں۔ بچوں کے ختنے مقامی لوگ خود کرتے ہیں اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

پہلی خوراک: عام طور پر بچہ کو جو پہلی خوراک دی جاتی ہے اس میں گڑ کا ہلکا سا رس شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب بچہ ضرورت محسوس کرتا ہے تو اُسے ماں اپنا دودھ پلاتی ہے۔

بعد کی خوراکیں: جب بچہ چند ماہ کا ہوتا ہے تو اُسے ماں کے دودھ کے علاوہ کھکنی (آٹے کی کھیر) بنا کر دی جاتی ہے۔

بچہ کی مالش: نومولود بچہ یا بچی کے جسم کی سرسوں کے تیل سے مالش کی جاتی ہے۔ ایک دو بار اُسے پاؤں سے پکڑ کر الٹا لٹکایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بچہ یا بچی کے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبایا جاتا ہے تاکہ بچہ کا سر گول رہے۔ اسی طرح ناک کو بھی دو انگلیوں سے سیدھا کر کے کھینچا جاتا ہے تاکہ ستواں رہے۔

لسپندی: بچہ کے ہاتھوں کی انگلیوں کے لئے موتیوں اور دھاگہ سے لسپندی جو کہ موتیوں کا ہوتا ہے بنا کر پہنائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں اس سے جہاں بچہ یا بچی کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے وہاں انگلیوں میں پچال یعنی زخم پیدا نہیں ہوتا۔

چاتھر کے ایام: زچگی کے چالیس دن تک کا عرصہ چھاتر کہلاتا ہے۔ زچگی کے ابتدائی دنوں میں زچہ کو اکیلا چھوڑا نہیں جاتا کیونکہ جن بھوت سے ڈرنے یا اس کا سایا لگنے کا خوف رہتا ہے۔ زچہ رات کو باہر نہیں نکلتی۔ زچہ اور بچہ کی حفاظت کے لئے مختلف ٹوٹکے اور تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

چھری رکھنا: زچہ اور بچہ کے سرہانے چھری یا لوہے کی دھار والی کوئی چیز رکھی جاتی ہے تاکہ جن بھوت اس سے دور رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جن بھوت لوہے اور اس کی دھار سے ڈرتے ہیں۔

دودھ بند ہونا/کمی ہونا: رات کو باہر نکلنے کی وجہ سے بعض خواتین کے پستانوں میں دودھ آنا یا تو بالکل بند ہو جاتا ہے یا اس میں بہت کمی آ جاتی ہے۔ کہتے ہیں اس کی وجہ جن بھوت کا سایہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے خواتین تعویز دھاگے کرواتی ہیں اور دھونی دی جاتی ہے۔

نظر بد سے بچاؤ کی دھونی: نظر بد سے بچاؤ کے لئے دھونی دینے کا رواج پایا جاتا۔ اس کے لئے عام طور پر نمیرو کے پتے، گدھے کی لد، گھاس پھونس اور آٹا سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر نظر بد کا اثر زیادہ ہو تو اس کے لئے کسی چوراہے سے گھاس پھونس کا کچرا، گدھے کی خشک لد، آٹا اور نمیرو کے پتوں کی دھونی دی جاتی ہے۔ دھونی صبح دوپہر، شام دی جاتی ہے۔ کہتے ہیں اس سے نظر بد سے بچاؤ ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر دُوم تھون کہا جاتا ہے۔ جن افراد کی نظر لگنے کا یقین غالب ہو اس سے بچوں کو چھپایا جاتا ہے۔ عام طور پر دھونی کے لیے جو اشیاء استعمال کی جاتی ہیں ان میں نمیر، چھلی، اسپین، آٹا، راستہ کے تنکے، خرشنہ، مانوں وغیرہ شامل ہیں۔

تعویز: بچوں کے گلے میں نظر نہ لگنے کے تعویز بھی باندھے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر بچہ دودھ نہ پی رہا ہو تو اس کے لیے تعویز لکھوائے جاتے ہیں۔ ماں کے دودھ میں اضافہ کے لیے بھی تعویز کیے جاتے ہیں۔

بچوں کی مقامی دوائی: بٹ یعنی مروال سنگ، سونف، اجوائن، مانوہ، کالی زیری، مامیخ، نرکچور، پودینہ، بوٹی، کالا ہریڑ، سفید ہریڑ، سنڈ، اسپر کی پیس کر سفوف بنا کر بچہ کو ماں کے دودھ کے ساتھ دیا جاتا ہے اسے سُرمے دارو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بٹ، اسپغول، گاگاولنے، پاپڑا، اوزکے، حنا، پنجی وغیرہ کا سفوف بھی ضرورت کے مطابق ماں کے دودھ کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

خُنگون: جب بچے مسلسل فوت ہوتے رہیں تو عورتیں پیدا ہونے والے بچہ یا بچی کے سر کے بائیں طرف کچھ بال چھوڑ کر باقی مونڈوا دیتی ہیں اسے خُنگون کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض عورتیں بچوں کے سر کو درمیان سے منڈوا کر کناروں پر بال چھوڑ دیتی ہیں۔ کہتے ہیں نرینہ اولاد ہوتے ہی مر جائے تو ہونے والے بچہ کے سر کے بال درمیان سے مونڈ کر کناروں پر چھوڑ دینے سے لڑکے فوت نہیں ہوتے۔ ایسے کئی بچے اور بچیاں دیکھی گئی ہیں۔

رضائی ماں: جب کسی عورت کا دودھ نہ ہو یا کوئی خاتون مر جائے تو بچہ یا بچی کو کسی دوسری عورت کا دودھ پلایا جاتا ہے اسے چچیلی ماں کہا جاتا ہے۔

بچہ کا خول: بچہ یا بچی کے لیے اس کی نانی، خالہ، چاچی، دادی یا ماں ایک خاص قسم کی ٹوپی تیا کرتی ہے جسے خول کہتے ہیں۔ کہتے ہیں اس قسم کی ٹوپی کے استعمال

سے بچہ یا بچی کا سر گول رہتا ہے۔

ناخن کاٹنے کا امتناع: بچہ یا بچی کے ناخن جلدی نہیں کاٹے جاتے۔ان کا خیال ہے کہ جن بچوں کے ناخن جلدی کاٹے جاتے ہیں وہ چوری کے عادی ہوتے ہیں۔اس لئے کئی ماہ تک بچہ کے ناخن کاٹے نہیں جاتے۔

گرہن: گرہن کے دوران اگر حاملہ عورت لکڑیاں کاٹے تو کہتے ہیں کہ اس کے ہاں پیدا ہونے والے بچہ کے ہونٹ یا ناک کٹی ہوئی ہوگی یا ہوتی ہے۔اس لیے عورتیں اس قسم کے حالات سے بچ کر رہتی ہیں۔

منحوسیت: جس عورت کی مسلسل بچیاں پیدا ہوتی رہیں تو اسے گھر اور خاندان کے لئے منحوس سمجھا جاتا ہے۔

زچگی اور ہیض کے ایام: ماضی میں زچگی اور ہیض کے ایام میں عورتوں کو ناپاک سمجھا جاتا تھا اور انہیں کھانا پکانے، پانی لانے یا دینے یعنی رزق کو چھونے وغیرہ کی اجازت نہ تھی۔آج کل بھی اس حالت میں عورتوں کو ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ہیض کے ایام کو گٹ اور زچگی کے ایام کو چاتھر کہا جاتا ہے۔

بچوں کے کھیل: ڈنڈا، فٹ بال، آنکھ مچولی، گڑیاں چن جرہ، اخروٹ، کبڈی، تتہ بات، چم چاقیس، فرفروں، تھام، نگریاں، لئے لایار، بلی اور چوہا اور جولوک۔جولوک کا ایک گیت کچھ یوں ہے:

جھلوک دیا دو کمیہالے ٹوکئی بخمالو گہ کھوڑو شاڑے گے بلاڑے وزویئے۔

کوہستان میں شادی کی لوک رسمیں

ہر عہد، تہذیب اور ثقافتی گروہوں میں شادی بیاہ کی مختلف رسومات پائی جاتی ہیں۔بعض اوقات ایک ہی ملک، علاقہ یا وادی میں یہ رسوم مختلف ہوتی ہیں جس کہ وجہ مختلف نسلی، لسانی، جغرافیائی اور ثقافتی پس منظر ہوتا ہے اور یہی صورت حال کوہستان میں بھی پائی جاتی ہے۔

منگنی: منگنیاں کم عمری میں طے کی جاتی ہیں۔منگنی کی اولین ترجیح حقیقی چچازادوں میں اور اس کے بعد اپنی ہی شاخ کی نزدیکی پیڑھیاں۔نسبی دائروں میں ہونے والی شادیوں کو زیادہ پائدار مانا جاتا ہے اور اس سے قبیلہ، خیل اور گھرانے کو باہمی اتحاد میں متحد رکھنے میں مدد ملتی ہے اسے یہ لوگ نسب بُھیون (نسب بُننا) بھی کہتے ہیں۔

منگنی کی دو صورتیں پائی جاتی ہیں۔ایک بدَ لی (وناسٹا) اور دوسری رُب یعنی پیسے پر۔وناسٹا کی منگنی میں معیار عمر کو سمجھا جاتا ہے دونوں لڑکیاں ہم عمر ہوں تو اُن کا حق مہر عموماً یکساں مقرر کیا جاتا ہے اور اگر عمر میں فرق زیادہ ہو تو پھر ایک کے بدلے میں دو لڑکیاں دی یا لی جاتی ہیں یا پھر ایک لڑکی کے ساتھ اضافی رُب (پیسے) لئے یا دیئے جاتے ہیں تاہم اگر اس قسم کا رشتہ اگر ایک ہی میراث یا حقیقی چچازادوں میں طے ہونا ہو تو پھر ایک کے بدلے میں ایک ہی لڑکی دی یا لی جاتی ہے اور عمروں کے فرق کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

یک طرفہ رشتہ دینے یا لینے کی صورت میں رُب کی رقم کا انحصار عموماً عمر پر ہوتا ہے اگر لڑکی کم عمر ہے تو اس کا رُب کم رکھا جاتا ہے اور اگر جوان، جوان بیواہ یا جوان مطلقہ ہے تو اس کا رُب زیادہ ہوتا ہے۔

والدین کی مرضی کے مطابق لُہال (منگنی) بچپن میں ہی کرنے کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔خاندانی حالات خواہ کچھ بھی ہوں منگنی توڑنے یا توڑنے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ایک بار جب منگنی ہو جائے تو پھر لڑکی یا لڑکے کی خوبصورتی، دماغی، جسمانی یا کسی بھی قسم کا نقص منگنی ٹوٹنے یا توڑنے پر اثر انداز نہیں ہوتا انتہائی کم مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں ان وجوہات کی بنا پر رشتہ ٹوٹا ہو۔

منگنی کی ابتدائی بات چیت: منگنی کی ابتدائی بات چیت لڑکی کے والدین یا اگر اس کا دادا اور دادی ہوں تو ان کے ساتھ شروع کی جاتی ہے اور یہ کئی دن یا ماہ تک جاری رہتی ہے۔ ظاہری طور پر لڑکی کی منگنی کا کُلی اختیار والد یا دادا کے پاس ہوتا ہے لیکن اندرونی طور پر ماں اور دادی کی مشاورت اور مرضی کے اثرات مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

پشٹو کے جوڑے کی رسم: وادی ہربن اور اس سے ملحقہ وادیوں میں منگنی کے بعد لڑکی کی ماں، خالہ اور دادی کو پشٹو نام کی رسم کے تحت کپڑوں کے جوڑے دیئے جاتے ہیں۔تاہم وادی پالس اور کولئی میں یہ رسم پائی نہیں جاتی۔

سُسن گونڑ/سُسنے گونڑ: منگنی کے بعد جب داماد پہلی بار سسرال کے ہاں جاتا ہے تو اس موقع پر ایک رسم ادا کی جاتی ہے جسے ہربن وادی میں سُسن گونڑ اور پالس و کولئی وادی میں سُسنے گونڑ کہا جاتا ہے۔اس رسم کے تحت ساس ایک مشکل قسم کی

لکڑی کا ٹکڑا اپنے ہونے والے داماد کے سامنے پھینک کر اسے چیرنے کی دعوت دیتی ہے جسے داماد نے ہر صورت میں چیرنا ہوتا ہے۔ اگر اس سے لکڑی کا یہ ٹکڑا چیرا نہ جائے تو اسے بہت ندامت کا سامنا ہوتا ہے اور سسرال والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ داماد ان کی بیٹی کے لائق نہیں۔ اب یہ رسم ترک ہو چکی ہے۔

رشتہ کے اعلان کی ایک ہربن ریت: ہربن وادی میں بچی کے پیدا ہوتے ہی رشتہ کے اعلان کی ایک انوکھی رسم پائی جاتی ہے اس رسم کے تحت بچی کی پھوپھی، خالہ یا کوئی بھی انتہائی قریبی پیڑھی کی رشتہ والی عورت بچی کے کپڑا کا پلو چیر کر اعلان کرتی ہے کہ متعلقہ بچی اس کے بیٹے کی بیوی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ اعلان بچی کے والدین سے قائم مان اور فخر کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور اس کی لاج رکھی جاتی ہے کوہستان کے دیگر حصوں میں یہ رسم نہیں پائی جاتی۔

رشتہ دینے یا لینے کی ترجیح: رشتہ دینے کے لئے نسلی اور شجری قیود کا خیال رکھا جاتا ہے اور اس کی پیڑیوں کے حساب سے امتیازی ترجیحات پائی جاتی ہیں۔ عمومی طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ رشتہ اپنی ہی ذات برادری میں دیا اور لیا۔ اس کی ترجیح کچھ یوں پائی جاتی ہے:

شادی کی ترجیح کا درجہ	پیڑھی، ذات یا قبائلی حلقہ
پہلی ترجیح	حقیقی چچازاد
دوسری ترجیح	میراث کے اندر
تیسری ترجیح	خیل کے اندر
چوتھی ترجیح	تحتانی گروہ کے اندر
پانچویں ترجیح	اپنے ہی قبائلی گروہ میں
چھٹی ترجیح	گروہ سے باہر دوسرے ہم مرتبہ قبیلہ میں
ساتویں ترجیح	کہیں اور کسی بھی ذات میں

باقاعدہ منگنی: جب رشتہ ملنے کا کلی یقین یا اندرونی طور پر بات چیت مکمل ہو جائے تو لڑکے والے مقامی رشتہ دار مردوں کا ایک جرگہ لے کر لڑکی کے گھر جاتے ہیں۔ جرگہ میں جانے والوں کی تعداد پانچ سے بیس تک ہو سکتی ہے۔ جرگہ کچھ وقفہ یا غیر رسمی بات کے بعد اپنے آنے کا مدعا بیان کرتا ہے۔ باقاعدہ گفتگو کا آغاز ایسا مرد کرتا ہے جو روایتی بات چیت میں مہارت رکھتا ہو۔ لڑکی والوں کی طرف سے بات چیت کا اختیار دادا، والد یا چچا کے پاس ہوتا ہے۔ لڑکی کا چچا اس کے والد سے بڑا ہو تو پھر والد کی بجائے چچا ہی بات چیت کرتا ہے۔ جرگہ میں دو طرفہ طور پر مکمل آمادگی کے بعد پھڑو (نشانی)، مہار (مہر) اور رُب کی رقم کا تعین کیا جاتا ہے۔

پھڑو (نشانی): پھڑو کی رقم سو سے تیس ہزار روپے تک ہو سکتی ہے۔ یہ رقم موقع پر یا کچھ عرصہ کے بعد ادا کی جاتی ہے یہ رقم لڑکی کی طرف سے جو بھی جرگہ میں بات چیت کرتا ہے اسے تھمادی جاتی ہے۔ اسے نشانی کی رقم بھی کہا جاتا ہے۔

رُب: رُب کی رقم پانچ ہزار سے ایک لاکھ یا اس سے زائد روپے تک ہو سکتی ہے یہ رقم شادی کی تیاری کے دوران (تمام یا آدھی) لڑکی والوں کو ادا کی جاتی ہے جس سے شادی کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔

مہر: مہار (مہر) حق مہر کی رقم پانچ ہزار سے پچاس ہزار روپے تک سنا اور مشاہدہ کی گئی ہے۔ یہ رقم لڑکی کی ہوتی ہے لیکن شادی کے بعد شوہر کوشش کرتا ہے کہ بیوی معاف کر دے یا بخش دے۔ بہت ہی کم لوگ مہر کی رقم نقد یا جنس کی صورت میں دیتے ہیں۔ کہتے ہیں خاوند کو بخش دینے میں ثواب ہے۔

خوشی کی فائرنگ: منگنی کی دعا کے ساتھ ہی لڑکے والے ہوائی فائرنگ کرتے ہیں اور اس سے وہ لوگ بھی باخبر ہو جاتے ہیں جنہیں پہلے سے ہونے والی منگنی کا علم نہ ہو۔ منگنی کے لئے جرگہ جانے اور دعا تک کوشش کی جاتی ہے کہ اسے صیغہ راز میں رکھا جائے تاکہ دوسرے لوگوں کو اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔ منگنی کے دوسرے یا تیسرے روز چند خواتین لڑکے کے گھر سے دیسی گھی، آٹا (آج کل مٹھائی) وغیرہ لڑکی کے گھر لے جاتی ہیں اسی طرح لڑکی والے بھی اگلی بار یہ بدلہ چکھا دیتے ہیں۔

پردہ: منگنی کے بعد شادی تک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے (بچپن کے سوا)۔ لڑکی اپنے ہونے والے شوہر، اس کے والدین اور بھائیوں سے پردہ کرتی ہے اور ان کے سامنے نہیں آتی اگر حقیقی چچازاد ہوں اور ساتھ ساتھ رہتے ہوں تو پھر ہونے والے شوہر سے پردہ کیا جاتا ہے دوسروں سے نہیں۔ گھرانوں میں تلخی اور رنجشیں خواہ کتنی ہی کیوں نہ پیدا ہوں منگنی توڑنا خلاف روایت سمجھا جاتا ہے اور اس کا اختیار لڑکے والوں کے پاس ہوتا ہے۔

شادی: شادیوں کی عمر عام طور پر پندرہ سولہ سال کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جب لڑکی بالغ ہو جائے تو لڑکے والے اس کے والدین سے رابطہ کرتے ہیں اور باہمی رضامندی سے شادی کی تاریخ طے کی جاتی ہے۔ ہربن میں پہلے پہل سالانہ

موقعوں پر اکٹھے ہی دس سے بیس تک شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ آج کل اکیلے اکیلے ہوتی ہیں۔

شادی کے امتناعی ایام: کئی وادیوں میں بدھ کے روز شادی کا امتناع پایا جاتا ہے اور اسے گھرانے کے لئے اچھا نہیں سمجھا جاتا کہتے ہیں کہ اس دن جس عورت کی شادی ہو اس کا شوہر جلد ہی یا تو قتل ہو جاتا ہے یا بیماری سے فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہ صفر کے ابتدائی پندرہ دنوں میں بھی شادی نہیں کی جاتی کہتے ہیں اس مہینے آسمان سے بلائیں، مصیبتیں اور آفات اترتی ہیں اور اس دوران اگر شادی کی جائے تو دلہن کا پاؤں اس گھر میں نہیں ٹکتا اور وہ مصیبتوں میں مبتلا رہتی ہے۔

شادی کے لئے ریشمی کڑھائی: شادی سے پہلے لڑکی اپنے لئے ریشمی کڑھائی کا اگو (ریشمی شال) تیار کرتی ہے۔ اس کی دو تہیں ہوتی ہیں۔ اور انداز اً دس گز کپڑا صرف ہوتا ہے۔ کڑھائی کے بیل بوٹوں کے لئے مختلف رنگوں کا ریشم استعمال کیا جاتا ہے اور کڑھائی پر ایک سے دو سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ریشمی قمیض اور شلوار کے پائنچوں کے لئے پُندی بھی بنائی جاتی ہیں۔

مالائیں: دلہن کے لئے مقامی طرز کی پاندری جو کہ مختلف لڑوں پر مشتمل ہوتی ہے تیار کی جاتی ہے اور اس کے سرے پر ہار پروئے ہوتے ہیں۔ گلے کے لئے تین چار لڑوں والی مالائیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ پہلے پہل کالاش عورتوں کی طرح بڑی بڑی مالائیں جنہیں مٹھر کہا جاتا ہے پہننے کا رواج تھا مگر اب معدوم ہو چکا ہے اور کم لڑوں والی مالائیں جنہیں شکے بالہ کہا جاتا ہے پہنی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ چپٹے موتیوں کی ایک لڑ والی سرخ مالا جسے سنک پیوں کہا جاتا ہے بھی پہنی جاتی ہے۔ یہ مالا گلے کے ساتھ چمٹی ہوتی ہے۔

مہمان داری: شادی کا جو دن مقرر ہوتا ہے اس کا لڑکی کو بالکل پتہ نہیں ہوتا نہ ہی اس کے رشتہ دار اسے بتاتے ہیں۔ والدین چھپکے چھپکے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ شادی سے پانچ تا پندرہ دن پہلے لڑکی کو اس کا ماموں، پھوپی یا حقیقی چچا (اگر قریب کی بستی میں رہتے ہوں) تو اپنے گھر لے جاتے ہیں جہاں شفقت اور محبت سے اس کی مہمان داری ہوتی ہے۔ اس دوران لڑکی کے گھر والے تمام تیاریاں مکمل کر لیتے ہیں۔

رشتہ داروں کو شادی کی خبر: شادی کی خبر لڑکی اور لڑکا دونوں گھرانوں والے اپنے رشتہ داروں کو بروقت پہنچاتے ہیں۔ پیغام رسانی کے فریضہ کا تعین رشتہ داروں کے گھروں کے فاصلہ سے کیا جاتا ہے۔ جو رشتہ دار ایک ہی جگہ یا نزدیک ہوں انہیں لڑکی اور لڑکے کا کوئی بھی استانزے (پیغام رساں) اطلاع پہنچاتا ہے۔ بعض اوقات مردوں کو مرد اور عورتوں کو عورت اطلاع دیتی ہے۔ جو رشتہ دار دور رہتے ہوں انہیں اطلاع دینے کے لئے کسی بھی مرد کو بھیجا جاتا ہے۔

قریبی رشتہ دار: جو رشتہ دار ماں یا باپ کی پیڑھی میں زیادہ قریب ہوں انہیں شادی کی اطلاع دینے میں انتہائی احتیاط برتی جاتی ہے اور انہیں شادی سے پانچ سات دن پہلے بلایا جاتا ہے تا کہ انتظامات میں ان کی مشاورت شامل رہے۔ ان میں بہنیں، خالہ، پھوپھی (حقیقی، غیر حقیقی یا رضائی سب کے سب) ان کی بیٹیاں اور بیٹے بھی کو مدعو کیا جاتا ہے۔

ناراض رشتہ داروں کو منانا: جو رشتہ دار کسی بھی چھوٹی موٹی وجہ سے ناراض ہوں انہیں شادی سے پہلے منانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے تا کہ انہیں شادی میں شامل کیا جا سکے۔ لڑکے یا لڑکی والے روٹھے ہوئے رشتہ داروں کو ان کے گھر جا کر مناتے ہیں۔ زیادہ مسئلہ ہو تو چھوٹے موٹے جرگہ کے ذریعے منایا جاتا ہے۔

شادی کے لئے اناج کا بندوبست: خزاں شادیوں کا ترجیحی موسم ہے۔ اس کی وجہ اناج، گھی اور توانا جانوروں کی وافر مقدار میں دستیابی ہے اور لوگ اپنے اپنے مستقل رہائشی مقامات پر منتقل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اکا دکا شادیاں کسی بھی مناسب موسم میں ہوتی ہیں۔

شادی کے لئے دیسی گھی کا بندوبست پہلے سے کیا ہوتا ہے اگر گھر میں دستیاب نہ ہو تو کسی سے بھی ایک یا دو گھڑے گھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور اگلے سال انہی برتنوں کو بھر کر واپس دیا جاتا ہے۔ شادیوں کے لئے پرانے گھی کے استعمال کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے۔ پرانا گھی سال یا دو سال کا ہوتا ہے اور اس کا برتن زمین میں دفن کیا ہوتا ہے اسے چٹھو گھی (تیز گھی) کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جندر سے مکئی کے دانے بھی پسوائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ گندم کا آٹا لاتے ہیں۔ جو لوگ بازار کے قریب ہیں وہ چاول پکاتے ہیں لیکن لوگ روٹی کا کھانا زیادہ پسند سے کھاتے ہیں۔

گھر کی سفیدی و بیل بوٹے: دولہا کی بہنیں اور قریبی عورتیں سفید یا عام مٹی سے گھر کی اندرونی اور بیرونی دیواروں کی تازہ لپائی کرتی ہیں۔ دیواروں پر بیل بوٹے بنانے کا رواج پایا جاتا ہے۔ جو عورت کڑھائی کی اچھی ماہر ہو وہ بیل

بوٹے بناتی ہے تاہم اکثر عورتیں کوشش کرتی ہیں کہ کچھ نہ کچھ لیکا جائے۔ بیل بوٹے زیادہ تر ریشمی کڑھائی کے نمونوں سے ماخذ ہوتے ہیں۔ جس میں درخت، شاخیں، پھول، بارڈر اور پرندوں کی تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ شیشی رنگ یا سرخ مٹی سے بھی بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔

دولہا کے تحائف: کوہستان میں شادیوں کے دوران کسی کا حلقہ قرابت داری اور اس کی اہمیت کا اندازہ بھی لگایا جاتا ہے۔ شادی کے دوران دولہا کے گھر دو قسم کے تحائف لائے جاتے ہیں ایک عام اور ایک خاص۔ عام تحائف عام رشتہ دار یا قریبی گھروں سے لائے جاتے ہیں جس میں کپڑا، چاول، مرغی، شہد، دیسی گھی یا کم مقدار کی نقدی کی صورت میں ہوتا ہے۔ وادی پالس، کولئی اور جلکوٹ میں اسے ٹوپلو کہا جاتا ہے۔ دولہا کے لئے خاص قسم کے تحائف قریبی دودھ یا خون کے رشتہ دار اور یارانہ والے لاتے ہیں۔ دودھ کے رشتہ داروں میں خالہ زاد یا ان کے بیٹے، حقیقی یا غیر حقیقی ماموں اور بھانجے یا ان کے بیٹے، رضائی بھائی وغیرہ۔ بھانجے کے لئے ماموں کی طرف سے عام طور پر بیل دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرے افراد عام طور پر بکرا لے کر آتے ہیں اور اسے مگر دون کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ایک ٹولی کی شکل میں آتے ہیں جس میں پانچ سے دس تک افراد ہوتے ہیں۔ جن گھرانوں کا کسی سے قریبی تعلق ہو ان کے لیے (ماضی میں وہ بیل لایا کرتے تھے آج کل) بکرا لانے کا رواج ہے ان گھرانوں سے وہ اشیاء بھی لائی جاتی ہیں جو کہ عام رشتہ دار لاتے ہیں۔ ان میں 7 کلو مکئی یا چاول، ایک کلو گھی، مرغی، سلور کی پلیٹ، رومال وغیرہ شامل ہیں۔

دلہن کے تحائف: جو تحائف دلہن کے لئے لائے جاتے ہیں۔ ان میں کڑھائی کئے ہوئے سرہانے، رومال، چادر، قمیض، پلیٹیں، دھاگے کی اٹیاں، کنگی، چاول یا مکئی وغیرہ شامل ہوتی ہے۔ ہر بن وادی میں ہمسایہ خواتین دلہن کے لئے کچھ نہیں لاتیں خالی ہاتھ آنے کا رواج پایا جاتا ہے۔

گرودر: ہر بن وادی میں شادی سے سات روز قبل دولہا کی طرف سے پانچ سے پندرہ تک جوان مرد اپنے سروں پر سرخ لیر باندھ کر دلہن کے گھر جاتے ہیں اس رسم کو گرودر کہا جاتا ہے۔ اس رسم کے مطابق یہ لوگ لڑکی کے گھر آ کر ناچ گانا کرتے ہیں خود بھی ناچتے ہیں اور گھر والوں کو بھی نچواتے ہیں۔ آج کل یہ رسم متروک ہے۔

اُزریان:

جو عزیز شادی پر دولہا کے گھر بکرا یا بیل لائیں انہیں مقامی اصطلاح میں اُزریان کہا جاتا ہے ان کی عام مہمانوں کی نسبت زیادہ خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ انہیں عام اوقات کے کھانوں میں شہد اور دیسی گھی دیا جاتا ہے۔ ان کی مختلف ٹولیاں ہوتی ہیں۔ جو بکرے یا بیل لائے جاتے ہیں انہیں بعض لوگ رنگ وغیرہ بھی لگاتے ہیں جس سے مویشی کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔

مایوں والی شام:

اگر لڑکی کسی رشتہ دار کے گھر لے جائی گئی ہو تو اسے مایوں والی شام واپس اپنے گھر لایا جاتا ہے۔ جب وہ چوکھٹ پر پاؤں رکھتی ہے تو اس کا بھائی، چچازاد، چچا، پھوپی زاد یا اور کوئی بھی قریبی رشتہ دار اُسے مایوں کی رات یا شادی کی خبر دیتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ ماں، بہنوں، بھائیوں، والد، چچا اور رشتہ دار خواتین کے گلے لگ کر بین کرنا شروع کرتی ہے۔ جس میں والدین اور بہن بھائیوں سے جدائی کے کلمات شامل ہوتے ہیں۔ جو آدمی دلہن کو شادی کی خبر دیتا ہے وہی اسے لے جا کر مایوں والی جگہ بٹھاتا ہے۔ ہر بن وادی میں شادی پر بین کا رواج پایا نہیں جاتا اور دلہن عام خواتین کی طرح ان میں موجود رہتی ہے اور بین نہیں کرتی۔ جب اسے شادی کا جوڑا پہنایا جاتا ہے اس وقت وہ چپکے چپکے روتی ہے۔ تھنگ، درلی اور فلچ کے گاؤں میں مجھے یہی بتایا گیا۔

مایوں بیٹھنے کی جگہ: کوہستان کی اکثر وادیوں میں مایوں پر بیٹھنے کے لئے جو جگہ تیار کی جاتی ہے وہ کمرہ کا ایک کونہ ہوتا ہے جہاں دری کے اوپر تلائی بچھا کر دلہن کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی ہے۔ یہ جگہ دلہن کا بھائی تیار کرتا ہے یا پھر کوئی بھی قریبی خوش قسمت قسم کا مرد۔ کہتے ہیں بدقسمت آدمی سے یہ جگہ تیار کروانا سہاگ کے لئے نیک شگون نہیں ہوتا۔ یہاں دلہن کی سہیلیاں اس کے اردگرد بیٹھتی ہیں اور باری باری گلے لگ کر روتی بھی ہیں۔ اس کے برعکس ہر بن وادی میں باپ اور سسرال کے گھروں میں دلہن کو چارپائی پر بٹھانے کا رواج پایا جاتا ہے۔

شادی کے بین:

کوہستان میں مختلف وادیوں کی زبانوں یا بولیوں میں شادی کے مختلف بین پائے جاتے ہیں جن میں باپ، ماں اور بھائیوں سے جدائی کا دکھ بیان کیا جاتا ہے۔ (شادی کے بین کو زرزار اور موت کے بین کو شوگو کہا جاتا ہے) ایک شادی کے دوران سنے گئے چند سنا بین ملاحظہ ہوں۔

ووئی وومی رزالی ماں مؤں کیہ غمائی تھییت:

زاروومی رزالہ رزازوئے جوحدجے دورپھت بوئیت
زاروومی بُہامی جوسُسن نہائیں
زاروومی رزالی ماں تجی کاتھہ صبر بُلا
زاروومی رازالہ رُروئے می پیئے ہتگی سلامُن
زاروومی بُہامون کیہ مسفر تھائے
زاروومی بُہائے گوس می پیئے ہتگی سلامُن

کوہستانی بین:

ارمان وومی حیایو ۔۔ ارمان وومی کایو
ارمان وومی یایو۔۔ ارمان وورُ اٹوئے یو
ارمان وومی مماٹویو۔۔ ارمان وومی یگو مہ تن جُدا ہُوگے
ارمان وویا گومہ تن خل ہُوگے۔۔ ارمان وورُ اٹو مہ تن خل ہُوگے
ارمان وومی سُر زبیخو مہ تن خل ہوگے

راکھ کی تھیلیوں سے مارنے کی رسم: ہربن وادی اوراس کے گردونواح میں یہ رسم پائی جاتی تھی کہ جب باراتی بستی کے قریب پہنچ جاتے تو بستی والے راکھ سے بھری ہوئی چھوٹی تھیلیوں سے انہیں مارا کرتے تھے تاہم اب یہ متروک ہے۔

زہانل یا ہلال: مایوں پر بیٹھنے کے بعد دلہن کو عموماً زہانل کے لفظ سے پکارا جاتا ہے۔ زہانل کے لفظی معنی شادی کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں دلہن مراد ہوتی ہے۔ مایوں پر بیٹھنے کے بعد جوں جوں رشتہ دار عورتیں اور سہیلیاں آتی ہیں وہ اٹھ کر انہیں گلے لگاتی اور بین کرتی رہتی ہے یہ سلسلہ تمام رات جاری رہتا ہے اس دوران دلہن ہنسنے سے گریز کرتی ہے۔

مایوں والی شام باراتی جونہی بستی کے قریب پہنچتے ہیں ہوائی فائرنگ کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ باراتی قریب پہنچ گئے ہیں۔ اگر دلہا یا دلہن کا کوئی انتہائی قریبی رشتہ دار انہی دنوں میں قتل یا فوت ہو چکا ہو تو پھر عموماً ناچ گانا اور ہوائی فائرنگ کی تمام رسمی اقسام منسوخ کی جاتی ہیں۔ باراتیوں میں مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ دور سے آنے والی بارات میں تندرست، توانا، نشانہ باز اور کشتی کے ماہر اور سیانے مرد لانے کو ترجیح دیتی ہے۔ تاہم وادی پٹن اور اس سے ملحقہ دروں میں باراتیوں کے ساتھ عورتیں نہیں ہوتیں صرف باراتی مرد ہوتے ہیں۔

تمبا کو لانے کی رسم: وادی کوئی میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ باراتی اپنے ساتھ چلم کا تمبا کو لائیں اور لڑکی والے مرد حجرہ میں جتنی بھی تمبا کو نوشی کریں اس کے لئے تمبا کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لڑکی والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تمبا کو ضائع کیا جائے لیکن باراتی تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکثر خاموش رہتے ہیں۔

باراتی عورتوں پر پانی چھڑکنا: باراتی خواتین جونہی لڑکی کے گھر داخل ہوتی ہیں ان پر چھت کی منڈیر سے پانی کے گھڑے انڈیلے جاتے ہیں۔ باراتی عورتیں پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کم سے کم بھیگنے دیتی ہیں۔ یہ رسم آٹھ اکتوبر 2002ء میں ایسے گھر میں بھی مشاہدہ کی گئی جس کے باسی وادی پالس سے تعلق رکھتے ہیں اور گزشتہ چالیس پچاس سال سے راولپنڈی میں رہ رہے ہیں اور باراتی وادی پالس سے وہاں آئے تھے۔ پانی چھڑکنے کے لئے موسم کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

گھی، آٹا اور اگو (شال) لانا: باراتی عورتیں اپنے ساتھ (لڑکے کے گھر سے) چند کلو دیسی گھی، مکئی کا آٹا اور دلہن کے لئے اگو (شال) اور جوڑا بھی ساتھ لے کر آتی ہیں اور یہ انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ دلہن کو اس وقت تک رخصت نہیں کیا جاتا جب تک اس کے سر پر لڑکے کے گھر سے لائی گئی شال نہ ڈالی جائے۔ اس شال کو قبولیت اور عزت کا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم وادی پٹن میں چونکہ باراتی عورتیں نہیں آتیں اس لئے دلہن کے لئے کپڑے، جوتے اور شال وغیرہ متعلقہ بستی کا ڈوم لے کر جاتا ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور واپسی پر وہی دلہن کا صندوق اٹھا کر دولہا کے گھر لاتا ہے۔

باراتیوں کے لئے شام کا کھانا: باراتیوں کو شام کا کھانا لڑکی کے رشتہ دار فراہم کرتے ہیں اور اپنی اپنی استطاعت کے مطابق چار چار پانچ پانچ مردوں کو مرد اور عورتوں کو عورتیں اپنے اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاتے ہیں۔ کھانے کے بعد یہ لوگ دوبارہ پہلے والی جگہ جمع ہوجاتے ہیں۔

دیرو/حجرہ: باراتی مرد حجرہ یا دیرو میں ٹھہرتے ہیں۔ یہاں آنے یا پہنچنے کے بعد سب سے پہلے دلہا اور دلہن کے رشتہ دار مرد آپس میں روایتی انداز میں خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں دیرو یا حجرہ میں چھوٹے بڑے کو عمر اور اہمیت کے مطابق بیٹھنے کی جگہ فراہم کی جاتی ہے۔ جب بڑے باتیں کریں تو چھوٹے بولنے سے اجتناب

کرتے ہیں۔

بعض اوقات باراتیوں میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کی آپس میں دشمنداری ہوتی ہے اس صورت میں ان کے لئے الگ الگ حجروں یا دیرو کا اہتمام کیا جاتا ہے اور انہیں کھانا بھی الگ الگ ٹولیوں میں فراہم کیا جاتا ہے۔

گورُ و چہ، رائیسہ: دلہن اور دولہا کے رشتہ دار شادی کے دوران دو واضح گروہوں سے شناخت کئے جاتے ہیں۔ دلہن کی طرف کے لوگ گورُ و چہ اور دولہا کے مہمانوں کو رئیسہ (رئیس کی جمع) کہا جاتا ہے۔

ناچ گانا: باراتی عورتیں رات کا کھانا کھانے کے بعد دلہن کے گھر میں گئی نوٹ (ناچ گانا) شروع کرتی ہیں۔ اس دوران عموماً دو مصرعہ گیت جسے شنا زبان میں گئی اور کوہستانی میں گیل کہا جاتا ہے گائے جاتے ہیں۔ ناچ گانے کے دوران دلہن بین نہیں کرتی۔ جونہی ناچ گانے میں وقفہ ہوتا ہے دلہن ضرورت کے مطابق بین شروع کرتی ہے۔ ان گیتوں میں دلہا، اس کے حقیقی یا غیر حقیقی بھائی، ماموں، چچا وغیرہ کے نام شامل کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اکا دکا خواتین مزاحی ناچ بھی ناچتی ہیں جس سے خواتین بھرپور لطف اندوز ہوتی ہیں۔ مزاحی ناچ میں بعض اوقات مردانہ لباس پہن کر معمول کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات یا مردانہ رویوں پر مردوں کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ ناچ گانے کے دوران کبھی کوئی اکیلی خاتون اور کبھی دو یا اس سے زائد گروپ کی شکل میں ناچتی ہیں۔ ناچنے والی عورت کے ناچ کی تال کے مطابق سلور کے تھال کو ڈھول کی طرح بجایا جاتا ہے۔ پہلے پہل یہ کام مقامی ڈوم کیا کرتا تھا۔ لیکن آج کل متروک کر دیا گیا ہے۔ جب ناچ اور تال کی آواز زور پر ہو تو ایک خاتون زور زور سے سیٹی بجاتی ہے۔

بئی: آدھی رات کے وقت دولہا کے گھر سے لایا گیا دیسی گھی اور مکئی کے آٹا کی بئی (ایک قسم کا کھانا) تیار کی جاتی ہے۔ یہ کھانا حلوہ کی طرح گاڑھا یا سخت ہوتا ہے لیکن اس میں مٹھاس نہیں ہوتی۔ پکانے کی ترکیب آسان ہے۔ مکئی کا آٹا ابلتے ہوئے پانی میں ڈالا کر ہلاتے رہتے ہیں اور جب پک کر گاڑھا ہو جاتا ہے تو آگ سے اتار کر کھانے کے قابل ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ضرورت کے مطابق پانچ سے دس خواتین کے لئے ایک بڑے تھال میں ڈال کر اس کے وسط میں خالی جگہ بنا کر اسے دیسی گھی سے بھرا جاتا ہے۔ خواتین لقمہ اٹھا کر گھی میں بگو کر کھانا شروع کرتی ہیں۔ یہ کھانا خواتین کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور مردوں کو نہیں دیا جاتا۔ صبح اذانوں سے پہلے دوسری بار خواتین کو دہی اور مکئی کی روٹی یا چاول کا کھانا دیا جاتا ہے۔ اکا دکا خواتین رات کو سوتی ہیں باقی سبھی رات بھر ناچ گانا اور آپس میں گپ شپ کرتی ہیں۔

مردوں کی روایتی مصروفیات: دوسری طرف رات کا کھانا کھانے کے بعد اندازاً دس بجے کے بعد مردوں کی روایتی مصروفیات شروع ہو جاتی ہیں ان مصروفیات میں غوئمنڈ (کشتی)، مجلس (شاعری)، ہریب (سُرنا اور ڈھول کی تھاپ کے ساتھ مردوں کا ناچ) اور داستان گوئی شامل ہیں۔ تاہم ان مصروفیات سے پہلے حجرہ میں مقامی سطح کے معاملات، دشمنداریوں اور دوسرے موضوعات پر بات چیت یا گپ شپ سننے میں ملتی ہے اور کم عمر لڑکے مرد مہمانوں کی پنڈلیاں اور پاؤں دباتے ہیں۔

غوئمنڈ: کشتی ان لوگوں کا اہم روایتی کھیل ہے جس میں روایتی مہارت اور داؤ پیچ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جو جوان کشتی میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں وہ اپنی خوراک میں قوی چیزوں کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ باراتیوں میں ان افراد کو ترجیحی طور پر شامل کیا جاتا ہے جو کہ روایتی کشتی کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ کشتی دلہا اور دلہن کے رشتہ دار یا مہمان مردوں میں ہوتی ہے۔ روایتی کشتی کے مقابلے رات اور دن کے اوقات میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ کشتی کے دوران تمام مرد گول دائرہ کی شکل میں بیٹھے ہوتے ہیں جہاں کشتی لڑی جاتی ہے۔ لوگوں کو کشتی کے عام جوڑوں کا اندازہ ہوتا ہے اور بے جوڑ کشتی نہیں کرائی جاتی۔ کشتی سے پہلے مرد اپنی اپنی قمیض اتار کر نیفوں کو گنج دیتے ہیں۔ یہ کشتی پنجاب سے مختلف ہے تاہم اس کے داؤ پیچ افغانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ کشتی شروع کرتے وقت دونوں جوان پہلے ہاتھوں کے پنجے ملا کر ایک دوسرے کو ہلکا سا دھکا دیتے ہیں جس سے ایک دوسرے کی قوت کا ابتدائی اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس کے بعد انتہائی پھرتی کے ساتھ ایک دوسرے پر داؤ پیچ لگائے جاتے ہیں۔ جو گر گیا اس کی ہار مانی جاتی ہے۔ گرانے والا یہ خیال نہیں کرتا کہ گرنے والے کو کوئی چوٹ لگے گی یا نہیں۔

ہریب: دلہا والے بارات کے ساتھ روایتی ڈوم لاتے ہیں۔ ان کا گروپ تین سے پانچ آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کے سازوں میں سُرنا، ڈھول، ٹمی (نقارہ نما چھوٹے چھوٹے دو ڈھول) کا جوڑا ہوتا ہے۔ یہ ساز شمالی علاقہ جات کے سازوں کی طرح ہیں۔ ہر بچہ، جوان یا بڑے مرد کا اپنا اپنا وزن یا سُر ہوتا ہے اور سُرنا والے ڈوم کو عموماً لوگوں کے ناچنے کا انداز یا تال کا علم ہوتا ہے۔ وہ جونہی کسی کا سُر پھونکتا ہے ناچنے والا خود بخود میدان میں کود جاتا ہے۔ جلکوٹ کے مرد روایتی ناچ میں زیادہ

مشہور رہے ہیں۔ سُرنا سابندی کے تحت پھونکی جاتی ہے اسے بجاتے ہوئے سانس نہیں لیا جاتا۔

مجھے ہربن وادی میں بتایا گیا کہ ہریپ کے ناچ کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک بہلہ نوٹ جسے تنبل کہا جاتا ہے اور دوسری بے غم نوٹ جسے بزم کہا جاتا ہے۔ بتایا گیا کہ دونوں قسموں میں تال اور رفتار کا فرق ہوتا ہے بہلہ نوٹ میں تیزی ہوتی ہے جبکہ بے غم نوٹ آہستہ جاتا ہے۔ آج کل ہریپ کا زیادہ تر رواج ختم ہو رہا ہے۔ ہربن وادی کے ڈوموں نے یہ پیشہ ترک کر کے جولاہے کا پیشہ اپنا لیا ہے۔

مجلس: شادیوں کے دوران روایتی لوک شاعر اپنے لاج گروں (ہمنواؤں) کے ساتھ مل کر گاتا ہے۔ مجلس میں چار بیت، صوت رونگو اور صود کی اصناف گائی جاتی ہیں جو کہ مردوں کی اصناف ہیں۔ اکا دکا شاعر مناجات بھی سناتے ہیں۔ مجلس کی ایک ترتیب ہوتی ہے اور اسی ترتیب کے تحت گایا جاتا ہے۔ مجلس کے دوران روشنی عموماً گل کر دی جاتی ہے۔ شاعر اور اس کے لاج گر حجرہ کے ایک کونے میں دائرہ کی شکل میں بیٹھ کر مجلس کرتے ہیں۔

رات کی تواضع: مجلس کے دوران شاعر، اس کے ساتھی اور دیگر مہمانوں کو وقفہ وقفہ سے چائے بسکٹ اور پراٹھے دیئے جاتے ہیں، ماضی میں رات کو دو تین بار مکئی کی روٹی اور دہی کا کھانا دیا جاتا تھا۔

منہ پر کالک لگانا: بارات میں آئے ہوئے جوان مرد اور لڑکے اگر جلد ہی سو جائیں اور روایتی مصروفیات کو نظر انداز کر دیں تو دلہن کے رشتہ دار لڑکے چپکے چپکے سے ان کے منہ پر توے یا چولہے کی کالک مل دیتے ہیں۔ یہی عمل خواتین بھی ایک دوسری کے ساتھ دہراتی ہیں۔

شادی کا جوڑا پہنانا: شادی کا جوڑا پہنانے کے لئے خوش بخت لڑکی یا خاتون کا انتخاب کیا جاتا ہے جو دلہن کی سہیلیوں میں سے ہوتی ہے۔ صبح آٹھ نو بجے کے قریب دلہن کو شادی کا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات جوڑا پہنانے کی رسم کی ادائیگی کے لئے کسی شادی شدہ خاتون کو بھی منتخب کیا جاتا ہے جس کی ازدواجی زندگی خوشحال ہو۔ ایسی عورتیں جن کے ساتھ مصائب گزرے ہوں انہیں جوڑا پہنانے کے دوران قریب نہیں چھوڑا جاتا۔

دلہن کا جوڑا: شادی کی قمیض رسمی طور پر سیاہ کپڑے کی ہوتی ہے جس کی آستینوں، گلے اور دامن پر ریشمی کڑھائی کا نفیس کام کیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قمیض پر موتی، سیپیاں اور سکے بھی ٹانکے ہوتے ہیں۔ دلہن کی شال جسے اگو کہا جاتا ہے ریشم سے تیار کی ہوتی ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی جھالریں بھی ہوتی ہیں جن کی لڑیوں میں عموماً سفید موتی پروئے ہوتے ہیں۔ اس پر بھی موتی، مرجان، سیپیاں اور پرانے سکے ٹانکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پاؤں میں پہننے کے لئے پلاسٹک یا چمڑا کے بوٹ ہوتے ہیں۔ پہلے پہل دلہن کے لئے بھاری قسم کی ایک شلوار تیار کی جاتی تھی جس کی پنڈلیوں سے پائنچہ تک کا حصہ کافی تنگ ہوتا تھا اور ٹخنہ کے اندرونی طرف اس پر موتیوں کا دو سے تین انچ کا ایک پھول لگایا ہوتا تھا جو کہ اب ترک کیا جا رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ وادی ہربن میں دلہن کو کپڑے صرف بھابھی، پھوپھی زاد یا مامی پہناتی ہے۔ جب کسی کا کوئی نہ ہو تو پھر ارد گرد کی کوئی بھی معزز خاتون یہ فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ دلہن کے کپڑے زیادہ تر لم جم (لال) ہوتے ہیں۔

دولہا کا جوڑا: دولہا عموماً عام لباس میں ہوتا ہے اور نیا جوڑا پہننا اچھا نہیں سمجھا جاتا تاہم اکا دکا نوجوان نیا جوڑا بھی پہن لیتے ہیں۔ دولہا کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا فعل نہ کرے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسے شادی کی خوشی ہے۔ روایتی طور پر دولہا خاموش رہتا ہے۔

گھانا (گہنا): دلہن کے پہننے کے لئے جو عام زیور پایا جاتا ہے اس میں چاندی کا ہمیل، بندی، دولڑہ، کانٹے اور کنگن شامل ہیں۔ بعض لوگ پیتل کے کڑے (کنگن) بھی بنواتے ہیں۔ اب اکا دکا لوگ کم مقدار میں سونے کے زیورات بھی بنانے لگے ہیں۔

ا۔ دولڑہ، مٹھر، درمیان چاندی ہوتی تھی، چاندی کے کنگن، چاندی کی مندری اور گشموئے۔ چاندی کی انگوٹھی یا ہکسری پہنتے ہیں۔ زیورات بنانے کی روایتی کوئی قید نہیں اگر کوئی نہ بنائے تو بھی مینہ نہیں دیا جاتا۔ دلہن کو مہندی یا سرخی پاؤڈر لگانے کا رواج نہیں۔ دلہن کے کانوں کے لئے کانٹے، کلائیوں کے لئے پیتل کے گگن جو عموماً کارتوس کے خولوں سے بنائے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چاندی کے کڑے بھی بنائے جاتے ہیں۔

نکاح: صبح دس بجے کے قریب (دلہن کے گھر تیار کیا گیا کھانا کھلانے سے پہلے) نکاح کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ لڑکی کا ایک بھائی مقرر ہوتا ہے۔ حقیقی اور غیر حقیقی بھائی کی عدم موجودگی کی صورت میں جو بھائی بنایا جاتا ہے اسے دین، دنیا اور

آخرت کا بھائی سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ یہ دلہن سے نکاح کی واک (رضا) لیتا ہے اور دو دوسرے رشتہ دار مرد اس واک کے گواہ ہوتے ہیں۔ واک لینے اور دینے میں کافی وقت لگتا ہے۔ دلہن کی سہیلیاں پہلے سے دلہن کو پکا کر دیتی ہیں کہ جلدی جلدی ہاں نہیں کرنی۔ دلہن سے واک لینے کے بعد تینوں مرد مولوی کے پاس آجاتے ہیں جو کہ جرگہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔ گواہ اپنی زبان میں دلہن کے وکیل کو دی گئی واک کی گواہی دیتے ہیں۔ نکاح شروع کرنے سے پہلے منگنی کے دوران مقرر کی گئی نشانی، مہر اور ژب کی رقم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نکاح کے دوران دولہا کافی دیر تک ہاں کرنے سے کتراتا ہے۔ بہت جلد نکاح کی ہاں کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ پہلے پہل نکاح کے دوران لڑکا بھاگنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس کے ساتھی اسے پکڑ کر واپس لایا کرتے تھے۔ اب بھاگنے کا عمل نہیں کیا جاتا۔ نکاح پڑھنے کے بعد ہوائی فائرنگ کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد نکاح کا اعلان ہوتا ہے۔ اس فائرنگ سے خواتین بھی خبردار ہو جاتی ہیں کہ مولوی صاحب نے نکاح پڑھا دیا ہے۔

ہربن وادی اور پٹن وادی میں نکاح دلہن کے گھر باندھا نہیں جاتا بلکہ دلہن کو سسرال لانے کے بعد نکاح پڑھایا جاتا ہے جب کی کولئی، پالس اور جلکوٹ وادی میں لڑکی کے گھر نکاح پڑھاتے ہیں۔

ہربن وادی میں نکاح کے لئے دولہا کو دلہن کے سامنے لا کر بٹھایا جاتا ہے۔ تاہم آج کل وکیل (قانونی وکیل نہیں) کے ذریعے نکاح پڑھانے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ ہربن وادی میں دولہا کو نکاح پڑھانے کے لئے جب لایا جاتا ہے تو اس کے ساتھی کسی کالے برتن کی کالک سے اس کے چہرے پر لکیریں لگا کر لاتے ہیں (اب متروک ہے)

تھمن: نکاح کے بعد کھانا کھانے کا وقت ہوتا ہے۔ تاہم کھانا دینے سے پہلے نشانہ بازی کا عمل شروع کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس وقت تک کھانا نہیں کھلاتے جب تک نشانہ گرایا نہ جائے۔ نشانہ بازی ان لوگوں کا مقبول مشغلہ ہے اور شادی بیاہ کے دوران اس کی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے کسی اونچے درخت کی چوٹی پر ایک نشانہ باندھا جاتا ہے جسے فائر سے گرانا ضروری ہوتا ہے۔

ہربن وادی میں دلہن کا والد ایک درخت کے نیچے ایک بیل باندھ کر درخت کی سب سے اونچی شاخ پر تھمن (نشانہ) باندھ کر دولہا والوں کو نشانہ سے گرانے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر وہ نشانہ گرا لیں تو اس کے بعد درخت سے بندھا ہوا بیل کھول کر دلہن کے ساتھ لے جانے کے حق دار بن جاتے ہیں۔

دہی کے چھینٹے کرنا: دولہا جب مردوں کے ساتھ مل کر کھانا شروع کرتا ہے تو اس دوران اس پر ایک آدھ جوان یا لڑکا دہی کی چھینٹے کرتا ہے اس دوران دولہا کا ساتھی اسے بچانے کی کوشش میں جلد ہی کھانا ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

گوشت کھانے کا امتناع: دولہا کوشش کرتا ہے کہ دلہن کے ہاں پکایا یا دیا جانے والا گوشت نہ کھائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے دولہا کا پیٹ پھول جاتا ہے اور اس کی صحت پر اثر پڑتا ہے یہی صورت دلہن کی ہوتی ہے وہ بھی دولہا کے ولیمہ کا گوشت کھانے سے گریز کرتی ہے۔ اکا دکا دولہا یا دلہن کھا بھی لیتے ہیں۔

جہیز دکھانا: جب مرد اور خواتین کھانا کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں تو لڑکی کے جہیز کا سامان آنگن یا کمرہ کے وسط میں لا کر ڈھیر کیا جاتا ہے۔ رشتہ داروں کی طرف سے لائے گئے جوڑے اور دوسری اشیاء باری باری دکھائی جاتی ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ تمام لائے گئے جوڑے دلہن کے ساتھ بھیج دئے جائیں۔ جہیز میں دی جانے والی اشیاء دو اقسام کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو خالص دلہن کی ہوتی ہیں جس میں دلہن کے جوڑے، زیور، صندوق، لحاف، تلائی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ جو سامان سسرال کو دیا جاتا ہے اس میں خشک میوہ جات، اخروٹ، املوک، درئبش (میٹھی روٹیاں)، سلور یا کسی دوسری قسم کی پلیٹیں، روئمال، تمباکو کے تھیلے، سرمہ دانیاں، کنگھے، دھاگہ کی اٹیاں، سوئیوں کے پلتے وغیرہ شامل ہیں یہ اشیاء دولہا کے گھر آئی ہوئی خواتین میں تقسیم کی جاتی ہیں۔

ہربن وادی میں دلہن کے جہیز میں صندوق، حنری (شاڑھی) آج کل بستر، کیلو (کھرپہ نما ایک زرعی اوزار)، ودشی، چار پانچ انگوٹھیاں (ساس وغیرہ کے لئے)، ساس کے لئے کپڑے، اوگی (درانتی)، پھلیس (بکریوں کے بال سے بنا ہوا کمبل نما چیز جو چارپائی پر پاؤں کی طرف نیچے بچھائی جاتی ہے)

رخصتی: دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر لے جانے کا رواج نہیں۔ (اس کی ایک وجہ علاقہ کا دشوار گزار ہونا ہے) دلہن کو لے جانے کے دو طریقے دیکھے گئے ہیں۔ اگر دولہا کا گھر نزدیک واقع ہو تو پھر دلہن کا حقیقی بھائی یا چچا اسے کاندھے پر اٹھا کر سسرال کے گھر پہنچاتا ہے اور اگر دولہا کا گھر دور واقع ہو تو پھر خواتین کے درمیان اسے چل کر جانا پڑتا ہے (یہ کولئی، پالس اور جلکوٹ وادی کا رواج ہے۔ ہربن وادی میں دلہن کی سہیلی اس کا پلو پکڑ کر ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اسے دولہا کے گھر پہنچاتی ہے۔ پٹن اور اس سے متعلقہ وادی میں دلہن کی رشتہ دار خواتین اسے ٹور کر ساتھ لاتی ہیں۔

مبارک بادی: وادی ہربن میں جب دلہن کو سسرال کی چوکھٹ پر پہنچایا جاتا ہے تو اس کی ساس وہاں کھڑی ہوتی ہے جسے دلہن کی سہیلیاں اور ارد گرد کی خواتین اسے مبارک باد دیتی ہیں (تھوئے نوش بُبارک)۔ دوسری وادیوں میں بھی ساس کو مبارک باد دی جاتی ہے لیکن چوکھٹ پر نہیں۔

دلہن پر چاول، سبز گھاس، اخروٹ پھینکنا: جب دلہن دولہا کی دہلیز پر پہنچتی ہے تو دولہا کی بہنیں یا رشتہ دار عورتیں چھت سے دلہن پر (کچے) چاول، سبز گھاس اور اخروٹ کے دانے پھینکتی ہیں۔ بعض وادیوں میں صرف اخروٹ پھینکے جاتے ہیں اور بعض مقامات پر اخروٹ اور ابلے ہوئے انڈے۔ کھانے کی اشیاء بچے اور بچیاں اٹھا لیتے ہیں۔

شال کی گانٹیں کھولنا: بعض وادیوں میں جب دلہن کو باپ کے گھر سے نکالا جاتا ہے تو اس سے پہلے اس کی شال کے چاروں کونوں میں (کچے) چاول کے دانے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ان گانٹوں کو دولہا کے گھر کھول کر گھر کے چاروں کونوں میں چاول کے دانے پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اس سے برکت کا شگون لیا جاتا ہے تا کہ دولہا کے گھر آنے والی دلہن اپنے ساتھ اناج کی برکت لائے اور گھر والوں کو مفلسی کا سامنا نہ ہو۔

باگو: سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دلہن کا بھائی یا کوئی بھی ایسا رشتہ دار جسے یہ فریضہ سونپا گیا ہو ساس سے دلہن کا حصہ پوچھتا ہے۔ جب دلہن کے نام کوئی چیز کی جاتی ہے تو اس کے بعد اسے اندر لے جا کر تیار کی ہوئی جگہ پر جو عموماً کمرہ کا ایک کونا (یا چارپائی) ہوتا ہے بٹھا دیا جاتا ہے۔ دلہن کے نام کی جانے والی اشیاء میں بھینس، گائے، بکری یا زمین کا ایک ٹکڑا شامل ہے۔

گود میں بچہ یا قرآن رکھنا: جب دلہن کو دولہا کے گھر لا کر چارپائی (یا پھر سجایا گیا کوئی کونا) پر بٹھا کر اس کی گود میں سب سے کم عمر بچہ بٹھایا جاتا ہے۔ یہ عمل اس بات کا شگون ہوتا ہے کہ دلہن کے ہاں نرینہ اولاد پیدا ہوتی رہے۔ اگر بچہ نہ ہو تو پھر گود میں قرآن مجید رکھا جاتا ہے۔ دلہن کی جیب میں ایک یا آدھ گز کا کپڑا ہوتا ہے جو بچہ کے سر یا قرآن مجید پر لپیٹ دیتی ہے۔ بعض وادیوں میں دلہن کی گود میں دھاگہ کا لٹھو اور کلہاڑی بھی رکھی جاتی۔

سلامی: کوہستان میں دولہا یا دلہن کو سلامی دینے یا لینے کا کوئی رواج نہیں۔

دلہن کی ٹوپی: وادی ہربن میں عورتیں شادی سے پہلے سفید اور شادی کے بعد سیاہ پٹو کی چار کونوں والی ٹوپی پہنتی ہیں۔ اس کا رواج خُمر، ہربن، شتیال اور بشہ میں عام ہے۔ یہ ٹوپی مردانہ ٹوپی سے مختلف ہوتی ہے۔ سفید ٹوپی کسی لڑکی کی دوشیزگی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

دلہن کی سہیلی کا قیام: ہربن وادی میں یہ رواج بھی پایا جاتا ہے کہ دلہن کے ساتھ آئی ہوئی سہیلی سات دن تک دلہن کے ساتھ اس کے گھر میں قیام کرے۔ کوہستان کی دوسری وادیوں میں اس کا رواج نہیں۔

چھیش سُیون: کوہستان کی بعض وادیوں میں یہ رواج بھی پایا جاتا ہے کہ اگر دلہن کی پہلے سے کوئی سوکن ہو تو وہ نئی آنے والی سوکن کو زیر رکھنے کے لئے کئی ٹوٹکے کرتی ہے۔ ان میں سے دو ٹوٹکوں کے مطابق وہ کوشش کرتی ہے کہ جب سوکن اندر آ کر بیٹھ جائے تو اس پر کسی بھی طرح اپنا سایہ لگا لے۔ سایہ لگانے کے لئے وہ روشنی کے سامنے اس طرح کھڑی ہوتی ہے کہ اس کا سایہ نئی دلہن پر لگ جائے۔ دوسرے ٹوٹکے کے مطابق جب دلہن اندر داخل ہوتی ہے تو پہلے والی سوکن اپنے پاؤں تلے تیز کلہاڑا یا کلہاڑی رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس لوک عمل کے مطابق اگر پہلے والی سوکن اس عمل کو صحیح طرح ادا کرے تو نئی دلہن کا پاؤں اس گھر میں ٹکنا مشکل ہو جاتا ہے اور خاوند کی منظور نظر بھی نہیں رہتی۔

مہمانداری: بارات جس راستے سے گزر رہی ہو اگر اس راستے یا محل وقوع میں دولہا کے خالہ زاد، پھوپی زاد، ماموں زاد، یارانہ والے، چچازاد وغیرہ کا گھر واقع ہو تو وہ باراتیوں کو ایک ایک رات اپنے گھر قیام کراتے ہیں۔ (یہ رواج کولئی، پالس اور جلکوٹ وادی میں پایا جاتا ہے)۔ دن کو بکرا یا گائے بیل ذبح کر کے کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ولیمہ کا اہتمام: جس دن بارات واپس دولہا کے گھر پہنچتی ہے اسی دن ظہر کے وقت ولیمہ کے کھانا کے لئے جانور (بیل، بھینس وغیرہ) ذبح کئے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک سے چار پانچ تک ہو سکتی ہے اور اگلے دن ولیمہ کا کھانا دیا جاتا ہے۔ بستی کے جوان اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

ایندھن اکٹھا کرنا: شادی پر آئے ہوئے سبھی جوان مرد اور لڑکے ولیمہ کا کھانا پکانے کے لئے قریبی جنگل سے لکڑیاں لاتے ہیں اور اس میں کوئی حیلہ بہانا نہیں کیا جاتا۔

گوشت پکائی: آدھی رات کو گوشت کی پکائی کا عمل شروع کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے شام ہی کو چند نوجوانوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ گوشت پکانے کا عمل سادہ ہوتا ہے اور پکانے میں کوئی مرچ، نمک یا مصالحہ وغیرہ کا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ پانی میں ابال کر پکایا جاتا ہے۔ گوشت کے پکنے کے بعد برتنوں سے نکال کر لکڑی کے تختوں پر ڈھیر کیا جاتا ہے۔ ولیمہ کے کھانے کی اطلاع اردگرد کے لوگوں کو دی جاتی ہے جو بھی خبردار ہوتا ہے آنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔

ولیمہ کا کھانا: ولیمہ کا کھانا نہایت سادہ ہوتا ہے۔ اندرون وادی جو کھانے پکائے جاتے ہیں۔ ان میں مکئی یا گندم کی روٹی، سادہ سالن، گوشت، نمک اور دیسی گھی شامل ہوتا ہے۔ ولیمہ کے کھانا کی تیاری میں مردوں اور عورتوں کی الگ الگ ذمہ داریاں پائی جاتی ہیں۔ مردوں کی ذمہ داری میں لکڑیاں لانا، مویشی ذبح کرنا اور گوشت پکانا شامل ہے جب کہ روٹیاں پکانے کی ذمہ داری خواتین کی ہوتی ہے۔ یہاں پیشہ ور دیگ نہیں پائے جاتے بلکہ مقامی لوگ خود ہی پکاتے ہیں۔

گوشت چونکہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے کوئی دس سے تیس تک برتنوں میں گوشت پکایا جاتا ہے۔ یہ ذمہ داری جوان مردوں یا لڑکوں کی ہوتی ہے۔ برتنوں کو کم فاصلہ پر ایک لائن میں رکھا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق آگ جلائی جاتی ہے۔ گوشت پکنے کا اندازہ اوجڑی کے ٹکڑے سے کیا جاتا ہے۔ جب گوشت پک جائے تو پھر برتنوں سے نکال کر لکڑ کے تختوں پر جمع کر کے کسی صاف چادر سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس طرح گوشت الگ رکھا جاتا ہے اور سادہ سالن یا کڑی الگ ہوتی ہے۔ کڑی، گوشت اور روٹی میں نمک نہیں ہوتا۔ دوسری طرف خواتین صبح ہی سے روٹیاں پکانا شروع کرتی ہیں اور اندازاً دس یا گیارہ بجے کے لگ بھگ ولیمہ کا کھانا کھلانا شروع کیا جاتا ہے۔ کھانا شروع کرانے سے قبل بعض افراد کو مختلف ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں تفصیل یہ ہے:

☆ دو سے چار افراد ذمہ دار ہوتے ہیں کہ وہ کھانے کے لئے آنے والوں کے ہاتھ دھلائیں اس طرح وہ باری باری لوگوں کے ہاتھوں پر پانی ڈالتے ہیں اس دوران قدرے گپ شپ بھی کی جاتی ہے۔

☆ آٹھ سے دس افراد کو ذمہ داری سونپی جاتی ہے کہ وہ کھانے کے تھال لائیں اور کھانے کے بعد اٹھا کر لے جائیں۔ یہ افراد اپنے اپنے تھال کا خیال رکھتے ہیں، سالن، نمک یا کسی چیز کی کمی ہو تو متعلقہ فرد کو پکارا جاتا ہے۔ جب ایک گروپ کھانا کھا لیتا ہے تو یہ لوگ اپنے اپنے تھال کو اٹھا لیتے ہیں اور متعلقہ جگہ جا کر اگلے

مزید روٹیاں توڑ کر دوسرے گروپ کے لئے تھال تیار کیا جاتا ہے۔

☆ دو سے چار افراد پکا ہوا گوشت تقسیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک ایک فرد گوشت کے تھال کو تھام کر رکھتا ہے اور ایک ایک فرد باری باری لوگوں کے ہاتھوں میں پکا ہوا گوشت تھماتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوہستان میں ولیمہ یا خیراتوں کے دوران پکا ہوا گوشت تھال یا سالن کے ساتھ فراہم نہیں کیا جاتا بلکہ الگ سے ہر فرد کو اس کا حصہ دیا جاتا ہے۔ یہ رواج صدیوں سے جاری ہے۔ گوشت کی تقسیم میں کسی کے سماجی منصب، عمر یا جنس کو ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگوں کو ایک ہی مقدار کا گوشت فراہم کیا جا سکے۔ جن کو پکا ہوا گوشت ملتا ہے وہ کھانا کھانے کے بعد کہیں بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہوئے کھاتے جاتے ہیں۔ بعض افراد اپنے حصہ کا گوشت بچا کر گھر لے آتے ہیں اور بچوں یا والدین کو فراہم کرتے ہیں۔

☆ دو افراد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جہاں کہیں نمک کی ضرورت ہو تھالوں میں نمک ڈالیں۔ جب لوگ کھانا کھا کر اٹھتے ہیں تو وہ ان کے ہاتھوں میں پکڑے پکے گوشت پر نمک چھڑکتے ہے۔

☆ چار سے چھ تک افراد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ برتوں میں سالن لائیں اور تھالوں میں ضرورت کے مطابق ڈالیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ تازہ اور گرم سالن فراہم کرتے رہیں۔

☆ دیسی گھی کی تیاری اور تقسیم کے لئے عموماً ایک خاتون اور دو مرد ہوتے ہیں۔ خاتون کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ضرورت کے مطابق گھی گرم کرتی رہے اور مانی (مٹی کا ایک برتن جس میں دیسی گھی ڈال کر مہمانوں کے لئے لے جایا جاتا ہے) میں گھی ڈال کر دے۔ ایک جوان مرد یا لڑکے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ گھی کا برتن خاتون خانہ سے لے جا کر گھی ڈالنے والے تک پہنچائے۔ درمیانہ عمر کا ایک مرد باری باری ہر مہمان کے کھانے کی جگہ گھی ڈالتا جاتا ہے۔ اسی ترتیب کے ساتھ جب خواتین کے کھانے کی باری آتی ہے تو خواتین انہیں کھانا فراہم کرتی ہیں۔ خواتین کی گود میں چھوٹا یا بڑا کوئی بھی بچہ ہو اس کے حصہ کا گوشت بھی متعلقہ خاتون کو فراہم کیا جاتا ہے۔

دلہن کے سرہانے دھار والا لوہا رکھنا:

ا۔ ساس، اس کی بیٹی یا بڑی بہو آنے والے نئی دلہن کے سرہانے کے نیچے پہلے یا بعد کے قریبی دنوں میں سونے سے پہلے چھری، کلہاڑی یا کوئی اور لوہے والی

رکھتی ہیں۔ عموماً دھار والی لوہے کی چیز رکھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کے دو مقاصد بیان کئے گئے ہیں ایک دلہن جن بھوت سے ڈر نہ جائے یا اس پر بھوت کا سایہ نہ پڑ جائے اور دوسرا وہ ساس یا گھر والوں کے ماتحت رہے اور زبان دراز نہ بن جائے۔

پہلے سات دن: پہلے سات دن تک نئی نویلی دلہن کو روٹی پکانے، آگ کے پاس بیٹھنے اور سیاہ برتن مانجنے یا ان کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہوتی تاہم وادی ہربن میں یہ رواج پایا نہیں جاتا۔

منحوسیت دور کرنے کا ٹوٹکا: دلہن کو دوسرے یا تیسرے دن قریبی چشمہ پر لے جایا جاتا ہے۔ وہاں وہ وضو کر کے نماز پڑھتی ہے اور اس کے بعد وہیں دہی کے ساتھ ناشتہ کرتی ہے۔ ناشتہ کے بعد ایک کورا کوزہ پانی کا بھر کر لایا جاتا ہے۔ جب وہ گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتی ہے تو ساس یا گھر کی کوئی بھی بالغ خاتون کوزہ کو اس کے سر پر پھیرنے کا عمل کرتی ہے۔ یہاں دلہن کی مٹھیوں میں مکئی کے دانے دیئے جاتے ہیں۔ دہلیز پر پہنچ کر دائیں ہاتھ کے دانے اندر اور بائیں ہاتھ کے دانے باہر پھینکوائے جاتے تھے۔ دائیں ہاتھ کے دانے برکت والے اور بائیں ہاتھ کے دانے بے برکت سمجھے جاتے ہیں۔ اس عمل سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ دلہن نے برکت گھر کے اندر اور بے برکتی گھر سے باہر پھینکی ہے۔ اس عمل سے یہ بھی مراد لی جاتی ہے کہ اگر دلہن میں کچھ منحوسیت ہو تو وہ بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے وہ گھی کے برتن اور آٹے کی کھرڑی (چمڑے کی بوری) کو چھوتی ہے اس کے بعد دہی کے ڈولے کو چھوا جاتا ہے۔ اور آخر میں مویشی خانہ میں جا کر ہاتھوں سے گوبر اٹھانے کا عمل کیا جاتا ہے۔ آٹا، گھی اور دہی کا ڈولا چھونے کا عمل اس بات کا شگون ہوتا ہے کہ گھر میں رزق کی فراوانی رہے۔ گوبر چھونے کا عمل اس بات کا شگون ہوتا ہے کہ گھر میں مال مویشی زیادہ سے زیادہ ہوتے جائیں اور ان میں کمی نہ ہو۔

رخصتی کا کھانا: ولیمہ کا کھانا کھانے کے بعد عام لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ تاہم دوسرے قریبی رشتہ دار اور یارانہ والے ایسے افراد جنہوں نے شادی کے لئے بیل یا بکرا وغیرہ لایا ہو انہیں ایک دو دن مزید ٹھہرایا جاتا ہے اور ولیمہ کے دوسرے روز بکرے ذبح کر کے ان کے لئے کھانا تیار کیا جاتا ہے اس کی ترتیب بھی ولیمہ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کھانے کو رخصتی کا کھانا کہا جاتا ہے اور اس کے بعد شادی کی تقریب کا اختتام ہوتا ہے۔

شادی کے موقعوں پر یارانہ یا اس کی تجدید: یارانہ کی لاج پشت در پشت نبھانا ان لوگوں کی قدیم رسم ہے۔ اس کے علاوہ نئے یارانہ کا رشتہ بھی عموماً شادیوں کے موقع پر جوڑے جاتے ہیں۔ اور اس کے لئے جسے دوست بنایا جاتا ہے اس کے سر پر پگڑی رکھی جاتی ہے۔ پگڑی رکھنے سے پہلے یہ دیکھنا یا سوچنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جس سے یارانہ کیا جائے اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا خون یا دودھ کا رشتہ پایا نہ جاتا ہو۔ یارانہ ہمیشہ اپنی خیل یا ذات سے باہر جوڑا جاتا ہے اور اسے انتہائی زیادہ احترام دیا جاتا ہے۔ اس رشتہ کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں صرف اور صرف خاص مواقع کے دوران آتے ہیں۔

دلہن کے لئے کھانا لانا: اگر دلہن کے میکے والے یا اس کے قریبی رشتہ دار جن میں پھوپھی، ماموں، چچا یا کوئی بھی رضائی رشتہ کا عزیز نزدیک رہتے ہوں تو عموماً سات ایام تک وہ اس کے لئے گھر سے کھانا لاتے ہیں۔

دلہن کے پاؤں آزاد کرانا: دلہن کا بہت قریبی رشتہ والا گھرانہ اس کے قریب ہو تو وہ دلہن کو ایک دو روز کے لئے اپنے ہاں لے جاتے ہیں۔ اسے دلہن کا پاؤں آزاد کرنا کہا جاتا ہے۔ جب اسے واپس لایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ کچھ مقدار کا کھانا، مرغے اور اس کے لئے کپڑے کا جوڑا دیا جاتا ہے۔

وادی کیال میں ابتدائی سات یوم تک دلہن کے قریبی رشتہ دار اسے ایک ایک دن کے لئے اپنے اپنے گھر لے جا کر اس کی دعوت کرتے ہیں اور شام کو گھی میں پکائی ہوئی دو انچ موٹی اور بارہ انچ گول مکئی کی ایک یا دو روٹیاں اس کے لئے پکوا کر واپس دولہا کے گھر پہنچایا جاتا ہے۔

ساس وسُسر کے پاؤں دبانا: شادی کے تیسرے یا چوتھے روز ساس اور سُسر کے پاؤں دبانا دلہن کے فرائض میں شامل ہو جاتا ہے اور اسے فرمان برداری کے زمرہ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

سہاگ رات: دلہن کو سہاگ رات کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کب اور کون سی رات سہاگ رات ہوگی۔ مشترکہ نظام خاندان پایا جاتا ہے اور اکثر یتی گھرانے ایک ہی کمرہ میں رہتے ہیں جب کہ مرد حجرہ یا بیٹھک میں سوتے ہیں۔ ایسے خاوند جو ہوشیار اور چالاک ہوں ان کی دلہنوں کی سہاگ رات جلد ہی آجاتی ہے اور جو بہت بھولے ہوں انہیں ہفتہ یا ماہ لگ جاتا ہے۔

ستمو گی: ساتویں کو یہ لوگ ستمو گی کہتے ہیں ضروری نہیں کہ دلہن کو سات دن کے

بعد ہی والدین میکے لے جائیں۔ بعض اوقات سال یا چھ ماہ بعد ساتویں پر لے جاتے ہیں۔ اس دوران وہ ماں باپ کے ہاں تین ماہ سے سال تک قیام کر سکتی ہے۔ ہربن وادی میں دس پندرہ دن کے بعد دلہن ساتویں پر چلی جاتی ہے اور ایک ماہ بعد واپس آنے کا رواج ہے۔

ساتویں سے واپسی: ساتویں سے واپسی کے لئے عام طور پر خزاں کے موسم کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس موسم میں خشک میوہ جات، گھی اور دوسری ضروری اشیاء وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہیں۔ دلہن میکے سے جو اشیاء سسرال کے گھر لاتی ہے۔ اس میں عام طور پر ساس، سسر، دیور، بڑی دیورانی (اگر ہو تو)، دولہا کے دادا، دادی، چھوٹے بھائی اور ان کی بہنوں کے لئے کپڑوں کے جوڑے بطور خاص شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سے چار من تک اخروٹ، املوک، شہد، دیسی گھی، ابلے ہوئے انڈے، میٹھی روٹیاں، پلیٹیں، رومال، کنگھے، سرہانے کے غلاف، تمباکو کے تھیلے، سرمہ دانیاں، دھاگے کی اٹیاں، سوئیوں کے پیکٹ، گھی، اناج اور ایک بکرا بھی شامل ہوتا ہے۔ دلہن کے ساتھ آنے والے افراد میں ایک یا دو خواتین اور باقی مرد ہوتے ہیں جن کی تعداد سامان پر منحصر ہوتی ہے۔ ہربن وادی میں صرف خشک میوہ جات لائے جاتے ہیں۔

برادری کی دعوت: دلہن کی واپسی کے دوسرے یا تیسرے روز برادری کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے اس دعوت کے لئے جو کھانا پکایا جاتا ہے اس کا اناج دلہن ساتھ لاتی ہے۔ مہمانوں میں کھانے کے علاوہ مٹھائی اور میوہ جات بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ارد گرد کے گھروں میں بھی یہ اشیاء دی جاتی ہیں۔ اس دعوت میں دولہا کی بہنیں، خالہ، پھوپھی اور ان کی اولاد کو مدعو کیا جاتا ہے۔ انہیں خشک میوہ جات کے علاوہ کنگھے، کپڑے، پلیٹیں، سرہانے، جوڑے وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔

دولہن کی پرکھ: لوگوں کا خیال ہے کہ عورت، بندوق اور گھوڑا گھر کے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس اثر سے کبھی فاقہ کشی اور کبھی خوشحالی کا دور شروع ہوتا ہے چنانچہ نئی دلہن کے آتے ہی ساس کی نظر گھر کے ماحول اور معاملات پر مرکوز رہتی ہے اور واقعات کا تہہ داری سے ادراک کیا جاتا ہے۔

دینی معاملات: جو دلہن دینی معاملات میں زیادہ آگاہی رکھے اسے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ورنہ اس کے ماں باپ کو کوسا جاتا ہے کہ انہوں نے بغیر کچھ پڑھائے سکھائے بیاہ دیا ہے۔

لوک فنون کی جانچ: دلہن کو کڑھائی سلائی کا کام نہ آتا ہو تو بھی اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ دیکھا گیا ہے کہ سب سے پہلے اسے تعویز دیا جاتا ہے کہ اسے کپڑے میں اچھی طرح بنائے اس سے اس کی صلاحیت کا اندازہ بھی لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چولہے بنانا، لپائی، دیواروں کے بیل بوٹے، کپڑوں کے ٹانکے، چرخہ کاتنا بھی جانچا جاتا ہے۔ جو دلہن ان کاموں میں کمزور ہو اس کی ماں کو کوسا جاتا ہے۔

دلہن کی اچھی خوبیاں: کسی بھی دلہن میں روایتی طور پر جو خوبیاں پسند کی جاتی ہیں ان میں مکمل نماز اور قرآن مجید کا پڑھنا، کفایت شعاری، کشیدہ کاری میں مہارت، مال مویشیوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کی چستی، گھر کی بات گھر تک محدود رکھنے کی عادت، جھوٹ اور فریب سے پرہیز اور باکردار ہونا سرفہرست ہے۔

کوہستان میں شادی کے مواقع کے بعض سماجی پہلو:

کوہستان میں شادیوں کے موقع اور تقریبات سے خاندانوں اور قبیلوں میں باہمی رشتہ بندی، تعاون، رابطہ کاری، مربوط مشاورت، مل بیٹھنے کے مواقع، صلحوں کے مواقع، اخوت، قربت اور یارانہ جیسے رشتوں کی تجدید کے مواقع فراہم ہوتے ہیں اس حوالہ سے یہاں شادیوں کے جو بنیادی خواص پائے جاتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:۔

☆ ایسی تقریبات میں اپنی ذات، قبیلہ کے لوگوں میں ناراضگیاں ختم کرنے اور انہیں منانے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اس طرح سماجی رنجشیں کم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

☆ جدی، ننھیالی اور یارانہ کے رشتوں کے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مالی مدد سے معاشی بوجھ کم ہوتا ہے۔ ننھیالی اور جدی رشتوں کے حلقہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ قدرے بڑے پیمانہ پر قبیلہ یا علاقائی سطح پر لوگوں کو باہمی معاملات پر بات چیت کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

☆ خواتین کو ایک دوسرے سے ملنے، خیالات اور تجربات کے تبادلہ کا موقع ملتا ہے۔

☆ شادیوں میں شرکت عام ہوتی ہے اور کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ تاہم اس میں روایتی ذمہ داریوں اور خدمات سے متعلق ثقافتی سوجھ بوجھ ایک نسل سے

دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہے۔

☆ لوک ادب (داستانیں، کہانیاں، مختلف اقسام کے گیت وغیرہ) کی نہ صرف تجدید ہوتی ہے بلکہ تخلیق اور دوسری نسل کو منتقل ہونے کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں۔

☆ وافر مقدار میں گوشت، گھی اور دوسری اشیاء کھانے کو ملتی ہیں اس طرح غذائیت کی قلت میں قدرے کمی ہوتی ہے۔

☆ قبیلوں اور خیلوں کے چھوٹے موٹے جرگے اور منصوبہ بندی کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

☆ دور دراز رہنے والے جدی اور ننھیالی رشتہ داروں کو ان تقریبات کے بہانے آنے جانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

کوہستان میں موت مرگ کی رسمیں

سُجی اُتھی سُمڑ بوجونائس (شِنا کہاوت): اس شنا کھان میں کہا گیا ہے کہ مٹی سے اٹھ کر مٹی میں ملنا ہے یعنی انسان فانی ہے۔ انسان کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو موت کے آگے اس کا بس نہیں چلتا۔ بیماریاں، اقدام قتل، سیلاب، آگ، طوفان اور کئی دوسرے حادثات ایسے ہیں جن سے انسان کی زندگی کے سفر کا اختتام پذیر ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے اپنے گھر اور قبیلہ کے لوگوں اور اپنی رسومات اور اثاثوں کو چھوڑ جاتا ہے۔ انسان کا دنیا میں آنا اور دنیا سے جانا ایک قدرتی عمل ہے اور اس عمل کے دوران ہم بشری صفات والے لوگ خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں سماجی اور ثقافتی طور پر مختلف رسومات ادا کرتے ہیں اسی قسم کی کچھ رسومات کوہستان میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ایک روایت: کہتے ہیں پرانے وقتوں میں لوگ اپنے ماں باپ کو عمر کی ایک حد کے بعد اگر وہ زندہ ہوں تو روایت کے مطابق انہیں گھر میں نہیں رکھ سکتے تھے بلکہ انہیں اٹھاتے اور ایک مقررہ جگہ لے جا کر انہیں ایک کھائی میں پھینک دیا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک شخص کا باپ عمر کی اس حد کو پہنچ گیا تو اس کے بیٹے نے روایت کے مطابق اسے لے جانے کی تیاری کی۔ جب وہ باپ کے قریب پہنچا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی تو باپ نے ایک آہ بھری۔ بیٹے کو اس پر بڑا رنج ہوا اور اس نے باپ سے پوچھا کہ کیا وہ موت سے ڈر گیا ہے۔ اس پر باپ نے اسے اپنی نحیف آواز میں کہا نہیں موت سے نہیں ذرا بلکہ وہ وقت یاد آیا ہے جب میرا باپ عمر کی اس حد کو پہنچ گیا تھا اور میں نے اسے اٹھا کر کھائی میں پھینک دیا تھا جہاں آج تو مجھے پھینکنے والا ہے۔ اس پر اس کے بیٹے نے قسم کھائی کہ وہ اسے نہیں لے جائے گا اور بیٹے نے گھر کے اندر ایک خاص خفیہ جگہ بنائی کر اپنے باپ کو وہاں روپوش رکھا۔

زَنکدَن: زَنکدَن کے معنی نزاع کی کیفیت ہے۔ جب کوئی سخت بیمار یا زخمی ہوتا ہے تو اس کے پاس گھر کے افراد کے علاوہ قبیلہ اور آس پاس کے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اگر وہ مرد ہے تو پھر بیماری کے دوران وہ مردوں کی تیمارداری یا خدمت میں ہوتا ہے۔ باری باری قریبی رشتہ دار رات بھر اس کے پاس بیٹھتے ہیں اسی طرح اگر وہ خاتون ہے تو خواتین اس کے پاس بیٹھی رہتی ہیں۔ بیمار پر جب نزاع کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کی چارپائی جلدی جلدی قبلہ کی سمت کی جاتی ہے اور اس کے بعد سب مل کر کلمہ شریف پڑھتے ہیں۔ نزاع کی کیفیت سے کسی کے اعمال اور دل کے حال کی کیفیت کا اندازہ کرنے کا رواج عام ہے۔ جب موت واقع ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے جو عمل کیا جاتا ہے وہ مرنے والے کی آنکھوں کو بند کرنا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک رومال یا لمبی سے صاف لیر لے کر سر اور ٹھوڑی کے گرد باندھ دیا جاتا ہے تاکہ مرنے والے کا منہ کھلا نہ رہے۔ اس کے بعد میت کو گھر کے اس کمرہ میں رکھا جاتا ہے جسے بیاک کہا جاتا ہے اور جہاں خواتین ہوتی ہیں انتہائی قریبی رشتہ دار مرد میت کو دیکھنے آتے جاتے ہیں تاہم غیر مردوں کا یہاں داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔

موت کی خبر: مختلف مقامات پر رہنے والے رشتہ داروں یا بستیوں کو خبر پہنچانے کے لئے بعض تیز ترین جوانوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ انتظامات کے دوران جس کا نام پکارا جاتا ہے وہ رات ہو یا دن جانے سے انکار نہیں کرتا۔ پہلے پہل خبر پہنچانے کا کام عموماً ڈوم لوگ کیا کرتے تھے۔ تاہم آج کل ڈوموں کی کمی کی وجہ سے لوگ اس کا بندوبست کرتے ہیں۔ جہاں جہاں موت کی خبر پہنچتی ہے وہاں کے لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جدی اور ننھیالی رشتہ داروں کو اطلاع دینا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔

بیوی کے رونے کی ممانعت: روایتی طور پر بیوی اپنے خاوند کی موت پر کھلم کھلا بین نہیں کرتی اور نہ ہی زور زور سے روتی ہے۔ باپ اپنے بیٹے، بیٹی، بہو وغیرہ کی موت پر رونے اور آنسو بہانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ متعلقہ شخص میں ضبط کا مادہ بھرا ہوا ہے۔ بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جاتے ہیں۔ بیوی کی موت پر خاوند کا رونا معیوب سمجھا جاتا ہے (تاہم معیوبی کی حد یعنی خاوند کا بیوی کے لیے اور بیوی کا خاوند کے لیے ایک جیسی نہیں)۔

شوگو (بین): نزاع کا عالم جونہی طاری ہوتا ہے گھر کی قریبی خواتین شوگو (بین) کرنا شروع کرتی ہیں۔ تاہم ایسی خاتون جو مرنے والے کی بیوی ہے رسمی طور پر وہ بین نہیں کرتی اس کے بین کو عام طور پر روایات کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی رہے (تاہم اکثر خواتین سے سنا جاتا ہے کہ فلاں فلاں عورت مویشی خانہ یا گھر کے کسی دوسرے کمرے میں جی بھر کر روتی رہی ہے)۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ سب سے زیادہ بین کرنے والی عورت بہن اور ماں ہوتی ہے اس کے بعد دوسری قریبی رشتہ دار خواتین موت مرگ پہ جو عام بین سنے جاتے ہیں ان میں موت سے جدائی، بے چھت، بے آسرہ اور یتیم رہ جانا، جوانی کی موت، بے اولاد مر جانا، بہنوں اور ماں باپ کو چھوڑ مرنا، ارمانوں کا ادھورا رہ جانا، بے دردی سے قتل ہو جانا جیسے دکھ کا اظہار پایا جاتا ہے۔ بین کے دوران مرنے والے اور بین کرنے والے کے رشتہ اور دکھ کا اظہار یا نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ بین کے دوران مرنے والے کی جوانی، بہادری، شجاعت، دکھ، قد اور رنگ وغیرہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات بہنیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر بین کرتی ہیں۔ بھائی کی موت پر باپ اور باپ کی موت پر بھائی کے گلے لگ کر بہنیں بین کرتی ہیں۔ موت پر رونا شوگو (بین) جب کہ دلہن کا اپنی شادی پر رونا زرزار کہلاتا ہے۔

کوہستانی شنا بین:

زاردومی رزالوُبا موں جومسفر پھتائے۔

زاردومی رزالوُزا می دربن تھائے۔

زاردومی رزالی ماں موں کھاں واری بوجُوس۔

زاردومی رزالی ماں موں جومسفر پھتیگیئی۔

زاردومی میرات ہوزا جونوٹھوئے۔

زاردومی رزالوُبا اسے قبتہ آلمی

زاردومی لڑزالی ماں موں قیزون پھت بلس۔

زاردومی رازالوُزا جولیلے ڈھنڈہ بُڑیلوئے۔

ترجمہ:

ہائے میرے بابل مجھے کیسا تنہا مسافر چھوڑ دیا۔

ہائے میرے پیارے بھائی میرے (آنے کا) در بند کر دیا۔

ہائے میری ماں میں کس طرف جاؤں گی۔

ہائے میری ماں مجھے کیسے مسافر چھوڑ دیا۔

ہائے میرے بے وارث بھائی تو گم ہو گیا۔

ہائے میرے بابل ہمیں یقین ہو گیا کہ تو ہمیں چھوڑ گیا ہے۔

ہائے میری دکھیاری امڑی میں مجبور و مسکین رہ گئی۔

ہائے میرے پیارے بھائی کیسے خون کی ٹھانڈ میں ڈھوب گئے۔

کفن دفن کا انتظام: کسی گھر میں جب کوئی سخت بیمار ہوتا ہے یا زخمی ہوتا ہے اور یہ یقین کیا جائے کہ اس کا بچنا ممکن نہیں تو اس کے لئے جو ابتدائی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ ان میں کفن، اسخات کی رقم، خیرات کے لئے اناج، دیسی گھی اور ذبح کرنے کے جانوروں کا بندوبست شامل ہیں تاکہ عین موقع پر بندوبست میں مشکل پیش نہ آئے۔ ایسے موقعوں پر اگر گھر میں کوئی چیز نہ ہو تو اردگرد کے رشتہ داروں سے ضرورت کی تمام اشیاء ادھار مل جاتی ہیں جو بعد میں نقد یا جنس کی صورت میں لوٹانا پڑتی ہیں۔

قبر کے لئے تختے لانا: کوہستان میں زیادہ تر لوگ قبروں کے لئے پتھر کی بجائے لکڑی کے موٹے تختے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لئے بستی کے جوان مرد فوری طور پر کلہاڑے لے کر جنگل میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے مضبوط قسم کے تختے لے آتے ہیں۔

قبر کی تیاری و قسم: بستی کے لوگ قبر کی تیاری شروع کرتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ مرنے والے کو اس کے باپ، دادا، دادی، بھائی یا ماں میں سے کسی کی اگر پہلے سے کوئی قبر ہو تو اس کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ بستی کے قبرستان مستقل رہائشی مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ قبر کی لمبائی کا اندازہ لگانے کے لئے ایک آدمی مرنے والے کے قد کا ناپ لاتا ہے جس کے مطابق قبر کھودی جاتی ہے۔ ابتدائی طور پر قبر کو اوپر سے نیچے تک ایک ہی سائز میں کھودا جاتا ہے اس کے بعد کھودی ہوئی قبر کے اندر چاروں طرف لکڑ اور پتھر کی دیوار بنائی جاتی ہے۔ قبر کے تختے اس کے اوپر رکھ کر مٹی ڈالی جاتی ہے۔

روغہ (صلح) کا موقع: موت مرگ کے دوران ایسے گھرانے جن کی صلح کی کوئی راہ نہ نکل رہی ہو تو متعلقہ گھرانے میں کسی بڑے مرد یا عورت کی فوتگی کے دوارن بستی کا معزز جرگہ مجرم کو ماتم والے گھر لے جاتا ہے زیادہ تر راضی نامہ ہوتا ہے۔ تاہم اس کے لئے دوسری روایتی شرائط کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ ایسے مواقع

ہوتے ہیں کہ بار بار نہیں آتے اور متعلقہ گھرانہ بعض اوقات تمام باتوں کو نظر انداز کر کے مجرم کو معاف کر دیتا ہے۔ اس میں اصل نقطہ گھر آنے کا ہوتا ہے جو گھر آئے سمجھا جاتا ہے کہ وہ غلطیاں اور ہار مان کر آیا ہے۔

دن کا کھانا: فوتگی پر آئے ہوئے تمام لوگوں کو دن یا شام کا کھانا بستی کے لوگ فراہم کرتے ہیں اور فوتگی والے گھر تین دن تک آگ نہیں جلائی جاتی۔

موضوع: مرنے والا اگر مرد ہے تو جنازہ پر آنے والوں کی گفتگو کا موضوع بنا رہتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں مقامی سطح پر روایتی انداز میں جس طرح اپنی عمر گزاری، لوگوں سے معاملات اور تنازعات یا دشمنی جیسے حالات سے گزرتے انہیں لوگ روایتی کسوٹی پر پرکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے قبیلوں کی لڑائی، علاقہ یا وادی کے معاملات سے متعلق موضوعات بھی زیر بحث رہتے ہیں۔ اس دوران لوگ ہنسنے اور غیر سنجیدہ گپ شپ سے انتہائی گریز کرتے ہیں۔

میت کو اکیلا نہ چھوڑنا: لوگوں کے خیال میں اگر میت اکیلی پڑی رہے تو اس پر پیرو (جن) کا اثر ہو جاتا ہے اور اس کے جسم میں جن داخل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کوشش کی جاتی ہے کہ میت کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔

تلاوت: اکثر مرد اور خواتین میت کے پاس رات بھر تلاوت کرتے ہیں۔ جو تلاوت کی جاتی ہے وہ مرنے والے یا والی کی روح کو بخش دی جاتی ہے۔

کفن کی تیاری: کوئی بھی سمجھ دار آدمی جس نے پہلے کفن تیار کئے ہوں وہ کفن تیار کرتا ہے۔ بعض اوقات مولوی حضرات بھی اس میں مدد دیتے ہیں۔ بازاروں کی دوری کی وجہ سے لوگوں نے گھروں میں عموماً کفن رکھے ہوتے ہیں۔

میت کا غسل: مردے کو اس کی وصیت کے مطابق غسل دیا جاتا ہے یا اگر وہ مرد ہے تو اس کا عزیز ترین رشتہ دار یا دوست غسل دینے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ اگر مرنے والا مرد ہے اور اس کی موت دشمنی کی وجہ سے واقع ہوئی ہو تو غسل کے دوران اس کے جسم کے زخموں کو بطور خاص دیکھا جاتا ہے اور بعد میں غسل دینے والے سے دوسرے لوگ زخموں کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں۔ غسل اسلامی شرائط کے مطابق دیا جاتا ہے۔

قدم لپ: جنازہ اٹھانے یا روانہ کرنے سے پہلے چوری کی قسم کا ایک کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ جنازہ اٹھانے کے بعد چالیس قدموں کی گنتی کی جاتی ہے جس کے بعد بچوں میں یہ کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ وادی سیوٗ اور کھندیا کے علاقہ میں چوری کی بجائے آٹے کی کھیر نما خوراک جسے لیٹی یا بئی کہا جاتا ہے اس کے پیڑے بنا کر بچوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح مردہ کو قبر میں سوال جواب میں آسانی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں جب مردے سے ملائکہ سوالات پوچھتے ہیں تو مردے کا گلہ خشک ہو جاتا ہے اس کے لیے چوری والا کھانا بچوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تا کہ مرنے والے کا قبر میں گلہ تر رہے اور اُسے جوابات دینے میں آسانی ہو اسے قدم لپ کہا جاتا ہے۔ تاہم آج کل یہ رسم ترک ہو چکی ہے اور علماء نے اسے بند کروا دیا ہے۔

جنازہ: جنازہ مقامی سطح کا کوئی بھی اچھا عالم پڑھاتا ہے۔ جنازہ پڑھنے کے بعد کچھ لوگ میت کو دفنانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

اسخات: جنازہ کے بعد مرنے والے کی مغفرت کے لئے مقامی لوگوں میں نقد رقم تقسیم کی جاتی ہے جسے اسخات کہا جاتا ہے۔ اس کی مقدار پانچ ہزار سے ایک لاکھ تک ہو سکتی ہے۔ اس کی تقسیم میں مرد، بچے اور خواتین سبھی شامل ہوتے ہیں۔ تاہم مرنے والے یا والی کے گھر کے افراد اس میں شامل نہیں ہوتے۔ اس رقم کو مرنے والے کی قضاء شدہ نمازوں اور چھوٹے ہوئے روزوں کے لئے نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ نقد رقم کی تقسیم کا یہ سلسلہ صوبہ سرحد کے زیادہ تر علاقوں میں رائج ہے۔

قرآن پھیرنا: پہلے پہل نماز جنازہ کے بعد چند نمازی لوگ گول دائرہ میں بیٹھ جاتے تھے اور پھر قرآن مجید پھیرنے کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ قرآن کے ساتھ اسخات کی رقم بھی رکھی ہوتی تھی۔ دائرہ میں بیٹھے ہوئے اشخاص باری باری قرآن کو تھامتے اور کلمہ شریف پڑھ کر دوسرے کو تھما دیتے۔ مگر گزشتہ بیس تیس سالوں سے بوجہ یہ رسم ترک کروا دی گئی ہے۔

اپنی مٹی میں دفنانے کی ترجیح: اگر کوئی پردیس میں فوت ہو جائے تو اس کی میت کو بستی میں لانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بعض حالات میں یہ لوگ بیرون وادی عارضی طور پر امانت کے طور پر میت کو دفن کرتے ہیں اور بعد میں مردہ یا اس کی ہڈیوں کو لا کر دوبارہ اپنی بستی میں دفن کرنے کا رواج عام رہا ہے اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

قبر کے سرہانے سبز شاخ گاڑھنا: میت دفنانے کے بعد جب قبر کی مٹی برابر کی جاتی ہے تو اس کے سر کی طرف کسی درخت کی سبز شاخ گاڑ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قبر پر کانٹا نما جھاڑیوں کی ٹہنیاں بھی رکھی جاتی ہیں تا کہ جانور قبر کو

نقصان نہ پہنچائے۔

دفن کے بعد: میت دفنانے کے بعد جب تمام لوگ چلے جاتے ہیں تو متعلقہ گھر کی خواتین قبر پر آتی ہیں اور کئی گھنٹے وہاں بیٹھی بین کرتی رہتی ہیں ان میں بہنوں یا بیٹیوں کے بین زیادہ غمگین ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہتا ہے۔

ماخام/مخام کوٹھی: میت دفنانے کے بعد اُسی شام کم مقدار کے کھانے کی خیرات کی جاتی ہے جسے شنابو لنے والے لوگ مخام کوٹھی کہتے ہیں۔ اس خیرات کے لئے ایک دو بکرے، اناج اور دیسی گھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کل مخام کوٹھی کی رسم ختم ہوگئی ہے۔

جُمعہ دَون: جوان مرد یا عورت کی فوتگی کے چالیس روز تک ہر ہفتہ کو آنے والے جمعہ کے روز مرنے والے کے ایصال ثواب کے لئے چھوٹی موٹی خیرات کی جاتی تھی اسے جمعہ دون کا نام دیا جاتا تھا۔ مخام کوٹھی کی طرح آج کل یہ خیرات بھی ترک کردی گئی ہے۔

باہر سے کھانے لانا: ایک ہفتہ تک اردگرد کے رشتہ دار متعلقہ گھر کھانا لاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کو اپنے گھروں میں لے جا کر کھانا کھلاتے ہیں۔ وادی پٹن اور اس کے کئی دوسرے علاقوں میں یہ رواج بھی پایا جاتا ہے کہ مرحوم کی برادری کے لوگ باری باری بکرا اور اناج لا کر مرحوم یا مرحومہ کے گھر میں کھانا پکواتے ہیں اور فوتگی پر آئے یا آنے والے سبھی مہمانوں کو وہی کھانا کھلاتے ہیں اور یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہتا ہے۔

خائیرات (ابتدائی خیرات): پہلے پہل میت کو دفنانے کے دوسرے روز بڑی خیرات دی جاتی تھی تاہم علماء دیوبند نے اس خیرات کو بند کروا دیا ہے اور یہ موقف پیش کیا گیا کہ خیرات تین دن کے بعد دی جائے اس سے پہلے جائز نہیں۔ اس طرح آج کل ابتدائی خیرات کا بندوبست تیسرے روز کیا جاتا ہے۔ اس خیرات کے لئے ایک سے تین تک جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ اگر مرنے والے کا گھر بازار کے قریب ہے تو پھر کھانا چاول کا تیار کیا جاتا ہے اور اگر اندرون وادی ہے تو پھر گندم یا مکئی کا کھانا اور اس کے ساتھ دیسی گھی دیا جاتا ہے۔

اُزریان: مرنے والا اگر جوان یا بوڑھا ہے تو دور کی بستیوں میں رہنے والے ایسے لوگ جن کا اس گھرانے کے موجودہ یا کئی پشت پہلے کسی مرد سے یارانہ رہا ہو تو وہ لوگ یا تو موقع پر ہی آتے ہیں یا چند ماہ یا سال کے بعد تاہم وہ جب بھی آئیں اُزر کے ساتھ آتے ہیں اور انہیں اُزریان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بکرا یا بیل لاتے ہیں اور انہیں انتہائی بلند مقام دیا جاتا ہے اور رشتہ کو کئی پشتوں تک نبھایا جاتا ہے۔ اس کے کچھ قواعد پائے جاتے ہیں جو مجھے 1995ء میں منظر نامی شخص (جواب فوت ہوگئے ہیں اور اس وقت ان کی عمر اسی سال تھی) نے بتایا کہ اگر اُزریان اپنے ساتھ بیل لائیں تو اس کے ساتھ آنے والے افراد کی تعداد چودہ تک ہوسکتی ہے اس سے زیادہ افراد نہیں لائے جاتے اور اگر وہ اُزر میں بکرا لائیں تو پھر سات افراد کا ٹولہ آتا ہے۔ انہیں میزبان گھرانہ چار سے سات روز تک اپنے ہاں ٹھہراتا ہے۔ یہ رشتہ خالص دوستی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ان میں پہلے سے خون یا دودھ کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ جہاں خون یا دودھ کا رشتہ ہو وہاں یارانہ نہیں کیا جاتا۔ ان کی رخصتی پر ایک یا دو بکرے ذبح کر کے بستی کے چیدہ چیدہ لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا جاتا ہے۔

قبر کے پاس الاؤ روشن رکھنا: تدفین کے بعد اسی شام قبر کے قریب آگ کا الاؤ جلایا جاتا ہے اور اُسے سات روز تک جلائے رکھا جاتا ہے۔ پرانی روایات کے مطابق اس عمل سے مرنے والے کو مختلف آفات سے بچانے میں مدد ملتی تھی۔ آج کل یہ رسم ترک کی جا چکی ہے اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔

قبر کے سرہانہ کی سِل: ماضی میں میت کو دفنانے کے بعد قبر کے سرہانے کی سِل یا تختہ سات روز تک نہیں رکھا جاتا تھا۔ سات روز تک آگ کا الاؤ روشن رکھا جاتا اور یہ دن جب پورے ہوتے تو سرہانے کی سل رکھ کر قبر کو مکمل بند کیا جاتا تھا اور آگ کا الاؤ بھی بجھا دیا جاتا تھا آج کل یہ رسم بھی ترک کی جا چکی ہے۔

چالیسواں: چالیس دن مکمل ہونے کے بعد بڑی قسم کی خیرات کی جاتی ہے جس میں ایک سے تین تک بڑے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ مکئی کا کھانا اور دیسی گھی شامل ہوتا ہے اور اس خیرات میں دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔

قبر باندھدنا: ۴۰ روز سے پہلے قبر کے گرد لکڑی کا پنجرہ تیار کر کے لگایا جاتا ہے اور قبر بھی لکڑی کے تختوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اسے مقامی ترکھان یا لوہار تیار کرتے ہیں۔ لکڑی کا کام مختلف اقسام کے نقوش، لکیروں اور دائروں کی شکل میں ہوتا ہے۔ قبر کا کتبہ بھی لکڑی کا تیار کیا جاتا ہے۔ کتبہ کی قدیم شکل گھوڑے کے سر سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ماضی بعید کے کسی دیوتا کی شکل سے مشابہت رکھتا ہے۔ پرانے قبرستانوں میں اس قسم کے کاموں کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

کالے خائیرات: سال مکمل ہونے کے بعد سالانہ خیرات کی جاتی ہے اس میں بھی کئی جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ اس خیرات کا ترجیحی موسم خزاں ہے۔ اس موسم میں مال مویشی وافر اناج اور گھی دستیاب ہوتا ہے۔

مرنے والے کے نام کی تحریم: مرنے والوں کے نام بعد کی پیڑھیوں میں رکھنے کا رواج نہیں اور اس میں دو روایتی پہلو پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ ان کے خیال میں مرنے والوں کے نام زندہ لوگوں کے حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کے خیال میں چوں کہ مرنے والا پہلی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا نام دوسری یا تیسری پشت میں رکھنا اس کی شان اور روایت کے خلاف ہے اور بزرگوں کا نام بعد کی پیڑھیوں میں احتراماً نہیں رکھا جاتا۔

مرحوم کی ذاتی اشیاء: اگر مرنے والی عورت ہے تو بعد از مرگ اس کی تمام گھریلو اشیاء جن میں کپڑے، زیور، لحاف وغیرہ جو بھی ہوں ان پر روایتی طور پر بیٹیوں کا حق ہوتا ہے۔ خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ بہو کا ان اشیاء میں کوئی حق یا حصہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ تاہم اگر مرحومہ کی بیٹیاں چاہیں تو اپنی مرضی کے مطابق کسی کو بھی یہ اشیاء دے سکتی ہیں۔ اگر مرحوم مرد ہے تو اس کی اشیاء عموماً بیٹے رکھتے ہیں۔ اور اگر اس کی کوئی عزیز چیز ہے تو اسے مرحوم کے عزیز، دوست کو دینا ترجیح دی جاتی ہے۔

خوشی کی تقریبات کی منسوخی: جب کسی گھر میں بڑی عمر یا کوئی جوان فرد فوت ہو جائے یا قتل ہو جائے تو متعلقہ گھر یا اس کے قریبی رشتہ دار تمام متوقع شادیوں یا خوشی کی تقریبات منسوخ کر دیتے ہیں۔ یا اگر کوئی ایسی تقریب جسے منسوخ نہ کیا جا سکے تو اسے انتہائی سادگی اور خاموشی سے منایا جاتا ہے۔

گگونی (بیوہ): اگر مرنے والے کی جوان بیوہ رہ گئی ہو تو روایتی طور پر کچھ عرصہ کے بعد اس کا نکاح دیور سے پڑھایا جاتا ہے۔ بیواہ اپنی مرضی سے کہیں اور شادی نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس کے بھائی یا باپ اس سلسلے میں اس کی کچھ مدد کر سکتے ہیں۔

لوک علاج، ٹونے ٹوٹکے، دم درود

علاج معالجہ کے مقامی اور روایتی ذرائع:

تعویز دھاگے، دم درود، منتر، صدقہ، جڑی بوٹیوں کا روایتی علاج۔

تعویز: تعویزوں میں زیادہ مشہور قسم تیغ بندی اور ہیکل کی ہے۔ تیغ بندی کے تعویز دشمن کی بندوق کی گولی سے بچنے کے لئے کئے جاتے ہیں جب کہ ہیکل کا تعویز دشمن پر غلبہ یا اپنی دھاک بٹھانے کے لئے ہوتا ہے۔ بعض نوجوان اپنی بندوق کے لئے بھی تعویز لکھواتے ہیں تا کہ ان کی بندوق کو نظر نہ لگے اور ان کی بندوق کا فائر خطا نہ ہو یا کوئی ان کی بندق کو تعویز کے عمل سے بند نہ کر دے۔

محبت، منگنی، ناچاقی، بے اتفاقی، اتفاق، گھریلو خوشی یا ناخوشی، نفرت، الفت، عداوت، تنگی، مفلسی اور کئی دوسرے معاملات کے لئے تعویز لکھوانے کا عام رواج ہے۔ ہر وادی میں کوئی نہ کوئی ماہر تعویز پایا جاتا ہے کچھ لوگ صرف اچھے فوائد کے لئے ہی تعویز لکھتے ہیں جبکہ کچھ برے بھلے سبھی کے لئے لکھتے ہیں۔ تعویزوں میں عام بیماری کے لئے بھی تعویز کئے جاتے ہیں ان میں بخار، سر درد، ناف کا گرنا، آدھے سر کا درد، سوکھا پن وغیرہ شامل ہیں۔ ہر تعویز کے ساتھ کچھ نہ کچھ آداب یا شرائط اور طریقے بھی بتائے جاتے ہیں جس کے مطابق تعویز کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ تعویز عام طور پر کاغذ پر لکھے جاتے ہیں اور انہیں سرخ، سفید یا سیاہ کپڑا میں سینے کی ہدایات دی جاتی ہیں۔ ماضی میں اس قسم کے تعویز بھوج پتر پر لکھے جاتے تھے۔ دور دراز وادی کے آباد کار اب بھی بھوج پتر کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

خاختی: تعویز کی یہ ایک اور قسم ہے جو یا تو کاغذ پر لکھی جاتی ہے یا پرچ پر۔ اس کی کے تعداد تین سے چالیس تک ہو سکتی ہے۔ مقررہ وقت پر اسے پانی میں گھول کر پیا جاتا ہے۔ عورتوں میں اس کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ دودھ کے اضافہ کے لئے بھی اس کا استعمال ہے۔

پلیتہ: یہ کاغذ پر لکھی ہوئی کوئی آیت یا ہندسوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ اسے سگریٹ کی طرح گول بنا کر عموماً سیاہ کپڑا میں لپیٹ کر آگ میں سلگایا جاتا ہے اور پھر متاثرہ فرد کو اس کا دھواں سنگھایا جاتا ہے۔ جن بھوت، ڈرنے، سوکھا پن اور بعض دوسری امراض میں اس سے علاج کیا جاتا ہے۔

مُت: جی متلانے، الٹی وغیرہ یا اگر جادو ٹونے کا شبہ ہو تو بعض دم کرنے والے حضرات یا خواتین سے پانی پر دم کروا کر مریض کو پلایا جاتا ہے۔ پانی پر کیے جانے والے دم کو مُت کہا جاتا ہے۔

صدقہ: بیماری یا کسی مشکل سے خلاصی کے لئے صدقہ دینے کا رواج پایا جاتا ہے۔ اگر صدقہ مرغ کی صورت میں تو پھر اسے بیمار بچہ یا شخص کے سر پر پھیر کر کسی غریب کو دے دیا جاتا ہے۔ اگر صدقہ میں گائے بیل دی جائے تو پھر یا تو ذبح کر کے

اس کا کچا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے یا پھر خیرات پکائی جاتی ہے۔

لیل نکھلون: بعض لوگ کسی خاص بیماری کے تحت اپنا خون نکلواتے ہیں۔اس قسم کا خون نکالنے کے لئے نشتر استعمال کیا جاتا ہے۔خون پیشانی یا بازو کی کسی رگ سے نکالا جاتا ہے۔بعض ماہر سینگ کے ذریعے بھی اس قسم کا خون نکالتے ہیں اسے سنگو دون یا سنگو سیون کہا جاتا ہے۔

منتر (دم) اور داغنا: مقامی زبانوں میں بعض منتر اور دم بھی پائے جاتے ہیں۔اس قسم کے منتر اور دم انسان اور مال مویشی سبھی کے فوائد اور نقصان کے لئے زیر استعمال رہے ہیں۔بعض منتروں میں ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن کے معنی معلوم نہیں۔یہاں چند منتروں کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

گائے/بھینس کے دودھ کا منتر: گائے بھینس کے دودھ کے لیے جو منتر پایا جاتا ہے اس میں چند الفاظ کے اضافہ سے منتر کے اثرات منفی اور مثبت قسم کے بن جاتے ہیں۔اگر گائے، بھینس دودھ نہ دے یا اچانک دودھ دینا بند کر دے تو سمجھا جاتا ہے کہ کسی نے نظر لگائی ہے یا کسی نے منتر پڑھ کر دودھ بند کر دیا ہے۔اس قسم کے مسئلے کے لئے مویشی کو دیئے جانے والے پیڑوں پر دم کے کر کھلایا جاتا ہے۔کا منتر یہ ہے:

پیری پوری موسوت پھوز گم
زوں پھوز وں پھوز گم
کنی چرے دونی پھوز گم
دوئی ٹرے باس پھوز گم
تربڑا تربڑا آئے مہیئے گون پھوز گم

آخری لائن میں جہاں لفظ مہیئے آتا ہے یہاں اگر گائے ہو تو گاؤ اور بکری ہو تو آئی کے لفظ کو بدلا جاتا ہے باقی منتر یہی ہوتا ہے۔اگر دودھ دینے والے جانور کا دودھ بند کرنا مقصود ہو تو پھر منتر میں جہاں لفظ پھوز گم آتا ہے وہاں لفظ گڑم لگایا جاتا ہے جیسے یہ ہے:

پیری پوری موسوت گڑم
زوں پھوز وں گڑم
کنی چرے دونی گڑم
دوئی ٹرے باس گڑم
تربڑا تربڑا آئے مہیئے گون گڑم

چاتھرے (زچگی کا) منتر: زچگی کی آسانی کے لئے بھی ایک منتر پایا جاتا ہے۔اکا دکا بڑی عمر کی تجربہ کار خواتین کے پاس اس کا ازن ہوتا ہے۔ایسی خواتین کو زچگی والے گھر قبل از وقت لایا جاتا ہے اور وہ زچگی کے دوران زچہ پر یہ منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی ہے۔منتر کے چند بول:

آرے موجیم، بارے موجیم
کورے کو ردم موجیم
شیرے شیر غم موجیم

دوئی ساپ کا منتر: یہ منتر دھدر اور دانوں کی بیماری کی ایک قسم کے لئے ہے۔مرد یا عورت دونوں کے پاس اس کا وزن ہوتا ہے۔

اونجھو پھروا
چچیر وپھروا
گیلی گئیں گیئے یم پھروا

ٹُر کا منتر: ٹُر کی بیماری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں بچہ کا سینہ جکڑ جاتا ہے۔جس سے بچہ کو کھانسی ہوتی ہے اور سانس چڑھ جاتا ہے۔اس کے دم کے لئے دم کرنے والی خاتون دم کرتی ہے اور پھر چھری کی الٹی طرف بچہ یا بچی کے گلے پر پھیر کر کہتی ہے خدئے گہ پیر اوستازے حکم گی تھوئے زِری دونیم یا۔یہ کہنے پر بچہ کی ماں ہاں کہتی ہے۔دم کے بول:

خلیم خلیم دُرپیرُ وچی خلیم
دُرمر جا نیو خلیم
دخالینہ بُدا چادے
دادے ٹُر دم دے

(یہ منتر پشتو زبان سے ماخذ ہے۔اس کے آخری دونوں سطریں پشتو زبان میں ہیں)۔

چچیو منتر (پستانوں کے درد کا دم): عورتوں کے پستانوں میں اگر درد یا سُرخی ہو جائے تو مندرجہ ذیل منتر پڑھ کر دم کیا جاتا ہے۔اس منتر کی ترتیب یہ کہ دم کرنے والی خاتون اپنے پستانوں پر دم کرتی ہے اور اس کا اثر بیمار خاتون کے پستانوں پر ہوتا ہے اور وہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔منتر یہ ہے:

آلو وتھو، بالو وتھو

ی موزہ مجی بو جو دتھو

تن جڑے تنڈ ور جڑے

پار آئے جنکوئے چچکو پیکس

(اس منتر میں بھی پشتو کے الفاظ پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی پشتو ماخذ ہے)

پلکے دم: پلاک یعنی دل میلہ ہونے لگے یا الٹیاں آئیں تو اس کے لئے پانی پر دم کر کے پیا جاتا ہے۔ دم کے بول:

ہشپا نبی پا ئد ا شا

ہاشپاپدی نہ روان شا

ہاشپاپدین روخان شا

(یہ منتر بھی پشتو زبان سے ماخذ ہے جیسا کہ اس کے کلمات سے ظاہر ہوتا ہے)

لسگرے دم: اس بیماری میں آنکھوں سے پانی بہتا ہے یا آنکھیں درد کرتی ہیں۔ اس کے لئے سیاہ سوتی کپڑے کا پلیتا بنا کر اس پر دم کیا جاتا ہے اس کے بعد پلیتا کو جلا کر آنکھوں کو اس کا دھواں کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ پلیتا کی بجائے دم پڑھ کر پھونکتے ہیں۔

کیں دم: بچہ یا بچی جب بار بار اجابت کرے تو کہتے ہیں کہ بچہ کو کیں ہوگئی ہے۔ اس کے لئے جو منتر پایا جاتا ہے وہ پڑھ کر بچہ یا بچی کی اجابت کی جگہ پر پھونکا جاتا ہے۔

تانگ دون (داغنا): دم اور منتروں کے علاوہ یہاں بیمار کو داغنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ اس عمل کو تانگ دون کہا جاتا ہے۔ اس کے کئی طریقے پائے جاتے ہیں جو یہ ہیں:

☆ جب کسی عورت یا بچہ کو سُرخے کی بیماری ہو تو اس کے جسم کو داغا جاتا ہے۔ اس کے لئے گھندلی نامی پودے (Sumbucus wightianum) کا خشک چھلکا (جسے کھاپ کہا جاتا ہے) استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جسم کے جس حصہ کو داغنا مقصود ہو اس پر تھوڑی سی کھاپ رکھ کر اس پر تیلی جلائی جاتی ہے جس سے جسم جلتا ہے۔ اگر ضرورت کے وقت کھاپ دستیاب نہ ہو تو رُوئی سے بھی داغا جاتا ہے۔

☆ بعض عورتیں راکھ سے داغنے کا عمل کرتی ہیں اس سے بچہ کے جسم پر جلنے کا کوئی داغ نہیں ہوتا۔

☆ کچھ مردوں کو لہاب سے داغتے ہوئے بھی مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس قسم کے اکا دکا لوگ پائے جاتے ہیں جو لہاب سے داغنے کا عمل کرتے ہیں۔

پرہیز: اگر بچہ کو داغا گیا ہو اور وہ ماں کا دودھ پیتا ہو تو ماں کے لئے ضروری ہے کہ وہ تین سے سات دن تک نمک یا نمک والی کوئی چیز نہ کھائے۔ اس کے علاوہ تین دن تک ہاتھ بگونا بھی منع ہے۔

جڑی بوٹیوں کی روایتی دوائی کی اقسام

جڑی بوٹیوں سے بنائی جانے والی روایتی دوائی کو بنیادی طور پر چھ اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆ سفوف کی قسم (اس کی پھکی لی جاتی ہے یا زخم پر چھڑکاؤ کیا جاتا ہے)۔

☆ شربت کی قسم (کسی پودے کے پتے، چھال یا جڑیں کوٹ کر شربت کا پیالہ بنایا جاتا ہے۔

☆ مرہم کی قسم (کسی پودا کے پتے، دانہ، جڑ یا چھلکا خشک کر کے پیس کر اس میں گھی یا کچھ اور ملا کر اس کی مرہم بنائی جاتی ہے جو زخم پر لگانے کے کام آتی ہے۔

☆ گولی (پودا کے پتے، دانہ، جڑ یا چھلکا پیس کر اس کی گولیاں بنا کر استعمال کی جاتی ہیں)۔

☆ پتا (کسی پودا کا پتا گرم کر کے اور اس پر کچھ لگا کر دانہ یا زخم پر رکھا جاتا ہے)۔

☆ حلوہ نما (کچھ جڑی بوٹیاں ایسی بھی ہیں جنہیں کوٹ کر گھی میں پکا کر حلوہ نما دوائی تیار کی جاتی ہے جیسے کمر درد کے لئے چکنی نامی پودے کی دوائی)۔

اپنی تاثیر کے حوالہ سے کچھ دوائیاں گرم ہوتی ہیں اور کچھ سرد قسم کی۔ استعمال کے دوران ان کا خیال رکھا جاتا ہے۔

جڑی بوٹیوں کا روایتی استعمال: مقامی سطح پر جڑی بوٹیوں سے روایتی علاج معالجہ کا رواج پایا جاتا ہے۔ خواتین اور مردوں کو ان جڑی بوٹیوں کے فوائد اور ان کے استعمال کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ان جڑی بوٹیوں سے جہاں بیماریوں کے علاج کے فوائد حاصل کئے جاتے ہیں وہاں اس سے رنگائی، بالوں کا بڑھانا اور بناؤ سنگھار کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مال مویشیوں کی بیماریوں کے لئے بھی جڑی بوٹیوں کو کام میں لایا جاتا ہے۔

لوک ناچ اور کھیل تماشے

ناچ کے تین اہم جزو: سُن ناچ خواہ عورت کا ہو یا مرد کا اس میں تین چیزیں ناچ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک تال، دوسرا ہاتھوں اور تیسری پاؤں کی حرکت۔ عورتوں کے ناچ میں ہاتھ اور پاؤں کی حرکت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور

اسی سے کسی کے ناچ کے فن کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

ہرِ پ (مردوں کا ناچ): کوہستان اور شمالی علاقہ جات میں ناچ گانے کا رمز یا آہنگ ایک جیسا ملتا ہے اور اس کے لئے ایک جیسے ساز مستعمل ہیں۔ تاہم مردوں اور عورتوں کے ناچ الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے ناچ، شادی بیاہ، بچوں کے ختنے یا دوسرے خوشی کے موقعوں پر دیکھنے میں آتے ہیں۔

ڈھول اور سرنا بجانے والے کو ہر کسی نے ناچ کا انداز اور تال معلوم ہوتی ہے اس لئے جس کو نچوانا چاہیں اس کی تال اور سر چھیڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد متعلقہ فرد بیٹھ نہیں سکتا بلکہ اس کے کاندھے پھڑکنے لگتے ہیں اور وہ مجمہ میں گود جاتا ہے۔

مردوں کے ناچ کی دو قسمیں: مجھے ہربن وادی میں بتایا گیا کہ مردوں کے ناچ کی دو قسمیں ہیں ایک بلہ نوٹ (جسے یہ تنبل بھی کہتے ہیں) اور دوسری بے غم نوٹ (جسے یہ بزم کہتے ہیں)۔ بتایا گیا ہے کہ دونوں میں فرق تال اور ناچ کی رفتار کا ہوتا ہے۔ بلہ نوٹ میں تیزی ہوتی ہے اور جسم کو تیزی سے حرکت دی جاتی ہے جبکہ بے غم نوٹ میں آہستگی کے ساتھ قدم اور ہاتھ ہلائے جاتے ہیں

ہتن: ہتن کے لغوی معنی ہنگامہ کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں مراد مردوں کے ناچ کی وہ قسم ہے جس میں کافی سارے مرد مل کر ناچتے ہیں۔ اس قسم کا ناچ ہربن اور چھلاس کی وادیوں میں زیادہ مقبول ہے۔ پہلے پہل جلکوٹ، پالس اور کوئی میں بھی اس قسم کے ناچ گانے ہوتے تھے مگر اب بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

عورتوں کے ناچ

عام ناچ: عورتوں کے عام ناچ کو نوٹ کہا جاتا ہے۔ عام نوٹ میں ایک عورت ناچتی ہے۔ یہ ناچ چادر کو بازوؤں پر پھیلا کر ناچا جاتا ہے۔ ہاتھ اور انگلیوں کو انتہائی مہارت سے حرکت دی جاتی ہے۔ بعض اوقات بازو اوپر نیچے کئے جاتے ہیں۔ اس دوران بعض خواتین منہ سے سیٹی بجاتی ہیں اور بعض چچ چچ قسم کی آوازیں نکالتی ہیں۔ اس ناچ کے دوران عورتوں کے عام دو مصرعہ گیت گائے جاتے ہیں۔ ایک عورت تھال یا ڈھول بجاتی ہے۔ جب ایک عورت تھک کر اپنا ناچ ختم کرتی ہے تو دوسری شروع کر دیتی ہے۔ ہر ناچ کی اپنی اپنی تال ہوتی ہے اور اسی تال کے مطابق ناچا جاتا ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر سب سے زیادہ دولہا کی بہنیں، چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد یا پھر بھانجیاں ناچتی ہیں۔ بعض اوقات دولہا کی ماں اور دادی کو بھی مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ناچے۔ قریب کی رشتہ دار عورتیں بھی دل کھول کر ناچتی ہیں۔

پہلے پہل عورتوں کے ناچ کے دوران ڈوم ڈھول بجایا کرتا تھا مگر اب ڈوم کو عورتوں میں ڈھول بجانے کی اجازت نہیں۔ کہتے ہیں ایک قبیلہ کا ڈوم اچھا ڈھول نہیں بجا سکتا تھا اس پر اس قبیلہ والوں نے اسے کچھ مدت کی مہلت دی تاکہ وہ کہیں جا کر ڈھول بجانے میں اچھی مہارت حاصل کر لے ورنہ اسے چھٹی دی جائے گی اس پر جلکوٹ یا ہربن کی طرف گیا اور وہاں سے اچھی مہارت حاصل کر کے لوٹا۔

پیخائے نوٹ: عورتوں کے ناچ کی اس قسم کو پیخائے نوٹ اور بعض اوقات گھنوئے پیخہ کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک عورت مزاحی انداز میں ہاتھ میں چمچہ اٹھا کر کسی مرد یا عورت کی نقل اتارتی ہے جس میں مار پیٹ یا دوسرا مزاحی انداز ملتا ہے۔ بعض خواتین کسی گنجی یا گنجی عورت کی نقل اتارتی ہیں۔ عورتوں میں اسے کافی پسند کیا جاتا ہے۔ اس میں عجیب و غریب قسم کی نقلیں اتاری جاتی ہیں۔ سخت مزاج شوہر، سُسر اور ساس بھی اس ناچ کا موضوع بنتے ہیں۔ جس طرح یہ ناچ پیخہ یا مزاح سے منسوب ہوتا ہے اسی طرح اس ناچ کے دوران جو دو یا ڈیڑھ مصرعہ گیت گائے جاتے ہیں وہ بھی مزاح کے انداز کے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک عورت نے یہ گیت سنایا جو اس طرح:

دو گھنو تھوئی ائی چالی	(اے گنجی تیری بکری سوئی)
دو گھنو توڑہ کھونی بلن	(اے گنجی تجھے کھانے کو بولی ملی)

قُربون، قُرلو: یہ دو قسم کے الگ الگ ناچ ہیں لیکن ان میں جو مشترک بات ہے وہ مل کر، ہاتھ پکڑ کر، زیادہ تعداد میں اور دائرہ کی شکل میں ناچنے کی ہے۔ ان میں عورتیں گانے کے ساتھ ساتھ ناچتی ہیں۔ زور زور کی سیٹیاں بجائی جاتی ہیں۔ منہ سے اخ و دخ، چچ چچ آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ یہ ہنگامہ قسم کا ایک ناچ ہوتا ہے جس میں آوازوں کا شور بھی شامل ہوتا ہے۔

پھست پیوُں: یہ دو عورتوں کے ناچ کی ایک قسم ہے۔ اس میں دونوں الگ الگ بغیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ناچتی ہیں۔ اس ناچ کے دوران بھی منہ سے سیٹیاں اور آوازیں (چچ چچ، اخ و دخ) نکالی جاتی ہیں۔

جوانوں کے کھیل: ☆ تھام، لنگڑیاں، تتہ بات، کھڑی، کھکینے ٹھک، ٹھری۔

☆ کبڈی، کشتی، کھونچیں، اخروٹ۔

بچوں کے کھیل: ☆ کھڑی، غلیل، ہال، چنری، لشو بکری، ربڑہ، کھکئے، چھمن۔ ☆ اخروٹ، لشوبکری، کھوثیں، چنری، کبڈی۔

بچیوں کے کھیل: ☆ گوڑی، لئے لاہار، چنری، دوں، بیدنس، چولہے بنانا۔ ☆ شن کڑے، ٹوکرائے، دوں بدون۔

چند کھیلوں کی تفصیل:

کھیل کا نام: کھکے بون (اخروٹ کھیلنا)

کھیل کا موسم: خزاں کے بعد

کھیل برائے: لڑکے اور بڑے

تعداد افراد: دو یا اس سے زائد

کھیل کا طریقہ کار: یہ کھیل اخروٹ کھیلنا کہلاتا ہے۔ اس کھیل میں بڑی کھکے (پہاڑی اخروٹ) استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ پہاڑی اخروٹ کی کاشت موسم خزاں میں ہوتی ہے اور عام طور پر لڑکے یا بڑے مرد موسم سرما میں عموماً برف باری کے بعد جب زیادہ ترنقل وحرکت محدود ہو جاتی ہے تو اس کھیل سے دل بہلاتے ہیں۔ اس کھیل میں دونوں طرف کے افراد برابر ہوتے ہیں۔ مخصوص جگہ پر ایک گول دائرہ بنایا جاتا ہے۔ ناس ڈالنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر کھلاڑی باری باری اخروٹ کا ایک دانہ دائرہ کی طرف پھینکتا ہے اس طرح سب کھلاڑی ایسا کرتے ہیں۔ آخر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ متعلقہ دائرہ کے سب سے زیادہ قریب کس کے اخروٹ کا دانہ ٹھہرا ہوا ہے۔ جو دائرہ کے جتنا قریب ہوتا ہے اس کی باری سب سے پہلے مانی جاتی ہے اور کھیل شروع کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد متفقہ طور پر ہر کھلاڑی محدود تعداد میں برابر برابر اخروٹ کے دانے دائرہ میں رکھ دیتا ہے۔ پھر جس کی باری سب سے پہلے آتی ہے وہ ایک متعین شدہ فاصلہ سے اخروٹ کے ایک دانہ سے دائرہ میں رکھے ہوئے اخروٹوں کا نشانہ لیتا ہے۔ جس دانے سے نشانہ لیا جاتا ہے وہی دانہ اگر متعلقہ دائرہ میں رہ جائے اور باہر نہ نکل سکے تو وہ آدمی آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اگر دائرہ میں رکھے اخروٹوں کے نشانہ پر کچھ دانے چوٹ پر باہر نکل جاتے ہیں تو وہ دانے کھیلنے والے کے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہی کھلاڑی دوبارہ نشانہ لگانے کا حقدار ہوگا۔ دوبارہ اگر اس کا نشانہ خطا گیا ہو تو پھر دوسرے کھلاڑی کی باری آجاتی ہے۔ اسے طرح کھیلتے ہوئے جو جتنے دانے نشانہ کے زریعے دائرہ سے باہر نکالے گا اس کے ہوتے جائیں گے۔ دانے ختم ہونے کے بعد اسی ترتیب سے کھیل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں ہر آدمی دیکھتا ہے کہ اس کے پاس کتنے اخروٹ ہیں جس کے ختم ہو جائیں وہ ہار جاتا ہے۔

کھیل کا نام: تھام دون

کھیل کا موسم: کوئی خاص موسم مقرر نہیں

کھیل برائے: بڑے

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: یہ بڑوں کا کھیل ہے اور اس کا کوئی خاص موسم نہیں ہوتا جب جی چاہا کھیل لیا۔ اس کھیل کو دو یا دو سے زائد افراد کھیل سکتے ہیں۔ اس کھیل کے لئے کچھ فاصلہ پر آمنے سامنے دو بڑے بڑے پتھر کھڑے کئے جاتے ہیں برابر کے کھلاڑی دونوں پتھر کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک ایک آدمی ہاتھ میں پتھر اٹھا کر اس سے بڑے پتھر کا نشانہ لیتا ہے۔ اس طرح دونوں ٹیمیں باری باری نشانہ لگا کر کھیلتے ہیں جس ٹیم کے بندے پتھر پر زیادہ چوٹیں مارتا ہے وہی جیت جاتا ہے اور اس کی نشانہ بازی مانی جاتی ہے۔ جب ایک مرتبہ ہار جیت ہو جاتی ہے تو دونوں ٹیمیں اپنی اطراف بدل دیتی ہیں۔ جیتنے والی ٹیم ہارنے والی ٹیم کی جگہ لے لیتی ہے اور دوبارہ کھیل شروع ہو جاتا ہے۔

کھیل کا نام: کھسیں

کھیل کا موسم: کسی بھی موسم میں

کھیل برائے: مرد، لڑکے

تعداد افراد: دو یا اس سے زائد لیکن برابر برابر

کھیل کا طریقہ: ایک ہی تعداد میں برابر برابر کھلاڑی آمنے سامنے ہوتے ہیں ایک طرف کی ٹیم میں سے ایک فرد کا نام پشی (بلی) ہوتا ہے۔ جب مدمقابل ٹیم پشی کو آؤٹ کرتی ہے تو یہ ان کی جیت ہوتی ہے۔ طریقہ کھیل یہ ہے کہ زمین پر ایک گول دائرہ بنایا جاتا ہے اور دونوں طرف کی ٹیمیں آمنے سامنے ہوتی ہیں۔ تمام کھلاڑی ایک ہاتھ سے پشت کی طرف سے پاؤں کو اوپر اٹھا کر انگوٹھا پکڑ کر ایک پاؤں کے بل چلتے ہیں اور مخالف ٹیم کے فرد کو دھکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اگر کسی کا انگوٹھا اس طرح چھوٹ جائے تو وہ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اور دائرہ سے باہر نکل کر بیٹھ جاتا ہے۔ بقیہ ساتھی کھیلتے رہتے ہیں۔ مخالف ٹیم کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بلی کو گرائے جب کہ کھلاڑی بلی اپنے ساتھیوں کی پشت پر اپنے آپ کو بچانے کی کاشش کرتا ہے۔

کھیل کا نام: اٹی ڈنڈا

کھیل کا موسم: مارچ سے مئی تک

کھیل: بچوں کا

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: تولی (ٹاس) کا طریقہ یہ ہے کہ کھلاڑی اٹی کو دائرہ کی طرف پھینکتا ہے جس کی اٹی دائرہ کے زیادہ قریب ہو اس کی باری پہلے آتی ہے۔ کھیلنے والے کے ہاتھ میں لکڑ کا دو فٹ کے برابر ڈنڈا ہوتا ہے۔ کھلاڑی دائرہ کے ساتھ کھڑا ہو کر اس سے زمین پر پڑی ہوئی اٹی پر چوٹ لگاتا ہے۔ اٹی کو صرف تین بار چوٹ مارنی ہوتی ہے۔ اگر کھلاڑی نے اٹی کو زور سے مار کر کہیں دور پھینکا تو جہاں وہ گرے گی وہاں سے دوسرا کھلاڑی اسے اٹھا کر دائرہ کی طرف پھینکتا ہے۔ اگر اٹی دائرہ میں آ کر ٹھہرے تو پھر کھیلنے والا آؤٹ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دوسرا کھلاڑی کھیلتا ہے۔ اگر دائرہ میں اٹی نہ ٹھہرے یا کچھ فاصلہ پر رک جائے تو پہلے سے کھیلنے والا آؤٹ نہیں ہوتا اور وہ دوبارہ اٹی کو چوٹ لگا کر دور پھینکنے کی کوشش کرتا ہے جونہی چوٹ سے اٹی اوپر اٹھتی ہے تو وہ اس پر ڈنڈا سے کراس چوٹ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر چوٹ لگانے سے پہلے مخالف کھلاڑی نے اٹی کو ہوا میں پکڑ (کیچ) لیا تو پھر بھی کھیلنے والا آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں دوڑنا بھی پڑتا ہے اس لئے کھلی جگہ اس کے لئے موضوں ہوتی ہے۔

کھیل کا نام: توتہ بات

کھیل کا موسم: بہار میں

کھیل: جوانوں/بڑوں کا

تعداد افراد: پانچ یا پانچ سے زائد

کھیل کا طریقہ: دونوں طرف آمنے سامنے سے برابر برابر کھلاڑی مقرر ہوتے ہیں۔ زمین پر ایک گول دائرہ کھینچا جاتا ہے۔ اس دائرہ میں ایک طرف کے بندے بھی دائرہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دوسری طرف کے کھلاڑی دائرہ کی شکل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے گرد گھومتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دائرہ میں بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص پر ہاتھ کی چوٹ لگائے۔ جس آدمی پر ہاتھ لگ جائے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ گھومنے والوں میں سے کسی بھی شخص کو پکڑ لے۔ جو آدمی پکڑا جائے وہ آؤٹ ہو جاتا ہے اور جو آدمی پکڑنے سے بچ جائے اور ہاتھ لگانے میں کامیاب ہو جائے تو جس پر ہاتھ لگے وہ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ آؤٹ ہونے والا ٹیم سے نکل کر آرام کرتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ آخر تک چلتا ہے تا آنکہ سب آؤٹ نہ ہو جائیں۔

کھیل کا نام: ہی گہ کون (تیر کمان)

کھیل کا موسم: خزاں

کھیل: بچوں کا

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: یہ تیر کمان کا کھیل ہے۔ کسی مقررہ جگہ پر کوئی خاص نشانی رکھی جاتی ہے۔ اس نشانی پر ہر ایک تیر مارتا ہے۔ جس کا تیر نشانے پر لگ جائے اس کی جیت ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فاصلہ یعنی رفتار کا مقابلہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس میں نشانہ نہیں ہوتا بلکہ تیر دور سے دور پھینکنا پڑتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ کس نے اپنا تیر دور پھینکا ہے۔ جس کا تیر دور گرے اس کی کامیابی ہوتی ہے۔ اس میں دو ٹیمیں آمنے سامنے ہوتی ہیں تاہم ہر آدمی اپنی اپنی جگہ ایک کھلاڑی ہوتا ہے اور ان کی ہار جیت بھی انفرادی ہوتی ہے۔

کھیل کا نام: ٹھک

کھیل کا موسم: خزاں کی راتیں

کھیل: بڑے مرد

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: اس کھیل میں بھی دو ٹیمیں آمنے سامنے ہوتی ہیں۔ تاہم ہر آدمی اپنی جگہ ایک انفرادی کھلاڑی ہوتا ہے اور ان کی ہار جیت بھی انفرادی ہوتی ہے۔ ہر کھلاڑی مختلف تعداد کے اخروٹ کے دانے ہاتھ میں پکڑتا ہے اور باقی دانے اپنی جھولی میں چھپا کر رکھتا ہے۔ اس طرح ہر آدمی اپنے ہاتھ میں پکڑے اخروٹ کے دانے باری باری دکھاتا ہے جس کے ہاتھ میں سب سے زیادہ دانے ہوں تو کم دانوں والے بھی لوگ اسے اپنے دانے دے دیتے ہیں۔ اگر دو کھلاڑیوں کے ہاتھ میں برابر دانے ہوں تو جو ہاتھ پہلے دکھاتا ہے اس کو اپنے دانے بھی دینے پڑتے ہیں۔ تاہم یہ یاد رہے کہ جھولی کے اخروٹ نہیں دیئے جاتے بلکہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخروٹ دیئے جاتے ہیں۔ یہ کھیل عموماً خزاں کی راتوں میں حجرہ کے اندر کھیلا جاتا ہے بعض اوقات کھیلتے کھیلتے صبح ہو جاتی ہے۔

کھیل کا نام: لوکا چو

کھیل کا موسم: کسی بھی موسم میں

کھیل: بچیوں کا

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: یہ بچیوں کا کھیل ہے۔ بچیاں ٹولیوں کی شکل میں کھیل کی جگہ پہنچتی ہیں۔ یہاں مختلف قسم کے مصنوعی گھر بنائے جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ملا کر گھر کی شکل بنائی جاتی ہے اور اسے گھر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کھیل میں چھوٹی بچیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں۔ ہر ٹولی میں ایک بچہ ہوتا ہے اس کو خاوند سے تشبیہہ دی جاتی (یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مقامی زبان میں اسے بھائی پکارا جاتا ہے لیکن پس منظر میں وہ خاوند ہوتا ہے)۔ کھیل میں شادیاں کرائی جاتی ہیں۔ اس میں ناچتے بھی اور گانے بھی گائے جاتے ہیں جو عام معمول کی زندگی اور ثقافت میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عیدوں کے ماقع پر بھی بچے یہ کھیل کھیلتے ہیں۔ بعض اوقات بچیاں اپنے ساتھ کچھ مقدار میں مکئی اور برتن ساتھ لے جاتی ہیں اور کھیل کی جگہ آگ جلا کر دانے بھوان کر کھاتی ہیں۔ شام کو واپسی پر بچیاں ایک دوسری سے کہتی ہیں کہ جو مذاق وغیرہ ہو گیا اس کو معاف کر دینا۔

کھیل کا نام: لُکشتو

کھیل کا موسم: جب جی چاہے

کھیل: بچوں کا

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: یہ بوں کا کھیل ہے۔ ایک بالشت کی چھوٹی لکڑی کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کا ایک سرا چھوٹا اور دوسرا موٹا ہوتا ہے۔ چھوٹے سرے کو نوکیلا بنایا جاتا ہے جو حصہ موٹا ہوتا ہے اسے ہلکا سا چیر کر اس کے اندر دو سے تین تک مرغی کے پر لگائے جاتے ہیں۔ اس کے لئے ایک نشانی کی جگہ مقرر کی جاتی ہے جس کے بعد باری باری اسے جتنا ہو سکے دور پھینکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا لکشتو دور جا کر گرتا ہے یا جہاں نشانہ لگاتا ہے اس کی جیت ہوتی ہے۔ یہ کھیل بھی ہپی گہ کون کے کھیل سے ملتا جلتا ہے۔

کھیل کا نام: ٹوکرائے

کھیل کا موسم: جب جی چاہا

کھیل: بچیوں کا

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: یہ چھوٹی بچیوں کا کھیل ہے۔ ہر بچی کے پاس چھوٹے چھوٹے پانچ کنکر ہوتے ہیں۔ ان میں سے چار کو نیچے رکھا جاتا ہے اور ایک ہاتھ میں ہوتا ہے جو کنکر ہاتھ میں ہوتا ہے کھیلتے وقت اسے ہوا میں اچھالا جاتا ہے اور اس دوران نیچے رکھے ہوئے چاروں کنکر ایک ہی نشت میں اٹھانے پڑتے ہیں اور ہوا میں اچھالا ہوا کنکر بھی پکڑا جاتا ہے اور گرنے نہیں دیا جاتا۔ اگر پانچوں کنکر ہاتھ میں آجائیں تو اس کی جیت ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نیچے گر جائے تو ہار ہوتی ہے۔

کھیل کا نام: لِشو لشو (چھپن چھوت)

کھیل کا موسم: مارچ سے مئی تک

کھیل: بچے اور بچیاں

تعداد افراد: دو یا دو سے زائد

کھیل کا طریقہ: یہ بچوں کا کھیل ہے لیکن بچیاں بھی اسے کھیلتی ہیں۔ اس میں کھیلنے والے برابر کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ جن کی باری ہوتی ہے وہ کہیں چھپ جاتے ہیں۔ اس کے لیے ایسی جگہ دائرہ بنایا جاتا ہے جب کھیل شروع ہوتا ہے تو ایک طرف کے بچے کہیں چھپ کر سیٹی کی آواز لگاتے ہیں اس کے بعد ان کی تلاش شروع کی جاتی ہے۔ چھپے ہوئے جب مل جائیں تو تلاش کرنے والا ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہے جس کے سر پر ہاتھ رکھا جائے وہ آؤٹ سمجھا جاتا ہے۔ اگر چھپے ہوئے کے سر پر کوئی ہاتھ نہ رکھ سکے اور وہ بھاگتا ہوا دائرہ میں پہنچ جائے تو یہ اس کی جیت سمجھی جاتی ہے اور اگر اسے بھاگتے ہوئے دائرہ میں پہنچنے سے پہلے پکڑ کر سر پر ہاتھ مارا جائے تو وہ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ یہ کھیل عموماً بارش کے دنوں میں گھروں کے اندر کھیلا جاتا ہے بارش کے دوران دوسرے کھیل کھیلنا ممکن نہیں ہوتا اس لئے گھروں کے اندر اسے کھیلنے کو ترجیح دی جاتی ہے

کھیل کا نام: بُڑا

کھیل کا موسم: خزاں

کھیل: بچوں کا

تعداد افراد: پانچ یا پانچ سے زائد

کھیل کا طریقہ: اس کھیل میں جتنے بھی کھلاڑی ہوتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں اور ایک لڑکا ان میں سب سے آگے ہوتا ہے جسے بُڑا کہا جاتا ہے۔ لڑکے بستی کے گھر گھر جاتے ہیں اور ہر دروازہ پر جا کر مکئی یا دوسری اشیاء مانگتے ہیں۔ لوگ تھوڑی بہت مکئی، چاول یا دوسری اشیاء دیتے ہیں۔ جب یہ اناج جمع ہو جاتا ہے تو بچے کسی دکان یا شخص کو بیچ کر رقم حاصل کر کے مرغا اور چاول خرید لاتے ہیں اور ایک جگہ جمع ہو کر اس کو پکا کر نوش کرتے ہیں اور آخر میں ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ مانگنے کے دوران بچے بستی کے گھروں کے دروازوں پر مل کر وہ بُڑا شالے والے کی آوازیں لگاتے ہیں۔

ٹھری (پولو): یہاں پولو کا کھیل بہت ہی سادہ انداز میں کھیلا جاتا ہے اور کم کم مقامات پر دیکھنے میں آیا ہے۔

گھوڑ سواری: گھوڑ سواری اور گھوڑ دوڑ کا شوق زیادہ پایا جاتا ہے۔ کئی مقامات پر ہر جمعرات کو گھوڑ دوڑ کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں بچے، جوان اور بڑے سبھی حصہ لیتے ہیں۔ اس کا اہتمام عموماً موسم گرما میں بلند چراگاہوں پر ہوتا ہے جیسے مڑو، لیدی، سپٹ، چوڑ وغیرہ کے مقامات۔

اہم جھیلیں، پہاڑ، گلیشیئر، ندی نالے اور چراگاہیں

جھیلیں:

☆ تحصیل پالس میں بعض بلند مقامات پر خوبصورت جھیلیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک بڑی جھیل بر پالس کے علاقہ کنڈل میں واقع ہے جو کافی بلندی پر پائی جاتی ہے۔ کافی گہری اور کشادہ ہے۔ جھیل کا ذریعہ گلیشیئرز کا پانی ہے۔ کنڈل نالہ بھی اسی جھیل سے پھوٹتا ہے۔ اس کے علاوہ تختو، مڑو اور لیدی کے بعض مقامات پر بھی چھوٹی چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔ ان جھیلوں کی سطح سمندر سے اوسطاً بلندی اندازاً گیارہ سے تیرہ ہزار فٹ ہے۔

☆ تحصیل داسو کے بعض مقامات پر چھوٹی چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں جن میں بڑی جھیل وادی جلکوٹ میں ہے جو شمیس کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جھیل کافی بڑی ہے۔ اس کے علاوہ جھاق، شہا، مہین سر بٹلی، پشکری، ڈونگہ، شیلو کے مقامات پر بھی چند چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔

☆ تحصیل پٹن کے علاقہ لیٹو اور توایاں کے مقام پر درمیانہ سائز کی جھیلیں پائی جاتی ہے ان کے اردگرد گلیشیئرز ہیں۔ اس کے علاوہ وادی دیر کے بالائی مقامات درہ گنگا، چن سر، درہ میدان اور پیسا کے مقامات پر بھی چند چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔

اہم ندی نالے:

☆ پٹن تحصیل میں وادی دیر، وادی کیال اور پٹن میں تین بڑے نالے پائے جاتے ہیں جو دریائے سندھ میں گرتے ہیں۔ ان کے علاوہ نیلگی، میدان، گنگا، دیر، سنگا، مدرازہ، رانولیا، بنکھڑ، شل خوں، سیر گاہ، سناگی، میدان، پھٹی، دیرہ، سن سر وغیرہ کے مقامات پر چھوٹے نالے پائے جاتے ہیں۔ ان نالوں میں مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض بڑے نالوں پر ڈیم زیر تعمیر ہیں۔

☆ تحصیل داسو میں کئی چھوٹے بڑے نالے بہتے ہیں جن میں جلکوٹ اور کھندیا، ثمر اور ہربین کے نالے بڑے ہیں۔ کھندیا کا نالہ اندازاً 95 کلومیٹر لمبا ہے جو کوہستان کا سب سے بڑا نالہ ہے۔ کچھ اور نالے بھی یہاں پائے جاتے ہیں جن میں دوگا نالہ، سیری نالہ، سویال نالہ، اتھور نالہ، میدان نالہ، ثم نالہ، شابیل نالہ، گبر نالہ۔ سپٹ نالہ، مڑوقق نالہ، چھوچورو نالہ، شکارو نالہ، ڈونگ نالہ، اچھر نالہ، ہربین نالہ، کیگاہ نالہ، بڑی یار، شہا نالہ، بگرو نالہ، ثمر نالہ، سازین نالہ، شتیال نالہ، شگو نالہ، نیلو نالہ، میدان نالہ، ڈنگ نالہ، ہاگ نالہ، رزاقہ نالہ اور جھاق نالہ شامل ہیں۔ تحصیل داسو کے نالوں پر تین سے چھ تک ڈیموں کی تعمیر کے امکانی سروے ہو رہے ہیں۔

☆ تحصیل پالس میں بھی کئی ایک نالے اور ندیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس تحصیل میں سب سے بڑا نالہ مسا (مشا) گاہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پالس وادی میں سے 75 کلومیٹر کی لمبائی میں بہتا ہوا دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ اس کے کئی معاون نالوں میں شریال نالہ، نگی نالہ، گوہر آباد نالہ، کھب کوٹ نالہ، شریدنالہ، کنڈل نالہ، دیوان نالہ، چوڑ نالہ، لیدی نالہ، نیلو نالہ، شیطان نالہ اور پڑدقو نالہ شامل ہیں۔ مشا گاہ میں مقامی قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں تین سے چار تک چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کے ابتدائی سروے ہو رہے ہیں۔

اہم پہاڑ:

☆ تحصیل پٹن میں پندرہ ہزار فٹ تک بلند پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ ان میں اوٹھ، توایاں موچھ، گھوڑا، للاوا، مڈو، پچھی، بوڑی، سرہاب، میدان، گبر، کنڈگی، گنگا، ڈھوپ، شملڈا، پہ چھی، سر، کوراؤ، کنی، چرلک، کراڑئی وغیرہ نام کے پہاڑ شامل ہیں۔

☆ تحصیل داسو میں کئی بلند پہاڑ اور پہاڑی چوٹیاں پائی جاتی ہیں جو کہ سطح سمندر سے 19502 اور 12000 فٹ بلند ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار چوٹیاں ایسی بھی ہیں جو کہ بارہ ہزار فٹ سے کم اونچی ہیں۔ بلند چوٹیوں میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

ڈھیر 14912 فٹ، سلیش، چھوچورو 14768 فٹ، عمر کنڈاؤ 14984 فٹ، کوٹ گل 16030 فٹ، کل کنڈاؤ، ہریپا کنڈاؤ 16728 فٹ، م ڑوق، ڈونگ 16154 فٹ، لاش گلاش 18100 فٹ، لٹس، ڈرڈا، قازیو کنڈاؤ، کھورو پو، چوکو کھگر پہاڑ، مہین کنڈاؤ، پش کری، فلک سیر 19502 فٹ، سیری پہاڑ 17568 فٹ، سویال پہاڑ 16090 فٹ، کئی جبہ، بڑی گو پہاڑ 17333 فٹ، حویلی، جھائل، میلاد، گلی وغیرہ۔ ان پہاڑوں میں پیراڈائیٹ، آہنی خصوصیات والے پتھر، ابرق اور کئی دوسرے معدنیات پائے جاتے ہیں۔

☆ تحصیل پالس کے مغربی ہمالیائی پہاڑی سلسلے اس علاقہ میں قدرتی حد بندی کا کام دیتے ہیں۔ یہاں 13000 سے 18000 ہزار فٹ بلند پہاڑی چوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ چوٹیاں بہادر سیر، غرابین، شہید بیلہ کھن، لیدی کنڈاؤ، کناڑی، دیوان، غازیانو کنڈاؤ، کنڈل، گھنجا، علاقہ چوڑ، کولئی اور بٹیڑہ کے مقامات میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ کئی چوٹیاں ایسی بھی ہیں جن کی بلندی 8000 فٹ سے زائد مگر 13000 ہزار فٹ سے کم ہیں۔

گلیشیئر:

☆ داسو میں کئی ایک درمیانہ اور چھوٹے سائز کے گلیشیر پائے جاتے ہیں جو کہ لاش گلاش، جلکوٹ، سپٹ، ہربین اور کھندیا کی وادی میں واقع ہیں۔ ان میں ہریپو گلی، کبک گلی، شہا وغیرہ کے گلیشیر بڑے ہیں۔ یہ گلیشیر زرعی نظام کے لئے آبی ذخائر کے اہم ذرائع ہیں۔

☆ تحصیل پٹن کے بعض بلند پہاڑی سلسلوں میں درمیانے سائز کے گلیشیرز پائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلے درہ ننگی، درہ میدان، لوڑی، پیسا، چھڑخواں، لال وا، پیلاشی ٹاپ اور وادی پٹن میں تھوئیں، اوٹھ، گھوڑا، ٹکی، چھورٹوں، لیٹو، توایاں میں واقع ہیں۔ یہ گلیشیر مقامی ندی نالوں کا منبع ہیں۔ جو زرعی نظام کے لئے آبی زخائر کے ذرائع ہیں۔

☆ تحصیل پالس کی مختلف وادیوں میں کئی چھوٹے اور درمیانی سائز کے گلیشیر پائے جاتے ہیں جن میں بہادر سیر، لیدی، کناڑی، مڑو، ٹھشونی، ڈھنڈو، لنڈی گاہ، شیطان گاہ، اتری، پڑوقو، دیوان، غازیان، کنڈل، گھنجا کے بعض مقامات شامل ہیں۔ یہ گلیشیر ندی نالوں کا منبع ہیں جو زرعی نظام کے لئے آبی ذخائر کے ذرائع ہیں۔

اہم بلند برفانی چراگاہیں: ☆ تحصیل داسو کے بعض مقامات پر بلند برفانی چراگاہیں پائی جاتی ہیں۔ ان مقامات میں سپٹ، گلی، گہرال، کھندیا، سیو، ممار، سور میلاد وغیرہ کی چراگاہیں شامل ہیں۔ یہ چراگاہیں نہ صرف مال مویشی اور جنگلی حیات کے لئے اہم ہیں بلکہ محفوظ سیاحتی مقاصد کے لئے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

☆ تحصیل پالس میں آٹھ ہزار سے لے کر تیرہ ہزار فٹ بلند بالائی / برفانی چراگاہیں پائی جاتی ہیں جن میں چوڑ، لیدی، مڑو اور گھنجا کے مقامات پر بڑی اور کشادہ چراگاہیں پائی جاتی ہیں۔ بعض مقامات پر چھوٹی چراگاہیں بھی پائی جاتی ہیں ان میں بہکوئی، کھنا، کناڑی، تورو، ڈھیری، گلی، ڈھندو، پڑوقو، میدان، بوش، دیوان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ چراگاہیں جون سے اختتام ستمبر تک مال مویشیوں کے لئے کھلی ہوتی ہیں اس کے بعد سردی شروع ہو جاتی ہے اور برف پڑتے ہی بیرونی راستے بند ہو جاتے ہیں۔

☆ تحصیل پٹن میں نو ہزار سے لے کر تیرہ ہزار فٹ بلند بالائی / برفانی چراگاہیں پائی جاتی ہیں جن میں ننگی، مڈرو، شلخو، بیک، رچا، چن سر، پھٹی، میدان ٹاپ، بوڑی، پیلاشی، دریدہ، تو نگ، بیسانٹ، گنگا شامل ہیں۔ بلند برفانی چراگاہیں جون سے اختتام ستمبر تک مال مویشیوں کے لئے کھلی ہوتی ہیں۔

کوہستان کی جنگلی حیات

جنگلی حیات: کوہستان کے خشک مرطوب جنگلات، جس کے زیریں علاقے خاردار جھاڑیوں اور زیتون اور شاہ بلوط کے درختوں کا مخلوط تسلسل، مخروطی درختوں کے قدرتی گھنے جنگل، مختلف اقسام کے نباتات سے بھرے نالے اور ڈھلوانیں، بلند برفانی چراگاہیں اور بلند خشک، سرد اور خشک بنجر پہاڑ یہاں کی جنگلی حیات کو قدرتی پناہ گاہیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں اب تک کم و بیش 142 اقسام کے پرندے مشاہدہ کا حصہ بنے ہیں۔ جن میں بھگر، مرغ زریں، کلیج اور مغربی دان گیر جیسے نایاب جنگلی مرغے شامل ہیں۔ یہاں مختلف انواع کے بدیسی پرندے کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس علاقہ میں کبھی جنگلی مرغوں کی بہتات تھی جن میں کلیج اور ریاڑ بھی شامل تھے۔ یہاں مونال کی کافی تعداد پائی جاتی ہے۔ چند اہم جنگلی مرغوں کی تفصیل یہ ہے:

مغربی دان گیر (نر: جچیل، مادہ: می): مغربی دان گیر عالمی اہمیت کا ایک نایاب جنگلی مرغا ہے جو معدومی کا شکار ہونے والے اہم پرندوں میں شامل ہے جس

کا اندراج لال کتاب برائے خطرناک کم تعدادی انواع میں ہو چکا ہے۔ دانگیر ایک خوبصورت پرندہ ہے۔ گرمائی موسم میں یہ پرندہ اپنے پسندیدہ ماحول میں گیارہ ہزار سات سو فٹ تک اوپر اور سرمائی موسم میں چھ ہزار فٹ کی بلندی پر مشاہدہ (پالس میں) کیا گیا ہے۔ نر اور مادہ کے رنگوں میں امتیازی فرق پایا جاتا ہے۔ نر کی گردن سے پچھلے حصہ کا رنگ سیاہ ہوتا ہے جس پر جگہ جگہ سفید دھبے ہوتے ہیں۔ گردن کا حصہ سرخی مائل ہوتا ہے جبکہ گلے کا حصہ ہلکا زردی مائل ہوتا ہے۔ سر کا حصہ سیاہ جبکہ آنکھ کا حلقہ سرخی مائل ہوتا ہے۔ پشت کے بعض پروں پر سلیٹی مائل رنگ کی باریک دھاریاں اور دھبے ہوتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ نر کے رنگوں میں تیزی یا گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ نر کے گلے پر گوشت (چمڑا) کا چھپر سا ہوتا ہے۔ اس کی دم دوسرے جنگلی مرغوں کی نسبت ذرا چوڑی ہوتی ہے۔

دانگیر کی عادات کے مطابق یہ ایک شرمیلا، چور اور انتہائی حساس پرندہ ہے جو گھنے اور خشک مرطوب جنگلات میں انسان سے چھپا رہتا ہے۔ اس کا گھونسلا درخت پر ہوتا ہے۔ یہ پرندہ واں واں کی آواز نکالتا ہے جو نومولود بچہ کے رونے کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔ نر سورج طلوع ہونے سے دن ڈھلنے تک واں واں کی آوازیں دیتا ہے۔ نر سرمائی موسم میں تنہا رہنا پسند کرتا ہے جب کہ بہار کے موسم میں اپنی مادہ کے ساتھ رہتا ہے اور اکثر اس کے گرد ناچنے کے انداز میں چکر لگاتا ہے۔ مادہ اپریل سے جون تک عموماً چار انڈے دیتی ہے جن کا رنگ سرخی مائل دار چینی رنگ کے دھبوں اور باریک چھوٹی دھاریوں سے چتن من ہوتے ہیں۔ مادہ اٹھائیس دن میں انڈے سیتی ہے اور وہی بچے پالتی ہے۔ دان گیر کی خوراک میں نرم اور سبز ٹہنیاں، بیج اور کیڑے مکوڑے شامل ہیں۔

مغربی دان گیر پاکستان، بھارت اور نیپال میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ پرندہ صوبہ سرحد کے اضلاع کوہستان اور مانسہرہ کے علاقہ کاغان میں پایا جاتا ہے اس کے علاوہ اس کی آبادی وادی نیلم، وادی لیپا، اور حاجی پیر میں بھی پائی جاتی ہے۔ کوہستان کی وادی پالس میں کیے گئے حالیہ گرمائی اور سرمائی موسم کے سروے کے مطابق اس پرندے کی یہاں کم از کم تین سو سے زائد جوڑوں کی آبادی پائی جاتی ہے۔ کوہستان میں وادی پالس کے علاوہ مغربی دان گیر کی کچھ تعداد وادی دیبر، وادی کیال، کولئی اور جلکوٹ میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ پرندہ دنیا میں سب سے زیادہ وادی پالس میں پایا جاتا ہے۔

بن ککڑو (مقامی نام: بن ککوں): پرندہ کم بالائی پہاڑی جنگلات میں گروہ کی شکل رہتا ہے۔ یہ پنجاب، سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں بھی پایا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد میں یہ پرندہ سوات، بنیر، کاغان، سرن وادی، الائی، مانسہرہ، گلیات، ہری پور اور کوہستان میں پایا جاتا ہے۔ کوہستان میں اس کی آبادی کم ہو رہی ہے۔ تاہم ماضی میں یہ تعداد کافی زیادہ تھی۔

نر کی پشت کا رنگ چمکیلا نیلا ہوتا ہے۔ دم اور جسم کے درمیانی حصے پر ایک سفید داغ ہوتا ہے۔ دم کا رنگ چمک دار سیاہ اور بھورا ہوتا ہے۔ سر پر سفید پروں کا گچھا تاج کی شکل میں پیچھے کی طرف نکلا ہوتا ہے۔ پیٹ کا رنگ زیادہ تر سلیٹی ہوتا ہے (زکیہ خانم، منظور احمد 1987ء)۔ مادہ کا رنگ بھورا ہوتا ہے جب کہ پروں کے کنارے زردی مائل ہوتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں کی آنکھوں کے حلقے سرخی مائل ہوتے ہیں۔ یہ اپنا گھونسلا زمین پر بناتے ہیں۔ نسل کشی کا موسم جون سے اگست تک ہے۔ مادہ نو یا دس انڈے دیتی ہے۔ اس کی خوراک میں بیج، چھوٹی شاخیں، کیڑے مکوڑے اور نباتات کے دانے، سبز پتے اور پھل شامل ہیں (ذکیہ خانم، منظور احمد 1987ء)۔

مرغ زریں (نر: لیشٹ، مادہ: بولاش): یہ انتہائی خوبصورت، نازک اور مظلوم پرندہ پاکستان، بھوٹان، نیپال، جنوبی تبت اور شمالی ہندوستان میں عام پایا جاتا ہے۔ یہ پرندہ اپنے ماحول میں چھ ہزار سے چودہ ہزار فٹ بلندی تک پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ پرندہ مانسہرہ، سوات، دیر چترال اور کوہستان کے اضلاع اور گلگت و آزاد کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ ضلع کوہستان میں یہ پرندہ پٹن، کیال، پالس، کولئی، بٹیڑہ، بنکھڑ، دیبر، کیال، کنشیر، جلکوٹ، ہربین، رزاقہ اور کھندیا وادی میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

نر مرغ زریں کی پشت اور پہلو نیلاہٹ والے سبز کاسنی رنگ کا ہوتا ہے۔ دم کا رنگ سنہری پیلا اور اس پر ایک سفید داغ ہوتا ہے۔ سر پر تیز چمک دار سبز رنگ کا تاروں سے بھرا ہوا تاج جب کہ پیٹ پر سیاہ رنگ ہوتا ہے۔ مادہ کا رنگ بھورا اور پروں پر سفید سے نشان جبکہ نر اور مادہ دونوں کے آنکھوں کے حلقے نیلے ہوتے ہیں۔ اس پرندہ کی خوراک میں بیج، گھاس، نباتات کی جڑیں اور باریک شاخیں اور کیڑے مکوڑے شامل ہیں۔ اس کی نسل کشی کا موسم اپریل سے جون تک ہے۔ مادہ سرخی مائل رنگ کے سات آٹھ انڈے دیتی ہے۔ یہ پرندہ زمین پر اپنا گھونسلا بناتا ہے۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے یہ پرندہ شکاریوں کا نشانہ رہتا ہے۔ لوک ادب اور شاعری میں اس کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔

بھگر (نر: بچاچو، مادہ: بھگر): یہ پرندہ پاکستان میں وسطی پائن کے جنگلات میں عام پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ہزار سے دس ہزار فٹ بلندی تک پایا جاتا ہے۔ یہ صبح سویرے بولنا شروع کرتا ہے۔ کوہستان میں کافی تعداد میں یہ پرندہ عام پایا جاتا ہے۔ نر کی پیٹھ کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔ دم اور جسم کے درمیانی حصے پر ایک سفید داغ ہوتا ہے۔ دم کا رنگ چمک دار سیاہ اور بھورا ہوتا ہے۔ سر پر سفید پروں کا گچھا تاج کی شکل میں پیچھے کی طرف نکلا ہوتا ہے۔ پیٹ کا رنگ زیادہ تر سلیٹی ہوتا ہے۔ اس کی مادہ کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے اور جسم پر زرد رنگ کی لکیریں ہوتی ہیں۔ اس کی نسل کشی کا موسم مارچ سے جون کے درمیان ہے۔ مادہ بھورے رنگ کے تین سے چھ انڈے دیتی ہے۔ یہ پرندہ زمین پر گھونسلا بناتا ہے اور درختوں پر بسیرا کرتا ہے۔ (ذکیہ خانم، منظور احمد، 1987)۔

ریاڑ/ریار (مقامی نام: بنیال): یہ نایاب اور معدوم ہونے والا جنگلی مرغا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ پاکستان میں معدوم ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ ماضی میں کوہستان کے کئی علاقوں یہ پرندہ پایا جاتا تھا لیکن کھیتوں اور آبادی کے نزدیک چھوٹے چھوٹے غول کی صورت میں رہنے کی وجہ سے اس کی آبادی معدومی کا شکار ہوئی۔ کوہستان میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ پرندہ اب بھی وادی بنکھڑ کے بعض مقامات اور وادی کنشیر و جلکوٹ کے درمیانی حصہ میں پایا جاتا ہے تاہم سروے سے ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

اس کے سر پر پیچھے کی طرف نکلی ہوئی سیاہی مائل بھوری کلغی ہوتی ہے، آنکھوں کے گرد چوڑی سرخ پٹی ہوتی ہے، دم لمبی، بھوری سلیٹی اور چاکلیٹی رنگ کی ہوتی ہے، جس پر چند دور دور واقع کالی اور سلیٹی دھاریاں ہوتی ہیں۔ پیٹ کا رنگ پہلوؤں پر سلیٹی اور درمیان میں سیاہ ہوتا ہے (ذکیہ خانم، منظور احمد، 1987ء)۔

دیگر پرندے: متذکرہ بالا جنگلی مرغوں کے علاوہ یہاں چکور، رام چکور، مرغابیاں اور کئی دوسرے چھوٹے پرندے پائے جاتے ہیں۔

ممالیائی جانور: کوہستان کے زیریں چیڑ پتوں والے جنگلات، وسطی پائن کے جنگلات و نباتات، بلند چراگاہیں اور بلند تر پہاڑی ماحولیاتی منطقے یہاں کی جنگلی حیات کو اہم ماحول فراہم کرتے ہیں۔ یہاں مختلف اقسام کے اہم ممالیائی جانور پائے جاتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

آئی بیکس: (مقامی نام: کل) لمبے اور مڑے ہوئے سینگوں والا یہ جانور دس ہزار سے اٹھارہ ہزار کی بلندی تک انتہائی سرد، دشوار، خشک اور بنجر پہاڑوں میں چھوٹے بڑے گروہ کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ جانور سوات، مانسہرہ، کوہستان اور سلسلہ ہندوکش میں چترال کے اضلاع میں پایا جاتا ہے۔ شمالی علاقہ جات میں بلتستان، ہراموش، دیوسائی، اشکومن، یاسن اور ہنزہ کے بالائی پہاڑی سلسلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ضلع کوہستان میں یہ جانور کولئی، گھنجا، چوڑ، لیدی، سرٹے، بہادر سیر اور جلکوٹ کے انتہائی بالائی پہاڑی سلسلوں میں اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اتھو راور کھندیا وادی کے پہاڑی سلسلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس جانور کا قد چالیس سے پچاس انچ تک ہوتا ہے گرمی اور سردی کے موسم میں اس کے رنگ میں تغیر ہوتا ہے۔ سردی میں زردی مائل سفید اور گرمی میں سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے۔ یہ جانور گھاس پھونس، جڑی بوٹیاں اور دیگر سبزہ پر اپنی گزر کرتا ہے۔ اس کی مادہ مئی، جون میں ایک بچہ دیتی ہے۔

مارخور: (مقامی نام: شرا، میانرو) بکری کی نسل کا یہ اہم جانور جس کی آبادی خطرات سے دوچار ہے پاکستان، افغانستان، بھارت اور سوویت یونین میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ جانور بلوچستان اور سرحد کے اضلاع چترال، دیر، بنیر، مردان، ڈی آئی خان اور کوہستان میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں اس کی دو قسمیں پائی ایک سیدھے سینگ والی اور دوسری ٹیڑھی سینگ والی قسم۔ کوہستان میں یہ جانور جلکوٹ، کیگاہ نالہ، اتھور، کھندیا، دبیر، رزاقہ، مندرازہ، پالس کے علاقہ کلو اور کنشیر میں چھ ہزار سے بارہ ہزار فٹ بلندی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کوہستان میں اس کی آبادی 221 سے 500 تک خیال کی جاتی ہے۔ ماضی کی نسبت اس کی آبادی میں کمی ہو رہی ہے۔ اس جانور کا قد اکتالیس اور سینگ پینتالیس انچ لمبے ہوتے ہیں۔ یہ گھاس، درختوں کے پتے، جڑی بوٹیاں اور سبزہ پر اپنی گزر بسر کرتا ہے۔ جوان مادہ سال میں ایک بچہ جبکہ بڑی عمر کی مادہ دو بچے بھی دیتی ہے۔ یہ جانور بھی چھوٹے بڑے گروہ کی شکل میں رہنا پسند کرتا ہے۔

ان جانوروں کے علاوہ برفانی چیتا (مقامی نام: نیلو دیں)، گلدار (مقامی نام "دیں")، مُشک ہرن (مقامی نام: رونز)، بھورا ریچھ، کالا ریچھ (مقامی نام: کنو ایچھ) کے علاوہ جنگلی بلی، گورال، گرے لنگور، بھیڑیا، لومڑ، گیدڑ، سنہری کھن چوہے، بندر وغیرہ کی کافی تعداد پائی جاتی ہے۔

سرحد کے قبائلی علاقہ جات

پشتون، پختون یا پٹھان اپنے مخصوص سماج اور ثقافتی روایات کو زیادہ محفوظ انداز میں عہد حاضر تک جن علاقوں میں زندہ رکھے ہوئے ہیں یہ ان کے خالص قبائلی علاقہ جات ہیں جو صوبہ سرحد میں ایجنسیوں کے نام سے متعارف ہیں، حکومت پاکستان کی طرف سے ہر ایجنسی میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ متعین ہے جو کہ پاکستان وصوبہ سرحد کے بندوبستی علاقوں اور قبائل کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرتا ہے ان ایجنسیوں میں قبائل کے اپنے مخصوص سماجی اور ثقافتی معاشرے قائم ہیں، اور ان معاشروں میں قبائل پختون اور پٹھانوں کے مخصوص اور ممتاز خصائیل وسماجی روابط اور ان کی معاشرتی حیات کی روایات وثقافتوں کے تحفظات کا ایک جامع اور پختہ نظام موجود ہے جس کے مطابق ان کی شادی وغمی کی تقریبات ان کی جنگی وزمینی جھگڑوں کے فیصلوں کیلئے عدالتی قوانین اور ان قوانین پر مبنی فیصلوں پر پابندی، باہمی سماجی معاملات میں جرگے کا نظام ان کی حریت پسندی اور مہمان نوازی کی پختہ روایات ان کے ہاں مستقل ثقافتی زندگی کی شناخت کا درجہ رکھتی ہیں صوبہ سرحد کے مختلف بندوبستی ومتمدن علاقوں سے جڑی ہوئی اس قسم کی معروف ومشہور ایجنسیوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

خیبر ایجنسی:

قبائلی علاقوں میں خیبر ایجنسی مرکزی حیثیت رکھتی ہے، افغانستان کی سرحد طورخم سے لے کر باب خیبر تک اس کی حد ہے، یہ متعدد حملہ آوروں اور مغرب سے مشرق کی طرف وارد ہونے والی اقوام کی گزرگاہ رہی۔ خیبر ایجنسی پشاور سے چند میل کے فاصلے پر مغرب کی جانب ایک درے کی صورت میں ہے اس لئے اسے عام طور پر درہ خیبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خیبر ایجنسی کا یہ درہ تاریخ کے انمٹ نقوش اپنے سینے پر سجائے ہوئے ہے۔ یہ دو رویہ پہاڑیوں کو کاٹتے ہوئے تقریباً بتیس میل تک پشاور اور کابل کے درمیان ایک خط مستقیم کی شکل میں گزرتا ہے، زمانہ قدیم میں وسطی ایشیاء سے آنے والی اقوام نے اکثر یہی راستہ اختیار کیا۔ خیبر ایجنسی کے مشرق میں پشاور کا قدیم تاریخی شہر ہے جو کہ صوبہ سرحد کا دارالخلافہ ہے۔ اس کے جنوب اور مغرب میں تیراہ کے علاقے کی چھوٹی چھوٹی زرخیز وادیاں ہیں جو کوہ سفید تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تیراہ میں آلو کی پیداوار بہت مشہور ہے۔ اور تیراہ کا آلو پورے صوبے میں مشہور ہے۔ اس کے شمال میں چند میل کے فاصلے پر دریائے کابل گزرتا ہے جو مشرق کی طرف دریائے سوات کے ساتھ مل جاتا ہے اس مقام کو دوآبہ کہتے ہیں پھر یہ دوآبہ دریائے سوات اور کابل یکجا ہو کر مزید مشرق کی طرف بہتے ہوئے جنوب مشرق کی سمت میں سب سے بڑے دریا، دریائے سندھ، کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ دریائے کابل درہ خیبر کی شمالی پہاڑیوں سے نکلتا ہوا پشاور کے میدانی علاقوں میں پہنچتا ہے۔ وید میں دریائے کابل کا ذکر کوبھا کے سنسکرتی نام کے ساتھ ہوا ہے، علاوہ ازیں خیبر کے شمال ہی میں تقریباً دس میل کے فاصلے پر ملاگوری کی گزرگاہ بھی ہے جس کے ساتھ ہی شمال مشرق کی جانب مہمند ایجنسی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، جب کہ اس کے جنوب مشرق کی جانب باڑہ ہے جو اب ایجنسی کی تحصیل ہے اور پھر اس سے متصل ہی جنوب مشرق کی جانب آفریدیوں کی معروف شاخ آدم خیل کا علاقہ ہے جو کہ ایک درہ ہے اور کوہاٹ سے متصل ہے اس لئے اسے درہ کوہاٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایف آر کوہاٹ بھی کہلاتا ہے، جب کہ انتظامی لحاظ سے اسے ایف آر کوہاٹ کہا جاتا ہے یہ درہ آدم خیل دو حصوں میں منقسم ہے، ایک ایف آر کوہاٹ اور پھر اس کے جنوب مشرق کی جانب ایف آر پشاور ہے جو کہ آدم خیل سے پشاور کے ساتھ منسلک ہے، اور خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر انتظام ہے۔ درہ آدم خیل کے آفریدی اپنے علاقے میں دیسی ساخت کی بندوقیں اور بارود بنانے میں مشہور ہے اور ہاتھوں کی چابکدستی سے درہ آدم خیل کے بازار میں اسلحہ ساز فیکٹریوں میں دستکار دیسی ساخت کا اسلحہ تیار کرتے ہیں۔ خیبر ایجنسی کے مشہور مقامات یہ ہیں:

جمرود:

یہاں پر ایک گیٹ بنایا گیا ہے، جسے باب خیبر کہتے ہیں باب خیبر کے ساتھ ہی سکھوں کے دور کے پشاور کے گورنر ہری سنگھ نلوہ نے ایک بہت بڑے احاطے پر مشتمل قلعہ تعمیر کروایا تھا، جسے قلعہ جمرود کہتے ہیں۔

لنڈی کوتل:

یہ خیبر ایجنسی کا مشہور مقام ہے، جہاں ایک بہت بڑا بازار ہے۔ یہی مقام خیبر رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔

علم گودر: کھجوری کے علاقہ میدان میں علم گودر کے مقام پر اسلحہ سازی کا ایک کارخانہ ہے، جہاں ہر قسم کا اسلحہ تیار ہوتا ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ عام طور پر ان

کے تمام بازاروں کو علاقہ غیر سمجھا جاتا ہے اور پاکستان کے بندوبستی علاقوں تک یہاں سے مال پہنچانے کی ممانعت ہے۔

باڑہ بازار:

باڑہ بھی خیبر ایجنسی کی ایک تحصیل ہے اور یہاں دریائے باڑہ گزرتا ہے۔ یہاں پر ایک قدیم قلعہ بھی ہے، دریائے باڑہ کو قدیم زبان میں رود باڑہ کہا جاتا ہے، اس دریا کا پانی زود ہضم اور صحت و توانائی کیلئے بے مثل سمجھا گیا ہے، یہاں پر بھی مختلف بیرونی مال دستیاب ہوتا ہے مگر زیادہ تر دکانیں اب یہاں سے حیات آباد منتقل ہوگئی ہیں، اس بازار کو آب کار خانو کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں مختلف مصنوعات اور خوردنی اشیاء کے کارخانے اور فیکٹریاں ہیں۔

خیبر ایجنسی ایک مشہور درے کی صورت میں تاریخی سند حاصل کر چکی ہے یہ درہ جمرود سے لے کر لنڈی خانے تک 33 میل لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس درے میں 1925ء میں خیبر ریلوے لائن بچھائی گئی تھی اس کے علاوہ اس درے میں جدید مواصلاتی سہولت کے پیش نظر ایک پختہ سڑک، جمرود سے شگئی اور وہاں سے علی مسجد تک جاتی ہے، مگر اب اس میں مزید کام ہو چکا ہے، اور یہاں سے لنڈی کوتل اور لنڈی کوتل سے طورخم تک دورویہ سڑک تعمیر کی گئی ہے، علی مسجد سے مغرب کی طرف تیراہ کو سڑک جاتی ہے۔ درہ خیبر سطح سمندر سے تین ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔

موسمی لحاظ سے درہ خیبر زیادہ تر سرد آب و ہوا کا حامل خطہ ہے اور اس کی پہاڑیوں پر سردیوں کے موسم میں اچھی خاصی برف باری ہوتی ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔

علی مسجد:

درہ خیبر کی ثقافتی اور مذہبی علامت علی مسجد ہے جو ایک پہاڑی ٹیلے پر تعمیر کی گئی ہے۔ تقریباً تمام قدیم کتب میں اس مسجد کا ذکر موجود ہے۔ اس کا تذکرہ مغل شہنشاہ بابر نے بھی اپنی توزک بابری میں کیا ہے، بابر جب کابل سے پشاور کی طرف آرہا تھا تو اس نے علی مسجد کے پاس ہی خیمے لگائے اور یہاں پر قیام کیا اور اس سارے علاقے کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا، علی مسجد کے بالکل سامنے سے تیراہ کی طرف سڑک جاتی ہے، یہ مسجد جمرود سے تقریباً 20 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ مسجد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے منسوب ہے۔ اس مسجد سے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ اس مقام پر ایک جنگ کے دوران حضرت علیؓ نے نماز پڑھی، مسجد کی چھت چوبی ہے اور چار چھوٹے دروازے ہیں، آگے ایک برآمدہ ہے اور پھر بیرونی حصہ میں وضو گاہ ہے، مسجد میں ایک ایسا نادر پتھر موجود ہے جس کے بارے میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ جب حضرت علیؓ اس جگہ نماز پڑھ رہے تھے تو اس علاقے کی ایک کافر عورت جس کا نام خیبرے تھا اس نے یہ پتھر حضرت علیؓ پر پھینکا مگر حضرت علیؓ نے اسے روک لیا، مسجد کے ساتھ ہی ایک ایسا پانی کا چشمہ ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ اس کے پانی سے غسل کرنے والا بیماری سے شفایاب ہو جاتا ہے۔ اس عقیدے کی بنا پر مدتوں سے دور دراز سے بیمار لوگ آکر یہاں نہاتے ہیں۔

ایف آر پشاور:

پشاور کے آفریدی قبائل میں سے ان کی ذیلی شاخ آدم خیل آفریدیوں کا علاقہ ایف آر پشاور ہے۔ انتظامی لحاظ سے یہ خیبر ایجنسی کے ساتھ منسلک ہے، اس کا صدر مقام جانہ کوڑھ ہے۔ دراصل آدم خیل آفریدی دو دروں میں آباد ہیں، ایک درہ جانہ کوڑھ ہے جسے ایف آر پشاور کا نام دیا گیا ہے اور دوسرا پشاور اور کوہاٹ کے درمیان درہ آدم خیل ہے۔

تفصیلات کے مطابق ایف آر پشاور میں ژوا کی آباد ہیں جو دو حصوں میں تقسیم ہیں، ایک حصہ ایف آر پشاور میں اور دوسرا ایف آر کوہاٹ میں۔ ایف آر پشاور کے ژوا کی کی ایک شاخ بوڑھ ہے جو پستونی ژوا کی ہیں۔ ان کے درمیان ایک قوم آفریدی کالاخیل ہے جو کہ انتظامی لحاظ سے خیبر ایجنسی سے ملحق ہے، مشرق کی جانب کالاخیل سرحد کے اختتام پر ایف آر پشاور شروع ہوتا ہے۔ اس میں پہلی آباد قوم اشوخیل ہے، جس کے تین ذیلی قبائل ہیں، علی خیل، آفریدی، اور پکی۔ پھر اس کے بعد حسن خیل قبیلے کے لوگ ہیں۔

جانہ کوڑ میں زکا خیل اور میاں خیل آباد ہیں، جانہ کوڑ ایک ایسا درہ ہے جو کہ موسمی لحاظ سے معتدل اور مرطوب ہواؤں کی گزرگاہ ہے، گرمیوں کے دنوں میں یہاں کا موسم معتدل اور خوشگوار ہوتا ہے اسے صحت افزاء مقام میں شامل کیا گیا ہے، یہاں پر ایک ذیلی درہ موسیٰ درہ کے نام سے موجود تھا جو کہ جانہ کوڑھ کا ذیلی درہ کہلاتا ہے۔ موسیٰ درہ کے پاس ہی ایک ایسا پہاڑ ہے جسے ڈنبرہ کہا جاتا ہے اس ڈنبرہ مقام کی غیر معمولی شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر پشتونوں کی زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر بے بدل اور خٹک پٹھانوں کے سردار خوشحال خان خٹک نے زندگی کے آخری دن گزارے۔ یہاں کے بزرگوں کی طرف سے ایک زبانی روایت یہ بھی رہی ہے کہ خوشحال خان خٹک کی زیر زمین آرام گاہ یعنی قبر بھی یہیں پر ہے کیونکہ جب خوشحال خان خٹک نے وفات پائی تو

اس وقت رسل ورسائل کے وسائل خچروں اور اونٹوں پر مشتمل تھے اور ڈنبرہ کے مقام اور اکوڑہ خٹک کے درمیان طویل مسافت تھی اس لئے اس امکان کو اس طویل فاصلے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خوشحال خان خٹک کو یہیں کسی مقام پر دفن کر دیا گیا ہو، چنانچہ علاقے کے ایک معتبر آفریدی باشندے شیر غنی آفریدی المعروف لالہ کے بقول یہاں کے لوگوں میں یہ مقولہ عام ہے کہ یہی خوشحال خان خٹک کے آخری ایام کی یادگار ہے اور اسی جگہ انہیں دفن کیا گیا تھا۔ مگر تحقیق کے بعد یہاں پر کوئی ایسی علامت نہیں دریافت ہوتی جسے اس بات کی تصدیق کیلئے علامتی نشان قرار دیا جا سکے اور نہ ہی کوئی ایسا ٹھوس ثبوت مل سکا ہے جسے شواہد کے طور پر پیش کیا جا سکے، یہاں پر موسیٰ درہ کے پاس ہی توتکی کا مقام ہے جو آفریدیوں کا علاقہ ہے اور پھر اس کے مشرق کی جانب خٹک قبیلے کی آبادیاں شروع ہو جاتی ہیں جس کے شمال مشرق میں بلند و بالا اور خوشگوار و معتدل موسم کا حامل علاقہ ہے اور اس کے نیچے ڈاک اسماعیل خیل اور دیگر خٹک بستیاں ہیں۔

مہمند ایجنسی

یہ ایجنسی نامور قبیلے مہمندوں کا مسکن ہے جو کہ خیبر ایجنسی کے شمال میں واقع ہے، مہمند ایجنسی کے مشرق میں ملاکنڈ اور چارسدہ، جنوب مشرق میں ضلع پشاور، مغرب کی جانب افغانستان کی سرحد، شمال کی طرف باجوڑ ایجنسی اور جنوب میں خیبر ایجنسی ہے، مہمند ایجنسی ایک لق و دق اور خشک پہاڑی علاقہ ہے، اور پہاڑوں پر ناہموار اور کھردرے ٹیلے، گھاٹیاں اور بے کیف پہاڑی نالے ہیں، یہاں خودرو گھاس اور فری کے پودے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم مہمند ایجنسی کے پہلو میں واقع درہ ناوا کے راستے سے ہو کر اپنی فوجوں کے ساتھ ہندوستان کو فتح کرنے کیلئے ناواگئی میں داخل ہوا۔ اور پھر 1001ء میں مشہور مسلمان فاتح محمود غزنوی کی فوجیں یہاں سے گزریں۔ اس ایجنسی کا پہلا صدر مقام یکہ غونڈ تھا۔ بعد میں یکہ غونڈ سے غلنئی منتقل ہوا جو اب ایجنسی ہیڈ کوارٹر ہے۔ مہمند ایجنسی کے باشندے ہمیشہ سے پاکستان کے ساتھ رہے ہیں اور ان کی حب الوطنی کسی شک و شبہ سے خالی ہے، یہاں کے تمام قبائل جرات و بہادری میں معروف حیثیت رکھتے ہیں، گندم اور مکئی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت مہمند ایجنسی میں اوسط شرح خواندگی 11.32 فیصد ہے، جب کہ خواتین کی شرح خواندگی 1.29 فیصد ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ خشک پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے اور لوگ بہادر و جفاکش ہیں مگر بتقاضائے زمانہ مہمندوں نے میدانی علاقوں خصوصاً پشاور کی طرف رخ کیا اور دوسرے خاندانوں اور قوموں کے ساتھ مل کر مختلف ہنر اور پیشے اپنا لئے۔ مہمند ایجنسی کا کل رقبہ 2296 مربع کلومیٹر ہے، بڑے بڑے قبائل میں مہمند صافی اور اتمان خیل یہاں آباد ہیں، آبادی کے لحاظ سے مہمند ساٹھ فی صد ہیں، ان کی آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ پورا علاقہ مہمند ایجنسی کے نام ہی سے مشہور ہے۔ مہمند ایجنسی کے انتظامی امور کو احسن طریقے سے چلانے کیلئے اسے تین بڑے ڈویژنوں اور سات تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ سب ڈویژن اپر مہمند اور لوئر مہمند کے نام سے مشہور ہیں۔

لوئر مہمند کا علاقہ ایجنسی کے دیگر مقامات کی نسبت زیادہ زرخیز علاقہ ہے اور یہاں مختلف قسم کی اچھی فصلیں پیدا ہوتی ہیں زمین قابل کاشت ہے۔

اپر مہمند میں جو علاقہ کمالی پلین سے اوپر باجوڑ ایجنسی اور سرحد افغانستان تک پھیلا ہوا ہے یہاں کی مٹی بڑی زرخیز اور فصلوں کیلئے قابل کاشت ہے اور اس کیلئے کثیر الرقبہ ہے اس لئے اس علاقے کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ اور کسان ہیں جو کہ اپنی زمینوں پر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

تاریخ مہمند ایجنسی:

1947ء میں جب پاکستان کی تشکیل ہوئی تو اس سے پہلے مہمند ایجنسی کا الحاق خیبر ایجنسی کے ساتھ تھا اور خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس ہی مہمند ایجنسی کے انتظامی امور چلانے کا اختیار ہوتا تھا جب پاکستان قائم ہو گیا تو خیبر ایجنسی سے مہمند ایجنسی کے اختیارات علیحدہ کر کے ڈپٹی کمشنر پشاور کے حوالے کئے گئے اور پھر جب 1951ء میں اس علاقہ کو باقاعدہ طور پر ایجنسی کا درجہ دیا گیا تو یکم اگست 1951ء کو یکہ غونڈ کو اس ایجنسی کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا گیا مگر 70 کی دہائی میں ایجنسی ہیڈ کوارٹر غلنئی میں منتقل ہو گیا جہاں اب پولیٹیکل ایجنٹ اور ان کے انتظامی امور کے ذیلی دفاتر ہیں۔

1920ء میں علاقے کے موضع نقی کنڈاؤ میں تحریک ہجرت و خلافت کے دوران حریت پسندوں کو افغانستان جانے کا راستہ فراہم کیا گیا۔

سرحد پر جب انگریزوں نے قبضہ جما لیا تو پھر 1849ء میں مہمندوں کے علاقوں پر تصرف حاصل کرنے کیلئے انہوں نے ان کے علاقے کی طرف پیش قدمی کی تو مہمندوں نے آزاد رہنے کی خاطر اپنے دیسی اسلحہ سے انکا راستہ روکا اور انگریزوں کے جدید ہتھیاروں کا مقابلہ کیا۔ اپنے جذبہ آزادی سے اپنی سرزمین کا دفاع کیا اور بے دریغ اپنی جانوں کو قربان کر کے اپنی آزادی کا تحفظ کیا اور انگریزوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، دو سال کے وقفے کے بعد انگریزوں نے مہمند

کے علاقے میں مچنی پر زور دار حملہ کیا اور ان کے چند دیہات کو جلا دیا اور ان کی زمینوں کو اپنی مقبوضات میں شامل کیا بعد میں صلح صفائی کے بعد حکومت نے مچنی کے ان قبائل کو 600 روپے سالانہ مالیہ ادا کرنے کی شرط پر انہیں ان کی زمینیں واگزار کیں، اور جلے ہوئے مکانات کی تعمیر نو اور زمینوں پر کاشت کی اجازت دی، مگر علاقے کے دس دیہات ایسے تھے جنہیں ان شرائط سے مستثنیٰ قرار دیا گیا یہ دیہات میں حسب ذیل ہیں۔

سپری شاہ منصور خیل، سادین، صاحب چینہ، سورک سپری، خواگا ترخہ، دروازگئی، ریگ مینہ، لنڈر تنگی

1951ء میں انگریزوں نے جارحانہ اقدامات کے تحت ترکزی اور حلیم زئی قبائل پر حملہ کر دیا انگریزوں کے پے در پے جارحانہ اقدامات کی وجہ سے مہمندوں اور انگریزوں کے درمیان ایک لامتناہی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چنانچہ انگریزوں نے مہمند قبائل کے حملوں کے خدشوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دفاعی نقطہ نظر سے مچنی کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا اس قلعہ کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ یہ پانچ گوشہ نما قلعہ ہے جس کی دیواریں 24 فٹ اونچی اور 12 فٹ چوڑی ہیں، اور اس کے گرداگرد 10 فٹ گہری اور 30 فٹ چوڑی خندق کھودی گئی ہے تاکہ اس قلعہ میں انگریز حکومت کی طرف سے جو فوج تعینات ہو اس تک مہمند قبائل کی رسائی ممکن نہ ہو، 1851ء اور 1852ء کے دوران اس قلعہ میں 150 افراد پر مشتمل فوجی دستہ رکھنے کی گنجائش موجود تھی جس کا سربراہ کیپٹن ہیگ تھا علاوہ ازیں اسی مقصد کے پیش نظر شبقدر کے مقام پر سکھوں کے دور کے تعمیر کردہ قلعہ کو بھی مضبوط کیا گیا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر پیش بندیوں کے باوجود بھی انگریزوں کو مہمند قبائل کی طرف سے قیمتی جانی نقصان اٹھانے پڑے کیونکہ جب مچنی قلعہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو اسی دوران مہمندوں نے 14 جنوری 1852ء میں حملہ کر کے لیفٹیننٹ اے باول نائیس کو قتل کر دیا جسے قلعہ کے برج میں دفن کیا گیا، پھر اسی مقام پر 21 مارچ 1873ء میں میجر میکڈانلڈ کو قبائل نے قتل کر دیا، مہمند قبائل اور انگریزوں کے درمیان جنگوں کا طویل سلسلہ جاری رہا۔ 1897ء میں مہمندوں نے علاقے کے روحانی پیشوا ملا نجم الدین عرف بڈے ملا کی سرکردگی میں انگریزوں سے ٹکر لی اور قلعہ شبقدر پر حملہ کر کے شکر گڑھ قصبہ کو جلا دیا، انگریزوں نے پشاور اور ملاکنڈ کی طرف سے جنرل ایلس اور جنرل بنڈن بلڈ کے زیر کماں مہمند ایجنسی پر بہت بڑا حملہ کر دیا اور متعدد مقامات پر قبائل اور انگریز لشکر کے درمیان خونریز لڑائیاں ہوئیں جن میں فریقین کی طرف سے قابل ذکر جانی اور مالی نقصان ہوا، جب بڈے ملا صاحب نے وفات پائی تو ان کے مشن کو حاجی صاحب تورنگزئی نے جاری رکھا۔

مہمند قبائل نے 1908ء اور 1915ء کے درمیانی عرصے میں متعدد حملے کئے، ایک یاداشت کے مطابق اپریل 1915ء میں خوئیزئی، بائیزئی، اور عثمان خیل پر مشتمل چار ہزار لشکر، اسی سال ستمبر کے مہینے میں بائیزئی اور دیگر مہمند قبائل کے تقریباً 18 ہزار اور اکتوبر میں مہمند قبائل کے تقریباً 9 ہزار قبائل پر مشتمل لشکر نے انگریزوں پر یلغار کی، 1916ء میں بائیزی قبیلے کے کوداخیل شاخ کے 200 افراد پر مشتمل لشکر نے قلعہ شبقدر پر دھاوا بول دیا اور پھر اکتوبر 1916ء میں مہمند قبائل اپنی جرات و دلیری کے سبب ان سے مرعوب نہ ہوئے تو پھر انگریزوں نے 15 نومبر 1916ء میں ہوائی جہازوں کے ذریعے فضائی حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس کی وجہ سے مہمندوں کو منتشر ہونا پڑا، اسی طرح جب 1930 میں اپریل کی 23 تاریخ کو قصہ خوانی بازار پشاور میں نہتے حریت پسندوں پر انگریزوں نے گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں متعدد شہری شہید اور زخمی ہوئے تو اس موقع پر بھی حاجی صاحب تورنگزئی کی قیادت میں مہمند قبائل کے بائیزئی، اتمان خیل اور صافی دو ہزار لشکر کے ساتھ نمودار ہوئے، اس موقع پر بھی انگریزوں نے فضائی حملوں کے ذریعے ان کو منتشر کیا۔

اجزائے ترکیبی

مہمندوں کی ذیلی شاخوں کی تفصیل:

ترکزی: ترکزئی مہمند قبیلے کی ایک اہم شاخ ہے، ان کا مسکن لوئر مہمند میں مچنی اور دروازگئی سے لے کر گندھاب تک پھیلا ہوا ہے، جہاں مچنی، سپارٹی اور گنداؤ اہم بستیاں ہیں اور داؤد خیل اور قاسم خیل اس کی دو اہم شاخیں ہیں، برہان خیل، عیسیٰ خیل، داویزی اور اتمانزئی مہمند، لوئر مہمند کے پٹیالی تحصیل میں گندھاب سڑک سے لے کر دریائے سوات تک اور کمالی کے بالائی حصہ تک سکونت پذیر ہیں، لوئر مہمند میں اتمان خیل قبیلہ کے لوگ بھی رہتے ہیں جن کا اصل مسکن دراصل باجوڑ ایجنسی ہے اور اسی ایجنسی کا قبیلہ ہے مگر اس کی بٹ کورنامی شاخ مہمند ایجنسی میں مقیم ہے اس کی دو اہم شاخیں اتمان خیل اور لمن اتمان خیل ہیں۔

حلیم زئی:

مہمند ایجنسی کے وسطی علاقہ میں یہ اہم قبیلہ حلیم زئی سکونت رکھتا ہے۔ اپر مہمند میں واقع یہ قبیلہ گندھاب حلیم زئی اور کمالی حلیم زی نامی دو شاخوں میں منقسم ہے اور اس کی ایک شاخ لوئر شلمان میں بھی مقیم ہے، حلیم زئی قبیلہ کے ساتھ ساتھ اپر

مہمند صافی قبیلے کا مسکن ہے یہ قبیلہ کمالی پلین سے اوپر باجوڑ ایجنسی اور افغان سرحد سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔

بائیزی: مہمندوں کے جو اہم قبیلے ہیں ان میں بائیزئی قبیلہ کے لوگ غیر معمولی حیثیت کے مالک ہیں اور اس بائیزئی قبیلہ کی اہم شاخیں خویزی، بابازی، کوڈاخیل، موسیٰ خیل، اتمر خیل اور خوگا خیل ہیں، یہ سب افغان سرحد کے نواحی علاقوں میں آباد ہیں۔

خوایزی: یہ ایک سرحدی اعتبار سے نہایت ہی اہم قبیلہ ہے، کیونکہ افغانستان کے علاقہ لعل پورہ کے مضافات میں خوایزی قبیلے کی چند بستیاں موجود ہیں، اور سرحد کے دونوں اطراف میں ان کی آبادیاں ہیں، ان کا علاقہ جنوب مغرب میں سرحد افغانستان تک پھیلا ہوا ہے اور گندھاب سے درہ خانچ کے ذریعے ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔

باجوڑ ایجنسی

دیر کے جنوب میں افغان سرحد کے ساتھ ساتھ مہمند ایجنسی سے متصل باجوڑ ایجنسی کا پہاڑی علاقہ ہے، جسے انگریزوں نے وحشیانہ پہاڑی علاقہ قرار دیا ہے۔ یہاں آباد لوگ آزاد منش اور دوسروں کی غلامی سے آزاد رہنے والے قبائل ہیں۔

باجوڑ کا علاقہ 327ء قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے بطور گزرگاہ استعمال کیا، تاریخ میں سکندر نے جن دریاؤں کو پار کرنے کا نام بتایا ہے ان میں کوس، پوسپلا، اور گوریس دریاؤں کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چشمے کا بطور خاص ذکر آیا ہے جو کہ گوریس کے درمیان ایک پہاڑی پر واقع تھا، بعد کے محققین کا خیال یہی ہے کہ یہ چشمہ جہاں واقع ہے، علاقہ کونڑ یعنی پنج کوڑھ کا بالائی حصہ ہو سکتا ہے، جہاں سے آج کل ڈیورنڈ لائن گزرتی ہے اس طرح محققین نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ کوس علی شنگ ہوگا اور پوسپلا کونڑ کا نام ہوگا اور گوریس پنج کوڑھ ہے جس کا نام مہابھارت کے چھٹے باب میں سنسکرت میں گادری لکھا ہے، اس صورت میں ایری گایو باجوڑ کا اہم مقام نواگئی ہوگا جو کہ باجوڑ کی مفید وادیوں پر مشتمل ہے اور پھر پنج کوڑھ کو عبور کر کے سکندر نے تالاش سے گزرنے والا راستہ اختیار کیا ہوگا اور اس طرح وہ پھر چکدرہ کے مقام پر پہنچ گیا ہوگا۔

بابر بھی اسی راستے سے ہو کر یوسفزئیوں کے علاقے تک پہنچا تھا۔

قومیں: باجوڑ میں جو بڑے قبائل آباد ہیں، ان میں سالارزئی، اتمان خیل اور مومند ہیں۔ ان میں اتمان خیل سڑ بنی پٹھان ہیں جو چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں یوسفزئیوں کی معیت میں مشرق کی طرف آئے انہیں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہ خالصتاً یوسفزئیوں کے علاقے میں آباد ہو کر ان میں خلط ملط ہو گئے، جب کہ باجوڑ کے علاقے میں آباد باشندوں نے اپنی امتیازی حیثیت کو قائم رکھا، اتمان خیل باجوڑ میں سب سے بڑا گروہ سمجھا جاتا ہے، اور پٹھانوں کی قدامت پر مبنی رسموں اور ثقافتوں کی پابندی میں علامت کا حامل گروہ ہے، لیکن باجوڑ میں جو غالب قبیلہ سمجھا جاتا ہے وہ سارزئی کا قبیلہ ہے ان میں سے پھر پانچ ذیلی حصے ہیں جو کہ ایک دوسرے سے مناقشت رکھنے والے حریف خوانین خار، نواگئی، پشت اور کوٹکی کے وفادار ہیں اور اسی روش کی بناء پر باجوڑ کا علاقہ قبائلی تصادم کا گڑھ رہا ہے۔

تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے باجوڑ کے قبائل کا گہرا تعلق مہمند ایجنسی کے مہمندوں سے رہا ہے، مجموعی طور پر باجوڑ میں رہنے والے قبائل شجرے کے لحاظ سے سڑ بنی ہیں اور ترکلانی کی اولاد ہیں۔

صافی:

باجوڑ میں ایک اور قابل ذکر قبیلہ بھی آباد ہے جسے صافی کہا جاتا ہے، صافیوں کی ایک اچھی خاصی اور پڑھی لکھی تعداد پشاور میں بھی موجود ہے مگر پٹھانوں کے ساتھ ان کی شناخت جس علاقے سے ہوتی ہے وہ مہمندوں اور باجوڑ کے ترکلانیوں کے درمیان باجوڑ کی وادی ہے، جو ان کا اصلی مسکن ہے، کیرو نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ صافی قبیلہ کے لوگ غالباً سب سے بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر اسلام کو دل و جان سے تسلیم کر کے کٹر مسلمان واقع ہوئے ہیں، اسی لئے انہوں نے اپنے لئے صافی کا لقب پسند کیا یعنی اسلام سے پہلے کی ہر ناپاکی سے پاک وصاف ہونے والے۔

ملاکنڈ ایجنسی

مالاکند یا ملاکنڈ ایک ہی علاقہ ہے، الف کی اضافت یا تخفیف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، البتہ تاریخ میں اس کا نام ملاکنڈ یا ملاکھنڈ لکھا گیا ہے، اس کے جنوب میں درگئی اور سخاکوٹ کے علاقے ہیں اور جنوب میں اس کا رقبہ سخاکوٹ تک ہے، شمال کی طرف طوطہ گان، اور مشرق کی جانب لنڈاکے واقع ہے۔

ملاکنڈ ایک ایجنسی ہے جہاں پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر ہے۔ ملاکنڈ دراصل ایک پہاڑ کا نام ہے اور اسی کے نام سے یہ پورا علاقہ منسوب ہے۔

میر سید بخاری نے لاہور تاریخ کے آئینے میں جو کتاب لکھی ہے اس کے

صفحہ نمبر 66 میں سنسکرت زبان کی گرائمر کے موجد پانینی کے حوالے سے انہوں نے علاقہ سمہ میں تین قدیم ترین قوموں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے پہلی قوم بھیگا ہے اور اس بھیگا قوم کی مناسبت سے چھوٹا لاہور اور ہنڈ کے قریب ایک مقام کا بھی نام ہے۔

دوسری قوم بھالا ہے۔ تخت بھائی اور مردان کے درمیان اسی بھالا سے منسوب ایک مقام حرف ہا کی تخفیف سے سری بالا ہے، جو اسی بھالا قوم کی طرف اشارہ ہے۔ تیسری قوم پانینی نے مالا لکھا ہے اور اس قوم سے منسوب یہی وہ مقام مالاکنڈ ہے لہذا مالاکنڈ کی توجیہہ میں یہ حقیقت زیادہ قابل تسلیم ہے کہ مالاکنڈ اسی مالا قوم کی سکونت گاہ ہونے کی بناء پر مالاکنڈ سے موسوم ہے۔

اس وقت مالاکنڈ میں جو قومیں رہتی ہیں ان میں اتمانخیل اور رانیزئی دو بڑی قومیں ہیں ایجنسی کے ایک حصے میں اتمان خیل اور جنوب کی طرف رانیزئی آباد ہے جب کہ سوات میں بھی رانیزئی موجود ہے جسے سواتی راہنزئی کہتے ہیں، رانیزئی قوم یوسفزئی پٹھانوں کی ایک شاخ ہے۔

بٹ خیلہ:

مالاکنڈ ایجنسی کا ایک تجارتی مرکز ہے جو اشیاء کے بڑے بازاروں میں سے ایک بڑا بازار ہے، جہاں ضروریات زندگی کی ہر شے یہاں دستیاب ہے، اور اس مقام پر سرکاری دفاتر، ایک بڑا ہسپتال اور سکولز ہیں۔

ڈھیری آلہ ڈھنڈ:

یہ بٹ خیلہ کے جنوب مشرق کی طرف ایک قدیم قصبہ ہے جہاں روایتی طرز تعمیر کے مطابق متعدد مکانات ہیں۔ یہ قصبہ مختلف محلوں پر مشتمل ہے، ہر محلہ کی سطح پر ایک حجرہ بنا ہوا ہے جب کہ علاقہ کے سردار کا بڑا حجرہ ہے۔ مکانوں کی چھتیں لکڑی اور بانس کی بنی ہیں، فراغت کے اوقات میں لوگ حجروں میں ننگ ٹکور کی مجلس منعقد کرتے ہیں، بیاہ شادیوں میں بھی اسی نوعیت کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں، یہاں ستار نواز، گھڑا نواز، اور بانسری نواز بڑے موسیقار ہیں، اور ان کی موسیقی میں چاربیتہ، خیمہ کے، لوباٹے اور سندرے مشہور موسیقی ہے۔

الہ ڈھنڈ میں برکس باغونہ کے مقام پر یوسفزئیوں کے سردار ملک احمد کا حجرہ تھا جو باقاعدہ طور پر ایک قلعہ بند جگہ تھی جہاں ملک احمد خان جرگے منعقد کرتا تھا اور اہم فیصلے ہوا کرتے تھے ملک احمد خان نے 1535ء میں وفات پائی اور اسی مقام پر دفن ہوئے۔

اورکزئی ایجنسی

اورکزئی ایجنسی قبیلہ اورکزئی کا کوہستانی علاقہ ہے جو کہ ان اورکزئیوں اور بنگشوں کے درمیان ایک جرگے میں تائی نامی نائی کی تقسیم کے مطابق انہیں ملا اس سے پہلے یہ اورکزئی تیراہ کی جنوبی ساحلی زمینوں میں آباد تھے۔

ہنگو اور وادی میرانزئی کے ساتھ ساتھ ٹل تک اور پھر ابراہیم زئی سے متصل جوزواغر کی پہاڑیاں جو کہ 9000 فٹ بلند ہیں اور جو کہ زخت قبیلے کے دلیر اور اہل شجاعت پٹھان ہیں ان کا علاقہ ہے یہ زواغر کی پہاڑیاں اورکزئی ایجنسی کی حد فاصل ہیں، اورکزئی کے مشرق میں ضلع کوہاٹ اور مغرب میں خیبر ایجنسی ہے، قطعی جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے زمختوں کے مشرق میں اور کوہ سفید کی جنوبی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ آفریدیوں کے پاس سے گزر کر کوہاٹ تک اور جنوب میں زیریں میرانزئی اور شمال میں دریائے باڑہ کے دیگر بین الدریائی فراز کے درمیان کا جو علاقہ ہے وہ اورکزئیوں کا علاقہ ہے، یہ نسلی اعتبار سے ایک ایسا قبیلہ ہے جو عام سیر و سیاح سے دلچسپی رکھنے والوں کی دلچسپیوں کے باوجود ناقابل رسائی بیان کی حد تک سرحدی علاقے میں رہنے والا مجمع القبائل قبیلہ ہے، اور انہیں کے نام اورکزئی سے یہ ایجنسی معروف و مشہور ہے۔ ان کا علاقہ بشمول تیراہ کا بین الدریائی راستہ اور اوپر کے علاقے وادی خانکی اور خزینہ تا توئی نوی (دریائے کوہاٹ) اور ابراہیم زئی کے قریب سے ہو کر گزرنے والا دریا، دریائے کرم میں گرتا ہے، تو اس لحاظ سے یہ سارا علاقہ تقریباً 700 مربع میل اور چھ ہزار فٹ بلندی پر ہے، اورکزئیوں کی ثقافتی اور موسمی حیات یہ رہی ہے کہ یہ سردیوں اور گرمیوں میں اپنی قیامگاہیں بدلتے رہے ہیں، سردیوں میں نسبتاً کم بلند اور پست پہاڑیوں میں آجاتے ہیں اور اپنے ریوڑ بھی لے کر انہیں علاقوں میں چراتے ہیں، ان پہاڑیوں کی چوٹیوں پر شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت ہیں وہ پہاڑی علاقہ جو کہ خانکی وادی پر محیط ہے جو دو پہاڑ زادہ غر اور سمند غر علی الترتیب نو ہزار اور سات ہزار فٹ بلندی پر ہیں، جنہیں پار کرنا نہایت ہی دشوار اور تھکا دینے والی مہم سے کم نہیں۔ کوہاٹ سے چھ میل کے فاصلے پر ان کا مشہور درہ ابلان ہے۔

اس درہ میں پٹھانوں کا ایک قبیلہ بزوٹی رہتا ہے جو کہ برطانوی حکومت کے دوران انگریزوں سے نبرد آزما رہا ہے، بزوٹی قبیلہ کے لڑاکو لوگ کوہاٹ چھاؤنی میں انگریز افسروں پر لوٹ مار کرتے رہے جس کے نتیجہ میں اس قبیلہ کو قابو میں رکھنے کے لئے اپنی طاقت کا استعمال کیا تھا۔ یہ درہ چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور پھر اس کے نیچے جنوبی باڑہ ملوغر تقریباً سات ہزار فٹ کے دامن میں بہنے والا دریا ہے، اس سے

آگے بھی دو تین ایسے پہاڑی راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں صرف بیل اور خچر پر ہی سفر کر سکتے ہیں، یہاں کی وادیاں زرخیز ہیں مگر پہاڑ خشک ہیں، اوپر کی طرف یہ وادیاں وسیع اور کشادہ ہو جاتی ہیں، ان میں وادی کرمانہ بلندی پر ہے جو کہ خانکی اور خزینہ وادی سے اوپر ہے، ایڈورڈ ای الیور نے اپنی کتاب پٹھان اور بلوچ میں اس وادی سے متعلق لکھا ہے کہ وادی کرمانہ 200 مربع میل کا طاس ہے جس میں چبوترے دار کھیت دیہات اور مضبوط قلعہ نما مکانات ہیں۔ ناشپاتی اور انگور وغیرہ کی بہتات ہے، طرح طرح کی سبزیوں اور عمارتی لکڑی کی پیداوار ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت کے دور میں یہ تمام علاقے ان کے لئے ناقابل رسائی تھے۔ 1872ء میں کیپٹن ٹکر تیراہ گیا تو اسے آڑے ہاتھوں لیا گیا، اس کے علاوہ ایک کھوجی مقامی پٹھانوں شکاریوں کے ساتھ بھیس بدل کر گیا اور وہ صرف اس حد تک کامیاب ہو سکا تھا کہ اسے اوپر سے دیکھ کر میدانی وادی کے ایک حصہ کا نقشہ بنا لایا تھا۔

اورکزئی قوم اور شاخیں:

اورکزئی اپنے شجرہ نسب کے لحاظ غورغشت کی اولاد میں شناخت ہوتے ہیں اورکزئیوں کی کئی ذیلی شاخیں مشہور ہیں ان میں دولت زئی، مسوزئی، اسماعیل زئی، محمد خیل، ستوری خیل، اور لشکر زئی ہیں جب کہ مزید جو شاخیں پھیل کر ان سے منسلک ہوتی ہیں ان میں علی خیل، ملاخیل، مستی اور شیخان ہیں، محمد خیل قوم کے لوگ شیعہ ہیں۔ باقی سب سنی ہیں، چاہے جس کسی بھی شاخ سے کسی کا تعلق ہو وہ اپنے نام کے ساتھ اورکزئی ہی لکھتا ہے، شروع سے تیراہ کی جنوبی ساحلی زمینوں میں آباد رہے ہیں، کثرت تعداد کے پیش نظر انہوں نے کوہاٹ کے میدانی علاقوں کی طرف رخ کیا مگر ان کے مقابل میں بنگش آ گئے اور پھر مستزاد یکہ جنوب کی طرف سے خٹکوں نے بھی پیش قدمی شروع کر دی، چنانچہ پہلے پہل تو قطع اراضی کے حصول کیلئے خٹکوں نے بھی بنگشوں کے ساتھ مل کر اورکزئیوں پر حملے شروع کر دیئے، چنانچہ دو لڑائیاں محمد زئی اور پتی کے قریب کوہاٹ سے تقریباً تین اور چار میل کے فاصلے پر ہوئیں، نتیجہ اورکزئی پسپا ہو کر تیراہ کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے، مگر یہاں ایک دلچسپ واقعہ جو کہ اورکزئیوں اور بنگشوں کے درمیان جائے سکونت کی تقسیم کے بارے میں ہے رقم کئے بغیر مدعا پورا نہیں ہوتا، ہوا یہ کہ ان لڑائیوں کے بعد بنگشوں اور اورکزئیوں کے درمیان مستقل طور پر جائے سکونت کی تقسیم کی ضرورت پیش آئی تو دو طرف سے بزرگ اکٹھے ہوئے اور فیصلہ کیا کہ ان جنگوں سے مقصد حاصل نہیں ہوتا طرفین سے سے بڑی جانیں مال تلف ہو جاتا ہے اس لئے مستقل طور پر علاقوں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہونا چاہیے اس غرض کیلئے دونوں کی جانب سے ایک جرگہ منعقد ہوا اور ثالثی کیلئے علاقے کے ایک نائی کو مقرر کیا گیا جس کا نام تائی تھا اسے اختیار دیا گیا کہ وہ جو بھی فیصلہ کریگا وہ دونوں گروہوں کیلئے قابل قبول ہوگا، چنانچہ تائی نے اپنے مخصوص انداز میں مختصر سے الفاظ میں جو فیصلہ دیا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

تائی تائی تائی تائی خودا و ائی

سمہ د بنگشو غر ٹول دے اورکزائی

ترجمہ:۔ تائی تائی تائی، تائی تو یہ کہتا ہے کہ میدان بنگشوں کے ہیں اور پہاڑ سارے اورکزئیوں کے۔

اس فیصلے کے بعد اورکزئی پہاڑوں کی طرف کوچ کر گئے اور میدانی علاقہ بنگشوں کے ہاتھ آ گیا۔ یہ تاریخی فیصلہ درسمند کے مقام پر ہوا تھا، تائی یہ فیصلہ دے کر گھوڑے پر بیٹھا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف چلا گیا اس کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہ آیا۔

اورکزئیوں کی بعض شاخیں کرم ایجنسی کے علاقے میں بھی ہیں، جیسے مسوزئی میں جو قوم مسوزئی آباد ہے اسی کے نام سے یہ علاقہ منسوب ہے جو کرم ایجنسی کے احاطے میں ہے، دراصل اورکزئیوں کے کل اٹھارہ قبیلے ہیں جو کہ اورکزئی ایجنسی سے لے کر کرم ایجنسی کے علاقہ الیف آرتک آباد ہیں، کرم ایجنسی میں مسوزئیوں کے علاوہ جو دوسری قومیں آباد ہیں ان میں علی شیرزئی، جو کہ مارغان درے میں آباد ہے۔ خوئیدادخیل یہ چنارک میں آباد ہے۔

اوتی زئی یہ زیادہ تر بندوبستی علاقے کے باشندے ہیں، جیسے مندوری بکن میں آباد چلے آ رہے ہیں۔ زوئی مخ، یہ لوگ علی شیرزئی اور روتی زئی کے درمیانی علاقے میں آباد ہیں، کچھ لوگ بندوبستی علاقے جیل مائے تک آباد ہیں۔

چمکنی: یہ ایک معروف قوم ہے جس کے اکثر باشندے پشاور کے ایک موضع چمکنی میں آباد ہیں، حضرت میاں عمر چمکنی اسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مزار مبارک موضع چمکنی پشاور میں ہے، چمکنی قوم کو بھی اورکزئیوں کی ایک سب سیکشن میں شمار کیا گیا ہے، ان کی ایک اچھی خاصی تعداد پاڑہ چنار کرم ایجنسی کے شمال مشرق کے ایک بلند ترین پہاڑی علاقے میں آباد ہے۔

کرم ایجنسی

صوبہ سرحد کے جنوب مغربی حصے کی جانب ایجنسیاں آزاد منش قبائل کے خطے ہیں۔ کرم ایجنسی کے باشندے تمدنی اور تہذیبی زندگی کے بہت قریب ہیں،

اکثریت تعلیمافتہ اور کاروباری مزاج رکھنے والے مہذب، با اخلاق و با اطوار لوگ ہیں۔ کرم ایجنسی ضلع کوہاٹ کے جنوب مغرب کی سمت میں ایک بہت بڑے علاقے پر مشتمل ہے، اس کا ہیڈ کوارٹر پاڑہ چنار ہے، جہاں پولیٹیکل ایجنٹ اور اس کے عملے کے دفاتر ہیں۔ پاڑہ چنار ایک نہایت ہی خوبصورت، سرد، اور فطری مناظر سے بھر پور دلکش خطہ ہے، جو کوہ سفید کے دامن میں ہے، ایجنسی کے شمالی حصے کی طرف مغرب سے مشرق کی جانب کرم ایجنسی کا فرانٹیئر ریجن کا علاقہ ہے جسے ایف آر کرم کہتے ہیں، دریائے کرم نے اس علاقے کی زمینوں کو سیراب کر رکھا ہے۔ علاقے میں گندم، مکئی، باجرہ کی فصلوں کے علاوہ چاول بھی بکثرت پیدا ہوتا ہے، اس خاص قسم کے موٹے اور کھانے میں لذیذ چاول کو کوری چاول کہا جاتا ہے۔ سبزیوں کی پیداوار میں علاقہ خود کفیل ہے، پھلوں میں سیب، انگور، ناشپاتی، مالٹا وغیرہ یہاں کی خاص پیداوار ہے، علاوہ ازیں، بادام اور اخروٹ کے درخت بکثرت ہیں، یہاں کا اخروٹ بہت مشہور ہے، آلو اور ٹماٹر کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے اور آلو صوبے کے دوسرے علاقوں میں بھی برآمد کیا جاتا ہے۔

کرم ایجنسی کے مغرب اور ساری جنوبی حد میں افغانستان کا علاقہ پھیلا ہوا ہے، کرم ایجنسی کے مغرب کی طرف شمالی وزیرستان کا علاقہ ہے، اس کے ہیڈ کوارٹر پاڑہ چنار کے مغرب اور جنوب مغرب کی جانب زیڑان اور شلوزان کے خوبصورت علاقے ہیں۔ جنوب مغرب کی طرف خرلاچی پوسٹ ہے جو کہ ڈیورنڈ لائن ہے۔ اس سے آگے افغانستان کا علاقہ ہے یہاں لکڑی کا بڑا کاروبار ہوتا ہے، کرم ایجنسی کے مغرب کی انتہائی جانب تری منگل اور پھر اس سے آگے افغانستان کا سرحدی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔

شمال کی طرف کرم ایجنسی میں کوہ سفید ایک ڈھال کی حیثیت سے قدرتی حفاظتی پہاڑ ہے اور یہی کوہ سفید شمال کی جانب افغان سرحد بھی ہے کوہ سفید کے درمیان شمالاً و جنوباً ایک سفید سی پٹی کا تنگ سا درہ ہے۔ یہ پیدل گزرگاہ ہے، یہ درہ افغانستان کے علاقے ننگرھار اور کرم ایجنسی کا سنگم ہے، اسی گزرگاہ میں مشہور تورہ بورہ پہاڑوں کے درمیان کا علاقہ ہے۔ مغرب میں ایک تھوڑا سا کنارہ افغانستان کے صوبہ لوگر اور جنوب مغرب میں افغانستان کا صوبہ پکتیا آ جاتا ہے جب کہ مشرق میں خیبر اور اورکزئی ایجنسی جب کہ جنوب مشرق میں وزیرستان ایجنسی کا علاقہ ہے۔

کرم ایجنسی تین حصوں میں منقسم ہے۔ 1) اپر کرم 2) لوئر کرم 3) ایف آر کرم جسے آب وسطی کرم کہا جاتا ہے۔

اقوام وقبائل:

افغانستان سے متصل ہونے کی وجہ سے اس ایجنسی کو تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عرصے تک اس علاقے کا بڑا رقبہ افغانستان کے زیر تسلط رہا ہے کرم ایجنسی میں آباد قوموں میں طوری، منگل حاجی اور مقبل ہیں۔ یہاں کا قدیم قبیلہ بنگش مشہور قبیلہ تھا، جنہیں طوریوں نے یہاں سے نکال دیا اور وہ ٹل اور ٹل سے ادھر ہنگو اور کوہاٹ تک کے میدانی علاقوں کی طرف چلے گئے۔

کرم ایجنسی کے میدانی اور بندوبستی علاقوں میں اس وقت اکثریت طوری قبائل کی ہے، اس قبیلے کی دو بڑی شاخیں ہیں۔

i) سرگل ii) چاردائی (سرگل چاردائی کا بڑا بھائی تھا)۔

پھر سرگل کی دو ذیلی شاخیں ہیں۔ i) حمزہ خیل ii) متوخیل

ان میں سے حمزہ خیل طوریوں کا بڑا قبیلہ سمجھا جاتا ہے، یہ لوگ ملانہ، تائیدا، کڑمان، مالی خیل اور بلیا میں لوئر کرم میں آباد ہیں، اس قبیلے کا بڑا سردار حاجی نصر اللہ خان مرحوم تھا اور عہد حاضر میں اس کا بیٹا حاجی طاہر حسین قبیلے کا بڑا ہے، ان کو انگریزوں نے نواب کا خطاب دیا تھا۔

مستوخیل قبیلے کے لوگ، ملانہ، کڑمان، احمد زئی، یوشھرہ، ازلی کلے وغیرہ میں آباد ہیں، ملانہ انکا ہیڈ کوارٹر ہے، اس قبیلے کا سردار سید حنیف جان میاں آف احمد زئی تھا، عصر حاضر میں اس کا بیٹا ڈاکٹر سید حسین نواب سردار ہیں، ان کا بھی خطاب نواب ہی ہے۔

چاردائی کی تین شاخیں ہیں۔ i) علی زئی ii) غنڈی خیل iii) دوپہر زئی، ان کا صدر مقام پیواڑ ہے۔

غنڈی خیل کے لوگ پیواڑ، نستی کوٹ، کراخیلہ، اور ابراہیم زئی میں آباد ہیں، دوپہر زئی کے باشندے بغدی، بوڑکی، خرلاچی، شنگک، شاخ اور شلان میں مقیم ہیں۔ علی زئی قوم کے لوگ کنج علی زئی اور علی زئی تحصیل میں آباد ہیں۔

طوری قبیلے کے سارے لوگ شیعہ ہیں یہ وادی کرم کا اہم ترین قبیلہ ہے، اس قبیلے کے بارے میں سرزمین پختون کے مصنف جیمز ڈبلیو سپین، کا کہنا ہے کہ یہ غورغشت پٹھان ہیں جو کہ مذہباً شیعہ ہیں ان کے خدوخال قطعی منگول ہیں اور یہ غالباً ابتدائی تاتاری فاتحین کی اولاد ہیں، یہ اپنے دعوے کے مطابق ایران سے مشرق کی طرف آنے والا تاتاری خاندان تھا جو کہ طوغانی کی سرکردگی میں مشرق کی طرف اٹھارویں صدی کے اوائل میں آئے، ان کے یہاں آنے سے پہلے بنگش قبیلے کے

لوگ کرم وادی میں آباد تھے جب طوری یہاں آئے تو بنگشوں کے ساتھ ان کی چپقلش اور معرکہ آرائی ہوئی جس کے نتیجے میں بنگش قبائل کرم وادی سے نیچے کی طرف ٹل، ہنگو اور کوہاٹ کے میدانی علاقوں کی طرف منتقل ہوگئے اور ان کا سامنا اورکزئیوں کے ساتھ ہوا اور پھر ایک جرگہ کے فیصلے کے مطابق انہیں کوہاٹ کا میدانی علاقہ ملا، جہاں اب تک بنگش آباد ہیں۔

کرم وادی کے اورکزئی:

وہ اورکزئی جو کہ کرم میں آباد ہیں یہ لوگ کرم ایجنسی کی شمالی پست پہاڑیوں میں آباد ہیں، ان کا وہ حصہ جو مامون زئی کے نام سے مشہور ہے، اس گروہ کا ایک اکثریتی حصہ مدتوں سے کرم وادی میں آباد ہے۔

زیمشت:

زیمشت قبیلے کے لوگ بھی وادی کرم کے دھانے کے اردگرد مدتوں سے آباد اور پہاڑی ڈھلانوں میں مقیم ہیں۔ ان کے کچھ دیہات وادی کرم کے میدانی علاقوں میں بھی ہیں، یہ اپنے آپ کو سترنی پٹھان کہتے ہیں مگر بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ یہ اورکزئی قبیلے کا ایک حصہ ہے۔ زیمشت قبیلے کے لوگ انگریزوں کے پہلو کا کانٹا بنے رہے اور اس قبیلے کے کچھ سرکش لوگ انگریزوں کو لوٹ مار کا نشانہ بناتے رہے جس کی وجہ سے انگریزوں کے ساتھ ان کے ایک دو خونریز معرکے بھی ہوئے۔

وزیرستان ایجنسی

صوبہ سرحد کے جنوب مغرب کی جانب وزیرستان ایجنسی ہے جو ہر دور میں اپنے سماجی اور روایتی حالات کی بنا پر خود مختار اور ناقابل شکست رہی ہے۔ وزیرستان کا علاقہ انگریز و دیسی تمام محققین و مورخین کیلئے دلچسپی کا باعث رہا ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے سر اولف کیرو کی کتاب ''پٹھان'' کی یہ سطریں بہت حد تک ممد و معاون ہیں، کیرو کہتا ہے ''یہ ایک ایسا قلعہ ہے جو فطرت نے اپنے لئے بنایا ہے، اس کی حفاظت وہ پہاڑ کرتے ہیں جو دیواروں کی طرح اس کے چاروں طرف کھڑے ہیں اس مربع کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ وہ راستہ گزرتا ہے جو خراساں سے قندھار اور کوئٹہ سے ہوتا ہوا درہ بولان سے گزر کر سندھ پہنچتا ہے، فوجی اور تجارتی قافلے ہمیشہ اس راستے سے گزرتے رہے ہیں، ژوب، بوری اور ڈکی میں داخلہ آسان ہے اور مغل اور درانی دونوں کی اس علاقہ میں حکومت رہی ہے لیکن اس کے شمال میں وہ قبائل جو کرم، ٹوچی اور گومل کے درمیانی علاقہ کے پہاڑوں میں آباد ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنی آزادی برقرار رکھی۔ انگریز ان کی ہر وادی میں بار بار گئے تھے اور انہوں نے سڑکوں اور قلعوں کا جال بچھا دیا لیکن ان میں سے نوئی بھی قبائل سے ہتھیار چھیننے، ان کے علاقہ کو معمولی نظم و نسق کے تحت لانے یا ان پر ٹیکس لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پورے علاقے کا مرکز وہ حصہ ہے جو اب وزیرستان کہلاتا ہے، غرضیکہ وزیرستان ایجنسی ان قبائل کا مسکن ہے جو کہ ایک مختلف قبائلی نظام کے تحت زندگی گزارتے رہے ہیں، وزیرستان ایجنسی، کرم اور گومل دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔''

اس علاقہ کے مشرق کی طرف جو بیرونی پہاڑیاں ہیں وہ بھٹنیوں کا علاقہ ہے۔ بھٹنی شیخ بیٹ کی اولاد ہیں جو چھوٹا سا قبیلہ ہے، یہاں کے اصلی باشندے وزیر ہیں جن کے علاقے کو وزیرستان کہا جاتا ہے، وزیرستان کا تمام علاقہ کرلانی پٹھانوں میں سے زیادہ طاقتور، زور آور قبیلوں میں سے درویش خیل وزیر اور محسود کے قبضہ میں چلا آ رہا ہے یہ ڈیڑھ سو سال پہلے تک تو ان کی تاریخی اور جغرافیائی خدوخال پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے مگر جب محققین کی رسائی ان کے علاقے کی دریافت تک ہوئی تو معلوم ہوا کہ پٹھانوں کے شجروں میں جو دلیری اور بہادری کا نشان رکھنے والے قبائل ہیں وہ یہی وزیر و محسود ہیں، ان کی پشتونوں میں سے کرلانی شجرے سے منسلک ہونا اور پھر مہیب و دشوار گزار پہاڑی علاقے میں ان کی سکونت نے اس نظریئے کو کافی تقویت بخشی ہے، کہ وہ پہاڑی قبائل میں سے سب سے زیادہ طاقتور اور خوفناک پہاڑی قبائل اور پرانی و خالص پشتون نسل میں سے ہیں۔

اقوام:

یہ سارا علاقہ جو کہ وزیرستان کہلاتا ہے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان، جہاں وزیر اور محسود آباد ہیں، وزیر اور محسود قبائل کے آباؤ اجداد آپس میں قرابت داری رکھتے ہیں مگر سماجی اور معاشرتی حالات کی تجزیہ نگاری کے پیش نظر محسود کو وزیریوں سے الگ کر لیا گیا جو پہاڑوں کے مرکزی سلسلہ میں آباد ہیں، ان کا علاقہ بالکل اس طرح ہے جس طرح اونٹ کی کوہان ہوتی ہے یعنی کوہان کی طرح ابھرا ہوا علاقہ ہے، ان محسودوں کے علاقہ کے گرد شمال مشرق میں وہ وزیر آباد ہیں جنہیں درویش خیل وزیر کہا جاتا ہے پھر ان کے مشرق کی جانب بھٹنی کا مختصر قبیلہ آباد ہے، وزیر اور محسود ہمیشہ آپس میں مصروف پیکار رہے ہیں۔ دونوں کی دلیری اور ہمسری کی تاریخی قدامت بہ تسلسل چلی آ رہی ہے، اسی لئے کیرو نے ان دونوں کی طاقت و دلیری اور شجاعت و آپس میں محاربت اور مضاربت کی نہ ختم ہونے والی کیفیت و حالت کے پیش نظر ان دونوں قبائل کے درمیان فرق و امتیاز کو

اس طرح بیان کیا ہے کہ محسود بھیڑیا ہے اور وزیر چیتا۔

دونوں کو شاندار جانوروں سے تشبیہہ دیکر کیرو نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک یعنی وزیر زیادہ سے زیادہ پھرتیلہ بہت حد تک مکار و ہوشیار ہے، تو محسود دھن کا پکا، متحد اور زیادہ خطرناک ہے۔

وزیر: وزیرستان ایجنسی میں مقیم قبائل کی اب مختصراً تشریح یہ ہے کہ وزیری قبیلہ کے لوگ پہاڑوں کے اس پیچیدہ سلسلہ کا اہم ترین اور بڑا حصہ ہیں جو کہ کرم سے ایک سو میل سے زیادہ جنوب کی طرف چلتا ہے یہ سارے کا سارا علاقہ شمالی اور جنوبی وزیرستان ایجنسیوں میں منقسم ہے، شمالی وزیرستان کا صدر مقام میرانشاہ ہے اور جنوبی وزیرستان صدر مقام سردیوں میں ٹانک اور گرمیوں میں وانا ہے۔

وزیری قبائل کا تعلق غور غشتی شجرے سے منسلک ہے یعنی یہ غور غشت کی اولاد ہیں، یہ اس علاقہ میں چودھویں صدی عیسوی میں نمودار ہوئے، یہ اپنے تئیں محسودوں سے ممیز کرنے کے لئے خود کو درویش خیل وزیر کہتے ہیں، حالانکہ ماخذ و منبع کے لحاظ سے محسود خود بھی وزیری ہیں، مگر ان دونوں میں نسلی مماثلت دیکسانیت کے باوجود آپس میں شیر و شکر نہیں کہا جا سکتا جس کی وضاحت گذشتہ سطروں میں ہو چکی ہے، وزیریوں کی دو بڑی شاخیں ہیں۔

i) اتمانزئی　ii) احمد زئی، اتمانزئی کے لوگ سرحد کے پاکستانی طرف شمالی وزیرستان میں اور احمد زئی جنوبی وزیرستان میں آباد ہیں۔

موسیٰ درویش:

وزیریوں میں موسیٰ درویش ایک ایسا مقدس نام ہے جسے قبیلے کی دونوں شاخیں یعنی اتمانزئی اور احمد زئی اپنا مورث اعلیٰ کہتی ہیں، وزیری انہیں موسیٰ نیکہ کہتے ہیں، موسیٰ درویش کا مزار احمد زئی علاقہ کے مغربی کنارے پر ڈیورنڈ لائن کے نزدیک ہے جو کہ پاکستانی علاقے کے حدود میں سرحد سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے، وزیریوں کی دونوں شاخیں اتمانزئی اور احمد زئی کم از کم تقریباً چار حصوں میں منقسم ہیں، اور پھر ان میں قریباً تین سو حصے ہیں۔ ان میں اہم ترین گروہ یہ ہیں۔

مداخیل، کابل خیل، اسپرکا، ناصر الدین، ہاتھی خیل، اور طوری خیل، مشہور زمانہ اور تاریخ میں اہم مقام پانے والے فقیر ایپی کا تعلق شاخ طوری خیل سے ہے۔

محسود: محسودوں کا علاقہ تین طرف سے وزیریوں اور مشرق کی جانب سے بھٹیوں میں محصور ہے، اور محسودوں کے اکثر معرکے اور جھگڑے ان دونوں جغرافیائی ہمسایوں کے ساتھ ہیں، یہ نہ صرف اپنے ہمسایوں کے ساتھ حالت محاربت میں رہتے ہیں بلکہ انہوں نے بیرونی مداخلت کاروں سکھوں اور انگریزوں کی بھی ہمیشہ درگت بنائی ہے، اور ان سے بھی برسر پیکار رہے ہیں، محسود جیسا کہ پچھلی سطروں میں کہا گیا ہے کہ وزیروں کا ہی ایک حصہ ہیں مگر حالات و واقعات اور تاریخی ستم ظریفی نے انہیں متحد و متفق نہیں رکھا، محسودوں کی تین اہم شاخیں ہیں،

i) بہلول زئی　ii) علی زئی اور　iii) شمن خیل، آگے پھر جا کر یہ مزید حصوں میں تقسیم در تقسیم ہو جاتے ہیں، ان میں پھر اہم ترین ذیلی حصے یہ ہیں۔ شی خیل، منزئی، ناناخیل، اور ایمل خیل، محسود علاقہ کافی گرم اور ماکن پر مرکوز ہیں، یہ گومل حصوں ٹانک زم اور وانا میدان کے سروں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ارمڑ:

یہ بھی وزیرستان کا ایک اہم قبیلہ ہے، جس کا مرکزی خطہ کافی گرم ہے، مشہور زمانہ مغلوں کے حریف اور تاریخ میں اہم مقام پانے والے بایزید انصاری کا تعلق اسی قبیلہ سے ہے، اس چھوٹے سے مگر اہم قبیلے کی اپنی روایات اور زبان ہے، یہ جو زبان اپنے علاقے میں بولتے ہیں اسے برگستہ کہتے ہیں، مگر یہ اپنی جداگانہ تہذیب و ثقافت کے حامل ہونے کے باوجود گرد و پیش کے پشتونوں سے خلط ملط ہو چکے ہیں، ارمڑوں کی ایک بہت بڑی تعداد محمود غزنوی کے لشکریوں میں بھی شامل کی گئی اور لڑائی میں حصہ لینے کے بعد محمود غزنوی نے انہیں پشاور میں ایک بہت بڑی اراضی دی تھی جو اب تک ارمڑوں کے نام سے منسوب یہاں موجود ہے اور ارمڑ اور ان کی ایک شاخ برکی یہاں رہتے ہیں۔

بھٹانی: وزیرستان کے مشرقی حصے کے چھوٹے سے قبیلے پر مشتمل لوگ ہیں، مورخین نے انہیں آس پاس کے طاقتور قبائل کی نسبت کمزور قبیلہ کے باشندوں میں شمار کیا ہے، ان کا علاقہ مشرق میں میدان مروت سے لے کر جنوب میں گومل تک کا ہے، اس قبیلہ کا شجرہ نسب قیس کے تیسرے بیٹے بیٹ یا بیطان سے جا ملتا ہے اسی لئے یہ اپنے آپ کو بھٹانی کہتے ہیں۔

دور: یہ وزیرستان ایجنسی کا ایسا چوتھا قبیلہ ہے جنہیں آس پاس کے پٹھان قبائل پختونوں کے شجروں سے باہر رکھتے ہیں۔

ان کی تقسیم جن حصوں میں ہے انہیں ٹپی زاد، عیدک ملی زاد ہیں جو آگے جا کر پھر کئی حصوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ وزیرستان کے مزروعہ اور اچھی زمینوں پر

قابض ہیں، ان کی سست روی کی وجہ سے بہت سی برائیاں ان میں در آئی ہیں اور غلاظت و وحشت پروری کے ایسے اوصاف ہیں جنہیں یہ دوسری اقوام پر غلبے کے تصور کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

قبائلی رسوم ورواج

قبائلی سماجی تنظیم:

اہل سرحد میں قبائلی علاقہ کے رہنے والے قبائل پٹھان ہی ایک ایسی لسانی، ثقافتی اور سماجی تہذیب و روایات کے مالک ہیں جو کہ سرحد کی دیگر اقوام کی نسبت اپنے سماجی اور ثقافتی احوال میں امتیازات کے اہل رہے ہیں۔

اگرچہ ہر بڑے قبیلے کے دو یا دو سے بھی زیادہ خیل یا طائفے رہے ہیں جو کہ قبائلی اور خاندانی وسعت کی ضرورت کے ماتحت ظہور پذیر ہیں، بعض حالات میں تو یہ وسعت پذیری اس حد تک دیکھی جاتی ہے کہ ایک خیل اپنے آبائی اور موروثی قبیلے سے لاتعلق ہو کر تعداد میں اتنی پھیل جاتی ہیں کہ دوسرے بڑے بڑے اور بنیادی قبیلے سے بھی بڑی خیل ہو کر بذات خود ایک بڑا قبیلہ ہو جاتا ہے، جسامت و اہمیت میں انکا مقام یہ ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے قبیلے کے ہم نام قبیلے سے موسوم ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر سپاہ خیل آفریدیوں میں بھی ہے اور شنواریوں میں بھی، اور ثمان خیل مہمندوں میں بھی ہے اور محسودوں میں بھی مگر ان کی نسبتی پہچان ہمیشہ اپنے آبائی قبیلے کے سیاق و سباق کے ساتھ ہی موزوں اور مناسب رہی ہے اور تعداد و جسامت و اہمیت میں کوئی قبیلہ کتنا ہی بڑا اور دوسرے نام سے معتبر کیوں نہ ہو جائے وہ اپنے نسبی شجروں سے ہمیشہ اپنے آپ کو جوڑے رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹے اور بڑے خیل و گروہ کی بنیاد اس کے خونی رشتے کے ساتھ منسلک ہے۔

تاہم خونی رشتوں سے مستثنیٰ حالت کے پیش نظر بعض گروہ بندیوں کے ناموں سے منسلک نظریئے سے متعلق تحقیق کے ضمن میں جین ڈبلیو سین نے لکھا ہے کہ صرف ساحل اور گارا یسے فرقے ہیں جو کم و بیش حد تک اکثر قبائل میں موجود ہیں۔ یہ فرقے جن کا دیگر قبائل گروپ بندیوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی متحدہ پالیسی یا مقاصد ہیں بعض علاقوں میں سین White اور طور Black کہلاتے ہیں یہ عام طور پر سیاسی گروہوں سے مشابہ ہیں۔

پختون ولی:

پٹھانوں کی کردار نمائی کیلئے ان کے اپنے ہی حالات سے پیدا ہونے والے خصائیل ہی ایسے ہیں جو ایک محقق کیلئے ان کے خصائیل و اطوار کا احاطہ کیلئے راہنما اصول دے سکتے ہیں وہ خصائیل جو ان کے اجتماعی، سماجی حالات کی نشاندہی کرتے ہیں وہ ان کے ذاتی اطوار بھی ہیں اور اجتماعی رویئے بھی ہیں جنہیں پیش نظر رکھ کر ان کی کردار نمائی کے خلاصہ پیش کرنے میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوتی، ان میں پختونوں، پشتونوں یا بعد کی انگریزی ایجاد پٹھان خصلت میں پختون ولی ایک ایسا جامع لفظ ہے جو ان کے ذاتی اور اجتماعی سماجی رویے کی ایک بڑی اور جامع تشریح کیلئے کافی ہے۔

کسی الجھن میں پڑے بغیر پختون ولی کی تشریح کیلئے اگر مختصر سی تفصیل کے ماتحت لفظ عزت یا ناموس کو سامنے رکھا جائے تو یہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ اس سلسلے میں پشتونوں کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک نے اپنی شاعری میں اس مسئلے کو زیادہ آسان بنا دیا ہے، خوشحال خان اپنی ایک نظم میں اس ضمن میں کہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''میں اس شخص سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی زندگی عزت سے نہیں گزارتا''

عزت کا لفظ ہی مجھے پاگل بنا دیتا ہے

اور پاگل آدمی کو سود و زیاں کی کیا پرواہ؟

گویا کہ پختون ولی میں جو پٹھان خصلت کا خمیر مضمر ہے وہ عزت اور عزت کے تقاضوں کو سمجھنا اور پھر ان کی حفاظت کرنا ہے، جو ان کے سماجی پشتون رویئے میں اس جملے کے ساتھ محفوظ ہے، جسے پختون ضابطہ حیات کہا جاتا ہے، یہ پختون ضابطہ حیات پٹھان معاشرے کے ہر فرد کی زندگی میں رواں دواں ہے جیسا کہ زندگی کی حرارت کیلئے رگوں میں گردش خون ہو، لہذا مرد ہو یا زن، بچہ ہو یا بوڑھا، سب کے لئے یہ پختون ولی کے ذیل کا ضابطہ حیات بہت ہی معتبر اور عزیز از جان ہے اور یہی کچھ سادہ سے قواعد و ضوابط ان کی سماجی زندگی اور ثقافتی رویوں کیلئے کافی ہے، لہذا جہاں پشتون و پٹھان کا تصور ہے وہاں ان کی زندگی کے اپنے ہی طور طریقے ان کے لئے متاع بے بہا ہیں۔

بدل:

گورنمنٹ آف انڈیا (قبل از تقسیم ملک) سنٹرل ایشیاء پارٹ I, III ص 266، کے حوالے سے سرزمین پختون، میں بدل سے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ ابتداء میں بدلہ صرف مظلوم ہی لے سکتا تھا اور بصورت قتل مقتول کا خاندان صرف اس فرد سے جس نے نقصان پہنچایا ہو، لیکن بدلے کی پابندی

مدتوں سے مورد توہین یا مجروح قبیلہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے، اور اس کا مداوا اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ فرد متعلقہ اور جارح قبیلہ کے خلاف کارروائی کی جائے اس کا نتیجہ خونی جھگڑوں کی صورت میں نکلا ہے جو قبیلوں کے آپس میں بین القبائل تعلقات کو متاثر کرتے ہیں جس سے پورے کے پورے خاندان اور چھوٹے چھوٹے قبیلے نیست و نابود ہونے کے خدشے پیدا ہونے لگے، بدل میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں اور انتقام کیلئے اقدام ضروری ہے تاوقت کہ قبیلے کا ایک فرد بھی زندہ ہو، انتقام گیری ہو سکتی ہے، پٹھانوں میں اس بدل کی رسم نے ایسی حیثیت اختیار کر لی کہ ان کے سماجی احوال میں سب سے زیادہ بقدر قیمت شے بدل ہے جس کی چاہے کتنی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے اور نتائج چاہے کتنے ہی ہولناک کیوں نہ ہوں۔

میلمستیا:

جو باتیں پختون ولی، کے قاعدے اور ضابطے میں شمار کی جاتی ہیں ان میں میلمستیا کو اولین حیثیت حاصل ہے جس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ مہمانداری اور مہمان کا تحفظ قبائلی حیات میں اسے اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ بعض اوقات یہ انتہائی قدر و قیمت رکھنے والی صفت مہمان کیلئے وبال جان بھی بن جاتی ہے دوران تحقیق کم از کم میرے لئے تو قبائلی علاقوں میں متعدد بار یہ میلمستیا کی مجلس وبال جان سے کم نہ تھی اور ویسے بھی ایک ایسا شخص جو کم خوردنی کا عادی ہو اس کے لئے تو یہ میلمستیا سے متعلق مجلس باعث رحمت کبھی بھی ثابت نہیں ہوتی، میلمستیا تحفظ خورد و نوش کی دو گونہ پابندی عائد کرتا ہے گو یہ پابندی اسی لمحہ ختم ہو جاتی ہے جب مہمان میزبان کی دہلیز سے باہر قدم رکھتا ہے اس سلسلے میں یہ بھی میلمستیا کے ضمن میں شمار ہونے والی بات رہی ہے کہ کوئی جو کسی پٹھان یا بالخصوص اس کے گھر تک پہنچ سکتا ہے، میزبان سے پناہ مانگ سکتا ہے، خواہ اس کے سابقہ تعلقات کیسے بھی رہے ہوں، پٹھان معاشرے میں ایسا بھی ہوا ہے کہ فریق مخالف ہونے کے باوجود جب کوئی مخالف فریق کے ہی حلیف کی حدود میں آ کر پناہ مانگ لے تو وہ اس بات پر مجبور ہے کہ وہ مخالف فریق کے گروہ یا فرد کو اپنی حفاظت میں سمجھے چاہے اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے، تاریخ کے صفحات میں ایسے واقعات موجود ہیں، اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ بے گناہ لوگ اجنبیوں یا اپنے ذاتی دشمنوں کو بچاتے ہوئے مارے گئے جنہوں نے اپنے حریفوں کے تعاقب کی وجہ سے پناہ مانگی تھی، غرض یہ کہ پٹھان ایک مرتبہ کسی کو پناہ دے دے تو میلمستیا کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اس کے جان و مال کا بڑی سے بڑی قیمت چکا کر بھی تحفظ کرے۔

شرمالہ:

پختونوں کے ہاں ایک خصوصی جرگہ ہے جو کہ جارح یا اس کے نمائندوں کی طرف سے بلایا جاتا ہے تا کہ کسی جھگڑے یا تنازعہ کا مذاکرات کے ذریعے حل تلاش کر کے فیصلہ کیا جائے اس میں جرگہ ہر طرح کا فیصلہ کر سکتا ہے، معاوضہ پر اتفاق کیا جا سکتا ہے، بھیڑ دی جا سکتی ہے اور بیٹی کی شادی کی پیش کش کی جا سکتی ہے۔

لڑائی میں آخری صلح (جو بالآخر فیصلہ کن صلح بن سکتی ہے) جو جرگہ یا حکومت کرائے ایک پتھر رکھ کر کی جاتی ہے اس پتھر کو تنگہ کہتے ہیں جو کہ فریقین کے درمیان عارضی صلح کی علامت ہوتی ہے۔

تور:

تور پشتو کا لفظ ہے جسے کے معنی ''سیاہ'' کے ہیں، یہ لفظ کھلم کھلا جرم اور سیاہ کاری کے لئے استعمال ہوتا ہے اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی عورت کسی آدمی کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتی ہے تو اسے اس آدمی کے ساتھ اور آدمی کو عورت کے ساتھ تور قرار دیدیا جاتا ہے اور پھر دونوں واجب القتل ہو جاتے ہیں۔

جرگہ:

پشتونوں کے ہاں جرگے کا رواج بہت قدیم اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے یہ جرگہ انتظامی، عدالتی، اور قانونی امور کی فرائض دہی میں پشتونوں کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے، علاوہ ازیں قبائل کے آپس کے یا حکومت اور قبائل کے مابین متنازعہ امور میں ثالثی کے فرائض بھی انجام دیتا ہے، جرگہ سسٹم پشتونوں کی روایتی اور ثقافتی اصولوں کے تابع ہوتا ہے، جو کہ عام حکومتی طرز کے مجلسی انداز کا نہیں ہوتا اس کا کوئی مخصوص مقام نہیں ہوتا یہ حجروں میں بھی ہوتا ہے اور بادشاہوں کے درباروں میں بھی ہوتا ہے لیکن دونوں طرح سے جرگہ کا مقام انتہائی اہم سمجھا جاتا ہے، جرگے میں اکثر بولنے کا حق اسے ہوتا ہے جو شیبہا بزرگ و باریش ہونے کے علاوہ متانت و سنجیدگی میں بات چیت بھی کر سکتا ہو، جرگے کے فیصلے کو ہر حالت میں قبولیت حاصل ہوتی اور جرگے کے بالاتفاق فیصلے کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم ہوتا ہے، جسے قبائل کے قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے، جرگہ جہاں جاتا ہے یا جہاں بیٹھتا ہے اس کے ممبران کا احترام وہاں کے لوگوں پر واجب ہوتا ہے۔

قاری جاوید اقبال

نام: محمد جاوید اقبال المعروف (قاری جاوید اقبال)

ولدیت: خادم حسین

پتہ: مکان نمبر 2996 سٹریٹ کالا خان جہانگیر پورہ پشاور

تاریخ پیدائش: 10 جنوری 1948

زبان دانی: ہندکو، اُردو، فارسی، عربی، انگریزی

تعلیمی استعداد:

(1) عربی فاضل، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن پشاور

(2) ایم اے اسلامیات، پشاور یونیورسٹی

(3) ایم اے عربی، پشاور یونیورسٹی

(4) سند اینڈ قرآت، مرکزی دارالقراء پشاور

کالم نویسی کا تجربہ: (متعدد اخبارات و رسائل میں کالم نویسی کا وسیع تجربہ جن میں:

(1) روزنامہ مشرق پشاور، (2) روزنامہ آج پشاور، (3) روزنامہ صبح پشاور، (4) روزنامہ الحاق پشاور (5) سابق ایڈیٹر ماہنامہ صفہ پشاور، (6) سابق ایڈیٹر ماہنامہ تعلیم و تجارت پشاور، (7) مقرر۔ ریڈیو پاکستان پشاور، (8) مقرر۔ پاکستان ٹیلی ویژن پشاور، اسلام آباد (9) اسکرپٹس رائیٹر ریڈیو پاکستان پشاور، (10) اسکرپٹس رائیٹر پشاور ٹیلی ویژن (11) تبصرہ نگار برائے کتب

ملازمت (تجربہ):

(1) بحیثیت مدرس برائے عربی اسلامیات اردو تاریخ منجانب ایف جی اینڈ صوبہ سرحد ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ

(2) بحیثیت پبلک ریلیشن آفیسر برائے ڈائریکٹر ایجوکیشن پشاور ڈویژن

(3) بحیثیت انسپکٹر آف سکولز ایف جی اینڈ صوبہ سرحد

انتظامی استعداد:

(1) منتظم برائے انعقاد تقریبات و سیمنارز فیڈرل گورنمنٹ مدارس و صوبہ سرحد گورنمنٹ

(2) مصنف برائے مقابلہ طلباء و طالبات، تقاریر، نعت خوانی و قرآت

(3) چیئرمین گندھارا اورشا اکیڈیمی صوبہ سرحد

(4) صدر نشین، مجلس فروغ اُردو صوبہ سرحد

(5) ممبر سلیکشن کمیٹی برائے صدارتی ایوارڈ حکومت صوبہ سرحد

(6) ممبر سٹیزن کمیٹی برائے تحفظ تاریخی ورثہ از ڈائریکٹریٹ آف میوزیم اینڈ آرکیالوجی صوبہ سرحد

(9) سینئر ممبر برائے کتب کمیٹی از آرکائیوز اینڈ لائبریریز صوبہ سرحد

(10) سابق ممبر برائے آرگنائزنگ کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات صوبہ سرحد

(11) سابق ممبر برائے آگنائزنگ کمیٹی برائے انعقاد سیمینار و تقاریب از سرحد آرٹس کونسل اینڈ کلچر ڈیپارٹمنٹ صوبہ سرحد

ایوارڈز:

(1) گولڈ میڈل برائے تصنیف ''ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں'' از سٹی یونیورسٹی پشاور

(2) امتیازی شیلڈ اینڈ سرٹیفکیٹ برائے تصنیف ''ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں'' منجانب سرحد کنزرویشن نیٹ ورک صوبہ سرحد

(3) ایوارڈ اینڈ دستار (قراقلی) منجانب محکمہ تعلیم صوبہ سرحد برائے ترتیب و تدوین سلیبس برائے سکولز صوبہ سرحد

(4) ایوارڈ برائے امتیازی لیکچر منجانب فیڈرل گورنمنٹ ایجوکیشن پشاور تاریخی

تصانیف و تراجم و تالیفات:

(1) ''ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں'' مطبوعہ از لوک ورثہ اسلام آباد

(2) ثقافتی انسائیکلوپیڈیا صوبہ سرحد از لوک ورثہ اسلام آباد

(3) ثقافتی جائزہ قبائلی علاقہ جات برائے لوک ورثہ اسلام آباد

(4) سرحدی لسانیات پر اردو کے اثرات از مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

(5) تحریک آزادی سے تحریک پاکستان صوبہ سرحد

(6) ترجمہ تشریح عربی دیوان دیوان متنبی لاہور

(7) شاعری مجموعہ صرصر از اکادمی افکار پشاور

(8) دینی مسائل تعلیم الدین از اکادمی افکار پشاور

(9) تجوید القرآن برائے صوبہ سرحد مدارس جماعت ششم تا دہم مطبوعات از تاج کتب خانہ اینڈ ٹیکس بک بورڈ صوبہ سرحد

(10) لغۃ القرآن برائے جماعت پنجم مطبوعہ تاج کتب خانہ پشاور

(11) خلاصہ اسلامیات برائے جماعت دہم مطبوعہ ضیع گائیڈ پشاور

(12) اسلامیات توضیح القرآن برائے یازدھم (گیارھویں) از خیبر گائیڈ

(13) علوم اسلامیہ اسلامیات برائے جماعت دوازدھم (بارھویں جماعت) از گائیڈ

اسکرپٹس رائیٹنگ:

(1) اسکرپٹ برائے ثقافتی ڈاکومینٹری پی ٹی وی پروگرام رنگ سرحد، (2) اسکرپٹس برائے ثقافتی پروگرام پی ٹی وی پروگرام ذائقے کا سفر

(3) اسکرپٹس برائے ثقافتی نشریات ریڈیو پاکستان پشاور و اسلام آباد برائے پروگرام صبح پاکستان

مختار علی نیئر

نام: آخونزادہ مختار علی نیئر

قلمی نام: مختار علی نیئر

والد کا نام: آخونزادہ قمر علی سرحدی

پتہ: محلہ اسلام آباد۔ نشتر آباد۔ پشاور شہر

صحافتی خدمات:

گزشتہ 40 برس سے مختلف اخبارات و رسائل میں لکھ رہے ہیں۔ جن میں چند درج ذیل ہیں:

۱) روزنامہ ''امروز'' لاہور، ۲) روزنامہ ''انجام''، ۳) روزنامہ ''شہباز'' پشاور، ۴) روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی، ۵) روزنامہ ''حیات''، ۶) روزنامہ ''سرخاب'' ھندکو پشاور، ۷) روزنامہ ''نصرت''، ۸) روزنامہ ''نوائے خیبر''، ۹) روزنامہ ''سرحد'' پشاور، ۱۰) ماہنامہ ''شہکار'' انڈیا لکھنؤ، ۱۱) ماہنامہ ''بیسویں صدی'' انڈیا دہلی، ۱۲) ماہنامہ ''صنم'' کراچی، ۱۳) ماہنامہ ''قند'' مردان، ۱۴) ماہنامہ ''ازژنگ'' پشاور، ۱۵) ماہنامہ ''آھنگ'' کراچی، ۱۶) ہفتہ وار ''غنچہ'' پشاور، ۱۷) پندرہ روزہ ''المظہر''، ۱۸) پندرہ روزہ ''سفینہ'' پشاور شامل ہیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے لئے درج ذیل پروگرام لکھے (ان پر انہیں آوٹ اسٹینڈنگ رائٹر کا اعزاز دیا گیا):

۱) ھندکو مزاحیہ سیریز ''ویکھدا جاندارے'' انعام یافتہ ثقافتی پروگرام

۲) ھندکو ثقافتی پروگرام ''متلاں'' (انعام یافتہ پروگرام)

۳) ھندکو لوک کہانیوں پر مبنی پروگرام ''لوک ورثہ''۔

۴) ادبی مزاحیہ پروگرام ''افراتفری'' اور ''چٹخارے'' (میں بولوں کے نہ بولوں)۔

۵) سلسلہ وار پروگراموں میں ''قلعہ بالا حصار''، ''قلعہ جمرود''، ''پشاور کے دروازے''، ''پشاور کی مسجدیں''۔

۶) ھندکو مزاحیہ ثقافتی اور ادبی پروگرام ''ٹھیہ''۔

۷) پاکستان ٹیلی ویژن کی جانب سے ۱۹۸۵ اور ۱۹۸۶ میں صوبہ سرحد کے بہترین ڈرامہ نگار کا اعزاز ملا اور ان کی ۲۵ سالہ علمی ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف پر ''سلور جوبلی گولڈ میڈل'' سے بھی نوازہ گیا۔

۸) ٹیلی ویژن کے لیے بے شمار تنقیدی پروگرام، لسانی پروگرام، مشاعرے، بچوں کے پروگرام، عید اسپیشل پروگرام لکھے۔

ریڈیو پاکستان کے لئے خدمات:

۱) پشاور ریڈیو سے نشر ہونے والا ھندکو پروگرام ''قاوا خانہ'' لکھا اور ھندکو پروگرام ''بیٹھک'' کی ۱۵ سال تک میزبانی کی۔

۲) اردو پروگرام ''حرف وصوت'' کی ۳ سال تک میزبانی کی اور بچوں کے لیے بے شمار تعلیمی پروگرام لکھے، جو ریڈیو کے رسالے ''آھنگ'' میں شائع ہوئے۔

۳) ھندکو ڈرامہ ''اُڈیکاں'' ریڈیو پر کئی بار نشر ہوا اور ابا سین آرٹس کونسل کی جانب سے بھی انعام دیا گیا۔

۴) پروگرام ''ہمارا پاکستان'' پر قومی اخبارات نے تعریفی خطوط شائع کئے اور بے شمار اردو اور ھندکو ڈرامے، دستاویزی پروگرام اور فیچر پروگرام لکھے۔

تعلیمی خدمات:

ٹیکسٹ بک بورڈ صوبہ سرحد کی اردو کی چھٹی اور ساتویں کتابوں کے مصنف ہیں۔

تحقیقی کام:

۱) تاریخ زبانِ ھندکو، ۲) ھندکو قوائد، ۳) متلاں، ۴) ھندکو نثری کھاڑی، ۵) تاریخِ روضہ حسین پر تحقیقی کام۔

اس کے علاوہ:

۱) ھندکو ضرب الامثال (اردو)، ۲) ھندکو لوک کہانیاں (اردو)، ۳) قدیم تھیٹر کے نغمے (اردو)، ۴) تزکرۂ قدیم شعرأ ھندکو (اردو)، ۵) قدیم ھندکو (ھندکو)، ۶) خزانہ (ھندکو لغت)، ۷) کلیاں اور بازار (اردو)، ۸) سائیں احمد علی مشہور کتابیں ہیں۔

رازول کوہستانی

نام: رازول کوہستانی

پیدائش: ستمبر ۱۹۵۶ء

پیدائش کا علاقہ: پالس، کوہستان

تعلیم: ۱۔ بی بی اے ۲۔ پروفیشنل اکاؤنٹنگ، آڈیٹنگ اور ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں ڈپلومہ ہولڈر

دلچسپی کے موضوعات: لسانیات، فوک لور، ثقافتی بشریات

تحقیقی علاقہ: انڈس کوہستان وشمالی علاقہ جات (کی وہ آبادیاں جہاں شنا زبان یا اس کے لہجے بولے جاتے ہیں)

مطبوعات: ۱۔ شنا ماحولی قاعدہ (انعام یافتہ)، ۱۹۹۶ء

۲۔ کوہستان میں ادویاتی جڑی بوٹیوں کا روایتی استعمال، ۱۹۹۷ء

۳۔ انڈس کوہستان (شن، یشکن وکمین قبائل اور ان کا نظام معاشرت)، ۱۹۹۸ء

۴۔ شنا کہاوتیں، ۱۹۹۸ء

۵۔ بنیادی شنا اردو لغت، ۱۹۹۹ء

6. Nominal Inflection in the Shina Language of Pakistan. Published in ACTA Oreintalia, Denmark, 2001 (with Ruth Schmidt, University of Oslo.

7. Phonology and Tonal System of Shina of Palas Valley. (Ruth Schmidt, University of Oslo, Norway), Published in ACTA Oreintalia, Denmark, December, 1998

8. The Shina Language in Pakistan to day (with Ruth Schmidt, University of Oslo, Norway) to be appeared in the Globalization, Technological advance and lesser-known languages in South Asia.

Studies in Language Companion Series.

زیر تحقیق وترتیب: ۱۔ شنا، کوہستانی، بٹیڑی، چھلسیو اور گبارہ زبانوں کی تقابلی لغت

۲۔ شنا زبان کا رسم الخط (تحقیقی، تنقیدی اور فنی جائزہ) ۳۔ شنا لوک شاعری

بیرون ممالک کا سفر: ۱۔ یونیورسٹی آف اوسلو (ناروے) کے شعبہ مشرقی علوم کی دعوت پر ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۳ء کے دوران بطور مہمان محقق کے مدعو کیا گیا جہاں کوہستان کی شنا زبان کی ایک حوالہ جاتی کتاب اور ایک طویل داستان پر تحقیقی کام مکمل کیا۔

۲۔ متعدد بار تربیتی ورکشاپس اور کانفرنسوں میں شمولیت کے لئے نیپال، لندن، کیمرج اور جرمنی جانے کا اتفاق ہوا۔

ملازمت: پالس کنزرویشن اینڈ ڈویلپمنٹ پراجیکٹ میں بطور اسسٹنٹ پروگرام آفیسر برائے فنانس اینڈ منسٹریشن کے کام کر رہے ہیں۔

دیگر: متعدد غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔

فہرست حوالہ جات۔ کتب (قاری جاوید اقبال)

1.	تاریخ ابن خلدون	(عبدالرحمن ابن خلدون)
2.	ارتھ شاستر	(وشنو گپتا۔ ترجمہ ارشاد الحق حقی)
3.	پشتون تاریخ کے آئینے میں	(تالیف از سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل)
4.	یوسف زیئے پٹھان	(اللہ بخش یوسفی)
5.	خیر البیان	(بایزید انصاری تدفین و ترتیب حافظ محمد عبدالقدوس قاسمی)
6.	شاھان گوجر	(مولفہ۔ ابوالبرکات عبدالمالک خان صاحب)
7.	روحانی رابطہ ''پشتو''	(عبدالحلیم اثر)
8.	لاہور تاریخ کے آئینے میں	(میر سید بخاری)
9.	ٹپے	(پرتو روہیلہ)
10.	تاریخ تناول	(فدا حسین)
11.	تاریخ ہزارہ	(ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی)
12.	تاریخ چترال	(مرزا محمد غفران)
13.	تاریخ پشاور	(منشی گوپال داس)
14.	چترال کی لوک کہانیاں	(غلام محمد)
15.	کتاب مقدس بائیبل	(بائیبل سوسائٹی)
16.	اباسین کوہستان	(محمد پرویش شاہین)
17.	سوات تاریخ کے آئینے میں	(فضل ربی راہی)
18.	حسین وادی سوات	(امیل ذادہ تائب)
19.	کالام کوہستان	(محمد پرویش شاہین)
20.	پشاور لوک کہانی	(خاطر غزنوی)
21.	سرحد کے لوک گیت	(فارغ بخاری)
22.	رزمیہ داستانیں	(رضا ہمدانی)
23.	پشتون کون؟	(پروفیسر پریشان خٹک)
24.	پٹھان اور بلوچستان	(ایڈورڈ۔ ای۔ آلیور)
25.	سرزمین پختون	(جیمز ڈبلیو سپین)

DATA ENTRED

.26	پٹھان	(سر اولف کیرو)
.27	ادبی تھمی پشتو	(ایاز داؤد زئی)
.28	ملغلرے پشتو	(پروفیسر نثار)
.29	تمبل پشتو	(نثار محمد خان)
.30	چترالی موسیقی الات موسیقی اور فنکار	(شیر ولی خان اسیر)
.31	قصص الانبیاء	
.32	ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں	(قاری جاوید اقبال)
.33	کوہاٹ تاریخ کے آئینے میں	(احمد پراچہ)
.34	تاریخ بنوں	(حبیبی)

1.	The Bazar of the story	(W. L. Heston)
2.	The Pathan	(Olof Kaino)
3.	Pata Khazana	(Muhammad Hatom)

شخصیات جن سے استفادہ کیا

.1	مولوی محمد عمر	(پاتراک کوہستان)
.2	حاجی قطب الدین	(شرینگل کوہستان دیر)
.3	امان ولی	(پاتراک کوہستان)
.4	حاجی معراج الدین	(سابق کمشنر مردم شماری صوبہ سرحد)
.5	بونیر خان	(سابق ڈائریکٹر تعلیم۔ اوڈیگرام سوات)
.6	محمود خان	(سابق کمشنر۔ شمالی علاقہ جات)
.7	مظروف اسلام	(سابق ڈائیریکٹر تعلیم۔ منگورہ سوات)
.8	محمد پرویش شاھین	(منگلور شاھین)
.9	سخی جان	(کالام کوہستان)
.10	فاروق جان بابر	(ڈیرہ اسماعیل خان)
.11	نصیر سدمد	(ڈیرہ اسماعیل خان)

12.	پروفیسر پریشان خٹک	(سابق چیئرمین اکادمی ادبیات۔ اسلام آباد)
13.	محمد انور شاہ قادری	(پشاور)
14.	احمد فراز المعروف یاسر	(جان سنز قصہ خوانی۔ پشاور)
15.	شیر غنی خان آفریدی	(پشاور)
16.	فضل خدا خان	(تہکال بالا۔ پشاور)
17.	ڈاکٹر میر رضوان احمد	(ریلوے ہسپتال۔ پشاور)
18.	ڈاکٹر مراد علی	(لیڈی ریڈنگ ہسپتال۔ پشاور)
19.	ظاہر اللہ خان	(ڈائریکٹر آرکائیوز لائبریز۔ صوبہ سرحد)
20.	محمد جمیل عباسی	(ایبٹ آباد)

DATA ENTRED

لوک ورثہ اسلام آباد اور الفیصل ناشران لاہور کے مشترکہ اشاعتی پروگرام کے تحت
پاکستان کے ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کے درج ذیل والیمز شائع کیئے جا رہے ہیں:

-- شمالی علاقہ جات

-- سرحد

-- بلوچستان

-- پنجاب

-- سندھ

-- پاکستان کی موسیقی اور موسیقاروں کا انسائیکلوپیڈیا

پاکستانی ثقافت، فنون اور صوفیاء کے حوالے سے کتابیں شائع کرنے کا منفرد مشترکہ
اشاعتی پروگرام

الفیصل ناشران و تاجران کتب

لوک ورثہ LOK VIRSA

ISBN 969-503-525-6

CAD LIBRARY PVT. LTD.